تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
تفسیرِ قرآن
تفسیر ماجدی
جلد اول
سورۃ فاتحۃ — تا — سورۃ مائدۃ
از
مولانا عبدالماجد دریابادی
مجلسِ نشریاتِ قرآن

جن کی ایک عمر عقلی علوم کے مطالعہ میں گذری تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے لوگوں کے ایمان بچ گئے، اور کتنے لوگوں کے ایمان میں نئی طاقت و توانائی پیدا ہوگئی۔

اب یہ نیا دور تھا عقلی علوم اور فلسفۂ یونان کے بجائے تجربی علوم، سائنس، بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے انکشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں، تاریخ و جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی، جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلمات اور جغرافیائی روایات محلِ نظر بلکہ خلافِ واقعہ بھی جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثارِ قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سبب سے عالمِ اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک نئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجازِ قرآن اور صداقتِ قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء و متکلمین، اور مفسرینِ قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، اور انھوں نے علمی و عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔

اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لئے مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی، اور انگریزی اور اُردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لئے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، اُن کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش و مطالعہ، اور عرق ریزی کا نتیجہ اُن کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے۔

راقم اس کے اظہار میں حرج نہیں سمجھتا کہ تفسیر قرآن (اپنی علمی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ) میرا ابتدا سے موضوع رہا ہے، تقریباً دس برس دار العلوم ندوۃ العلماء میں یہ مضمون میری حقیر ذات سے متعلق رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اس سلسلہ میں قدیم تفاسیر میں سے کوئی قابلِ ذکر تفسیر (جو کوئی خصوصیت رکھتی ہو) ایسی یاد نہیں آتی جو نظر سے نہ گذری ہو، جدید مطبوعات بھی علم میں آتے رہے، اور ان سے بھی وقتاً فوقتاً استفادہ کی نوبت آئی، عربی ممالک کے سفر کے سلسلہ میں جدید ترین مطبوعات سے بھی واقفیت کا موقعہ ملا، اس کے بعد شاید میرا یہ عرض کرنا کچھ وقعت رکھتا ہو، اور ناظرین کے لئے ہمت افزائی اور اطمینانِ قلبی کا باعث ہو کہ "تفسیر ماجدی" اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے، اور تمام تفسیری ذخیرہ کی موجودگی میں اس کی بہرحال ضرورت تھی، قرآن مجید کے بیسیوں مقامات ایسے ہیں کہ اُن میں قرآن کا اعجاز اور وحیِ محمدی کی صداقت پورے طور پر اس وقت تک عیاں نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ان آیات کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو، اور جن اقوال و عقائد کی تردید یا نفی کی گئی ہو، اُن کی حقیقت و اصلیت اور اُن کی اس دور میں اہمیت و مقبولیت و عمومیت معلوم نہ ہو، اس سلسلہ میں مولانا عبد الماجد صاحب نے ایک نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے، جس کا شکریہ ان سب لوگوں پر واجب ہے جو مغربی زبانوں سے براہِ راست واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے ان ماخذوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یا اُن کے پاس اتنا وقت اور

ایسا وسیع کتب خانہ نہیں ہے، قرآنی واقعات و قصص اور مقامات و امکنہ، نیز اشخاص و اقوام اور مذاہب و فرق سے متعلق انھوں نے اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو یکجا نہیں مل سکتا، پھر جہاں تک میری نظر پڑی ہے، وہ مسلکِ سلف سے ہٹے نہیں ہیں۔

قرآن مجید کا یہ بھی ایک اعجاز ہے اور اس کے کامل طور پر منزل من اللہ اور محفوظ رہنے کی دلیل ہے کہ صُحفِ سابقہ تورات و انجیل میں باہر سے جو چیزیں داخل کر دی گئی تھیں اور بے اصل مشہورات و روایات اس میں شامل ہو گئی تھیں، کچھ تو بعد کی علمی تحقیقات کی روشنی میں اور کچھ اُن سے جو غلط فہمیاں، ذاتِ الٰہی اور انبیاء علیہم السّلام کی شخصیتوں کے بارے میں اُن سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں، بلکہ اُن سے اُن کی ذات، اُن کی عصمت و تقدس، اور اُن کی دعوت پر حرف آتا تھا، قرآن مجید کے ترجمہ ہی کے ذریعہ یا براہِ راست مطالعہ کے اثر سے ان صحیفوں کے مطالعہ کرنے والے اور اُن پر ایمان رکھنے والے ان اقوال کی نسبتوں اور صُحفِ سابقہ میں ان مضامین کی شمولیت سے شرمندہ اور خائف ہوئے، اور انھوں نے کہیں اُن کو خارج کرتے اور کہیں الفاظ کے تغیر و تبدل سے اس کی تلافی کی کوشش کی، اور ان صحیفوں کے دوسری زبانوں میں ترجمے اور تشریح میں اور کہیں اپنے جدید علمی تحقیقات اور مذاہب و اخلاق کے موسوعات (ENCYCLOPAEDIAS) میں اُن کی نفی اور تردید کی یا ایسی جدید تحقیقات پیش کیں جن سے تردید و تنقید اور ارتیاب و تشکیک کے وہ خطرات دور ہوں اور جدید تحقیقات و انکشافات پر نظر رکھنے والے عقیدہ کے تزلزل اور شک و ارتیاب سے محفوظ ہو جائیں، اور کبھی کبھی اُن کو ان بعض بیانات پر جوان "مقدس کتابوں" میں باہر سے شامل ہو گئے ہیں، اور وہ ان کو ماننے والوں کے عقیدہ میں مسلّمات و عقائد میں داخل ہیں، مستقل کتابیں لکھنے کی بھی توفیق ہوئی، اور یہ سلسلہ عرصہ سے شروع ہو کر ابھی تک جاری ہے لیکن اس کے لئے تقابلی مطالعہ (COMPARATIVESTUDY) اور کسی ترقی یافتہ مغربی زبان کے جاننے (بالخصوص انگریزی دانی کی ضرورت تھی) اور اس سے بڑھ کر قرآن کے اعجاز اور اس کے محفوظ رہنے پر عقیدۂ راسخ پھر عزم و بلند ہمتی، محنت کوشی اور جذبۂ دینی کی ضرورت تھی (معذرت کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ) ہمارے جدید دانش گاہوں کے فضلاء اور کسی مغربی زبان کے ماہر ابھی تک اس گہرے، وسیع اور ذمہ دارانہ تقابلی مطالعہ سے غافل اور کنارہ کش رہے ہیں، جس سے قرآن مجید کا یہ اعجاز اظہر من الشمس اور ایک بدیہی حقیقت کی طرح واضح اور روشن ہو۔

ہمارے محدود علم میں (اور یہ بات وسیع سفروں اور سیاحتوں، یورپ اور امریکہ کے سفروں اور وہاں کی بہت سی علمی کوششوں سے واقفیت کے بعد لکھا جا رہا ہے) اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادمِ دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو توفیق دی کہ وہ تقابلِ مذاہب اور تقابلِ صُحفِ سماوی کا منظم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں اور کم سے کم انگریزی میں شائع ہونے والی تنقیدی، احتسابی و تقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز، اور وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مضامین و مباحث کا مطالعہ جاری رکھیں، اور ان کے حوالہ و نشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات و انجیل کے تحریفات، خارجی اضافات اور ذات و صفاتِ خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں، یہ ایک خادمِ دین مترجم و مفسرِ قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص و بلند ہمتی کا شاہکار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں اُن کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نظر نہیں آتا۔

اس کی تصدیق وتشریح کے لئے راقم اپنی کتاب "مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی" کا ایک مضمون پیش کرتا ہے، "صحفِ سابقہ کی تحریفات پر تنبیہ اور مذاہبِ سابقہ کے عقائد و فرق کے باریک فرق" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔

قرآن کے اعجاز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے اختلافی عقائد اور خیالات کو (جن سے عام آدمی واقف نہیں ہے) بڑی صحت اور پختگی کے ساتھ بیان کیا ہے، اور ان کے مختلف مذہبی خیالات واختلافات کے سلسلہ میں بڑی نازک باریک باتوں کا خیال رکھا ہے، قرآن نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ان کے جو عقائد واختلافات بیان کئے ہیں، ان کے مذہبی ذخیرہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ سے اس کے لفظ لفظ کی تصدیق ہوتی ہے، جس قدر ان مذاہب سے گہری واقفیت پیدا ہوتی جارہی ہے، اور ان کی کتابوں کے (جو اب کثرت سے شائع ہوتی جارہی ہیں) گہرے مطالعہ کے مواقع و ذرائع بڑھتے جارہے ہیں، قرآن کے بیانات کی تصدیق ہوتی جاتی ہے اور عجیب عجیب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں کوئی لفظ ضائع وبے کار نہیں اور اس کے الفاظ و تعبیر کا کوئی فرق بے محل نہیں ہے۔

اس طرح اشخاص وواقعات کے سلسلہ میں قرآن نے جن چیزوں پر زور دیا، یا جن چیزوں کی نفی کی ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ یہودی وعیسائی ان چیزوں کو نہیں مانتے تھے، اور ان کے بعض الزامات وروایات کی تردید مقصود ہے، یہاں پر اس کی صرف تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے "کفر" کی نفی کی ہے، اور کہا ہے:-

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا۔ اور سلیمان علیہ السلام نے مطلق کفر کی بات نہیں کی، بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔

(سورۃ البقرۃ۔ ۱۰۲)

ایک خالی الذہن اور سلیم الفطرت انسان کو اس پر تعجب ہوسکتا تھا کہ ایک جلیل القدر نبی سے "کفر" کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ نبوت کا منصب نہ صرف ایمان کا مستلزم ہے، بلکہ نبی برحق اہلِ ایمان کا امام وقائد، پیشوا و مقتدیٰ، اور اپنی امت کے لئے ہدایت وایمان کا ذریعہ اور سرچشمہ ہوتا ہے۔

لیکن بائبل میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو تصریحات آئی ہیں، اور جن کے بعض نمونے پچھلے صفحات میں گذرے ہیں، اور ان کے بارے میں یہودیوں میں (معاذ اللہ) شرک وثنیت اور تعلیم سحر وغیرہ کی جو روایات مشہور ومقبول عام تھیں، نیز یہودی لٹریچر (دائرۂ معارف یہودیہ (JEWISH ENCYCLOPAEDIA) اور دائرۂ معارف مذاہب واخلاق (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS) وغیرہ مآخذ کے شائع ہونے کے بعد ان کے بارہ میں یہودی نقطۂ نظر، اور تاریخی پس منظر کا جو علم ہوتا ہے، اس کو سامنے رکھ کر، اس نفی وتردید، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عصمت وبراءت کے قرآنی بیان کی قدر وقیمت، اور اہمیت وضرورت واضح ہوجاتی ہے، یہودی اور عیسائی دنیا (جس کے نزدیک عقائد وتعلیمات کا مآخذ قرآن نہیں بائبل تھی) اپنے اسی قدیم خیال پر قائم رہی، لیکن بالآخر اس کو اسی صداقت کی طرف آنا پڑا جس کا دنیا کے تمام علمی تمدنی مرکزوں سے دور بیٹھ کر صحرائے عرب میں ایک نبی اُمّی نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اعلان کیا تھا، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے (جو برطانوی تحقیق وکاوش کا لبِ لباب ہوتا ہے) اس مقالہ میں جو حضرت سلیمانؑ پر ہے، صاف طور پر کہا گیا ہے۔

"سلیمانؑ خدائے واحد کا مخلص پرستار تھا۔"[1]

انسائیکلوپیڈیا بیبلیکا (ENCYLOPAEDIA BIBLCA) جو خاص مسیحی فضلاء اور ماہرین علوم، عہد عتیق کی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ہے، میں صاف طور پر اس کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ بائبل کی وہ آیتیں جن سے حضرت سلیمانؑ کا (معاذ اللہ) کفر اور شرک ثابت ہوتا ہے' بڑھائی گئی ہیں، اور الحاقی ہیں' اور اپنی بیویوں کے اثر سے ان کے دیوتا کی پرستش کے الزام کی صاف تردید کی گئی ہے۔[2]

۲۔ قرآن شریف میں "خلق السمٰوات والارض" کے بعد آتا ہے کہ اس عمل خلق و تکوین کے بعد اس کو کسی طرح کا تکان اور آرام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور (جو مخلوقات)
وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا	ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنا دیا، اور ہم کو
مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ (سورۃ ق۔ ۳۸)	ذرا بھی تھکان نہیں ہوا۔

ایک سلیم الفطرت انسان اس کو پڑھ کر تعجب کر سکتا ہے کہ اس قوی اور عزیز، قادر و قاہر خدا کو جس کی صفت ہے "وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا"[3] (اور زمین و آسمان کی) نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں) اور "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ"[4] (اور اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند) اس کی صفائی دینے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اس خلق و تکوین کے بعد تھکا نہیں؟ لیکن جب بائبل کی اس عبارت پر نظر پڑتی ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو بنایا، اور ساتویں دن آرام کیا تھا۔ (پیدائش ۲:۲[5])

بائبل کے عربی ترجمہ میں "فاستراح فی الیوم السابع" کے الفاظ ہیں (ساتویں دن استراحت کی) کنگ جیمس کی مستند انگریزی بائبل میں حسب ذیل الفاظ ہیں:۔

" AND HE RESTED ON SEVENTH DAY FROM ALL HIS WORK WHICH HE HAD MADE " GEN. 2:2

ان تصریحات کے پڑھنے کے بعد ہی قرآن خداوندی "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ" کی ضرورت، معنویت اور افادیت صحیح طور پر سمجھ میں آتی ہے' اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس جہالت اور جرأت کی تردید' اور کس غلط فہمی یا غلط بیانی کا ازالہ ہے جس میں علم و ہدایت کے سب سے بڑے مدعی ہزاروں برس مبتلا ہے' اور شاید اسی کی یادگار میں آج تک وہ (سبت) مناتے ہیں' اور اس میں کچھ کام نہیں کرتے۔

۳۔ حضرت مسیحؑ کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدہ کو قرآن مجید نے تین طرح سے ذکر کیا ہے:۔

---

[1] جلد ۲ ص ۹۵۲ طبع چہاردہم

[2] مستفاد از تفسیر ماجدی ملاحظہ ہو تفسیر آیت "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا" (البقرۃ۔ ۱۰۲)

[3، 4] سورۃ البقرۃ۔ ۲۵۵

[5] معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی علماء اور مترجمین کو بعد میں اس غلطی کا احساس ہوا کہ وہ خدا کی طرف کس کمزوری کو منسوب کر رہے ہیں' اور انھوں نے اپنے اصول و معمول کے مطابق تراجم پر نظر ثانی کرنے کے وقت اس تعبیر میں ترمیم کر دی ہمارے سامنے برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا ۱۹۵۶ء کا جو ایڈیشن ہے اس میں اس کے بجائے حسب ذیل عبارت ہے "اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر دیا تھا، ساتویں دن فارغ ہوا" (۲:۱)

۱ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ (المائدہ۔ آیت ۱۷۔ و آیت ۷۲)	جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم خدا ہیں بیشک کافر ہیں۔
۲۔ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ (سورۃ التوبہ۔ ۳۰)	اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔
۳۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۶ سورۃ یونس ۶۸)	اور یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے (نہیں) وہ پاک ہے۔
وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ (سورۃ مریم ۸۸۔ ۸۹)	اور کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے (ایسا کہنے والو یہ تو) تم بری بات (زبان پر) لائے ہو۔
وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ (سورۃ مریم۔ ۹۲)	اور خدا کو شایان شان نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔
وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ۝ (الاسراء۔ ۱۱۱)	اور کہو کہ سب تعریف خدا ہی کو ہے جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔
وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ (الکہف۔ ۴)	اور ان لوگوں کو بھی ڈرائے جو کہتے ہیں کہ خدا نے (کسی کو) بیٹا بنایا ہے۔

کیا یہ صرف اسالیب بیان کا فرق ہے اور یہ سب معنیً متحد اور مرادف ہیں؟ لیکن مسیحی فرقوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کی تفصیل معلوم ہونے کے بعد جواب روشنی میں آچکی ہے، الفاظ کے اس دقیق فرق کی افادیت و اہمیت سمجھ میں آتی ہے اور خاص طور پر جب یہ معلوم ہو گیا کہ مسیحیوں میں ایک مستقل فرقہ ADOPTIONIST کا ہے، جو حضرت مسیحؑ کی صلبی اولاد ہونے اور ان کی ابنیت و ولدیت کا قائل نہیں، بلکہ صرف اس کا قائل ہے کہ خدا نے معاذ اللہ ان کو متبنّیٰ (ADOPT) کر لیا تھا، تو قرآن کے اعجاز کا قائل ہو جانا پڑتا ہے، نبی عربی اُمّی نے حجاز میں بیٹھ کر چودہ سو برس پہلے وحی کی بنیاد پر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا، اور اس دقیق فرق کو جس سے اچھے پڑھے لکھے عیسائی بھی واقف نہ تھے ملحوظ رکھا تھا، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں:۔

"مسیحیوں کا ایک زبردست ADOPTIONIST اتحادیوں کے نام سے گذرا ہے، ان کے مرکزی عقیدہ کے لئے اصلاحی لفظ تبنیت یا اتحادیت ADOPTIONSIM کا ہے، ان کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "اقنوم اول یعنی خدائے برتر و اعظم نے انھیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنّیٰ بنا کر شریک الوہیت کر لیا، اور اب وہ الوہیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفات الٰہی میں شریک و سہیم ہے" اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۷۸۰ء میں ملتی ہے، آٹھویں صدی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا، آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اسی شاخ کی جانب ہے"[1]

یہ تمام دقیق باتیں، اور یہ معجزانہ پہلو کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی جس کو یہودیوں، عیسائیوں کے

[1] تفسیر ماجدی جلد اول صفحہ ۲۰۴

اندرونی اور گہرے واقعات وخیالات کا پورا علم نہیں تھا، یہ عالم الغیب کا صحیفہ ہے جس میں کوئی شک و اشتباہ، اور اس کے علم میں کوئی نقص وعیب نہیں۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○ (حٰمٓ السجدة ۴۱:۴۲)

اور یہ تو ایک عالی مرتبہ کتاب ہے اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والا (خدا) کی (اتاری ہوئی ہے۔[1]

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے لئے بڑے فخر ومسرت اور اس سے بڑھ کر سعادت وتوفیق الٰہی کی بات ہے کہ اس کو اس قابل صد ہزار قدر دینی وقرآنی خدمت کی حامل تفسیر کو پہلی مرتبہ ہندوستان سے نظر ثانی اور تعارف ومقدمہ کے ساتھ شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے' اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لائق احترام اور مستحق قدر واعتراف مصنف کے لئے ذخیرۂ آخرت اور مجلس کے لئے باعثِ برکت وقبولیت بنائے۔

سید ابوالحسن علی ندوی

[1] مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی ص۸۲-۸۶

اس مقالہ کے لکھنے کے بعد حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی تردید میں مستقل کتاب (TRIAL OF JESUS CHRIST) شائع ہوئی، جو مولانا کی عنایت ومحبت سے مطالعہ میں آئی، اس میں مصنف نے قدیم رومی تاریخ اور عدالتی کاغذات کی مدد سے اس وقت کے وہ ضابطے، قوانین اور روایات جمع کردی ہیں' جن کے مطالعہ سے قرآن خداوندی وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم کی ایسی تصدیق ہوتی ہے' اور حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی نفی وقرآن مجید کا اعجاز وصداقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ[1]

(طبعِ ثانی)

نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

کتاب کسی زبان کی بھی ہو اگر ادبی اعتبار سے بلند اور معنوی اعتبار سے عظیم ہے تو اُسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں، ہر صاحبِ قلم کے لئے کٹھن، بلکہ کہنا چاہیے کہ صبر آزما ہے، ہر زبان کی ساخت الگ ہوتی ہے، ترکیبیں جدا گانہ، نشستِ الفاظ کی ایک ہیئت مخصوص، صرف و نحو کے قاعدوں ضابطوں کی ایک وضع خصوصی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر لفظ اپنی زبان میں جو ضمنی مدلولات اور مخفی اشارات وکنایات رکھتا ہے انھیں زبانِ ترجمہ کے کسی لفظ میں بعینہٖ کیونکر لے آیا جائے؟ ——— ترجمہ میں اگر پابندی زبانِ ترجمہ کے طور طریقوں، ترکیبوں اور بندشوں، محاورہ و روزمرہ کی رکھئے، تو یہ تو اچھا خاصا ترجمہ کرنا نہ ہوا، زیادہ سے زیادہ اسے "ترجمانی" کہہ لیجئے، اور اگر کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھ دینے کا کر لیا، اور تکیہ تمام تر لغت و فرہنگ کی کتابوں پر رکھا تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ و بے کیف بن جائے گی کہ خود اپنی ہی طبیعت بدحظ ہو کر رہے گی اور جی اُسے پڑھنے پڑھانے کو نہ اٹھے گا۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام کے انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں، اور سعدیؔ کی گلستان اور مولانا رومیؔ کی مثنوی کے ترجمے انگریزی اور اردو میں موجود ہیں، بڑی قابلیت اور بڑے اہتمام و کاوش سے کئے ہوئے، لیکن ان سب مثالوں میں اصل اور اس کے ترجمہ میں ادبی و ذوقی حیثیت سے کوئی مناسبت ہی نہ رہی تو جب یہ حال انسانوں ہی کی لکھی ہوئی ہر اونچی معیاری کتاب کا ہوا تو اب اُس کتاب کے باب میں کیا کہئے جو دنیا کی ہر عظیم کتاب سے عظیم تر، اور ہر بلند نوشتے سے بلند تر ہے، اور جس کی عظمتوں، رفعتوں، نزاکتوں، لطافتوں، ملاحتوں تک پورا بار پانا، کیا لفظی اور کیا معنوی ہر اعتبار سے حدودِ بشری ہی سے باہر ہے! ——— دنیا کے بڑے سے بڑے عالموں، فاضلوں، دانشوروں، ادیبوں، حکیموں، عالموں، عارفوں کے بھی بس کی بات نہیں کہ دنیا کی اس ایک ہی کتاب **الکتاب** کو کما حقہٗ اپنی زبان میں منتقل کر کے دکھا سکیں، کبھی نہ کسی منزل پر پہنچ کر سب ہی اپنے کو اعترافِ عجز پر مجبور پاتے ہیں، کہاں کلامِ خدائے قدوس و نامحدود اور کہاں فہم واستعداد بندۂ محدود، دونوں میں اتنی نسبت بھی تو نہیں، جتنی آفتاب کو ذرّہ سے، سمندر کو قطرہ سے ہوتی ہے، شارحین، مترجمین، مفسرین اگر کہیں نہ کہیں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ نہ جائیں تو کیا کریں ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

لیکن قربان جایئے اُس رحمتِ بے حساب اور مرحمتِ بے پایاں کے کہ وعدۂ مزدِ وصلہ رسائی و یافت پر نہیں مجرد سعی و تلاش پر رکھ دیا ہے، داد و انعام کے لئے شرط کامیابی و فائز المرامی کی نہیں، صرف ہمت و اخلاصِ نیت پر رکھی ہے، اجر و صلہ کے دروازے اپنی طرف سے کھول دیئے ہیں، اور انتظار صرف اس کا رہتا ہے کہ بندے کا کوئی قدم طلب و سعی کا اٹھے تو سہی!

---

[1] اس حقیقت کے بارے میں ایک عارف شاعر (اکبر الہ آبادی) کیا خوب اور کس مزے سے کہہ گیا ہے ؎

حشر تک کھل نہ سکے راز اسے کہتے ہیں
جستجو پھر بھی کرو، ناز اسے کہتے ہیں

دادِ حق را قابلیت شرط نیست!

اِدھر بندے نے ہچکچاتے ہوئے قدم اٹھایا کہ اُدھر سے نوازش و دستگیری شروع ہوگئی!
ایک سرتاپا بے بضاعت اور سراپائے بے علمی و نااہلی کی ہمت اسی شانِ ربّ العالمینی نے بڑھائی، اور جو پیکر ضعف و جہل تھا، اس میں عزم و حوصلہ کی روح اسی کرشمۂ بندہ نوازی نے دوڑائی!

ہے آرزو کہ ابروئے پُرخم کو دیکھئے   اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

شرح و تفسیر کی بحثوں کو ذرا دیر کے لئے چھوڑیئے، محض سادے ترجمہ کو لیجئے، اردو و عربی کے درمیان فرق صرفی، نحوی، اسلوبی، انشائی حیثیت سے گویا مشرق و مغرب کا ہے، عربی میں جو اسلوب بیان، فصاحت کے اعلا معیار پر ہے، وہ اردو میں اگر کہیں غیر فصیح ہی نہیں، مہمل بن جاتا ہے، عربی میں زور و تاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر، بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں جیسے انه هو يبدئ ويعيد۔ انك انت العزيز الحكيم۔ انا سمعنا۔ انني انا الله۔ انا نحن نحي الموتىٰ۔ نحن نزلنا عليك۔ اب اگر لفظی ترجمہ کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں اردو میں بھی ضمیر غائب "وہ" یا ضمیر حاضر "تو" یا ضمیر متکلم "میں" یا "ہم" دہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہی ہوجائے، لازماً اردو میں اس مفہوم کو لانے کے لئے اردو ہی کے اسلوب سے کام لینا پڑے گا، اور ضمیر کی تکرار سے نہیں، بلکہ ضمیر کے ساتھ کہیں "ہی" سے کام لیا جائے گا، کہیں "تو" (بہ واؤ مجہول) لگا دیا جائے گا، اور کہیں "ہی" اور "تو" دونوں کو ملا کر کام لیا جائے گا۔

اسی طرح اردو میں حال اور مستقبل کے دو صیغے مستقل اور الگ الگ ہیں، عربی میں دونوں کے لئے ایک ہی صیغہ مضارع کا ہے جسے بجنسہٖ اردو میں لے آنے کی کوئی شکل ہی نہیں، اور ترجمہ کے لئے ناگزیر ہے کہ دو میں سے کوئی ایک صیغہ حسب مقتضائے مقام اردو کے لئے متعین کرے ——— اسی طرح تثنیہ کو جمع سے ممتاز کرنے کے لئے اردو میں لفظ "دو" یا "دونوں" کی تصریح لازمی ہے۔

عربی کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ فقرے میں فعل کو مکرر لے آتے ہیں کہیں فعل ہی کی کسی حالت میں، اور کہیں اُسے اسمی یا مصدری صورت دے کر، اور کہیں موصوف کی صفت خود اُسی لفظ سے لے آتے ہیں۔ اعتدیه عذابا۔ فميلوا ميلا۔ فرضتم لهن فريضة مكروا مكرهم۔ قتلوا تقتيلا۔ يفجرونها تفجيرا۔ يخرجكم اخراجا۔ قدروها تقديرا۔ اخرجني مخرج صدق۔ ادخلني مدخل صدق۔ وغیرہ پچاسوں ترکیبیں اس قسم کی قرآن مجید میں آئی ہیں اور عربی میں عین فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہیں، لیکن اردو میں وہی لفظ دہرا دینے سے بات بالکل ہی نہ بن سکے گی، اور اردو میں اس موقع کے لئے کوئی دوسرا ہی لفظ لانا پڑے گا، کہیں "بہت" کہیں "بڑا" کہیں "خوب" کہیں "خوب ہی" کہیں "مار کے" وقس علیٰ ہٰذا۔

اسی طرح ایک خالص عربی ترکیب فزادهم الله مرضًا کی ہے، اب اگر اس کا تحت اللفظ ترجمہ "بس بڑھا دیا ان کو اللہ نے از روئے مرض" کر دیا، تو اس بیسویں صدی عیسوی والے عام اردو خواں کے پلّے کیا پڑے گا؟ لازم ہے کہ عربی ترکیب سے ہٹ کر سلیس اردو میں "بس اللہ نے ان کا مرض بڑھا دیا" لایا جائے، اور ایسی ترکیبیں قرآن مجید میں ایک دو جگہ نہیں، خاصی تعداد میں موجود ہیں ———
اور ایسی ہی ایک اور الجھن صیغۂ مجہول کو ترجمہ میں مجہول رکھنے میں بھی کبھی کبھی پیش آجاتی ہے، اس کی ایک مثال قرآن مجید کے شروع ہی میں غير المغضوب عليهم میں ملتی ہے، چنانچہ اکثر مترجمین کو اس کا ترجمہ صیغۂ معروف میں کرنا پڑا ہے "تو" یا "تیرا" کے اضافہ کے ساتھ، مثلاً "نہ وہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے" یا "نہ وہ جن پر تو غصہ ہوا ہے"۔

ایک بڑا مرحلہ مترجم کے لئے لغاتِ اضداد کا ہے، عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جو متضاد مفہوموں کے لئے آتے ہیں، مثلاً

شراء کو خریدنے کے لیے بھی آتا ہے، اور فروخت کرنے کے لئے بھی، یا جیسا کہ امید و بیم دونوں موقعوں پر آتا ہے یا فوزء کر اس کے مفہوم میں پاکی بھی داخل ہے اور ناپاکی بھی، چنانچہ عربی میں مستقل کتابیں لغاتِ اضداد پر موجود ہیں، قرآن مجید میں ایسے لفظوں کی بہتات تو نہیں کہی جاسکتی، پھر بھی جہاں کہیں ہیں، وہاں مترجم کو قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوتا ہے اور سہارا سیاقِ کلام کا لینا ہوتا ہے ——— اور اسی سے ملتا ہوا مسئلہ اختلافِ قرأت کا ہے، جہاں دو دو قرأتیں وارد ہوئی ہیں اور دونوں متواتر، وہاں اعراب بدل گئے ہیں اور قدرۃً اس کا اثر معنی و مفہوم پر پڑا ہے اس اختلافِ قرأت کی ایک نمایاں مثال، سورۃ المائدہ کی چھٹی آیت ہے، جہاں فامسحوا برؤسکم وارجلکم میں ارجلکم کی قرأت نصب کے علاوہ جر کے ساتھ (ارجلکم) بھی متواتر ہے اور اختلافِ قرأت کا دائرہ اعراب تک محدود نہیں علاماتِ وقف میں بھی وارد ہوا ہے۔

انتشارِ ضمائر کا مرحلہ بھی کچھ کم نازک و دشوار نہیں، ایک ہی آیت بلکہ جزو آیت کے اندر ایک ہی ضمیر کا مرجع ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ اور ہو گیا ایسے موقع پر اگر خود سیاقِ کلام کے بعد رہنمائی حدیث و آثار سے نہ مل جائے تو مترجم غریب کا تو کام ہی تمام ہو جائے!

پھر ایک بڑی دقت ان الفاظِ قرآنی سے پیدا ہو گئی ہے جو اردو میں چل گئے ہیں، بلکہ ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، یہ چیز تو بہ ظاہر بڑی آسانی پیدا کرنے والی ہے، اور نو آموز مترجم اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ ان کے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا، یہ تو خود اردو بن گئے ہیں، لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے یہ لفظ اردو میں آ تو بے شک گئے ہیں، لیکن اپنے مفہوم قرآنی سے الگ ہو کر، مترجم نے اگر انھیں کہیں اسی طرح اردو میں منتقل کر دیا تو نادانستہ اور غیر شعوری طور پر مفہوم قرآنی سے بہت دور جا پڑے گا، اشتراکِ صوری کے باوجود اختلافِ معنوی کی شکل صورتیں تین ہیں، اور تینوں ہی ترجمۂ قرآن کے سلسلہ میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔

۱۔ زیادہ تر تو ایسا ہے کہ قرآن مجید نے ایک لفظ وسیع و عمومی معنی میں استعمال کیا ہے لیکن بعد کو عربی میں اس کا ایک محدود و متعین اصطلاحی مفہوم قائم ہو گیا، اور اردو میں منتقل ہو کر اس کا وہی آخری مفہوم آیا، اس کی ایک روشن مثال لفظ "قتل" ہے قرآن نے اسے لغوی، وسیع، عمومی مفہوم میں لیا ہے یعنی جان لینے یا مطلق ہلاک کرنے کے معنی میں، بعد کو یہی لفظ ایک اصطلاحِ فقہی بن گیا اور اب اس کے معنی کسی دھاردار آلہ سے ہلاک کرنے "تک محدود ہو گئے، اور اردو میں رائج یہی محدود اصطلاحی مفہوم ہو گیا ——— ایسے الفاظ کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ رب، جہاد، ظلم، وثوق، شراب، آیت، خیر، زکاۃ، فضل، دین، عرش، سماء، جاہل، نسل، مکر، کید، اجل، مجاہدین، شیطان، جنت وغیرہ پچاسوں قرآنی لفظ اسی قبیل کے ہیں کہ انھیں ہر جگہ اردو ترجمہ میں منتقل کر دینا فہم قرآنی پر شدید ظلم کرنا ہو گا۔

۲۔ کہیں صورتِ حال اس سے مختلف ہے یعنی قرآن میں متجانس کیفیات یا متماثل اشیاء کے لئے الفاظ کئی کئی آئے ہیں، مگر اردو میں ان کے ادا کرنے کو لفظ بس ایک ہی دو موجود ہیں، جیسے اردو میں ایک لفظ "سانپ" ہے قرآن مجید اس کے لئے تین تین لفظ تھوڑے تھوڑے سے فرق کے اظہار کے لئے لایا ہے، کہیں حیۃ کہیں جانّ، کہیں ثعبان، یا اردو میں لفظ "اونٹ" ہے، قرآن مجید میں تین لفظ لایا ہے کہیں بعیر، کہیں جمل، کہیں ابل ——— عربی زبان، خصوصاً قرآنی زبان کی وسعتوں کا کہنا ہی کیا، دن رات کے مختلف اوقات کے لئے اردو میں مستعمل لفظ صرف چار ہیں، صبح، شام، دوپہر، سہ پہر، قرآن مجید نے اوقاتِ شب و روز کے لئے کم سے کم دس لفظ اختیار کئے ہیں، بکرۃ، اصیل، ضحی، غسق، فجر، صبح، غدو، عشیۃ، ظہیرۃ، عصر، اب اتنے لفظوں کے ٹھیک مقابل اردو لفظ کہاں سے لائے جائیں!

اسی طرح اردو میں ایک لفظ "ڈرنا" یا اس کا متعدی "ڈرانا" آتا ہے، قرآن مجید نے اس کے لئے سات سات یا دو سے کام لیا ہے، خوف، خشیت، وجل، تقوی، حذر، اشفاق، رھبۃ، ایک اور مفہوم ہے، جس کے لئے اردو میں "جماعت" یا "گروہ" ہی سے کام چلانا پڑتا ہے، قرآن مجید نے اسے سات سات طریقوں سے تعبیر کیا ہے، فئۃ، طائفۃ، حزب، نفر، عصبۃ، فریق، فرقۃ، امۃ

طرح اردو کے ایک لفظ 'چھپانے' کے لئے قرآن مجید میں کئی کئی لفظ ملے جاتے ہیں کہیں تغفون کہیں تستون کہیں تستروں کہیں تکتمون ایسے ہی اس کے مقابل مفہوم کے لئے اردو میں کام صرف کھولنے یا ظاہر کرنے سے چلایا جاتا ہے لیکن قرآن مجید میں اس کے لئے کہیں تبدون ہے کہیں تخرجون کہیں تعلنون، کہیں تجہرون علیٰ ہذا قرآن کے الخالق اور الباری اور الفاطر اور بدیع کو متقارب المعنیٰ میں پھر بھی چار مستقل مفہوموں کو بیان کرنے والے ہیں، اردو میں ان کے الگ الگ مترادفات مشکل ہی سے مل سکیں گے۔

۳۔ ان دونوں صورتوں یعنی کہیں تحدید و تخصیص اور کہیں تعمیم و توسیع کے علاوہ ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ :-

(الف) یا تو قرآنی لفظ نے اردو میں آکر ایک دوسرے معنی اختیار کر لئے ہیں۔

(ب) اور یا اس نے دو مشہور قرآنی مفہوموں کے بجائے صرف ایک ہی مفہوم اردو میں قبول کیا ہے۔

اور ایسے الفاظ دو چار نہیں، کثرت سے ملیں گے، مثلاً یہ بیان کے مشتقات :-

وسیلہ، محراب، فوج، ذرۃ، غلام، مشفق، ناصح، غصۃ، غرور، عارض، اعتبار، تاویل، کشف، فتح، ارث، بلا، قاصد، فتنہ، فلک، عام، سیارۃ، ذکر، حواری، اسباب، انہار، اعلام، مجنون، شہید، رقیب، قہر، عورۃ، ممنون، صاحب، تکلیف۔

اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں فہرستیں محض نمونہ کے طور پر درج ہوئیں، احاطہ واستقصاء مقصود نہیں۔

اور یہ چند مشکلات تو اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کے معیار سے عرض ہوئیں اور یہ تلاش کاوش و توجہ کے بعد کسی نہ کسی درجہ میں حل ہو ہی جاتی ہیں، باقی جو دشواری، بڑے سے بڑے فاضل کے لئے بھی اس راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہے وہ خود قرآن کا اعلیٰ اور حدِ بشری سے مافوق مرتبۂ بلاغت ہے جس شدت کا زور اور جوش قرآن میں اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، اور جس غضب کی تاثیر سے اس کی ایک ایک آیت ایک ایک ترکیب لبریز ہے اس کا بلکہ اس کے عُشر عشیر کا بھی ترجمہ میں منتقل کرنا دنیا کے بڑے سے بھی بڑے انسان کے بس میں نہیں یہ رسول کریمؐ ہی کا ظرف تھا جو اس پر عظمت وجلال وحی کے بار کو برداشت کر سکے، اور پھر اسی کے ذریعہ سے انھوں نے عرب کے پتھر دل والوں کو موم کر دیا، ایک سیلاب رواں کر دیا، دلوں میں ایک آگ لگا دی، دماغوں میں انقلاب برپا کر دیا۔۔۔ قرآن مجید کی تحدی تو اتنی سی تھی کہ کوئی دوسرا چھوٹے سے چھوٹا بھی قرآن بنا کر لے آئے لیکن یہ ظلوم وجہول عرض کرتا ہے کہ کوئی قرآن کو کسی دوسری زبان میں جیسا کہ اس کا حق ہے، منتقل ہی کر کے دکھائے بڑے سے بڑے فاضل روزگار کے شرف وافتخار کے لئے یہی بہت ہے کہ وہ اپنی بساط کے لائق کچھ تھوڑے ہی بہت نکتے بلاغتِ قرآنی کے سمجھ لے!

اردو میں قرآن مجید کے ترجمے ایک دو نہیں، ماشاء اللہ خاصی بڑی تعداد میں ہو چکے ہیں اور برابر ہوتے جا رہے ہیں ان میں سے بیشتر اپنی جگہ اچھے ہی ہیں ان میں مرتبۂ امتیاز نہ صرف اپنی اوّلیت کے لحاظ سے بلکہ لفظی ومعنوی خوبیوں کے لحاظ سے بھی اب تک شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کے ترجمہ کو حاصل ہے اس کا سال طبع ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء ہے لیکن اس عاجز نے اپنے لئے دلیل راہ حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کے ترجمہ کو بنایا جو ان کی تفسیر بیان القرآن کے ساتھ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں اول بار شائع ہوا ہے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بس اپنا نظیر آپ ہی ہے۔

عقائد وشرح وتفسیر سے الگ ہو کر، جہاں تک محض ترجمہ کا تعلق ہے کم سے کم دو اور ترجمے بھی اچھے نکل چکے ہیں۔

بعض نے ترجمہ کے بجائے ترجمانی اپنا مطمح نظر رکھا ہے، اور ظاہر ہے کہ ترجمان کو آزادی کا حق مترجم سے کہیں زیادہ حاصل ہو جاتا ہے

ترجمہ کی چند مشکلات بیان ہو چکیں، شرح وتفسیر کی ذمہ داریاں اور دشواریاں اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

قرآن مجید جہاں یکتا و منفرد اور حیثیتوں سے ہے وہاں اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ بہ یک وقت زندۂ جاوید اور ہمہ وقت تازہ، اور عالمی یا آفاقی صحیفۂ ہدایت بھی ہے، اور بہ قید زمان و مکان، ایک متعین ملک و متعین ماحول کے لئے مخصوص بھی یعنی ایک طرف تو وہ دنیا کے ہر ملک و اقلیم کے لئے ہے، اس کی مخاطب چین و جاپان، ایران و ہندوستان، یورپ اور امریکا اور افریقہ، مشرق و مغرب، شمال و جنوب کی ساری ہی قومیں ہیں، اور وہ بھی کسی مخصوص، محدود زمانہ کی نہیں بلکہ پہلی صدی ہجری کی طرح چودھویں صدی ہجری کی بھی، خواہ ان کی تہذیب و تمدن اور ماحول کچھ بھی ہو، اور دوسری طرف اس کی مخاطب اوّل و براہ راست ایک مخصوص ملک عرب کی وہ قوم تھی جو تاریخ کے ایک متعین زمانہ، ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں موجود و آباد تھی، اور اپنی ایک مخصوص ذہنیت، ثقافت و معاشرت اور مخصوص فکری و وجدانی ہیئت کے ساتھ ـــــ قرآن مجید کی یہ دوگانہ حیثیت یعنی ایک طرف عالمی و آفاقی، اور دوسری طرف قومی و وطنی، موجود ہی نہیں بلکہ برابر ساتھ ساتھ چل رہی ہے، گو ظاہر ہے کہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے یہ دوسری حیثیت پہلی پر مقدم ہے۔

یہ ایک کلیدی و بنیادی حقیقت ہے اور اس کے مستحضر رکھنے سے دو نتیجے خود بخود لازم آجاتے ہیں:-

۱۔ قرآن مجید کی معنویت گو آفاق گیر ہے لیکن اپنی صورت و قالب کے لحاظ سے وہ بہر حال عربی کلام ہے، نہ انگریزی یا اردو یا کچھ اور، اور جہاں تک اسلوب بیان اور طرز ادا کا تعلق ہے، وہ عربی ہی کے لغوی، نحوی، لسانی، ادبی، انشائی، اسلوبی مقتضیات کا پورا کرنے والا ہے، نہ کسی اور زبان کے تقاضوں کا، سجع، وزن اور قافیہ اگر بلاغت عرب کے اجزاء میں تو وہ ضرور اس میں موجود ہوں گے، بعض موقعوں پر اگر فقروں کی تکرار عربی حسن ادب کی جان ہے تو وہ یقیناً اس میں پائی جائے گی، شہادت پیش کرنے کے موقع پر اگر قسم کھانا عربی زور بیان کا ایک جزو ہے تو وہ لازمی طور پر اس میں شامل ہوگا، وقس علیٰ ہذا، غرض یہ کہ اس میں زبان کی سلاست و لطافت اور بیان کی فصاحت و بلاغت جو کچھ بھی ملے گی سب عربی ہی کے معیار کے مطابق، نہ کہ ہندی یا فارسی یا سنسکرت یا انگریزی یا جرمنی زبان کے معیار کے ماتحت، اس صریح و واضح معیار کو چھوڑ کر اسے کسی بھی غیر عرب پیمانے سے ناپنے کا مطالبہ کرنا خود اپنے جہل اور نامعقولیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

۲۔ مخاطب اول و براہ راست قوم عرب تھی، ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول کی، اس لئے مخاطبات میں ان کے فہم و استعداد کی، اور ان کے مسلمات عقل و نقل کی رعایت (جب تک کہ اس سے کوئی دینی، روحانی، اخلاقی گمراہی نہ پیدا ہو رہی ہو) حد درجہ ضروری تھی، حکایات و امثال میں اگر ذکر ارجن و بھیم کا یا رستم و اسفندیار کا یا یونان و روم کے مشاہیر کا چھیڑ دیا جاتا، یا گردش ارض و آفتاب کے ضمن میں گر نیوٹن اور آئنسٹائن کے زمانہ کے نظریات و تحقیقات کا حوالہ دیا جانے لگتا یا تاریخ، جغرافیہ، عام علوم و فنون کے سلسلے میں کوئی بھی ایسی بات وضاحت و صراحت کے ساتھ فرما دی جاتی، جو مخاطبین اول کی فہم و استعداد سے بالاتر ہوتی تو یہ سرتاسر خلاف حکمت و مصلحت ہوتا، کلیدی اور بنیادی اصلاحی حقیقتوں کا منوانا، بجائے خود ہی کیا کم دشوار تھا کہ ایک اور محاذ جنگ خواہ مخواہ ایسے غریب و نامانوس مذاکرات کا قائم ہو جاتا، اور توحید، رسالت و آخرت کے منکرین کو ایک اور وسیع میدان انکار و تکذیب کا خواہ مخواہ ہاتھ آجاتا۔

اس لئے قرآن مجید نے انتہائی حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان ساری فرعی، ضمنی، ثانوی بحثوں سے متعلق اس نے صراحت تو ایک بار بھی مذاق عرب کے خلاف نہیں کی اور اہل عرب کے علمی، عقلی، فکری مزعومات کو ان کے حال ہی پر چھوڑے رکھا، لیکن اشارے ایسے برابر رکھ دیئے اور کلام میں لچک اتنی پیدا کر دی کہ آئندہ نسلیں اپنے اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق اس کتاب الٰہی کی تعبیر و تشریح میں آزاد رہیں۔

یہ انتہائی نازک و دشوار مقام تھا، کوئی بشری عقل و حکمت اس سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے اور اس کے کتاب الٰہی ہونے پر ایک مستقل دلیل۔

سائنس اور ایک سائنس ہی پر کیا موقوف ہے، ریاضی کے ممکن استثناء کے بعد سارے ہی دنیوی علوم و فنون کا یہ حال ہے کہ ان کی

یافت اور تحقیق برابر بدلتی رہتی ہے اور ثبات و قرار ان علوم میں سے کسی کے بھی نصیب میں نہیں! اسی مسلسل و مستمر بے ثباتی کا نام ان علوم کی "ترقی" یا "ارتقاء" رکھ دیا گیا ہے۔ نظریات و ظنیات ہی نہیں ان علوم کے بڑے بڑے مقبول و معروف مسلّمات و قطعیات تک ہر تھوڑی سی مدت گزر جانے پر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، اور "قدیم" کے پرستار "جدید" کے معتقدین کا بس منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں! ___ قرآن مجید بشری علوم کی ان نیرنگیوں اور تلون مزاجیوں کا ساتھ کیونکر دے سکتا تھا، اس نے اَن ہونی ہونی کر دکھائی کہ اپنی عبارت کے اندر لچک اس غضب کی اور اتنی حیرت انگیز رکھ دی کہ جس طرح اب تک کسی دور کے بھی محقق اُسے عصری تحقیقات کے منافی و معارض نہ پا سکے، آئندہ بھی کسی دور میں ان شاء اللہ نہ پا سکیں گے۔

ایک گزارش اور ___ قرآن مجید نے متعدد غیر قوموں کا ذکر کثرت سے کیا ہے، کبھی ان کے حال سے سبق لینے کو اور کبھی اپنے مخاطبین پر حجت قائم کرنے کو، ان کے عقائد اور ان کے اعمال کو جا بجا صراحت سے بیان کیا ہے، اور ان کی تلمیحات کو کثرت سے لایا ہے۔ یہود اور نصرانیوں کے علاوہ قوم اسرائیل، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم یونس، قوم شعیب، قوم فرعون وغیرہ کے صریح تذکرے تو ظاہر ہی ہیں، باقی ذکر مجوس اور صابئین، اور قوم تبع اور قریش اور اصحاب فیل کا بھی نام لے کر کیا ہے، اور کفر و شرک میں مبتلا، معاصر اور گزشتہ کتنی ہی آخرت فراموش قوموں کی جانب اشارے کہیں مجمل اور کہیں خوب مفصل کئے ہیں، اور ملکوں میں نام مصر اور بابل اور مدین کے، اور اشخاص میں نام علاوہ حضرات انبیاء کے مریم، قارون، فرعون، ہامان، عمران، سامری، ابولہب، امّ موسیٰ، امرأۃ لوط، امرأۃ فرعون وغیرہ کے، اور بتوں میں نام لات، عزّیٰ، منات، بعل کے لئے ہیں، اس لئے لازمی ہے کہ جدید مفسر و شارح قرآن تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی، اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور عرب اور نواح عرب کے مشرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو، اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں (خصوصاً فلکیات) سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدین و تقویٰ، صالحیت و مقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو جائے گا، اور اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا، کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہو جانا بیان کرے گا، اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخصی نام سمجھ کر دعویٰ اُلوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا ___ مفسر کا محض صالح و متقی ہونا ہرگز اس کی ضمانت نہیں کہ اس کی تاریخی، جغرافی اور عام سائنسی معلومات بھی صحیح ہیں، قرآن مجید یقیناً ایک دینی صحیفہ ہے لیکن اس کا علمی پایہ بھی ہرگز ایسا نہیں کہ کسی کو اُس پر کسی اعتبار سے بھی حرف گیری کا موقع مل سکے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن مجید معنوی اعتبار سے بھی ایک انتہائی مرتب و منظم کتاب ہے، اور انشائی اعتبار سے انتہائی بلیغ اور اسی نسبت سے قدرۃً ایک دشوار ترین کتاب بھی، اس کے دقائق و اسرار تو الگ رہے، اس کی ظاہری لفظی ترکیبیں تک بھی ہر جگہ آسان نہیں، اس کی تفسیر کوئی ایک بندہ تو کیا، سارے ہی بندے مل کر بھی چاہیں کہ درجہ تکمیل کو پہنچا دیں، تو یہ حد بشری سے خارج ہے، اور نہ انسان اس کا مکلّف ہے، جس کو جتنی یافت قرآن کے اندر میسر آجائے، بس وہی اس بندہ کے مرتبہ و شرف کے لئے بہت ہے ___ قرآن مجید نے اپنے کو آسان جو فرمایا ہے وہ موعظت اور عبرت پذیری کے پہلو سے "قابل عمل ہونے کے لحاظ سے" ولقد یسّرنا القرآن للذکر فهل من مدّکر، نہ کہ دوسرے پہلوؤں سے۔

ایک طرف یہ سب ہے، لیکن دوسری طرف یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قرآن وقت کے چلتے ہوئے اور اصطلاحی مفہوم میں کوئی "علمی" یا "ادبی" یا "تحقیقی" مقالہ نہیں، اصلاً وہ محض کتاب ہدایت ہے، یا انسانی زندگی کا انفرادی و اجتماعی دستور العمل، اُس کی دنیا سر تا سر حکمت و اخلاق، روحانیت، عبدیت و انابت کی دنیا ہے، اس کی فضا سکینت قلب کی فضا، اور اس کا ماحول تقویٰ و طہارت کا ماحول ہے، اس کے مغز تک پہنچنے کے لئے تقویٰ و طہارت کسی درجہ میں بہرحال ناگزیر ہے، طہارت جسم کی طرح طہارت قلب کا ذرا سا بھی اہتمام کئے بغیر محض زبان و لغت کے بل پر قرآن فہمی کی سعی یکسر سعی لاحاصل ہے، آخر ابوجہل (عمر بن ہشام مخزومی) اور ابولہب (عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب ہاشمی) تو خالص قریشی تھے، اور ٹکسالی اہل زبان، کوئی لسانی اشکال انہیں کیوں پیش آنے لگا تھا،

لیکن بدنصیبوں نے اپنی روح کو روحانیت قرآنی سے تمامتر بیگانہ و نا آشنا رکھا، قرآن اُن پر ذرہ بھر بھی نہ کھل سکا، بند کا بند ہی رہا، اور اُن کو اور ان کے ساتھیوں کو قرآن فہمی کی سعادت درجۂ ادنیٰ میں بھی نصیب نہ ہوئی۔

کلام اس غیرت والے غنی عن العالمین کا ہے جس سے بڑھ کر نہ کوئی غیور ہے نہ بے نیاز۔ اور متکلم کی شان غیرت و غنا کا عکس پوری طرح کلام میں جلوہ گر، جو بڑا بننا چاہتا ہے لازم ہے کہ وہ چھوٹا بن کر اس در وانے میں داخل ہو، عارف رومی نے سوق صد کی صحیح ہی کہا ہے ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز کہ اشکستہ نگیرد دستِ شاہ

استاد کی ضرورت جب چھوٹے سے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں پڑتی ہے تو قرآن کا علم تو سارے علوم کا بادشاہ اور سب بڑھ کر مہتم بالشان ہے، کیسے ممکن ہے کہ قرآنیات کا کوئی طالب علم استاد سے اور اگلے ماہرین فن کے نتائج تحقیق سے بے نیاز رہ کر اس کی منزلیں طے کرے، اور اگر کسی کو بدقسمتی سے (اِن سطور کے راقم کی طرح) کوئی زندہ استاد کامل الفن نہ میسّر آئے (گو ان سطور کے راقم کو مولانا حمید الدین فراہیؒ، صاحب "نظام القرآن" اور حضرت مولانا تھانویؒ صاحب "بیان القرآن" کی سرسری صحبتیں کچھ عرصہ تک ضرور نصیب ہی ہیں) تو اس خلا کو اکابر مفسرین اور محقق شارحین کی کتابیں ایک بڑی حد تک پُر کر سکتی ہیں۔
اِن حضرات کی تلاش، تفحص، تحقیق کی داد دل سے دیجئے، ان کی سپاس گزاری کے لئے قلب کی گہرائیوں کو وقف کر دیجئے، ان کے کارنامے اگر رہنمائی کو نہ موجود ہوتے تو آج کس کی ہمت ہوتی کہ اس امر مہم و عظیم کو چھیڑ بھی سکتا، سر رشتہ انھیں متقدمین کی سعی و مشقت سے بنی بنائی ہوئی مل گئی، جس پر قدم رکھنا ہر متأخر کے لئے آسان ہو گیا ہے، لیکن اس انتہائی قدر و منزلت اور آخری احترام و اعتراف کے بعد بھی یہ عقیدہ ذہن میں تازہ رکھئے کہ نبی معصومؐ کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، اس لئے فکر و فہم و اجتہاد کے لحاظ سے بڑے سے بڑا محقق بھی غیر معصوم ہی ہے اس لئے پیروی کسی کے بھی قول کی ہر حال میں کئے جانا، اور صریح دلیل مخالف کے باوجود بھی کرتے رہنا طریق حق و صواب نہیں ۔۔۔ اللہ کے کلام کی شرح و تفسیر اگلوں اور پچھلوں کے کسی دور میں بھی آخری اور انقطاعی نہیں ہو سکتی، کون اُس علیم کُل کے کلام کے سارے گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے ذہن کی گرفت میں لا سکتا ہے؟ کس کا علم علیم مطلق کی کتاب کے سارے اطراف کا احاطہ کر سکتا ہے؟ نئے نئے گوشے فکر و نظر کے ہمیشہ اُبھرتے آئیں گے، اور نئے نئے میدان علم و تحقیق کو دعوت ہر دور میں دیتے رہیں گے، نئے نئے سوال برابر پیدا ہوں گے، اور نئے نئے جواب کتاب الہدیٰ کے صفحوں میں تلاش سے برابر ملتے رہیں گے۔
لیکن دوسروں کی معصومیت سے انکار کے معنی خود اپنی معصومیت کے اثبات کے واللہ باللہ نہیں، ورنہ اس سے یہ خوش اعتقادی اپنی تلاش و یافت کے لئے لازم آتی ہے کہ جیسے یہ علم و تحقیق کا حرف آخر ہے، اور جزم و وثوق کے ساتھ قابل اعتماد، حاشا، اس کا وہم بھی نہ آنے پائے، فوق کل ذی علم علیم۔

لغت و متعلقات لغت، لغتِ قرآنی اور تفسیر و متعلقات تفسیر کا ذخیرہ عربی میں ماشاءاللہ اچھا خاصہ موجود ہے، اس بے بضاعت کی رسائی جہاں تک ہو سکی، اور جہاں جہاں سے استفادہ و خوشہ چینی ممکن ہوئی، اس کی مختصر سی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ لغت

۱۔ الجمہرۃ فی اللغۃ (چار ضخیم جلدوں میں) از ابوبکر محمد بن حسین ابن درید الازدی (ف ۳۲۱ھ)
۲۔ الصحاح (دو جلدوں میں) از ابو نصر اسمٰعیل بن حماد الجوہری (ف ۳۹۳ھ یا ۴۰۰ھ)
۳۔ القاموس (دو ضخیم جلدوں میں) از مجد الدین محمد بن یعقوب الفیروزآبادی (ف ۸۱۷ھ)
۴۔ لسان العرب (بیس حصوں یا پانچ ضخیم جلدوں میں) از جمال الدین محمد بن کرم بن منظور الافریقی الخزرجی (ف ۷۱۱ھ)

۵۔ تاج العروس شرح القاموس (دس ضخیم جلدوں میں) از سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی (ف ۱۲۰۵ھ)
۶۔ اقرب الموارد (تین جلدوں میں) از سعید الخوری الشرطونی (ف ۱۳۳۱ھ)
۷۔ کلیات ابی البقاء۔ از الشریف ابوالبقاء الحسن الکندی (ف ۱۰۹۵ھ)
۸۔ کتاب الأضداد۔ از محمد بن القاسم الانباری البغدادی (ف ۳۲۷ھ)
۹۔ کتاب الأجناس۔ از ابو عبید القاسم بن سلام البغدادی (ف ۲۲۴ھ)

ان کے علاوہ شاذ و نادر کام صراح (فارسی ترجمۂ صحاح) اور منتہی الارب و المنجد سے بھی لیا گیا ہے بہ لحاظ استفادہ بر فہرست تاج اور لسان ہیں

(الف) لغات القرآن

عام لغت کے علاوہ جو مخصوص لغات قرآنی ہیں، حسب ذیل پیش نظر رہی ہیں:۔

۱۔ المفردات فی غریب القرآن۔ از ابو القاسم الراغب الاصفہانی (ف ۵۰۲ھ)
۲۔ غریب القرآن۔ از ابو بکر محمد بن عزیز السجستانی (ف ۳۳۰ھ)
۳۔ مشکلات القرآن و غریبہ۔ از ابن قتیبہ الدینوری (ف ۲۷۶ھ)
۴۔ مفردات القرآن۔ از حمید الدین الفراہی (ف ۱۳۴۹ھ)
۵۔ النہایۃ فی غریب الحدیث والتنزیل (چار جلدوں میں) از مجد الدین مبارک ابن الأثیر الجزری (ف ۶۰۶ھ)

اوران کے علاوہ کہیں کہیں مشکلات القرآن (از انور شاہ کاشمیری) بھی۔[1]

خصوصی استفادہ "مفردات" راغب سے رہا تھا، اوراس کے بعد "نہایہ ابن اثیر" سے۔

(ب) اعراب القرآن

۱۔ اعراب القرآن۔ از ابو البقاء العکبری۔ (ف ۶۱۶ھ)
۲۔ مغنی اللبیب۔ (دو جلدوں میں) از جمال الدین ابو محمد عبد اللہ یوسف بن ہشام الانصاری (ف ۷۶۱ھ)
۳۔ مجاز القرآن۔ (جزو اول۔ سورۃ الکہف تک) از ابو عبیدہ معمر۔ (ف ۲۱۰ھ)
۴۔ معانی القرآن۔ (جزو اول۔ سورۂ یونس تک) از ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء (ف ۲۰۷ھ)
۵۔ اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم۔ از ابو عبد اللہ حسن معروف بہ ابن خالویہ (ف ۳۷۰ھ)

(ج) قرآنیات کی جامع کتابیں

۱۔ الإتقان فی علوم القرآن۔ از ابو الفضل عبد الرحمٰن جلال الدین السیوطی (ف ۹۱۱ھ)
۲۔ البرهان فی علوم القرآن۔ (چار جلدوں میں) از بدر الدین زرکشی (ف ۷۹۴ھ)

۲۔ عربی تفسیریں

۱۔ تنویر المقباس۔ روایات منقول از حضرت عبد اللہ بن عباسؓ صحابیٔ رسولؐ (ف ۶۸ھ)
۲۔ تفسیر القرآن الکریم۔ (۴۸ سورتوں کی تفسیر) از سفیان ثوری الکوفی (ف ۱۶۱ھ)

---

[1] عز الدین بن عبد السلام (ف ۶۶۰ھ) کی کتاب "الفوائد فی مشکل القرآن" (مطبوعہ کویت) پہلی جلد تفسیر کے پریس میں چلے جانے کے بعد ملی آئندہ جلدوں میں اس کا حوالہ لفظ "مشکل" سے ملا کرے گا۔ انشاء اللہ۔

۳۔ تفسیر جامع البیان (۳۰ جلدوں میں) از ابوجعفر ابن جریر الطبری۔ (ف سنہ ۳۱۰ھ)
۴۔ الکشاف (۲ جلدوں میں) از جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (ف سنہ ۵۳۸ھ)
۵۔ مفاتیح الغیب معروف بہ التفسیر الکبیر (۸ جلدوں میں) بیشتر حصہ از محمد فخر الدین رازی (ف سنہ ۶۰۶ھ)
۶۔ الجامع لاحکام القرآن معروف بہ تفسیر قرطبی (۲۰ جلدوں میں) از ابومحمد عبداللہ بن احمد القرطبی (ف سنہ ۶۷۱ھ)
۷۔ معالم التنزیل (۸ جلدوں میں) از محی السنہ حسین بن مسعود البغوی (ف سنہ ۵۱۰ھ)
۸۔ تفسیر ابن کثیر (۸ جلدوں میں) از عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل بن بشیر الدمشقی (ف سنہ ۷۷۴ھ)
۹۔ انوار التنزیل معروف بہ تفسیر بیضاوی (۵ جلدوں میں) از قاضی عمر ناصر الدین البیضاوی (ف سنہ ۶۸۵ھ)
۱۰۔ مدارک التنزیل (۵ جلدوں میں) از حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمود النسفی (ف سنہ ۷۱۰ھ)
۱۱۔ البحر المحیط (۸ جلدوں میں) از اثیر الدین ابوحیان الغرناطی (ف سنہ ۷۴۵ھ)
۱۲۔ روح المعانی (۹ جلدوں میں) از شہاب الدین آلوسی بغدادی (ف سنہ ۱۲۷۰ھ)
۱۳۔ التفسیر القیم: تفسیری اقوال ابن قیم۔ (مرتبہ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی) (ف سنہ ۷۵۱ھ)
۱۴۔ جلالین {از جلال الدین محلی (ف سنہ ۸۶۴ھ) / و جلال الدین سیوطی (ف سنہ ۹۱۱ھ)}

یہ سب تفسیریں اہل سنت کی مستند و معتمد ہیں، زمخشری صاحب کشاف اگرچہ معتزلی ہیں لیکن سند قبول انھیں بھی اہل سنت میں حاصل رہی ہے خصوصاً ان کے نکات ادبی، نحوی و لغوی کو، اور بیضاوی و مدارک کی تو کہنا چاہئے اصل واساس ہی کشاف ہے۔ مفسرین کی بڑی تعداد فقہیات میں شافعی، اہل حدیث یا مالکی ہے، البتہ صاحب مدارک پختہ حنفی ہیں۔

ترتیب واستفادہ کے لحاظ سے سرفہرست ابن جریر، قرطبی، کبیر اور روح المعانی رہی ہیں۔

سرسری ورق گردانی کی حد تک ذیل کی تفسیریں پڑھی رہی ہے اور کہیں کہیں کام کی باتیں ان میں بھی نکل آتی ہیں:۔

۱۔ لباب التاویل معروف بہ تفسیر خازن۔ از علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد الخازن (ف سنہ ۷۴۱ھ)
۲۔ غرائب القرآن معروف بہ تفسیر نیشاپوری۔ از نظام الدین الحسن الخراسانی النیشاپوری (ف سنہ ۷۲۸ھ)
۳۔ ارشاد العقل السلیم معروف بہ تفسیر ابی سعود۔ از ابوالسعود محمد بن محمد الحسن الرومی (ف سنہ ۹۸۲ھ)
۴۔ نظام القرآن (مختلف سورتوں کی تفسیر) از حمید الدین الفراہی (ف سنہ ۱۳۴۹ھ)
۵۔ النہر اللقیط بر حاشیہ البحر المحیط۔ از اثیر الدین ابوحیان الغرناطی (ف سنہ ۷۴۵ھ)
۶۔ تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن۔ از ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری (ف سنہ ۱۳۶۷ھ)

(الف) فقہی تفسیریں

۱۔ احکام القرآن (۳ جلدوں میں) از ابوبکر جصاص رازی حنفی (ف سنہ ۳۷۰ھ)
۲۔ احکام القرآن (۲ جلدوں میں) از قاضی ابوبکر محمد بن العربی مالکی (ف سنہ ۵۴۳ھ)
۳۔ تفسیر احمدی۔ از شیخ احمد عرف ملا جیون امیٹھوی حنفی (ف سنہ ۱۱۳۰ھ)

عربی تفسیروں میں یکسانیت و تکرار بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے یعنی ایک مفسر جو پہلے لکھ گیا ہے اکثر بعد کے آنے والے ہیں گویا آنکھ بند کرکے یعنی بلا جرح و تنقید نقل کرتے چلے گئے ہیں اور بہت جگہ لفظ تک نہیں بدلے ہیں لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف تنوع و رنگا رنگی

بھی اچھی خاصی ہے ہر بڑے مفسر کا جیسے ایک مستقل مذہب و مسلک ہے اور اس کے ساتھ اسی کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں ــــ مفسرین کی اکثریت مشرقی ہے یعنی عراق، شام، عرب و ایران وغیرہ کی لیکن دو بڑے مفسر مغربی بھی ہیں، ایک امام قرطبی، دوسرے محدث ابوحیان غرناطی کہ یہ دونوں اسپین کے تھے، اگر مطالعہ ذرا غور سے کیا جائے تو مشرق و مغرب دونوں کی ذہنیت اور طرز فکر کا فرق ان تفسیروں میں جھلکتا ہوا نظر آئے گا، اسپین جغرافی حیثیت سے تو بہر حال یورپ ہی کا ایک حصہ ہے۔

مذاق طبع کے لحاظ سے بھی مفسروں کی تقسیم یا درجہ بندی کی جا سکتی ہے، کسی کے ہاں سارا زور روایات حدیث و آثار صحابہ پر ہے، اور کوئی نحوی ترکیبوں کے حل اور صرفی اشتقاق کے سلجھانے میں لگا ہوا ہے، اور کوئی کوئی ایسے بھی ہوئے جن میں شان جامعیت موجود ہے، مثلاً متقدمین میں امام رازی اور متاخرین میں آلوسی بغدادی کہ ان دونوں کے ہاں کہنا چاہئے کہ سب ہی کچھ موجود ہے۔

فارسی تفسیروں میں کوئی قابل ذکر کتاب نظر نہ آئی، ہاں ترجمہ کی حد تک شاہ ولی اللہ دہلوی کی "فتح الرحمٰن" کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اردو تفسیریں

۱۔ بیان القرآن (۱۲ جلدوں میں) از اشرف علی تھانوی (ف ۱۳۶۲ھ)

اسے اگر اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔

۲۔ خلاصۃ التفاسیر (۵ جلدوں میں) از فتح محمد تائب لکھنوی (ف ۱۳۴۲ھ)

ہرچہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مصداق۔

۳۔ مواہب الرحمٰن (۳۰ طویل، عریض، ضخیم جلدوں میں) از امیر علی ملیح آبادی (ف ۱۳۳۶ھ)

کہنا چاہئے کہ عربی کی ساری ہی متداول تفسیروں کا جوہر کھنچ کر اس کے اندر آ گیا ہے۔

ذیل کی بھی تفسیریں جستہ جستہ پیش نظر رہیں:-

۱۔ فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی (۷ جلدوں میں) از ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی (ف ۱۳۳۶ھ)

۲۔ تفسیر ثنائی (۷ جلدوں میں) از ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری (ف ۱۳۶۷ھ)

۳۔ ترجمہ تفسیر مظہری۔ از قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صرف چند پارے نظر سے گزر سکے) (ف ۱۲۲۵ھ)

۴۔ ترجمہ تفسیر فتح العزیز۔ از شاہ عبدالعزیز دہلوی (صرف پارہ ۲۹ نظر سے گزرا) (ف ۱۲۳۹ھ)

۵۔ غایۃ البیان فی تفسیر القرآن (۲ جلد ضخیم) از احمد حسن امروہوی (صرف دوسری جلد دستیاب ہوئی) (ف غالباً ۱۳۳۰ھ)

۶۔ بیان القرآن (۳ جلدوں میں) از محمد علی لاہوری ایم اے (محض ترجمہ کی حد تک قابل قدر ہے) (ف ۱۳۶۸ھ)

۷۔ تفہیم القرآن (۵ جلدوں میں) از ابوالاعلیٰ مودودی (صرف پہلی چار دستیاب ہوئیں)

۸۔ حواشی شبیری (برحاشیہ ترجمہ شیخ الہند) از شبیر احمد عثمانی دیوبندی (ف ۱۳۷۰ھ)

۹۔ ترجمان القرآن۔ از مولانا ابوالکلام آزاد (صرف پہلی دو جلدیں نظر سے گزریں)

یہ ساری تفسیریں بجز دو یا تین کے عقائد اہل سنت کی ترجمان ہیں۔

ان کے علاوہ سلوک قرآنی پر ایک بڑے کام کی کتاب:-

مسائل السلوک من کلام الملوک۔ از اشرف علی تھانوی ہے۔

"مرشد تھانوی" کے حوالہ سے جو عبارتیں اپنی تفسیر میں درج کی ہیں، وہ سب اس سے لی گئی ہیں۔

لغت وتفسیر کی جن کتابوں کے حوالے بار بار اور کثرت سے دینے پڑے ہیں، بہ غرض سہولت بجائے ہر مرتبہ اُن کا پورا نام نقل کرنے کے صرف اُن کے مختصر مخففات درج کر دیئے گئے، ان علامات کو یہاں سمجھ لیجئے۔

نمبر شمار	حوالہ	اصل کتاب	نمبر شمار	حوالہ	اصل کتاب
۱	ابن جریر	تفسیر جامع البیان طبری	۱۶	رازی	مفاتیح الغیب
۲	ابن خالویہ	اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم	۱۷	راغب	مفردات غریب القرآن
۳	ابن عباس	تنویر المقباس	۱۸	روح	روح المعانی
۴	ابن العربی	احکام القرآن	۱۹	سجستانی	غریب القرآن
۵	ابن قتیبہ	مشکلات القرآن وغریبہ	۲۰	عکبری	اعراب القرآن
۶	ابوالبقاء	کلیات ابوالبقاء	۲۱	قرطبی	تفسیر احکام القرآن
۷	اقرب	اقرب الموارد	۲۲	کشاف	تفسیر الکشاف
۸	ابوسعود	حواشی ابوسعود العمادی	۲۳	مجاز	تفسیر مجاز القرآن
۹	بحر	البحر المحیط	۲۴	مدارک	تفسیر مدارک التنزیل
۱۰	برہان	البرہان فی علوم القرآن	۲۵	معالم	معالم التنزیل
۱۱	بیضاوی	انوار التنزیل	۲۶	معانی	معانی القرآن
۱۲	تاج	تاج العروس	۲۷	مغنی	مغنی اللبیب
۱۳	تھانوی	تفسیر بیان القرآن	۲۸	نہر	النہر اللقیط
۱۴	جصاص	احکام القرآن	۲۹	نیشاپوری	تفسیر غرائب القرآن
۱۵	جوہری	الصحاح			

اِن مخففات کے علاوہ جو کچھ بھی حوالے ہیں، وہ کتابوں کے پورے نام کے ساتھ ہیں۔

مالک و مولا جس بے بضاعت کو بھی چاہے رحمتوں اور برکتوں سے نواز دے جس مشت خاک کو چاہے نعمتوں سے مالامال اور عزتوں سے سرفراز کر دے، جب اپنی علمی کم مائیگی بلکہ بے مائیگی پر نظر جاتی ہے تو بہ خدا اپنی اس جسارت پر عقل دنگ وحیران رہ جاتی ہے۔ جو عقلاً آن ہونی تھی، وہ عملاً بہر حال ہو کر رہی کام الٹا سیدھا، جیسا اور جس طرح بھی بن پڑا، ہو ہی گیا، اب وہ خلق وخالق دونوں کے روبرو ہے، جس نے لکھ ڈالنے کی توفیق دی، کیا عجب کہ وہی رب العزت اپنی اس توفیق کی لاج بھی رکھ لے!
تفسیر طبع اول کا مسودہ کوئی ۴، ۵ سال کی مدت میں ۱۹۴۳ء میں ختم ہو گیا تھا، چار سال سے اوپر کی مدت مسودہ کی کانٹ چھانٹ اور صفائی یعنی مسودہ سے مبیضہ بننے میں لگ گئے، ۱۹۴۷ء تک مبیضہ ناشر صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گیا، پھر جو کچھ گزری اور کتاب جیسی اور جس ہیئت وصورت کے ساتھ ۱۳، ۱۴ سال کے صبر آزما انتظار کے بعد یعنی ۱۹۶۲ء میں پریس سے باہر نکلی اس کے تذکرے سے اب کچھ حاصل نہیں۔

سفینہ جب کنارے پہ آلگا غالب   خدا سے کیا گلہ، جورِ ناخدا کہیئے

کتاب پر نظرِثانی کا کام مسودۂ اول کی تکمیل کے ڈیڑھ ہی ایک سال بعد شروع ہو گیا تھا نظرِثانی اپنی فہم وبساط کے لائق تفسیر کی سطر سطر پر کی گئی، اور خاصی حد تک ترجمہ کی بھی حذف وترمیم کی ضرورت تفسیر میں جابجا محسوس ہوئی اور اضافہ کی گنجائش بہت زائد نکلی خصوصاً اس کے تاریخی اور سائنسی حصوں میں طبع اول کو پڑھ کر جن ناظرین کرام نے اپنے مشوروں سے نوازا یا یوں کہیے کہ راقم آثم کو اس کی کوتاہیوں، غلطیوں اور لغزشوں سے مطلع فرمایا، ان کی فہرست خاصی طویل ہے، ورنہ عجب نہیں کہ شکریہ نام بہ نام ایک ایک کا ادا کیا جاتا لیکن تین ایسے ہیں جن کی صراحت ناگزیر ہے۔ نمبر اول پر میرے قدیم مخلص ورفیق مولانا محمد اویس ندوی نگرامی سلمہ اللہ شیخ التفسیر دارالعلوم ندوہ ہیں، ان کی گراں بہا امداد مختلف طریقوں سے حاصل ہوتی رہی، باقی دوسرے صاحبوں میں سے ایک فرنگی محل کے سابق مفتی مولانا محمد شفیع انصاری لکھنوی ثم پاکستانی ہیں، اور دوسرے صاحب سنبھل (ضلع مرادآباد) کے مولوی محمد حسن صاحب بدر ہیں، ان دونوں نے بڑی مشقت وتعب اٹھا کر دیدہ ریزی کے ساتھ بڑی ہی مفصل یادداشتوں سے شکرگزار کیا۔

اور اپنے اُن محسن کے لئے کیا کہوں، اور ان کا نام زبان پر کیوں کر لاؤں، جنھوں نے دس ہزار کی یکمشت رقم سے اس کام کا لگا لگا دیا اور اس شدید ترین گرانی اور کاغذ، کتابت وسامانِ طبع کی شدید کمیابی کے وقت کم سے کم جلد اول کی طباعت کو ممکن بنا دیا، باقی جلدوں کی طبع واشاعت کا بھی اللہ ہی مالک وضامن ہے، خود اسی جلد کے تیار ہو جانے کی کیا امید تھی، زندگی نے اگر وفا کی بھی جس کی امید ضعیف کیا معنی موہوم سی ہے تو ان شاء اللہ اخیر کے ساتھ اشاریہ (انڈکس) بھی شامل ہوگا۔

رب العزت اس ناچیز وبے مایہ کی کوشش کو خلعتِ قبول سے سرفراز فرمائے، اور حشر میں قرآن مجید کے شارحوں، مفسروں کے خادموں کی صف میں اٹھائے، اور مجھے اور میرے والدین کو، میرے عزیزوں اور مخلصوں کو، میرے بزرگوں اور خوردوں کو، اور ان سب کو جو کسی حیثیت سے اور کسی درجہ میں بھی اس تفسیر کی تکمیل میں شریک ومعاون رہے ہیں، سب کو اپنے آغوشِ رحمت میں جگہ دے، اور اپنے لطف وکرم کی بارش ساری اُمّتِ اسلامی پر نازل فرما دے۔

قطرۂ ز آبِ رحمت تو بس ست ۔۔۔ شستن نامۂ سیاہ ہمہ!

ناظرین سے صرف اتنی التجا ہے کہ ان دعاؤں پر آمین کہہ دیں، اور خود بھی اس کا اجر حاصل کریں۔

مئی ۱۹۶۷ء
محرم ۱۳۸۷ھ

عبد الماجد
دریاباد۔ بارہ بنکی

مکرّر

بیسویں صدی کے ثلث آخر میں کوئی کتاب وہ بھی ضخیم چھپے اور وہ انڈکس (اشاریہ) سے خالی ہو، مصنف کی کم نصیبی کے سوا اور کس چیز پر اسے محمول کیا جائے لیکن اپنی کم نصیبی تو اس سے بھی بڑھ کر نکلی، انڈکس کیا معنی معمولی فہرست مضامین کا انتظام بھی اس سے کئے نہ ہو سکا۔

پڑھنے والوں کو اس خامی سے جس زحمت کا شکار ہونا پڑے، اس کے لئے بجز درخواست عفو کے اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

عبد الماجد
فروری ۱۹۶۸ء
ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ

افتتاحیہ (۲)

نحمدہٗ و نستعینہ و نصلی علیٰ رسولہ. قرآن مجید صرف مسلمانوں ہی کے لئے نازل ہوا ہے، یا اُس میں کچھ حصہ دوسروں کا بھی ہے؟ قرآن کی خدمت جتنی گراں اور قابلِ قدر جیسی گہری اور قابلِ رشک، مسلمانوں نے کی کیا کسی دوسری قوم نے اپنے صحیفۂ مقدس کی کی ہوگی لیکن اس سارے اعتراف کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ اس چودہ سو برس (۱۴۰۰ سنہ) کی مدت میں قرآن کے مخاطب صرف مسلمان ہی سمجھے گئے، اور اسی مفروضہ پر اس کی شرح و تفسیر میں دفتر کے دفتر تیار ہوتے چلے گئے، اس پر حق کہنا چاہئے کہ مسلمانوں ہی کا قائم ہوا، اور اس کے خلاف یا اس سے ہٹ کر کبھی سوچا ہی نہ گیا۔

اور اب تک یہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا، قرآن اصلاً صرف کتابِ ہدایت ہے، اس کی دعوت توحید، رسالتؐ معاد کی مع ان کی تفصیلات و جزئیات کے ہے، اس کی پکار عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق کے مسائل تک محدود ہے، اور اب تک جو کچھ لکھا لکھایا گیا، سب ان ہی مسائل کو زیادہ مدلل، زیادہ روشن و واضح کرنے ہی کے لئے لیکن قرآن مجید میں صرف یہی کچھ نہیں ہے، ضمناً اور بالواسطہ تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے سیکڑوں نکتوں پر گفتگو آگئی ہے اور ان مادی، دنیوی حقیقتوں پر بھی روشنی پڑتی چلی گئی ہے، افتتاحیہ نمبر (۱) میں یہ حقیقت گوش گزار کی جا چکی ہے کہ قرآن کی حیثیت اپنے اصل و مغز کے لحاظ سے ابدی، آفاقی، عالمگیر ہے، یعنی زمان و مکان کی قیود سے ماورا لیکن دوسری یا ضمنی حیثیت سے جب یہ کلام چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کی قوم عرب کے لئے نازل ہوا تو اس میں پوری رعایت زمانہ و ماحول کی بھی رکھ لی گئی، پھلوں میں نام انار، انگور اور کھجور کے لائے گئے، آم اور آڑو اور نارنگی کے نہیں لائے گئے، جانوروں میں ذکر اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، کتے کا لایا گیا جس سے عرب مانوس تھے، تیندوے، گینڈے، فاختہ، قمری کا نہیں لایا گیا، چاند، سورج اور تاروں کے بیان کئے گئے تو قصداً ایسی عبارت میں جو اس زمانہ کے مسلمات عقلی و فکری سے ٹکراتی نہ تھی، لیکن اتنی لچک رکھتی تھی کہ جب صدیوں کے بعد نظریاتِ فلکی بدل جائیں، تو الفاظ قرآنی کی تفسیر و تشریح جب بھی ذہنوں پر گراں نہ ہو، زمین کی گردیت اور زمین کی گردش، اور سورج اور چاند کی خلائی گردشیں سب کی سب کھل کر اس نے اُس زمانہ میں بیان نہیں کیں، جبکہ یونان کے حکیم، ہندوستان کے ہندسی، عراق و مصر کے منجم سب اس کے قائل و معتقد تھے کہ آسمان نام ہے ایک بڑی اور ٹھوس چھت کا جس میں ستارے، چاند جڑے اور جڑے ہوئے ہیں، اگر بیان کر دیتا تو کون اس کلام کو قابلِ اعتنا سمجھتا اور کتنی بحثیں عقلی اور دماغی، اصل مقصد ہدایت سے بالکل الگ نہ چھڑ جاتیں، بالاجمال حکمتِ خداوندی نے ایسا اعجازی طریقۂ کلام اختیار کیا کہ جس سے ظاہری مطلب تو

اس زمانہ کے مزعومات، مسلّمات اور معتقدات کے مطابق نکل آئے لیکن اتنی گنجائش اس میں ہو کر جب عقل انسانی بلوغ کو پہنچ جائے اور علوم و فنون برگ و بار لے آئیں تو وہی کلام معنی و مفہوم علوم عصری کے عین مطابق دینے لگے، اور کلام نبوت کا یہ اعجاز بجائے خود اس کی حقانیت کی ایک مستقل دلیل بن جائے ـــ اور مومنین صادقین کے علاوہ باہر والے بھی بہ قدر اپنے ظرف و نصیب کے اس سے مستفید ہونے لگیں۔

فرعون کو جب تک لوگ فلاں بادشاہ کا شخصی نام سمجھتے رہے اس نام کے عربی ترجمے بھی ملتے رہے، اور یہ عقیدہ جما رہا کہ وہ اپنی ذات سے مدعیِ اُلوہیت و ربوبیت کا ہو گیا تھا، لیکن جب تاریخ نے پردہ کشائی کی کہ وہ شخصی نام نہیں بلکہ لقب شاہی فرماں رواؤں کے اس خاندان کا تھا جو اپنے کو مظہر یا اوتار معبود اعظم یا سورج دیوتا کا سمجھ رہا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کے معاصر ایک نہیں دو فرعون ہوئے ہیں یا تو اب فرعون دو نہیں بیس ہوئے ہوں، قرآنی بیان کو اس سے کیا ضرر؟ ـــ اگلوں نے مفسر قرآن کے لئے جو شرائط تقویٰ و طہارت قلب وغیرہ کے لکھے ہیں وہ یقیناً بجائے خود لازمی و ناگزیر، لیکن جب ایک بار سوال یہ چھڑ گیا اور طے پا گیا کہ قرآن کریم، غیروں اور منکروں کے لئے بھی ہے تو تفسیر نگار کے لئے علوم عصری سے بہرہ مند ہونا بھی کچھ کم ضروری نہیں رہ جاتا۔

بے خیالی اور بے غوری کی تو بات ہی دوسری ہے ورنہ اگر استقراء سے کام لیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ قرآن اگرچہ صراحتہً کہیں بھی دعوت دنیا کے چلے ہوئے علوم و فنون کی طرف توجہ کی نہیں دیتا لیکن ساتھ ہی مطالبات ایسے کرتا ہے کہ کہیں بہ قاعدۂ اشارۃ النص اور کہیں بہ قاعدۂ اقتضاء النص کہ دوسرے علوم و فنون کی تحصیل کچھ ناگزیر سی ہو جاتی ہے مثلاً جہاں تقسیم ترکہ کا حکم ہے، فرمایئے کہ اس کی تعمیل بغیر علم الحساب (ارتھمیٹک) کے ممکن کیونکر ہے؟ یا اس قسم کے جو ٹکڑے جابجا آتے گئے ہیں، قل سیروا فی الارض۔ اولم یسیروا فی الارض۔ ان پر عمل درآمد بغیر جغرافیہ کے میدان میں قدم رکھے کیونکر ممکن ہے، اسی طرح اس مضمون کی جتنی آیتیں آئی ہیں کہ انّ فی خلق السموٰت والارض واختلاف الیل والنہار لاٰیات لّاولی الالباب۔ ان کے ذیل میں مفسر کی نظر علوم طبعی و فلکیاتی میں جتنی گہری ہوگی اس کو حکمت و صنعت تکوینی کے کیسے کیسے دلائل و شواہد ملتے جائیں گے، دریا اور پہاڑ شجر و حجر، جمادات و نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے جہاں جہاں تذکرے آئے ہیں ان کے تعین و تحقیق نے کتنے ہی سائنسی علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں، یتفکرون۔ یفقھون اور یعلمون وغیرہ کی تاکید و تفصیل سے اگر منطق اور استدلالات فکری کی طرف رہنمائی مقصود نہیں تو اور کیا ہے؟ اور نوحؑ و ابراہیمؑ، اسحاقؑ و اسماعیلؑ، ایوبؑ و یونسؑ۔ داؤدؑ و سلیمانؑ۔ موسیٰؑ و ہارونؑ۔ یعقوبؑ و یوسفؑ۔ عزیرؑ و زکریاؑ، یحییٰؑ و عیسیٰؑ، لقمان و ذوالقرنین اور قوم عاد و ثمود و تبعّ اور فرعون و قارون و ہامان کے نام لے آنے سے ملکوں ملکوں کی تاریخ کی طرف توجہ دلانا تو بالکل ہی ظاہر ہے جتنی صحیح و تاریخی دریافتیں ان شخصیتوں اور ان کی قوموں سے متعلق فراہم ہوتی رہیں گی۔ ان شاء اللہ قرآن کا زر خالص اور زیادہ ہی نکھرتا آئے گا۔

قرآن مجید میں حشو مطلق نہیں ہے، جو عبارتیں سرسری اور پہلی نگاہ میں غیر ضروری بلکہ بے تعلق سی نظر آتی ہیں

اُن کی بھی جب اہمیت کھل کر رہتی ہے تو ان کی معنویت کا بالآخر اعتراف کرنا پڑتا ہے حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں آتا ہے کہ وماکفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا۔ اور سلیمان جو شروع ہی سے حضرت سلیمانؑ کو پیمبر برحق مانتا ہے جھٹ سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ آخر پیمبر سے کفر کا امکان ہی کیا تھا پیمبر کی یہ منقبت بے ضرورت ہی تو ٹھہرتی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اہل کتاب کی مسلّم کتاب بائبل (عہد عتیق) کے صحیفہ سلاطین کے باب ۱۱ کی ابتدائی آیتوں میں یہ صاف درج ہے کہ سلیمانؑ اپنی آخر عمر میں غیر معبودوں کی طرف مائل ہو گئے تھے اور "اجنبی معبودوں" کی پیروی کرنے لگے تھے گویا توحید سے نکل کر شرک میں پڑ گئے تھے اور یہود اور مسیحیوں کی کروڑوں آبادی کے نزدیک مشرک ہو گئے تھے اتنی شدید گمراہی کی تردید قرآن اگر کھل کر نہ کرتا تو اور کیا کرتا! ـــــ الفاظِ قرآنی کی معنویت اور اہمیت اب ظاہر ہو گئی ہوگی۔

اسی سورۂ بقرہ میں وارد ہوتا ہے (رکوع ۲۲ آیت ۱۷۷) کہ لیس البرّان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ۱۴ (نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیرا کرو) آیت نے مترجمین و شارحین کو حیرت میں ڈال دیا ہے، کسی نے ترجمہ لیس البر کا "نیکی یہی نہیں ہے" کیا ہے اور کسی نے "نیکی کامل یہ نہیں ہے" گویا مشرق رُخی یا مغرب رُخی کا نیکی یا عملِ خیر ہونا سب ترجموں میں مشترک ہے، حالانکہ قرآن مجید سرے سے اسی کی نفی کر رہا ہے، مفسرین رحمہم اللہ بیچارے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ دنیا کے شرک میں شرک جلی کی ایک قسم سمت پرستی بھی ہے، کلامِ مبین ضرب اسی عقیدہ پر لگا رہا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ سمت پرستی میں کیا رکھا ہے! جو تم کسی متعین سمت کو مقدس فرض کیے ہوئے ہو، بلکہ طاعت کے اصناف و اقسام تو یہ ہیں کہ :۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ (البقرہ ۔ ۱۷۷)

کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیمبروں پر اور مال خرچ کرتا ہے اس کی محبت کے باوجود اپنے قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور مسکینوں پر اور مسافروں پر اور سائلوں پر اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردنیں چھڑانے پر اور نماز کی پابندی کرنے پر اور زکوٰۃ کی ادائی کرنے پر اور وعدوں کے پورا کرنے پر جبکہ معاہدہ کر چکے ہوں اور تنگی اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے

یعنی طاعت کی صورتیں نکلیں یا تو اعتقادی و ایمانی یا پھر عملی (جسمانی و مالی) نہ کہ محض مشرق رُخی یا مغرب رُخی، تقدس کسی سمت میں کچھ بھی نہیں، طاعت تو ایک مخصوص مکان یا مرکز یا قبلہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا ہے، خواہ وہ نمازی کے جس سمت میں بھی پڑ رہا ہو ـــــ اس ایک علم یعنی شرکِ سمت پرستی نے حکمِ قرآنی کی معنویت کیسی واضح اور جلی کر دی!

اسی طرح سورۃ القصص میں فرعون، ہامان کو حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے سلسلہ میں حکم دیتا ہے۔

فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۔ (رکوع ۴ آیت ۳۸)

اے ہامان! تو میرے لئے مٹی کی اینٹوں کو آگ دے تاکہ پختہ محل کھڑا کر دیں جس پر سے ہم موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھ سکیں اور میں تو موسیٰ کو اس باب میں جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

اب اس آیت میں من طین حشو ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ دنیا کی بڑی اور مہذب سلطنتوں میں شاہی محل پتھر ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور قدرۃً قصر فرعون بھی سنگی سمجھا جاتا، سنگ مرمر کا، سنگ رخام کا، یا کسی اور ایسے ہی قیمتی پتھر کا لیکن مصر کی شاہی عمارتوں کی تعمیر پتھر سے نہیں، مٹی سے ہوئی ہے اور فن تعمیرات کی تاریخیں جو لکھی گئی ہیں ان میں یہ صراحت سے درج ہے کہ مصر کا تعمیری تمدن سنگی نہیں، گلی رہا ہے قرآن مجید نے اس فنی باریکی کو پیش نظر رکھ کر، اور رفع اشتباہ کے خیال سے من طین کی صراحت کر دی، اور اس پر حشو کا اطلاق ذرا بھی نہ ہونے دیا ــــ مفسرین بڑے بڑے اہل علم وفضل سہی الله کے علم سے سارے عالم کے عالموں، نہ کہ فلسفیوں و مفسروں کے علم کو ملا کر بھی کیا نسبت؟

قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے پر جو قوی ترین دلائل قائم ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ فلکیات سے متعلق جو قرآنی بیانات تھے، وہ جس طرح اس وقت صادق رہے تھے، جب یونان و مصر، ہند، عرب، چین و فرنگستان کے علم کی دنیا میں آسمان نیلگوں شکل بادل کے ایک ٹھوس چھت تھا، ستارے اس میں جڑے ہوئے تھے اور آسمان چاند اور سورج کو لئے ہوئے مسلسل زمین کے گرد گردش میں رہتا تھا، اور زمین ایک چپٹی ساکن بستی تھی، وہ قرآنی بیانات آج بھی اسی طرح جیساں اور صادق ہیں جب پرانے نظریات کی دھجیاں بکھر گئی ہیں اور ان کی جگہ تمام تر نئے، نرالے اور انوکھے حقائق نے لے لی ہے.

جدید مفسر کی نظر صاحب قرآن کے ماحول اور ملک کی تاریخ پر ہونا لازمی ہے، اور یہ نظر جتنی گہری اور وسیع ہو، اسی قدر بہتر ہے، بعض قدیم مفسرین نے شان نزول کو بہت اہمیت دی ہے اور اس عنوان کے ماتحت رطب و یابس ساری ہی روایتوں کو یکجا کر دیا ہے یہ تلاش بے شک قابل قدر ہے لیکن کافی نہیں اس میں وسعت اور گہرائی دونوں بہت زیادہ چاہیئے، محض چند صحابہ اور مخلصوں کے حالات و اقوال جمع کر دینا کافی نہیں، نہ صرف قبیلۂ قریش بلکہ سارے حجاز کے طور طریقوں کو پیش نظر ہونا چاہیئے ان کے رسم و رواج، عقائد و اوہام، ان کے معتقدات و مزعومات، ان کے شعر و خطبات سب سے واقفیت ہونا چاہیئے، قریبی ملکوں سے ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی، عورتوں کا ان کے ہاں سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی مرتبہ کیا تھا، دولت کے کیا کیا مصرف رائج تھے، آقا و غلام، زردار و نادار کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی، مفلس، یتیم اور مسافر کس برتاؤ کے مستحق سمجھے جاتے تھے، قانونی، اخلاقی و معاشی آداب کس سطح اور کس معیار کے تھے، سیاسی اور عمرانی رشتے ایک طرف عراق و ایران، دوسری طرف شام و مصر کے ساتھ کس قسم کے تھے، شرک کے مختلف مذاہب اور مسیحیت، یہودیت، مجوسیت کس کس روپ میں جلوہ گر تھے، تاریخی نوشتوں کے علاوہ اثری کتبات نے ان سارے مسائل سے متعلق جو معلومات کے انبار لگا دیئے ہیں یہ سب تفسیر لکھنے والے کے دائرہ نظر کے اندر آ جاتے ہیں.

اسلامی اصطلاحیں بہت بعد کی چلی ہیں، قدیم لفظی و معنوی اشتراک سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے، جو قبل اسلام میں وہی لفظ اگر کسی کی زبان سے ادا ہو تو اس کا ترجمہ اسلامی اصطلاح میں کر دینا کہیں تو غیر ضروری ہوگا، اور کہیں صریح غلط مثلاً ایک لفظ صلوٰۃ ہے جس کا اردو ترجمہ اسلامی اصطلاح میں نماز ہے لیکن حضرت شعیبؑ کی قوم جب اس لفظ کا استعمال کرتی ہے تو ضرور نہیں کہ اس موقع پر بھی اس کا ترجمہ "نماز" ہی سے کیا جائے، اور اس کے تصور میں قیام، قعود، رکوع، سجود وغیرہ نماز اسلامی کے ارکان کو شامل رکھا جائے بلکہ "پوجا" یا "پوجا پاٹ" بھی کافی ہو سکتا ہے اسی طرح جب پیکر عصمت و متانت حضرت یوسفؑ کو ایک خادم کی حیثیت سے دیکھ، ایک جاہلی ملک کی امیرزادیاں پکار اٹھیں

إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ میں ملک کا ترجمہ فرشتہ سے کرنا صحیح نہ ہوگا، فرشتہ کا تخیل مشرک قوموں میں سرے سے تھا ہی نہیں؛ یہ تو سرتاسر اسلامی تصور ہے، یہاں ترجمہ دیوتا یا دھرماتما سے کرنا مناسب ہوگا ـــــ قرآن مجید تو باریک سے باریک فرق کا لحاظ رکھتا ہے، چنانچہ ملک مصر کے فرماں رواؤں کے لئے وہ دو مختلف موقعوں پر دو مختلف لفظ لایا ہے، حضرت یوسفؑ کے ہم عصر فرمانروا کے لئے ملک اور اس کے کئی سو برس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے معاصر کے لئے فرعون، اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں مصر کا شاہی خاندان بالکل دوسرا ہو چکا تھا، اور اب یہاں بادشاہ کا سرکاری لقب فرعون مقرر ہو چکا تھا۔

قرآن کا بہت بڑا اعجاز (کہنا چاہیے کہ شاید سب سے بڑا اعجاز) یہ ہے کہ اس نے عقلی علوم اور ترقی پذیر علوم کے مسائل کے باب میں بڑی کاہی لچک روا رکھی ہے کہ جو مسئلہ جس طرح اس کے نزول کے وقت علوم عصری کے عین مطابق نظر آتا تھا، اسی طرح آج چودہ سو سال کے بعد بھی معاصر تحقیق کے مطابق ہے۔ اللہ پانی کا برسانے والا ہے، یہ حقیقت قرآنی آج بھی پوری طرح صحیح اور یقینی ہے، جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سورج کی حرارت سے سمندر کے پانی سے بھاپ اٹھتی ہے اور اوپر چڑھتی ہے، منجمد ہو کر خاص کثیف شکل بادلوں کی اختیار کر لیتی ہے، یہ بادل پہاڑوں سے ٹکرا کر پلٹتے ہیں، ہواؤں کا رخ اور ان کی بلندی مقرر کرتی ہے، پھر جب حرارت اور رطوبت ایک خاص درجہ کی ہوتی ہے تو یہ بادل بوند بوند ہو کر زمین پر گرنے لگتے ہیں، اور اس وقت بھی پوری طرح صحیح اور یقینی تھی جب یہ کچھ معلوم نہ تھا، اور انسان صرف اتنا جانتا تھا کہ بادل ایک قسم کے جانور ہیں جو سمندر سے پانی پی کر آسمان پر چلے جاتے ہیں اور آسمان پر پانی کے ذخیرے جمع رہتے ہیں، جیسے دنیا میں لوگ ٹنکیوں اور چلیوں میں پانی کا ذخیرہ جمع رکھتے ہیں ـــــ اس صورت حال کا راز صرف یہ ہے کہ قرآن نے غیبیات کا تو پورا اور کامل علم اپنے اندر دے دیا اور اللہ، روح، وحی، فرشتے، پیمبروں، جنت، دوزخ، جزائے اعمال سے متعلق تو ساری ضروری تفصیل بیان کر دی، اس لئے کہ ان ماوراء عقلیات کے علم کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ بجز وحی الٰہی اور کتاب آسمانی کے ممکن نہیں، باقی جتنے علوم و فنون کا تعلق انسانی عقل، ذہن و دماغ سے ہے، اور ان کے مجموعہ کا نام خواہ فلسفہ رکھئے خواہ سائنس ان کی جزئی تفصیلات کی طرف تو قرآن گیا ہی نہیں ہے بلکہ صرف مجمل اشارات ان کے متعلق کر دیئے ہیں، اس اعتماد کے ساتھ کہ جوں جوں عقل بشری ترقی کرتی جائے گی، یہ عقلی گتھیاں خود بخود کھلتی جائیں گی اور طبیعاتی حقیقتیں اپنے کو مادی آلات کی مدد سے پہچنوائی جائیں گی۔

اعجاز قرآنی یہی ہے کہ سائنسی تحقیقات جو کچھ بھی ہوں، قرآن ان علوم عصری سے کہیں سے ٹکرائے گا نہیں بلکہ ان کے ہم آہنگ ہی ہر دور میں نکلے گا ـــــ یہ بنیادی حقیقتیں اگر پیش نظر رہیں تو ان شاء اللہ تفہیم قرآن میں بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اور تفسیر قرآن بجائے ایک "خشک" سے موضوع کے ہم دنیا والوں کے لئے بھی بڑا دلچسپ بن جائے گا۔

تفسیر کے بعد اب دو لفظ زبان ترجمہ کے متعلق اور سن لیجئے، ترجمہ جو بھی کرے گا، انھیں محاورات سے کرے گا، جو وہ اپنے گرد و پیش بول چال میں پائے گا، اور محاورات کا حال یہ ہے کہ سو برس کی مدت تو خیر بہت بڑی ہوئی

پچاس ہی برس میں یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے اور کتنے ہی کہنہ و فرسودہ ہو جاتے ہیں! ہم اپنی عمر کا گھسنا اور سرکنا تو محسوس کرتے ہیں! لیکن یہ بہت کم محسوس ہونے پاتا ہے کہ لفظوں کی عمر بھی تو اسی طرح ہر روز گھسکتی اور سرکتی رہتی ہے! ابھی یہ لفظ جو نگر ۱۱ اور توانا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھا اور کمزور ہو چلا بلکہ جگہ چھوڑنے لگا اور قریب ہے کہ بالکل ٹکسال باہر ہو جائے۔ شاہ عبد القادر دہلویؒ کی زبان اپنے زمانہ میں ترجمہ کی بہترین زبان تھی لیکن آخر کب تک ثبات و قیام اُسے بھی رہتا، جدید نسل کے لئے اب وہ پچاس فی صدی ناقابلِ فہم ہو گئی ہے، قدرت کے اس تصرف کو روک دینا یا اس کی باگ پھیر دینا کس کے بس کی بات ہے، نمونے کے طور پر صرف دس پانچ لفظ سن لیجئے :-

"صاحب" پہلے، مالک و حاکم کو کہتے تھے اب صرف رفیق کو کہتے اور ہلکی تعظیم کے موقع پر بولتے ہیں۔

"تماشبین" پہلے عیاش کو کہتے تھے اب عام تماشائی کے معنی میں بولتے ہیں۔

"رنج" کا لفظ پہلے بیماری کے لئے بھی عام تھا، اب صرف غم کے مترادف ہے۔

"چالاک" پہلے اردو میں متحرک کو بھی کہتے تھے اب صرف زیرک و دانا کو کہتے ہیں پہلوئے ذم لئے ہوئے۔

"بہرہ" پہلے مطلق حصہ کے معنی میں آتا تھا اب بجز منفی ترکیب "بے بہرہ" کے یا فارسی ترکیب (مثلاً بہرہ ور) اردو کے استعمال میں نہیں۔

"دریا" کے مفہوم میں پہلے "سمندر" بھی شامل تھا، اب سمندر کے لئے نہیں آتا۔

"بندی خانہ" پہلے اردو میں عام تھا، اب اس کی جگہ جیل یا جیل خانہ یا قید خانہ بولتے ہیں۔

"آشنا" اور "آشنائی" پہلے مطلق "دوست" اور "دوستی" کے مترادف تھے اب دونوں میں پہلوئے ذم شامل ہو چکا ہے، تقریباً یہی حال "یار" اور "یاری" کا ہو گیا ہے۔

"پاداش" پہلے مطلق جزا یا معاوضہ کے معنی میں تھا، اب سزا یا جرمانہ ہی کے معنی میں رہ گیا ہے۔

افتتاحیہ (۳)

نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ ایمان اگرچہ اصطلاح میں کفر وانکار کے مقابل کی چیز ہے لیکن قرآن مجید نے اسے شروع ہی میں جس کیفیت نفسی کے مقابلہ ومعاوضہ میں رکھا ہے وہ ریب یا شک و اشتباہ ہے اور نفی کلی اسی کی کی ہے ایمان جس کیفیت یقین کا نام ہے اس کے لوازم میں اطمینان یکسوئی اور ٹھہراؤ۔ ریب اس کے مقابل مترادف ہے بے اطمینانی، بے یقینی، شک، اضطراب وتردد کے، ایمان ایک روشن ستارہ اور مستحکم قلعہ ہے ثبات وقیام کا، سکون قلب کا، انشراح خاطر کا، ریب اس کے ٹھیک برعکس ایک تاریک گڑھا ہے بے قراری کا، تذبذب کا، دودلے پن کا، قرآن جس عالم اور جس مقام کی چیز ہے وہ ایمان ہے اور وہ دعوت بھی دیتا ہے اسی ایمان کی، اور بیدار بھی کرتا ہے اسی احساس ایمانی کو، اور اسی کو قرآن نے مزید زور وتاکید کے لئے کہیں کہیں ایقان سے بھی تعبیر کیا ہے اس مقام سے اعراض اور اس سے انکار اپنے کو حیص بیص میں ڈانواڈول میں مبتلا رکھنا ہے۔

اس مقام عرفان سے گزر کر اس جہل محض کو جہل مرکب بنانے کے لئے اس خشک و ویران بنجر کو سبز باغ بنا ڈالنے کے لئے اور اس پر روغن اور پالش پھیرنے کے لئے شیطان یعنی مغوی اول نے طرح طرح کے خوشنما نام اور بلند بانگ مصطلحات اس کے لئے گڑھ لئے ہیں، مثلاً تشکیک و عقلیت، فلسفہ ولاادریت، ماحصل ان خانہ زاد "علوم" کا اور نقلی "فنون" کا، سکون قلب کی دولت سے محروم رہنا اور ظن وتخمین کی تاریکیوں میں ہچکولے کھاتے رہنا ہے۔

یہ کتاب حکیم اپنے نقطۂ آغاز ہی سے نفی "ریب" کی کرتی ہے "ذٰلک الکتاب لاریب فیہ" (البقرۃ آیت ۱)۔ اور بد انجاموں کے حق میں خبر یہ "فی ریبھم یترددون" (سورۂ توبہ ع ۲) "فی شک یلعبون" (دخان ع ۱) "لاھیۃ قلوبھم" (انبیاء ع ۱) "فی غفلۃ معرضون" (انبیاء ع ۱) "لفی شک منہ مریب" (حٰم السجدۃ ع ۵) کی سنائی ہے، خوش انجامی کی خوش خبری صرف ان کے حق میں ہے، جن کے دل ایمان وایقان سے لبریز ہیں "الذین یومنون بالغیب" (بقرہ ع ۱) "یومنون بما انزل من قبلک" (بقرہ ع ۱) "وبالاٰخرۃ ھم یوقنون" (بقرہ ع ۱)۔

اس تمہیدی معروضہ کے بعد گزارش ہے کہ قرآن کی اس خصوصیت کا استحضار کر لیا جائے جو افتتاحیہ نمبر ایک میں بیان ہو چکی ہے کہ قرآن دنیا کی وہ واحد کتاب ہے، جو ایک ہی وقت میں مطلق بھی ہے اور مقید بھی،

یعنی ایک طرف ازلی وابدی ہدایت نامہ ہر ملک ہر قوم ہر زمانہ کے لئے اور دوسری طرف زمان ومکان کی قید سے محدود و مقید بھی، ملک عرب کے صوبہ حجاز میں ساتویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں نازل ہونے والی اور اس وقت وزمانہ کی ساری خصوصیات لئے ہوئے عربی لغت ولسان کی پابند عربی اسلوب بیان کے مطابق، عربوں کے خیالات وعقائد، معاشرت واخلاق، تاریخ وجغرافیہ سب کی رعایت رکھنے والی اور قرآن علاوہ اور دوسری حیثیتوں کے ایک کلام معجز اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ اپنی اسی دوگانہ حیثیت اطلاقی ومقید کو شروع سے آخر تک قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس بنیادی حقیقت سے ایک دوسری حقیقت بہ طور فرع پیدا ہوتی ہے، فہم قرآنی کی کلید محض دینداری اور اخلاص مندی سے ہاتھ نہیں آجاتی، اور اسی طرح نہ محض عام معلومات کی وسعت وفراوانی سے اور نہ محض علوم وفنون پر دسترس اور عبور سے، اور نہ اسی طرح محض عربی زبان کی سطحی واقفیت اور نری مہارت سے ہی کام چل سکتا ہے، یہ امر محض اتفاقی نہیں، اور نہ ثانوی درجہ کا ہے کہ قرآن عربی زبان میں ایک عرب پر نازل ہوا اور اس کی براہ راست اور اولین مخاطب قوم عرب قرار پائی، ان میں سے ہر شے درجہ اول کی اور بے حد اہمیت رکھتی ہے اور جب تک یہ مقصدی اہمیت پوری طرح پیش نظر نہ ہوگی قرآن پوری طرح کھل نہ سکے گا اس کے متعدد گوشے اور پہلو ذہن بشری میں غیر واضح، نہ صاف اور دھندلے رہیں گے اور پڑھنے والے کی آنکھ پر ایک نہ ایک رنگین عینک چڑھی رہے گی، قرآن کی تحقیق نعوذ باللہ یہ نہیں کہ کسی طرح کھینچ تان ہوگئی ہو اور کوئی تھوڑی عربی جاننے والا اسے اٹک اٹک کر پڑھے اور اس کی فصاحت وبلاغت کو اس کے ادب وانشاء کو اپنے دماغ کے گوشوں میں سمیٹ لے، وہ فصیح ترین، بلیغ ترین، جمیل ترین عربی، عربی مبین میں ہے، وہ شروع سے آخر تک خالص ترین اور شیریں ترین عربی میں ہے، یہ نہیں کہ کہیں اس کا اسلوب عجمی یا ہندی ہوگیا ہے، یا کوئی ترکیب اس میں چینی، جاپانی یا امریکی زبان کی آگئی ہے، یا کوئی تخییل فارسی یا ترکی یا عبرانی کی در آئی ہو، اس میں ذرا شک نہیں کہ راغب اصفہانی اور زمخشری ترکستانی اور ابوالبقاء عجمی اور یہیں ہمارے زمانہ میں حمید الدین فراہی ہندی بہت کچھ اپنی وادی فہم قرآن کر گئے، ادھر فراء وابو عبیدہ بھی اپنے امکان بھر سبزہ کو پانی بنا گئے، اور صحاح وقاموس لسان العرب، تاج العروس والوں کا ذخیرہ سے بہت کچھ آبیاری اس چمن کی کر گئے، پھر بھی قرآنیات کے طالب علم کو چاہئے کہ اسے کلام جاہلیت پر پورا عبور حاصل ہو، ایک ایک تلمیح، ایک ایک ضرب المثل جاہلیت عرب کی اس کے نوک زبان ہو، اور معنی وبیان کے جو نکتے اور دقیقے اسلوب عربی میں رائج ہوں، وہ پانچویں صدی عیسوی کے ایک عرب اہل زبان کی طرح اس کے دماغ میں مستحضر ہوں، اہل حضرات عرب کی ایک ایک روایت، ایک ایک حکایت سے اس کا دماغ گونج رہا ہو۔

ان سطور کے راقم اور ان اوراق کے جامع کو ان علوم وفنون میں بھی آنے ہی کیا ہیں لیکن جہاں تک ادبیات عرب کا تعلق ہے اس کا شمار تو مبتدیوں کی صف میں بھی نہیں، اور اس کامل نااہلی کے باوجود وہ جو جرأت وجسارت کر چکا ہے، اس پر اگر آخرت میں مواخذہ ہی سے بچ جائے تو یہی اس کے حق میں عین رحمت ہوگی۔

قرآن ایک اور لحاظ سے بھی معجز ہے، اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن اس طرح کی تصنیف نہیں،

جیسی دنیا کی بہترین تصنیفیں ہیں، ایک مصنف ایک مستقل موضوع اپنے سامنے رکھتا ہے، سوچ بچار کر قلم اٹھاتا ہے ہر باب کو ربط دوسرے باب سے اور ہر فصل کا وصل دوسری فصل سے کرتا جاتا ہے، اول کو آخر سے وابستہ رکھتا ہے، کاٹ چھانٹ، ردو بدل، حذف و ترتیب، غرض بار بار نظر ثانی کرتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ کتاب کی تیاری و تکمیل کی مدت ۲۲-۲۳ سال کی ہو! اور اس مدت میں بشری مصنف جوان سے بوڑھا ہو جاتا ہے، اور کتاب کے مختلف ٹکڑے، موقع اور ضرورت پیش آجانے پر برجستہ اور فی الفور تیار ہوئے ہیں، یہ کتاب مغلوبیت کے حال میں تیار ہوئی ہے اور اقتدار و قوت کے عہد میں بھی، حالتِ امن و آشتی میں بھی اور شدتِ جنگ و حرب کے حال میں بھی، ہدایات اس میں اخلاق و موعظت کے بھی ہیں اور معاشیات و مالیات کے بھی، احکام اس میں عبادات کے بھی ہیں اور معاملات کے بھی، اور اس تنوع و اختلاف موضوع کے باوجود اس میں نہ کوئی تضاد و تناقض ہے اور نہ کوئی نشیب و فراز، ہر جزئی واقعہ کے لئے کوئی نہ کوئی ہدایت، جیسے زمان و مکان کا کوئی بھی اثر اس کلام پر نہیں!

یہ حقیقتیں ہیں تو بالکل صاف اور سامنے کی، نہ ان میں کوئی خفا و پوشیدگی، نہ ان میں کوئی اشتباہ و پیچیدگی، یہاں ان کے عرض کرنے سے مقصود صرف یہ کہ ناظرین ان کا استحضار کرلیں، اور اپنے ایمان کو قوی سے قوی تر بنالیں، عرض ہے کہ جب متن کی تلاوت ترجمہ سمیت کریں، تو کلام الٰہی کی اس دوگانہ حیثیت کو جسے ہر حال میں قائم رکھنا ہے، کہیں بھی نظر سے اوجھل ہونے نہ دیں، انشاء اللہ اس سے نفع بیّن انھیں محسوس ہوگا، اور حسِ باطنی و روحانی کو ایک نیا ذوق و لطف اس سے حاصل ہوگا — جو واقعات بہ ظاہر بالکل جزئی و شخصی ہوں، متعلق بالوقت بھی، مختص بالمکان بھی، انھیں اسی طرح لانا، مگر اس حکیمانہ سلیقہ مندی اور حسنِ ترتیب سے کہ یہ جزئیات کام کلیات و اصول کا دے سکیں، اور پھر اس نظم کو قصے اور حکایات ہوں تو، اور قانون و ضابطے ہوں تو، دونوں صورتوں میں پختگی اور قطعیت کے ساتھ قائم رکھنا اگر اعجاز کا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

اسلام اپنے شارع کے زمانے ہی میں مدینہ، مکہ اور پورے صوبۂ حجاز سے باہر نکل چکا تھا اور چند ہی روز بعد اول جانشینوں یعنی خلافتِ راشدہ کے دور میں آس پاس کے سارے ملکوں نجد، یمن، عراق، شام، فلسطین، مصر، ایران تک پہنچ چکا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد اسپین اور یونان، اور ترکی، ایران، افغانستان، بلوچستان، ہندوستان اور چین سب اس کے زیر اثر تھے، کچھ فوجی طاقت سے اور زیادہ تر تبلیغی قوت سے لیکن سب کا رنگ الگ الگ، ہر ملک اپنی انفرادیت و شخصیت لئے ہوئے، کوئی ملک دوسرے ملک کا نقشِ ثانی نہیں اور ایک قوم دوسری قوم کا چربہ نہیں، عجمی اسلام الگ، ہندی اسلام الگ، مصری اسلام الگ، اسپینی اسلام الگ، ہر قوم کے اسلام میں دخل اس کے رسم و رواج کا، ہر ملک کے اسلام میں خو بو اس سرزمین کی شامل، ہر ملک کے باشندوں کی نسلی و نفسیاتی خصوصیات سے متاثر، ہر ملک کا اسلام وہاں کی آب و ہوا سے اور مقامی رسم و رواج سے رنگین — تشریع تکوینیات کو منسوخ نہیں کردیتی معدوم نہیں کردیتی اپنی روح کو قائم و ثابت رکھ کر ان میں صرف ترمیم و اصلاح کردیتی ہے۔

قرآن کے متعلم کو چاہئے کہ تفسیر کے عظیم الشان ذخیرہ کو بھی اسی نظر سے دیکھے، حجاز میں بیٹھ کر جو تفسیریں

لکھی گئیں وہ قدرۃً ان تفسیروں سے مختلف ہیں جو عراق و ایران میں لکھی گئیں، اور اسپین والے مفسرین کا رنگ مصر و شام والی اور عجمی اور ہندی تفسیروں سے مختلف ہے طالب علم کی نظر ان سب باریکیوں پر رہے۔

یہ اختلافات تو جغرافی و مکانی نقطۂ نظر سے ہوئے، دوسرا اختلاف اسی درجہ و مرتبہ کا زمانی ہے یا وقت اور دور کے اثر سے دوسری صدی ہجری کے طبقۂ قرآنی کا رنگ بالکل سادہ اور منقولی اور گویا خالص نقلی تھا، پانچویں صدی میں جب یونان کی منطق اور فلکیات و مابعد الطبیعات کی دخل در معقولات فضا میں گرج اور چمک پیدا کر چکی تھی، اور عجم کی دولت و امارت عقلیات کی دنیا کو مسموم اور فضا کو زہر آلود کر چکی تھی بحثوں کا رخ بھی پلٹ گیا نئے نئے مسئلے کھل کر سامنے آنے لگے اور اپنے حل کا انتظار کرنے لگے تھے یہاں تک کہ چودھویں صدی ہجری — جب سائنس اور علوم طبعی کا عملہ دخل پوری طرح شروع ہو گیا، اور سیاسی معاشیاتی سوالات دل و دماغ دونوں پر چھاپہ مارنے لگے — ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور خلائی جہازوں کے دور میں جو سوالات آ میں گے ناگزیر ہے کہ وہ ان سے بہت مختلف ہوں جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جب انسان کا سفر صرف اپنی ٹانگوں کے بل پر موقوف تھا، یا زیادہ سے زیادہ اونٹ اور خچر اور گھوڑے اور بیل تک محدود تھا، اور اس کی بزم آرائیاں بجائے گیس کے ہنڈوں، بجلی کے قمقموں کے صرف شمع و فانوس اور موم بتیوں کو جانتی پہچانتی تھیں۔

بات تو صرف وہی ہے جسے وقت کا ایک شاعر اکبر الٰہ آبادی اپنی زبان میں کہہ گیا ہے۔

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے	دنیا اہمی ہے اپنی تعلی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ	اللہ آپ ہے ان کی تسلی کے واسطے

عبدالماجد
دریاباد، ضلع بارہ بنکی

جولائی ۱۹۷۶ء

(۱)

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ[۱] مَکِّیَّۃٌ[۲][۳]

سورۂ فاتحہ ۔ مکی

رُکُوْعُهَا ۱ — ایک رکوع

اٰیَاتُهَا ۷ — سات آیتیں — ۲۵ کلمے — ۱۲۳ حروف

[۱] سورۃ کے لغوی معنی بلندی یا بلند منزل کے ہیں۔

السورۃ الرفعۃ (لسان) السورۃ المنزلۃ الرفیعۃ (راغب۔ ابو البقاء) ای منزلۃ ثم منزلۃ (مجاز)

جس طرح دنیا کی دوسری کتابیں مختلف بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں قرآن کے ہر باب کو سورت کہتے ہیں، گویا ہر سورۃ ایک بلند منزل کا نام ہے اور ہر سورۃ دوسری سورۃ سے ایک بلند منزل کی طرف سے دوسری بلند منزل کی طرف لے جاتی ہے۔

وبہا سمّیت السورۃ من القرآن ای رفعتہ (لسان) بہ سمیت سورۃ القرآن لاجلالہ ورفعتہ (تاج) قیل لارتفاعہا لانہا کلام اللہ (ابو البقاء) فکل سورۃ من القرآن بمنزلۃ درجۃ رفیعۃ ومنزل عال یرتفع القاری منہا الی درجۃ اخری (ابو البقاء) معنی السورۃ فی کلام العرب الابانۃ لہا من سورۃ اخری وانفصالہا عنہا وسمّیت بذلک لانہ یرتفع فیہا من منزلۃ الی منزلۃ (قرطبی)

سورۃ کے دوسرے معنی شہر پناہ کی دیوار کے بھی ہیں۔

سور المدینۃ حائطہا (راغب)

سورۂ قرآنی کو سورہ اس لئے بھی کہا جاتا ہے کہ گویا وہ فصیلِ شہر کی طرح اپنے مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

قیل من سورۃ المدینۃ لاحاطتہا بآیاتہا (ابو البقاء)

قرآن مجید کو مختلف سورتوں میں تقسیم و ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے تھے۔

قال قوم من اھل العلم ان تالیف سورۃ القرآن علی ما ھو علیہ فی مصحفنا کان من توقیف من النبی صلعم (قرطبی)

آنحضورؐ ہی کے ارشاد کے مطابق ایک سورۃ شروع کی جاتی تھی اور دوسری ختم، اور جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ فرما دیتے تھے کہ اس کو فلاں سورۃ میں لکھ لو، حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ:

فاذا نزلت علیہ الآیۃ فیقول ضعوا ھذہ الآیۃ فی السورۃ التی یذکر فیہا۔

جب حضورؐ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ فرماتے کہ اس کو فلاں سورۃ میں رکھو (جامع ترمذی تفسیر سورۃ البراءۃ)

کل قرآنی سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) ہے۔

[۲] فاتحۃ کے لغوی معنی ہیں ابتداء کرنے والی کے، قرآن مجید کی اس ابتدائی سورت کو بھی الفاتحۃ اسی لئے کہتے ہیں، یہ گویا دیباچۂ قرآن ہے، سورتوں کے نام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے رکھے ہوئے ہیں اکثر ایک ایک سورۃ کے کئی کئی نام روایت ہوئے ہیں۔

وقد ثبتت جمیع اسماء السور بالتوقیف من الاحادیث والآثار (اتقان۔ نوع ۱۷)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے

بھی کل ایک ہی ایک رکوع ہے (پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں)

ھ آیۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں، اصطلاح میں سورت کے اندر کی سب سے چھوٹی تقسیم کا نام ہے ہر فقرہ جس میں کوئی حکم ہو یا وہ ایک مستقل عبارت ہو ایک آیت ہے۔

وقیل لکل جملۃ من القرآن دالۃ علی حکم آیۃ (راغب) ولکل کلام منہ منفصل بفصل لفظی آیۃ (راغب) وأمّا الآیۃ فھی العلامۃ بمعنی أنھا علامۃ لانقطاع الکلام الذی قبلھا من الذی بعدھا وانفصالہ (قرطبی) والآیۃ من القرآن انّما سمّیت آیۃ لأنّھا کلام متصل الی انقطاعہ وانقطاع معناہ قصۃ ثم قصۃ (مجاز القرآن)

قرآن مجید کی کل آیتیں شمار کرلی گئی ہیں اور ان کی میزان بقول اصح ۶۶۱۶ ہے۔ (اتقان)

لـه قرآن مجید کے کل الفاظ بھی شمار کر لئے گئے ہیں اور ان کی میزان بقول اصح ۷۷۹۳۴ ہے۔ (اتقان)

ـه کل حروف قرآنی بھی شمار کر لئے گئے ہیں اور ان کی میزان بقول اصح ۳،۲۳،۶۷۰ ہے۔ (اتقان)

اللہ اللہ! کلام الٰہی کے عاشق و شیدائی کیسی کیسی دیدہ ریزیاں اس کے واسطے کر گئے ہیں۔

ـه قرآن مجید کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سورت کے ہر سورت کی ابتدا میں دہرایا گیا ہے یعنی ۱۱۳ بار اور سورۃ النمل کے اندر عبارت میں بطور آیت قرآنی بھی آیا ہے اور اس لئے اس کے جزو قرآن ہونے نہ ہونے کی بابت تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ہر سورت کی ابتدا میں بھی اس کی حیثیت بطور ایک مستقل آیت کے ہے؟ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ نہیں ہے، بلکہ یہ سورتوں کے درمیان محض بطور علامت فرق و تمیز کے اور ہر سورت کے شروع میں بطور افتتاحی فقرہ کے ہے، امام مالکؒ بھی اسی مسلک سے متفق ہیں۔

قال ابو حنیفۃ لیست فی اوائل السور بآیۃ وانّما ھی استفتاح لیعلم بھا مبدؤھا (ابن العربی) مفصل بحث جصاص رازی حنفیؒ کی احکام القرآن میں موجود ہے۔

ہر جائز کام کی ابتداء بسم اللہ سے کرنے کی بڑی فضیلتیں حدیث میں وارد ہوئی ہیں اور خود رسول اللہ صلعم کی عادت مبارک یہی تھی کہ کھانا کھاتا، پانی پیتے، وضو کرتے، سواری کرتے، غرض اس قسم کے سارے کاموں کی ابتدا بسم اللہ ہی سے کرتے تھے اور یہ بھی یہی کہ جو شخص کسی کام کو خدائے رحمٰن و رحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہے وہ عملاً اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ میرا ضمیر پاک ہے میری نیت مخلصانہ ہے، میرا مقصد اعلیٰ ہے اور میں توحید کا پرستار ہوں، ایک طرف شرک سے اور دوسری طرف الحاد سے بیزار ہوں، غرض بسم اللہ سے بڑھ کر قوت بخش اور اس سے زیادہ روح و اخلاق کو بلند کرنے والا ذکر اور کوئی نہیں۔

بسم اللہ کی ب نحویوں کی اصطلاح میں باء استعانت کہلاتی ہے اور باء ابتدائیہ بھی۔

لـه الباء حرف جر ملازمۃ للاسم ... علی المصاحبۃ عند قوم (قاموس، تاج) وقال آخرون الباء ... معنی الابتداء کأنہ قال أبتدئ باسم اللہ (تاج)

یہ اصطلاحی بحثیں جو کچھ بھی ہوں، بہرحال پڑھنے والا گویا یہ کہتا ہے کہ میں شروع کرتا ہوں اس کلام کو اللہ کے نام سے مدد چاہتے ہوئے اور یہ کہہ کر بسم اللہ خواں گویا اپنی اور سب کی طرف سے قطع نظر کر کے تکیہ کر لیتا ہے اللہ کی ذات اور اس کی صفات رحمانیہ و رحیمیت پر۔

بسم اللہ اس کی ترکیب مقدر یوں مانی گئی ہے، بسم اللہ قبل کل شئی واوّل کل شئی۔

مجازہ کأنك قلت بسم الله قبل كل شئ واوّل كل شئ (مجاز)

الرّحمٰن مرادف ہے ذوالرّحمة کے (مجاز)

الرّحیم مرادف ہے الراحم کے (مجاز)

اَللّٰہ خدا کے لئے اسم ذات ہے، کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا ہے، فارسی کے "خدا" یا انگریزی کے "گاڈ" کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی بولا جا سکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے، نہ تثنیہ، نہ کسی لفظ سے مشتق ہے، اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔

عَلَمٌ للذّات واجب الوجود المستجمع لجميع صفات الكمال غير مشتق (تاج) لم تسمّ به غيره تبارك وتعالى ولهذا لا يعرف في كلام العرب له اشتقاق من فعل يفعل (من كمل ولد بما لم يلد ولم يصبح (قرطبی)

ف الرّحمٰن و الرّحیم، دونوں ایک ہی مصدر رحمة سے مشتق ہیں جیسے ندیم و ندمان، اور مفہوم دونوں کا اصلاً ایک ہی ہے۔

اسمان مشتقان من الرحمة ونظيرهما في اللغة نديم وندمان وهما بمعنى (صحاح)

رحمٰن کا صحیح ترجمہ دشوار ہے، مصدر رحمة سے صیغۂ مبالغہ ہے فعلان کے وزن پر زیادتِ صفت کے لئے جس کے بعد زیادتی کا کوئی درجہ نہ ہو۔

معناه عند أهل اللغة ذو الرحمة التي لا غاية بعدها في الرحمة (تاج) مبالغة فعلان مثل غضبان وسكران من حيث الاستيلاء والغلبة (بحر)

اسم ذات "اللہ" کی طرح اسم صفت "رحمٰن" کا اطلاق بھی صرف ذات باری ہی پر ہوتا ہے۔

ولا يطلق الرحمٰن الّا على الله تعالى (راغب) اسم مختص بالله لا يجوز ان يسمّى به غيره (تاج) قل ادعوا الله او ادعوا الرحمٰن فعادل به الاسم الذي لا يشركه فيه غيره (صحاح)

یہ بات اتفاقی نہیں بہت پُرمعنی ہے کہ قرآن مجید میں اسم ذات کے بعد جو سب سے پہلا اسم صفتی ارشاد ہوا ہے وہ صفتِ رحمانیت کا مظہر ہے۔ لین پول (LANE POOL) انگریز اسی لیے اپنے ہم قوموں کو سُنا کر کہتا ہے کہ:-

"لوگ یہ بات بار بار بھول جاتے ہیں کہ قرآن کے اندر وصف رحمت پر کتنا زور دیا گیا ہے"

رحیم بھی اسم صفت صیغۂ مبالغہ ہے، فعیل کے وزن پر، تکرار و تواتر کے اظہار کے لیے۔

مبالغة الفعيل من حيث التكرار (بحر)

گویا صفتِ رحمت و شفقت کی انتہائی قوت و شدت کا اظہار رحمٰن سے ہو رہا ہے اور انتہائی تعدد و کثرت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱

(ساری) تعریف[1] اللہ کے لئے ہے (وہ) جہانوں کا مالک ہے

...سم سے کیفیت وکمیت کے اس فرق کے اظہار کے لیے رحمٰن کا ترجمہ "نہایت رحم کرنے والے" اور رحیم کا ترجمہ "بار بار رحم کرنے والے" سے کیا گیا ہے۔

رحمٰن میں شانِ کرم کا ظہور بے مومن وکافر سب کے لیے۔ اور اسی لیے اس کا ظہور اسی دنیا میں بھی ہو رہا ہے۔ رحیم میں یہ تجلی رحمت ومغفرت کا خصوص بے اہل ایمان کے ساتھ، اس لیے اس کا پورا ظہور آخرت ہی میں ہوگا، اور اسی معنی میں یہ حدیث صحیح مسلم میں صحابی ابن مسعود کے واسطہ سے آئی ہے کہ الرحمٰن رحمٰن الدنیا والرحیم رحیم الآخرة۔ اور اسی معنی میں جعفر صادقؓ کا بھی یہ قول نقل ہوا ہے۔ الرحمٰن اسم خاص لصفة عامة والرحیم اسم عام لصفة خاصة (تاج)

صوفیانہ مذاق پر ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ رحمانیت وہ تربیت ہے جو ذرائع ووسائط کے ساتھ ہو، اور رحیمیت وہ تربیت ہے جو براہ راست وبلا واسطہ ہو، رحمانیت وہ شفقت ہے جو طبیب مریض کے ساتھ رکھتا ہے اور رحیمیت شفقتِ محض ہے (روح)

اسلام کے اس خالص توحیدی کلمہ کے مقابلہ میں اب مسیحیت کا فقرۂ افتتاحیہ ملاحظہ ہو:-

"شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے!"

کوئی نسبت اس شرک جلی کو اسلام کی توحیدِ خالص سے ہے؟ راقم آثم کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ عجب نہیں جو خالقِ اکبر کی یہی صفاتِ رحمانیت ورحیمیت ہی مسخ ہو کر مسیحیت میں بیٹا اور روح القدس بن گئی ہوں۔

[1] اَلْحَمْدُ میں ال کلمۂ استغراق ہے یعنی جمیع حمد کوئی سی بھی ہو، کسی قسم کی بھی ہو، بظاہر کسی کے لیے بھی ہو۔

حَمْدُ کا درجہ لغوی اعتبار سے مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے، شکر تو کسی متعین ہی نعمت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور مدح میں ممدوح کی خوبیوں کا ارادی واختیاری ہونا ضروری نہیں، صرف حمد ہی ایسی چیز ہے جو محمود کی عام اختیاری خوبیوں اور فضیلتوں کی بنا پر کی جاتی ہے (راغب)

فی کلام العرب معناه الثناء الکامل (قرطبی)

گویا قرآن مجید کی سب سے پہلی تعلیم توحید کے جملہ اصناف کی جامع ہے، مدح اور تعریف کسی کی بھی ہو کسی نام سے بھی ہو، در حقیقت صرف اللہ ہی کی ہوتی ہے اور اسی کو پہنچتی ہے۔

الالف واللام فی الحمد لاستغراق جمیع أجناس الحمد لله تعالیٰ (ابن کثیر)

اور یہی معنی ہیں اس حدیث نبوی کے بھی کہ اللّٰھمّ لك الحمد کله ولك الملك کله وبیدك الخیر کله والیك یرجع الأمر کله۔ حاکم اگر عادل ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے صفت عدل اس کے اندر رکھ دی ہے، طبیب اگر حاذق ہے تو اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اللہ نے اُسے یہ کمال عطا کر دیا ہے، کسی کی شکل جیسے

اور کسی کی سیرت پاکیزہ ہے تو ہر موقع پر مدح وثنا وتعریف وستائش کی اصل مستحق صرف ذات باری تعالیٰ جمال آفریں وکمال آفریں ہے۔ ع

ہر جا کنیم سجدہ بہ آں آستاں رسد!

۲ ربّ، جو یہاں بہ طور اسم استعمال ہوا ہے، مصدر ہے تربیت کے معنی میں، اور تربیت کے معنی ہیں کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشو ونما دیتے رہنا، تا آنکہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

ھو انشاء الشئ حالا فحالا الی حد التمام (راغب) وھو تبلیغ الشئ إلی کمالہ شیئاً فشیئاً (بیضاوی)

الرب المصلح والمدبر والجابر والقائم نقال لمن ۔ ام باصلاح شئ واتمامہ (قرطبی)

اُردو میں اس کا ترجمہ پروردگار سے بھی صحیح ہے، لیکن قریب ترین لفظ اس مفہوم کے لیے "مُرَبّی" کا ہے، اور یہی مترجم تھانویؒ نے اختیار کیا ہے۔ اصول ارتقاء جس پر یورپ کو ناز ہے، ذرا خیال کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی پوری رعایت لفظ "ربّ" میں آگئی ہے، ربوبیت کے معنی ہی کسی شے کو درجہ بدرجہ حدِ کمال تک پہنچانا یہ ارتقاء ہے! یہاں مُراد اُسی کا اصل اصول ہے، نہ کہ ڈاروِن وغیرہ کے بیان کئے ہوئے قاعدے اور ضابطے، عربی میں اس کا اطلاق مطلق اور بلا اضافت صورت میں صرف حق تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

ولا یقال الرب مطلقا الا للہ تعالیٰ (راغب) ولا یستعمل الرب لغیر اللہ بل بالاضافۃ

(ابن کثیر) لا یقال الرب بالالف واللام الا للہ تعالیٰ (ابن خالویہ)

بسم اللہ سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو متنِ قرآن میں سب سے پہلے اللہ کی صفت ربوبیت ہی کا اظہار ہے، گویا یہ صفت اُمّ الصفات ہے، اور آگے جتنے بھی اسماء الٰہی آئیں گے، سب کی تفسیر مقاصدِ ربوبیت ہی کے تحت میں ہوگی، اور مسیحیوں کے "آسمانی باپ" سے کہیں زیادہ شفقت، کہیں زیادہ قدرت، کہیں زیادہ حکمت لفظ ربّ سے عیاں ہے۔

۳ العٰلمین۔ عالم کا لفظ خود اسم جمع ہے، کوئی اس کا واحد نہیں آتا، اور مُراد اس سے خلقت یا موجودات ہے۔

العالم الخلق کلہ (لسان)

عالمون۔ بہ صیغۂ جمع کے معنی ہوئے ہر ہر صنف موجودات اور سارے سلسلۂ کائنات کے۔

والعالمون اصناف الخلق (لسان)

اور اب اس کُرۂ ارض کے علاوہ جس سے ہم مانوس ہیں، جتنے بھی عالم "ماہتاب" "مریخ" وغیرہ کے دریافت ہوتے جائیں، سب اسی قرآنی صیغۂ جمع کے تحت میں آتے جائیں گے۔

ربّ العٰلمین کا لفظ لاکر قرآن مجید نے گویا بتا دیا کہ ہر صنفِ موجودات کا ایک مستقل نظامِ تربیت ہے اور سب کا آخری سِرا اسی قادرِ مطلق واحد ویکتا کے ہاتھ میں ہے، کوئی بھی صنفِ موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ ربوبیت وتربیت سے آزاد ومستثنیٰ نہیں۔

یہ تعلیم بھی اسی ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل، مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں، یہ حقیقت تاریخِ مذاہب میں نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے، اسلام سے قبل مذاہب جس صورت میں موجود تھے، وہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے، ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتی تھی، گویا خدا کی حیثیت محض

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾

(وہ) رحمٰن[۱] ہے (وہ) رحیم[۳] ہے (وہ) مالک روزِ جزا کا[۴]

قومی خدا کی رہ گئی تھی، بابل، مصر، ہند، یونان، روم، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں، بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کی پوری طرح قائل نہیں رہی تھی، قرآن نے ایک لفظ ربّ العٰلمین لاکر ان سارے مشرکانہ و گمراہانہ عقائد کی تردید کردی۔ مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفتِ ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگی ہے، اسی لیے قرآن نے تصحیح میں بھی اُسی کو مقدم رکھا، علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ کلمۂ الحمد للہ ربّ العٰلمین تمام کلموں سے افضل و اشرف ہے، یہاں تک کہ لا الٰہ اِلّا اللہ سے بھی، اس لیے کہ اس میں صرف توحید ہے اور اس میں توحید کے ساتھ حمد بھی۔ (قرطبی)

[۲] (جو دنیا میں سب کو رزق دے رہا ہے، سب کو راحت پہنچا رہا ہے، نفع رسانی کا دروازہ سب کے لیے کھولے ہوئے ہے۔)

الرحمٰن العاطف على البر والفاجر بالرزق لهم ودفع الآفات عنهم (ابن عباسؓ)

الرحمٰن فی نفسه (المنار) ذی الرحمة العامة التی وسعت كل شیٔ (المنار)

نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ۹

[۳] (جو آخرت میں مومنین کو اجر ان کے استحقاق سے بہت زائد دے گا۔)

الرحيم خاصة على المؤمنين بالمغفرة وادخالهم بالجنة (ابن عباسؓ) الرحيم بفعله

(المنار) ذی الرحمة الخاصة بمن شاء من عباده الصالحين (المنار)

نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۹

صفات کے بیان میں صفتِ ربوبیت کو سب سے پہلے لانا اور اس کے مابعد صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر زور دینا خود اس امر کی ایک واضح شہادت ہے کہ عقائدِ اسلام میں ان صفات کا مرتبہ کتنا بلند اور ان کا درجہ کیسا اہم ہے، ان تصریحات کی موجودگی میں اور ان کی تکرار کے باوجود بھی پادریوں کا یہ کہے جانا کہ اسلام کا خدا صرف قوت اور قہرمانی کا خدا ہے، حقیقت پر کیسا ظلم کرنا ہے۔

[۴] مٰلِكِ۔ حاکم یا قاضی خواہ کیسے ہی وسیع اختیارات رکھتا ہو بہ ہر حال اس کے اختیارات محدود ہی ہوتے ہیں اور وہ مجرم کو حسبِ ضابطہ سزا دینے پر مجبور ہوتا ہے گویا خود حاکم پر حکومت ضابطہ یا قانون کی ہوتی ہے، بخلاف اس کے مالک وہ ہوتا ہے جسے پورے اختیارات حاصل ہوں، مجرم کو چاہے بخش دے چاہے سزا دے، کوئی اس سے باز پرس کرنے والا اور کوئی اس پر حاکم نہیں، حدیثِ مسلم میں آیا ہے کہ لا مالك الا الله عز و جل (اللہ عزوجل کے سوا کوئی بھی مالک نہیں) اور محققین کا قول بھی ایسا ہی ہے کہ بجز اللہ کے اور کسی کو ملک کہنا یا پکارنا جائز نہیں۔

لا یجوز ان یسمّی احد بهذا الاسم ولا یدعی به الا الله تعالیٰ (قرطبی)

لفظ کا فارسی ترجمہ بھی اسی لیے سفیان تابعیؒ سے شہنشاہ مروی ہے۔

قال سفیان مثل شاهان شاه (قرطبی)

اور مفسرین نے بھی معنی مطلق الاختیار کے لیے ہیں۔

المالك هو المتصرف فى الاعيان المملوكة كيف يشاء من الملك (صاوی)

ہندوستان کی بعض مشہور مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ قانون مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں کرم) کے خلاف خدا بھی نہیں جا سکتا اور کسی خطا وار کو معاف نہیں کر سکتا، مسیحیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ خدا انصاف کرنے پر مجبور ہے اور اسی لیے صفتِ عفو و رحم کے اظہار کے لیے، اسے اپنے "اکلوتے بیٹے" کو بطور کفارہ کے سب گنہگار مخلوق کی طرف سے پیش کرنا پڑا، قرآن مجید کے ایک لفظ مالک میں ان سب باطل عقائد کی تردید آگئی، اسے اختیار کامل ہے کہ جس مستحقِ سزا کو چاہے سزا دے اور جس مجرم کو چاہے بعد سفارش یا بلا سفارش بالکل ہی معاف کر دے۔

یوم الدین۔ دین کے معنی لغت میں متعدد آتے ہیں۔

الدّين الجزاء والحساب (مجاز) الدين الحساب الدين الجزاء (كتاب الاضداد)

اور قیامت کو بھی روزِ جزاء اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پورے حساب اور ہر عمل کے بدلے کا دن ہوگا، یہاں بھی یوم الدین سے مراد روزِ حشر ہے۔

اى يوم حساب الخلائق وهو يوم القيمة يدينهم بأعمالهم (ابن جرير عن ابن عباسؓ) اى يوم البعث والجزاء (كبير) فانه اليوم الذى يدين الله العباد فيه بأعمالهم (ابن القيم) ولهذا قيل ليوم القيمة يوم الدين انها هو يوم الحساب (كتاب الاضداد)

اللہ تعالیٰ مالک تو آج بھی ہے روزِ جزا کے ساتھ تخصیص کا مطلب یہ ہے کہ اس روز اس کی صفتِ مالکیت کا مشاہدہ و تحقق بڑے سے بڑے منکر کو بھی ہو کر رہے گا۔

ابن قیمؒ نے کہا کہ سورہ میں پانچ اسمائے الٰہی آئے ہیں، اور پانچوں کی تشریح الگ الگ کی ہے خلاصہ یہ کہ اسم اللہ صفاتِ جلال و جمال کا جامع ہے اور اس کے اندر وہ سب کچھ بالاجمال آگیا جس کی تفصیل اسمائے حسنیٰ ہیں۔

فتلزم ان يجمع معانى الاسماء الحسنى دال عليها بالاجمال. صفات الجلال والجمال اخص باسم الله (ابن القيم)

اور اسم الرب کے تحت میں سارے صفاتِ فعل و قدرت ضرر و نفع عطاء و منع وغیرہ کے آگئے۔

وصفات الفعل والقدرة والتفرد والنفع والعطاء والمنع ونحو ذالك وكمال القوة وتدبير امر الخليقة اخص باسم الرب (ابن القيم)

اور اسم الرحمٰن کے تحت میں، صفاتِ جود و احسان، بخشش و کرم، لطف و رافت آگئے۔

وصفات الاحسان والجود والبر والحنان والمن، والرافة واللطف اخص باسم الرحمٰن (ابن القيم)

اور اسم الرحیم کے معنی ہیں اپنے بندوں پر رحم کرنے والا۔

والرحيم الراحم لعباده اور اسم مالک کے تحت میں صفاتِ عدل جزاء و سزاء اور اعزاز و اذلال وغیرہ آگئے

وصفات العدل والقبض والبسط والخفض والرفع والعطاء والمنع والاعزاز والاذلال والقهر والحكم وغيرها اخص باسم الملك (ابن القيم) ۵

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ④

ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں۱۵ اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں ۱۶.

۱۵ (نہ کہ کسی اور کی، اے پروردگار!)

إِیَّاکَ لفظ ایّا خود ہی حصر اور تخصیص کے لیے آتا ہے اور پھر بہ حیثیت مفعول اس کی تقدیم فعل نَعْبُدُ پر اس حصر و تخصیص کو اور زیادہ مؤکد کر دیتی ہے یعنی ہم تیری عبادت میں شائبہ بھی کسی کی شرکت کا نہیں رکھتے۔

معناہ نعبدک ولا نعبد غیرک (ابن عباس) وقدم المفعول للتعظیم والاهتمام به والدلالة على الحصر (بیضاوی)

یہ مفعول کو مقدم کر کے لانے کی ترکیب درست ہے، اس کے برعکس فعل کو مقدم کر کے لانے کی ترکیب مثلاً نعبد ایاک جائز نہیں، اب یہاں سے دعا کی تعلیم ہے گویا بندے اپنی زبان سے دعا کر رہے ہیں، اس سے پہلے صرف تمہید دعا تھی، صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب، یا مخاطب سے غائب کی طرف دفعۃً انتقال کا نام صنعتِ التفات ہے اور عربی ادب و انشاء میں یہ عیب نہیں، اس کا شمار بہترین صنعتوں میں سے ہے، صاحبِ کشاف نے اس موقع پر امرء القیس جاہلی کے تین شعر شہادۃً نقل کیے ہیں جن میں یہ صنعت موجود ہے۔

دیباچہ میں گزر چکا ہے کہ کسی عبارتِ ادبی کی خوبیوں کی جانچ اور پرکھ کے لیے خود اس زبان کے ادب کا معیار پیشِ نظر لازمی ہے نہ کہ کسی دوسرے کے ادبی معیار کا، عربی عبارت عربی ہی کے فنِ بلاغت سے جانچی جائے گی نہ کہ اُردو، فارسی، انگریزی، ہندی، چینی، جاپانی کسی اور زبان کے معیار سے۔

بزرگوں سے منقول ہے کہ قرآن مجید کا لُبِّ لُباب سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا لُبِّ لُباب یہ آیت ہے۔

قال بعض السلف الفاتحة سر القرآن وسرها هذه الكلمة. (ابن کثیر)

نَعْبُدُ عبادت نام ہے تذلّل، انکسار و افتقار کے آخری مرتبہ کا۔

انّها غاية التذلّل (راغب) العبادة اقصى غاية الخضوع والتذلّل (کشاف)

اور اسی لیے اس کا مستحق بجز ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔

لم تستعمل الا في الخضوع لله تعالى (کشاف) ولا يستحقها الا من له غاية الافضال وهو الله تعالى (راغب)

مشرک قومیں خدا معلوم چھوٹے بڑے کتنے دیوی دیوتاؤں کو عبادت میں شریک کرتی رہتی ہیں بلکہ ان کی عبادتوں میں تو خدا کی شرکت رہنے بھی نہیں پاتی، معبود تمام تر اگنی دیوتا اور سورج دیوتا اور کالی مائی اور بھیم جی وغیرہ بن جاتے ہیں، مسیحیوں کے ہاں بھی نماز جیسی اور جب کبھی بھی ہوتی ہے اس میں برابر خدا کے ساتھ فرزندِ خدا کی شرکت رہتی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی) آیت کے ایک لفظ إِیَّاکَ سے تردید ہو گئی، سارے مذہبوں کے مشرکانہ طرزِ عبادت کی۔

نَعْبُدُ کا صیغۂ جمع بھی قابلِ لحاظ ہے، دعا تنہا ایک ایک فرد نہیں کر رہا ہے، ساری ملتِ اسلامیہ مل کر اجتماعی رنگ میں کر رہی ہے اور یہ اجتماعیت کی اہمیت قرآن و حدیث دونوں کی دعاؤں میں کثرت سے جلوہ گر ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ نسبتِ عبودیت سالک کے مقام کی انتہا ہے، کوئی مقام اس سے مافوق نہیں۔

۱۶ (نہ کہ کسی اور سے، اُسے حاجت روا سمجھ کر، اے اللہ!)

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝۵

چلا ہم کو سیدھا راستہ ۱۲

آیت کے جزو اول میں بیزاری و تبری ہے شرک سے اور اس آخری جزو میں بندہ کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بساطی، بے قدرتی کا، اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نصرت کے لیے ہر طرح اللہ کے ہاتھ میں سپرد کر دینے کا۔

فالاول تبرء من الشرك والثانی تبرء من الحول والقوۃ والتفویض الی اللہ عز وجل (ابن کثیر)

نَعۡبُدُ کے مابعد نَسۡتَعِيۡنُ لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق، تیری ہی اعانت، تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ ایاک کی تکرار توحید اور ردِ شرک کی اہمیت کو اور دوبالا کر رہی ہے۔

کرر للاهتمام والحصر (ابن کثیر) کرر الضمیر للتنصیص علی انه المستعان به لا غیر (بیضاوی)

نعبد کا تعلق اللہ کی صفتِ الوہیت سے ہے اور نستعین کا صفتِ ربوبیت سے (ابن القیم)

آیت نے جڑ کاٹ دی ہے، ہر قسم کی مظاہر پرستی اور مخلوق پرستی کی، شرک کی خفی سے خفی راہیں بند کر دی ہیں، اور کوئی خفیف سی بھی گنجائش پیر پرستی، پیمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی باقی نہیں چھوڑی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ سالک کا مقام اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر تمام ہو جاتا ہے، اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے وہ طالب تمکین و رسوخ ہوتا ہے۔

۱۲ یعنی وہ راہ جس میں کوئی کجی نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں، کہیں ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں، مراد اس سے جادۂ شریعت ہے کہ یہی زندگی کا مکمل نظام ہے، زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ کے باب میں ایک مکمل دستورِ حیات ہے اور اسی پر چلتے رہنا، فرد و جماعت دونوں کے حق میں دنیوی اور اخروی اعتبار سے فلاح ہی فلاح ہے۔ صحابہ، تابعین سب سے یہی معنی مروی ہیں۔

هو دین اللہ الذی لا عوج له (ابن جریر عن ابن عباس) قال ابن عباس وجابر هو الاسلام وهو قول مقاتل (معالم) عن ابی مالك و … عن ابن عباس و … عن ابن مسعود و عن ناس من اصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم قالوا هو الاسلام (ابن کثیر)

اِهۡدِنَا یہ گویا بندوں کی زبان سے درخواست ہے کہ اے ہمارے ہادی برحق وہ سیدھی حقیقی راہ سعادت ہم پر کھول دے، اس پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اور اپنے فضل و کرم کو ہمارا دستگیر رکھ۔ طلبِ ہدایت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راہرو بھٹکا ہوا ہے اور وہ راستہ دریافت کر رہا ہے، دوسرے یہ کہ راہ تو مل چکی، اب درخواست اسی پر قائم رہنے کی ہے، یہاں مراد یہی دوسری قسم کی دستگیری ہے۔

ای وفقنا للثبات علیه (ابن جریر عن ابن عباس) اهدنا ای ثبتنا کما … عن …

جو پہلے ہی سے ہدایت یاب ہیں، ان کی طرف سے یہ درخواست ہدایت پر ثبات، استقامت اور مزید ہدایت کی ہے، اور چونکہ روحانی ترقیوں کی انتہا نہیں، اس لیے جو جس مرتبہ پر ہے، اس کی دعا اس سے بھی بلند تر مرتبہ کی ہے اور مومن کی ہوسِ ہدایت طلبی کبھی بجھتی نہیں، یہ اعتراض محض طفلانہ ہے کہ ہدایت یاب کو درخواستِ ہدایت کی …

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے ؎۱۱

نَعْبُدُ، نَسْتَعِيْنُ، اِهْدِنَا سب میں ضمیر متکلم کا صیغہ جمع میں آنا بہت ہی پُر معنی ہے خواہ اظہارِ عبودیت کرنے والا اپنی جگہ پر فردِ واحد ہی ہو اس میں یہ تعلیم بھی آ گئی کہ فرد کا رابطہ اُمت سے کسی حال میں نہ چھوٹنے پائے۔

صراط۔ اس کا مفہوم شاہراہ، شارعِ عام کا ہے، محض گلی یا گزرگاہ کا نہیں۔

المنهاج الواضح (مجاز)

عبادت کرتے ہیں تو "ایک میں" نہیں بلکہ "ہم سب"، طلبِ اعانت کرتے ہیں تو "ہم سب" درخواستِ ہدایت کرتے ہیں تو "ہم سب" اُمت و ملت کی یہ زبردست و ہمہ وقتی شیرازہ بندی اسلام ہی کا حصہ ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ مطلوب و مقصود صراطِ مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی جو ساری مخلوق کے لیے خود بخود عام ہے۔

؎۱۱ (بابِ ہدایت میں)

یہ مزید شرح و تفسیر ہے اسی سیدھے راستہ یا صراطِ مستقیم کی تعلیمات و ہدایات تو ساری کی ساری قرآن مجید کے لفظ و عبارت میں آ گئیں لیکن مشیتِ الٰہی نے مزید شفقت و کرم سے ان تعلیمات و ہدایات کے عملی نمونے بھی انسانی روح و قالب میں بشری صورت و سیرت میں بکثرت بھیج دیے کہ اس صراطِ مستقیم پر چلنا اور زیادہ آسان ہو جائے یہ انعام پائے ہوئے لوگ انبیاء و مرسلین ہیں ان کی زندگی کے واقعات و حالات قرآن مجید میں بکثرت نقل ہوئے ہیں اور ان میں بھی علی الخصوص اس پاکیزہ جماعت کے پاکیزہ ترین سردار محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کی سیرتِ مبارکہ کا ایک ایک جزیہ تک محفوظ ہے پھر اس کے بعد آپ کے جو صحیح نائب و جانشین آپ کے بعد ہوئے ہیں اور ہر دور میں ہوتے آئے ہیں یعنی اولیائے اُمت صدیقین یا پھر شہیدانِ راہِ حق اور عام صالحین کہ یہ بھی اپنے اپنے درجہ میں نمونہ کا کام اپنے بعد آنے والوں کے لئے دے سکتے ہیں۔ خود قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ ان انعام پائے ہوؤں کی فہرست کے خاص خاص عنوان گنا دیے ہیں

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (سورۃ النساء ۔ ٦٩)

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے لفظ سے امام ابن جریر نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جن لوگوں کو یہ مرتبہ نصیب ہوا ہے اس کی تہہ میں اصل شے محض انعامِ الٰہی و فضلِ خداوندی ہے۔

وفی هذه الآية دليل واضح على ان طاعة الله جل ثناءه لا ينالها المطيعون الا بانعام الله بها عليهم وتوفيقه اياهم لها.

ابھی طلب صراطِ مستقیم کی ہو چکی تھی اب اس کی مزید تشریح کر کے گویا یہ اشارہ بھی کر دیا کہ وہ صراطِ مستقیم کوئی فرضی، خیالی اور موہوم چیز نہیں بلکہ وہ ایسی راہ ہے جس پر اللہ کے بندے اب تک چل بھی چکے ہیں اور کامیاب ہو چکے ہیں اور اس میں بڑی تسکین نئے چلنے والوں کے لیے ہے۔

الفاظ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر خوب غور کر لیا جائے تعلیم طلب صراطِ مستقیم کی محض مجرد صورت میں

اسی مفہوم کو سلبی و منفی شکل میں ادا کیا جا رہا ہے گویا جس طرح مقصود و مطلوب محبوبین و مقربین کے طور طریقوں کی اتباع ہے اسی طرح ممنوع و ناجائز منکروں اور نافرمانوں کی ہم مسلکی ہے۔

حیرت ہے کہ بعض جدید اہل قلم نے مسیحی پادریوں کے طعن و طنز سے متاثر بلکہ مرعوب ہو کر اسلام میں غضب الٰہی کے وجود ہی سے انکار کر دینا چاہا ہے، گویا حق سبحانہ وتعالیٰ ان کم فہموں کے خیال میں ایک بڑے پیمانہ پر کوئی سادھو سنیاسی مہاتما ہیں جو بدبخت چاہے ان کے بنائے اور اٹھائے ہوئے قوانین کو جو سرتاسر بندوں ہی کے نفع و مصلحت، فلاح و بہبود کے لیے ہیں آزادی و بے تکلفی سے توڑتا پھوڑتا چیرتا پھاڑتا ہے اور وہ اہنسا پر عمل کر کے تماشائی کے ساتھ جمود و تعطل کے ساتھ سارا تماشہ دیکھتا ہے اور اصلاح حال کے لیے نہ اپنی غیر محدود قوت اور لامتناہی توانائی کو حرکت میں لائے اور نہ دفع فساد کے لیے کوئی عملی اقدام کرے! پادریوں کے اعتراض کی اصل و بنیاد ہی غلط ہے انھوں نے غضب الٰہی کو بھی قیاس کیا انسانی غصہ اور طیش پر جو نتیجہ ہوتا ہے نفس کی ایک انفعالی کیفیت کا، حق تعالیٰ پاک ہے ہر قسم کے انفعال اور تأثر سے، وہ صرف فاعل ہے تمام تر مؤثر ہے اس کے اصلاحی اقدام عمل اس کی تعزیری حرکت ارادی کا نام بندوں کی زبان میں غضب الٰہی ہے اس کی حاکمانہ قوت اور مربیانہ شفقت دونوں کا عین مقتضی یہی ہے کہ وہ گنہگاروں، باغیوں، مجرموں کو ان کے جرم و بغاوت کے آخری عملی نتائج تک پہنچائے اس کا غیظ و غضب درحقیقت تتمہ اور ضمیمہ ہے اس کی رحمت بے حساب کا اور لازمی نتیجہ ہے اس کی شفقت بیکراں کا۔

اہل تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں احادیث و آثار بھی اسی کی تائید میں ہیں اور آیت کریمہ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے لیکن ایک گروہ نے مشرکین مراد لیا ہے صحیح یہی ہے کہ آیت ان سب کے حق میں عام ہو جو از راہ شرارت و خبث نفس حق کی مخالفت دیدہ و دانستہ کرتے رہتے ہیں۔

۲۵ یعنی ان کی راہ بھی نہیں جو اپنی غفلت، بے التفاتی، نادانی کی بنا پر حق کی طرف رخ بھی نہیں کرتے۔

اہل تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں حدیث و آثار بھی اسی کی تائید میں ہیں اور آیۂ کریمہ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغضوب علیھم اور ضالین کے مصداق کا حصر انھیں دو مذہب والوں کے ساتھ کر دینا صحیح نہیں، جو کھلے ہوئے مشرک و ملحد ہیں ظاہر ہے کہ وہ ضلالت میں ان سے بھی بڑھے ہوئے اور غضب الٰہی کے ان سے مستحق تر ہیں۔ محقق رازی کی رائے میں بہتر یہ ہے کہ کل عملی غلطیوں والوں کو زمرۂ مغضوب علیھم میں رکھا جائے اور کل اعتقادی غلطیوں والوں کا شمار طبقۂ ضالین میں کیا جائے۔

فالاولی ان یحمل المغضوب علیھم علی کل من اخطأ فی الاعمال الظاهرة وهم الفساق ويحمل الضالون على كل من اخطأ في الاعتقاد لأن اللفظ عام والتقييد خلاف الاصل (کبیر)

ولا الضالین میں لا تاکید نفی کے لیے ہے، اور عربی میں یہ اسلوب عام ہے جیسے یہ فقرہ ما زید بقائم ولا قاعد ولیس عندك نفع ولا دفع۔

لا تأكيد لأنه نفي كما دخلت لا لتوكيد النفي (معالم)

لا ان حروف زائدہ میں سے ہے جو تتمیم کلام کے لیے آتے ہیں۔

لاھی حروف الزوائد لتتمیم الکلام (معالم)

سورہ کے ختم پر آمین کہنا مستحب ہے آمین خود ایک دعا ہے اس کے معنی ہیں اِسْتَجِبْ یعنی اے رب قبول فرما۔

یعنی آمین عند اکثر اھل العلم اللھم استجب لنا (قرطبی)

تذییل

یہ خوش عقیدگی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحید الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کا بیان آگیا ہے اس کی نظیر سے مذاہبِ عالم کے دفتر خالی ہیں اور اس سے بڑھ کر تو کیا اس کے برابر بھی مثال پیش کرنے سے دنیائے مذاہب عاجز ہے، مسیحی دنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی دعا LORDS. PRAYER پر ہے لیکن اول تو اس کا ضعفِ اسناد بھی خود مسیحی فاضلوں کو مسلم ہے یعنی اس کی تحقیق نہیں کہ الفاظ خود حضرت مسیح کے ہیں بھی پھر چیز جہاں سے بھی آئی ہو یہاں اس کے الفاظ سورۂ فاتحہ کے بالمقابل درج کیے جاتے ہیں ہر منصف مزاج خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ قرآن مجید کی فاتحۃ الکتاب اور اس انجیلی دعا کے درمیان کیا نسبت ہے!

سورۃ الفاتحۃ	انجیلی دعا
۱۔ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے (وہ) سارے جہانوں کا مربی۔	۱۔ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ (متی ۶: ۹، ۱۰)
۲ (وہ) نہایت رحم کرنے والا (وہ) بار بار رحم کرنے والا۔	۲۔ تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔
۳۔ (وہ) مالک روزِ جزا کا۔	
۴۔ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد مانگتے ہیں	۳۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے اور
۵۔ چلا ہم کو سیدھا راستہ۔	۴۔ جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض کو معاف کر۔
۶۔ اور ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔	۵۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ برائی سے بچا۔
۷۔ نہ ان کا (راستہ) جو زیرِ غضب ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔	

۱۔ کہاں رب العالمین کی لامحدود وسعت و ہمہ گیری اور کہاں آسمان پر بیٹھے رہنے والی بعید اور محدود ادنیٰ پھر باپ جیسی محض مادی تعلق رکھنے والی ہستی۔

۲۔ ایک طرف اعلان ہو رہا ہے ہمہ گیر صفاتِ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کا اور دوسری طرف ان کی بجائے ذکر ہے صرف زمین پر آسمانی بادشاہت کے آنے کا۔

۳۔ توحید خالص پر جو زور قرآنی عبارت میں نفی عبادتِ غیر و نفی استعانت بالغیر میں ہے انجیل دعا کہاں اس کا بر عکس

۴۔ انجیلی دعا کی آیت نمبر ۳ میں روٹی کی اس درجہ اہمیت مادیت کی انتہا ہے۔

۵۔ محض برائی سے بچنے کی دعا، صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی نسبت سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔

(۲)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

رکوعہا ۴۰ چالیس رکوع — آیاتہا ۲۸۶ دو سو چھیاسی آیتیں

سورۂ بقرہ [1] مدنی [2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے [3]

الٓمّٓ ۝۱

الف لام میم [4]

[1] سورت کے اور بھی متعدد نام ہیں، سب سے زیادہ مشہور نام یہی ہے۔ "بقرۃ" کے لفظی معنی گائے کے بھی ہیں اور بیل کے بھی۔ لفظ بقرۃ سورہ کے آٹھویں رکوع میں آیا ہے اور وہیں ایک قصہ بھی اس کے متعلق درج ہے، سورت کا یہ نام بھی اسی مناسبت سے پڑا۔ بزرگ و معظم تو ہر سورت قرآن کی ہے، لیکن اس سورت کا شمار بزرگ ترین سورتوں میں ہے، عقائد و اعمال دونوں کے باب میں اسلام کی اہم ترین تعلیمات کہنا چاہیے کہ سب کی سب اس کے اندر آگئی ہیں اور یہ جو بعض روایتوں میں آیا ہے کہ فلاں فلاں صحابی کو اس کے سیکھنے اور حاصل کرنے میں کئی کئی سال لگ گئے ہیں تو یہاں سیکھنے سے محض تلاوت یا اس کے الفاظ کا حفظ نہیں بلکہ اس کے احکام و مسائل پر عبور ہے۔ احادیث میں اس سورۃ کی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں، ایک یہ کہ شیطان اور سورۂ بقرہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، شیطان مصدرِ ظلمت و ضلالت ہے، ظاہر ہے کہ وہ مرکزِ نور و ہدایت کے ساتھ کیوں کر اکٹھا ہو سکتا ہے۔

ان الشیطان ینفر من البیت الذی یقرأ فیہا سورۃ البقرۃ (مسلم، ترمذی، عن ابی ہریرۃ)

اقرؤا سورۃ البقرۃ فان اخذہا برکۃ وترکہا حسرۃ ولا تستطیعہا البطلۃ وہی سنخۃ ...

(دارمی، عن خالد بن معدانؒ)

بالفرض یہ روایتیں نہ موجود ہوتیں، جب بھی سورت کے مضامین کی بلندی، جامعیت و جامعیت سورت کو بجائے خود اس مرتبۂ فضیلت کا مستحق بنانے کو کافی تھیں۔

[2] یعنی اس سورت کی بیشتر بلکہ تقریباً تمام تر آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مدینہ کے زمانہ میں بعد ہجرت نازل ہوئی ہیں، کہیں کہیں کسی آیت کا نازل ہونا سورت کے مدنی ہونے کے منافی نہیں۔

[3] اللہ اور رحمٰن اور رحیم سب پر حاشیے گزر چکے۔

[4] الٓمّٓ لفظ کے تینوں حروف پڑھنے میں پوری طرح جدا جدا کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں جب ... ور

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

یہ کتاب ۵ؔ

ترجمے میں اُردو رسم الخط میں ظاہر بھی کر دیا گیا ہے اور یہ حروف مُقطعات کہلاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحابی اور بعض تابعینؒ کا قول ہے کہ الٓمّٓ مخفف اور قائم مقام ہے پورے فقرہ أنا اللہ أعلم کا۔ نحوی زجاج لغوی نے یہی قول اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ حروف مقطعات میں سے ہر حرف کسی مشتق کی دلالت کرتا ہے اور "عربی شاعری" سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں (قرطبی) بعض نے کہا ہے کہ یہ سورت کا نام ہے۔ متکلمین اور خلیل نحوی اور سیبویہ نحوی اسی طرف گئے ہیں۔

انها اسماء السور وهو قول أكثر المتكلمين و ختير الخليل و سيبويه ...

ابو عبید لغوی نے کہا ہے کہ اس کے معنی ابتدائے کلام کے ہے اور یہ سورت کا شعار (نام) ہے۔

ومعنى الٓمّٓ افتتاح يبتدأ الكلام وشعار للسورة. (مجاز)

بعض کا قول ہے کہ یہ قرآن ہی کا ایک نام ہے اور قول بھی نقل ہوئے ہیں۔ بعض صوفیہ نے انہیں عارفانہ اشارات و مرموزات قرار دیا ہے اور ان سے طرح طرح کے نکتے اور لطیفے پیدا کئے ہیں۔ ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ خطبات عرب کے دستور کے مطابق یہ حروف محض افتتاح کلام کے لیے لائے گئے ہیں اور یہ بات اس لیے دل کو زیادہ لگتی ہے کہ عرب اگر اس طرز خطاب و خطابت سے آشنا و مانوس نہ ہوتے تو ...ضرور ہی کرتے، اعتراض کے لیے تو مخالفین بہانے ہی ڈھونڈتے رہتے تھے، لیکن اس قسم کا کوئی بھی ... اہل زبان سے منقول نہیں۔

مشاہیر صحابہؓ و تابعینؒ میں سے اکثر کا اور جمہور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ یہ حروف ان متشابہات قرآنی میں سے ہیں جن کا علم کسی مصلحت سے عام بندوں کو نہیں دیا گیا۔

إنّ هذا علمٌ مستورٌ وسرٌّ محجوبٌ استأثر الله تعالى به ... (كبير)

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ... شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خثیم وغیرہ سب کا یہی مذہب ہے۔ (قرطبی و ابن کثیر)

یہ اعتراض کہ قرآن کے مخاطب جب ہم ہیں تو ان حروف کو بھی ہمارے لیے قابل فہم ہونا لازمی ہے کچھ زیادہ باوقعت و باوزن نہیں، قرآن مجید کے اندر اور جتنے مضامین و مطالب ہیں کیا وہ سب ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آگئے ہیں؟ یا کائنات خارجی میں جو کچھ موجود ہے کیا ان موجودات میں سے سب کا معرف بڑے سے بڑے فاضلوں اور محققوں کی بھی سمجھ میں آگیا ہے؟

۵ؔ محض زبانی یادداشتوں یا روایتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ باضابطہ و مستند نوشتہ ایک صحیفہ مکتوب، قرآن مجید اپنا پہلا تعارف اسی حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ ضبط تحریر میں آیا ہوا، ایک کتابی شکل میں ہے۔

صحیفۂ آسمانی ہے وہ دوسرے مذہبوں کی کتب سماوی کی طرح نہیں کہ صاحبِ مذہب کے ذہن میں ان کے صرف معانی و مطالب ہوں اور پھر دوسرے لوگ ان سے اپنی سمجھ کے مطابق نقل کریں اور وہ بھی اور بہت مدت کے بعد، بعد جب نوبت جمع و کتابت کی آئے تو صحتِ لفظی در اصل وقت و ترتیب زندگی کی چیز ہو، مضمون و معنی تک تو ہو کتاب اور یہ ہو ایک کتاب کا ہو لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور بشری قلم شریک ہو جائیں۔

دلائل و شواہد کو چھوڑیے، جس دعوے کی حد تک بھی تو اس باب میں قرآن کی حریف و مقابل دنیا کی کوئی بھی الہامی کتاب نہیں، توریت، انجیل، وید، کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں کہ وہ لفظاً بہ لفظ، حرف بہ حرف نازل شدہ کتاب ہے اور نہ ان کے پیرو انہیں اس حیثیت سے پیش ہی کرتے ہیں، یہ دعویٰ تنزیلِ لفظی کا تو صرف قرآن مجید ہی کا ہے آج دنیا میں اس کا خدا اور قلم کے زور میں کہتے ہیں۔ یہ صحیفہ جیسے وجوہ سے جتنی بھی چاہیں تیار کر ڈالی جائیں الکتٰب (یہ صیغۂ واحد بہ تخصیص الف و لام) یا "کتابِ واحد" کا مصداق تو صرف قرآن ہی نکلے گا۔ زمخشری معتزلی کا مرتبہ اللہ بلند کرے کیا خوب بات کہہ گیا ہے۔

معناہ ان ذلک الکتاب ھو الکتاب الکامل کأن ما عداہ من الکتب فی مقابلتہ ناقص.

مطلب یہ ہے کہ کتاب تو بس یہی ایک کتاب کامل ہے اور اس کے سامنے کتابیں جتنی بھی لائی جائیں گی سب ناقص ہی ہوں گی۔

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) بہرحال مومن و خادمِ قرآن تھے اور آج سے آٹھ یا ساڑھے آٹھ سو سال قبل کے مومن، اگر وہ یہ کہہ گئے تھے تو انہیں کہنا ہی چاہیے تھا، یہ دیکھیے کہ قرآن کا منکر اور مادیت و عقلیت کا پرستار اور وہ بھی اس بیسویں صدی کا، کیا کہہ رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم کی شہادت ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ THE MOST WIDELY READ BOOK IN THE WORLD پڑھی جاتی ہے (جلد ۱۵ ص ۸۹۸) اور پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر ہٹی کا بیان ہے کہ قرآن عہدِ آخریں کی کتابوں میں سب سے کم سن ہے لیکن دنیا میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی بھی ہے۔ (تاریخ اہلِ عرب ص ۱۲۷، مطبوعہ ۱۹۳۷ء)۔

ذٰلِکَ اسمِ اشارہ ہے اور اشارۂ بعید کا ترجمہ اردو میں "وہ" سے کیا جاتا ہے لیکن بُعد ہمیشہ بُعدِ مکانی یا بُعدِ زمانی ہی نہیں ہوتا، بُعدِ منزلت و علوئے مرتبت بھی بُعد ہی کی قسمیں ہیں اور ھٰذا کے مقابلہ میں ذٰلِکَ اسی بلندیِ منزلت کے اظہار کے لیے آتا ہے اور محاورۂ عرب میں مخاطب کے لیے بارہا صیغۂ غائب لے آیا کرتے ہیں۔

یقال بازاء ھذا فی المستبعد بالشخص او بالمنزلۃ ذلک وذاک (راغب) انما قال ذلک لشیء منزلۃ فی الشرف والتعظیم (تاج) معناہ ھذا القرآن وقد تخاطب العرب الشاھد فتظھر لہ مخاطبۃ الغائب (بحار)

• اردو اور فارسی زبانوں میں بھی اشارۂ بعید "آن" بارہا تعجب و تکریم و علوئے منزلت کے موقع پر آتا ہے۔ آنحضرت، آنجناب، آنعزیز وغیرہ۔ صحابی ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعتِ کثیر مجاہد، عکرمہ، سعید ابن جبیر، سدی، مقاتل، زید بن اسلم وغیرہ سے ذٰلک ھٰذا کے معنی میں مروی ہوا ہے (ابن کثیر)

لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝۲

(کہ) کوئی شبہ اس میں نہیں[۴] ہدایت ہے (اللہ سے) ڈر رکھنے والوں کے لیے[۵]

خود ذلک اور ھذا دونوں اسموں کے درمیان تبادلہ محاورۂ عرب میں بالکل جائز ہے۔

یستعملون کلا منهما مکان الآخر وهذا معروف فی کلامهم۔ (ابن کثیر)

اشارہ کا ث "الیہ اس کے بعد کا اسم یعنی الکتب ہے۔ گویا فقرہ کا صحیح اردو ترجمہ یہ ہوا "یہ مکرم و معظم کتاب"

[۴] (کہ یہ کتاب الٰہی ہے، اس کا ہر مضمون برحق اور اس کا ہر لفظ صدق ہے)

ای لا شک فیه انه من عند الله وانه الحق والصدق (معالم)

یہ معنی تابعین کو، صحابہ کو، سب کو مسلم ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

قال ابن ابی حاتم لا اعلم فی هذا خلافا (ابن کثیر)

اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھئے قرآن بجائے خود ایک عالم ہے، اس عالمِ قدس کے اندر گزر نہ کسی شک و تردد کا ہے نہ خلجان و اضطراب کا، یہاں تو جو کچھ ہے تسکین و اطمینان ہے، علم و ایقان ہے، یکسوئی و اذعان ہے، ہر دعویٰ مدلل ہے اور ہر حقیقت ثابت شدہ، اب اگر کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے تو گناہ چشمۂ آفتاب کا نہیں قصور شپرہ چشمی کا ہے۔ اسی لیے ارشاد یہ نہیں ہوا ہے کہ اس کے باب میں کسی کو شک و تردد لاحق ہو ہی گا نہیں بلکہ ارشاد صرف یہ ہوا ہے کہ خود یہ کتاب اس کے مضامین شک و شبہہ سے بالاتر ہیں۔

ما نفی ان احدا لا یرتاب فیه وانما المنفی کونه متعلقا للریب ومظنة له (کشاف)

المراد انه بلغ فی الوضوح الی حیث لا ینبغی لمرتاب ان یرتاب فیه۔ (کبیر)

لا ریب فیه۔ مقصود چونکہ نفی رَیب کی تاکید ہے، اس لیے ترکیب کلام بجائے لا فیه ریبٌ کے لا ریبَ فیه رکھی گئی کہ اس میں زور اس سے زیادہ ہے۔ (کبیر)

[۵] قرآن مجید کے مطالعہ کے وقت اس کا یہ اپنا بتایا ہوا وصف اول ہی سے خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وہ کوئی تاریخ کا دفتر نہیں کہ اس میں سنہ وار ترتیب کے ساتھ پچھلے زمانہ کے واقعات درج ہوں، کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ علوم طبعی و ریاضی کے مسائل کا حل اس کے اوراق میں ڈھونڈھا جائے، کوئی فلسفہ کا مقالہ نہیں کہ اس کے پڑھنے والے اشراقیوں اور مشائیوں، یونانیوں اور ہندیوں کے ظنون اور نظریات میں اُلجھے رہیں، افسانہ و محاضرات کی کتاب نہیں کہ پڑھنے والے اسے تفریح اور دل بہلانے کے لیے پڑھیں اس کی اصلی اور بنیادی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ھدایت نامہ ہے، دستورِ حیات ہے، مکمل و مفصل نقشۂ زندگی ہے۔

لِلْمُتَّقِیْنَ۔ یہ قید لگا کر صاف بتا دیا کہ اس قانونِ عام و ہدایتِ تام سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر خوفِ خدا موجود ہو، کتاب ہدایت نازل تو ساری دنیا کے لیے ہوئی ہے

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ؁

خطاب سارے عالم سے کر رہی ہے لیکن عملاً اس سے نفع صرف وہی لوگ حاصل کریں گے جن کے اندر حق کی طلب اور تلاش ہے اور جن کا ضمیر زندہ ہے۔ آفتاب اپنی جگہ عالمتاب سہی لیکن جن کی بصارت ہی ضائع ہو چکی ان کے لیے تیز سے تیز شعاعیں بے کار ہیں، زمین اگر مُردہ ہے تو اس کے حق میں بڑی سی بڑی بارش بھی بے اثر ہے غذا بہتر سے بہتر بھی ہیضہ کے مریض کے لیے لاحاصل بلکہ مُضر ہے، قرآن مجید سے استفادہ کے لیے اوّلین شرط دل کے اندر تقویٰ ہے

هو في نفسه هدى ولكن لاينا له الا الأبرار (ابن كثير)

جن کے دلوں میں ہدایتِ خداوندی کی کوئی طلب ہی سرے سے نہیں وہ اس کتابِ ہدایت سے کوئی نفع نہیں اٹھا سکتے۔

؁ (اور وہ بھی رسول کی تعلیمات و تصریحات کے مطابق نہ کہ اپنے ظن و تخمین وہم و گمان سے)

يُؤْمِنُوْنَ۔ ایمانیات کے دائرہ کے اندر جتنی چیزیں بھی ہیں سب کو تصریحاتِ نبوی کے مطابق ماننا ہوتا ہے جو علم بے کسی اور راہ سے آیا ہوا علم اس دائرہ میں نامقبول ہے، ایمان کی کیفیتِ نفسی شک و ریب تردد و تذبذب کی بالکل ضد ہے، ایمان سے اس کے برعکس دماغ کو سکون، دل کو اطمینان، روح کو تسلّی نصیب ہوتی ہے، دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی صاحبِ ایمان کو خودکشی کرتے نہیں پایا گیا، ایمان کے بغیر دل میں بے کلی اور بے چینی ہی رہا کرتی ہے لیکن ایمان والے کو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی ڈھارس بندھی رہتی ہے کہ وہ بڑا سہارا اور مضبوط آسرا رکھتا ہے۔

بِالْغَيْبِ یعنی ایمان ایسے عالم پر رکھتے ہیں جو محسوسات اور معقولات سے ماوراء ہے اور جس کی بابت خبریں صرف نبی کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہیں، اس قید سے یہ صاف ہو گیا کہ جن لوگوں کی ذہنیت مادّیت یا مادّیات تک محدود ہے اور کسی لطیف عالمِ بالا کے وجود کے، کسی فوق المادّہ عالمِ غیب کے قائل ہی نہیں، وہ حقیقی راہِ فلاح سے ہمیشہ محجوب و محروم ہی رہیں گے۔

غَيْب۔ لغت میں شہود کی ضد ہے، ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو، یا مشاہدہ و تجربہ سے باہر ہو۔

الغيب كل ما غاب عنك (لسان) استعمل في كل غائب عن الحاسّة (راغب)

یہ لغوی تشریح تھی آیت میں الغیب سے مراد ائمۂ تفسیر نے وہ عالم لیا ہے جو حواس و عقل سے ماوراء ہے اور جس کی بابت جو کچھ بھی علم ہوتا ہے وہ حضرات انبیاء کے توسط سے، مثلاً احوال حشر و نشر، حور و ملائک، جنت و دوزخ وغیرہا، اور یہ تفسیر خود جماعت صحابہؓ سے مروی ہے۔

اما الغيب فما غاب عن العباد من امر الجنة وامر النار ما ذكر الله تعالى وتبارك في القرآن (ابن جرير عن ابن مسعود وناس من أصحاب النبي صلّى الله عليه وسلّم) وهو قول جمهور

المعرب، ان الغيب هو الذى يكون غائبا عن الحاسّة (كبير)

غیب کی تفسیر منقول اسی قدر ہے لیکن اسے ذرا سی وسعت دینے سے اس کے اندر پیمبر کے سارے علوم داخل ہو جاتے ہیں اور پیمبر جن جن امور سے وحی جلی یا وحی خفی کی روشنی میں لوگوں کو روکتا ہے ان کی باریک باریک برائیوں کا امت کے نقطۂ نظر سے داخل غیب ہونا صاف معلوم ہو جاتا ہے وحی الٰہی کی خود دمیں سود، شراب، زنا وغیرہ کی خرابیوں اور مفسدوں کو جس طرح اپنی گرفت میں لے آئی ہے وہ انسان کے لیے غیب ہی کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن جب غیب کی حقیقت یہ معلوم ہو گئی کہ وہ شہود یا علم کے مقابلہ کی چیز ہے تو ظاہر ہے کہ جس طرح ہر شخص کا علم و مشاہدہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اسی نسبت سے ہر ایک کا غیب بھی دوسرے سے جدا گانہ ہوتا ہے طبیب کے لیے مرض و مریض سے متعلق بہت سے امور شہود میں ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے غیب کے حکم میں داخل ہوتے ہیں، اسی طرح ہر فن کا ماہر ایسی چیزیں جانتا ہے جو عامی کے لیے غیب یا خفا میں ہوتی ہیں گویا جس شخص کا دائرۂ علم جس قدر وسیع ہوگا، اسی نسبت سے اس کا دائرۂ غیب چھوٹا ہوگا، یہاں تک کہ حق تعالیٰ پر چونکہ ہر چیز روشن و عیاں ہے اس لیے کوئی شے اس کے لیے غیب میں داخل ہی نہیں اور اس لیے اُسے جب عالم الغیب کہا جاتا ہے تو اُس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو سب بندوں کے لیے غیب میں ہوتی ہیں "غیب" کی اضافت یہاں صرف بندوں کی جانب ہوتی ہے، ورنہ حق تعالیٰ کے لیے تو جس طرح دور و نزدیک آسان و دشوار، بڑا اور چھوٹا سب یکساں ہیں، اور ان کے باہمی فرق بے معنی ہیں، اسی طرح غیب و شہود بھی بالکل ایک ہیں۔

ويقال الشئ غيب وغائب باعتباره بالناس لا بالله تعالىٰ فانه لا يغيب عنه شئ (راغب)

بڑے سے بڑے عالم و عارف کے لیے بھی اس کے مرتبۂ علم و معرفت کے بعد اور اسی کے ماتحت و مناسب حدودِ غیب شروع ہوتے ہیں، یہیں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ پیمبر چونکہ تمام دوسرے انسانوں سے دانا تر و عالم تر ہوتے ہیں اور ان کا دائرۂ ادراک و معرفت ساری دوسری مخلوق سے وسیع تر ہوتا ہے اس لیے قدرۃً انھیں بے شمار ایسی مخفیات کا علم ہوتا ہے جو غیر انبیاء کے لیے تمام تر مجہول ہوتی ہیں لیکن اس ساری وسعت کے باوجود کہیں نہ کہیں، کسی منزل پر پہنچ کر ان کے علم کی بھی انتہا ہو جاتی ہے اور دائرۂ غیب ان کا بھی شروع ہو جاتا ہے، غیب پر ایمان لانا تو آیت میں متقین کی سب سے پہلی علامت بیان کیا گیا ہے اب اگر کسی کا غیب ہی نہیں تو وہ ایمان کس چیز پر لائے گا، انبیائے کرام تو متقی ہی نہیں متقیوں کے سردار و پیشوا ہوتے ہیں ان کا ایمان بھی اگر غیبیات و مخفیات پر نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ ہاں البتہ ان کا غیب انھیں کے ظرف و مرتبہ و بساط کے موافق ہوتا ہے ہر شما کا سا غیب ان کا نہیں۔

دین کا مغز کہیے یا ایمان کی روح یہی عالمِ غیب کا عقیدہ ہے یعنی یہ اعتقاد کہ اس عالمِ مادی سے ماوراء اس کائنات حسی سے اوپر کچھ اور ایک عالم ہے ضرور، اور جو اس عالم کے وجود کا قائل نہیں وہ سرے سے مذہب ہی کا قائل نہیں اور سب سے بڑا غیب تو خود وجود باری ہے سب سے بڑھ کر روشن و عیاں مگر سب سے زیادہ مخفی و نہاں، عالم غیب کے منکر اور محض مادیات کے قائل کو جس طرح تقویٰ سے کوئی واسطہ نہیں اسی طرح ایمان سے بھی کوئی تعلق نہیں۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ③

اور نماز کی پابندی کرتے ہیں[۹] اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں[۱۰]

خوب خیال کرلیا جائے کہ فلاح پانے والوں کے لیے اولین، مقدم ترین شرط یہ ہے کہ ان کا ایمان غیب پر ہو، سائنسی اکتشافات، فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں، منطقی موشگافیوں اور سارے دوسرے علوم و فنون کی اس راہ میں کوئی پرسش نہیں۔

[۹] (وقت سے، خشوع کے، تعدیل ارکان کے، غرض جملہ لوازم باطنی و شرائط ظاہری کے ساتھ)
صَلٰوۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں، اصطلاح شریعت میں ایک مخصوص ہیئت کی معروف عبادت کا نام ہے اور یہ نام بھی اسی سے پڑا کہ دعا ہی اس عبادت کا جزو اعظم ہے۔

الصلوٰۃ التی ھی العبادۃ المخصوصۃ اصلہا الدعاء۔ (راغب)

محققین نے کہا ہے کہ نماز تو کیسر طلب، دعا زبان سے بھی، دل سے بھی، اعضاء ظاہری سے بھی یعنی دعاء قولی، دعاء قلبی، دعاء فعلی کا مجموعہ۔ اقامۃ صلوٰۃ اور محض ادائے صلوٰۃ میں فرق ہے، اقامت صلوٰۃ میں نماز کی تکمیل صوری و معنوی ہر طرح کی آگئی۔

کسی شے کی اقامت کرنے کے معنی ہی عربی میں یہ ہوتے ہیں کہ اسے اس طرح ادا کیا جائے جو اس کا حق ہے۔

اقامۃ الشیٔ توفیۃ حقہ (راغب)

اور اقامت صلوٰۃ کی تعبیریں مداومت سے، تعدیل ارکان سے، اور مختلف طریقوں سے کی گئی ہیں (ابن جریر، کبیر وغیرہ) سب سے زیادہ جامع تشریح یُقِیمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کی صاحب جلالین نے اپنے دو لفظوں میں کردی ای یاتون بہا بحقوقہا۔

ان دیکھے خدا کے آگے جھکنے، سر عبودیت خم کرنے اس سے گہرا ربط و تعلق پیدا کرنے اور خود افراد ملت میں باہم نظم پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے، اور بدنی عبادتوں میں یہی فریضہ سب سے اعلیٰ اور ایمان توحید کا سب سے بڑا عملی مظہر ہے، فرد کے لیے اسلامی نماز باجماعت کے جو اخلاقی، طبی، مادی فائدے ہیں نیز ملت کے لیے جو معاشری، اجتماعی مصلحتیں ہیں ان کی جھلک کہیں دور سے دیکھ کر یہود، مسیحی اور منکرین تک اس کے دلدادہ ہوگئے ہیں، اور ان کے اہل علم اپنی تحریروں میں بار بار اس کا ذکر داد و مدح کے لہجہ میں کرچکے ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی)

متقین کی پہلی علامت یہ ارشاد ہوئی تھی کہ وہ عقیدۂ غیب کے قائل ہیں دوسری علامت یہ بیان ہورہی ہے کہ عملی زندگی میں وہ نماز کے پابند ہیں۔

[۱۰] (مناسب و ضروری موقعوں پر جائز اور مفید کاموں میں)
رِزْق کا لفظ کلام عرب میں بڑے وسیع معنی رکھتا ہے، اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آجاتی ہیں خواہ ظاہری و مادی ہوں مثلاً مال و صحت، اولاد، یا معنوی و روحانی ہو، مثلاً علم و حکمت، فہم سلیم وغیرہ۔

یقال للعطاء الجاری تارۃ دنیویا کان ام اخرویا وللنصیب تارۃ (راغب) الرزق فی کلام

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اتارا گیا [11] اور (اس پر) جو آپ سے قبل اتارا گیا [12]

العرب هو الحظ (کمر) اسم لکل ما ینتفع به (معالم) الرزق فی اللغة النصیب والعطاء وعلی الحسی والمعنوی کالمال والولد والعلم والتقوی (منار)

رَزَقْنٰهُمْ میں ہر رزق کو اپنی جانب منسوب کرکے بتا دیا کہ جو نعمت جتنی اور جس قسم کی بھی انسان کو ملتی ہے سب اللہ ہی کے فیض وعطاء کا ثمرہ ہوتی ہے، انسان کی اپنی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

يُنْفِقُوْنَ متقین کی تیسری صفت یہ ارشاد ہوئی کہ اللہ کے ہاں سے انھیں جو بھی ظاہری ومعنوی نعمتیں عطا ہوئی ہیں، انھیں وہ اللہ ہی کے دین برحق کی راہ میں صرف کرتے ہیں، اللہ کی مخالفت، عدوان وعصیان میں صرف نہیں کرتے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ ہم نے انھیں جو انوار معرفت عطا کیے ہیں ان کا وہ طالبین پر افاضہ کرتے رہتے ہیں۔

[11] (اے ہمارے رسول)

یعنی ان متقین کا چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں رسول کے لائے ہوئے پیغام پر خواہ قرآن ہو یا اس کے علاوہ۔

آیت کی عبارت سے یہ شبہ صاف ہو جاتا ہے کہ تین چیزیں الگ الگ ہیں (۱) ایک کلام کا نازل کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ (۲) دوسرے وہ شخص جس پر کلام نازل ہوا ہے یعنی اللہ کا رسول برحق (۳) تیسرے خود کلام، بروز، تمثل، حلول، اور وحدۃ الوجود (اپنے عوامی مفہوم میں) ان سب مشرکانہ ونیم مشرکانہ عقائد کی جڑ اس سے کٹ جاتی ہے، نہ کلام متمثل ہوا ہے اور نہ رسول (نعوذ باللہ) اللہ کے اوتار انسانی قالب میں خدا ہیں بلکہ ایک مستقل انسانی شخصیت رکھتے ہیں۔

[12] (دوسرے پیغمبروں پر خواہ وہ کسی ملک، کسی قوم، کسی زمانہ کے ہوں)

پانچواں وصف متقین، مہتدین کا یہ ارشاد ہوا کہ وہ (بخلاف یہود ونصاریٰ کے) اعتماد، اعتقاد دوسرے انبیاء پر بھی رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ سلسلۂ ارشاد وہدایت کوئی نو پیدا چیز نہیں یہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان دنیا میں آئے، سلسلۂ وحی کی عمر اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانیت کی اور مومن کے لیے تصدیق صرف ختم المرسلین کی کافی نہیں بلکہ سارے انبیاء ورسل کی کرنا ضروری ہے خواہ وہ درجۂ اجمالی ہی میں ہو۔

محققین نے دونوں ایمانوں بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کے درمیان فرق یہی کیا ہے کہ پہلا ایمان تفصیلی ہونا چاہیے، سارے اصول وفروع پر لازمی اور دوسرا ایمان محض اجمالی وعمومی کافی ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٥

یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں[۱۴] اور (یہی لوگ) بامراد تو بس یہی ہیں[۱۵]

[۱۴] سورۂ فاتحہ میں دعا بندوں کی زبان سے طلبِ ہدایت کی تھی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ دعا تھا قبول ہوئی، کتاب ہدایت نازل ہوگئی۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ اب ارشاد ہوا کہ فلاں فلاں علامتیں جن میں موجود ہوں وہی ہدایت یاب لوگ ہیں۔ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ۔

أُولَٰئِكَ۔ ان ہدایت یاب لوگوں کے خصوصیاتِ ذیل قرآن مجید ہی سے معلوم ہو چکے ہیں۔

۱۔ ان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے ان کے دلوں میں خوفِ خدا کی جگہ ہوتی ہے (الْمُتَّقِينَ)

۲۔ ان کا اعتقاد اس مادی دنیا سے پرے ایک عالمِ غیب پر ہوتا ہے (يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ)

۳۔ ان کے تعلق مع اللہ کا عملاً اظہار یوں ہوتا ہے کہ یہ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور نماز کا حق ادا کرتے رہتے ہیں (يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ۔)

۴۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو یہ اللہ کی مخلوق پر صرف کرتے رہتے ہیں (مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔)

۵۔ یہ رسول کے رسول برحق اور بہترین معلم و ہادی ہونے اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین رکھتے ہیں (يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ۔)

۶۔ پورے سلسلۂ وحی و نظامِ نبوت کی تصدیق کرتے رہتے ہیں (وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ۔)

۷۔ ان کا کامل اعتقاد یومِ آخرت یا روزِ جزاء پر رہتا ہے (وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝)

[۱۵] (دنیا اور آخرت دونوں میں)

دنیا کی فلاح تو یہ کہ انھیں راہِ ہدایت نصیب ہوگئی اور انفرادی و اجتماعی، شخصی و قومی ہر حیثیت سے جامع ترین و بہترین دستورِ حیات منازلِ زندگی کے طے کرنے کا ہاتھ آگیا، اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں پورا پورا اصلاح کرے گا۔

اي الذين ادركوا ووجدوا ما طلبوا ونجوا من شر ما منه هربوا۔ (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

فلاح عربی میں بڑے ہی وسیع معنی میں آتا ہے، دنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے اس لیے مفلحون کا پورا ترجمہ "کامیاب" "بامراد" وغیرہ کسی اردو لفظ سے ہونا دشوار ہی ہے امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ ائمۂ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ کلامِ عرب میں جامعیتِ خیر کے لیے فلاح سے جامع کوئی لفظ موجود نہیں۔

ليس في كلام العرب كله اجمع من لفظة الفلاح لخيري الدنيا والآخرة كما قال ائمة اللسان (تاج) كل من اصاب شيئا من الخير فهو مفلح (مجاز)

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ کی ترکیب نے معنی میں حصر و تاکید پیدا کر دی اور هُمْ بطور کلمۂ فصل کے تاکیدِ نسبت و تخصیص کے لئے ہے۔

وهم فصل يفصل الخبر عن الصفة ويؤكد النسبة ويفيد اختصاص المسند بالمسند اليه (بیضاوی) وادخال هو في مثل هذا التركيب احسن لانه محل تاكيد ورفع توهم (بحر)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ

بیشک جو لوگ کفر (اختیار) کیے ہوئے ہیں ٢٦ اُن کے حق میں یکساں ہے خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا آپ

لَا يُؤْمِنُونَ ⑥

انھیں نہ ڈرائیں ٢٧ وہ ایمان نہ لائیں گے ٢٨

مفسر تھانویؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ حصر کا تعلق فلاح کامل سے ہے نہ کہ فلاح مطلق سے، اور المفلحون سے مراد الکاملون فی الفلاح ہے اور معتزلہ و خوارج جنھوں نے آیت سے یہ نکالنا چاہا ہے کہ بائر کا مرتکب فلاح مطلق یعنی نجات سے محروم رہے گا، انھوں نے فلاح مطلق (نجات کاملہ) کے اور مطلق فلاح کے درمیان خلط کر دیا ہے۔

المراد بہ الفلاح الکامل المستفاد من الاطلاق فالحصر للفلاح المطلق لا لمطلق الفلاح۔ (تھانوی)

بامراد اور فلاح یاب لوگوں کے، عام اس سے کہ وہ قومیں اور جماعتیں ہوں یا افراد، قرآن مجید نے جو اوصاف گنا دیے ہیں، ان میں کہیں بھی یہ ذکر آنے پایا ہے کہ بڑے بڑے تاجر، بڑے بڑے صناع، بڑے بڑے کشور کشا و جنگ آزما ہوں گے؟ قرآن مجید جس فلاح حقیقی کی طرف بلا رہا ہے اس کا دائرہ ان سب سے الگ ہے۔

صاحب النار نے مادہ فلح سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ اَلْمُفْلِحُوْنَ انھیں نہیں کہتے جنھیں کوئی نعمت از خود بلا تعب و مشقت ہاتھ آجائے بلکہ وہ لوگ ہیں جنھیں فلاح کامل اثر اتحاد ایمان اطاعت پوری طرح بجا لانے کے بعد حاصل ہو گی۔

٢٦ (اور قیام دلائل کے باوجود اس پر اڑے ہوئے ہیں۔)

ای اثبتوا علی الکفر۔ (ابن عباس)

ایسے لوگ ظاہر ہے کہ علم الٰہی میں کفر ہی پر مرنے والے ہیں، جو لوگ دلائل حق میں غور نہیں کرتے اور باطل پر جمے رہتے ہیں ان کی استعداد قبول حق کے باب میں روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بالکل مردہ ہو جاتی ہے، آیت میں خصوصی اشارہ یہود مدینہ کی جانب ہے ان کا کفر کفر جحود کی قسم کا تھا یعنی یہ نبی آخر الزماں کی بابت پیشین گوئیاں اور ان کی علامتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور پھر دانستہ اغماض و اخفا کرتے رہتے تھے کہ اپنی دینی ریاست اور دنیوی سیادت میں فرق نہ پڑنے پائے۔

واما معنی الکفر فانہ الجحود ذلک ان الاحبار من یہود المدینۃ جحدوا نبوۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وستروہ عن الناس وکتموا امرہ۔ (ابن جریر)

٢٧ (لیکن آپ کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے، آپ کا اجر اس سے ثابت ہوتا رہے گا)

آج معمولی مبلغ بھی اپنی دھن کے کیسے پکے ہوتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا کے لیے مبلغ اعظم تھے دین الٰہی کی اشاعت کے لیے آپ کی تڑپ کا کیا کہنا۔ آپ کو حرص اگر تھی تو اسی کی کہ کافر سب کے سب دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں یہاں یہ حقیقت آپ کو بتلا دی گئی ہے کہ آپ کچھ بھی کر ڈالیے ان کے حق میں سب یکساں ہے، یہ بدبخت

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز

اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے

خَتَمَ اللّٰهُ اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل، بندہ کے کفر اختیاری کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا مسبب جیسا کہ دوسری جگہ اور زیادہ صاف ارشاد ہوا ہے۔

بل طبع الله علیها بکفرهم، واجمعت الامة علی ان الله عز وجل قد وصف نفسه بالختم والطبع علی قلوب الکافرین مجازاۃ لکفرهم (قرطبی وابن کثیر)

فطرت سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے اور اس فطرت سلیم میں دلائل حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے، لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانون شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت میں آجاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے اور نصرت الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آنے لگتی ہے اس نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کیا وہی اللہ تعالیٰ اسے بحیثیت علت العلل و مسبب الاسباب اپنے قانون تکوینی (نہ کہ قانون رضا) کے ماتحت دینے لگتا ہے اور یہی معنی ہیں، انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ مہر خداوندی کوئی مادی چیز نہیں۔

امام لغت راغب اصفہانی نے اس عنوان پر اپنے عام دستور کے خلاف بسط و تفصیل سے گفتگو کی ہے، ان کی تحقیق انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:۔

اشارۃ الی ما اجری اللہ بہ العادۃ ان الانسان اذا تناھی فی اعتقاد باطل او ارتکاب محظور ولا یکون منہ تلفتٌ بوجہ الی الحق یورثہ ذلک ھیئۃ تمرنہ علی استحسان المعاصی وکانما یختم بذلک علی قلبہ۔

اور دوسرے ائمۂ لغت نے ختم قلب سے مراد یہ لی ہے کہ اب اس شخص کی نہ سمجھ میں کوئی چیز آتی ہے اور نہ اب کوئی چیز اس سے نکل سکتی ہے گویا قلب ہر طرف سے بند ہو گیا ہے۔

ومن المجاز ختم علی قلبہ اذا جعلہ لا یفھم شیئاً ولا یخرج منہ شیٔ کانہ طبع (قاموس۔ تاج)

قُلُوْبِهِمْ قلب سے مراد سینے کے اندر کا وہ مضغۂ گوشت نہیں جو طبی اصطلاح میں دل کہلاتا ہے بلکہ وہ دل مراد ہے جو محاورۂ زبان میں احساس، عقل، ارادہ سب کا مرکز ہے انسانی بول چال میں ہر زبان میں دل اسی کو کہا جاتا ہے، اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے، قرآن مجید نے رعایت محاورۂ انسانی کی ہر جگہ رکھی ہے علوم و فنون کے مصطلحات کا اتباع کہیں نہیں کیا ہے توریت، انجیل وغیرہ دوسرے الہامی صحیفوں میں دل اسی معنی میں آیا ہے۔

۲۰ے (چنانچہ کھلے ہوئے دلائل حق اور روشن آیات الٰہی بھی انھیں نظر نہیں آتے)

یہ سب ثمرہ ہے ان کافروں کے ارادی اعراض عن الحق اور دانستہ کج روی کا، حق تعالیٰ کی جانب

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ

اور اُن کے لیے بڑا (ہی) عذاب ہے ۲۱ اور کچھ لوگ ایسے (بھی) ہیں جو کہتے ہیں ۲۲

ان ،فعال کا انتساب جو کچھ ہے وہ محض تکوینی حیثیت سے ہے، یعنی بطور علت العلل و مسبب الاسباب کے۔ ارادۂ حق جس طرح بندہ کے زہر کھا لینے پر موت کا ثمرہ طبعی مرتب کر دیتا ہے، اُسی طرح بندہ کی ارادی کجروی پر موت روحانی کا ثمرہ بھی مرتب کر دیتا ہے۔ مرضی حق کا تعلق نہ اول الذکر سے ہے نہ آخر الذکر سے۔ قرآن کے اس اسلوب بیان کی اور فہم، سماعت و بصارت کی قوتوں سے سزا کے طور پر محرومی کی مثالیں قدیم صحیفوں میں بھی کثرت سے ملتی ہیں:۔

"خدا نے تم کو وہ دل جو سمجھے اور وہ آنکھیں جو دیکھیں اور وہ کان جو سنیں آج تک نہیں دیے" (استثناء ۲۹: ۴۰) "تم سنا کرو پر سمجھو نہیں، تم دیکھا کرو پر بوجھو نہیں۔ تو ان لوگوں کے دلوں کو چربا دے اور ان کے کانوں کو بھاری کر" (اسیعاہ ۶: ۹، ۱۰) "وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ آنکھیں لیپی گئیں سو وہ دیکھتے نہیں اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں" (اسیعاہ ۴۴: ۱۸) "تمہاری آنکھیں جو کہ نبی ہیں موندی ہیں اور تمہارے سروں پر جو کہ غیب بین ہیں حجاب ڈالا ہے" (اسیعاہ ۲۹: ۱۰) "میں نے انھیں اُن کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا" (زبور ۸۱: ۱۱ و ۱۲)۔

انجیل میں اس قسم کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو، رومیون ۱۱: ۷ و ۸، اور ۲ تھسلنیکون ۲: ۱۱

۲۱ (آخرت میں)

اسلام مسلسل حیات کا قائل ہے، یہ ناسوتی، مادی زندگی صرف ایک حصہ ہے کل زندگانی کا، باقی اس کا پورا ظہور و بروز حیات اُخروی ہی میں ہوگا، اخروی زندگی تتمہ و نتیجہ ہے اُس دُنیوی زندگی کا۔ اور یہاں کی مسلسل قانون شکنی و نافرمانی عذاب الٰہی کی شکل میں ظاہر ہوگی، گویا جو تخم آج ڈالے گئے ہیں کل وہی نشو و نما کی صورت میں نمودار ہوں گے۔

عَظِيمٌ۔ عذاب اُخروی کے شدید و عظیم ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں اور قرآن مجید میں اُسے مختلف پیرایوں میں سمجھایا اور بتایا گیا ہے پھر بھی اُس کی تفصیلی کیفیت اور نوعیت ادراک بشری سے بالاتر اور مافوق ہے، اور بعض نے عظیم کے کلمۂ نکرہ ہونے سے بھی یہی استنباط کیا ہے کہ وہ کسی خاص و غیر متعارف ہی نوعیت کا ہوگا۔

من الآلام العظام نوع عظيم لا يعلم كنهه الا الله (مدارك وبيضاوى) والتنكير فيه للنوعية اى لهم فى الآخرة نوع من العذاب غير متعارف فى عذاب الدنيا (روح)

۲۲ (محض زبان سے، شرکتِ قلب کے بغیر)

النَّاسِ۔ ناس جمع ہے انسان کی اور اصل میں یہ اُناس ہے۔

اصله عند سيبويه والجمهور أناس وهو جمع او اسم جمع لانسان (روح)

مَنْ، واحد، تثنیہ، جمع، تینوں موقعوں پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، حالتِ افراد میں بلحاظ اس کی لفظی

آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٨﴾

کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ اور روزِ آخرت پر حالانکہ وہ (بالکل ہی) ایمان والے نہیں ۲۳

حیثیت کا کیا جاتا ہے اور جمع میں نظر اس کے معنی و مفہوم پر رکھی جاتی ہے۔

اب تک قرآن مجید نے ذکر دو قسم کے انسانوں کا کیا ہے، ایک مومن، فرمانبردار، قانونِ الٰہی کے مطیع، دوسرے کافر، نافرمان، قانونِ الٰہی کے منکر و باغی، اب ذکر ایک تیسری صنف کا شروع ہو رہا ہے، ہوتے یہ بھی کافر و منکر ہی ہیں لیکن اپنے کفرِ خالص پر پردہ مکر و زیب کا ڈالے رکھتے ہیں یعنی زبان پر دعوئ اسلام رکھتے ہیں اور دل میں کفرِ خالص، زبان سے اقرار ایسا کہ جس میں قلب کی تصدیق کسی درجہ میں بھی شامل نہیں، ان ننگ انسانیت انسانوں کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہتے ہیں، نفاق کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اعلان و اظہار بھلائی کا کرتا پھرے اور شر کو اندر ہی اندر چھپائے رکھے۔

النفاق هو اظهار الخير واسرار الشر (ابن کثیر)

پھر نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک نفاقِ حقیقی یا اعتقادی جس میں ایمان سرے سے ہوتا ہی نہیں اور اس کی سزا ابدی خلودِ جہنم ہے۔ دوسرا النفاقِ عملی یا مجازی، اس میں ایمان کا استحضار نہیں رہتا اور انسان گناہ پر بے دریغ جری ہو جاتا ہے۔

هو انواع اعتقادی وهو الذی یخلد صاحبه فی النار وعملی هو من اکبر الذنوب۔ (ابن کثیر)

سورۂ بقرہ مدنی ہے اور مدینہ میں منافقین کثرت سے تھے، اسلام سے عداوت میں اور رسولِ اسلام سے عناد میں، یہ لوگ کھلے ہوئے کافروں سے کچھ کم نہ تھے، شاید کچھ بڑھے ہی ہوئے تھے۔

نفاق یعنی جھوٹا اظہارِ اسلام مکہ میں نہ تھا بلکہ مکہ میں تو اس کے برعکس صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ مومن ہو کر بھی ایمان کو چھپائے رکھتے اور بہ ظاہر کافر گروہ میں شامل رہتے، نفاق کی بنیاد مدینہ میں پڑی، وہ بھی غزوۂ بدر کے بعد جب اسلام کو روز بہ روز دنیوی عظمت و شوکت حاصل ہونی شروع ہو گئی۔

اس وقت بعض لوگوں نے اپنے کو محض تقیۃً بلا شائبۂ ایمان و صداقت مومن و مسلم کہنا شروع کر دیا، اس پارٹی کا سرغنہ یا سرخیل بنو خزرج کا سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، اس کا اثر و اقتدار حریف قبیلہ بنی اوس پر بھی تھا، یہ اپنے وقت کا کامیاب ترین لیڈر تھا، یہاں تک کہ مدینہ کی ساری آبادی اس کی سرداری پر متفق ہو چکی تھی، اور قریب تھا کہ اس کی بادشاہی کا اعلان ہو جائے کہ یک بیک اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے، اس نے اپنی دوکان یوں اُجڑتے دیکھی تو اپنے پیروؤں کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ زبان سے کلمۂ اسلام کا پڑھتے جاؤ لیکن دل میں اپنے ہی عقائد پر جمے رہو، اوس و خزرج کے علاوہ یہود کی بھی ایک غدار و ضمیر فروش جماعت نے خوشی سے اس تحریک پر لبیک کہا، البتہ مکہ کا کوئی مہاجر اس میں شریک نہیں ہوا، ابن کثیر نے تفصیل سے لکھا ہے اور یہاں بھی زیادہ تر اسی کی تلخیص ہے۔

۲۳ یعنی ان کے دل میں ایمان کا گذر ذرہ برابر بھی نہیں ہے، ایمان انھیں چھو بھی نہیں گیا ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ

دھوکا دیتے ہیں (اپنے خیال میں) اللہ کو اور ایمان والوں کو ۲۴ ۵

یعنی بون ذلک فی... لیس وراءہ شئ... انھم لیسوا من الایمان فی شئ (بیضاوی)

اٰمَنَّا...... الْاٰخِرِ. ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرۃ۔ خدائے واحد اور روزِ آخرت پر ایمان۔ یہی دو عقیدے تو سارے ایمان کی جان ہیں، ایمان بالرسالت انھیں بنیادی عقیدوں کی اہم ترین فرع ہے۔

بِمُؤْمِنِيْنَ. حرف باء تاکید کے لیے ہے۔

اکد النفی بالباء (بیضاوی)

ظاہر سیاق کا تقاضہ یہ تھا کہ فعل ما قبل "قالوا آمنا" کی تردید و تغلیط میں "ما آمنوا" یا اسی قسم کا کوئی اور فعل ماضی ہی لایا جاتا، لیکن یہاں تاکید اور زور کے لیے بجائے فعل کے، اسم فاعل لایا گیا کہ ان لوگوں سے نفی ایمان کی ماضی، حال، مستقبل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔

وفیہ من التوکید والمبالغۃ ما لیس فی غیرہ (کشاف) تاکیدا ومبالغۃ فی التکذیب لان اخراج ذواتھم من عداد المومنین ابلغ من نفی الایمان عنھم فی الماضی الزمان (بیضاوی) کان ذلک مبالغۃ فی تکذیبھم۔ (کبیر)

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں و عاطفہ نہیں حالیہ ہے۔

۲۴ یعنی محض مسلمانوں سے نفع حاصل کرنے کے لیے ان کی گرفت سے اپنے کو بچانے کے لیے اپنے کو مسلمان کہہ رہے ہیں اور جرم کفر پر اضافہ جرم خدع کا کر رہے ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ. باب مفاعلہ سے ہے اور اس کا خاصہ طرفین سے مشارکت ہے لیکن یہاں یخدعون کے معنی میں ہے۔

فی معنی یخدعون ومعناھا یظھرون غیر ما فی انفسھم (مجاز)

اور یہاں یہ وزن محض زور اور تاکید کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

المفاعلۃ لافادۃ المبالغۃ فی الکیفیۃ (ابو سعود) اخرج فی زنۃ فاعلت للمبالغۃ (بیضاوی)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ. رسول کی رسالت پر ان کا ایمان ہی کب تھا، یہ تو انھیں اپنا ہی جیسا ایک معمولی بشر سمجھ رہے تھے، اور دھوکے دھڑی کا معاملہ ان سے بھی ایسا ہی رکھنا چاہتے تھے جیسے دنیا میں عام انسانوں سے رکھا جاتا ہے، قرآن مجید نے گرفت کی اور کہا کہ دیکھو بات کہاں تک پہنچتی ہے یہ تو عین اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش ہوئی۔

اجترؤا علی اللّٰہ حتی ظنوا انھم یخدعون اللّٰہ (ابن جریر عن ابن عباس) یخدعون اللّٰہ

وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ⑨

حالانکہ (فی الواقع) دھوکا کسی کو بھی نہیں دیتے بجز اپنی ذات کے ۲۵ اور اس کا بھی احساس نہیں رکھتے ۲۶

فی زعمهم (مدارك)

قرآن مجید ہی میں اس باب کے اس طرز استعمال کی ایک دوسری مثال قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ میں ملتی ہے جہاں مراد محض لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ہے (بحار)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود رسول ؐ کو دھوکا دینے کی کوشش کو قرآن مجید نے عین اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے تعبیر کیا ہو جیسا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ سے بھی واضح ہو رہا ہے۔

ای یخدعون رسوله واولیاءه ونسب ذلك إلی الله تعالیٰ من حیث ان معاملة الرسول کمعاملته (راغب) ای رسول الله (مدارك) ذکر نفسه واراد به رسوله علی عادته فی تفخیم امره (کبیر)

اس طرز تعبیر کی اور بھی نظیریں قرآن مجید میں مل جاتی ہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا مثلاً عداوت یا فریب کا ایسا ہی ہے جیسے حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا۔

۲۵ یعنی ان کے اس نفاق سے نقصان کسی اور کا نہیں، خود انھیں کا ہوتا ہے اور ہو گا، آخرت میں عذاب، اور دنیا میں رسوائی، فضیحت اور منافقت کی پردہ دری۔

ضررها یلحقهم ومکرها یحیق بهم (کشاف) یفتضحون فی الدنیا ویتوجهون العقاب فی العقبیٰ (معالم)

۲۶ (کہ اس منافقت کا وبال خود انھیں پر ہو کر رہے گا۔)

لا یعلمون ان وبال خداعهم یعود علیهم (معالم)

يَشْعُرُوْنَ۔ بجائے یَعْلَمُوْنَ کے یہاں یَشْعُرُوْنَ وارد ہوا ہے، شعور عربی میں علم حسّی کو کہتے ہیں اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے اور مشاعر انسان کے آلات حواس کو کہتے ہیں۔

المشاعر الحواس (راغب) الشعور علم الشئ علم حسّ من الشعار ومشاعر الانسان حواسه (کشاف)

شعور میں مفہوم خفی و باریک چیزوں کے ادراک کا شامل ہے۔

الشعور ادراك ماخفی (المنار)

اس لفظ کے لانے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ منافقوں کو اس مکر و فریب سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا وہ بالکل مادی ہونے کی طرح صاف اور صریح ہے، لیکن یہ احمق فرط غفلت سے اس کا بھی احساس نہیں رکھتے۔

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا

ان لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے ۳۲ؔ سو اللہ نے بڑھادی اُن کی بیماری ۳۳ؔ

والمعنى ان لحوق ضرر ذلك بهم كالمحسوس وهم لتمادي غفلتهم كالذي لاحس له (كشاف) اى لاتدركونه بالحواس (راغب)

۳۲ؔ (کفر کی اور نفاق کی اور رشک کی جو انھوں نے اپنے ہاتھوں پیدا کر رکھی ہے)

شكّ ونفاق وخلاف وظلمة (ابن عباس)

دوسرا پہلو ان کم اعتقادوں کے مرض کا یہ تھا کہ جوں جوں مسلمانوں کو ترقیاں اور کامیابیاں حاصل ہوتی جاتی تھیں، ان کے رشک و حسد میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی، چنانچہ ہمارے ائمۂ تفسیر کی نظر سے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں ہونے پایا ہے۔

والمعنى ان المنافقين مرضت قلوبهم لما رأوا ثبات امر النبي صلى الله عليه وسلم واستعلاء شانه يوما فيوما (كبير) والمراد به هنا ما في قلوبهم ..... من الغل والحسد والعدا لأن صدورهم كانت تغلى على رسول الله صلى الله عليه وسلم والمؤمنين (كشاف)

مَرَضٌ ۔ لغوی اعتبار سے نام ہے انسان کے حالتِ طبعی سے خروج کا۔

المرض الخروج عن الاعتدال الخاص بالانسان (راغب) على ما ذهب اليه اهل اللغة حالة خارجة عن الطبع ضارة بالفعل (روح)

رذائل نفسانی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور مجازاً نفاق و کفر کو بھی مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کے لیے ادراکِ فضائل اور تحصیلِ حیاتِ اُخروی کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ (راغب)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ امراضِ قلب کا معاصی کے معنی میں اثبات خود قرآن مجید سے ہو گیا۔

۳۳ؔ (رسولِ اسلام اور جماعت مومنین کو مزید ترقیاں اور فتحمندیاں دے دے کر یا اپنے کلام کے مسلسل نزول سے)

منافقوں کے دل کے روگ کو ترقی دو طریقوں سے ہوتی رہی، یا تو یوں کہ جوں جوں اسلام کو مزید غلبہ و اقتدار حاصل ہوتا گیا، ان لوگوں کے دل کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی اور یا یوں کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے غیظ و تبغض میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ اہلِ تفسیر نے یہ دونوں پہلو اختیار کیے ہیں۔

كلما زاد رسوله نصرة وتبسطا في البلاد ونقصا من اطراف الارض ازدادوا حسدا وغلا وبغضا (كشاف) كلما نزل على رسوله الوحي كفروا به فازدادوا كفرا الى كفرهم (كشاف)

فَزَادَهُمُ میں حرف "ف" بہت اہم ہے یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آ رہا ہے وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔

والفاء للدلالة على ترتّب مضمونها عليه (ابو سعود)

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ⑩

اور ان کے لیے عذاب دردناک (ہونا) ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے ۲۹

حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے بلکہ اس نے تو صرف وہ حالات و اسباب پیدا کر دیے جن سے ان بدنصیبوں نے اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا، ورنہ اگر وہ اپنی عقل و ارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو انھیں اسباب و حالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔

وکان اسناد الزیادۃ الی اللہ تعالیٰ من حیث انہ مسبب من فعلہ (بیضاوی)

یہ سزا جو بالکل جرم کے مناسب حال ہی۔

وھو الجزاء من جنس العمل (ابن کثیر)

اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب، قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورۂ عام ہے:۔

"اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انھیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا" (زبور ۸۱: ۱۰ و ۱۱)

"پس خدا نے منہ موڑ کر انھیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں" (اعمال ۷: ۴۲)

"خدا نے ان کے دلوں کی خواہش کے مطابق انھیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کیے جائیں" (رومیوں ۱: ۲۴)

۲۹ یعنی اپنے مومن ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے، یہ عذاب الیم جس کا یہاں ذکر ہے منافقوں پر مطلق کفر پر نہیں بلکہ ان کی منافقت پر یا جھوٹے دعویٰ ایمان پر ہوگا۔

عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ کافروں کے لیے جس عذاب کی خبر اوپر دی جا چکی ہے (آیت ۷ میں) اس کی صفت عظیم آئی ہے اور یہاں منافقوں کے لیے جس عذاب کی وعید ہے وہ الیم ہوگا، اور الیم کے معنی ہیں مؤلم یعنی دکھ پہنچانے والا۔ گویا تکلیف و اذیت کا پہلو اسی میں زیادہ نمایاں ہوگا۔

وصف بہ العذاب للمبالغۃ (بیضاوی) اراد مؤلم موجع (ابن الانباری)

خوب سمجھ لیا جائے کہ جو منافق تھے، وہ کافر تو تھے ہی لیکن کافر کے علاوہ بھی کچھ اور تھے یعنی خادع و کاذب تو عذاب عظیم کے مستحق تو وہ اپنے کفر کی بنا پر ہو ہی چکے یہ منافقت کا عذاب الیم اس پر مستزاد۔ گویا منافقوں پر دونوں عذابوں کا مجموعہ ہوگا۔

قد حصل للمنافقین مجموع العذابین فصار المنافقون اشد عذابا من غیرھم من الکفار (بحر)

بِمَا میں ب سببیہ ہے اور مَا مصدری۔

الباء للسببیۃ وما مصدریۃ (ابو سعود) ما المصدر (معالم)

منافقوں اور ریاکاروں سے انجیل کا طرز خطاب حسب ذیل ہے:۔

"تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہے مگر اندر

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر بگاڑ مت پھیلاؤ ۳۰؎ تو کہتے ہیں کہ ارے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۳۱؎

مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔" (متی ۲۳: ۲۷)

اور شیوخ واکابر یہود کے الفاظ ان کی جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یوں منقول ہیں:۔

"جو اولیاء کی صحبت میں منافقت کے ساتھ رہتے ہیں خدا انہیں غارت کرکے رہے..... جو کوئی منافقت برتے خدا کرے چیل کوے اس کی آنکھیں نکال کر رہیں۔" (جلد ۶ ص ۵۱۳)

اور ربانیین کے تالمود میں ہے:۔

"جو کوئی منافقت برتتا ہے وہ غضب (خداوندی) دنیا پر لاتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور جو بچے ابھی رحم مادر میں ہیں، وہ تک اس پر لعنت کرتے ہیں، اور اس کی جگہ جہنم ہے۔" (ایوری مینز تالمود ص ۱۰۱)

۳۰؎ اس سے معلوم ہوا کہ قانون شریعت کے علاوہ کسی دین جاہلی پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مرادف ہے، امن عالم ونظام اقوام قائم جب ہی رہ سکتا ہے جب عملدرآمد قانون شریعت پر رہے۔ اس راہ سے انحراف بلکہ سرمو تجاوز کرنا بھی دنیا کو بدنظمی، ابتری، بے حیائی، کشت وخون، ظلم، خیانت اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ وکشمکش کو دعوت دینا ہے، چنانچہ دنیا عملاً اس کا تجربہ بارہا کر چکی ہے اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اس قول کا قائل کون تھا؟ بعض نے اس کا قائل رسول اللہ ؐ کو قرار دیا ہے اور بعض نے عام مومنین کو، اور کسی نے اللہ تعالیٰ کو بھی۔ الفاظ میں گنجائش ان سب کی ہے۔

وكل ذلك محتمل (كبير)

لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ۔ فساد عربی میں اردو کے مفہوم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے اور کسی ایک ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی برائی اور خرابی پر حاوی ہے۔

الفساد خروج الشئ عن الاعتدال ويضاده الصلاح (راغب)

۳۱؎ (اور الٹا ہم ہی پر الزام فساد وتخریب کا لگ رہا ہے)

جواب بعینہ وہ ہے جو آج بھی خدا معلوم امت کے اندر کتنے منافقوں کی زبان پر ہے، دین میں رخنے قدم قدم پر ڈالتے جاتے ہیں، اور زبان پر دعوے وہی تجدد کے، اصلاح کے، تعمیر کے ہیں۔

نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ کے معروف معنی تو یہی ہیں کہ یہ لوگ زبانی دعوے اپنے دین حق پر قائم ہونے کا رکھتے تھے۔

قالوا انما نحن على الهدى مصلحون (ابن جرير۔ عن مجاهد)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے والے ہیں محمدی اور غیر محمدی کے درمیان جو کشمکش ہے، اس کے مٹانے والے ہیں۔

قالوا انما نريد الاصلاح بين الفريقين من المؤمنين واهل الكتب (ابن جرير عن ابن عباس)

اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے اردو میں زور کا یہ مفہوم لفظ "ارے" سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ

کیا خوب! یہی لوگ تو بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں۔ اور یہ اس کا بھی احساس نہیں رکھتے ۳۲؎ اور جب ان سے

اٰمِنُوا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوٓا أَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۚ

کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہیں ۳۳؎ تو کہتے ہیں ۳۴؎ کہ کیا ہم (ایسا) ایمان لائیں جیسا کم عقل ایمان لائے ہیں ۳۵؎

۳۲؎ (کہ بگاڑ تو تمام تر انہیں کی ذات سے پھیل رہا ہے)
کیا ٹھکانا ہے ان کی غباوت کا، مسخ شدہ ذہنیت کا! سیاہ کو سفید کہہ رہے ہیں، تاریکی کا نام کافور رکھ رہے ہیں اور احساس اپنے اس جہل کا بھی نہیں رکھتے!
اَلَآ کلمۂ تنبیہ ہے، عربی میں "خبردار ہو جاؤ" "آگاہ رہو" کے معنی میں۔ یہاں سیاق میں اس کا پورا مفہوم اُردو کا "کیا خوب" یا "کیوں نہ ہو" سے ادا ہوتا ہے۔
۳۳؎ (اسلام اور رسولِ اسلام پر صدق واخلاص کے ساتھ)
دعوٰی ایمان کا تو اب بھی ان لوگوں کو تھا، سمجھانے والوں کا مطلب یہ تھا کہ ایمان دل سے لاؤ، دیانت اور راستی کے ساتھ رسول کی رسالت کو تسلیم کرو۔
ای ایمانا مقرونا بالاخلاص بعیدا عن النفاق (کبیر) اخلصوا فی ایمانکم (خازن)
النَّاس۔ ناس اَلْ کے داخلہ کے بعد معرفہ ہو گیا، اب مراد ساری نوعِ انسانی نہ رہی بلکہ وہ متعین ومخصوص افراد رہ گئے جو مخاطبین کے لیے معلوم ومعروف تھے، روایتوں میں عبداللہ بن سلام وغیرہ حق شناس یہود کے نام آئے ہیں جنھوں نے اسلام کی صداقت کو قبول کر لیا تھا۔
هم بعض الناس لا جميعهم (ابن جرير) كما صدق المهاجرون والمحققون من اهل يثرب (قرطبی) هم ناس معهودون كعبد الله بن سلام واشياعه (كشاف)
یہ بھی جائز ہے کہ الناس کو انسانِ کامل کے معنی میں لیا جائے اور اس صورت میں مراد ہوگی کہ ایمان ان کی طرح لاؤ جو صفتِ انسانیت میں کامل ہیں۔ اور وہی انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔
الكاملون فی الانسانية (كشاف) واللام فی الناس للجنس والمراد به الكاملون فی الانسانية۔ (بیضاوی)
اس سے اشارہ یہ نکلا کہ جو منکرین ہیں وہ صورۃً انسان ہیں لیکن حقیقتاً اپنی نافہمی کے لحاظ سے چوپائے ہیں۔
ومن عداهم كالبهائم فی فقد التمييز بين الحق والباطل (كشاف)
۳۴؎ (اس کے جواب اور اپنی صفائی میں)
۳۵؎ یہ طنز ہے اس وقت کے پکے اور سچے مسلمانوں پر، رسولؐ کے صحابیوںؓ پر۔
يعنون اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم (ابن جرير۔ عن ابن عباس وابن مسعود)
یہی سنت آج تک چلی آرہی ہے "ترقی پسندوں" "روشن خیالوں" اور "اہلِ تجدد" کے دربار سے آج بھی

أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا لَقُوا

کیا خوب! کم عقل تو خود یہی لوگ ہیں۔ اور اس کا بھی علم نہیں رکھتے ۳۶ اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان

الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ

لاچکے ہیں ۳۷ تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لاچکے ہیں ۳۸ اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں ۳۹

"جمود پسند" "رجعت پسند" "تاریک خیال" وغیرہ کیسے کیسے خطابات خالص و مخلص اہلِ ایمان کو عطا ہوتے رہتے ہیں
۳۶ کیا ٹھکانا ہے ان کے حمق اور نافہمی کا! اپنے افساد کو اصلاح کہہ رہے تھے اب حق بالائے حق یہ ہے
کہ عقل، دوراندیشی، حکمت کو بے عقلی ٹھہرا رہے ہیں! ایمانی خالق سے انکار و تکذیب کا ایک وبال یہ بھی پڑتا
ہے کہ خود عقل بھی ماری جاتی ہے اور ہر سیدھی چیز اُلٹی نظر آنے لگتی ہے۔
سَفِیۡہ کہتے ہیں اس کم عقل کو جسے اپنے نفع نقصان کی پوری تمیز نہ ہو۔
السفیہ الجاھل ضعیف الرأی القلیل المعرفۃ بمواضع المنافع والمضار (ابن جریر)
المراد بالسفہ الطیش وخفۃ العقل وضعف الرأی (المنار)
أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ کی ترکیب میں بڑا ہی زور منافقین کی سفاہت پر ہے کس درجہ
بے وقوف لوگ یہ ہیں کہ اپنے نفع نقصان میں تمیز ذرا نہیں کرتے۔
۳۷ (اور جو صاحبِ وجاہت اور صاحبِ اثر بھی ہیں) جیسے حضرت ابوبکرؓ جو زمانہ جاہلیت میں
ایک بڑے تاجر تھے اور اب ایمان لاچکے تھے۔
ای ابابکر واصحابہ (ابن عباس)
۳۸ (اور آپ ہی جیسے مسلمان ہیں)
آمنا کایمانکم (معالم)
یہ بات یہ لوگ ذی اثر مسلمانوں کی رضاجوئی اور خوشنودی کے لیے کہتے۔
غرورًا منھم للمؤمنین ومصانعۃ وتقیۃ (ابن کثیر)
منافقین کی ایک ذہنیت یہ بھی تھی کہ غریب عوام مسلمانوں کے مقابلہ میں تو اکڑے رہتے لیکن مسلمانوں میں
جو صاحبِ اثر و اقتدار ہوتے ان کے آگے فوراً جھک جاتے اور اُن سے بہ تملق پیش آتے، منافقتِ ایمانی کے بعد
طبیعت میں تملق پیدا ہو جانا بھی کچھ قدرتی سا ہے۔
۳۹ یعنی اپنے شریر رفیقوں یا سرداروں کے پاس۔
شَيَاطِينِهِمْ مادہ شطن کے معنی خیر و حق سے بُعد کے ہیں اور شاطن شیطن دونوں بعید
کے معنی میں ہیں۔ (تاج)
شیطان (بہ صیغۂ نکرہ) کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، ہر سرکش اور ہر بھڑکانے والے کو شیطان

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ ۙ

تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں

کہتے ہیں، انسان، جنات، حیوانات سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، گو شیطان بطور ایک اسم وصفی کے مخصوص ہے ابلیس کے لیے۔

کل عات متمرد من الجن والانس والدواب فھو شیطان (صحاح) الشیطان کل عارم متمرد من انس او جن او من دابۃ (تاج) والشیطان اسم لکل عارم من الجن والانس والحیوانات (راغب)

والشیطان معروف وکل عات متمرد من الجن والانس والدواب (لسان)

حدیث نبوی میں شیطان اور بھی وسیع مفہوم میں آیا ہے، چنانچہ تنہا سفر کرنے والے کو بھی شیطان بتایا گیا ہے چنانچہ نہایۂ ابن اثیر میں اس پر بسط سے کلام ہے۔

شیطان کے ایک معنی انسان کے اخلاقی اور روحانی مرض کے ہیں اور لفظ کا یہ استعمال حدیث نبوی میں آیا ہے۔

وسمّی کل خلق ذمیم للانسان شیطانا فقال علیہ السلام الحسد شیطان والغضب شیطان (راغب)

اور تاج العروس نے بھی یہ معنی سنداً نقل کیے ہیں۔

یہاں شیاطین سے مراد رؤساء یہود و منافقین لیے گئے ہیں جو اپنی سرکشی و طغیان کے لحاظ سے خود ہی شیطان بنے ہوئے تھے، نیز ان کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے۔

کھنتھم ورؤساؤھم (ابن عباس) رؤسھم فی الکفر (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود)

شیاطینھم سے ایک کھلی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب اپنے بھڑکانے والوں سے ملتے ہیں۔

من دعاۃ الفتنۃ وعمال الفساد وانصار الباطل الذین یصدون عن سبیل الحق (المنار)

خَلَوْا اِلٰی خلی کا صلہ جب اِلٰی آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں، کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے، تنہائی میں ملنے کے۔

خلا الیہ اجتمع معہ فی خلوۃ (لسان) خلا الیہ ای انتھی الیہ فی خلوۃ (راغب)

اِلٰی حرف الی جب کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر لایا جاتا ہے تو اس کی معیت کا مفہوم ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ یہاں بھی اسی مفہوم معیت میں آیا ہے۔

"الی" حرف جار تأتی للمعیۃ وذلک اذا ضممت شیئاً الی اٰخر کقولہ تعالی واذا خلوا الی شیاطینھم (تاج)

مَعَکُمْ (اپنے اصلی عقائد و خیالات میں)

یعنی ہم مسلمانوں کے ساتھ تو محض ظاہرداری کے طور پر ہیں اور مصلحۃً اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں ورنہ حقیقۃً تو ہم تمہارے ہی ہم عقیدہ و ہم مذہب ہیں۔

انا معکم ما انتم علیہ من التکذیب بمحمد (ابن جریر)

إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ

ہم تو محض بنا رہے تھے [۴۱] انھیں اللہ بنا رہا ہے [۴۲] اور وہ انھیں ڈھیل دے رہا ہے [۴۳]

يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾

(تو) وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں [۴۴]

[۴۱] (ان مسلمانوں کو اور ان کے پیمبر اور ان کے صحابیوں کو)

بمحمّد واصحابه (ابن عباس)

مطلب یہ ہوا کہ عوام منافقین جب تنہائی میں اپنے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل وجان سے تو آپ ہی کے ساتھ ہیں، باقی مسلمانوں کے بنانے کے لیے ان کی سی کہہ دیتے ہیں۔

استہزاء کے معنی تمسخر کرنے، ہنسی اڑانے، بنانے کے ہیں۔

[۴۲] یعنی ان کے تمسخر کو انھیں پر پلٹے دیتا ہے، مجازات، سزا، معاوضہ کے موقع پر محاورۂ عرب میں یہ طریقہ عام ہے کہ جزائے فعل کو اصل فعل ہی کا نام دے دیا جاتا ہے۔

ای یجازیهم جزاء الهزؤ (راغب) مثل قوله نسوا الله فنسيهم ای جازاهم جزاء النسيان (ابن قتيبه) جزاء الاستهزاء باسمه كما جزاء السيئة سيئة (بيضاوی) انما هو على مقابلة اللفظ بمثله ومزاوجته له وتقول العرب الجزاء بالجزاء والاول ليس بجزاء ومنه قول الشاعر۔

ألا لا يجهلن احد علينا　　　فنجهل فوق جهل الجاهلينا

ومعلوم انه لم يمدح بالجهل ولكنه جرى على عادتهم فى ازدواج الكلام ومقابلته (جصاص)

ہنسی اور تمسخر کا انتساب ذات باری تعالیٰ کی جانب قدیم صحیفوں میں برابر موجود ہے۔

"تو اے خداوند ان پر ہنسے گا، تو ساری قوموں کو مسخرہ بنا دے گا۔" (زبور ۵۹: ۸)

"میں تمھاری پریشانیوں پر ہنسوں گا، اور جب تم پر دہشت غالب ہوگی تو میں ٹھٹھے ماروں گا" (امثال ۱: ۲۶)

[۴۳] (اپنے قانون تکوینی کے مطابق)

خالق کائنات نے بندوں کو جو آزادی و اختیار دے رکھا ہے، اس میں وہ خواہ مخواہ دست اندازی کبھی نہیں کرتا، سانپ کو کاٹنے کی، زہر کو ہلاک کرنے کی، آگ کو جلانے کی، یہ ساری اجازتیں اور آزادیاں اسی کے قانون تکوینی کے مطابق ہیں۔

[۴۴] یہ خود ایک تفسیر ہو گئی اللہ کے "استہزاء" کی۔

عَمَهٌ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سجھائی نہ دے اور وہ ادھر ادھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پھرے۔

هو التردد فى الضلال والتحير فى منازعة (تاج) العمى فى العين والعمه فى القلب (قرطبی)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ

یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی خرید کر لی ہدایت کے بدلے ۴۵ سو نہ اُن کی تجارت ہی سود مند ہوئی

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

اور نہ وہ راہ یاب ہوئے ۴۶

وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کے بعد بڑے سے بڑے روشن خیال انسان کی بھی واقعی یہی حالت ہوجاتی ہے۔ اپنی محدود و ناقص عقل کے سہارے وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے طرح طرح کے "نظریے" قائم کرتا ہے "اصول و کلیات" بناتا ہے ہر طرف ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے کھلا ہوا راستہ جس سے قلب کو سکون کامل حاصل ہوجائے کوئی نہیں سجھائی دیتا ہے شک ارتیاب بے اطمینانی کے ولدل میں اور زیادہ پھنستا جاتا ہے۔

۴۵ ان کی بدبختی کی انتہا ہے کہ انھوں نے ہدایت و ایمان جیسی جنس بے بہا قیمت میں دے کر خریدی بھی تو کیسی نکمی اور بے حقیقت چیز، گمراہی و کفر۔

اشْتَرَوا۔ اشترا یا خریداری کے معنی کسی چیز کا معاوضہ میں لینا۔ ایمان کا قبول کر لینا ان منافقین کے بالکل اختیار کے اندر تھا لیکن اس کے بجائے انھوں نے روش کفر کی اختیار کر لی، اہل عرب ہر استبدال کے موقع پر اشتراء بولتے ہیں۔

(اختاروا الكفر على الايمان (ابن عباس) اى استبدلوا الكفر بالايمان (معالم) والعرب تستعمل ذلك فى كل من استبدل شيئا بشئ (قرطبى) ويجوز الشراء والاشتراء فى كل ما يحصل به شئ (راغب)

بِالْهُدَىٰ میں ب کے معنی بعوض۔

اى بدلا منه (ابوسعود)

عرب کے باشندوں کا تجارتی کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، اور تجارت کی اصطلاحیں ان کی زبان و ادب کا ایک جزو بن گئی تھیں، جیسا کہ آج کل انگریزوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے اور ان کی کاروباری تجارتی اصطلاحیں انگریزی زبان و ادب کا جزو بن چکی ہیں۔

۴۶ (اور ہوتے بھی کیسے، جب کہ اپنی قوتِ ارادہ و فیصلہ سے صحیح کام نہ لے کر خود گمراہی خرید رہے تھے) تجارت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور نفع اس پر بڑھتا رہے یہاں منافق کا فروں نے نفع کا کیا ذکر عقل سلیم کے سرمایہ ہی کو اُلٹا برباد کر ڈالا۔ (کبیر)

رِبح بھی تجارتی اصطلاح ہے، اردو کے لفظ نفع کے معنی میں۔

فَمَا رَبِحَت میں حرف "ف" نے صاف کر دیا کہ یہ عدم نفع نتیجہ اور معلول رہا خریداریِ ضلالت کا۔

اتى بالفاء للاشارة الى تعقيب نفع الربح للشراء (روح)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ

ان کی (عجیب) مثال تو ان کی سی (عجیب) مثال ہے[۴۶] جنہوں نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اپنے اردگرد کو

ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾

روشن کر دیا[۴۸] تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں[۴۹]

۴۶ (محرومی و خسران کے لحاظ سے)
الَّذِي لفظاً واحد ہے لیکن یہاں معناً بطور جمع کے استعمال ہوا ہے۔
يقع للواحد والجمع (قرطبی) وضع الذی موضع الذین (کشاف)
عربی میں متعدد نظائر اس طریق استعمال کے کہ لفظ واحد لا کر مراد جمع لی گئی ہے، خود قرآن مجید ہی میں مل جاتے ہیں
مثلاً وخضتم کالذی خاضوا۔ الذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون
ما خلقكم ولا بعثكم الا كنفس واحدة وغیرہا۔
مَثَل کے مفہوم میں ایک پہلو ندرت و غرابت کا بھی شامل رہتا ہے یعنی ایسا حال جو عجیب و غریب ہو۔
ولم يضربوا مثلا الا قولا فيه غرابة من بعض الوجوه (کشاف)
۴۸ یعنی مسائل و حقائق خوب واضح اور روشن ہو گئے۔
۴۹ (اور طرح طرح سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں)
مطلب صرف اس قدر ہے کہ منافقین کا اندرونی نورِ بصارت سلب ہو گیا ہے، یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں طلبِ حق مطلق نہ تھی اور قانونِ اسلام کے مقابلہ میں وہ راہ تمام تر انکار و بغاوت کی، اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ادنیٰ و حقیر مصلحت کوشیوں کی بنا پر زبان سے اظہارِ اسلام کیے جاتے تھے، یہاں ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جب حقانیت کی آگ خوب روشن ہو گئی اور ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا، تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے، منافقین نے خود اپنے اندرونی حاسۂ بصارت کو ضائع کر دیا اور اس روشنی سے محروم ہو گئے۔ سلبِ بصارت اور گمراہی میں چھوڑ دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب محض تکوینی حیثیت سے ہے یعنی جب منافقوں نے گمراہ رہنا چاہا اور دعوتِ حق کو قبول و توجہ کے کانوں سے سنا ہی نہیں تو مشیتِ الٰہی نے بحیثیت علت العلل کے اس پر نتیجہ بھی وہی مرتب کر دیا۔ رضاء الٰہی کو اس میں مطلق دخل نہیں۔
نُورِهِمْ ..... ظُلُمَاتٍ، نور کے صیغۂ واحد اور ظلمات کے صیغۂ جمع میں لانے سے نکتہ یہ پیدا کیا گیا ہے کہ راہِ حق و ہدایت خطِ مستقیم کی طرح صرف ایک ہی ہے اور گمراہیاں خطِ منحنی کی طرح بے شمار ہو سکتی ہیں۔
فان الحق واحد وهو صراط الله المستقيم ...... بخلاف طرق الباطل فانها متعددة متشعبة (ابن القیم)

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ

(وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں ۵۰ تو اب وہ واپس نہ ہوں گے ۵۱ یا پھر جیسے آسمان سے

فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ

زور کا مینہ برس رہا ہو ۵۲ اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی ۵۳

۵۰ یعنی صدائے حق گویا سنتے ہی نہیں، اور کلمہ حق وایمان کے ادا کرنے سے ان کی زبان گنگ ہے اور دید حق کی طرف سے ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں، اور یہ سب کچھ اپنی اختیاری گمراہی کے نتیجہ کے طور پر۔

۵۱ (اور باطل سے حق کی طرف، کفر سے ایمان کی طرف، اندھیرے سے روشنی کی طرف)

عن کفرھم وضلالتھم (ابن عباس) الی الھدٰی ولا الی خیر (ابن جریر عن ابن عباس)

۵۲ منافقین مدینہ کے بھی دو طبقے تھے، ایک تو وہ تھے، جن کے دلوں میں سرتاپا کفر تھا، ایمان کا گزر ہی نہ تھا، اس طبقہ کی مثال ابھی اوپر گزر چکی ذھب اللہ بنورھم وترکھم فی ظلمٰت لا یبصرون۔ دوسرا طبقہ ان منافقین کا تھا جو کبیر منکر نہ تھے بلکہ آج کل کے بعض انتہائی "روشن خیالوں" کی طرح مشککین ومذبذبین میں تھے اسلام کی ظاہری قوت وشوکت اور مادی اقتدار وفتحمندی کو دیکھ کر کبھی چند قدم اس کی طرف بڑھتے اور جب مسلسل کامیابی نہ پاتے تو پھر پیچھے ہٹ جاتے، آیت میں مثال اسی طبقہ کے منافقین کی بیان ہو رہی ہے۔

ھذا مثل اٰخر ضربہ اللہ تعالٰی لضرب اٰخر من المنافقین وھم قوم یظھر لھم الحق تارۃ ویشکون تارۃ اخرٰی (ابن کثیر) ھذا ھو المثل الثانی للمنافقین (کبیر)

کَصَيِّبٍ۔ تمثیل میں اس باران رحمت سے اشارہ ہے طلوع اسلام کی جانب۔

المراد من الصیّب ھو الایمان والقراٰن (کبیر) وھو مثل القراٰن الذی بہ حیاۃ القلوب کالمطر الذی بہ حیاۃ الارض والنبات والحیوان (ابن القیم)

صیّب کے معنی بارش کے ہیں اور یہی تابعینؒ وصحابہؓ سے منقول بھی ہیں۔

والصیّب فی المشھور المطر وھو المراد ھنا عن ابن عباس وابن مسعود ومجاھد وقتادۃ وعطاء وغیرھم (روح) المطر الذی یصوب من السماء ای ینزل منھا بسرعۃ (ابن القیم) جعل الصوب لنزول المطر اذا کان بقدر ما ینفع (راغب)

السماء یہاں کثرت سے اس کے معنی بادل یا سحاب کے نقل ہوئے ہیں۔

ای من السحاب (معالم) قیل المراد بالسماء السحاب (بیضاوی)

اُفق بھی اس کے معنی لیے گئے ہیں۔ والمراد بالسماء ھنا الاُفق (روح)

سماء کے خود لفظی معنی میں بھی اس مفہوم کی پوری گنجائش موجود ہے کہ ہر چیز جو انسان سے اوپر کی طرف ہو لغت میں سماء ہی ہے۔

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ

وہ ٹھونسے ہوئے ہیں اپنے کانوں میں انگلیاں کڑک کے سبب اور موت کے اندیشہ سے ۵۴

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹

حالانکہ اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو ۵۵

السماء کل ما علاك فأظلك (صحاح)

سماء کے معنی بارش کے بھی برابر مستعمل ہیں۔

والسماء المطر (صحاح)

اَوْ کو بعض نے یہاں بَل کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے وَ کے معنی میں (کبیر) صاحب روح نے بھی یہ قول نقل کیے ہیں۔

وزعم بعضهم ان او هنا بمعنى الواو وقيل بمعنى بل۔

لیکن خود ان کو رد کر کے صاحب بحر کی رائے سے اتفاق کیا ہے کہ اَو یہاں تفصیل کے لیے ہے کہ دیکھنے والا اوپر کی دونوں تمثیلوں میں سے ایک اختیار کر سکتا ہے۔

ثم اختار ابوحيان انها للتفصيل۔ (روح)

۵۳ اشارہ ہے اُن شدائد کی طرف جو آغاز اسلام میں امت کو برداشت کرنے پڑتے تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شرعی پابندیاں مراد ہوں جو اظہار اسلام کے بعد بہرحال منافقین پر بھی عائد ہو جاتی تھیں مثلاً ادائے نماز، فریضۂ جہاد، ترک امارت قدیم، اطاعت رسول وغیرہا (کبیر)

مما فيه من الاوامر الشديدة بفعلها والاعداد والصبر على الامر والاوامر الشاقة على نفوس التي هي على خلاف اهوائها۔ (ابن القيم)

فِيْهِ میں ضمیر کا مرجع صَيِّب بھی ہو سکتا ہے اور السماء بھی۔

ظُلُمٰتٌ کا تعلق فی صَيِّب سے بھی ہو سکتا ہے اور فی السماء سے بھی حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

۵۴ یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے والے وہی اندھیرے میں راہ چلنے والے ہیں یعنی منافقین و مذبذبین مطلب یہ ہے کہ منافقین اپنی بزدلی، پست ہمتی، دون فطرتی کی بنا پر اسلام لانے میں ہر وقت خطرے ہی دیکھ رہے ہیں۔ ایک معنی یہ بھی نقل ہوئے ہیں کہ منافقین قرآن مجید کے بیانات اور احکام و مواعید کی تصریحات سننے ہی سے بچنا چاہتے تھے اور کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں یہ کلام اثر نہ کر جائے اور انھیں اسلام لاتے ہی نہ بن پڑے۔

مِنَ الصَّوَاعِقِ۔ یہاں اشارہ ہے قرآن مجید کے بیانات اور اس کے وعیدوں کی جانب۔

اي من بيان القرآن ووعده ووعيده (ابن عباس)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا

قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اُچک لے جائے ۵۵ وہ جب اُن پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چلنے ہیں

أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ

اور جب ان پر اندھیرا ہوا (تو بس) کھڑے رہ جاتے ہیں ۵۶ اللہ اگر چاہتا تو ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کر دیتا ۵۷

حَذَرَ الْمَوْتِ ای مخافۃ مبل القلب الیہ (ابن عباس)

الموت۔ موت عام خیال کے مطابق ختم زندگی اور عدم محض کا نام ہے لیکن قرآن اُسے زندگی ہی کی طرح ایک مستقل اثباتی وجود دیتا ہے اور یہی اہل سنت کا مسلک ہے۔

ومع محققوا اہل السنۃ ان الموت صفۃ وجودیۃ خلقت ضدا للحیاۃ (روح)

۵۵ (اپنے علم سے، قدرت سے، ہر لحاظ سے)

سو کافر اس کی گرفت سے بچ کر جا کہاں سکتے ہیں اور اس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں اور حیلے بے اثر رہیں گے جیسے محیط سے وہ چیز نہیں بچ سکتی جو اُس کے احاطہ میں ہو۔

ای عالم بہم وجامعہم فی النار (ابن عباس)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر محض علم ہی کے لحاظ سے محیط نہیں بلکہ ذاتاً بھی محیط ہے بلا کسی کیفیت کے۔ اور عارف رومی نے کہا ہے ؎

اتصالے بے تکیّف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

۵۶ (اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں)

تشبیہ مرکب کے سلسلہ میں بیان ہو رہا ہے آثار غلبۂ اسلام کی قوت و شدت کا، کہ یہ منافقین کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لیے اور انہیں مرعوب کرنے کے لیے کافی ہے۔

وھذا تمثیل لشدۃ الامر علی المنافقین۔ (کشاف)

۵۷ یعنی جب اسلام کی مادی فتح مندیاں اور کامیابیاں دیکھتے ہیں تو ان منافقین و مذبذبین کے قدم گویا اضطراراً اسلام کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، طلب حق تو ان کے دل میں ہوتی ہی نہیں البتہ مرعوبیت کچھ دیر کے لیے آمادہ کر دیتی ہے لیکن جب اہل ایمان کو ابتلاء پیش آنے لگتے ہیں تو یہ منافقین و مذبذبین انکار اور بے یقینی کے مقام پر ٹھٹک جاتے ہیں اور اسلام کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔

كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ۔ کلما اصاب المنافقین من عز الاسلام اطمأنوا الیہ (ابن کثیر عن ابن عباس)

وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا۔ واذا اصاب الاسلام نکبۃ قاموا لیرجعوا الی الکفر (ابن کثیر عن ابن عباس)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ ایسا ہی حال اس سالک کا ہے جو حالت بسط میں طاعات میں لگا رہتا ہے اور حالت قبض میں چھوڑ بیٹھتا ہے۔

۵۸ (جیسا معاملہ کہ بعض اگلی قوموں کے ساتھ بھی پیش آ چکا ہے۔)

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۹ اے انسانو ۶۰ عبادت (اختیار) کرو اپنے پروردگار کی ۶۱

الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾

جس نے تمہیں پیدا کیا ۶۲ اور تم سے قبل والوں کو (بھی) ۶۳ عجب نہیں کہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۶۴

توریت میں ہے :-

"جب وہ اس کی طرف کو اُترے تو الیسع نے خداوند سے دعا مانگی اور کہا مہربانی کرکے اُن لوگوں کو اندھا کر دیجیے سو اس نے جیسا کہ الیسع نے کہا تھا ان کو اندھا کر دیا" (۲ سلاطین ۲ : ۸)

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ یعنی مشیتِ الٰہی اگر یہی ہوتی (قانونِ تکوینی) اگر اب بھی یہی ہوتا۔
اس سے اشارہ یہ بھی نکل آیا کہ مؤثرِ حقیقی صرف ارادۂ الٰہی ہے اور اسبابِ ظاہری میں تاثیر جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے مشیتِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے بذاتِ خود نہیں۔

والتنبيه على ان تاثير الاسباب فى مسبباتها مشروط بمشية الله تعالى (بيضاوى)

۵۹ (چنانچہ اس پر قادر ہے اور اب بھی یہی کر سکتا ہے)

قَدِيرٌ صیغۂ مبالغہ ہے، زور و قوت میں قادر سے زیادہ، اسلام کا خدا قادرِ مطلق ہے، ہمہ توان ہے۔

القدير فعيل منه وهو للمبالغة (نهاية)

مصری، ہندی، یونانی خداؤں کی طرح ناقص اور محدود القوٰی نہیں۔
قدیر کے مفہوم میں ایسا فاعل داخل ہے جس کا فعل ہمیشہ عین مقتضائے حکمت ہی ہوتا ہے نہ اس سے کم نہ اس سے زائد۔ اور اسی لیے اسم قدیر کا اطلاق بجز اللہ تعالےٰ کے کسی کی ذات پر نہیں ہوتا۔

القدير والفاعل بما يشاء على قدر ما تقتضى الحكمة لا زائدا عليه ولا ناقصا عنه ولذلك لا يصح ان يوصف به الا الله تعالى (راغب)

ابھی ارشاد ہوا تھا کہ مشیتِ الٰہی بندوں کو مسلوب الاختیار بنا کر رکھنے کی نہیں اب ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اللہ کی قدرت کسی سے محدود نہیں اس کا ارادہ ہر قانون پر غالب ہے، اس کی صفت قدرتِ کاملہ کے باب میں کوئی دھوکا نہ ہو۔

۶۰ قرآن مجید کا مخاطب سارا عالمِ انسانیت ہے کوئی مخصوص نسل مثلاً بنی اسرائیل اور کوئی مخصوص قوم مثلاً اہلِ عرب نہیں۔

خطاب لجميع من يعقل (بحر) وهو ههنا عام (معالم)

یہ طرزِ خطاب خود ایک دلیل ہے تخاطب کے عام ہونے پر اور قرآن مجید کے خطاب کی عالمگیری پر پچھلے دو رکوعوں میں موجوداتِ انسانی کی سہ گانہ تقسیم از روئے اعتقاد بیان ہو چکی ہے یعنی مومن، کافر، منافق، اب سارے عالمِ انسانی کو خطاب مجموعی طور پر شروع ہو رہا ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً۪

وہ وہی (پروردگار) ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ایک فرش اور آسمان کو ایک چھت بنا دیا ہے ۶۵

۶۱ قرآن مجید کے اصل پیام کا آغاز گویا اب ہو رہا ہے۔ اور اس کا عنوان اول ہے مسئلۂ توحید کہ وہی اصل و اساس ہے سارے عقائد و مسائل اسلامی کی۔

رَبَّکُمُ۔ اسماء الہیہ میں سے یہاں سب سے اول اسم رب کو لانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ صفاتِ الٰہی میں کتنی بڑی اہمیت صفتِ ربوبیت کو حاصل ہے۔

۶۲ (تن تنہا بلا کسی کی شرکت و اعانت کے)

خَلَقَکُمْ۔ عمل تخلیق خالص خدائی عمل ہے، ہمسر و مساوی ہونا تو خیر الگ رہا، ماتحت و معاون کی حیثیت سے بھی کوئی شریک تخلیق نہیں، پھر خَلَقَکُمْ سے اس پر بھی زور دینا مقصود ہے کہ کائنات "خلق" ہوئی ہے نیست سے ہست ہوئی ہے عدم سے وجود میں آئی ہے یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی غیر مخلوق مادہ موجود تھا، اللہ نے اس کی صورت میں کوئی خاص صفت و ترتیب پیدا کر دی۔ بہت سے باطل مذہبوں کا رواجی تخیل رہا۔

الخلق اختراع الشیٔ علی غیر مثال سبق (معالم) یستعمل فی ابداع الشیٔ من غیر اصل ولا احتذاء (راغب)

۶۳ (پس الوہیت و معبودیت کا سزاوار وہی ایک ہے جو تمہارا رب بھی ہے اور خالق بھی)

الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ۔ اس سے پچھلی انسانی نسلوں کا مراد ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ خلقتِ انسانی سے قبل ہوئے زمین پر کوئی اور مخلوق بھی آباد ہو، جیسا کہ توریت میں درج بھی ہے، قرآنی لفظ ان سب ممکن مخلوقات پر حاوی ہے "تم کو (یعنی موجودین بصیغۂ حال) اور تم سے قبل والوں کو" (یعنی موجودین بصیغۂ ماضی) یہ دو لفظ لا کر قرآن مجید نے اشارہ ادھر بھی کر دیا کہ توحید کا درس ماضی و حال تاریخ و مشاہدہ دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۶۴ (کہ توحید ہی درجۂ تقویٰ تک پہنچانے کا بے خطا نسخہ ہے)

تکونوا من المتقین الذین رضی اللہ عنہم ربّھم (ابن جریر)

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے "تاکہ تم اس طریقہ سے بچ جاؤ" (اپنے پروردگار سے) لَعَلَّ ہے تو اظہار شک اور امید و آرزو کے لیے لیکن قرآن مجید میں جہاں حق تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہے تو کسی امر کی آرزو کی جگہ اس کے وقوع کا اور شک و احتمال کی جگہ یقین کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اردو ترجمہ "تاکہ" سے بھی جائز ہو گیا ہے۔

ھی کلمۃ رجاء وطمع وشک وقد جاءت فی القرآن بمعنی کَیْ (لسان) وقد جاءت فی القرآن بمعنی کَیْ (تاج) ذکر بعض المفسرین ان لعلّ من اللہ واجب وفسر فی کثیر من المواضع بِکَیْ (راغب) قال سیبویہ لعلّ وعسیٰ حرفا ترجّ وھما من اللہ واجب (معالم)

۶۵ آیت کے اس ٹکڑے کی جان یا اصل روح جَعَلَ لَکُمْ ہے مقصود زمین یا آسمان کی ہیئت بیان کرنا

یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت بیان کرنا کسی درجہ میں بھی نہیں، بیان صرف یہ کرنا ہے کہ زمین ہو یا آسمان کوئی بھی از خود نہیں بن گئے ہیں، بلکہ جو کچھ اور جیسے بھی کچھ ہیں، اللہ کے بنائے ہوئے اور اسی قادر مطلق کے زیر فرمان ہیں۔

رَبَّكُمُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الخ دوسری تعلیم ساتھ ہی ساتھ یہ ملی کہ زمین و آسمان انسان کے لیے خلق ہوئے ہیں، انسان زمین و آسمان کے لیے خلق نہیں ہوا ہے، مقصود و مطلوب انسان ہے، زمین و آسمان دونوں باذنِ الٰہی اسی خلیفۃ اللہ کے خادم ہیں، پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان اپنے ان خادموں کے آگے خود ہی جھکنے لگے اور الٹا انہیں معبود قرار دے کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

اَرْض۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے قدموں کے نیچے ہو۔

كل ما سفل فهو ارض (تاج) يعبر بها عن اسفل الشئ كما يعبر بالسماء عن اعلاه (راغب)

اسی طرح سماء ہر اس بلند چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سر کے اوپر ہو۔

السماء كل ما علاك (تاج) كل ما علا فأظل قيل له سماء (قرطبى) سماء كل شئ اعلاه (راغب) السماء سقف كل شئ وكل بيت (لسان) وقال الزجاج السماء فى اللغة يقال لكل ما ارتفع وعلا قد سما يسمو وكل سقف فهو السماء (لسان) السماء ارتفاع والعلو (لسان) السماء مجموع ما فوقنا من العالم (المنار)

اَرْض میں اصل تخیل پستی کا ہے اور انسان کے تعلق میں اس کا اصلی وصف فراش یا ما یفرش کا ہے یعنی وہ ایسی چیز ہے جو بچھا دی گئی ہے یا بچھی ہوئی ہے، ہمارے لیے فرش ہے یا ایسی ٹھوس اور ہموار چیز ہے جس پر ہم قدم رکھ سکتے ہیں، چل سکتے ہیں، بیٹھ سکتے ہیں، لیٹ سکتے ہیں نہ کہ کوئی ایسی کھردری یا پلپلی چیز ہے جس پر بیٹھنا، چلنا، قدم رکھنا ناممکن ہو، یہ زمین اپنی ہیئت کے لحاظ سے گول ثابت ہو یا چپٹی، بہر حال و بہر صورت اس کا تعارف انسان اور انسانیت کے سلسلہ میں اس سے بہتر ممکن نہیں کہ وہ انسان کے لیے فرش کا کام دے رہی ہے اور اس کام پر اسے اللہ ہی نے لگایا ہے، چنانچہ قرآن نے یہاں اس کا یہی وصف بیان کر دیا۔

اسی طرح سماء میں اصل تخیل بلندی کا ہے، زمین جس طرح بطور فرش ہمیں نیچے سے سنبھالے ہوئے ہے، آسمان اسی طرح ہمیں اوپر سے ڈھانپے ہوئے ہے، ظاہر ہے کہ جو محسوس و مرئی چیز اس قدر بلند ہے کہ بڑے بڑے بلند میناروں کی بلندیاں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں، پرندوں اور طیاروں کی بڑی سے بڑی بلند پروازیاں سب اس کے اندر سما جائیں اور سب اس سے پست ہی رہیں تو چھت کا اطلاق اس پر بجا نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔

زمین کی طرح آسمان کی ہیئت سے قرآن مجید یعنی دنیا کے اس اخلاقی اور روحانی نظام نامہ کو کوئی تعلق نہیں، آسمان کوئی ٹھوس مادی جسم رکھتا ہے یا محض خلا و منتہائے نظر ہے، اس قسم کے مسائل کا تعلق تمام تر ذہنی و تجرباتی علوم سے ہے، قرآن کو تو آسمان کا صرف وہی وصف بیان کرنا تھا جو سلسلۂ عبدیت بشری و خلافت الٰہی سے تعلق رکھتا ہے اور یہی اس نے کر دیا، زمین و آسمان کی پوجا ہر مشرک، جاہلی "متمدن" قوم نے کی ہے اور آسمان کو بہت بڑا دیوتا یونانیوں سے لے کر ہندیوں تک سب نے مانا ہے، قرآن کے تعارفِ زمین و آسمان کی اصلی زد انہیں مشرکانہ تخیلات اور جاہلی اوہام پر جاکر پڑتی ہے۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا

اور آسمان سے پانی اُتارا ۶۵ پھر تمھارے لیے غذا کو پھل پیدا کیے ۶۶ سو تم

تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ ۶۸ اور تم جانتے (بوجھتے) بھی ہو ۶۹

۶۵ (اسی معبودِ واحد وبرحق اور اسی خالقِ یکتا ومطلق نے نہ کہ کسی دیوی دیوتا نے)
السَّمَآءِ بالکل جائز ہے کہ یہاں ابر کے معنی میں ہو۔

ومن هذا قيل للسحاب السماء لانها عالية (لسان) هي سقف كل شئ ... والسحاب

والمطر (ابو بقاء) السماء بناء وهي سقف والمراد به السحاب ههنا۔ (ابن کثیر)
مقصود اس حقیقت کی تعلیم ہے کہ آسمان اور بارش سب خدائے واحد ہی کی مخلوق ومصنوع ہیں نہ کوئی آکاش دیوتا ہیں نہ کوئی اِندر دیوتا اور نہ کوئی FATHER - ZEUS بلکہ یہ کلدانیوں مصریوں، ایرانیوں ہندیوں یونانیوں رومیوں کے سب گڑھے ہوئے خرافات ہیں آسمان اور بارش کی پرستش دنیا سے بالکل ختم اب بھی نہیں ہوئی ہے ایشیا، افریقہ، امریکہ تینوں برّاعظموں کے خدا معلوم کتنے گوشوں میں اب بھی یہ شرک جاری ہے۔
لفظ سماء کے معنی اوپر کے حاشیہ میں ابھی گزر چکا ہے کہ بہت وسیع ہیں اس لیے سماء سے پانی کا اترنا بخارات کے منجمد ہونے اور پھر گرمی پاکر برس پڑنے یا اور اسی طرح کے درمیانی واسطوں کے ہرگز منافی نہیں۔
۶۶ (اسی معبودِ واحد اور خالق یکتا نے نہ کہ کسی اور دیوی دیوتا نے)
خدا جانے کتنی مشرک قومیں الگ الگ دیوی دیوتا، زراعت کے، نباتات کے، پھل پھلاریوں کے مان چکی ہیں قرآن مجید کا کام مسائلِ طبیعیات، فلکیات، جغرافیہ طبعی وغیرہ کی تعلیم دینا نہیں بلکہ ان عالمگیر مشرکانہ عقائد اور جاہلی تخیلات کی تردید ہے کائنات میں جو کچھ ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے تمام تر قادرِ مطلق ہی کی کارفرمائی کا ثمرہ ہے۔
بِهٖ یعنی پانی کے واسطہ یا ذریعہ سے۔

المعنى انه جعل الماء سببا فى خروجها ومادة لها (کشاف)
پانی خصوصاً بارشی پانی کو جو دخل عظیم ہر قسم کی زمینی پیداوار اور نباتات میں ہے اور پھر بالواسطہ بھی اور براہِ راست حیوانی اور انسانی زندگی کے قیام وبقا میں ان سب کی تفصیل اگر لکھی جائے تو بجائے تفسیر قرآن کے ایک ضخیم سائنسی مقالہ تیار ہو جائے۔
۶۸ (کسی کو کسی حیثیت سے بھی)
خلیفۃ اللہ جب کبھی اپنے مقام ومرتبہ کو بھول کر پستی میں گرا ہے تو اس نے اپنا سر جھکایا اور ماتھا ٹیکا ہے درختوں کے آگے ان کے پھلوں کے آگے، بارش کے دیوتا کے آگے، زمین کے آگے۔ آسمان کے آگے۔ قرآن مجید اسی حماقت وسخافت پر اُسے تنبیہ کر رہا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

اور اگر تم اس (کتاب) کے بارہ میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو کوئی ایک سورت اس جیسی بنا لے آؤ

فَلَا تَجْعَلُوْا میں ف سببیہ ہے یعنی جس نے تمہیں ان نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا وہ ہے بھی اسی لائق کہ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

اَنْدَادًا۔ نِدّ عربی میں کہتے ہیں مثل و مشابہ کو بھی، اور مخالف و مدِّ مقابل کو بھی۔

الند المثل والنظیر وقال الأخفش الند الضد والشبہ (تاج)

چنانچہ اَنداد کے معنی اضداد اور اشباہ دونوں کے لیے گئے ہیں۔

لفظ کی جامعیت میں نکتہ یہ ہے کہ شرک دنیا میں دونوں قسم کا مروج رہا ہے، بہت سی قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو محض ایک خدائے اصغر یا تحت خدا تسلیم کیا ہے اور مجوس نے اہرمن کو یزداں کے حریف و مدِّ مقابل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۹۶ (اپنے الہام فطری اور عام فہم بشری کی بنا پر کہ سب کا حاکم، سب کا خالق بس وہی ایک ہے!) اتنی بصیرت جو توحید تک پہنچا دے ہر قلب بشری میں ودیعت رکھ دی گئی ہے بشرطیکہ غلط تعلیم و تربیت اور ناقص ماحول اس فطرت ہی کو مسخ نہ کر ڈالے۔

وانتم تعلمون انی صانع ہذہ الأشیاء (ابن عباس) انتم بکمال عقولکم تعلمون ان ہذہ الأشیاء لا یصح جعلہا انداد اللہ تعالیٰ (کبیر)

مغربی محققین و مفکرین نے بھی بڑے رد و قدح کے بعد مانا کہ نوع بشری کا اولین و قدیم ترین عقیدہ توحید کا رہا ہے نہ کہ شرک کا۔

۹۷ (یعنی اس کے کلام الٰہی ہونے کے باب میں اے کافرو اور منکرو!)

خطاب یہاں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کے تحت ساری نوع انسانی سے ہو رہا ہے، صرف قریش بلکہ صرف اہل عرب سے ہی نہیں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہارے خیال میں یہ کلام الٰہی نہیں تو یقیناً ایک انسانی تصنیف ہوگی اور جب وہ ایک انسان ایسی تصنیف پر قادر ہے تو کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے چہ جائیکہ لائق و فائق انسانوں کا ایک پورا مجمع۔ کلمۂ اسلام کے اجزاء ترکیبی دو ہیں: ایک توحید باری، دوسرے رسالت محمدی، توحید کا بیان اوپر کی دو آیتوں میں ہو چکا، اب دعوت تصدیقِ رسالت کی دی جا رہی ہے۔

۹۸ (جن کا نام محمدؐ ہے)

سیاق و موقع ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خاص قربِ اختصاص کے اظہار کا ہے نیز آیت میں ایک پُر زور اور دائمی چیلنج منکرین کو دیا جا رہا ہے لیکن اس انتہائی زور اور اہمیت کے موقع پر بھی جو سردار انبیاء اور سردار رسل تھے، وہ قرآن کی زبان پر محض ایک عبد بندہ یاد کیے جا رہے ہیں، نہ خدا کے بیٹے اور اکلوتے بیٹے، نہ خدا کے مثل، نہ خدا کے بروز یا اوتار، نہ خدا کے وزیر یا مشیر، بلکہ محض عبد یا محض بندے! توریت میں خداوند کے خادم

کا لقب ایسے ہی اعزاز و اکرام کے موقع پر آیا ہے اور ابراہیم نبی، اسحاق نبی اور یعقوب نبی کو خداوند کا خادم ہی ٹھہرایا ہے۔

نَزَّلْنَا۔ یعنی جس کلام کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے بتدریج حسب ضرورت و مصلحت اُتارا ہے، شک و تردد کا ایک بڑا سبب یہی نزولِ تدریجی تھا، منکرین کہتے تھے کہ جس طرح اور شاعر سوچ سوچ کر شعر کہتے ہیں، یہ "رسول" بھی وقفوں کے ساتھ آیتیں گڑھتے رہتے ہیں، یا خدائی کلام ہوتا تو ایک بارگی سب کا سب نہ آ جاتا۔ (مظہری)

عَبْدِنَا سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ آپ عبدیت میں کامل اور احکامِ الٰہی کے پورے پورے مطیع و فرمانبردار تھے۔ (مظہری)

۲ک۵ (معانی کی بلندی، مطالب کی جامعیت، مضامین کی ندرت کے لحاظ سے)

قرآن مجید اپنی زبان کی فصاحت اور حسنِ انشاء کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر ہے، جیسا کہ بڑے بڑے ماہرینِ ادب تسلیم کر چکے ہیں، لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب یَاَیُّهَا النَّاس کے ماتحت سارے انسان ہیں، صرف قریش یا اہلِ عرب نہیں، اس لیے قرآن مجید کی بے نظیری کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کر دینا ہے، قرآن نے اپنی حقیقت خود بیان کر دی ہے وہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کتابِ ہدیٰ ہے، یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام نامہ یا مکمل، ہمہ گیر و ہمہ جہتی دستور العمل، اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں، سب ضمنی ہیں، وہ یہاں پیش اپنے اسی سب سے بڑے وصف کو کر رہا ہے اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک ایک سورہ کے اندر موجود ہیں، اب اگر تم اپنی متحدہ کوشش اور جدوجہد سے بھی اس کے مقابلہ کی کوئی چیز پیش کر سکتے ہو تو لا دکھاؤ۔

مِنْ مِّثْلِهٖ۔ مثلیت کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے:—

قل فأتوا بكتب من عند الله هو أهدى منهما أتبعه إن كنتم صدقين (قصص آیت ۴۹)

هو أهدى کے ایجاز میں سب کچھ آ گیا۔

من مثله کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کثرت سے مثله فی البلاغة اور حسنِ نظم کے منقول ہوئے ہیں لیکن اعجاز میں من وجه المعنى کا پہلو بھی اہلِ تحقیق سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ یعنی

مثل هذا القرآن حقا وصدقا لا باطل فيه ولا كذب۔ (ابن جریر عن قتادہ)

اور امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں متعدد پہلو اختیار کیے ہیں۔

بِسُوْرَةٍ۔ میں پورا قرآن نہ سہی، اس کا نصف یا ثلث بھی نہیں، اس کی کسی ایک سورۃ ہی کے برابر تم تصنیف کر دیکھو۔

(لفظ سورۃ پر حاشیہ شروع میں گزر چکا ہے)

من مثله۔ مِنْ بعض نے کہا تبعیض کے لیے ہے، بعض نے کہا ہے تبیین کے لیے ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ زائد ہے

من للتبعيض أو للتبيين وزائدة عند الأخفش (بیضاوی)

مثلہ میں ضمیر قرآن کی جانب ہے۔

ای من مثل القرآن (مجاز) الهاء كناية عن القرآن (معالم)

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے مقابلہ میں بلالو ۷۳ اگر تم سچے ہو ۷۴

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ

اور اگر تم (یہ) نہ کرسکو، اور ہرگز نہ کرسکو گے ۷۵ تو پھر اس آگ سے ڈرو ۷۶ جس کا

۷۳ شُهَدَآءَ میں شہداء سے عموماً مراد حامیوں اور ناصروں سے لی گئی ہے۔

یعنی اعوانکم ما استم علیہ (ابن جریر عن ابن عباس) معناہ اعوانکم ونصراءکم (قرطبی)

المراد من الشہداء اکابرھم او من یوافقہم فی انکار امر محمد علیہ السلام (کبیر) قیل انہ

اراد جمیع من یصدقکم ویوافقکم علی قولکم (جصاص)

لیکن اگر شہداء کے وہی لفظی معنی گواہ کے رکھے جائیں جب بھی مراد یہ ہوگی کہ ان لوگوں کو بھی بلا دیکھو، جو تمہارے اس دعوے کی کہ تم نے کسی قرآنی سورت کا جواب لکھ لیا ہے تصدیق کردیں۔

. . . ای ادعوا کل من تعتمدون علیہ یشھد لکم (المنار)

۷۴ (اپنے اس زعم وگمان میں کہ قرآن انسانی دماغ کی پیداوار ہے)

قرآن کا سیدھا سادہ دعوے یہ ہے کہ وہ انسان کا نہیں، خدا کا کلام ہے، اور اپنے اس دعوی پر دلیل اس نے کیسی قطعی، اور عوام وخواص دونوں کی سمجھ میں آجانے والی یہ پیش کردی ہے کہ اگر کوئی اسے امکانِ بشری کے اندر سمجھتا ہے تو ذرا اس کا ادنیٰ اور ہلکا ہی نمونہ سب کی متحدہ کوشش سے پیش کر دکھائے! قرآن کی اس تحدی کو اب چودہ سو سال ہوا چاہتے ہیں، اور دنیا جہان کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں بھی قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کی کتاب سے یکسر خالی ہیں۔

فقہاء مفسرین نے ان آیتوں سے نکالا ہے کہ دین میں دلائل کا استعمال بھی شامل ہے، اثبات توحید ورسالت پر مجرد دعوت وتصدیقِ خبر پر دین ختم نہیں ہوجاتا اس لیے کہ قرآن مجید نے دعوت دینے کے ساتھ ساتھ ان پر دلائل بھی قائم کیے ہیں۔

وقد تضمنت ھذہ الآیات مع ذکرنا من التنبیہ علی دلائل التوحید واثبات النبوۃ الامر باستعمال حجج العقول والاستدلال بدلائلہا وذلک یبطل من نفی الاستدلال بدلائل اللہ تعالیٰ واقتصر علی الخبر بزعمہ فی معرفۃ اللہ والعلم بصدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جصاص)

۷۵ (قیامت تک)

اللہ اکبر کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک اُمّی کی زبان سے، اپنی عقل وحکمت، اپنی زبان وادب، اپنے علوم وفنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا کیسا جوش اُس وقت بھی آیا ہوگا اور آج بھی آرہا ہے۔ ع

لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی!

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

ایندھن آدمی اور پتھر ہیں ۵۵ (اور) وہ کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے ۵۶

کتنے نئے نئے مسلک روز بہ روز پیدا ہو رہے ہیں، کیسی کیسی "ISM" ہر روز اٹھ رہی ہیں، یہ سب گویا قرآن کے جوابات ہی ہیں، ہر جواب ناکام اور شرمناک حد تک ناکام۔

۵۴ یہ دنیا کی نہیں دوزخ کی آگ ہوگی، وہ دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ تیز اور جلانے والی ہے، چنانچہ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ وہ اس سے ستر حصہ زیادہ تیز ہوگی، آخرت کے عذابِ آتشیں کا ذکر توریت میں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ ۳۳ : ۱۴ نیز ۶۶ : ۲۴۔

انجیل کی تعلیم تمام تر رافت و حلم، عفو و درگزر کی سمجھی جاتی ہے، لیکن آگ کے جہنم کا ذکر حضرت مسیحؑ کے ٹھنڈے مواعظ میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو متی ۱۸ : ۸ و ۹۔

فَاتَّقُوْا جوابِ شرط ہے اور حرف "ف" نتیجہ کو بتلا رہا ہے یعنی جب قرآن کی پیش کی ہوئی دلیل کے جواب سے عاجز آچکے ہو اور اپنے انکار پر کوئی دلیل خود رکھتے نہیں، تو اب انکارِ حق کیے چلے جانا بجز عناد و خبثِ نفس کے اور کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور جہنم کا عذابِ آتشیں اسی معاندانہ انکارِ حق کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے۔

۵۵ جہنم کی اصل غذا تو خود اہلِ کفر و شرک ہوں گے، سزا انھیں کو ملے گی، لیکن اس سزا میں اضافہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کی مورتیوں، ان کے ٹھاکروں کو بھی ان کے پہلو میں رکھ دیا جائے گا اور گویا ان سے کہا جائے گا کہ لو اب اپنے انھیں معبودوں سے کام لو جنھیں دنیا میں پوجتے رہے تھے، پتھر کی مورتیوں کو تو کوئی احساس ہوگا نہیں، البتہ ان کے پجاری یہ منظر دیکھ دیکھ کر اور زیادہ تڑپیں گے، جلیں گے، کلپیں گے، شرک اور مورتی پوجا میں تعلق بہت قدیم، بہت وسیع، بہت گہرا ہے، دنیا کی تقریباً ہر مشرک قوم نے بت پرستی بھی ضرور کی ہے، کلدانیہ، مصر، عرب، یونان، روم سب بت پرست رہ چکے ہیں اور ہندوستان کی بت پرستی تو مشہور ہی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

والمراد بها حجارة الاصنام والانداد التي كانت تعبد من دون الله (ابن كثير)

اراد بها الاصنام۔ (معالم)

جدید جاہلی متمدن و مہذب قوموں کا ذوقِ سنگ تراشی و مجسمہ سازی بھی بت پرستی سے کچھ بہت زیادہ دور نہیں۔

۵۶ یہیں سے اہلِ سنت نے یہ استنباط کیا ہے کہ جہنم کی اصل غایت کافروں ہی کی تعذیب ہے نہ کہ محض اہلِ فسق و عصیاں کی۔

اور اس مسئلہ کے ماخذ علاوہ احادیثِ نبوی کے قرآن مجید ہی کی متعدد آیات بھی ہیں، مثلاً لَا يَصْلٰهَآ إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (واللیل) والعذاب عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (النحل) وغیرہا۔

ہاں عارضی طور پر تادیب کے لیے اہلِ فسق و عصیاں بھی اس میں داخل کر دیے جائیں تو یہ اس حقیقت کے منافی نہیں۔

وكون الاعداد للكافرين لا ينافي دخول غيرهم فيها على جهة التطفل (روح)

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور ان لوگوں کو خوش خبری سنا دیجئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ۹۵ کہ ان کے لیے (بہشت کے) باغ ہیں کہ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ

ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی ۹۶ انھیں ان میں سے جب کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا

۹۵ (اے ہمارے پیغمبر!)

بَشِّرْ. گویا مومنین صالحین اس کے مستحق ہیں کہ مخاطب انھیں مبارک باد پہنچائے اور اس میں ان لوگوں کی تکریم زائد ہے بہ مقابلہ اس کے کہ انھیں براہ راست خود ہی بشارت دے دی جاتی۔

اٰمَنُوْا. یعنی توحید و رسالت پر ایمان لے آئے۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ. یعنی عمل مطابق شریعت اسلام کئے۔ "نیک عمل" کے سمجھنے میں بہتوں کو دھوکا ہوا ہے اور یہ مغالطہ آج کل عام ہو گیا ہے، سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق چیزیں ہیں اور پھر اس مفروضہ کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو لیکن ایمان سے یکسر محروم ہو، حالانکہ یہ تخیل ہی سر تا سر غلط ہے، نیکی ایمان سے الگ نہیں، ایمان ہی کی عملی شکل کا نام ہے، ایمان جب تک قلبی ہے ایمان ہے، اگر قولی لسانی ہے تو اسلام ہے، اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسن عمل، حسن کردار، یا عمل صالح پڑ جاتا ہے اور حسن عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر ایسی پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبۂ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں تو وہ نیکی نہیں، نیکی کی صرف صورت ہے، نیکی کی صرف نقل ہے اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں، اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہو سکتا، عمل نیک کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطۂ شریعت کے موافق ہو۔

فقہاء مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں اٰمَنُوْا اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ دو الگ الگ چیزیں بیان ہو رہی ہیں، دونوں کے درمیان عطف ہے اور معطوف، معطوف علیہ کے علاوہ ہوتا ہے، یہ دلیل ہے اس گروہ کے خلاف جو ایمان اور عمل صالح کو مترادف سمجھتا ہے۔

والاٰیة حجة علی من جعل الأعمال ایمانا لأنه عطف الأعمال الصالحة علی الایمان والمعطوف غیر المعطوف علیه (مدارک)

۹۶ یہ عالم آخرت کے انعام کا بیان ہے، جنت کے انعامات اس قسم کے جتنے بھی بیان کیے گئے ہیں، سب عمومی اور اکثری کے حکم میں داخل ہیں، حصر اور کلیہ کی صورت میں نہیں، چنانچہ عموماً انسان کو لطف دریا اور باغ میں ملتا ہے، اس لیے اس کے لیے یہ سامان آخرت میں موجود ہو گا، لیکن بالفرض کوئی شخص ایسا ہے جسے بجائے سبزہ و گلزار کے دشت و ریگستان پسند ہے تو جنت میں یہ سامان مہیا ہوتے بھی دیر نہ لگے گی، آیت سے معلوم ہوا کہ بشارت جنت کے استحقاق کے پورے اسباب ایمان اور عمل دونوں وصف ہیں۔

قَالُوۡا هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ

تو وہ بول اٹھیں گے اشہ کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں (اس کے) قبل مل چکا ہے ۲شہ اور انھیں وہ (وہاں) دیا ہی جائے گا ملتا جلتا ہوا ۳شہ

لَهُمۡ میں "ل" استحقاق کا ہے یعنی اہل جنت ان نعمتوں کو اپنے حق سے پائیں گے اور استحقاق سے مراد استحقاق ذاتی نہیں بلکہ استحقاق بربنائے وعدۂ الٰہی۔

واللام فی لھم تدل علی استحقاقھم ایاھا لاجل ما ترتب علیه من الایمان والعمل الصالح (بیضاوی) ولام الجر للاستحقاق ولا استحقاق بالذات فھو بمقتضی وعد الشارع الذی لا یخلفه فضلا وکرما (روح)

جنّٰت۔ جنت کے لفظی معنی سطلق گھنے باغ کے ہیں لیکن قرآن مجید میں جس جنت کا وعدہ مومنین صالحین سے ہے وہ مخصوص دائمی باغ ہیں جو آخرت میں ملیں گے۔

اشہ (فرط مسرت وانبساط سے)

خوب خیال کر لیا جائے کہ اسلام نے جس جنت کا نقشہ پیش کیا ہے وہ مادی وروحانی دونوں ہی قسم کی نعمتوں راحتوں لذتوں کا مجموعہ ہوگی، یہ نہ ہوگا کہ جسمانی اور حواس کی مسرتیں وہاں حذف کر دی جائیں جس طرح اس دنیا میں انسان نام ہے جسم وروح کے مجموعہ کا جنت میں بھی اُسے جسمانی تقاضوں اور روحانی مطالبوں دونوں کی آسودگی نصیب ہوگی۔

مِنۡهَا میں پہلا مِنۡ، من الجنات کے معنی میں ہے اور دوسرا مِنۡ تبعیضیہ ثَمَرَةٍ کی تفصیل کے لیے۔

من الاولی للابتداء والثانیة للتبعیض (المنار)

۲شہ (دنیا میں یا جنت میں)

یعنی جنتیوں کو جب کوئی پھل پھلاری کھانے میں آئے گا تو انھیں پہلا مزہ بھی تازہ ہو جائے گا اور اس کی شکل دیکھتے ہی وہ بول اٹھیں گے کہ ارے یہ تو وہی لذیذ میوہ ہے جس کا مزہ ہمیں خوب یاد ہے۔

مِنۡ قَبۡلُ۔ یہ قبل والے پھل دنیا کے باغوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور جنت کے باغوں کے بھی اہل تفسیر سے دونوں منقول ہیں، ماحصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی اہل جنت میں شوق آفرینی ورغبت افزائی۔

یعنی فی الدنیا وقیل یعنی فی الجنة (قرطبی) فیھا وجھان الاول انه من ارزاق الدنیا والثانی ان المشبه به رزق الجنة ایضاً (کبیر) ای من قبل ھذا فی الدنیا جعل ثمر الجنة من جنس ثمر الدنیا لتمیل النفس الیه أو فی الجنة لأن طعامها متشابه فی الصورة کما حکی ابن کثیر عن الحسن (بیضاوی)

یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ دنیا میں تو انسان کے لیے اکل وشرب ایک ضرورت طبعی کی چیز ہے بدل ما یتحلل کے لیے زندگی قائم رکھنے کے لیے۔ جنت میں اس قسم کی کوئی ضرورت ظاہر ہے کہ باقی نہ رہے گی، وہاں جنتیوں کا کھانا پینا جو کچھ بھی ہوگا محض لذت حاصل کرنے کے لیے۔

۳شہ یعنی یہ تشابہ محض اہل جنت کے خیال کے مطابق نہ ہوگا واقعۃً ونفس الامر میں بھی یہی ہے یہ تشابہ کس سے

وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿٢٥﴾

اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی ٨٦ اور وہ (ان بہشتوں) میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے ٨٧

ہوگا، بعض نے کہا کہ دنیا کے پھل پھلاریوں سے اور بعض کا قول ہے کہ جنت ہی کے میوے ایک دوسرے سے مشابہ ہوں گے، لیکن اگر دنیا ہی کے پھلوں سے تشابہ مُراد لی جائے تو یہ لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ یہ تشابہ بہت صرف صوری اور ظاہری ہی ہوگی ورنہ اصل لذت، ذائقہ، خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے جنت اور دنیا کی نعمتوں میں آسمان و زمین کی نسبت ہے، چنانچہ محققین نے کہہ دیا ہے کہ دونوں میں اشتراک صرف نام کا ہوگا۔

ليس في الدنيا مما في الجنة الا الأسماء (ابن جرير عن ابن عباس)

بعض اہلِ لطائف و اسرار نے آیت سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ اسی دنیا کے اعمالِ حسنہ جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کی شکل و شکل اختیار کرلیں گے اور اہلِ جنت کو اپنے حسناتِ دنیوی اور ان کے ثمراتِ اُخروی کے درمیان ایک خاص تشابہ و تناسب محسوس ہوگا۔

أي هذا الذي وعدنا به في الدنيا جزاء على الايمان والعمل الصالح (المنار)

٨٦ خوب پاک صاف ہر طرح اور ہر اعتبار سے جسم کی، روح کی، ہر ممکن گندگی اور آلودگی سے ستھری، پاکیزہ۔

مطهرة من القذر والأذى (ابن جرير عن ابن عباس) قيل مطهرة من مساوى الاخلاق (معالم) فالمراد طهارة أبدانهن وطهارة ازواجهن من جميع الخصال الذميمة (كبير) و التطهير يستعمل في الأجسام والأخلاق والأفعال (بيضاوى) ومن كل قذر ومن كل أذى يكون من نساء الدنيا فطهر مع ذلك باطنها من الاخلاق السيئة والصفات المذمومة (ابن القيم)

مُطَهَّرَةٌ میں طاہرة سے زور اور قوت زیادہ ہے۔

ولم يقل طاهرة لأن مطهرة ابلغ لانها تكون للتكثير (مدارك)

بعض روشن خیالوں کو پاکیزہ بیویوں کے نام سے خدا معلوم کیوں اتنی شرم آئی کہ انھوں نے اس معنی ہی سے انکار کر دیا اور اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کی تفسیر عجیب توڑ مروڑ کر کی ہے، گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت و راحت کے موقع پر بیویاں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا بڑے ہی شرم و ندامت کی بات ہے! جنت کے نفس وجود ہی سے اگر کسی کو انکار ہے، جب تو بات ہی اور ہے ایسے مخاطب کے سامنے پہلے جنت کا اثبات کیا جائے گا لیکن اگر جنت کا اقرار ہے تو پھر وہاں کی کسی لذت، کسی نعمت، کسی راحت سے انکار کے کوئی معنی نہ نقل کے لحاظ سے صحیح ہیں، نہ عقل کے اعتبار سے۔ جنت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ مادی اور روحانی ہر قسم لذتوں، مسرتوں، راحتوں کا گھر ہوگا۔ یا پھر یہ ہے کہ بیوی کے نعمت اور اعلیٰ نعمت ہونے ہی سے انکار ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس عقیدہ کا رشتہ اسلام سے کہیں زیادہ رہبانیت اور مسیح کی لائی ہوئی نہیں پولوس کی پھیلائی ہوئی مسیحیت سے وابستہ ہے، زوجیت جب دنیا میں اللہ کا ایک اعلیٰ انعام ہے تو آخر جنت میں کس جرم میں اس سے محرومی ہو جائے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی، مادی، حسی خصوصاً ازدواجی نعمتوں کو حقیر سمجھنا یا ان سے شرمانا تمام تر جاہلی مذہبوں خصوصاً

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ

اللہ اس سے ذرا نہیں شرماتا ۵۹

پولسی مسیحیت سے دماغی مرعوبیت کا نتیجہ ہے اسلام تو حسی اور معنوی، مادی اور روحانی جسمانی اور عقلی ہر قسم کی نعمت کی قدر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسی خشک لذت جس میں کوئی شائبہ نہ لامسہ کا ہو نہ باصرہ کا نہ ذائقہ کا نہ سامعہ کا اور صرف اسی پر قانع رہنا کمال نہیں نقص ہے، ہنر نہیں عیب ہے اور معلوم ہے کہ نقص و عیب جنت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ عمل زوجیت سے ایک دوسرا مقصود جو دنیا میں حاصل ہوتا رہتا ہے یعنی بقائے نوع یا افزائش نسل، وہ تو جنت میں موجود نہ ہوگا، غذا کی طرح صحبت کی نفس لذت ہی وہاں مقصود رہ جائے گی۔

۵۸ سب سے بڑی اور آخری بات جنت کے سلسلے میں یہ فرما دی گئی کہ اس کی لذتیں اور مسرتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں اور داخلۂ جنت کے بعد زوال عیش کا امکان ہی نہیں، دنیا کی بڑی سے بڑی لیکن کیسی فانی اور عارضی نعمتیں اس کے سامنے تصور میں بھی لائی جا سکتی ہیں؟

خٰلِدُوْنَ۔ خلود کے معنی ایسی حالت میں رہنے کے ہیں جس میں کبھی تغیر اور خرابی نہ پیدا ہو۔

الخلود هو تبري الشيء من اعتراض الفساد وبقاؤه على الحالة التي هو عليها (راغب)

اور جب اس کا ذکر جنت واہل جنت کے سیاق میں آئے گا تو معنی یہ ہوں گے کہ اس حالت لذت و نعمت کو دوام ہوگا اور وہ کبھی فنا نہ ہوگی۔

فلا اخر له ولا انقضاء بل في نعيم سرمدي ابدي على الدوام. (ابن کثیر)

اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد وہ حالت ہے جسے کبھی فنا نہیں ابدی، سرمدی زندگی۔

وفي الشرع الدوام الابدي اي لا يخرجون منها ولا هي تفنى بهم فيزو لوا بزوالها.

واسماهي حياة ابدية لا نهاية لها. (اسمار)

۵۹ (جیسا کہ بعض کج فہم اور معاند معترضین کے خیال میں شرمانا چاہیے)

لَا يَسْتَحْيِ۔ یہ لفظ ممکن ہے کہ خود معترضین طاعنین نے استعمال کیا ہو کہ یہ کیسا محمد کا خدا ہے جو ایسی حقیر چیزوں کو پیش کرتے بھی نہیں شرماتا اور قرآن مجید نے جواب میں بہ رعایت مشاکلت اس لفظ کو دہرا دیا ہو۔

يجوز ان تقع هذه العبارة في كلام الكفرة فقالوا اما يستحي رب محمد ان يضرب مثلا بالذباب والعنكبوت فجاءت على سبيل المقابلة واطباق الجواب على السؤال وهو حق من كلامهم وطراز عجيب. (کشاف)

قرآن مجید میں اپنے اپنے موقع اور محل پر تذکرہ بڑی سے بڑی مخلوق کا بھی آیا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی کا بھی جانوروں میں ایک طرف ہاتھی اونٹ، شیر کا، اور دوسری طرف چیونٹی، مکھی اور مچھر کا، اسی تذکرہ پر بعض معاصر نافہموں نے کہنا شروع کیا کہ واہ دعویٰ تو کلام الٰہی ہونے کا، اور مضامین اس کے اندر ایسے حقیر اپنا فہم

اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کہ مثال بیان کرے مچھر تک کی یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور چیز کی) ۵۵ سو جو لوگ ایمان لائے

اور کم عقل معترضین بعض روایتوں میں آتا ہے کہ یہود تھے بعض میں ہے کہ مشرکین تھے بعض میں ہے کہ منافقین عجب نہیں کہ تینوں ہوں

نزلت فی الیھود (روح عن ابن عباس) نزلت فی المنافقین (روح عن مجاھد) والقول الثالث

ان ھذا الطعن کان من المشرکین قال القفال الکل محتمل ھٰھنا۔ (کبیر)

بہرحال وہ جو کوئی بھی ہوں اتنی موٹی سی بات ان کی سمجھ سے باہر تھی کہ چیزیں چھوٹی یا بڑی تو انسان کی نسبت سے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ کے نزدیک تو بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی سب یکساں ہے۔

۵۵ (کسی دینی حقیقت کی توضیح کے لیے)

مثال کی غایت ہی یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو ذہن کے سامنے زیادہ کھول کر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لے آئے اب یہ مقصد جس مثال سے پورا ہو سکے اسی کو بہترین کہا جائے گا، خواہ وہ چیز جو مثال میں پیش کی گئی ہے بجائے خود کیسی ہی ہو، مچھر بظاہر ایک بہت حقیر اور بے حقیقت سی مخلوق ہے اب جہاں مخلوق کی بے حقیقتی بیان کرنا ہو گی وہاں موزوں مثال ظاہر ہے کہ مچھر ہی کی ہو گی، پھر اس پر اعتراض کرنا کیسی سفاہت کی دلیل تھی، امام رازی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ صناع عالم اور خلاق عالم کی بنائی ہوئی کوئی شے بھی درحقیقت حقیر و بے حقیقت نہیں، بلکہ جو چیز بظاہر جتنی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہو گی اسی قدر اس کا بیان کمال علم، کمال اطلاع، اور کمال حکمت پر اور زیادہ دلالت کرے گا۔

مَثَلًا مَّا۔ مثل کا لفظ خود نکرہ تھا، مَا کے اضافہ نے اس کے وصف تنکیر کو اور بڑھا دیا، بلکہ اسے درجۂ ابہام تک پہنچا دیا، چنانچہ بعض اہل نحو کی اصطلاح میں مَا ابہامیہ ہے۔

مَا ھذہ ابھامیۃ وھی التی اذا اقترنت باسم نکرۃ ابھمت ابھاما وزادتہ شیاعا وعموما کقولک اعطنی کتابا ما ترید ای کتاب کان۔ (کشاف)

مَا حرف زائد کہا گیا ہے تاکید کلام کے لیے ہے۔

ما توکید للکلام من حروف الزوائد (مجاز) قال الزجاج ما حرف زائد للتوکید عند جمیع البصریین (مغنی) وقال ابن فارس وکثیر من علماء نا ینکرون زیادۃ ما ویقولون لا یجوزان یکون فی کتاب اللہ جل عزہ حرف یخلو من فائدۃ ولھا تاویل یجوزان یکون جنسا من التاکید (تاج)

فَمَا فَوْقَهَا۔ یعنی مچھر سے بھی بڑھ کر ہو اپنے جثہ کے صغر یا ظاہری بے حقیقتی کے اعتبار سے۔

مما فوقھا فی الصغر (راغب) اراد مما فوقھا فی الصغر والمحققون مالوا الی ھذا القول (کبیر) مادونھا فی الصغر والحقارۃ وھذا قول الکسائی وابی عبیدۃ قالہ الرازی واکثر المحققین (ابن کثیر) ای فما تجاوزہ وزاد علیھا فی المعنی الذی ضربت فیہ مثلا وھو القلۃ والحقارۃ (کشاف) یقال فلان فی اللوم والدناءۃ ای ھو اکثر لوما ودناءۃ منہ وکذا اذا قیل ھذا فوق ذلک فی الصغر وجب ان یکون اکثر صغرا منہ (ابو البقاء)

فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا

وہ تو یہی سمجھیں گے کہ وہ (مثال) یقیناً حق ہے ان کے پروردگار کی جانب ۴۸ البتہ جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے

أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا

ہیں وہ یہی کہتے رہیں گے ۴۹ کہ اللہ کا اس مثال سے مطلب کیا تھا ۵۰ گمراہ بھی کرتا ہے بہتوں کو اسی ۵۱

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں اصل ہے اس عادت صوفیہ کی کہ مثال لانے میں حیا عرفی کی پروا نہیں کرتے

۴۸ (اور اپنے مقصود وغایت اور توضیح مراد میں بالکل کافی ووافی)

أَنَّهُ میں ضمیر مَثَل کی طرف راجع ہے۔

هذا المثل (ابن کثیر عن ابی العالیہ) المثل هو (معالم) والضمیر للمثل. (کشاف)

دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر خود قرآن کی طرف راجع ہے۔

ای یعلمون انہ کلام الرحمٰن وانہ من عند اللہ (ابن کثیر عن قتادۃ)

أَمَّا حرف أَمَّا آغاز کلام میں لے آنے سے فقرے میں قوت اور تاکید کی زیادتی ہو جاتی ہے۔

حرف فیہ معنی الشرط ولذالک یجاب بالفاء وفائدتہ فی الکلام ان یعطیہ فضل توکید (کشاف) قال سیبویہ اما زید فذاهب معناہ مهما یکن من شیء فزید ذاهب ای هو ذاهب لا محالۃ فانہ منہ عزیمۃ (بیضاوی) توکید ما صدر بہ (ابو سعود)

۴۹ (استفہاماً نہیں، طنز وتعریض کی راہ سے)

۵۰ یعنی وہ اسی میں الجھے رہیں گے کہ ایسی مثالوں سے حاصل کچھ بھی نہیں۔ ھذا کے لفظ میں ایک پہلو تحقیر واہانت کا ہے۔

وفی قولهم ماذا اراد اللہ بهذا استحقار (بحر) وفی هذا استحقار واسترذال (بیضاوی)

اردو روزمرہ کے مطابق ھذا مثلاً کا ترجمہ ہوگا "ایسی ویسی مثال سے"۔

۵۱ (اپنے قانون تکوینی کے مطابق)

اللہ کو خالق شر ماننے میں دنیا کے مذہبوں کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئی ہیں چنانچہ انھیں سے بچنے کے لیے ایک دوسرا خالق شر بھی فرض کر لیا گیا ہے، لیکن اس دشواری کی اصل یہ ہے کہ خیر کی طرح شر کا بھی کوئی ایجابی یا مثبت وجود فرض کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ شر تو اشیائے کائنات کے، موجودات عالم کے، اور اپنے قویٰ کے صرف غلط و ناجائز طریق استعمال کا نام ہے۔ خالق کائنات نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے، مختلف راہوں میں سے ایک کے انتخاب کی اور اسی کا نام ارادہ ہے چنانچہ انسان جب اپنے ہی ارادہ واختیار سے غلط کام لے کر غلط راہ کا انتخاب کرتا ہے تو اسی کو شر میں مبتلا ہو جانا کہتے ہیں۔ اللہ علاوہ احکم الحاکمین، مالک الملک اور آخری اور اصلی قانون ساز ہونے کے تکوینی حیثیت سے ہر شے کا آخری مسبب الاسباب بھی تو ہے، وہ بدی کا خالق صرف اسی معنی میں ہے، جس معنی میں زہر کا، زہریلے جانوروں کا، خونخوار درندوں کا خالق ہے۔

وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲۶)

اور راہ بھی دکھاتا ہے بہتوں کو اسی سے ۹۲ اور وہ گمراہ کسی کو (بھی) اس سے نہیں کرتا بجز بے حکمی کرنے والوں کے ۹۳

يُضِلُّ بِهٖ کے معنی صرف اسی قدر ہیں کہ بندہ جب اپنی رائے اور ارادہ سے گمراہی اختیار کرنے لگتا ہے تو حق تعالیٰ اس کا بھی سامان بہم پہنچا دیتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ سامان تو اکٹھے ہو جائیں اور نتیجہ نہ برآمد ہونے دے۔

بِهٖ یعنی اس سے اور اسی طرح دوسری قرآنی تمثیلات سے۔ ضمیر کا مرجع مَثَلًا ہے

الضمير في به للمثل (روح) اى يضل بالمثل او بالكلام المضروب فيه المثل (المدارك)

كَثِيْرًا۔ بہتوں کو۔ یہ "بہت" وہ ہیں جو اپنی قوتِ فکر و نظر سے صحیح کام نہیں لیتے اور اس لیے اپنے ارادہ سے کفر و ضلالت اختیار کیے رہتے ہیں حق تعالیٰ کی رضا کو ان کے کفر میں ذرا بھی دخل نہیں۔

۹۲ (اللہ اپنے اسی قانونِ تکوینی کے مطابق) بِهٖ ضمیر کا مرجع یہاں بھی مَثَلًا ہے۔

كَثِيْرًا۔ یہ "بہت" وہ ہیں جو اپنی قوتِ فکر و نظر سے صحیح کام لیتے رہتے ہیں، مومنین مہتدین کا شمار گو کا فرین مضلین کے مقابلہ میں کمتر ہو پھر بھی بجائے خود ایک بہت بڑی تعداد میں ہے اور اسی لیے کثیر کا لفظ اس کے لیے بھی آیا ہے۔

۹۳ آیت نے خود اس مضمون کو صاف کر دیا کہ گمراہی تو انھیں کے حصہ میں آتی ہے جو خود گمراہ رہنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ گمراہی کسی پر چپک نہیں دیتا، بار بار کی ارادی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے انسان کا نور مجہ کر رہ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ اس کے برعکس باطل اور ناحق پر جمود پیدا ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ کا خاتمہ کفر و انکار پر ہوتا ہے۔

فِسق کہتے ہیں احکام سے تجاوز کر جانے کو اور فاسق وہ ہے جو دائرۂ اطاعت سے باہر نکل جائے

الفسق العصيان والترك لأمر الله عزّ وجلّ والخروج عن طريق الحق (لسان) المنافق والكافر سمّيا فاسقين لخروجهما عن طاعة ربّهما. (ابن جرير)

ائمۂ لغت نے کہا ہے کہ فاسق کے استعمال کی مثال عربی میں اسلام سے قبل عہدِ جاہلیت میں نہیں ملتی فیروز آبادی کا قول ہے:

ليس في كلامهم ولا شعرهم فاسق على انه عربي (قاموس)

اور ابن الاعرابی نے کہا ہے۔

لم يسمع في كلام الجاهلية ولا في شعرهم فاسق هذا عجب وهو كلام عربي (لسان)

فسق بحیثیت فعل کے بے جان چیزوں کے سلسلہ میں ضرور استعمال میں تھا، لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال انسان کے لیے قدیم کلام عرب میں نہیں ملتا۔

لم يسمع الفاسق في وصف الانسان في كلام العرب (راغب عن ابن الاعرابي)

جس اصطلاحی معنی میں اس کا استعمال اب عربی بلکہ اردو میں عام ہے اس میں یہ تمام تر ایک اسلامی لفظ ہے اور ان چند لفظوں میں سے ہے جو قرآن نے آ کر عربی زبان کو دیے۔

لا يعرف اطلاقها على هذا المعنى قبل الاسلام. (تاج)

الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ ۪ وَ یَقۡطَعُوۡنَ

جو اللہ سے اپنے معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑتے ہیں ۹۴ اور جس چیز کو اللہ نے

مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ

حکم دیا تھا جوڑے رکھنے کا اُسے کاٹتے ہیں ۹۵ اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ۹۶

جاہلی عربی کی طرح آج انگریزی زبان بھی باوجود اپنی اتنی وسعت کے حلّت، حرمت، طہارت، تقوی کے دائرہ کے بہت سے الفاظ سے محروم ہے۔ ع۔ ایں حدیثے را بیانِ دیگر است۔

۹۴ عَهۡدَ اللّٰهِ۔ یعنی معاہدۂ طاعت کو عہدِ ایمان کو توحید کے جانتے فطری کو اقرارِ توحید ربوبیت تو ایسا سیدھا سادہ صاف مسئلہ ہے کہ ہر انسان کی فطرتِ سلیم اس عقیدہ پر گواہ ہے، نافرمان و فاسق خود اپنی اس فطرتِ سلیم سے اقرارِ فطری سے بغاوت کرتا رہتا ہے اور اسی لیے یہاں فاسقین کے تحت میں ہر قسم کے اہل کفر آ گئے۔

عنی بهذه الآیة جمیع اهل الكفر والشرك والنفاق وعهده الی جمیعهم فی توحیده ماوضع لهم من الأدلة الدالة علی ربوبیته۔ (ابن کثیر)

مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ۔ اس عہدِ فطرت کی توثیق ہر دور اور ہر زمانہ میں پیغمبروں کی تعلیمات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے۔

والمراد به ماوثق الله به عهده من الآیات والكتب (بیضاوی)

۹۵ آیت کے وسعتِ مفہوم میں سارے حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہیں یعنی وہ سارے فرائض جو ہر انسان پر خالق و مخلوق دونوں سے متعلق عائد رہتے ہیں۔

ان یوصل من الایمان والارحام (ابن جریر عن ابن عباس) صلة الارحام والقرابات وقیل المراد اعم من ذلك۔ (ابن کثیر)

امام رازیؒ نے ایک معنی یہ بھی کیے ہیں کہ حکم الٰہی تو مومنین کے ساتھ رشتہ جوڑے رکھنے کا ہے یہ اہلِ فسق اپنا رشتہ کافروں سے جوڑ لیتے ہیں۔

۹۶ (اپنے عقائدِ کفریہ باطلہ سے)

اس فساد کے اندر روحانی، مادی ہر قسم کے مفسدے شامل ہیں، اسلام کی حقیقت ہی چونکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے اور ایک ہمہ گیر نظامِ حیات اس لیے اس سے اعراض و انحراف کے کھلے ہوئے معنی یہی ہیں کہ کسی ناقص دستورِ زندگی اور چھوٹے نصب العین کو قبول کر لیا ہے اور اس ناقص پروگرام کا لازمی نتیجہ ہے انفرادی انتشار اور اجتماعی اختلال

والاظهر ان المراد منه الصد عن طاعة الرسول علیه الصلوٰة والتسلیم لان تمام الصلاح فی الارض بالطاعة۔ (کبیر)

مشاہدہ ہے کہ آج دنیا اتنی ترقیوں اور علمی کمالات کے باوجود کیسی کیسی مصیبتوں میں بھٹک رہی ہے انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اور یہ صلاح و فلاح سے محرومی نتیجہ ہے اسلامی زندگی کو گم کر دینے کا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا

بس یہی لوگ تو ہیں گھاٹے میں رہنے والے ۹۷ تم لوگ کس طرح کفر کر سکتے ہو اللہ سے ۹۸ درانحالیکہ تم بے جان تھے ۹۹

فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾

سو اس نے تمہیں جاندار کیا ۱۰۰ پھر وہی تمہیں موت دے گا ۱۰۱ پھر وہی تمہیں زندہ کریگا ۱۰۲ پھر اسی کی طرف تم واپس کیے جاؤ گے ۱۰۳

۹۷ اس نقصان میں خسارۂ عاجل بھی شامل ہے اور خسارۂ آجل بھی عاجل اس لحاظ سے کہ عدمِ ایمان سے دلوں سے سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے اور قوم و افراد قوم طرح طرح کی بد اخلاقیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور آجل اس اعتبار سے کہ آخرت میں ہر نعمت سے محروم رہنا ہے گی۔

مغبونون بذهاب الدنيا والآخرة۔ (ابن عباس)

۹۸ (اے کافرو اور منکرو!)
یعنی کفر و انکار کی جرأت و ہمت کس طرح رکھتے ہو؟ سوال سے مقصود اُن کی جسارت پر اظہار تعجب ہے۔
على وجه التعجب (ابن عباس) فالمراد به التبكيت والتعيير على وجه التعجب والتوبيخ لا على استفهام المجمل (معالم) اخرج مخرج التعجب (ابو البقاء)
لفظ کیف کا استعمال قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی حق تعالیٰ کے سلسلہ میں آیا ہے سیاق ہمیشہ تنبیہ یا توبیخ ہی کا رہا ہے۔
وكل ما اخبر الله تعالى بلفظة كيف عن نفسه فهو استخبار على طريق التنبيه للمخاطب او توبيخا۔ (راغب)

۹۹ (صلب پدر میں)
یعنی ابھی تمہاری تشکیل ہوئی بھی نہ تھی۔
بیان خلقتِ انسانی کا ہو رہا ہے کہ انسان پر تکوین کے مختلف دور گزرتے رہتے ہیں۔

۱۰۰ (رحم مادر میں)
نعمتوں میں سب سے مقدم صفتِ حیات ہے کہ دوسری ساری نعمتوں سے استفادہ اسی کے بعد ممکن ہے اس لیے ذکر میں بھی اُسے یہاں سب سے مقدم رکھا۔

۱۰۱ یعنی جسد کو بے روح کر دے گا اس دنیوی مدتِ زندگی کے خاتمہ پر۔
سبق توحیدِ کامل کا مل رہا ہے کہ خلق، احیاء، افناء سب قوتیں باری تعالیٰ ہی کی ہیں یہ نہیں جیسا کہ بعض مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ موجد و خالق کوئی ایک ہیں برہما کے نام سے اور قائم و باقی رکھنے والے کوئی دوسرے ہیں وشنو کے نام سے اور موت و ہلاکت لانے والے ایک تیسرے ہیں شیو کے نام سے۔

۱۰۲ (حشر میں)
حشر کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں ہے کہ بغیر وقوع حشر کے اس محدود و مختصر زندگی میں نظامِ عدل کا تحقق ممکن ہی نہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ

وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا ۱۳۶

۱۳۵ (نہ کہ کسی اور کی طرف حساب و کتاب کے لیے)
انسان کو جزا و سزا اور اعمال کی جواب دہی کے لیے براہ راست اللہ تعالیٰ ہی کے حضور میں پیش ہونا ہے اس کیا رد ہو گیا مسیحی مشرکوں کے اس عقیدہ کا کہ حشر میں پیشی مسیح ابن اللہ کے حضور میں ہوگی، اس ایک آیت میں پورا بیان خلقتِ انسانی کا آگیا کہ انسان پہلے بے جان ہوتا ہے پھر اس میں روح سے جان ڈالی جاتی ہے اور ایک مدت متعین پر روح کے نکل جانے کے بعد وہ پھر بے جان ہو جاتا ہے اور آخری بار حشر میں از سرِ نو زندہ کیا جائے گا۔
۱۳۶ خطابِ عام نوعِ انسانی سے ہے، ان سے ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ تم تو خود ہی ساری کائناتِ ارضی کے مقصود و مطاع ہو پھر کیسی حماقت ہوگی کہ تم اور کسی مخلوق کو مقصود و مطاع بنا لو، آیت ہر قسم کے شرک ہر قسم کی مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دینے کے لیے کافی ہے اس فرشِ زمین پر جو کچھ بھی ہے سب انسان ہی کے لیے ہے، نہ یہ کہ انسان کسی اور مخلوق کے لیے ہو، شرک انسان اس فطری اور قدرتی ترتیب کو الٹ دیتا ہے، حدیث نبوی کا یہ ٹکڑا جو مسلمان ہر جمعہ کو خطیب کی زبان سے سنتا ہے کہ انما الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ (دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم پیدا کیے گئے ہو آخرت کے لیے) اسی مفہوم کا ترجمان ہے اور خلیفۃ اللہ کی بیشک یہی شان ہونا چاہئے سب کچھ اس کے لیے ہو اور وہ خود خدا کے لیے ہو، وہ جس چیز کو جس طرح بھی چاہے اپنے تصرف میں لائے اور اس کا جواب وہ صرف اپنے مالک و خالق کے سامنے ہو، مرتبۂ انسانی کا یہ شرف و احترام اسلام ہی کا قائم کیا ہوا ہے، ڈارون کے ترقی یافتہ بندر نے مذہب کو اس رتبہ و مقام سے کیا واسطہ، ارتقاء کائنات کا اصل اصول بالکل صحیح مان لیا جائے جب بھی اس کی ڈارونی تعبیر کی گمراہی تو بدستور رہے گی۔
لَكُمْ یعنی تمہارے ہی نفع کے لیے۔

ای لاجلکم ولانتفاعکم به فی دنیاکم ودینکم (کشاف) هو یدل علی ان المذکور بعد قوله خلق لاجل انتفاعنا فی الدین والدنیا (کبیر)

فقہاء نے آیت کے الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ زمین پر جو کچھ بھی انسان کے نفع کے لیے پیدا کیا گیا ہے اصلاً ان پر حکم اباحت ہی کا ہے، تا وقتیکہ کوئی دلیل عقلی ان کے منع یا حرمت پر نہ قائم ہو۔

وقد استدل الکرخی، وابوبکر الرازی والمعتزلة بقوله "خلق لکم" علی ان الاشیاء التی یصح ان ینتفع بها خلقت مباحة فی الاصل (مدارک) هی نص الدلیل القطعی علی القاعدة المعروفة عند الفقهاء ان الاصل فی الاشیاء المخلوقة الاباحة والمراد اباحة الانتفاع بها اکلا وشربا ولباسا وتداویا وادراکا وزینة (المنار)
اَلْاَرْض سے مراد لازمی طور پر زمین ہی نہیں بلکہ مطلق سمتِ سفلی بھی مراد ہو سکتی ہے جس طرح السماء سے مراد مطلق سمتِ علوی ہو سکتی ہے۔

ارید جهة السفل کما یراد بالسماء جهة العلو (بیضاوی) ان اراد بالارض الجهات السفلية دون الغبراء کما تذکر السماء وترادا الجهات العلوية جاز ذلك (کشاف)

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۹

پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی ۵۰؎ اور انہیں سات آسمان درست کر کے بنا دیئے ۵۱؎ اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

جَمِیْعًا. ان سب میں گنگا جی بھی شامل ہیں اور نربدا، پربت بھی، گئو ماتا بھی اور ہنومان جی بھی، حجر پرستی، شجر پرستی، دریا پرستی ــــــ کوہ پرستی، ناگ پوجا وغیرہ مخلوق پرستی اور مظاہر پرستی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب بے معنی اور ننگ انسانیت ہیں۔

۵۰؎ لفظ ثُمَّ سے یہ لازم نہیں آتا کہ آفرینش اَرْض وَمَا فِی الْاَرْض کے بعد تسویۂ سما ہوا ہے۔ ثُمَّ کا استعمال عام ہے محض فرق زمانی ظاہر کرنے کو، دو علیحدہ زمانے ظاہر کرنے کو، نہ کہ لازمی طور پر تقدیم و تاخیر ظاہر کرنے کو۔

ثم لعله لتفاوت ما بين الخلقين لا للتراخي في الوقت فانه يخالفه ظاهر (بیضاوی) ثم ليس للترتيب ههنا وانما هو على جهة تعديد النعم (کبیر)

سَمَآء. واحد اور جمع دونوں کے معنی میں آتا ہے۔

يستعمل للواحد والجمع. (راغب)

چنانچہ یہاں لفظاً واحد ہے لیکن معنًی جمع ہے کہ جنس سما کے معنی میں ہے۔

والسماء ههنا اسم جنس (ابن کثیر) فانها في معنى الجنس (ابو سعود)

اس لیے ضمیر جمع هُنَّ سے کوئی خلجان نہ ہونا چاہیے، سَمَاء کی وسعتِ مفہوم پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے (ص ۶۵)

یہاں مراد اجرام علوی سے بھی لی گئی ہے اور سمتِ علوی سے بھی۔

المراد بالسماء هذه الاجرام العلوية او جهات العلو. (بیضاوی)

گویا مفہوم یہ ہوا کہ وہ بلندی کی طرف متوجہ ہوا:

المراد بالسماء جهات العلو كانه قيل ثم استوى الى فوق (کشاف)

اِسْتَوٰی کا صلہ جب اِلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں قصد کیا، توجہ کی، التفات کیا، انتظام کیا، تدبیر کی

اذا عدى بإلى اقتضى معنى الانتهاء اليه إمّا بالذات او بالتدبير (راغب. تاج)

چنانچہ یہاں ائمۂ تفسیر عمومًا اسی طرف گئے ہیں۔

عمد الى خلق السماء (ابن عباس) قال بعضهم اقبل عليها وقال بعضهم عمد اليها (ابن جریر) قصد اليها

اي بقصده وإرادته (قرطبي عن سفيان وابن كيسان) اقبل وعمد الى خلق السموات (مدارك) والاستواء هنا

مضمن معنى القصد والاقبال لانه عدى بإلى (ابن کثیر) والمراد ان ارادته توجهت الى مادة السماء (المنار)

یہ معنی بھی لیے گئے ہیں کہ ہر شے کا انتظام اس نے اپنی مرضی کے مطابق کر لیا۔

اي استقام الكل على مراده بتسوية الله تعالى (راغب)

۵۱؎ آسمانوں کا تعداد میں سات ہونا توریت و انجیل دونوں کو مسلم ہے۔ ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے: "عہد عتیق و عہد جدید دونوں میں آسمانوں کا جو تخیل ہے ...... وہ سات آسمانوں کا ہے" (جلد ۲ ص ۳۲۲)

سَوّٰىهُنَّ. تسویہ کے معنی ہیں تکمیل تک پہنچا دینے اور ہر طرح درست کر دینے کے۔ ضمیر هُنَّ السماء کی طرف راجع ہے، خواہ اس کی تفسیر اجرام سے کی جائے یا خود اس کو معنًی جمع قرار دیا جائے (بیضاوی)

ع ۳

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

اور (وہ وقت یاد کرو ۹۸) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا ۹۹ کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں ۱۰۰

ومعنی تسویتھن تعدیل خلقھن واخلاءہ من العوج والفطور واتمام خلقھن (کبیر)

فان السماء فی معنی جمع (معالی) فاتم خلقھن من تلک المادۃ الدخانیۃ فجعلھن سبع

سمٰوات تامات منتظمات الخلق (المنار)

اسی لیے سوّٰھن کا ترجمہ ٹھیٹھ اردو میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "انھیں ٹھیک ٹھاک کر دیا"۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لیے ہیں یعنی کرۂ قمر، کرۂ عطارد، کرۂ زہرہ، کرۂ شمس، کرۂ مریخ، کرۂ مشتری، کرۂ زحل (کبیر) صاحب تفسیر مظہری نے ایک حدیث سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ عرش اور اس کے اندر جتنے سماوات ہیں سب کروی ہیں اور عرش زمین کے اطراف کو محیط ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہر کوکب اپنے فلک میں ایک خاص چال سے چلتا ہے اور آسمان کو حرکت نہیں۔ یہ ساری تشریح پرانی فلکیاتی تحقیق کے مطابق بھی جدید ترین فلکیاتی تحقیق کے مطابق جو بھی تشریح کی جائے قرآن سے باہر نہیں قرآن کے اندر ہی ہوگی۔

۹۷ (چنانچہ اپنے بندوں کی ساری ضرورتوں کا بھی اُسے پورا علم ہے اور اس نے اپنے بندوں کو محض پیدا ہی نہیں کیا بلکہ از راہ بندہ پروری اُس نے ان کی ہر ضرورت کے پورا کرنے کا بھی سامان کر دیا)۔

صفتِ خلق کے بعد صفتِ علم کا اثبات بھی ضروری تھا۔ جاہلی قوموں نے بکثرت اپنے دیوی دیوتاؤں کو ان کے معبود تسلیم کر لینے کے باوجود ان کے علم کو ناقص مانا ہے۔

۹۸ اِذْ ظرفِ زمان ہے کسی گزشتہ واقعہ کی یاد دلانے کے موقع پر آتا ہے جس طرح اِذَا کسی واقعہ مستقبل پر آتا ہے۔

اذ ظرف موضوع لزمان نسبۃ ماضیۃ وقع فیھا نسبۃ اخری مثلھا (ابو سعود)

بعض نے اُذْکُرْ اس کے قبل مقدر مانا ہے۔

ھو نصب باضمار اذکر والمعنی اذکر لھم (کبیر) واذکروا فعلی بابیکم (کبیر)

ابو عبیدہ لغوی نے کہیں کہہ دیا تھا کہ اِذْ یہاں زائد ہے اس کی شدومد سے تردید اہل لغت اور ائمہ تفسیر دونوں کی ہے۔

قال ابن اسحاق ھذا اقدام عن ابی عبیدۃ (لسان) قال الزجاج ھذا اجتراء عن ابی عبیدۃ

(ابن کثیر) ردہ ابن جریر قال القرطبی وکذا ردہ جمیع المفسرین (ابن کثیر)

۹۹ (آفرینش آدم کے وقت)

سورہ کے رکوع اول میں بیان فطرتِ انسانی کا تھا کہ قرآن کے مخاطبین میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک اُس کے پیام کو قبول کرنے والے صالح و سلیم فطرت رکھنے والے، دوسرے بد فطرت یعنی پیام الٰہی سے انکار کرنے والے دوسرے رکوع میں مخاطبین کی ایک تیسری نوع کا بیان تھا۔ تیسرے رکوع میں اصل پیام کا لُبِّ لباب سنا دیا گیا یعنی توحید و رسالت کی تبلیغ کر دی گئی، اب اس چوتھے رکوع میں اس تبلیغ کی تاریخ شروع ہوتی ہے یعنی یہ پیام ابتداءً نسل انسانی کے بانی و مورث حضرت آدمؑ کو دیا گیا اور ان سے نسل بہ نسل منتقل ہوتا آیا ہے۔

رَبُّكَ۔ ذکر آفرینش انسانی کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اللہ کی صفتِ ربوبیت کو یاد دلانا بہت پُر معنی ہے، ربوبیت تدریجی ترقی کی پوری طرح حامل ہے۔

مَلٰٓئِكَةِ۔ جمع ہے مَلَكٌ کی اور وہ اُلُوكٌ سے ہے جس کے معنی پیامبری یا پیام رسانی کے ہیں۔

الأُلوك الرسالة ومنه ألكنى اى ابلغه رسالتى (راغب) من الالوكة وهى الرسالة (روح)

ملئكة کو ملائکہ کہتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کا اصل کام پیام رسانی ہوتا ہے اور یہ خالق کے پیامات مخلوق تک لایا کرتے ہیں، یہ اللہ کے ایجنٹ یا واسطے ہیں۔

لأنهم وسائط بين الله تعالى وبين الناس فهم رُسل الله أو كالرسل اليهم (بيضاوى)

اُردو میں انھیں کو فرشتہ کہتے ہیں، فرشتے نوری مخلوق ہوتے ہیں، وجود خارجی رکھتے ہیں محض صفاتِ الٰہی یا قوائے طبیعی کے مرادف نہیں، عادۃً انسان کے لیے غیر مرئی رہتے ہیں جب ضرورت مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں

اجسام لطيفة هوائية تقدر على التشكل بأشكال مختلفة مسكنها السموات وهذا قول أكثر المسلمين (كبير) وذهب أكثر المسلمين الى انها اجسام لطيفة قادرة على التشكل بأشكال مختلفة مستدلين بان الرسل كانوا يرونهم كذالك (بيضاوى)

ان کی لاانتہا تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے، وجود میں انسان پر تقدم زمانی رکھتے ہیں سرشت معصومانہ ہوتی ہے یعنی بدی کی صلاحیت نہیں رکھتے، خالق کے خاص فرمانبردار خادم ہوتے ہیں، مخلوق، محکوم، بندے ہونے میں بالکل انسانوں جیسے ہیں، خود کوئی معبودانہ یا نیم معبودانہ حیثیت دیوی دیوتا کی قسم کی مطلق نہیں رکھتے اور یہیں سے رد ہو جاتا ہے، ان باطل مذہبوں کا جنھوں نے ملائکہ کو خواہ اسی نام کے ساتھ خواہ انھیں دیوی دیوتا قرار دے کر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی درجہ دے رکھا ہے۔

لِلْمَلٰٓئِكَةِ میں لام تبلیغ کا ہے۔

اللام الجارة للتبليغ (روح)

خَلِيْفَةً (عنقریب اپنی حکومت کی تنفیذ کے لیے)

اللہ اللہ خاک کے پتلے کا یہ شرف و مرتبہ! اللہ کی مخلوق تو اس وقت تک بھی بے شمار تھی، اب اُن میں انسان نامی محض ایک نئی صنف کا اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ اللہ کا نائب زمین پر پیدا کیا جا رہا ہے! بعض اہل تحقیق نے یہیں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ تخلیق تو ساری ہی موجودات کی ہوئی، جنات کی بھی اور ملائکہ کی بھی جنت کی بھی اور عرش کی بھی لیکن اور کسی کے بھی قصۂ تخلیق کے ذکر کا اہتمام قرآن نے نہیں کیا ہے یہ فخر صرف خلقتِ آدم کے حصہ میں آیا اور یہ دلیل ہے آدم کی افضلیت و اشرفیت کی۔

ولم يقل انى خالق عرشًا أو جنةً أو ملكًا وان قال ذلك تشريفا وتخصيصا لآدم (م)

أَتَجْعَلُ۔ ہمزۂ استفہامی کہا گیا ہے کہ یہاں استفہام کا نہیں بلکہ ایجاب کا کام دیتا ہے۔

جاءت على لفظ الاستفهام ولكن معناها معنى الايجاب (مجاز)

خَلِيْفَةً۔ جو کسی کی نیابت کرے، خواہ اس لیے کہ وہ موجود نہیں یا اس لیے کہ فوت ہو چکا، یا اس لیے کہ

معذور ہے اور خواہ اس لیے کہ اس سے مُستخلف کی تعظیم ظاہر ہو۔

الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشريف المستخلف (راغب)

اور خلیفۃ اللہ وہ ہے جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے۔

يخلفني في الحكم بين خلقي وذلك الخليفة هو آدم ومن قام مقامه في طاعة الله والحكم بالعدل بين خلقه (ابن جرير عن ابن عباس وابن مسعود) خليفة الله في ارضه لاقامة أحكامه وتنفيذ قضاياه (معالم)

یہیں سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ انسان کو جو قوٰی ملیں گے وہ اس غایت و مقصود یعنی منصب خلافتِ الٰہی کے متناسب ملیں گے نسل انسانی خود اپنی صلاح و فلاح کے لیے اس کی محتاج تھی، اور محتاج ہے کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطے سے شریعتِ الٰہی سے استفادہ کرے اور سلسلۂ نبوت اسی غرض سے قائم ہوا ہے۔

والمراد به آدم وكذلك كل نبي استخلفهم الله في عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم. (بیضاوی)

واضح رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی انسان، نوعِ انسان کو اس بلند مرتبہ یعنی خلافت و نیابتِ الٰہی پر نہیں رکھا ہے اور جاہلی مذہبوں کا تو ذکر ہی نہیں، خود یہودیت اور اس کا مسخ شدہ ضمیمہ مسیحیت دونوں اس باب میں اسلام سے کہیں پیچھے ہیں، بائبل میں اس موقع پر ذکر اس قدر ہے۔

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا، اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے اور زمین سے بخار اٹھتا تھا، اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا سو آدم جیتی جان ہوا۔" (پیدائش ۲: ۵ - ۷)

گویا جس طرح اور سب حیوانات پیدا ہو رہے تھے، "ایک جاندار" آدم بھی پیدا ہوگیا اس کا کام زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ "زمین کی کھیتی" کرے کہاں یہ اتنا طویل لیکن بے مغز، انسان کو کاشتکاری تک محدود رکھنے والا بیان اور کہاں قرآن مجید کا باوجود شدتِ اختصار انسان کو مرتبۂ خلافتِ الٰہی پر پہنچا دینے والا، بلند و جامع اعلان! بعض صوفیہ نے یہیں سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جوہر خاک کو شرف خلافت اس لیے عطا ہوا کہ کثافت ہی فیضانِ اتم کے قابل اور تحملِ نورانیت کے لائق ہے اور بعض عارفین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ نور آفتاب کا فیض کامل و ذاتی زمین ہی پر ہے بسبب اس کے کمال کثافت کے، اور پانی اور ہوا اور آگ پر یہ فیضان صرف صفاتی ہے اس لیے کہ کثافت ان میں کم ہے اور اجرام علویہ تو اس نورانیت کے صرف سایہ و عکس ہی سے مستفیض ہو سکتے ہیں، بسبب کمالِ لطافت کے اور آدم کی ترکیب جسمی چونکہ خاکی عنصر سے ہوئی ہے اور اُن کے اخلاق کی عالم ملکوت سے اور ان کی روح کی عالم امر و نور سے اس لیے اُن میں صلاحیت فیضان بھی غایتِ کمال کی قرار پائی ہے! اور خیر یہ ساری تشریح تو اس لحاظ سے تھی کہ انسان کو زمین پر احکامِ شریعت کی تنفیذ کرنا ہے لیکن اللہ سارے عالم کا رب بھی تو ہے تو اس کی حاکمیت سارے عالم پر طبعی، مادی، تکوینی حیثیت سے بھی تو جاری ہوتی ہے اور جس طرح اس نے چوری اور زناکاری اور قتل کو جرائم قرار دے کر ان کی سزائیں اس دنیا میں رکھی ہیں اور جس طرح اس نے کفر و شرک نفاق وغیرہ کو شدید ترین معاصی قرار دے کر ان کی سزائیں آخرت پر اٹھا رکھی ہیں اسی طرح وہ خالق کائنات مادی کا اور عالم عنصریات کا بھی تو ہے اور ہوا، پانی، آگ، مٹی کی ترکیب و تحلیل، حرارت، روشنی، بجلی، کشش، بارش، چاند، سورج، ستارہ وغیرہ

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، درآنحالیکہ ہم

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ

تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں یا اللہ اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں ؟!

کے بھی سارے قاعدے قانون بھی اسی کے بنائے ہوئے چلائے ہوئے پھیلائے ہوئے ہیں، اس لیے لازم ہے کہ انسان کو جب خلافت تفویض ہو تو رب الارباب کی اسی کا شانِ تکوینی حیثیت سے بھی ہو، اور انسان ان سارے قوانینِ فطرت پر غالب و متصرف ہو کر رہے، انسان مادی و مشینی ترقیاں جتنی بھی کرتا جائے گا وہ سب شواہد اس کی اسی خلافتِ تکوینی کے ہوں گے، یہ نت نئے ایجادات و اکتشافات، اس کی فلاحِ روحانی اور نجاتِ اُخروی نقطۂ نظر سے جتنے ہی لاحاصل ہوں، عبث اور بے کار ہوں بہرحال ہیں سب اس کی خلافتِ تکوینی ہی کے مظاہر۔

اللہ اللہ معاف کرے، یہاں کلام کے سمجھنے میں بعض اکابر سے تسامحات ہو گئے ہیں، فرشتوں کا یہ قول بطور اعتراض یا گستاخی کے نہ تھا، فرشتے تو گستاخی کر ہی نہیں سکتے، "باغی فرشتوں" کا تخیل تمام تر مسیحی ہے اور عجب نہیں کہ مسیحیوں کے ساتھ تعلقات قائم ہو جانے سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر گیا ہو، فرشتوں کا یہ قول تمام تر وفورِ نیازمندی، اقرارِ وفاداری اور جوشِ جاں نثاری کا نتیجہ تھا، جیسا کہ ہمارے بعض محققین نے صراحۃً لکھا ہے۔

لیس علی وجہ الاعتراض علی اللہ ولا علی وجہ الحسد لبنی ادم کما قد یتوھمہ بعض المفسرین (ابن کثیر) ولیس باعتراض علی اللہ تعالٰی ولا طعن فی بنی ادم علی وجہ الغیبۃ فانھم اعلی من ان یظن بھم ذلک (بیضاوی) لیس المقصود الا الاستفسار عن المرجح لا التعجب والتفاخر (روح) علی طریقۃ قول من یجد فی خدمۃ مولاہ وھو یأمر بھا غیرہ اتستخدم العصاۃ وانا مجتھد بھا (ابو سعود)

بہترین تقریر اس سلسلہ میں وہ ہے جو ہمارے شیخِ وقت مفسر تھانویؒ نے کی ہے وہ ذیل میں بجنسہٖ نقل ہے:—

"مطلب یہ ہے کہ ہم تو سب کے سب آپ کے فرمانبردار ہیں اور ان میں کوئی، کوئی مفسد سفاک بھی ہوگا سو اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ لپٹ کر اس کو انجام دیں گے اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہوں گے، البتہ جو صلیح ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے، مگر جو مفسد ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں، خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا، کوئی نہ ہوگا، اس خدمت کے لیے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بطور اعتراض کے نہیں کہا، نہ اپنا استحقاق جتلایا، جو ان مقدس خدمت گاروں پر شبہات پیدا ہوں، بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم نیا کام تجویز کرے اس کے لیے ایک مستقل عملہ بڑھانا چاہے اور اپنے قدیمی عملہ سے اس کا اظہار کرے وہ لوگ اپنی جاں نثاری کی راہ سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس کام کے لیے تجویز ہوئے ہیں ہم کو کسی طرح تحقیق ہوا ہے کہ بعض بعض تو اس کو بخوبی انجام دے سکیں گے اور بعض بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے جس سے حضور کا مزاج ناخوش ہوگا، آخر ہم کس مرض کی

وہ ہیں ہر وقت حضور پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں اور حضور کی جان و مال کو دعا دیتے رہتے ہیں کیسا ہی کام کیوں نہ ہو حضور کے اقبال سے اس کو انجام دے نکلتے ہیں، کبھی کسی خدمت میں ہم غلاموں نے عذر نہیں کیا، اگر وہ نئی خدمت بھی ہم کو عنایت ہوگی تو ہم کو کوئی عذر و انکار نہ ہوگا، اسی طرح فرشتوں کی عرض و معروض اظہار نیازمندی کے واسطے تھی، اور یہ بات کسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کرا دی ہوگی کہ بنی آدم بھی بُرے بھلے سب ہی طرح کے ہوں گے۔

نَجْعَلُ فِيهَا۔ مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا۔ ضمیر هَا دونوں جگہ ارض (روئے زمین) کے لیے ہے۔
فِيهَا کی تکرار شدتِ فساد کے اظہار کے لیے ہے۔

وتكرار الظرف للدلالة على الافراط فى الفساد (روح)

مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا۔ فرشتوں کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ خلیفہ سے یہاں اشارہ محض ذاتِ آدم کی طرف نہیں کیونکہ ان سے فساد فی الارض اور خونریزی کہاں ظاہر ہوئی بلکہ خلیفہ سے اشارہ جنسِ آدم یا نسلِ آدم کی جانب ہے

وليس المراد ههنا بخليفة آدم فقط كما يقوله طائفة من المفسرين. .... والظاهر انه لم يرد آدم عينا اذ لو كان كذلك لما حسن قول الملئكة اتجعل فيها من يفسد فيها فانهم ارادوا ان من هذا الجنس من يفعل ذلك. (ابن كثير)

اَتَجْعَلُ فِيهَا۔ الخ مطلب یہ ہے کہ یہ جدید مخلوق اور اس کی ذریات آپ کے قوانین کی نافرمانی بھی کرے گی اور نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روئے زمین پر مادی و معنوی دونوں حیثیتوں سے فساد برپا ہو کر رہے گا، فرشتوں کی یہ ساری عرض و معروض ان کی کسی غیب دانی کی بنا پر نہیں، بلکہ نیابتِ الٰہی و خلافتِ ربانی کا نام سن کر خود ہی انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا، قوائے بشری کی ترکیب کا بھی اور زمینی مخلوق کی ضرورتوں اور طبعی تقاضوں کا بھی اور اس سے یہ نتیجہ خود بخود ان کے سامنے آ گیا تھا کہ زمین پر شر و فساد بھی ہوگا اور انسانوں میں سے باغی و نافرمان بھی پیدا ہوں گے۔

انهم عرفوا خلقته وعرفوا انه مركب من هذه الاخلاط الاربعة...... والاحتياج الى الحاكم والقاضى انما يكون عند التنازع والتظالم فكان الاخبار عن وجود الخليفة اخبارا عن وقوع الفساد بطريق الالتزام (كبير) علموا ذلك من تسمينه خليفة لان الخلافة تقتضى الاصلاح وقهر المخالف عليكم وهو يستلزم ان يصدر منه فساد (روح)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسانی آبادی سے قبل روئے زمین پر جو جنات آباد تھے ان کی سرشت و فطرت پر قیاس کر کے فرشتے انسان کے حق میں بھی یہی سمجھے۔

كما فعل بنو الجان فقاسوا الشاهد على الغائب (معالم) او انهم قاسوهم على من سبق (ابن كثير)

توریت میں اس مخلوق کا ذکر بصراحت موجود ہے۔

بِحَمْدِكَ میں ب تسبیح کے ساتھ حمد کے دوام معیت کے اظہار کے لیے ہے۔

الباء لاستدامة الصحبة والمعية (روح)

لَكَ میں ل اظہارِ تخصیص کے لیے ہے یعنی تقدیس خاص تیری رضا ہی کے لیے ہے۔

اشعارا بان ايقاع الفعل لاجل الله تعالى وخالصا لوجهه سبحانه (روح)

قَالَ إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ۝٣٠ وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلۡأَسۡمَآءَ كُلَّهَا

(اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے [۱۱۱] اور اللہ نے آدم کو اسم سکھلا دیئے کل کے کل [۱۱۲]

تسبیح اور تقدیس کے درمیان یہ فرق کیا گیا ہے کہ تسبیح کا اطلاق باعتبار طاعات کے ہوتا ہے اور تقدیس کا بہ لحاظ اعتقادات کے۔ (روح)

وَنَحۡنُ میں و حالیہ ہے۔

والواو للحال (کبیر) والواو فی ونحن للحال (کشاف)

نَحۡنُ ..... لَكَ۔ دنیا میں دیوتا پرستی کی بیماری فرشتوں ہی کے فرائض کی غلط تشخیص سے پیدا ہوئی ہے آگ کے فرشتوں کو جاہلی قوموں نے اگنی دیوتا مان لیا، بارش کے فرشتہ کو اندر دیوتا قیس علی ہذا۔ قرآن نے نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ فرشتوں کی زبان سے کہلا کر ان کی عبدیت محض پر انہیں کی زبان سے ایک اور مہر لگا دی، فرشتے یہاں صاف صاف عرض کر رہے ہیں کہ ہم خدام تو اپنی سرشت کے لحاظ سے بجز حق تعالیٰ کی تحمید و تقدیس کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ فرشتہ اور دیوتا دونوں کے تصور کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے فرشتہ تمام تر مخلوق اور عبد ہوتا ہے اللہ کے حکم سے موجودات کے کسی خاص شعبہ پر مامور جس سے اثنائے خدمت میں کسی غلطی لغزش یا خیانت کا احتمال ہی نہیں، دیوتا اس کے برعکس خود ایک مستقل بالذات و خود مختار وجود ہوتا ہے اور عبد نہیں بلکہ معبود۔

[۱۱۱] (مصالح کائنات و مخلوقی حاجات کے سلسلہ میں)

مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اس کی کیا خبر کہ عبدیت کے علاوہ نیا کام خلافتِ الٰہی کا جو اس نئی مخلوق سے لیا جانے والا ہے اور اس کے لیے جن صلاحیتوں اور جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے وہ تمہارے اندر کہاں تک موجود ہیں۔

انا اعلم من المصلحۃ الراجحۃ فی خلق ھذا الصنف علی المفاسد التی ذکرتموھا ما لا تعلمون (ابن کثیر)

دیوتا پرستی پر ایک اور ضرب لگی، ملائکہ پرستوں کو ان کے جہل پر ایک اور تنبیہ کی گئی کہ صفاتِ خلق، قدرت وغیرہ تو الگ رہیں محض ان مصالح کے علم کے لحاظ سے بھی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ سے کیا نسبت؟ کہاں علم محدود کہاں علم نامحدود!

[۱۱۲] یعنی آدم کو اشیائے کائنات کے اسماء اور آثار و خواص کا علم دے دیا۔

آیت کے ان الفاظ سے اہلِ سنت و جماعت نے انبیاء کی تفضیل ملائکہ پر نکالی ہے۔

وفیہ دلیل علی ان الانبیاء افضل من الملٰئکۃ وان کانوا رسلا کما ذھب الیہ اھل السنۃ والجماعۃ (معالم)

اور آدم کی فضیلت ملائکہ پر اسی علم کی بنا پر تو اور مفسرین نے بھی لکھی ہے۔

واعلم ان ھذہ الآیات تدل علی شرف الانسان ومزیۃ العلم وفضلہ علی العبادۃ ......

وان آدم افضل من ھؤلاء الملٰئکۃ لانہ اعلم منھم والاعلم افضل (بیضاوی)

آدم ہی سب سے پہلے بشر تھے اسی لیے ابوالبشر کہلاتے ہیں اور خلیفۃ اللہ کے اولین مصداق جنت سے جب زمین پر آئے تو غالباً دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد ہوئے جو اب ملک عراق کہلاتا ہے توریت میں ان کے صاحبزادوں کا نام آتا ہے ہابیل، قابیل، شیث، توریت ہی کی حسب روایت عمر ۹۳۰ سال کی پائی، عربی میں ان کا یہ نام کس مناسبت

سے پڑا، کسی نے کہا کہ زمین کی جلد (ادیم) سے پیدا ہوئے اس لیے آدم کہلائے، کسی نے کہا کہ اپنی جلد کی سُرخی کی بنا پر
خلق آدم من ادیم الارض فسمّی آدم (ابن جریر۔ عن سعید بن جبیر) قیل سمّی بذلک
لکون جسدہٖ من ادیم الارض وقیل لسمرۃ فی لونہ (راغب)
اَسْمَآءَ۔ اسم کا مفہوم عربی میں اُردو کے "نام" سے کہیں زیادہ وسیع ہے اسم وہ ہے جس کے ذریعہ سے
کوئی چیز جانی جائے، پہچانی جائے۔
اسم الشیٔ علامتہ (قاموس) الاسم مایعرف بہ ذات الشیٔ (راغب)
اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو اسی طرح اہلِ لغت
نے بھی تشریح میں اس کا لحاظ رکھ لیا ہے۔
قال ابن سیدہ الاسم ھو اللفظ الموضوع علی الجوھر او العرض للتمییز ای لیفصل بہ بعضہ عن بعض (تاج)
اسم کے ساتھ اگر مسمّٰی کا علم نہ ہوا تو اسم محض ایک آواز کانوں تک رہے گی اور ذہن کے سامنے کوئی مفہوم
نہ پیدا ہوگا، علامہ راغب نے اسی لیے اس پر شرح و بسط سے کلام کرکے آخر میں کہا ہے۔
انّ معرفۃ الاسماء لاتحصل الّا بمعرفۃ المسمّٰی و حصول صورتہ فی الضمیر (کہ اسم کی معرفت بغیر
مسمّٰی کی معرفت کے اور ذہن میں اس کی تصویر کے ہو نہیں سکتی) اور ایک دوسرے امامِ لغت نے اس کی دلالت الفاظ میں دی ہے
ھو کلام نفیس (تاج)
اور بعضوں نے کہا ہے کہ اسم مرادف ہے ذاتِ شیٔ اور عینِ شے کے۔
یقال ذاتٌ ونفسٌ وعینٌ واسمٌ بمعنی (قرطبی)
یہ تو لفظی معنی ہوئے آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلوماتِ اشیاء سے لی ہے اور اسماء کے ساتھ مسمّیات
اور ذوات و خواصِ اشیاء کو شامل کیا ہے اور اشیاء کے اسماء سے مراد اُن کے آثار و خواص کا علم لیا ہے، گویا سارے
علوم تکوینی آدم و بنی آدم کو ودیعت کر دیے گئے۔
فالمراد الانواع الثلاثۃ من الکلام وصورۃ المسمّیات فی ذواتھا (راغب) علّم آدم مسمّیات
الاسماء (کشاف) اَلہمہ معرفۃ ذوات الاشیاء وخواصھا واسمائھا واصول العلوم وقوانین الصناعات وکیفیۃ
آلاتھا (بیضاوی) علّمہ صفات الاشیاء ونعوتھا وخواصھا (کبیر) یدل علی انہ علّم الاسماء کلّھا
لآدم اعنی الاجناس بمعانیھا لعموم اللفظ فی ذکر الاسماء...... وانہ علّمہ ایاھا بمعانیھا
اذ لافضیلۃ فی معرفۃ الاسماء دون المعانی (جصاص) ای اودع فی نفسہ علم جمیع الاشیاء
من غیر تحدید ولا تعیین فالمراد بالاسماء المسمّیات مجازًا عن المدلول بالدلیل (المنار)
صاحب تفسیر مظہری نے کہا کہ مراد اسماء سے اسماءِ الٰہی ہیں، انھیں کا علم اجمالی کامل آپ کو دل گیا تھا اور
ہر اسم و صفت کے ساتھ ایسی مناسبت تامّہ آپ کو پیدا ہو گئی تھی کہ آپ جس کسی اسم یا صفت کی طرف توجہ کرتے
وہ اسم یا صفت فوراً آپ پر متجلّی ہو جاتی مثلاً جب اسم پاک الاوّل کی تجلّی آپ پر ہوئی تو ہر گزری ہوئی چیز آپ پر
منکشف ہو گئی اسی طرح جب اسم پاک الآخر کی تجلّی ہوئی تو ہر آنے والی چیز معلوم ہو گئی اور اسی پر قیاس کیجیے اسماءِ الٰہی کا

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ

پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا ۱۱۲ پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے اسم

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

اگر تم صحیح القول ہو ۱۱۵

کیا جا سکتا ہے۔ اللہ اکبر! یہ مقام ہے انسان کی فضیلت کبریٰ کا۔ حیف ہے کہ یہ خلیفۃ اللہ دیوتا پرستی، ملائکہ پرستی میں مبتلا ہو جائے۔ كُلَّهَا۔ کی تصریح سے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ تکوینی سلسلہ میں معرفتِ اشیاء ساری کی ساری انسان کو ہو کر رہے گی اور اسی لیے علوم کے سلسلہ میں ابھی اسے بے شمار منزلیں طے کرنا ہیں۔

۱۱۲ (تاکہ انسان کی اعلیٰ صلاحیت اور منصبِ خلافتِ الٰہی سے اس کی مناسبت فرشتوں پر بھی ظاہر ہو جائے) عَرَضَهُمْ سوال یہ ہے کہ کیا چیز اب فرشتوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے؟ اگر چیزوں کے محض نام مراد ہوتے تو لفظ قرآنی عَرَضَهَا ہوتا۔ ضمیر هُمْ ذوی العقول کے لیے ہے اور غیر ذوی العقول ضمناً و تبعاً اس میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ دلیل ہے اس پر کہ پیش صرف نام نہیں ہو رہے تھے، بلکہ اصل موجودات گویا پہلے صورتِ مثالی سے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام اور خواص سے اطلاع بخشی گئی، پھر خود ان مخلوقات و موجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

عرض الخلق على الملٰئكة (ابن جریرؒ عن ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ و غیرهما من اصحاب النبیؐ) عرض هذه الاشياء على الملٰئكة (ابن جریر۔ عن قتادةؒ) اى عرض المسمّيات (کشاف) المراد به ذوات الاشياء او مدلولات الالفاظ (بیضاوی)

تقدیر کلام یوں تھی اسماء المسمّيات۔ مضاف الیہ حذف کر دیا گیا کہ مضاف اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ (بیضاوی)

۱۱۵ (اپنے اس گمان میں کہ تم ہر منصب کی اہلیت اور ہر خدمت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہو۔) خطاب فرشتوں سے ہو رہا ہے۔

اَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ۔ اسماء پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا، مراد یہاں بھی محض نام نہیں خواص و آثار بھی مراد ہیں۔ المسمّيات والغرض من الانباء باسمائها الابانة عن معرفتها۔ (المنار)

صٰدِقِيْنَ۔ صدق سے مراد یہاں ارادی سچائی اور راست گفتاری نہیں کہ اس کے خلاف کا تو فرشتوں میں احتمال ہی نہیں بلکہ مراد محض ان کے دعوے کا صحیح ہونا یا ان کے خیال کا مطابقِ واقعہ ہونا ہے۔ صدق کا اطلاق لغت عربی میں اردو کی "سچائی" سے کہیں زیادہ وسیع ہے وہ جس طرح ارادی راست گفتاری کے لیے آتا ہے اسی طرح اصابتِ رائے، صحتِ خیال و نفس واقعیت کے لیے بھی۔

وقد يستعمل الصدق والكذب فى كل ما يحق و يحصل فى الاعتقاد (راغب) والصدق هو الصواب (بحر)

صدق و کذب، عربی کے ان دو لفظوں کے صحیح مفہوم پر نظر نہ ہونے سے اردو خواں طبقہ قرآن و حدیث

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲

وہ بولے تو پاک ہے ۱۱۵ ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دیدیا ۱۱۶ بےشک تو ہی تو ہے علم والا ۱۱۷ حکمت والا ۱۱۸

نے خود کتنی ہی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اردو میں سچ اور جھوٹ کا تعلق لازمی طور پر فاعل کے قلب اور اس کی نیت سے ہوتا ہے اور کسی انسان کا سچا جھوٹا ہونا اس کے اخلاقی صفات میں داخل ہے عربی صدق و کذب میں یہ مفہوم لازمی نہیں یہاں اکثر مفہوم صرف واقعیت و عدم واقعیت کا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں فاعل کی نیت یا ارادہ کو مطلق دخل نہ ہو۔

مرشد تھانوی ؒ نے فرمایا کہ مدارِ خلافت مجاہدۂ اعمال نہیں بلکہ علم و فہم ہے بشرطیکہ بدعملی نہ ہو اور اسی لیے مشائخ طریقت، عطائے خلافت کے وقت اسی کی زیادہ رعایت کرتے ہیں۔

۱۱۵ (ہر نقص سے اور شائبۂ بےعلمی سے بھی اور اس سے برتر اور منزہ کہ تیرا کوئی سا بھی فعل حکمت سے خالی اور مصلحت سے عاری ہو)

ملائکہ کی زبان سے بار بار عبدیت اور توحید پرستی کے کلمات ادا کرانا دنیا میں پھیلی ہوئی ملائکہ پرستی (دیوی دیوتا پوجا) پر ضرب شدید لگاتا ہے۔

۱۱۶ (اور ہم ناچیز بندوں کے علم کی تیرے لامتناہی اور لامحدود علم کے سامنے بساط ہی کیا؟) صفتِ خلق، صفتِ قدرت وغیرہ دوسری صفاتِ عالیہ کا تو خیر ذکر ہی کیا خود صفتِ علم کے بھی معیار سے کہاں فرشتوں کا علمِ جزئی اور کہاں حق تعالیٰ کا علمِ کلی۔ نور کے بنے ہوئے فرشتے عرض کرتے ہیں اور کس سچائی اور سادگی کے ساتھ کہ ہمارا علم ہی کیا ہے ہاں وہی بس تھوڑا بہت جو تو نے ہمیں عطا کر دیا ہے۔ کم ظرف انسان جو اپنے علم پر ناز کرنے لگتا ہے، ذرا سوچے کہ یہ اعترافِ بےعلمی فرشتے کر رہے ہیں اور کس شانِ خشیت و عبدیت کے ساتھ مناجات کر رہے ہیں کہ بار الٰہا علم ہمارے پاس کہاں؟ ہمیں علم سے واسطہ کیا؟ علیم و حکیم تو آپ ہی ہیں اور ہمیں یہ جو کچھ علم جو کچھ ملا بھی ہے وہ بھی محض آپ ہی کا عطیہ اور آپ ہی کے لطف و کرم کا صدقہ ہے۔

۱۱۷ (جس کے علم کے لیے حاضر و غائب، قریب و بعید، حال و مستقبل سب یکساں! اور جو بحیثیت ہمہ داں و ہمہ بیں کے ہر مخلوق کے ظرف سے، استعداد سے، ملکات طبع سے پوری طرح واقف)

الْعَلِيْمُ فعیل کے وزن پر صیغۂ مبالغہ ہے، مراد ہے وہ علم والا جس کا علم سارے ہی اشیاء کے ظاہر و باطن، روشن و خفی کا کامل احاطہ کیے ہوئے ہو۔

العلیم ھو العالم المحیط علمہ بجمیع الاشیاء ظاھرھا و باطنھا، دقیقھا، و جلیلھا علی اتم الامکان و فعیل من ابنیۃ المبالغۃ (نہایۃ)

اِنَّكَ کے ساتھ اَنْتَ کا اضافہ تاکیدِ مفہوم کے لیے ہے یعنی علم تو بس تیرا ہی کامل ہے۔

۱۱۸ (اور اسی قانونِ حکمت کے ماتحت بشر و ملک ہر مخلوق کو بس اس کی استعداد کے مطابق اس کے ظرف کے تناسب علم کا تقسیم کرنے والا اور کام لینے والا)

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ

(اللہ نے) فرمایا اے آدم! بتلا دو انھیں ان کے اسم ۱۳۰ پھر جب انھوں نے انھیں ان کے اسم بتلا دیے ۱۳۱ تو فرمایا

اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا

(اللہ نے) ۱۳۲ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ

كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

تم چھپاتے ہو، وہ سب جانتا ہوں ۱۳۳

الْحَكِيْمُ، وہ حکمت والا ہے جس کی معرفت بہترین اشیاء سے بہترین طریقے پر ہو، بڑی سی بڑی باریکیاں سب اس پر روشن ہوں۔

الحکیم ذو الحکمۃ والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم ویقال لمن یحسن الصناعات متقنا حکیم (نہایۃ)

فرشتے یہ کہہ رہے ہیں کہ تیرا ہر حکم حکمت و معدلت سے لبریز ہی ہوتا ہے۔

ای الحکیم فی خلقک وامرک وفی تعلیمک ما تشاء ومنعک ما تشاء ولک الحکمۃ فی ذلک والعدل التام (ابن کثیر)

۱۳۰ (یا صفات) یعنی فرشتوں کو اشیائے کائنات کے آثار و خواص بتا دو۔ اسماء پر حاشیہ اوپر گزر چکا۔ جب فرشتے اظہار عجز کر چکے تو اب آدمؑ سے ارشاد ہوا کہ تم اپنے معلومات کا اظہار کرو، آدمؑ کی فضیلت اس علم تکوینی ہی کی بناء پر تو تھی۔

اَنْۢبِئْهُمْ۔ ضمیر جمع مذکر ملائکہ کی جانب ہے۔

بِاَسْمَآئِهِمْ۔ ضمیر جمع مذکر غائب اشیاء کائنات یا مسمیات کی جانب ہے۔

۱۳۱ (اور اس طرح آدمؑ کا شرف عیاناً ملائکہ پر ثابت ہو گیا)

اَنْۢبَاَهُمْ۔ ضمیر ملائکہ کی جانب ہے۔

بِاَسْمَآئِهِمْ۔ ضمیر اشیاء کائنات یا مسمیات کی جانب ہے، فرشتوں کو علم انسان کی اس استعداد اعلیٰ کا نہ تھا، اور امتحان سے مقصود انسان کے اسی شرف استعداد کو کھول کر دکھا دینا تھا۔

۱۳۲ خطاب کا یہاں سے براہ راست ملائکہ سے ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن بالواسطہ اس میں وہ ساری مخلوق بھی آگئی جو فرشتوں سے فروتر ہے۔

۱۳۳ گویا آیت نمبر ۳۰ میں اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی جو اجمالی حقیقت بیان ہوئی تھی اب اس کی تفصیل ہو گئی اور ضمناً ان مسائل کی تعلیم آگئی کہ علم کل صرف ذات باری کا خاصہ ہے اور خالق کے لامحدود

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا[124] کہ آدم کے آگے جھکو[125] تو (وہ سب) جھکے مگر ابلیس (نہ جھکا)[126]

ولا متناہی علم سے مخلوق اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق کے بھی علم کو کوئی نسبت نہیں۔

مفسرین نے یہاں ایک روایت نقل کی ہے کہ آدم کا ابھی جسدِ خاکی ہی تیار ہوا تھا اور روح ابھی اس میں نہیں پڑی تھی کہ ادھر سے ابلیس کا گزر فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ ہوا، ہمراہیوں سے پوچھا کہ یہ نئی مخلوق اگر ہم سب پر حاکم بنادی گئی تو کیا کروگے؟ فرشتے بولے کہ جان و دل سے اطاعت کریں گے اور کیا کریں گے۔ اس پر ابلیس نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے تو اطاعت نہ ہوگی میں تو خود ہی اس پر غلبہ حاصل کروں گا اور مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں مَا تُبْدُوْنَ کا تعلق فرشتوں کے اعلانِ اطاعت اور اظہارِ طاعت سے ہے اور مَا کُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کا تعلق ابلیس کے اخفاءِ بغاوت سے لیکن خطاب کو اگر شروع ہی سے ساری مخلوق کے لیے عام لے لیا جائے (جیسا کہ ابھی اوپر کے حاشیہ میں گزر چکا) تو پھر اس روایت سے استناد کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو مخلوق کی نظر سے پوشیدہ ہیں، ورنہ حق تعالیٰ کے لیے غیب و شہود دونوں ایک ہی حکم میں ہیں۔

[124] یہاں صراحت صرف فرشتوں کی ہے لیکن جب یہ حکم فرشتوں کو مل رہا تھا تو جنات وغیرہ جو نسبتاً ادنیٰ مخلوق تھے، وہ اس حکم کے مخاطب بدرجۂ اولیٰ ٹھہرے، بادشاہ کا حکم جب وزیر یا نائب السلطنت کو ملتا ہے تو ادنیٰ عہدہ دار بدرجۂ اولیٰ اس کے مخاطب ہوتے ہیں۔

[125] (بہ طور اظہارِ عجز و نیاز، بہ حیثیت علامتِ تسلیم و اطاعت۔)

اُسْجُدُوْا۔ سجدہ سے مراد سجدۂ اصطلاحی، فقہی و سجدۂ نماز نہیں مطلق سجدہ مراد ہے، سجود اور سجدہ کے لفظی معنی محض تواضع و تذلل کے ہیں۔

سجد ای خضع (قاموس) السجود اصلہ التطامن والتذلل (راغب) کل من ذل و خضع لما امر بہ فقد سجد (لسان۔ عن الفراء)

سجدۂ نماز کو بھی سجدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تذلل و تواضع کا بہترین مظہر ہے۔

ویکون السجود علی جهة الخضوع والتواضع (لسان)

خود محاورۂ قرآن میں سجود کا استعمال اس معنی میں عام ہے، مثلاً:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اے مخاطب کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوق ہے سب اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہے) "مفردات راغب" میں اور بھی مثالیں اس کی دی ہیں، اور یہاں بھی قولِ اصح یہی ہے کہ یہ حکم سجدہ اپنی ہیئتِ معروف کے ساتھ زمین پر پیشانی رکھنے کے معنی میں نہ تھا بلکہ صرف جھکنے کے معنی میں تھا۔

كان ذلك انحناء ولم يكن خروا على الذقن (مدارك عن ابن عباس) قيل المعنى اللغوى ولم يكن فيه وضع الجباه بل كان ذلك مجرد تذلل وانقياد (روح) قال قوم لم يكن هذا السجود المعتاد اليوم ولكنه يبقى على اصل اللغة فهو من التذلل والانقياد (قرطبی) هو سجود لا نعرف صفته ولكن اصول الدين تعلمنا انه ليس سجود عبادة اذ لا يعبد الا الله تعالى (المنار)

لیکن جن لوگوں نے اسے سجدۂ متعارف کے معنی میں لیا ہے انھوں نے بھی تصریح کردی ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا جو اگلی شریعتوں میں جائز تھا، سجدۂ عبادت ہرگز نہ تھا، مقصود تمام تر آدم کا اعزاز و اکرام تھا نہ کہ ان کی پرستش۔

تكرمة لآدم لا عبادة لآدم (ابن جرير) كان ذلك سجود تعظيم وتحية لا سجود عبادة (معالم) كان السجود تحية لآدم (مدارك) والسجدة لآدم اكراما واعظاما واحتراما وهى طاعة لله عزوجل لانها امتثال لامره تعالى وقد قواه الرازی فی تفسيره وضعف ما عداه (ابن كثير)

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ عالم ارواح کا ہے، عالم ناسوت کا ہے ہی نہیں اور تکلیفات شرعیہ کا تعلق اسی عالم ناسوت سے ہے۔

لِاٰدَمَ یعنی خلیفۃ اللہ کے آگے، نائب سلطان حقیقی کی طرف رُخ کر کے — نہ یہ کہ اس کو، لِ یہاں اِلیٰ کا مرادف ہے یعنی سمت اور طرف کے معنی میں ہے، سجدہ صرف سمت آدم میں تھا جیسے آج بھی سمتِ کعبہ میں ہوتا ہے، مسجود جس طرح آج بھی کعبہ نہیں رب کعبہ ہے اسی طرح اُس وقت بھی ذات باری ہی تھی، قرآن مجید ہی کی ایک اور آیت میں لِ عند کے معنی میں آیا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ۔ چنانچہ متعدد اکابر تفسیر یہاں اسی طرف گئے ہیں۔

قيل اى الى آدم فكان آدم قبلة والسجود لله تعالى (معالم) فالمسجود له بالحقيقة هو الله تعالى وجعل آدم قبلة لسجودهم (بيضاوی) اى اسجدوا الى مستقبلين وجه آدم (قرطبی) نصبه الله قبلة لسجودهم كالكعبة (بحر عن الشعبی)

۱۲۶ اِبْلِیْسُ لفظی معنی ہیں یاس زدہ کے قرآن مجید میں مصدر اِبلاس مختلف موقعوں پر اسی مفہوم میں آیا ہے یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ وغیرہا، ابلیس اسی سے مشتق ہے اور یہاں بطور علم کے شیطان کے لیے آیا ہے۔

الابلاس الحزن المعترض من شدة اياس منه اشتق ابليس (راغب) ابليس افعيل من الابلاس وهو الاياس من الخير والندم والحزن۔ (ابن جرير)

یہ ابلیس کوئی فرشتہ نہ تھا جیسا کہ یہود و نصاریٰ کی تقلید میں ایک عام خیال مسلمانوں میں بھی پھیل گیا ہے اور اچھے اچھے صاحب علم بھی اس میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ جنّی تھا جیسا کہ قرآن مجید میں صراحۃً ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ (کہف آیت ۵۰) نور کا بنا ہوا فرشتہ نہیں جو نافرمانی پر قادر ہی نہیں ہوتا بلکہ آگ کا بنا ہوا جن تھا خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ (اعراف آیت ۱۲)

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ﴿٣٤﴾ وَقُلْنَا يٰٓـَٔادَمُ اسْكُنْ

اس نے انکار کیا اور تکبر میں آگیا ۱۲۷ اور کافروں میں سے ہوگیا ۱۲۸ اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور

أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا

تمہاری بیوی بہشت میں رہو سہو اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ ۱۲۹

ان صریح نصوص کے مقابلہ میں قول کسی کا بھی ہو قابلِ اعتنا نہیں۔

۱۲۷ أَبَىٰ انکار کیا حکم کی تعمیل سے وَاسْتَكْبَرَ اس نے صاف کر دیا کہ تعمیل ارشاد سے انکار کسی اشتباہ یا غلط فہمی کی بنا پر نہیں محض پندارِ تفوق کی بنا پر تھا، انکار اس نے اپنی بڑائی کی راہ سے کیا، نہ یہ کہ از راہ عشق الٰہی میں اور اس حکم کو منافی توحید خالص جان کر جیسا کہ بعض شاعروں اور بعض شاعر منش صوفیوں سے منقول ہے۔ اسْتَكْبَرَ کے بابِ استفعال سے یہ نکتہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ ابلیس میں یہ کبر فطری و خلقی نہ تھا بلکہ اس نے اپنے میں پیدا کیا۔

وکان السین والتاء للاشعار بأن الکبر لیس من طبیعۃ ولکنہ متعمّد لہ (المنار)

۱۲۸ یعنی اس نافرمانی نے اُسے کافروں میں داخل کر دیا، یہ معنی نہیں کہ وہ پہلے سے کافروں میں تھا ہی۔ کَانَ کے معنی محض "تھا" کے نہیں "ہوگیا" کے بھی آتے ہیں جیسا کہ اسی مقام پر۔

ومن اقسام کان الناقصۃ ان تاتی بمعنی صار کقولہ تعالیٰ کان من الکافرین (تاج)

صار من الکافرین باباءہ واستکبارہ (مدارک) صار منھم باستقباحہ امر اللہ تعالیٰ ایاہ بالسجود لآدم (بیضاوی) وصار من الکافرین (معالم) قیل بمعنی صار وھو مما اثبتہ بعض النحاۃ (روح)

جن اہلِ تفسیر نے کَانَ کو "ہوگیا" کے بجائے "تھا" کے معنی میں لیا ہے انھوں نے فِي عِلْمِ اللهِ (اللہ کے علم میں) محذوف مانا ہے، ابلیس پر کفر کا اطلاق حکم الٰہی کے ردّ و انکار کی بنا پر ہوا محض ترکِ عمل (سجدہ) کی بنا پر نہیں، ترکِ عمل کو گناہ کیسا ہی ہو ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہنچا دینے کے لیے اہلِ سنت کے مذہب میں کافی نہیں اور اس تصریح کے بعد خوارج کو یہ کہنے کا موقع نہ رہا کہ ابلیس محض ایک (ترکِ سجدہ) سے کافر ہوگیا۔

قال ابن فورک ثم ان کفرہ لیس لترک الواجب بل باستقباحہ امر اللہ بالسجود (روح) تقول انہ انما کفر لاستکبارہ واعتقادہ کونہ محقاً فی ذلک التمرد واستدلالہ علی ذلک بقولہ انا خیر منہ (کبیر) وصار من الکافرین باباءہ واستکبارہ وردّہ الامر لا بترک العمل بالامر لان ترک السجود لا یخرج من الایمان ولا یکون کفراً عند اہل السنۃ خلافاً للمعتزلۃ والخوارج (مدارک)

۱۲۹ جَنَّةٌ۔ لفظی معنی ہر اس باغ کے ہیں، جس کے درخت زمین کو چھپا لیں۔

کل بستان ذی شجر یستر باشجارہ الأرض۔ (راغب)

الجنّۃ۔ سے اصطلاحِ شرعی میں مراد وہ عظیم الشان باغ ہے جو بے شمار نعمتیں لیے ہوئے عالمِ آخرت میں نیک کاروں کے لیے مخصوص ہے اور آج نظروں سے مستور ہے اس کا نام جنت یا تو اس لیے پڑا کہ وہ بلکے

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

اور اس درخت کے پاس نہ جانا ۱۳۰

باغوں سے مشابہ ہے گو مشابہت بہت دور کی سہی۔ اور یا اس لیے کہ اس کی نعمتیں ابھی مستور ہیں۔
سمّیت الجنۃ اما تشبیھا بالجنۃ فی الارض وان کان بینھما بون واما لسترہ نعمھا عنا (رغ)

اَنْتَ۔ اس صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اصلی حضرت آدمؑ تھے حضرت حوا کی حیثیت تابع کی سی تھی۔

زَوْجُكَ۔ مراد حضرت حوا ہیں جو اس وقت پیدا ہو چکی تھیں۔

ابن القیمؒ نے ایک بڑی طویل بحث کر کے یہ دکھلایا ہے کہ قرآن مجید میں زوج محل تعظیم و اکرام میں آیا ہے اور امرأۃ میں اس کے برخلاف پستی و تحقیر کا اشارہ ہے تاوقتیکہ کوئی اور سبب خاص اس لفظ کے لانے کا باعث نہ ہو۔
یہ روایت کہ حضرت حوا کی پیدائش حضرت آدم کی پسلی سے ہوئی ہے توریت کی ہے :۔

"اور خداوند خدا نے کہا کہ اچھا نہیں آدم اکیلا رہے میں اس کے لیے ایک ساتھی اس کے مانند بناؤں گا۔۔۔۔ اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس کی پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کہ وہ نر سے نکالی گئی۔" (پیدائش ۲ : ۱۸ و ۲۳)

بعض حدیثی روایتیں جو اس مضمون کی مروی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایسی نہیں جسے قطعی صحت کا درجہ حاصل ہو اور قرآن مجید نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء اور سورۃ الاعراف میں جو کچھ کہا ہے اس کی تعبیر اور طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے۔

حَيْثُ شِئْتُمَا۔ اس سے جنت کی وسعت عظیم کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔
آیت کے الفاظ سے اس پر بھی روشنی پڑ گئی کہ زوجیت کا ہونا یا خوب کھانا پینا شرف آدمیت اور کسی روحانی فضیلت کے منافی ہرگز نہیں کہ یہاں کھانے پینے کا تو علی حکم ہی ابو البشر کو مل رہا ہے اور زوجیت ان کے ساتھ شروع ہی سے چپکا دی گئی ہے، یہ صرف غیر اسلامی رہبانیت ہے جس نے زوجیت اور کھانے پینے کو کمال انسانی کے منافی قرار دے لیا ہے۔

۱۳۰ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ ظاہر ہے کہ یہ درخت جنت کے درختوں میں سے کوئی متعین اور حضرت آدمؑ کے لیے معلوم و معروف درخت تھا، لیکن اب اس کی تعیین و تصریح سے کوئی نتیجہ نہ تھا، اس لیے قرآن حکیم جو کبھی بے نتیجہ بات نہیں کہتا، اس کی تصریح سے خاموش ہے اور حدیث صحیح میں بھی اس باب میں کچھ وارد نہیں ہوا ہے، اقوال البتہ کثرت سے نقل ہوئے ہیں، جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ وہ درخت محض مجازی معنی میں تھا یعنی شجر علم یا شجر معرفت تھا۔
وقال قتادۃ شجرۃ العلم وفیھا من کل شئ (معالم) وقال الکلبی شجرۃ العلم علیھا من کل

فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

ورنہ تم گنہگاروں میں سے ہو جاؤ گے ۱۳۱؎ پھر شیطان نے دونوں کو پھسلا دیا اسی درخت کے باعث ۱۳۲؎

لوت ومن أكل منها علم الخير والشر (بحر)

لیکن محققین امام ابن جریر، امام رازی، علامہ ابن کثیر وغیرہم کا مسلک اس باب میں خاموشی کا ہے۔

قال الامام العلامة ابو جعفر ابن جرير والصواب فی ذلك ان يقال لا علم عندنا بأی شجرة كانت علی التعیین لان الله لم یضع لعباده دلیلا علی ذلك فی القرآن ولا فی السنة الصحیحة ....

وكذلك رجح الامام الرازی فی تفسیره وغیره وهو الصواب (ابن کثیر) واعلم انه لیس فی الظاهر ما یدل علی التعیین فلا حاجة ایضا الی بیانه لانه لیس المقصود من هذا الكلام ان یعرفنا تلك الشجرة (کبیر)

والاولی عدم تعیینها بغیر قاطع (ابو سعود) وقیل شجرة لم یعلمنا الله ما هی وهذا هو الاظهر (بحر)

والاولی ان لا تعین من غیر قاطع كما لم یعین فی الآية (بیضاوی) والاولی عدم القطع والتعیین (روح)

توریت میں یہ بیان ایک بڑی طویل عبارت میں آیا ہے اور اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:-

"اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اس سے کھائے گا ضرور مرے گا۔" (پیدائش ۲: ۱۶ و ۱۷)

یہ بات بھی مجمل ہی رہی، ہماری تفسیروں میں مادی درختوں میں سے گیہوں، خرما، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ سے لے کر شجرِ محبت، شجرِ علم وغیرہ معنوی درختوں تک بہت سے نام گنا دیے گئے ہیں۔

قیل الحنطة وقیل النخلة وقیل التین، قیل الحنظل وقیل شجرة المحبة وقیل شجرة الطبیعة والهوی وقیل وقیل (روح)

۱۳۱؎ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ان لوگوں میں سے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی نافرمانی سے بڑھ کر کون سا ظلم اپنے آپ پر ہوگا۔

اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت اس وقت تک دار الجزا یا دار الخلد نہ تھی جیسی کہ اب ہے بلکہ اس وقت وہاں کے قیام کے کچھ مخصوص قوانین تھے "شرائط تھے" اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی تو کوئی اشکال نہیں رہتا، وہاں وسوسۂ شیطانی کے پہنچ جانے پر یا کسی متنفس کے وہاں سے نکالے جانے پر۔

مرشد تھانویؒ نے لَا تَقْرَبَا سے یہ نکتہ خوب پیدا کیا کہ اصلاً صرف اکل ممنوع تھا لیکن ممانعت قربِ شجر سے بھی کر دی گئی، اسی طرح مشائخ محققین بعض دفعہ مباحات سے روک دیتے ہیں کہ کہیں غیر مباح کی طرف منجر نہ ہو جائے۔

۱۳۲؎ شیطان وہ ہے جو خیر اور برکت اور رحمتِ الٰہی سے دور ہو گیا۔

شطن عنه بعد واشطنه ابعده .... والشاطن البعید .... والشیطان البعید والشاطن الخبیث (معالم) شطن ای باعد (راغب) الشیطان فیعال من شطن ای بعد (معالم)

ابلیس کا ذکر اوپر آچکا ہے وہی جب نافرمانی کی پاداش میں جنت سے نکالا جاچکا اور ہر طرح کی خیر و برکت سے محروم و مہجور ہوچکا تو اب اس کا وصفی نام الشیطان پڑ گیا، لہٰذا اسی کو اب اس وصفی لقب سے یاد کیا جارہا ہے۔

سمی بہ لبعدہ عن الخیر وعن الرحمۃ (معالم) والشیطان ھو ابلیس بلا خلاف ھاھنا (...)

یہ شیطان، الشیطان بنی آدم سے شدید بغض و حسد رکھے ہوئے ہے اور دن رات انھیں بھڑکانے اور گمراہ کرنے میں مشغول رہتا ہے لیکن اس کے پاس اور کوئی قوت نہیں، انسان کو مجبور تو ذرا بھی نہیں کرسکتا البتہ پروپیگنڈے کے فن کا وہ امام ہے۔ ترغیب خوب دے سکتا ہے، سیاہ کو سفید خوب کھا سکتا ہے اور وسوسہ اندازی کی طاقت غضب کی رکھتا ہے، نزدیک اور دور اپنا عمل سب کہیں سے کرسکتا ہے، فاصلہ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا اور مادی رکاوٹیں کسی قسم کی بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں، جنت کی حیثیت اس وقت تک دار الجزاء کی متعین نہیں ہوئی تھی اس لیے وہاں بھی اس کا عمل بے تکلف اثر کرسکتا تھا۔

اَزَلَّ زَلَّۃ سے ہے اور اس کے معنی ہیں، جگہ سے ہٹادیا، ڈگا دیا، پھسلا دیا، بغاوت، سرکشی یا ارادی نافرمانی کا کوئی مفہوم اس میں شامل نہیں۔

ای اسرلھما (معانی) الزلۃ فی الاصل استرسال الرجل من غیر قصد (راغب) انہ اسم یحمل یمع علی خلاف الامر من غیر قصد الی الخلاف کزلۃ الماشی فی الطین (مدارک)

قرآن مجید نے پیمبروں کی غلطیوں، لغزشوں، فروگزاشتوں کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بائبل کے برخلاف کوئی اخلاقی جرم، کوئی دانستہ نافرمانی، کوئی حقیقی معصیت کبھی بھی ان کی جانب منسوب نہیں کی ہے نہ صراحۃً نہ کنایۃً ۔۔۔ یہ بحث بھی چھڑی ہے کہ آیا کسی نبی کے کسی عمل پر زلت (لغزش) کا اطلاق ہو بھی سکتا ہے؟ جن علماء و فقہاء نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے، انھوں نے استدلال اسی آیت سے کیا ہے:۔

وھذا دلیل علی انہ یجوز اطلاق اسم الزلۃ علی الأنبیاء کما قال مشائخ بخاری (مدارک)

اور ملا علی قاری کی شرح الفقہ الاکبر میں اسی بحث میں ہے:۔

وقد کانت منھم ای من بعض الانبیاء ..... زلات ای تقصیرات وخطیات ای عثرات .....

ھذا ما علیہ اکثر العلماء خلافا لجماعۃ من الصوفیۃ وطائفۃ من المتکلمین حیث نفوا السھو والنسیان والغفلۃ

عَنْھَا میں ضمیر ھا، شجرۃ کی جانب ہے اور عَنْ تعلیلیہ ہے بمعنی "اس کے سبب سے" اکثر اہل تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

یصح ان یکون عائدا الی اقرب المذکورین وھو الشجرۃ ..... وعنھا ای بسببھا (ابن کثیر) والضمیر فی عنھا للشجرۃ ای فحملھما الشیطان علی الزلۃ بسببھا (کشاف) ای حملھما علی الزلۃ بسببھا (روح)

قرآن مجید میں عن کثرت سے اس معنی میں آیا ہے مثلاً إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ (التوبۃ ۱۱۴) وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ (ھود ۵۳) وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي (الکھف ۸۲)

ضمیر ھا سے اشارہ جنت کی طرف بھی سمجھا گیا ہے، اس قول پر مراد یہ ہوگی کہ شیطان انھیں دور لے گیا جنت سے

وقیل ازلھما ای اذھبھما الضمیر حینئذ للجنۃ (روح) یصح ان یکون الضمیر عائدا الی الجنۃ

اور حاصل بھی دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔
یہ بھی خوب خیال رہے کہ یہاں جن افعال کی بھی نسبت شیطان سے کی گئی ہے (مثلاً ازلال یا اخراج) محض مجازی ہے ورنہ فاعلِ حقیقی ہر موقع پر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔
وسے الازلال والازالہ والاخراج لابلیس علی سبیل المجاز والفاعل للأشیاء ھو اللہ تعالی (بحر)

۱۳۴ (زمین پر)
اِهْبِطُوْا۔ یہ جنت زمین کے کسی حصہ میں نہیں آسمان پر تھی اور قولِ محقق یہی ہے۔
ای انزلوا الی الارض (ابن کثیر، معالم) کان امرا بالھبوط من الجنۃ الی الارض (بحر)
خود ہبوط کا مقتضی بھی یہی ہے جب تک کوئی اور قرینہ موجود نہ ہوگا، ہبوط کے معنی بلندی سے پستی میں اترنے کے لیے جائیں گے۔
الھبوط النزول الی الارض (مدارک) الھبوط الانحدار علی سبیل القھر۔ واذا استعمل فی الانسان فعلی سبیل الاستخفاف (راغب)
اِهْبِطُوْا۔ خطاب اب بجائے صیغۂ تثنیہ (تم دونوں) کے صیغۂ جمع (تم سب) میں ہو رہا ہے گویا مخاطب اب تنہا آدم و حوا ہی نہیں بلکہ ان کی ساری نسل بھی ہے۔
المراد ھما و ذریتھما (مدارک) اجمع الضمیر لأنھما اصلا الجنس فکأنھما الانس کلھم (بیضاوی) اجمع الضمیر لتنزیلھما منزلۃ البشر کلھم (روح)

۱۳۵ یہ مختصر لفظوں میں کل زمینی زندگی کا نقشہ آگیا یعنی یہاں جنت کے سکون و اطمینان کے برعکس کشمکش، بغض، حسد، نفسانیت، خود غرضی کا زور رہا کرے گا۔
مسئلۂ ارتقاء کے علمبرداروں نے جس قانون تنازع للبقاء پر اتنا زور دیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک پرتو اسی حقیقتِ قرآنی کا آگیا ہو۔

۱۳۶ (اور اس کے بعد واپس آنا)
فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ آیت کا یہ جزو خود اس امر پر دلیل ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر اب بھیجے جا رہے ہیں اور اب تک جس جنت میں وہ تھے، وہ زمین پر نہیں آسمان پر تھی، اور اس وقت سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے، نئی زندگی اور نیا ماحول، اور اب یہیں انھیں رہنا سہنا ہے۔
مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ یعنی قیام زمین پر دائمی نہ ہوگا صرف ایک مدتِ موعود تک رہنا ہوگا۔ متاع میں خود ہی مفہوم ایک محدود الوقت نفع کا ہے۔
متعۃ ای لکل انسان فی الدنیا تمتع امدۃ معلومۃ (راغب)
اور اس پر الی حین کے اضافہ نے اس مفہوم کو اور واضح و مؤکد کر دیا، گویا شروع ہی سے یہ بات ابو البشر کے کان میں ڈال دی گئی ہے کہ موت کسی حادثہ کا نام نہیں وہ تو داخلِ فطرت اور لازمی و ناگزیر ہے۔ خود زمینی زندگی البتہ ایک عارضی صورت کا نام ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

سو آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لیے[۱۳۷] سو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی[۱۳۸] بے شک وہ تو ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا[۱۳۹] بڑا مہربان[۱۴۰]

۱۳۷ھ توبہ وانابت کے خطا وار کو توبہ وانابت کے الفاظ اپنی طرف سے تلقین کر دینا خود ایک بڑی فرد رحمت خداوندی اور رحمتِ الٰہی کی ہے، اور پھر اس سے بڑھ کر بندہ نوازی کا کمال یہ ہے کہ اس تعلیم و تلقین کی نسبت تک اپنی جانب نہیں فرمائی گئی بلکہ اُسے حضرت آدم ہی کی جانب منسوب کر دیا گیا کہ انھوں نے یہ الفاظ سیکھ لیے کیا حدِ شفقت و بندہ پروری کی! یہ کلمات والفاظ کیا تھے؟ روایتیں جو اس باب میں نقل ہوئی ہیں مختلف ہیں لیکن خود قرآن مجید میں تو یہ الفاظ حضرت آدم و حوا کی زبان سے نقل ہوئے ہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف ۲۳)

مِنْ رَّبِّهٖ۔ ایسے موقع پر اللہ کی صفتِ ربوبیت کو یاد دلانا، اور اسماء الٰہی میں سے چُن کر اسم رب لانا نہایت ہی بلیغ ہے، بندہ کی لغزش اس کا رب نہ معاف کرے گا تو اور کون کرے گا۔

۱۳۸ھ (اور ان کی خطا سے درگزر کر دی)

تَابَ عَلَيْهِ۔ تاب کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں کہ رحمت کے ساتھ رجوع و توجہ کی، یا توبہ کی توفیق دی، یا توبہ کے اسباب آسان کر دیے۔

تاب الله عليه اى قبل توبته منه (راغب) رزقه التوبة من خطيئته (ابن جرير) رجع اليه بالرحمة والقبول (كشاف) عبارة عن قبول التوبة والعفو عن الذنب والتوبة لهما والتمر لاتباعها۔

ایک سوال یہ اُٹھایا گیا ہے کہ گنہگار تو دو تھے، آدم اور زوجۂ آدم، اب یہاں صرف صیغۂ واحد مذکر کیوں آیا؟ (روح) اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ عورت مرد کے تابع ہے اور متبوع کے ذکر میں خود تابع کا ذکر آجاتا ہے۔

ولم يقل عليهما لان النساء تبع يغنى عن ذكرهن ذكر المتبوع ولذا طوى ذكرهن فى اكثر الكتاب والسنة (روح) وقد جاء طى ذكر النساء فى اكثر القرآن والسنة (بحر)

اور ایسا ہی تفسیر کبیر و مدارک میں ہے۔

۱۳۹ھ صیغۂ مبالغہ کی اہمیت ملحوظ رہے، اسلام کا خدا یہی نہیں کہ توبہ قبول فرماتا ہے بلکہ توبہ کے سامان اور اسباب اور اس کے لیے سہولتیں بھی بہم پہنچاتا رہتا ہے۔

يقال لله ذالك لكثرة قبوله توبة العباد حالا بعد حال (راغب) وهو اكثر القبول لتوبة العبد او لكثير الاعانة عليها (بحر) الرجاع على عباده بالمغفرة او الذى يكثر اعانتهم على التوبة (بيضاوى) وهذا من لطفه بخلقه ورحمته لعبيده (ابن كثير)

اِنَّهٗ کی ترکیب نے اور زیادہ زور و قوت پیدا کر دی۔

۱۴۰ھ معنی یہی نہیں کہ وہ صرف خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہی ہو، بلکہ اپنی طرف سے اوپر سے فضل و کرم کرنے والا ہے

اشارة الى مزيد الفضل (روح) المبالغ فى الرحمة وفى الجمع بين الوصفين وعد للتائب

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ

(اور) ہم نے حکم دیا کہ تم سب اس سے نیچے اتر جاؤ[۱۴۱] پھر اگر تمھیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے[۱۴۲] تو جو کوئی پیروی

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

میری ہدایت کی کرے گا، سو اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے[۱۴۳]

بالاحسان مع العفو (بیضاوی)

یہی وہ رَحِیْمٌ اور تَوَّابٌ اور غَفُوْرٌ (تینوں صفات بہ صیغۂ مبالغہ!) خدا ہے جس کے لیے معاندوں نے بار بار کہا ہے کہ اسلام کا خدا ایک غضب ناک اور سخت گیر خدا ہے!

۱۴۱ (اے اولاد آدم)

جَمِیْعًا۔ مراد ذریتِ آدم ہے۔ والمراد الذریۃ۔ (ابن کثیر)

مِنْهَا میں ضمیر جنت کی طرف ہے یعنی جنت سے نیچے اُترو۔

یہ حکم بطور سزا و عتاب نہیں مل رہا ہے اس لیے کہ خطا تو اب معاف ہی ہو چکی ہے بلکہ محض نتیجۂ طبعی کا ظہور ہے شجر ممنوع کا پھل کھا لینے سے جو طبعی اثرات مرتب ہو چکے تھے ان کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی۔ رُوح کے داغ دھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم و مادہ سے بھی غلط کاری کے نقش مٹ جائیں کوئی شخص خودکشی کے ارادہ سے اگر زہر کھا لے اور معاً اسے اپنی عصیاں کاری پر تنبیہ ہو جائے اور وہ روئے، گڑگڑائے دل سے توبہ کرے اس سے گناہ تو عجب نہیں کہ معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظامِ جسم پر مرتب ہو چکے ہیں وہ تو بہرحال ہو کر رہیں گے خشوع، خضوع، انابتِ قلب ان مادی اثرات کو مٹانے کے لیے کافی نہیں۔

۱۴۲ (اور وہ یقیناً پہنچے گی، پیمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعہ سے)

اب ناسوتی دنیا میں گزر بسر کرنے، رہنے سہنے کا سرکاری، خدائی قانون بنایا جا رہا ہے۔

۱۴۳ (روزِ جزا میں)

هُدَايَ، جو پیغام ہدایت رسولوں کے ذریعہ سے آتا ہے اسے براہ راست حق تعالیٰ کی جانب بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ۔ ان کے اوپر کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آئے گا یعنی ان کے لیے فی نفسہ کوئی بات خطرہ یا تشویش کی نہیں، یہ مطلب نہیں کہ صالحین طبعی طور پر بھی اپنے انجام کی نسبت اندیشہ نہ کریں گے یہ فکر و اندیشہ تو صالحین کو دوسروں سے کہیں زیادہ لگا رہتا ہے۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن کا تعلق ماضی سے مطلب یہ ہوا کہ حشر میں مومنین صالحین کو نہ کوئی سزا پیش آنے والی ہے اور نہ وہ اپنی ناسوتی زندگی پر حسرت و تأسف کریں گے۔

مَنْ موصول کا استعمال واحد، جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔

ويعبر به عن الواحد والجمع (راغب)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا

اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے سو وہی دوزخی ہیں ۱۳۴؎ اور وہ اس میں

خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

(ہمیشہ) پڑے رہیں گے ۱۳۵؎

۱۳۴؎ گویا جو لوگ ضابطۂ شریعت کے انکار اور قانونِ الٰہی کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنا مستقل تعلق دوزخ اور آتشِ دوزخ سے پیدا کر لیا ہے، آخرت میں یہی تعلق جو ابھی مخفی اور غیر مرئی ہے مجسّم و متشکل ہو جائے گا۔ عذابِ آخرت سے ڈرانا قرآن مجید کے ساتھ مخصوص نہیں گو جتنا زور اس پر قرآن مجید نے دیا ہے اس کی نظیر بیشک کہیں نہیں ملتی جہنم کے عذابِ آتشیں بلکہ اس کے دوام و خلود کے ذکر سے بائبل کے صفحات بھی خالی نہیں۔

"خداوند سلطنت کرتا ہے۔۔۔۔۔ ایک آگ اس کے آگے آگے جاتی ہے اور اس کے دشمنوں کو ہر طرف جلاتی ہے" (زبور ۹۷: ۱ و ۳)

"فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جدا کر دیں گے اور انھیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانتوں کو پیسنا ہوگا۔" (متی ۱۳: ۴۹ و ۵۰)

"اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے فرشتوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے۔" (متی ۲۵: ۴۱ و ۴۶)

"جہنم میں ڈالا جائے جہاں اس کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی۔" (متی ۲۵: ۴۱ و ۴۶)

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ۔ اہلِ جنت کے ذکر میں ذاتِ حق کے لیے ضمیر متکلم صیغۂ واحد کی اوپر ابھی گزر چکی ہے تَبِعَ هُدَايَ ۔ اہلِ جہنم کے سلسلہ میں وہی ضمیر متکلم صیغۂ جمع میں ہو گئی ہے۔ بِاٰيٰتِنَا اہلِ لطائف نے لکھا ہے کہ وہ موقع اظہارِ خصوصیت و شفقت کا تھا، اس لیے "میری" ہی مناسب تھا، اب محل حاکمانہ جلال و اقتدار کا ہے اس لیے یہاں "ہماری" ہی موزوں ہے۔

اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی دوزخ والے۔ وہ لوگ جو دوزخ کے ہو چکے، گویا وہ دوزخ ہی کی آبادی ہیں۔

الصاحب الملازم (راغب) ومعنى الصحبة اقتران بالشئ والغالب في العرف ان تطلق على الملازمة (روح)

۱۳۵؎ خلود کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا ایک حال پر قائم و برقرار رہنا اور اس کے اندر کوئی تغیر، کوئی خرابی نہ پیدا ہونا۔

الخلود هو تبري الشئ من اعتراض الفساد وبقاؤه على الحالة التي هو عليها (راغب)

اس سے ثانوی مفہوم دوام و ہمیشگی کا پیدا ہو گیا۔

ثم استعير للمبقى دائما (راغب) الخلد البقاء والدوام في دار لا يخرج منها كالخلود ودار الخلد الآخرة لبقاء اهلها۔ (تاج)

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ

اے بنی اسرائیل ۱۴۶ میرا وہ انعام یاد کرو جو

"خلود" قرآن مجید میں اس معنی میں بہت صاف طور پر آیا ہے، جہاں خالد کو باقی کے معنی میں لے کر فانی سے اس کا تقابل کیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِن مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ (انبیاء ۳۴)

اور خلود فی الجنۃ اور خلود فی النار سے مراد ہے جنت کی نعمتوں یا جہنم کے عذاب کا دوام اور اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا کبھی اپنے اپنے مقام سے باہر نہ نکلنا۔ اہلِ جنت کے تنعم اور اہلِ جہنم کے عذاب کا دائم و غیر منقطع ہونا اُمت کے اجماعی مسلّمات میں سے ہے۔

ای مخلدون فیها لا محید لهم عنها ولا محیص (ابن کثیر) فهم اصحاب العذاب الدائم المعد

وخلودهم ما لهم دوام علی ما انعقد علیه الاجماع (روح) ماکثون ابدا لا یفنون ولا یخرجون (جلالین)

۱۴۶ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ، مشہور و نامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام عراقی ثم شامی ثم حجازی (۲۱۶۰ ۔ ۱۹۸۵ ق م) سے مشہور و موعود نسلیں چلیں۔ ایک بی بی ہاجرہ علیہا السلام مصری کے بطن سے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسمٰعیل کہلائی۔ اور آگے چل کر قریش اسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی۔ ان کا وطن عرب رہا۔ دوسری بی بی سارہ علیہا السلام عراقی کے بطن سے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب عرف اسرائیل علیہ السلام سے یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، اس کا وطن شام رہا۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا، شام ہی کا جزو تھا۔ ایک تیسری نسل تیسری بیوی حضرت قطورہ سے چلی اور بنی قطورہ کہلائی، لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ کی اہمیت حاصل نہیں۔

بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا۔ توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی۔ انبیاء و مرسلین ان کے درمیان ہوتے رہے۔ بڑے بڑے عابد و زاہد ان میں پیدا ہو گئے، حکمران سلاطین اور فوجی جنرل بھی ان میں بڑے بڑے پیدا ہوتے رہے۔ نزول قرآن کے وقت ان کا دنیوی اقتدار مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر، وغیرہ اطراف و جوانب میں پھیل چکے تھے اور ان کے..... بعض قبیلے حجاز و اطراف حجاز خصوصاً یثرب (اسی کا نام بعد کو مدینۃ النبی پڑا) اور حوالی یثرب میں آباد ہو چکے تھے۔

"بنی اسرائیل" تو ایک قومی و نسلی اصطلاح ہے، مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے۔ اہلِ کتاب تھے۔ توریت محرّف و مسخ شدہ ہو کر سہی، بہرحال موجود ان کے درمیان تھی۔ سلسلۂ وحی و نبوت اور عقیدۂ جزا و سزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے۔ علوم انبیاء و معارف اولیاء کے حامل تھے۔ مالدار تھے، ساہوکار تھے، ساتھ ہی ساتھ سفلی عملیات سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ حجاز کی آبادی میں اس دینی و دنیوی تفوق کی بناء پر اہمیت انھیں اس وقت بھی حاصل تھی۔ ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بت پرستوں کی تھی، وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم و فضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے اور دوسری طرف اکثر ان کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے، گویا دینی و دنیوی اکثر حاجتوں میں انھیں کو مشکل کشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظم و قاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظم

اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ

میں نے تم پر کیا ۱۴۲؎ اور مجھ سے وعدہ پورا کرو تو میں تم سے وعدہ پورا کروں ۱۴۳؎

قومیں مرعوب و متاثر ہو جاتی ہیں۔ بسر کیف عرب بھی اسرائیلی اخلاق، اسرائیلی روایات بلکہ اسرائیلی عقائد سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے اور بہت سے مسائل میں یہود کو اپنا استاد جانتے تھے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ یہود کے مذہبی نوشتوں اور اسرائیلیوں کی مقدس زبانی روایتوں دونوں میں ایک آنے والے نبی کی بشارت موجود تھی اور یہ لوگ اس نبی موعود کے منتظر بنے تھے ان اسباب عام وخاص دونوں کی بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ قرآن مجید میں تخاطب اس قوم کے ساتھ ہو اور خوب مفصل ہو۔
اس منزل پر پہنچ کر بہتر ہوگا کہ ایک نظر قرآن مجید کے ترتیب بیان پر بھی کر لی جائے۔ قرآن مجید کا اصل تخاطب ساری کائناتِ انسانی سے ہے۔ اسی مناسبت سے رکوع اول میں بیان اس کا ہوا کہ نوعِ انسان کی حقیقی تقسیمیں دو ہی ہیں، یکا پہچے، مومن، دوسرے ٹیڑھے یا کافر۔ مومن یا نیک وہ جو قرآن مجید کے دستورِ حیات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کافر یا بد وہ جو اس سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے رکوع میں بیان کافروں ہی کی ایک خاص قسم یعنی کافروں کا ہوا اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ بھی ایمان ونجات سے محروم ہی رہیں گے۔ تیسرے رکوع میں تخاطب ساری نسلِ انسانی کو کیا گیا، اور قرآن مجید کا اصل پیام یعنی توحید ورسالت بیان کر دیا گیا۔ چوتھا رکوع تاریخ نسلِ انسانی پر ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا کہ انسان کی اصلی غرضِ آفرینش دنیا میں قانونِ الٰہی کی تنفیذ ہے اور حاکمیتِ الٰہی کی نیابت۔ ذرا سی غفلت میں نسلِ انسانی کا دیرینہ دشمن شیطان اس کو بہکا سکتا اور حق سے باطل کی طرف نور سے ظلمت کی جانب اُسے موڑ سکتا ہے لیکن انسان اگر ذرا بھی ہمت اور توجہ صرف کرتا ہے اور انبیاء کی بتائی ہوئی اور دکھائی ہوئی صراطِ مستقیم پر قائم رہے تو وہی غالب و منصور رہے گا۔ اب پانچویں رکوع میں بیان اس کا شروع ہوتا ہے (اور اس کی تفصیل متعدد رکوعوں تک چلتی رہے گی) کہ مدت دراز ہوئی ایک بڑے مقبول برگزیدہ بندہ کی اولاد میں ایک خاص نسل کو توحید کی نعمت خاص سے سرفراز کیا گیا تھا مگر وہ قوم اس کی نااہل ثابت ہوئی، موقعے اُسے بار بار دیئے گئے، رعایت اس کے ساتھ بار بار کی گئی لیکن ہر بار اس نے اس نعمت کو اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا یہاں تک کہ اپنی نسل کے آخری پیغمبر (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی مخالفت میں حد سے گزر گئی، طویل وسلسل مراعات کے بعد اب حکومتِ الٰہی کا دستور ایک نیا ضابطہ اختیار کرتا ہے۔ اس نا شکر گزار، نافرمان عصیان پیشہ قوم کو اس منصب سے معزول کیا جاتا ہے، اور یہ نعمت اس سے چھین کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے دنیا کی تمام قوموں اور ساری نسلوں کے واسطے عام کی جا رہی ہے۔

۱۴۲؎ اس انعامِ خداوندی کی تصریح کے لیے ملاحظہ ہوں حواشی نمبر ۱۳۰ و ۱۶۲، بہر حال کوئی ایسا انعام تھا جو نسلِ اسرائیل پر نسلِ اسرائیل کی حیثیت سے تھا۔

۱۴۳؎ توریت نسلِ اسرائیل پر احسانات الٰہی اور خداوندی نعمتوں کی یاد دہانیوں سے بھری پڑی ہے۔
عَهْدِيْ یعنی تمہارا وہ عہد جو میرے ساتھ ہے اور وہ عہد اطاعت الٰہی واطاعتِ انبیاء کا ہے۔

ما عاهدتموني من الايمان بي والطاعة لي (کشاف) بامتثال امري (معالم)

توریت میں بھی اسی عہد کا ذکر جا بجا ہے مثلاً:۔

"تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے ...... اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرطوں

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا

اور تم صرف مجھی سے ڈرتے رہو ۱۴۹ اور اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے تصدیق کرتی

تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ۪

ہوئی اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے اور مت بنو اس کے ساتھ کفر کرنے والوں کے متقدم ۱۵۰ ۱۵۱

اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا۔ اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا"۔ (استثناء ۲۶: ۱۷)

عَهْدِكُمْ۔ یعنی جو عہد میں نے تم سے تمہارے ایمان وطاعت پر بطور انعام کر رکھا ہے۔

ای ارضی عنکم وادخلکم الجنة (کبیر۔ عن ابن عباس)

توریت میں اس کا ذکر بھی جا بجا ہے۔ مثلاً:۔

"اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا" (استثناء ۲۶: ۱۷)

"اگر تم میری آواز کے فی الحقیقت سننے والے ہوگے اور میرے عہد کو حفظ کروگے تو تم ساری قوموں سے زیادہ میرے ایک خزانہ خاص ہوگے"۔ (خروج ۱۹: ۵)

اَوْفُوْا۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ وفائے عہد جس کا یہاں ذکر ہے اس کے مراتب میں بہت وسعت ہے۔ ادنیٰ مرتبہ بندہ کی طرف سے ادائے کلمۂ شہادت ہے اور حق تعالیٰ کی طرف سے حفاظتِ جان ومال۔

۱۴۹ (نہ کہ اپنی ہی جیسی مخلوق سے)

توحید کے لیے خطابِ عام جملہ عالمِ انسانیت سے رکوع تین میں ہو چکا ہے اب خطابِ خاص اسی مخصوص حاملِ توحید قوم بنی اسرائیل سے ہے لیکن یہاں اشارہ شرکِ جلی اور بت پرستی سے زیادہ شرکِ خفی اور ضعفِ ایمان کی جانب ہے یا خلاقی بیماری اسرائیلیوں کی ساری قوم میں پھیل چکی تھی اور خالق کی رضا اور عدمِ رضا کے بجائے انسانوں کو راضی رکھنے کی پروا اور ان کی ناخوشی سے بچنے کی اہمیت اچھے اچھے علماء ومشائخ یہود کے دلوں میں گھر کر چکی تھی، انجیل میں حضرت مسیحؑ کے مواعظ میں اس قسم کی ہدایتیں اور تنبیہیں کثرت سے ملتی ہیں۔

مشرکین اور بت پرستوں کے معاملہ میں جو آیتیں ہیں ان کا پیرایہ دوسرا ہے اور یہاں جو موحد قوم کو سرزنش ہو رہی ہے کہ رضائے الٰہی کے بجائے رضائے مخلوق کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا عنوان دوسرا ہے۔

۱۵۰ (رسول اللہ ﷺ کی رسالت سے انکار کر کے)

بِمَآ اَنْزَلْتُ۔ اشارہ ہے قرآن کی طرف۔

یعنی القرآن (معالم) یعنی به القرآن (ابن کثیر)

لِمَا مَعَكُمْ۔ اشارہ ہے توریت کی طرف۔

من التوراة (معالم)

كَافِرٍۢ۔ صورۃً واحد ہے معنیً جمع ہے یعنی یا تو تقدیرِ کلام یہ ہے کہ:۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور میری آیتوں کو فروخت مت کرو، تھوڑی سی قیمت پر ۱۵۱ اور صرف مجھی سے ڈرو ۱۵۲

ولا تکونوا اوّل فریق کافر (قرطبی)

اور یہ بقول اخفش نحوی وفرّاء نحوی اعتبار معنی فعل کا کیا گیا ہے اور یہ ترکیب کلام عرب میں بالکل جائز وفصیح ہے۔

لان المعنی اول من کفر به (قرطبی) وذلك من کلام العرب فصیح جید فی الاسم اذا کان مشتقا من فعل (معالم)

به۔ ضمیر قرآن کی طرف ہے اور ہو سکتا ہے کہ رسول کی جانب ہو اور ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

وکلا القولین صحیح لانهما متلازمان (ابن کثیر)

اَوَّلَ۔ اوّل ہمیشہ تقدم زمانی ہی کے موقع پر نہیں آتا چنانچہ امام راغب نے قرآن مجید کی ان آیتوں انا اوّل المسلمین۔ انا اوّل المومنین میں اوّل کے معنی اسلام وایمان میں امام ومقتدا کے لیے ہیں۔

فمعناه انا المقتدی بی فی الاسلام والایمان (راغب)

اَوَّلَ کَافِرٍ بِهٖ۔ مشرکین عرب اسرائیلیوں کی دماغی وذہنی بالادستی کے پوری طرح قائل تھے ان کے انکار کی لغت کو سند میں پیش کرتے تھے، یہود بہرحال اہل کتاب تھے کتاب آسمانی کی قدر انہیں کو ہونا چاہیے تھی اور بہ طور مقتدائے عرب انہیں کی ذمہ داری سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۴۷ و ۱۶۲)

ای لاتکونوا ممن یقتدی بکم فی الکفر۔ (راغب)

معنی کم فیہ من العلم مالیس عند غیرکم (ابن جریر عن ابن عباس) فان وضعکم ان تکونوا اوّل من امن به لانکم تعرفون حقیقة الامر (معج) اذھم منظورالیهم فی مثل هذا لانهم حجة مظنون بهم علم (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا کہ اوّل سے مراد اولیت وقدمیت زمانی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طرف سبقت ومبادرت نہ کرو اور یہ طرز تعبیر کلام عرب میں عام ہے۔

ای ولا تبادروا الی الکفر به وهذا الاستعمال معروف فی الکلام البلیغ بهذا المعنی لایمض بالاولیة فیه حقیقتهما۔ (المنار)

۱۵۱ حق کو کسی بھی دنیوی، ذوی مصلحت کی بناء پر چھوڑ دینا، آخرت کی ابدی دولت کو دنیا کے قلیل تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر ڈالنا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ حق کو تھوڑے دام پر نہ بیچا جائے اور زیادہ دام پر بیچ ڈالا جائے، دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی آخرت کے مقابلہ میں بہرحال قلیل ہی ہے۔

کل کثیر الیه قلیل وکل کبیر الیه حقیر (کشاف)

امام رازی نے کہا ہے کہ اشتراء یہاں استبدال کے معنی میں ہے یعنی بدلنے اور معاوضہ کرنے کے۔ یہودی حق فروشیوں کے کاروبار کا ذکر عہد نامہ جدید میں بھی ہے مثلاً:۔

”یہ لوگ ناجائز نفع کی خاطر ناشائستہ باتیں سکھا کر گھر کے گھر تباہ کر دیتے ہیں“ (طیطس ۱ : ۱۱)

اور دوسرے مقامات پر بھی ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ

کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو؟ ۱۵۷ درانحالیکہ تم کتاب (الٰہی) پڑھتے رہتے ہو ۱۵۸

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾

سو کیا تم عقل سے کام (ہی) نہیں لیتے؟

اٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ زکوٰۃ دیتے رہو کہ اس سے مرض حب مال کی اصلاح ہو جائے گی۔ (تھانویؒ)

اِرْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔ جھکنے والوں کے ساتھ جھکو کہ تواضع باطنی کے حصول میں بڑا دخل اہل تواضع کی صحبت کو ہوتا ہے۔ (تھانویؒ)

اِرْكَعُوْا۔ رکوع اسلامی نماز کے ایک معروف رکن کا نام ہے مقصود ارشاد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ نماز باجماعت پڑھا کریں۔ فقہاء میں ایک بحث یہ پیدا ہوئی کہ آیا کافروں کو فروع کا مخاطب بنانا درست ہے؟ ایک گروہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے جواب اثبات میں دیا ہے لیکن دوسرے گروہ کی طرف سے معقول جواب یہ ہے کہ آیت کے یہ سارے احکام ایک آیت کے قبل کے حکم ایمان وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ کے ماتحت ہیں یعنی پہلے ایمان لاؤ پھر ان احکام پر عمل کرو۔

۱۵۷ یعنی کیسے غضب کی بات ہے کہ دوسروں کو تو ایمان لانے کا مشورہ دے دیتے ہو اور خود ایمان نہیں لاتے۔ خطاب بنی اسرائیل سے چلا آ رہا ہے اور یہ گزر چکا ہے کہ اسرائیلی اپنے صاحب علم و کتاب ہونے کی بنا پر مشرکین عرب کی نظر میں محترم و قابل وقعت تھے اہل عرب قرآن کے پاس آ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے باب میں استفادہ کرتے کہ اس مدعی نبوت کے دعووں میں کہاں تک صداقت ہے؟ ہم اس کی تصدیق کریں یا نہ کریں؟ وغیرہا۔ احبار یہود ایسے موقعوں پر بارہا مشورہ یہ دے اٹھتے کہ بیشک ان میں علامتیں تو ہمارے ہاں کی پیشین گوئیوں کے مطابق پائی جاتی ہیں۔

قالوا هو صادق وامره حق فاتبعوه (کبیر) نزلت في احبار المدينة كانوا يامرون سرًا من نصحوه باتباع محمد صلى الله عليه وسلم (روح۔ عن ابن عباس)

مزید دیانت کے لحاظ سے تو ان کا مشورہ یہ تھا لیکن اپنے عمل کے وقت ہوائے نفس حائل ہو جاتی اور خیال یہ گزرنے لگتا کہ اسلام لانے کے بعد ماتحتی اور پابندی کی زندگی بسر کرنا ہوگی، یہ ریاست یہ مالی اور جاہی مزے کہاں حاصل رہیں گے

وهم كانوا لا يتبعونه لطمعهم والصلات التي كانت تصل اليهم من اتباعهم (کبیر) ولا يتبعونه (روح عن ابن عباس)

البرّ۔ بِرّ کے لفظی معنی نیکی کے ہیں اور یہ اپنے اطلاق میں عام ہے یعنی ہر قسم کی نیکی پر شامل۔

البر اى التوسع في الخير الكامل (راغب) هو اسم جامع لاعمال الخير (کبیر) بقول جميع اهل العربية (ابن مسعود)

یہاں اشارہ قبول اسلام و تصدیق رسالت محمدی کی طرف ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ۔ ہمزہ یہاں اظہار حیرت اور ملامت کے لیے ہے۔

والهمزة للتقرير مع التوبيخ والتعجب (کبیر) الهمزة للتقرير مع التوبيخ والتعجب من حالهم (کشاف)

۱۵۸ یعنی کتاب توریت جس میں علامتیں اور شہادتیں ان خاتم النبیین کی درج ہیں۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور صبر اور نماز سے مدد چاہو ۱۵۹ کہ وہ بیشک گراں ہے ۱۶۰ مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) جنھیں اس کا خیال رہتا ہے

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

کہ انھیں اپنے پروردگار سے ملنا (بھی) ہے اور اس کا کہ انھیں اس کی طرف واپس ہونا ہے ۱۶۱

یعنی بالکتب التوریٰۃ۔ (ابن جریر عن ابن عباس)

۱۵۹ (ایمان کی ثابت قدمی اور شعائر کفر کے ترک پر)
ایمان لے آنے اور صراط مستقیم اختیار کر لینے کے بعد طرح طرح کی کلفتیں اور بندشیں ناگزیر ہیں، ان تلخیوں اور ناخوشگواریوں کو ہلکا کرنے کے لیے یہاں علاج یہ بتایا جا رہا ہے کہ عادت صبر کی ڈالو اور نمازیں پڑھتے رہو۔
الصَّبْرِ صبر کی ایک تفسیر صوم یا روزے سے آئی ہے۔

وقال مجاهد الصبر الصوم (معالم)

دوسرے معنی ترکِ شہوات کے کیے گئے ہیں۔
۱۶۰ اِنَّهَا ضمیر نماز کی طرف ہے۔

قال المورج ردّ الکنایة الی الصلوٰۃ لانھا اعم (معالم)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر استعانۃ کی طرف ہے
نماز کا حکم ابھی ابھی مل چکا ہے اب بیان ان طریقوں کا ہو رہا ہے جن سے خود نماز کی پابندی آسان ہو جائے۔
خَاشِعِيْنَ خشوع کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے۔ یہاں آیت میں خشوع قلب کے دو خاص اثرات کا بیان ہو رہا ہے۔ پہلا اثر یہ ہے کہ خاشعین کو اس کا استحضار رہتا ہے کہ یہ عبادتیں رائیگاں جانے والی نہیں۔ اپنے شفیق و کریم پروردگار کے حضور میں بہرحال حاضر ہونا ہے۔ اس وقت یہ ساری محنت وصول ہو جائے گی اور استحقاق سے کہیں بڑھ کر اجر ملے گا۔ شوق نماز اس مراقبہ سے پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ دوسرا اثر خشوع قلب کا یہ ہے کہ خاشعین کے دل میں یہ بات جم جاتی ہے کہ آخر تو واپسی مالکِ حقیقی کے روبرو ہو گی۔ محاسبہ جس طرح ہر عمل کا ہو گا اسی طرح ترکِ عمل کا بھی ہو گا۔ ترکِ نماز کی عادت اس مراقبہ سے خود بخود ترک ہو جائے گی۔ عمل میں ساری سہولتیں یقین ہی کی مضبوطی اور قوت سے پیدا ہوتی ہیں اور یقین کے ایجابی و سلبی دونوں پہلو یہاں بیان میں آ گئے۔
نفسیات جدید میں محرکِ عمل دو ہی چیزیں مانی گئی ہیں۔ ترغیب و ترہیب۔ ترغیب کا جزو انھم ملٰقوا ربھم میں جزا و اجر کے استحضار سے آ گیا اور ترہیب کا جزو وانھم الیه راجعون میں مراقبۂ مواخذہ سے آ گیا۔
لَكَبِيْرَةٌ کبیرہ یہاں ثقیل کے معنی میں ہے طبیعت پر بھاری، گراں۔
يَظُنُّوْنَ ظن لغت میں شک اور یقین دونوں کے معنی میں آیا ہے۔

العرب تسمی الیقین ظنًا والشک ظنًا (ابن جریر) الظن من الاضداد یکون شکًا و یقینًا (معالم)

يٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى

اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا ۱۶۱ اور تمہیں

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾

دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ۱۶۲

مفردات راغب میں ہے کہ ظن کبھی قوی ہو کر حدِ علم تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی ضعیف ہو کر وہم کے مترادف رہ جاتا ہے۔ اور کلام عرب میں ظن بمعنی یقین کے استعمال کے نظائر بے انتہا ہیں۔

والشواهد من اشعار العرب وكلامها على ان الظن فى معنى اليقين اكثر من ان تحصى (ابن جرير)

الظن بمعنى اليقين او الترجيح مشهور عن العرب (نهر)

یہاں اکثر ائمہ تفسیر نے یقین ہی کے معنی میں لیا ہے۔

قوله الذين يظنون الظن هنا اليقين (راغب) اى يعلمون ويستيقنون (ابن جرير عن ابن عباس) الظن هنا اليقين (ابن جرير عن ابى العالية) اى يستيقنون (معالم) وروى عن مجاهد والسدى والربيع بن انس وقتادة نحو قول ابى العالية (ابن كثير) معناه يوقنون قاله الجمهور (بحر)

بعض نے یہاں بھی مراد توقع و امید سے لی ہے اور اس قدر بھی کافی ہے۔

يظنون اى يتوقعون (كشاف)

۱۶۱ ملاحظہ ہوں حواشی ۱۲۶ و ۱۲۷

۱۶۲ خوب خیال رہے کہ یہاں ذکر مذہب یہود کا نہیں ایک مخصوص قوم و نسل کا ہے۔ بنی اسرائیل نام کسی مذہب یا فرقہ یا عقیدہ کا نہیں ایک خاص نسل کا ہے۔ افضلیت یہاں مذہب یہودیت کی نہیں نسل اسرائیل کی بیان ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نسل کی افضلیت سارے عالم پر کس معنی میں ارشاد ہو رہی ہے اور وہ کون سی ایسی نعمت تھی جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے ساتھ بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی؟ اگر کہئے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرت آبادی تو اول تو یہ انعامات اللہ کے خود اس درجہ کے نہیں کہ ان کا ذکر اس شان و اہتمام کے ساتھ کیا جائے اور انھیں کو معیار فضیلت و افضلیت بنایا جائے اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں نصیب رہ چکی ہیں، کلدانیہ، مصر، ہندوستان ان سب ملکوں کا تمدن اپنے زمانہ میں اسرائیلیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہ چکا ہے اور تاریخ کا بیان ہے کہ ان قوموں کا دنیوی جاہ و حشم اسرائیلیوں سے بڑھ چڑھ کر رہا ہے پھر آخر قوم اسرائیل کی وہ مخصوص فضیلت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی اعلیٰ ترین نعمت مسلک توحید کی تھی۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم و بیش شرک میں مبتلا تھیں یا اسی کی طرف بہی چلی جا رہی تھیں، یہ نسل اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی، جو من حیث القوم توحید کی علمبردار رہی عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے رسالت کی

قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدۂ توحید راسخ اور پختہ ہوگا۔ اور انبیاء و رسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے نسل اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے، ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں کبھی کبھی پیدا ہو گئے ہوں تو وہ اس کے منافی نہیں، ذکر یہاں افراد کا نہیں نسل و قوم کا ہو رہا ہے، دنیا کی ساری دوسری قوموں میں جس وقت ظہور راہ "نادین" کا ہو رہا تھا اور وہ قومیں عناصر پرستی، مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بت پرستی، غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی شکل میں گرفتار تھیں، انبیاء و رسل اور ان کی تعلیمات کا چرچا صرف بنی اسرائیل میں تھا۔ ہندوستان کی آریہ نسل میں فلسفہ، ہندسہ، ریاضیات، معقولات کے ماہرین و علماء جیسے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں بہرحال حلولیت کا ترکہ اس میں حلول ہی کئے ہوئے تھا۔ اور توحید و رسالت کی دعوت صرف سامی نسل کی شاخ اسرائیلی کے حصہ میں آئی تھی، موجودہ یہود کو بھی اپنے اسلاف کی امتیازی حیثیت یاد ہے جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"بنی اسرائیل پر خاص فرض عائد ہوا تھا کہ توحید باری کی دعوت دیتے رہیں اور آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی، کواکب پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہیں۔" (جلد ۹ ص ۶) "بنی اسرائیل کا واحد فریضہ دنیا میں خدا کا گواہ بننا تھا۔" (جلد ۶ ص ۳) "مخلوقات کے مراتب مختلف ہیں، ذی شعور مخلوق غیر ذی شعور مخلوق سے فائق و برتر ہے، انسان فائق ترین ہے، انسانوں میں بنی اسرائیل بحیثیت موحد پرستاران حق کے مشرکوں سے افضل و بالا تر ہیں۔" (جلد ۹ ص ۱۱) "سامی قوموں میں سب سے پہلے عبرانیوں ہی کی رسائی اپنے انبیاء کی تعلیم سے توحید باری تک ہوئی۔" (جلد ۹ ص ۵۹)

مسیحی فرنگی مؤرخین نے بھی اسی تاریخی حقیقت کا اعادہ کیا ہے، ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے:

"دین توحید کی بنیاد بنی اسرائیل ہی میں پڑی۔" (جلد ۲ ص ۳) "انسانیت کی موجودہ روحانی کائنات عام اس سے کہ مسیحی ہو یا اسلامی سب کی تہ میں اسی عقیدۂ توحید کی بازگشت ہے جس کی دعوت سب سے پہلے اسرائیلیوں نے دی تھی۔" (جلد ۲ ص ۳)

خود توریت کی تصریحات بھی اس سلسلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں:

"تو خداوند اپنے خدا کے لیے ایک پاک قوم ہے۔ خداوند تیرے خدا نے چن لیا کہ تو سب گروہوں کی نسبت جو زمین پر ہیں اس کے خاص گروہ ہو، خداوند نے تم سے محبت رکھی اور تمہیں برگزیدہ کیا، نہ اس لیے کہ تم اور گروہوں سے گنتی میں زیادہ تھے، کیونکہ تم سب گروہوں سے کمتر تھے بلکہ اس لیے کہ خداوند عالم نے تم سے محبت رکھی" (استثناء ۷: ۶ و ۷) "خداوند کو خوش آیا کہ تمہارے باپ دادوں سے محبت رکھے اس لیے ان کے بعد ان کی اولاد کو یعنی تم کو سارے گروہوں کی بہ نسبت پہلے برگزیدہ کیا، جیسا کہ آج ہے" (استثناء ۱۰: ۱۵) "تم میرے گواہ ہو، خداوند فرماتا ہے اور میرا بندہ بھی جسے میں نے برگزیدہ کیا...... سو تم میرے گواہ ہو"۔ (یسعیاہ ۴۳: ۱۰ و ۱۲)

قوم بنی اسرائیل اور امت موسوی دو بالکل اور قطعاً علیحدہ چیزیں ہیں۔ اس لیے آیت کی تفسیر میں امت موسوی اور امت محمدیؐ کے تقابل و تفاضل کا سوال ہی سرے سے نہیں پیدا ہوتا، اس سوال کا یہاں تھا قطعاً بے ضرورت...... بلکہ بے محل ہے، افضلیت بنی اسرائیل کو کسی خاص زمانہ کے اندر محدود و مقید کرنے کی ضرورت ہمارے قدیم مفسرین کو محض اس لیے پیش آئی کہ "امت موسوی" اور "قوم اسرائیل" کے درمیان خلط ہو گیا اور دونوں کا عظیم الشان فرق نظر میں نہ رہا، امت محمدیؐ کی فضیلت بلحاظ دین و عقیدہ ہے نہ کہ کسی نسلی یا قومی اعتبار

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

اور اس دن سے ڈرتے رہو جب نہ کوئی کسی کے حق میں بدل بن سکے گا اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی

شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

اور نہ کسی سے معاوضہ قبول کیا جائے گا نہ انھیں مدد ہی پہنچ سکے گی ۱۶۳

ہے اور آیت میں ذکر ایک خاص نسل کی افضلیت کا ہے، یہ کوئی نظریہ یا اجتہادی مسئلہ نہیں ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ جس وقت دنیائے تہذیب طرح طرح کی مشرکانہ وہم پرستیوں میں مبتلا تھی موحد اعظم ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل کی ایک شاخ توحید کا علم بلند کیے ہوئے تھی۔ ہمارے قدیم مفسرین میں سے بھی کسی کسی کے ذہن کی رسائی اس حقیقت تک ہو گئی ہے اور وہ صاف لکھ گئے ہیں کہ نسل اسرائیلی کی افضلیت اس میں سلسلۂ نبوت وانبیاء کے لحاظ سے تھی۔

بما جعل فیھم من الانبیاء وھذا خاصۃ لھم ولیست لغیرھم۔ (قرطبی)

۱۶۳ یَوْمًا " اس دن" سے مراد ظاہر ہے کہ یوم قیامت ہے، قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی۔ حشر ونشر، جزا وسزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسؤلیت اور ذمہ داری کی روح ہے اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں، کہنا چاہیے کہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے مٹ چکا تھا، آگے روز قیامت کے جو اوصاف بیان ہو رہے ہیں سب میں مقصود کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدہ ہی کا رد ہے۔

لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ۔ اس سے مقصود اس اسرائیلی عقیدہ کی تردید ہے جو آج تک جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یوں لکھا چلا آتا ہے:۔

"بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے"۔ (جلد ۸، ص ۲۱)

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (جب کہ موت حالتِ کفر پر اور عدمِ ایمان میں ہوئی ہو) یہاں بھی تردید ہے اس اسرائیلی عقیدہ کی کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں، بہرحال اپنے اسلاف کرام شفاعت کر کے بخشوا ہی لیں گے۔ شفاعت اور شفیعِ مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ۔ اس میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدۂ کفارہ پر ہے، مسیحیوں کے ہاں عقیدۂ کفارہ کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے لیکن خود یہود بھی ایک بڑی تعداد میں اسی عقیدۂ کفارہ سے متأثر ہو کر اس کے قائل ہو گئے تھے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۲۷۵)

وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ۔ ایمان نہ رکھنے والوں کو کسی طرف سے مدد ونصرت بھی نہ پہنچے گی کہ سزا ہی کچھ تخفیف ہی ہو سکے، چہ جائیکہ نجاتِ کامل ہو سکے، گمراہ قوموں نے طرح طرح کے سہارے گڑھ رکھے تھے کہ فلاں اور فلاں عذابِ الٰہی کی گرفت سے بچا لیں گے، یہاں سب کی جامع تردید آگئی۔

وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمھیں فرعون والوں سے نجات دی تھی جو تمھارے اوپر بڑا عذاب توڑ رہے تھے ۱۲۴؎

۱۲۴؎ (جس پر تمھاری تاریخ کے اوراق روشن گواہی دے رہے ہیں)

'آل' لغت میں 'اہل' کا مرادف ہے اور مراد اس سے اہل و عیال، اتباع، ہم مذہب اور ہم نسب ہوتے ہیں۔

اھل الرجل عیالہ واتباعہ واولیاءہ (تاج) قومہ واھل دینہ ومثلھا (مجاز)

فرق یہ ہے کہ اہل کا استعمال عام ہے اور آل صرف خصوصیت اور اہمیت رکھنے والوں کے لیے آتا ہے۔

لایستعمل الآل الا فیہ شرف غالبا (تاج)

فِرْعَوْنَ کسی متعین بادشاہ کا ذاتی نام یا علم نہیں، قدیم شاہانِ مصر کا عام لقب تھا جیسے ہمارے زمانہ میں ابھی کل تک جرمنی کے بادشاہ کو قیصر، روس کے تاجدار کو زار، ترکی کے فرمانروا کو سلطان، والیِ مصر کو خدیو اور والیِ دکن کو نظام کہتے تھے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہمعصر کوئی ایک بادشاہ نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے دو بادشاہ ہوئے ہیں۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسے بھی قرآن کا اعجاز ہی کہنا چاہیے کہ وہ بجائے شخصی نام کے عمومی لفظ لایا جس کے بعد تشخیص کے ایک یا دو یا چند ہونے کا سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

مصر سے نکل کر بنی اسرائیل کے سفر جزیرہ نمائے سینا کا نقشہ ایک جدید مغربی فاضل کی تحقیق کے مطابق حسب ذیل ہے

بحر متوسط

سینا

بحر احمر
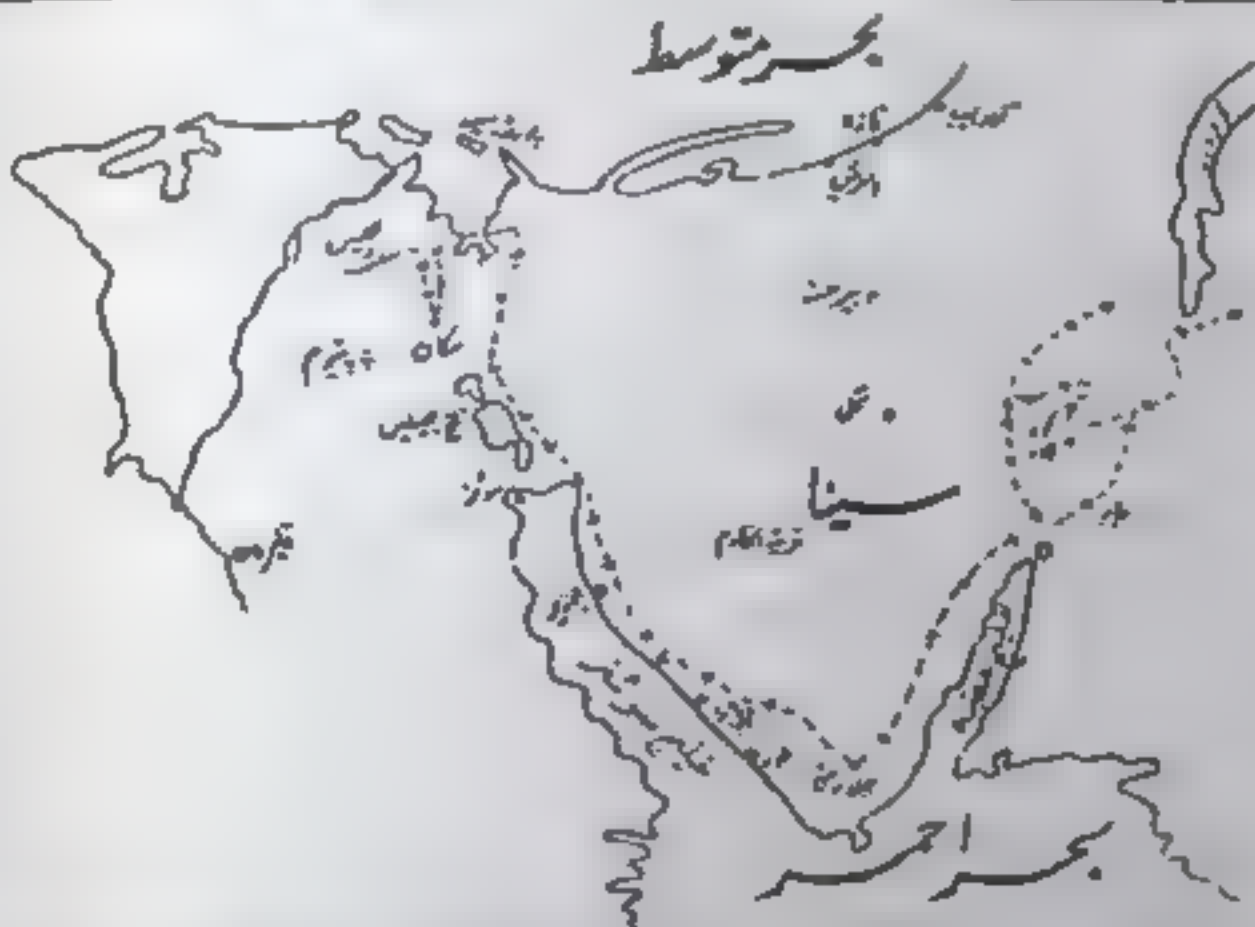
یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یعنی ظالم و جابر حکمرانوں کی طرح تمھیں رعایا بنائے ہوئے تمھارے اوپر طرح طرح کی سختیاں کر رہے تھے۔

توریت میں ہے:۔

• مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت

يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن

تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے ۱۶۵ اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۱۶۶ اور اس میں تمہارے پروردگار

رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ

کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی ۱۶۷ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لیے سمندر پھاڑ دیا تھا ۱۶۸ پھر ہم نے تمہیں بچا لیا

محنت کی کرواکے ان کی زندگی تلخ کی اور ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں (خروج ۱: ۱۳ و ۱۴)
قدیم ترین اسرائیلی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود (HISTORY OF JEWISH-ANTI QUITIES) میں تفصیلات اور زیادہ موجود ہیں۔

قرآن مجید اور توریت کے بیان کا یہ فرق بھی قابل لحاظ ہے کہ توریت نے حاکمانہ سخت گیریوں کو سارے مصریوں کی جانب منسوب کر دیا اور قرآن نے حسب معمول محتاط اور انتہائی صادقانہ لہجہ میں نام صرف فرعونیوں کا لیا۔ دونوں چیزیں بالکل ایک دوسرے سے ایسی ہی الگ ہیں جیسے انگریزی قوم اور انگریزی حکومت ہندوستان پر گرفت انگریزی حکومت کی تھی۔ نہ کہ انگریزی قوم کی۔

نَجَّیْنَا باب تفعیل سے ہے اور اس باب کی ایک خاصیت فعل کی تدریج ظاہر کرنا بھی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سارے اسرائیلی مصر سے دفعۃً نہیں نکلے تھے بلکہ رفتہ رفتہ اور مختلف ٹولیوں میں نکلتے رہے اور ان کا سب سے بڑا اور آخری دستہ وہ تھا جو حضرت موسیٰ کی قیادت میں روانہ ہوا، اور راہ بحر قلزم سمندر پار ہوا۔ ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے:- "ممکن ہے کہ مصری اسرائیلیوں کے گروہ وقتاً فوقتاً مصر سے نکل کر اپنے اجداد کے مقبروں کے گرد آباد ہوتے رہے ہوں" (جلد ۳ صفحہ ۸۶) اگر تاریخ نے کبھی اس مفروضہ کی تصدیق کر دی تو قرآن مجید کے لفظ نَجَّیْنَا (باب تفعیل سے) لانے کی اعجازی قدر اس وقت بھی

۱۶۵ توریت میں ہے۔
"اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو ...... اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو" (خروج ۱: ۵ و ۲۲)
فرعون سرکار کا حکم یہ نافذ ہوا تھا کہ اسرائیلی رعایا کا فرزند نرینہ کوئی سا بھی جینے نہ پائے۔

۱۶۶ یہ لڑکیوں کا قتل نہ کرنا اور انہیں عورت بننے کے لیے زندہ رکھنا غالباً اس لیے تھا کہ انہیں آئندہ فرعونی امراء اپنے حرم میں داخل کریں۔ ملمین کی "ہسٹری آف دی جیوز" جلد اول صفحہ ۱۴)
توریت میں ذکر قرآن کی طرح صرف ان کے زندہ رکھنے کا ہے وجہ و مصلحت درج نہیں۔
"اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو ...... ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی ہو اسے جیتی رہنے دو" (خروج ۱: ۱۵ و ۲۲)

۱۶۷ مشہور اور قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس (جس کا زمانہ حضرت مسیح سے متصل بعد کا ہے) کے الفاظ بھی تقریباً بالکل یہی ہیں:-

"یہ ایک بہت سخت ابتلا تھا"۔ (تاریخ آثار یہود۔ باب ۲، فصل ۹)
تاریخ اسرائیل کی کتابیں اس کڑی آزمائش کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔

۱۶۸؎ فرعون اور مصری گورنمنٹ کے مظالم سالہا سال تک برداشت کرنے کے بعد بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ساری قوم اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کرکے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو چلا جانا طے کرلیا، سفر مصری حکومت سے چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع کیا، زمانہ وہ تھا کہ راستہ میں نشیب اور ٹیلوں وغیرہ ہونا الگ رہا، آج کل کی طرح باقاعدہ سڑکیں نہ تھیں، شب کی تاریکی میں اسرائیلی راستہ بھول گئے اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف بچھ اور آگے بڑھ کر اپنے داہنے پر مشرق کی طرف مڑتے پہلے ہی ادھر گھوم پڑے۔ ادھر فرعون کو خبر ہوگئی اور وہ اپنے لشکر کی کمان خود کرتا ہوا تیزی سے تعاقب میں آپہنچا۔ اب اسرائیلیوں کے سامنے یعنی مشرق کی جانب بحر قلزم کا شمالی سرا تھا، اور داہنے بائیں یعنی شمال و جنوب میں پہاڑیاں تھیں، اور پشت پر یعنی مغرب کی جانب مصری لشکر تھا۔ قرآن مجید میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، توریت میں اس کو خروج بنی اسرائیل سے موسوم کیا ہے زمانہ کی تعیین جزم کے ساتھ مشکل ہے۔ جدید ترین تحقیقات کے مطابق پندرھویں صدی قبل مسیح کا وسط قرار پایا ہے، بلکہ بعض نے جرأت کرکے سنہ بھی متعین کردیا ہے یعنی ۱۴۴۷ق۔م۔

بِكُمْ تمہارے لیے، یعنی تمہیں بچانے کے لیے تمہیں راستہ دینے کے لیے۔

ای فرقنا لکم (معالم) ای فرقنا بسببکم و بسبب انجائکم (کشاف) بسببکم (جلالین)

بشر کے محدود نقطۂ نظر اور انسان کے ناقص علم کے اعتبار سے جو شدید خلاف معمول اور حیرت انگیز واقعہ کسی نبی کی تائید میں ظاہری مادی اسباب کے بے تعلق ظہور میں آئے اُسے اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں، ایسے کسی واقعہ کو جس کا ثبوت یقینی روایت یا شہادت یا نقل صحیح سے مل جائے "خلاف عقل" کہہ کر اس کے امکان سے انکار کر بیٹھنا خود ایک انتہائی نادانی اور بے عقلی ہے، تاریخی عجائب سے آخر تاریخ لبریز ہی ہے، اور خوارق و نوادر و حوادث عجیبہ سے دنیا کا کون سا گوشہ زمانہ کا کون سا دور خالی رہا ہے؟ آج کس ملک کس تاریخ کے اخبارات عجائب سے خالی رہتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ ایسے واقعات کو خلاف معمول، خلاف عادت عامہ کہا جاسکتا ہے اور ان کے روایتی ثبوت کا مطالبہ یقیناً کرنا چاہیے، راویوں پر جرح بھی خوب کرلینا چاہیے لیکن اس سے تجاوز کرکے ان کے نفس امکان ہی میں شک کرنا یا انہیں خلاف عقل یا محال قرار دینا اپنی کم عقلی کا مظاہرہ ہے۔ استبعاد جو کچھ ہے وہ تو صرف انسانی معیار سے ہے، انسان کے بہت ہی محدود و مختصر رقبۂ علم و تجربہ کے اعتبار سے، ورنہ جو قادر مطلق ہے اس کے لیے تو "حسب معمول" اور "خلاف معمول" سب یکساں ہے، اور عجیب و مانوس کا فرق اس کے لیے تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا "وقوع" اور "امکان" دو بالکل الگ چیزیں ہیں اور انہیں کے خلط مبحث نے معجزہ کے مسئلہ میں اتنی الجھن پیدا کردی ہے، امکان تو ہر چیز کا ہے قادر مطلق کے دائرۂ قدرت کے اندر ہر بڑی سے بڑی چیز ہے، ناممکن یا محال اس کے لیے تو کوئی سی بھی چیز نہیں، لیکن وقوع پر یقین کرنے کے لیے ضرورت شاہدوں کی ہوتی ہے اور جو واقعہ جس قدر عجیب اور معمول عام سے ہٹا ہوگا، اسی نسبت سے اس پر یقین لانے کے لیے شہادت بھی زبردست ہونی چاہیے۔

یہ تو معجزات پر اصولی گفتگو تھی، باقی یہاں جس فرق البحر کا ذکر ہے، یہ تو سمندر کا پھٹ جانا اور درمیان میں خشکی کی راہ بن جانا کچھ ایسا زیادہ خارق عادت بھی نہیں کہ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہ ہو۔ بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں

وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٠﴾

اور فرعون والوں کو غرق کر دیا، درانحالیکہ تم دیکھ رہے تھے ۱۲۹

پیش آ ہی چکی ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۴ء (رمضان ۱۳۵۲ھ) میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار و اطراف بہار میں آیا، اس موقع پر صوبہ بہار کے صدر مقام شہر پٹنہ میں دن دوپہر کوئی ڈھائی بجے کے وقت ایک مجمع کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع و عریض دریا کا پانی چشم زدن میں غائب ہوگیا، اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے دھارے کے خشک زمین نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چند سکنڈ نہیں، چار پانچ منٹ تک قائم رہا، یہاں تک کہ دریا اُسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے اُبل کر پھر جاری ہوگیا! ـــ واقعہ کی مفصل روئداد ایک نامہ نگار کے قلم سے انگریزی روزنامہ پانیر (لکھنؤ) کی ۲۰ جنوری ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں درج ہے۔

البحر۔ بحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکا ہوگیا ہے بلکہ بحر قلزم (یا بحر احمر) مراد ہے۔ دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن اور محلّہ سے مغرب جانب واقع تھا، اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لیے مشرق کی طرف تھا۔ نیل سے اس راستہ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا، اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے مصر کے شرق میں جہاں بعد کو نہر سویز کھد گئی اور پہلے خشکی تھی، اس سے متصل جنوب میں (نقشہ اٹھا کر دیکھئے) سمندر دو شاخوں کی شکل میں تقسیم نظر آئے گا، یہاں ان دو میں سے مغربی شاخ مراد ہے۔ اسرائیلی اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھنا

۱۲۹ اسرائیلی اپنے کو ہر طرف سے محصور پا کر قدرۃً سخت پریشان ہوئے لیکن رہنمائی اللہ کے ایک پیمبر کر رہے تھے آپ نے وحی الٰہی کے اشارہ سے فرمایا کہ بلا توقف سمندر میں چل پڑو، سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں طرف پہاڑ جیسی دو دیواروں کی طرح کھڑا ہوگیا، درمیان میں خشک راستہ پیدا ہوگیا، اسرائیلیوں کا قافلہ عبور کر گیا، اتنے میں فرعونی بھی لب ساحل پہنچ گئے، اور یہ منظر دیکھ کر وہ بھی پیدل اور سوار خشک سمندر میں در آئے، لیکن ابھی درمیان ہی میں تھے کہ پانی کی وہ کھڑی دیواریں آناً فاناً آپس میں مل گئیں اور سمندر کا پانی حسب سابق رواں ہوگیا اور دیکھتے دیکھتے فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو کر رہ گیا۔ توریت میں تصریحات ذیل ملتی ہیں:ـــ

"پھر موسیٰ نے دریا پر ہاتھ بڑھایا، اور خداوند نے بسبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا اور پانی کو دو حصہ کر دیا، اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر گئے، اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔" (خروج ۱۴: ۲۱ و ۲۲)

"بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔ سو خداوند نے اُس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا۔" (خروج ۱۴: ۲۹ و ۳۰)

"اور مصریوں نے پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کئے ہوئے وہ اور فرعون کے سب گھوڑے اور اس کی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھایا اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصلی قوت پر تھا، اور مصری اس کے آگے بھاگے۔ اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا اور پانی پھرا، اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپا لیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوڑا۔" (خروج ۱۴: ۲۳-۲۸)

وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا ۱۷۰ پھر تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا ۱۷۱

وَأَنْتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿٥١﴾

اور تم (سخت) ظالم تھے ۱۷۲

واقعہ کا زمانہ جدید ترین اثری تحقیق کے مطابق ۱۴۴۷ ق م یا اس سے لگ بھگ قرار پایا ہے۔

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔ فقرہ غیر ضروری یا برائے بیت نہیں۔ بنی اسرائیل پر اس حقیقت کا پُرزور طریقہ پر اعلان مقصود ہے کہ اپنے ایسے پُرقوت دشمن کی ہلاکت و بربادی کا نظارہ محض تائید خداوندی سے تم نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ توریت میں ہے:

"اسرائیلیوں نے مصریوں کی لاشیں دریا کے کنارہ پر دیکھیں"۔ (خروج۔ ۱۴-۳۱)

۱۷۰ جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو مصری حکومت کے پنجۂ غضب سے نکال لائے تو اب مشیت خداوندی یہ ہوئی کہ اس قوم کو ایک پورا نظام شریعت اور دستور زندگی عطا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ جزیرہ نمائے سینا کے ایک پہاڑ کی چوٹی کوہ طور پر نوشتۂ غیبی لینے کے لیے ایک چلّے کے لیے طلب کیے گئے۔

مُوسٰى۔ موسیٰ بن عمران سلسلۂ اسرائیلی کے سب سے زیادہ مشہور و جلیل القدر پیمبر کا نام ہے۔ توریت میں ہے کہ "عمر ایک سو بیس سال کی پائی"۔ (استثناء۔ ۳۴: ۷)

آپ کا زمانہ مؤرخین اور اثریین کا تخمینہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی قبل مسیح کا تھا۔ سال ولادت غالباً ۱۵۲۰ ق م، سال وفات غالباً ۱۴۰۰ ق م۔

أَرْبَعِينَ لَيْلَةً۔ چالیس رات دن مراد ہیں۔ قمری حساب سے ۲۴ گھنٹہ والا دن بجائے صبح کے شام سے شروع ہوتا ہے اس لیے عربی محاورہ میں بجائے چالیس دن کے چالیس رات آتا ہے۔ توریت میں ہے:

"اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات خداوند کے پاس رہا"۔ (خروج۔ ۳۴-۲۸)

اسلامی روایتوں میں آتا ہے کہ یہ زمانہ ذیقعدہ کے پورے مہینہ اور ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کا تھا:۔

قيل انها ذوالقعدة بكماله وعشر من ذي الحجة (ابن کثیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل سلوک کے یہاں جو چلّے کی میعاد متعارف ہے اس کی اصل یہیں سے ہے۔

۱۷۱ (بطور اپنے معبود کے)

مِنْ بَعْدِهٖ۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں۔ اُدھر حضرت موسیٰ پہاڑ پر تشریف لے گئے ادھر ان کی موحد قوم نے گرد و پیش کی مشرک قوموں کی دیکھا دیکھی ایک گوسالہ کی مورت سونے کی بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ توریت میں خروج کا باب ۳۲ پورا اسی گوسالہ پرستی کی تفصیلات ..... کی نذر ہے۔

۱۷۲ (اپنے حق میں)

قرآن مجید نے اس قسم کے فسق شدید بلکہ شرک کو اکثر ظلم ہی سے تعبیر کیا ہے اور واقعی اس سے بڑھ کر ظلم انسان کا

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ

پھر ہم نے تم کو اس کے بعد بھی معاف کر دیا ۱۷۳؎ کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ ۱۷۴؎ اور

اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

(وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیے تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ ۱۷۵؎

اپنے حق میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ اسرائیلیوں میں یہ گمراہی آئی کہاں سے؟ اس سوال کے جوابات مختلف دیے گئے ہیں، ایک قول ہے کہ مصریوں کی گاؤ پرستی کا عکس تھا، دوسرا قول ہے کہ مشرک کنعانیوں (فلسطینیوں) کے ہم جوار ہونے کا اثر تھا، تیسرا قول ہے کہ گوسالہ مورت تھی چند رماں دیوتا کی اور گوسالہ پرستی مرادف تھی ماہتاب پرستی کی، بہرحال یہ شرک جس راہ سے بھی آیا ہو، قرآن نے اسے شرک ہی قرار دیا، خواہ وہ مورتی (نعوذ باللہ) خدائے واحد ہی کی کیوں نہ بنائی گئی ہو۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ حلول باری تعالیٰ کی جناب میں محال ہے ورنہ اگر محض غلطی ہوتی تو اسرائیلی اس میں معذور سمجھے جاتے۔

۱۷۳؎ (تمہاری توبہ واستغفار اور تم میں سے ایک خاص گروہ کی سزایابی کے بعد)
گوسالہ پرستی اور شرک جیسے انتہائی جرم کی سزا چاہیے تو یہ تھا کہ ساری قوم کو ملتی، شرک کرنے والوں کو شرک کی اور باقی تماشہ دیکھتے رہنے والوں کو سکوت عن الحق اور اعانتِ جرم کی، لیکن واقعۃً سزا صرف ایک مخصوص گروہ کو ملی، جیسا کہ ابھی آ چکا ہے اور باقی ساری قوم توبہ واستغفار کے بعد بچ گئی۔

۱۷۴؎ (کہ شکر گزاری اور منت پذیری تو جوہرِ شرافت اور لازمۂ انسانیت ہے)
توحید وطاعت پر ثابت قدمی ہی اس موقع پر عملی شکر گزاری تھی۔

۱۷۵؎ (اور جزئیاتِ تک کے لیے زندگی کا ایک دستور العمل ہاتھ آ جائے)
اجمالاً راہِ ہدایت یعنی توحید کی تعلیم تو اسرائیلیوں کو پہلے سے ملی ہوئی تھی اور پیمبران کے درمیان موجود ہی تھے اب کتاب اس لیے نازل فرمادی گئی کہ ایک مستقل ومرتب دستور العمل جزئیاتِ زندگی کا ان کے ہاتھ میں آ جائے اور آئندہ یہ راہ سے بھٹکنے نہ پائیں۔

اَلْكِتٰبَ۔ یعنی توریت۔ قرآن مجید میں مطلق الکتب کا لفظ علاوہ قرآن کے توریت کے لیے بھی آیا ہے۔

اَلْفُرْقَانَ۔ فرقان اپنے لفظی معنی میں ہر وہ چیز ہے جس سے حق وباطل کے درمیان فرق کیا جا سکے۔
کل ما فرق به بين الحق والباطل فهو فرقان (لسان)

اَلْفُرْقَانَ۔ قرآن کا بھی ایک نام ہے اس مناسبت سے کہ قرآن حق وباطل، حرام وحلال کے درمیان فارق ہے اور اسی مناسبت سے اس کا اطلاق علاوہ قرآن کے توریت وانجیل پر بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کتابیں بھی فارق ہیں بہ لحاظ عقائد حق وباطل کے درمیان، بہ لحاظ اقوال صدق وکذب کے درمیان اور بہ لحاظ اعمالِ نیک وبد کے درمیان (راغب) اس مقام پر الفرقان کی متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بےشک تم لوگوں نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا اپنی گوسالہ

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

پرستی سے سو اب اپنے خدا سے توبہ کرو پھر اپنے اشخاص کو قتل کرو

منشا یک یہ کہ اکتاب ... واو، دان کے درمیان عطف تفسیری ہے اور مراد دونوں سے ایک ہی ہے یعنی توریت. توریت ہی کی دو صفتیں ہیں. ایک صفت کتابیت، دوسری صفت فرقانیت اول کے لحاظ سے وہ الکتاب ہے اور دوسری کے لحاظ سے الفرقان.

هو الجامع بين كونه كتابا منزلا و فرقانا يفرق بين الحق و الباطل يعني التوراة الكتاب الفرقان ... والواو زائدة يعني الكتاب الفرقان (معالم عن الكسائي)

۲. دوسرے یہ کہ اس سے مراد یہاں توریت اپنے احکام و شرائع کے لحاظ سے ہے. ابن عباسؓ اور بہت سے تابعین کا یہی مذہب ہے. یہ قول قول اول سے معنیً بالکل ملتا ہوا ہے.

۳. مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئے تھے (مثلاً معجزۂ عصا، معجزۂ یدِ بیضا وغیرہا) یہی مذہب مجاہد تابعی کا ہے.

انه معجزات الفارقة بين الحق والباطل (روح)

۴. مراد وہ فتح و غلبہ ہے جو بنی اسرائیل کو حکومتِ فرعونی کے مقابلہ میں عطا ہوا تھا.

النصر والفرج الذي اتاه الله بني اسرائيل على قوم فرعون (كبير) الفرقان الفرج من الكرب لانهم كانوا مستعبدين مع القبط (قرطبي)

یہود کا عقیدہ ہے کہ لکھی ہوئی کتاب توریت کے علاوہ زبانی بھی بہت سے اسرار و مسائل کی تعلیم حضرت موسیٰؑ کو ہوئی تھی اور وہ ان کے بعد سے سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ان کی قوم میں منتقل ہوتے چلے آئے ہیں. سو یہود کے نقطۂ خیال سے فرقان سے مراد اس علم سفینہ کے علاوہ یہ علم سینہ ہے.

ف (یعنی اس کے کہ بنی اسرائیل شرک اور گوسالہ پرستی کے مرتکب ہو چکے تھے)

ف (کہ توحید جیسی دولت بے بہا پا کر پھر شرک اور مخلوق پرستی کی سفلیت پر اُتر آئے)

ف فَتُوْبُوْٓا میں فاء سببیہ ہے کہ نہ انھوں نے ظلم کیا ہوتا نہ آج توبہ کی نوبت آتی.

والفاء للسبب (بيضاوي) لان الظلم سبب للتوبة (بحر)

توریت میں اس موقع پر ہے :-

"اور موسیٰ نے کہا آج خداوند کے لیے اپنے تئیں مخصوص کرو، ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور بھائی پر حملہ کرے تاکہ وہ تمہیں برکت دیوے" (خروج ۳۲ : ۲۹)

بَارِئِكُمْ. اسماء حسنیٰ میں سے ایک اسم البارئ بھی ہے جو قرآن مجید میں صرف تین جگہ آیا ہے. دو جگہ تو اسی

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز نہ باور کریں گے تمہارے (کہنے سے ۱۸۳) جب تک

الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

ہم خدا کو دیکھ نہ لیں علانیہ ۱۸۴ سو (اس پر) تم کو آپکڑا کڑک نے ۱۸۵ اور تم (اس کا آنا) دیکھ رہے تھے ۱۸۶

قانون فوجداری کے شدید مجرموں، لٹیروں، ڈاکوؤں، نقب زنوں کو محض معافی طلب کرنے پر چھوڑ دیتی ہے۔

۱۸۰ (اور اس خیریت اور بہتری کا ظہور آخرت میں ہوگا)
خَیْرٌ سے اشارہ یہاں نجات، مغفرت اور گناہ کی گندگی سے پاک صاف ہونے سے ہے یہاں ذکر خیال رہے کہ اسلامی نہیں اسرائیلی ضابطۂ شریعت کا ہو رہا ہے۔

۱۸۱ (من حیث القوم)
تَابَ عَلَیْکُمْ یعنی تمہاری توبہ من حیث القوم قبول کر لی سزا صرف انہیں افراد کو ملی جو شرک کے مجرم واقعۃً اور علانیۃً تھے، آبادی کا بڑا حصہ جو صرف اپنی خاموشی سے شریک جرم رہا، اس کی خطا معاف ہوگئی۔

۱۸۲ دنیا کی بہت سی گمراہ قوموں کا یہ عقیدہ رہ چکا ہے اور اب بھی ہے (مثلاً بدھ مذہب والوں کا) کہ خدا کو معاف کردینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ وہ خود قانون مکافاتِ عمل کا پابند ہے مسیحیت بھی اسی اساسی گمراہی میں مبتلا ہے، خدا چونکہ از خود کسی کو معاف نہیں کرسکتا اور اپنی رحم دلی کی بنا پر چاہتا ہے معاف کردینا، اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو سب کی طرف سے بطور کفارہ سزا دے دی، اور دوسروں کو معاف کردیا، یہودیت نے بھی خدا کی قہاریت پر اتنا زور دیا کہ اس کی رحمت و رحمانیت کی تصویر بالکل دھندلی پڑگئی۔ قرآن مجید نے توبہ و قبولِ توبہ اور رحمتِ الٰہی کی وسعت پر بار بار زور دے کر ان ساری گمراہیوں کی تردید کردی۔
التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ دونوں پر حاشیے گزر چکے۔

۱۸۳ (کہ جو مخاطبہ تم سے ہوا وہ مخاطبۂ الٰہی ہی تھا، اور جو کلام تم ہمیں سناتے ہو وہ کلامِ الٰہی ہی ہے)
قُلْتُمْ "تم نے کہا تھا" یعنی تمہاری قوم کے ستر بڑے بوڑھے نمائندوں نے۔

والقائلون ھم السبعون الذین اختارھم موسیٰ للمیقات (بیضاوی) لن نؤمن لک ای لاجل قولک (بیضاوی)

تاریخ اسرائیل کے اہم ترین واقعات دہرائے جارہے ہیں اور اسرائیلیوں پر حجت ان کی قومی تاریخ سے قائم کی جارہی ہے اب ذکر اس وقت کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا میں ستر بزرگان قوم کو ہمراہ لے کر لشکرگاہ سے کوہ طور پر گئے ہیں۔ دامنِ کوہ میں انہیں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے ہیں اور مکالمہ و مخاطبۂ الٰہی سے مشرف ہونے کے بعد اس کی اطلاع اور خوشخبری ان بزرگانِ قوم کو پہنچائی ہے۔

۱۸۴ (اپنی انہیں مادی اور ظاہری آنکھوں سے)
گویا اللہ تعالیٰ بھی کوئی مادی جسم رکھتا ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کرسکتا ہے، اور گویا رسول کے حواس ع

بشری حواس سے کسی طرح بھی ممتاز نہیں ہوتے۔ اس لیے جو کچھ وہ دیکھ اور سن سکتا ہے وہی سب ہی دیکھ اور سن سکتے ہیں

۱۸۵ (اس گستاخانہ مطالبہ کی پاداش میں)

لفرط العناد والتعنت وطلب المستحیل۔ (بیضاوی)

اَخَذَتْکُمُ پکڑ لیا تم کو یعنی انھیں ستر بزرگان قوم کی جماعت کو۔ معتزلہ نے آیت سے استدلال کیا ہے کہ رؤیت باری ممکن ہی نہیں، ورنہ اگر جائز ہوتی تو اس سوال پر سرداران اسرائیل کو اتنی سخت سزا ملتی لیکن اہل سنت کا مذہب ہے کہ رؤیت باری جنت میں تو مومنین کو ہو ہی کر رہے گی۔ ہاں دنیا میں بھی مخصوص افراد کو بہ طور فضل خاص ممکن ہے، البتہ ہر جہت جسم اور مادی کم و کیف سے پاک :۔

وقد اختلف فی جواز رؤیۃ اللہ تعالیٰ فاکثر المبتدعۃ علی انکارھا فی الدنیا والآخرۃ واھل السنۃ والسلف علی جوازھا فیھما ووقوعھا فی الآخرۃ (قرطبی) الممکن ان یری رؤیۃ منزھۃ عن الکیفیۃ وذلک للمؤمنین فی الآخرۃ ولافراد من الانبیاء فی بعض الاحوال فی الدنیا (بیضاوی)

رہی ان کی یہ سزا تو اس کے اسباب بالکل دوسرے ہیں مثلاً یہ کہ وہ پیغمبر کی بات کو جھٹلا رہے تھے (حالانکہ ظہور معجزات و دلائل کے بعد پیمبر پر ایمان لانا فرض ہو جاتا ہے) یا یہ کہ وہ سوال اپنے رفع جہل کے لیے نہیں بلکہ بہ طور انکار از راہ عناد کر رہے تھے۔

انما عوقبوا بکفرھم لانھم امتنعوا عن الایمان بموسیٰ بعد ظہور معجزاتہ والایمان بالانبیاء واجب بعد ظہور معجزاتھم ولانھم لہ، یسألوا سوال استرشاد بل سوال تعنت وعناد (مدارک)

۱۸۶ توریت میں ہے :۔

"اور یوں ہوا کہ تیسرے دن صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا اُمڈی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی چنانچہ سب لوگ ڈیروں میں کانپ کانپ گئے۔" (خروج ۔ ۱۹ : ۱۶)

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ مفسر ابن حیان نے کہا ہے کہ یَنْظُرُوْنَ عربی میں یَنْتَظِرُوْنَ کے معنی میں بھی آتا ہے اس لیے اگر کوئی یہ مراد لے کہ "تم سوال رؤیت کے مقبول ہونے کا انتظار کر رہے تھے" تو اس معنی کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے اگرچہ کسی سے یہ مفہوم منقول نہیں۔

ولکن ھذا الوجہ لیس بمنقول فلا نجسر علی القول بہ وان کان اللفظ یحتملہ (بحر)

الصاعقۃ سے یہاں مراد موت کا ہونا اگرچہ اکابر سے منقول ہے لیکن امام رازی نے اس معنی کے لینے میں خاصی جرح کی ہے، ان کا ایک استدلال یہ ہے کہ یہی لفظ قرآن مجید میں خود حضرت موسیٰؑ کے لیے استعمال ہوا ہے خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا لیکن وہیں فَلَمَّآ اَفَاقَ بھی وارد ہوا ہے اور معلوم ہے کہ افاقہ موت سے نہیں صرف غشی سے ہوتا ہے اور اسی سے ملتا ہوا کلام ابن جریر طبری کا بھی ہے :۔

وانہ تعالیٰ قال فی حق موسیٰ وخر موسیٰ صعقا اثبت الصاعقۃ فی حقہ مع انہ لم یکن میتا لانہ قال فلما افاق والافاقۃ لا تکون عن الموت بل عن الغشی (کبیر) ومما یدل علی انہ قد یکون مصعوقا وھو حی غیر میت قول اللہ تعالیٰ وخر موسیٰ صعقا یعنی مغشیا علیہ (ابن جریر)

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۶)

پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا تمہارے مرے پیچھے ۱۸۰ کہ شاید تم شکر گزار ہو ۱۸۱

صاعقہ کے اصل معنی شدید فضائی آواز (کڑک، گرج) کے ہیں، اس سے بھی وہی مفہوم موت اور عذاب اور آگ کے پیدا ہو گئے ہیں:۔

والصاعقة هي الصوت الشديد من الجو ثم يكون منه نار فقط او عذاب او موت (راغب)

اور دوسرے متقدمین مفسرین کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی وسیع مفہوم رکھتا ہے اور ان کی تحقیق بھی اس باب میں کچھ ایسی ہی ہے۔

واصل الصاعقة كل امر هائل رآه او عاينه او اصابه حتى يصير من هوله وعظيم شانه الى هلاك وعطب والى ذهاب عقل وغمور فهم وفقد بعض آلات الجسم صوتا كان ذلك او نارا او زلزلة او رجفا (ابن جریر)

ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ موت سے مراد جہل ہے اور بعث سے مراد عطائے علم ہے:۔

وقيل احييناكم من بعد موتكم علما كم بعد جهلكم (قرطبی) وكذلك اذا حمل الموت على الجهل ... تارة عن اماتة ... وعن الجهل بالموت (بحر)

۱۸۰ یہ احیاء حضرت موسیٰ کی سفارش پر ہوا تھا، اسرائیلی روایات اس باب میں خاموش ہیں۔

بَعَثْنٰكُمْ ۔ جلا اٹھایا تم کو" یعنی انہیں ستر بزرگان قوم کو۔

بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ۔ موت اور بعث دونوں کے کھلے ہوئے معنی مرنے اور جی اٹھنے کے ہیں اور یہی اہل تفسیر نے عموماً سمجھا ہے بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ بعد موت کی قید لگائی ہی اس لئے گئی کہ "بعث" کو کوئی غشی یا نیند کے بعد نہ سمجھے

اي احييناكم (قرطبی) ماتوا وذهبت ارواحهم ثم ردوا لاستيفاء آجالهم (قرطبی) وقيد البعث لانه قد يكون عن اغماء او نوم (بیضاوی) والموت هنا ظاهره مفارقة الروح الجسد وهذا هو الحقيقة (بحر)

لیکن بعض تفسیروں میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ موت حقیقی نہ تھی، بلکہ بیہوشی کی قسم سے مجازی موت تھی، اور بعث سے بھی مراد اس غشی سے افاقہ ہے۔

من جعل البعث الاقامة من الغشية ويخرج على قول من قال انهم صعقوا ولم يموتوا (روح) فيه موانع سلك المجاز مجازا وعبّر بالموت عن الغشي وبالبعث عن الافاقة (بحر) ومن الناس من قال كان هذا الموت غشيا وهذا الاول نا حقيقة (روح) وقيل ماتوا موت همود يعتبر به الغيرة ثم ارسلوا واصل البعث الارسال (قرطبی)

۱۸۱ (اور آئندہ توحید اور ایمان پر پوری طرح قائم رہو)

بعض تفسیروں میں بیان یہ قصہ نقل ہوا ہے کہ یہ ستر اشخاص بعد کو حضرت موسیٰؑ کی دعا سے نبی ہو گئے لیکن یہ قصہ بے اصل ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى

اور ہم نے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کر دیا ۱۸۹؎ اور ہم نے تمہارے اوپر من وسلویٰ اتارا ۱۹۰؎

ھذ غریب جدًّا (ابن کثیر) وھو بعید۔ (روح)

۱۸۹؎ (تمہیں آفتاب کی تپش سے بچانے کے لیے جب کہ تم صحرائے سینا میں بھٹک رہے تھے)
جزیرہ نمائے سینا جیسے ریگستانی ملک اور چٹیل میدان کی دھوپ میں سایہ میسر آجانا واقعی سایۂ رحمت سے کم نہیں توریت میں ستونِ ابر اور ستونِ آتش دونوں کا ذکر بطورِ معجزہ کے ہے بسیاقِ قرآنی سے معجزہ کا پہلو لازم نہیں آتا۔ ذکرِ عام نعمتوں کا ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر ان کی تاریخ کے اہم ترین دور میں برابر نازل ہوتی رہیں اور قرآن مجید نے عام متقل اور بذریعۂ طبعی اسباب پیدا شدہ نعمتوں کو کہیں بھی معجزانہ وخارقانہ نعمتوں سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ توریت میں ہے:

"اور خداوند دن کو بدلی کے ستون میں تاکہ انہیں راہ بتائے اور رات کو آگ کے ستون میں ہو کے تاکہ انہیں روشنی بخشے۔ ان کے آگے چلا جاتا تھا، تاکہ دن رات چلے جائیں اور بدلی کا ستون دن کو اور آگ کا ستون رات کو ان کے آگے سے ہرگز نہ اٹھاتا تھا۔" (خروج ۱۳: ۲۱ و ۲۲)

روایاتِ یہود میں حسبِ بیان جیوش انسائیکلو پیڈیا (جلد ۴ صفحہ ۱۲۳) یہ تصریح بھی موجود ہے کہ بنی اسرائیل جب کثرتِ معاصی میں مبتلا ہو جاتے تھے تو یہ ابر اُن پر سایہ کرنا چھوڑ دیتا تھا۔

الْغَمَامَ۔ قرآن مجید نے اسے محض ابر بتایا ہے یہود اسے تختِ خداوندی سمجھتے تھے۔
غمام مطلق ابر نہیں ہے، سحاب کی لطیف ترین ونفیس ترین شکل کا نام ہے۔

عن مجاھد قال لیس بالسحاب (ابن جریر) عن ابن عباس قال وغمام ابرد من ھذا واطیب (ابن جریر)
عن مجاھد وکانہ یرید واللہ اعلم انہ لیس من زی ھذا السحاب بل احسن منہ واطیب واھی منظرا (ابن کثیر)

۱۹۰؎ (اسی دشتِ سینا میں)
أَنْزَلَ۔ اُتارا سے یہ مراد لازمی طور پر نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی غیر طبعی معجزانہ طریق پر اُتری ہو، پانی، باس، لوہا، کھانے کے سامان وغیرہ جو اپنے معمولی اور طبعی طریقوں پر انسان کے کام کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان سب کے لیے قرآن مجید کی زبان میں اُتارنے ہی کا لفظ آیا ہے۔
اہلِ لغت نے بھی کہا ہے کہ نعمت ہو یا مصیبت بندوں پر اللہ کی طرف سے اس کے نزول کے معنی صرف عطاء کے ہوتے ہیں۔

فانزال اللہ نعمہ ونقمہ علی الخلق اعطاء ھم ایاھا۔ (راغب)

بلکہ یہ عطا خواہ براہِ راست ہو خواہ بالواسطہ یعنی محض اس کے اسباب کی فراہمی ان سب کے لیے فعل انزال ہی آتا ہے
وذلک بانزال الشئ نفسہ واما بانزال اسبابہ والھدایۃ الیہ (راغب) ثم ان انزال الشئ قد یکون نفسہ وقد تکون بانزال اسبابہ والھدایۃ الیہ (تاج)

الْمَنّ۔ اہلِ لغت کی تحقیق میں یہ ایک میٹھی رطوبت تھی جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔

المن شئ کالطل فیہ حلاوۃ یسقط علی الشجر (راغب)

عربی میں اسم جنس ہے خیر و شر کی طرح جس کا واحد نہیں آتا۔

اسم جنس لا واحد له من لفظه مثل الخير والشر قاله الاخفش۔ (قرطبی)

منّ اس کے متعدد بیان کئے گئے ہیں، میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین کے مرادف ہے۔

الترنجبين وعلى هذا اكثر المفسرين (قرطبی) الاكثرون على ان المن هو الترنجبين (معالم)

اور ترنجبین سے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی لذیذ اور دانہ دار آسمان سے گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے۔

الترنجبين طل يقع من السماء وهو ندى شبيه بالعسل جامد متحبب (مفردات ابن البیطار)

بہرحال اتنا یقینی ہے کہ کوئی لذیذ قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانہ میں بلا مشقت و تعب مل جاتی تھی، توریت کی تصریحات اس بارہ میں حسب ذیل ہیں:۔

"صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ منّ ہے، کیونکہ انھوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسٰی نے انھیں کہا کہ یہ روٹی ہے، جو خداوند نے کھانے کو تمھیں دی ہے" (خروج۔ ۱۶: ۱۴ و ۱۵) "اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام منّ رکھا۔ اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید تھی اور مزہ اس کا شہد میں ملی ہوئی پھلوری کا تھا" (خروج۔ ۱۶: ۳۱) "اور منّ سوکھے دھنیے کی مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانہ کا سا تھا، لوگ ادھر ادھر جا کر اُسے جمع کرتے تھے اور چکی میں پیستے تھے یا اوکھلی میں کوٹتے تھے اور ہانڈیوں میں پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے، اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا، اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی تو منّ بھی ان پر پڑتا تھا۔" (گنتی۔ ۱۱: ۸۔ ۱۱)

سَلْوٰی، ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، گرمی میں شمال کی جانب چلا جاتا ہے، جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے، اُڑتا اونچا نہیں، بہت نیچے رہتا ہے، تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۰، ص ۲۸۵) اس کا شمالی سفر مصر سے فلسطین کی جانب عموماً مارچ میں ہوتا ہے اور جنوبی فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں۔ اسرائیلی بٹیر وہ تھے جو مارچ اپریل میں رات کے وقت اپنے شمالی پرواز میں ہوتے ہیں، بحر قلزم شمال میں جہاں دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، وہاں تک یہ اپنے سالانہ اڑان میں آتے ہیں اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کا راستہ اختیار کرتے ہیں، سمندر کی ہوا ان کی بے شمار تعداد بہ آسانی اسرائیلیوں کے ڈیروں تک لے آتی تھی (ڈکشنری آف دی بائبل، از ڈاکٹر ہیسٹنگز، جلد ۴، ص ۱۸) ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے، رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، کالم ۳۹۹۰)

واضح رہے کہ سارے رکوع میں اور اس کے بعد بھی ذکر بنی اسرائیل کے ساتھ حق تعالیٰ کے معاملات کا ہے اور ان معاملات کو حق تعالیٰ نے بطور اپنے احسانات و انعامات کے گنایا ہے۔ ضرور نہیں کہ یہ سارے واقعات اپنے عام طبیعی اسباب سے ہٹ کر بصورت معجزات ہی پیش آئے ہوں۔ اصل مقصود یہاں احسانات و انعامات خداوندی کی یاد دہی ہے خواہ وہ حسب عادت ہوں، خواہ بطور خرق عادات یعنی قانون تکوینی کی عام دفعات کے ماتحت یا کسی خصوصی دفعہ کے مطابق ہوں۔ تجربے

كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ

کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ۱۹۱ اور انھوں نے زیادتی ہم پر

يَظْلِمُونَ ۝۵۰

نہیں کی بلکہ زیادتی اپنی ہی جانوں پر کرتے رہے ۱۹۲

ابر کی سایہ افگنی، منّ وسلویٰ کے نزول اور چٹان سے چشمے کی روانی، سب کو معجزات میں شمار کیا ہے، لیکن کسی کی تحقیق میں اگر یہ سب امور عام واقعات طبیعیہ ہی میں داخل ہوں اور ان کی توجیہ عام اور معمولی قوانین تکوینی کے ماتحت ہو جائے یا آج کل کی اصطلاح میں ان کے سائنٹفک اسباب دریافت ہو جائیں تو اس کا اثر ارشاداتِ قرآنی پر مطلق نہیں پڑے گا، ان کی احسانی اور انعامی حیثیت بہرصورت قائم رہتی ہے اور اسی کی تذکیر قرآن کا مقصود ہے۔ توریت میں البتہ اس کے برعکس سارا زور ان واقعات کی معجزانہ حیثیت پر ہے۔ نزول منّ وسلویٰ کے سلسلے میں یہ جو خیال عام طور پر قائم ہو گیا ہے کہ اسرائیلیوں کو بجز ان دو چیزوں کے اور کوئی غذا ملتی ہی نہ تھی اس حصر پر کوئی دلیل قرآن مجید سے موجود نہیں، قرآن مجید سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو غذائی نعمتیں ان لوگوں کے لیے عام تھیں، لیکن یہ کسی اور غذا کی نفی کو مستلزم نہیں۔ اسرائیلیوں کے ساتھ جانوروں کے جو جھنڈ اور گلے تھے ان سے اگر حیوانی غذا کا وہ کام لیتے ہوں تو اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہیں۔ ریگستان میں نباتاتی غذا سے البتہ وہ محروم تھے اور اسی کی انھوں نے اپنے پیغمبر سے فرمائش کی

۱۹۱ (اور ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو، روز کی روز خرچ کرتے رہو)

حکم اسرائیلیوں کو یہ ملا تھا کہ بلا ضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرتے جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ "ذخیرہ اندوزی" کی عادت یہودیوں کی آج کی نہیں، بہت قدیم ہے۔

طیّبٰت کی تحقیق کہیں آگے آئے گی، یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس کے تحت میں ساری پاکیزہ لطیف ولذیذ چیزیں آ گئیں۔ اسلام نے بعض خشک مذہبوں کی طرح انسان کو خواہ مخواہ بھوکے رہنے کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ لذائذِ دنیوی سے پوری طرح استفادہ کی ترغیب دی ہے بشرطیکہ اس سے کسی قانون الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

۱۹۲ (اس حکم کی خلاف ورزی کر کے)

جرم میں مبتلا، توکل سے ناآشنا اور نافرمانی کے عادی بنی اسرائیل سے تعمیل اتنے معمولی حکم کی بھی نہ ہو پائی، لگے ان غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرنے، ادھر لطیف غذائیں باسی ہو ہو کر سڑنے لگیں۔ توریت میں ہے:۔

"اور باوجودیکہ موسیٰ نے کہا کہ کوئی اس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے، وہ اس کے سننے والے نہ ہوئے اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا، سو اس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا۔" (خروج ۔ ۱۶: ۲۰)

یہود جو مشرک قوموں کے اثر سے عقیدۂ تجسیم کے قائل تھے یعنی خدا تعالیٰ کو بھی بشری اوصاف سے متصف جانتے تھے اور اس کے تاثر و انفعال کے معتقد تھے، انھیں یہ بار بار بتلانے اور یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ خدا تعالیٰ کسی نفع نقصان سے متاثر نہیں ہوا کرتا، یہ انسان ہی ہے جو احکام الٰہی کی نافرمانی کر کے نقصان اٹھاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا[۱۹۳] کہ اس بستی میں[۱۹۴] داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ پیو[۱۹۵] اور

الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾

دروازہ (شہر) میں عاجزی سے جھکے ہوئے داخل ہونا[۱۹۶] اور کہتے جانا توبہ ہے[۱۹۷] ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیک کرداروں کو مزید دیں گے

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ باوجود معاصی کے نعمتوں کا جاری رہنا استدراج اور سخت خطرناک ہے اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکا ہوا ہے چنانچہ وہ کثرت جاہ و مال کو علامت مقبولیت کی سمجھتے ہیں۔

۱۹۳ؔ (بنی اسرائیل سے ان کے پیمبر کی وساطت سے)

یہ واقعہ اگر حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ہے تو وہی مراد ہیں اور اگر ان کے بعد کا ہے تو ان کے جانشین حضرت یوشعؑ۔ قرآن مجید جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے توریت کے بعض حصوں کی طرح تاریخ کی کوئی کتاب نہیں اس لیے اس کے بیانات میں تسلسل زمانی اور ترتیب تاریخی ہرگز ضروری نہیں۔ اس کا مقصود نتائج اور عبر ہیں اور ان سے اخلاقی و روحانی سبق، نہ کہ واقعات کی روئیداد۔ اس ایک حقیقت کو پیش نظر نہ رکھنے سے یہود و نصاریٰ آج قرآن فہمی میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ یہ واقعہ جس کا ذکر اس شروع ہو رہا ہے تاریخ اسرائیل ہی کا ایک مسلم واقعہ ہے زمانہ تاریخی اس کا جو بھی ہو۔

۱۹۴ؔ یہ بستی کون سی تھی؟ ممکن ہے کہ فلسطین کا مشہور شہر اریحا ہو جو موجودہ نقشوں میں (JERICHO) کے نام سے ملے گا۔ یہ بحر مردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشعؑ کے زمانہ میں فتح کیا تھا۔ قدیم اثر کا رخ، بیت المقدس کے بعد پھر اسی شہر کی جانب ہے۔

قرية اريحا (ابن عباس) هي اريحا قرية من بيت المقدس (ابن جرير۔ عن ابن زيد)

اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لیے گئے ہیں۔ بعض شہروں کے نام تک اب بدل گئے ہیں۔ مثلاً ایلہ کہ اب اسے عقبہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مراد شہر شطیم ہو یہ علاقہ موآب میں واقع ہے جو بحر مردہ کے مشرق میں ہے شہر دریائے یردن کے مشرقی (بائیں) کنارہ پر ہے۔ بحر مردہ کے شمال و مشرق میں۔ بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانہ میں یہ شہر گویا ان کا سرحدی ناکہ تھا۔ عربی میں اسے وادی الشار بھی کہتے ہیں اور وادی ستی م بھی بعض مفسرین نے جو دروں کا نام لیا ہے اس سے بھی یہی مراد معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۵ؔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر خوب وسیع اور خوب آباد و پُر رونق تھا۔ آیت کی تصریح سے یہ اشارہ بھی نکل آیا کہ کھانے پینے کی آزادیاں شریعت الٰہی میں ہمیشہ رہی ہیں بشرطیکہ حدود سے باہر خواہ مخواہ نکل نہ جائے۔

۱۹۶ؔ (بہ طور اظہار عجز و نیاز و عبودیت کے) کہ یہی شان مومنین مخلصین کی ہے۔

الْبَابَ۔ دروازہ سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے اردگرد ایک بلند چار دیواری شہر پناہ کے نام سے مشہور ہوتی تھی شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ کے پھاٹک سے گزرنا ہوتا تھا۔

سُجَّدًا۔ یہاں اپنے لغوی معنی میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ سجدۂ نماز کی ہیئت مخصوص مراد نہیں

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ

پھر زیادتی کرنے والوں نے جو انہیں بتلایا گیا تھا اس کے خلاف ایک دوسرا کلمہ بدل ڈالا ۱۹۹ سو ہم نے ان زیادتی

ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

کرنے والوں پر ایک بلا آسمان سے نازل کی ۲۰۰ اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے ۲۰۱

سجدًا ای منزللین متعادین (راغب) خاشعة خاضعة (ابن جریر۔ عن ابن عباس)

وارید به الخضوع وهو الاقرب (کبیر) بل هو امنحنین خضوعا لا علی هیئة متعینة (قرطبی)

توریت اس اہم جزو کے تذکرے سے خالی ہے۔

۱۹۷ گویا زبان بھی قلب و اعضاء کی طرح اظہارِ تذلل کرتی رہے۔ یہ فرق ہے اللہ والوں کے لشکر اور دنیادار بادشاہوں کے لشکروں کے داخلے میں۔ ایک کے ہاں قومی بینڈ اور ترانے بجتے ہوتے ہیں یعنی قدم قدم پر قومی شیخی اور وطنی بڑائی کا اظہار۔ دوسرے کے ہاں قلب خشوع سے لبریز اور زبان پر تسبیح۔

قُوْلُوْا حِطَّةٌ سے یہ مراد نہیں کہ بعینہٖ لفظ حِطَّة کا تلفظ ادا کرتے جاؤ۔ یہ لفظ تو عربی ہے اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں عبری یا عبرانی تھی۔ مراد یہ ہے کہ انہیں زبان سے بھی کلمات توبہ و استغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا

وقد روی عن ابن عباس انهم امروا بهذه اللفظة بعینها وهذا محتمل ولکن الاقرب خلافه

لوجهین احدهما ان هذه اللفظة عربیة وهم ما کانوا یتکلمون بالعربیة وثانیهما وهو الاقرب ثم

مرواما بقولوا قولا دالا علی التوبة والندم والخضوع (کبیر) ولا تتوقف التوبة علی ذکر لفظة بعینها (روح)

اور ایسا ہی صاحب بحر نے بھی کہا ہے، قرطبی کی "احکام القرآن" اور ابن العربی مالکی کی "احکام القرآن" میں یہاں طویل بحث اس کی موجود ہے کہ آیا شریعت کے الفاظ میں تبدیلی جائز ہے؟ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ جہاں الفاظ ہی تعبدی ہوں یعنی حکم انہیں الفاظ ہی کا ہو وہاں تبدیلی جائز نہیں جہاں اصل مقصود معانی ہوں وہاں لفظی تبدیلی جائز ہے بشرطیکہ معنوی تغیر تک نہ پہنچ جائے۔

۱۹۸ یعنی ان لوگوں کو جو نیک کاری میں اخلاص کامل سے لگے ہوئے ہیں۔ عفو و مغفرت کا وعدہ تو سب ہی توبہ کرنے والوں سے ہو چکا۔ اس کے بعد یہ ذکر مزید فضل و کرم کا ہے۔

۱۹۹ یعنی جو الفاظ انہیں تلقین کیے گئے تھے انہیں چھوڑ چھاڑ کچھ اور کلمے ہزل اور تمسخر کے زبان پر لانے لگے۔ یہ کلمے کیا تھے اس میں روایتیں مختلف ہیں مگر ماحصل سب کا ایک ہی ہے کہ بجائے توبہ و انابت کے اب وہ کام تمسخر و استہزاء سے لے رہے تھے۔

ومعنی الآیة انهم وضعوا مکان ما امروا به من التوبة والاستغفار قولا مغایرا له مشعرا

باستهزاء هم بما امروا به کل ذلک عدم مبالاة باوامر الله (بحر)

۲۰۰ رِجْزًا۔ رجز نام ہے ہر عذاب کے لئے خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔

الرجز ھو العذاب (راغب)
لفظ کی تنوین عذاب کی شدت وہیبت کے اظہار کے لیے ہے۔
والتنوین للتھویل والتفخیم۔ (ابو سعود)
مِنَ السَّمَآءِ، سے مراد یہ نہیں کہ وہ عذاب برف باری وغیرہ کی طرح آسمان سے نازل ہوتا ہوا دکھائی دیا، مگر یہ فقرہ اس حقیقت کے نمایاں کرنے کے لئے ہے کہ وہ عذاب آسمانی حاکم کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ محض اسباب سے طبعی طور پر پیدا نہیں ہو گیا تھا۔
ای مقدر من السماء (بیضاوی)
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، کی تکرار آیت میں ان ظالموں کے ظلم کو نمایاں کرنے کے لئے ہے۔
فی تکریر الذین ظلموا زیادۃ فی تقبیح امرھم وایذان بان انزال الرجز علیھم لظلمھم کما
ولم یضمرہ تعظیما للامر۔ (قرطبی)
یہ عذاب تھا کس صورت میں؟ ہمارے ہاں روایتیں طاعون کی نقل ہوئی ہیں۔
بعث اللہ علیھم الطاعون (کبیر عن ابن زید) الطاعون (کبیر عن ابن وھب) والمراد بہ الطاعون (سعودی)
تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر بار بار آیا، اور بائبل میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ آیت ماقبل میں اگر قریہ سے مراد شہر سطیم ہی لیا جائے جو موآب کے علاقہ میں ہے تو اس طاعون کا تو مفصل ذکر بائبل میں موجود ہے:۔
"سو اسرائیل سطیم میں مقیم ہوئے اور ان لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کی اور انہوں نے اپنے معبودوں کی قربانی پر لوگوں کی دعوت کی، لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا۔ اور اسرائیلی بعل فغور سے لے۔ تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا" (گنتی۔ ۲۵: ۲-۴)
"وہ جو اس وبا میں مرے چوبیس ہزار تھے" (گنتی۔ ۲۵: ۹)
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ یعنی ان کی مسلسل نافرمانیوں کے باعث۔ ب یہاں سببیہ ہے۔
ای بسبب فسقھم (جلالین) ای بسبب فسقھم المستمر (ابو سعود)
کانوا یفسقون کا صیغہ دوام، عادت و استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔ یہاں یہ صاف کر دیا کہ طاعون کا اصل سبب طبی یا طبعی نہ تھا، روحانی یا اخلاقی بدپرہیزیاں یا نافرمانیاں تھیں۔ قانون تکوینی کی خلاف ورزی نہیں اصل باعث شریعت موسوی کی خلاف ورزی تھی ...... شریعت کی خوردبین نگاہ امراض و معاصی کے ان مخفی تعلقات تک بہ آسانی پہنچ جاتی ہے جو دنیا کے بڑے بڑے حاذق طبیبوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔
فقہاء نے آیت سے اہل بدعت کا ظالم اور سزاوار غضب ہونا نکالا ہے، بدعت کہتے ہیں دین حق میں ایسے نئے امر کے پیدا کرنے کو جس کا نشان اصل شریعت میں موجود نہ ہو اور قرطبی نے کہا ہے کہ جب لفظی تبدیلی یہ نوبت پہنچا دیتی ہے تو عملی تحریف کی شناعت کا کیا ٹھکانا!
والقول انقص من العمل فکیف بالتبدیل والتغییر فی العمل (قرطبی)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا مانگی ۲۰۲ سو ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا (فلاں) پتھر پر مارو ۲۰۳

۲۰۲ اب قوم اسرائیل فلسطین سے دور اور مصر سے الگ دونوں کے درمیان متعلق جزیرہ نمائے سینا کے لق ودق بیابان و ریگستان میں اپنے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ کوچ در کوچ کرکے ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک منزل سے دوسری منزل کو منتقل ہو رہی ہے۔ قدیم گلہ بان قوموں میں یہ دستور عام تھا اور آج بھی بہت سی خانہ بدوش قوموں میں عام ہے۔ خشک ملک اور پھر ملک کے جغرافیہ سے ناواقفیت، چلتے چلتے یہ لوگ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی نایاب تھا، اور ساتھ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ صورت حال کا ذرا تصور کیجیے، پیاس سے بے حال اور بیدم تو ہو ہی رہے تھے، مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے اور لگے اپنی جھنجھلاہٹ اور غصہ اپنے رہبر اور سردار حضرت موسیٰ پر اتارنے۔ توریت میں ہے:

"تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرا کیا، وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا، سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پیویں۔۔۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کرکے کہا کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں، وہ سب تو مجھے ابھی سنگسار کرنے کو تیار ہیں" (خروج۔ ۱۷: ۱-۴)

اور قدیم ترین یہودی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ہے:۔

"وہ مقام رفیدیم میں پہنچے جہاں پیاس کی شدت سے بیتاب ہو رہے تھے۔۔۔ یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا۔ اس پر لوگ غصہ میں بھر کر پھر موسیٰ پر ٹوٹ پڑے۔۔۔ لیکن وہ خدا کے آگے دعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہو گیا" (باب ۱ فصل ۲)

پھر بھی جب انسان، ہمت میں نہیں ہوتے جب تلاش کے بعد مایوسی ہو چکی تھی تو بجز دعا اور مناجات کے اور کیا کرتے؟

البتہ توریت ہی میں ایک دوسری جگہ مقام کا نام رفیدیم کے بجائے قادس (قدیش) درج ہے اور تفصیلات تقریباً سب وہی:

"بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے دشت صین کو آئی اور قادس میں رہنے لگی۔۔۔۔ وہاں جماعت کے لیے پانی نہ تھا، سو وہ جمع ہو کے موسیٰ و ہارون کے برخلاف ہوئے اور لوگ موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا۔۔۔ یہاں تو پینے کو پانی ہی نہیں، تب موسیٰ و ہارون جماعت کے سامنے سے جماعت کے خیمہ کے دروازے پر گئے اور منہ کے بل گرے"۔ (گنتی ۲۰: ۱-۴)

اسی بنا پر علماء اہل کتاب میں سخت اختلاف پڑ گیا کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا، وہ مقام کون سا تھا، لیکن بہرحال وہ مقام کوئی سا بھی ہو، اور ایک ہو یا دو ہوں، نفس اس واقعہ کا وقوع کوئی اختلافی و نزاعی مسئلہ نہیں اور یہ تاریخ بنی اسرائیل کے مسلمات میں سے ہے۔

اسْتَسْقٰى لفظی معنی ہیں کہ پانی طلب کیا، پانی کی تلاش کی اور مراد یہ ہے کہ پانی کے لئے دعا کی۔

ای دعالھم موسٰی بالسقیا۔ (کشاف)

مشہور ماہر اثریات سر فلنڈرز پٹری (PETRIE) تیس آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ ۱۹۰۴ء ۱۹۰۵ء میں اسی جزیرہ نمائے سینا کی تحقیق پر روانہ ہوئے، ان کے مشاہدات کا خلاصہ ایک دوسرے ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن کی زبانی سنیے:

"یہ جزیرہ نما علاوہ سیاہ اور سرخ رنگ کی پہاڑیوں سے لبریز ہے جس میں کہیں کہیں سبزہ زار بھی ہیں اور گہری گہری وادیاں اور شگاف جا بجا نخلستانوں کے ساتھ فاصلے جو نقشہ پر قریب قریب معلوم ہوتے ہیں ان ناہموار یو

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ

تو اس میں سے بارہ[۱۲] چشمے پھوٹ نکلے[۲۰۶] (اور) ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا[۲۰۷]

کے باعث علاوہ بڑے لمبے لمبے ہیں پینے والے پانی کے کافی ذخیرہ کی فراہمی کی مشکلات جو اسرائیلیوں کو اپنی صحرانوردی کے زمانہ میں پیش آئی تھیں آج بھی ان کا تجربہ ہو رہا ہے"۔

۲۰۵ (تاکہ اسی چٹان سے پانی کا چشمہ جاری ہو جائے)

پہاڑی چشمہ، پہاڑوں کے اندر سے پانی کے اُبلتے ہوئے دھارے ہر ایک کے مشاہدہ میں آچکے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب پانی کے لئے بارگاہ الٰہی میں عرض کی تو انہیں ہدایت ہوئی کہ فلاں پہاڑی تک چلے جاؤ وہاں چٹان پر اپنا عصا مارو پانی اُبلنے لگے گا۔ توریت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی جس سے چشمہ اُبلا حورب یا حریب میں واقع تھی۔

"خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریا پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے اور جا۔ دیکھ میں وہاں حورب کے چٹان پر تیرے آگے کھڑا ہوں گا تو اس چٹان کو مار یو۔ اس سے پانی نکلے گا تاکہ لوگ پیویں چنانچہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے یہی کیا"۔ (خروج ۱۷: ۵، ۶)

عَصَا معروف و متعارف معنی لاٹھی یا ڈنڈے کے ہیں۔ موسیٰ کے اس عصا کا ذکر قرآن مجید میں بکثرت آیا ہے۔ اس کے یہ کھلے ہوئے معنی چھوڑ کر ایک مجازی معنی (جو صرف عصا المسلمین وغیرہ کی ترکیب میں جائز ہے) "جماعت یا گروہ" کے کرنا لغت پر ظلم کرنا ہے۔

الْحَجَرَ سے مراد کوئی خاص چٹان ہے جو حضرت موسیٰ کے علم میں تھی۔

الاشارۃ الی حجر معلوم (کبیر) اللام فیہ للعھد (بیضاوی) کان حجرا معینا بدلیل انہ عرفہ بالالف واللام (معالم)

فَاضْرِبْ ضرب کے عام و معروف معنی مارنے کے ہیں۔ "چلنے" کے معنی اُسی صورت میں ہوتے ہیں جب فعل ضرب کا صلہ فِی کے ساتھ آئے مثلاً ضَرَبَ فِی الْاَرْضِ۔ بعض معاصرین نے آیت کا ترجمہ "اے موسیٰ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ" کیا ہے، جس طرح لغت و قواعد زبان کے خلاف ہے اسی طرح تاریخ کے بھی بالکل مخالف ہے اور اپنی تائید میں کوئی دلیل کسی قسم کی نہیں رکھتا، نہ عقلی نہ نقلی۔

۲۰۶ یعنی اس پہاڑی چشمہ سے بارہ دھارے یا بارہ[۱۲] ٹونٹیاں الگ الگ جاری ہو گئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے عین مطابق۔ بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں، قرآن نے کہاں سے گڑھ کر کہہ دیا؟ قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوا دیا۔ جارج سیل انگریزی میں قرآن کریم کا قدیم ترین مترجم ہے۔ آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے :-

"ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے، بتصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ[۱۲] مقامات سے نکلا تھا"۔

اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے :-

"چٹان میں اس وقت چوبیس[۲۴] سوراخ موجود ہیں جو بآسانی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ بارہ[۱۲] ایک طرف ہیں

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

کھاؤ پیو اللہ کے (دیے ہوئے) رزق میں سے، اور زمین پر شرارت نہ کرتے پھرو ۲۰۶

اور بارہ ان کے مقابل جانب ہیں۔

پادری ڈین اسٹینلی (DEAN STANLEY) نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بنفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات و تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف SINAI AND PALESTINE کے نام سے شائع کی اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

"یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور اس خمیدہ حصہ کے قریب بیچا کی وسیع وادی میں واقع ہے شگاف اور دراز جا بجا پڑے ہوئے ہیں کچھ منہ سے ہوئے ہیں کچھ بیچ دبے ہوئے گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں۔ اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس رہتے ہیں" سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے یہ اشارہ انھیں شگافوں کی طرح ہے (ص ۴۷-۴۶) عرب کے امی کی لائی ہوئی کتاب کے اعجاز کے قربان جائیے صدیاں گزر جانے پر اس کے بیان کی جزئیات تک کی تصدیق ہو رہی ہے اور وہ بھی منکرین و معاندین کی زبان سے۔

۲۰۵ اناس یعنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ہر گروہ نے۔

ای من کل سبط (بیضاوی) ای من قومہ الذی استقی لھم (بحر)

اُنَاس صیغۂ جمع ہے لفظاً اس کا کوئی واحد نظر نہیں آیا۔

جمع لا واحد لہ من لفظ (روح)

مَشْرَبَهُمْ یعنی اپنے لیے پانی لینے کی جگہ۔

ای عینھم التی یشربون منھا (کشاف) ای موضع شربھم (جلالین)

۲۰۶ جب قوم کی قوم قانون الٰہی کو چھوڑ کر اپنے ہوائے نفس کے مطابق کوئی روش اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ دنیا میں لازمی طور پر فتنہ و فساد، حرب و ضرب اور کثرت جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور امن انفرادی و اجتماعی دونوں طرح پر اٹھ کر رہتا ہے۔ فضل و انعام سے سیراب کر کے بنی اسرائیل کو ہدایت مل رہی ہے کہ جو فارغ البالی نصیب ہے اس کو غنیمت سمجھو۔ قانون الٰہی کی پابندی کرو۔ اس قانون کو توڑ کر امن نظام عالم میں اختلال کے باعث نہ ہو۔

رِزْقِ اللّٰهِ میں رزق کی نسبت اپنی جانب کر کے گویا ایک بار پھر انھیں جتا دیا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ سب خدا ہی کے فضل و عطا سے ہے۔ تمھارے زور بازو کا نتیجہ نہیں۔

لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ عثی کے معنی خود فساد میں حد سے گزر جانے کے ہیں۔

العثی شدۃ الفساد (قرطبی) العثی اشد من الفساد (معالم)

مُفْسِدِيْنَ جو ترکیب میں حال واقع ہوا ہے ہر پہلو سے فساد پر زور دینے کے لیے ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے ٢٠٧ سو اپنے پروردگار سے ہمارے

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ

لئے دعا کیجئے ان چیزوں کی جنھیں زمین اگاتی ہے ٢٠٨ ساگ ہوا، ککڑی ہوئی، گیہوں ہوا، مسور ہوئی، پیاز ہوا ٢٠٩

تکرر المعنی تاکیدٌ لاختلاف اللفظ (قرطبی)

عیث و عثی کے معنی ایک ہی ہیں۔ عثی لغتِ قرآنی ہے (قرطبی) ایک باریک فرق دونوں میں یہ ہے کہ عیث کا تعلق فسادِ حسّی سے ہے اور عثی کا فسادِ معنوی سے (راغب)

كُلُوْا..... الْمُفْسِدِيْنَ۔ اسلام سختیوں کا مذہب نہیں۔ حدود کے اندر رہ کر کھانے پینے کی پوری آزادیاں اس میں موجود ہیں۔ قرآن مجید نے بار بار اس کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ ترغیب بھی دی ہے۔ ممانعت جو کچھ ہے وہ صرف حدود سے تجاوز کرنے اور باعثِ فتنہ و فساد بن جانے کی ہے۔

٢٠٧ (اور لے کھانے کھاتے اکتا گئے ہیں)

یہ ذکر بھی اُسی دشتِ سینا کے زمانہ خانہ بدوشی کے کسی اور موقع کا ہے۔ قرآن مجید بیانِ واقعات میں ان کی تاریخی ترتیب کے تسلسل کا ہرگز پابند نہیں۔ بنی اسرائیل عرصہ دراز تک ایک ہی قسم کی غذا کھا کھا کر اکتا گئے تھے اور اب اپنے پیمبر سے فرمائش کر رہے تھے کہ اس بیابان سے نکال کر کہیں دوسری جگہ لے چلئے، جہاں قسم قسم کے شہری اور دیہاتی کھانے موجود ہوں۔ طَعَامٍ وَّاحِدٍ یعنی ایک ہی قسم کا کھانا۔ بٹیر اور ترنجبین جو انھیں ہر روز ملے چلا جاتا ہے۔ طعام واحد سے مراد ایک عدد طعام نہیں اس لئے کہ کھانے تو دو عدد تو انھیں بہر حال مل ہی رہے تھے بلکہ مراد ایک ہی قسم کا کھانا ہے جو انھیں ہر روز ملے جاتا تھا۔

ومعنی الطعام بالواحد مع انه نوعان لانهما طعام کل یوم والعرب تقول لمن یاکل کل یوم عدة الوان لا تغیر انه یاکل طعاما واحدا (المنار)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غذائے حیوانی تو انھیں روز ہی ملے جاتی تھی۔ اب اُس سے اکتا کر غلہ، سبزی وغیرہ چاہتے تھے چنانچہ اپنی فرمائش میں نام انھیں چیزوں کے گنائے ہیں۔

٢٠٨ (اور جن کے خوگر ہم مصر میں رہ چکے ہیں۔)

مصریوں کی مرغوب غذا اکثر زراعت پیشہ قوموں کی طرح یہی زمینی پیداوار تھی:۔

"مصر میں آج کی طرح اُس وقت بھی بڑی مانگ سبزی، پیاز، ہلدی وغیرہ کی تھی" (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کالم ١٢٠٠)

اور یہی چیزیں اسرائیلیوں کی بھی اصل غذا بن چکی تھیں:۔

"اسرائیلیوں کی اصل غذا سبزی تھی خصوصاً دال کی اقسام" (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ٥ ص ٤٣٠)

"قدیم اسرائیلی سبز ترکاریوں اور پھلوں پر بسر کرتے تھے" (۔ ۔ ۔ جلد ٥ ص ٥٩٦)

٢٠٩ توریت کی روایت اس سے ملتی جلتی، مگر کسی قدر مختلف حسب ذیل ہے:۔

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا

(موسیٰ نے) کہا تو کیا جو چیز ادنیٰ ہے تم اسے لینا چاہتے ہو اس چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے (تو خیر) کسی شہر

فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ

میں اُتر پڑو (وہیں) مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو۲۱۲ اور ان پر جما دی گئی ذلت اور محتاجی ۲۱۳

• اور بنی اسرائیل بھی پھرے اور روتے ہوئے بولے کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور پیاز اور وہ لہسن پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی، یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من۔ (گنتی ۔ ۱۱: ۴-۶)

فوم کے معنی گیہوں کے علاوہ لہسن کے بھی آتے ہیں۔

ھا ضمیر ہر جگہ اَرْض کی طرف راجع ہے۔ اُردو میں اس کا ترجمہ خلاف محاورہ ہونے کے سبب ساقط کر دیا گیا، جیسا کہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور مولانا تھانویؒ کے ترجمہ میں بھی یہی ساقط ہے۔

۲۱۲ (کہ بڑے شہروں میں سبزیاں اور پھل، علاوہ فصل اور موسم کے بھی مل جایا کرتے ہیں۔)

مِصْرًا۔ کوئی شہر۔ یہاں مراد جزیرہ نمائے سینا یا اُس کے مضافات کا کوئی آباد شہر ہے۔ مصر کے لفظی معنی شہر کے ہیں جس کی حد بندی ہو چکی ہو۔

اسم لکل بلد ممصور ای محدود۔ (راغب)

اور یہاں تو تنوین کے ساتھ کھلا ہوا اسم نکرہ ہے، لیکن بڑے بڑے فاضل انگریز مترجمین نے بے کھٹکے اس کا ترجمہ ملک مصر ہی کر ڈالا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انھیں سمجھایا کہ تمھاری فرمائش بیجا ہے، نامعقول ہے، جب دیکھا کہ اصرار جاری ہے تو پھر یہ کہا کہ اچھا اگر یہی منظور ہے تو شہری تمدن اختیار کرو۔ ساری گفتگو سمجھنے کے لیے قوم اسرائیل کے اس وقت کے طرز معاشرت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ صورت حال یہ ہے کہ مصر جیسے متمدن و مہذب ملک سے لاکھوں کی تعداد میں نکل تو آئے ہیں لیکن ابھی دوسرے مہذب و متمدن ملک اور اپنے قدیم وطن یعنی فلسطین (یا کنعان) تک نہیں پہنچ پائے ہیں بلکہ دونوں کے درمیان اور فلسطین کے جنوب میں جزیرہ نمائے سینا کے بیابان میں معلق ہیں۔ یہ علاقہ اس وقت تک غیر متمدن ہے۔ مکان، باغ، بازار، کھیت وغیرہ جو لوازم تمدن ہیں اس لق و دق بیابان میں کہیں موجود نہیں۔ اسرائیلی اس وقت مکانوں یا سکونت پذیر نہیں بلکہ اپنے خیموں ڈیروں کے ساتھ کہ آج یہاں سے کوچ ہے تو کل وہاں مقام، خانہ بدوشوں کی طرح ایک مستقل سفر اور مستمر نقل و حرکت اس بیابان میں کر رہے ہیں۔ البتہ بیابان کے خاتمہ کے بعد ملک مصر سے دور، اتنا اور بے آب و گیاہ نہیں، غیر بیابانی علاقے اچھے خاصے آباد تھے۔ اور شہری اور حضری تمدن کے نمونے موجود تھے۔ یہ علاقہ مصر کے زیر حکومت تھا گو برائے نام۔ مِصْرًا میں اشارہ اسی قسم کے کسی شہر کی طرف ہے۔

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ۔ استبدال کے معنی ہیں کسی شے کے بدلے میں دوسری شے کو طلب کرنا۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ

اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے ۲۱۳ یہ (سب) اس سبب سے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے انکار کرتے رہتے تھے

والاسم ال طلب شئ مدلا من احو۔ (المنار)

۲۱۱ ضُرِبَتْ کے معنی ہیں لیس دی گئی، مسلط کر دی گئی۔

ذِلَّةُ کے معنی ہیں خواری اور رسوائی اور مَسْكَنَةُ سے مراد ہے فقر اور محتاجی۔

الذلۃ الذل والصغار (قرطبی) المسکنۃ الفقر والفاقہ وشدید الحاجۃ (کبیر)

عَلَيْهِمُ۔ میں ضمیر هم کے مرجع کو خوب سمجھ لینا چاہئے یہ کون لوگ ہیں جن کے اوپر ذلت اور تنگ حالی مسلط کر دی گئی ہے، ضمیر کا مرجع الیھود یا الذین ھادوا نہیں بلکہ بنی اسرائیل ہے یعنی اس وعید کے مورد فلاں فلاں عقیدے رکھنے والے فلاں مسلک کے ماننے والے نہیں بلکہ اسرائیلی نامی ایک متعین قوم ونسل ہے سبحان اللہ ایک ذرا سا لفظ جان بلاغت ہے اس نے اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیا کہ جو ذلت، نکبت، افلاس ظہور قرآن پر قریب چودہ سو سال گزر جانے پر بھی ایک حد تک چپکی پڑی چلی آرہی ہے اس کی مورد وحامل ایک مخصوص نسل وقوم ہے نہ کہ کسی مخصوص مذہب وملت کے پیرو۔ خود لفظ ANTI-SEMITISM بتا رہا ہے کہ یہود سے جو مستقل عداوت نازی جرمنی کو خصوصاً اور روسی، ہنگری، رومانیہ وغیرہ کو رہ چکی ہے اس کی بنا نسلی یا قومی تھی نہ کہ دینی یا اعتقادی۔

مفلسی، محتاجی، تنگدستی کے انتساب پر عجب نہیں کہ ناظرین کو حیرت ہو اور سوال دل میں پیدا ہو کہ متمول تو یہود کا ضرب المثل ہے پھر اس قوم کو محتاج وتنگدست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ محض دھوکا اور عام طور سے چلا ہوا مغالطہ ہے۔ دولت وثروت جنسی بھی ہے۔ وہ قوم یہود کے صرف اکابر ومشاہیر تک محدود ہے، ورنہ عوام یہود کا شمار دنیا کی مفلس ترین قوموں میں ہے۔ یہ بیان خود محققین یہود کا ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"یہود کا متمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جن جن ملکوں میں آباد ہیں وہاں کی آبادی میں انہیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے" (جلد ۱۰ ص ۱۵۱)۔

"عوام یہود عموماً دوسری قوموں سے کہیں زیادہ غریب رہا ہے اور رہا ہے گو ان کے چند افراد بہت زائد دولت مند رہے" (جلد ۱۲)

۲۱۲ (اسی دنیا میں اپنی ہی جیسی مخلوق کے ہاتھوں)

بَآءُوْ کے معنی اور بھی کئے گئے ہیں، لیکن اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد استحقاق ہے۔

ای استوجبوا اللعنۃ (ابن عباس) ای استحقوا غضبا (بحر) ای استحقوا (کبیر)

نسل اسرائیل پر اس قدرتی غضب کا ظہور بار بار انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوتا چلا آرہا ہے اس آخر زمانہ میں ہٹلر جیسے جنگجو فرمانروا کی یہود دشمنی ویہود بیزاری اخبار بین وتاریخ خواں طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ عارف کے لئے اس قصہ میں بڑا سبق ہے ان لوگوں کے حال سے عبرت پکڑنا چاہئے انہوں نے بلا پر صبر کیا نہ نعمت پر شکر ادا کیا اور نہ قضائے الٰہی پر راضی رہے ایسوں پر ذلت طغیان مسلط کر دی گئی، محبت دنیا ان کے قلب میں بٹھا دی گئی اور انہیں درجات عالیہ سے گرا دیا گیا۔

يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

انبیاء کو ناحق قتل (تک) کر ڈالتے تھے ۲۱۴ یہ (سب) اس لئے ہوا کہ وہ نافرمان کرتے اور حد سے بڑھ بڑھ جاتے تھے

۲۱۳ لفظ یہاں کَفَرُوْا نہیں کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ استعمال ہوا ہے، ذکر کسی خاص موقع کا نہیں کہ اس وقت وہ منکر ہو بیٹھے تھے بلکہ ذکر ان کی مستقل قومی خصلت کا ہو رہا ہے کہ انکار کرتے ہی رہتے تھے، انکار کو شعار ہی بنا لیا تھا۔

ذٰلِکَ یعنی ان کا یہ مستحق غضب ہو جانا۔

اشارۃ الی ما سبق من ضرب الذلۃ والمسکنۃ والبوء بالغضب (بیضاوی۔ الکشاف)

اٰیٰتُ اللّٰہِ کا لفظ عام ہے۔ معجزات وخوارق بھی مراد ہو سکتے ہیں اور کتب آسمانی بھی۔

ای المعجزات مطلقا...... او الکتب المتلوۃ مطلقا (روح) المعجزات التسع وغیرھا او القرآن او جمیع آیات اللّٰہ المنزلۃ علی الرسل (بحر)

بِاَنَّھُمْ میں باء سببیہ ہے یعنی یہ سزا انہیں کفر عادی اور مسلسل قتل انبیاء کی پاداش میں ملی تھی۔

بسبب کفرھم بالمعجزات وقتلھم الانبیاء (بیضاوی)

۲۱۴ قتل تک "یعنی دوسری بیہودگیاں، شرارتیں، فتنہ پردازیاں تو تھیں ہی حد یہ ہے کہ قتل تک سے نہ چوکے، یسیعاہ نبی کا قتل، یرمیاہ نبی کا قتل، زکریا نبی کا قتل، یحییٰ نبی کا قتل اور عیسیٰ مسیح کا اقدام قتل (بلکہ اپنے خیال میں قتل ہی) یہ اسرائیل کی تاریخ جرائم کے چند جلی عنوانات ہیں۔ یہ قوم اس قابل رہ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی رعایتیں روا رکھی جائیں؟ اسے زندہ رہنے کی بھی کچھ مہلت دی جاتی؟

بِغَیْرِ الْحَقِّ نبی کا قتل تو جب ہو گا ناحق ہی ہو گا، نبی کے قتل جائز کی کوئی صورت ہی نہیں پھر قرآن جس میں ایک لفظ بھی بے کار یا بطور حشو نہیں اسے کیوں لایا؟ قرآن کا مقصود تو اس اضافہ سے یہ ہے کہ خود ان قاتلوں کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق و ناجائز تھے یعنی خلاف عدل تو خیر ہوتے ہی، قانون وقت کے لحاظ سے خلاف قانون اور بے ضابطہ بھی تھے!

ای عندھم ایضا (مدارک) قتلوھم من غیر ان کان ذلک القتل حقا فی اعتقادھم وخیالھم (کبیر) ای لم یاتوا الی قتلھم وجھا یستحقون بہ القتل عندھم (بحر)

بعض نے کہا ہے کہ اس تصریح سے مقصود قتل کے ناحق ہونے پر زور اور تاکید ہے۔

کان ھذا تعظیما للشنعۃ علیھم (قرطبی) تعظیم للشنعۃ والذنب الذی أتوہ (قرطبی)

سلسلۂ اسرائیلی کے خاتم نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، زمانہ بھی آپ کا نسبۃً بہت قریب کا ہے یعنی عہد تاریخی کے اندر کا، اس وقت کی تاریخ ایک اچھی حد تک محفوظ ہے، حال میں اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ روزیڈی (ROSADI) اور انگلستان کے ایک بیرسٹر انیس (INNES) نے قدیم کاغذات کی چھان بین کر کے آپ کے مقدمہ کی روداد الگ الگ شائع کی ہیں، یہ پڑھنے کے قابل ہیں، ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے سزائے صلیب کا فیصلہ سنانے میں کوئی اجتہادی غلطی ہو گئی، بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک بالکل جھوٹا استغاثہ گڑھا اور پہلے مذہبی عدالت میں، اور پھر ملک کی عام فوجداری عدالت میں بالکل ہی بے ضابطہ کارروائیاں کر کے سزا دلانے میں کامیاب

ہوگئے ـــــ رومی اور جیسے بھی کچھ ہوں آئین دوستی اور قانون پرستی تو ان کی شہرہ ہے جب ان تک کے عہد میں یہ اندھیر ہوا تو پھر قدیم ترین انبیاء کی مظلومیت کا کیا ٹھکانا جن کے قتل میں عجب نہیں کہ ضابطہ کی ظاہری اور رسمی صورت بھی نہ برتی گئی ہو۔
۲۱۵ اسرائیلیوں کے مسلسل تمرد، سرکشی، نافرمانی کے تذکروں سے توریت و انجیل دونوں کے صفحات لبریز ہیں، سب کی نقل کرنے کی نہ گنجائش نہ ضرورت۔ مشتے نمونہ از خروارے صرف دو چار نمونے دیکھتے چلئے:۔

"انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑا دیا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی، یہاں تک کہ خدا کا غضب ایسے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔" (۲ تواریخ ۳۶: ۱۶)

"تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمھارے نبیوں کو کھا گئی ہے" (یرمیاہ۔ ۲: ۳۰)

"اے آل یعقوب اور اہل اسرائیل کے سب خاندانو! خداوند کا کلام سنو۔ خدا یوں فرماتا ہے کہ تمھارے باپ دادوں نے مجھ میں کون سی ناانصافی پائی جو وہ مجھ سے دور بھاگے اور بطلان کے پیرو ہوئے اور آپ باطل ہوگئے" (یرمیاہ ۲: ۴ و ۵) "وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھیر لائیں قتل کیا اور انھوں نے کاموں سے تجھے غصہ دلایا" (نحمیاہ ۹: ۲۶)

یہ مختصر اور بہت ہی مختصر اقتباسات عہد قدیم کے نوشتوں سے تھے اب عہد جدید کے نوشتوں کے ایسے ہی مختصر نمونے ملاحظہ ہوں:

"اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو!.... نبیوں میں سے کس کو تمھارے باپ دادوں نے نہیں ستایا؟" (اعمال ۷: ۵۱ و ۵۲) "تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں..... دیکھو میں نبیوں داناؤں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا ہے تم پر آئے...... اے یروشلم! اے یروشلم! تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ہیں انھیں سنگسار کرتی ہے۔" (متی۔ ۲۳: ۲۹ و ۳۷۔ لوقا۔ ۱۲: ۳۴، ۳۵)

غرض توہین انبیاء اور پیمبرکشی کا الزام یہود پر قرآن مجید نے دنیا میں پہلی بار نہیں لگایا ہے ان کی فرد جرم کا یہ عنوان تو قدیم نوشتوں میں موجود چلا ہی آتا تھا، قرآن مجید نے محض اس کی تصدیق و توثیق کردی۔

ذٰلِكَ اس مکرر اسم اشارہ کا مشار الیہ کفر اور قتل انبیاء بھی ہو سکتا ہے اور عام اسباب اعتداء بھی۔

قبل الاشارۃ الی الکفر والقتل (بیضاوی) یجوز ان یشار بذالک الی الکفر وقتل الأنبیاء۔ (مدارک)

بِمَا عَصَوا میں باء سببیہ ہے۔

ای بسبب ارتکابھم انواع المعاصی واعتداءھم حدود اللّٰہ فی کل شئ (مدارک)

ہو سکتا ہے کہ یہاں مع کے مرادف ہو۔

والباء بمعنی مَعَ (بیضاوی)

وَكَانُوا يَعْتَدُونَ صیغہ محض ماضی کا نہیں، ماضی استمراری کا ہے یعنی یہ طغیان و عدوان اس قوم کی عادت میں داخل ہوگیا تھا۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ کسی گناہ کو بھی خفیف نہ سمجھنا چاہئے، ایک گناہ برابر دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے یہاں تک کہ کفر کا، چنانچہ یہاں بھی عصیان اور تجاوز حدود تھا جو ان کو

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ

بیشک جو لوگ ایمان لاچکے ہیں ٢١٩ اور جو لوگ یہودی ہوئے ٢٢٠ اور نصاری ٢٢١

کفرِ آیاتِ الٰہی اور قتلِ انبیاء تک لایا۔

مفسر بیضاوی نے بھی یہاں یہی کہا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک نوبت پہنچا دیتی ہے چنانچہ یہاں بھی چھوٹے عصیان نے رفتہ رفتہ کفر و قتلِ انبیاء تک پہنچا دیا۔

جرّهم العصيان والتمادي والاعتداء فيه الى الكفر بالآيات وقتل النبيين فان صغار الذنوب سبب يؤدي الى ارتكاب كبارها۔ (بیضاوی)

٢١٩ (آخری رسول اور آخری کتاب پر یعنی مسلمان ہوچکے ہیں)

ایمان لانے کے معنی کل عقائدِ ضروری کے تسلیم کرلینے کے ہیں۔ توحید پر ایمان، رسالت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتابوں پر ایمان، سب کچھ اس میں شامل ہے اور الذین آمنوا مطلق صورت میں قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی آیا ہے مراد اس سے مسلمان ہی ہیں، یہاں بھی مراد مومنین ہی ہیں۔

اي من آمن بمحمد صلى الله عليه وسلم (بحرص ابن عباسؓ) هم المصدقون رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما آتاهم من الحق من عند الله (ابن جرير)

امام رازیؒ نے بھی متکلمین سے یہی معنی نقل کئے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر دین پر قائم و ثابت رہے

الذين آمنوا في الماضي وثبتوا على ذلك واستمروا عليه في المستقبل وهو قول المتكلمين (کبیر)

٢٢٠ جو لوگ دینِ یہودیت کے پیرو ہیں۔

يقال هاد وتهوّد اذا دخل في اليهودية۔ (بیضاوی)

خواہ پہلے سے یہودی چلے آرہے ہوں نسلاً یہودی ہوں یا پہلے مشرک وغیرہ کچھ اور رہے ہوں اور اب یہودی عقیدے اور شعار اختیار کرلئے ہوں۔

اب تک کہ بنی اسرائیل نام ایک خاص نسل و خاندان کا چلا آرہا تھا اور ان کی تاریخ کے اہم ترین منظر سامنے لائے جارہے تھے اب کہ ان کے مسلک اور عقیدوں کا شروع ہوتا ہے اور پہلی بار الذین ھادوا آیا ہے بنی اسرائیل ایک نسلی نام تھا، ایک کنبہ یا قبیلہ یا قوم کا نام تھا جسے اپنی عالی نسبی پر فخر تھا، اپنے آباء و اجداد کی مقبولیت پر ناز تھا تاریخ کے دہراتے وقت ضروری تھا کہ اسی نسلی نام کو لیا جائے اب یہاں ایک دینی مسلک کا، ایک اعتقادی نظام کا شروع ہو رہا ہے ضروری ہوا کہ اب نام ایسا لایا جائے، کوئی وصف ایسا بیان کیا جائے جو بجائے نسل و نسب خاندان کے رہنمائی مسلک و عقیدہ کی جانب کرے۔ الذین ھادوا اسی ضرورت کو پورا کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کی بلاغت کے وجوہِ اعجاز بے شمار ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متقارب لیکن متمائز معنی کے لئے لفظ بھی وہ مختلف لاتا ہے اور ان کے دقیق باہمی فرق کا لحاظ رکھ لیتا ہے۔ مذہب یہود ایک نسلی درجہ کا تبلیغی مذہب نہیں، کسی غیر اسرائیلی کو باضابطہ یہودی بنانے کا طریقہ ان کے ہاں نہیں۔ عرب میں متعدد قبیلے ایسے

آباد تھے جو نہ پیدائشی یہودی تھے اور نہ نسلاً اسرائیلی بلکہ عرب یا بنی اسماعیل تھے لیکن یہود کی صحبت سے متاثر و مرعوب ہو کر انھوں نے پہلے یہود کے طور طریقے اور پھر ان کے عقیدے اختیار کر لئے اور رفتہ رفتہ اُن کا شمار بھی یہودی آبادی میں ہونے لگا۔ بجائے الیھود کے الذین ھادوا لانے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے عقائد اختیاری کی جانب دلالت خوب واضح ہو جائے۔ بنی اسرائیل کی قومی حکومت و وجاہت کا خاتمہ تو ظہور اسلام سے مدتوں پہلے بلکہ کہنا چاہئے کہ سنہ ۷۰ء میں مشرک رومیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی بربادی کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین یہود کی حیثیت صرف ایک مذہبی اور دینی فرقہ کی رہ گئی تھی۔ اسی لئے خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کا لفظ جہاں جہاں استعمال کیا ہے، سیاق عبارت ہر جگہ تاریخی ہے اور الیھود کا ذکر جہاں کہیں کیا ہے وہاں ان کی دینی و اعتقادی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ مدینہ و جوار مدینہ بلکہ یمن میں بھی جو یہود تھے وہ نسلاً بنی اسرائیل نہ تھے بنی اسمٰعیل ہی تھے لیکن اسرائیلیوں کی صحبت میں رہ کر تمدن معاشرت یہاں تک کہ عقیدے بھی انھیں کے اختیار کر لئے تھے۔ اَلَّذِيْنَ هَادُوْا میں کھلا ہوا اشارہ اسی حقیقت کی طرف آ گیا۔

۲۲۱ **وَالنَّصٰرٰى۔** نصاریٰ جمع ہے نصرانی کی۔ ملک شام (حال فلسطین) میں ایک قصبہ ہے ناصرہ (NAZARETH) علاقہ گلیلی میں، بیت المقدس سے ۷۰ میل شمال میں، اور بحر روم سے مشرق میں ۲۰ میل کے فاصلہ پر، موجودہ آبادی آٹھ نو ہزار کے درمیان ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا آبائی وطن یہی قصبہ ہے اور آپ یسوع ناصری اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں۔ ناصرہ ہی کو عربی تلفظ میں نصران بھی کہتے ہیں۔ نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی جانب ہے۔

سموا بذلک انتسابا الی قریۃ یقال لھا نصران (راغب) نصران قریۃ بالشام ینسب الیھا النصاری۔ (صحاح جوھری)

یہی اشتقاق ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ صحابی سے آیا ہے:۔

سمیت النصاری نصاریٰ لان قریۃ عیسی ابن مریم کانت تسمی ناصرۃ وکان اصحابہ یسمون الناصریین (ابن جریر۔ عن ابن عباس)

اور یہی قول قتادہ و ابن جریج تابعین کا ہے، نیز بعد کے محقق مفسرین کا:۔

وھو قول ابن عباس وقتادۃ وابن جریج (کبیر) قیل سموا بذلک لقریۃ تسمی ناصرۃ کان ینزلھا عیسی فلما نسب اصحابہ الیہ قیل النصاری (قرطبی) وقیل انھم سموا بذلک من اجل انھم نزلوا ارضا یقال لھا ناصرۃ قالہ قتادۃ وابن جریج وروی عن ابن عباس ایضا (ابن کثیر) فلما نسب اصحابہ الیہ قیل النصاری۔ قالہ ابن عباس وقتادۃ (قرطبی)

بعض نے اسے عربی کا لفظ فرض کر کے نصرت سے مشتق سمجھا ہے لیکن قول صحیح وہی ہے جو ابھی گزر چکا۔

خوب خیال کر لیا جائے قرآن یہاں ذکر مسیحیوں کا نہیں نصاریٰ کا کر رہا ہے اور قرآن حکیم کا ہر ہر لفظ پر حکمت ہوتا ہے۔ مسیحی وہ ہیں جو ایمان اناجیل اربعہ پر رکھتے ہیں، مسیح کو خدا کا نبی نہیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا انسان کے قالب میں حلول کر آیا تھا، آخرت میں نجات دینے والا (SAVIOUR) خدا کو نہیں مسیح ابن اللہ کو یقین کرتے ہیں اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابل فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود ایک خدا ہے اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں۔۔۔ اس کھلے ہوئے شرک کے قائلوں کا ذکر بجز اس مقام پر

وَالصّٰبِئِينَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اور صابی ۲۱۹ (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے ۲۲۰

مقصود نہیں اسی لئے نام بھی جو مشہور اور چلا ہوا تھا اُسے ترک کر کے نصاریٰ لایا گیا۔

نصرانی معرب ہے NAZARENE کا حضرت مسیح کے پیچھے پیروی کو ماننے والے ابتدائی زمانہ میں NAZARENES کہلاتے تھے یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے آگے چل کر یہی لوگ ایبونیہ (EBONITES) بھی کہلائے چنانچہ جب خود پولوس پر عدالت میں الزام لگا تو وکیل ترطلس نے اسے فرقہ ناصریہ کا فرد کہہ کر اپنی تقریر میں پیش کیا۔

ہم نے اس شخص کو مفسد اور دنیا کے یہودیوں میں فتنہ انگیز اور ناصریوں کے بدعتی فرقہ کا سرگروہ پایا" (اعمال ۲۴: ۵)

مسیح کے ساتھ لفظ ناصری اسی اعمال میں کئی جگہ آیا ہے (۲: ۲۲، ۳: ۶، ۴: ۱۰ وغیرہ) اور خود انجیل متی میں بھی یہ ذکر یوں آگیا ہے

"یوسف خواب میں ہدایت پاکر گلیل کے علاقہ کو روانہ ہو گیا اور ناصرہ نام ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔" (متی ۲: ۲۳)

لیکن جب مُشرکانہ عقائد کا زور بندھا اور اصل مسیحیت حلولیت اور تثلیث ہی قرار پاگئی تو قدرتاً نصرانیت کا ستارہ بھی گردش میں آیا اور نصرانی و نصرانیت کے الفاظ بجائے عزت و تکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے وجود مسیحیت سرتاپا پولوسیت ہے اور تمام تر پولوس (PAUL) طرسوسی کی تعلیمات پر مبنی ہے یہ حضرت مسیح کے کچھ ہی روز بعد شروع ہو گئی تھی اور نصرانی اس کے بالکل منکر تھے، قرآن مجید نے محل مدح میں ایک موقع پر بھی تثلیثی مسیحیت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کا ذکر جب کبھی آیا ہے تو ہمیشہ ملامت بیزاری کے ساتھ مثلاً ان آیتوں میں:

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ (المائدۃ ۷۳) لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (المائدۃ ۷۲) وغیرہ

وَالصَّابِئُوْنَ ۔ صابی کے لفظی معنی ہیں جو کوئی بھی اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں آجائے یا اس کی طرف مائل ہو جائے۔

قال ابو اسحٰق الزجاج الصابئون الخارجون من دین الی دین (تاج) قیل لکل خارج من الدین الی دین آخر صابی (راغب)

خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شروع میں صابی اسی لئے کہا جانے لگا تھا کہ آپ نے دین قریش کو چھوڑ کر دین اسلام اختیار کیا تھا

وکانت العرب تسمی بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم الصابی لانہ خرج من دین قریش الی دین الاسلام (تاج)

اصطلاح میں صابیوں (SABIANS) کے نام کا ایک مذہبی فرقہ جو عرب کے شمال و مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر آباد تھا یہ لوگ دین توحید اور عقیدۂ رسالت کے قائل تھے اور اسی لئے اصلاً اہل کتاب تھے انہیں کو نصاریٰ یحییٰ بھی کہا جاتا تھا گویا بہ نسبت ایک پیغمبر حضرت یحییٰ کی جانب کہے جاتے تھے، حضرت عمرؓ جیسے مبصر و نکتہ رس خلیفہ راشد حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جیسے محقق صحابی نے صابیوں کا شمار اہل کتاب میں کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے ان کا ذبیحہ بھی حلال مانا ہے

قال عمر بن الخطاب وابن عباس ھم قوم من اھل الکتاب قال عمر تحل ذبائحھم مثل ذبائح اھل الکتاب (معالم)

اور اہل لغت بھی اسی طرف گئے ہیں:۔

ھم جنس من اھل الکتاب (صحاح جوھری)

تابعین میں سے متعدد اکابر ان کے اہل کتاب یا موحد ہونے کے قائل ہیں:۔

هم طائفة من اهل الكتاب (ابن جرير عن السدي) فرقة من اهل الكتاب (ابن كثير عن ابي العالية والربيع بن انس والضحاك والسدي واسحاق بن راهويه)

ابن زید ان کے موحد ہونے کے قائل تھے اور قتادہ اور حسن بصری سے تو یہاں تک منقول ہے کہ اہل قبلہ تھے اور نماز پانچ وقت کی پڑھتے تھے (ابن جریر) اور ہمارے امام ابو حنیفہ جو خود بھی عراقی تھے اور اس لئے صابئین سے براہ راست واقفیت کا موقع رکھتے تھے ان کا فتوٰی ہے کہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور ان کے ہاں کی عورتوں سے نکاح بھی جائز اور یہی قول بعض اور قدیم فقہاء اُمت کا ہے:۔

ولهذا قال ابو حنيفة واسحاق لا بأس بذبائحهم ومناكحتهم (ابن كثير) قال ابو حنيفة لا بأس بذبائحهم ونكاح نسائهم۔ (قرطبی)

تاریخ ایران پر ایک مستند مستشرق کی کتاب کا فرنچ سے اردو ترجمہ ابھی حال میں نکلا ہے (انجمن ترقی اُردو دہلی) اس کے صفحہ ۲۷ پر فاضل مترجم شیخ محمد اقبال مرحوم پرنسپل اورینٹل کالج لاہور لفظ مینڈئین (MANDAEAN) پر حاشیہ دیتے ہیں:

"مینڈئین بہ زبان آرامی مبنی اور دو علم۔ اس فرقہ کے لوگ عراق میں اب بھی موجود ہیں اور صابئون کہلاتے ہیں وہ لوگ اگرچہ عیسائی نہیں ہیں، تاہم جان دی بپٹسٹ کو مانتے ہیں۔ عراق میں عوام الناس ان کو حضرت یحیٰی کی امت کہتے ہیں۔" (ایران بعہد ساسانیان)

اور یہاں خود قرآن مجید ان کے نام کا عطف دو اہل کتاب قوموں پر کر رہا ہے یہ خود ایک قرینہ ان کے اہل کتاب اور اہل توحید ہونے کا ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ان کے لقب "نصارٰئے یحیٰی" کو اگرچہ ایک غلط تسمیہ ٹھہرایا گیا ہے تاہم یہ تصریحات اس میں درج ہیں:۔

"مینڈینہ (MANDAEAN) مشرقی مذہبی فرقہ ہے جس کے عقائد و اعمال مسیحیوں، یہودیوں اور مشرکوں کے دین کا مخلوط ہیں۔ یہ لوگ جنوبی بابل یعنی واسط و بصرہ کے علاقہ میں خوزستان کے قریب آباد ہیں اور مقامی زبانیں یعنی عربی و فارسی بولتے ہیں۔ ان کے مذہبی نوشتے آرامی زبان میں ہیں جو بابل کے تالمود سے قوی مشابہت رکھتی ہے...... یہ اپنے کو دوسرے فرقوں کے سامنے صابی ہی کہتے ہیں۔" (جلد ۸ صفحہ ۲۸۹)

اسی میں آگے ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اور انبیائے برحق حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ وغیرہ کے منکر ہیں لیکن حضرت یحیٰیؑ کی نبوت کے قائل ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں اس فرقہ کی تاریخ، عقائد وغیرہ پر مقالہ بڑی ہی شرح و بسط کے ساتھ ہے (جلد ۸ صفحہ ۳۸۰ تا ۳۹۲) ان کا دوسرا لقب مغتسلہ بھی لکھا ہے کہ غسل اور بپتسمہ اور پانی میں غوطہ دینے کے بہت قائل ہیں۔ ان کی تعداد قریب چار ہزار کے بیان کی ہے۔ نماز ان کے ہاں پانچ وقت کی فرض ہے، تین بار دن میں اور دو بار رات میں اور ان کا قبلہ قطب تارہ یا سمت شمال ہے۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا (نیو ایڈیشن) میں ان کی آبادی عراق میں چھ ہزار بیان کی گئی ہے (جلد ۸ صفحہ ۲۲۰)۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یعنی اللہ کی ذات و صفت پر ایمان لائے جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے اور وہ ایمان ہر قسم کی شرک آمیزی سے پاک ہو۔ اس ایمان باللہ کے تحت میں اس کے سارے لوازم و تضمنات بھی داخل ہیں۔

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور نیک عمل کرے ۲۲۱ سو ان (سب) کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے، اور نہ کوئی اندیشہ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

ان کے لئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے ۲۲۲

ورنہ خدا پر مطلق ایمان تو کسی نہ کسی صورت میں تقریباً ہر انسان کا ہے اور ان لوازم توحید میں سب سے اونچے نمبر پر ایمان بالرسل ہے کہ بندوں کا صحیح تعلق اللہ کے ساتھ قائم کرنے والی اس کا سیدھا راستہ بتانے والی ذات رسول ہی کی ہوتی ہے

قد دخل فی الایمان باللہ الایمان بما اوجبہ اعنی الایمان برسلہ (کبیر) وقد اندرج فی الایمان بالیوم الآخر الایمان بالرسل اذا بعث لا یعرف الا من جہۃ الرسل (بحر) وفی الایمان باللہ وبالیوم الآخر اندراج الایمان بالرسل والکتب والبعث۔ (قرطبی)

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یوم آخرت پر ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ سارے احکام آخرت پر ایمان لایا جائے

دخل فی الایمان بالیوم الآخر جمیع احکام الآخرۃ۔ (کبیر)

بعض نے کہا ہے کہ یہ ایمان آخرت لازمی طور پر شامل ہے ایمان بالرسل کو۔

وقد اندرج فی الایمان بالیوم الآخر الایمان بالرسل اذ البعث لا یعرف الا من جہۃ الرسل (بحر) وفی الایمان باللہ وبالیوم الآخر اندراج الایمان بالرسل والکتب والبعث (قرطبی)

تناسخ، حلول وغیرہ کے گمراہانہ عقائد کی بنیاد صرف یہی ہے کہ دوسرے مذہبوں میں یوم حشر کا ایمان صحیح باقی نہیں رہا اور انھوں نے جزا و سزا کی اور صورتیں تجویز کر لیں۔

۲۲۱ (اور عمل صالح کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل وحی الٰہی یعنی شریعت اسلامی کے ماتحت ہو) دور حاضر کی چلتی ہوئی گمراہیوں میں سے ایک سوال جو بار بار پیش ہوتا رہتا ہے، یہ ہے کہ ایک شخص صحیح الایمان ہے مگر بدعمل اور دوسرا شخص خوش عمل ہے مگر ایمان سے خالی، تو ان دو میں نجات کس کی ہوگی؟ علماء اس کے جوابات مختلف دیتے رہتے ہیں لیکن سب سے سیدھا اور بے تکلف جواب یہ ہے کہ حسن عمل کا ایک لازمی عنصر تو خود ایمان ہی ہے بغیر تصحیح ایمان کے بغیر حق تعالٰی کی رضا جوئی کے کوئی عمل، عمل صالح کی تعریف میں آ ہی کب سکتا ہے، ایمان سے خالی شخص کا حسن عمل تو صرف صورۃً عمل ہوگا، ورنہ اس کی حقیقت (یعنی خالق کونین کی رضا طلبی) تو اس سے خارج ہی ہوگی

۲۲۲ اعتقاد صحیح اور عمل صحیح بس یہی دو شرائط نجات ہیں، گویا مذہبی دنیا کو یہ بشارت پہلی بار کھلے لفظوں میں پہنچی کہ اصل شے عقیدہ اور عمل ہیں اور ان دو کی تصحیح کے بعد قوم، نسل وغیرہ کی ساری نسبتیں ہیچ ہیں۔

عِنْدَ رَبِّهِمْ میں عِنْدَ سے مراد عندیت مکانی نہیں کہ یہ تو اللہ تعالٰی کے حق میں جو مکان و جہت سے پاک منزہ ہے محال ہے بلکہ مراد اجر کا یقینی اور قطعی ہونا ہے۔

لیس المراد العندیۃ المکانیۃ فان ذلک محال فی حق اللہ تعالٰی بل المراد ان اجرھم متیقن جار مجری۔ (کبیر)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا ۲۲۳ اور ہم نے تمہارے اوپر کوہ طور بلند کیا ۲۲۴ (اور کہا کہ) مضبوطی کے ساتھ اس (کتاب) کو پکڑو جو ہم نے تم کو دی ہے ۲۲۵

قرآن مجید کا ایک بلیغ و حکیمانہ اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات کے ضمن میں بڑے بڑے اہم کلیات بیان کر جاتا ہے بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانی اور پشتہا پشت کی سرکشی کا ذکر چلا آ رہا تھا، مخاطبین پر یہ اثر پڑنا بالکل طبعی تھا کہ ایسے مجرموں کے لئے اب نجات کی کوئی گنجائش رہ ہی کیا سکتی ہے، معاً یہ آیت درمیان میں لا کر اس مایوسی کو رفع کر دیا گیا ہے کہ جو کوئی بھی اپنا عقیدہ اور عمل درست رکھے گا، خواہ مسلمان ہو یا یہودی یا نصرانی یا صابی غرض کوئی بھی ہو، رحمت و مغفرت کی راہیں سب کے لئے کھلی ہوئی ہیں، کام کی چیزیں صرف ایمان صحیح اور عمل صحیح ہیں۔

لیعرف ان جمیع ارباب الضلال اذا رجعوا عن ضلالھم وآمنوا بالدین الحق فان اللہ سبحانہ وتعالیٰ یقبل ایمانھم وطاعتھم ولا یردھم عن حضرتہ البتۃ (کبیر)

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ بیان آخرت کا ہو رہا ہے یعنی قیامت کے دن، جو کشف و حقائق کا دن ہوگا، اہل ایمان کو نہ اپنے ماضی پر حسرت ہوگی نہ اپنے مستقبل کی طرف سے تشویش، خوف و اندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے، اور غم و حزن کا ماضی سے۔

مَنْ اٰمَنَ ۔۔۔۔ يَحْزَنُوْنَ ۔ سوال یہ ہوا ہے کہ مَنْ تو صیغۂ واحد غائب ہے پھر اس کی خبر (هُمْ يَحْزَنُوْنَ) صیغۂ جمع میں جا کر کیسے نکلی؟ جواب یہ ہے کہ مَنْ لفظاً واحد ہے لیکن اس کا اطلاق واحد، تثنیہ، جمع سب پر ہوتا ہے اور اس کی متعدد نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔

من یقع علی الواحد والتثنیۃ والجمع فجائز ان یرجع الضمیر مفردا ومثنی ومجموعا (قرطبی)

مَنْ پر حاشیہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

۲۲۳ (اے بنی اسرائیل تمہارے پیغمبر کے واسطے سے اس مضمون کا کہ تم توریت پر عمل کرو گے۔)

تاریخ اسرائیل کا بیان مسلسل چل رہا ہے اور تخاطب بنی اسرائیل ہی سے ہے۔

۲۲۴ الطور ۔ طور مطلقاً پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص و متعین پہاڑ کا بھی نام

الطور اسم جبل مخصوص وقیل اسم لکل جبل۔ (راغب)

جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑیوں پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے سلسلے میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے لیکن خود جبل سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں، متعدد چوٹیاں ہیں، انہیں میں سے کسی کا نام طور ہوگا۔ قوم کے اوپر پہاڑ بلند کرنے سے کیا مراد ہے؟ توریت میں اس کی کچھ مجمل سی کیفیت درج ہے:۔

"وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا پر نیچے سے بالا دھواں تھا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور شور کا سا دھواں اس پر اٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا۔" (خروج ۱۹: ۱۷ و ۱۸)

اور تالمود جو توریت کی مشہور و مستند اور نہایت ضخیم شرح یہود کے ہاں موجود ہے اس میں اس اجمال کی تفصیل یوں آئی

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ

اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم متقی بن جاؤ ۲۲۶ پھر تم اس (عہد) سے اس کے بعد (بھی) پھر گئے ۲۲۷

ذیل درج ہیں :۔

”حق تبارک تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہ سینا کو اُلٹ دیا جس طرح کوئی بڑا ظرف اُلٹ دیا جاتا ہے اور کہا کہ اگر تم توریت کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن ہو کر رہ جاؤ گے“ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۳۲)

”خدا نے پہاڑ کو ان لوگوں پر اُلٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ توریت کو اگر قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہے گا“ (ایضاً)

ہمارے مفسرین نے جو آثار صحابہ و تابعین کی زبان سے نقل کئے ہیں، ان میں بھی روایتیں اسی سے ملتی جلتی ہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

۲۲۵ یہ پورا مقولہ اسی وقت کا ہے جب کتاب نازل ہوئی تھی کتاب ہدایت کے نزول اور رفع طور کے ساتھ ساتھ ہدایت اس کی بھی ہوئی تھی کہ اس کتاب کی محافظت کرنا اور اس کے احکام پر مستعد رہنا۔

اعملوا بما اعطیتکم من الکتٰب (ابن عباس)

ما اتیتکم سے مراد کتاب توریت ہے احکام توریت کے اس اخذ و تمسک کی تاکید اور اس کے ترک پر وعید خود توریت میں بھی جا بجا مذکور ہے :۔

”جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے کہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت، سب جماعت کہے آمین“ (استثناء ۲۷ : ۲۶) ”اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے تاکہ ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ سے فرماتا ہوں دھیان رکھ کے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا زمین کی قوموں کی نسبت تجھے سرفراز کرے گا“ (استثناء ۲۸ : ۱) ”لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہو گا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو بتاتا ہوں دھیان رکھ کے عمل کرے تو ایسا ہو گا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی“ (استثناء ۲۸ : ۱۵)

۲۲۶ (اور تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ کتاب الٰہی پر عمل کیا جائے)

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ۔ یاد رکھو اس کے مضامین کو تاکہ ان پر عمل کر سکو۔ احکامِ الٰہی کا یاد رکھنا اصلاً اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان پر عمل کیا جا سکے، حکم کے تحت میں حفظ، قراءت وغیرہ بھی داخل ہیں لیکن مقصود اصلی وہی عمل ہے۔

اقرؤا ما فی التوراۃ واعملوا بہ (ابن کثیر عن ابی العالیہ) ای تدبروہ واحفظوا اوامرہ ووعیدہ ولا تنسوہ ولا تضیعوہ ھذا ھو المقصود من الکتٰب العمل بمقتضاہا لا الاملاوتہا باللسان وترتیلہا۔ (قرطبی)

لَعَلَّ کے لئے پوری تصریح اوپر گزر چکی ہے کہ یہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے استعمال ہوتا ہے تو مفہوم شک و احتمال کا نہیں رہتا، بلکہ معنی یقین کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

۲۲۷ (اور سب سابق پھر نافرمانی کرنے لگے)

مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی اس قول و قرار کے بعد کتاب ہدایت و احکام مل جانے کے بعد۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ

سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہونے والوں میں سے ہوتے ۲۲۸ اور تم خوب

عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے سبت کے بارہ میں تجاوز کیا تھا ۲۲۹

ای من بعد العصیان (قرطبی)

۲۲۸ یعنی فی الفور ہلاک کر دیئے گئے ہوتے اور ساری قوم کی قوم دنیا سے اسی طرح بے نشان کر دی گئی ہوتی جیسے اور پرانی متعدد قومیں ہو چکی ہیں۔ فضل و رحمتِ خداوندی بنی اسرائیل کے حق میں یہی تھی کہ ان کی خطاؤں و جرائم سے مزید چشم پوشی کی گئی اور انھیں مہلت سنبھلنے اور اپنے کو درست کرنے کی دی گئی۔

یہ ایک مزید تصریح قرآن مجید کی ہے کہ قوم اسرائیل الطاف خداوندی خصوصی کی مورد ہمیشہ سے رہی ہے۔

۲۲۹ لَقَدْ عَلِمْتُمْ۔ علم کا لفظ خود ہی یقین کے معنی میں آتا ہے یہ بار ہا استعمال ہو چکا ہے پھر یہ حرف لام مؤکد حرف تاکید۔ لقد جس فعل پر داخل ہوتا ہے اس میں معنی شدتِ تاکید کے پیدا کر دیتا ہے گویا قرآن بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کا کوئی واقعہ ان کے لئے خوب اچھی طرح جانا بوجھا ہوا یاد دلا رہا ہے اور ان سے کہہ رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل جس واقعہ کا ذکر آگے آ رہا ہے وہ تمھاری تاریخ کا ایک مسلّم و متعارف واقعہ ہے اور تم اس سے بلا شک اشتباہ خوب واقفیت رکھتے ہو۔

مِنْكُمْ۔ یعنی تمھارے اسلاف و اجداد میں سے۔

فِي السَّبْتِ۔ یعنی احکام سبت کے بارہ میں۔

السَّبْت۔ سبت کے لفظی معنی ہیں ہفتہ کا ساتواں دن سنیچر یا شنبہ۔ شریعتِ یہود کی اصطلاح میں یہ ایک مقدس دن مسیحیوں کے اتوار کی طرح ہے۔ یہ دن صرف یادِ خدا اور عبادت کے لئے مخصوص تھا اور اس روز تجارت، زراعت، شکار وغیرہ ہر قسم کے دنیوی کام سب ممنوع تھے اور ممانعت بھی اس شدت کے ساتھ کہ جو اس حکم کو توڑے اس کی سزا قتل۔ توریت کے الفاظ ہیں:

”پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمھارے لئے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔

..... پس جو کوئی روز سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے“ (خروج۔ ۳۱: ۱۴ و ۱۵)

اعْتَدَوْا۔ تجاوز کر جاتے تھے، شریعتِ موسوی کے حدود سے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت داؤد کے زمانہ میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انھیں کا ہے۔ حضرت داؤد کا زمانۂ حکومت ۱۰۱۳ ق م تا ۹۷۳ ق م کا ہے۔ مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر توریت میں ایلات (Elath) کے نام سے آتا ہے (استثنا۔ ۲: ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر (قدیم علاقۂ ادوم میں) خلیج کی شرقی خلیج میں لب ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ اس کو عقبہ کے نام سے پہچانتا ہے اور عقبہ خلیج عقبہ کا مشہور بندرگاہ ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنی شریعت کے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرتے اور مچھلی کا شکار ایک حیلہ چالاکی کے ساتھ اور اسے ظاہری صورت جواز دے کر سبت کے دن کیا کرتے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ

تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ ۔ ۲۳۰ پھر ہم نے اسے (موجب) عبرت بنا دیا اس زمانہ کے

يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے اور ایک (موجب) نصیحت (بنا دیا) خوف خدا رکھنے والوں کے لئے ۲۳۱

۲۳۰ اس سلسل نافرمانی پر سزا تو ان مجرموں کو یقیناً ملی، باقی یہ کہ کیا ملی؟ اس کی تفصیلات اس درجہ قطعی نہیں جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سزا اسی طرح واقع ہوئی جیسی قرآن کے ظاہر الفاظ میں مذکور ہے یعنی وہ انسان بندر بنے اور مسخ ہو کر بدہوک ہو گئے، اس تفسیر پر عقلاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، جو لوگ سنت کے قانون تشریعی کے توڑنے میں اتنے جری و بیباک ہیں ان کے حق میں خالق کائنات اپنے قانون تکوینی کو کسی حد تک کر بدل دے اور بجائے ارتقاء کے کبھی اگر (ارتقاء معکوس) ہو جائے تو اس میں عدم امکان تو خیر کیا ہوتا استبعاد بھی تو کچھ ایسا زیادہ نہیں لیکن روایتیں خود اس نتیجہ پر تمام تر متفق نہیں بلکہ یہ قول تابعین ہی کے زمانہ سے تفسیروں میں لکھا چلا آرہا ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا صوری نہیں یعنی ان کے عادات واخلاق بندروں کے سے کر دیئے گئے تھے، اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہونے لگا تھا، ورنہ حقیقتاً وہ بندروں کے جسم وقالب میں تبدیل نہیں کئے گئے تھے۔

لم یمسخوا قردۃ انما ھو مثل ضربہ اللہ لھم (ابن جریر عن مجاہد)، مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ وانما ھو مثل ضربہ اللہ کمثل الحمار یحمل اسفارا (ابن جریر عن مجاہد) روی عن مجاہد فی تفسیر ھذہ الآیۃ انہ انما مسخت قلوبھم وردت افہامھم کافہام القردۃ (قرطبی)

مفردات میں بھی ایک قول اسی معنی میں نقل ہوا ہے :۔

قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا وان لم تکن صورتھم کصورتھا۔ (راغب)

اور صاحب منار کا قول ہے کہ آیت ان لوگوں کے واقعی مسخ ہو کر بندر بن جانے کے باب میں نص قطعی نہیں۔

والآیۃ لیست نصا فیہ ولم یبق الا النقل۔ (المنار)

لیکن جمہور مفسرین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ قول غریب اور ظاہر سیاق قرآنی کے خلاف ہے :۔

قول غریب خلاف الظاہر من السیاق فی ھذا المقام وفی غیرہ (ابن کثیر) وظاہر القرآن انھم مسخوا قردۃ علی الحقیقۃ وعلی ذلک جمہور المفسرین وھو الصحیح (روح)

قرطبی میں آیت نمبر (۷۶) اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم کے تحت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک کلام یہود قریظہ سے معرکہ خیبر کے دن کا نقل کیا ہے جس میں قردۃ وخنازیر صاف مجازی معنی میں آیا ہے فقرہ یہ ہے :۔

یا اخوۃ القردۃ والخنازیر اخزاکم اللہ وانزل بکم نقمتہ۔ — اے بندروں اور سوروں کے بھائیو تم نے عہد توڑ ڈالا ہے اللہ تمہیں غارت کرے اور تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔

۲۳۱ سزا کی تفصیلی نوعیت کچھ بھی ہو بہرحال تھی وہ کوئی بہت سخت اور عبرت ناک سزا قرآن کا مقصود

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو ۲۳۳

اس سزا کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس کی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے، واقعہ جو کچھ بھی ہو یہود کا جانا بوجھا ہوا تھا قرآن اُسے صرف یاد دلا رہا ہے۔

جَعَلْنٰھَا میں ھا کی ضمیر عقوبت کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور اس مسخ شدہ امت کی طرف بھی ماحصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

ای جعلنا تلك العقوبة (ابن جریر عن ابن عباس) یعنی به فجعلنا الامة التی اعتدت فی السبت (ابن جریر)

نَكَالًا۔ نکال وہ سخت سزا ہے جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔

ای عبرة تنكل للمعتبر بها (بیضاوی) عبرة تنكل من اعتبر بها۔ (کشاف)

مَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا۔ مَا دونوں جگہ مَنْ کے معنی میں آیا ہے یعنی مَا کا استعمال جاندار، صاحب عقل مخلوق کے لئے ہوا ہے۔

ما بین یدیها۔ معاصرین کے معنی میں ہے اور ما خلفها بعد کے آنے والوں کے معنی میں۔

ما بین یدیها ای معاصریهم (ابن عباس) ما خلفها ای من خلفهم (ابن عباس) بما قبلها وبما بعدها من الامم والقرون (کشاف) للامم التی فی زمانها وبعدها (جلالین)

یدیها اور خلفها دونوں میں ضمیر ھا عقوبت کی طرف ہے۔

والضمیران للعقوبة (قرطبی)

گویا سزا ایسی تھی کہ مدتوں تک نسلاً بعد نسلٍ اس کا چرچا رہے اور لوگ اس کا تذکرہ سن سن کے ڈرتے اور لرزتے رہا۔

۲۳۲ یعنی تاکہ متقین کو اس واقعہ کی حکایت سے راہِ تقویٰ کی طرف ترغیب اور زیادہ ہو یا یہ مراد لی جائے کہ نصیحت کو قبول کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے متقین ہی ہوں گے، صاحبِ روح المعانی نے یہاں یہ نکتہ اہلِ عرفان کے لئے لکھا ہے کہ اللہ نے عبادتوں کو خاص خاص ہیئت کے ساتھ خاص اوقات میں متعین کیا ہے تاکہ طبعی ظلمتیں دور ہوں، جو شخص ان ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نورِ استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ اصحابِ سبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے یعنی جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہیں انہیں کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے اگرچہ اس امت کے لئے مسخ صورت نہیں لیکن انسان کو چاہئے کہ ادویۂ شرعیہ کے ذریعہ سے اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے، چنانچہ بعض اہلِ کشف اس زمانہ میں ایسے بھی پائے گئے ہیں جو انسان کو اسی حیوان کی شکل میں دیکھتے ہیں، جس کی صفتِ حیوانی اس پر غالب ہوتی ہے مثلاً جس پر ظلم و شقاوت غالب ہوتی ہے اسے آتا ہوا دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں کہ بھیڑیا آ رہا ہے جس پر حرام خوری کی گندگی غالب ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یوں بول اٹھتے ہیں کہ سُوَر آ رہا ہے اور اس قسم کا کشف تکوینی صرف اہلِ حق و مقبولین کے ساتھ مخصوص نہیں۔

۲۳۳ اسرائیلیوں میں ایک واقعہ قتل کا ہو گیا تھا، اور قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا، ذبح گاؤ کا حکم اسی

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

وہ بولے آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں کیا؟ ۲۳۴ (موسیٰ نے) کہا اللہ مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں ۲۳۵

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو ۲۳۶ کہا کہ وہ (تو) کہتا ہے کہ وہ گائے

لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیاہی (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان ہو ۲۳۷ سو (اب) کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے۔

میں ملا۔ اس کی کچھ تصریح اگلے رکوع میں آرہی ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ صدیوں تک مصر میں اور مصر والوں کے درمیان رہتے رہتے بہت سے مشرکانہ رسوم توحید کے علمبردار اسرائیلیوں پر بھی چل چکے ہیں اور گائے کی عظمت بلکہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ چکی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گائے کی تقدیس مشرکانہ مذہب کا ایک جزو تھی، توریت میں اسرائیلیوں کو ذبح گاؤ کا حکم خاص خاص قیدوں اور شرطوں کے ساتھ بار بار ملا ہے۔ مثلاً :-

بنی اسرائیل کو کہو کہ ایک لال گائے جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو تجھ پاس لاویں تم اسے الیعزر کاہن کو دو کہ اسے خیمہ گاہ سے باہر لے جائے اور وہ اس کے حضور ذبح کی جائے۔" (گنتی۔ ۱۹: ۲) "جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کوئی خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو ایک بہتی وادی میں جو نہ جوتی گئی ہو نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں۔" (استثناء۔ ۲۱: ۳ و ۴)

بَقَرَةٌ۔ اصلاً صرف گائے کے لئے ہے اور ثور کا مؤنث ہے۔

قیل للن کر ثور (راغب) البقرة اسم للانثى والثور اسم للذکر (قرطبی)

لیکن بعض مفسرین نے اسے گائے اور بیل دونوں کے لئے عام رکھا ہے اور یہاں اس سے بیل مراد لی ہے۔

۲۳۴ بنی اسرائیل گئو ماتا کے احترام و تقدیس کے جذبہ سے سرشار تھے، یقین ہی نہ آیا کہ ایسے مقدس و محترم جانور کے ذبح کر ڈالنے کا حکم ملا ہوگا، بس یہی سمجھے کہ حضرت موسیٰ ہنسی اور تفنن طبع کی راہ سے کہہ رہے ہیں۔

۲۳۵ (اور احکام خداوندی کی پیام رسانی میں ہنسی دل لگی سے کام لینے لگوں)

کوئی جہالت اور جاہلیت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اللہ کی طرف سے پیام رسانی میں بندہ اپنی طرف سے تفریح و تفنن برتنے لگے جَاهِلِيْنَ۔ جہل کے لغوی معنی ہیں کسی کام کو اس کے برخلاف ادا کرنا جو اس کے ادا کرنے کا حق ہے۔

الجهل فعل الشيء بخلاف ما حقه ان يفعل (راغب)

اللہ کی طرف سے پیام گڑھ لینے کی جسارت وہی کرسکتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ سے غافل و جاہل ہو۔

انما يكون ذلك من الجهل بالله تعالى (بحر)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو ۲۳۲ کہاکہ وہ فرماتا ہے کہ

بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ

وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو ۲۳۳ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو ۲۳۴ وہ بولے اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے

يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾

درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ (اور) کیسی ہو ۲۳۵ اس لئے کہ گائے میں ہم پر اشتباہ پڑ گیا ہے ۲۳۶ اور خدا نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے ۲۳۷

یا وہ کرسکتا ہے جو امور دینی میں استہزاء کے نتائج و عواقب سے بے خبر ہو۔

ان آکون من الجاھلین بمافی الاستھزاء فی امر الدین من العقاب الشدید (کبیر)

فقہاء و مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ دین و معظمات دین کے ساتھ استہزاء حکم جہل اور گناہ عظیم میں داخل ہے اور اس کا مرتکب مستحق وعید ہے۔

وفی الآیة دلیل علی منع الاستھزاء بدین اللہ ودین المسلمین ومن یجب تعظیمه وان ذلك جھل وصاحبه مستحق للوعید (قرطبی) یدل علی ان الاستھزاء من الکبائر العظام (کبیر)

لیکن ساتھ ہی یہ ضروری تصریح بھی کردی ہے کہ مزاح یا خوش طبعی کو استہزاء یا تمسخر سے کوئی مناسبت نہیں، دونوں میں بڑا فرق ہے، خوش طبعی تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمۂ دین میں برابر رائج رہی ہے۔

ولیس المزاح من الاستھزاء بسبیل الاتری ان النبی صلی اللہ علیه وسلم کان یمزح والائمة بعدہ (قرطبی) والفرق بین الھزء والمزاح ظاھر فلا ینافی وقوعه من الأنبیاء (روح)

اور مفسر قرطبی نے اس سلسلہ میں ابن خویز منداد کے حوالہ سے شہر کوفہ کے قاضی (رح) کی ایک چٹپٹی حکایت بھی نقل کی ہے۔

۲۳۶ (بہ لحاظ عمر)

مَا هِيَ سے مراد بیان حقیقت نہیں، مقصود توضیح مزید ہے۔

ای ما حالھا وصفتھا (بیضاوی)

۲۳۷ نہ ایسی بوڑھی ہو نہ بالکل بچہ۔

فَارِض وہ ہے جس کے بچہ جننے کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہو۔

بِکْر وہ ہے جس نے ابھی بچہ جنا ہی نہ ہو۔

العارض المسنّة التی لاتلد والبکر الفتیة التی لم تلد قط (معالم)

یہیں سے خیال ہوتا ہے کہ بَقَرَة سے مراد بیل نہیں گائے ہی ہے۔

عَوَان کے معنی درمیانی سن رکھنے والی۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي

کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی

الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۚ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ

دیتی ہو۲۴۳ سالم، اس میں (کوئی) داغ (دھبہ) نہ ہو۲۴۴ وہ بولے اب آپ ٹھیک پتہ لائے۲۴۵

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے۲۴۶

العوان المتوسط بین السنین (راغب)

۲۳۸ اہل مصر بیل کی تقدیس کے باوجود اسے قربانی پر بھی چڑھایا کرتے تھے، مگر قربانی کے بیل میں بڑی بال کی کھال نکالا کرتے تھے، اس کا رنگ یکسر سفید ہو، اس کے جسم پر بال ایک بھی سیاہ نہ ہو، دُم بالکل صحیح اور طبعی حالت میں ہو، کوئی داغ دھبہ نہ ہو، غرض طرح طرح کی قیدیں اور شرطیں تھیں۔ یہ سب پوری ہولیتیں جب کہیں جاکر قربانی کی نوبت آتی۔ اسرائیلیوں نے جاتنی موشگافیاں کیں عجب نہیں کہ مصریوں ہی کی صحبت کا اثر ہو۔

۲۳۹ یعنی رنگ خوب شوخ کھلتا ہوا ہو۔ فلسطین و سینا کی بعض گائیں یقیناً اس رنگ کی ہوتی ہوں گی۔ مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل کشف خود نفس کو بھی زرد ہی رنگ کا بتاتے ہیں۔ اور صوفیا نے جو نفس کو اس گائے سے تشبیہ دی ہے تو اس سے وہ مشابہت اور بڑھ جاتی ہے۔

۲۴۰ یعنی وہ گائے خوش نما، خوش منظر، خوش رنگ ہو۔ بدرنگ، بدنما، بدمنظر نہ ہو۔

۲۴۱ یعنی ذرا اور تعیین و تحدید کیجئے، اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے۔ اس حلیہ اور اس رنگ کی گائیں تو بہت سی ہیں۔

۲۴۲ (گائے تک۔ اور اُسے ضرور ذبح کرکے رہیں گے)

ای الی عین البقرۃ المامورین بھا (بحر)

۲۴۳ ہندوستان میں عام رواج صرف بیل سے کاشتکاری کا کام لینے کا ہے، گائے سے نہیں لیکن دوسرے ملکوں میں یہ کام گائے سے بھی لیا جاتا ہے۔

۲۴۴ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۲۳۸۔
اسرائیلیوں کے ہاں کسی عیب دار یا داغ دار جانور کا قربانی کے لئے ذبح کرنا ناجائز تھا:۔
"تو خداوند اپنے خدا کے لئے بیل یا بھیڑ بکری جس میں کوئی عیب یا برائی ہو، ذبح مت کیجو کیونکہ خداوند تیرے خدا کو اس سے نفرت ہے۔" (استثناء ۱۷: ۱) "تمھارا جانور بے عیب چاہئے۔" (خروج ۱۲: ۵)
"اگر اس کی قربانی سوختنی گائے بیل ہے تو بے عیب نر لاوے" (احبار ۱: ۳)

۲۴۵ یعنی مفصل اور پورا پتہ تو اب بتایا ہے۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا ۲۴۷ پھر تم اس باب میں لڑنے جھگڑنے لگے ۲۴۸ اور اللہ کو وہ ظاہر

تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ

کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے ۲۴۹ تو ہم نے کہا کہ اس (میت) پر اس (گائے) کا کوئی ٹکڑا مارو ۲۵۰ یوں ہی اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا ۲۵۱

۲۴۶ یعنی ان کی مسلسل موشگافیوں سے تعمیل حکم بعید ہی معلوم ہوتی تھی۔

۲۴۷ (اپنے ہی میں سے)

"تم نے" یعنی تم میں سے کچھ لوگوں نے۔ ذکر بنی اسرائیل ہی کا بدستور چل رہا ہے، یہاں بھی اشارہ ان کی قومی تاریخ ہی کے کسی واقعہ کی طرف ہے لیکن اس خاص واقعہ کی تعیین کے لئے یہود کے ذخیرۂ تاریخ وروایات میں بہت زیادہ گھسنے اور ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ کوئی آئندہ مفسر ہمت کرکے اس فرض کو ادا کرے گا، گو ہمارے مفسرین کی قطعی رائے یہ ہے کہ اوپر جو حکم ذبح گاؤ کا ملا ہے وہ اسی واقعۂ قتل کے سلسلہ میں، قرآن مجید نے بیان میں صرف ترتیب اقوال میں تقدیم وتاخیر کردی ہے۔

قوله تعالى واذ قتلتم نفسا وان كان مؤخرا فى التلاوة فهو مقدم فى المعنى على جميع ما ابتدء به من شان البقرة (جصاص) قوله تعالى ان الله يامركم ان تذبحوا بقرة مقدم فى التلاوة وقوله قتلتم نفسا مقدم فى المعنى على جميع ما ابتدء به من شان البقرة (قرطبی)

۲۴۸ (اور ایک دوسرے پر الزام رکھنے لگے)

یعنی اصل قاتل کا پتہ نہیں لگ رہا تھا، کوئی کہتا تھا کہ قاتل فلاں ہے اور کوئی کہتا کہ فلاں، ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔ فَادّٰرَءْتُمْ۔ درء کے معنی جھگڑنے کے بھی ہیں اور دفع کرنے کے بھی، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دفع کرنے ہی کے معنی میں آیا ہے۔

فادرءوا عن انفسكم الموت۔ ويدرأعنها العذاب۔ يدرءون بالحسنة السيئة۔

یہاں اِدّٰرَءْتُمْ بروزن اِفَّاعَلْتُمْ سے مراد آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر الزام ڈالنے سے ہے۔

اى ينفى كل واحد منكم القتل عن نفسه ويضيفه الى غيره (كبير) اختلفتم واختصمتم فى شانها (کبیر)

۲۴۹ یعنی اصل قاتل کا پتہ۔ رکوع سابق میں جو حکم ذبح گاؤ کا ملا ہے، وہ جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے، شاید اسی موقع کے لئے تھا۔

۲۵۰ تفصیلات کا علم تو عالم الغیب کو ہے البتہ اتنا پتہ تو یہود کے قانون شریعت (توریت) کے مطالعہ سے بہرحال چلتا ہے کہ قتل کے موقع پر جب قاتل کی تحقیق ہو رہی ہو، چند خاص شرائط کی پابندی کے ساتھ ایک جوان گائے کو جس سے کوئی خدمت نہ لی گئی ہو ذبح کیا جاتا تھا، اور اس کے لاشہ پر بزرگان قوم ایک خاص طریق پر دعا کرکے خون کے گناہ سے اپنی بخشائش چاہتے تھے، کتاب استثناء کے باب ۲۱ میں آیت ۱-۹ میں تفصیلا درج ہیں یہاں صرف چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:

"اگر اس سرزمین میں جس کا خداوند تیرا خدا تجھے ارشاد کرتا ہے کسی مقتول کی لاش کھیت میں پڑی ہوئی ملے اور

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ

اور وہ تم کو اپنی نشانیاں ۲۵۱؎ دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۲۵۳؎ اس پر بھی تمہارے دل اور اس کے

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ

بعد بھی سخت ہی رہے ۲۵۴؎ چنانچہ وہ مثل پتھر کے ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر ۲۵۵؎

معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے، تب تیرے بزرگ اور تیرے قاضی باہر نکلیں اور ان بستیوں تک جو مقتول کے گرداگرد ہیں، درمیان کو ناپیں۔ اور یوں ہوگا کہ جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو…… اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں…… پھر اس شہر کے سارے بزرگ جو مقتول سے نزدیک ہیں اس بچھیا کے اوپر جو اس وادی میں گردن ماری گئی ہے اپنے ہاتھ دھوئیں اور جواب دے کے کہیں کہ ہمارے ہاتھوں نے یہ خون نہیں کیا، نہ ہماری آنکھوں نے دیکھا۔
تفسیری روایات میں آتا ہے کہ مقتول زندہ ہو گیا تھا اور قاتل کا نام اور پتہ بتا کر پھر مر گیا۔ واللہ اعلم۔

۲۵۱؎ (قیامت کے دن)

جعل تبارك وتعالى ذلك الصنيع حجة لهم على المعاد (ابن کثیر)
قرآن مجید نے اپنی عام خصوصیت یعنی خاص سے عام کی تعلیم کی یہاں بھی نہ چھوڑی۔ اور ایک جزئی واقعہ سے اپنی قدرت اور امکانِ بعث کا پہلو نمایاں کیا۔

۲۵۲؎ (اور نمونے اپنی قدرتِ کاملہ اور اختیارِ مطلق کے)

۲۵۳؎ (اور کم از کم اس نظیر کے مشاہدہ کے بعد امکانِ بعث اور وقوعِ قیامت کے انکار سے تو باز آجاؤ)

۲۵۴؎ یعنی قبول کی طرف ذرا نہ مائل ہوئے۔
ثُمَّ یہاں استبعاد کے لئے ہے یعنی جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا وہ نہ نکلا۔
ثم لاستبعاد القسوة بعد مشاهدة ما يزيلها (ابو سعود)
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ۔ اس تصریح نے اس استبعاد کو اور زیادہ قوی و شدید کر دیا۔
مؤكد للاستبعاد اشد تاكيدا (جمل)

۲۵۵؎ (عدمِ قبولِ حق کے باب میں)
اسرائیلی صحیفوں میں بھی یہ مضمون بار بار آیا ہے مثلاً:
"وہ تربیت پذیر نہ ہوئے انھوں نے اپنے چہرہ کو چٹان سے سخت تر بنایا، انھوں نے پھرنے سے انکار کیا ہے"۔
(یرمیاہ۔ ۵: ۳) "سارے اہلِ اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں" (حزقیل ۳: ۷)
اَوْ یہاں شک کے مفہوم میں تو بہرحال نہیں آیا ہے اتنے پر سارے علماء ادب کا اتفاق ہے اختلاف جو کچھ ہے وہ اس کے بعد ہے کہ پھر کس معنی میں ہے؟

وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ

اور پتھر تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے ندیاں بھی پھوٹ نکلتی ہیں ۲۵۶ اور کوئی ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ

فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ

پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے ۲۵۷ اور کوئی ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آ گرتا ہے ۲۵۸

اختلف علماء العربية بعد الاجماع على استحالة كونها للشك (ابن کثیر)

چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ "بلکہ" کے معنی میں ہے۔

کلمة أَوْ بمعنى بَل (کبیر) أَوْ بمعنى بَل (جمل) قال آخرون أَو ههنا بمعنى بل (ابن کثیر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَوْ یہاں بطور کلمۂ اباحت آیا ہے یعنی خواہ انھیں پتھر سمجھو یا پتھر سے بھی بڑھ کر سخت، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ اَوْ کو کلمۂ تنویع قرار دیا جائے اور آیت کے معنی یہ کئے جائیں کہ: ان کے قلب دو قسم کے ہیں کچھ تو پتھر جیسے سخت، اور کچھ اس سے بھی زیادہ سخت۔

فالمعنى هم فرقتان. فيهم من قلبه كالحجر، فيهم من قلبه اشد من الحجر (قرطبی) كان قلوبهم على قسمين قلوب كالحجارة قسوة وقلوب شد قسوة من الحجارة (بحر) او للتنويع اى بعض كالحجارة وبعض اشد۔ (روح)

ایک گروہ ادھر بھی گیا ہے کہ عندکم آخر میں محذوف ہے۔

وقال آخرون معنى ذلك فهى كالحجارة او اشد قسوة عندكم حكاه (ابن جریر۔ ابن کثیر)

۲۵۶ (اور ان سے ایک عالم سیراب ہوتا ہے)

اس قسم کے پتھر یا چٹان کی مثال انسانی آبادی میں حضرات انبیاء و رسل ہیں ان کے چشمۂ فیض سے ایک عالم اپنی روحانی پیاس بجھاتا اور سیراب ہوتا رہتا ہے۔

۲۵۷ (اور ان سے بھی کسی درجہ میں اللہ کی مخلوق سیراب ہوتی رہتی ہے۔)

اس نوعیت کے پتھر یا چٹان کی مثالیں اولیاء امت اور ابرار و متقین ہیں کہ ان سے بھی انسانوں کا ایک بڑا طبقہ فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔

۲۵۸ (اور اس طرح خود اپنے تاثرات کا ثبوت پہنچاتا رہتا ہے)

اس طرح کے پتھر یا چٹان کی مثال عام مومنین صالحین ہیں کہ دوسروں کی اصلاح و ہدایت اگر نہ کر سکیں جب بھی اپنا ایمان تو سلامت لے ہی جاتے ہیں اور اپنے قبولِ حق کا ثبوت تو دے ہی جاتے ہیں۔

مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۔ اوپر سے ذکر پتھروں ہی کا چلا آرہا ہے پتھروں کا جمود تو مسلّم اور ان کی قساوت مشاہد ہے پھر ان میں خشیت اللہ کا گزر کیسے اور ہیبت الٰہی کا اثر کیونکر؟ اہل سنت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ خشیتِ الٰہی کا یہ اثر پتھروں میں اپنے حقیقی اور لفظی معنوں میں ہے یعنی بعض پتھروں میں گداز کا جزو ہوتا ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ

اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ۲۵۹ تو کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو ۲۶۰ کہ وہ لوگ (تمہارے کہنے سے) ایمان لے آئیں گے

گو ان کے مرتبۂ جمادی کے مطابق، اور ان میں فہم و ادراک کی قوتیں ہوتی ہیں۔ گو ان کی سطح حجری کے مناسب جیسے طور کہ آخر پہاڑ ہی تھا، لیکن تجلی الٰہی کے وقت جلالتِ ربانی سے چور چور ہو گیا۔

ذلك بان الله جل ذكره اعطى بعض الحجارة المعرفة والفهم (ابن جرير) قيل المراد به حقيقة الخشية (مدارك) مذهب قوم وهو المروى عن مجاهد وغيره انها خشية حقيقية (روح) مذهب اهل السنة ان لله تعالى علما فى الجمادات وسائر الحيوانات سوى العقلاء لا يقف عليه غير الله فلها صلوة وتسبيح وخشية (معالم)

لیکن ایک دوسرا گروہ بھی اہل سنت کا ہے، یہ کہتا ہے کہ خشیت سے یہاں مراد محض خشیت مجازی یا انقیاد تکوینی ہے، عقل و فہم، شعور و ارادہ سے اس کا تعلق نہیں لیکن بہرحال طبعی و اضطراری طور پر تو موجودات کا ایک ایک ذرہ قوانین الٰہی ہی کے تابع ہے اسی کو یہاں مجازاً خشیت الٰہی سے تعبیر کر دیا گیا ہے جیسے خود محاورۂ قرآنی ہی میں ایک دوسری جگہ ارادہ کو بے جان و بے روح دیوار کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ جدارا يريد ان ينقض (الكهف ع) حالانکہ سب جانتے ہیں کہ دیوار میں کوئی قوت نہ ارادہ کی ہوتی ہے نہ خواہش کی۔

وقال آخرون بل قوله من خشية الله كقوله جدارا يريد ان ينقض ولا ارادة له قالوا وانما اريد بذلك من عظم امر الله يرى كانه هابط خاشع من ذل خشية الله (ابن جرير) قيل هو مجاز عن انقيادها لامر الله (مدارك) والخشية مجاز عن الانقياد (بيضاوى) قال قوم ان الخشية مجاز عن انقيادها لامر الله

دونوں گروہ اہل حق ہی کے ہیں اور دونوں تفسیریں اپنی اپنی جگہ درست ہیں بعض نے مجاز لفظ یہبط میں تسلیم کیا ہے۔ (روح)

قيل لفظة الهبوط مجاز (قرطبى)

ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ منھا میں ضمیر الحجارۃ کی طرف نہیں بلکہ القلوب کی جانب ہے۔

ان الضمير فى قوله تعالى وان منها راجع الى القلوب لا الى الحجارة اى من القلوب لما يخضع من خشية الله (قرطبى)

ف ۲۵۹ خدائے تعالیٰ نہ بے علم و بے خبر ہے، نہ بے طاقت و بے اختیار ہے، اور اس کے علم و طاقت دونوں کا حال عنقریب منکشف اور مشاہد ہو کر رہے گا۔

ف ۲۶۰ (اے مسلمانو! اسرائیلیوں کی ان ساری بدکرداریوں کی روداد سننے کے بعد بھی) خطاب اس آیت میں اسرائیلیوں سے نہیں، مسلمانوں سے ہے۔ حسن بصری تابعی کا قول ہے کہ اس کے مخاطب رسول اور مومنین ہیں۔

قال القاضى وهذا التى بالظاهر (كبير) يريد محمدا واصحابه (معالم)

بلکہ خصوصیت کے ساتھ خطاب انصار سے ہے جو ہم وطنی اور ہم عہدی کی بنا پر یہود کے ایمان لے آنے پر خصوصیت سے حریص تھے۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ

دراں حالیکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں پھر اسے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں بعد اس کے کہ اسے سمجھ

مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾

چکے ہیں اور وہ اسے (خوب) جانتے بھی ہیں ۲۶۳

والخطاب لاصحاب النبی وذلک ان الانصار کان لھم حرص علی اسلام الیھود للحلف والجوار الذی کان بینھم۔ (قرطبی)

أَفَتَطْمَعُونَ۔ میں جو ہمزۂ استفہامی ہے اس سے مقصود استبعاد ہے یعنی بھلا ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے؟

الھمزۃ للانکار الواقع استبعاد۔ (ابو سعود) الاستفھام للاستبعاد والانکار التوبیخی (روح)

تَطْمَعُونَ طمع کے عام معنی لالچ کرنے، حرص رکھنے کے ہیں، لیکن دوسرے معنی امید، توقع کے بھی ہیں اور یہی یہاں مراد ہیں۔

طمع فیہ وبہ ای حرص علیہ ورجاہ (لسان) افترجوا یا محمد (ابن عباس)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے فارسی میں ترجمہ "امید" سے اور مفسر تھانوی نے اردو میں "توقع" سے کیا ہے۔

۲۶۱ وہ لوگ یعنی عہدِ رسول کے معاصر یہود، جن کی قساوتِ قلب کی اتنی مفصل و مسلسل سرگزشت ابھی بیان ہو چکی۔

ھم الیھود الذین کانوا فی زمن الرسول علیہ السلام (کبیر)

لَكُمْ یعنی تمہاری خاطر سے، تمہارے کہنے سے، تمہاری دعوت پر۔

ای لاجل دعوتکم وتستجیبوا لکم (کشاف) لام السبب ای یؤمنوا لاجل دعوتکم لھم (بحر)

أَن يُؤْمِنُوا۔ اَنْ موضعِ نصب میں ہے اور تقدیرِ کلام یوں ہے فی ان یؤمنوا۔ (قرطبی)

۲۶۲ (کہ کیسی سخت جسارت کر رہے ہیں)

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ۔ کَانَ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور لغت و نحو دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ایسا فریق تھا اسرائیلیوں کے درمیان گویا ذکر ماضی کا اور یہود معاصرِ عہدِ اسلام کا ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک ایسا فریق رہا ہے ان کے درمیان گویا ذکر حال کا اور معاصر یہود کا ہو رہا ہے۔ ائمۂ تفسیر سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں لیکن سیاق دوسرے معنی کے زیادہ موافق ہے کہ بحث معاصرین ہی پر قائم کی جا رہی ہے اور لازم انہیں کو قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

المراد بالفریق من کان فی زمان محمد علیہ الصلوٰۃ وھذا اقرب (کبیر)

فَرِيقٌ مِّنْهُمْ۔ لفظ فریق پر حاشیہ پہلے گزر چکا۔

كَلَامَ اللَّهِ۔ یعنی یہود کے آسمانی صحیفے اپنے ہاں کے صحیفوں کی تحریف یہود کو خود مسلم رہی ہے۔ یرمیاہ نبی اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں،

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں ۲۶۳ے اور جب آپس میں تنہا

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ

ہوتے ہیں ۲۶۴ے تو کہتے ہیں کہ ارے کیا تم انہیں وہ بتا دیتے ہو جو خدا نے تم پر منکشف کیا ہے ۲۶۵ے جس سے

رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؀۷۶

وہ تمہیں تمہارے پروردگار کے حضور میں قائل کردیں گے ۲۶۶ے سو کیا تم نہیں سمجھتے ۲۶۷ے

"تم نے زندہ خدا رب الافواج، ہمارے خدا کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے"۔ (یرمیاہ۔ ۲۳، ۳۶)

قرآن مجید کی اعجازی کامیابیوں میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اب خود یہود بھی اپنے آسمانی صحیفوں کی تنزیل لفظی کے قائل نہیں رہے ہیں اور ان کے علماء و اکابر اب صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ صرف مضامین و مطالب کا القاء ہمارے انبیاء و اصفیاء کے قلب صافی پر ہوتا تھا اور وہ حضرات انہیں الہامات معنوی کی روشنی میں اپنے لفظ و عبارت میں نوشتے تیار کر دیتے تھے۔

مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ۔ یعنی نادانستگی میں نہیں دیدہ و دانستہ سب کچھ جان لینے، سمجھ لینے کے بعد۔ آیت سے عالم بےعمل کی گمراہی اور زیادہ نکلتی ہے۔

ودل هذا الكلام ايضا على ان العالم بالحق المعاند فيه بعيد من الرحمة لانه علم الوعد والوعيد ولم ينهه ذلك عن قتادة (قرطبی)

۲۶۳ے اب ذکر منافقین یہود کا شروع ہو رہا ہے۔ یہود کی بڑی تعداد تو مدینہ میں علانیہ دشمن اسلام تھی ہی، لیکن پھر ان کے علاوہ اس قماش کے بھی تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے تھے، یہ ذکر انہیں منافقین کا ہے۔

يعني المنافقين من اليهود۔ (ابن جریر۔ عن ابن عباس)

۲۶۴ے یعنی یہ دیکھ لیتے ہیں کہ آس پاس کوئی مسلمان تو نہیں سن رہا ہے۔

فعل خلا کا صلہ جب الی کے ساتھ آتا ہے اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا واذا خلوا الی شیاطینھم کے تحت میں۔

۲۶۵ے یعنی وہ اسرار و تعلیمات جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں مثلاً آخری نبی کی بشارتیں اور علامتیں۔ یہود جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو قائل کرتے کہ تم اپنے ہاں کی پیشین گوئیاں اور خاص تعلیمات مسلمانوں پر کیوں ظاہر کر کے خواہ مخواہ ان کے ہاتھ میں ہتھیار اپنے خلاف دے دیتے ہو، انہیں معلومات سے وہ ہمیں قائل کرتے ہیں، یہی دلائل وہ بار بار تمہارے خلاف استعمال کرتے ہیں، گویا یہ احمق سمجھ رہے تھے کہ رسول اسلام اور پیروان اسلام کو جو کچھ بھی علم ہوگا محض ان کے بتانے ہی سے ہوگا اور بس ان کے سوا ان پر علم و معلومات کے کل دروازے بند ہیں! یہ جہل مرکب بالکل اسی طرح کا تھا جس میں آج سارا فرنگستان مبتلا ہے، یہ لوگ قرآن مجید پر جب تبصرہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اس مفروضہ کو بنیاد کار

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾ وَمِنْهُمْ

کیا یہ (اتنا بھی) نہیں جانتے کہ اللہ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور اسکی بھی جسے یہ ظاہر کرتے ہیں ٢٦٧ اور ان میں

أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾

ان پڑھ (بھی) ہیں جو کتاب (الٰہی) کا کوئی علم نہیں رکھتے بجز جھوٹی آرزوؤں کے اور محض تخیلات ہی میں پڑے رہتے ہیں ٢٦٩

بنا لیتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ یہود کی توریت مروجہ مسیحیوں کی انجیل مروجہ اور اسی طرح کے دوسرے انسانی ہی ذریعے سے اخذ و منقول ہے اور اس کا تو کوئی امکان ذرا کا بھی نہیں کہ اس میں کوئی غیبی امداد وحی والہام کے قسم کی شامل ہو۔

لفظ الفتاح تو ایک اسلامی اصطلاح ہے لیکن پہلے بھی اس کا استعمال صرف اہل عرب کی زبان پر تھا، یہاں ایسے ذہنوں کی ترجمانی نقل ہوا ہے جو مسلم تھے نہ عرب۔ اس لئے بجائے اسی کو بجنسہ رکھنے کے اس کا ترجمہ یہاں "خدا" درج کر دیا گیا۔

یہ روایت بھی نقل ہوئی ہے کہ کچھ یہود مسلمان ہو گئے تھے ایک روز اپنے اسلاف پر نزول عذاب کی حکایتیں مسلمانوں سے بیان کر رہے تھے، اس پر انھیں باقی یہود نے ٹوکا کہ یہ کیا غضب کی باتیں مسلمانوں کو سنائے دیتے ہو، انھیں معلومات سے یہ مسلح ہو کر تو وہ ہمارے اوپر اور حملہ کریں گے۔ (قرطبی)

٢٦٦ عِنْدَ رَبِّكُمْ کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن اور آخرت میں تمھیں قائل کریں گے، چنانچہ ایک گروہ نے یہی معنی لئے ہیں۔

المراد بما حاجوكم يوم القيامة (كبير عن الاصم) اى عند ربكم يوم القيامة (جلالين)

لیکن زیادہ لگتے ہوئے معنی یہ ہیں کہ اسی دنیا میں تم پر حجت قوی قائم کر دیں گے اور عند ربکم یہاں عند اللہ کی طرح حجتِ قوی و معروف کے معنی میں ہے، اس لئے کہ اول تو یہود عالم آخرت کے پوری طرح قائل نہ تھے، دوسرے وہاں حجت قائم کرنے کے لئے کسی ایسے ظاہری سہارے کی ضرورت بھی نہ تھی، وہاں تو کشفِ حقائق از خود ہو کر رہے گا۔ اس لئے یہاں گویا احتجاج بہ کتاب کو عند اللہ سے تعبیر کیا ہے اور یہ امر قدیم ائمہ تفسیر کی عظمت پر بس کرتا ہے کہ انھوں نے یہود کے عقائد متعلق بہ آخرت کا پورا علم رکھے بغیر بھی یہی پہلو اختیار کر لیا ہے۔

هو فى كتاب الله هكذا وهو عند الله هكذا بمعنى واحد (كشاف) اى فى حكمه تعركم عن القصد) قيل هذا على اضمار المضاف اى عند كتاب ربكم (مدارك) ليحتجوا عليكم بما انزل ربكم فى كتابه (بيضاوى) اى فى كتابه وحكمه (روح)

یہ مفہوم مان کر عِنْدَ کو فِیْ کے معنی میں لینا ہوگا۔

قيل عند هو معنى فى اى ليحاجوكم به فى ربكم (قرطبی)

٢٦٧ (جو مسلمانوں کو اپنے رازوں ہی زبانی سے واقف کئے دیتے اور ان کے ہاتھوں میں اپنے خلاف ہتھیار دیئے دیتے ہو) اب یہاں پر اکابر یہود کی تقریر اپنے ہم قوموں سے ختم ہوئی۔

٢٦٨ (اور وہ بھی اللہ جب چاہے رسول اور مومنین کو اطلاع دے سکتا ہے)

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ

سو (سخت) خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب (الٰہی) کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا

عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

کی طرف سے ہے ۲۷۰ تاکہ اس سے قدرے قلیل معاوضہ حاصل کریں ۲۷۱

معمولی سی بات ہے کہ اللہ کے لئے ایسے امور کی اطلاع اپنے پیمبر کو دے دینا مشکل ہی کیا تھا لیکن بے مغز ہیود اس امکان ہی کی طرف بہت ذہن نہیں لے جاتے تھے کہ شاید اس مدعی نبوت کا تعلق خدائے تعالٰی کے ساتھ واقعی کچھ ہو۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آج بے مغز فرنگی اس امکان ہی کی طرف ذہن نہیں لے جاتے کہ کہیں قرآن انسانی تصنیف کے بجائے واقعی خدا ہی کی کتاب نہ ہو۔

ف۲۶۹ (کہ ہمارے بزرگ ہمیں بخشوا لیں گے "ہم خدا کے خاص محبوبوں کی اولاد ہیں ہمیں کیا غم" وغیرہ) اشارہ اسی قسم کے خرافات عقائد کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ یہ ذکر عوام یہود کا ہے۔ یہ عوام کالانعام پڑھے نہ لکھے، باپ دادا کی لکیر کے فقیر اپنے دل کی گڑھی ہوئی آرزوؤں اور دل خوش کن روایتوں میں پڑے مست رہتے تھے انجیل میں کہیں تو مسیح کی زبان سے اور اس سے بڑھ کر پولوس کی زبان سے یہود کی انھیں باطل پرستیوں اور حماقت نوازیوں کا ذکر بار بار آیا ہے آمانی۔ اُمنیۃ کی جمع ہے ایک معنی تو یہ ہیں کہ محض اپنی آرزوؤں کو پالتے رہتے ہیں جنھیں واقعیت و حقیقت سے مطلق تعلق نہیں۔

امنیۃ ما یتخیلہ الانسان (کبیر) التمنی فی ھذا الموقع ھو تخلق الکذب وتخرصہ۔ (ابن جریر)

دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ یہ جھوٹی روایتوں، بے ثبوت و بے سند خرافات میں پڑے رہتے ہیں اور یہی اکثر اکابر سے منقول ہیں۔

اکاذیب مختلفۃ سمعوھا من علماءھم فقبلوھا علی التقلید (بحر عن ابن عباس ومجاہد والفراء)

ف۲۷۰ پچھلی آیت میں ذکر عوام یہود کا تھا، اب ذکر خواص و اکابر یہود کا ہے۔ توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں، دوست دشمن سبھی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الٰہی نہیں اور اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے۔ اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خاصانِ خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب و تالیف دیا اور خدائے تعالٰی کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً یا بالواسطہ ہے حقیقی اور بلاواسطہ مفہوم میں نہیں پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں یا وہ بالغرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوئی ہوں بہرحال ان کے وقوع کا اعتراف اب کھلے خزانے سب کو ہے اور بائبل کی تنقید عالیہ (HIGHER CRITICISM) ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے جرمن، فرنچ، انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں اور مقالہ و مضامین کا تو شمار ہی نہیں پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے انتقاد متن (TEXTUAL CRITICISM) انتقاد تاریخی (HISTORICAL CRITICISM) وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں۔۔ کاش سید احمد خاں مرحوم (اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے) آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ یہود و نصارٰی

فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾

سو خرابی ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں ۲۷۲ اور خرابی ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے رہتے ہیں

کی طرف سے جس الزام کی صفائی خواہ مخواہ انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھی اس جرم کا اقبال اب کھلے لفظوں میں وہی ونگ کثرت سے کر رہے ہیں۔ یورپ اب جاکر جو کہتا ہے اور یہ فن ابھی پچھلی صدی یعنی انیسویں صدی سے پیدا ہوا ہے عرب کے اُمّی کے لائے ہوئے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ سو صدی پیشتر ہی اہل کتاب کی "کتاب" (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) کو تمام تر محرّف و ناقابل اعتماد قرار دے دیا تھا۔

بِأَيْدِيهِمْ۔ یہ تصریح کا اضافہ زور و تاکید کلام کے لئے ہے۔ اس لئے کہ کتابت ہاتھوں سے تو بہر حال ہوتی ہی ہے جیسا کہ اُردو محاورہ میں بھی زور و تاکید کے موقع پر بولتے ہیں "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" "اپنے کانوں سے سنا ہے" حالانکہ دیکھنا اور سننا تو ہمیشہ آنکھوں اور کانوں ہی سے ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید میں بھی اس کی نظیریں ملتی ہیں یقولون بافواههم۔ وطائر يطير بجناحيه الا انما امثالكم وغيرها محققین نے لکھا ہے کہ اس آیت اور آیت ماقبل دونوں میں بڑی وعید شریعت میں ہر قسم کے اضافہ و ترمیم وغیرہ پر موجود ہے۔

في هذه الآية والتي قبلها التحذير من التبديل والتغيير والزيادة في الشرع فكل من بدل وغير او ابتدع في دين الله ما ليس منه ولا يجوز فيه فهو داخل تحت هذا الوعيد الشديد والعذاب الأليم (قرطبی)

اَللہ کا لفظ یہاں یہود کی زبان سے ادا ہوا ہے اس لئے ترجمہ خدا سے کیا گیا۔

۲۷۱ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت کے اندر دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہود کی انتہائی شقاوتِ قلب کی جانب کہ کلامِ ربّانی تک میں تحریف سے نہ چوکے، دوسرے اس امر کی طرف کہ اس تحریف سے بھی مقصود کوئی خدمتِ دین نہ تھی، تمام تر تحصیل جاہ و مال ہی تھی۔

ثَمَنًا۔ ثمن کے معنی صرف نقد یا زرِ قیمت کے نہیں بلکہ جو چیز بھی کسی چیز کے معاوضہ میں حاصل ہو وہ اس کی ثمن ہے

كل ما يحصل عوضا عن شيء فهو ثمنه (راغب)

مفسرین نے بھی اسے یہاں اسی وسیع مفہوم یعنی مطلق دنیوی معاوضہ کے معنی میں لیا ہے۔

الثمن هنا هو عرض الدنيا (بحر)

قَلِيلًا۔ کلامِ ربّانی کی تصحیف و تحریف جیسے شدید و عظیم جرم سے جو بھی مادی نفع کسی قسم کا بھی حاصل ہوگا، ظاہر ہے کہ وہ حقیر و بے وقعت ہی ہوگا۔

بعض خشک اہلِ ظاہر نے آیت کے ظاہر الفاظ پر جاکر یہ فتوے دے دیا ہے کہ قرآن مجید کی خرید و فروخت دونوں ناجائز ہیں لیکن مذہب صحیح یہ ہے کہ دونوں بالکل جائز ہیں، بیع و شرا یہاں جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ کاغذ، کتابت وغیرہ کی ہوتی ہے نہ کہ آیات اللہ کی۔ آیت سے اگر کوئی وعید لازم آتی ہے تو وہ جھوٹے مسئلے بنانے والوں اور موضوع حدیثیں بیان کرنے والوں کے حق میں ہے۔

۲۷۲ قرآنی اور اسلامی معیارِ صداقت و دیانت سے ہر تحریف اور ہر تصحیف موجبِ لعنت ہے اور حد سے

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز چند گنے چنے دنوں کے ۲۷۲

زمی ہوئی جسارت اور اسی لئے یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں بھی آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی شخص کسی کلام کو کلام الٰہی مان کر اس میں دخل و تصرف کی ہمت کر کیسے سکتا ہے۔ لیکن دوسری قومیں اس معیار ہی سے نا آشنا ہیں۔ بلکہ بعض اہل کتاب کے ہاں تو بھلائی کے لئے برائی درست اور "خدا کی سچائی" اور "خداوند کے جلال" کے اظہار کے لئے یہ جھوٹ جائز۔ آج دنیا میں مسیحیت کے نام سے جو تثلیثی مذہب پھیلا ہوا ہے اس مذہب کے بانی پولس (۱۰۰۰) اسرائیلی ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ قول آج تک انجیل مروج میں لکھا چلا آرہا ہے:

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟ اور ہم کیوں نہ برائی کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو؟" (رومیون ۔ ۳ : ۷)

۲۷۰ (اپنی تحریفی جسارتوں سے)

مِمَّا يَكْسِبُونَ ۔ سے مراد کیا ہے؟ یعنی وہ کیا چیز ہے جو وہ اپنی حرکتوں سے حاصل کرتے رہتے ہیں؟ اس کے دو جوابات دیئے گئے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے گناہوں کا ذخیرہ مراد ہے یعنی وہ لوگ اپنی ان حرکتوں سے اپنے معاصی ہی کا انبار بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

نفال من المعاصی (معالم) والمراد منه لذلک سائر معاصیهم (کبیر)

دوسرے یہ کہ جو مالی نفع وہ اپنی اس مجرمانہ تحریف اور (بے قول قود) دیگر مصلحت آمیز سے حاصل کرتے ہیں وہ بیان مراد ہے۔

یصیبون من الحرام والرشوة (ابن عباس) ای مما اکلوا به من السحت (ابن کثیر) المال المأخوذ علی هذا الوجه (کبیر، مرید به الرشی بیضاوی)

فَوَيْلٌ ..... وَوَيْلٌ ۔ ویل کی تکرار معصیتِ تحریف و تصحیف کی اہمیت کے اظہار کے لئے ہے۔

وکرر الویل تغلیظا لفعلهم (قرطبی)

۲۷۲ اور یہ چند دن وہی ہیں (جیسا کہ پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے حاشیے میں اکابر یہود کے حوالے سے لکھا ہے) جن میں قوم اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی یعنی کوئی چالیس دن۔ اور یہی بات ہمارے بعض ائمۂ تفسیر نے بھی نقل کی ہے:۔

قد ارمعین یوما التی عبد فیها آباؤنا العجل ۔ (ابن عباس)

اور ایک دوسرے مسیحی مترجم قرآن سیل نے یہ مدت گیارہ مہینہ یا ایک سال نقل کی ہے اسی طرح ایک میعاد ستّر دن کی بھی نقل ہوئی ہے بہرحال وہ بھی کوئی محدود و متعین مختصر سی مدت بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتشِ دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھے ہوئے تھے چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے:

"آتشِ دوزخ گنہگاران قوم یہود کو چھوئے گی بھی نہیں اس لئے کہ وہ در جہنم پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے۔" (جلد ۵ ص ۵۸۳)

او یہود کے بڑے مقدس نوشتہ تالمود کے انتخابات کا جو مجموعہ انگریزی میں ڈاکٹر کوہن (KOHAN) کا مرتب

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ

آپ کہیے کیا تم اللہ کے ہاں سے کوئی وعدہ پاچکے ہو جو اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا یا یوں ہی تم

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ

اللہ پر وہ جوڑ رہے ہو جس کا علم تم نہیں رکھتے ۲۷۵ (نہیں) بلکہ اصل یہ ہے کہ جو کوئی بھی بدی کسب کرے گا اور

خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞

اس کا گناہ اس کو گھیرے گا سو یہی لوگ تو اہل دوزخ ہیں ۲۷۶ اس میں ہمیشہ پڑے رہنے والے ۲۷۷

کیا ہوا EVERYMAN'S LIBRARY SERIES میں شائع ہوا ہے، اس میں یوں آیا ہے:-

"قیامت کے دن ابراہیم دیر دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے" صفحہ ۲۰۲ "جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی" صفحہ ۲۰۵

حاصل یہ کہ بنی اسرائیل اپنی قوم کو خدا کی لاڈلی اور دلاری سمجھے ہوئے تھے اور اس پر حد سے زیادہ نازاں تھے یہود کی زبان سے اس سلسلہ میں "ہم" صیغہ جمع متکلم جہاں بھی آیا ہے اجتماعی معنی کے اعتبار سے یعنی "ہماری قوم" کے معنی میں ہے۔

۲۷۵ یہود سے بطور حجت الزامی سوال ہو رہا ہے کہ یہ جو اپنی قوم کی محبوبیت، خصوصاً عذاب آخرت سے محفوظیت کا، عدم مسئولیت کا عقیدہ تم نے اپنے دل میں جما رکھا ہے تو آخر یہ یوں ہی اپنے دل سے گڑھ لیا ہے یا اس کی کوئی سند بھی اپنے مقدس نوشتوں میں دکھا سکتے ہو؟ آخر یہ اعتماد کہاں سے قائم کر لیا ہے۔

تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ۔ قال کا صلہ جب علی کے ساتھ ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی پر کوئی بات جوڑنے، کسی پر غلط بات باندھ دینا

قال علیه ای افتری (تاج)

۲۷۶ نجات و عدم نجات کا اصل قانون اب بیان ہو رہا ہے کہ اسے نسل و قوم سے کوئی واسطہ نہیں۔

بلٰی۔ ایسے اقرار کے موقع پر آتا ہے جہاں کوئی انکار قبل سے واقع نہ ہو۔

وضعت بلٰی لکل اقرار فی اوله جحد ووضعت نعم للاستفهام الذی لا جحد فیه معا

اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ۔ قصداً بدی کی راہ اختیار کرنا اور معصیت سے پوری طرح گھر جانا کہ خود ایمان کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہ جائے، صرف انھیں کے لئے ممکن ہے جو سرے سے اہل باطل ہوں اور ان کی موت کفر ہی پر آئے، مومن کیسا ہی بدعمل ہو بہرحال اس آیت کا مصداق نہ ہوگا کم از کم زبان سے اقرار اور قلب سے تصدیق کا درجہ تو اسے حاصل ہی ہوگا، تمام اکابر اہل سنت نے یہاں مراد کفر ہی سے لی ہے

ای اشرك بالله ومات علیه (ابن عباس) السیئة الکفر والشرك قال ابن عباس ومجاهد (معالم) المؤمنون لا یخلدون فی حکم هذه الآیة (معالم عن الواحدی) فلما کان المؤمن فاعظم الطاعات وهو الایمان معه فلا یکون الذنب محیطا به فلا یتناوله الوعید (مدارك)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا

اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یہی لوگ اہل جنت ہیں اس میں ہمیشہ رہنے

خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ

والے ٢٧٧ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ٢٧٩ کہ عبادت نہ کرنا کسی کی بجز اللہ کے ٢٨٠

بعض اہل باطل نے اس آیت سے جو مومن عاصی کی عدم مغفوریت پر استدلال کرنا چاہا ہے وہ صریحًا باطل ہے۔ سَیِّئَۃً خود سیئہ کے معنی ہی شرک کے گئے ہیں۔

اَلسَّیِّئَۃُ الشرک (قرطبی) واحد السیئۃ لانہ تنی بد ش مفرد وھو الشرک (بحر)

٢٧٧ خُلُوْد کے معنی اگرچہ مدت طویل کے بھی ہیں لیکن اہل دوزخ اور اہل جنت کے سلسلہ میں جہاں جہاں اس لفظ کا استعمال قرآن مجید میں ہوا ہے اہل سنت کا اجماع ہے کہ اس سے مراد دوام یا ہمیشگی ہے اور اس کی تاکید میں قرآن مجید میں خٰلِدِيْنَ فِيْهَا کے ساتھ جا بجا ابدًا بھی آیا ہے۔

والمراد بالخلود الدوام (روح)۔ ومن الناس من حمل الخلود علی اصل الوضع وھو اللبث الطویل ولیس بشیء لان فیہ تھوین الخطب فی مقام التھویل مع عدم ملائمتہ حمل الخلود فی الجنۃ علی الدوام (روح)

٢٧٨ دونوں آیتوں میں نجات کا پورا قانون ایجاز و اختصار کے ساتھ آ گیا کہ نجات کو نسل و قوم سے کوئی تعلق نہیں، جو کوئی اپنے قصد و اختیار سے بدعقیدگی و بدکرداری کی راہ پر چلے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے، جو کوئی اپنے قصد و اختیار سے ایمان و عمل صالح کی روش کا انتخاب کرے گا، اس کی منزل جنت ہے۔

اُولٰٓئِكَ۔ فَاُولٰٓئِكَ۔ اوپر کی آیت کے الفاظ تھے فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ اور اس آیت میں ہے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ گویا ایک ہی قسم کا حکم لگنے میں ایک جگہ اُولٰٓئِكَ فَ کے ساتھ ہے اور ایک جگہ بغیر فَ کے، یہ فرق گو خفیف اور لفظی ہی نہیں محض حرفی ہے لیکن اتنا فرق بھی آخر کیوں؟ اہل تحقیق نے جواب میں کہا ہے کہ پہلا موقع وعید کا تھا اہل جہنم کے لئے اور وعید میں امکان تخلف وعید کا ہے اس لئے اس پر زور دیا گیا ہے اور دوسرے موقع پر بشارت وعدہ تھا اہل جنت سے جس سے تخلف کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس لئے محض اُولٰٓئِكَ بغیر فَ کے بالکل کافی ہو گیا اور دوسرا جواب اس کے برعکس یہ بھی دیا گیا ہے کہ اہل نحو کہتے ہیں کہ اس فقرہ میں دخل داری فالکرمہ میں اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے کا اکرام نہ بھی کیا جائے لیکن دوسرے فقرہ من دخل داری اکرمہ میں اکرام کرنا یقینی ہو جاتا ہے، عدم اکرام کا احتمال نہیں باقی رہتا۔ اسی نمونہ پر قرآنی فقرہ میں نیک کاروں کو جنت ملنا بالکل یقینی ہے (روح)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جو ترتیب یہاں ہے قرآن نے ہر جگہ اور بڑی کثرت سے ملحوظ رکھی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گو عمل صالح اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ضروری ہے، لیکن ایمان اس سے بھی اہم تر ہے اور بغیر ایمان کے مجرد عمل صالح کے کوئی معنی ہی نہیں، ایمان کی حقیقت نیت عمل اور فکر کی تصحیح ہے اور قرآن مجید نے بالکل فطری ترتیب کے مطابق تصحیح فکر کو تصحیح عمل پر مقدم رکھا ہے، محض عمل اگر نیت سے قطع نظر کر لی جائے تو صرف صورت عمل رہ جاتا ہے حقیقت عمل نہیں

وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا

اور حسنِ سلوک سے پیش آنا (اپنے) ماں باپ سے اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے بھی) ۲۸۱ اور لوگوں سے

لِلنَّاسِ حُسْنًا

(بالعموم) بھلی بات کہنا ۲۸۲

۲۷۹ (ان کے پیغمبروں کے واسطہ سے)
عہد جب اس کا تعلق خدائے تعالیٰ سے ہوتا ہے، محاورۂ توریت میں حکم کے معنی میں آتا ہے مثلاً:۔
"اور اس نے اپنا عہد تمہارے آگے بیان کیا جس پر عمل کرنے کا حکم دیا اس نے یعنی دس احکام" (استثناء ۴: ۱۳)
بعض شارحینِ قرآن نے بھی یہاں "عہد لینے" کو "حکم دینے" کے معنی میں لیا ہے۔
ای اُمرنا بنی ملک (ابن قتیبہ)
۲۸۰ توریت اثباتِ توحید و ممانعتِ شرک سے بھری پڑی ہے۔ صرف دو ایک مقام بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔
"میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے
زمین پر یا پانی پر زمین کے نیچے ہے مت بنا تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر" (خروج ۲۰: ۳۔۵)
"میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے
زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا تو انہیں سجدہ نہ کر نہ ان کی بندگی کر" (استثناء ۵: ۷۔۸) "سن لے
اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے" (استثناء ۶: ۴) "تم اوپرے معبودوں کی قوموں کے معبودوں میں سے
جو تمہارے آس پاس ہیں پیروی نہ کرو، کیوں کہ خداوند تیرا خدا جو تمہارے درمیان ہے غیور خدا ہے، نہ ہو کہ خداوند
تیرے خدا کے قہر کی آگ تجھ پر بھڑکے اور تجھے روئے زمین سے فنا کر دے" (استثناء ۶: ۱۴ و ۱۵)
تَعْبُدُوْنَ۔ صورۃً صیغہ مضارع ہے لیکن معنی امر ہے۔
ھو اخبار فی معنی النھی (کشاف)
بلکہ امر صریح سے بلیغ تر ہے یعنی اس سے یہ نکلتا ہے کہ گویا اس حکم کی تعمیل ہو چکی۔
وھو ابلغ من صریح الامر والنھی لانہ کانہ سورع الی الامتثال (کشاف) ھو ابلغ من صریح
النھی لما فیہ من ابھام ان المنھی سارع الی الانتھاء فھو یخبر عنہ (بیضاوی)
۲۸۱ اس سے ملتے جلتے احکام توریت موجودہ میں اب بھی موجود ہیں:۔
"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے" (خروج ۲۰: ۱۲) "اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے جیسا خداوند تیرے خدا
نے فرمایا ہے" (استثناء ۵: ۱۶) "اور اپنے مفلس بھائی کی طرف سے اپنے ہاتھ مت سمیٹیو بلکہ تو اس پر اپنا ہاتھ
کشادہ رکھیو اور کسی کام میں جو وہ چاہے بقدر اس کی احتیاج کے ضرور اس کو قرض دیجیو" (استثناء ۱۵: ۸)
"مسکین زمین پر سے کبھی جاتے نہ رہیں گے اس لئے یہ کہہ کے میں تجھے حکم کرتا ہوں کہ تو اپنے بھائی کے واسطے اور

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ۚ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ

اور نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا ۲۸۲ پھر تم (سب ان احکام سے) پھر گئے بجز تم میں سے

وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ

(معدودے) چند کے اور تم ہی ہو گردن کش ۲۸۳ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا ۲۸۴

وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾

اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے مت نکالنا، پھر تم نے اس کا اقرار کر لیا اور تم (اس کے) گواہ ہو ۲۸۵

اپنے مسکین کے لئے اور اپنے محتاج کے واسطے جو تیری زمین پر ہے اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو" (استثناء ۱۵: ۱۱)

" اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہیں آویں اور کھاویں اور سیر ہو ویں" (استثناء ۱۵: ۸ و ۹)

۲۸۲ یعنی عام طور پر لوگوں سے حسن گفتار کو قائم رکھو۔

ای قولوا للناس مقالة حسنة (بحر) قولوا لهم القول الطيب (بحر عن ابی العالیہ)

بات چیت میں اچھی طرح پیش آتے رہنا، سہل ترین اور ادنیٰ ترین فریضۂ انسانیت ہے اس لئے یہ حکم عام ہے یعنی خوش خلقی سے سب ہی کے ساتھ پیش آتے رہنا چاہئے، چاہے وہ نیک ہو یا بد، فاسق و صالح کیسا ہی انسان ہو، ہاں احتیاط اتنی رہے کہ اس خوش خلقی و خندہ روئی سے کہیں مخاطب کی بدعت یا بدمذہبی کی تائید نہ پیدا ہو جائے۔

وهذا كله حض على مكارم الأخلاق فينبغي للانسان ان يكون قوله للناس لينا ووجهه منبسطا مع البر والفاجر والسني والمبتدع من غير مداهنة ومن غير ان يتكلم معه بكلام يظن انه يرضي مذهبه (قرطبی)

بعض نے کہا ہے کہ اس حکم کی تعمیم آیاتِ قتال سے منسوخ ہو گئی لیکن حضرت ابو جعفر باقرؒ سے مروی ہے کہ یہ حکم اب بھی عام ہے، تحدید و تخصیص پر کوئی دلیل نہیں، اور یہی مذہب قوی ہے۔

زعم ابو جعفر محمد بن علی الباقر ان هذا العموم باق على ظاهره وانه لاحاجة الى التخصيص وهذا هو الاقوى (کبیر)

توریت موجودہ میں اب حسن سلوک کے جتنے بھی احکام ملتے ہیں ان کا دائرہ محدود ہے بنی اسرائیل کے ساتھ اس لئے یا تو اس حکم کو اہلِ توریت نے بدل ڈالا اور یا حکم یہ ہی خاص شریعت محمدیؐ کا حکم جیسا کہ متعدد اہل تفسیر کا گمان ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کیا جائے ان سے با ادب پیش آیا جائے ان کے احکام کی تعمیل کی جائے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور ان کے دوستوں سے بہ حسن سلوک پیش آیا جائے۔

الاحسان الى الوالدين معاشرتهما بالمعروف والتواضع لهما وامتثال امرهما والدعاء لهما بعد مماتهما وصلة اهل ودهما (قرطبی)

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکال بھی دیتے ہو (اور)

دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ

ان کے مقابلہ میں گناہ وظلم کے ساتھ (ان کے مخالفین کی) مدد بھی کرتے ہو ؑ۲۸۷

حکم توحید کے معاً بعد بندوں کے ساتھ ان احکام سلوک وحسن معاشرت کو لے آنا اس کی دلیل ہے کہ خدائے اسلام کے ہاں حقوق العباد (بندوں کے حقوق) کی اہمیت کتنی زیادہ رہی ہے۔

۲۸۳ صلوٰۃ، اقامت صلوٰۃ، زکوٰۃ اب یہ سب مخصوص اسلامی اصطلاحیں ہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اسرائیلیوں کو یہ سب احکام انھیں مخصوص ہیئتوں اور انھیں متعین قیود کے ساتھ ملے تھے جن کا اب نام ہے۔ وہ تھیں عبادتوں سے متعلق لیکن ان کی مخصوص ہیئت اور ان کے حالات وماحول کے مطابق، خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور دعا وعبادت کی تاکید اب بھی توریت میں مختلف عنوانات سے موجود ہے۔

۲۸۴ خطاب اب قرآن کے معاصر یہود سے ہے کہ اب تم سارے قول وقرار سے پھر گئے اور تم میں سے صرف چند (عبداللہ بن سلام وغیرہ) دین حق پر قائم رہ گئے۔

الخطاب لمعاصری محمد صلی اللہ علیہ وسلم الاقلیل کعبد اللہ بن سلام واصحابہ (قرطبی)

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ چند شہادتیں اسی مضمون کی خود توریت سے ملاحظہ ہوں:۔

"وہ اس راہ سے جو میں نے انھیں فرمائی جلد پھر گئے" (خروج ۳۲: ۸) "میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے" (خروج ۳۲: ۹) "اس لیے کہ تم گردن کش لوگ ہو" (خروج ۳۳: ۳) "بنی اسرائیل کو کہہ دے کہ تم گردن کش لوگ ہو" (خروج ۳۳: ۵)

یہ چند حوالے صرف نمونہ کے طور پر دیے گئے ورنہ توریت کا تو یہ ایک خصوصی موضوع ہی ہے۔

تَوَلَّيْتُمْ ... مُّعْرِضُوْنَ۔ تولی اور اعراض کے درمیان فرق یہ کیا گیا ہے کہ تولی جسمانی ہوتا ہے اور اعراض قلبی یا روحانی

وقیل التولی بالجسم والاعراض بالقلب (قرطبی)

۲۸۵ "عہد لیا" یہاں بھی "حکم دیا" کے معنی میں ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۷۹

خونریزی کی ممانعت توریت مروجہ میں بھی متعدد مقامات پر ملتی ہے۔ مثلاً:

"تو خون مت کر" (خروج ۲۰: ۱۳) "بے گناہ کا لہو تیری زمین پر جسے خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے بہایا نہ جائے کہ خون تجھ پر ہو" (استثناء ۱۹: ۱۰)

۲۸۶ یعنی ان احکام کی اطاعت کا اقرار تم نے صاف صاف کیا جو آج تک تمھارے نوشتوں میں لکھا چلا آتا ہے، اور تمھیں اس سے مجال انکار نہیں۔ توریت میں ہے:۔

"وہ بولے کہ سب کچھ جو خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے، اور تابع رہیں گے" (خروج ۲۴: ۷)

۲۸۷ یہود کے جو قبیلے عہد نبوی میں مدینہ اور جوار مدینہ میں آباد تھے، ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ باہم خانہ جنگیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ مشرکین مدینہ دو بڑی ٹکڑیوں میں آج کل کی "مہذب" فرنگی قوموں کی طرح بٹے ہوئے تھے، ایک تھا

وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ

اور اگر وہ تم تک اسیر ہو کر پہنچ جاتے ہیں تو تم فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو ۲۸۸ حالانکہ ان کا (وطن سے) نکالنا ہی تم پر حرام تھا ۲۸۹

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو ۲۵۰ پس تم میں سے جو ایسا کرے

يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ

اس کی سزا کیا ہے بجز دنیوی زندگی میں رسوائی کے ۲۹۱

اوس کا تھا، دوسرا خزرج کا، اسرائیلیوں کے بھی بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ یہی کیا کرتے کہ ان میں ایک مشرکوں کے ایک حصے کے ساتھ ہو جاتا، اور دوسرا مشرکوں کی دوسری پارٹی کے ساتھ۔ اور پھر جنگ جب شروع ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ وہ سب ہی کچھ ہوتا جو جنگ میں ہوا کرتا ہے، جلاوطنی، اسرائیلی کا قتل اسرائیلی کے ہاتھ سے وغیرہا۔ یہاں عہد نبوی کے معاصر اسرائیلیوں کے یہی خصوصیات بے نقاب کئے جا رہے ہیں۔

بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ یہ کہکر اور بڑھا کر قرآن نے بتلا دیا یہ بھی نہیں کہ اس خانہ جنگی اور مشرک نوازی کی بنا کسی جذبۂ صادق و صحیح اور حسن نیت و اخلاص پر ہو بلکہ تمام تر جن اخلاقی گندگیوں میں دنیوی اہل سیاست عموماً مبتلا رہتے ہیں اور مشرکین خاص طور سے مبتلا تھے، وہی ان محاربات کا باعث تھیں۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آج بھی یہ درج ہے کہ جنگ بعاث مشرکین کی باہمی جنگ تھی یہود اس میں فریقین کی جانب سے شریک ہو گئے اور نمایاں حصہ لیا بنی نضیر اور بنی قریظہ نے اوس کا ساتھ دیا، اور بنی قینقاع خزرج کی حمایت میں نکل پڑے جنگ نے طول کھینچا اور بڑے گھمسان کا رن پڑا، بالآخر شکست خزرج کے فریق کو ہوئی۔ (جلد ۸ صفحہ ۲۲۳) اسی انسائیکلوپیڈیا میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ یہودی قبیلے مشرکین مدینہ کے ساتھ شادی بیاہ کرتے تھے، اور جنگ میں دونوں فریقوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے"۔

۲۸۸ (اور اس کو اپنے نزدیک دینداری کا بڑا کارنامہ سمجھ کر اس پر فخر کرتے اور احسان جتلاتے ہو)

۲۸۹ توریت محرف میں بھی آج تک اسی قسم کے احکام لکھے چلے آتے ہیں:۔

"تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر"۔ (خروج ۲۰: ۱۷)

لیکن بالفرض کوئی صراحت اس قسم کی نہ ملے جب بھی کسی کو بلا عذر شرعی وطن سے بے وطن کر دینا ظلم کی انتہا ہے۔ ھُوَ ضمیر اخراج کے لئے ہے۔

و ھو اخراجھم محرم علیکم تم اعاد الاخراج مرۃ اخری تکریرا علی ھو (معالم)

۲۵۰ الْكِتٰبِ سے اس جا پر مراد ظاہر ہے کہ اسرائیلیوں ہی کی آسمانی کتاب توریت ہے، بحث ارشاد دور پر قائم ہو رہی ہے کہ قرآن پر ایمان لانا تو الگ رہا، تم خود توریت ہی کے کب پابند ہو؟ بلکہ جس بیباکی سے تمہارے اکابر اس کے بعض احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، اس سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے اوپر توریت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ،

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی ۲۹۷ اور ان کے پیچھے ہم نے پے در پے پیمبر بھیجے ۲۹۸

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ،

اور عیسیٰ ابن مریمؑ کو ہم نے روشن نشانات عطا کئے ۲۹۹ اور ہم نے روح القدس (کے ذریعہ) سے ان کی تائید کی ۳۰۰

یہ اسلات کافی ہیں۔ قرآن کو اسی لئے اس عقیدہ کی تردید بار بار کرنی پڑی اور مختلف پیرایوں میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ قانون الٰہی کے باخبر کا ہندو و سفارش کوئی بھی نبی یا ولی نہیں ہو سکتا اور جو ایمان سے خالی ہیں ان کی امداد و نصرت کسی سمت و جہت سے بھی نہ ہوگی۔

۲۹۷ (اور ایک مستقل دستور شریعت سے قوم اسرائیل کو بطور انعام خاص مشرف و ممتاز کیا۔)

الْكِتٰبَ سے مراد وہی توریت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کون تھے کس زمانہ میں تھے، یہ سب ذکر پہلے حاشیوں میں آچکا ہے۔

۲۹۸ (تمھاری ہی نسل اسرائیل میں)

اسرائیلیوں میں حضرت موسیٰؑ کے بعد بھی انبیاء کا متواتر اور بہ کثرت آتے رہنا تاریخ کا ایک مشہور و مسلّم واقعہ ہے حضرت یوشعؑ نبی، حضرت داؤدؑ نبی، حضرت زکریاؑ نبی، حضرت یحییٰؑ نبی کے نام سے اُردو داں طبقہ بھی واقف ہے متعدد انبیاء کے صحیفے کیسے ہی محرّف سہی بہرحال "عہد نامۂ عتیق" کے موجودہ مجموعہ میں شامل ہیں۔

۲۹۹ (ان کی پیمبری و صداقت کے)

الْبَيِّنٰتِ ۔ اس میں دلائل، خوارق، معجزات سب آگئے۔

عِيْسٰى۔ آپ سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ سنہ عیسوی آپ ہی کے نام سے جاری ہے آپ کے بعد صرف نبوت محمدی ہوئی ملک شام کے علاقہ ارض گلیل میں ایک قصبہ ناصرہ نامی ہے وہی آبائی وطن ہے ولادت بیت المقدس کے ایک گوشہ میں ہوئی، خاندان یوسف بن یعقوب بن ماثان نامی ایک حکیم کا تھا جناب یوسف لکڑی کا کام کرتے تھے اسی لئے یوسف نجار کے نام سے مشہور تھے شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک نیم خود مختار صوبہ تھا اور اس وقت والی شام ہیرود تھا، مسیحی تقویم میں تین سال کی غلطی شروع سے چلی آرہی ہے اس لئے آپ کا سالِ ولادت وہ نہیں جب سے مسیحی تقویم شروع ہوئی ہے بلکہ اس سے تین سال بعد کا ہے اس لحاظ سے کہنا یہ چاہئے کہ آپ کی ولادت ۳ ؁ ق م میں ہوئی۔ ۳۲ سال کی عمر میں آپ جمہور امت کے عقیدہ کے مطابق زندہ اور مسیحی عقیدہ کے مطابق تین دن کے لئے وفات پاکر آسمان پر اٹھالئے گئے۔ آپ کے رفع آسمانی سے انکار صرف بعض جدید فرقوں نے کیا ہے۔

مَرْيَمَ بنت عمران بن ماثان قوم اسرائیل کے ایک بڑے معزز خاندان سے تھیں۔ اور خود بھی باعصمت اور خوبصورت تھیں۔ سال وفات مسیحی روایتوں کے مطابق ۴۸ ؁ ہے۔

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ۔ ابن مریم کے لفظ میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ مسیحؑ اپنے پیمبرانہ عظمت کے باوجود محض بشر ہی تھے، ایک عورت کے بطن سے پیدا۔ خدا یا مثیلِ خدا یا فرزند خدا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے۔

۳۰۰ رُوْحُ الْقُدُس۔ اسلامی اصطلاح میں مشہور ممتاز و مقرب فرشتہ حضرت جبرئیلؑ کو کہتے ہیں۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ

تو کیا جب کبھی کوئی پیمبر تمہارے پاس ان (احکام) کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھائے ۳۰۱ تو تم اکڑنے لگے ۳۰۲

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

پھر بعض کو تم نے جھٹلایا ۳۰۳ اور بعض کو تم قتل ہی کرنے لگے ۳۰۴

ای بجبریل علیه السلام واطلاق روح القدس علیه شائع (روح) الروح الامین یسمّی به جبریل وسماه بروح القدس (راغب) ذهب جمهور المفسرین الی ان المراد بروح القدس املك المسمّی بجبریل الذی ینزل علی الانبیاء ومنه یستمدون الشرائع عن الله تعالی (المنار)

مسیحی اصطلاح میں روح القدس "تثلیث مقدس" کے اقنوم ثالث کو کہتے ہیں اس سے یہاں کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں، اصطلاح کے مشترک ہونے سے بعض دفعہ بڑے بڑے مغالطے اور غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش چونکہ خداوندی مصالح کے مطابق عام بشری طریق سے الگ ایک نئے قانون کے ماتحت ہستی ملکوتی سے ہوئی تھی، اس لئے عجب کیا جو بعد میں بھی آپ کو مناسبت عالم ملائکہ سے زیادہ رہی ہو اور اسی مناسبت سے استفاضہ بھی ملائکہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہو۔

اَیَّدْنٰهُ میں اشارہ ادھر بھی نکلتا ہے کہ آپ اپنی بشریت کی بناء پر اعانتِ خداوندی کے محتاج تھے اور وہ اعانت ایک فرشتہ کے ذریعہ کرائی جاتی تھی۔

۳۰۱ (اور اسی طرح کے احکام تو کم و بیش سب ہی پیمبر لائے)

مخاطبت انھیں بنی اسرائیل سے ہے، رُوئے سخن دفعۃً صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب کی طرف (یا کسی ایک صیغہ سے دوسرے کی طرف) پلٹ دینا صنعتِ التفات کہلاتا ہے اور عربی ادب و انشاء میں یہ عیب نہیں حسن ہے، قرآن مجید میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

۳۰۲ (اور اس پیغمبر کی اطاعت و اتباع سے عار محسوس کرنے لگے۔)

انسان کی یہ شامت شروع سے رہی ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلہ میں حاکم و قاضی وہ اپنے ہوائے نفس ہی کو رکھنا چاہتا ہے اور جو احکام اُسے اپنی خواہشوں یا اپنی محدود و ناقص اور جذبات زدہ عقل کے منافی نظر آتے ہیں، جھٹ ان سے انکار اور ان کے مقابلہ میں علم بغاوت بلند کر دیتا ہے ـــــ آج جس چیز کا نام "روشن خیالی" ہے تحلیل کرکے اور خوب غور کرکے دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں اصلاً صرف یہی ملے گا استکبار نفس اور پیمبر کے اقتداء و اتباع سے عار۔

۳۰۳ (اور ہر طرح ان کی ایذا کے درپے ہو گئے۔)

۳۰۴ جیسے زکریا نبی، یحییٰ نبی وغیرہما، تفصیلی حاشیہ رکوع ۷ کے ذیل میں گزر چکا۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ کبر ہی اکثر معاصی کی بنیاد ہے چنانچہ یہاں قرآن نے تکذیب انبیاء و قتل انبیاء کو کبر ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ (۸۸)

اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (نہیں) بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے ان کے کفر کے باعث اور وہ ایمان بہت ہی تھوڑا رکھتے ہیں

۳۰۵ (اور دعوتِ اسلام ہمارے اوپر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔)
یہود فخریہ اور علانیہ کہتے تھے کہ یہ نئے پیغمبر کچھ بھی کر ڈالیں ہم ان کے کہے میں نہیں آنے کے۔
غُلْفٌ۔ جمع غلاف کی ہے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے قلوب گنجینۂ علوم ہیں۔ معارفِ موسوی سے لبریز ہیں۔ ہمیں ضرورت کسی نئی تعلیم کے قبول کرنے کی نہیں۔

ھی جمع غلاف (راغب) ای ھی اوعیۃ للعلم تنبیہا انّا لا نحتاج ان نتعلّم منك فلنا غنیۃ بما عندنا۔ (راغب)
یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اَغْلَف کی جمع ہو اور اَغْلَف کہتے ہیں غیر مختون کو۔ اس کو جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔
قیل ھو جمع أغلف (راغب) مستعارا من الاغلف الذی لم یختن (کشاف) قیل واصلہ ذو الغلفۃ الذی لم یختن (روح)
"مختون" و "نامختون" کہنے کا محاورہ یہود کی زبان پر عام طور سے چڑھا ہوا تھا۔ کبھی اپنے کو "نامختون" کہتے کبھی اپنے دل و جسم کو یا کبھی اپنے اعضاء و جوارح کو ـــ توریت میں بار بار اس کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:۔
"بس میں جو نامختون ہونٹ رکھتا ہوں، فرعون میری کیونکر سنے گا؟" (خروج ۶: ۳۰) "تب دل کے نامختون اور جسم کے نامختون اجنبی زادوں کو میرے مقدس میں لائے" (حزقی ایل ۴۴: ۷)
بلکہ کہیں کہیں انجیل میں بھی آیا ہے:۔
"اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو! تم ہر وقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو" (اعمال ۷: ۵۱)
قرآن کا یہ اندازِ بیان بھی ایک اعجازی پہلو رکھتا ہے کہ جب یہود کا قول نقل کیا تو زبان بھی انھیں کی اختیار کی۔

۳۰۶ قرآن مجید یہود کے اس فخریہ قول کے جواب میں کہتا ہے کہ "جس محفوظیت" پر انھیں اس قدر غرہ ہے یہ کوئی فخر و ناز کی چیز نہیں یہ تو ایک نشانی ہے صداقت سے ان کے دور ہو جانے اور حق سے ان کے بُعد پیدا ہو جانے کی اور یہی حقیقت ہے لعنت کی۔
لعنت۔ پر پہلے حاشیہ گزر چکا ہے کہ وہ نام ہے رحمتِ الٰہی سے بُعد و ہجران کا۔
بِكُفْرِهِمْ۔ اس میں یہ بتا دیا کہ یہ ملعونیت اور مغضوبیت جو ان پر طاری ہوگی ان کے کفر اختیاری کے باعث ہوگی۔ اللہ کے پیمبر سے مخالفت و عناد پر اصرار رکھنے کے باعث ہوگی۔ بِ سببیہ ہے۔
ای بسبب کفرھم (ابو سعود)
لعنت کا محاورہ توریت میں بہت عام ہے صرف ایک مقام کا اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو:۔
"یہ ساری لعنتیں تجھ پر آ پڑیں گی اور تجھ تک پہنچیں گی، تو شہر میں لعنتی ہوگا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔ تیرا ٹوکرا اور تیرا کٹھرا لعنتی ہوگا۔ تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل، تیری گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہوں گے۔ تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا۔ خداوند سارے کاموں میں جن پر تو ہاتھ لگائے گا تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا۔" (استثناء ۲۸: ۱۵-۲۰)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا

اور جب اُن کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی تصدیق کرنے والی اُس کی جو اُن کے پاس (پہلے سے) موجود ہے

مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ

اور اس کے قبل یہ (خود ہی) کافروں سے بیان کیا کرتے تھے ف ۳۰۹

لعنت انجیل میں بھی منقول ہے حضرت مسیحؑ کی زبان سے، نہ صرف کاہنوں اور فریسیوں کے لئے بلکہ انجیر کے خشک درخت کے لئے بھی۔

ف ۳۰۷ (اور یہ تھوڑا یا برائے نام ایمان نجات کے لئے کافی نہیں۔)

قَلِيْلًا۔ قلیل یہاں ایمان کی صفت ہے۔ سچا ایمان نجات کے لئے ضروری ہے اور جس کا حکم ہر مکلف کے لئے ہے اس کے متعدد اجزاء ہیں۔ یہود کا ایمان جو کچھ بھی تھا، صرف ان میں سے بعض پر تھا۔

ای لا یؤمنون الا بعض مما کلفوا به (کبیر) فقلیلا صفة مصدر محذوف ای ایمانا قلیلا یؤمنون۔ (مدارک)

مَا يُؤْمِنُوْنَ میں مَا مزید ایمان کی قلت پر زور دینے کے لئے ہے یعنی نہایت ہی قلیل ایمان برائے نام۔

ما مزیدة للمبالغة فی القلیل (بیضاوی) ما مزیدة للمبالغة (ابو سعود) ما زائدة لتاکید القلة۔ (جلالین)

ما کا زائدہ ہونا نحویوں کی ایک خاص اصطلاح ہے، یہ مراد نہیں کہ یہ بے کار یا عبث ہے۔

انما قال هذه لافادة العموم تارة ولتفخیم الشیٔ تارة۔ (المنار)

قَلِيْلًا صفت مؤمن کی بھی ہو سکتی ہے۔ مفہوم اس صورت میں یہ ہوگا کہ ان میں سے بہت ہی تھوڑے ایمان لانے ہیں چنانچہ بعض اکابر ادھر بھی گئے ہیں:۔

ای لا یؤمنون منهم الا قلیل (ابن جریر عن قتادة) قال بعضهم فقلیل من یؤمن منهم (ابن کثیر)

اور امام رازیؒ نے ترجیح اسی آخری ترکیب کو دی ہے لیکن محاورہ میں قلیل کا استعمال نفی مطلق کے موقع پر بھی ہوتا ہے:

یجوز ان تکون القلة بمعنی العدم (کشاف) وقلیل یعبر عن النفی، نحو قلما یفعل ذلک ...

وعلی ذلک حمل قوله قلیلا ما تؤمنون۔ (راغب)

معنی اس صورت میں یہ ہوں گے کہ یہ ایمان سے بالکل خالی ہیں:۔

والمعنی فیه نفی جمیعه (ابن جریر) معناه لا یؤمنون اصلا لا قلیلا ولا کثیرا (کبیر)

ف ۳۰۸ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی قرآن۔ لِمَا مَعَهُمْ یعنی توریت۔ قرآن مجید نے اپنی یہ صفت جا بجا بیان کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ بجائے خود صادق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کا مصدق بھی ہے اور ان پچھلی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور توریت ہے۔

ف ۳۰۹ (کہ عنقریب آخری نبی نجات دہندہ کا ظہور ہونے والا ہے)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد اس سیاق میں مشرکین عرب ہیں۔ ایک نومسلم انصاری صحابی سے روایت ہے کہ ما ذا قبل اسلام میں جب ہم یہود کو شکست دیتے تھے تو وہ کہا کرتے کہ اچھا ٹھہر جاؤ عنقریب ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے، ہم اس کے

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

پھر جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو (خوب) پہچانتے تھے تو اسی سے کفر کر بیٹھے ۳۱۰ سو اللہ کی لعنت ہو کافروں پر ۳۱۱

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ

بری ہے وہ چیز جس کے عوض میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے ۳۱۲ کہ انکار کرتے ہیں اس (کلام) کا جو اتارنے

يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ

نازل کیا ہے (محض) اس ضد پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل (خاص) نازل کیا ۳۱۳

ساتھ ہو کر تمہیں قتل کر کے رکھ دیں گے نسوہ ان ھام۔ باب جبرانشا وعبودبر لا ثنہ یہود نے حضرت عیسیٰ کے مسیح ماننے سے تو انکار کر دیا تھا لیکن ان کے بعد سے برابر ایک مسیح (نجات دہندہ) کے ظہور کے منتظر رہا کرتے تھے اور اس کا ذکر مشرکین مکہ سے اکثر کرتے رہتے تھے۔ يَسْتَفْتِحُوْنَ۔ یہاں يَسْتَفْتِحُوْنَ کے مرادف قرار دیا گیا ہے اور فتح کے معنی عربی میں خبر دینے اور بیان کرنے کے ہیں۔

ای یعرّفون المشرکین ان نبیا یبعث منھم (روح) ای یفتحون علیھم ویُعرّفونھم (کشاف)

لیکن يَسْتَفْتِحُوْنَ اپنے عام اور مشہور معنی کے لحاظ سے مفہوم طلب فتح ونصرت کا رکھتا ہے اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ اس کے قبل یہود اس پیمبر نبی کا واسطہ دلا دلا کر خدا سے مدد چاہا کرتے تھے اور ائمہ تفسیر کی اکثریت نے یہی مراد لی ہے

ای یستنصرون اللہ ببعثۃ محمد علیہ السلام (راغب) یستنصرون بمحمد والقرآن (ابن عباسؓ)

ومعنی الاستفتاح الاستنصار (ابن جریر) یسئلون الفتح والنصرۃ (کبیر)

۳۱۰ (اور اسی سے انکار کرنے لگے کہ یہ کلام کلامِ الٰہی ہے یا یہ شخص اللہ کا پیمبر ہے)

مَا عَرَفُوْا سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور ذاتِ رسالت بھی۔ حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

کنی عن الکتٰب ویحتمل ان یراد بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (روح)

مقصد یہ ہے کہ یہود اس آخری نبی اور اس کی نبوت کی علامتوں سے اپنے ہی دینی نوشتوں کے ذریعہ سے خوب واقف ہو چکے تھے نبی کا ظہور بالکل اچانک اور ان کے علم وواقفیتِ سابق کے بغیر نہیں ہوا۔ انجیل یوحنا میں حضرت یحییٰ نبی (انجیلی زبان میں ان کا نام یہی یوحنا ہی ہے) کے ظہور کا حال یوں درج ہے کہ:۔

"جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لیوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟" (یوحنا۔ ۱: ۱۹۔ ۲۰)

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہود صدیوں سے ایک جانے بوجھے ہوئے نبی ("وہ نبی") کے انتظار میں تھے۔

۳۱۱ یعنی ان پر جو جان بوجھ کر عناد وتعصب کی راہ سے کفر وانکار کر بیٹھیں۔

لعنت پر ایک حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾

سو وہ مستحق ہوگئے غضب پر غضب کے ۳۱۴ اور کافروں کے لئے عذاب ذلت والا ہے ۳۱۵

۳۱۲ یعنی کیسی بری وہ حالت ہے جسے اختیار کرکے وہ بزعم خود اپنی جانوں کو عقوبت آخرت سے بچا رہے ہیں

بئس ما باعوا به حظ انفسهم ای اختاروا الکفر وبذلوا انفسهم للنار (معالم)

اشتراء لغات اضداد میں ہے، خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں آتا ہے، یہاں بیچنے کے معنی میں ہے۔

الاشتراء ھھنا بمعنی البیع (معالم) معناہ باعوا (بیضاوی)

۳۱۳ قرآن نے اس حقیقت کو بار بار صاف کیا ہے کہ یہود کا یہ کفر وانکار کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر، فکر و نظر کے کسی دھوکے یا مغالطہ کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس ضد وعناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندان اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کو کیوں مل رہی ہے؟ — وہی نسلیت یا قومیت کی ملعون عصبیت جو آج تک دنیا پر مسلط ہے۔ امام رازی کی خداداد نظر قرآن حکیم کے عجیب عجیب نکتوں تک پہنچ جاتی ہے، اس مقام پر لکھا ہے کہ یہود تو نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھنے لگے تھے، ایک عرب کو اس کا مدعی پا کر اٹھے اس کے رشک و حسد پر اسے محمول کرنے لگے۔

ظنوا ان ھذا الفضل العظیم بالنبوۃ المنتظرۃ یحصل فی قومھم فلما وجد فی العرب حملھم ذلک علی البغی والحسد (کبیر)

کیا صرف اس ضد اور نفسانیت کی کہ نسل اور خاندانی عصبیت کی بنا پر تصدیق نبوت تک سے انکار کردیا!

مِنْ فَضْلِهٖ میں فضل سے مراد فضل وحی ہے۔

یعنی الوحی (بیضاوی)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ احوال موہوبہ محض فضل مشیت کے تابع ہوتے ہیں، کسب و اکتساب کو دخل نہیں۔

۳۱۴ غَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ کی تفسیر میں بہت سے قول نقل ہوئے ہیں، ان میں سے ایک قول تابعی حضرات سے منقول یہ ہے کہ یہود کی پہلی مغضوبیت کی بنیاد رسالت عیسوی سے انکار ہے اور دوسری مغضوبیت کی بنیاد رسالت محمدی سے انکار۔

وھو قول الحسن والشعبی وعکرمۃ وابی العالیۃ وقتادۃ (کبیر)

یہ تفسیر بھی اپنی جگہ پر خوب ہے لیکن اس سے بھی زیادہ دلنشین اور بے تکلف قول یہ ہے کہ پہلا عتاب اُن کے بالکل بلاوجہ اور دلیل واضح و صریح کی موجودگی میں انکار و تکذیب رسالت پر ہے اور دوسرا عتاب ان کے جذبات حسد و عناد پر۔

لانھم کفروا بنبی الحق وبغوا علیہ (کشاف) للکفر والحسد (بیضاوی) بما اقترفوا من الکفر والبغی (روح)

یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ مقصود کلام غضب کی تکرار نہیں بلکہ اس کی تاکید اور اشدیت ہے۔

المراد بہ تاکید الغضب وتکثیرہ (کبیر) ویحتمل ان یراد الترادف والتکاثر لاغضاب (روح)

غَضَبٍ کا صیغہ نکرہ شدت غضب کے اظہار کے لئے ہے۔

والتنکیر للتعظیم (جلالین)

۳۱۵ عذاب الٰہی کا نہایت شدید و الیم ہونا تو ظاہر ہی ہے، پھر اس عذاب کی نسبت چونکہ یہود کی قومی و نسلی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اُس (کلام) پر جو اللہ نے نازل کیا ہے[۳۱۶] تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر تو ایمان رکھتے

وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ

ہیں جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے[۳۱۷] اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے یہ کفر کرتے ہیں[۳۱۸] حالانکہ وہ (خود بھی) حق ہے اور اس کا بھی تصدیق

فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے[۳۱۹] آپ کہیے کہ اچھا تم اس کے قبل انبیاء کو کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم (واقعی) ایمان والے تھے[۳۲۰]

عجیب مناسبت ہے یہ سزا ان کے غرور کو توڑنے والی ان کی توہین و ذلت و رسوائی کو بڑھانے والی بھی ہوگی۔

۳۱۶ (اپنے بندہ اور آخری رسول محمدؐ پر)

ذکر وہی بنی اسرائیل کا چل رہا ہے، اور انھیں سے کہا جاتا تھا کہ آخری کتاب الٰہی قرآن پر ایمان لاؤ۔

۳۱۷ (اور وہ ہمارے لئے بالکل کافی ہے)

أُنزِلَ عَلَيْنَا۔ ہمارے اوپر یعنی ہماری قوم و نسل کے اوپر نازل ہوا ہے یہود کا کہنا یہ تھا کہ ہم کوئی سلسلۂ وحی یا سلسلۂ رسالت کے منکر تھوڑے ہی ہیں، ہم بھی تو مومن ہی ہیں اور اپنی نسل اسرائیل کے انبیاء کے قائل ہیں۔

۳۱۸ یہ یہود کے قول کا تتمہ ہے قرآن مجید نے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے اسرائیلی سلسلہ کے باہر کسی اور نبوت کے قائل نہیں ایک عرصہ تک الطاف الٰہی و عنایاتِ خداوندی کے مورد خاص بنے رہنے اور اسی نسل کے اندر انبیاء کے سلسل پیدا ہوتے رہنے سے بنی اسرائیل کے دل میں یہ جم گیا تھا کہ نبوت خاندانِ اسرائیل کے باہر جا ہی نہیں سکتی۔

وَرَاءَهُ۔ وراء یہاں علاوہ کے معنی میں ہے بالاتر کے معنی میں نہیں۔

یرید سواه (معالم)

۳۱۹ هُوَ الْحَقُّ۔ ضمیر هُوَ قرآن کی جانب ہے، اس کی حقانیت دلائل سے ثابت اور شواہد سے روشن ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ یعنی وہ تصدیق کرتا ہے توریت اور انبیاء بنی اسرائیل کے دوسرے صحیفوں کی،

قرآن یہاں یہود کے مقابلہ میں اپنے دو وصف بیان کر رہا ہے:

۱. ایک یہ کہ وہ فی نفسہ حق ہے، اس کی حقانیت دلائل سے ثابت ہے، اس لئے اس پر ایمان لانا بجائے خود واجب ہے۔

۲. دوسرے یہ کہ توریت اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں کے ساتھ اس کا تعلق منافات کا نہیں اس کا رشتہ اتحاد و تصدیق کا ہے

۳۲۰ تیسرا جواب قرآن مجید نے یہود کو یہ دیا کہ خود یہی دعویٰ تمھارا کب صحیح ہے کہ تم اپنی قوم کے انبیاء پر ایمان رکھتے ہو؟ ایمان و تصدیق الگ رہی، تم نے خود اس زور و شور سے ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت و عداوت پر اس حد تک اُتر آئے کہ انھیں قتل تک کر ڈالا، اور تمھاری قومی تاریخ کے تو صفحات رنگین ہیں انبیاء کے خون سے! اسرائیل اور قتل انبیاء پر مفصل حاشیے رکوع (۷) کے ذیل میں گزر چکے، بائبل کے اُن حوالوں کے علاوہ ایک حوالہ

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور بالیقین موسیٰ تمھارے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آئے ۳۲۱ اس پر بھی تو تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا ۳۲۲

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ

اور تم تو ہو ہی ظالم ۳۲۳ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا تھا اور تمھارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا تھا

اور ملاحظہ ہو نحمیاہ نبیؑ کے زمانہ میں خدا کا بنی اسرائیل اپنے باپ دادوں سے متعلق مناجات میں کہتے ہیں:۔

"وہ نافرمانبردار نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو ان کو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھرلائیں قتل کیا اور انھوں نے اپنے کاموں سے تجھے غصہ دلایا۔" (نحمیاہ ۹: ۲۵و۲۶)

ظاہر ہے کہ قرآن کے مخاطبین معاصرین نے انبیاء پیشین کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ موجودہ اسرائیلیوں کے اسلاف نے انھیں قتل کیا تھا لیکن چونکہ موجودہ نسل یہود بھی اپنے بزرگوں کی اس روش سے متفق تھی اسے بھی جرم قتل کا مرتکب قرار دیا گیا

ولیس الذین خوطبوا بالقتل هم القتلة انما قتل الانبیاء اسلافهم الذین مضوا فتولوهم على ذلك ورضوبه فنسب القتل الیهم (معانی القرآن)

۳۲۱ (اور ان کھلے ہوئے نشانوں کا اثر طبعی طور پر یہ ہونا چاہئے تھا کہ تم خدا کی طاعت اور نبی کی طاعت میں دل سے لگ جاتے)

حضرت موسیٰؑ کے کھلے ہوئے نشانات اور معجزات جو فرعون کے مقابلہ میں تھے، عصا، ید بیضاء وغیرہ، وہ تو مشہور ہی ہیں لیکن جَآءَكُمْ سے اشارہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ معجزات موسوی خود بنی اسرائیل کے لئے بھی تھے۔

۳۲۲ (پرستش کے لئے اور بطور معبود)

محذوف مفعول۔ ای اتخذتموه الٰهًا (المنار)

یہ ہے تمھارے دعوئے توحید کی حقیقت! گوسالہ پرستی پر حاشیے رکوع (۶) کے ذیل میں گزر چکے۔

ثُمَّ یہاں محض تاخیر زمانی کے لئے نہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ تم کیسی پستی میں اتر گئے اور یہ کہ تم نے یہ اس وقت کیا جب تمھارے پاس دلائل و شواہد اس کے خلاف پہنچ چکے تھے۔

ثم للتراخی فی الرتبة والدلالة على نهاية قبح ما صنعوا (ابو سعود) کلمة ثم للاستبعاد (روح)

مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت اپنی قوم کو میدان میں چھوڑ کر ستر منتخب افراد کے ہمراہ کوہ طور پر گئے ہوئے تھے۔ تفصیلات رکوع (۶) کے ذیل میں گزر چکیں۔

۳۲۳ (اپنے حق میں)

یعنی تمھاری تاریخ گواہ ہے کہ تم اپنی جانوں پر، اپنی روحوں پر ظلم کرنے کے کیسے عادی رہے ہو، یہ گویا جواب سائل کا تتمہ ہے۔ اسرائیلیوں سے ارشاد ہو رہا ہے کہ اور زمانوں میں تو خیر تم نے جو کچھ کیا خیر وہ تو کیا ہی، شرک تو تم نے خود حضرت موسیٰؑ ہی کے زمانہ میں شروع کر دیا اور شرک بھی کیسا جلی، گوسالہ پرستی! اور وہ بھی پیمبر کی صرف

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ

(کہ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے ۳۲۵؎ اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو ۳۲۶؎ یہ (اس وقت) بولے تھے کہ (اچھا) ہم نے سن لیا

وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ

مگر ہم نے مانا نہیں ۳۲۷؎ اور ان کے دلوں میں گوسالہ ان کے کفر باطن کے سبب پیوست ہو گیا تھا ۳۲۸؎

چند روزہ غیر حاضری کے زمانہ میں بچھڑے کے لئے۔ نہ ان کے لائے ہوئے نشانات اور دلائل ہوسکے اور نہ یہ امر کہ وہ تو ابھی زندہ سلامت موجود ہیں، غرض کہ نافرمانیوں میں دلیر تم آج سے نہیں مدت دراز سے ہو!

۳۲۴؎ (تمہارے اوپر نزول شریعت کے وقت)

طور رفع طور وغیرہ پر حاشیہ رکوع (۷) میں گزر چکا۔

۳۲۵؎ یعنی یہ احکام و شرائع جو ابھی تم پر نازل کئے ہیں۔

۳۲۶؎ (ان احکام و شرائع کو گوش دل سے سنو اور ان پر عمل کرو)

ای اقبلوا ما سمعتم (بحر) قال الماتریدی معنی اسمعوا افہموا (بحر) وقیل اعملوا (بحر) المعنی اسمعوا اطیعوا ...... انما المراد اعملوا ما سمعتم والتزموہ (قرطبی)

۳۲۷؎ آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ لفظ عَصَيْنَا (ہم نے نہیں مانا) ان لوگوں نے زبان سے بھی کہا ہو۔

قال ابو مسلم وجائز ان یکون المعنی سمعوہ وتلقوہ بالعصیان فعبّر عن ذلک بالقول وان لم یقولوہ (کبیر) قال اهل المعانی انہم لم یقولوا هذا بألسنتہم ولکن لما سمعوہ وتلقوہ بالعصیان نسب ذلک الی القول اتساعًا۔ (معالم)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول یہاں بطور مجاز زبان حال کے معنی میں استعمال ہوا ہے نطق لسانی مراد نہیں۔

قیل یعبّر بالقول للشیٔ عما یفهم به من حاله وان لم یکن نطق (بحر) وقیل المعنی قالوا بلسان المقال سمعنا وبلسان الحال عصینا (روح) اختلف هل صدر منہم هذا اللفظ حقیقة باللسان نطقا او یکونوا فعلوا فعلا کان قام مقام القول فیکون مجازا۔ (قرطبی)

چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی اس لئے گویا زبان حال سے یہی کہہ رہے تھے۔ (تھانویؒ)

قول کا لفظ یوں بھی عربی زبان میں نہایت وسیع معنی رکھتا ہے زبان سے ادا کرنا اس کے لئے لازمی نہیں راغب نے اپنے مفردات میں خود قرآن ہی سے اس کے متعدد معنی نقل کئے ہیں اور چوتھے نمبر پر اس کے معنی دلالت حال لکھے ہیں اور ایک شاعر کا مصرعہ بھی سند میں پیش کیا ہے۔

یقال للدلالة علی الشیٔ نحو قول الشاعر امتلأ الحوضُ وقال قطنی۔

اور تاج العروس میں سیبویہ وغیرہ ائمہ لغت کے حوالہ سے اس سے بھی زیادہ وسیع معنی بیان کرگئے ہیں، لیکن اگر ان سرکشوں اور گستاخوں نے یہ لفظ زبان سے بھی نکالا ہو تو ان کی عادی اور مسلسل نافرمانیوں کو دیکھتے ہوئے،

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ إِنْ كَانَتْ

آپ کہہ دیجئے (کیسی) بُری ہے وہ بات جس کا حکم تمہارا ایمان تمہیں دے رہا ہے اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو ۳۲۹ آپ

لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ

کہہ دیجئے کہ اگر عالمِ آخرت خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر ۳۳۰

تعجب ذرا سا بھی نہیں، یرمیاہ نبیؑ کے صحیفہ میں ایک تصریح بالکل اس سے ملتی جلتی، گویا ایک دوسرے موقع کے لئے موجود ہے:

"خداوند یوں کہتا ہے کہ راہوں پر کھڑے ہو اور دیکھو اور پرانے رستوں کی بابت پوچھو کہ بھلی راہ کہاں ہے اسی پر چلو کہ تم اپنے جیون میں آرام پاؤ گے پر انہوں نے کہا کہ ہم اس میں نہ چلیں گے، اور میں نے تمہارے اوپر نگہبان بھی ٹھہرائے اور کہا کہ نرسنگے کی آواز سنو۔ پر انہوں نے کہا کہ ہم نہ سنیں گے۔" (یرمیاہ ۶: ۱۶، ۱۷)

۳۲۸ چنانچہ بیل کے تقدس کا اعتقاد اسرائیلی قوم میں مدت دراز تک قائم رہا (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ صفحہ ۵۵۲)

العجل سے مراد حُبّ العجل ہے اور اس قسم کا حذف مضاف کلام عرب میں عام ہے۔

اراد حُبّ العجل ومثل هذا مما يحذف فيه العرب كثير۔ (معانی)

أُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ۔ مراد یہ ہے کہ گوسالہ کی محبت ان کے رگ رگ میں رچ گئی تھی جیسے پانی رگ رگ میں پہنچ کر جزو بدن بن جاتا ہے۔ اُشرِبَ کا یہ استعارہ شدید محبت اور شدید نفرت دونوں موقعوں پر اہل عرب کی زبان میں عام ہے۔

وان من عادتهم اذا ارادوا العبارة عن مخامرة حب او بغض استعاروا الى اسم اسراب لأنه هو ابلغ انجاع فى البدن (راغب)

یا یہ استعارہ رنگ سے ہو کہ وہ بھی کپڑے کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔

كما يداخل الثوب الصبغ (کشاف) كما تداخل الصبغ الثوب والشراب اعماق البدن۔ (بیضاوی)

الْعِجْلَ۔ چنانچہ یہاں بھی العجل سے مراد حُبّ العجل لی گئی ہے۔

اى حب العجل ...... المعنى جعلت قلوبهم تشربه وهذا تشبيه ومجاز عبارة عن تمكن امر العجل فى قلوبهم۔ (قرطبی)

بِكُفْرِهِمْ۔ ب سببیہ ہے یعنی ان کے کفر کے باعث، نتیجۂ کفر کے طور پر۔

الباء للسبب اى الحامل لهم على عبادة العجل هو كفرهم السابق (بحر)

۳۲۹ حجت الزامی ہے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں، گویا قرآن کا کہنا یہ ہے کہ دعویٰ تو یہ کہ ہم صاحب ایمان و توحید ہیں، اور عمل یہ کہ گوسالہ کی تنزیہ و تقدیس میں لگے ہوئے ہو! کیا اچھا تمہارا ایمان ہے!

۳۳۰ (جیسا کہ تم اپنے زعم و پندار میں سمجھے ہوئے ہو)

بنی اسرائیل کے اس بنیادی عقیدہ کا ابتدائی خاکہ تو خود موجودہ توریت میں موجود ہے مثلاً:

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو" (استثناء ۱۴: ۱) "تو خداوند اپنے خدا کے لئے مقدس قوم ہے" اور

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

تو موت کی آرزو کر دیکھو اگر تم سچے ہو۳۳۱؎

خداوند نے تجھ کو چن لیا تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لئے خاص قوم ہو" (استثناء ۱۴: ۲)
رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ یہود اپنے سوا کسی اور کو الطافِ خداوندی کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے، نجاتِ اخروی کو اپنا مخصوص حق سمجھنے لگے تھے، اپنے کو خدا کا محبوب اور خدا کا لاڈلا اور چہیتا فرزند قرار دینے لگے تھے اور خیال یہ جم گیا تھا کہ خداوند خدا کا جو معاملہ ہماری قوم و نسل کے ساتھ ایک ناقابلِ تبدیل طور پر ہے وہ دنیا جہان میں کسی اور کے ساتھ نہیں، نسلی تقدیس کی یہی وبا ہے جو ہندوستان میں برہمنیت کے نام سے جلوہ گر ہے۔

الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ مراد ہے جنت اور نجات کا حاصل ہونا۔

دُوْنِ النَّاسِ ۔ ناس سے مراد نوعِ انسانی ہے اور دون الناس سے مراد اپنی قوم و نسل کی خصوصیت کا اظہار اور اس میں دوسروں کی شرکت سے انکار ہے۔

دون هنا لفظ يستعمل للاختصاص وقطع الشركة. (بحر)

۳۳۱؎ (اپنے اس دعویٰ میں کہ ہماری نجات یقینی اور قطعی ہے)
قدیم مفسرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ یہی مطالبہ یہود بھی تو الٹ کر مسلمانوں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کر سکتے تھے اور پھر اپنے اپنے مذاق پر اس کے جوابات دیئے ہیں، لیکن حقیقتاً یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کوئی مسلمان کب اپنی نجات کو محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہو جانے سے یقینی سمجھتا ہے؟ مسلمان تو خود ہی ایمان اور عملِ صالح کے دہرے دہرے اختیاری معیار سے ڈرتا اور ترساں رہتا ہے کہ دیکھا چاہیئے حشر میں اس امتحان میں پورا اترتا بھی ہے یا نہیں، یہ اطمینان اور یہ زعم کہ چونکہ ہم فلاں گھرانے فلاں خاندان میں پیدا ہو گئے ہیں اس لئے بغیر کسی جہد و الکتساب کے ہماری نجات یقینی ہو چکی، یہ عقیدہ اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص تھا، مسلمان اس کے قریب ہی کب گیا، جو یہ سوال اس پر عائد ہو سکے؟ اسلام تو اس نسلی تقدس اور اضطراری نجات کے عین مٹانے کے لئے ہے، مسلمان تو خود ہی کہتا ہے کہ مجھے اپنا انجام نہیں معلوم، میں ایمان اور اطاعت کی راہ اپنی طرف سے اختیار کر کے آگے فضلِ خداوندی کا منتظر ہوں، مسلمان کے سامنے اس سوال کو پیش کرنے کا کوئی محل ہی نہیں، پھر یہ بھی ہے کہ یہ مطالبہ ہر اسرائیلی سے ہر زمانہ کے لئے ہے بھی نہیں، اس کا دائرہ صرف انہیں معاند یہود کے ساتھ مخصوص ہے جو رسول اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے اور سارے خواہ کے بعد بھی آپ کے منکر تھے۔

معنا خاص بالمعاصرين له صلى الله عليه وسلم. (روح)

یہ حدیث خود صحابی حضرات سے مروی ہے بلکہ حضرت ابن عمرؓ نے تو اپنے زمانہ کے ایک گستاخ یہودی کے جواب میں یہ مضمون بڑی حدت و شدت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

توهم هذا الكلب اللعين الجاهل ان هذا لكل يهودي او لليهود في كل وقت لا انما هو لاولئك الذين كانوا يعاندون ويجحدون نبوة النبي صلى الله عليه وسلم بعد ان عرفوا. (روح)

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

لیکن وہ اس کی آرزو ہرگز کبھی بھی نہ کریں گے بہ سبب ان (اعمال بد) کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں ۳۳۲

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

اور اللہ ظالموں سے (خوب) واقف ہے ۳۳۳ اور آپ انھیں زندگی پر حریص سب لوگوں سے بڑھ کر پائیں گے ۳۳۴ (یہاں

يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ

تک کہ) مشرکوں سے بھی بڑھ کر ۳۳۵ ان میں سے ایک ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار (ہزار) برس کی عمر پائے ۳۳۶

ابن القیم نے آیت کا ایک دوسرا ہی مفہوم لیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ مطالبہ اس کا نہیں کہ یہود خود اپنے حق میں موت کی دعا کریں بلکہ اس کا ہے کہ اگر رسول کو کاذب تسلیم کرتے ہیں تو کاذب کے حق میں بددعا کریں لیکن اس کی ہمت انھیں نہ پڑی اور وہ رسول کے حق میں بددعا نہ کرسکے اور یہ ایک مزید نمایاں ثبوت اعجاز محمدی کا ہے۔

فلیس المراد تمنوا لانفسکم خاصۃ بل اُدعوا بالموت وتمنوہ للمبطل وھذا ابلغ فی اقامۃ الحجۃ و برھان الصدق واسلم من ان یعارضوا بقولھم فتمنوہ انتم ایضا ان کنتم محقین فی دعواکم انکم اھل الجنۃ (تفسیر القیم ص) ولا وقع من احد منھم فی حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم البتہ وذلک لعلمھم بصحۃ نبوتہ وصدقہ وکفرھم بہ حسدا وبغیا ولا یتمنونہ لعلمھم انھم ھم الکاذبون وھذا القول ھو الذی نختارہ۔ (ایضا)

اور سیرۃ ابن ہشام میں خود ایک روایت بھی اس کے متعلق موجود ہے جس میں آیت کے بعد اس کی شرح یوں درج ہے:

ای اُدعوا بالموت علی ای الفریقین اکذب عند اللہ۔ — موت کی دعا کرو اس فریق کے لئے جو اللہ کے یہاں باطل پر ہو۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ موت کی محبت، خواہ طبعی ہو یا عقلی، ولایت کی علامتوں میں سے ہے۔

۳۳۲ یعنی ان کا دل خود چور ہے، اُن کا ضمیر ان پر ملامت کر رہا ہے، لقائے رب کا کوئی ولولہ، کوئی جذبہ ان میں باقی ہی کہاں ہے جو یہ عالم آخرت کی تمنا کرسکیں۔

اَبَدًا۔ احتجاج بالا جب صرف یہود معاصرین رسول کے ساتھ مخصوص ہوگیا تو اَبَدًا کے معنی بھی لازمی طور پر یہ ہوں گے کہ یہ اپنی زندگی بھر ایسا نہ کریں گے۔

ویعنی بالابد ھا ما یستقبل من زمان اعمارھم (بحر) ای لن یتمنوہ ما عاشوا (روح)

۳۳۳ یعنی اُن لوگوں سے جو اپنے ہتکنڈوں سے خود اپنے حق میں ظلم کرتے رہتے ہیں۔

الظلم ھو تجاوز ما حد اللہ۔ (بحر)

۳۳۴ یعنی اس زندگی پر حریص جو پلیدی اور گندگی سے لبریز ہے، زندگی سے محبت اور موت سے وحشت

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع ۱۰

حالانکہ اگر اتنی عمر وہ پا بھی جائے تو یہ (امر) اسے عذاب سے تو نہیں بچا سکتا ۳۳۷ اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے (خوب) دیکھ رہا ہے ۳۳۸

ایک حد تک طبعی ہے اور ان طبعی حدود کے اندر ہرگز اسلام میں کوئی ملامت نہیں لیکن یہود کا جذبۂ محبتِ دنیا طبعی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، دنیا پرستی مقصود بالذات بن گئی تھی اور روحانیت کا ذوق بالکل مُردہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں بھی جن قوموں نے جنتر منتر وغیرہ ظاہری یا رسوم میں غلو اور ان پر تکیہ کر رکھا ہے ان کے دل بھی ذوقِ آخرت سے یکسر محروم ہو چکے ہیں اور یہود کی محبتِ دنیا و محبتِ مال آج بھی ضرب المثل ہے۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں تالمود وغیرہ کے حوالہ سے اس مضمون کے متعدد قول نقل ہوئے ہیں کہ دنیوی زندگی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے، معصیت گوارا کر لینا چاہیے لیکن موت نہ گوارا کرنا چاہیے، وقِس علیٰ ھذا۔ ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۳۳۵ (جو بیچارے کتاب آسمانی اور پیامِ انبیاء کی دولتوں سے محروم ہیں)
مطلب یہ ہے کہ مشرکین تو سرے سے اُخروی نعمتوں کے لذت شناس ہی نہیں، وہ اگر ادھر سے غیر ملتفت ہو کر اپنا مرکزِ توجہ و محورِ زندگی اسی مادّی زندگی کو بنائے رکھیں تو کچھ ایسا حیرت انگیز نہیں، غضب تو یہود کر رہے ہیں جو اپنے آسمانی صحیفوں اور پیمبرانہ ہدایتوں کے باوجود بھی مشرکوں سے بڑھ کر دنیا سے لپٹے ہوئے ہیں۔
ومشرکوا العرب لا یعرفون الا ھذہ الحیاۃ ولا علم لھم من الآخرۃ (قرطبی) وذھب الحسن الی ان الذین اشرکوا ومشرکوا العرب خصوا بذلک لانھم لا یؤمنوا البعث فھم یتمنون طول العمر (قرطبی)
ایک عجیب بات اسی سلسلہ میں یہ ہے کہ تطویلِ عمر کے جو عجیب عجیب نظریئے آج یورپ میں قائم ہو رہے ہیں اور طرح طرح کی تدبیریں اور نسخے اس کے لئے ایجاد ہو رہے ہیں، ان میں پیش پیش جو ڈاکٹر اور اہلِ سائنس ہیں، وہ عموماً یہودی ہیں۔

۳۳۶ اَحَدُھُمْ۔ ضمیر ھُمْ کا مرجع یہود ہیں۔
ای یودّ احد الیھود (ابن کثیر عن السدی) والضمیر فی احدھم یعود فی ھذا القول علی الیھود۔ (قرطبی)
بعض نے مرجع الذین اشرکوا کو ٹھہرایا ہے لیکن سیاق قولِ اول کو صاف ترجیح دے رہا ہے۔
ای یودّ احد الیھود کما یدل علیہ نظم السیاق (ابن کثیر)
اَلْفَ سَنَةٍ۔ لازمی نہیں ہے کہ اَلْف سے مراد پورے دس سو کا عدد ہو، اَلْف مطلق انتہائی طولِ عمر کے اظہار کے لئے بھی آ سکتا ہے۔
وخص الالف بالذکر لانھا نہایۃ العقد فی الحساب (قرطبی) ومعنی الف سنۃ الکثرۃ یشمل من یودّ ان لا یموت ابدًا۔ (روح)

۳۳۷ بالفرض اس قدر طویل زندگی حاصل بھی ہو گئی تو کیا نتیجہ؟ بہرحال خاتمہ تو ایک روز اس طویل سے طویل زندگی کا بھی ہونا ہے اور پھر اسی مواخذۂ اُخروی کا سامنا، سو ایسی لایعنی اور لغو تمناؤں کے پھیر میں پڑے رہنا کسی دیندار شخص کے لئے ممکن ہی کیونکر ہے۔
بِهٖ ضمیر اسی اَحَد کی جانب ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبریل کا مخالف ہے ۳۳۹ تو انھوں نے اس (قرآن) کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے

قیل به ضمیر الاحد للمتقدم (قرطبی) الضمیر لاحدهم (بیضاوی)

۳۳۸ (اور ہر طرح کی جزا و سزا پر قادر ہے۔)
خدا تعالیٰ کی ہمہ بینی و ہمہ دانی، ہمہ توانی کا استحضار انسان کو راہ راست پر قائم رکھنے کے باب میں اکسیر ہے،
انسان غفلت و معصیت کی طرف قدم اسی وقت رکھتا ہے جب ذہن سے ایک حاضر و ناظر حاکم کا تصور غائب ہوتا
ہے یہی راز ہے اس کا کہ قرآن مجید میں اللہ کی صفات ہمہ بینی، ہمہ دانی کی یاد دہانی اس کثرت و تکرار کے ساتھ ہوئی ہے۔
بَصِيرٌ. یعنی اس پر ہر مخفی سے مخفی چیز روشن ہے۔
وقال العلماء وصف الله عزّ وجلّ نفسه بانه بصیر علی معنی عالم بخفیات الامور
والبصیر فی کلام العرب العالم بالشیٔ الخبیر به (قرطبی)
ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ وہ بصارت آفریں ہے، مخلوق میں قوتِ بصارت اس نے رکھی ہے، اور مخلوق
کو صاحبِ بصر اس نے پیدا کیا ہے۔
قیل وصف تعالیٰ نفسه بانه بصیر علی معنی جاعل الاشیاء المبصرة ذوات البصار ای مدرکة
للمبصرات بما خلق لها من الآلة المدرکة والقوة فالله بصیر بعباده ای جاعل عباده مبصرین (قرطبی)

۳۳۹ جِبْرِيل. اسلامی اصطلاح میں ایک فرشتۂ اعظم کا نام ہے، ان کے سپرد ایک اہم خدمت انبیائے کرام
تک وحی الٰہی کے پہنچانے کی ہے، انسان بڑے سے بڑا مقبول انسان بھی بشری ہوتا ہے اور جسم خاکی ہی رکھتا ہے، اس کے
محدود اور کثیف خاکی قویٰ علی العموم اتنا تحمل نہیں رکھتے کہ براہ راست تجلیات لاہوتی کی شعاعوں کو قبول کر سکیں،
اس غرض کے لئے عموماً لطیف الجسم نور کے بنے ہوئے فرشتوں سے سفارت و توسط کا کام لیا جاتا ہے، یہود بھی وجود ملائکہ کے
قائل تھے بلکہ خود حضرت جبریل کو بھی ایک فرشتۂ اعظم مانتے تھے اور ان کا ذکر توریت میں آج تک موجود ہے لیکن اپنی نادانی سے
خیال یہ جما لیا تھا کہ وہ ایک فرشتۂ عذاب ہیں، ان کا کام وحی لانا نہیں عذاب لانا ہے، اور وحی لانا تو کام ایک دوسرے فرشتہ حضرت
میکائیل کا ہے، اپنے ان مفروضہ عقائد و مسلّمات کے بعد وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر معترض ہوتے تھے کہ یہ نئے مدعی نبوت اپنی
وحی کے سلسلہ میں نام حضرت جبریل کا کیوں لاتے ہیں ــــ یہاں تعرض یہود کی اسی غلط اندیشی سے کیا جا رہا ہے، موجودہ توریت
میں بار بار ذکر ایک ایسے فرشتہ کا آتا ہے جو لوگوں کو مارتا رہا تھا (۲۔ سموئیل۔ ۲۴: ۱۶ و ۱۷) اور علمائے یہود نے اس سے مراد فرشتہ جبریل
ہی سے رکھی تھی، آج بھی یہود حضرت جبریل کو حضرت میکائیل کا ہمسر و ہم رتبہ نہیں ان سے کمتر ہی سمجھتے ہیں (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ صفحہ ۵۴۱)

۳۴۰ (پھر ان سے مخالفت و عداوت و بدگمانی کے کیا معنی؟)
انَّهُ ضمیر جبرئیل کی طرف ہے۔
الهاء الاولی یعود علی جبریل. (کبیر)
نَزَّلَهُ ضمیر قرآن کی جانب ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ

(وہ) تصدیق کرنے والا ہے اس (کلام) کا جو اس کے قبل سے ہے اور ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لئے خوشخبری ہے ۳۴۲

عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

جو کوئی مخالف ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبریل کا یا میکائیل کا ۳۴۳ تو اللہ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

(بھی) بالیقین مخالف ہے ایسے کافروں کا ۳۴۴

والثانية على القرآن وهذا قول ابن عباس واكثر اهل العلم۔ (كبير)

عَلٰى قَلْبِكَ۔ امام رازیؒ نے یہاں سوال یہ پیدا کیا ہے کہ قرآن تو محمدؐ پر اُترا ہے پھر یہاں قلب محمدؐ کی تخصیص کیوں کی ہے اور پھر جواب یہ دیا ہے کہ اس تنزیل کی محافظت تو آپ کے قلب ہی نے کی اس لئے اس کا تخصیصی ذکر ہوا۔ یہاں یہود کے جہل کو رفع کیا گیا، اور بتایا گیا کہ حضرت جبرئیل کے نام سے چڑھنا کیا معنی وہ تو خدا کے ایک معتمد سفیر ہیں اور خدمتِ سفارت پر مامور۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اِذن کے معنی لغت میں علاوہ اجازت کے، حکم یا ارشاد کے بھی ہیں۔

ويكون باذنه اى بامره (لسان) ويكون الامر اذنا۔ (تاج)

چنانچہ یہاں بھی اذن اللہ سے مراد اللہ کا حکم یا ارشاد ہی ہے۔

اى بامر الله (جلالين) فالاظهر بامر الله (كبير) اى بامره (بيضاوى) اى باذن الله۔ (معالم)

۳۴۲ یہاں کلام مجید نے اپنے تین وصف متعین طور پر بیان کئے:۔ ایک یہ کہ وہ گزشتہ انبیاء اور سابق صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے، اس کا پیام کوئی نرالا اور انوکھا نہیں، وہی توحید کا پرانا سبق ہے جو سارے سلسلۂ وحی میں مشترک رہا ہے، دوسرے یہ کہ وہ فی نفسہٖ ایک ہدایت نامہ ہے، تیسرے یہ کہ وہ اہل ایمان کے حق میں مایۂ بشارت ہے۔

۳۴۳ یعنی جو شخص بھی اللہ یا اس کے پیمبروں یا اس کے فرشتوں خصوصاً جبرئیل و میکائیل جیسے مقرب فرشتوں سے وہ رشتہ و تعلق قائم رکھتا ہے جو ان کے مرتبۂ واجب کے منافی ہے۔

عَدُوٌّ عربی میں بطور مصدر بھی آتا ہے اور اس معنی میں یہ ضد ہے دوستی و محبت کا۔

منافاة الالتئام۔ (راغب)

دوسرا استعمال اس کا بحیثیت اسم کے ہے جیسا کہ یہاں ہے اور اس معنی میں مقابل ہے دوست کے۔

العدو للشخص ضد الصديق۔ (روح)

اور اس کے مفہوم میں محض عداوت نہیں بلکہ اکا دکا نافرمانی، حق ناشناسی، غرض دوستی و محبت کے منافی جو کچھ ہے سب داخل ہے

میکال یا میکائیل جبرئیل کی طرح ایک فرشتہ مقرب کا نام ہے مشہور روایتوں میں آیا ہے کہ ان کے ذمہ مخلوق کی رزق رسانی اور بارش ہے گویا جس طرح احکام تشریعی کے لئے واسطۂ خاص حضرت جبرئیل ہیں احکام تکوینی کے لئے واسطۂ خاص میکائیل ہیں پہلے کا تعلق خاص بارگاہِ الوہیت سے ہے دوسرے کا کارگاہِ ربوبیت سے اور دونوں کا نام ایک ساتھ عطف کرکے لانے میں اشارہ یہ ہے کہ دونوں اپنی اصل فطرت و حقیقت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔

لان فطرتهما واحدة وحقيقتهما واحدة۔ (المنار)

توریت میں ان کا ذکر بڑے تعظیمی لہجہ میں موجود ہے یہود نے اپنے سارے تعلقات انھیں سے جوڑ رکھے تھے اور انھیں اپنا قوی محافظ سمجھتے تھے یہود نے جب حضرت جبرئیل کے حامل وحی ہونے سے انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۲۹) تو اپنی عداوت و رغبت کا اظہار انھیں دو فرشتوں کا نام لے کر کیا تھا اسی مناسبت سے قرآنی جواب میں بھی تصریح انھیں دونوں کے نام کی ہے اور ساتھ ہی جیسا کہ قرآن مجید کا عمومی دستور کسی واقعۂ خاص سے ایک ہدایتِ عام بیان کر دینے کا ہے ایک عام قاعدہ تمام معصوموں (یعنی انبیاء و ملائکہ) سے متعلق بیان کر دیا گیا۔

و۔ اہل لغت نے لکھا ہے کہ حرف واو ہمیشہ عطف و جمع ہی کے لئے نہیں آتا بلکہ "یا" کے معنی بھی کبھی دیتا ہے

تكون بمعنى أوْ (قاموس)

چنانچہ یہاں چاروں جگہ اسی معنی میں ہے یعنی ان اسماء کا مجموعہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو کوئی ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہے۔

يعنى من كان عدوًّا لأحد هؤلاء انه عدو للكل (معالم) يعنى من كان عدوًّا لأحد من هؤلاء (كبير) التنبيه على ان معاداة الواحد والكل سواء فى الكفر. (بيضاوى)

یہاں یہ سوال نہ پیدا ہو کہ جبرئیل و میکائیل تو عمومی لفظ ملٰئکۃ میں داخل ہی ہو چکے پھر اب ان کے الگ ذکر کی کیا ضرورت تھی نام کے ساتھ یہ ذکر محض تفصیل و تخصیص کے لئے ہے جیسا کہ سورۂ رحمن میں فاکھۃ کا عمومی لفظ لا کر پھر اس کے دو افراد نخل و رمان کا ذکر خصوصی کیا گیا ہے عطف خاص کا عام پر عربی ادب کا ایک مسلم قاعدہ ہے۔

تفصيلا وتخصيصا كقوله تعالى فيهما فاكهة ونخل ورمان خص النخل والرمان بذكر مع دخولهما فى ذكر الفاكهة للتفصيل (معالم) فهذا من باب عطف الخاص على العام كانهما دخلا فى الملائكة فى عموم الرسل ثم خصصا بالذكر (ابن كثير) وخص الملكان بالذكر لفضلهما كانهما من جنس آخر اذ التغاير فى الوصف ينزل منزلة التغاير فى الذات (مدارك) افراد الملكين بالذكر لفضلهما. (بيضاوى)

آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ جبرئیل و میکائیل ساری جماعتِ ملائکہ میں افضل ہیں۔

۳۴۳ یعنی ایسا ہر شخص کافر سمجھا جائے گا اور اس کے ساتھ معاملہ وہ کیا جائے گا جو دشمن کے ساتھ دشمن کرتا ہے۔

فقہاء نے آیت سے نکالا ہے کہ معصوموں کی اطاعت عین اطاعت الٰہی اور معصوموں کی مخالفت عین مخالفتِ حق ہے فرشتہ کی اطاعت توریت میں بھی عین اطاعتِ رب بتائی گئی ہے:-

"دیکھ میں ایک فرشتہ تیرے آگے بھیجتا ہوں کہ راہ میں تیرا نگہبان ہو اور تجھے اس جگہ جو میں نے تیار کی ہے لے آوے اسکے آگے ہوشیار رہ اور اس کا کہا مان اُسے مت چڑھا کیونکہ وہ تیری خطا نہ بخشے گا کہ میرا نام اس میں ہے پر اگر تو سچ مچ

وَلَقَدۡ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖۖ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَآ إِلَّا ٱلۡفَٰسِقُونَ ﴿٩٩﴾

اور بالیقین ہم نے آپ پر روشن نشان اتارے ہیں ۳۲۴ اور ان سے کوئی (بھی) انکار نہیں کرتا بجز نافرمانوں کے ۳۲۵ کیا یہ کہ

أَوَكُلَّمَا عَٰهَدُواْ عَهۡدٗا نَّبَذَهُۥ فَرِيقٞ مِّنۡهُمۚ بَلۡ أَكۡثَرُهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ ﴿١٠٠﴾

انھوں نے جب کبھی بھی کوئی عہد کیا ہے ۳۲۶ تو انھیں میں سے کسی نہ کسی (جماعت) نے اسے توڑ ہی پھینکا ہے ۳۲۷ اصل یہ کہ ان میں زیادہ تر تو اعتقاد ہی نہیں رکھتے ۳۲۸

اس کا کہا مانے اور سب جو میں کہتا ہوں کرے تو میں تیرے دشمنوں کا دشمن اور تیرے مخالفوں کا مخالف ہوں گا۔ (خروج ۲۳: ۲۰ و ۲۲)

یہی کہا گیا ہے کہ خلفائے راشدینؓ اصحاب رسولؐ جن کے فضائل گویا تواتر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں ان کی مخالفت وعداوت بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ سے عداوت رکھنا خود اللہ تعالیٰ کی عداوت کا سبب بن جاتا ہے۔

۳۲۴ (آپ کی صداقت اور نبوت کے)

یعنی ایک تو قرآن خود ایک معجزہ ہے، پھر دوسرے تائیدی شواہد ودلائل، بشارت ومعجزات۔

اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ سے مراد آیاتِ قرآنی بھی ہو سکتی ہیں، یہ جن بےنظیر تعلیمات کی حامل ہیں ان پر نظر کر کے بعض محققین نے یہی پہلو اختیار کیا ہے۔

الاظھر ان المراد آیات الفرقان الذی لا یاتی بمثلہ الجن والانس (کبیر)

لیکن لفظ آیات ہے عام ووسیع، اس لئے دوسرے بزرگوں نے سارے اقوال کو جمع کر کے لکھا ہے کہ اس سے مراد کچھ ہے قرآن بھی معجزات بھی کتبِ سابقہ پر اطلاع بھی معجزات سابقہ پر اطلاع بھی قرآن کا قانونی نظام بھی۔ وقیل علی ھذا ای القرآن والمعجزات المقرونۃ بالتحدی عما خفی واخفی فی الکتب السابقۃ او الشرائع والفرائض او مجموع کل ما تقدم (بحر) وقال بعضھم لا یمتنع ان یکون المراد من الآیات البینٰت القرآن مع سائر الدلائل ..... وسائر المعجزات۔ (کبیر)۔

یہود جو اپنے پیغمبروں کے معجزات کی روایتوں کے خوب عادی ہو چکے تھے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ یہ کیسے نبی ہیں؟ نبی ہیں تو کوئی نشانی تو دکھلائیں، جواب ملا کہ تم ایک نشانی کو کہتے ہو، ہم تو انھیں متعدد نشانات (بہ صیغہ جمع) دے چکے ہیں، اور وہ بھی دقیق وخفی نہیں، نمایاں وروشن، سب کو نظر آجانے والے۔

ف۳۲۵ یعنی ان شواہد صریح اور دلائل روشن سے انکار کوئی فطرت سلیم والا تو کرتا نہیں، بس وہی لوگ کرتے ہیں جو قانون الٰہی کو توڑتے رہنے اور شرائع ربانی سے بغاوت کرنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ انجیل میں یہود کی قساوت قلب کے سلسلہ میں ہے کہ مسیحؑ نے "اگرچہ ان کے سامنے اتنے معجزے دکھائے تو بھی وہ اس پر ایمان نہ لائے"۔ (یوحنا ۱۲: ۳۷)

اَلۡفٰسِقُوۡنَ سے مراد اس سیاق میں الکافرون ہی ہیں، اس لئے کہ ذکر یہاں فسقِ اعمال کا نہیں فسقِ عقائد کا ہے۔

المراد بالفاسقین ھنا الکافرون لانہ کفر آیات اللہ تعالیٰ ھو من باب فسق العقائد فلیس من باب فسق الافعال (بحر) وکنی بالفسق ھنا من الکفر لان الفسق خروج الانسان عما حد لہ (بحر)

۳۲۶ (خدا یا اس کے کسی نبی کی اطاعت کا)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور جب ان کے پاس پیمبر اللہ کی طرف سے آئے تصدیق کرتے ہوئے اس (کتاب) کی جو ان کے پاس موجود

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ

تھی ف۳۴۹ تو ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت نے کتاب اللہ کو اپنی پشت کے پیچھے پھینک مارا ف۳۵۰ گویا وہ

كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

جانتے ہی (بوجھتے) نہیں ف۳۵۱

ذکر انھیں عصیان پیشہ یہود کا چل رہا ہے۔
ف۳۴۷ بنی اسرائیل کی تاریخ، غداری، عہد شکنی، نافرمانی، سرکشی کی ایک مسلسل تاریخ ہے، توریت کے صحیفے، انجیل کے ورق، قدیم مؤرخین یہود جوزیفس وغیرہ کے دفتر سب اسی سرگزشت سے لبریز ہیں، اور یہاں اشارہ ان کی اسی قومی خصوصیت کی جانب ہے۔
فَرِيْقٌ کا ترجمہ اس سیاق میں ٹکڑی یا ٹولی ہی سے ہو سکتا ہے، فریق اسم جنس ہے جس سے واحد نہیں آتا اور اس کا اطلاق قلیل، کثیر دونوں پر ہوتا ہے۔
اسم جنس لا واحد له يقع على القليل والكثير۔ (بحر)
ف۳۴۸ (اپنے کسی عہد و پیمانِ اطاعت کا)
لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی ایفائے عہد تو الگ رہا، ان میں سے بہتیرے اسی کے قائل نہیں ملتے کہ کبھی اطاعت کا عہد و پیمان کیا بھی تھا، گویا لا یؤمنون میں ایمان اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں لفظی معنی میں ہے۔
لَا يُؤْمِنُوْنَ کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایمان کو ایمانِ اصطلاحی کے مفہوم میں لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ لوگ خود اپنی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان کب رکھتے ہیں۔
(لا یصدقون بکتابهم (کبیر) لا یؤمنون بالتوراة (مدارک)
ماحصل دونوں صورتوں کا یہی ہے کہ وہ پاسِ عہد خصوصاً آخری نبی کی تصدیق کرنے کے عہد کا اپنے کو پابند ہی کب سمجھتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیا جائے کہ کتاب الٰہی کی کسی ایک آیت سے بھی انکار یا اللہ کے لئے ہوئے عہدوں میں سے کسی ایک عہد سے روگردانی انسان کو کافر بنانے کے لئے کافی ہے۔
واجمع المسلمون على ان من كفر باٰية من كتاب الله او نقض عهد الله الذى اخذه على عباده فى كتبه فهو كافر (بحر)
ف۳۴۹ یعنی کتاب توریت کی۔ یہود کو بتایا یہی جا رہا ہے کہ نئے نبی جو آئے ہیں یہ تمھاری کتاب اور اس کے دین کو مٹانے کے لئے نہیں، یہ تو عین اسے تازگی بخشنے، اسے حیاتِ تازہ دینے کے لئے آئے ہیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ

اور (یہ لوگ) پیچھے لگ گئے ۳۵۲ اُس (علم) کے جو سلیمانؑ کی بادشاہت میں شیطان پڑھا کرتے تھے ۳۵۳

رَسُوْلٌ۔ یہ کسی پیمبر کے آنے کا ذکر ہے، جائز ہے کہ رسول کو مطلق رسول کے معنی میں لیا جائے اور مراد اس سے کوئی بھی پیمبر سمجھا جائے یہ معنی بھی یہود کی عام عادت تکذیبِ انبیاء و رسل کے لحاظ سے صحیح ہیں لیکن ترجیح اس پہلو کو ہے کہ یہاں مراد رسولِ موعود، نبی آخر الزماں ہیں اور رَسُوْلٌ کا صیغۂ نکرہ میں ہونا اس کے منافی نہیں صیغۂ نکرہ جس طرح تعمیم کے لئے آتا ہے، عظمت و تکریم کے لئے بھی آتا ہے اور وہی یہاں مقصود ہے۔

والتنكير للتعظيم (ابو سعود) التنكير للتفخيم (روح)

۳۵۰ نَبَذَ ... وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ۔ کتاب کے پس پشت پھینک دینے سے محاورہ میں مراد اس کی طرف سے بے التفاتی برتنا اور اس کی عملی مخالفت کرنے سے ہے۔

اى مرموه بقلة اعتدادهم به (راغب) مثل بما يرمى به وراء الظهر استغناءً عنه وقلة الالتفات اليه (کشاف)

کتاب اللہ سے یہاں کیا مراد ہے؟ یہود کی بے التفاتی اور بے تعلقی قرآن سے تو ظاہر ہی تھی اور یہ کوئی بات ایسی ذکر کرنے اور توجہ دلانے کی نہ تھی، غضب یہ تھا کہ قرآن و صاحبِ قرآن سے مخالفت کی دھن میں خود اپنی کتاب آسمانی کی طرف بھی وہ بے پروا اور بے تعلق ہو گئے تھے کہ آخر توریت میں بھی تو نبی آخر الزماں کی بابت پیشین گوئیاں اُن کی علامتیں اور اُن پر ایمان لانے کی تاکید درج تھی، اس لئے محققین نے ترجیح اس کو دی ہے کہ کتاب اللہ سے یہاں مراد توریت ہے۔

يعنى التوراة (کشاف) قيل انه القرآن وقيل انه التوراة وهذا هو الاقرب (کبیر) يعنى بقوله كتاب الله التوراة (ابن جریر عن السدی)

۳۵۱ (کہ اس کتاب کے اندر بھی کوئی مضمون اس قسم کا موجود ہے)

لا يعلمون ما فى التوراة من الامر باتباع محمد صلى الله عليه وسلم وتصديقه (ابن جریر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ تشبیہ آیت میں یہود کی ان لوگوں سے دی گئی ہے جو جاہل ہیں گو یا دانستہ وہ حرکت جاہلوں کی سی کر رہے ہیں

تشبيه بمن لا يعلم او فعله فعل الجاهل فيجئ من اللفظ انهم كفروا على علم (قرطبی)

۳۵۲ ذکر اسرائیلیوں کا چل رہا ہے اور وہی یہاں مراد ہیں، خصوصاً یہودِ عرب۔

وَاتَّبَعُوْا تصدیق کرنے لگے، پیروی کرنے لگے۔

اى اقتدوا به اماما (بحر) وَاتَّبَعُوْا کا عطف نَبَذَ فَرِيْقٌ پر ہے۔

۳۵۳ یعنی بجائے اس کے کہ وحی الٰہی کا اتباع اور رسولِ برحق کی تصدیق کرتے، یہ یہود تو ایک اور ہی علم کے پیچھے لگ گئے اور وہ علم بھی کس کا؟ شیطان کا! قرآن مجید وقت کی اہم ترین قوم یہود کے بخئے تو کھول ہی رہا ہے اب اس نے ان کی فردِ جرم میں ایک اس عنوان کا بھی اضافہ کیا کہ یہ لوگ وحی الٰہی کی اتباع کے بجائے ایک دوسرے سفلی علم میں پڑے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں قرآن مجید بعض اہم تاریخی اور دینی حقیقتوں کو زبردست روشنی میں لے آیا ہے۔
اس علم سے مراد فنِ سحر ہے، فنونِ سحر و کہانت میں یہود کی مہارت تا ایں تاریخ میں مسلّم چلی آ رہی ہے اُن کے اکابر و مشاہیر

اس کا ذکر برابر کرتے آئے ہیں بلکہ اکثر فخر کے ساتھ، قرآن مجید نے اکثر تاریخی حقائق کی طرح ان کی تفصیلات میں گئے بغیر یہاں صرف اشارہ کر دینا کافی سمجھا ہے۔ یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ سے قطع نظر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی قائم تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی کا یہودی النسل پروفیسر مارگولیس آنجہانی جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اپنی انگریزی سیرۃ رسول میں معاصر یہودِ عرب کے سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

"یہ لوگ فن سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدان جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے"۔ (ص ۱۸۹)

اصل عبارت اور مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

اور ہمارے مفسرین نے اس سحر پرستی میں یہود عہد سلیمانی اور یہود عہد محمدیؐ کو شریک سمجھا ہے۔

قل یهود زمان سلیمان وقیل یهود زماننا واللفظ فيهم عام ولجميعهم محتمل وقد كان الكل منهم متبعا لهذا الباطل (ابن العربي) وقد روى فيه عن ابن عباس ان المراد به اليهود الذين كانوا في زمن سليمان بن داؤدؑ وفي زمن النبيؐ (بصائر)

شَيَاطِينُ۔ جب صیغہ جمع میں ہے تو ظاہر ہے کہ ابلیس تو یہاں مراد ہو نہیں سکتا۔ اہل لغت اور اکابر اہل تفسیر دونوں کی رائے ہے کہ شیطانوں سے مراد یہاں خبیث و سرکش قسم کے جنات ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے تابع تھے۔

اى مردة الجن (راغب) المراد شياطين الجن وهو قول الاكثرين (كبير)

والمتبادر من الشياطين مردة الجن وهو قول الاكثرين (روح) وهم المتمردون من الجن الوحشی

لیکن خود جنات کیا ہیں؟ جنات سے مراد وہ صاحب شعور و ادراک ہستیاں ہیں جن کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور جو انسانی آنکھ کو عموماً اور عادۃً نظر نہیں آتے۔ انسان کی طرح وہ بھی مکلف ہیں، گو یہ ضرور نہیں کہ ان کی شریعت بھی جزئیات تفصیلات کے لحاظ سے شریعت انسانی ہو۔ اس مخلوق کا وجود دلائل نقلی و شواہد سے پوری طرح ثابت ہے، اور اس کے وجود سے انکار پر کوئی ایک دلیل بھی قائم نہیں، نہ عقلاً نہ نقلاً۔

بعض کا قول ہے کہ مراد شیاطین انس ہیں یعنی وہ سرکش و خبیث انسان جو حضرت سلیمانؑ کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور سحر و کہانت کے بھی ماہر تھے، فرقۂ معتزلہ کے متکلمین کا رجحان اسی معنی کی طرف ہے۔

قيل شياطين الانس وهو قول المتكلمين من المعتزلة (كبير)

راغب لغوی نے بھی معنی جس طرح سرکش جنات کے دئے ہیں اسی طرح سرکش انسانوں کے بھی جائز رکھے ہیں۔

فهم مردة الجن ويصح ان يكونوا هم مردة الانس ايضًا۔ (راغب)

اور مفسرین اہل سنت نے بھی گنجائش دونوں کے لئے رکھی ہے۔

الشياطين من الجن والانس او منهما (بيضاوى) وهو يريد شياطين الجن والانس (جصاص)

اگر انسان ہی مراد لئے جائیں یعنی دربار سلیمانی کے باغی سردار و سرغنہ تو ان کا مفصل ذکر عہد عتیق کے بعض صحیفوں میں ملتا ہے، ملاحظہ ہو سلاطین باب ۱۱ و ۱۲۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ یعنی آپ کے عہد حکومت میں۔ عَلٰى صرف استعلاء کے لئے نہیں بلکہ مصاحبت، تعلیل وغیرہ کے علاوہ ظرفیت کے لئے بھی آتا ہے اور فی کے معنی میں اس کا استعمال عام ہے۔ ابن جریر جو عربیت کے بھی امام ہیں لکھتے ہیں:

والعرب تضع فی موضع علی وعلی فی موضع فی — اور عرب "فی" کا استعمال "علی" کی جگہ کرتے ہیں اور "علی" کا "فی" کے موقع پر۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

اور سلیمانؑ نے (تو کبھی) کفر نہیں کیا ۳۵۲

در الاتقان (سیوطی) اور مغنی اللبیب میں بھی اس معنی کی تصریح ہے، اور اہل لغت لکھتے ہیں :-

کان ذلک علی عہد فلان ای فی عہد فلان (تاج). فلان واقع علی عہد فلان ہو الیتی فی عہد فلان.

خود قرآن مجید میں بھی علی ایک دوسری جگہ صاف فی کے معنی میں آیا ہے :-

ودخل المدینة علی حین غفلة (القصص - ۱۵)

اور فراء نحوی نے کہا ہے کہ ایسے موقع پر "فی" اور "علی" مرادف ہوتے ہیں.

تصلح "فی" و "علی" فی مثل هذا الموضع (معالم)

چنانچہ یہاں بھی اہل تحقیق نے یہی معنی لئے ہیں کہ سلیمانؑ کے عہد حکومت میں

ای علی عہد سلیمان (ابن کثیر) ای فی عہد ملکه (ابو سعود) ای فی عہد سلیمان (ابن جریر)

ای فی ملکه و عہده (معالم) ای فی ملکه (مغنی)

سُلَيْمٰنُ سلیمان بن داؤدؑ (۹۹۳ ق م تا ۹۳۳ ق م) اسرائیلی سلسلہ کے ایک نامور پیغمبر گزرے ہیں اور اپنے والد ماجد ہی کی طرح ایک بڑے تاجدار بھی، شام و فلسطین کے علاوہ آپ کے حدود حکومت مشرق کی سمت میں عراق کے دریائے فرات کے ساحل تک، اور مغرب میں سرحد مصر تک وسیع تھے، آپ کی سلطنت کی عظمت و شوکت پر دوست و دشمن سب کو اتفاق ہے، اسلام میں اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی و اخلاقی مرتبہ یعنی نبوت و رسالت کے ساتھ جس طرح فقر و مسکنت جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح دولت و آثار حکومت و ریاست بھی، اسلام کا خدا غریبوں اور امیروں، ناداروں اور زرداروں سب کا یکساں خدا ہے.

آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ان یہود کے آبا و اجداد عہد سلیمانی میں شیطانی شغلوں (سحر و کہانت) میں لگے رہے اسی طرح آج خود بھی بجائے نبی کی ہدایتوں پر چلنے کے انھیں سفلی شغلوں میں پڑے ہوئے ہیں.

۳۵۲ (جیسا کہ ناپاسوں کافروں، افترا پردازوں نے مشہور کر رکھا ہے)

آیت کے اس مقام پر پہنچکر مومن کے قلب میں ذرا کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ کہنے والی کون سی بات تھی جو قرآن نے فرمادی؟ جب حضرت سلیمان پیغمبر برحق تھے، تو یہ کھلی ہوئی اور موٹی سی بات ہے کہ آپ شائبۂ کفر و شرک سے بر احل دور تھے، پیغمبر کے حق میں یہ نازل ہونا کہ وہ کفر سے بری تھے، یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی، جیسے کسی ملک کا بادشاہ یہ فرمان جاری کرکے رعایا کو بتلائے کہ ہمارا نائب السلطنت باغی و غدار نہیں، کھٹک بجا ہے قرآن مجید کبھی کوئی چھوٹا سا بیان بھی بے ضرورت نہیں دیتا، مگر یہاں قرآن کو اس اعلان و اعلام کی ضرورت تھی اس ضرورت کا علم سادہ دل مسلمان کو کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا علم تو اسی علیم و ہمہ داں پروردگار ہی کو ہو سکتا تھا، سلیمانؑ کو پیغمبر ماننے والی دو قومیں مسلمانوں سے پہلے بھی ہو چکی ہیں، یہ دونوں وہی ہیں جو اہل کتاب کہلاتی ہیں یعنی یہود و نصاریٰ، ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت و پیمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان کے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم کا اندراج کر دیتے ہیں! یہاں تک کہ کفر و شرک بھی، کہ اس کی عدالت میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر بھی سنگین تصور میں نہیں آسکتا

یہودی قصص وحکایات اور مسیحی آثار و روایات کی کتابوں کو چھوڑیئے، خاص الخاص بائبل یعنی عہدِ عتیق کے صحائف، جن پر یہود و نصاریٰ دونوں کا ایمان ہے، انھیں ملاحظہ فرمالیجئے کہ اس مجموعہ میں آج تک کیا تصریحات لکھی چلی آرہی ہیں :۔

• جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا۔" (۱ سلاطین ۔۱۱: ۴، ۱۰۰۶)

یعنی محض غفلت یا عدم اعتناء کی بنا پر عملی کوتاہی یا عصیان نہیں، صریح بدعقیدگی، توحید ہی کی طرف سے بے یقینی — آگے اور ملاحظہ ہو :۔

"سواذ بس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔" (۱ سلاطین ۱۱: ۹، ۱۰)

معاذ اللہ، خدا کا پیمبر اور کفر و شرک میں مبتلا! چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، دنیا سیکڑوں سال تک ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک انھیں یہودیانہ تحریفات و اختراعات کا شکار ہو کر اس موحدِ اعظم کو نعوذ باللہ کافر و مشرک سمجھتی رہی، یہاں تک کہ قرآن آیا، جو ہر قوم، ہر زمانہ کے سچے پیمبروں کی عزت و ناموس کا محافظ ہے اور اس نے آکر یقین نہ کرنے والی دنیا کے سامنے آکر اعلان کیا کہ سلیمانؑ کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو! وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے، قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہو کر خاموش ہو گئی، جن کے کان تھے انھوں نے سنا، دنیا اپنے کاروبار میں لگی رہی، جیسی رہی بائبل والوں نے بائبل کی پرستاری نہ چھوڑی، یہاں تک کہ تیرہ ساڑھے تیرہ ۱۳½ صدیاں اور گزر گئیں اور اب قدرتِ حق کا اعجاز دیکھئے کہ اب جو محققانہ و فاضلانہ کتب جوامع و حاویاتِ بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی اور شائع ہو رہی ہیں، وہ تائید اور تصدیق بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کی کر رہی ہیں! انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بطور کاوش و تحقیق کا لُبِّ لباب ہوتا ہے اس کے سب سے آخری اڈیشن میں مقالہ زیرِ عنوان سلیمان نکال کر دیکھئے، صاف یہ مضمون ملے گا:

• سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے۔" (جلد ۲ صفحہ ۹۵۲ طبع چہاردہم)

انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، خاص مسیحی فضلاء اور پرستارانِ بائبل کی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ہے، اس میں تو یہاں تک ہے کہ بائبل کی جو آیتیں ابھی اوپر نقل ہو چکی ہیں، ان کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں، وہ الحاقی ہیں، اور پھر لکھا ہے :۔

• یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی لیکن اغلب یہ ہے کہ قربان گاہیں ہی تیار کرائیں اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا۔" (کالم ۴۶۸۰)

خیر یہ اعجاز تو کلام الٰہی کا تھا، اس سے بڑھ کر بھی ہوتا تو ہو سکتا تھا، لیکن محدود و ناقص عقل اور زمان و مکان سے مقید علم رکھنے والے بندوں نے اپنی ایمانی فراست و اخراقیت سے جو کام کر دکھایا، وہ بھی اعجاز سے کچھ کم نہیں، ان میں سے امام ابن جریر آج کے نہیں، آج سے ایک ہزار سال قبل کے شخص ہیں اور یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے شاید زیادہ واقف بھی نہ ہوں، آج نہیں اس وقت اپنی تفسیر میں ابن اسحاق کے حوالہ سے یہ روایت بصراحت درج کر گئے ہیں کہ: آیتِ بالا یہودیوں کے گندے عقائد اور افتراؤں کے رد میں نازل ہوئی ہے جو آپس میں کہتے تھے کہ :۔

قال بعض احبار الیھود الا تعجبون من محمد یزعم ابن داؤد کان نبیا واللہ ما کان

وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ٭

البتہ شیطان ہی (کفر کیا کرتے تھے ۳۵۵) لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ۳۵۶

الا ساحر، ما نزل اللہ فی ذلک من قولھم وما کفر سلیمان الخ

”ان نئے مدعی نبوت کی نادانی تو دیکھو کہ ابن داؤد کو یہ نبی اللہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں حالانکہ بخدا وہ تو بس ایک ساحر تھا، اللہ نے انھیں کے قول کے رد میں یہ آیت نازل کی ہے وما کفر سلیمٰن“

اور جصاص رازی نے اس قسم کی روایت میں حوالہ علاوہ محمد بن اسحاق کے، ابن عباس صحابی اور سعید بن جبیر و قتادہ تابعین کا بھی دیا ہے۔

۳۵۵ (اور اُسے منسوب حضرتؑ کی جانب کر دیتے تھے)

ان شیطانوں کی (خواہ وہ جن ہوں یا انس) ایک شیطنت یہ بھی تھی کہ اپنی کافرانہ، ساحرانہ حرکتوں کی نسبت حضرت سلیمانؑ کی جانب کر دیتے تھے اور شہرت یہ دیتے تھے کہ ہم تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں ان کی رضامندی بلکہ ان کے اشارہ ہی سے کر رہے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے نبی برحق کو ان گندگیوں سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔

قرآن کریم نے کس کس طرح دوسری امتوں کے انبیاء کی طرف سے صفائی پیش کی ہے، انھیں کے اُمتیوں کے لگائے ہوئے داغ دھبے ان کی پاک سیرتوں سے دھو سکے ہیں اور یہ ناشکر گزار قومیں ہیں کہ اُسی قرآن ہی کی دشمنی پر تلی ہوئی ہیں۔

۳۵۶ السِّحْرَ۔ اس کی حقیقت، ماہیت اور اقسام اور اس کے شرعی احکام پر بعض قدیم مفسرین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے خصوصاً ابوبکر جصاص رازی اور امام فخر الدین اور ابن کثیر نے یہاں مختصراً اتنا جان لینا کافی ہے کہ بنا ہے اسباب خفی مثلاً تاثیر کواکب، استعانت شیاطین الجن وغیرہ سے کام لے کر تصرفات عجیب کرنے کا خاص خاص شغلوں اور ریاضتوں سے یہ فن حاصل ہو جاتا ہے مشرک جاہل قوموں میں اس کا رواج پہلے بھی زور و شور سے رہ چکا ہے اور اب بھی ہے، شریعت اسلام نے اسے حرام قرار دیا۔

یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ۔ یُعَلِّمُوْنَ کا فاعل شیاطین ہونا ظاہر ہی ہے، اکثر مفسرین نے اسی ترکیب کو اختیار کیا ہے اور یہاں بھی ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا، لیکن اس کی بھی گنجائش ہے کہ فاعل بجائے شیاطین کے یہود ہی کو قرار دیا جائے یعنی فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کو، معنی اس صورت میں بجائے ماضی کے حال کے ہو جائیں گے یعنی یہ یہود لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے ہیں سحر کی، سحر و کہانت تاریخ بنی اسرائیل کا ایک مسلم و ناقابل انکار جزو ہے، خود عہد عتیق کے صحیفوں میں اس کی شہادت موجود ہے:

”انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا، اور فال گیری اور جادوگری کی ...... ان باتوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نہایت غصہ ہوا، اور اپنی نظر سے انھیں گرا کر دور کر دیا“ (۲۔ سلاطین ۱۷: ۱۷ و ۲۱)

مفسر ابوبکر جصاص رازی نے ”احکام القرآن“ میں عبارت کی ترکیب سب سے مختلف قرار دے کر معنی بھی قدرتاً سب سے الگ ہی لئے ہیں اس پر بھی وہ پہنچے اسی نتیجہ پر ہیں جس پر اور اہل سنت پہنچے ہوئے ہیں، آیت کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ اللہ نے چند فرشتے بھیجے کہ وہ دنیا پر سحر کا مفہوم روشن کر دیں اور یہ بتا دیں کہ یہ تمام تر کذب و کفر ہے جس سے بچنا واجب ہے۔

معناہ واللہ اعلم ان اللہ ارسل الملکین لیبینا للناس معانی السحر ویعلموھم انہ کفر و

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۔

اور (وہ پیچھے لگ گئے) ۳۵۶ اُس (علم) کے بھی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُتارا گیا تھا ۳۵۷ ۳۵۸

کذب فقوبة لاضیقة له حتی یجتنبوا لما بین الله علی اُمة رسله سائر المحظورات والمحرمات ليميزوا

۳۵۶ بیان انہیں عرب یہود کا چل رہا ہے۔

واؤ عاطفہ کبھی فقرہ کو فقرہ سے جوڑتا ہے کبھی لفظ کو لفظ سے اور کبھی فقرہ کو لفظ سے یہاں فقرہ وما انزل علی الملکین کا عطف ہے فقرہ ماقبل ما تتلوا الشیطین پر اور دونوں فقرے تابع ہیں فعل اتبعوا کے گویا تقدیر کلام یوں ہے "واتبعوا ما تتلوا الشیطین الخ۔ واتبعوا ما انزل علی الملکین" بعض نے ما انزل الخ کا عطف السحر پر مانا ہے۔ عطف علی السحر وقیل ھو عطف علی ما تتلوا ای واتبعوا ما انزل (کشاف۔ مدارک) معنی میں کوئی بڑا فرق اس سے بھی نہیں پڑتا، اور حاصل دونوں صورتوں میں ایک ہی رہتا ہے۔

قرآن جو کچھ بھی کہتا ہے حق مطلق کی شان بے نیازی کے ساتھ بالکل بے خوف اور بے دھڑک کہتا ہے نہ کسی خارجی سہارے کی تلاش نہیں محتاجی، خارجی سہارے از خود اس کی طرف کھنچتے چلے آتے ہیں، اسے اپنی جگہ پر اطمینان کامل ہے کہ اس کے کسی بیان میں تردید کی گنجائش تو کجا، شک و تردد بھی کسی طالب حق کو نہیں پیدا ہوگا۔ یہود عرب کا طویل فرد جرم اوپر سے مسلسل چلی آ رہی ہے ابھی ابھی ذکر ان کے فلسطینی سحر کا آچکا ہے (سلیمان نبی بادشاہ فلسطین کے تھے، ان کے عہد کا سحر فلسطینی ہی سحر کہا جائے گا) اب وہ یہ بھی کہے ڈالتا ہے کہ یہ تو جیسے پرانی بات ہوا، اور کتاب و سنت کے قدیم قدر شناس یہی نہیں کہ عہد سلیمانی کے شیاطین جن و انس کی، دنیا سحر و کہانت کا حق ادا کر رہے، بلکہ اس فلسطینی سحر کے علاوہ بابل یا عراق کے بھی سحر کے دلدادہ بنے ہوئے ہیں، یہ مدعی ہیں علم و فضل دینی روحانیت کے لیکن عملاً غرق ہیں نیو سحر کے انواع و اقسام میں۔

تاریخ قدیم کے جاننے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ عہد رسالت و طلوع اسلام سے صدیوں قبل قوم بنی اسرائیل دو مستقل حصوں میں بٹ چکی تھی ایک ٹکڑا وہ جو بخت نصر کے ہاتھوں جلاوطنی یا جبری ہجرت کے بعد کلدانیہ یا بابل (موجودہ عراق) میں رہ پڑا تھا اور وہیں بس گیا تھا، دوسری شاخ وہ جو ایک مدت دراز کے بعد وہاں سے واپس آکر پھر فلسطین میں آباد ہوئی آیت اس تاریخی راز کو فاش کر رہی ہے کہ عہد رسالت کے معاصر یہود عرب جامع ہیں فلسطینی اور بابلی دونوں قسم کے رذائل و خبائث کے تاریخ قدیم کے یہ نازک دقائق اور اپنی جگہ پر بالکل مسلّم و مستند حقائق، جو عام طور پر اچھے اچھے اہل علم کے علم میں بھی نہیں ادا کرائے جا رہے ہیں کسی مؤرخ اعظم کی زبان سے نہیں، عرب کے ایک اُمی کی زبان سے اللہ اللہ۔

۳۵۸ (کسی خاص حکمت و مصلحت کے ماتحت)

دو باتوں کا اس سلسلہ میں استحضار رہے تو ان شاء اللہ آیت کی تفسیر میں کوئی اُلجھن ذہن میں پیدا نہیں ہونے پائے گی۔

۱۔ ایک یہ کہ نزول و انزال کا اطلاق صرف احکام تشریعی میں نہیں ہوتا، اُمور تکوینی میں بھی برابر ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ تکوینیات کے سلسلہ میں جو کام گندے سے گندا بھی کیا جاتا ہے اس کے لئے واسطہ اور وسیلہ بہرحال فرشتے ہی ہوتے ہیں، اور یہ امر ان کی نزاہت و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔

مَآ اُنْزِلَ میں مَا موصولہ ہے الذی کے معنی میں بعض نے مَا کو نافیہ قرار دے کر ما انزل کا عطف مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ پر کیا ہے لیکن محققین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور ابن جریر میں اس پر مفصل گفتگو موجود ہے

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ

اور وہ دونوں کسی کو بھی (اس فن کی باتیں) نہ بتلاتے تھے ۳۵۹ جب تک یہ نہ کہہ دیتے ۳۶۰ کہ ہم تو بس ایک (ذریعۂ) امتحان ہیں ۳۶۱ سو تم (کہیں) کفر نہ اختیار کر لینا ۳۶۲

یہ کام ہے کہ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ کا عطف مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر کرکے اس تاریخی حقیقت کو صاف اور بے نقاب کر گئے کہ یہود کی فرد جرم دونوں جزوں سے سیاہ ہے اتباع سحر فلسطین سے بھی اور اتباع سحر بابل سے بھی! — خود قرآن کا اعجاز تو خیر بہت بڑی چیز ہے حق یہ ہے کہ قرآن والوں کا اعجاز بھی اپنی جگہ دلوں کو ہلا دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔

بابل کی اسی سحر پرور و کہانت خیز سرزمین میں جب عملیات سفلیہ اور علوم سحریہ کا زور حد سے بڑھ گیا اور عوام کے ذہن میں ہادیان حق، انبیائے کرام اور اولیائے صالحین کی حیثیت خلط ملط اور ملتبس ہو کر کاہنوں، ساحروں، عاملوں، شعبدہ بازوں کی ہو کر رہ گئی تو مشیت الٰہی اور حکمت ربانی نے حق و باطل کے ان دو علمبردار گروہوں میں نمایاں فصل و امتیاز کرانے اور لوگوں کی اصلاح خیال کے لئے دو فرشتوں کو انسانی صورت و قالب میں بھیجا۔

ھاروت وماروت۔ یہ نام ہیں ان دونوں فرشتوں کے، دونوں اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے فرشتے تھے لیکن جب ایک غرض خاص کے ساتھ انسانوں کے درمیان رہنے بسنے کے لئے بھیجے گئے تھے تو ظاہر ہے ان کی شکل و شباہت رنگ و روپ جسم و قالب انسانوں ہی کا ہوگا اور ان کی عادتیں اور ان کے جذبات بھی بالکل بشری ہوں گے بعض اہل تفسیر نے یہاں ایک قصہ یہود کا بیان کیا ہوا، ملک عراق کی مشہور رقاصہ اور بیسوا زہرہ کا نقل کیا ہے لیکن اول تو آیت کی تفسیر اس قصہ پر موقوف کسی درجہ میں بھی نہیں، دوسرے خود محدثین اور محققین تفسیر نے اس کی صحت سے بالکل انکار کر دیا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ قصہ گڑھا ہوا اور لغو و مردود ہے، اس گروہ میں قاضی عیاض مالکیؒ، امام رازیؒ، شہاب الدین عراقی وغیرہم شامل ہیں اور ابن کثیر نے تو بڑی لمبی بحث کے بعد یہ کہہ دیا ہے کہ اگرچہ یہ قصہ بڑے بڑے تابعین نے نقل کیا ہے، لیکن اس کی سند حدیث صحیح سے ذرا بھی نہیں ملتی بلکہ اسرائیلیات ہی پر ختم ہوتی ہے۔

اعلم ان ھذہ الروایۃ فاسدۃ مردودۃ غیر مقبولۃ (کبیر) وھذا کلہ لا یصح منہ شیء (نعم)

ونص الشھاب العراقی علی ان من اعتقد فی ھاروت وماروت انھما ملکان یعذبان علی خطیئتھما مع الزھرۃ فھو کافر باللہ تعالی (روح) وحاصلھا راجع فی تفصیلھا الی اخبار بنی اسرائیل اذ لیس فیھا حدیث مرفوع صحیح متصل الاسناد الی الصادق المصدوق (ابن کثیر)

لیکن بالفرض صحیح ہو بھی تو جب کسی خاص حکمت و مصلحت سے کسی فرشتہ کو پیکر انسانی اور جذبات بشری دیئے گئے ہوں اور کسی وقت وہ ملکوتی الاصل بشری جذبات سے مغلوب بھی ہو جائے تو اس میں کوئی استحالہ نہ شرعی ہے نہ عقلی۔

۳۵۹ یُعَلِّمٰنِ۔ تعلیم کے متعارف مفہوم کی بنا پر اس لفظ سے یہ شبہ نہ ہو کہ ملائکہ سحر کا درس یا سبق دیا کرتے تھے، استغفر اللہ، تعلیم کے معنی علاوہ سکھانے اور سبق دینے کے اعلام یعنی جتلانے، بتلانے، آگاہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔

والتعلیم ربما یستعمل فی معنی الاعلام (راغب)

چنانچہ ماہرین قرآن کی ایک جماعت نے یہاں بھی یہی معنی لئے ہیں۔

والتعلیم بمعنی الاعلام (معالم) وقالت طائفۃ ھو ھنا بمعنی یعلمان بالتخفیف فھو من باب الاعلام (بحر)

اور خود ایک قراءت بھی مصدرِ اعلام کے ساتھ منقول ہے۔

وقرء طلحة بن مصرف يعلمان بالتخفيف من الاعلام (روح)

مِنْ اَحَدٍ میں مِنْ زائد ہے تاکیدِ استغراق کے لئے، معنی ہوں گے "کسی کو بھی" یا "کسی ایک کو بھی"۔

من زائدة لتاكيد استغراق الجنس (بحر)

۳۶۰ (بہ نظرِ احتیاط مزید)

ملائکہ اس باب میں اتنی احتیاط رکھتے کہ خیر خود سے تو کسی کو کیا بتلاتے سکھلاتے، جو لوگ پوچھنے آتے انھیں بھی پہلے متنبہ کر دیتے

حتی ينصحاه اولا (معالم) حتی ينبهاه وينصحاه (مدارك) لا يعلماه حتی يبالغا فی نهيه (جصاص)

۳۶۱ امتحان یعنی وہ چیز جس سے کھل جائے کہ سحر و کہانت سے بچا کون کون رہا اور مبتلا ان میں کون کون ہو گیا۔

فِتْنَةٌ کے معنی امتحان، آزمائش، جانچ پڑتال کے آتے ہیں۔

تارة يستعمل فی الاختبار (راغب)

اور یہاں بھی آزمائش مراد ہے۔

ومعناها فی هذا الموضع الاختبار والابتلاء (ابن جرير عن ابن جريج) ای ابتلاء واختبار من الله (كشاف)

مطلب یہ ہوا کہ انسان نما ملائکہ کسی پر بھی حقیقتِ سحر کو نہ کھولتے، کسی کو کلماتِ سحر پر مطلع نہ کرتے جب تک کہ اسے متنبہ نہ کر دیتے، ہوتا یہ تھا کہ فسق پیشہ لوگ آکر ہاروت و ماروت کو گھیرتے اور ان سے اصرار کر کے دریافت کرتے کہ آپ ہمیں سحر سے روک تو رہے ہیں لیکن یہ تو بتلائیے کہ سحر کہتے کسے ہیں، وہ ہیں کون سے اعمال و اقوال جن پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے؟ فرشتے انھیں اس تنبیہ و یاددہانی کے بعد کہ اس فن سے کام لینا کفر ہے، جب انھیں آگاہ و خبردار کرنے کے لئے ان اعمال و اقوال کی نقل و حکایت ان کے سامنے کرتے تو وہ فسق پیشہ لوگ اس سے فائدہ یہ اٹھانے کہ خود اس فن ہی کے سیکھ جانے کا کام لینے لگتے —— بالکل ایسی ہی بات جیسے آج کوئی کسی فقیہ عالم سے یہ دریافت کرے کہ رشوت اور سود کا اطلاق کن کن آمدنیوں پر ہوتا ہے، اور پھر ان سے بچنے کے بجائے الٹا انھیں طریقوں پر عمل شروع کر دے!

یہ مفہوم طبعزاد نہیں، حضرت علیؓ سے ایک اثر ٹھیک اسی معنی میں مروی ہے۔

قال علی كان يعلمان تعليم انذار لا تعليم دعاء اليه كانهما يقولان لا تفعل كذا كما لو سأل سائل عن صفة الزنا او القتل فاخبر بصفة ليجتنبه (بحر)

۳۶۲ (ان اعمال و اقوال سحر کو اختیار کر کے)

ای لا تجعل ما تسمع منا سببا للكفر (ابن العربی) وقولهما فلا تكفر يدل علی ان عمل السحر كفر (جصاص)

فقہاء نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اعمال و اقوالِ سحر یہ کا اعتقاداً اختیار کر لینا کفر کے مرادف ہے۔

ای لا تكفر بعمل هذا السحر واعتقاده فثبت ان ذلك كفر اذا عمل به واعتقده (جصاص)

فَلَا تَكْفُرْ۔ اس جزو کا اضافہ تاکیدِ بیان کے لئے ہے۔

هذا تاكيد للبيان (ابن العربی)

اس میں فقہاءِ امت کا اختلاف شروع سے چلا آ رہا ہے کہ آیا مطلق سحر یعنی اس کا سیکھنا بھی حرام ہے یا محض اس پر عمل

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ

غرض لوگ ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھ ہی لیتے ۳۶۳ جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی زوجہ کے ۳۶۴

مراد ہے قول دو دونوں قسم کے لئے ہیں۔ بعض نے تعلم کو بالکل جائز رکھا ہے اور صرف عمل کو حرام قرار دیا ہے اور بعض نے نفسِ تعلم کو بھی۔

قیل ولا تتعلموه لتعمل به وهذا علی من قال تعلمه جائز والعمل به کفر وقیل لا تکفر بتعلم السحر وهذا علی قول من قال ان تعلمه کفر (بحر)

بعض نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ سحر کا سیکھنا بہرصورت حرام ہے یہاں تک کہ کافر ساحروں کے رد کے لئے سیکھا جائے جب بھی حرام ہے اس لئے کلامِ الٰہی ولا تکفر دلالت کرتا ہے مفہوم کی علی الاطلاق حرمت پر اور وہ سحر ہے از [illegible] لیکن یہ تحقیق خود حنفیہ کے یہاں بھی متفق علیہ نہیں، اور شافعیہ کو تو اس سے بالکل اختلاف ہے۔

ولا تکفر باعتقاد جوازه و تعمل به وفیه دلیل علی ان تعلم السحر وما لا یجوز اتباعه غیر محظور وانما منع من اتباعه والعمل به (بیضاوی) ای لا تتعلم السحر فتعمل به فتکفر (معالم) ولا تکفر بتعلمه والعمل به علی وجه یکون کفرا۔ (مدارک)

حضرت تھانویؒ کی تحقیق اس موقع پر بھی قابلِ قدر ہے:-

"سحر کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس میں کلماتِ کفر ہوں مثل استعانت بہ شیاطین و کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے خواہ اس سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے یا نفع پہنچایا جائے اور اگر کلماتِ مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلافِ اذنِ شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے یا کسی اور غرضِ ناجائز میں استعمال کیا جائے تو وہ فسق و معصیت ہے اور اگر ضرر نہ پہنچایا جائے اور نہ کسی اور غرضِ ناجائز میں استعمال کیا جائے تو اُسے عُرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں، اور وہ مباح ہے اور اگر کلمات مفہوم نہ ہوں تو بوجہ احتمالِ کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے۔ اور کفرِ عملی کا اطلاق ہر ناجائز پر صحیح ہے۔"

۳۶۳ یعنی وہ فسق پیشہ اور معصیت دوست لوگ سحر سیکھ ہی جاتے، ملائکہ کی نیت کا بخیر ہونا بالکل ظاہر ہے وہ تو نفسِ مسئلہ سمجھاتے، سحر کی حقیقت بیان کرتے، اس کی حرمت کا حکم صادر کرتے، لیکن فاسد الطبع لوگ اس سے فن سیکھ جاتے اور اُسے کام میں لانے لگتے۔

۳۶۴ ذکر (ایک بار پھر حافظہ کو تازہ کر لیجئے) یہود کا چل رہا ہے، یہود عہدِ سلیمانی کا، نیز ان کی اولاد در اولاد کا۔ قرآن، ایک اُمّی کا لایا ہوا قرآن، ان کی فردِ جرم سناتے سناتے یک بہ یک یہ بھی کہہ ڈالتا ہے کہ یہود سحر و عملیاتِ سفلی میں تو مشغول رہتے ہی تھے، ان میں بھی خصوصاً ان اعمال میں جن کا تعلق میاں بیوی کے افتراق سے تھا۔ قرآن نے تو ضمناً اور گویا بالکل لپیٹ میں ایک بات کہہ ڈالی، اب دیکھئے بیسویں صدی کے خود یہود اور محققینِ اسرائیل اپنے اسلاف کے مشغلۂ سحر و ساحری کی نوعیت سے متعلق کیا شہادت دیتے ہیں؟

سحر کی سب سے زیادہ عام متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لئے دیا جاتا تھا، خاص کر وہ نقش جو [illegible] کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں، چنانچہ ذکر بھی سحر اور

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

حالانکہ وہ (فی الواقع) کسی کو بھی اس کے ذریعہ سے نقصان نہ پہنچا سکتے مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے ۳۶۵ اور یہ وہ

مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ

چیز سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان تو پہنچا سکتی ہے اور انھیں نفع نہیں پہنچا سکتی ۳۶۶ ہے

حرام کاری کا عموماً ساتھ ہی ساتھ آیا ہے۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۸ ص ۲۵۵)

۳۶۵ (یعنی بجز مشیتِ تکوینی کے)
اسلام نے شرک کی جڑ جس جس طرح کاٹی ہے اس کے لحاظ سے یہ صراحت ضروری بھی تھی، ارشاد ہو رہا ہے مؤثرِ حقیقی ان عملیاتِ سحریہ کو، ان ٹونے ٹوٹکوں کو ہرگز نہ سمجھ لینا ان میں قوت ذرا سی بھی نہ تھی، مؤثر و فاعلِ حقیقی جس طرح ہر حال میں صرف ہماری مشیت، صرف ہماری تجلی ارادی تکوینی رہتی ہے اس موقع پر بھی صرف وہی رہی۔ اِذْنِ اللّٰہ کے معنی یہاں تقدیر الٰہی، مشیتِ تکوینی، قضا و قدر کے ہیں۔

الاذن هنا العلم (جصاص) ای بعلمه ومشیئته (مدارک) معناه الا بقضائه وقدرته ومشیئته (معالم عن سفیان ثوری) ای بارادته وقضائه لا بأمره (قرطبی) ای علمه وتکوینه فالساحر یسحر والله یکون (معالم)
بس اتنا یاد رہے کہ یہ اللہ کی قدرت، مشیت یا حکمتِ تکوینی ہرگز مرادف اللہ کے حکم یا رضا کے نہیں۔

یعنی بعلمه وقضائه لا بامره (ابن العربی)
زہر کے اثر سے بے گناہوں کی ہلاکت کافروں کے ہاتھوں اولیاء و انبیاء کی اہانت و اذیت، مشرکوں کا مسلمانوں پر غلبہ و تسلط، جس قانونِ حکمتِ تکوینی کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے اسی کے ماتحت سحر بھی اپنا اثر دکھاتا ہے اور رضائے الٰہی سے بُعد جس قدر غلبۂ کفر وغیرہ کو ہے اسی قدر تاثیرِ سحر کو، ہر ہر ارادۂ الٰہی کے اندر کتنی کتنی تکوینی حکمتیں اور کائناتی مصلحتیں ہوتی ہیں، اس کا علم بھی بجز اسی دانا و بینا، علیم و خبیر کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔
سلف کا مذہب سارے اسباب و مسببات کے بارے میں یہی رہا ہے کہ مؤثرِ حقیقی مشیتِ الٰہی ہے، وہی جب چاہتی ہے سبب و نتیجہ کے درمیان حائل بن جاتی ہے اور جب نہیں چاہتی ہے تو حائل نہیں ہوتی۔

وفیه دلیل علی ان فیه ضررا مودعا اذا شاء الله تعالی حال بینه وبینه واذا شاء خلاه وما اودعه فیه وهذا مذهب السلف فی سائر الاسباب والمسببات (روح)

۳۶۶ (جیسا کہ ہر معصیت کا قاعدہ ہے کہ اس کی تحصیل مضر اور غیر مفید ہوا کرتی ہے۔)
یعنی یہ بدبخت یہود اپنا وقت اور اپنی قوتیں کیسی ضائع کر رہے ہیں ان علوم و فنون کی تحصیل میں جو ان کے حق میں نافع تو ذرا سی بھی نہیں اور مضر ہی ہیں، ضمناً اس سے علوم سحریہ کے سیکھنے کی ممانعت بھی نکل آئی جیسے ان علوم عقلیہ و فلسفہ کی جو گمراہی کی طرف لے جائیں۔

فیه دلیل علی انه واجب الاجتناب کتعلم الفلسفة التی تجر علی الغوایة (مدارک)

وَلَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ؕ

اور (یہ بھی) خوب جانتے ہیں ۳۶۵ کہ جس نے اسے اختیار کرلیا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۳۶۶

وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

اور بہت ہی بری وہ چیز ہے جس کے عوض میں انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ۳۶۷ کاش وہ (اتنا ہی) جانتے ۳۶۸

يَضُرُّهُمۡ. يَنۡفَعُهُمۡ ضرر کی حقیقت مذہب اہلِ سنت میں یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دکھ ہے کہ جس کے معاوضہ میں کوئی نفع نہ ہو۔

حقیقۃ الضرر عند اهل السنۃ کل الم لا نفع یوازیہ (ابن العربی)

اور نفع کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے پیچھے نہ تکلیف ہوتی ہو اور نہ اس پر عذاب مرتّب ہو۔

وحقیقۃ النفع کل لذۃ لا یتعقبها عذاب ولا یلحق فیہ ندامۃ (ابن العربی)

اور سحر میں ضرر اور عدم نفع جمع ہوتے ہیں۔

والضرر وعدم المنفعۃ فی السحر متحقق (ابن العربی)

۳۶۵ (خود اپنے مذہبی نوشتوں کی تصریحات سے)

اشارہ عہدِ رسالت کے یہود کی جانب ہے یعنی یہود معاصرینِ عہدِ رسولؐ سے متعلق۔

متعلق بقولہ تعالٰی ولما جاءهم وقصۃ السحر مستطردۃ فی البین والضمیر لاولئک الیهود۔ (روح)

قرآن نے کس دعوے سے کہہ دیا کہ لَقَدۡ عَلِمُوۡا؟ یہ یہود ہی خوب جانتے ہیں کہ سحر و ساحری کیسی گندی چیز ہے یہود کہہ سکتے تھے کہ ہم کہاں جانتے ہیں؟ کس نے ہمیں یہ خبر دی ہے؟ ہمارے مقدس نوشتوں میں کہاں یہ موجود ہے؟ مگر نہ کہہ سکے اس لئے کہ آج کی تحریف شدہ، مسخ شدہ توریت تک میں یہ تصریحات باقی ہیں:۔

"تو جادوگری کو جینے مت دے" (خروج ۲۲: ۱۸) "اور جادو نہ کرو، اور ساعتوں پر لحاظ مت کرو" (احبار ۱۹: ۲۶)

"اور منتال و ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کی نفرت کے باعث ہیں" (استثناء ۱۸: ۱۲)

۳۶۶ یعنی آخرت میں نیکی اور اجر کا مطلق کوئی حصہ نہیں۔

وهو النصیب من الخیر (جصاص)

اِشۡتَرٰىهُ. ضمیر سحر کی طرف ہے۔

ای اختار السحر (معالم) ای استبدل ما تتلوا الشیاطین بکتاب اللّٰہ واستبدل السحر بدین اللّٰہ (جصاص)

نکتہ شناسوں نے کہا ہے کہ یہ اشارہ پھر اسی حقیقت کی طرف ہے کہ سحر کفر ہے۔

وقال الحسن ماله من دین وهذا یدل علی ان العمل بالسحر وقبوله کفر (جصاص)

یہود کو دعوتِ حق دی جا رہی تھی، پیام ان کے پاس مذہب توحید کا پہنچ رہا تھا، اور وہ تھے کہ دعوت سے غافل و بے پروا، فارغ و غیر متوجہ، اپنے انھیں علوم سحر و کہانت میں لگے ہوئے اور انھیں خرافات کے

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

اور اگر وہ لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اس کا ثواب اللہ کے ہاں کہیں بہتر ہوتا کاش وہ (اتنا) جانتے ۳۷۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ

اے ایمان والو! "راعنا" مت کہا کرو ۳۷۲ اور "انظرنا" کہا کرو اور سنتے رہا کرو ۳۷۳

کمال کے درجہ میں رکھے ہوئے تھے، اشارہ ان کی اسی محرومی و بدنصیبی کی جانب ہے۔

ف ۳۶۹ "اپنے آپ کو بیچ ڈالا" یعنی اپنی جان کو عذاب و ہلاکت میں ڈالا۔

بِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ۔ وہ بری چیز کفر و اعمال سحریہ ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، بندوں کے حال پر کمال شفقت سے، تأسف و حسرت کے لہجہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ دین برحق جیسی نعمت سے منہ موڑے ہوئے یہ کفر و سحر اختیار کئے ہوئے ہیں، گویا دوزخ کی خریداری کر چکے ہیں۔

۔ اختاروا السحر والكفر على الدين والحق (معالم) وهذا ايضا يؤكد ان قبوله والعمل به كفر (جصاص)

ف ۳۷۰ یعنی افسوس کہ اس حد تک بھی انھوں نے اللہ کی دی ہوئی عقل سلیم سے کام نہ لیا!

ف ۳۷۱ (اور اپنی موجودہ روش کفر و فسق سے تائب ہو جاتے)

گنہگار بلکہ سرکش و نافرمان و غدار بندوں کے حق میں اس قدر تأسف اسی مالک حقیقی ہی کا حصہ ہے، کیا حد ہے اس شفقت و کرم بے حساب کی!

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا۔ سے بعض فقہاء نے سحر کے کفر ہونے پر استدلال کیا ہے۔

يقتضي ذلك ايضا (جصاص) وقد استدل بقوله ولو انهم امنوا واتقوا من ذهب الى تكفير الساحر كما هو رواية عن الامام احمد بن حنبل وطائفة من السلف وقيل بل لا يكفر ولكن حده ضرب عنقه. (ابن کثیر)

تفسیر ابن کثیر میں ابن ہبیرہ کی کتاب الاشراف علی مذاہب الاشراف کے حوالہ سے ہے کہ بجز امام ابوحنیفہ کے جو حقیقت سحر ہی کے منکر ہیں، دوسرے علماء حقیقت سحر کے قائل ہیں۔

وقد ذكر الوزير ابو المظفر يحيى بن محمد هبيرة رحمه الله في كتابه الاشراف على مذاهب الاشراف بابا في السحر فقال اجمعوا على ان السحر له حقيقة الا ابا حنيفة فانه قال لا حقيقة له

ف ۳۷۲ (مجمع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب و متوجہ کرتے وقت)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مجمع میں قرآن سناتے یا تبلیغ کرتے ہوتے اور لوگ کوئی بات سن نہ پاتے تو قدرتا دوبارہ آپ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتے، یہودنے ایسے موقع کے لئے از راہ شرارت لفظ رَاعِنَا استعمال کرنا شروع کیا تھا اس کے اصل معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ "ہماری رعایت کیجیے" لیکن رَاعِنَا کے "عین" کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے اس کے معنی میں ایک گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، مسلمان اس شرارت سے غافل، بے خبر، خالی الذہن خود بھی بعض اوقات یہ لفظ بولنے لگتے، یہاں انھیں کو یہ ممانعت ہو رہی ہے، یہود تو خیر اسے طنز و تمسخر کی راہ سے کہتے ہی تھے

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

اور کافروں کے لئے عذاب دردناک ہے ٢٧٣ جو لوگ کافر ہیں (خواہ) اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین

اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

میں سے ٢٧٥ وہ اسے (ذرا بھی) پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے پروردگار کی طرف سے اتر آئے ٢٧٦

جب بھی عرب میں یہ کلمہ ذرا پہلوئے ذم لئے ہوئے تھا۔

ول خطوب هي كلمة المجاز على وجه الهزء (جصاص)

اُنْظُرْنَا کے معنی ہیں "ہمارے اوپر نظر کیجئے" اور یہ پہلوئے ذم سے خالی ہے آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رتبہ رسالت کا ادب صرف معنوی ہی حیثیت سے نہیں لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے احتمال بھی اہانت کا نکلتا ہے، ان سے اجتناب لازم ہے۔

وهذا يدل على تجنب الالفاظ المحتملة التي فيها التعرض للتنقيص (ابن العربي) وهذا يدل على ان كل لفظ احتمل الخير والشر فغير جائز اطلاقه حتى يقيد بما يفيد الخير (جصاص)

بلکہ امام مالکؒ کے ہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہوجاتی ہے فقہاء حنفیہ نے جو اپنی باریک بینی کے لئے سب ممتاز ہیں یہ بھی نکالا ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کہ فلاں مقام پر مراد امر خیر ہے یا شر، واضع کی نیت کے لحاظ سے ہوگا، متکلم کی رائے سے نہیں صحابہ کرامؓ تو ظاہر ہے کہ سوء ادب کے شائبہ قصد سے بھی بری تھے، ممانعت جو کی گئی، وہ بھی بدنیت پر حکم کرکے ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ مقصد اس حکم سے مسلمانوں کو کافروں کے تشبہ قولی و عملی سے روکنا ہے۔

والغرض ان الله تعالى نهى المومنين عن مشابهة الكافرين قولاً وعملاً۔

اور آگے حدیث من تشبه بقوم فهو منهم درج کرکے اس سے استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو شدید و مؤکد ممانعت کافروں کے قول فعل، وضع و لباس، فیشن وغیرہ کے اختیار کرنے سے ہے۔

فيه دلالة على النهي الشديد والتهديد والوعيد على التشبه بالكفار في اقوالهم وافعالهم ولباسهم واعيادهم وعباداتهم وغير ذلك من امورهم التي لم تشرع لنا ولا نقر عليها (ابن كثير)

٢٧٣ (رسولؐ کے ارشادات ادب و تعظیم کے ساتھ)

حال کے بعض گمراہ فرقوں نے ایمان و اسلام کے لئے رسولؐ کی شخصیت سے بالکل قطع نظر کرکے محض قرآن کے اتباع کو کافی سمجھ لیا ہے، ان کی گمراہی آیت سے ظاہر ہے۔

٢٧٤ (پیمبر برحقؐ کی توہین اور اپنی دناءت اخلاق کی پاداش میں)

خصوصاً ان کافروں کے لئے جو رسولؐ کے ساتھ شدت بغض و عداوت میں اس حد تک پہنچ جائیں اور عام انسانیت و تہذیب کے حدود کا بھی لحاظ نہ رکھیں ـــ ایسے بدتمیز معاندین کی اصلاح کی توقع بھی کیا ہوسکتی تھی۔

٢٧٥ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ کافروں یعنی طریق اسلام کے منکروں کی بڑی قسمیں دو ہیں، ایک مشرک جو

مسئلے توحید، رسالت، معاد و حشر ہی کے قائل نہیں، بلکہ ان کے بجائے عجیب عجیب تخیلات اور اوہام گڑھ رکھے ہیں، دوسرے اہل کتاب جو ان بنیادی حقائق پر عقیدہ ایمان رکھتے ہیں، لیکن عملاً و معنًا ان سب حقیقتوں کو مسخ کر چکے ہیں، یہاں جملہ میں آگے جو خبر آنے کی ہے اس کا مبتدا بھی الذین کفروا ہے، مزید صراحت کے لئے اس کی دونوں قسموں کو بھی کھول کر بیان کر دیا ہے۔

اَہْلِ الْكِتٰبِ۔ یہ لفظ قرآن مجید میں پہلی بار آیا ہے۔ قرآنی اصطلاحات میں یہ لفظ مومنین اور مشرکین کا درمیانی درجہ رکھتا ہے اور اس کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر ہوتا ہے، جو اصلاً توحید، نبوت و معاد کے قائل تھے اور آسمانی صحیفے بھی اپنے پاس رکھتے تھے گو معنوی اور لفظی تحریفات کے لحاظ سے بالکل مسخ شدہ، اور قرآن کے منکر تھے۔ گویا نفس سلسلۂ وحی کے قائل تھے۔

وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ۔ من مشرکین کے معنی میں ہے۔ ای ومن المشرکین (معالم)

الْمُشْرِكِيْنَ۔ مشرک وہ تھے جو سرے سے توحید و نبوت ہی کے قائل نہ تھے، بجائے ایک خدائے واحد کے مختلف فرشتوں کو مختلف قویٰ کا مستقل مالک و متصرف سمجھتے تھے، ان کو دیویوں، دیوتاؤں کے نام سے پکارتے اور انہیں کی پرستش کرتے، اور مختلف عناصر اور مظاہر فطرت کی بھی الوہیت کے قائل رہتے، گویا سلسلۂ وحی ہی کے سرے سے منکر تھے۔

حیرت و افسوس ہے کہ انگریزی کے تقریباً کل مترجمین قرآن اور اردو کے متعدد شارحین نے شاید افراط "روشن خیالی" کے اثر سے ترکیب عبارت کو بالکل نظر انداز کر کے ترجمہ یوں کر دیا ہے:۔

"اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں وہ اور مشرکین (ذرا بھی) پسند نہیں کرتے"۔

حالانکہ یہ ترجمہ کسی طرح بھی صحیح نہیں، اول تو اہل الکتب کا مفہوم ہی کافر اہل کتاب کا ہے اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو اہل کتاب ہی کیوں رہ جائیں، مومن ہی نہ کہلانے لگیں، اس لئے یہ کہنا کہ ان میں سے جو کافر ہیں تو وہی بے معنی ہے، پھر اس سے بڑھ کر صریح اور قاطع المشرکین کا اعراب ہے، المشرکین حالت جری میں ہے اور من حرف جار کا مجرور۔ اس کا عطف صریحاً اہل الکتب پر ہے، اگر الذین کفروا پر ہوتا تو حالت رفعی میں ہوتا اور بجائے المشرکین المشرکون ہوتا۔ ایک حدیث میں کافروں کی یہ دو گونہ تقسیم اہل کتاب و مشرکین بہ صراحت کر کے دونوں کے حق میں عذاب کی دعا آئی ہے۔

اللهم عذب الكفرة اهل الكتب والمشركين الذين يجحدون آياتك ويكذبون رسلك ويصدون عن سبيلك ويتعدون حدودك ويدعون معك الٰها آخر لا اله الا انت تبارکت وتعاليت عما يقولون الظالمون علوًا كبيرًا.

مِن یہاں بیان و تفصیل کا ہے، جنس الذین کفروا کے دو طبقوں کے اظہار کے لئے، جیسا کہ سورۃ البینۃ میں آیا ہے، لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ۔

من للبيان (جلالين) من للتبيين (بيضاوی) من للبيان لان الذين كفروا جنس تحته نوعان اهل الكتب والمشركون (كشاف۔ كبير۔ مدارك)

۳۷۶ (اے مسلمانو!)

مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک، یہ کسی طرح گوارا ہی نہیں، بلکہ دل سے شاق گزر رہا ہے کہ خیر و رحمت کا نزول مسلمانوں پر ہو۔

نوازے جانا آئینِ حکمت کے منافی ہے۔

۳۷۹ (لوگوں کے دماغ یا حافظہ سے)

انساءھا ای محو ذکرھا عن القلوب (راغب) انساء آمنہ ای اذھابھا عن القلوب (بیضاوی)

آیۃ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کا اطلاق آیت مکتوبی پر بھی ہوتا ہے اور نشان، دلیل، معجزہ پر بھی۔ یہاں مراد اگر دلائل و معجزات ہی لی جائے جب تو آگے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایک کے بجائے دوسرا نشان حقانیتِ قرآن کا وجود میں اب بھی آتا ہی رہتا ہے اور زمانۂ نزول قرآن میں تو خارقِ عادت نشانوں کی کبھی کمی نہ تھی۔

البتہ اگر آیت مکتوبی ہی مراد لی جائے جب بھی دو شقیں موجود ہیں، آیتیں یا قرآن مجید کی ہوں گی یا کتبِ سابق کی، اگر کتبِ سابق کی آیتیں مراد ہیں جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی کا مذہب ہے جب بھی بحث آگے نہیں بڑھتی، پرانی آیتوں کا قرآنی آیتوں سے منسوخ ہونا تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ نزاع، ہاں اگر آیاتِ قرآنی مراد ہوں تو سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کے نسخ سے مفہوم کیا ہے؟

نسخ سے مراد کسی نے آج تک یہ تو لی نہیں کہ فلاں عقیدہ کسی زمانہ میں واجب تھا اور اب وہ منافی ایمان قرار پا گیا یا جھوٹ، چوری، زنا، قتل پہلے حرام تھے پھر حلال قرار پا گئے، یا فلاں حکایت پہلے جس طرح قرآن میں بیان ہوئی تھی بعد کو اس کی تردید ہو گئی، غرض نسخ کی گنجائش کا عقائد میں، کلیاتِ اخلاق میں، امورِ حسی میں، قصصِ گزشتہ اور حکایاتِ ماضی میں، اخبارِ غیب میں، غرض قرآن مجید کے بیشتر حصہ میں تو کوئی بھی قائل نہیں، نسخ کی گنجائش جو کچھ بھی ہے لے دے کے بس بابِ احکام میں ہے اور احکام کی مثال طبیب کے نسخہ کی ہے، طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب و ہوا میں فرق ہوتے رہتے ہیں، ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزاء میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا، قرآن کے بعض احکامِ قانون کے نسخ کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خود قانون ساز و قانون آرا کے قلم سے عین وضعِ قانون کے دوران میں بعض قانون جو عارضی و ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں بدل دیئے گئے اور ان کی جگہ مستقل و دوامی قوانین نے لے لی، انسان کے دانت اور جبڑے مستقل طور پر غذاؤں کے چبانے، پیسنے، چیرنے، کاٹنے اور پھاڑنے وغیرہ کا کام کرتے ہیں، لیکن ابتدائی شیر خوارگی میں دانت نکلنے سے قبل دوسری قسم کی شربتی و نیم شربتی غذا میں ہی اس کے لئے موزوں ہیں اس موٹی اور سیدھی سی بات میں خدا معلوم اتنا گھبرانے کا کون سا پہلو ہے جو آج بعض مفسرین جدید مثلاً نسخ ہی سے انکار پر تل گئے ہیں، یہ بھی خوب واضح رہے یہ نسخ جو کچھ بھی ہوگا محض علمِ بشری ناقص و محدود کے اعتبار سے ہوگا، ورنہ علمِ الٰہی میں تو ہر حکم ازل سے وقتِ معین کے لئے مقرر و ثابت ہی ہے۔ جمہور کا مذہب اسی وقوعِ نسخ کا ہے گو ایک گروہ عدمِ نسخ کا بھی قائل رہا ہے

وروی عن بعض المسلمین انکار النسخ واجمع الجمھور من المسلمین علی جواز النسخ ووقوعہ (کبیر)

والمسلمون کلھم متفقون علی جواز النسخ فی احکام اللہ تعالیٰ لما لہ فی ذلک من الحکمۃ البالغۃ وکلھم قال بوقوعہ (ابن کثیر)

اور ابن کثیر میں ابو مسلم اصفہانی کا قول قرآن میں عدمِ وقوعِ نسخ کا نقل کر کے اس کا بڑی سختی سے رد کیا ہے۔

وقال ابو مسلم الاصفہانی المفسر لم یقع شیء من ذلک فی القرآن وقولہ ضعیف مردود مرذول (ابن کثیر)

فقیہ جصاص نے کسی صاحب کا قول بھی جو فقہ میں داخل نہ تھے مگر ادب و لغت کے ماہر تھے اسی معنی پر نقل کیا ہے کہ شریعتِ محمدی کے اندر کوئی نسخ نہیں، ناسخ خود یہ شریعت ساری شریعتوں کی ہے۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ

کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے سلطنت آسمانوں اور زمین کی ہے ۳۸۲

زعم بعض المتأخرین من غیر اهل الفقه انه لا نسخ فی شریعة نبینا محمد صلی الله علیه وسلم وان جمیع ما ذکر فیها من النسخ فانما المراد به نسخ شرائع الانبیاء المتقدمین (احکام القرآن)

اصل مغالطہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اصطلاح نسخ کو اردو کی "منسوخی" کے مرادف سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اصطلاح شریعت میں نسخ کے معنی ازالہ یا مٹا دینے کے ہیں ہی نہیں بلکہ کسی مطلق و غیر مقید کو صرف محدود و مقید کر دینے کے ہیں.

وتفسیر النسخ لغة التبدیل وشریعة بیان انتهاء الحکم الشرعی المطلق الذی تقرر فی أوهامنا استمراره بطریق التراخی فکان تبدیلا فی حقنا بیانا محضا فی حق صاحب الشرع (مدارک) وفی الشریعة هو بیان انتهاء الحکم الشرعی الذی فی تقدیر أوهامنا استمراره لولاه بطریق التراخی (ابو البقا)

اور نسخ کتاب کے معنی عربی میں کتاب کے مٹا دینے کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کی صورت کو دوسرے قالب میں نقل کر دینے کے ہوتے ہیں۔

ونسخ الکتاب نقل صورته المجردة الی کتاب آخر وذلک لا یقتضی ازالة الصورة الاولی بل یقتضی اثبات مثلها فی مادة اخری. (راغب)

نسخ کے جو معنی اصطلاحِ فقہاء میں ہیں وہ تو بہت بعد کی اصطلاح ہے اور خود آیت بھی آیتِ قرآنی کے معنی میں بعد کی اصطلاح ہے اس لئے سب سے صاف اور بے تکلف ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہم جو موقوف کرتے ہیں کسی نشان کو" اور لفظ "موقوف" بھی قدیم ترین دہلوی ترجموں میں آیا ہے.

۳۸۰ (یعنی وقت و موسم بدلے ہوئے حالات کے زیادہ مطابق)

ای بما هو أنفع لکم واسهل علیکم (معالم)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جو حال یا وارد، بلا اختیارِ عبد زائل یا مغلوب ہو جائے حق تعالیٰ اس سے بہتر یا اس کے مثل ہی دوسرا عطا کر دیتا ہے سو اس پر افسوس و حسرت نہ کرنا چاہئے

۳۸۱ (سو ایسے قادرِ مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ احوال و مصالح کی رعایت برابر کرتا رہے)

خطاب یہاں معترض، معاند، منکرِ نسخ سے ہے.

قیل لمنکر النسخ (روح)

اور بعض نے مطلق سامع کو مخاطب قرار دیا ہے.

والاولی ان یکون المخاطب السامع (بحر)

۳۸۲ (اور اسی کو ہر طرح کا اختیارِ کامل و تصرفِ مطلق حاصل ہے)

خطاب یہاں عام ہے ہر سامع اور مخاطب کے لئے یہی کہا گیا ہے کہ خطاب رسولؐ سے ہے اور آپؐ کے واسطے سے امت سے

الخطاب للنبی والمراد هو وأمته (سجاوندی)

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ

اور اللہ کے سوا کوئی (بھی) تمہارا یار و مددگار نہیں ۳۸۳؎ تم تو یہ چاہتے ہو کہ

اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

اپنے رسول سے سوال کرو ۳۸۴؎ جیسا کہ (اس کے) قبل موسیٰ سے سوال کئے جا چکے ۳۸۵؎ اور جو کوئی ایمان

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

کے بدلے میں کفر اختیار کرے گا ۳۸۶؎ سو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

۳۸۳؎ (اے بنی آدم)
آیت بجائے خود ایک درس توحید کامل کا ہے، ملک، ولایت، نصرت سب اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔

۳۸۴؎ (ازراہِ عناد و اعتراض) مخاطب یہاں غالباً یہود ہیں۔

نزلت فی الیھود (معالم)

اور اور قول بھی نقل ہوئے ہیں، لیکن ترجیح اسی قول کو ہے۔

اختلفوا فی المخاطب بہ علی وجوہ احدھا انھم المسلمون والقول الثانی انہ خطاب لاھل مکۃ والقول الثالث المراد الیھود وھذا القول اصح (کبیر) ورجح انھم الیھود (بحر)

رَسُوْلَكُمْ سے مراد اس صورت میں رسولِ وقت سے ہوگی۔ تمہارے زمانہ کے رسول سے، لیکن مسلمان ہی اگر مخاطب سمجھے جائیں جب بھی یہ تہدید اجائز ہوگا۔

اَمْ بعض اہل نحو نے اسے ہمزہ کا مرادف اور سوالیہ یا استفہامیہ مانا ہے۔

قال بعض البصریین ھی بمعنی الاستفھام (ابن جریر)

لیکن اکثر نے اسے منقطعہ قرار دیا ہے اور بَلْ کے معنی میں لیا ہے۔

اَمْ اذا جرد عن الف الاستفھام فمعناہ بل (راغب) ام ای بل (جلالین) ام منقطعۃ التقدیر بل تریدون (مدارک) ام ھھنا منقطعۃ والتقدیر بل تریدون (عکبری) فیھا الاضراب والانتقال عن حملھم علی العمل بموجب علمھم (ابو سعود)

۳۸۵؎ سوال اگر کسی مسئلہ کی سنجیدہ تحقیق و دریافت کے لئے ہوں تو باعثِ رحمت ہیں لیکن جب عناد اور نفسانیت اور شرارت سے ہوں اور اعتراض محض اعتراض کی غرض سے ہوں تو وہی سوالات ایک لعنت بن جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے جیسے جیسے گستاخانہ سوالات اور بیہودہ فرمائشوں کی بھرمار بنی اسرائیل کرتے رہے ان کے تذکرہ سے تاریخ اسرائیل اور خود بائبل کے صفحات لبریز ہیں۔ قرآن کا اس کو اتنی کھلی ہوئی تلمیح کے طور پر لے آنا بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ قرآن بھیجنے والا اس سے خوب واقف تھا اور یہ کلام عرب کے ایک اَن پڑھ انسان کی تصنیف ہو نہیں سکتا

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا

بہت سے اہل کتاب تو دل ہی سے چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان (لے آنے) کے بعد پھر سے کافر بنا لیں ۳۸۸ حسد کی

مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا

راہ سے جو ان کے نفسوں میں ہے ۳۸۸ (اور یہ بھی) بعد اس کے کہ ان پر حق واضح ہو چکا ۳۸۹ سو معاف

وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

کرتے رہو اور درگزر کرتے رہو ۳۹۰ تا آنکہ اللہ اپنا حکم بھیج دے ۳۹۱ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۹۲

۳۸۶ (جس کی ایک شکل یہی رسول سے معاندانہ اور گستاخانہ سوال و جواب ہے)
يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایمان کے بدلہ اور مقابلہ میں راہِ کفر کو اختیار کیا۔
ای یختار الکفر و یاخذہ لنفسہ (ابو سعود) بالایمان ای بمقابلتہ بدلا منہ (ابو سعود)
سیاق میں ذکر یہود کا ہے اس لئے انھیں کے ایک نبی کے صحیفہ کا اقتباس بے محل نہ ہوگا:۔
"سنو اے آسمانو اور کان لگا اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا پوسا پھر انھوں نے مجھ سے سرکشی کی بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے صاحب کی چرنی کو۔ بنی اسرائیل نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے، آہ خطاکار گروہ، ایک قوم جو گناہ سے لدی ہوئی ہے بدکاروں کی نسل خراب اولاد کہ انھوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے خدا ہی کو حقیر جانا، اس سے بالکل پھر گئے۔" (یسعیاہ۔ ۱: ۲، ۴)

۳۸۷ (اے ایمان والو)
شانِ نزول کے ایک مخصوص واقعہ کی بنا پر عموماً مفسرین نے یہاں اہل کتاب سے مراد یہود یا احبارِ یہود کو لیا ہے لیکن لفظ قرآنی عام ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس کے عموم میں یکساں داخل ہیں۔ مسیحیوں کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم اور علماء یہود کی طرف سے نسبۃً ہلکا اور مخفی پروپیگنڈا اعتقاداً اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی، جغرافی، تحریروں کے ذریعہ سے اسلامی آبادیوں کے درمیان جاری رہتا ہے وہ سب اسی حقیقت کے مظاہر ہیں۔ غایت ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کی یہی رہتی ہے کہ مسلمان اگر یہودیت و مسیحیت کو نہ بھی قبول کریں جب بھی کم سے کم اپنے دین کی طرف سے تو ضرور بدگمان و برگشتہ ہو کر رہیں۔ پرانے مفسروں نے بھی کہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ایک زبردست انتباہ کافروں کی مسلم دشمنی سے متعلق ہے۔
یحذر تعالی عبادہ المومنین عن سلوک طریق الکفار من اھل الکتب و یعلمھم بعداوتھم لھم فی الباطن والظاھر (ابن کثیر)

۳۸۸ یعنی یہ کوششیں اور سرگرمیاں بھی اخلاص و خیرخواہی کی راہ سے نہیں، رشک و حسد سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہود کا حسد تو خود اپنے پیغمبر و ہادی تک سے رہا ہے اور اس پر خود عہد عتیق ناطق ہے:۔
"انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ کے اور خداوند کے مقدس مرد ہارون پر حسد کیا۔" (زبور ۔ ۱۰۶: ۱۶)
اور عہد جدید کی شہادتیں بھی حسد کے باب میں کچھ کم واضح و صریح نہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو ۳۹۳ اور جو کچھ بھلائی تم اپنے واسطے آگے بھیج دو گے اسے

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ

اللہ کے پاس پا لو گے ۳۹۴ یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے ۳۹۵ اور یہ کہتے ہیں کہ

يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ

جنت میں کوئی ہرگز نہ داخل ہوگا مگر ہاں وہی جو یہودی یا نصرانی ہو ۳۹۶ یہ ان کی (نری) آرزوئیں ہیں ۳۹۷

"یہودیوں نے حسد میں آکر بازاری آدمیوں میں سے کئی بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لیا اور بھیڑ لگا کر شہر میں فساد کرنے لگے" (اعمال ۔ ۱۷: ۵) "یہودی اتنی بھیڑ دیکھ کر حسد میں بھر گئے" (اعمال ۱۳: ۵۱)

۳۸۹ یعنی اہلِ کتاب کے اس انکار و مخالفت کی بنیاد کوئی اشتباہ یا مغالطۂ عقلی نہیں، مخصوص ضد اور عناد اور استکبار ہے، وضوحِ حق ان پر پوری طرح ہو چکا ہے۔

۳۹۰ (سردست اے مسلمانو ان سے کسی طرح کا انتقام نہ لو)
یہود کی مفویانہ کوششوں پر مسلمانوں کا اشتعال ایک امر طبعی تھا، ان کو ہدایت ہو رہی ہے کہ سردست عفو و درگزر ہی سے کام لیتے رہو اور انتقامی تعزیری کارروائیاں فوراً نہ شروع کر بیٹھو۔
سورۃ اور آیت مدنی ہے، مکی زندگی مدت ہوئی ختم ہو چکی ہے اور رسول اور سب صحابی رفعِ شر کے لئے وطن سے بے وطن ہو کر اب مدینہ آچکے ہیں، حکمِ قتال بیان آتے ہی فوراً نازل نہیں ہو جاتا، صبر کے ساتھ انتظار کرنے کی ہدایت یہاں بھی خاصی مدت تک ملتی رہتی ہے۔

۳۹۱ (جہاد و قتال کے لئے)
اکثر صحابہ و تابعین سے حکم کی تفسیر حکم جہاد و قتال کے ساتھ منقول ہے۔
انه الأمر بالقتال وهو قول اكثر الصحابة (كبير) الذى هو الاذن فى قتالهم (بيضاوى) المراد به الأمر بالقتال (روح)
حکمِ قتال اس وقت تک نہیں نازل ہوا تھا، آیت سے صاف اشارہ اس طرف نکل آیا کہ آئندہ ہونے والا ہے۔

۳۹۲ (پس ایسے قادر مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ سرکش اور زور آور کافروں سے پورا بدلہ لے لے اور ان کا زور توڑ دے اور مظلوم و مغلوب مسلمانوں کو دیکھتے دیکھتے مظفر و منصور، حاکم و غالب بنا دے۔)

۳۹۳ (اس درمیان میں اے مسلمانو!)
مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جہاد کے احکام دوسرے ہیں، جب تک وہ نافذ نہ ہوں، ان کے انتظار میں عام احکامِ اسلامی کی پابندی میں غفلت و تساہل کو راہ نہ دو، یہ مالی اور بدنی عبادتیں تو ہر حال و صورت میں واجب العمل ہیں۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١١١﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ

آپ کہہ دیجئے کہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو ۳۹۸ ہاں البتہ ۳۹۹ جو کوئی (بھی)

وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠

اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو ۴۰۰ تو ایسے کے لئے اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے

۳۹۴ نیکی کچھ جہاد و قتال ہی پر موقوف نہیں، اعمالِ صالحہ جو کچھ بھی میسر آجائیں سب یکساں قبولیت رکھتے ہیں، برابر انھیں بجا لگے رہو۔

لِاَنْفُسِكُمْ۔ حذفِ مضاف ہے یعنی اپنے نفع، اپنی نجات و مغفرت کے واسطے۔

وھو علی حذف مضاف ای لنجاۃ أنفسکم (بحر)

تَجِدُوْهُ۔ اسے پاؤگے یعنی اس کے اجر و ثواب کو پاؤگے۔

تجدوہ ای ثوابہ (بیضاوی) المراد وجدان ثوابہ وجزائہ (کبیر)۔

۳۹۵ (سو اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی نیکی ضائع ہو جائے گی، اجر ہر نیکی کا پورا پورا ملے گا۔)

ان آیتوں میں تردید ہے اس گروہ کی جو دین کو جہاد و قتال کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے جب حالات تکوینی ایسے پیش آجائیں کہ جہاد و قتال ممکن العمل نہ رہے تو باقی احکامِ اسلام کی تعمیل پر بھی پورا ہی اجر دینے والا اللہ ہے۔

بَصِيْرٌ۔ پر حاشیہ پہلے گزر چکا۔

۳۹۶ یہ کہنے والے یہود و نصاریٰ تھے، قرآن مجید نے انھیں کی ترجمانی کی ہے، یہود کا یہ عقیدہ شروع سے چلا آرہا ہے کہ نجات انھیں کی قوم اور وابستگانِ قوم کے ساتھ مخصوص ہے، چنانچہ انجیل یوحنا میں بھی ان کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ:

"نجات یہود میں ہے" (یوحنا۔ ۴ : ۲۲)

یہود و نصاریٰ دونوں کے ہاں کے مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی، ظہورِ اسلام کے وقت یہود و نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ اس نئے دین کے قبول کرنے کی ضرورت کیا، نجات تو ہمارے دینوں کے ساتھ وابستہ ہے

۳۹۷ (جو کبھی پوری ہونے والی نہیں اور جن کی تائید میں نہ کوئی دلیل معقول ہے اور نہ سند منقول)

محض بزرگ زادگی اور نسلی و نسبی شرافت جب پیغمبروں کی اولاد کے کام نہ آسکی تو ہمارے زمانہ کے پیرزادوں اور شاہ زادوں کا اپنے شرفِ نسلی پر قناعت کئے رہنا کس درجہ بے عقلی ہے۔

اُمْنِيَّةٌ واحد ہے امانی کا، منی سے مشتق۔ اضحوکہ۔ اعجوبہ کے وزن پر۔

۳۹۸ (اپنے اس دعویٰ میں کہ نجات یہودیت یا نصرانیت کے ساتھ وابستہ ہے)

پیغمبر علیہ السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ اہل کتاب سے کہئے کہ خالی زبانی دعووں اور خالی آرزوؤں سے کیا ہوتا ہے اگر حقانیت کے مدعی ہو تو اپنی تائید میں کوئی دلیل عقلی یا نقلی لاؤ۔

اہل اللہ نے آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ دعوے نفی کا ہو یا اثبات کا مدعی کے ذمہ بہر صورت برہان کا پیش کرنا ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ

اور ایسوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے ۴۰۱ اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی

النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ

بنیاد پر نہیں ۴۰۲ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں ۴۰۳ درانحالیکہ

وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ

وہ سب (ایک ہی) کتاب (آسمانی) پڑھتے ہیں ۴۰۴ اسی طرح وہ لوگ بھی کہنے لگے انھیں کا سا قول جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے

وفی الآیۃ دلیل علی ان المدعی سواء ادعی نفیا او اثباتا لا بد لہ من الدلیل والبرھان وذلک من اصدق شیء وادلہ علی بطلان القول بالتقلید (کبیر)

۳۹۹ یعنی نجات کا صحیح قانون یہ ہے جو آپ بیان ہو رہا ہے۔
بَلٰی۔ اپنے ماسبق کی نفی و تردید کے لئے ہے یعنی تمہارا دعویٰ غلط محض ہے صحیح قاعدہ یہ ہے جو آگے آرہا ہے۔

۴۰۰ (اپنے اس ایمان و اعتقاد میں)
یعنی اس کا عمل بھی اس کے عقیدۂ توحید کے مطابق ہو گویا ایمان و حسنِ عمل دونوں جمع ہوں۔
وجہ کے لفظی معنی چہرہ کے ہیں لیکن محاورۂ عرب میں اکثر مراد ذات یا عین شے سے ہوتی ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔

ربما عبر عن الذات بالوجہ (راغب) والوجہ اما مستعار للذات واما عبر بہ عن القصد (روح) وخص الوجہ بالذکر لکونہ اشرف ما یری من الانسان ولانہ موضع الحواس وفیہ یظہر العز والذل والعرب تخبر بالوجہ عن جملۃ الشیء (قرطبی)

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی توحید کا پوری طرح قائل ہو جائے بلا آمیزش شرک۔

ای اخلص نفسہ لا یشرک بہ غیرہ (کشاف) لم یقصد سواہ (روح) ومعنی اسلم استسلم وخضع وقیل اخلص عملہ (قرطبی)

۴۰۱ خوف و اندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن و غم ماضی کے واقعات پر ہوتا ہے ذکر قیامت کا ہے کہ اس روز اہل ایمان نہ اپنے ماضی پر حسرت و تأسف کریں گے نہ آئندہ کے لئے دہشت زدہ ہوں گے یہ پورا فقرہ اور اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے۔

۴۰۲ یعنی ان کا دین تمام تر باطل ہے یہودی قوم عقیدۂ بہرحال موحد تھی نصرانیت کا شرک اور الوہیت کی تثلیث وہ برداشت ہی نہ کر سکتی تھی اور نہ اس کی قائل ہو سکتی تھی کہ ایسے گڑھے ہوئے دین میں کچھ بھی صداقت ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۴۰۳ یعنی ان کا دین تمام تر باطل ہے شریعت موسوی سے متعلق موجودہ انجیلوں میں تذکرہ الفاظ ذیل میں ہے:
"آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے راستباز ٹھہرتا ہے" (گلتیوں ۲:۱۶)

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ

سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس باب میں فیصلہ کر دے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں ۴۰۶ اور اس سے

اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ

بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے ۴۰۷ اور ان کی بربادی کی کوشش کرے

شریعت کے اعمال سے کوئی بشر راست باز نہ ٹھہرے گا۔" (ایضاً ۲: ۱۶) "راست بازی اگر شریعت کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا۔" (ایضاً ۲: ۲۱) ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

اصطلاح انجیل میں مطلق شریعت (LAW) سے مراد شریعتِ موسوی آیا ہوتی ہے۔

۴۰۴ اَلْكِتٰبَ۔ یعنی مجموعۂ صحائف انبیاء بنی اسرائیل۔ اسی کو آج عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں، یہود و مسیحی دونوں ان صحیفوں کے الہامی و مقدس ہونے کے قائل ہیں۔

وَهُمْ میں وَ حالیہ ہے عطف کے لئے نہیں۔

الواو للحال۔ (کشاف)

افسوس ہے کہ انھیں گمراہ قوموں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی باوجود اپنی مشترک کتاب کے آپس کے گروہ در گروہ ہو کر ایک دوسرے کی تحقیر بلکہ تفسیق و تضلیل شروع کر دی اور نوبت تکفیر کی آ جاتی ہے حدیث کہ شافعیہ حنفیہ کو ذلیل سمجھنے لگے اور اشعریہ ماتریدیہ کے نزدیک حقیر ہو گئے، ہدایت ان کے اپنے اپنے مختصر حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی!

۴۰۵ (وحی اور نبوت کا)

وہ کہنے لگے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی حق پر نہیں۔

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ علم سے آیت میں مراد کتاب آسمانی کا علم ہے، یہ کہنے والے کون تھے عموماً ان سے مراد مشرکین عرب لئے گئے ہیں اور ہر ایسے مذہب کے پیرو جس کی بنیاد کسی کتاب آسمانی پر نہ ہو یعنی ہر دین جاہلی کے پیرو اس کے تحت میں آ جاتے ہیں۔

قال بعضهم عنى بذلك مشركى العرب لانهم لم يكونوا اهل كتب فنفى عنهم من اجل ذلك العلم (ابن جرير)

اى الذين لا علم عندهم ولا كتاب كعبدة الاصنام والمعطلة ونحوهم (كشاف۔ مدارك) وهم مشركوا العرب فى قول الجمهور (روح)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ کے مفہوم کو عموم ہی پر رکھنا بہتر ہوگا جس کے تحت میں سب ہی اہل باطل آ جاتے ہیں۔

واختار ابو جعفر ابن جرير انها عامة تصلح للجميع وليس لهم دليل قاطع يعين واحدا من هذه الاقوال والحمل على الجميع اولى (ابن كثير)

قرآن مجید نے علم اور اس کے مختلف صیغوں یعلمون وغیرہ کو جہاں جہاں استعمال کیا ہے عموماً علم حقیقی علم وحی و نبوت ہی کے معنی میں کیا ہے، ان آیتوں سے آج کے رواجی "علوم و فنون" اور اسکولوں کالجوں یونیورسٹیوں کی تعلیم پر استدلال کرنا کس قدر ظلم قرآن مجید اور فہم سلیم دونوں پر ہے!

مِثْلَ قَوْلِهِمْ یعنی یہود و نصاریٰ جس طرح ایک دوسرے کو باطل قرار دیتے تھے اسی طرح اہل عرب رسول اسلام (علیہ السلام) کو باطل پر کہنے لگے۔

وقال السدی فھم العرب قالوا لیس محمد علی شیٔ (ابن کثیر۔ ابن جریر) قال مقاتل یعنی مشرکی العرب کذلک قالوا فی نبیھم محمد واصحابہ انھم لیسوا علی شیٔ من الدین (معالم)

۴۰۲ فیصلہ سے عملی حسی فیصلہ مراد ہے، ورنہ جہاں تک دلائل و شواہد کا تعلق ہے، حق و باطل کفر و ایمان کے درمیان یقینی فیصلہ تو اس دنیا میں بھی موجود ہے۔

بَیْنَھُمْ سے مراد ایک فریق اہلِ حق و ایمان کا، اور دوسرا گروہ اہل باطل و کفر کا۔

یعنی بین المحق والمبطل (معالم) یحکم بین المحق والمبطل (کبیر)

۴۰۳ (جیسا کہ مشرکینِ مکہ نے عین حرم کعبہ میں ذکر عبادت الٰہی سے مسلمانوں کو روک دیا تھا، خصوصاً واقعہ حدیبیہ میں)

ھؤلاء المشرکون حین حالوا بین رسول اللہ صلعم یوم الحدیبیۃ وبین ان یدخل مکۃ (ابن جریر عن ابن زید)

حیرت ہے کہ بعض مفسرین یہاں بے احتیاطی سے برابر یہ روایت نقل کرتے گئے ہیں کہ یہاں اشارہ مسیحیوں کی جانب ہے جنھوں نے بخت نصر کلدانی کے حملۂ بیت المقدس کے وقت اس کی مدد کر کے بیت المقدس قبلۂ یہود کی بربادی میں شرکت کی تھی، حالانکہ بخت نصر کا زمانہ ولادتِ مسیحؑ سے کئی صدی قبل کا تھا، اس وقت مسیحیوں کا وجود ہی کیسے ہو سکتا تھا، خوشی کی بات ہے کہ اس روایت کی پوری تردید خود ہی ایک قدیم مفسر جصاص رازی نے کر دی ہے جو فقہ میں تبحر کے ساتھ تاریخ پر بھی پوری نظر رکھتے تھے، اور امام رازی نے بھی تفسیر کبیر میں اُسے دُہرایا ہے۔

لاخلاف بین اھل العلم باخبار الاولین ان عھد بخت نصر کان قبل مولد المسیح علیہ السلام بدھر طویل والنصاریٰ انما کانوا بعد المسیح (احکام القرآن)

بخت نصر کلدانی یا بابلی کی بربادی بیت المقدس کی تاریخ ۵۸۶ ق۔م ہے۔

بعض نے مراد بیت المقدس سے لی کہ وہاں ٹائیٹس (طیطاؤس) رومی کے عہد میں رومی مشرکین نے یہود اہل توحید کو ذکر الٰہی سے روک دیا تھا، بہرحال حکم عام ہے، قریبی سببِ نزول جو کچھ بھی رہا ہو، حکم کو کسی خاص مسجد یا خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔

انہ کل مسجد وھو الصحیح لان اللفظ عام ارد بصیغۃ الجمع فتخصیصہ ببعض المساجد او فی بعض الأزمنۃ محال (ابن العربی)

مَسٰجِدَ اللّٰہِ مسجد کے لفظی معنی جائے سجدہ کے ہیں، مراد اس سے مسلمانوں کی عبادت گاہ ہوتی ہے، مسجد کے حسن و تاثر، کشش و دل آویزی، صفائی و سادگی کی شہادت غیر مسلموں کی زبان سے بھی منقول ہے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

اَظْلَمُ یعنی ظالم تر، خبیث تر، مجرم تر۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ منع ذکر و داخلۂ مسجد اگر کسی ضرورتِ دینی، و مصلحتِ شرعی سے ہو تو بالکل درست ہے کہ ایسے موقع پر یہ امور مسجد کی بربادی و ویرانی میں نہیں، عین اصلاح و آبادی میں داخل ہیں، مسائل ذیل بھی فقہاء نے آیت کے تحت درج کیے ہیں:

۱۔ مسجد میں اذنِ عام ہونا شرط ہے۔

أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي

وہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ہاں یہ کہ ڈرتے ہوئے ف۴۲۰ اُن کے لئے

الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾

دنیا میں (بھی بڑی) رُسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے ف۴۲۱

۲۔ مسجد کا دروازہ کسی مملوک زمین پر نہ ہو۔

بعض عارفوں نے لکھا ہے کہ جب اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی عمارت میں ذکرِ حق روک دینے والوں کے حق میں قرآن نے یہ وعید اور پھٹکار رکھی ہے تو اس قوم یا شخص کے جرم کی اہمیت یا عظمت کا کیا ٹھکانا ہے جو قلوبِ انسانی کو کہ وہ معنوی مسجد گاہِ حق ہیں ذکرِ حق سے روکے۔ اسلامی تعلیم کی روک تھام میں سعی کرنا، اشاعتِ مذہب کے حق میں روڑے اٹکانا، سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

ف۴۱۹ فقہاء نے کہا ہے کہ جس طرح اللہ کے ذکر سے مسجد آباد ہوتی ہے ممنوعات و بدعات کے ارتکاب سے مسجد کی بربادی بھی ہو جائے گی نیز وہ تمام امور جو نمازیوں کی کمی اور مسجد کی ویرانی کا باعث ہوں، آیت کے تحت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ف۴۲۰ (مسلمانوں کے رعب و دبدبے سے)

یعنی داخلہ کی اجازت غیر مسلم کو صرف اس حال میں دی جا سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا محکوم ہو اور اس کا داخلہ سرکشانہ نہیں مطیعانہ ہو۔ قرآن مجید میں لفظ مساجد بہ صیغۂ جمع ہے لیکن ایک قول ہے کہ مساجد سے یہاں مراد مسجد حرام یا حرمِ کعبہ ہی ہے۔

المراد بالمساجد المسجد الحرام۔ (معالم عن ابن زید)

اور اس شبہ کا کہ لفظ جمع سے مراد واحد کیوں کر ہوگی، جواب یہ دیا گیا ہے کہ محاورۂ زبان میں یہ جائز ہے، مثلاً اگر کوئی شخص ایک ہی مردِ نیک کو ایذا پہنچائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ نیکوں کا ستانے والا بڑا ظالم ہے۔

کما تقول لمن آذی صالحا واحدا ومن اظلم ممن آذی الصالحین۔ (کشاف)

ایک قول یہ بھی ہے کہ آیت سارے کافروں کے حق میں ہے کہ عبادت کے روکنے والے تو سارے ہی کافر ہیں اور مساجد سے مراد کل روئے زمین ہے چنانچہ کافروں کو دار الاسلام میں داخلہ کا کوئی حق نہیں بجز اس کے کہ مسلمانوں ہی کی شرائط پر ہو اور یہ قول امام ابو حنیفہ کی جانب منسوب ہے مراد اگر مسجد حرام لی جائے تو قانونی و تشریعی حیثیت سے قطع نظر، واقعاتی رنگ میں بات بالکل صحیح نظر آئے گی، چنانچہ مسجد حرام اس وقت سے آج تک بحمد اللہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں چلی آرہی ہے۔

مَسَاجِدَ اللّٰهِ کی ترکیب سے فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ جو جگہ عبادت کے لئے مخصوص کر دی جائے اور اس کے لئے اذنِ عام دے دیا جائے وہ شخصی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے البتہ اگر کسی نے اپنے گھر کا کوئی حصہ عبادت کے لئے مخصوص کر لیا اور اس کے لئے اذنِ عام نہیں رکھا تو اس پر مسجد کا اطلاق ہی نہ ہوگا، اور وہ اس شخص کی ذاتی ملک باقی رہے گی (ابن العربی)

ف۴۲۱ عذابِ آخرت کا تجربہ تو آخرت ہی میں ہوگا، باقی دنیا میں ان لوگوں کی ذلت و رسوائی کا مشاہدہ تو چند روز میں سب کو ہو گیا۔ یہود، مشرکین، منافقین، سارے اعدائے اسلام، جزیرۂ عرب میں اور اس کی سرحدوں میں دیکھتے دیکھتے نیست و نابود ہو گئے ہیں اور قرآن مجید کی پیش گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی) ۴۱۱؎ سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو ۴۱۲؎ ادھر ہی اللہ کی ذات ہے ۴۱۳؎

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ

بیشک اللہ بڑا وسعت والا ہے ۴۱۴؎ بڑا علم والا ہے ۴۱۵؎ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے ۴۱۶؎ کیسا پاک ہے وہ! ۴۱۷؎

۴۱۱؎ (بہ حیثیت مخلوق و بہ حیثیت مملوک بھی)

یعنی انھما لہ ملکا و خلقا (ابن جریر)

لِلّٰہِ میں لام اختصاص کا ہے۔ نحو میں لام جارہ کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک لام اختصاص بھی ہے۔ یعنی مشرق و مغرب سب اسی کے ہیں۔

(اللام لام الاختصاص ای ھو خالقھما و مالکھما (کبیر)

اُمّتِ محمدی جواب ساری دنیا کے لئے اُمتِ عادلہ بنا کر بھیجی جا رہی تھی لازمی تھا کہ اس کی مرکزیت و یکجہتی کے لئے ایک قبلہ بھی ہو اور وہ قبلہ اب خانۂ کعبہ مقرر ہو رہا تھا۔ اہل کتاب نے اس پر اعتراضات شروع کئے۔ یہ نقل اعتراض و جواب اعتراض کی تمہید ہے۔ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ دونوں سمتیں اور انھیں ذُوپر کیا موقوف ہے، ہر سمت اور ہر جہت اللہ تعالیٰ کے لئے یکساں ہے، وہ سب کا یکساں خالق ہے، حاکم ہے، مالک ہے کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدیس کوئی شائبۂ الوہیت، کوئی شان حق تعالیٰ موجود نہیں۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے بات سرسری نہیں بہت گہری ہے۔ مذاہب جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں، جہالتوں، توہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ایک مشترک گمراہی مشرک قوموں میں یہ رہی ہے کہ خدا چونکہ متشکل ہے اور مجسّم ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی متعین سمت یا جہت میں ہو اور اس تعیّن کی بنا پر خود وہ سمت یا جہت مقدّس ہے۔ مصری، ہندی، رومی، تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کر کے اسی جہت کو مقدس مانا ہے اور چونکہ سورج دیوتا کا مرتبہ مذاہب مشرکہ میں عموماً اہم و مقدم رہا ہے شاہ خاور کے طفیل میں یہ سمت مشرق ہی عموماً مقدس سمجھی گئی اور دنیا کے اکثر علاقوں میں پہنچی رہی۔ مسلمان جس کی آنکھیں ہی توحید کے آغوش میں کھلی ہیں، اس کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ سمت و جہت جیسی خیالی چیز بھی قوموں کی معبود ہو سکتی ہے۔ مشرکوں ہی کے اثر سے یہ سمت پرستی کا شرک اہل کتاب میں سرایت کر گیا اور مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج و شائع رومی مذہب ہی کا مثنیٰ یا پرتو ہے اس لئے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ یہود جنھیں اپنی توحید پر ناز تھا، وہ بھی تمام تر محفوظ نہ رہ سکے، بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح اس صف میں آ گئے۔ بعض قوموں نے مشرق کے جواب میں مغرب کی تقدیس کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مشرق اگر منطقۂ حیات کی بنا پر مقدس ہے تو مغرب بھی منطقۂ موت و دیار ہلاکت ہے، شاہ خاور طلوع اگر ادھر سے ہوتا ہے تو روزانہ غروب و رفنا تو ادھر ہی ہوتا ہے پھر اس کے تقدس کا بھی کیوں نہ قائل ہوا جائے، چنانچہ یہ دونوں سمتیں خوب پجتی رہیں، مشرق زیادہ اور مغرب اس سے کچھ کم، اصل انگریزی حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی، دنیا کی دنیا اس سمت پرستی کے شرک اس مشرق پرستی اور مغرب پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھی کہ توحید قرآنی نے اعلان کیا

کے عقائد کو چیلنج کر کے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب لگا کے ایک عالم کو چونکا دیا، قدیم مذاہب یہ آواز سن کر بھونچکے سے رہ گئے۔

۴۱۲ (دعا کے لئے، نماز کے لئے، یا کسی عبادت کی بھی غرض سے اے مسلمانو!)
خطاب اس امت سے ہو رہا ہے جس کا کام ہی دنیا میں خدائے واحد کی پرستاری تھی اور شرک و ہر شائبۂ شرک سے بیزاری۔
اَیْنَمَا کے معنی حَیْثُمَا بھی کئے گئے ہیں۔

عن مجاھد قال حیثما کنتم (ابن جریر)

۴۱۳ یعنی وہ خدائے واحد جو ہر مکان، ہر ظرف کی قید سے پاک، ہر سمت و جہت سے منزہ ہے اس کی ذات پاک کی تجلیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں، جدھر بھی رخ کرو گے جلوہ اسی کا پاؤ گے اس کی تجلیات کو کسی خاص جہت کے ساتھ محدود و مخصوص کر لینا عین جہل ہے۔
وَجْهُ۔ لفظی معنی چہرہ کے ہیں، ثانوی معنی ذات یا وجود کے ہیں، وجہ اللہ کی ترکیب جب آئے گی مراد اللہ کا چہرہ نہیں ذات یا وجود ہی سے ہو گی اور وہی یہاں بھی مراد ہے۔

وربما عبر عن الذات بالوجه (راغب) فثم ذاته (بیضاوی) قیل الوجه بمعنی الذات جعل ھنا کنایة عن علمه واطلاعه بما یفعل ھنالك (روح) قال الحذاق ذلك راجع الی الوجود والعبارة عنه بالوجه من مجاز الکلام ... وقال ابن فورك قد تذکر صفة الشیء والمراد به الموصوف توسعا ... کذلك اذا ذکر الوجه ھنا والمراد من له الوجه ای الوجود (قرطبی)

آیت میں پوری تردید آ گئی عقیدۂ تجسیم کی جس کے لئے انگریزی میں ایک لمبا سا نام ANTHROPOMORPHISM ہمارے اماموں نے بھی آیت کو اسی معنی میں لیا ہے۔

الآیة من اقوی الدلائل علی نفی التجسیم واثبات التنزیه (کبیر) ھذا یدل علی نفی الجھة والمکان عنه تعالی لاستحالة ذلك علیه (ابن العربی)

مسیحیوں کے ہاں آج تک ایک مذہبی اصطلاح (ORIENTATION) مشرق روئی کی چلی آ رہی ہے اور گرجے شرق رویہ ہی بنائے جاتے ہیں، آیت سے اس کی بھی تردید ہو رہی ہے۔
فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ ہم بھی اسی طرح کائنات میں جس چیز پر نظر ڈالتے ہیں انوار حق ہی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

۴۱۴ وہ تو خود ہی بے پایاں وسعتوں والا ہے، بڑی سے بڑی وسعت خود اس کے اندر شامل، اسے بھلا کون اپنے اندر لے سکتا ہے؟ اس کی سمائی کس بڑے سے بڑے ظرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہر سمت اور ہر جہت تو خود ہی اس کی مخلوق ہے، مملوک ہے، وہ لامحدود بھلا کسی محدود سمت و جہت میں گھر سکتا ہے؟

واسع باحاطته بالاشیاء (بیضاوی)

یہاں پہنچ کر صوفی منش ناظرین حضرت رومی کی مثنوی کے یہ شعر بھی مستحضر کر سکتے ہیں:۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است | من نہ گنجم ہیچ در بالا و پست
در زمین و آسمان و عرش نیز | من نمی گنجم یقیں داں اے عزیز

۴۱۵ وہ اپنے اس علم کامل اور حکمت بالغہ کے لحاظ سے جو قبلہ چاہے مقرر کر دے اس کی مصلحتوں اور حکمتوں کا احاطہ کون

بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اصل یہ ہے کہ اسی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ۴۱۸ سب اسی کے حکم بردار ہیں ۴۱۹

کر سکتا ہے؟ وہ وحدتِ امت کے لئے تعیینِ قبلہ جب کرے گا مناسب ہی کرے گا اس میں کسی جہت کی ذاتی تقدیسیت کو اصلاً کوئی دخل نہیں۔

۴۱۶ یہ کہنے والے کون تھے؟ مراد بہت سے اہلِ باطل لئے جا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر اشارہ اس گڑھے ہوئے مذہبِ تثلیث کی جانب ہے جس کا نام ایک پیغمبرِ برحق کی جانب منسوب کر کے مسیحیت رکھ دیا گیا ہے حالانکہ اس کے عقائدِ باطلہ سے (نعوذ باللہ) حضرت مسیح کو کوئی نسبت نہیں۔

اِتَّخَذَ وَلَدًا کا صحیح ترجمہ ہے بنا رکھا ہے ایک بیٹا، بنا رکھا ہے ایک بیٹا، یہاں مسیحیوں کا قول یہ نہیں نقل ہوا ہے کہ خدا کے ایک بیٹا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ اتخاذِ ولد کا صاف مفہوم یہ ہے کہ خدا نے گویا کسی کو متبنّیٰ کر لیا ہے۔ قرآن مجید کی تلمیحات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے قرآن کے صدہا مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی ضرورت ہے کہ نظر اہلِ باطل کے عقائد و خیالات پر ذرا گہری ہو۔ مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ ADOPTIONISTS اتخاذیوں کے نام سے گزرا ہے، ان کے مرکزی عقیدہ کے لئے اصطلاحی لفظ تبنیت یا اتخاذیت (ADOPTIONISM) کا ہے۔ عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقۃً خدا نہیں، وہ خدا پیدا نہیں ہوئے، وہ خدا شروع سے بیٹے بنائے اور خود بخود نہیں ہیں، بلکہ اصلاً اور خلقۃً وہ انسان ہی تھے، البتہ اقنومِ ثالثہ یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع ہی سے ہونے لگا تھا، اس لئے وہ تقدیسیت کے ایسے اوجِ کمال پر پہنچ گئے اور روحِ الٰہی ان کے اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنومِ اول یعنی خدائے بزرگ و اعظم نے انھیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنّیٰ بنا کر شریکِ الوہیت کر لیا، اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفاتِ الٰہی میں شریک و سہیم ہیں۔ اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۱۸۵ء میں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے۔ ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اس شاخ کی جانب ہے، بڑے سے بڑا محقق مفسر بھی بہرحال بندۂ بشری ہوتا ہے، کسی کی نظر سے کوئی پہلو رہ جاتا ہے کسی کی نظر سے کوئی۔ مسیحیت کے سلسلہ میں یہ خوب یاد رہے کہ مسیحی مذہب میں عقیدۂ ابنیت کوئی ثانوی درجہ یا فرعی حیثیت نہیں رکھتا، مسیحیت کی روح اور جان یہی عقیدہ ہے۔

۴۱۷ (ہر قسم کی بشری رشتہ داریوں سے جو اس کے لئے ہر حال میں پست اور باعثِ توہین ہیں)

کلمۂ سُبْحٰنَ میں اللہ کی پاکی کے اثبات کے ساتھ اس کے برعکس عقیدہ پر اظہارِ حیرت بھی ہے۔

نزّہ تعالیٰ نفسه بکلمة سبحانه التی تفید التنزیه مع التعجب مما ینافیه (المنار)

تنبیہ ہے مسیحیوں کو کہ معاذ اللہ، خدا کو خدا بھی کہے جاتے ہو اور پھر اس کے لئے یہ بشری سطح والی رشتہ داریاں بھی مانے جاتے ہو، الوہیت کے باب میں کتنا گھٹیا تخیل اور کیسا کریہہ نظریہ رکھتے ہو۔

۴۱۸ مخلوق کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ صرف مملوکیت و مخلوقیتِ مطلقہ کا ہے نہ کہ فرزندی و دلبندی وغیرہ خرافات کا۔ توحید کی صاف و سادہ تعلیم یہی ہے کہ حق تعالیٰ ان سارے امتیازات و تعینات سے پاک ہے جو اہلِ شرک نے اس کے گڑھ رکھے ہیں، ضمناً آیت شرک کی دوسری قسموں پر بھی ضرب لگاتی جاتی ہے۔ ہر ہستی اللہ کی مملوک ہے، کوئی ہستی اس کی

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

(وہ) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا ۴۲۰

ملوکیت سے خارج نہیں اور ہر ہستی صرف اللہ ہی کی مملوک ہے، یہ نہیں کہ کچھ ہستیاں اس کی مملوک ہوں اور کچھ کسی اور کی

۴۱۹ (اگر ارادۃً نہیں تو جبلۃً و اضطراراً)

اللہ کی تکوینی محکومی اور فرمانبرداری سے چارہ کسی کو بھی نہیں۔

کُلٌّ یعنی جمیع مخلوق، مومن و کافر، بلند و پست، کبیر و صغیر، زندہ و بے جان۔

قٰنِتُوْنَ سب اسی کے آگے جھکے ہوئے، سب کی تقدیر اسی کی مشیت سے وابستہ۔

ای منقادون لایمتنع شیٔ منھم علی تکوینہ وتقدیرہ ومشیتہ (کشاف) منقادون لایمتنعون عن مشیتہ وتکوینہ (بیضاوی)

قنوت کے بہترین معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اپنے جسم کی شہادت سے اور زبانِ حال سے اللہ کی عبودیت و طاعت کا اقرار کیا جائے

واولی معانی القنوت الطاعۃ والاقرار للہ عزوجل بالعبودیۃ بشہادۃ اجسامھم بما فیھا من آثار الصنعۃ (ابن جریر)

بڑی یا چھوٹی، وحشی یا ترقی یافتہ کس مخلوق کی مجال ہے، جو اللہ کے بنائے ہوئے دن اور اللہ کی بنائی ہوئی رات کے چوبیس گھنٹوں کے علاوہ کوئی گھنٹہ، کوئی منٹ، کوئی لمحہ اپنے لئے پیدا کر سکے؟ بڑے سے بڑے ماہرین سائنس میں سے کسی کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز، ایک فٹ، ایک انچ جگہ اپنے لئے تلاش کر سکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان اور مکان کی جو حدیں مقرر کر دی ہیں، اُن سے قدم باہر نکال سکے؟ کون ایسا ہے جو اس کے خلق کے ہوئے قانونِ حرارت، برودت، رطوبت سے بے نیاز رہ سکے؟ کون ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانونِ کشش اجسام سے بغاوت کر سکے، عدد، وزن، مقدار کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر رکھے ہیں، کس میں اتنی ہمت ہے کہ گنجائش ان سے عدول و انحراف کی پا سکے؟ بڑے سے بڑے موجد، بڑے سے بڑے صناع کا کمال بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے نظامِ تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کر لیا ہے، اور ستبالاباب کے حضور میں وہ دوسروں سے بڑھ کر بندہ قانت ہے۔

کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ اس میں رد آگیا ہر مشرک قوم کا کہ جن جن کو تم ابن اللہ یا دیوی یا دیوتا مانتے ہو وہ اللہ کے شریک و ہیم و ہمسر تو کسی حیثیت سے کیا ہوتے، سب کے سب اس کے محکوم، اس کے مخلوق، اس کے قوانینِ تکوینی کے تابع و مسخر ہیں۔

۴۲۰ (اور اسی طرح ساری مخلوق کا، نیز ان سب سے سابق و مقدم بھی ہے)

بَدِيْعُ۔ یہاں صیغۂ مبالغہ میں فعیل کے وزن پر مُبْدِعٌ کے معنی میں ہے جیسے اَلِيْمٌ مُؤْلِمٌ کے معنی میں اور سَمِيْعٌ مُسْمِعٌ کے معنی میں آتا ہے۔

البدیع یقال للمبدع (راغب) ای مبدعھا وانما ھو مفعل صرف الی فعیل کما صرف المؤلم الی الیم (ابن جریر)

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ

اور جنھیں علم سے بہرہ نہیں ۴۲۲ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا ۴۲۵

اے بروں از وہم وقال وقیل من — خاک بر فرق من و تمثیل من.

مقصود صرف اس قدر ہے کہ اُدھر حق تعالٰی کا ارادہ ہوا اور ادھر شئے اور بلا توسط و توقف اس کا ظہور عملاً ہو گیا۔

وهذا مجاز عن سرعة التكوين والتمثيل اذ لا قول ثم (مدارك) قلنا ان كن ليس بامر حقيقة اذ لا فرق بين ان يقال واذا قضى امرا فانما يكون ته فيكون وبين ان يقال فانما يقول له كن فيكون (معالم) ليس المراد به حقيقة امر وامتثال بل تمثيل حصول ما تعلقت به ارادته بلا مهلة بطاعة المامور المطيع بلا توقف (بيضاوی) المراد من هذه الكلمة سرعة نفاذ قدرة الله فی تكوين الأشياء وانه تعالى يخلق الاشياء لا بفكرة ومعاناة وتجربة (كبير)

لہ یعنی ضمیر اس چیز کی جانب ہے جس کا وجود ابھی خارج میں نہیں ہوا لیکن علم الٰہی میں تو بہرحال موجود ہی ہے، وامرِ الٰہی کے اعتبار سے مامور و موجود میں کوئی فرق ہی زمانی حیثیت سے نہیں ہر مامور کے معنی موجود ہونے کے ہیں، اور ہر موجود کے معنی مامور ہونے کے ہیں۔

امره للشئ بكن لا يتقدم الوجود ولا يتأخر عنه فلا يكون الشئ مامورا بالوجود الا وهو موجود بالامر ولا موجودا الا وهو مامور بالوجود (ابن جرير) المطلق على تعلق الارادة الالهية بوجود الشئ من حيث انه يوجب (بيضاوی) هو بمنزلة الموجود اذ هو عنده معلوم (بحر) المخاطب هو ذلك الشئ الموجود فی علم الله تعالٰى المامور به المشوق فی الوجود الخارجی (گازرونی)

كُنْ فَيَكُوْنُ۔ کان یہاں تامہ ہے ناقصہ نہیں یعنی "ہو جاؤ" وجود میں آجانے کے مرادف ہے فلاں چیز ہو جا یا بن جا کے مرادف نہیں۔

من كان التامة بمعنى احدث فيحدث۔ (بيضاوی)

۴۲۳ یعنی بس وہ شئے فوراً وجود میں آجاتی ہے اس کے ہونے میں نہ کچھ دیر لگتی ہے نہ اس کے لئے کسی اعانت وساطت، شرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

المراد من هذه الكلمة سرعة نفاذ قدرة الله تعالى فی تكوين الاشياء (كبير)

یہی گویا مشرکین ہی سے خطاب ہے کہ تم عمل تخلیق خداوندی کو سمجھے بھی ہو؟ اس میں بجز ارادۂ الٰہی کے کسی چیز کی شرکت کا گزر ہی نہیں اور اس سے تمہارے شرک کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔

۴۲۴ یعنی علم حقیقی سے، علوم آسمانی سے مراد مشرکین ہیں۔

الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ سے یہاں مراد وہی لوگ ہیں جو علم حقیقی سے بے بہرہ ہیں۔

وهم كفار العرب (ابن جرير عن قتادة والربيع) والمراد جهلة المشركين فی روی ذلك عن قتادة والسدی والحسن وجماعة، وعليه اكثر المفسرين (روح) قال ابن عباس والحسن والربيع والسدی نزلت فی كفار العرب (بحر)

أَوْ تَأْتِينَآ ءَايَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ

یا ہمارے پاس کوئی نشان (عظیم) کیوں نہیں آجاتا ۲۲۶ اسی طرح وہ لوگ کہہ چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہیں کا سا کہنا ۲۲۷

تَشَٰبَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿١١٨﴾

ان کے قلوب تشابہ ہو گئے ۲۲۸ ہم نے اپنے نشان تو کھول کھول دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں ۲۲۹

۲۲۵ (براہ راست اور بلا واسطہ انبیاء و رسل)

کما یکلم رسلہ وانبیاءہ (ابن جریر)

لَوْلَا یہاں ھلّا کے معنی میں ہے اور ھلّا کا اردو ترجمہ کیوں نہیں" ہی سے ہو سکتا ہے اور محاورۂ قرآنی میں لولا عموماً اسی معنی میں آتا ہے۔

یعنی ھلا یکلمنا اللہ (ابن جریر) وکل ما فی القران لولا فھو بمعنی ھلّا الّا واحد (معالم)

اور سیوطی نے بھی اتقان (نوع ۴۰) میں یہ قول خلیل نحوی اور مالک سے نقل کیا ہے۔ مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ خدا اگر اپنے فلاں فلاں بندوں سے بہ قول انھیں کے کلام کر سکتا ہے اور کرتا ہے تو آخر ہم سے کیوں نہیں کرتا ہم بھی تو انسان ہی ہیں۔

۲۲۶ (جس سے ہم چار و ناچار ان پیمبر کے دعویٰ کی تصدیق کر ہی دیں)

ایۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں۔ قرآن مجید میں بکثرت معجزہ کے معنی میں آیا ہے اور یہاں بھی یہی مراد ہے اور معجزہ سے مراد وہ واقعہ ہے جو معمول عام سے ہٹا ہوا ہو اور بلا اسباب ظاہری اس کا ظہور تائید رسول کے لئے ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر معنوی دلائل و شواہد تو کثرت سے موجود تھے۔ لیکن مشرکین کی طرف سے ہم فرمائشیں جاری رہیں کہ کوئی عظیم الشان حیرت انگیز حسّی معجزہ دکھایا جائے جس کے بعد گنجائش ہی چون و چرا کی نہ رہے۔ جن لوگوں کی عقلی و روحانی، اخلاقی سطح پست ہے ان کی طرف سے اولیاء ربانی سے فرمائشیں آج بھی اسی قسم کی خارق عادت کرتا کی ہوتی رہتی ہیں۔

ایۃ کی تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے یعنی کوئی عظیم الشان، لرزہ انگیز معجزہ۔

۲۲۷ (اپنے اپنے زمانہ کے پیغمبروں اور داعیان حق سے)

یعنی ان کی یہ فرمائشیں کوئی انوکھی اور ان کا یہ مطالبہ کوئی نرالا نہیں جاہلوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اسی قسم کی فرمائشیں پیش کی ہیں۔ رسالت محمدی سے حضرات انبیاء میں قریب ترین زمانہ حضرت عیسیٰ کا گزرا ہے آپ عرب میں نہیں شام میں تھے۔ آپ سے بھی تعلیمات اور اصل پیام کو چھوڑ کر تقاضے انھیں آسمانی نشانوں کے ہوتے رہتے تھے:

"فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لئے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشان دکھا۔" (متی ۱۶:۱)

یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ کو لا دکھانے کی فرمائش شروع ہو گئی تھی۔

"فلپس نے اس سے کہا کہ اے خداوند ہمیں باپ کو دکھا، بس ہمیں کافی ہے۔" (یوحنا۔ ۱۴:۸)

الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم سے مراد پرانے زمانے کے مشرکین جاہلین ہیں۔

۲۲۸ یعنی اگلوں اور پچھلوں کے قلب بالکل ایک سے ہیں۔ بے بصیرتی اور ناحق شناسی میں۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ

ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر ۴۳۰ اور آپ سے اہل دوزخ کی بابت کچھ بھی

الْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ

پوچھ نہ ہوگی ۴۳۱ اور آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے ۴۳۲ جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں ۴۳۳

انجیل میں یہی مضمون غضب ناکی کے لہجہ میں ہے :۔

"اس زمانے کے بُرے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یونس کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔" (متی۔ ۱۶ : ۴) "اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو، تم ہر وقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو جیسے تمہارے باپ دادا کرتے تھے ویسے ہی تم بھی کرتے ہو۔ نبیوں میں کس کو تم نے نہیں ستایا؟" (اعمال۔ ۷ : ۵۱ و ۵۲)

۴۲۹ مطالبہ ایک نشان (آیۃ بصیغۂ واحد) کا تھا۔ جواب یہ ملا کہ یہاں تو نشان پر نشان (الآیات بصیغۂ جمع) پیش کئے جا چکے ہیں۔ تاریخ اور سیرت میں جن معجزوں کا ذکر آتا ہے ان سے قطع نظر دو معجزے تو بالکل بیّن و نمایاں تھے :۔

۱۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سچائی، امانت، پاکبازی، عقل و فہم کے لحاظ سے بے نظیر ہونا۔ آپ کی سیرت مبارک کے ایک ایک جزو کا بجائے خود معجزہ ہونا۔

۲۔ قرآن مجید کا لفظی، معنوی، ظاہری، باطنی، تعلیمی و ادبی اعتبار سے بے مثل ہونا۔

بَيَّنَّا۔ یعنی یہ نشانات کچھ ان سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، ہم نے انہیں بالکل واضح و آشکارا کر رکھا ہے، ان میں کسی طرح کا خفا نہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا۔ قد کی تاکید نے بیّنّا کی صراحت کو اور زیادہ زوردار بنا دیا، اور اسی کے اظہار کے لئے اردو میں ترجمہ "کھول کھول" لایا گیا ہے۔

لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ۔ یعنی یہ کھلے ہوئے نشان بھی نظر انہیں لوگوں کو آتے ہیں جن کے قلب جہل و عناد کی گندگی اور شک و ارتیاب کی آلودگیوں سے پاک ہیں، شواہد و دلائل مادی قسم کے ہوں یا معنوی، بہرحال ان سے نفع حاصل کرنے کے لئے دیدۂ بصیرت و چشم بینا ضروری ہے۔ آنکھ رکھنے والے کے لئے پیمبر کی کتاب زندگی کی ایک ایک سطر معجزہ ہے۔ عارف رومیؒ نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے

در دل ہر کس کہ از دانش مزہ است   روئے و آواز پیمبر معجزہ است

اما من کان فی ارتیاب او شک او تغافل او جہل فلا ینفع فیہ الآیات ولو کانت فی غایۃ الوضوح (بحر)

یقین۔ شک کی ضد ہے اور علم و تحقیق کے مرادف ہے۔

الیقین ازاحۃ الشک والعلم وتحقیق الامر ونقیضہ الشک۔ (تاج)

لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو یقین کی طلب اور پیاس اپنے اندر رکھتے ہیں

ای طالبون معرفۃ حقائق الاشیاء علی یقین وصحۃ (ابن جریر) ای یطلبون الیقین (بیضاوی)

۴۳۰ (سارے عالم کے لئے اے ہمارے پیغمبر)

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی (بتلائی ہوئی) یہی تو بس راہ ہے ۴۳۲ اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے

الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے ۴۳۳ تو آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار ۴۳۶

بِالْحَقِّ حق کے ساتھ یعنی دین حق کے ساتھ یا راہ حق کا ہادی بنا کر، یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ حقانیت و صداقت کے ساتھ مع اس کی ساری قوتوں اور دلائل کے۔

بَشِيْرًا مومنین مطیعین کے حق میں کہ جو آپ کے پیام کو مان لیں گے ان سے دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کا وعدہ ہے۔

نَذِيْرًا منکرون اور سرکشوں کے حق میں کہ جو آپ کے پیام سے عناد کریں گے۔ ان کی آخرت تو یقیناً اور دنیا اکثر تباہ ہو کر رہے گی اقبال

لطف و قہر او سراپا رحمتے آں بہ یاراں ایں بہ اعدا رحمتے

۴۳۱ (اور اہل دوزخ وہی ہوں گے جو آپ کے پیام کے منکر ہیں) تو مطلب یہ ہوا کہ منکرین کے انجام کی ذمہ داری آپ پر کیا ہے؟ آپ کیوں ان کے لئے اس قدر فکر و تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں؟ آپ کا فرض تو پیام پہنچا دینے پر ختم ہو جاتا ہے آگے کی ذمہ داری آپ پر ذرا بھی نہیں۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ جو کوئی خود اپنی اصلاح نہ چاہے مرشد کو اس کے زیادہ درپے نہ رہنا چاہئے۔

۴۳۲ (خواہ آپ ان کی کتنی ہی رعایت ملحوظ رکھیں اور ان کے ساتھ برتاؤ کتنی ہی غمخواری و دلسوزی کا رکھیں) حکم نصرانیوں سے متعلق ہے جو بہرحال اہل کتاب تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مشترک ایمان سلسلۂ وحی و نبوت پر رکھتے تھے تو جو کھلے ہوئے اہل شرک ہیں اور اسلامی عقائد سے اشتراک کسی درجہ کا بھی نہیں رکھتے ان کی رضا جوئی اور ان سے توقع صلح رکھنے کا جو حکم ہوگا ظاہر ہی ہے۔

۴۳۳ (یعنی اس مذہب کے پیرو جو انہوں نے گڑھ رکھا ہے اور اپنے دین حق سے دست بردار ہو جائیں) مِلَّة کے معنی مذہب اور طریقہ کے ہیں۔

الملّة الشريعة او الدّين (قاموس) قال ابو اسحٰق الملّة السنّة والطريقة (تاج)

دین اور ملت میں فرق یہ ہے کہ دین کا استعمال اللہ اور افراد امت کے سلسلہ میں ہوتا ہے مثلاً دین اللہ یا دین زید اور ملت کا استعمال نبی اور جماعت کے سیاق میں ہوتا ہے مثلاً ملت ابراہیم یا ملت یہود۔ (راغب)

یہودیت و نصرانیت دو مذہبوں کے باوجود ان کے لئے لفظ ملت کے صیغہ واحد لانے سے اکثر فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کفر جس قسم کا بھی ہو بہرحال ایک ہی ملت کے حکم میں ہے۔

وقد استدل كثير من الفقهاء على انّ الكفر كلّه ملّة واحدة (ابن كثير)

اور اسی اصل کی بنا پر اکثر فقہاء نے کہ ان سے مراد شافعیہ و حنفیہ بہرحال ہیں، وراثت کا فرول اور مسلموں کے درمیان جائز نہیں رکھی ہے لیکن کافروں کافروں کے درمیان جائز رکھی ہے خواہ ان کا کفر آپس میں مختلف ہی ہو۔

وھذا مذھب الشافعی وابی حنیفۃ واحمد فی روایۃ عنہ (ابن کثیر)

۴۳۴ (حق وصواب کی نہ کسی اور کی نکالی اور بتلائی ہوئی راہ)
اسی پر عقل ونقل کے دلائل کا اتفاق ہے اور اسی اللہ کی بتلائی ہوئی راہ کا نام طریقِ اسلام ہے۔

۴۳۵ (مسائل دین میں، اور یہ پیروی اب ان کے لئے محال ہے)
لَئِن میں لام قسم کا ہے تاکید و قطعیت کے لئے۔
لام قسم۔ (جلالین)
قرآن ہے خدا کا کلام لیکن ہے بہرحال محاورۂ انسانی ہی میں انسانی کلام میں جہاں جہاں قسم کا موقع آتا ہے قرآن میں بھی اس کی رعایت کی جائے گی۔
اَھْوَآء سے مراد وہ رائیں اور خیالات ہیں جو علم وحقیقت کے بجائے نفسانی خواہشوں پر مبنی ہوں۔
ای آراءھم الزائغۃ (بیضاوی) والھوی رأی یتبع الشھوۃ (بیضاوی)
العلم سے مراد علم وحی ہے ہر طرح پر قطعی ویقینی اور ہر اشتباہ سے بالاتر۔
العلم الوحی (بیضاوی) ای من بعد الذی اقتصصت علیک من نبأھم (ابن جریر) الدین المعلوم صحتہ بالدلائل القاطعۃ (کبیر)
گویا ایک سرے پر العلم ہے حقیقت سے تمام تر لبریز اور دوسرے سرے پر اَھْوَآء ہیں حقیقت سے تمام تر خالی استدلال قرآنی کی منطقی شکل اب یہ ہوئی۔
۱۔ یہود ونصاریٰ کی رضا طلبی کے لئے لازمی ہے کہ آپ ان کا دین اختیار کریں لیکن ان کا دین سرتاسر محرف و باطل ہے اس لئے ان کی رضا طلبی کے لئے لازم ہوا کہ آپ دین محرف وباطل اختیار کریں۔
۲۔ جو رحمت خداوندی سے مالامال اور توفیق الٰہی سے سرفراز ہو اس کے لئے باطل کی پیروی محال ہے آپ رحمت خداوندی سے مالامال اور توفیق الٰہی سے سرفراز ہیں اس لئے آپ کے لئے پیروی باطل محال ہے۔
۳۔ اور جب آپ کے لئے پیروی باطل محال ہے تو ملت یہود ونصاریٰ کی پیروی جو خود ایک شکل زیغ وباطل ہی کی ہے اس کی پیروی بھی آپ کے لئے محال ہے اور اسی لئے ان باطل پرستوں کی حصول رضا کی بھی کوئی شکل آپ کے لئے نہیں آگے جو وعید اتباع باطل پر آئی ہے اور اس کے ساتھ قید بَعْدَ الَّذِی جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ کی لگی ہوئی ہے اس قید سے امام رازیؒ نے استنباط کیا ہے کہ وعید ہمیشہ دلائل صریحہ کے بعد ہی ہوگی اور اس کے حق میں ہوگی جو عمل پر قدرت بھی رکھتا ہو اور یہیں سے تردید اس عقیدہ کی بھی ہوگئی کہ اللہ تکلیف مالایطاق بھی دیتا ہے۔
یدل علی انہ لا یجوز الوعید الابعد نصب الأدلّۃ واذا صح ذلک فبأن لا یجوز الوعید الابعد القدرۃ اولی فبطل بہ قول من یجوز تکلیف مالایطاق۔ (کبیر)

۴۳۶ ولی (یار) اس دنیا میں۔ اور نصیر (مددگار) عالم آخرت میں۔
خوب خیال رہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے یہ بات محض بطور فرض کے کہی گئی ہے اور فرض جب محالات عقلی تک کئے جاسکتے ہیں تو محالات عادی یا ممنوعات شرعی کے فرض کرلینے میں تو اور بھی کوئی اشکال نہیں اور اس طرز

الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اُسے اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے ۴۳۷ وہ لوگ اس پر

بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

ایمان لے آئیں گے ۴۳۸ اور جو کوئی اس سے کفر (اختیار) کرے گا تو یہی لوگ (پورا) نقصان اٹھانے والے ہیں ۴۳۹ اے بنی اسرائیل

اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٢﴾

میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں ۴۴۰ اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ۴۴۱

مخاطب سے مقصود بھی بجائے مسئلہ کی اہمیت پر زور دینا ہے۔ جنکروں کی طرف میلان پر اتنا تشدد جب خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے۔

فیہ تہدید ووعید شدید للأمۃ عن اتباع طرائق الیھود والنصارٰی (ابن کثیر)

اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں خطاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صرف لفظاً ہے ورنہ مراد اُمت ہی ہے اور اصل حکم اسی کو۔

الخطاب مع الرسول والامر لامتہ (ابن کثیر) قیل الخطاب مع النبی والمراد بہ الامۃ (معالم) قیل المقصود بہ امتہ (روح)

امام رازیؒ نے کہا ہے کہ شفاعت کافر کے حق میں نہیں ہو سکتی۔

وعند نا الاشفاعۃ فی الکفر (کبیر)

۴۳۷ یعنی دل سے اس کی تعظیم و احترام کرتے ہیں یا اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں یا اس میں تحریف و تغیر کو راہ نہیں دیتے حق تلاوت ادا کرنے میں یہ سب کچھ آ گیا۔

یتبعونہ حق اتباعہ (ابن عباس) لایحرفون الکلم عن مواضعہ ولایتاولونہ علی غیر الحق (کبیر)

الْكِتٰبَ سے مراد توریت ہے۔

یعنی التوراۃ (ابن عباس) وھو التوراۃ (ابن جریر)

الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

ھم الیھود والنصارٰی وھو قول عبد الرحمٰن بن زید واختارہ ابن جریر (ابن کثیر)

۴۳۸ (اور اسلام قبول کر لیں گے)

مطلب یہ ہے کہ جو اہل کتاب ضد نفسانیت ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے، وہ خود اپنی کتاب کے مطالعہ سے قرآن کی حقانیت و صداقت کے قائل ہو جائیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ میں ضمیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب بھی پھیری جا سکتی ہے اس تاویل سے کہ اوپر آپ کا ذکر اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ میں مضمر ہے۔

قیل یعود علی النبی صلعم وقد تقدم ذکرہ فی قولہ انا ارسلنٰک بالحق (بحر)

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

اور اس روز سے ڈرو جب نہ کوئی کسی کے بھی کام آئے گا اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے

عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى

سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ انہیں کہیں سے مدد ہی پہنچ سکے گی ۴۴۲ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کو ۴۴۳

اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ

ان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا ۴۴۴ اور انہوں نے وہ انجام دے دیئے ۴۴۵

اکثر نے الکتٰب کی طرف پھیری ہے۔

ظاہرہ ای الضمیر فی بہ یعود الی ما یعود الضمیر فی یتلونہ ای الکتٰب (بحر)

لیکن انسب یہ ہے کہ ضمیر میں مرجع الحق (آیت ۱۱۹) اور العلم (آیت ۱۲۰) کو مانا جائے اور معنی یہ کئے جائیں کہ یہ لوگ اس دین حق اور علم وحی پر ایمان لے آئیں گے بعض حضرت تھانویؒ اور مفسر دہلویؒ (شاہ عبدالعزیزؒ) دونوں نے یہی ترکیب اختیار کی ہے یہ اختلافات صرف ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہیں مآل و مقصود کلام ہر صورت میں تقریباً ایک ہی ہے۔

۴۳۹ (دنیا و آخرت میں اور ان کا شمار کافروں ہی میں ہوگا) منکرین اسلام یہود کی ہلاکت آخرت میں تو یقینی ہے دنیا میں بھی ان کی بربادی سب کے سامنے آچکی ہے۔ تنقولہ میں ضمیر کے مرجع کے بارہ میں اختلافات ہیں اور انسب یہاں بھی یہی ہے کہ الحق و العلم کو مانا جائے۔

۴۴۰ قوم بنی اسرائیل اور ان پر جو احسانات خداوندی تھے ان کا تعارف رکوع ۵ میں مفصل کرایا جا چکا ہے وہیں کے حاشیے ملاحظہ فرمائے جائیں۔ شروع میں تاریخ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے بیان ہوئی یعنی اسرائیل کے اس عہد کی جب وہ مستقل صاحب کتاب و شریعت ہو کر آزاد و خود مختار قوم بنے اور طرح طرح کی نافرمانی و سرکشی میں بھی مبتلا ہوئے اب اس کے قدیم ترین دور یعنی عہد ابراہیمی کی طرف توجہ کیا جاتا ہے حضرت ابراہیمؑ ہی کے بعد سے تو آپ کی نسل کی دو شاخیں ہوئیں اور ان میں سے ایک کا نام دو پشت کے بعد ہی اسرائیل پڑا۔

۴۴۱ (توحید کے علمبردار اور مبلغ کی حیثیت سے)

قرآن مجید جو بھی دعویٰ کرتا ہے کسی کی پرواہ کئے بغیر بے تکان اور بے دھڑک کرتا ہے بنی اسرائیل کو اس نے مطلق صورت میں بلا کسی قید و شرط کے اس وقت تک کی تمام قوموں کے مقابلہ میں افضل قرار دیا ہے یہ افضلیت اسی نعمت توحید کی بنا پر تھی دنیا کی دنیا شرک کی لعنت میں مبتلا تھی توحید پر قائم صرف یہی قوم تھی اور سلسلہ نبوت کی تاریخ صرف یہی نسل تھی تفصیل کے لئے رکوع ۶ کے حاشیے ملاحظہ فرمائے جائیں۔ بنی اسرائیل کو ان کے عروج اور ان کی گمراہیوں کی سرگزشت سنا کر یاد دلایا جا رہا ہے کہ ان کی افضلیت و شرفیت کا راز خاک یہی تھا کہ وہ موحد اعظم حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں تھے اور توحید و نبوت کی امانت انہیں کی نسل کے سپرد کی گئی تھی انہیں اگر پھر استفادہ انہیں انعامات سے منظور ہے تو چاہئے کہ اسی دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں۔

۴۴۲ (کسی طرف سے بھی اور نہ ان کی فریاد رسی کسی سے بھی ہو سکے گی۔)

یہ آیت بھی رکوع چھ میں گزر چکی اور وہیں اس پر متعدد حاشیے بھی دیئے جا چکے ہیں۔

بنی اسرائیل نے اس وقت ایک تو عقیدۂ قیامت کو بالکل بھلا دیا تھا، اور جزا و سزا کی ساری صورتیں اسی دنیا میں
منحصر و محدود سمجھ لی تھیں، چنانچہ موجودہ توریت میں بھی جہاں جہاں سعادت و شقاوت کے ثمرات مذکور ہیں اسی دنیا
کی خوشحالی و بدحالی کا بیان ہے، اس لئے پہلے تو انھیں یوم آخرت کی یاد دلائی گئی اور پھر ان کی گمراہی کے ایک ایک مرکزی عقیدہ
شفاعت، کفارہ و فدیہ پر ضرب لگائی گئی، آیت کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ یہودیت کے ساتھ نصرانیت کی بھی جڑ کٹ
جاتی ہے، نصرانیت کی تو بنیاد ہی شفاعت، کفارہ و فدیہ ہی کے عقائد باطلہ پر ہے۔

۴۴۳ یہ نام پہلی بار قرآن میں آیا ہے، قرآن کے مخاطب اول اہل عرب تھے، جو شخصیتیں ان کے لئے معلوم و معروف
تھیں قرآن ان کے نام ان کے سامنے بے تکلف بغیر کسی مزید تعارف و تشریح کے لے آتا ہے اور پھر ابراہیمؑ تو وہ بزرگ تھے جن سے
علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ بھی خوب ہی واقف تھے، ان کا تعارف اور بھی غیر ضروری تھا، یہ ابراہیم علیہ السلام وہی
ہیں جو اسلامی عقیدہ کے علاوہ یہودی و نصرانی عقیدہ میں بھی بڑے جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں، توریت میں آپ کا نام ابرام اور ابراہیم
دونوں طرح سے آیا ہے، توریت کی روایت ہے کہ آپ کے اور نوحؑ کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہوا ہے یعنی آپ ان کی
گیارھویں پشت میں تھے، لیکن خود توریت ہی کے شارحین کا خیال بعض قوی قرائن کی بنا پر یہ ہے کہ توریت میں نسب نامہ کی
کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں، سال ولادت سر چارلس مارسٹن محقق اثریات کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ ق م ہے اور
عمر شریف توریت میں ایک سو پچھتر سال درج ہے، سال وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ ق م ٹھہرتا ہے، والد کا نام تارح تھا یا عربی
تلفظ میں آزر، نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی کئی طرح آیا ہے، مسلمانوں کے لئے قرآنی لفظ آزر کافی ہے، وطن آبائی ملک بابل
یا کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیا) تھا، جدید جغرافیہ میں اسی کو ملک عراق کہتے ہیں، جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی اس کا
نام توریت میں اُور (UR) آیا ہے، مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب تھا، اب زیر زمین نمودار ہو گیا ہے، کھدائی کے کام کی داغ بیل
۱۹۱۸ء ہی میں پڑ گئی تھی، ۱۹۲۲ء میں برطانیہ اور امریکہ کے ماہرین اثریات کی ایک مشترک تحقیقی مہم برٹش میوزیم اور
پنسلوینیا یونیورسٹی کے زیر اہتمام عراق کو روانہ ہوئی اور کھدائی کا کام پورے سات سال جاری رہا، رفتہ رفتہ پورا شہر
نمودار ہو گیا اور عراق گورنمنٹ کے محکمۂ آثار قدیمہ نے عجائب خانہ کے حکم میں لاکر ان کھنڈروں کو محفوظ کر دیا ہے، یہ شہر خلیج
فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایۂ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے، ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور نبوت چونکہ
مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلم ہے، اس لئے ان قوموں کے علماء نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کوئی
درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے، موجودہ محرف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت دیکھ کر بعض روشن خیال محققین نے انیسویں
صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نام کے کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں بلکہ محض ایک قومی نام تھا یا ہر شیخ قبیلہ
کا لقب، لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت پوری طرح تسلیم کی جا چکی ہے،
نسل اسرائیلی اور نسل اسمٰعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آ رہی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام
دونوں سلسلوں کے مورث اعلیٰ تھے، اللہ کی نعمت خاص انحصار یعنی توحید کی علمبرداری نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں
کی پاداش میں چھین کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے اب ساری دنیا کے لئے عام ہو رہی ہے، ضرورت تھی کہ ابراہیمی شخصیت
(اور ان کے ضمن میں اسمٰعیلی شخصیت) کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کر دیا جائے، چنانچہ یہاں یہی ہو رہا ہے،
لفظ ابراہیم کے سریانی زبان میں جو بھی معنی ہوں، عربی اہل لغت نے اپنی زبان میں اَبٌ رحیم کے معنی میں لیا ہے،

قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ

ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ ۴۲۶

اس لئے کہ آپ کی شفقت بچوں کے ساتھ مسلّم و معروف ہے۔

قال السهيلي وكثيرما يقع الاتفاق بين السرياني والعربي او يقاربه في اللفظ. ألا ترى ان ابراهيم تفسيره أب رحيم لرحمته بالاطفال (قرطبی) وابراهيم علم اعجمي قيل معناه قبل النقل اب رحيم (روح)

حدیث نبوی میں بھی یہی مضمون آیا ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے بچوں کی بعد وفات قیامت تک کفالت و تربیت حضرت ابراہیم کے ذمہ رہے گی۔

۴۲۴ (اور وہ چند امور احکام تھے اوامر و نواہی کے قسم کے)

اِبْتَلٰى۔ آزمایا۔ اپنی واقفیت کے لئے نہیں کہ وہ تو خود علیم کل ہے بلکہ علی الاعلان تاکہ دوسروں کو اُن کے ایمان کامل کا مشاہدہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں آزمانے کا لفظ جب بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔

وابتلاء الله العباد ليس ليعلم احوالهم بالابتلاء فانه عالم بهم ولكن ليعلم العباد احوالهم. (معالم)

كَلِمٰتٍ، یہ کلمات کیا تھے ان کی تعیین میں بڑا اختلاف ہے اور نص کوئی موجود نہیں۔

قد اختلف العلماء فيها اختلافا كثيرا (ابن العربی) واختلف العلماء في المراد بالكلمات على اقوال (قرطبی)

لیکن تفصیل ان کی جو کچھ بھی ہو بہر حال تھے وہ احکام و شرائع ہی۔

اى شرائع الاسلام (معالم عن ابن عباس) اى اختبارا له بما كلفه من الاوامر والنواهى (ابن کثیر)

بابه قولان احدهما انها شريعة الاسلام (ابن العربی)

۴۲۵ یعنی آپ ان امتحانوں میں پورے اُترے اور ان احکام کی تعمیل کر دی۔

عمل بهن (معانی) اى فأداهن (ابن جرير عن ابن عباس) اى عمل بهن (ابن جرير عن قتادة)

اى قام بهن كلهن (ابن کثیر)

اِتْمَام مقابل ہے نقص کا، یعنی آپ نے ان احکام کی ادائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انہیں کامل طور پر انجام دے دیا۔

اتم ذلك كله ووفى به وقام به على حسب ما امره الله تعالى من غير نقصان لأن ضد الاتمام النقص وقد اخبر الله باتمامهن (جصاص)

روایاتِ یہود میں بھی یہ ذکر آیا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۴۲۶ (کہ امور دین و شریعت میں تمہاری اقتداء کریں)

اى يأتمون بك في دينك (کبیر) اى يأتمون بك في دينهم (مدارک)

اِمَامًا۔ امام کہتے ہی اسے ہیں جس کی پیروی کی جائے لغت میں بھی اور اصطلاح شریعت میں بھی۔

هو اسم من يؤتم به (مدارک) اسم الامامة مستحق لمن يلزم اتباعه والاقتداء به في امور الدين او في شيء منها (جصاص) الامام القدوة (قرطبی)

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٢٤﴾

بولے اور میری نسل سے بھی؟ ۴۴۶؎ ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا ۴۴۷؎

توریت میں بھی یہ وعدۂ امامت ان الفاظ میں ملتا ہے:۔

"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں، برکت دوں گا، اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کروں گا اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے"۔ (پیدائش۔ ۱۲ : ۲ و ۳)

یہ دینی سرداری اور امامت پورے ایک عالم کی آج تک آپ کے حصہ میں چلی آرہی ہے اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذاہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ کی امامت پر متفق و متحد ہیں، ایک نامور فرنگی فاضل، بیسویں صدی کے ثلث اول کے ختم پر آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:۔

"ابراہیمؑ کی ہستی کسی بدوی سردار کی نہ تھی کہ وہ لوٹ مار کرتے اور ملک گیری کرتے رہتے، ان کی اصلی اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے وہ حقیقۃً مورث اعلیٰ کسی نسل کے نہیں بانی و امام وہ مذہبی تحریک کے تھے، محمدؐ کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے، اور توریت کے حسب روایت وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد اول صفحہ ۶۰ طبع چہاردہم)

جن لفظوں کو یہاں ترجمہ میں زیر خط کردیا گیا ہے انھیں ایک بار پھر پڑھ لیا جائے، یورپ کی زبان سے اللہ کے حبیبؐ اور اللہ کے خلیلؑ کے درمیان مماثلت کا یہ اعتراف بس اللہ ہی کی شان ہے۔

آیت سے ایک نتیجہ فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ احکام کی تعمیل اور امتحان الٰہی میں کامیابی انسان کو دینی پیشوائی و سرداری کا مستحق بنا دیتی ہے اور انبیائے کرامؑ کے بعد اولیائے امت اور علمائے امت کی امامت اپنے اپنے ظرف و حیثیت کے مطابق اسی قانون کی مظہر ہیں۔

فقیہ جصاص رازیؒ نے کہا ہے کہ:۔

فالانبیاء علیہم السلام فی اعلی مرتبۃ الامامۃ ثم الخلفاء الراشدون بعد ذلک ثم العلماء والقضاۃ العدول ومن الزم اللہ باقتداء ھم ثم الامامۃ فی الصلوٰۃ ونحوھا (احکام القرآن)

(امامت کے جو معنی بیان ہوئے ہیں اس کے لحاظ سے امامت کے اعلیٰ مرتبہ پر تو حضرات انبیاء فائز ہوتے ہیں ان کے بعد خلفائے راشدین ہیں پھر نمبر علماء اور عادل ججوں کا آتا ہے اور ان کا جن کی پیروی خدا نے لازم کردی ہے پھر امامت نماز ہے وغیرہ)

۴۴۶؎ (امام ہوتے رہیں گے)

عالم کی پیشوائی، سرداری و امامت کی بشارت پاکر ابراہیم علیہ السلام کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہوگیا اور اس جوش مسرت میں سوال کر بیٹھے کہ اس انعام میں میری نسل اور میری اولاد بھی شریک ہے نا؟

ذُرِّيَّة کے معنی ہیں اولاد اور اولاد در اولاد، اس میں سارا سلسلۂ نسل آگیا، اور یہ سلسلۂ ابراہیمی شاخ اسرائیلی اور شاخ اسمٰعیلی دونوں کو شامل ہے، اسرائیلیوں کو جو دعویٰ تخصیص تھا اس کی جڑ یہیں سے کٹ گئی۔

مِنْ ذُرِّيَّتِيْ میں مِن تبعیضیہ ہے اور فقرہ کی ترکیب نے اسے صاف کر دیا کہ ابراہیم کی یہ دعا (سوال کے رنگ میں) پوری ساری نسل سے متعلق نہیں اس کے ایک جزو سے متعلق تھی۔

من تبعیضیة ای وجاعل بعض ذریتی (ابو سعود) ومن ذریتی یدل انه علیه السلام طلب ان یکون بعض ذریته ائمة للناس (کبیر)

من ذریتی کا عطف جاعلک کے ک پر ہے گویا تقدیر کلام یوں ہے، وجاعلک بعض ذریتی، محاورۂ عرب میں جب سَاُكْرِمُكَ بولا جاتا ہے تو جواب استفہامی میں بجائے پورے فقرہ سَاُكْرِمُ زَیْدًا کے صرف زَیْدًا کافی ہے (کشاف) بعض نے آیت کی ترکیب یوں مانی ہے کہ گویا آپ دعا کر رہے ہیں کہ میری نسل میں بھی امام پیدا کئے جائیں۔

قاله ان یجعل من ولده ائمة لانه عطف على الاول فکان بمنزلة واجعل من ذریتی ائمة (جصاص)

آیت سے معلوم ہوا کہ مسرت و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کرنا نہ صرف امر طبعی ہے بلکہ سنتِ انبیاء بھی ہے۔

قال یعنی برکت و فضل کا سلسلہ تمہاری نسل میں بھی ضرور رہے گا لیکن اس کے تحقق کے لیے محض اِرث و نسب نسل کافی نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح بھی حاصل کرنا ہوگا، گویا دعائے ابراہیمی اولادِ صالح کے حق میں قبول ہوگئی۔

دل علی انه ینالہ غیر الظالم (جلالین)

اور حضرت کو خبر دے دی گئی کہ آپ کی نسل میں دونوں طرح کے لوگ ہوں گے کچھ صالح و مطیع اور کچھ ظالم و نافرمان، صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی اور ظالم اس سے محروم کر دیئے گئے۔

تنبیه علی انه قد یکون من ذریته ظلمة وانهم لاینالون الامامة لانها امانة من الله وعهد، والظالم لایصلح لها وانما ینالها البررة الأتقیاء منهم (بیضاوی) ای لا أجعل عهدی لمن کان ظالما۔ (راغب)

عَهْدِیْ۔ میرا وعدہ یعنی منصبِ امامت و پیشوائی کا وعدہ۔

معنی العهد عهد الامامة (ابن جریر عن مجاهد) هذا العهد هو الامامة المذکورة فی ما قبل (کبیر)

عہد کے معنی امان کے بھی لئے گئے ہیں۔

العهد الأمان قال الله تعالی لاینال عهدی الظّٰلمین (کتاب الاجناس)

الظّٰلِمِیْنَ۔ ظلم سے یہاں مراد کفر لی گئی ہے۔

ای اهل الکفر (مدارک) قد فسر الظلم ههنا بالکفر وهو قول ابن جبیر (بحر) المراد بالظالم الکافر ههنا اذ هو الظالم المطلق (مدارک) المتبادر من الظلم الکفر (روح)

اور کافر کو امامتِ دینی نہ ملنی بالکل ظاہر اور متفق علیہ ہے۔

لان امامة المسلمین لاینبت لاهل الکفر (مدارک)

ظالم کی ایک تفسیر فاسق بھی آئی ہے۔

والظلم یستعمل فی الذنب الکبیر والذنب الصغیر (راغب) الظالم العاصی غیر الکافر (بحر)

فقہاء نے اس آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ فاسق کی امامت کا انعقاد جائز نہیں، امام کو عادل و صالح اور حسبِ قوت ہونا ضروری ہے۔

استدل جماعة من العلماء علی ان الامام یکون من اهل العدل والاحسان والفضل مع قوة

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ (کعبہ ۴۴۹) کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقام امن قرار دیا۔۴۵۰

علی القیام بذالک (قرطبی) فاما اھل الفسوق والجور والظلم فلیسوا لہ باھل (قرطبی)
جصاص نے احکام القرآن میں آیت کے تحت میں امامت فاسق کے غیر نافذ و ناجائز ہونے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔
مرشد تھانوی ؒ نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ اختیاری بدعملی کے ساتھ فضل الٰہی و انعام خداوندی جمع نہیں ہوتے۔

۴۴۹ بیت کے لفظی معنی گھر کے ہیں (جہاں رات بسر کی جائے)
البیت سے متفقہ طور پر مراد بیت الحرام یا حرم کعبہ ہے، شہر مکہ معظمہ کے اندر کی یہ عمارت روئے زمین پر خدا کی عبادت کا قدیم ترین مکان ہے اور قرآن نے اس حقیقت کا اعلان کھلے لفظوں میں ادا کر دیا ہے:-
ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبٰرکا۔
بیت کعبہ کی تقدیس و برکت کے ساتھ ساتھ کعبہ کی یہ قدامت بھی نہایت شاندار ہے لیکن انکار قدامت پر کوئی دلیل ہر ممکن کوشش کے بعد آج تک قائم نہیں ہو سکی ہے بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف کو لکھنا پڑا:-
"یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے پرے ہے۔" (محمد اینڈ محمد ازم صفحہ ۱۶۶)
پھر آگے مشہور و قدیم رومی مورخ ڈایوڈورس سکولس (DIODORUS SECULUS) جس کا زمانہ خود حضرت مسیح سے ایک صدی قبل کا ہے کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسل عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا (صفحہ ۱۶۶) ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔
البَیْت سے مراد کعبہ کا ہونا تو ظاہر ہی ہے جیسا کہ جمہور مفسرین کا قول بھی ہے:-
البیت ھنا الکعبۃ علی قول الجمھور (بحر)
لیکن فقہائے مفسرین اس طرف بھی گئے ہیں کہ مراد سارا حرم ہے نہ کہ صرف خانہ کعبہ۔
والمراد جمیع الحرم (جصاص) وقیل المراد البیت الحرام لا نفس الکعبۃ لانہ وصفہ بالامن وھذہ صفۃ جمیع الحرم لا صفۃ الکعبۃ فقط و یجوز اطلاق البیت و یراد بہ کل الحرم (بحر)

۴۵۰ مَثَابَةً۔ مصدر ثَوْب کے معنی ہر کسی شے کا اپنی حالت اصلی یا حالت مقصودہ کی طرف لوٹنا۔
رجوع الشیٔ الی الحالۃ الاولیٰ التی کان علیھا اوالی الحالۃ المقدرۃ المقصودۃ (راغب)
اور جب کچھ لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو کہا جاتا ہے ثَابَ الْقَوْم اور اسی سے مَثَابَة اسم ظرف ہے
المثابۃ مفعلۃ من ثاب القوم الی الموضع اذا رجعوا الیہ فھم یثوبون الیہ مثابا و مثابۃ۔ (جصاص)
مَثَابَةً میں ۃ مبالغہ کی ہے، اس میں زور و تاکید مثاب سے زائد ہے۔
والتاء فی مثابۃ للمبالغۃ قالہ الاخفش (بحر)
گویا مثابۃ کے معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار رجوع کرے اور پھر بھی نہ بھرے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ؕ

اور مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ بنالو۴۵۱

مرجعا للناس ومعاذا یأتونه کل عام ویرجعون الیه فلا یقضون منه وطرًا۔
یعنی امام جریر نے خود بھی لئے ہیں اور یہی ابن عباس صحابیؓ اور مجاہدؒ سدّی عطاء وغیرہ تابعین سے بھی نقل کئے ہیں اور بیت الحرام کا یہ وصف شاہد بھی ہے لوگ حج پر حج اور عمرہ پر عمرہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس سے اکتاتے نہیں پھر چونکہ الیت مرجع ارباب حج وعمرہ کا ہے اس لئے اجتماع ورجوع کے ساتھ عبادت کا مفہوم بھی لازماً اس لفظ میں شامل ہوگیا ہے۔
مباءۃ ومرجعا للحاج والعمار یتفرقون عنه ثم یثوبون الیه (کشاف)
للنّاس۔ عام زائرین کا تانتا جو کعبۃ اللہ کی زیارت اور عمرہ کا سال کے ہر موسم، ہر فصل ہر زمانہ میں لگا رہتا ہے اس سے قطع نظر تصور میں نقشہ ان لاکھوں انسانوں کا جمائیے جو صرف حج کے موقع پر کھنچے چلے آتے ہیں صرف حجاز یا ملک عرب ہی کے ہر حصہ سے نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطہ، ہر علاقہ، ہر ملک سے اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ یعنی تقریباً چار ہزار سال سے قائم ہے، اب جاکر للنّاس کی تفسیر ذہن میں آسکے گی۔
اَمْنًا۔ مامونیت اس سے ظاہر ہے کہ صرف عمارت کعبہ یا مسجد الحرام ہی نہیں بلکہ اردگرد کی سرزمین میلوں تک داخلِ حرم ہے اور حرم وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا الگ رہا، جانور تک کا شکار جائز نہیں! اور یہ حکم تو خیر شریعت اسلامی کا ہے، ارض حرم کا مامن ہونا جاہلیتوں کو بھی مسلّم رہا ہے، بڑے بڑے مجرم مشرکوں کے دور حکومت میں بھی جرم کرکے خانہ کعبہ کی دیواروں کے درمیان آکر پناہ پاجاتے تھے، فرنگی قاموس علم ودانش میں ہے:۔
• اتنا تو بہر حال ہے کہ محمدؐ کے دور سے بہت قبل مکّہ کی ذوحیثیتیں ہم مسلّم پاتے ہیں ایک تجارتی مرکز کی ایک مقدس مندی کی جس کے اردگرد کی زمین بھی حرم ہے۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۵ ص ۱۵۱ طبع چہاردہم)
غرض کہ قرآن نے البیت کے جو دو وصف یہاں ذکر کئے ہیں وہ اعتقاد سے زیادہ تو مشاہدۂ ماضی وحال کی چیز ہیں، فقہائے مفسرین نے بھی تصریح کردی ہے کہ یہاں اس کی محض خبر نہیں دی گئی ہے بلکہ مامونیت کا حکم بھی مراد ہے۔
انما هو حکم منه بذلك لا خبر (جصاص)
۴۵۱ (اے مسلمانو!)
اتَّخِذُوْا صیغۂ امر ہے اور یہ خطاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اُمّت اسلامیہ سے ہے۔
الخطاب لامة محمد صلی الله علیه وسلم (بیضاوی) المامور به الناس کما هو ظاهر (روح)
والخطاب علی هذین الوجهین لامة محمد صلی الله علیه وسلم وهو صلی الله علیه وسلم رأس المخاطبین (روح)
مَقَامِ اِبْرٰھٖمَ کے معنی اُس پتھر ہی کے لئے گئے ہیں جس پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے تھے اور یہ پتھر خانہ کعبہ سے چند ہی فٹ کے فاصلہ پر اب بھی ایک حجرہ میں محفوظ ہے، یہ اصطلاح اگرچہ نزول قرآن کے بعد کی ہے لیکن ایک بہت بڑے گروہ نے یہی معنی لئے ہیں، اور حج کے موقع پر اس حجرہ کے سامنے طواف کے

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ

اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی طرف حکم بھیجا ٤٥٢

سنت حجر کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں یہ نماز واجب ہے اور شافعیہ کے ہاں محض سنت۔ محققین کے دوسرے گروہ نے جس میں ابن عباسؓ صحابی، مجاہد و عطا تابعین اور امام فقہ نخعی وغیرہ شامل ہیں، اس کے معنی سارے حرم یا کل مشاہد حج کے لئے ہیں۔

قال ابن عباس الحرم کله (ابن کثیر) وروی عن مجاهد وعطاء مثل ذلك (ابن کثیر) وذهب النخعی ومجاهد الی ان المراد من مقام ابراهیم الحرم کله وابن عباس وعطاء الی انه مواقف الحج کلها (روح) وعن ابن عباس ایضا ومجاهد وعکرمة وعطاء ———: الحج کله (قرطبی)

مِنْ مَّقَامِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی اس کا صرف ایک حصّہ ظاہر کرنے کے لئے۔ بعض نے فِی کے معنی میں لیا ہے۔

ومن اما بمعنی او بمعنی فی او زائدة والاظهر الاول (روح)

مُصَلًّى۔ نماز کی جگہ یا دعا کی جگہ۔ صلٰوۃ دعوت کے معنی میں بھی آیا ہے، اصل مصدر کے اعتبار سے جائے نماز اور جائے دُعا میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے اور اب اسے اور زیادہ صاف ہو جانا چاہئے کہ قرآن مجید اپنے مخاطبات میں تاریخ انسانی کی ترتیب کا پابند نہیں، بار ہا پاس پاس کی آیتوں میں بلکہ کبھی خود ایک ہی آیت کے اندر معنوی مناسبت کی بنا پر دو ایسے واقعات جمع کر دیے جاتے ہیں جن کے درمیان زمانی حیثیت سے صدیوں کا فصل ہوتا ہے اور اسی میں یہ بھی شامل ہے کہ واقعاتِ ماضی کے بیان سے متصل ہی اور گویا انھیں کے ضمن میں کوئی مستقل حکم حال و مستقبل کے لئے دے دیا جائے اور صیغۂ امر لا کر اس کا عطف صیغۂ ماضی پر کر دیا جائے، قرآن اصلاً کتاب ہدایت ہے اور وہ اپنے اس مقصد و اصل کے آگے پروا کسی انسانی حد بندی اور کسی مصنوعی و اختراعی تکلف کی نہیں کرتا۔

٤٥٢ عَهِدْنَآ کے معنی ہیں ہم نے حکم دیا، یا ہم نے وحی کی۔

ای امرنا (ابن جریر عن ابن زید) امرناهما (کشاف) قیل معناه امرنا وقیل اوحینا (قرطبی)

عَهِدَ۔ بہ معنی امر پر حاشیہ عہد بنی اسرائیل کے سلسلے میں اوپر گزر چکا ہے۔

اِبْرٰهٖمَ۔ پر حاشیہ اوپر گزر چکا، اسمٰعیلؑ ابراہیمؑ کے فرزند اکبر تھے آپ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے، سال ولادت غالباً ٢٠٧٤ق م۔ سال وفات غالباً ١٩٣٧ق م۔ توریت میں ہے کہ عمر ١٣٧ سال کی پائی آپ کے بارہ فرزند ہوئے اور ان سے بارہ نسلیں چلیں، توریت میں ان بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں اور یہ تصریح ہے کہ "یہ اپنی اُمتوں کے بارہ رئیس تھے" (پیدائش۔ ٢٥: ١٢)

عرب کا مشہور و عالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے اس لئے آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بھی مورثِ اعلیٰ ہوئے اہل کتاب کہلانے والوں نے آپ کے خلاف زہر اگلنے اور اپنے خبث و عناد کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے تاہم اپنی کتاب کی تصریحات کو کیا کریں گے جو تحریف و تلبیس کی ہر ممکن کوشش کے بعد بھی نہ مٹ سکیں ان میں ابراہیم خلیلؑ کی دعا بھی شامل ہے اور خداوند کریم کے وعدے بھی اور تاریخ کا بیان بھی:-

أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو ۲۵۳ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے

"اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے" (پیدائش ۱۷: ۱۸) "اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا" (پیدائش ۱۷: ۲۰) "اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا" (پیدائش ۲۱: ۱۸) "اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا، اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا" (پیدائش ۲۱: ۲۱)

یہاں حکم جو کچھ مل رہا ہے وہ آپ کو اور آپ کے والد ماجد کو مشترک مل رہا ہے گویا خدمتِ کعبہ میں آپ اپنے والد ماجد کے برابر کے شریک تھے۔

۲۵۳ (ہر طرح کے شرک و بت پرستی کی گندگی سے)

طَهِّرَا۔ طہارت سے اصلاً یہاں مراد یہ ہے کہ نجاستِ معنوی و اعتقادی سے دور اور ذکرِ توحید و عبادتِ الٰہی سے معمور رکھو، ضمناً ظاہری صفائی کا حکم بھی آ جاتا ہے۔

ھو تطھیرہ من الاصنام و عبادۃ الاوثان فیہ و من الشرک باللہ (ابن جریر عن مجاھد و قتادہ وابن زید) من الاوثان الخبائث والانجاس کلھا (مدارک) والتطھیر المامور بہ ھو التنظیف من کل ما لا یلیق بہ (بحر محیط)

طَهِّرَا تثنیہ کا صیغہ ہے حکم حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی مل رہا ہے اور اقامتِ توحید میں برابر کے شریک بنائے جا رہے ہیں، فقہاء نے خطاب کے اس صیغہ سے مفہوم عموم کا لیا ہے یعنی تطہیر کی ذمہ داری ہر فرد پر ہے خواہ وہ ابراہیمؑ کی طرح متبوع و مقتدا ہو یا اسمٰعیلؑ کی طرح تابع و مقتدی ہو۔

طَهِّرَا بالتشدید مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب اچھی طرح پاک صاف رکھو، فقہاء نے یہیں سے یہ نکالا ہے کہ مسجد کی صفائی فرض ہے۔

بَيْتِيَ۔ اضافت تشریفی ہے "میرے گھر کی" ترکیب کو خوب سمجھ لینا چاہیے، اسلام کا خدا کوئی مرئی و مجسم دیوی دیوتا ہے نہیں جو اسے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کے لئے کسی گھر یا مکان کی ضرورت ہو، اس لئے "میرے گھر" سے مراد میرے رہنے کا گھر تو ہو ہی نہیں سکتا، مراد صرف یہ ہے کہ وہ گھر جو میری یاد و عبادت کے لئے مخصوص و نامزد ہو چکا ہے، اضافت سے مقصود اظہارِ شرف و عظمت ہے۔

ھذہ اضافۃ تشریف لان مکانا محل للہ تعالیٰ (بحر) الاضافۃ للتشریف کناقۃ اللہ (روح) اضافۃ البیت الی ضمیر الجلالۃ للتشریف (ابو سعود)

بَيْتِيَ میں کوئی اشارہ مخصوص کعبہ کے لئے نہیں، ذکر صرف وصف یعنی بیت کے ساتھ فرمایا ہے۔ اسی سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہی حکم تطہیر ہر عبادت خانۂ الٰہی یعنی مسجد کے لئے رہے گا۔

دخل فیہ بالمعنی جمیع بیوتہ تعالیٰ فیکون حکمہا حکمہ فی التطہیر والنظافۃ (قرطبی)

أَنْ۔ أَنْ یہاں مفسرہ یعنی اَے کے معنی میں لیا گیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهٗ مِنَ

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیمؑ نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنادے اور اس کے رہنے

الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ

بسنے والوں کو روزی دے پھلوں سے ۲۵۵ (یعنی) ان بسنے والوں کو جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں ۲۵۶ اللہ نے ارشاد

فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهٗٓ إِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

فرمایا کہ جو کفر کرے گا میں اسے بھی کچھ دن مزہ اٹھانے دوں گا پھر اسے کشاں کشاں عذاب جہنم تک پہنچا دوں گا اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے ۲۵۷

أی بمعنی أی مفتوحة (قرطبی)

۲۵۴ للطائفین میں لام تخصیص کے لئے ہے یعنی کعبہ (اور اسی طرح ہر مسجد) پر حق خصوصی لوگوں کا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ عمارت بن کر تیار ہوچکی تو اب غایت تعمیر بیان ہورہی ہے کہ مقصود اس عمارت سے قیام توحید و استیصال شرک ہے۔

الطائفین۔ خانہ کعبہ کا طواف کرنے والے۔ طواف کے معنی رسالہ میں اور گزر چکا ہے۔ طواف کے سلسلہ میں تو خواہ کچھ زمرہ ہے لیکن یوں بھی بجائے خود بڑے اجر کی چیز ہے اور سالم ہی بڑے لطف کی بھی جیسا کہ ہر صاحب ذوق کا تجربہ شاہد ہے۔ اس نامہ سیاہ نے اس کا بیان اپنے سفرنامہ حجاز میں کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ خانہ کعبہ کو تمام دنیائے اسلام کی مسجدوں بلکہ نمازوں سے جو مرکزی نسبت حاصل ہے اسی مناسبت سے اہمیت طواف کعبہ کو بھی حاصل ہے۔ کعبہ مظہر اعظم ہے دین توحید کا۔ اس کے گرد چکر لگانا گویا زبان حال سے اقرار کرنا ہے کہ ہماری ساری عبادتوں کا، سارے اعمال کا، ساری زندگی کا مرکزی نقطہ بس توحید الٰہی ہے۔

عاکفین۔ عکوف کے لفظی معنی ہیں کسی جگہ کے رہنے کو خصوصاً لازم کرلینا۔

العکوف الإقبال علی الشیء وملازمته علی سبیل التعظیم له (راغب)

اور اعتکاف اصطلاح شریعت میں نام ہے مسجد کے اندر بہ نیت عبادت قیام کو کسی مدت کے لئے لازم کرلینے کا، کہ بجز بشری ضرورتوں کے اور کسی حال میں باہر نہ نکلا جائے۔

هو الاحتباس فی المسجد علی سبیل القربة (راغب)

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت کفایہ مؤکدہ ہے۔ اس میں روزہ بھی شرط ہے۔ نفس اعتکاف ہر حال میں موجب اجر و قربت ہے۔

الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ رکوع و سجدہ نماز کی دو مشہور و متعارف ہیئتیں ہیں۔ طائفین اور عاکفین اور رکع و سجود، چار لفظوں کے لانے کے بجائے یہ بھی ممکن تھا کہ صرف عابدین یا ذاکرین کہہ دیا جاتا لیکن تفصیل و تصریح سے ایک ایک عبادت کی تخصیص اور بندگی کا رنگ الگ الگ اظہار ہوگیا۔

وخص الرکوع والسجود بالذکر لأنهما أقرب أحوال المصلی إلی الله تعالیٰ (قرطبی)

۲۵۵ ابراہیم خلیل اللہ کی یہ دعا جس حیرت انگیز طریقہ پر پوری ہوئی ہے وہ خود ایک معجزہ ہے۔ پہلی دعا یہی کہ شہر مکہ کو امن والا بنا دیا جائے۔ آس پاس کے رہنے والے لٹیرے اور خونخوار لوٹ مار قتل و خون کا بازار گرم

وہاں سفر محدود و خطرناک، راستے غیر محفوظ، اس پر بھی حج و زیارت کے لئے حاجیوں کا تانتا صدیوں سے بندھا ہوا اور اب امن و امان کے لحاظ سے مکہ اور حوالی مکہ آپ اپنی نظیر ہیں، نہ ڈاکے پڑتے ہیں، نہ قافلے لٹتے ہیں، نہ لاشے تڑپتے نظر آتے ہیں، اور شریعت اسلامی نے تو شہر و مضافات شہر کو "حرم" ہی قرار دے دیا، یعنی ان حدود کے اندر جانور تک کا شکار نہیں کیا جا سکتا اور خونی بھی اگر آ کر خانۂ کعبہ کے اندر پناہ گزیں ہو جائے تو اسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا، شہر اور خانۂ کعبہ کا اتنا احترام جاہلیوں تک نے بھی اپنے زمانہ میں ملحوظ رکھا، دوسری دعا یہ تھی کہ مکہ والوں کو پھل پھلاری کھانے کو ملتے رہیں، مکہ واقع ایسی جگہ ہے کہ ساری زمین سخت ریتیلی ہے یا سخت پتھریلی، بارش بھی بہت ہی قلیل مقدار میں ہوتی ہے، غرض یہ کہ نہ ثمر دار پھلوں اور میوہ دار درختوں کا ذکر ہی نہیں، معمولی سے معمولی پھل پھول کے درخت بلکہ تازہ و سبز گھاس بھی کبھی چند روز قبل تک نہیں پیدا ہوتی اور کاشتکاری و باغبانی کو چند روز پیشتر کوئی جانتا بھی نہ تھا، ایک بے آب و گیاہ سرزمین کہیں ریگستان، کہیں گرم و خشک پہاڑیوں کے چٹان لیکن ان سب کے باوجود جیسے تازہ پھل میوے ترکاریاں غلے چاہئے، شہر مکہ میں خرید لیجئے اور اب اس بیسویں صدی کے وسط میں تو زمین تک خاصی گل و گلزار ہو گئی۔

بَلَدًا اٰمِنًا۔ فقہاء مفسرین نے یہاں بھی کہا ہے کہ مقصود محض خبر امن دینا نہیں بلکہ حکم امن دینا مقصود ہے۔

کل ھذا من طریق الحکم لا علی وجہ الاخبار (جصاص)

۴۵۶ ابھی ابھی حضرت ابراہیمؑ کو بتایا جا چکا تھا کہ فضل و برکت کے خاصہ وعدے ایمان و عمل صالح کے ساتھ مشروط ہیں، ان کے بغیر نہیں۔

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (آیت ۱۲۴) اللہ کے پیغمبر نے اللہ کے اس ارشاد کو گرہ باندھ لیا اور اب جو دعا کی اس میں خود ہی یہ قید لگا دی کہ پر امن شہر اور رزق و ثمرات کی برکتیں صرف اہل ایمان و طاعت کے لئے مقصود و مطلوب ہیں۔

دعاء للمؤمنین خاصۃ (معالم) الرزق علی الامامۃ فخص المؤمنین (مدارک) خصص دعاءہ بالمؤمنین دون الکافرین۔ (کبیر)

حضرات انبیاء کی ادب شناسی کا کیا کہنا! حق تعالیٰ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ امامت یا دینی سرداری مخصوص ہے اہل ایمان و طاعت کے ساتھ، خلیل جلیلؑ نے یہ اشارہ پا کر دنیوی منفعت و تمتع کو بھی اہل ایمان و طاعت کے ساتھ مخصوص کر دیا، حالانکہ اس کا تعلق ربوبیت سے ہے جو مومن و کافر سب کے لئے اس عالم میں عام ہے۔

فنبّہ سبحانہ علی ان الرزق رحمۃ دنیویۃ تعم المؤمن والکافر بخلاف الامامۃ والتقدم فی الدین فقد کان ابراھیم قاس الرزق علی الامامۃ فنبّہ سبحانہ علی ان الرزق رحمۃ دنیویۃ لا تخص المؤمن (بیضاوی)

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ایمان کے اجزاء یہاں دو ہی بیان کئے گئے ہیں، اللہ پر ایمان اور روز آخرت پر ایمان، انہیں کے ضمن میں ایمان کے دوسرے ضروری اجزاء بھی آ گئے، اس کی ضرورت مطلق نہیں کہ ایمان کا ذکر جہاں کہیں بھی آئے ہر جگہ اس کے سب ہی اجزاء کی تصریح ہو۔

لما کان الایمان باللہ والیوم الآخر یتضمن الایمان بجمیع ما یجب ان یؤمن بہ اقتصر علی ذلک (بحر) واقتصر فی متعلق الایمان بذکر المبدأ والمعاد لتضمن الایمان بھما الایمان بجمیع ما یجب الایمان بہ (روح)

۴۵۷ قلیلًا۔ کچھ دن، یہاں مراد ہے زندگی بھر سے کہ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہی ہوتی ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانۂ (کعبہ) کی بنیادیں بلند کر رہے تھے ۴۵۵

متاعا یتمتع بہ الی وقت مماتہ (ابن جریر) الی منتھی اجلہ (معالم)
فعل اُمَتِّعُهٗ سے خود ہی اشارہ تمتع کے عارضی اور چند روزہ ہونے کا نکل رہا تھا وصف قَلِيْلًا

لا کر اسے اور مؤکد اور روشن کر دیا۔
مطلب یہ ہوا کہ وہ فضلِ خداوندی جو اہلِ ایمان و اہلِ ہدایت کے ساتھ مخصوص ہے اور جس سے اہلِ ضلالت وکفر محروم رہیں گے اس کا تعلق نفع آخرت سے ہے امامت دین سے ہے رہے اس دنیوی زندگی کے انعامات اور منافع، غذا اور مسکن وغیرہ تو ان سے محروم کافروں اور منکروں تک کو نہ کیا جائے گا کہ یہ قانونِ ربوبیت کا عین تقاضا ہے
اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ۔ دوزخ جیسی جگہ کوئی شخص خوشی سے تو جائے گا نہیں ہر ایک کشاں کشاں ہی لے جایا جائے گا۔ قرآن نے یہاں جو اس کی تصریح کر دی ہے وہ جہنم کی ہولناکی کا نقش واضح کرنے کے لئے۔

۴۵۵ الْبَيْتِ سے مراد خانۂ کعبہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔ الکتاب جس طرح قرآن کریم ہے النبی جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ البیت اسی طرح کعبۃ اللہ ہے۔
يَرْفَعُ۔ کا لفظ قابلِ غور ہے بنیادیں اول بار رکھی نہیں جا رہی تھیں، وہ تو غالباً حضرت آدمؑ ہی اپنے عہد میں رکھ گئے تھے، عمارت کے منہدم ہو جانے کے بعد اب انھیں از سرِ نو اٹھایا جا رہا تھا۔ مسیحیوں کو خانہ کعبہ سے جو ضد اور اس کی قدامت سے جو کد ہے بالکل ظاہر ہے ہر امکانی کوشش اپنے قلم سے اس کی مخالفت میں کر چکے ہیں لیکن حقیقت اس کے باوجود حقیقت ہی ہے مترجم قرآن جارج سیل (SALE) اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھتا ہے

"مکہ جسے بکہ بھی کہا گیا ہے اور یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور ان کے معنی مقام اجتماع عظیم کے ہیں یقیناً دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے اور بعض کی رائے میں توریت کے (مسّا) میسا سے یہی مراد ہے۔"

اور پھر وہی آگے لکھتا ہے:۔

"مکہ کا معبد اہل عرب کے درمیان مقدس اور ایک عبادت گاہ کی حیثیت سے بہت ہی قدیم زمانہ سے اور محمد سے بہت سی صدیوں قبل سے چلا آتا تھا۔"

باسورتھ اسمتھ اپنے لکچرز آن محمد اینڈ محمڈن ازم میں لکھتے ہیں:۔

"بناء کعبہ کا سلسلہ حسب روایات اسمٰعیل اور ابراہیم تک پہنچتا ہے بلکہ شیث و آدم تک اور اس کا نام بیت ایل خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ابتدائی شکل میں کسی ایسے ہی بزرگ نے تعمیر کیا ہے" (صفحہ ۲۳۸)

سب سے بڑھ کر قابلِ لحاظ شہادت سر ولیم میور کے قلم سے ہے:۔

"مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ یک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے۔ جس مقام کا تقدس اتنے وسیع رقبہ میں مسلّم ہو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد قدیم ترین زمانہ سے چلی آتی ہے۔" (لائف آف محمد۔ مقدمہ صفحہ ۱۰۲ و صفحہ ۱۰۳)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا

اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ) قبول کر[۲۵۸] یقیناً تو ہی (سب کچھ) سننے والا ہے (سب کچھ) جاننے والا ہے۔[۲۶۰] اے ہمارے

مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا دے۔[۲۶۱] اور ہماری نسل سے اپنی ایک فرمانبردار اُمت پیدا کر[۲۶۲]

یہ شہادتیں مخالفوں کی تھیں، باقی ہمارے ہاں کی روایتوں میں خانۂ کعبہ کی قدامت کی جو روایتیں ہیں ان سے تو تفسیر، حدیث، سیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اسْمٰعِيْلَ۔ اسمٰعیلؑ کی عمر اور زمانہ وغیرہ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے ایک پیغمبر برحق کی حیثیت سے اسلام میں آپ کا جو مرتبہ ہے ظاہر ہے لیکن آپ کا ایک مستقل معجزہ یہ ہے کہ جن قوموں نے آپ کی اور آپ کی والدۂ ماجدہ کی ہجو اور بدگوئی کو اپنا شعار بنا لیا ہے ان تک کے نوشتوں میں آپ کی تعظیم منقول چلی آتی ہے چنانچہ بعض احبارِ یہود کا یہ قول آج تک یہود ہی کی دائرۃ المعارف میں لکھا چلا آتا ہے کہ:۔

"جو کوئی خواب میں اسمٰعیل کو دیکھے حق تعالیٰ کے ہاں اس کی دعا قبول ہو جائے گی"۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۶۲۹)

آپ کی والدۂ ماجدہ حضرت ہاجرہ شاہِ مصر کی صاحبزادی تھیں اور مصر کا شاہی خاندان حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کی ایک شاخ تھا، عراق سے منتقل ہو کر مصر میں آباد ہو گیا تھا، جب حضرت ابراہیمؑ اپنے سفر میں ادھر سے گزرے تو بحیثیت ایک شیخ قبیلہ کے آپ کو شاہِ مصر نے اپنا مہمان بنایا، اور رخصت کے وقت آپ کے اعزاز و اکرام میں اپنی صاحبزادی کو بطور تحفہ پیش کیا، اور تواضع و انکساری کی راہ سے کہ مشرقی میزبانی کا خاصہ ہے کہا کہ یہ آپ کی کنیزی کے لئے ہدیہ ہے، اردو زبان میں یہ محاورہ آج تک چلا ہوا ہے، شادی بیاہ کے موقع پر چھوٹے سے بڑا معزز شخص بھی اپنی لڑکی کو کنیز ہی کہہ کر داماد اور سمدھی کے سامنے پیش کرتا ہے، مشرقی تواضع کے اس عام پیرایۂ بیان سے معاندین کو گویا ایک بڑی معتمد و مستند دستاویز ہاتھ آ گئی اور ام اسمٰعیل ان کے ہاں آج تک کنیز ہی چلی آ رہی ہیں! واقعات بہرحال واقعات ہیں انھیں کوئی کہاں تک جھٹلا سکتا ہے؟ اسی جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ایک بڑے احبار یہود کے حوالہ سے ہے:

"ہاجرہ فرشتہ ہی کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہوئیں، ان کی عصمت آبی اس سے ظاہر ہے کہ ابراہیمؑ نے انھیں اپنے پاس سے الگ کر دیا جب بھی ان کی وفاداری میں فرق نہ آیا...... ان کے نام کے ایک معنی "آراستہ" بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ اس بنا پر کہ وہ زیورِ اخلاق و حسنِ عمل سے آراستہ تھیں"۔ (جلد ۶ صفحہ ۱۳۸)

اور اسی میں ایک دوسری جگہ یہ روایت بھی درج ہے کہ:۔

"بادشاہ نے خود اپنی صاحبزادی بطور کنیز ہدیہ کر دی"۔ (جلد ۱ صفحہ ۵۵)

اور قصص یہود کا جو مجموعہ گنزبرگ (GINZBERG) نے چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے اس میں ہے:۔

"بادشاہ مصر نے عہد کر لیا کہ وہ ابراہیمؑ کو ہر طرح پُرقوت و شوکت بنا کر رہے گا..... چنانچہ اپنی بیٹی تک ہدیہ دے دی، سارہ کی تعلیم و تربیت میں رہ کر وہ بھی ویسی ہی باخدا بن گئیں اور ہر طرح ابراہیم کی رفاقت کے قابل"۔ (جلد ۱ صفحہ ۲۲۳ و صفحہ ۲۳۷)

۲۵۹ (محض اپنے فضل و رحمت سے)

کیا ٹھکانا ہے اس خشیتِ قلب کا! اخلاص کے مجسمے ہیں، صداقت کے پتلے ہیں، اس پر بھی ڈرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے نذر قبول بھی ہوتی ہے یا نہیں!
باب تفعّل کا ایک خاصہ تکلّف ہے اس لئے بعض نکتہ سنجوں نے لفظ تَقَبَّلْ سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ فعل بذاتِ خود ہرگز قابلِ قبول نہیں تمام تر ناقص ہے اور مقبولیت محض لطف وکرم سے ہوئی ہے نہ کہ کسی استحقاق کی بنا پر۔
ای التقبل عبارۃ عن ان یتکلف الانسان فی قبوله (کبیر) فی اختیار صیغة التفعل اعتراف بالقصور لما فیه من الاشعار بالتکلف فی القبول (روح)
مزدور اور معار جب کام کرتے ہیں تو عموماً اور عادۃً کچھ گنگناتے بھی جاتے ہیں اللہ کے گھر کے یہ معار بھی اللہ کے گھر کی دیواریں اٹھاتے وقت خاموش نہ تھے یہاں ان کی مناجات بیان ہو رہی ہے۔
فقہاء کا استنباط ہے کہ ہر عمل صالح کے بعد دعا کرنا مستحب ہے چنانچہ ختم نماز پر دعا اور افطارِ صوم کے وقت دعا اسی قبیل سے ہیں۔
۴۶۰ سَمِيعُ. سننے والا زبان سے نکلے ہوئے لفظ وقول کا۔
عَلِيمُ. جاننے والا دل کے اندر کے اخلاص کا۔
مشرک قوموں کے حکماء وفلاسفہ نے سب سے زیادہ ٹھوکر حق تعالیٰ کی صفتِ علم ہی کے باب میں کھائی ہے اور باری تعالیٰ کا علم ناقص اور محدود فرض کیا ہے قرآن جو علم باری کے کامل ومحیط ہونے کا شد ومد سے اثبات کرتا ہے اور اللہ کے عَلِيم، سمیع، بصیر ہونے کو بار بار پیش کرتا ہے اس کا ایک مقصد فلاسفہ کے اس وہم باطل کی تردید کرنا ہے۔
۴۶۱ (اور زیادہ)
مُسْلِمَيْنِ کے معنی یہاں دو طرح کئے گئے ہیں ایک اللہ کی توحید کے ماننے والے بلا شائبۂ شرک وشرکت۔
ای موحدین مخلصین لا نعبد الا ایاك (کبیر)
دوسرے اسلام کے عام احکام کے پابند۔
ای قائمین بجمیع شرائع الاسلام (کبیر)
لیکن دونوں معنی ایک دوسرے کے منافی بالکل نہیں مُسْلِم کے ترجمہ فرمانبردار میں نہ وہ وسعت ہے نہ وہ لطف جو خود لفظ مُسْلِم میں ہے۔
مسلمون ای منقادون للحق مذعنون له (راغب)
فرمانبردار بندے یا مسلم تو وہ اس وقت بھی تھے جب دعا کر رہے تھے دعا کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہماری فرمانبرداری میں مزید ترقی دے
والمعنی زدنا اخلاصا واذعانا لك (کشاف) والمراد طلب الزیادۃ فی الاخلاص والاذعان او الثبات علیه (بیضاوی)
۴۶۲ أُمَّةً مُسْلِمَةً کے ترجمہ "فرمانبردار امت" میں وہ بلاغت ومعنویت کہاں جو قرآنی لفظ امتِ مسلمہ میں ہے دعا کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ وہ امت آج تک اسی نام سے مشہور چلی آتی ہے دوست دشمن سب کی زبان پر۔ ایک یہودی ٹوری (TOWRY) نامی امریکہ کی ییل (YALE) یونیورسٹی کا استاد اپنی اسلام دشمنی میں آکسفورڈ والے مارگولیس آنجہانی کا پورا جانشین ہے لیکن ایک بات بڑے پتے کی اس کی زبان سے بھی نکل گئی ہے کہتا ہے:۔
"اسلام کی بنیاد تو حقیقۃً اسمٰعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہل عرب کے مورثِ اعلیٰ ہیں" (جیوش فاؤنڈیشن آف اسلام صفحہ

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور ہم کو ہمارے دینی قاعدے بتلا دے ۴۶۳ اور ہمارے حال پر توجہ رکھ ۴۶۴ یقیناً تو ہی تو ہے بڑا توجہ فرمانیوالا بڑا مہربان

مِنْ ذُرِّيَّتِنَا یعنی ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مشترک نسل سے۔
دعا دونوں بزرگوار مل کر کر رہے تھے، اس لئے ذریت سے مراد بنی اسمٰعیل ہی ہو سکتے تھے۔
برناباز (BARNABAS) نامی حضرت مسیح کے ایک بلند پایہ حواری (صحابی) ہوئے ہیں ان کی انجیل کو مسیحیوں نے اپنے مذاق و مسلک کے بالکل ناموافق پاکر اس کی اصلیت ہی سے انکار کر دیا ہے اس انجیل کے نسخے انگریزی، عربی، اردو، تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔
اس میں صراحت کے ساتھ ہے کہ عہد الٰہی اسمٰعیل کے ساتھ ہوا تھا نہ کہ اسحٰق کے ساتھ:۔
وقولی لانی اقول لکم الحق ان العھد صنع باسمٰعیل لا باسحٰق (۳۱،۴۳)
میری بات کا یقین کرو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وعدہ اسمٰعیل سے کیا گیا تھا نہ کہ اسحٰق سے۔
اور پھر ہے:۔
وان الموعد صُنع باسمٰعیل لا باسحٰق (۱۸:۴۴) وعدہ اسمٰعیل سے کیا گیا تھا نہ کہ اسحاق سے۔

۴۶۳ مَنَاسِكَنَا یعنی عام دینی قاعدے خصوصاً بیت اللہ کے حج و زیارت کے آداب و شعائر، مناسک جمع ہے منسک کی اور منسک ہر عبادت ہے۔
قیل مناسک الحج ومعالمه قاله قتادة والسدی وقیل جمیع المتعبدات وکل ما یتعبد به الی الله تعالٰی، یقال له مَنسَكٌ ومَنسِكٌ (قرطبی) وفی الشرع اسم للعبادة یقال رجل ناسك ای عابد (جصاص)
واصل النسك العبادة والناسك العابد (معالم)
اَرِنَا۔ اِرَاءَۃ کے معنی یہاں آنکھ سے دکھلا دینے کے نہیں بلکہ سکھلا دینے، بتلا دینے کے ہیں۔
ای علمنا وعرفنا (معالم) علمنا (جلالین) قال عطاء اخبر بها لنا علمناها (ابن جریر)
فعل رأی کا تعدیہ جب دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی رؤیت کے نہیں علم کے ہو جاتے ہیں۔
رأی اذا عُدی الی مفعولین اقتضی معنی العلم (راغب) الرؤية ههنا بمعنى العلم (ابن قتیبه)
ابن حاجب نحوی اور ابوحیان مفسر نے اس معنی کے قبول کرنے سے انکار بھی کیا ہے لیکن جب تائید میں راغب اور زمخشری جیسے مستند امامانِ ادب و لغت کی شہادتیں موجود ہیں تو کسی کا انکار چل نہیں سکتا۔
وانکر ابن الحاجب واتبعه ابوحیان ثبوت رأی بمعنى عرف وذكره الزمخشری فی المفصل والراغب فی مفرداته وهما من الثقات فلا عبرة بانكارهما۔ (روح)

۴۶۴ (رحمت و شفقت و مغفرت کے ساتھ، جیسی کہ اب تک رکھی ہے۔)
وتوبة الرب علی عبده عوده عليه بالعفو له عن جرمه والصفح له عن عقوبة ذنبه مغفرة له منه وتفضلا عليه (ابن جریر)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اے ہمارے پروردگار! ان میں ایک پیغمبر انہیں میں سے بھیج ۳۶۶ (جو) انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب (الٰہی)

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اور دانائی کی تعلیم دے اور انہیں پاک (و صاف) کرے ۳۶۷ یقیناً تو ہی تو ہے بڑا زبردست بڑا حکمت والا ۳۶۸

عصمت انبیاء کا عقیدہ ایک الگ شے ہے اور بجائے خود ثابت و مسلّم، لیکن خود نبی پر تو خشیت و عبدیت کا غلبہ دل پر بھی بڑھ کر رہتا ہے، وہ تو بہر صورت اپنے لئے ہر وقت عفو و مغفرت اور رحمت ہی کا طالب رہتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ طلب توجہ، رحمت کے ثبات و دوام کے لئے تھی:۔

وقالت طائفۃ طلبا للتثبیت والدوام لا انہما کان لہما ذنب (قرطبی)

یہی کہا گیا ہے کہ عوام کی توبہ اور ہے خواص کی اور، اور اخص الخواص کی ان سے بھی بلند و ممتاز۔

وتوبۃ خواص الخواص لرفع الدرجات والترقی فی المقامات (روح)

۳۶۵ (تو تیرے لئے ہماری اس دعا کو شرف قبول بخش دینا کچھ بھی دشوار نہیں)

آیت سے بڑی تعلیم آداب کی بھی مل رہی ہے، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ جیسی مقدس ہستیاں بھی جب عاد دعا کرتی ہیں تو کن نمایاں آثار عبودیت کے ساتھ!

۳۶۶ مِنْهُمْ۔ یہ قید خوب خیال میں رہے، دعائے ابراہیمی ابھی چل رہی ہے، ابھی ابھی آپ اور حضرت اسمٰعیل دونوں مل کر عرض کر چکے ہیں کہ اے پروردگار ہم دونوں کی نسل میں سے ایک امت مسلمہ، ایک اپنی فرمانبردار امت پیدا کر، اور اس کے معاً بعد مِنْهُمْ کا لفظ لاتے ہیں، کھلی ہوئی مراد نسل اسمٰعیلی سے ہے، لفظ ھُمْ کا مرجع ذرّیّۃ کو سمجھا گیا ہے اور امت مسلمہ کو بھی۔

والضمیر فی منہم یحتمل ان یعود علی الذریۃ ویحتمل ان یعود علی امۃ مسلمۃ (بحر)

ماحصل دونوں کا ایک ہی یعنی نسل اسماعیلی، اور یہ جزو تاریخ سے اپنی جگہ ثابت ہے کہ صحیح النسب نسل اسماعیلی قوم عرب ہی رہ گئی تھی، اس لئے لازمی تھا کہ یہ پیغمبر عرب ہی میں پیدا ہو۔

رَسُولًا۔ اس کا ایک تو صیغہ واحد اور پھر اعراب کی تنوین، گویا یہ اشارہ قریب بہ صراحت پہنچ گیا کہ وہ رسول ایک ہی ہوگا، متعدد نہ ہوں گے۔

یہود کا دعوٰی ہے (اور نصاریٰ بھی انہیں کا ساتھ دیتے ہیں) کہ نبوت و رسالت تو بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص تھی، یہ نیا پیغمبر بنی اسمٰعیل میں کیسے پیدا ہو گیا؟ لیکن انہیں کی توریت باوجود ان کی ساری تحریفات کے اب تک شہادت کچھ اور ہی دے رہی ہے، ایک جگہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھرو۔" (استثناء ۱۸: ۱۵)

قطع نظر اس سے کہ بنی اسرائیل میں تو ایک نبی نہیں خدا معلوم کتنے انبیاء حضرت موسیٰؑ کے بعد پیدا ہوتے رہے،

خود "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی تصریح بتا رہی ہے کہ مراد بنی اسرائیل نہیں بلکہ ان کے ہم جد بھائی بنی اسمٰعیل ہیں اگر خبر اسرائیلی ہی نبی کی دینا ہوتی تو بجائے "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کے عبارت "تجھ ہی میں سے" ہوتی۔ یہ الفاظ تو صرف مخاطبین کی وحشت دور کرنے اور ان میں جذبۂ انس و موانست پیدا کرنے کے لئے ہیں کہ اے میری قوم جو واجب وہ نبی آئے تو اس کی اطاعت کرنا، وہ بھی تمہارا غیر نہیں تمہارے ہی بھائیوں میں سے ہوگا، اور پھر دو ہی آیتوں کے بعد توریت میں بعینہٖ یہی مضمون براہ راست حق تعالےٰ کی جانب سے ادا کیا گیا ہے :-

"خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لئے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔" (استثنا ۔ ۱۸ : ۱۸)

اب دیکھئے کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" یعنی لفظی کلام الٰہی ہونے کا مصداق بجز قرآن کے ساری آسمانی کتابوں میں اور ہے ہی کون؟ لفظی کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کس دوسری کتاب کا ہے؟ پھر دیکھئے کہ "تجھ سا" یعنی "موسیٰ کا سا" ہونے کا مصداق تاریخ کی دنیا میں بجز ذات محمدیؐ کے اور ہوا کون ہے؟ اور کیا اس سے بھی قطع نظر ممکن ہوگی کہ یہاں بھی بجائے "ان ہی" کے یا "اسرائیلیوں ہی سے" کے صراحت "ان کے بھائیوں ہی سے" ہونے کی موجود ہے۔

اور پھر یہی پیش گوئی انھیں لفظوں میں موسیٰ نبی کی زبان سے نکلی ہوئی، نصاریٰ کی انجیل میں بھی دہرائی ہوئی موجود ہے

"موسیٰ نے کہا کہ خداوند خدا تمھارے بھائیوں میں سے تمھارے لئے مجھ سا نبی پیدا کرے گا۔ جو کچھ وہ تم سے کہے تم اس کی سننا۔" (اعمال ۔ ۳ : ۲۲)

۴۶۷ ذرا سا غور کرنے سے نظر آجائے گا کہ رسول اعظمؐ کے جملہ فرائض کمال ایجاز کے ساتھ ان چند فقروں میں آگئے ہیں

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ ۔ رسول کا پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوت آیات ہوتا ہے یعنی اللہ کا کلام پہنچانا، گویا رسول کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہوتی ہے۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ۔ رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا، اس کا کام کتاب الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے، اس تعلیم کے اندر کتاب کی شرح، ترجمانی، تفسیر، تفصیل، تخصیص، تعمیم سب کچھ آگئی اور یہیں سے ان کج فہموں کی بھی تردید ہو گئی، جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا قاصد کا سمجھے ہوئے ہیں، گویا رسول کی دوسری حیثیت معلم اعظم کی ہوئی۔

وَالْحِكْمَةَ ۔ پھر رسول تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت و دانائی کی تلقین بھی امت کو کریں گے، احکام و مسائل دین کے قاعدے اور آداب عوام و خواص سب کو سکھائیں گے اور خواص کی رہنمائی اسرار و رموز میں بھی کریں گے، گویا رسول کی تیسری حیثیت مرشد اعظم کی ہوئی۔

يُزَكِّيْهِمْ ۔ تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے، رسول کا کام محض الفاظ اور احکام ظاہر کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے گویا رسول کی یہ چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہوئی۔

۴۶۸ (تو تو اس دعا کو کیوں نہ قبول کرے گا۔)

اِنَّكَ اَنْتَ ۔ عربی کے اس دہرے فقرۂ مخاطبت کا مفہوم اردو میں یقیناً "تو تو" (پہلا "تو" واؤ معروف اور

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

اور ابراہیم کے مذہب سے کون پھرے گا مگر وہی جس نے اپنے کو احمق بنا لیا ہو ۴۶۹

دوسرا "و" واؤ مجہول کے ساتھ) ادا ہوتا ہے۔

العَزِيْزُ۔ ہر دعا کے قبول کرنے پر، ہر آرزو کے پورا کرنے پر قادر جس کی مشیت پر ملتی اور غالب کوئی چیز نہیں آسکتی عزۃ کے معنی شدت اور قوت اور غلبہ کے ہیں اور العزیز وہ ہے جس کی قوت پر کوئی غالب نہ آسکے۔

هو الغالب القوى الذى لايغلب والعزة فى الاصل القوة والشدة والغلبة (نهاية)

الْحَكِيْمُ۔ قادر مطلق ہونے کے ساتھ حکیم مطلق بھی، قبول وہی دعائیں کرتا ہے بندوں کی آرزوئیں وہی پوری کرتا ہے جو قانونِ حکمت کے مطابق و ماتحت ہوتی ہیں۔ الحکیم کے معنی حکمران و قاضی کے بھی ہیں اور چیزوں کے پختہ و کامل کرنے والے کے بھی اور صاحبِ حکمت کے بھی اور خود حکمت کے بھی بہترین علوم کے ساتھ بہترین اشیاء کی معرفت کے۔

الحكيم بمعنى الحاكم وهو القاضى والحكيم فعيل بمعنى فاعل أو هو الذى يحكم الاشياء ويتقنها فهو فعيل بمعنى مفعل وقيل الحكيم ذو الحكمة والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم ويقال لمن يحسن دقائق الصناعات ويتقنها حكيم (نهاية)

اللہ اکبر! خلیل و ذبیح کی ادب شناسیوں کا کیا کہنا! دعائیں بھی کیسے کیسے نکتے ملحوظ رکھ لئے ہیں۔۔۔ حضرات انبیاء سے بڑھ کر ادب شناس اور ہو بھی کون سکتا ہے؟

۴۶۹ (اور اپنے کو نفع و نقصان کی موٹی تمیز سے بھی محروم کر لیا ہو۔) یعنی ملتِ ابراہیمی تو عین دینِ فطرت ہے اس کی تعلیمات عین طبعِ سلیم کی ترجمان ہیں اس سے کنارہ کشی تو صرف وہی اختیار کر سکتا ہے جس کی فطرت ہی سلیم نہ باقی رہی ہو، بلکہ مسخ ہو چکی ہو۔ اس مقدمہ کی تصدیق انسان جب چاہے اعتقاد سے نہیں آزمائش سے کر لے۔ اسلام نے جماعت (سوسائٹی) کا جو نظام قائم کیا ہے وہی بہترین نظامِ اجتماعی ہے ہر فرد کے لئے جو ضابطۂ عمل بنا دیا وہی بہترین ضابطۂ شخصی ہے عقل و جذبات، فرد و جماعت، دل و دماغ، جسم و روح، حریت و اطاعت، حیاتِ بشری کے متضاد و متناقض عنصروں کی جتنی باہمی رعایت شریعتِ اسلام نے ملحوظ رکھی ہے، دنیا کے کسی قانون میں کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی۔

دعائے ابراہیمی ختم ہوئی، اب بیان ملتِ ابراہیمی کا شروع ہو رہا ہے کہ یہ تو وہی دینِ توحید ہے جس کی دعوت آج اسلام دے رہا ہے اور جسے تم سب باوجود اپنے مشترک بزرگ ابراہیمؑ کی پیروی کے دعوے کے چھوڑے بیٹھے ہو۔

مِلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ۔ قرآن نے عجب بلاغت و نکتہ سنجی سے کام لے کر یہاں اپنے دینِ اسلام کی نسبت نہ حق تعالٰی کی جانب کی نہ رسولِ وقت حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب، بلکہ صرف ابراہیمؑ خلیل کی جانب کی، یہاں مخاطب اصلی یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب ہیں اور یہ تینوں قومیں مسلمانوں ہی کی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مقدس پیشوا مانتی تھیں، اس اسلوبِ بیان کو اختیار کر کے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن تمہیں کسی نئے دین کی دعوت نہیں دے رہا، تمہارے ہی بزرگ و محترم پیشوا ابراہیمؑ ہی کے دین کی جانب تمہیں بلا رہا ہے! ۔۔۔ تلطف اور حسنِ تبلیغ کا پیرایہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا، مشرکین عرب

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور ہم نے تو انھیں دنیا میں بھی برگزیدہ کر لیا تھا ۴۷۰ اور آخرت میں بھی وہ زمرۂ صالحین میں ہوں گے ۴۷۱ اور (وہ

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ حکم بردار بن جاؤ ۴۷۲ وہ بولے میں حکم بردار ہو جاتا ہوں سارے جہان کے پروردگار کا ۴۷۳

کے پاس آسمانی کتاب کی قسم سے کوئی کتاب تو نام کے لئے بھی موجود نہ تھی۔ البتہ یہود و نصاریٰ کے نوشتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل اس وقت بھی درج تھے اور آج تک لکھے چلے آ رہے ہیں۔ توریت مروجہ میں ہے:-

"اپنے باپ ابراہام پر اور سرہ پر جو تمہیں جنی نگاہ کرو کہ جب میں نے اسے بلایا وہ اکیلا تھا، پھر اس کو برکت دی اور اس کو بہت بنایا" (یسعیاہ۔ ۵۱: ۲) "اے ابراہام تو مت ڈر۔ میں تیری سپر اور تیرا بہت بڑا اجر ہوں" (پیدائش۔ ۱۵: ۱) "اور وہ خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے صداقت محسوب ہوا" (پیدائش ۱۵: ۶)

اور مسیحیوں کی انجیل مروجہ میں ہے:-

"ابراہیم خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے راست بازی گنا گیا۔ پس جان لو کہ جو ایمان والے ہیں وہی ابراہیم کے فرزند ہیں" (گلتیون۔ ۳: ۶) نیز (رومیون۔ ۴: ۳)

مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ ہماری شریعت وہی شریعت ابراہیمی ہی ہے، بجز ان حصوں کے کہ جو اب منسوخ ہو گئے ہیں:-

وقد یتدل بھذہ الآیۃ من قال ان شریعۃ ابراھیم شریعۃ لنا الا ما نسخ منھا (قرطبی)

یدل علی لزوم اتباع ابراھیم فی شرائعہ فیما لم یثبت نسخہ (جصاص)

۴۷۰ (ان کی اسی توحید پرستی اور ایمان بالشر کے صلہ میں ہر قسم کی نعمتوں اور سرفرازیوں کے لئے یہاں تک کہ منصب رسالت و نبوت کے لئے)

ایک مسیحی مؤرخ ریونڈ ولیم ڈین (DEANE) ایم۔ اے نے ایک مستقل سیرت ابراہیم انگریزی میں لکھی ہے، اس سے آپ کے دنیوی عروج و اقبال پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے۔ ان "روشن خیال" لامذہبوں کی تردید کے لئے یہی کافی ہے جنھوں نے اسی انیسویں صدی کے آخر میں آپ کے وجود کو فرضی قرار دیا تھا۔

۴۷۱ (ایک پیغمبر جلیل القدر کے شایان شان)

یہود و نصاریٰ نے اہل کتاب ہونے اور نبوت و سلسلۂ وحی پر ایمان رکھنے کے باوجود اپنے اپنے نوشتوں میں کوئی کسر عصمت انبیاء کے داغدار بنانے میں اٹھا نہیں رکھی، اس لئے قرآن مجید جہاں جہاں انبیائے سابق کا ذکر کرتا ہے اکثر ان حضرات کی اخلاقی و روحانی عظمت پر بھی زور دیتا ہے اور اسی طرح انبیائے برحق کی نصرت و حمایت کا فرض توریت و انجیل کی عائد کی ہوئی فرد جرم کے مقابلہ میں ادا کرتا جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب اہل کتاب نبی اور نبوت کے قائل گویا ان الفاظ کے صرف لفظی معنی میں تھے، یعنی نبی وہ ہے جو کاہنوں، جوتشیوں کی طرح غیب کی خبریں دے سکے، اور اسے انھیں

يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اے بیٹو بے شک اللہ نے تمہارے لئے دین کا انتخاب فرما لیا ہے ۴۷۷ سو ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ تم مرتے وقت بجز مسلم کے کچھ اور ہو

اور عہد لینے کا سلسلہ قائم رہا۔

امہ یعنی بنی للشاتہ عہد الیہم عہد ابعد عہد واوصی وصیۃ بعد وصیۃ (ابن جریر)

فیہ معنی التکثیر (قرطبی)

بنیہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے آٹھ تھے: (۱) حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ہاجرہ مصری کے بطن سے (۲) حضرت اسحاقؑ، حضرت سارہ عراقی کے بطن سے (۳) زمران (۴) یقسان (۵) مدان (۶) مدیان (۷) اسباق (۸) سوخ۔ یہ سب حضرت قطورہ کے بطن سے تھے (پیدائش ۲۵: ۱ و ۲)

۴۷۵ (ہدایت کر گئے۔)

یعقوبؑ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے پوتے اور حضرت اسحاقؑ نبی کے صاحبزادہ تھے اور نبی زادہ ہونے کے علاوہ خود بھی نبی تھے۔ اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔ توریت میں ہے:-

"اور خدا نے اُسے کہا کہ تیرا نام یعقوب ہے، تیرا نام آگے کو یعقوب نہ کہلائے گا بلکہ تیرا نام اسرائیل ہوگا، سو اس نے اس کا نام اسرائیل رکھا۔" (پیدائش۔ ۳۵: ۱۰ و ۱۱)

عمر حسب روایت توریت ایک سو سینتالیس ۱۴۷ سال کی پائی۔ زمانہ غالباً ۲۰۰۰ ق م تا ۱۸۵۳ ق م۔ ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی۔ ۱۸۶۸ ق م میں اپنے نامور فرزند یوسفؑ نبی کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے، وفات یہیں ہوئی۔

۴۷۶ چار ازواج طاہرات سے آپ کے بارہ ۱۲ فرزند تھے۔ ان کے نام حسب تصریح توریت حسب ذیل ہیں:-
روبن، شمعون، لاوی، یہوداہ، اشکار، زبلون، یوسف، بن یامین، دان، نفتالی، جد، آشر ۱۲۔
(پیدائش ۳۵: ۲۲-۲۶)

(انہیں صاحبزادوں میں سے جہاں تک خاندانی شجرہ اور نسب نامہ سے پتہ چلا ہے لاوی کی نسل سے ان سطور کا راقم نامہ سیاہ بھی ہے۔)

۴۷۷ الدّین۔ یعنی اس دین توحید کا، ملت اسلام کا، ال عہد کا ہے یعنی جانا پہچانا ہوا دین اسلام۔

والالف واللام فی الدّین للعھد لانھم قد کانوا عرفوہ (قرطبی)

اصطفٰی۔ اصطفاء کے معنی ہیں چن لینا اور ملاوٹ یا آمیزش سے پاک کر دینا۔

لکم۔ میں لام تخصیص کا ہے یعنی یہ دین تمہارے لئے ہے اور تم اس دین کے لئے ہو۔

مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو قوم عرب اور نسل یہود دونوں کے مورث اعلیٰ ہوئے ہیں اور نصاریٰ کے بھی مقتدا اور حضرت یعقوبؑ جو نسل اسرائیلی کے جد امجد ہوئے ہیں یہ دونوں تو اپنی اولاد کو خود اپنے اختیار کئے ہوئے اور خدا کے پسند کئے ہوئے دین کو منتقل ہی کر گئے اور فرما گئے کہ تم تعیین کسی مزید تلاش میں حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت ہی نہیں تمہارے لئے تو یہ اللہ کا بنایا ہوا، اور بتایا ہوا دین توحید موجود ہی ہے۔ قرآن کے مخاطبین

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ

بھلا اس وقت تم کیا موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آپہنچی ۴۷۹ اور اس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے

مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَآئِكَ إِبْرَٰهِيمَ

کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے ۴۸۰ وہ بولے ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا اور آپ کے

وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ إِلَٰهًا وَٰحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۳﴾

باپ دادوں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی (اُس) خدائے واحد کی اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں ۴۸۱

اول کے سب اسلاف پرستی کے مرض میں گرفتار تھے ان سے خطاب کا یہ بہترین اسلوب ہے کہ اچھا اگر دین کے بارے میں اپنے اسلاف ہی کو حکم بنا رہے ہو تو دیکھو وہی کیا کہہ گئے ہیں۔

۴۷۸ (اور چونکہ موت کا وقت انسان کے علم میں نہیں اس لئے تیار اس کے لئے ہر وقت اور ہمیشہ رہو)

مطلب یہ ہوا کہ مسلم ہمہ وقت بنے رہو، ایمان کو ہر لحظہ دل میں جگہ دیئے رہو۔

معناہ داوموا علی الاسلام حتی لا یصادفکم الموت الا وانتم مسلمون (معالم) ای احفوا فی حال الحیاۃ والزموا ھذا لیرزقکم اللہ الوفاۃ علیہ (ابن کثیر) ای الزموا الاسلام ودوموا علیہ ولا تفارقوہ حتی تموتوا (قرطبی)

دین کے مطالبات میں بس ایک ایمان ہی کا مطالبہ ایسا ہے جو ہمہ وقتی اور ہمہ حالی ہے، ورنہ اعمال جتنے بھی ہیں سب حالات کے تابع ہیں اور حالات خود تغیر پذیر ہیں۔ ضمناً اہل کتاب کو بھی فہمائش ہو رہی ہے کہ تم جس دین کو نیا اجنبی اور انوکھا سمجھ کر اس سے بدکتے اور بھڑکتے ہو وہ تو پیدا نہیں وہ تو عین تمھارے ہی بزرگوں کا تسلیم کیا ہوا دین ہے۔ (راقم سطور نامہ سیاہ سے اگر فرمائش کی جائے کہ سارے قرآن مجید سے کسی ایک آیت کا اپنے لئے انتخاب کرے تو اس کی نظر انتخاب اسی آیت بلکہ اس کے آخری جزء پر پڑے گی۔ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ۔ جی یہی ہے کہ زندگی کی ہر ساعت میں یہی آیت ورد زبان رہے اور دل پر اسی کے معنی کا استحضار رہے، موت کے وقت یہی دل وزبان پر ہو اور بعد موت یہی کفن پر بھی لکھ دی جائے اور قبر کے کتبہ پر بھی کندہ کردی جائے، بارہا اس آیت پر وجد طاری ہو چکا ہے، بارہا اس آیت پر آنسو جاری رہ چکے ہیں اور دل یہ کہتا ہے کہ احکام کی حد تک سارے قرآن مجید کا لُبِّ لباب یہی آیت ہے)

۴۷۹ (اور آپ کو اس کے علامات و آثار محسوس ہونے لگے)

حَضَرَ الْمَوْتُ۔ یعنی وقتِ موعود قریب آگیا، یہ مراد نہیں کہ خود موت ہی آپ پر طاری ہو گئی۔

ای مقدماتہ واسبابہ (قرطبی) کنی بالموت عن مقدماتہ لانہ اذا حضر الموت نفسہ لا یقول المحتضر شیئا (بحر) ای حین قرب یعقوب من الموت (معالم)

قرآن مجید ہی میں ایک اور دوسری جگہ ہے وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ. یہاں بھی موت سے مراد موت کے دواعی و اسباب ہی لئے گئے ہیں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ خطاب اہل کتاب سے ہے اور استفہام میں لہجۂ زجر شامل ہے۔

والخطاب للیهود والنصاریٰ .... وقال لهم علی جهة التوبیخ (قرطبی) معنی الاستفهام ههنا الجحود والتوبیخ یحق معنی النفی (بحر) والخطاب مع اهل الکتاب (کبیر)

یعنی تم جو واہیات خرافات حضرت یعقوبؑ کی جانب منسوب کر رہے ہو تو تمہارا اس وقت وجود ہی کہاں تھا؟ صحیح واقعات وہ ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے۔

اَمْ۔ بَل کے معنی میں بھی لیا گیا ہے۔

ای بل اشهدا سلافکم یعقوب (قرطبی)

۴۸۰ آیت سے اس کی تعلیم ملتی ہے کہ حضرات انبیاء کو زندگی بھر کی طرح اپنے آخر وقت میں بھی سب سے مقدم فکر دین ہی کی ہوتی ہے اور اپنی اولاد کے حق میں ان کی سب سے بڑی شفقت یہی ہے۔

الآیه دالة علی ان شفقة الانبیاء علی اولادهم کانت فی باب الدین وهمتهم مصروفة الیه دون غیره (کبیر)

مَا تَعْبُدُوْنَ میں مَا عام ہے ای شئ کے معنی میں۔ بیجان کے ساتھ مخصوص نہیں۔

ما عام فی کل شئ والمعنی ای شئ تعبدون (کبیر)

مِنْ بَعْدِیْ۔ یعنی میری وفات کے بعد مضاف محذوف ہے۔

ای من بعد موتی (ابو سعود)

۴۸۱ یعنی "ہم سب اس پر اسلام لا چکے ہیں"۔

توریت موجودہ کے اوراق تو اس اہم اور ضروری تذکرہ سے کسی مصلحت سے خاموش ہیں۔ البتہ احبار یہود کا یہ قول نقل ہو کر پہنچا ہے کہ:۔

"یعقوبؑ نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹوں کو یہ تین احکام دیئے (۱) بت پرستی نہ کرنا (۲) خدا کی بے حرمتی نہ کرنا (۳) میرے جنازہ کو کوئی کافر ہاتھ نہ لگانے پائے"۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۷ صفحہ ۲۲)

روایات و حکایات یہود کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں صراحت اس سے بڑھ کر ملتی ہے:۔

"یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا .... مجھے اندیشہ ہے کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا "سن اے اسرائیل اے ہمارے باپ! ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے"۔ (گنزبرگ کی قصص یہود جلد ۲ صفحہ ۱۴۱)

اٰبَآئِكَ۔ اسمٰعیلؑ یعقوبؑ کے بڑے چچا (یا تایا) تھے، فرزندان یعقوبؑ نے کمال سعادت مندی سے ان کا شمار بھی آبا یعقوبؑ میں کیا جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی باپ چچا کو ایک ہی حکم میں رکھا جاتا ہے حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے "آپ کے چچا حضرت عباسؓ کے لئے بھی لفظ اَبْ آیا ہے"

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ۴۸۲ ان کے آگے ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا

تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾

اور وہ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی ۴۸۳

[illegible] یعنی میرے بڑوں یا بزرگوں میں بھی باقی ہیں۔

آیت میں دادا اور چچا دونوں کے لئے لفظ اَبْ ہی آیا ہے۔

اسحٰق۔ یہ نام پہلی بار آیا ہے۔ حضرت ابراہیم کے دوسرے صاحبزادے تھے، حرم اول حضرت سارہ کے بطن سے۔ سال ولادت غالباً [illegible] ق م، سال وفات [illegible] ق م۔ عمر شریف توریت میں ایک سو اسّی سال درج ہے، یہ بھی درج ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو سال تھی۔

آپ کے بستر مرگ کا منظر قصص الیہود میں یوں دکھایا گیا ہے:۔

”جب اسحٰق نے دیکھا کہ ان کا وقت موعود آپہنچا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات علی، عظیم، قیوم، عزیز ہیں اور جو آسمان، زمین اور ان کے درمیان کی ہر شے کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔“ (جلد اول ص [illegible])

۴۸۲ (اور ان کے فضائل و کمالات بھی ان کے ساتھ گزر چکے، تمہیں آخر ان کے نام گنانے سے کیا حاصل؟) تِلْكَ اُمَّةٌ سے مراد یہی اجداد یہود ہیں جن کا شمار جماعت انبیاء میں ہے۔ خطاب یہاں یہود سے ہے جو آبائی خوش نسلی، عظمت اور پیرزادگی کے نشہ میں چور تھے۔ اس میں بڑا سبق آج کے پیرزادوں، رسمی مشائخ زادوں اور بہت سے بدعتی فرقوں کے لئے موجود ہے، بلا سعی عمل بزرگوں کی محض نسبت سے فائدہ اٹھانے کی جڑ ہی اسلام نے کاٹ دی ہے۔

۴۸۳ اسلام کے طفیل اب یہ بات معمولی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اس وقت بہت ہی اہم اور گویا ایک نادر سی بات تھی۔ شخصی و ذاتی ذمہ داری اور انفرادی مسئولیت کی تعلیم اسلام کے خصوصیات امتیازی میں سے ہے۔ ورنہ مشرک تو مشرک یہود اہل توحید تک اس سفاہت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ذاتی عمل کی ضرورت ہی کیا ہے، مقبولان الٰہی کی جانب انتساب نسلی اور بزرگوں کی طرف نسبت نسبی بالکل کافی ہے۔ مسیحیوں کا گڑھا ہوا مسئلہ ”معصیت متوارث“ سب کو معلوم ہے، یعنی جو معصیت ابو البشر سے سرزد ہو گئی تھی وہ ہر نسل آدم میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ یہود نے اس کے مقابل ایک عقیدہ ”نجات متوارث“ کا وضع کر لیا تھا، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ:۔

”خدائے تعالیٰ اپنے اسم پاک کے طفیل میں اور بطور اپنے افضال کے باپ کے حسنات اولاد کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے۔“ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۲، ص [illegible])۔

توریت مروجہ میں ایک آیت اسی مضمون کی ملتی ہے:۔

”میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارٰى تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ

اور یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو راہ یاب ہو جاؤ گے ٤٨٤ آپ کہہ دیجئے ٤٨٥ کہ نہیں بلکہ ہم نے تو ابراہیم یکسو والے کا مذہب پا لیا ٤٨٦

پشت تک جو میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں۔" (استثناء ۵ : ۹)

بس تنکے کی اوٹ پہاڑ، یہ کھڑا کر لیا گیا کہ ہر نسل کو انتقال ثواب اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی یعنی اسلاف واخلاف دونوں کی طرف سے ہوتا رہے گا، اور پھر اولاد ابراہیم کو تو کوئی ڈر ہی نہیں :۔

"بعض کو ثواب اپنے اسلاف کے اعمال کا ملے گا، اور بعض کو ثواب اپنے اخلاف کے اعمال کا۔"

(جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۲ صفحہ ٦)

"افراد یہود کی امیدیں سب اسلاف کے تقدس پر قائم ہو گئی تھیں (یعنی اس پر کہ) ہم ابراہیم کی اولاد ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۳ طبع یازدہم صفحہ ١٨٣)

مفسرین نے بھی آیت سے یہی مطلب لیا ہے کہ گمراہ قوموں خصوصاً یہود کی آباء پرستی پر ضرب لگائی جا رہی اور شخصی وانفرادی مسئولیت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

یعنی لا یؤاخذ احد بعمل غیرہ (معالم) ای ان السلف الماضین من آبائکم من الانبیاء والصالحین لا ینفعکم انتسابکم الیہم اذا لم تفعلوا خیرا یعود نفعہ علیکم (ابن کثیر)

آیت سے ان لوگوں کی بھی تردید نکل آئی ہے جنھوں نے مشرکین کے بچوں کو ان کے والدین کے جرم کی پاداش پر معذب ہونا مانا ہے۔

ھذا یدل علی معان احدھا ان الابناء لا یثابون علی طاعۃ الآباء ولا یعذبون علی ذنوبھم وفیہ ابطال مذھب من یجوز تعذیب اولاد المشرکین بذنوب الآباء ویبطل مذھب من یزعم من الیھود ان اللہ تعالٰی یغفر لھم ذنوبھم بصلاح آبائھم (جصاص)

٤٨٤ قرآن مجید کی صفا اور سیدھی تعلیمات اور اس کے واضح دلائل کو سن کر چاہئے تو یہ تھا کہ اہل کتاب ان سے متاثر ہوتے اور قبول حق پر آمادہ ہو جاتے لیکن بجائے اس کے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اُلٹے مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا دین قبول کر لو تو تمھیں دنیا کی فلاح اور آخرت میں نجات حاصل ہو جائے

٤٨٥ (ساری اُمتِ اسلامیہ کی طرف سے ان لوگوں کے جواب میں اے ہمارے پیغمبر)

٤٨٦ (اس کی اصلی اور غیر محرف شکل میں)

مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ۔ یہود اور نصاریٰ دونوں، نومسلموں اور نیم مسلموں کو اپنی اپنی طرف کھینچتے تھے کہ "فلاح ونجات منظور ہو تو ہمارے مذہب میں آؤ، اس نئے مذہب میں کیا رکھا ہے؟" مسلمانوں کو تعلیم اس جواب کی مل رہی ہے کہ "تمھارے ہاں کیا رکھا ہے بجز تحریفات کے؟ رہا ہمارا دین تو وہ کوئی نیا ذرا بھی نہیں وہ تو بس قدیم دین توحید ابراہیم علیہ السلام کا ہے اور ہم اسی کی اصلی اور غیر محرف شکل پر قائم ہیں۔"

حَنِيفًا۔ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے مضاف الیہ ابراہیم کا، اکثر اکابر تفسیر اسی طرف گئے ہیں۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

اور وہ مشرکین میں کے نہ تھے ۴۸۷ کہہ دو کہ ہم تو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر

اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

جو ہم پر اتارا گیا ۴۸۸ اور جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ

(یعقوبؑ) پر اتارا گیا ۴۸۹ اور جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو دیا گیا اور اس پر جو دوسرے انبیاء کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا

حال من المضاف الیہ (کشاف) ھو حال من المضاف الیہ (ابو سعود)

دوسرا قول یہ ہے کہ حَنِيْفًا صفت ابراہیمؑ کی نہیں بلکہ ملّہ کی ہے اور حال مضاف الیہ کا نہیں بلکہ مضاف کا واقع ہوا ہے۔

وھو حال من المضاف بتاویل الدین او بتشبیھہ بفعیل بمعنی مفعول (روح)

اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا: "ہم نے پالیا ہے مذہب ابراہیمؑ کا جو سیدھی راہ ہے"۔

خود حنیف کے معنی لغت میں دو آئے ہیں، ایک مستقیم اور محمد بن کعب قرظی سے یہاں یہی مروی ہے۔

الحنیف ھو المستقیم .. .. قالوا فکل من اسلم للہ ولم ینحرف عنہ فی شئ فھو حنیف وھو مروی عن محمد بن کعب القرظی (کبیر) فامّا الحنیف فانہ المستقیم من کل شئ (ابن جریر)

اور دوسرے معنی جھکے ہونے یا مائل کے ہیں اور اس مفہوم میں مراد یہ ہوگی کہ دین حق کی طرف جھکے ہوئے تھے۔

الحنیف المائل فالمعنی ان ابراھیم حنف الی دین اللہ ای مال الیہ (کبیر) الحنف ھو میل عن الضلال الی الاستقامۃ والحنیف ھو المائل الی ذلک (راغب)

۴۸۷ یہ تعریض ہے اہل کتاب پر کہ تم کس منہ سے اپنے کو دین ابراہیمؑ کی جانب منسوب کرتے ہو، وہ تو شرک کے قریب ہو کر بھی نہیں گزرے تھے، ابراہیم علیہ السلام کی توحید خالص پر یہود و نصاریٰ سب ہی متفق تھے مگر عملاً ان کی روش چھوڑے ہوئے تھے بلکہ مسیحی تو صریح شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔

۴۸۸ (اللہ کے ہاں سے ہمارے پیمبر کے واسطے سے)

خطاب عام مسلمانوں سے ہے یعنی ہمیں تو نسلی یا قومی تعصب کسی سے بھی نہیں، ہمارا رشتہ اسمٰعیلی، اسرائیلی، ہر شریعت الٰہی سے بس اعتقاد و انقیاد ہی کا ہے۔

۴۸۹ (اللہ کے ہاں سے)

اَلْاَسْبَاط جمع ہے سبط کی اور معنی ہیں اولاد کی اولاد یا پوتے اور نواسے۔

الاسباط اولاد اولاد وقیل اولاد البنات (تاج) السبط ولد الولد کانہ امتداد الفروع۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے ۴۹۱ اور ہم اللہ ہی کے حکم بردار ہیں ۴۹۲

والاسباط ای قبائل کل قبیلۃ من نسل رجل (راغب)
اختلاف اس میں ہوا ہے کہ آیا یہ مخصوص ہے پوتوں یا نواسوں کے لئے لیکن قول فیصل یہ ہے کہ پوتوں اور نواسوں دونوں کے لئے عام ہے۔
کلام الائمۃ صریح فی انہ یشمل ولد الابن والابنۃ کما صرح بہ ابن سیدۃ (تاج)
جس طرح بنی اسمٰعیل کی شاخیں قبائل میں تقسیم ہوئی گئیں اسی طرح بنی اسرائیل کی شاخیں اسباط کہلائیں اور اس طرح یہ لفظ اسرائیلی شاخوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔
قال الازھری الاسباط فی بنی اسحٰق بمنزلۃ القبائل فی بنی اسمٰعیل (تاج) فی بنی اسحٰق ویعقوب کالقبائل فی بنی اسمٰعیل .... انما سموا ھؤلاء بالاسباط وھؤلاء بالقبائل لیفصل بین ولد اسمٰعیل وولد اسحٰق (بیضاوی)
نسل اسرائیل میں نبوت بہت وسیع پیمانہ پر پھیلی رہی۔ فقرہ کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مسلمان کسی پیمبر کے بھی منکر نہیں۔
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ۔ یہ دونوں نام اس سیاق اور اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ اسمٰعیل علیہ السلام کا نام لانا تو اس لئے ضروری تھا کہ اہل کتاب انھیں سے تعلق رکھتے تھے۔ بغیر ان کا نام لائے اسلام کے دعوی کا اثبات ہی نہیں ہو سکتا تھا لیکن اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے نام لانا خود ایک دلیل روشن ہے اسلام کے فراخ دلی اور بے تعصبی کی۔ قرآن اگر بشری کلام ہوتا تو بشری فطرت تو یہ تھی کہ اہل کتاب کے شدید اور مسلسل اشتعال انگیز تعصب کے جواب میں اسمٰعیلؑ کی نصرت وحمایت میں اسحاقؑ ویعقوبؑ کے نام ہی نظر انداز کر دیئے جاتے۔
ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ تینوں کی تاریخی شخصیتوں پر حاشیے اوپر گزر چکے۔
۴۹۰ (کلام الٰہی یا کتاب آسمانی میں سے)
مُوْسٰی۔ آپ کی تاریخی شخصیت پر حاشیہ گزر چکا۔
عِيْسٰى۔ ابن مریم، بجائے والد کے اپنی والدہ کی جانب منسوب ہیں۔ بنی اسرائیل کے آخری اور مشہور نبی ہوئے ہیں آپ پر سلسلہ اسرائیلی رسالت کا، بلکہ قومی ونسلی رسالت کا، ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، ولادت صوبۂ یہودیہ (ملک شام) کے قصبہ بیت اللحم میں یا بیت المقدس میں، حاکم شام ہیرود کے زمانہ میں ہوئی۔ شام اس وقت روم کی شہنشاہی کا ایک نیم آزاد علاقہ تھا، سال ولادت اغلباً ۸ ق م ہے یہ بات سننے میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی لیکن اس پر اتنی حیرت نہ کیجئے سنہ عیسوی جو اس وقت رائج ہے خود اسی تقویم کے قائم کرنے میں شروع ہی سے غلطی رہ گئی اور اس کا پتہ بعد کو چلا چنانچہ سنہ عیسوی کا پہلا سال آپ کا سال ولادت نہیں آپ کی ولادت کے چوتھے سال سے یہ سنہ جاری ہوا ہے آپ کی عمر غالباً تینتیس سال کی تھی اور سنہ ۳۰ عیسوی تھا کہ اسرائیلیوں نے آپ کی تعلیم وتبلیغ سے نہایت درجہ آزردہ ہو کر آپ پر مقدمہ پہلے تو اپنی آزاد وخود مختار مذہبی عدالت میں چلایا، اور پھر سرکاری قانون کا مجرم بنا کر رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش کیا، وہاں سے سزائے موت (بذریعہ صلیب) کا حکم صادر ہوا، اس کے بعد

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ

تو اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان رکھتے ہو تو بیشک وہ راہ پا گئے ۴۹۳ اور اگر وہ منہ موڑے رہیں تو

فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾

بس وہ (بڑی) مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴ سو اب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں بس ہے ۴۹۵۔ اور وہ (بڑا) سننے والا (بڑا) جاننے والا ہے ۴۹۶

کیا گزری، اس کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیت وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کے تحت میں انشاء اللہ آئے گا۔

۴۹۱ (کہ ان میں سے کسی کو بھی مرسل مانیں کسی کو نہ مانیں)

اسلام کے ایک جدید و نو پیدا مذہب ہونے کی یہ تردید ایک بار پھر کی جارہی ہے، عالمگیر مذہب آج ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا وہ ہو سکتا ہے جو ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، ہر زمانہ کے پیغمبروں اور سچے ہادیوں کی علانیہ اور پرزور تصدیق کر رہا ہے یا وہ مذہب ہو سکتے ہیں جو آسمانی ہدایت کو فلاں ملک فلاں قوم، فلاں نسل کے ساتھ مخصوص و مقید کئے ہوئے ہیں؟

بَیْنَ اَحَدٍ۔ اَحَد یہاں جماعت کے معنی میں ہے، اور اس لئے اس پر بَیْنَ کا لانا درست ہے۔

واحد فی معنی الجماعۃ ولذا صح دخول بین علیہ (مدارک) قد اریدبہ ھنا الجماعۃ ولھذا ساغ ان یضاف الیہ بین ویفید عموم الجماعات کذا قال بعض المحققین (روح) وھو للعموم (بحر) احد ھھنا ھو المستعمل فی النفی لان بین لایضاف الا الی جمع او الی واحد معطوف علیہ وقیل احد ھنا بمعنی الفریق (عکبری)

۴۹۲ (وہ ہم کو جس کی بھی اطاعت کا حکم دے گا ہم اس کے پیرو ہو جائیں گے ہمیں کسی سے نہ تعصب نہ عناد ہم تو بس امر الٰہی کے فرمانبردار ہیں)

اسلامی تعلیمات کا عطر بات بات پر بس یہی مسئلۂ توحید ہے۔

۴۹۳ (اور اپنے ایمان کی بنا پر نجات کے مستحق ہو گئے)

خطاب مسلمانوں سے ہے اور یہ لوگ سے مراد وہی منکرو کافر اہل کتاب ہیں جن کا سلسلہ اوپر سے چلا آرہا ہے اس میں بشارت ہے کہ اتنی ضد و عناد کے باوجود اگر اب بھی وہ ایمان لے آئیں تو ان کا پچھلا کفر و عناد ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا فَاِنْ اٰمَنُوْا میں ف سے اشارہ اس طرف ہے کہ اب جب کہ تعلیم اسلامی کا معیار ان پر پوری طرح واضح ہو چکا۔

بِمِثْلِ۔ ب مؤکدہ ہے اور مثل بطور صلۂ کلام ہے۔

قیل ان الباء زائدۃ مؤکدۃ ومثل زائدۃ کما فی قولہ تعالی لیس کمثلہ شیء ای لیس کھو شیء (قرطبی) انما زائدۃ للتاکید (روح)۔

تقدیر کلام یوں بھی گئی ہے اسمانا مثل ایمانکم (عکبری)

بِهٖ ضمیر اللہ کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور قرآن اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۱۳۸)

(ہمارے اوپر) اللہ کا رنگ ہے^۴۹۷ اور اللہ سے بہتر کون رنگ (دینے والا) ہے^۴۹۸ ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں^۴۹۹

والہاء ترجع الی اللہ او القرآن او محمد (عکبری)

۴۹۴ (حق و راہ راست سے)

یعنی اتنی واضح ہدایت پہنچ جانے کے بعد اگر اب بھی ایمان نہ لائیں تو اب جو انہیں مخالفت ہے وہ مخالفت ہی کی غرض سے ضد اور عداوت ہی کی بنا پر ہے اس لئے نہیں کہ وضوح حق میں کوئی خفا یا ابہام باقی رہ گیا ہے اب جو وہ دین کو نہیں سمجھتے تو محض اس لئے کہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔

علمنا انہ لیس غرضہم طلب الدین والانقیاد للحق وانما غرضہم المنازعۃ واظہار العداوۃ ای ہماہم الا فی خلاف وعداوۃ ولیسوا من طلب الحق فی شئ (مدارک)

۴۹۵ پیمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسکین اور تسلی دی جارہی ہے کہ آپ ہجوم اعداء اور قوت و کثرت مخالفین سے ذرا بھی تشویش و فکر نہ کریں یہ حق کے معاندین آپ کو اور آپکے دین کو گزند پہنچانے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے اب اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ آیت میں بڑا سبق صبر و تسکین کا امت کیلئے ہجوم اعداء و مخالفین کے وقت ہے۔

۴۹۶ اس پر ہر مخالفت جلی و خفی روشن ہے۔

السمیع۔ سننے والا ان کے الفاظ و اقوال، ان کے حرف و عبارت کا یعنی جو کچھ ان کی زبانوں پر ہے ان کی گفتگوئیں اور تقریریں سب اللہ پر روشن ہیں۔

سَمِیع، فَعِیل کے وزن پر صیغۂ مبالغہ ہے اور السَّمِیع وہ ہے جو بڑا ہی سننے والا ہے اور ہر خفی سے خفی آواز کو بغیر اس کے کہ اس کے پاس سننے کا عضو یعنی کان موجود ہو۔

السمیع الذی لا یعزب عن ادراکہ مسموع وان خفی فہو یسمع بغیر جارحۃ وفعیل من ابنیۃ المبالغۃ (نہایہ)

العَلِیْمُ۔ جاننے والا ان کے دلوں کے احوال و اسرار کا یعنی ان کے ظاہر کی طرح ان کا باطن بھی اس عالم کل پر روشن ہے اور ان کی اندرونی کارروائیاں اور سازشیں سب اس کے سامنے بے نقاب موجود ہیں۔

عَلِیْمٌ بروزن فعیل صیغۂ مبالغہ ہے۔

العلیم ہو العالم المحیط علمہ بجمیع الاشیاء ظاہرہا وباطنہا ودقیقہا وجلیلہا علی اتم الامکان وفعیل من ابنیۃ المبالغۃ (نہایہ)

۴۹۷ یعنی اس کے دین کا رنگ، دین فطرت کا رنگ جو اہل حق میں اس طرح جذب و پیوست ہو گیا جیسے کپڑے میں رنگ جذب و پیوست ہو جاتا ہے۔

یعنی تعالیٰ ذکرہ بالصبغۃ صبغۃ الاسلام (ابن جریر) ای دین اللہ قالہ ابن عباس وسمی صبغۃ لظہور اثر الدین علی صاحبہ کظہور اثر الصبغ علی الثوب ولانہ یلزمہ ولا یفارقہ (بحر) قال الضحاک عن ابن عباس دین اللہ وکذا روی عن مجاہد و ابی العالیۃ وعکرمۃ وابراہیم والحسن

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

آپ کہیے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے باب میں حجت کیے جاتے ہو ۵۰۰ درانحالیکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی

اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

پروردگار ہے ۵۰۱ اور ہمارے عمل ہمارے لیے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لیے ہیں اور ہم تو اسی کے لیے مخلص ہیں ۵۰۲

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ

کیا تم (یہ) کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد (یعقوبؑ) یہودی یا نصرانی تھے ۵۰۳

وقتادۃ والضحاک وعبد اللہ بن کثیر وعطیۃ العوفی والربیع بن انس والسدی نحو ذلک (ابن کثیر)

تقدیر کلام یوں بھی کی گئی ہے۔ صبغنا اللہ صبغۃ (بیضاوی) صبغنا اللہ بالایمان صبغۃ (مدارک)

یعنی ہمیں اللہ نے (اپنے) رنگ میں رنگ دیا ہے۔

لے سخن اوپر سے یہود و نصاریٰ کی طرف چلا آرہا ہے، ان دونوں کے ہاں بڑی اہمیت ایک خاص قسم کے رنگ ظاہری یا غسل کی تھی جسے بپتسمہ یا اصطباغ کہا جاتا تھا، انھیں کی اصطلاح میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے، لازم پکڑنے کی چیز تو توحید ہے۔

یعنی الزموا دین اللہ (معالم)

۴۹۸ (جس کا دین ایمان کے رنگ کو نکھار دیتا ہے، اور کفر و ضلالت کی نجاستوں کو دور کر دیتا ہے)

فالمراد انہ یصبغ عبادہ بالایمان ویطہرہم بہ من اوساخ الکفر فلا صبغۃ احسن من صبغتہ (کشاف، کبیر)

۴۹۹ (اور سارے عقائدِ باطل، شعائرِ باطل، معبودانِ باطل کے منکر ہیں)

نَحْنُ۔ ہم یعنی مسلمان یا امتِ مسلمہ۔

۵۰۰ خطاب اگرچہ سارے اہلِ باطل کے لیے عام ہے لیکن سیاق میں خاص طور پر مراد یہود و نصاریٰ ہیں

ذکروا فیہ وجوہا احدہا انہ خطاب للیہود والنصاریٰ وہو الیق بنظم الآیۃ (کبیر)

فِي اللّٰهِ۔ یعنی اللہ کے دین کے باب میں۔

ای فی دین اللہ والقرب منہ (قرطبی)

۵۰۱ (تو کم از کم اس کی ذات و صفات کے باب میں تو تمہیں کوئی مغالطہ یا غلط فہمی نہ رہنا چاہیے)

یعنی اے اہلِ کتاب جب ہمارے تمہارے درمیان کوئی اختلاف پروردگار کے تعین میں نہیں، تو اول تو اس کی توحید پر قائم رہنا چاہیے اور تثلیث فی التوحید یا توحید فی التثلیث اور خدا کے فرزند یا فرزندوں وغیرہ قسم کے خرافات سے بالکل بچنا چاہیے دوسرے جب اس کی صفاتِ کمالیہ پر ایمان ہے تو وہ اپنی حکمت و ربوبیت کے تقاضے سے جس نسل کے جس فرد کو بھی چاہے نبوت و رسالت سے سرفراز کر دے وہ ہر طرح مالک و مختار ہے، اسرائیلی، غیر اسرائیلی کسی خاص نسل کا اجارہ نہیں۔

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ

آپ کہیے تم واقف تر ہو ۵۰۴ یا اللہ ۵۰۵ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اس شہادت کو چھپائے

مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

جو اس کے پاس اللہ کے ہاں سے پہنچ چکی ہے ۵۰۶ اور اللہ تمہارے کرتوت سے بےخبر تو ہے نہیں

۵۰۲ (اپنے عقائد اور اپنی عبادات میں ہر شرک، ہر ضلالت سے پاک صاف ہو کر)
یہ اعمال تو ہمارے اور اپنے اعمال کے فرق کا اثر آخرت میں تو تمہیں بھی نظر آجائے گا، آج جتنا چاہو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر لو۔
وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ میں تعریض ہے مخاطبین (یہود و نصاریٰ) پر کہ ہم تمہاری طرح نہیں، جو خدائے واحد کے کلام میں غیر اللہ کی اور اس کی عبادت میں شرک کی آمیزش کر دیتے تھے۔
فیه تعریض للیهود والنصاریٰ بالشرك الذی هم علیه (نهر)
۵۰۳ یعنی کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ان پیغمبروں، بزرگوں اور تمہارے مورثوں کے عقائد، ذات و صفاتِ باری کے باب میں بجائے دینِ توحید و اسلام کے یہودیت و نصرانیت کے تھے۔
اَمْ تَقُوْلُوْنَ خطاب اہلِ کتاب خصوصاً یہود سے ہے، اور لہجۂ خطاب میں زجر کا پہلو شامل ہے۔
صیغة استفهام ومعناه التوبیخ (معالم) اورد الله هذا الکلام فی معرض الاستفهام علی سبیل الانکار والغرض منه الزجر والتوبیخ (کبیر)
جتنے اسماء و اعلام یہاں آئے ہیں، ان سب پر حاشیے آیت ۱۳۶ کے ذیل میں اور اس کے قبل گزر چکے۔
۵۰۴ (ان حضرات کے دین و عقائد کے باب میں)
یہ مخاطبین پر بطور طنز و تعریض کے ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم سے کسی بندہ کا بھی کیا مقابلہ ہے؟ چہ جائیکہ منکروں کافر بندوں کے علم کا۔
ذلك علی سبیل التهکم بهم والاستهزاء (بحر)
۵۰۵ (اور اللہ کی شہادت یہ ہے کہ یہ سب توحید خالص کے پیرو تھے)
نزولِ قرآن کے وقت یہود میں بڑے بڑے عالم و فاضل موجود تھے، ان سب کو چیلنج دے کر ایک امی کی زبان سے کہلایا جا رہا ہے کہ تم واقعات کو توڑ مروڑ کر، صداقتوں کا گلا گھونٹ کر جو کچھ بھی کہے جاؤ، واقعہ اور حقیقت یہی ہے کہ یہ سب حضرات خالص موحد اور توحید کے مبلغ ہوئے ہیں، آج یورپ کے بڑے بڑے ماہرینِ تاریخ اور محققینِ اثریات جو کچھ ان حضرات کے دین کی بابت کہہ رہے ہیں وہ اسی قرآنی متن کی شرح اور اسی امی کے لائے ہوئے کلام کے اجمال کی تفصیل ہے۔
۵۰۶ (اور وہ شہادت ہے دینِ اسلام کے برحق ہونے کی، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کے موحد کامل اور مبلغِ توحید ہونے کی، اور آخر زمانہ میں ایک رسولِ برحق کے ظہور کی)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ٥٠٨ ان کا کیا ہوا ان کے آگے آئے گا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے آگے آئے گا ٥٠٩

تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی ٥١٠

اس شہادت کو چھپانے والے ظاہر ہے کہ اہل کتاب خصوصاً یہود کے علماء تھے اور یہ شہادت محفوظ تھی ان کی مسلّم آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں میں۔

شهادة فی کتمانهم امر محمد صلی الله علیه وسلم ونبوته (ابن جریر) وهی شهادة الله لابراهیم بالحنفیة (مدارک) وفیه تعریض بکتمانهم شهادة الله لمحمد علیه السلام بالنبوة فی کتبهم وسائر شهاداته (مدارک)

٥٠٧ (اور وہ وقت آنے پر انہیں کے مطابق تم سے معاملہ کرے گا)
مطمئن اور بے فکر نہ ہو جاؤ، وہاں رتی رتی کی خبر ہے اور ویسا ہی معاملہ پیش آئے گا، وہاں بزرگوں کے ساتھ نسبی و نسلی انتساب ہرگز کام نہ دے گا، منکروں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اس سے بہتر اور موثر کوئی ذریعہ ہے کہ اللہ کے عالم الغیب ہونے کا استحضار ذہن کے سامنے بار بار ہوتا ہے، اور قرآن مجید یہی کراتا رہتا ہے۔

٥٠٨ (اور محض ان کے نام کا انتساب بغیر ان کے سے اعمال و عقائد کے ہرگز کافی نہیں)۔
تِلْكَ أُمَّةٌ سے مراد ہیں قوم اسرائیل کے اکابر سلف خصوصاً اجداد ثلثہ ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ جن کی اولاد ہونے پر اسرائیلیوں کو حدود جائز سے زیادہ ناز تھا، نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ٤٨٣۔

٥٠٩ (آخرت میں)
یعنی نہ ان کے ایمان و اعمال صالحہ سے تمہیں کچھ نفع پہنچے گا اور نہ تمہارے کفر و اعمال سیئہ سے انہیں کوئی ضرر پہنچے گا

٥١٠ یہود کی کتابوں میں آج تک یہ تعلیمات موجود ہیں کہ "جس طرح انگور کی زندہ و شاداب بیل ایک بے جان ستون کے سہارے بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے اسی طرح زندہ یہودی اپنے آنجہانی اور مرحوم مورثوں اور بزرگوں کے بل بوتے پر پروان چڑھتا رہتا ہے اور تینوں اجداد اسرائیل نیز دوسرے صالحین و اخیار نے اعمال صالحہ کا جو انبار عظیم لگا دیا ہے اسی سے ان کی اولاد کو مجموعاً و منفرداً برابر حصہ ملتا رہتا ہے، اور اس طرح کسی فرد میں خواہ کتنی ہی کمزوریاں ہوں اس کی نجات یقینی ہے۔" قرآن حکیم اس "نجات متوارث" کے عقیدہ پر برابر ضرب شدید لگاتا جاتا ہے، نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ٤٨٤۔

یہ آیت ابھی پہلے ہی گزر چکی تھی، مکرر تاکید کی غرض سے لائی گئی۔

کررت للتاکید (مدارک) کررها لانها تضمنت معنی التهدید والتخویف (قرطبی) تکریر للمبالغة فی التهدید والزجر عما استحکم فی الطباع من الافتخار بالآباء والاتکال علیهم (بیضاوی)

سَيَقُولُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ

اب بیوقوف لوگ (ضرور) کہیں گے ۱۱۵ کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو اُن کے (اس) قبلہ سے جس پر وہ اب تک

۱۱۵ (بطور استفہام و استفسار نہیں، بلکہ بطور طنز و تعریض)

الاستفہام ھنا خرج بہ الی الاستہزاء والتعجب (روح)

سَيَقُولُ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل کے لئے ہو اور اس کے معنی عنقریب کے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مطلق تاکید کے لئے ہو اور معنی صیغۂ ماضی کے دے۔ اور چونکہ آیت کا نزول ایک قول کے مطابق حکم تحویلِ قبلہ سے قبل نہیں اس کے بعد ہوا ہے اس لئے مفسرین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہاں ماضی مراد ہے اور اردو محاورہ میں اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی گزرے ہوئے واقعہ سے متعلق کہا جائے کہ ہم تو جانتے ہی تھے کہ یہ لوگ ضرور اس پر اعتراض کریں گے

[illegible] لانہ من [illegible] سیقول [illegible]

قیل ان سَيَقُولُ بمعنی قال (روح)

اور اسی سے ملتا ہوا یہ قول بھی ہے کہ صیغۂ ماضی یہاں اُس اعتراض کے استمرار کو ظاہر کرنے کو لایا گیا ہے یعنی یہ لوگ برابر اس طرح کہتے رہیں گے۔

[illegible] المستقبل [illegible]

یفعلون [illegible] المستقبل موضع الماضی دلالۃ علی استدامۃ ذلک وانہم یستمرون علی ذلک القول (قرطبی) وسیقول ظاہر فی الاستقبال (بحر)

اس صورت میں بالکل درست ہوگا اگر آیت کو ایک سچی پیشین گوئی یا اخبار بالغیب کی مثال میں بھی پیش کیا جائے۔

ان اللہ تعالی اخبرھم قبل ان ذکروا ھذا الکلام انہم سیذکرونہ [illegible]

[illegible] النبی صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] ھذا القول فی [illegible]

[illegible] والمؤمنین بہ قبل وقوعہ (معالم)

انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی قیام مکہ کے زمانہ میں اسی قبلہ کی طرف رخ پر نماز جاری رکھی جب مدینہ ہجرت فرمائی جب بھی اُسی قبلہ کو برقرار رکھا۔ بیت المقدس مدینہ سے سمت شمال میں واقع ہے آپ کا دل بار بار یہ چاہتا تھا کہ اپنے جدِّ بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے خانۂ کعبہ کو قبلہ بنائیں لیکن حکم الٰہی اب تک یہ نہیں ہوا تھا آخر وردِ مدینہ کے سولہ مہینہ بعد تحویلِ قبلہ کا حکم ملا کہ اب نماز بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی جائے حکم کی تعمیل فوراً ہوئی۔ خانۂ کعبہ مکہ میں مدینہ سے ٹھیک جنوب میں واقع ہے اور اس طرح مدینہ کے نمازیوں کے رُخ دفعۃً شمال سے جنوب کی جانب پھر گئے۔

بیت المقدس یہود کا قبلہ تھا، اس کی منسوخی کا اعلان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہود کو بہت ہی ناگوار گزرا، وہ یوں بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا دشمن اور اپنے دین کا بیخ کن سمجھنے لگے تھے تحویلِ قبلہ کے اس تازہ اعلان کو وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھے اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کرنے لگے ان کے ہمنوا

كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

تھے ۵۱۲ بتا دیا۔ آپ کہہ دیجیے ۵۱۳ کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ملک ہیں ۵۱۴ وہ جسے چاہے ۵۱۵

کچھ اور لوگ بھی منافقوں اور بددینوں میں سے ہوگئے۔

سُفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ سے یہی لوگ مراد ہیں سُفَهَاء جمع ہے سَفِیْه کی اور سَفِیْه کے معنی کم عقل یا بدعقل کے ہیں

السَّفَهُ خِفَّةٌ تَعْتَرِي ... وَاسْتُعْمِلَ فِي خِفَّةِ النَّفْسِ لِنُقْصَانِ الْعَقْلِ (راغب)

یہاں سفاہت کا اطلاق احکام الٰہی میں قیل وقال کرنے والوں کے حق میں ہے۔

السفہاء سے مراد یہود کا ہونا صحیح بخاری میں موجود ہے۔

السُّفَهَاءُ هُمُ الْيَهُوْدُ (بخاری کتاب التفسیر عن البراء)

مفسرین کثر اسی طرف گئے ہیں۔

وَالْمُرَادُ بِالسُّفَهَاءِ الْيَهُوْدُ الَّذِيْنَ بِالْمَدِيْنَةِ قَالَهُ مُجَاهِدٌ (قرطبی)

بعض روایتیں منافقین مدینہ سے متعلق بھی ملتی ہیں۔

نَزَلَتْ فِي الْمُنَافِقِيْنَ (ابن جریر عن السدی)

راجح یہ ہے کہ آیت عام رکھی جائے تمام معترضین کے لئے۔

وَالْآيَةُ عَامَّةٌ فِي هٰؤُلَاءِ كُلِّهِمْ وَيُمْكِنُ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهِ الْكُلُّ لِاَنَّ لَفْظَ السُّفَهَاءِ لَفْظُ عُمُوْمٍ (كبير) لِاَنَّهُ يُفِيْدُ الْكُلَّ (كبير) وَالْمُتَبَادِرُ وَعُمُوْمُهُ يَشْمَلُ سَائِرَ الْمُنْكِرِيْنَ لِتَغْيِيْرِ الْقِبْلَةِ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْيَهُوْدِ وَالْمُشْرِكِيْنَ۔ (روح)

۵۱۲ یعنی بیت المقدس سے۔

قِبْلَةٌ۔ وہ مکان ہے جس کے مقابل منہ کرکے نماز پڑھی جائے۔

صَارَ اسْمًا لِلْمَكَانِ الْمُقَابِلِ الْمُتَوَجَّهِ اِلَيْهِ لِلصَّلٰوةِ (راغب۔ روح)

یہ حکم سب سے زیادہ ناگوار یہودیوں کو گزرا، اب تک وہ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ مسلمان کم از کم ان کے ہم قبلہ تو ہیں، اب یہ مسرت بھی ان سے چھن گئی۔

آیت سے یہ حقیقت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نماز پہلے غیر کعبہ کی طرف پڑھی جاتی تھی اور اس کے بعد سمت خانۂ کعبہ مقرر ہوئی۔

وَقَدْ نَصَّ اللّٰهُ فِي هٰذِهِ الْاٰيَاتِ عَلٰى اَنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ اِلٰى غَيْرِ الْكَعْبَةِ ثُمَّ حَوَّلَهَا اِلَيْهَا (جصاص)

فقہاء مفسرین نے کتاب اللہ سے سنت کے نسخ کی مثال میں اس حکم کو بھی پیش کیا ہے، حضورؐ بیت المقدس کی طرف رخ تو اپنے اجتہاد سے کئے ہوئے تھے، قرآن مجید میں اس کا کوئی حکم نہ تھا، قرآن مجید نے تو اسے صرف منسوخ کیا ہے۔

هٰذِهِ الْاٰيَةُ يَحْتَجُّ بِهَا مَنْ يُّجَوِّزُ نَسْخَ السُّنَّةِ بِالْقُرْاٰنِ لِاَنَّ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يُصَلِّيْ اِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَلَيْسَ فِي الْقُرْاٰنِ ذِكْرُ ذٰلِكَ ثُمَّ نَسَخَ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ (جصاص) وَدَلَّتْ عَلٰى

إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا

سیدھی راہ چلا دیتا ہے ۵۱۶ اور اسی طرح ہم نے تمھیں بنا دیا ۵۱۷ ایک امت عادل ۵۱۸ تاکہ تم

جَوَازِ نَسْخِ السُّنَّةِ بِالْقُرْاٰنِ وَذٰلِكَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى نَحْوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَلَيْسَ فِيْ ذٰلِكَ قُرْاٰنٌ فَلَمْ يَكُنِ الْحُكْمُ اِلَّا مِنْ جِهَةِ السُّنَّةِ ثُمَّ نُسِخَ ذٰلِكَ بِالْقُرْاٰنِ (قرطبی)

۵۱۳ (ان کے جواب میں، اے ہمارے پیغمبر)

۵۱۴ (اور کسی خاص سمت و جہت میں کوئی تقدس رکھا ہوا نہیں ہے اس کے لئے سب برابر ہیں، وہ جدھر اور جس چیز کو بھی چاہے، نماز کے لئے رخ مقرر کر دے، سوال اصلاً پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔)

معترضین کا اعتراض تمام تر جہت پر تھا، اور افسوس ہے کہ مفسرین بھی اس بحث میں الجھ گئے ہیں قرآن مجید نفس اس اعتراض ہی کو ہٹاتا ہے، اور بار بار کہتا ہے کہ کسی جہت کی کیا خاص اہمیت ہے، جہت سب اللہ کے نزدیک ایک ہی ہیں۔

لِلّٰهِ میں لام ملکیت کا ہے، مشرق و مغرب سب اللہ کی ملک میں، مخلوق ہیں، ہر دوسری مخلوق کی طرح تابع و محکوم ہیں، یہ ضرب ہے مشرق پرستی، مغرب پرستی، اور ہر قسم کی سمت پرستی پر، جو مختلف مشرک جاہلی قوموں کا مذہب رہی ہے، شرک کی اس خاص سمت پرستی یا جہت پرستی پر حاشیہ اوپر گزر چکا، پارہ اول رکوع ۱۴، آیت ۱۱۵ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کے تحت میں۔

۵۱۵ (اور اس کا چاہنا ہمیشہ قانون حکمت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔)

مَنْ يَّشَاءُ یعنی قانون مشیت کے ماتحت و مطابق، اور مشیت کے تحت میں سارے ہی مصالح تکوینی آ گئے۔

۵۱۶ (اور اسے بے چون و چرا رسول یا وقت کے سب سے بڑے حکیم الٰہی و عالم ربانی کے اتباع کی توفیق دیتا ہے)

فقہاء مفسرین نے کہا ہے کہ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ قرآن کا نزول تدریجاً ہوا ہے اور احکام مختلف حالات کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں۔

فِيْهَا دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْقُرْاٰنَ كَانَ يَنْزِلُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ وَفِيْ حَالٍ بَعْدَ حَالٍ عَلٰى حَسَبِ الْحَاجَةِ اِلَيْهِ حَتّٰى اَكْمَلَ اللّٰهُ دِيْنَهٗ (قرطبی)

۵۱۷ (اے مسلمانو)

وَكَذٰلِكَ۔ اسی طرح یعنی ایک اسی مسئلہ پر موقوف نہیں، ہر معاملہ میں۔

۵۱۸ یعنی ایسی امت جو ہر اعتبار اور ہر معیار سے غایت اعتدال پر ہو، ہر کجی اور ہر افراط و تفریط سے پاک، اردو محاورہ کے مطابق متوازن۔

وَسَطًا عربی زبان میں یہ لفظ خاص مدح کے لئے آتا ہے۔

وَاَمَّا الْوَسَطُ فَاِنَّهٗ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ الْخِيَارُ (ابن جریر) اُسْتُعِيْرَ لِلْخِصَالِ الْمَحْمُوْدَةِ لِوُقُوْعِهَا بَيْنَ طَرَفَيْ اِفْرَاطٍ وَتَفْرِيْطٍ۔ (بیضاوی)

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ

گواہ رہو لوگوں پر ۵۱۹ اور رسول

معنوی اعتبار سے لفظ کہنا چاہیے کہ تمام خصالِ محمودہ کا جامع ہے یعنی ایسی اُمت جو ساری رُوحانی واخلاقی قدروں کی حامل ہو۔

حدیث نبوی میں وَسَط کی تفسیر عَدْل سے آئی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمَّۃً وَّسَطًا قَالَ عَدْلًا (ابن جریر عن احمد)

اور عَدْل کا لفظ عربی میں خود بڑا وسیع اور جامع ہے اور ائمۂ لغت سے یہی معنی منقول ہیں۔

قَالَ الْجَوْھَرِیُّ فِی الصِّحَاحِ اُمَّۃً وَّسَطًا اَیْ عَدْلًا وَھُوَ الَّذِیْ قَالَہُ الْاَخْفَشُ وَالْخَلِیْلُ وَقُطْرُبٌ

آیت سے یہ فقہی استنباط بھی کیا گیا ہے کہ اجماعِ اُمت خود ایک حجت ہے۔

اِحْتَجَّ جُمْھُوْرُ الْاَصْحَابِ وَجُمْھُوْرُ الْمُعْتَزِلَۃِ بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ عَلٰی اَنَّ اِجْمَاعَ الْاُمَّۃِ حُجَّۃٌ (کبیر) وَفِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی صِحَّۃِ الْاِجْمَاعِ وَوُجُوْبِ الْحُکْمِ بِہٖ (قرطبی) وَاسْتَدَلَّ الشَّیْخُ اَبُوْ مَنْصُوْرٍ رَحِمَہُ اللّٰہُ بِالْاٰیَۃِ عَلٰی اَنَّ الْاِجْمَاعَ حُجَّۃٌ لِاَنَّ اللّٰہَ وَصَفَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ بِالْعَدَالَۃِ وَالْعَدْلُ ھُوَ الْمُسْتَحِقُّ لِلشَّھَادَۃِ وَقَبُوْلِھَا فَاِذَا اجْتَمَعُوْا عَلٰی شَیْءٍ وَشَھِدُوْا بِہٖ لَزِمَ قَبُوْلُہٗ (مدارک)

آیت سے استدلال کیا گیا ہے اُمتِ محمدی کے خیر و عادل ہونے پر لیکن پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وصف تو عارضی ہے اور اپنے وجود کے لئے ہر فرد میں مستقل ثبوت کا محتاج ہوگا۔

قَالُوْا فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ دَلَالَۃٌ عَلٰی اَنَّ الْاَصْلَ فِی الْمُسْلِمِیْنَ الْعَدَالَۃُ وَھُوَ مَذْھَبُ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَاسْتَدَلَّ بِقَوْلِہٖ اُمَّۃً وَّسَطًا اَیْ عُدُوْلًا وَّخِیَارًا وَقَالَ بَقِیَّۃُ الْعُلَمَاءِ الْعَدَالَۃُ وَصْفٌ عَارِضٌ لَا یَثْبُتُ اِلَّا بِبَیِّنَۃٍ وَاخْتَارَ الْمُتَاَخِّرُوْنَ مِنْ اَصْحَابِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ مَا عَلَیْہِ الْجُمْھُوْرُ لِتَغَیُّرِ اَحْوَالِ النَّاسِ وَلِمَا غَلَبَ عَلَیْھِمْ فِیْ ھٰذَا الْوَقْتِ (بحر) فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ دَلَالَۃٌ عَلٰی صِحَّۃِ اِجْمَاعِ الْاُمَّۃِ مِنْ وَجْھَیْنِ اَحَدُھُمَا وَصْفُہٗ اِیَّاھَا بِالْعَدَالَۃِ وَاَنَّھَا خِیَارٌ ... وَالْوَجْہُ الْاٰخَرُ قَوْلُہٗ لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ بِمَعْنَی الْحُجَّۃِ عَلَیْھِمْ۔ (جصاص)

۵۱۹ ملتِ اسلامی انفرادی واجتماعی دونوں حیثیتوں سے ساری دنیا کے لئے بطور نمونہ کے تیار کی گئی تھی کائنات کی ہر اُمت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر پورا اُترنا چاہیے تھا نہ یہ کہ خود یہ اُمت اپنے کو بھول کر ہر مشرک ملحد بے مذہب اُمت کی تقلید و نقالی میں لگ جائے آیت سے کمال درجہ کی فضیلت اُمتِ اسلامی کی ثابت ہو رہی ہے

قَالَ عُلَمَاؤُنَا اَنْبَاَنَا رَبُّنَا تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہٖ بِمَا اَنْعَمَ عَلَیْنَا مِنْ تَفْضِیْلِہٖ لَنَا بِاسْمِ الْعَدَالَۃِ وَتَوْلِیَۃِ خَطِیْرِ الشَّھَادَۃِ عَلٰی جَمِیْعِ خَلْقِہٖ۔ (قرطبی)

شُھَدَاء سے یہ تنبیہ بھی نکل رہی ہے کہ مسلمانوں کو اخلاقی پستی اور فسق و فجور کی ہر صورت سے بچے رہنا چاہیے ورنہ پھر ادائے شہادت کے قابل ہی کہاں رہ جائیں گے اور دوسروں کے مقابلہ میں حجت کیسے ہو سکیں گے۔

عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا

گواہ رہیں تم پر ۵۲۰ اور جس قبلہ پر آپ (اب تک) تھے ۵۲۱ اُسے تو ہم نے اسی لئے رکھا تھا

لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ

کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع کرنے والوں کو اُلٹے پاؤں واپس چلے جانے والوں سے ۵۲۲

۵۲۰ جس طرح دنیا کی ہر اُمت کے لئے نمونہ اور معیار کا کام دینے کے لئے اُمّتِ اسلامیہ ہے خود اس اُمت کے لئے معیار کا کام دینے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ حضورؐ کی وفات کی خبر پا کر حضرت عمرؓ کا بے خود ہو جانا ایک مشہور و معلوم تاریخی واقعہ ہے۔ سیرۃ ابن ہشام میں خاتمہ کے قریب خود حضرت عمرؓ کی زبان سے یہ روایت درج ہے کہ اس وقت مجھے غلط فہمی اسی آیت سے ہوئی تھی۔ میں اس سے یہ سمجھے ہوئے تھا کہ آپ قیامت تک زندہ رہیں گے اور اُس روز اپنی امت کے اعمال پر گواہی دیں گے۔

فَاِنَّہٗ وَاللّٰہِ اِنْ کَانَ الَّذِیْ حَمَلَنِیْ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا اَنِّیْ کُنْتُ اَقْرَءُ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا فَوَاللّٰہِ اِنْ کُنْتُ لَاَظُنُّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَیَبْقٰی فِیْ اُمَّتِہٖ حَتّٰی یَشْھَدَ عَلَیْھَا بِاٰخِرِ اَعْمَالِھَا فَاِنَّہٗ الَّذِیْ حَمَلَنِیْ عَلٰی اَنْ قُلْتُ مَا قُلْتُ۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۴ ص ۳۳۱ ۔ مطبوعہ مطبع مصطفےٰ مصر)

اس کا باعث یہ تھا کہ میں اس آیت کو پڑھا کرتا تھا۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔ اور میں یہ سمجھتا تھا کہ حضورؐ اپنی اُمت میں قیامت تک زندہ رہ کر اُن کے اعمال کے گواہ ہوں گے پس اسی سبب میں نے اُس روز وہ گفتگو کی تھی۔

۵۲۱ (اور اس پر بھی اذنِ الٰہی ہی سے تھے)

یعنی بیت المقدس۔ اس سلسلہ میں یہ خوب ملحوظ رہے کہ اسلام میں قبلہ خواہ بیت المقدس ہو یا خانۂ کعبہ بہرحال ایک متعیّن و مخصوص مکان کا نام ہے خواہ وہ کسی مقام سے کسی طرف پڑے، نہ کہ کسی متعیّن سمت و جہت کا جیسا کہ مشرکوں کے ہاں اور مسیحیوں کے ہاں ہے۔

اس قبلہ پر آپؐ مدینہ میں آکر بھی سولہ، سترہ مہینے تک قائم رہے تھے۔

۵۲۲ (اور فرمانبرداروں کا امتیاز نافرمانوں سے کرلیں)

لِنَعْلَمَ۔ علم کے معنی یہاں تمیز و شناخت کے ہیں۔

ای لیمیّز بہ الثابت علٰی دینہ من المرتد (بحر) علی اطلاق العلم علٰی معنی التمیز لأن بالعلم یقع التمییز (بحر) الا لنمیز ھؤلاء من ھؤلاء ..... فسمّی التمییز علمًا (کبیر)

علم الٰہی کلّی میں تو ہر واقعہ شروع ہی سے موجود ہے لیکن کائنات میں جب تک کوئی واقعہ واقع نہ ہولے اُس پر

وَاِنۡ كَانَتۡ لَكَبِيۡرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ

اور یہ (حکم) بہت گراں ہے مگر ان لوگوں کو نہیں جنھیں اللہ نے راہ دکھادی ہے ۵۲۳ اور اللہ ایسا

اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ ؕ

نہیں کہ ضائع ہوجانے دے تمھارے ایمان کو ۵۲۴

واقعہ کا اطلاق نہ ہوگا، قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ مضمون آیا ہے مراد اس کے وقوعِ ظاہری، عملی سے ہوتی ہے۔

اور علم بیاں رویت کے معنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے:۔

قَالَ عَلِیٌّ معنی لِنَعۡلَمَ لِنَرٰی (قرطبی) علم عربی میں بہت دفعہ رؤیت کے مُرادف آجاتا ہے۔

وَالعَرَبُ تَضَعُ العِلۡمَ مَكَانَ الرُّؤۡيَةِ وَالرُّؤۡيَةَ مَكَانَ العِلۡمِ۔ (قرطبی)

۵۲۳ (اور وہ اطاعتِ رسول کے ذوقِ سلیم سے بہرہ ور رہیں۔)

وَاِنۡ كَانَتۡ۔ یعنی یہی حکم تحویلِ قبلہ۔

اَیۡ تَحۡوِيۡلُهَا قَالَهٗ اِبۡنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ۔ (قرطبی)

بعض علماء نے یہیں سے یہ استنباط کیا ہے کہ اہل قبلہ جتنے بھی ابا درجۂ ضروری تک راہ ہدایت پر ہیں۔ قبلہ پر قائم رہنا ایک بڑے امتحان سے گزرنا ہوا، اور اہل قبلہ کی عدم تکفیر کی ایک بنیاد بن گیا، گویا آخر آپ قبلہ فارق ہے اہلِ اہتدا اور اہلِ ضلال کے درمیان۔

آیت سے مدح و فضیلتِ صحابہ کرامؓ بھی نکلتی ہے، انھوں نے بے چوں وچرا محض تقلید عملِ رسولؐ میں فوراً اپنا منھ شمال سے جنوب کی جانب پھیر دیا۔

يَدُلُّ عَلٰی كَمَالِ طَاعَتِهِمۡ لِلّٰهِ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَانۡقِيَادِهِمۡ لِاَوَامِرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ۔ (ابن کثیر)

۵۲۴ (اور اعمالِ ایمانی کو)

بعض مسلمانوں کو یہود کے ورغلانے سے یا از خود یہ وہم ہوگیا تھا کہ جب اصل قبلہ خانۂ کعبہ ہے اور بیت المقدس محض ایک عارضی قبلہ تھا تو اس رُخ پر جتنی نمازیں پڑھی گئیں وہ بیکار گئیں اور جو مسلمان اس حکم جدید سے قبل وفات پاچکے، وہ تو سرتاسر گھاٹے میں رہے۔ جواب انھیں کو مل رہا ہے کہ یہ وہم کیسا! قبلہ کوئی سا بھی ہوا اجر تو تعمیل احکام کرنے والوں کا ہے جنھوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، انھوں نے بھی بہرحال حکم ہی کی تعمیل کی تھی، اجر اُن کا تمام وکمال ثابت رہا۔

اِيۡمَانَكُمۡ۔ ایمان سے اس سیاق میں کھلی ہوئی مُراد اس عملِ ایمان یا نماز سے ہے جو قبلۂ منسوخ کی جانب پڑھی جاچکی، ایمان اُسے اس لحاظ سے کہا گیا کہ وہ لازمۂ ایمان ہے اور ملزوم پر لازم کا اطلاق مجازی عام ہے۔

اَیۡ صَلَاتَكُمۡ اِلَی الۡقِبۡلَةِ الۡمَنۡسُوۡخَةِ ..... فَالۡاِيۡمَانُ مَجَازٌ مِنۡ اِطۡلَاقِ اللَّازِمِ عَلٰی مَلۡزُوۡمِهٖ وَالۡمَقَامُ قَرِيۡنَتُهٗ وَهُوَ التَّفۡسِيۡرُ الۡمَرۡوِیُّ عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ (روح) يَقُوۡلُ عُلَمَاءُنَا مِنَ الۡفُقَهَاءِ اِنَّهَا تُسَمّٰی اِيۡمَانًا وَهِیَ مِنۡ اَرۡكَانِ الۡاِسۡلَامِ وَعَهۡدِ الۡاِسۡلَامِ (ابن العربی) سُمِّیَ الصَّلٰوةُ اِيۡمَانًا لِاِيۡمَانِهَا

إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ

اور اللہ تو لوگوں پر بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے ۵۲۵ بے شک ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ۵۲۶

عَلٰى نِيَّةٍ وَقَوْلٍ وَعَمَلٍ (قرطبی) وَأَكْثَرُ الْمُفَسِّرِينَ عَلٰى أَنَّ الْمُرَادَ بِالْإِيمَانِ هُنَا الصَّلٰوةُ۔ (المدارک)

إِيمَانَكُمْ۔ مخاطبت براہ راست زندہ مسلمانوں سے ہے لیکن ایمان ان کا نہیں بلکہ وفات یافتہ مسلمانوں کا مراد ہے۔

ای الایمان الی الاحیاء من المومنین والمعنی فی من مات قبل ان تحوّل القبلۃ ..... يُرِيدُ إِيمَانَهُمْ لِأَنَّهُمْ دَاخِلُونَ مَعَهُمْ فِي الْمِلَّةِ۔ (معالم)

۵۲۵ چنانچہ دوسرے احکام کی طرح یہ حکم تحویل قبلہ بھی مع اپنے سارے تعلقات و تضمنات کے تمام ناس کی شفقت و مہربانی، رافت و رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

خاص مومنین متبعین پر تو حق تعالیٰ کا فضل و کرم ظاہر ہی ہے باقی یہاں ذکر عموم کے ساتھ کل بندوں پر شفقت و رحمت کا ہے اور اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں ایک نہیں، متعدد ہیں۔

رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ ماہرین زبان کا بیان ہے کہ رأفت کا درجہ رحمت سے بڑھا ہوا ہے۔

الرَّأْفَةُ أَشَدُّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقَالَ أَبُو عَمْرِو بْنِ الْعَلَاءِ الرَّأْفَةُ أَكْثَرُ مِنَ الرَّحْمَةِ وَالْمَعْنٰى مُتَقَارِبٌ۔ (قرطبی)

۵۲۶ (انتظار وحی میں اے پیمبر!)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صحیح جذبۂ دینی کے ماتحت اس کا یقین تھا کہ اب جب کہ امامت بنی اسرائیل سے چھن چکی ہے تو ان کا قبلہ بھی قبلۂ امت نہیں رہ سکتا، تحویل قبلہ کا حکم اب آکر رہے گا، اور فرشتۂ وحی کے انتظار میں آپ کی نظر بار بار آسمان کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی، یہاں اسی کیفیت کا بیان ہے۔

حق تعالیٰ اگرچہ ہرگز کسی جہت کا پابند، کسی مکان سے محدود نہیں، تاہم تجلیات خاصہ کو قرآن میں آسمان کی جانب منسوب کیا گیا ہے اور ہر ایسے تعظیم کے موقع پر نام آسمان کا لیا گیا ہے جیسے بہ سلسلۂ وحی و رحمت و بارش۔

وَخَصَّ السَّمَاءَ بِالذِّكْرِ إِذْ هِيَ مُخْتَصَّةٌ بِتَعْظِيمِ مَا أُضِيفَ إِلَيْهَا وَيَعُودُ مِنْهَا۔ (قرطبی)

اسی لئے محققین نے لکھا ہے کہ بوقت اضطرار و دعا آسمان کی طرف منہ کرنا موجبات قبول میں سے ہے بلکہ اس نسبت علوی سے کمال یقین اور تصفیۂ قلب میں اور مدد ملتی ہے۔

قَدْ نَرٰى۔ گو صیغہ مضارع ہے، لیکن مراد ماضی ہے۔

لَفْظُهُ مُسْتَقْبَلٌ وَالْمُرَادُ بِهِ الْمَاضِي۔ (عکبری)

نَرٰى سے اشارہ یہ بھی ہو گیا کہ آپ حیران و مضطر کیوں ہوتے ہیں، ہم نے خوب دیکھ لیا ہے آپ کے تعلق خاطر کو، اور اس میں کمال تسکین ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔

فِي السَّمَاءِ میں فِي، إِلٰى کے معنی میں ہے۔

فِي جِهَةِ السَّمَاءِ (کشاف) نَحْوَ السَّمَاءِ وَقِبَلَهَا۔ (ابن جریر)

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

سو ضرور آپ کو متوجہ کر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں ۵۲۷ اچھا اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف ۵۲۸

۵۲۷ یعنی خانۂ خدا و قبلۂ ابراہیمی کی جانب۔ یہ وعدہ ہے تحویل قبلہ کا۔ یہاں بجائے براہ راست یہ ارشاد فرمانے کے کہ ہم کعبہ کی طرف آپ کو پھیر دیں گے، ارشاد یہ ہوا ہے کہ ہم اسے آپ کا قبلہ قرار دے دیں گے جسے آپ خود قبلہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کمال رفعتِ مراتب اور کمال درجۂ رضا و قبولیت ظاہر ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل طریقت کے ہاں جو اصطلاح مقامِ مُرادیت و محبوبیت کی آئی ہے اس کی اصل یہی آیت ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس بلندیٔ مرتبہ کا کہ مولا خود طالب رضائے عبد ہو جائے! اس کے آگے کوئی مرتبہ تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اقبالؒ نے اسی مقام کی تشریح کی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ کے دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ہم آپ کو اس کا والی و حاکم اور اس پر متصرف بنا دیں گے۔ اي نُمَكِّنَكَ مِنِ اسْتِقْبَالِهَا۔ (مدارک۔ روح)

ابھی وعدہ ہوا تھا تحویل قبلہ کا، اب حکم ہو گیا تحویل قبلہ کا۔

اَلْوَجْهُ۔ لفظی معنی ہیں چہرہ کے، لیکن حکم میں کل جسم کے ہے۔

اَلْمُرَادُ مِنَ الْوَجْهِ هٰهُنَا جُمْلَةُ بَدَنِ الْاِنْسَانِ (کبیر) وَقَدْ يُعَبَّرُ عَنْ كُلِّ الذَّاتِ بِالْوَجْهِ (کبیر)

وجہ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا ہے۔

۵۲۸ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ عزت و حرمت والی مسجد سے مراد مکہ معظمہ کی وہ مسجد اعظم ہے جس کے اندر خانۂ کعبہ واقع ہے۔ خانۂ کعبہ بہت ہی مختصر عمارت کا نام ہے۔ مدینہ والوں یا اور کہیں کے لوگوں کو اس کی جہت کی تعیین بہت دشوار تھی۔ اس لئے امت کی سہولت کے لئے نام نسبۃً ایک بہت بڑی عمارت کا لے لیا گیا (مدارک۔ بیضاوی) محققین کے نزدیک یہاں مسجد حرام سے مراد کعبہ ہی ہے۔

وَمُرَادُهُ الْبَيْتُ نَفْسُهُ (جصاص) وَالْمُرَادُ بِهِ الْبَيْتُ لِاَنَّهُ تَعَالٰى خَاطَبَنَا بِلُغَةِ الْعَرَبِ وَهِيَ تُعَبِّرُ عَنِ الشَّيْءِ بِمَا يُجَاوِرُهُ اَوْ بِمَا يَشْتَمِلُ عَلَيْهِ (ابن العربی) اَيْ فِيْ جِهَتِهٖ وَسَمْتِهٖ لِاَنَّ اسْتِقْبَالَ الْعَيْنِ الْعَلِمِ مُتَعَسِّرٌ عَلَى النَّائِيْ وَذِكْرُ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ دُوْنَ الْكَعْبَةِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْوَاجِبَ مُرَاعَاةُ الْجِهَةِ دُوْنَ الْعَيْنِ (مدارک)

اور امام مالکؒ سے یہ منقول ہے کہ مسجد حرام قبلہ ساری دنیا کی ہے اور خانۂ کعبہ قبلہ ہے اس مسجد کا۔ مسجد حرام یا حرم شریف کی موجودہ عمارت کا نقش اول خلیفۂ مہدی عباسی کے زمانہ کا ہے۔ بعد کے خلفاء و سلاطین برابر اس میں اضافہ کرتے رہے، خصوصاً ترک سلاطین۔ موجودہ ہیئت سلطان سلیم ثانی (متوفی ۹۸۲ھ) کے عہد سے تقریباً قائم ہے۔ صحن کی وسعت ۴۰۰ فٹ بیان کی گئی ہے۔ متعدد بڑے بڑے عالی شان اور فراخ دالان چاروں طرف اس کے علاوہ ہیں۔ داخلہ کے ۱۹ دروازے ہیں۔ مینارے چھ ہیں اور گنبد گمزیوں کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے۔ ایک دوسرے بیان کے مطابق شمالی غربی وسعت ۵۴۵ فٹ ہے۔ جنوبی و مشرقی ۵۵۳ فٹ، شمالی مشرقی ۳۶۰ فٹ اور جنوبی و غربی ۳۶۴ فٹ۔

شطر سے مراد ہے مسجد حرام کی سمت میں یا اس کے رُخ پر، نہ کہ عین اس کے مقابل کہ اس کی تعمیل دور دراز

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے کر لیا کرو اسی کی طرف ۵۲۹ اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے وہ یقیناً

لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾

جانتے ہیں کہ وہ (حکم) واقعی ہے ان کے پروردگار کی طرف سے ۵۳۰ اور اللہ بے خبر نہیں ان کی کارروائیوں سے ۵۳۱

کے علاقوں میں ممکن ہی نہیں۔

شطرہ ای نحوہ وتلقاءہ قالہ ابن عباس وابو العالیہ ومجاھد والربیع بن انس (جصاص) شطرہ محتمل ان یکون الناحیۃ والجھۃ کما فی ھذہ الایۃ (قرطبی) وفیہ دلالۃ علی انہ لو ای ناحیۃ من البیت فوجھہ لیقابلی صلوتہ اجزاہ لانہ متوجہ شطرہ ونحوہ (جصاص) والقول الاخر وعلیہ الاکثرون ان المراد المواجھۃ کما رواہ الحاکم عن ... علی ... وھذا قول ابی العالیہ ومجاھد وعکرمۃ وسعید بن جبیر وقتادۃ والربیع بن انس وغیرھم (ابن کثیر) وفی الایۃ قولان الاول ھو قول جمھور المفسرین من الصحابۃ والتابعین والمتاخرین واختیار الشافعی فی کتاب الرسالۃ ان المراد جھۃ المسجد الحرام وتلقاءہ وجھتہ (کبیر)

فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز میں جو استقبال قبلہ فرض ہے وہ سینہ کا ہے چہرہ کا استقبال قبلہ صرف سنت ہے، نماز سے باہر ہونا صرف اس وقت ممکن ہے جب چہرہ کے ساتھ سینہ بھی کعبہ کی طرف سے پھر جائے صرف گردن پھیر جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے مالکیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ نمازی کی نظر اپنے سامنے کی جانب رہنا چاہیے۔ بخلاف امام ابوحنیفہؒ و شافعیؒ و احمدؒ کے جنھوں نے اپنی فقہ میں یہ رکھا ہے کہ نظر سجدہ گاہ پر جمی رہے۔

وقد استدل المالکیۃ بھذہ الایۃ علی ان المصلی ینظر امامہ لا الی موضع سجودہ کما ذھب الیہ الشافعی و احمد و ابو حنیفۃ (ابن کثیر)

۵۲۹ (حالت نماز میں)

وُجُوهَكُمْ۔ چہرہ یہاں سارے جسم انسانی کا قائم مقام ہے۔ یہ مراد نہیں کہ قبلہ رخ انسان صرف اپنے چہرہ کو رکھے اور سارے جسم کو دوسری طرف۔

اراد بالوجہ جملۃ البدن لان الواجب استقبالھا بجملۃ البدن وکنی بالوجہ عن الجملۃ لانہ اشرف الاعضاء ... وقد یراد بہ نفس الشیٔ۔ (بحر)

خطاب سارے مسلمانوں یا امت محمدی سے ہے ابھی ابھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا تھا کہ اپنے پسندیدہ قبلہ کی طرف نماز پڑھا کیجیے۔ اب عام حکم صراحت کے ساتھ ساری امت کو مل رہا ہے حَيْثُ مَا كُنْتُمْ سے فقہاء نے یہ نکالا ہے کہ نماز، انسان کہیں بھی موجود ہو، درست ہے، کچھ مسجد ہی کی قید نہیں۔

حَيْثُ مَا كُنْتُمْ یعنی دنیا کے کسی حصہ میں اور کہیں بھی ہو کعبہ کی طرف رخ کرنا وقت نماز میں فرض ہے۔

امر تعالی باستقبال الکعبۃ من جمیع جھات الارض شرقا وغربا وشمالا وجنوبا (ابن کثیر)

وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ ۚ

اور اگر آپ ان لوگوں کے سامنے جنھیں کتاب مل چکی ہے، ساری ہی نشانیاں لے آئیں ۵۳۲ (جب بھی) یہ آپ کے قبلہ کی

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ

پیروی نہ کریں گے ۵۳۳ اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں ۵۳۴ اور نہ وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

ہیں ۵۳۵ اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہش کی پیروی کرنے لگیں ۵۳۶ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے ۵۳۷

۵۳۰ علماء و اکابر یہود کو اپنے وہاں کی روایتوں اور نوشتوں کی بنا پر خوب علم تھا کہ پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کا قبلہ وہی ہوگا جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا تھا کہ وہی قبلۂ اصلی اور حقیقی ہے بیت المقدس کا قبلہ ہونا عارضی تھا۔ اَنَّهُ میں ضمیر سے مراد یہی حکم تحویل قبلہ ہے۔

اَیِ التَّحْوِیْلَ اِلَی الْکَعْبَةِ (کشاف) وَالضَّمِیْرُ لِلتَّحْوِیْلِ اَوِ التَّوَجُّهِ۔ (بیضاوی)

مِنْ رَّبِّهِمْ کی قید نے اس حقیقت کو اور واضح کر دیا کہ استقبالِ کعبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد نہیں تمام تر حکم ربانی ہے۔

۵۳۱ ان الفاظ کے ضمن میں یہ حقیقت بھی آگئی کہ اللہ اپنے بندوں کی کارروائیوں کا احتساب کرتا رہتا اور مجرموں کی سزا پر بھی قادر ہے۔

اِعْلَامٌ بِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَا یُهْمِلُ اَعْمَالَ الْعِبَادِ وَلَا یَغْفُلُ عَنْهَا وَضِمْنُهُ الْوَعِیْدُ۔ (قرطبی)

۵۳۲ یعنی اپنی پیغمبری کے سارے ممکن دلائل و معجزات بھی۔

اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ سے مراد یہود ہیں۔

۵۳۳ (یہ حد ہے ان کے ضد و عناد و تعصب کی اس لئے آپ کا ان کے اعتراضات کی طرف اعتنا کرنا ہی بے کار ہے)

۵۳۴ (اس لئے کہ اسرائیل کی امامت کے خاتمہ پر آپ کو ایک مستقل امتیازی عالمگیر قبلہ عطا ہو چکا ہے اور یہود و نصاریٰ کو آپ کی طرف سے اب ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا چاہئے۔)

۵۳۵ چنانچہ یہود کا قبلہ آج تک ہیکل بیت المقدس ہے، اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں، بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں، اور عجب نہیں کہ اندرونی اختلافات اس سے بھی زائد ہوں، بحمد اللہ کہ ہمارے قدیم مفسرین بھی یہود و نصاریٰ کے قبلوں کے فرق سے صحیح طور پر واقف تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

فَالْیَهُوْدُ یَسْتَقْبِلُ بَیْتَ الْمَقْدِسِ وَالنَّصَارٰی مَطْلَعَ الشَّمْسِ۔ (مدارک)

اور خیر نسفی تو بعد کے شخص کے ہیں، ابن جریر تو متقدمین میں ہیں، وہ تک اس سے باخبر تھے۔

وَذٰلِکَ اَنَّ الْیَهُوْدَ تَسْتَقْبِلُ بَیْتَ الْمَقْدِسِ بِصَلَاتِهَا وَاَنَّ النَّصَارٰی تَسْتَقْبِلُ الْمَشْرِقَ (ابن جریر)

إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ

تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے ٥٣٦ جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں ٥٣٩ وہ آپ کو پہچانتے ہیں

اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾

اس طرح جیسے کہ اپنی نسل کو پہچانتے ہیں ٥٤٠ اور بے شک اُن میں کے کچھ لوگ خوب چھپاتے ہیں حق کو حالانکہ جانتے ہوتے ہیں ٥٤١

وقف لازم

وقف منزل

٥٣٦ (تحویلِ قبلہ کے باب میں، حالانکہ عصمتِ نبوت خود ہی اس مفروضہ کے منافی ہے)
اہلِ کتاب کی اتباع واسترضاء تو مطلقاً ممنوع ہے لیکن قبلہ جیسے بنیادی دینی مسئلہ میں اُن کی اتباع حصیت ہی نہیں کفر ہے

٥٣٧ یعنی علم ثابت بالوحی، قرآنی اصطلاح میں اَلْعِلْمُ سے یہی علم حقیقی مراد ہوتا ہے، دنیوی "علوم" کی کوئی صنف نہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ آیت میں تہدید ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم صحیح کے باوجود بجائے اس کے اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔

وَفِيْ ذٰلِكَ تَهْدِيْدٌ لِّمَنْ يَتْرُكُ الدَّلِيْلَ بَعْدَ إِنَارَتِهٖ وَيَتَّبِعُ الْهَوٰى. (مدارک)

٥٣٨ اللہ کے قانون میں رُو رعایت کی گنجائش کسی کے لئے نہیں یہاں تک کہ انبیاء کے لئے بھی نہیں، اور نفس فطرت بشری کے لحاظ سے گناہوں کی صلاحیت اُن میں بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی دوسری انسانوں میں یاد رہے کہ توفیقِ الٰہی ان کا تعلق ہر وقت اور ہر حال میں اپنے سے قائم رکھتی ہے اور انھیں خطاء سے محفوظ اور معصیت سے معصوم بنائے رکھتی ہے امام رازیؒ نے آیت سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ عالم کے حق میں وعید شدید تر ہے غیر عالم کے مقابلہ میں۔

دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى اَنَّ تَوَجُّهَ الْوَعِيْدِ عَلَى الْعُلَمَاءِ اَشَدُّ مِنْ تَوَجُّهِهٖ عَلٰى غَيْرِهِمْ (کبیر)

فَاِنَّ الْعَالِمَ الْحُجَّةُ عَلَيْهِ اَقْوَمُ مِنْ غَيْرِهٖ (ابن کثیر)

٥٣٩ عموم لفظ کے تحت میں مسیحی بھی داخل ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ مراد یہود ہیں، توریت وصحفِ قدیم کو مسیحی بھی مانتے ہیں، علماءِ بلاغت نے اشارہ کیا ہے کہ اس موقع پر صیغۂ معروف اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ضمیر متکلم کی تصریح کے ساتھ صیغۂ مجہول اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے کہیں زیادہ بلیغ و پُرمعنیٰ ہے۔

٥٤٠ یعنی خوب اچھی طرح بغیر کسی اشتباہ والتباس کے، مطلب یوں ہوا کہ پچھلے نوشتوں میں ایک نبی آخرالزماں کی آمد کی بابت پیشین گوئیاں اس صراحت سے مذکور ہیں کہ یہود کو آپ کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی وہ جس طرح اسرائیلی انبیاء کو پہچان لیتے تھے ٹھیک اسی طرح آپ کو بھی پہچان سکتے ہیں۔

اَبْنَآءَهُمْ کے لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں، لیکن ضمیر هُمْ سے مراد افراد واشخاص نہیں بلکہ قوم یہود ونسل اسرائیل مجموعۃً ہے یعنی ابنائے اسرائیل۔ اَبْنَاء کا لفظ عربی میں اولاد سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے اور ہمیشہ صلبی بیٹوں ہی کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ جن جن پر فرزندی کا اطلاق مجازاً ہو سکتا ہے اُن سب پر حاوی ہے۔ يَعْرِفُوْنَهٗ میں ضمیر هٗ سے کیا مراد ہے؟ قدماء ہوں یا اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد بیت الحرام کو بہ حیثیت قبلۃ الانبیاء کے پہچاننا ہے چنانچہ تفسیر ابن جریر میں ابن عباسؓ صحابی سے لے کر قتادہ، ابن زید تک

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ

یہ امر) حق ہے تیرے پروردگار کی طرف سے پس تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جانا ۵۴۱ اور ہر ایک کے لئے کوئی

هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

رُخ ہوتا ہے جدھر وہ متوجہ ہوتا ہے ۵۴۳ سو تم نیکیوں کی طرف بڑھو ۵۴۴

ابن جریر کے تابعین کے اقوال اسی معنی میں منقول ہیں لیکن متوسطین اور متاخرین میں تقریباً سب کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے کہ مراد ذاتِ رسالت سے ہے اور دلائل اسی کے زیادہ مؤید ہیں اور سند اس کی بھی تابعین سے مل جاتی ہے۔

يَعْنِيْ يَعْرِفُوْنَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (معالم) اي يَعْرِفُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (کشاف) ذَكَرُوْا فِيْهِ وُجُوْهًا اَحَدُهَا اَنَّهٗ عَائِدٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .. وَالْقَوْلُ الثَّانِيْ .. وَاعْلَمْ اَنَّ الْقَوْلَ الْاَوَّلَ اَظْهَرُ (کبیر) وَالضَّمِيْرُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ لَّمْ يَسْبِقْ ذِكْرُهٗ لِدَلَالَةِ الْكَلَامِ عَلَيْهِ (بیضاوی) وَالضَّمِيْرُ عَائِدٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ مُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ وَغَيْرُهُمَا (بحر رحمی)

ظاہر ہے کہ ضمیر غائب ہے لیکن اُردو میں نہایت تعظیم کے موقع پر غائب "وہ" کے بجائے حاضر "آپ" لاتے ہیں۔

۵۴۱ یہود اور دوسرے معاندین کا یہ اخفائے حق دانستہ اور بہ ارادہ ہے کسی معذوری، دانستہ غلط فہمی یا دلائل میں خفاء کا نتیجہ نہیں۔

اَلْحَقَّ حق سے مراد یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ مفصل و مکمل تعارف ہے، جو توریت اور دوسرے الہامی نوشتوں میں موجود ہے۔

مَا فِيْ كُتُبِهِمْ مِنْ صِفَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ابن کثیر) اي يَكْتُمُوْنَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ابن جریر عن مجاهد) وَالْحَقُّ الْمَكْتُوْمُ هٰهُنَا هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ قَتَادَةُ وَمُجَاهِدٌ (بحر) يَعْنِيْ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ مُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ ۔ (قرطبی)

دوسرے معنی امر تحویل قبلہ کے بھی لئے گئے ہیں۔

قِيْلَ اَمْرُ تَحْوِيْلِ الْقِبْلَةِ (کبیر)

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس ٹکڑے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ انکار کرنے والے عوام و جہلائے یہود نہیں اُن کے علماء و اکابر تھے

۵۴۲ (اے مخاطب!)

آیت کا یہ جزو تاکیدِ کلام کے لئے ہے یعنی یہاں جو کچھ بیان ہو رہا ہے، خواہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق ہو یا امر تحویل قبلہ سے متعلق، بہر حال و بہر صورت یہ اللہ ہی کا کلام ہے اور ہرگز بے التفاتی یا کم التفاتی کے قابل نہیں

۵۴۳ یعنی ہر قوم راست راہ دینے و قبلہ گاہ ہے!

یعنی ہر قوم، ہر اُمت نماز و عبادت کے لئے ایک مرکزی رُخ مقرر رکھتی ہے، سو اُمتِ اسلامیہ کے لئے بھی ایک متعین قبلہ ناگزیر ہے۔

ع ۱۶ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لِکُلٍّ "ہر ایک" سے مُراد ہر قوم یا ہر اُمت ہے اور حذفِ مضاف کی طرح حذفِ مضاف الیہ کی مثالیں عربی میں عام ہیں۔
وَلَمْ یَقُلْ لِکُلِّ قَوْمٍ اَوْ اُمَّۃٍ لِاَنَّہٗ مَعْرُوْفُ الْمَعْنٰی عِنْدَ ھُمْ (کبیر) تَعْنِیْ بِذٰلِکَ اَھْلَ الْاَدْیَانِ (ابن کثیر) لِکُلِّ طَائِفَۃٍ مِّنْ اَھْلِ الْاَدْیَانِ (بحر)

مُوَلِّیْھَا۔ تَوْلِیَۃ یہاں اقبال (رُخ کرنے) کے معنی میں ہے۔
یُرِیْدُ مُوَلِّیْ وَجْھِہٖ اِلَیْھَا وَالتَّوْلِیَۃُ فِیْ ھٰذَا الْمَوْضِعِ اِقْبَالٌ۔ (معانی)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ بعض صوفیۂ عارفین نے آیت کو حدیثِ نبوی کُلٌّ مُّیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَہٗ (ہر ایک کے لیے وہی آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے) سے مؤید کر کے اس کی شرح میں کہا ہے کہ تکوینی و تشریعی دونوں حیثیتوں سے اللہ نے انسانوں کے حالات مختلف رکھے ہیں، اور متعدد طبقے ان کے پیدا کئے ہیں کوئی کاشتکاری میں لگا ہے کوئی تجارت میں اور کوئی صنعت و حرفت میں، اسی طرح دینی حیثیت سے بھی کوئی احادیثِ نبوی جمع کر رہا ہے کوئی حفظِ قرآن کر رہا ہے کوئی مسائلِ فقہ کا استنباط کر رہا ہے کوئی قرآن کی تفسیر و ترجمانی میں لگا ہوا ہے، یہ سب مختلف طریقے راستے ہیں اللہ کی طرف سے اللہ ان سارے طریقوں کو اپنے بندوں کے ذریعے آباد رکھنا چاہتا ہے تو جو شخص جس طریق پر بھی اللہ کی رضا کے قصد سے چلے گا، اللہ اُس کے لئے قبول و وصول آسان کر دے گا۔

ھُوَ۔ اخفش نحوی اور زجاج لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی رُخوں کا پھیرنے والا ہے۔
قِیْلَ ھُوَ عَائِدٌ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی قَالَ الْاَخْفَشُ وَالزَّجَّاجُ (بحر) اَوْ ھُوَ لِلّٰہِ تَعَالٰی اَیْ اَنَّہٗ مُوَلِّیْھَا اِیَّاہُ (مدارک)

۵۴۲ (اے مسلمانو!)
خطاب اُمتِ اسلامیہ کو ہے کہ حُسنِ عمل کی طرف بڑھو اور جملہ مذاہب و ادیان کے اتحادِ قبلہ کے خیالِ خام میں نہ پڑے رہو۔
خَیْرَات۔ خَیْر کی جمع، وسیع و عام مفہوم میں ہے، رضائے الٰہی کے لیے موافق شرع جملہ امور کو شامل، وصول الی اللہ کے بے شمار راستوں پر حاوی، اور آیت میں حکم اُنھیں کی طرف بڑھنے کا ہے۔
یُرِیْدُ۔۔ بِالطَّاعَاتِ وَالْمُرَادُ الْمُبَادَرَۃُ اِلَی الْقَبُوْلِ (ابن کثیر) فَمَعْنَاہُ الْاَمْرُ بِالْبِدَارِ اِلَی الطَّاعَۃِ فِیْ وَقْتِھَا (کبیر) یَعْنِی الْمُبَادَرَۃُ وَالْمُسَارَعَۃُ اِلَی الطَّاعَاتِ (جصاص) مَعْنَاہُ اِفْعَلُوْا الْخَیْرَاتِ مِنَ السَّبْقِ وَھُوَ الْمُبَادَرَۃُ فِی الْاَوَّلِیَّۃِ (ابن العربی)

فَاسْتَبِقُوْا۔ عارفین نے کہا ہے کہ ہر وقت جو چیز اُس وقت کے لحاظ سے خیر و مصلحت ہو، اس کی طرف بڑھنا ہی استباقِ خیر ہے۔
اَلْخَیْرَات۔ فَاسْتَبِقُوْا کا صلہ اِلٰی محذوف ہے۔
اَیْ اِلَی الْخَیْرَاتِ۔ (قرطبی۔ معالم)

نمازِ فرض کی ادائی اول وقت میں اکثر مفسرین نے اس آیت سے نکالی ہے اور اس باب میں کوئی اختلاف نہیں، اُس کے آگے فقہاء و مفسرین نے سوال یہ پیدا کیا ہے کہ ایک طرف نماز کا اول وقت ہے، اور دوسری طرف انتظار کرنے میں جماعت مل رہی ہے تو ترجیح کس کو ہے؟ اور جواب یہ دیا ہے کہ ترجیح انتظارِ جماعت کو ہے۔
وَلَا خِلَافَ فِیْ مَذْھَبِنَا اَنَّ تَاْخِیْرَ الصَّلٰوۃِ لِاَجْلِ الْجَمَاعَۃِ اَفْضَلُ مِنْ تَقْدِیْمِھَا لِاَنَّ فَضْلَ الْجَمَاعَۃِ

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۴۸﴾

تم جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تم سب کو پالے گا ۵۲۵ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۲۶

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ

اور آپ جس جگہ سے بھی (باہر) نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں ۵۲۷

وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾

اور یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے امر حق ہے ۵۲۸ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو ۵۲۹

مُعَيَّنٌ مَعْلُومٌ وَفَضْلُ أَوَّلِ الْوَقْتِ مَجْهُولٌ وَتَعْيِينُ الْمَعْلُومِ أَوْلَىٰ (ابن العربی) اور اسی کو قرطبی نے بھی نقل کردیا ہے۔

۵۲۵ (اور تمہاری نمازوں میں وحدت پیدا کردے گا۔)
ساری امت کا قبلہ ایک خاص مکان کو مقرر کردینے سے ایک خیال یہ پیدا ہوسکتا تھا کہ یہ تو ایک صورت انتشار کی سی پیدا ہوگئی، کوئی شمال کی طرف رخ کرے گا، کوئی جنوب کی طرف وقس علیٰ ہذا۔ شبہہ کے جواب میں ارشاد ہورہا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے، یہ شبہہ محض سطحی ہے، مقصود تو نماز اور نمازیوں میں وحدت پیدا کرنا ہے، تم شمال وجنوب، شرق، غرب دنیا کے کسی خطہ کسی علاقہ میں بھی متفرق ومنتشر ہو، عالم الغیب الشہادۃ کو تو بہرحال علم ہے کہ تم رخ ایک ہی طرف کئے ہوئے ہو، وہ کعبہ کی طرف پڑھی ہوئی ساری نمازوں کو ایک حکم میں رکھے گا۔
يَجْعَلُ اللَّهُ تَعَالَىٰ صَلَاتَكُمْ مَعَ اخْتِلَافِ جِهَاتِهَا فِي حُكْمِ صَلَاةٍ مُتَّحِدَةِ الْجِهَةِ (روح)
أَيْ يَجْمَعُكُمْ وَيَجْعَلُ صَلَاتَكُمْ كُلَّهَا إِلَىٰ جِهَةٍ وَاحِدَةٍ قَالَهُ الزَّمَخْشَرِيُّ (بحر)
دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ اشارہ یہاں موت وقیامت کی طرف ہے یعنی تم دفن جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تعالیٰ سب کو حشر میں یکجا کردے گا۔
يَعْنِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ (قرطبی۔ معالم)

۵۲۶ (اور اس کے احاطۂ قدرت سے کوئی چیز بھی خارج نہیں)
یہ ایک اصولی جواب بہت سے شبہات کا ہے اللہ کے بتائے ہوئے مسائل میں انسان کو جہاں کہیں بھی استبعاد عقلی معلوم ہوتا ہے اس کی بنیاد ہمیشہ اسی مغالطہ پر ہوتی ہے کہ اپنے اوپر قیاس کرکے اللہ کے قویٰ کو بھی محدود اور اس کی قدرت کو بھی زمان ومکان وغیرہ کی قیود کا پابند سمجھ لیا جائے، قرآن مجید نے ہمیشہ اس بشری ذہنیت (سائیکالوجی) کو پوری طرح سمجھ کر بار بار اسی حقیقت کی طرف تنبیہ کی ہے کہ خدائی فعلیت پر حکم لگاتے وقت خدائی قدرت کی بھی وسعت بے پایاں کو یاد رکھ کرو۔

۵۲۷ مطلب یہ کہ یہ حکم استقبال کعبہ سفر وحضر سب کہیں کے لئے ہے محض قیام مدینہ کے ساتھ مخصوص نہیں
تَكَرَّرَ بِهٰذَا التَّنَادِي الْحَالَيْنِ إِقَامَةً وَسَفَرًا أَيْ أَنَّهُ مَأْمُورٌ بِاسْتِقْبَالِ الْبَيْتِ الْحَرَامِ (بحر)

۵۲۸ یعنی امر ثابت شدہ جس میں اب کسی نسخ وتبدیلی کا امکان نہیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ

اور آپ جس جگہ سے بھی (باہر) نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں ۵۵۰ اور تم لوگ (بھی)

مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ

جہاں کہیں ہو اپنا منہ اُس کی طرف موڑ لیا کرو ۵۵۱ تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے ۵۵۲

حُجَّةٌ ۖ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ

سوا اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہیں ۵۵۳ سو تم اُن سے نہ ڈرو ۵۵۴ بلکہ (صرف) مجھی سے ڈرو ۵۵۵

هُوَ الْحَقُّ أَيِ الثَّابِتُ الَّذِي لَا يَعْرِضُ لَهُ نَسْخٌ وَلَا تَبْدِيلٌ. (بحر)

اِنَّهٗ میں ضمیر حکم استقبال قبلہ کی طرف ہے۔

أَيِ الْإِسْتِقْبَالُ أَوِ الصَّرْفُ أَوِ التَّوْلِيَةُ (روح)

۵۴۹ ایک جزئی حکم کے بعد کلی تنبیہ اسلوب قرآنی کے خصائص میں سے ہے اور صیغۂ واحد سے صیغۂ جمع کی طرف منتقل ہو جانا عربی اسلوب بلاغت میں عام ہے۔

۵۵۰ الفاظ کی تکرار غائت تاکید معنی کے لئے ہے اور یہ اہل عرب کا عام دستور ہے۔

كُرِّرَتْ تَوْكِيدًا (بحر) هُوَ الْأَمْرُ الْمَعْهُودُ فِي لِسَانِ الْعَرَبِ وَهُوَ أَنْ تُعَادَ الْجُمْلَةُ مَرَّةً وَاحِدَةً. (بحر)

بعض نے لکھا ہے کہ پہلا حکم تعمیم حال کے لئے ہے یعنی سفر حضر میں جس حال میں بھی ہوں توجہ کعبہ کی طرف کرلی جائے اور دوسرا حکم تعمیم مکان کے لئے ہے یعنی دور و نزدیک، حاضر و غائب جہاں کہیں بھی ہوں توجہ کعبہ کی طرف کرلی جائے۔ مفسرین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق دوسری حکمتیں بھی اس تکرار حکم کی لکھی ہیں۔

۵۵۱ (اے مسلمانو)

یعنی یہ حکم رسول ؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ساری اُمت پر اس کی تعمیل فرض ہے۔ یہاں تک یہ حکم استقبال کعبہ کل ملا کر چھ بار آچکا ہے۔ اہل لطائف و اسرار نے لکھا ہے کہ ہر بار کے حکم سے ایک ایک خاص اشارہ مقصود ہے، مثلاً (۱) پہلی بار سے مطلق حکم وجوب (۲) دوسری بار سے تعمیم احوال یعنی سفر ہو یا حضر (۳) تیسری بار سے تعمیم مکان یعنی نزدیک ہو یا دور، حاضر ہو یا غائب (۴) چوتھی بار سے تعلیم ادب یعنی قبلہ رو رہنے کا استحباب (۵) پانچویں بار سے توجہ قلبی یعنی دل اُسی کی طرف لگے جدھر پروردگار کی خاص توجہ ہے (۶) چھٹی بار سے تاکید یعنی رفع احتمال نسخ۔

۵۵۲ (مثلاً اہل کتاب کو اس اعتراض کی گنجائش کہ ہمارے نوشتوں کے بموجب تو آخری نبی کا قبلہ، قبلۂ ابراہیمی ہوتا تھا، یا مشرکین عرب کو اس اعتراض کا موقع کہ یہ نبی دین ابراہیمی کے مدعی ہو کر قبلۂ ابراہیمی کو چھوڑے ہوئے ہیں۔)

لِلنَّاسِ میں النَّاس سے مراد جملہ مخالفین و معترضین ہیں۔

۵۵۳ یعنی رہے وہ کج فطرت معاندین جو اس کے بعد بھی اعتراضات پر اڑے رہیں گے سو اُن کی کچھ پروا ہی نہ کرو

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ

تاکہ میں اپنا انعام تم پر پورا کروں ۵۵۶ اور تاکہ تم راہ پر (قائم) رہو ۵۵۷ (اسی طرح) جیسے ہم نے تمہارے

رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ

درمیان ایک رسول تمہیں میں سے بھیجا ۵۵۸ جو تمہارے رُوبرو ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے ۵۵۹ اور

الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے ۵۶۰ جو تم نہیں جانتے تھے ۵۶۱

اَلَّا لِلْمُعَانِدِیْنَ مِنْهُمْ (کشاف) لَا حُجَّةَ لِاَحَدٍ عَلَیْکُمْ اِلَّا الْحُجَّةَ الدَّاحِضَةَ لِلَّذِیْنَ مِنْ الْیَهُوْدِ وَغَیْرِهِمْ (بحر)

اِلَّا کو یہاں ابوعبیدہ لغوی نے واؤ کے مرادف قرار دیا ہے اور مفہوم استثناء سے انکار کیا ہے۔ (معانی)

مَوْضِعُ اِلَّا هٰهُنَا لَیْسَ بِمَوْضِعِ اسْتِثْنَاءٍ اِنَّمَا هُوَ وَاوُ الْمُوَالَاةِ وَمَجَازُهَا وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا۔ (مجاز)

لیکن فراء نے کہا ہے کہ یہ قول معنی کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن ترکیب زبان کے اعتبار سے غلط ہے۔

فَهٰذَا صَوَابٌ فِی التَّفْسِیْرِ وَخَطَاءٌ فِی الْعَرَبِیَّةِ (معانی) اسی طرح زجاج لغوی نے بھی اس کی تغلیط کی ہے۔

وَاَبْطَلَ الزَّجَّاجُ هٰذَا الْقَوْلَ۔ (قرطبی)

۵۵۴ (اور نہ ان کی بکواس کی کچھ پرواہ کرو)

فَلَا تَخَافُوْا مَطَاعِنَهُمْ فِیْ قِبْلَتِکُمْ (بحر)

۵۵۵ (کہ میری ہی نافرمانی تمہیں نقصان پہونچا سکتی ہے)

۵۵۶ اتمام نعمت کے مفہوم اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس سیاق میں کھلی ہوئی مراد تعیین قبلہ سے ہے۔

بِهِدَایَتِیْ اِیَّاکُمْ اِلٰی قِبْلَةِ اِبْرَاهِیْمَ (معالم) وَاِتْمَامُ النِّعْمَةِ بِمَا هَدَاهُمْ اِلَیْهِ مِنَ الْقِبْلَةِ (بحر)

لِاُتِمَّ کا عطف لِئَلَّا یَکُوْنَ پر ہے (جلالین)

خانۂ کعبہ کا محل نزول رحمت مرکز تجلیات ہونا مسلّم ہے ساتھ ہی نماز کا افضل عبادات ہونا مسلّم ان دونوں حقیقتوں کے استحضار کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعیین قبلہ سے بڑھ کر عنایت اور تکمیل نعمت اور کیا ہوگی۔

۵۵۷ (اور اپنے درجات ہدایت میں مزید ترقی کرتے رہو)

شریعت اسلامی دنیا کا کامل ترین محکم نظام ہے اور اس کامل ترین نظام کا ایک اہم جزو تعیین قبلہ و استقبال کعبہ ہے۔ لَعَلَّکُمْ میں لَعَلَّ کے کا مرادف ہے، شک کے لئے نہیں ہے "تاکہ" کے معنی میں ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جو لوگ پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں ان کو ہدایت یابی سے سرفراز کرنا دلیل اس امر کی ہے کہ مدارج قرب میں ترقی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

۵۵۸ کَمَا کا تعلق آیت ماقبل سے ہے یعنی یہ اتمام نعمت اب استقبال کعبہ کے واسطے سے اسی طرح

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع ۱۸

سو تم مجھے یاد کرتے رہو۵۶۲ میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں گا ۵۶۳ اور میری شکر گزاری کرتے رہو اور میری ناشکری نہ کرو ۵۶۴

سے ہوگا، جیسے بعثتِ رسول کے ذریعہ سے اس کے قبل ہو چکا ہے۔

کَمَا اَرْسَلْنَا مُتَعَلِّقٌ بِاُتِمَّ اَیْ اِتْمَامًا کَاِتْمَامِھَا بِاِرْسَالِنَا الرَّسُوْلَ۔ (جلالین)

۵۵۹ھ (ہر طرح کے فسق و عصیان اور اخلاقی آلودگیوں سے)

رسول کی حیثیت محض پیامِ رساں اور مُبلّغ کی نہیں ہوتی، مُزکّی (پاک کرنے والے) کی بھی ہوتی ہے، رسول کی گوناگوں حیثیتوں پر حاشیے آیت نمبر (۱۲۹) کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

۵۶۰ھ رسول کی حیثیت مُعلّم اور شارح کی بھی ہوتی ہے۔

یُعَلِّمُکُمْ لفظ تعلیم سے اشارہ ادھر بھی ہوگیا کہ پیغمبر کے ارشادات محض لفظ و عبارت تک محدود نہیں رہتے وہ حکمت و دانائی کے سبق، روحانیت کے اصول و مسائل کی تعلیم بھی دیتا رہتا ہے یعنی انھیں اپنے سامعین کے رگ و ریشہ میں اتارتا رہتا ہے۔

۵۶۱ھ وحی الٰہی کو عقلِ بشری سے وہی نسبت ہے جو خدا کو بندہ سے ہے اور رسول چونکہ وحی سے مؤید رہتا ہے اس لئے قدرۃً اس کی باریک بین، دوررس اور دقیقہ سنج نگاہ اُن دقیق حقائق تک پہونچ جاتی ہے جو بڑے بڑے عقلاء و مفکرین سے بھی مخفی رہتے ہیں اور رسول کی رسائی عالمِ حقیقت کی اُن گہرائیوں تک ہو جاتی ہے جو علم و عقل، کشف و اشراق سب سے ماوراء ہیں۔

لِیَکُوْنَ اِرْسَالُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نِعْمَۃً عَظِیْمَۃً وَلَوْلَاہُ لَکَانَ الْخَلْقُ مُتَحَیِّرِیْنَ فِیْ اُمُوْرِ دِیْنِھِمْ لَا یَدْرُوْنَ مَاذَا یَصْنَعُوْنَ (روح) مَا لَا سَبِیْلَ اِلٰی مَعْرِفَتِہٖ اِلَّا بِالْوَحْیِ۔ (مدارک)۔

۵۶۲ھ (طاعت و عبادت کے ذریعہ سے)

بندہ کا اپنے مالک کو یاد کرنا یہی ہے کہ اُس کی بتلائی ہوئی راہ پر ہمت اور شوق سے چلتا رہے اور یہ یادِ الٰہی کسی خاص وقت کے ساتھ محدود و مقید نہیں، لکھتے پڑھتے، بولتے چالتے، ملتے جُلتے، سوتے جاگتے، سب میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھنا یہی بندہ کی طرف سے یادِ الٰہی ہے۔

فَاذْکُرُوْنِیْ۔ ذکر سے مراد لی گئی ہے آیاتِ الٰہی اور ان کی عظمت و قدرت کا تفکر۔

فَاذْکُرُوْا بِالْفِکْرِ فِیْ دَلَائِلِہٖ وَاٰیَاتِہٖ وَقُدْرَتِہٖ وَعَظَمَتِہٖ (جصاص)

اور اسی کو سارے اذکار سے افضل اور ان کی اصل قرار دیا گیا ہے۔

وَھُوَ اَفْضَلُ الذِّکْرِ، سَائِرُ وُجُوْہِ الذِّکْرِ مَبْنِیَّۃٌ عَلَیْہِ وَتَابِعَۃٌ لَہٗ (جصاص)

ذِکْر سے مُراد ذکرِ قلبی سے لی گئی ہے کہ یہی اس کے اصل معنی بھی ہیں، اور اسی ذکرِ قلبی کو انسان پابندی کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھ سکتا ہے۔

فَاَصْلُ الذِّکْرِ التَّنَبُّہُ بِالْقَلْبِ لِلْمَذْکُوْرِ وَالتَّیَقُّظُ لَہٗ...... وَاَنَّ الْمُرَادَ ذِکْرُ الْقَلْبِ الَّذِیْ یَجِبُ اِسْتِدَامَتُہٗ فِیْ عُمُوْمِ الْحَالَاتِ۔ (قرطبی)

۵۶۳ھ (اپنے لطف و عنایتِ خاص سے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (١٥٣)

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو ٥٦٥ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ٥٦٦

اللہ کا اپنے بندوں کو یاد کرنا یہی ہے کہ ان پر دنیا و آخرت دونوں میں اپنے خصوصی فضل و کرم کی بارش کرتا ہے۔
وَمَعْنَى الْاٰيَةِ اُذْكُرُوْنِىْ بِالطَّاعَةِ اَذْكُرْكُمْ بِالثَّوَابِ وَالْمَغْفِرَةِ۔ (قرطبی)
فَاذْكُرُوْنِىْ اور اَذْكُرْكُمْ میں ضمیر متکلم کو صیغۂ واحد میں لانا علامت تخصیص کی ہے۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بندہ ادھر سے یاد میں لگا ہے تو اُدھر سے بھی سرفرازی ہوتی رہے گی، اور یہی اصلی ثمرہ اور انعام ہے بندہ کے ذکر الٰہی کا، سو اگر ذہن کے سامنے اُن کا استحضار رہے تو بندۂ ذاکر و شاغل کو نہ کبھی تشویش ہو اور نہ بے حاصلی کی شکایت پیدا ہو۔

٥٦٤ وَاشْكُرُوْا لِىْ۔ توحید، ایمان و اسلام کے حقوق ادا کرتے رہنا، یہی اللہ کی شکر گزاری کرتے رہنا ہے، اور شکر کی بہترین تعریف یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ ہی کے کاموں میں لگایا جائے۔
وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ کفر و شرک، الحاد و ارتیاب، فسق و بدعت میں پڑے رہنا یہی اللہ کی ناشکری اور اس کی نعمتوں سے کفران کرنا ہے اور ناشکری کا اصلی مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے قوٰی کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔

٥٦٥ یعنی ہجوم و مشکلات کے وقت بھی مشکل کشائے حقیقی سے تعلق برابر جوڑے رہو، اُس پر بھروسہ رکھو، اُس کے آگے جھکتے رہو ـــــ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی بڑی اور پُرقوت ہستی سے تعلق قائم ہو جانے سے دل کو کتنی تقویت حاصل ہو جاتی ہے، خطرہ کے وقت پولیس کے پہونچ جانے سے کسی بڑے حاکم کے آجانے سے دل کو کیسی ڈھارس بندھ جاتی ہے، شدید بیماری کے وقت کسی نامور طبیب کے آجانے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسی جُڑ جاتی ہے، پھر جب دل کا ربط ہمہ بیں و ہمہ داں، ناصرِ حقیقی و حافظِ حقیقی سے قائم ہو جائے تو انسان بے بیان کی تسکینِ خاطر و تقویتِ قلب کا کیا پوچھنا! دنیا میں رہ کر زندگی کی کشمکش میں پڑ کر مشکلات و مصائب کا پیش آتے رہنا ناگزیر ہے، افراد کو بھی اور اُمت و جماعت کو بھی، اور وہ دستور العمل ناقص ہے، جو مشکلات کے دفاع اور مصائب سے مقابلہ کا طریقہ نہ بتلائے، قرآن مجید نے بجائے غیر ضروری اور نامتناہی تفصیلات میں جانے کے یہاں اشارہ اصل اصول کی جانب کر دیا۔
بِالصَّبْرِ۔ صبر کے لفظی معنی تنگی و ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رکھنے کے ہیں۔
اَلصَّبْرُ الْاِمْسَاكُ فِىْ ضِيْقٍ۔ (راغب)
اور اصطلاحِ شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے اور قدم دائرۂ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔
اَلصَّبْرُ حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا يَقْتَضِيْهِ الْعَقْلُ وَالشَّرْعُ (راغب)
صبر کے یہ معنی نہیں کہ جو امور طبعی اور بشری ہیں ان کے آثار کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے، بھوک کے وقت مضمحل اور نڈھال ہو جانا، درد کی تکلیف سے کراہنا، رنج کے وقت آہ سرد بھرنا، عزیزوں قریبوں کی موت پر آنسوؤں سے رونا، ان میں سے کوئی شے بھی صبر کے منافی اور بے صبری میں داخل نہیں، قرآنی فرمان کا مطلب صرف

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۱۵۴)

اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انھیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ۵۶۷ البتہ تم ادراک نہیں کر سکتے ۵۶۸

اس قدر ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت گھبرا نہ جاؤ ثابت قدم رہو، دل قابو میں رکھو، خود دل کے بس میں نہ آجاؤ۔

اَلصَّبْرُ وَالصَّلٰوۃُ، صبر ایک سلبی کیفیت اور صلوٰۃ ایک ایجابی عمل ہے ان دو کلیدی لفظوں سے اشارہ ادھر ہو گیا کہ انفرادی اصلاح اور اجتماعی فلاح دونوں کا راز صرف ان دو چیزوں میں ہے ایک معاصی سے حفظ و احتیاط دوسرے اوامر کا اتباع۔

۵۶۶ اللہ کی معیتِ عام تو کافر و مومن، فاسق و صالح اپنے ہر بندہ کے ساتھ ہے وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ

یہاں یہ معیتِ عام مراد نہیں بلکہ معیتِ خصوصی مراد ہے جس کے آثار حفاظت، اعانت و توجہِ خاص ہیں۔ یہ اسی معیتِ الٰہی کا احساس و استحضار تھا جس نے رسول کریمؐ کے صحابہؓ کو بے پناہ قوت، جرأت، بے خوفی کا مالک بنا دیا تھا اور حق یہ ہے کہ اس مراقبہ سے بڑھ کر نہ روح کے لیے کوئی لذیذ غذا ہے اور نہ جراحتِ قلب کے لیے کوئی مرہم تسکین یہی ایک تصور ہے اہل ایمان کے لیے جو ہر ناگوار کو خوشگوار ہر تلخ کو شیریں اور ہر زہر کو قند بنا دینے کو کافی ہے، دورِ حاضر کے مغربی مفکرین اور نفسیین نے بھی اس تعلق باللہ پر روشنی ڈالی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ قلب کی اداسی، افسردگی کے وقت تعلق باللہ سے بڑھ کر مونس و رفیق دوسرا کوئی نہیں ملاحظہ ہو JAMES کی VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCES کے مختلف مقامات۔

مَعَ معیت کی مختلف قسمیں (مکانی، زمانی، معنوی، وغیرہ) گنانے کے بعد اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ اس میں مفہوم نصرت و اعانت کا شامل رہتا ہے۔

يَقْتَضِي مَعْنَى النُّصْرَةِ. (راغب)

اور وہی یہاں مراد ہے۔

قَالُوا الْمَعِيَّةُ هُنَا مَعِيَّةُ الْمَعُونَةِ. (المنار)

صبر کی فضیلت ابھی ابھی اِسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ میں آچکی تھی، اب إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ کہہ کر اسے اور زیادہ واضح و مؤکد کر دیا۔ مشکلات تکوینی ہوں یا تشریعی حقیقۃً ان سے مقابلہ کرنے کی بہترین سپر انسان کے ہاتھ میں اسی صبر کی ہے اور اس سے امت کے ہر ہر فرد کو ہر وقت مسلح رہنا لازمی ہے۔

صَبر اپنے وسیع مفہوم میں ایک جامع لفظ ہے صلوٰۃ اسی کی ایک ممتاز صورت ہے معیتِ الٰہی کی نعمت جب صابرین کو ملے گی تو نمازیوں کو بدرجۂ اولیٰ ملے گی اور اسی لیے اس کی صراحت کی ضرورت نہ رہی۔

وَلَمْ يَقُلْ مَعَ الْمُصَلِّينَ لِأَنَّهُ إِذَا كَانَ مَعَ الصَّابِرِينَ كَانَ مَعَ الْمُصَلِّينَ مِنْ بَابِ أَوْلٰى لِإِيمَاءِ الصَّلٰوةِ عَلَى الصَّبْرِ (روح)

۵۶۷ (عالم برزخ میں ایک خاص حیات کے ساتھ اور عام انسانوں کی طرح مُردہ نہیں)

آیت سے مقصود حیاتِ شہداء کا اثبات ہے، یہ مراد نہیں کہ انھیں زندہ جان کہا بھی جائے۔

أَنَّ الْمَقْصُودَ إِثْبَاتُ الْحَيَاةِ لَهُمْ لَا أَمْرُهُمْ بِأَنْ يَقُولُوا فِي شَأْنِهِمْ إِنَّهُمْ أَحْيَاءٌ وَإِنْ كَانَ ذٰلِكَ أَيْضًا صَحِيحًا (روح)

فِي سَبِيلِ اللّٰهِ یعنی دینِ حق کی راہ میں، مذہبِ صحیح کی خاطر۔

أَيْ فِي طَاعَتِهِ وَإِعْلَاءِ كَلِمَتِهِ (روح)

غزوۂ بدر میں جب کچھ صحابی شہید ہو گئے تو نا فہم کافروں نے کہنا شروع کیا کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنی زندگی گنوادی، اور زندگی کے لطف سے محروم ہو گئے، انھیں جواب مل رہا ہے کہ تم جس معنی میں انھیں مردہ سمجھ رہے ہو اُس میں وہ مرے سے ہوئے ہی نہیں بلکہ زندوں سے کہیں بڑھ کر پر لذت سے لذت یاب ہو رہے ہیں۔ اصطلاح میں ایسے مقتول کو شہید کہتے ہیں برزخی زندگی اپنی عام صورت میں تو سب ہی کے لئے ہے لیکن شہیدوں کو اُس عالم میں ایک خصوصی اور امتیازی زندگی نصیب ہوگی آثار حیات میں دوسروں سے کہیں زیادہ قوی بقول مفسر تھانوی شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر اُس کے جسد ظاہری تک بھی پہونچتا ہے کہ اس کا جسد باوجود گوشت پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسد زندہ کے صحیح و سالم رہتا ہے جیسا کہ احادیث و مشاہدات شاہد ہیں اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء شہیدوں سے بھی زیادہ قوت و امتیاز رکھتے ہیں۔

تَخْصِیْصُ الشُّهَدَاءِ لِاِخْتِصَاصِهِمْ بِالْقُرْبِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ مَزِیْدِ الْبَهْجَةِ وَالْكَرَامَةِ (بیضاوی)

ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ حیات روحانی ہوتی ہے، لیکن ترجیح اسی قول کو ہے کہ جسمانی و روحانی دونوں ہوتی ہیں۔

ذَهَبَ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ السَّلَفِ اِلٰى اَنَّهَا حَقِيْقَةٌ بِالرُّوْحِ وَالْجَسَدِ وَذَهَبَ الْبَعْضُ اِلٰى اَنَّهَا رُوْحَانِيَّةٌ وَالْمَشْهُوْرُ تَرْجِيْحُ الْقَوْلِ الْاَوَّلِ (روح) قِيْلَ حَيَاةٌ رُوْحَانِيَّةٌ مَحْضَةٌ۔ (المنار)

اور یہ عقیدہ جمہور اُمت کا، عہد صحابہ سے لے کر اب تک چلا آرہا ہے کہ روح کو، جو جسم کے علاوہ ایک جوہر قائم بالذات ہے احساس موت یعنی جسم سے الگ ہونے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

وَفِيْهَا دَلَالَةٌ عَلٰى اَنَّ الْاَرْوَاحَ جَوَاهِرُ قَائِمَةٌ بِاَنْفُسِهَا مُغَايِرَةٌ لِمَا يُحَسُّ بِهِ مِنَ الْبَدَنِ تَبْقٰى بَعْدَ الْمَوْتِ دَرَّاكَةً وَعَلَيْهِ جُمْهُوْرُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَبِهِ نَطَقَتِ الْاٰيَاتُ وَالسُّنَنُ (بیضاوی)

آیت سے بقاعدۂ دلالۃ النص یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال صرف کرنے والے اور انھیں ہوائے نفس میں لُٹانے والے یکساں نہیں ہوتے حیات شہداء کے معتقد یہود بھی بعض فرقے ہوئے ہیں (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۹ صفحہ ۵۶۶) ابن العربی مالکی نے کہا ہے کہ اسی آیت سے تمسک کر کے بعض ائمہ نے شہید کے لئے غسل و نماز جنازہ دونوں غیر ضروری بتائے ہیں کہ ان کی تطہیر تو شہادت سے ہو چکی لیکن امام ابو حنیفہؒ نے نماز جنازہ کو ضروری برقرار رکھا ہے (احکام القرآن) اور جب شہید زندہ ہیں اور رزق بھی پاتے رہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ تو اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ اسی طرح کافروں کو عذاب بھی بعد موت ہوتا ہوگا، اور اس سے اثبات عذاب قبر کا ہوتا ہے۔

وَاِذَا كَانَ اللّٰهُ يُحْيِيْهِمْ بَعْدَ الْمَوْتِ لِيَرْزُقَهُمْ فَيَجُوْزُ اَنْ يُّحْيِيَ الْكُفَّارَ لِيُعَذِّبَهُمْ وَيَكُوْنُ فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى عَذَابِ الْقَبْرِ (قرطبی) جَازَ اَنْ يُّحْيِيَ الْكُفَّارَ فِيْ قُبُوْرِهِمْ فَيُعَذَّبُوْا وَهٰذَا يُبْطِلُ قَوْلَ مَنْ يُّنْكِرُ عَذَابَ الْقَبْرِ۔ (جصاص)

امام رازی نے آیت کے تحت میں حدیث نبوی اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النِّيْرَانِ (قبر یا تو ایک باغ ہوتی ہے جنت کے باغوں میں سے یا ایک گڑھا ہوتا ہے آگ کے گڑھوں میں سے) درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ عذاب و ثواب قبر کے باب میں حدیثیں گویا حد تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں۔

وَالْاَخْبَارُ فِيْ ثَوَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِهٖ كَالْمُتَوَاتِرَةِ (کبیر)

۵۶۸ اس لئے کہ برزخ حواس ناسوتی سے مُدرک نہیں ہوتا اور انسان اُس حیات عالی و لطیف کا ادراک اپنے حواس ظاہری کے ذریعہ سے نہیں کر سکتا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ

اور ہم تمہاری آزمائش کرکے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال اور جان اور پھلوں کے کچھ نقصان

وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ

سے ۵۲۹ اور آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ۵۵۰ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے۔

اِنَّمَا هِيَ اَمْرٌ لَا يُدْرَكُ بِالْعَقْلِ بَلْ بِالْوَحْيِ (بیضاوی) لِاَنَّهَا مِنْ اَحْوَالِ الْبَرْزَخِ الَّتِيْ لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهَا وَلَا طَرِيْقَ لِلْعِلْمِ بِهَا اِلَّا بِالْوَحْيِ (روح) لِاَنَّ حَيَاتَهُمْ الشَّهِيْدَ لَا نَعْلَمُ حِسًّا (مدارک)

ابن کثیرؒ نے ایک حدیث نبوی نقل کرکے اور اس سے استنباط کرکے لکھا ہے کہ ایسی حیات عام مومنین کو حاصل رہتی ہے، البتہ شہداء کا ذکر خاص طور پر ان کی عظمت و اکرام کے لئے قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے۔

فَفِيْهِ دَلَالَةٌ لِعُمُوْمِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيْضًا وَاِنْ كَانَ الشُّهَدَاءُ قَدْ خُصِّصُوْا بِالذِّكْرِ فِي الْقُرْاٰنِ تَشْرِيْفًا لَهُمْ وَتَكْرِيْمًا وَتَعْظِيْمًا۔

۵۲۹ (بہ تقاضائے حکمت)

خطاب مومنین صادقین سے چلا آ رہا ہے انہیں بتایا ہے کہ مصیبتیں اور بلائیں ان پر بھی یقیناً آئیں گی لیکن بطور سزا و عذاب نہیں بلکہ ابتلاء و امتحان کے رنگ میں اور اس ارشاد سے ان کی تسلی و تسکین کا بہترین سامان بہم پہونچا دیا۔ آزمائش خداوندی سے مقصود نتائج کو دنیا پر ظاہر کر دینا ہوتا ہے ورنہ حق تعالیٰ کو تو علم ظاہر ہے کہ ہمیشہ سے ہے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے اس چوٹ کے درمیان جو دشمن کے ہاتھ سے پہونچتی ہے اور اس نشتر کے جو شفیق ڈاکٹر لگاتا ہے کہ ایک کی بنیاد تمام تر بدخواہی پر ہوتی ہے اور دوسرے کی یکسر اخلاص و ہمدردی پر۔ عام انسان کو جو دکھ درد دنیا میں پہونچتے رہتے ہیں ان میں کتنی مختلف وہ تکلیفیں ہوتی ہیں جو بعض بطور آزمائش اور بعض از دیاد مراتب کی خاطر ایک مومن کو حکیم مطلق و شفیق مطلق پروردگار کی طرف سے پہونچائی جاتی ہیں۔ بِشَيْءٍ سے یہ بتا دیا کہ امتحان بہت سخت نہیں ہوگا بلکہ ہر ایک کے جزو قلیل ہی سے متعلق ہوگا، کل سے متعلق نہیں۔

اَيْ بِقَلِيْلٍ مِنْ ذٰلِكَ (بیضاوی) بِقَلِيْلٍ مِنْ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْ هٰذِهِ الْبَلَايَا وَطَرَفٍ مِنْهُ۔ (مدارک)

اَلْخَوْفِ۔ خوف کا لفظ جامع ہے، جان، مال، عزت ہر چیز سے متعلق اندیشہ و ہراس اس کے اندر آ گیا۔

اَلْجُوْعِ۔ بھوک کا امتحان یہ ہے کہ کسی حاجت کے باوجود ہر مال حرام سے بچے اور نہ روزے سے جھجکے اور نہ فقر و فاقہ سے ڈرے۔

اَمْوَال۔ رشوت، سود، خیانت، بیع فاسد، ہر غیر شرعی معاملت سے دستبردار ہو جائے اور جو مالی نقصانات تکوینی طور پر واقع ہوں، چوری ہو جائے، آگ لگ جائے، ان سب پر صبر سے کام لے۔

اَلْاَنْفُسِ۔ موت، بیماری، جہاد کے حادثوں میں صبر سے کام لے۔

اَلثَّمَرٰتِ۔ اولاد سے بھی مراد ہو سکتی ہے اور تجارت، زراعت وغیرہ کے منافع سے بھی، ہر قسم کی نیک نامی، ناموری کے موقع بھی اس میں شامل ہیں، محققین نے کہا ہے کہ بندہ کا ہر امتحان شرک و توحید کے درمیان فارق ہوتا ہے عوام کا امتحان شرک جلی سے متعلق ہوتا ہے اور خواص کا شرک خفی سے۔

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

تو وہ کہتے ہیں ۵۵۱ء بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بے شک ہم اُسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں ۵۵۲ء

مرشد تھانوی ؒ نے فرمایا کہ آیت نص ہے اس باب میں کہ مجاہدہ اضطراری بھی نافع ہوتا ہے۔

۵۵۰ء صبر کرنے والوں کو یعنی اُن بندوں کو جو حالت غم میں بھی حدود شریعت سے قدم باہر نہیں نکالتے۔ صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو محسوس ہی نہ کرے اس کا نام صبر نہیں بے حسی ہے۔ صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و درد انگیز واقعہ پر عقل کو نفس پر غالب رکھے زبان کو شکوہ اور ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دے اور نظر کو مسبب الاسباب اُس کی مصلحت و حکمت پر اُس کی شفقت و رحمت پر رکھے۔

غم میں بھی قانون فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں ۔۔۔ یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں! (اکبرؔ)

۵۵۱ء (حضور قلب کے ساتھ)

تحصیل صبر میں عقیدۂ قلب تلفظ زبانی پر مقدم ہے۔

مُصِیْبَۃ کے لغوی معنی اُفتادگی کے ہیں اور حدیث میں اس کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ كُلُّ شَیْءٍ یُؤْذِی الْمُؤْمِنَ فَهُوَ مُصِیْبَةٌ (جو شے بھی مسلمان کو ناگوار گزرے بس وہی اُس کے حق میں مصیبت ہے) اہل شرح و تفسیر سے بھی ایسے ہی قول منقول ہیں۔

اَلْمُصِیْبَةُ كُلُّ مَا یُؤْذِی الْمُؤْمِنَ وَیُصِیْبُهٗ (قرطبی) اَلْمُصِیْبَةُ كُلُّ مَا اٰذَی الْمُؤْمِنَ فِیْ نَفْسٍ اَوْ مَالٍ اَوْ وَلَدٍ قَلَّتْ اَوْ كَثُرَتْ (بحر) وَالْمُصِیْبَةُ كُلُّ مَا یُصِیْبُ الْاِنْسَانَ مِنْ مَكْرُوْهٍ فِیْ نَفْسٍ اَوْ مَالٍ اَوْ اَهْلٍ قَلِیْلًا كَانَ مَكْرُوْهًا اَوْ كَثِیْرًا

گویا اس کا اطلاق نہایت وسیع اور عام ہے اور اس کے تحت میں چھوٹی بڑی ہر ناخوشگوار و تکلیف دہ شے آگئی، بیماری ہو، مالی نقصان ہو، دشمنوں، عزیزوں کی مفارقت کا صدمہ ہو، موت کا غم ہو، اولاد کی جدائی ہو، بے عزتی ہو، وغیرہ وغیرہ۔

حدیث نبوی میں اسے آیت استرجاع سے تعبیر کیا گیا ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ جو کوئی مصیبت کے وقت اسے پڑھ لیا کرے گا، اللہ اس کی بگڑی بنائے گا اور اس کی عاقبت بخیر کرے گا۔ وَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَرْجَعَ عِنْدَ الْمُصِیْبَةِ جَبَرَ اللّٰهُ مُصِیْبَتَهٗ وَاَحْسَنَ عُقْبَاهُ۔

زبان سے اس آیت کی تلاوت کا دستور بحمد اللہ اب بھی اکثر مسلمان گھروں میں پایا جاتا ہے لیکن تحصیل صبر کے لئے محض زبانی اعادہ ہرگز کافی نہیں، قلب کے سامنے بھی استحضار پوری طرح ہونا چاہیے۔

اَلْاِسْتِرْجَاعُ تَسْلِیْمٌ وَّاِذْعَانٌ (مدارک) وَلَیْسَ الصَّبْرُ بِالْاِسْتِرْجَاعِ بِاللِّسَانِ بَلْ بِهٖ وَبِالْقَلْبِ۔ (صاوی، روح)

قَالُوْٓا۔ صورۃً صیغہ ماضی کا ہے لیکن مقصود مومنین صابرین کی عادت کا بیان ہے۔

اِذَآ۔ بیان کسی ایک اور اتفاقی واقعہ کے لئے نہیں، عام عادت کے اظہار کے لئے آیا ہے یعنی جب جب یا کبھی بھی کوئی ناخوشگواری پیش آتی ہے۔

وَالْمَعْنٰى فِیْ اِذَا هُنَا عَلَى التَّكْرَارِ وَالْعُمُوْمِ۔ (بحر)

۵۵۲ء (خواہ آج خواہ چند روز بعد)

آیت کے اندر تعلیم تین چیزوں کی ملی۔

ایک یہ کہ ہم سب عبد محض ہیں اور تمام تر اُسی کی ملک ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی۔ اپنی کوئی شے ہی نہیں

أُولَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

یہی لوگ تو وہ ہیں کہ ان پر نوازشیں ہوں گی ان کے پروردگار کی طرف سے اور رحمت (بھی) اور یہی لوگ راہ یاب ہیں [۵۵۳]

نہ بیوی نہ بچے، نہ مال نہ جائداد، نہ وطن نہ خاندان، نہ جسم نہ جان! ع

جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا! (اکبرؔ)

انسان کے سارے رنج و غم، درد و حسرت کی بنیاد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب چیزوں کو اپنی سمجھتا ہے لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہو گیا، اور کوئی سی بھی شئے ہو، سرے سے اپنی رہی ہی نہیں، تو اب اُن محبوبات، مالوفات، مرغوبات کے چھن جانے پر گلہ و شکوہ رنج و ملال کا موقع ہی کیا؟

دوسری بات یہ کہ بڑے بڑے رنج اور صدمے اور دل کے داغ بھی عارضی اور فانی ہیں، رہ جانے والے کوئی بھی نہیں، عنقریب انھیں چھوڑ چھاڑ، مالک کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہاں پہنچتے ہی سارے قرضے بیباق ہو جائیں گے ہر کھوئی ہوئی چیز وصول ہو کر رہے گی۔

یہ تینوں عقیدے جس کے جتنے زیادہ مضبوط ہوں گے اُسی قدر اُس کے دل کو دنیا میں امن و سکون حاصل رہے گا، غم و حزن کے بار کو ہلکا کرنے کا جو عارفانہ اور نہایت بیش بہا نسخہ یہاں بتا دیا گیا ہے، یہ صحائفِ کائنات میں بے نظیر ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر صرف یہی ایک آیت ہوتی تو یہی اُسے حکیم مطلق کا کلام ثابت کرنے کے لئے واللہ کافی تھی۔

صَبر، ایک کیفیتِ نفسی کا نام ہے، اور اصلاً اس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے کلمۂ صبر دُہرانے کا حکم اسی کیفیت کو قوی اور مؤکد بنانے کے لئے ہے، محققین کہتے ہیں کہ آیت میں جو حکم ہے اُس کی تعمیل کے تین مرتبے ہیں:—

(۱) درجۂ اعلیٰ، دل میں آیت کے معنی منقش ہوں، اور زبان پر بھی اُس کے الفاظ جاری ہوں (۲) درجۂ اوسط، دل میں معنی کا خیال کر لے، اور زبان سے ادا نہ کرے (۳) درجۂ ادنیٰ، دل میں استحضار نہ ہو مگر زبان سے دُہرا دے، چوتھی ممکن صورت یہ ہے کہ دل میں اعتقاد کسی درجہ میں بھی موجود نہ ہو محض زبان سے دُہرا دے اس مقام کا نام منافقت ہے اور یہ ایمان والوں کی دنیا سے خارج ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بابت تاریخ کا بیان ہے کہ آپ ادنیٰ ادنیٰ تکلیف یا ناگواری کے موقع پر بھی یہ کلمہ زبان پر لاتے رہتے تھے، اور یہی معمول آپ کے صحابیوںؓ کا رہا ہے۔

رٰجِعُوْن۔ سے یہ مُراد نہیں کہ انسان ابھی کہیں اور ہے، اور پھر کسی ایسے مقام یا جہت میں آجائے گا جہاں خدا ہے، خدا کے پاس تو وہ اب بھی ہے، مُراد یہ ہے کہ عالمِ آخرت میں جس طرح اللہ کی ملکیت و ربوبیت سارے ظاہری اسباب کے ٹوٹ جانے سے بالکل واضح و نمایاں ہو جائے گی، اُسی طرح یہ خدا ہی کی طرف رجوع بالکل آشکار ہو کر رہے گا، درمیانی واسطے سب غائب ہو کر رہیں گے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ کلمۂ استرجاع تمام مصیبتوں کا علاج ہے، اور انھیں میں قبض بھی داخل ہے جو سالکوں کو اکثر پیش آتا رہتا ہے۔

۵۵۳ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

اور واقعی ان سے بڑھ کر عبودیت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور ہو کون سکتا ہے کہ عین نزولِ

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ

صفا و مروہ بے شک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں ۵۵۲ھ

مصیبت کے وقت بھی ان حقیقتوں سے غافل نہ ہونے کہ ہم بندے ہیں اپنے مالک نہیں بلکہ اللہ کے مملوک ہیں، ہماری جان، مال، ہماری بیوی بچے سب اسی کی ملک اور اس کے عطیہ ہیں، وہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ کر رہا ہے ہر طرح ہمارے حق میں بہتری ہے، ہم کو پلٹ کر بس اسی کے پاس جانا ہے اور اسی سے ہمارا آخری سابقہ پڑنے والا ہے۔

اوپر کی آیت میں صابرین کے حق میں جس خوشخبری کا ذکر تھا، یہ سب اسی کا بیان ہو رہا ہے۔

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ یعنی یہ لوگ عنایت خاصہ کے مورد ہوں گے ہر شخص اپنے اپنے درجہ کے متناسب۔

وَرَحْمَةٌ یعنی یہ لوگ رحمت عام کے مورد رہیں گے، اور کوئی ان نعمتوں کی حد و نہایت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

وَهِيَ بِنِعْمَةٍ الَّتِي لَا نَعْلَمُ مَقَادِيرَهَا إِلَّا اللّٰهُ تَعَالٰى (جصاص)

هُمُ الْمُهْتَدُونَ. دنیا میں ان کی رسائی اس حقیقت تک ہو چکی تھی کہ کوئی چیز بھی اپنی نہیں یہاں تک کہ خود ان کے جسم و جان، نفس و روح کا، ملک حق تعالیٰ ہی ہے چنانچہ جب یہ اس کے پاس پہونچیں گے تو سب ہی کچھ پالیں گے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ و خاصہ کو پالیا، اس سے دنیا اور آخرت کی بچی ہی کون سی نعمت؟

أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ بِمَطَالِبِهِمِ الدُّنْيَوِيَّةِ وَالْأُخْرَوِيَّةِ فَإِنَّ مَنْ نَالَ تَزْكِيَةَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَرَحْمَتَهُ لَمْ يَفُتْهُ مَطْلَبٌ۔ (روح)

عوامی زبان میں أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ کا ترجمہ ہوگا "بس یہی لوگ تو پہونچے ہوئے ہیں"!

۵۵۲ھ (نہ کہ دیوی دیوتاؤں کی یادگاروں میں سے)

الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ کسی زمانہ میں مسجد الحرام کے پاس دو پہاڑیاں تھیں اب معمولی بلندیاں محض چٹان کی سی رہ گئی ہیں، صفا حرم شریف کی داہنی جانب ہے، اور مروہ بائیں جانب، دونوں کے درمیان فاصلہ ۴۹۳ قدم کا ہے یا تقریباً ۱/۴ فرلانگ۔

جاہلیت کے زمانہ میں ان دونوں پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب ہو گئی تھی، جس کی پوجا ہوتی تھی۔

قَالَ الشَّعْبِيُّ كَانَ عَلَى الصَّفَا صَنَمٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يُسَمَّى إِسَافًا وَعَلَى الْمَرْوَةِ صَنَمٌ يُسَمَّى نَائِلَةَ (قرطبی)

ذَكَرَ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ فِي كِتَابِ السِّيرَةِ ... فَكَانَ مَنْ طَافَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ يَسْتَلِمُهُمَا۔ (ابن کثیر)

صفا کے لغوی معنی صاف پتھر یا خالص چٹان کے ہیں، اور مروہ کے بھی لفظی معنی سفید نرم پتھر کے ہیں۔

الصَّفَا الْحِجَارَةُ الصَّافِيَةُ (راغب) قَالَ الْمُبَرِّدُ وَهُوَ كُلُّ حَجَرٍ لَا يُخَالِطُهُ غَيْرُهُ مِنْ طِينٍ أَوْ تُرَابٍ (روح) الْمَرْوَةُ فِي الْأَصْلِ الْحَجَرُ الْأَبْيَضُ۔ (روح)

حدیث صحیح میں یہ مضمون آیا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو شیر خوارگی کے زمانہ میں خانہ کعبہ کے پاس پیاسا اور تنہا چھوڑ کر اس تلاش میں نکلی تھیں کہ کہیں کوئی قافلہ آتا جاتا نظر آجائے تو اس سے پانی ہاتھ آئے، اور اسی اضطراب میں دوڑ کر اس پہاڑی سے اس پہاڑی پر جاتی تھیں کہ شاید بلندی سے کسی قافلہ پر نظر پڑ جائے۔

شَعَائِرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے دین کی نشانیاں یا علامتیں، دین الٰہی کے وہ شعائر جو طاعتوں میں بطور علم کام دیں۔

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا

سو جو کوئی بیت (اللہ) کا حج کرے یا عمرہ کرے ۵۷۵ اس پر (ذرا) بھی گناہ نہیں کہ اُن دونوں کے درمیان آمد و رفت کرے ۵۷۶

شَعَائِرُ جمع ہے شَعِيرَةٌ کی اور اس کے معنی ہیں علامت کے۔

جَمْعُ شَعِيرَةٍ وَهِيَ الْعَلَامَةُ (مدارك) أَيْ أَعْلَامِ طَاعَتِهِ وَكُلُّ شَيْءٍ جُعِلَ عَلَمًا مِنْ أَعْلَامِ طَاعَةِ اللّٰهِ فَهُوَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (كبير) هِيَ الْعَلَائِمُ الَّتِي نَدَبَ اللّٰهُ إِلَيْهَا وَأَمَرَ بِالْقِيَامِ بِهَا (بحر عن الزهري) الْمُتَعَبَّدَاتُ الَّتِي أَشْعَرَهَا اللّٰهُ تَعَالَى أَيْ جَعَلَهَا أَعْلَامًا لِلنَّاسِ مِنَ الْمَوْقِفِ وَالسَّعْيِ وَالنَّحْرِ وَالْإِشْعَارِ الْعَلَامَةُ (قرطبی)

اصطلاح میں مراد مناسکِ حج کی علامتیں ہیں۔

أَيْ مِنْ أَعْلَامِ مَنَاسِكِهِ وَمُتَعَبَّدَاتِهِ (مدارك) مِنْ مَعَالِمِ اللّٰهِ فِي الْحَجِّ (ابن العربی) أَيْ مِنْ مَعَالِمِهِ وَمَوَاضِعِ عِبَادَاتِهِ (قرطبی)

۵۷۵ حَجَّ الْبَيْتَ۔ حج عبادتِ اسلامی کا چوتھا رکن یا نماز، روزہ، زکوٰۃ کے بعد چوتھا فریضہ۔ لفظی معنی قصد کے ہیں اب اصطلاح میں یہ خانۂ کعبہ کی سالانہ زیارت متعیّن قاعدوں کے مطابق و ماتحت کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔

أَيْ قَصَدَ وَأَصْلُ الْحَجِّ الْقَصْدُ ثُمَّ اخْتُصَّ هٰذَا الْاِسْمُ بِالْقَصْدِ إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ بِأَفْعَالٍ مَخْصُوصَةٍ (قرطبی) أَصْلُ الْحَجِّ الْقَصْدُ لِلزِّيَارَةِ... خُصَّ فِي تَعَارُفِ الشَّرْعِ بِقَصْدِ بَيْتِ اللّٰهِ تَعَالَى إِقَامَةً لِلنُّسُكِ۔ (راغب)

حج اُمت کے ہر فرد پر خواہ دنیا کے کسی علاقہ کا باشندہ ہو بشرطِ استطاعت و صحت و امن راہ، عمر میں ایک بار فرض ہے گویا دنیائے اسلام کی بین الاقوامی سالانہ کانگرس۔ ارکانِ حج میں جو چیزیں فرض ہیں وہ تین ہیں (۱) پوششِ احرام یعنی حدودِ حرم میں داخلے سے پہلے عام لباس اُتار کر احرام یا بے سِلا ہوا لباس پہن لینا (۲) میدانِ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو حاضری، اصطلاح میں اُسے وقوف کہتے ہیں (۳) طوافِ زیارت یعنی وقوف کے بعد خانۂ کعبہ کا طواف۔

اور واجباتِ حج چار ہیں (۱) ۹، ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں مزدلفہ میں قیام (۲) صفا و مروہ کے درمیان آمد و رفت، اصطلاحی نام سعی ہے (۳) مزدلفہ کے قیام کے بعد منیٰ میں کنکریاں پھینکنا، اصطلاحی نام رمی جمرات ہے (۴) طوافِ کعبہ (یہ طواف فرض کے علاوہ ہے اور طوافِ صدر کہلاتا ہے) قربانی کرنا، سر کے بال اُتروانا وغیرہا بہت سے سنن و مستحبات ان کے علاوہ ہیں۔

اَوِ اعْتَمَرَ عمرہ یا حجِ اصغر لفظی معنی زیارت کے ہیں، شریعت میں اصطلاح زیارت بیت اللہ کے لئے بن گئی ہے بلا قیدِ وقت و تاریخ۔

اَلْاِعْتِمَارُ وَالْعُمْرَةُ الزِّيَارَةُ الَّتِي فِيهَا عِمَارَةُ الْوُدِّ وَجُعِلَ فِي الشَّرِيعَةِ لِلْقَصْدِ الْمَخْصُوصِ (راغب) وَهِيَ الْعُمْرَةُ الْحَجُّ الْأَصْغَرُ (راغب۔ تحت الحج) اِعْتَمَرَ أَيْ زَارَ وَالْعُمْرَةُ الزِّيَارَةُ۔ (قرطبی)

اس میں حج کی طرح مہینہ اور تاریخ کی قید نہیں اور نہ اس میں وقوفِ عرفات ہے اور نہ قیامِ مزدلفہ و منیٰ، سال کے ہر موسم میں اور ہر وقت ہو سکتا ہے، عمرہ کی نیت سے احرام حدودِ حرم سے باہر باندھے، طوافِ کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر کے بال اُتروائے بس عمرہ ہوگیا احرام کھول دے۔

۵۷۶ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ۔ صفا و مروہ کو نسبت تو توحید کے خاص الخاص گھرانے سے حاصل تھی یعنی ہاجرہ

وَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۵۸﴾

اور جو کوئی خوشی سے کوئی امر خیر کرے سو اللہ تو بڑا قدر دان ہے بڑا علم رکھنے والا ہے ۵۷۷

اور اسماعیل اور ابراہیم علیہم السلام سے، لیکن زمانۂ جاہلیت میں تصرف ان پر بھی مشرکوں کا ہو گیا تھا، اور ایک ایک پہاڑی پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب ہو گئی تھی، بعض مشرک قبیلے تبرکاً جب حج کرنے جاتے تو انھیں بھی دوڑ دوڑ کر چھوتے اور چومتے، قرنِ اول کے مسلمانوں صحابیوں کی توحید پرستی اور شرک بیزاری کا کیا پوچھنا، قدرۃً خیال گزرا کہ کہیں ان پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت شعائرِ شرک میں نہ قرار پائے، آیت میں انھیں کا شبہہ دور کیا گیا ہے، اور ارشاد ہوا ہے کہ یہ جاہلیت کی نہیں عین توحید کی یادگاریں ہیں، اس لئے اگر ان کے درمیان آمد و رفت اسلامی و توحیدی حج کا جزو رکھی جائیں تو اس میں مطلق مضائقہ نہیں۔

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ كَانَ عَلَى الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةِ اَصۡنَامٌ وَكَانَ الۡمُسۡلِمُوۡنَ لَا يَطُوۡفُوۡنَ عَلَيۡهَا لِاَجۡلِ الۡاَصۡنَامِ (جصاص)

يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ طوف کے اصلی معنی کسی چیز کے گرد گھومنے یا چکر کاٹنے کے ہیں، لیکن وسعت دے کر اس کے معنی مطلق آس پاس جانے کے بھی کئے گئے ہیں، اور یہاں مراد دو مقاموں کے درمیان آمد و رفت سے ہے۔

اَلطَّوۡفُ الۡمَشۡيُ حَوۡلَ الشَّيۡءِ (راغب) وَالۡمُرَادُ هُنَا السَّعۡيُ بَيۡنَهُمَا۔ (مدارک)

یہی صفا و مروہ کے درمیان، حنفیہ کے ہاں واجب ہے، امام احمدؒ کے ہاں سنت ہے اور مالکیہ و شافعیہ کے ہاں فرض ہے، یہ آمد و رفت سات بار ہوتی ہے، درمیان کا کچھ فاصلہ تقریباً دو فرلانگ دوڑ کر چلنا ہوتا ہے اسی لئے اس کا نام سعی (دوڑ) ہے، اس فاصلہ کی علامت کے طور پر سڑک کے کنارے دو پتھر سبز رنگ کے نصب کر دیئے گئے ہیں، کسی زمانہ میں یہاں بالکل ویرانہ تھا، لیکن اب تو عین بازار ہے اور صفا و مروہ کے درمیان خوب آبادی اور چہل پہل رہتی ہے۔

۵۷۷ (اس لئے اس کے ہاں نہ اعزاز و اکرام کی کمی کسی نیک کام کے لئے ہوگی، اور نہ وہ کسی کے اخلاص عمل سے ناواقف ہے)

تَطَوَّعَ۔ تَطَوُّعٌ۔ ہر وہ چیز ہے فرض کے علاوہ جو انسان اپنی خوشی سے انجام دے۔

خَيۡرًا۔ خیر عام معنی میں ہے، ہر عمل خیر کو شامل۔

اَلۡمُرَادُ مِنۡهُ جَمِيۡعُ الطَّاعَاتِ۔ (کبیر عن الحسن) فَهٰذَا اَوۡلٰى لِاَنَّهٗ اَوۡفَقُ بِعُمُوۡمِ اللَّفۡظِ (کبیر)

مطلب یہ کہ کوئی سا بھی نیک کام ہو، کسی نوعیت اور کسی درجہ کا، جو بھی انسان خوشی سے انجام دے گا اس کا اجر اُسے مل کر رہے گا۔

شَاكِرٌ۔ شکر کا لفظ جب اللہ کے لئے آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندگی تھوڑی سی طاعت پر معاوضہ بہت زائد دیتا ہے۔

اَلشُّكۡرُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى اَنۡ يُّعۡطِيَ لِعَبۡدِهٖ فَوۡقَ مَا يَسۡتَحِقُّهٗ يَشۡكُرُ الۡيَسِيۡرَ وَيُعۡطِي الۡكَثِيۡرَ (معالم)

عَلِيۡمٌ۔ یعنی نیتوں تک سے واقف۔ عَلِيۡمٌ پر حاشیہ گزر چکا ہے۔

عَلِيۡمٌ بِنِيَّتِهٖ (معالم)

ابھی ایک ہی آیت اوپر ذکر فضائلِ صبر کا ہو رہا تھا، اس کے معاً بعد ذکر حج کا شروع ہو جانا، علاوہ اور بہت سی

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡھُدٰی مِنۡ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں سے نازل کر چکے ہیں بعد اس کے کہ ہم

بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ

اسے لوگوں کے لیے کتاب (الٰہی) میں کھول چکے ہیں ۵۷۸

حکمتوں اور مصلحتوں کے ایک خاص مناسبت بھی صبر سے رکھتا ہے ان سطور کے راقم نارسیاہ کا ذاتی تجربہ ہے کہ ہجوم حج کے ہجوم و چپقلش اور مسلسل کوچ و مقام میں فرائض تک کی پابندی مشکل پڑ جاتی ہے سنن و مستحبات کا کیا ذکر ہے استعمال کے باوجود زبان پر قابو رکھئے، ہاتھ پیر پر قابو رکھئے، کان اور آنکھ پر قابو رکھئے، غرض صبر کا پورا امتحان ہو جاتا ہے۔

۵۷۸ یعنی کتب سابق کے مضامین اور پیش گوئیوں کو دانستہ چھپاتے ہیں، مراد یہود و نصاریٰ ہیں، اور اس پر ابن عباس صحابی اور مشاہیر تابعین سب کا اتفاق ہے۔

نَزَلَتۡ فِیۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ مِنَ الۡیَھُوۡدِ وَالنَّصٰرٰی (کبیر عن ابن عباس والمجاھد والحسن وقتادہ والربیع والسدی والاصم) اَلۡاَقۡرَبُ اَنَّھَا نَزَلَتۡ فِی الۡیَھُوۡدِ وَالۡحُکۡمُ عَامٌّ (روح)

یَکۡتُمُوۡنَ۔ اور حق پوشی بھی اس غضب کی کہ محض سکوت پر کفایت نہیں کرتے، بلکہ الٹی حق کے مخالف شہادت دے گزرتے ہیں، کتمان کا اطلاق اس اخفاء پر ہوتا ہے جو قصداً کیا جائے اور اس موقع پر جہاں اظہار ضروری ہو۔

اَلۡکِتۡمَانُ تَرۡکُ اِظۡھَارِ الشَّیۡءِ قَصۡدًا مَعَ مَسَاسِ الۡحَاجَۃِ اِلَیۡہِ (روح)

اَلۡبَیِّنٰتُ وَالۡھُدٰی۔ بیّنات وہ نشانیاں ہیں جو بجائے خود واضح و صریح ہیں، اَلۡھُدٰی وہ ہے جو دوسروں کے لیے ذریعہ ہدایت بن سکے، یہاں بیّنات سے مراد رسالت محمدیؐ کے دلائل و شواہد ہیں اور ھُدٰی سے مراد احکام شریعت ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلۡبَیِّنٰتُ وَالۡھُدٰی کے عموم میں منصوص و مستنبط دونوں قسم کے احکام آ گئے۔

یَعُمُّ الۡمَنۡصُوۡصَ عَلَیۡہِ وَالۡمُسۡتَنۡبَطَ لِشُمُوۡلِ اسۡمِ الۡھُدٰی لِلۡجَمِیۡعِ (قرطبی) وَذٰلِکَ یَشۡتَمِلُ عَلٰی سَائِرِ اَحۡکَامِ اللّٰہِ فِی الۡمَنۡصُوۡصِ عَلَیۡہِ وَالۡمُسۡتَنۡبَطِ لِشُمُوۡلِ اِسۡمِ الۡھُدٰی لِلۡجَمِیۡعِ (جصاص)

اور فقہاء مفسرین نے یہیں سے یہ بھی نکالا ہے کہ چونکہ عدم کتمان یعنی بیان اس قول کا واجب ہے جس کا قبول واجب ہے اس لیے خبر احاد بھی واجب العمل ہے۔

وَفِیۡہِ دَلِیۡلٌ عَلٰی وُجُوۡبِ الۡعَمَلِ بِقَوۡلِ الۡوَاحِدِ لِاَنَّہٗ لَا یَجِبُ عَلَیۡہِ الۡبَیَانُ اِلَّا وَقَدۡ وَجَبَ قُبُوۡلُ قَوۡلِہٖ (قرطبی) عَامٌّ فِی الۡجَمِیۡعِ وَکَذٰلِکَ مَا عُلِمَ مِنۡ طَرِیۡقِ اَخۡبَارِ الرَّسُوۡلِ فَقَدِ انۡطَوَتۡ تَحۡتَ الۡاٰیَۃِ لِاَنَّ فِی الۡکِتَابِ الدَّلَالَۃَ عَلٰی قُبُوۡلِ اَخۡبَارِ الۡاٰحَادِ وَعَنۡہُ عَلَیۡہِ السَّلَامُ فَکُلُّ مَا اقۡتَضَی الۡکِتَابُ اِیۡجَابَ حُکۡمِہٖ مِنۡ جِھَۃِ النَّصِّ فَقَدۡ شَمِلَتۡہُ الۡاٰیَۃُ (جصاص) وَیُحۡتَجُّ بِھٰذِہِ الۡاٰیَاتِ فِیۡ قُبُوۡلِ الۡاَخۡبَارِ الۡمُقَصِّرَۃِ عَنۡ مَرۡتَبَۃِ اِیۡجَابِ الۡعِلۡمِ بِمُخۡبِرِھَا فِیۡ اُمُوۡرِ الدِّیۡنِ (جصاص)

اور علوم دین پر اجرت لینے کے عدم جواز پر بھی اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

وَفِی الۡاٰیَۃِ حُکۡمٌ اٰخَرُ وَھُوَ اَنَّھَا مِنۡ حَیۡثُ دَلَّتۡ عَلٰی لُزُوۡمِ اِظۡھَارِ الۡعِلۡمِ وَتَرۡکِ کِتۡمَانِہٖ فَھِیَ دَالَّۃٌ ع

اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا

یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور اُن پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں ۵۷۹؎ البتہ جو لوگ توبہ کرلیں ۵۸۰؎

وَاَصۡلَحُوۡا وَبَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۰﴾

اور درست ہو جائیں ۵۸۱؎ اور ظاہر کردیں ۵۸۲؎ یہ وہ لوگ ہیں کہ میں ان پر متوجہ ہو جاؤں گا رحمت سے ۵۸۳؎ اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا رحمت والا ہوں ۵۸۴؎

اِمْتِنَاعٌ عَنْ اِبْرَازِھَا عِنْدَ الْحَاجَۃِ ... لِاِخْبَارِ الْاُمَّۃِ وَتَعْلِیْمِ الدِّیْنِ (جصاص)

بَیَّنّٰہُ میں ہٗ کی ضمیر مَآ اَنۡزَلۡنَا کی طرف ہے یعنی اُس مضمون کو، اس علوم کو۔

وَالْھَاءُ فِیْ بَیَّنّٰہُ تَرْجِعُ اِلٰی مَآ اُنْزِلَ مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْھُدٰی (قرطبی)

اَلۡکِتٰبُ سے مراد جنس کتاب یعنی قدیم کتب آسمانی۔

وَالْکِتٰبُ اِسْمُ جِنْسٍ فَالْمُرَادُ جَمِیْعُ الْکُتُبِ الْمُنَزَّلَۃِ (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ایسے شخص کی مذمت ہے جو اپنے مریدوں کے سوا دوسروں سے علوم شریعت کو چھپاتا ہے کہ علوم ما انزل اللہ کے عموم میں داخل ہیں۔ البتہ علوم مکاشفہ کا حکم دوسرا ہے وہ منزل نہیں بلکہ بعض اوقات ان کے اظہار میں خوف فتنہ بھی ہے۔

۵۷۹؎ (خواہ لعنت کرنے والے جنس آدم سے ہوں یا جنات ہوں یا ملائکہ ہوں یا اور کوئی مخلوق ہوں)

لَعۡنَۃ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔ اللہ کی لعنت یہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو اپنے سے دُور اور اپنے فضل وکرم سے مہجور کر دیتا ہے

اَیْ یُبْعِدُھُمْ عَنْ رَحْمَتِہٖ (روح) وَذٰلِکَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی فِی الْاٰخِرَۃِ عُقُوْبَۃٌ وَفِی الدُّنْیَا اِنْقِطَاعٌ

مِنْ قُبُوْلِ رَحْمَتِہٖ وَتَوْفِیْقِہٖ۔ (راغب)

مخلوق کی لعنت یہ ہے کہ ان بدکاروں کے لئے بددعا کی جائے، ان کے لئے حق تعالیٰ کی رحمت سے دُوری اور اُس کے فضل وکرم سے مہجوری طلب کی جائے۔

وَمِنَ الْاِنْسَانِ دُعَاءٌ عَلٰی غَیْرِہٖ (راغب) بِمَعْنَی الدُّعَاءِ عَلَیْھِمْ بِالْاِبْعَادِ عَنْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ (روح)

لفظ لعنت قدیم صحیفوں کا بھی چلا ہوا محاورہ ہے، ملاحظہ ہوں توریت میں استثناء ۱۱:۲۶ و ۲۷ نیز ۸:۱۵-۲۱ وغیرہ اور انجیل میں مرقس ۱۱:۲۱۔ یوحنا ۷:۴۹ وغیرہ۔

فقہاء نے آیت ماقبل سے استدلال کیا ہے کہ عالم پر تبلیغ حق اور اپنے علم کا بیان واجب ہے۔

اِسْتَدَلَّ بِھَا عُلَمَاءُنَا عَلٰی وُجُوْبِ تَبْلِیْغِ الْحَقِّ وَبَیَانِ الْعِلْمِ عَلَی الْجُمْلَۃِ۔ (ابن العربی)

۵۸۰؎ (اپنے پچھلے جرائم سے)

توبہ کرنے سے مراد باز آنا، نادم ہونا، اور عزم ترک کے ساتھ عذر خواہی کرنا ہے۔

۵۸۱؎ یعنی آئندہ کے لئے اپنی اصلاح حال کرلیں۔

۵۸۲؎ (اپنی آسمانی کتابوں کے اُن مضامین کو جنھیں وہ اب تک چھپاتے رہے ہیں)

یہاں مراد ہیں اسلام و پیمبر اسلام سے متعلق پچھلے صحیفوں میں پیش خبریاں۔ خلاصہ یہ کہ یہ مجرم اگر ماضی پر نادم ہو کر

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ

بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اور مرجائیں اسی حال میں کہ وہ کافر ہیں، سو یہ وہی لوگ ہیں کہ ان پر لعنت ہے

وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۱۶۱)

اللہ کی، اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی ۵۸۵

اب بھی ایمان لے آئیں اور تلافیٔ مافات پر آمادہ ہو جائیں۔

۵۸۳ یعنی یہ تائبین نہ صرف لعنت کی زد سے باہر ہو جاتے ہیں بلکہ رحمت و مغفرتِ الٰہی کے تحت بھی آجاتے ہیں البتہ جو لوگ اپنی انھیں بدکرداریوں پر اصرار رکھتے ہیں اُن پر سزا بھی قائم رہتی ہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ مَاتُوا عَلَى الْكِتْمَانِ وَلَمْ يَتُوبُوا عَنْهُ فَقَدِ اسْتَقَرَّتْ عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ وَلَمْ تَزَلْ عَنْهُمْ (روح)

أَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا۔ توبہ و قبول توبہ کا مضمون قرآن مجید میں بار بار آیا ہے یہاں توبہ کے ساتھ قید اصلاح اور تبیین کی لگی ہوئی ہے یعنی جو فساد پھیلایا تھا اُس کی اصلاح اور جو چھپایا تھا اس کا اظہار۔ محققین نے لکھا ہے کہ جن گناہوں سے صرف حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے مثلاً نماز یا روزہ کا ترک اُن کے لئے محض توبہ و استغفار کافی ہے کہ اس کا تعلق صفات رحمانیت و رحیمیت سے ہے لیکن جن گناہوں سے بندوں کی حق تلفی لازم آتی ہے مثلاً قتل، چوری، رشوت، غصب، فساد، بد امنی، سود خواری، عقائد باطلہ کا اعلان اُن کے لئے ضروری ہے کہ ہر متعین معصیت کے ضرر کا عملی تدارک بھی بقدر امکان کرے جب جا کر توبہ قبول ہوگی کہ یہاں واسطہ حق تعالیٰ کی صفت عدل سے ہے۔

۵۸۴ قرآن مجید کا بار بار صفت رحیمی اور قبول توبہ پر زور دینا ایک طرف اُن گمراہ قوموں (مثلاً بودھ مت والوں) کے مقابلہ میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ قانون مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں "کرم") ہر حال اور ہر صورت میں اپنا عمل کرکے رہتا ہے اور کوئی خدائی قوت اس پر غالب نہیں آسکتی اور دوسری طرف اُن گمراہ قوموں (مثلاً مسیحیوں) کے مقابلہ میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ صفت رحیمی کا اظہار پوری طرح کر ہی نہیں سکتا، اور اس کی صفتِ عدل کے تقاضہ کو پورا کرنے اور گنہگاروں کو معافی دلوانے کے لئے کسی کفارہ کا وجود لازمی ہے۔

۵۸۵ أَجْمَعِينَ کا لفظ تاکید کے لئے آیا ہے اور اس کا تعلق اللہ اور ملائکہ اور الناس تینوں سے ہے محض الناس سے نہیں

وَأَجْمَعِينَ تَأْكِيدٌ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الْكُلِّ لَا لِلنَّاسِ فَقَطْ۔ (روح)

لَعْنَةُ اللَّهِ۔ اہلسنت کے ہاں کسی متعین گنہگار پر لعنت کرنا ہرگز جائز نہیں البتہ بغیر کسی کو متعین کئے ہوئے مبہم و مطلق صورت میں جائز ہے، مثلاً یہ کہ چور پر لعنت ہو۔

فَأَمَّا الْعَاصِي الْمُعَيَّنُ فَلَا يَجُوزُ لَعْنُهُ اِتِّفَاقًا وَأَمَّا لَعْنُ الْعَاصِي مُطْلَقًا يَجُوزُ اِجْمَاعًا (ابن العربی)

وَذَكَرَ ابْنُ الْعَرَبِيِّ الْاتِّفَاقَ عَلَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ لَعْنُ الْعَاصِي وَالْمُتَجَاهِرِ بِالْكَبَائِرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (بحر)

بلکہ حدیث صحیح میں تو مومن پر لعنت اُس کے قتل کے مثل بتائی گئی ہے۔

وَفِي صَحِيحِ مُسْلِمٍ لَعْنُ الْمُؤْمِنِ كَقَتْلِهِ (ابن العربی)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

وہ اس میں پڑے رہنے والے ہیں ۵۸۶ کہ نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہونے پائے گا اور نہ انہیں مہلت ہی دی جائے گی ۵۸۷

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع ۱۹

اور تمہارا خدا ایک خدا ہے ۵۸۸ بجز اس کے کوئی خدا نہیں ۵۸۸ بے انتہا رحم و کرم کرنے والا، بار بار رحم کرنے والا ۵۸۹

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ۔ بلکہ زندگی میں تو کافر متعین تک پر بھی لعنت کی اجازت نہیں وَمَاتُوْا کی قید نے صاف کر دیا کہ یہاں جن پر لعنت آئی ہے اُن کی موت ہی کفر پر ہو چکی تھی اور اصل مدار ختم اعمال یا وفات پر ہے۔

قال لی کثیر من اشیاخی انّ الکافر المعیّن لا یجوز لعنہ لانّ حالہ عند الموافاۃ لا تعلم (ابن العربی) وقد بیّن اللّٰہ تعالٰی فی ھذہ الاٰیۃ فی اطلاق اللعنۃ الموافاۃ علی الکفر (ابن العربی) وجمھور العلماء علی جواز لعن الکفّار جملۃ من غیر تعیین.. واما الکافر فجمھور العلماء علی انہ لا یجوز لعنہ (بحر) فان الکافر المعیّن فقد ذھب جماعۃ من العلماء الی انہ لا یلعن لانّا لا ندری بما یختم اللّٰہ لہ (ابن کثیر)

عبرت حاصل کرنا چاہئے ان مسلمانوں کو جو اپنے کسی بھائی کو لغزش میں مبتلا دیکھ کر اس پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں۔

۵۸۶ (ہمیشہ ہمیش کے لئے)

خٰلِدِيْنَ۔ خلود کے معنی ہیں لازم پکڑ لینے کے یعنی اسی لعنت و عذاب میں جس میں وہ ہمیشہ چپٹے رہیں گے

الخلود اللزوم الطویل ومنہ یقال اخلد الی کذا ای لزمہ ورکن الیہ۔ (کبیر)

فِيْهَا میں ضمیر دوزخ کی طرف ہے اور بعض نے لعنت کی طرف راجع کی ہے مقصود ہر صورت میں ایک ہی ہے۔

ای فی سعینھا والنار (بیضاوی۔ مدارک) یعنی فی اللعنۃ ای فی جزائھا وقیل خلودھم فی لعنۃ انّھا مؤبدۃ علیھم۔ (قرطبی)

اور بجائے اسم کے ضمیر لانے سے مقصود اظہار عظمت و اہمیت ہے۔

انّھا اضمرت تفخیمًا لشأنھا وتھویلًا (کشاف)

۵۸۷ تخفیف کا تعلق بعد عذاب سے ہے اور مہلت کا تعلق قبل عذاب سے یعنی دوزخ میں پڑنے کے بعد نہ کسی قسم کی تخفیف ان کے عذاب میں ہوگی اور نہ عذاب میں پڑنے سے قبل ہی کوئی مہلت انہیں ملے گی۔

۵۸۸ (نہ بڑا نہ چھوٹا، نہ ملکی نہ غیر ملکی)

یہاں خطاب ساری نوع انسانی سے ہے نفس وجود باری تو مشرکین عرب کو بھی تسلیم تھا جس طرح آج بھی ساری مشرک قوموں کو تسلیم ہے لیکن مشرکین علاوہ اُس خدائے عظیم یا خدائے بزرگ کے اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا یا دیوتا تسلیم کرتے ہیں بلکہ مشرکین قدیم تو اپنی قوم کے علاوہ دوسری قوموں کے یہاں تک کہ اپنی دشمن قوموں کے بھی دیوتاؤں کے وجود کے قائل تھے ان کی قوت کے قائل تھے ان کی خدائی کے قائل تھے بس صرف اُن کی عبادت کے منکر تھے اور اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ دشمن کا دیوتا بھی دشمن ہی ہوگا۔ گویا خدا بھی جذبات و احساسات کے لحاظ سے انسان کا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اُدل بدل میں اور جہازوں کے چلنے میں جو

الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ

سمندر میں اُن چیزوں کے ساتھ چلتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہونچاتی ہیں، اور (اس) پانی میں جسے اللہ نے آسمان

مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ

سے اُتارا پھر اس سے زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد جلا اُٹھایا اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے اور

وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

ہواؤں کے بدلنے میں، اور بادل میں (جو) آسمانوں اور زمین کے درمیان مُقید ہے (ان سب میں) اُن لوگوں

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

کے لئے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں موجود ہیں ۵۹۰

منتفی ہوتا ہے، قرآن نے آکر اس عقیدہ پر بھی ضرب کاری لگائی، اور دعوے سے بار بار اعلان کیا کہ قابل پرستش ونا قابل پرستش ہونا کیسا، کسی دوسرے خدا یا دیوتا کا وجود ہی سرے سے نہیں نہ بڑے کا نہ چھوٹے کا، نہ ملکی کا نہ غیر ملکی کا! اور اللہ کے ساتھ شریک کا وجود محض وہم انسانی کی ایک اختراع ہے! ہمارے قدیم مفسرین بھی بغیر جدید علم الاقوام (انتھرالوجی) کی کسی تحقیق کے اس نکتہ تک پہونچ گئے تھے۔

إِزَاحَةً لِأَنَّ يُتَوَهَّمَ أَنَّ فِي الْوُجُوْدِ إِلٰهًا وَلٰكِنْ لَا يَسْتَحِقُّ مِنْهُمُ الْعِبَادَةَ. (بیضاوی)

خدائے واحد کے وجود کا دعوے اور تمام دوسرے خداؤں سے انکار اس شد و مد سے اُس قوم کے سامنے کیا جارہا ہے جس کے دو چار نہیں۔ ۳۶۰ بُت اس کے سب سے بڑے مندر میں موجود تھے۔

وَكَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ ثَلٰثُ مِائَةٍ وَسِتُّوْنَ صَنَمًا. (قرطبی)

۵۸۹ یعنی مظہر کامل رحمانیت کا بھی اور رحیمیت کا بھی، دونوں صفتیں اُسی پر ختم ہیں، کوئی اس کا شریک نہ اس صفت میں اور نہ اُس صفت میں۔

۵۹۰ (اللہ کی حکمت و ربوبیت، قدرت، صنّاعی اور اس کی فردیت کی)

زمین و آسمان کے یہ سارے کارخانے جو دنیا کے ہر علم سے بڑھ کر حیرت انگیز، اور انسانی سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہیں، بجائے خود اس کی دلیل ہیں کہ نہ یہ اپنے آپ وجود میں آسکتے ہیں نہ باقی رہ سکتے ہیں جب تک کوئی صاحب شعور، صاحب ارادہ قادر مطلق ہستی اُن کی صانع و خالق نہ ہو، ان سارے مظاہر فطرت کا تسلسل و استمرار ان کی یک رنگی

وباقاعدگی ان کا نظم وانضباط، ہر عقل سلیم کو مجبور کر رہے ہیں کہ اُن کے عقب میں ایک ذی اختیار فعال کا ہاتھ تسلیم کیا جائے، اُسی عقل سلیم کو جو ایک معمولی سی گھڑی کو بھی بغیر کسی ماہر فن اور صنّاع گھڑی ساز کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے! یہ خلاق ہستیاں اگر صیغۂ جمع یعنی ایک سے زائد فرض کی جائیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک خالق ان سارے امور کے لئے کافی نہ تھا، اس سے اس کا عجز ثابت ہوا، اور جو عاجز یا کسی بات میں ناقص ہے، وہ خالق نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر کسی کی ربوبیت اور خالقیت پر اعتقاد ہے تو اسے لامحالہ واحد و یکتا بھی ماننا پڑے گا۔

خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمان ہوں یا زمین، سب مخلوق ہی ہیں، غیر مخلوق یا خود آفریدہ کوئی نہیں، مشرک قوموں نے انھیں معبود مانا ہے، اور صاحب تصرف و حاجت روا دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے ان کی پرستش کی ہے، قرآن مجید نے لفظ "خلق" سے ادھر اشارہ کر دیا کہ یہ عظیم الشان موجودات بھی کائنات کے ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ کی طرح مخلوق ہی ہیں، اور آکاش دیوتا، دھرتی ماتا وغیرہ قسم کے الفاظ نرے بے معنی اور مہمل ہیں۔

اَلَّیْلِ وَالنَّهَارِ۔ دنیا ایسی مشرک قوموں سے بھی خالی نہیں رہی ہے جنھوں نے رات اور دن کو ذی حیات اور صاحب ارادہ و تصرف مان کر انھیں دیوی دیوتا کا درجہ دیا ہے، اور ان کی پوجا کی ہے، یہاں ان کے اختلاف (اَدل بدل) کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ ان کا غیر مخلوق یا خود آفریدہ ہونا الگ رہا، یہ وقت و زمان کے بے حس و بے جان اجزاء تو خود اپنی حرکت تک پر قادر نہیں، قادر مطلق ہی ان میں رات دن اُلٹ پھیر کرتا رہتا ہے۔

اَلْفُلْكُ۔ فلک مرکب بحری۔ واحد و جمع دونوں صیغوں میں آتا ہے۔

فَإِفْرَادُهُ وَجَمْعُهُ بِلَفْظٍ وَاحِدٍ (قرطبی) تَقَعُ عَلَى الْوَاحِدِ وَعَلَى الْجَمْعِ وَهِيَ السَّفِينَةُ وَالسُّفُنُ (بحر)

اور قدیم فقہاء مفسرین نے اُس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ بحری سفر عبادت کی غرض سے ہو، ... اور تجارت کے لئے ہو ... بہر صورت جائز ہے اور بحری تجارت کے پُر منافع ہونے کا اشارہ بھی اس میں شامل ہے۔

فَدَلَّ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ وَالْمَعْنَى عَلَى إِبَاحَةِ رُكُوبِهِ لِلْمُتَعَبِّدِ وَالْمُتَاجِرِ (قرطبی) دَلَالَةٌ عَلَى إِبَاحَةِ رُكُوبِ الْبَحْرِ غَازِيًا وَتَاجِرًا أَوْ مُبْتَغِيًا لِسَائِرِ الْمَنَافِعِ إِذْ لَمْ يَخُصَّ ضَرْبًا مِنَ الْمَنَافِعِ دُونَ غَيْرِهِ (جصاص) دَلَّ عَلَى إِبَاحَةِ رُكُوبِهَا وَعَلَى إِبَاحَةِ الْاِكْتِسَابِ وَالتِّجَارَةِ وَعَلَى الْاِنْتِفَاعِ بِاللَّذَّاتِ۔ (کبیر)

ہندستان میں جب شروع شروع میں ریل نکلی ہے تو دیہات میں خود اس کی پوجا شروع ہو گئی تھی اور بہت سے "خوش عقیدہ" مشرکوں نے اپنی معبودوں کی فہرست میں ایک "انجن دیوتا" کا بھی اضافہ کر لیا تھا، ایسی ہی وہم پرست قوموں نے اگر کبھی بادبانی جہازوں اور دخانی کشتیوں کی بھی پوجا کی ہو تو کچھ عجب نہیں، فلک کے عموم کے تحت میں اسٹیمر، لائنر، ڈریڈ ناٹ ہر قسم کے چھوٹے بڑے جہاز اور آب دوز و تباہ کن ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں، غرض کل بحری سواریاں آگئیں جو اس وقت موجود ہیں یا قیامت تک ایجاد ہو سکیں، سامان جنگ کے لئے یا سامان تجارت کے لئے یا بغرض تفریح۔

مَا یَنْفَعُ النَّاسَ۔ (انسان کو فائدہ پہونچانے والی چیز) کا وصف سب میں عام و مشترک ہے، مَا یَنْفَعُ النَّاسَ کے عموم کی وسعت لحاظ رکھنے کے قابل ہے، انسانی نفع و منفعت کی ہر ممکن شے اس میں آگئی۔

أَيْ بِالَّذِي يَنْفَعُهُمْ مِنَ التِّجَارَاتِ وَسَائِرِ الْمَآرِبِ الَّتِي تَصْلُحُ بِهَا أَحْوَالُهُمْ وَبِرُكُوبِ الْبَحْرِ تُكْتَسَبُ الْأَرْبَاحُ وَيَنْتَفِعُ مَا يُحْمَلُ إِلَيْهِ الْمَتَاعُ أَيْضًا (قرطبی) لِمَعَايِشِ النَّاسِ وَالْاِنْتِفَاعِ بِمَا عِنْدَهُ، أَهْلِ ذٰلِكَ الْإِقْلِيمِ وَنَقْلِ مَا فِي

هٰؤُلَاءِ وَمَا عَسٰی أُولٰئِکَ اِلٰی هٰؤُلَاءِ . بِی تَیْسِیْر بَحْیٍ زُرُوْعِهِمْ وَالْعَمَلِ عَلَیْهَا فِی اِسْتِمَارَاتٍ وَمَکَاسِبَ وَأَنْوَاعِ لِمَطَالِبَ .

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ ایک معترض نے سوال کیا ہے کہ قرآن کی جامعیت کا دعویٰ ہے تو اس میں نمک مرچ وغیرہ کھانے کے مسالوں کا ذکر کہاں ہے؟ جواب یہ ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ کا عموم ان سب کو شامل ہے۔ (معالم)

مِنَ السَّمَآءِ ۔ السَّمَاء کا مفہوم جیسا کہ اوپر تشریح ہو چکی ہے بادل آسمان وغیرہ ہر اوپر والی چیز کے لئے عام ہے۔ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ لا کر یہ یاد دلا دیا کہ بارش میں حیات بخشی کی جو قوت ہے، یہ اسی خدائے واحد حیات آفریں کی ودیعت کی ہوئی ہے۔

دَآبَّةٍ ۔ عام ہے ہر حیوان کے لئے۔ حیوان پرستی شرک کا ایک جزو اعظم تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے، بابل، مصر، ہندوستان وغیرہ میں گائے، بیل، بندر، لنگور، سانپ، بچھوے وغیرہ کی پوجا برابر ہوا کی ہے۔

السَّحَابِ ۔ اسم جنس ہے واحد سحابۃ ہے۔

هُوَ اسْمُ جِنْسٍ وَاحِدُهٗ سَحَابَةٌ ۔ (روح)

زمین، کرہ ۲۵ ہزار میل کے محیط کا کوئی گولا ہے، تو یا اگر غیر پیمائش شدہ وسعت کی کوئی چپٹی چیز ہے تو بھی، اگر تیزی اور پھرتی کے ساتھ گردش کر رہی ہے یا اگر اپنی جگہ پر ساکن ہے تو بھی، ہر حال میں اور ہر صورت فرض کرنے کے بعد بھی کیسی عظیم الشان کاریگری کیسی بے مثال صناعی کا نمونہ ہے! فضا کی خلا میں کس کی قوت اسے تھامے ہوئے سنبھالے ہوئے ہے؟ اس کے اور چاند سورج اور ستاروں سیاروں کے درمیان فاصلہ کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے؟ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے متعین کر دی ہے؟ آفتاب اسے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہونچا رہا ہے؟ چاند سے روشنی اور خنکی ایک متعین حساب سے کس کا دست قدرت اس تک لا رہا ہے؟ آسمان اگر ٹھوس مادی اجسام ہیں تو یا اگر خلا میں محض حد نظر ہیں تو بھی ہر صورت میں ان کی وضع، ساخت، ترکیب، ہیئت انسانی دسترس سے کتنی بالاتر ہے! گنتی شمار سے باہر ثوابت و سیاروں کے سکون و حرکت کا انتظام کون قائم کئے ہوئے ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی اور ان کے طلوع و غروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے؟ نظام فلکی کے بے شمار اجزا و عناصر میں یہ ترتیب و رباہمی تناسب کس کی حکمت و صنعت کے دم سے زندہ ہے؟ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں؟ گرمی اور سردی اور برسات ہر موسم میں ان کے اندر مناسب وقت تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں ان کے طلوع و غروب کے وقت کیسے بندھے ہوئے ہیں؟ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جس تاریخ و وقت کلکتہ میں دن نکلتا ہے، دمشق میں بھی دن نکل آئے نہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی ایران کی شام بن جائے، جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جون میں وہی باقی رہ جائیں آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اور قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تغیرات کس کی حکومت قاہرہ اور حکمت کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں؟ بحر ذخار سارے بڑے عظموں کو اپنی گرفت میں لئے رہنے والا، رقبہ میں خشکی سے چہار چند اپنی اس ساری عظمت و ہیبت کے باوجود کس طرح مشت خاک انسان کے قبضہ میں آ گیا ہے؟ کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک ٹھانک کر ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے بڑے مہیب فاصلوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے! اس میں جزر و مد جب ہوگا قمری مہینوں کی فلاں فلاں ہی تاریخوں پر ہوگا۔ اپنی ساری غضبناک تندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا، ایک مخصوص و متعین ہی وزن کی چیزوں کو وہ لئے اور تیرائے گا، اور اس کے علاوہ وزن والیوں کو ڈبو دے گا، اس کے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ خاص مزہ ہوگا، کنوؤں کے پانی سے مختلف، دریاؤں کے پانی سے مختلف، اس طرح سیکڑوں دوسرے قانونوں کا پابند اسے کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی شریک بنائے ہوئے ہیں ۵۹۱ اُن سے ایسی محبت رکھتے

كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ

ہیں جیسی اللہ سے ۵۹۲ (رکھنا چاہیے) اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی محبت سب سے قوی رکھتے ہیں ۵۹۳

بارش کا خاص خاص فصلوں میں اخاص خاص موسموں میں اخاص خاص فضائی تغیرات کے ماتحت ہونا بخارات کا ایک خاص گرمی پاکر سمندری ذخیرۂ آب سے اٹھنا ایک خاص فاصلہ تک اوپر جانا، ایک خاص درجہ کی سردی پاکر اُن دُخانی و ہوائی اجزاء کا منجمد ہو جانا، اُن کا بادل کی شکل اختیار کر لینا، ایک خاص درجۂ ثقل تک بڑے بڑے بھاری اور بوجھل بادلوں کا فضا میں سنبھلے رہنا پھر فلاں فلاں فضائی تغیرات کے ماتحت فلاں فلاں علاقہ تک جانا، پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں ایک متعین مدت تک اندر برس جانا، اس سے از سر نو خشک زمین میں جان پڑ جانا، یہ سارے رد و بدل کسی حکیم کی حکمت کسی آمر کی حکومت کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی ہوئی شہادت دے رہے ہیں! پھر حیات نباتی کے علاوہ خود حیات حیوانی جن عجائب کا مجموعہ ہے ہر زندہ جسم میں بے شمار ذرّوں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے ان میں جو ایک مخصوص ترتیب و متعین ترکیب ہوتی ہے ایک خاص درجہ کی حرارت جو حیات کو قائم رکھتی ہے ایک خاص مقدار سے بڑھی ہوئی سردی جو اس لطف میں انتشار اس اجتماع میں انتشار پیدا کر دیتی ہے نظامِ تغذیہ، نظامِ تنفس، نظامِ تناسل، نظامِ عصبی وغیرہ جسم کے اندر متعدد نظامات، پھر ہر نظام کے ماتحت بے شمار قاعدے اور ضابطے، اس سارے نظامِ عالم کی تکوین و قیام پر کس کی قدرت، کس کی مشیت، کس کی حکومت کارفرما ہے؟ اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں سوالات پر انسان جتنا زیادہ غور اور نکتہ سنجی سے کام لے گا توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا، جاہلی اور غیر مومن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطۂ نظر غلط ہوتا ہے اس کی اگر تصحیح ہو جائے اور ان علومِ مادی کا مطالعہ اگر ایمانی نقطۂ نظر سے شروع کر دیا جائے تو بجائے الحاد و ارتیاب و تشکک کے عرفان و ایقان کی راہیں روز بروز روشن تر ہو جائیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ آیت میں مصنوعات سے صانع پر استدلال ہے اور یہی اصل ہے مراقبۂ صوفیہ کی۔

۵۹۱ اَنْدَادًا۔ نِدّ کے لفظی معنی کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۶۲؎۔ کسی شے کا نِدّ یا مَدِیْد اُسے کہتے ہیں جو اس کے اصل جوہر میں شریک ہو۔

نِدِيْدُ الشَّيْءِ مُشَارِكُهٗ فِيْ جَوْهَرِهٖ وَذٰلِكَ ضَرْبٌ مِّنَ الْمُمَاثَلَةِ۔ (راغب)

اَنْدَاد سے مراد عموماً مورتیوں، بتوں، دیوتاؤں سے لی گئی ہے۔

اَلْمُرَادُ الْاَوْثَانُ وَالْاَصْنَامُ الَّتِيْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَهَا (قرطبی) اَلْمُرَادُ بِهَا الْاَصْنَامُ كَمَا هُوَ الشَّائِعُ فِي الْقُرْاٰنِ وَالْمَرْوِيُّ عَنْ قَتَادَةَ وَمُجَاهِدٍ وَاَكْثَرِ الْمُفَسِّرِيْنَ۔ (روح)

رؤساء، سردار اور مقتدایانِ قوم بھی مراد لیے گئے ہیں۔

قِيْلَ الرُّؤَسَاءُ الَّذِيْنَ يُطِيْعُوْنَهُمْ طَاعَةَ الْاَرْبَابِ مِنَ الرِّجَالِ (روح) اَلسَّادَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُطِيْعُوْنَهُمْ (کبیر عن السدی) وَالْاَنْدَادُ عِنْدَ جُمْهُوْرِ الْمُفَسِّرِيْنَ اَعَمُّ مِنَ الْاَصْنَامِ وَالْاَوْثَانِ

وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ

اور کاش ظالم جب عذاب کو دیکھ لیتے ۵۹۴ تو سمجھ لیتے

فَيَشْمَلُ الرُّؤَسَاءَ الَّذِيْنَ خَضَعَ بَعْضُ النَّاسِ خُضُوْعًا دِيْنِيًّا (المنار)

تیسرا قول یہ ہے کہ مفہوم ان سب کو دیئے ہے اور لفظ کا عموم ہر ایسی چیز کا بیان ہے جو اللہ تعالٰی کے سوا قلب پر مسلط ہو جائے اور امام رازی نے اس قول کو صوفیہ اور عارفین کی جانب منسوب کیا ہے۔

اَلْقَوْلُ الثَّالِثُ ——— قَوْلُ الصُّوْفِيَّةِ وَالْعَارِفِيْنَ وَهُوَ اَنَّ كُلَّ شَيْءٍ شَغَلْتَ قَلْبَكَ سِوَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَقَدْ جَعَلْتَهُ فِيْ قَلْبِكَ نِدًّا لِلّٰهِ تَعَالٰى (کبیر) وَقِيْلَ الْمُرَادُ اَعَمُّ مِنْهُمَا وَهُوَ مَا يُشْغِلُ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى (روح)

۵۹۲ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی مسیحیوں کو محبت اور تعلق خاطر خدا سے کہیں زیادہ خدا کے بیٹے" اور مریم "روح القدس" اور "مقدس کنواری" سے ہے، اور ہندوؤں کی محبت اور تعلق خاطر اپنے ایشور اور پرماتما سے کہیں زیادہ درگا مائی، لکشمی مائی، اگنی دیوتا وغیرہ دیویوں، دیوتاؤں کے ساتھ اور رشیوں منیوں سادھوؤں کے ساتھ ہے۔

كَحُبِّ اللّٰهِ۔ اس فقرہ نے اسے بالکل صاف کر دیا کہ غیر اللہ سے نفس محبت ممنوع نہیں، بلکہ ماں باپ بھائی بہن، بیٹے، بیٹی، عزیزوں، دوستوں، رفیقوں سے تو محبت درجۂ طبعی میں رکھ ہی دی گئی ہے، اکثر شریعت و طریقت سے بھی محبت رکھنا مستحب بلکہ کسی حد تک تو واجب بھی ہے، البتہ جو محبت حرام ہے، وہ محبوب کو درجۂ ربوبیت پر پہونچانے والی محبت ہے "یا علی" "یا حسین" "یا خواجہ" "یا غوث" "یا وارث" کے نعرے لگانے والے ذرا اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں کہ محبت کا کتنا حصہ اللہ کے لئے باقی رہ گیا، اور کتنا دوسروں کی نذر ہو چکا ہے۔

ابن القیم نے یہاں اپنی اور اپنے شیخ ابن تیمیہ کی طرف سے یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ یہ غیر اللہ کے ساتھ شرک صفت خلق و ربوبیت میں نہ تھا، اس لئے کہ غیر اللہ کو رب و خالق کون تسلیم کرتا ہے بلکہ افراط تعظیم و محبت کے اعتبار سے تھا، مومن کو تو انتہائی اعتقاد و اخلاص جو ہوتا ہے وہ بس اللہ ہی سے ہوتا ہے نہ کہ غیر اللہ سے۔

فَهٰذَا اَنْدَادٌ فِي الْمَحَبَّةِ لَا فِي الْخَلْقِ وَالرُّبُوْبِيَّةِ فَاِنَّ اَحَدًا مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ لَمْ يُثْبِتْ هٰذَا النِّدَّ بِخِلَافِ نِدِّ الْمَحَبَّةِ فَاِنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ الْاَرْضِ قَدِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا فِي الْحُبِّ وَالتَّعْظِيْمِ ... وَكَانَ شَيْخُ الْاِسْلَامِ ابْنُ تَيْمِيَّةَ يَقُوْلُ اِنَّمَا ذُمُّوْا بِمَا شَرَكُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَبَيْنَ اَنْدَادِهِمْ فِي الْمَحَبَّةِ وَلَمْ يُخْلِصُوْهَا لِلّٰهِ كَمَحَبَّةِ الْمُؤْمِنِيْنَ لَهٗ (تفسیر ابن القیم ص ۱۳۰)

۵۹۳ یعنی مومن کی محبت حقّی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی تمام دوسری محبتوں پر غالب و حاکم رہتی ہے، آیت نے ضمناً اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا کہ مومن کا تعلق اللہ کے ساتھ اصلاً انس و محبت ہی کا ہوتا ہے، کاش اس آیت کو وہ مسیحی مشنری آنکھ کھول کر پڑھیں جن کے نزدیک اسلام کا خدا ایک دہشت ناک قسم کا معبود ہے۔

۵۹۴ (تو پھر عذاب کی نوبت ہی کیوں آتی)

يَرٰى یہاں يَعْلَمُ کے معنی میں ہے۔

اَیْ يَعْلَمُ لَيْسَ بِرُؤْيَةِ عَيْنٍ (مجاز) وَيَرٰى بِمَعْنٰى يَعْلَمُ (قرطبی) اَیْ لَوْ يَعْلَمُ هٰؤُلَاءِ (روح)

أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ

کہ قوت اللہ ہی کی ہے ساری کی ساری ۵۹۵ اور یہ کہ اللہ کا عذاب بہت ہی سخت ہے ۵۹۶ (اس وقت کا خیال کرو) جب

اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

مقتدا (یا متبوع) اپنے مقتدیوں (یا پیروؤں) سے الگ ہو جائیں گے ۵۹۷ اور عذاب دیکھ لیں گے، اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ کر رہ جائیں گے ۵۹۸

لَوْ کا جواب محذوف ہے یعنی یہ کہ اللہ کا عذاب شدید و بے پناہ ہے۔

وَجَوَابُ لَوْ مَحْذُوفٌ وَالْمَعْنٰى لَعَلِمُوْا فِي الدُّنْيَا أَنَّ الْقُدْرَةَ عَلٰى عَذَابِ اللّٰهِ (جلالین) قَالَ أَبُوْ عُبَيْدٍ الْمَعْنٰى لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فِي الدُّنْيَا عَذَابَ الْآخِرَةِ لَعَلِمُوْا حِيْنَ يَرَوْنَهُ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (قرطبی)

اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اپنے حق میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والے، یعنی مشرکین۔

۵۹۵ (اور کوئی شخص اس عذاب کے دور کرنے پر قادر نہیں۔)

"اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم مشرکین جب دنیا میں کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، اور اسی مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آخرت میں کہ دار الجزاء ہے اور بھی سخت ہوگا، تو اس طرح غور کرنے سے زائے ہوئے معبودین کا عجز، اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار کر لیتے۔" (تھانوی)

۵۹۶ (آخرت میں)

اس شدتِ عذاب کا پورا ظہور عالمِ آخرت ہی میں ہوگا۔

۵۹۷ (قیامت میں)

یہاں اس منظر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، جب قیامت میں مشرکین کے خواص علماء اور امراء اپنے عوام اور اپنے مقلدین اور رعایا سے علیحدگی کا اعلان کر دیں گے، اور انھیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔

۵۹۸ اہل باطل کے جتنے بھی باہمی تعلقات اور رابطے ہیں، استادی شاگردی کے، ہم نسبی و قرابت کے، ہم وطنی اور دوستی کے، یہ سب اسی دنیا تک محدود ہیں، آخرت میں جو حقائق کے شاہدہ اور معائنہ کا وقت ہوگا، سب ایک دوسرے سے بے تعلق بلکہ آپس میں مخالف نظر آئیں گے۔ یہ قرآن ہی کی نص ہے اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِيْنَ۔ (سورۃ الزخرف۔ ۴۳: ۶۷)

اَلْأَسْبَابُ۔ وُصْلَاتْ کے معنی میں ہے یعنی وہ رشتے جو انھیں دنیا میں جوڑے رکھتے تھے۔

أَيِ الْوُصْلَاتُ الَّتِيْ كَانُوْا يَتَوَاصَلُوْنَ عَلَيْهَا فِي الدُّنْيَا۔ (مدارک)

بِهِمْ میں ب، عَنْ کے معنی میں بھی لی گئی ہے۔

بِهِمْ أَيْ عَنْهُمْ (معالم) قِيْلَ بِهِمْ بِمَعْنٰى عَنْهُمْ۔ (عکبری)

اور ب سببیہ بھی مانی گئی ہے یعنی یہ قطع تعلق بسبب کفر کے ہوگا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ

اور پیرو کہنے لگیں گے ۵۹۹ کاش ہم کو پھر ایک دفعہ (جانا) مل جاتا ۶۰۰ تو ہم بھی اُن سے الگ ہو جائیں جیسے یہ ہم سے

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ

الگ ہو گئے ہیں اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو انھیں (خالی) ارمان (کرکے) دکھائے گا ۶۰۱ اور وہ دوزخ سے کبھی بھی

مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ يٰاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ

نہ نکل پائیں گے ۶۰۲ اے انسانو! زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے اس میں سے کھاؤ (پیو) ۶۰۳

ع

اَلْبَاءُ هُنَا السَّبَبِيَّةُ وَالتَّقْدِيْرُ وَتَقَطَّعَتْ بِسَبَبِ كُفْرِهِمْ (عکبری) اَلْبَاءُ السَّبَبِيَّةُ اَيْ تَقَطَّعَتْ بِسَبَبِ كُفْرِهِمُ الْاَسْبَابُ الَّتِيْ كَانُوْا يَرْجُوْنَ مِنْهَا النَّجَاةَ۔ (روح)

وَرَاَوُا الْعَذَابَ۔ عذابِ الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اب اس کا درجہ خبر کا نہ رہے گا، مشاہدہ کا ہو جائے گا۔

۵۹۹ (غم وغصہ اور جذبات انتقام کے ساتھ)
کشف حقائق کے بعد ذہنیتیں قدرۃً بدل جائیں گی۔

۶۰۰ (دنیا میں)
کافروں کی زبان سے آخرت میں دنیا میں ایک بار پھر جانے کی تمنا و حسرت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔

۶۰۱ یعنی یہ حسرت پوری نہ ہوگی اور یہ خلش کانٹا بن کر ہمیشہ کھٹکتی ہی رہے گی۔
حَسَرٰتٍ۔ حسرت پشیمانی کے انتہائی درجہ کا نام ہے۔
اَلْحَسْرَةُ اَشَدُّ النَّدَامَةِ (مجاز)

۶۰۲ سزائے دوزخ کے دوام وخلود پر یہ ایک نص صریح ہے۔
بِخٰرِجِيْنَ میں ب خبر کی تاکید اور تابید کا کام دے رہی ہے، اردو ترجمہ کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔
دَلِيْلٌ عَلٰى خُلُوْدِ الْكُفَّارِ فِيْهَا وَاَنَّهُمْ لَا يَخْرُجُوْنَ مِنْهَا وَهٰذَا قَوْلُ جَمَاعَةِ اَهْلِ السُّنَّةِ لِهٰذِهِ الْاٰيَةِ (قرطبی) بَلْ هُمْ فِيْهَا دَائِمُوْنَ (مدارک) اِعَادَةٌ لِلْمُبَالَغَةِ فِي الْخُلُوْدِ وَالْاِقْنَاطِ عَنِ الْخَلَاصِ وَزِيَادَةُ الْبَاءِ لِتَاْكِيْدِ النَّفْيِ (روح) اَصْلُهُ وَمَا يَخْرُجُوْنَ فَعُدِلَ بِهِ اِلٰى هٰذِهِ الْعِبَارَةِ لِلْمُبَالَغَةِ فِي الْخُلُوْدِ (بیضاوی)
شیخ رشید رضا مصری نے اپنے شیخ واستاذ محمد عبدہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مفسرین نے ایسی آیتوں کے تحت میں یہ جو لکھ دیا ہے کہ یہ مخصوص ہیں کافروں کے لئے تو اس سے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُن کے لئے کوئی تنبیہ و وعید ہے ہی نہیں اور ان کے لئے صرف کلمۂ توحید کا اقرار کافی ہو جائے گا۔

۶۰۳ یعنی کھا سکتے ہو، بالکل جائز ہے کہ کھاؤ پیو، کھانے کی اجازت دی جا رہی ہے نہ کہ حکم، مراد یہ نہیں کہ لازمی طور پر کھاؤ۔ خطاب عام نسل انسانی سے ہے، دین حنیف ابراہیمی کو چھوڑ کر یہود، نصاریٰ، مشرکین سب ہی کھانے پینے کے باب میں طرح طرح کی

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا

اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو ۶۰۴ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۶۰۵ وہ تو تمہیں

يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾

بس برائی اور گندگی ہی کا حکم دیتا ہے ۶۰۶ اور اس کا کہ تم اللہ پر ایسی باتیں گڑھ لو جن کا تم علم نہیں رکھتے ہو

غلط روی اور کج راہی میں مبتلا ہوگئے تھے اور خلط کرکے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کے حکم میں رکھ رہے تھے۔

مِمَّا فِي الْاَرْضِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔

مِنْ لِلتَّبْعِيْضِ اِذْ لَا يُؤْكَلُ كُلُّ مَا فِي الْاَرْضِ (بیضاوی)

حَلٰلًا۔ جو غذائیں بجائے خود جائز ہیں، اور حرام نہیں کی گئی ہیں۔

وَالْحَلَالُ مَا اَحَلَّهُ الشَّرْعُ (معالم) اَلْمُرَادُ مِنْهُ مَا يَكُوْنُ جِنْسُهٗ حَلَالًا (کبیر)

طَيِّبًا۔ یعنی جو غذائیں حاصل بھی جائز ذرائع سے ہوئی ہوں، اور جن پر غیر کا حق نہ ہو مثلاً بیع فاسد نہ ہو، اجرت فاسد نہ ہو، وغیرہا۔

اَلْمُرَادُ مِنْهُ اَنْ لَّا يَكُوْنَ مُتَعَلِّقًا بِهٖ حَقُّ الْغَيْرِ (کبیر) طَيِّبًا طَاهِرًا (معالم)

ترجمان القرآن میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ سعد بن ابی وقاصؓ صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنادے۔ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کہ لقمۂ حلال کا التزام کرو، خود بخود مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے ـــــ یہ ہے اسلام میں اکل حلال کی اہمیت۔

طَيِّبًا۔ طیب کے معنی لذیذ کے بھی ہیں، اور اس کی تفسیر لذیذ و نفیس سے ہی آئی ہے۔

وَاَصْلُ الطَّيِّبِ مَا تَسْتَلِذُّهُ النَّفْسُ (راغب) وَالطَّيِّبُ فِي الْاَصْلِ هُوَ مَا يُسْتَلَذُّ بِهٖ وَيُسْتَطَابُ (کبیر) وَقَالَ الشَّافِعِيُّ الطَّيِّبُ الْمُسْتَلَذُّ (قرطبی) مِنْ مَا يُسْتَطَابُ وَيُسْتَلَذُّ (مدارک) مَعْنَاهُ هُنَا بِمَعْنَى الْحَلَالِ وَهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وَغَيْرِهٖ (بحر) وَقَالَ السَّجَاوَنْدِيُّ حَلَالًا مُطْلَقَ الشَّرْعِ طَيِّبًا مُسْتَلَذَّ الطَّبْعِ (بحر)

اسلام راہبوں، سنیاسیوں، ترک لذات کرنے والوں کا مذہب نہیں، لذیذ و ذائقہ دار چیزوں کو تو قرآن مجید نے موقع مدح پر یاد کیا ہے۔

۶۰۴ (اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام، اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھہرا کر) حکم تو عام ہے ہر شیطانی روش کے لئے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ تعلق حرام و حلال غذاؤں سے ہے۔

وَالصَّحِيْحُ اَنَّ اللَّفْظَ عَامٌّ فِيْ كُلِّ مَا عَدَا السُّنَنَ وَالشَّرَائِعَ مِنَ الْبِدَعِ وَالْمَعَاصِيْ (قرطبی)

۶۰۵ (اور اسی دشمنی کے تقاضے سے انسان کو اُلٹی صلاحیں اور قانون الٰہی توڑنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے، اس سے کسی نوع کی خیر خواہی کی توقع ہی نہ رکھو)

۶۰۶ (خواہ اس کا ظاہری قالب یا روپ جیسا بھی معصومانہ یا خوشنما ہو)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے آتارا ہے اُس کی پیروی کرو ۶۰۸

یہاں یہ خوب سمجھ لیا جائے کہ شیطان جب بھی بندوں کے پاس آتا ہے اپنی مجرّد اصلی و نفرت انگیز شکل میں آنے کے بجائے ہمیشہ کسی نہ کسی ظاہر فریب خوشنما قالب ہی میں آتا ہے۔

اِنَّمَا کلمۂ حصر کا ہے اس کے ضمنا معنی یہ ہوئے کہ شیطان سے ہمیشہ شیطنت ہی کا ظہور ہوگا۔ کسی نیکی کے صدور کا اس سے امکان نہیں۔

دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى اَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَاْمُرُ اِلَّا بِالْقَبَائِحِ لِاَنَّهُ تَعَالٰى ذَكَرَهُ بِكَلِمَةِ اِنَّمَا وَهِيَ لِلْحَصْرِ (کبیر)

اور بعض وقت جو بظاہر شیطان نیکی کی طرف دعوت دیتا معلوم ہوتا ہے تو وہاں بھی اس سے اس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ بالآخر بدی و معصیت ہی کی طرف لائے۔

وَقَالَ بَعْضُ الْعَارِفِيْنَ اَنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَدْعُوْا اِلَى الْخَيْرِ لٰكِنْ لِغَرْضٍ اَنْ يَجُرَّهُ مِنْهُ اِلَى الشَّرِّ۔ (کبیر)

سُوْٓءٌ و فَحْشَآءُ دو لفظ متقارب المعنی ہیں لیکن متحد المعنی نہیں، سُوْٓءُ تو وہ چیز ہے جو عقلاً بھی ناپسندیدہ ہو، اور فحشاء وہ ہے، جسے شریعت نے بُرا ٹھہرایا ہے۔

اَلسُّوْٓءُ وَالْفَحْشَآءُ مَا اَنْكَرَهُ الْعَقْلُ وَاسْتَقْبَحَهُ الشَّرْعُ وَالْعَطْفُ لِاخْتِلَافِ الْوَصْفَيْنِ (بیضاوی)

یہ فرق بھی کیا گیا ہے کہ سُوْٓء میں کوئی حد شرعی مقرر نہیں اور فحشاء میں حد شرعی معین کی گئی ہے اور یہی ابن عباس سے منقول ہے

اَلسُّوْٓءُ مَا لَا حَدَّ فِيْهِ وَالْفَحْشَآءُ مَا فِيْهِ حَدٌّ حُكِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَغَيْرِهٖ۔ (قرطبی)

اَلْفَحْشَآءُ کا اطلاق زنا اور دواعی زنا تک محدود نہیں بلکہ اس کے تحت میں ہر وہ معصیت آجاتی ہے جو بدنامی کا باعث ہو اس کا درجہ السُّوْٓءُ سے بڑھ کر ہے۔

وَاَمَّا الْفَحْشَآءُ فَكُلُّ مَا يَقْبُحُ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ مِنَ الْمَعَاصِيْ وَالْاٰثَامِ وَلَا يَخْتَصُّ بِنَحْوِ الزِّنَا كَمَا قَالَ بَعْضُهُمْ وَالْفَحْشَآءُ فِي الْغَالِبِ اَقْبَحُ وَاَشَدُّ مِنَ السُّوْٓءِ (المنار)

۶۰۷ یعنی اپنی طرف سے نکالی ہوئی چیزوں کو احکام خداوندی کی طرح سمجھنے لگو۔

تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ قول کا صلہ جب عَلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے خلاف گڑھ لینا کسی پر بہتان لگانا۔

قَالَ عَلَيْهِ اَيِ افْتَرٰى۔ (تاج)

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ علم سے یہاں مراد علم یقینی یا علم ثابت بالوحی ہے پس اس وعید کے تحت میں صرف کفر ہی کے نہیں، بلکہ بدعت کے اقوال بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

فَيَدْخُلُ فِيْ هٰذَا الْكُلِّ كَافِرٌ وَكُلُّ مُبْتَدِعٍ اَيْضًا (ابن کثیر) وَيَدْخُلُ فِيْهِ كُلُّ مَا يُضَافُ اِلَى اللّٰهِ مِمَّا لَا يَجُوْزُ عَلَيْهِ۔ (مدارک)

۶۰۸ (اور شریعت الٰہی کی ماتحتی میں آجاؤ)

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی اللہ نے جو کچھ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اُتارا ہے، بس اس کی تحقیق اتباع سے قبل کر لینا ضروری ہے کہ وہ حکمِ خدائی ہے بھی۔

قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ

تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو پایا ہے ۶۰۹ خواہ اُن کے باپ (دادا)

شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي

نہ ذرا بھی عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں ۶۱۰ اور جو لوگ کافر ہیں اُن کا حال تو اُس شخص جیسا ہے ۶۱۱ جو ایسے (جانور)

يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

کے پیچھے چلا رہا ہے جو کچھ سنتا ہی نہیں بجز بلانے اور پکارنے کے (یہ لوگ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو (کچھ بھی) نہیں سمجھتے ۶۱۲

۶۰۹ گویا طریقِ آبائی میں خطا و غلطی کا امکان ہی اُن کے نزدیک نہیں، اور یہی جمود عین جہالت و ضلالت ہے، آج مشرک قوموں اور مبتدع فرقوں کا بھی یہی حال ہے جب انھیں اتباعِ حق کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں اپنے آباؤ اجداد کے رسوم کو پیش کر دیتے ہیں، اور یہ تحقیق ذرا بھی نہیں کرتے کہ کون حکم آسمانی ہے اور کون نہیں۔

۶۱۰ یعنی نہ فہمِ دین اور اس کے حقائق و معارف کی رکھتے ہوں، اور نہ ہدایت کسی کتابِ آسمانی کے ماتحت رکھتے ہوں۔

لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا. اَلْمُرَادُ اَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا مِّنَ الدِّيْنِ۔ (کبیر)

لَا يَهْتَدُوْنَ اَیْ لَا يَهْتَدُوْنَ اِلَی الْحَقِّ (روح)

بعض کج رائے فرقوں نے آیت سے تقلیدِ فقہی کا عدمِ جواز ثابت کرنا چاہا ہے حالانکہ قاعدۂ اقتضاء النص اس کا مقتضی ہے کہ آیت سے تقلید کے عدمِ جواز پر نہیں عین جواز پر استدلال کیا جائے، آیت میں جس امر کی مذمت وارد ہوئی ہے وہ نفسِ تقلید نہیں، بلکہ گمراہ و نادان اسلاف کی تقلید ہے، اور یہ قید خود اس امر کی دلیل ہے کہ محققین اہلِ علم کی تقلید جائز ہی نہیں، مستحسن بلکہ عین مطلوب ہے، کسی مریض سے اگر یہ کہا جائے کہ تم نے بھی کیا حماقت کی کہ ایک اناڑی اور اَن پڑھ کا علاج شروع کر دیا، تو ظاہر ہے کہ اس فقرہ سے مذمت نفسِ علاج کی نہیں بلکہ اناڑی اور اَن پڑھ سے علاج کی نکلی، اور نفسِ علاج کی مقصودیت یا مطلوبیت ہی ظاہر ہوئی۔

البتہ محققین نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ تقلید عقائد میں نہیں ہوتی، تقلید صرف احکام میں ہوتی ہے عقائد کے باب میں حکم اور معیار کتاب و سنت کی تصریحات ہی ہیں۔

قَالَ ابْنُ عَطِيَّةَ اَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰی اِبْطَالِ التَّقْلِيْدِ فِی الْعَقَائِدِ (قرطبی) لِاَنَّهٗ فَرَضَ عَلٰی كُلِّ مُكَلَّفٍ تَعَلُّمَ اَمْرِ التَّوْحِيْدِ وَالْقَطْعَ بِهٖ وَذٰلِكَ لَا يَحْصُلُ اِلَّا مِنْ جِهَةِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ (قرطبی)

۶۱۱ (بے حسی اور نافہمی میں)

ذکر داعیِ حق کی دعوتِ حق کا ہو رہا ہے، ایک تشبیہ رسولؐ اور اُس کی امتِ دعوت کے رویہ سے متعلق پیش کی جا رہی ہے، مضاف داعی محذوف ہے۔

عَلٰی حَذْفِ مُضَافٍ تَقْدِيْرُهٗ مَثَلُ دَاعِی الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (بیضاوی) مَثَلُ دَاعِيْهِمْ اِلَی الْاِيْمَانِ (کشاف)

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا

اے ایمان والو! پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں کھاؤ (پیو) ۶۱۳ اور اللہ کا

لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

شکر ادا کرتے رہو ۶۱۴ اگر تم خاص اُسی کی بندگی کرنے والے ہو ۶۱۵

فِیْهِمَا مُضَافٌ مَحْذُوْفٌ اِمَّا مِنْ جَانِبِ الْمُشَبَّهِ اَوِ الْمُشَبَّهِ بِهٖ (روح)

فراء نحوی، البغوی نے تقدیر کلام یوں مانی ہے، مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الْبَهَائِمِ الَّتِیْ لَا تَفْقَهُ مَا یَقُوْلُ الرَّاعِیْ اَکْثَرَ مِنَ الصَّوْتِ۔ (معانی)

۶۱۲ یعنی اُس جانور کی طرح جس کے کان میں پکارنے والے کی آواز اور الفاظ تو آتے ہیں باقی وہ معنی و مفہوم کچھ نہیں سمجھتا۔ یہی حال منکرین دعوتِ حق کے ساتھ کر رہے ہیں، داعی کے الفاظ تو سُن لیتے ہیں لیکن اُن کے مفہوم و معنی پر غور ہی نہیں کرتے

اَیْ لَا یَعْرِفُ اِلَّا الصَّوْتَ الْمُجَرَّدَ دُوْنَ الْمَعْنٰی (راغب) مَثَلُ الدَّابَّةِ تُنَادٰی فَتَسْمَعُ وَلَا تَعْقِلُ مَا یُقَالُ لَهَا کَذٰلِكَ الْکَافِرُ یَسْمَعُ الصَّوْتَ لَا یَعْقِلُ (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

صُمٌّ۔ یعنی بہرے ہیں، آواز حق کی طرف سے۔

صُمٌّ عَنِ الْحَقِّ فَلَا یَسْمَعُوْنَهٗ وَلَا یَنْتَفِعُوْنَ بِهٖ (ابن جریر عن قتادہ)

بُکْمٌ۔ یعنی اقرار حق کے لئے اُن کی زبان گونگی ہے۔

بُکْمٌ عَنِ الْحَقِّ فَلَا یَنْطِقُوْنَ بِهٖ (ابن جریر عن قتادہ)

عُمْیٌ۔ یعنی اندھے ہیں خود اپنے نفع و نقصان کے باب میں۔

عُمْیٌ عَنِ الْهُدٰی فَلَا یُبْصِرُوْنَهٗ (ابن جریر عن قتادہ)

دُعَآءً وَّ نِدَآءً۔ دعا اور ندا میں فرق یہ کیا گیا ہے کہ دعا قریب کے لئے ہے اور نداء بعید کے لئے۔

وَالنِّدَآءُ لِلْبَعِیْدِ وَالدُّعَآءُ لِلْقَرِیْبِ وَلِذٰلِكَ قِیْلَ لِلْاَذَانِ بِالصَّلٰوةِ نِدَآءٌ لِاَنَّهٗ لِلْاَبَاعِدِ (قرطبی)

قِیْلَ اِنَّ الدُّعَآءَ لِلْقَرِیْبِ وَالنِّدَآءَ لِلْبَعِیْدِ۔ (روح)

اس سے ملتا جلتا ایک فقرہ توریت میں بھی موجود ہے:۔

"وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں، سو وہ دیکھتے نہیں اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں۔" (یسعیاہ۔ ۴۴: ۱۸)

۶۱۳ یعنی کھا پی سکتے ہو۔ کھانے پینے کی اجازت ہے۔ صیغۂ امر یہاں بمعنی اجازت ہے، بمعنی حکم نہیں۔

کُلُوْا فِیْ هٰذَا الْمَوْضِعِ لَا یُفِیْدُ الْاِیْجَابَ وَلَا النَّدْبَ بَلِ الْاِبَاحَةَ۔ (کبیر)

لیکن بہر حال یہ صیغۂ اباحت بھی محلِ ترغیب میں ہے۔ اللہ اپنے پرستاروں کو اپنی نعمتوں سے لذت گیر ہونے کی دعوت دے رہا ہے، مطلق صورت میں ان پر کوئی قدغن عائد نہیں کر رہا ہے۔ اسلام کا مزاج خشک راہبانہ جوگیانہ مذہبوں سے کس درجہ مختلف ہے؟

کُلُوْا یہاں لفظی معنی میں صرف کھانے تک محدود نہیں، بلکہ ہر قسم کا جائز انتفاع اس میں آگیا۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ

اس نے تم پر بس مُردار اور خون اور سُور کا گوشت اور جو (جانور) غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو حرام کیا ہے ۶۱۶

المراد بالأكل الانتفاع من جميع الوجوه (قرطبي) وكلوا العموم جميع وجوه الانتفاع دلالة وغيره

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ خطاب اب تک عامۃ الناس سے تھا، حلال وحرام کے باب میں مشرکین کی غلطی کے اظہار کے لئے۔ اب خطاب صرف مومنین سے ہے، اُن سے ارشاد ہو رہا ہے کہ حلال وحرام کے باب میں اہل جاہلیت کی پیروی نہ کریں۔

طَيِّبَاتِ۔ کا دوسرا ترجمہ "لذیذ چیزوں" بھی ہو سکتا ہے۔

أي من مستلذاته (كشاف)

طَيِّب کے لئے مزید ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۶۰۲ جو ابھی دو ایک صفحہ اوپر گزر چکا ہے۔

۶۱۴ (زبان سے بھی اور عمل سے بھی)

یعنی ان نعمتوں کی قدر کرتے رہو، ان کے حق ادا کرتے رہو، بخل سے کام نہ لو، انھیں ناجائز محل پر استعمال نہ کرو۔ وغیرہا

اُشْكُرُوا۔ شکر اس امر کا کہ اُس نے یہ رزق عطا کیا، اور رزق بھی حلال وطیب۔

یہاں صیغۂ امر وجوب کے لئے ہے نہ کہ صرف اباحت کے معنی میں۔

اشكروا الله أمر وليس بإباحة (كبير)

۶۱۵ یعنی اگر اپنے دعوے ایمان و اخلاص میں سچے ہو تو اس کے حکم پر عمل کرو اور اس کے مقرر کئے ہوئے حق ادا کرتے رہو۔

۶۱۶ یعنی حیوانات کے سلسلہ میں تو شریعتِ الٰہی کی حرام کی ہوئی بس یہ چیزیں ہیں، نہ وہ چیزیں جو تم نے اپنی تجویز سے گڑھ رکھی ہیں، یہاں تردید تمام تر مشرکوں کے خود تراشیدہ محرمات کی ہو رہی ہے، باقی جو چیزیں حدیثِ صحیح کی بنا پر یا کسی اور دلیل شرعی سے حرام ہیں، ان سے آیت کو کوئی بحث نہیں۔

ليس المراد من الآية قصر الحرمة على ما ذكر مطلقا بل مقيدا بما اعتقدوه حلالا (روح)

اَلْمَيْتَةَ۔ میتہ یا مُردار وہ جانور ہے جو بغیر کسی کے ہلاک کئے از خود مر جائے یا ہلاک تو کیا جائے لیکن ذبح شرعی کے مطابق نہ ہو۔

هو غير المذكى إما لأنه لم يذبح أو ذبح ولكن لم يذكه ذكاة شرعية [illegible]

الروح من غير ذكاة مما شأنه الذبح (مدارك)

زندہ جانور کے اگر گوشت کا کچھ حصہ کاٹ لیا جائے تو وہ بھی مُردار ہی کے حکم میں داخل ہوگا۔ حنفیہ کے ہاں مُردار سے کسی قسم کا بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ مُردار گوشت کتوں اور شکاری پرندوں کو کھلانا بھی درست نہیں کہ یہ بھی اُس سے نفع اُٹھانا ہی ہوا، درانحالیکہ قرآن میں مُردار کی حرمت مطلق صورت میں ہے۔

وقال أصحابنا لا يجوز الانتفاع بالميتة على وجه ولا يطعمها الكلاب والجوارح لأن ذلك ضرب من الانتفاع بها وقد حرم الله الميتة تحريما مطلقا معلقا بعينها (جصاص)

لیکن عملِ دباغت کے بعد مُردار کی ہڈی کھال وغیرہ پاک ہو جاتی ہے اور مُردار کے حکم میں رہتی ہی نہیں، یہ مسئلہ احادیث وآثار سے ثابت ہے اور حنفیہ اور بعض دوسرے ائمۂ فقہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

قَالَ اَبُوْحَنِیْفَةَ وَاَصْحَابُهٗ وَالْحَسَنُ بْنُ صَالِحٍ وَسُفْیَانُ الثَّوْرِیُّ وَعُبَیْدُ اللّٰهِ بْنُ الْحَسَنِ الْعَنْبَرِیُّ وَالْاَوْزَاعِیُّ وَالشَّافِعِیُّ یَجُوْزُ بَیْعُهٗ بَعْدَ الدِّبَاغِ وَالْاِنْتِفَاعُ بِهٖ (جصاص) وَالْحُجَّةُ لِمَنْ طَهَّرَهَا وَجَعَلَ ذَکَاتَهَا مَا وَرَدَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاٰثَارِ الْمُتَوَاتِرَةِ مِنَ الْوُجُوْهِ الْمُخْتَلِفَةِ بِالْاَلْفَاظِ الْمُخْتَلِفَةِ کُلُّهَا یُوْجِبُ طَهَارَتَهَا وَالْحُکْمَ بِذَکَاتِهَا۔ (جصاص)

اور احادیث اس قسم کی وارد ہوئی ہیں:۔

اَیُّمَا اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ (عن ابن عباسؓ) ذَکَاةُ الْاَدِیْمِ دِبَاغُهٗ (عن سلمہ بن المحبق)

دو جانور ایسے ہیں جو حدیث صحیح کی رو سے بغیر ذبح کے بھی جائز ہیں، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی۔

وَقَدْ اُحِلَّ مِنَ الْمَیْتَاتِ بِالْحَدِیْثِ السَّمَکُ وَالْجَرَادُ (مدارک) هٰذِهِ الْاٰیَةُ فَلَهَا التَّخْصِیْصُ بِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ اُحِلَّتْ لَنَا الْمَیْتَتَانِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ اَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِیُّ (قرطبی)

فقہاء مفسرین نے اس سلسلہ میں اس مسئلہ کو بھی بیان کر دیا ہے کہ جن غذاؤں میں ذبیحہ کا سوال ہی نہ پیدا ہو، وہ مجوس اور مشرکوں اور سب غیر کتابیوں کے ہاں کی بھی جائز ہیں۔

وَقَالَ اَبُوْ عُمَرَ لَا بَاْسَ بِاَکْلِ طَعَامِ عَبَدَةِ الْاَوْثَانِ وَالْمَجُوْسِ وَسَائِرِ مَنْ لَا کِتَابَ لَهٗ مِنَ الْکُفَّارِ مَا لَمْ یَکُنْ مِنْ ذَبَائِحِهِمْ۔ (قرطبی)

اَلدَّمُ۔ یعنی خون جاری یا سیال۔

اَلْمُرَادُ بِالدَّمِ الْجَارِیْ (معالم) یَعْنِی السَّائِلَ (مدارک) دَلَّ ذٰلِکَ عَلٰی اَنَّ الْمُحَرَّمَ مِنَ الدَّمِ هُوَ الْمَسْفُوْحُ دُوْنَ غَیْرِهٖ۔ (جصاص)

اور سورۂ انعام میں دمِ مسفوح کی قید خود موجود ہے اور فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دم جو یہاں مطلق صورت میں ہے وہ اسی قید مسفوحیت کے ساتھ حرام ہے۔

وَحَمَلَ الْعُلَمَاءُ هٰهُنَا الْمُطْلَقَ عَلَی الْمُقَیَّدِ اِجْمَاعًا۔ (ابن العربی۔ قرطبی)

اس پر فقہاء امت کا اجماع ہے کہ خونِ جاری حرام بھی ہے اور نجس بھی، نہ اس کا کھانا جائز ہے نہ اس سے کوئی نفع اٹھانا جائز ہے۔

اِتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اَنَّ الدَّمَ حَرَامٌ نَجِسٌ لَا یُؤْکَلُ وَلَا یُنْتَفَعُ بِهٖ۔ (ابن العربی)

حدیث صحیح کی رو سے دو منجمد خون حلال ہیں، ایک جگر، دوسرے تلی اور ان کی حلت پر فقہاء امت کا اجماع ہے

اُحِلَّتْ لَنَا دَمَانِ الْکَبِدُ وَالطِّحَالُ اَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِیُّ۔ (قرطبی)

گو علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ جگر و طحال خون کی تعریف میں آتے ہی کب ہیں، وہ تو گوشت کی قسم کی چیزیں ہیں، نہ کہ خون کی قسم کی، اور نہ اس تخصیص و استثناء کا سوال ہی پیدا ہوتا ہے۔

وَالصَّحِیْحُ اَنَّهٗ لَمْ یُخَصَّصْ وَاَنَّ الْکَبِدَ وَالطِّحَالَ لَحْمٌ یَشْهَدُ بِذٰلِکَ الْعِیَانُ الَّذِیْ لَا یُعَارِضُهٗ بَیَانٌ وَلَا یَفْتَقِرُ اِلٰی بُرْهَانٍ۔ (ابن العربی)

وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ۔ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ حرمت لحم خنزیر کی آئی ہے لیکن فقہاء امت کا

اجماع ہے کہ سؤر کا صرف گوشت ہی نہیں، بلکہ اس کی چربی، ہڈی، کھال، بال سب ہی حرام ہیں اور لحم کی تصریح تو اس لئے ہے کہ گوشت ہی ہر جانور کے جسم کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے، اور جب گوشت کہہ دیا تو اس کے تحت و تابعیت میں اجانور کے دوسرے اجزاء بھی آگئے۔

نبی الخنزیر بجمیع اجزائہ وخص اللحم لانہ المقصود بالاکل (مدارک) اتفقت الامۃ علی ان الخنزیر حرام بجمیع اجزائہ (ابن العربی) واللحم وان کان مخصوصا بالذکر فان المراد جمیع اجزائہ وانما خص اللحم بالذکر لانہ اعظم منفعۃ وما یبتغی منہ (جصاص)

جصاص رازیؒ نے لکھا ہے کہ اس کی نظیر ایک دوسرے سئلہ سے بھی ملتی ہے جہاں قرآن مجید نے شکار کے قتل کو محرم کے لئے حرام کہا ہے، حالانکہ مراد وہاں صرف ہلاک ہی نہیں، بلکہ شکار کے جملہ افعال کی حرمت حالت احرام میں ہے۔ بعض مبتدع فرقوں کے اس قول کے جواب میں کہ گوشت کی حرمت سے چربی کی حرمت کہاں لازم آتی ہے، فقیہ ابن العربی مالکی کہتے ہیں کہ یہ اعتراض اہل عجم کی طرف سے ہوا ہے، جو یہ نہیں جانتے کہ لفظ لحم میں شحم شامل ہے البتہ شحم میں لحم شامل نہیں جس طرح ہر حمد شکر ہے، لیکن ہر شکر حمد نہیں ہے۔

وہم اعاجم لا یعلمون انہ من قال لحما فقد قال شحما ومن قال شحما فلم یقل لحما اذ کل شحم لحم ولیس کل لحم شحما من جہۃ اختصاص اللفظ ..... کما ان کل حمد شکر ولیس کل شکر حمدا من جہۃ ذکر النعم (ابن العربی)

اور ایسا ہی قرطبیؒ نے بھی کہا ہے اور ادیب شہیر (زمخشری) نے کہا ہے کہ عرب جب لحم سمین بولتے ہیں تو اس سے مراد لحم شحیم (چربیلا گوشت) لیتے ہیں، اور شحم تو لحم کے تابع اور اسی کی ایک صفت ہے۔

لان الشحم داخل فی ذکر اللحم لکونہ تابعا لہ وصفۃ فیہ بدلیل قولہم لحم سمین یریدون انہ شحیم (کشاف)

رہی اس کے جسم کی نجاست تو جمہور فقہاء اس کے بھی قائل ہیں۔

قال جمہور العلماء انہ نجس۔ (ابن العربی)

البتہ امام مالکؒ کا اصول چونکہ یہ ہے کہ زندگی خود دلیل طہارت ہے، اور ہر زندہ جانور پاک ہے اس لئے وہ سؤر کی نجاست کے بھی قائل نہیں۔

قال مالک انہ طاہر وکذلک کل حیوان عندہ لان علۃ الطہارۃ عندہ الحیوۃ (ابن العربی)

سؤر کا سارا جسم تو ناپاک ہوتا ہی ہے البتہ اس کے بالوں سے نفع اٹھانے کی گنجائش ہے، چنانچہ ایک حدیث میں اس کا جواز مذکور ہے۔

لاخلاف ان جملۃ الخنزیر محرمۃ الا الشعر فانہ یجوز الخرازۃ بہ وقد روی ان رجلا سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الخرازۃ بشعر الخنزیر فقال لا بأس بذلک۔ (قرطبی)

امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ داؤد ظاہریؒ سؤر کے بالوں سے انتفاع کے جواز کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ عدم جواز کے اور امام ابویوسفؒ سے جواز و کراہت دونوں کی روایتیں منقول ہیں۔

وقد اختلف الفقہاء فی جواز الانتفاع بشعر الخنزیر فقال ابوحنیفۃ ومحمد یجوز الانتفاع

بہ الخنزیر وقال الشافعی لا یجوز الانتفاع بشعر الخنزیر۔ (جصاص)

فقہی احکام اور شرعی حرمت سے قطع نظر، خنزیر بجائے خود ایسی نجس چیز ہے کہ خود فطرتِ سلیم اُسے گندہ سمجھتی ہے اور نظافتِ طبع کو اُس کی جانب رغبت کرنے سے کراہت آتی ہے، یہاں تک کہ لفظ خنزیر بھی عربی فیلالوجی (لسانیات) کے بعض ماہروں کا خیال ہے کہ خنز الشیءُ (وہ چیز گندی ہو گئی) سے بنا ہے، انگریزی زبان میں بھی جتنے نام اس جانور کے مثلاً HOG, SWINE, PIG یا اس جانور کے گوشت کے لئے ہیں مثلاً HAM PORK, BACON سب کے سب دلالتِ ثانوی گندگی و غلاظت پر کرتے ہیں اور اس کے گوشت کے جو طبی نقصانات ہیں، خصوصاً امراضِ غدودی میں یہ جس طرح متعین ہوتا ہے اس پر تو آج کل کے ڈاکٹر بہت کچھ لکھ چکے ہیں، سؤر کی گندگی اور ناپاکی اتنی روشن دلیل ہے کہ بعض پرانی قومیں مثلاً اہلِ مصر بھی اُسے نجس سمجھتی رہی ہیں، بلکہ خود یہود کے ہاں بھی یہ حرام تھا، آج مسیحی قومیں جس ذوق و شوق سے یہ گندہ گوشت تازہ اور خشک دونوں صورتوں میں کھایا کرتی ہیں اور اس کی چربی سے جو طرح طرح کے کام لیتی رہتی ہیں، بلکہ اس کی نسل کی پرورش کا انتظام جس بڑے پیمانہ پر جاری کئے ہوئے ہیں، اُسے دیکھ کر تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ کراہت کیسی؟ عجب نہیں کہ کچھ فضائل اس جانور کے مسیحیت میں وارد ہوئے ہوں حالانکہ اس کی حرمت اور نجاست دونوں صراحت کے ساتھ بائبل میں موجود ہیں:۔

”اور سؤر کہ کھُر اس کا دو حصہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے، پر وہ جگالی نہیں کرتا، وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے“ (احبار ۱۱:۷)

”اور سؤر کہ کھُر اس کے چرے ہوئے ہیں، پہ جگالی نہیں کرتا بھی تمہارے لئے ناپاک ہے، تم اس کا گوشت نہ کھائیو نہ اس کی لاش کو ہاتھ لگائیو“ (استثناء ۱۴:۸)

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ اِہلال کے اصلی معنی آواز بلند کرنے، پکار کر دینے، شہرت دے دینے کے ہیں۔

هو رفع الصوت عند رؤية الهلال ثم يستعمل لكل صوت (راغب) الإهلال رفع الصوت (روح)

مراد یہ ہے کہ جس جانور کو بطریقِ تعظیم و عبادت یا بہ قصدِ تقرب کسی مخلوق کے لئے نامزد کر دیا جائے اور نیت کسی مخلوق کی نذر و نیاز یا بھینٹ کی کر لی جائے، وہ حرام ہو جاتا ہے، خواہ اُس کے ذبح کے وقت بسم اللہ بھی کیوں نہ پڑھ لی جائے، شیخ سدو کے نام کے بکرے اور اس قبیل کی تمام چیزیں اسی حکم کے تحت میں آجاتی ہیں۔

ولا خلاف بين المسلمين أن المراد به الذبيحة إذا أهل بها لغير الله عند الذبح (جصاص)

”در حدیث وارد است کہ ملعون من ذبح لغير الله یعنی ہر کہ بذبح جانور تقرب غیر خدا نماید ملعون است خواہ در وقت ذبح نام خدا گیرد زیرا کہ چوں شہرت داد کہ ایں جانور برائے فلانے است ذکر نام خدا وقت ذبح فائدہ نہ کرد۔“ (تفسیر فتح العزیز)

”جس جانور کو غیر اللہ کے نامزد اس نیت سے کیا ہو کہ وہ ہم سے خوش ہوں گے اور ہماری کارروائی کر دیں گے، جیسا کہ عام جاہلوں کی عادت ہوتی ہے کہ اس نیت سے بکرا، مرغا وغیرہ مقرر کر دیتے ہیں، وہ حرام ہو جاتا ہے اگرچہ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا ہو، البتہ اگر اس طرح نامزد کرنے کے بعد اس سے توبہ کرے پھر حلال ہو جاتا ہے۔“ (تھانویؒ)

بعض فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی حاکم یا سردار کے آنے پر بطور بھینٹ کے ذبح کرے گا تو وہ بھی حرام ہو جائے گا، اگرچہ اس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ

لیکن (اس میں بھی) جو شخص مضطر ہو جائے ۶۱۷ اور نہ بے حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے نکل جانے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ۶۱۸

ذُبِحَ لِقُدُومِ الْأَمِيرِ وَنَحْوِهِ كَوَاحِدٍ مِنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِأَنَّهُ أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَوْ ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ تَعَالٰى. (الدر المختار)

بلکہ بعض فقہاء نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کوئی مسلمان اگر جانور کو تقرب غیر اللہ کے قصد سے ذبح کرے گا تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ سمجھا جائے گا۔

قَالَ الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً وَقَصَدَ بِذَبْحِهَا التَّقَرُّبَ إِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ. (کبیر)

فقہاء مفسرین سے آیت کے تحت میں یہ تصریح نقل ہوئی ہے کہ مجوسی اور مشرک اور لامذہب کے ہاتھ کے ذبیحے ناجائز ہیں۔

وَهِيَ ذَبِيحَةُ الْمَجُوسِيِّ وَالْوَثَنِيِّ وَالْمُعَطِّلِ فَالْوَثَنِيُّ يَذْبَحُ لِلْوَثَنِ وَالْمَجُوسِيُّ لِلنَّارِ وَالْمُعَطِّلُ لَا يَعْتَقِدُ شَيْئًا فَيَذْبَحُ لِنَفْسِهِ. (قرطبی)

۶۱۷ یعنی حرام غذا کے استعمال پر مجبور ہو کر۔

أَيْ فَمَنِ اضْطُرَّ إِلٰى شَيْءٍ مِنْ هٰذِهِ الْمُحَرَّمَاتِ أَيْ أُحْوِجَ إِلَيْهَا. (قرطبی)

اُضْطُرَّ۔ اِضْطِرَارٌ۔ ضرورت سے مشتق ہے اور اس کے باب افتعال سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شدت ضرورت کے وقت ان حرام غذاؤں کو بھی بقدر کفایت کھایا جا سکتا ہے، شدید ضرورت کی صورتیں دو ہو سکتی ہیں:۔

(۱) یہ کہ بھوک کی شدت سے معلوم ہوتا ہو کہ دم نکلا جاتا ہے اور حلال غذا سرے سے دستیاب ہی نہیں ہو رہی ہے یا افلاس کی بنا پر اس تک دسترس نہ ہو اور یا پھر کسی مرض کی بنا پر حلال غذا ناقابل استعمال ہو۔

(۲) یہ کہ کوئی حاکم اس حرام غذا کے استعمال پر مجبور کر رہا ہو۔

وَهٰذِهِ الضَّرُورَةُ لَهَا سَبَبَانِ أَحَدُهُمَا الْجُوعُ الشَّدِيدُ وَالثَّانِي إِذَا أَكْرَهَهُ عَلٰى تَنَاوُلِهِ مُكْرِهٌ (کبیر) الْاِضْطِرَارُ لَا يَخْلُو أَنْ يَكُونَ بِالْإِكْرَاهِ مِنْ ظَالِمٍ أَوْ بِجُوعٍ فِي مَخْمَصَةٍ وَالَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَالْعُلَمَاءِ فِي مَعْنَى الْآيَةِ هُوَ مَنْ صَيَّرَهُ الْعُدْمُ وَالْغَرَثُ وَهُوَ الْجُوعُ إِلٰى ذٰلِكَ. (قرطبی)

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ۔ یہ صیغہ حال ہے مضطر کا، اور تقدیر کلام یوں ہے فَمَنِ اضْطُرَّ لَا بَاغِيًا وَّلَا عَادِيًا (روح المعانی)

۶۱۸ (ان حرام چیزوں کے کھا لینے میں) بلکہ اکثر تو ایسے موقع پر نہ کھانا گناہ ہے۔

بَلْ رُبَّمَا يَأْثَمُ بِتَرْكِ التَّنَاوُلِ (روح) وَهٰهُنَا يَتَضَمَّنُ مَعْنَى الْوُجُوبِ. (کبیر)

اس لئے کہ حفظ نفس تو اولین فرائض میں سے ہے اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خودکشی کے مترادف ہے جو حرام خوری سے شدید تر ہے، مریض کو آخر افطار کرا ہی دیا جاتا ہے۔

وَلَا خِلَافَ أَنَّهُ لَا يَجُوزُ لَهُ قَتْلُ نَفْسِهِ بِإِمْسَاكِهِ عَنِ الْأَكْلِ وَأَنَّهُ مَأْمُورٌ بِالْأَكْلِ عَلٰى وَجْهِ الْوُجُوبِ (قرطبی) لَوْ تَرَكَ الْأَكْلَ فَتَلِفَتْ نَفْسُهُ فَذٰلِكَ أَكْبَرُ الْمَعَاصِي (قرطبی) وَقَالَ الطَّبَرِيُّ لَيْسَ الْأَكْلُ عِنْدَ الضَّرُورَةِ رُخْصَةً

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۷۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ

بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحمت والا ہے ۶۱۹ بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں،

الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي

اور اُس کے معاوضہ میں قلیل قیمت حاصل کرتے ہیں ۶۲۰ سو ایسے لوگ تو اپنے پیٹوں میں بس آگ ہی

بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ

(آگ) بھرتے ہیں ۶۲۱ اور اللہ قیامت کے دن اُن سے کلام نہ کرے گا ۶۲۲ اور نہ اُنھیں پاک کرے گا ۶۲۳

بل ذلك عزيمة واجبة ولو امتنع من الاكل كان عاصيا (بحر) وقال مسروق بلغني انه من اضطر الى الميتة فلم ياكل حتى مات دخل النار وكانه اشار الى انه قاتل نفسه بتركه ما اباح الله له (بحر) ومذهبي ان اكل الميتة للمضطر عزيمة لا رخصة قال ابو الحسن الطبري المعروف بالكيا الهراسي رفيق الغزالي في الاشتغال وهذا هو الصحيح عندنا كالافطار للمريض ونحو ذلك۔

غَيْرَ بَاغٍ۔ یعنی اس کی نیت اور ارادہ نافرمانی اور قانون شکنی کا نہ ہو، اور وہ محض طالبِ لذت نہ ہو، ضرورت واقعی ہو، یہ ہرگز نہ ہو کہ کسی شخص کے دل میں قانونِ الٰہی کا احترام ہی ہلکا ہو، یا وہ حرام چیزوں سے لذت ہی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ باغ کے معنی دو ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے پر ظلم کرنے والا، دوسرے طالبِ لذت۔

وَلَا عَادٍ۔ اور نہ حدودِ شرعی سے تجاوز کرنے والا، یعنی مقدار میں بھی بس محض بقدرِ ضرورت کھائے، یہ نہ ہو کہ خوب سیر ہو کر کھانے لگے

قال الشافعي وابو حنيفة واصحابه لا ياكل المضطر من الميتة الا قدر ما يمسك رمقه (كبير)

۶۱۹ غَفُورٌ۔ ایسا مغفرت والا کہ بعض حالات میں جرائم پر بھی مواخذہ نہیں کرتا، بلکہ اُنھیں جرائم ہی باقی نہیں رہنے دیتا

رَحِيمٌ۔ ایسا شفقت والا کہ تنگی کے موقعوں پر آسانی بہم پہونچا دیتا ہے۔ ان صفات کے استحضار سے ہر مومن مسلم کو جو طبعی کراہت حرام اشیاء کی طرف ہوتی ہے وہ کم ہو جائے گی، اور وہ اجازت سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

۶۲۰ یہود کی جانب اشارہ ہے، جو اپنے ہاں کی اصل آسمانی تعلیمات کو چھپاتے تھے، اور اس اخفاء و کتمان سے ان کا مقصود کچھ نفعِ دنیوی حاصل کرنا ہوتا تھا۔

يعني علماء اليهود (قرطبی) يعني اليهود (ابن کثیر)

ثَمَنًا قَلِيلًا۔ سے یہ مُراد نہیں کہ زیادہ قیمت اور بڑے معاوضہ پر دین فروشی جائز ہے، مُراد اس سے محض دنیوی معاوضہ ہے جو نفعِ آخرت کے مقابلہ میں ہمیشہ قلیل و حقیر ہی ہوگا۔

سماه قليلا لانقطاع مدته وسوء عاقبته۔ (قرطبی)

۶۲۱ (کہ یہ جرمِ کتمانِ حق اُنھیں صریح آتشِ جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔)

یہود کا جرم اخفائے حق اور کتمانِ وحیِ آسمانی، اُن کی معصیت اکلِ حرام سے کہیں بڑھا ہوا تھا، اس لئے

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ

اور ان کے لئے دردناک عذاب ہی ہے ۶۲۳ (الف) یہ (ب) وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو خرید لیا ہے ہدایت کے بدلے میں اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ

کو نجات کے بدلے میں، اور یہ لوگ کیسی جبوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لئے ۶۲۴ اور یہ (سزا) اس لئے ہوگی کہ اللہ نے کتاب کو بالکل

بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

ٹھیک ٹھیک اتارا تھا ۶۲۵ اور بے شک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں وہ (بڑے) دور دراز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں

اس جرم کی سزا بھی سخت تر مذکور ہوئی۔

۶۲۲ (بہ طریق لطف وملاطفت)

عِبَارَةٌ عَنِ الْغَضَبِ عَلَيْهِمْ وَإِزَالَةُ الرِّضَا عَنْهُمْ (قرطبی) وَقِيلَ نَفْيُ الْكَلَامِ عِبَارَةٌ عَنْ غَضَبِهِ عَلَيْهِمْ (کشاف) قِيلَ أَرَادَ بِهِ أَنَّهُ يَبْعَثُ عَلَيْهِمْ غَضْبَانَ (معالم)

جو خطاب بہ طریق عتاب ہوگا، وہ ظاہر ہے کہ اس سے مستثنیٰ ہے، قیامت کے دن اللہ کی اپنے بندوں سے گفتگو ان کی انتہائی خوش قسمتی ہوگی، اور اس سے محرومی ان کی انتہائی بدنصیبی۔

۶۲۳ (الف) برزخ کے بعد حشر میں بھی جو لوگ اپنے ایمان اور دوسری نیکیوں کی بنا پر اپنے گناہوں سے دھو دھلا اور ہر گرفت سے پاک پائیں گے، وہ بھی گویا بڑے سستے چھوٹ گئے، بڑی اور اصلی مصیبت ان کی ہے جن میں قیامت کے دن کوئی شائبۂ ایمان بھی نہ پایا جائے گا۔

۶۲۳ (ب) فقرہ کی ترکیب یعنی اس کے الفاظ کی ترتیب نے مفہوم میں تاکید اور زور شامل کر دیا۔

۶۲۴ (کہ اس کے لئے تیار ہو گئے اور یہاں دنیا میں ایمان وطاعت پر آمادہ نہ ہوئے!)

مَا کلمۂ تعجب ہے کہ اپنی حرکتوں کے ثمرے اور دہشتناک نتیجے معلوم ہیں اس پر بھی یہ شوخ چشمی!

مَذْهَبُ الْجُمْهُورِ مِنْهُمُ الْحَسَنُ وَمُجَاهِدٌ أَنَّ مَا مَعْنَاهُ التَّعَجُّبُ (قرطبی) تَعَجُّبٌ مِنْ حَالِهِمْ فِي الْتِبَاسِهِمْ بِمُوجِبَاتِ النَّارِ مِنْ غَيْرِ مُبَالَاةٍ مِنْهُمْ (کشاف)

اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۔ اس کا تعلق اسی دنیا سے ہے یعنی ہدایت کے بدلے گمراہی کو لے لیا، اسی دنیا میں

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ۔ اس کا تعلق عالم آخرت سے ہے یعنی لازمی نتیجہ عدم ایمان کا یہ ہوگا کہ آخرت میں مغفرت کے بجائے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۶۲۵ (اور نابکار بندوں نے اس میں خواہ مخواہ خلط وتلبیس کر دیا)

اَلْكِتٰبَ۔ یہاں بہ طور اسم جنس استعمال ہوا ہے، مراد ہیں تمام کتب آسمانی۔

بِالْحَقِّ۔ یعنی بالکل صحیح یا دلائل وشواہد کے ساتھ۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

طاعت یہ نہیں ہے ۶۲۷ کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا کرو ۶۲۸

اَیْ بِالصِّدْقِ وَقِیْلَ بِالْحُجَّةِ (قرطبی)

ذٰلِکَ۔ یہ اشارہ عذاب وغیرہ کی طرف ہے۔

اَیْ ذٰلِکَ الْعَذَابُ (کشاف۔ بیضاوی) اَیْ مَجْمُوْعُ مَاذُکِرَ مِنْ اَکْلِ النَّارِ وَعَدَمِ التَّکْلِیْمِ وَالْعَذَابِ الْمُرَتَّبِ عَلَی الْکِتْمَانِ۔ (روح)

۶۲۶ (اور اس کے نتائج بھگت کر رہیں گے)

اِخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ یعنی خواہ مخواہ اور اپنے اغراض کے لئے اپنی کتاب آسمانی میں جھگڑے نکال کھڑے کئے ورنہ تعلیماتِ الٰہی میں کمال وضوح کی بنا پر اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

فِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ یعنی بھٹک کر حق و صداقت سے بہت ہی دور جا پڑے ہیں، یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ یہ غفلت اُن میں اس سے پیدا ہو گئی ہے کہ اللہ کے سچے کلام میں انھوں نے ازراہِ نفسانیت خواہ مخواہ اختلاف کیا اور اس لئے اور زیادہ بھٹک گئے۔

۶۲۷ (جیسا کہ گمراہ اور مشرک قومیں سمجھ رہی ہیں)

قرآن مجید کے متعدد مقامات کی طرح یہ آیت بھی اصلاً گمراہ و مشرک قوموں کے رد میں ہے اور اس کا مفہوم پوری طرح جبھی روشن ہوگا، جب اُن کے عقائدِ باطل کو پیش نظر رکھا جائے۔

اَلْبِرّ۔ بِرّ کے معنی لغتِ عربی میں بہت وسیع ہیں، نیکی کے جملہ اقسام پر شامل ہے، اردو میں اس کا صحیح مفہوم لفظ طاعت ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔

اَلْبِرُّ التَّوَسُّعُ فِیْ فِعْلِ الْخَیْرِ فَمِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی الثَّوَابُ وَمِنَ الْعَبْدِ الطَّاعَةُ (راغب)۔ اَلْبِرُّ الطَّاعَةُ (تاج) قَالَ بَعْضُهُمُ الْبِرُّ الْخَیْرُ ... وَلَا اَعْلَمُ تَفْسِیْرًا اَجْمَعَ مِنْهُ لِاَنَّهٗ یُحِیْطُ بِجَمِیْعِ مَا قَالُوْا۔ (تاج)

اہلِ لغت ہی کو نہیں اہلِ تفسیر کو بھی بِرّ کے مفہوم کی وسعت مسلم ہے۔

اَلْبِرُّ اِسْمٌ جَامِعٌ لِلطَّاعَاتِ وَاَعْمَالِ الْخَیْرِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی (کبیر) اِسْمٌ عَامٌّ لِجَمِیْعِ مَا یُؤْجَرُ عَلَیْهِ الْاِنْسَانُ (کبیر) اِسْمٌ جَامِعٌ لِاَنْوَاعِ الْخَیْرِ وَالطَّاعَةِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی۔ (روح) اَلْبِرُّ کُلُّ فِعْلٍ مَرْضِیٍّ (بیضاوی) اِسْمٌ لِلْخَیْرِ وَلِکُلِّ فِعْلٍ مَرْضِیٍّ (کشاف)

۶۲۸ (حالتِ نماز میں یا عبادت کے وقت)

ظہورِ اسلام سے قبل دنیا کی بے شمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی سمت پرستی تھی یعنی بے جان دیوتاؤں، دیویوں، مورتیوں، پتھروں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کے علاوہ خود سمتوں یا جہتوں کی بھی پرستش جاری ہو گئی تھی اور مختلف جاہلی قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت مثلاً مشرق مقدس ہے اور فلاں معین جہت مثلاً مغرب قابلِ پرستش ہے، قرآن مجید یہاں شرک کی اسی صورتِ خاص کی تردید کر رہا ہے اور ارشاد کر رہا ہے کہ کسی جہت

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ

بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے ۶۲۹

کیا تقدس رکھا ہوا ہے اور کوئی سمت بہ حیثیت سمت ہرگز قابل تقدیس نہیں، طاعت (البر) سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ہمارے حضرات مفسرین کو اس آیت میں جو اشکال نظر آیا، وہ محض اس لئے کہ ان کی نظر مذاہب غیر کی اس گمراہی پر نہ تھی، اسلام نے ظاہر ہے کہ نماز کے لئے کوئی سمت بہ حیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی ہے۔ اُس نے تو صرف ایک متعین مکان یعنی خانۂ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور اُسے قبلۂ توجہ ٹھہرایا ہے، خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ مصر وطرابلس وحبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے، ہندوستان، افغانستان اور چین سے مغرب میں، شام وفلسطین ومدینہ سے جنوب میں اور یمن اور بحر قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں یہ حقیقت پیش نظر رہے تو اشکال از خود رفع ہو جاتا ہے اور مختلف تاویلوں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

اَلْمَشْرِقِ۔ سورج دیوتا دنیائے شرک کا معبودِ اعظم رہا ہے، مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی اور یہ چونکہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے عموماً جاہلی قوموں نے مشرق کو بھی اقدس سمجھ لیا، اور عبادت کے لئے مشرق رخی اختیار کرلی۔ حضرت مسیحؑ کے چند ہی سال بعد جب مسیحیوں میں ایک شخص پولوس نامی آگھسا (جسے ایک دنیا آج سینٹ پال کے نام سے یاد کرتی ہے) اور اس نے مسیحیت کا رُخ بجائے تجدید توحید و سوئیت کے ایک مستقل تثلیثی شرک کی طرف پھیر دیا، رومی اُس وقت حاکم قوم تھی، اور جیسے ابھی کل تک ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں انگریزیت اور صاحبیت کا بول بالا تھا، فلسطین میں محکوموں کے دلوں میں رومی مشرکوں ہی کے علوم و فنون، تہذیب، معاشرت، دین و عقائد کا تسلط چھایا ہوا تھا، اور رومی مذہب کا ایک جزو آفتاب پرستی بھی تھا، پولوسی مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مشرکانہ مراسم رومیوں سے دھڑا دھڑا اخذ کر لئے، وہیں اس مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا، اور عبادت مشرق کی طرف رُخ کر کے کرنے لگے، چنانچہ مسیحیوں کے گرجے آج تک مشرق رویہ چلے آتے ہیں، قرآن مجید نے اس مشرق رُخی پر زبردست ضرب لگائی اور بتا دیا کہ یہ سمت دار تقدس تو کسی درجہ میں بھی طاعت یا عبادت نہیں، بلکہ طاعتیں وہ ہیں، جن کی تفصیل یہی آیت آگے کر رہی ہے۔

وَالْمَغْرِبِ۔ مشرق پرستی سے تو بہرحال کم اور بہت کم مگر پھر بھی بہت کچھ عام اور وسیع وبا مغرب پرستی کی بھی شرک کی دنیا میں رہ چکی ہے، آفتاب کے طلوع وغروب پر قیاس کر کے مشرک ذہنیت نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح مصدر حیات سمت مشرق ہے، اسی طرح مستقر موت و اجل سمت مغرب ہے، اور اسی لئے یہ بھی مستحق تعظیم و تقدیس ہے، ملاحظہ ہوں حواشی نمبر ۴۱۱ و ۴۱۲ پ ۱۔

اَلْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ یہ دونوں نام صراحت کے ساتھ صرف مثال کے طور پر لے لئے گئے ہیں، مقصود تمام سمتوں کی تعمیم ہے، انہی دو سمتوں کی تحدید یا تخصیص نہیں۔

وَالْمُرَادُ مِنْ ذِكْرِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ التَّعْمِيْمُ لَا تَعْيِيْنُ السَّمْتَيْنِ (روح)

۶۲۹ مشرکانہ ذہنیت کی تردید کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اصلی طاعت یہ ہے جس کا بیان اب آ رہا ہے

آیت کے اس جزو میں عقائد کی تصحیح آگئی۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ. تقدیر کلام یوں ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ. طاعت اس کی ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ الخ
وَالتَّقْدِيْرُ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ (قرطبی) فَحُذِفَ الْمُضَافُ وَهُوَ كَثِيْرٌ فِي الْكَلَامِ وَهٰذَا اِخْتِيَارُ الْفَرَّاءِ وَالزَّجَّاجِ وَقُطْرُبٍ۔ (کبیر)

دوسری تقدیر کلام یوں بھی مانی گئی وَلٰكِنَّ الْبَارَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ. اس لئے کہ عربی میں مصدر کا استعمال صفات کے موقع پر بھی ہوتا رہتا ہے۔

فَالْعَرَبُ تَجْعَلُ الْمَصَادِرَ صِفَاتٍ فَمَجَازُ الْبِرِّ مُهٰنَا مَجَازُ صِفَةٍ لِمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (مجاز)
فراء نحوی نے یہ بھی کہا ہے کہ عربی میں اسم کو فعل کی خبر بنا دیا جاتا ہے اور فعل کو اسم کی خبر (معانی)

اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اس میں دہریت و الحاد کی جلی و خفی ہر صورت کی تردید آگئی، ایمان و طاعت میں داخلہ کا یہی دروازہ ہے کوئی ایسا نظام یا مسلک (خواہ اس کی بنیادیں عقلی ہوں یا اخلاقی یا معاشی یا سیاسی) جس میں اللہ کی آیات و صفات پر ایمان کامل داخل نہ ہو، طاعت سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتا، مادیت و عقلیت (ریشلزم) لاادریت (اگناسٹی سزم) اشتمالیت (کمیونزم) وغیرہ سب اسی حکم کے تحت میں آجاتی ہیں، اور بودھ مذہب اور جین مت بھی، اگر ان کی بابت یہ بیان صحیح ہے کہ ان میں توحید باری موجود نہیں۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس میں تردید ان تمام گمراہ قوموں کی آگئی جو وجود باری کی تو قائل تھیں لیکن اس عقیدہ سے خالی ہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہے جہاں ایک روز جزائے اعمال کا سامنا کرنا اور زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور نیز اور یہود نے اپنی زبردست توحید کے باوجود عالم آخرت سے اپنا تعلق نہایت درجہ ضعیف کر رکھا تھا، جزا و سزا اسی دنیا میں سمجھنا خواہ قومی و اجتماعی عروج و زوال سے، خواہ بہ قاعدۂ تناسخ مختلف قالبوں میں روح کے الٹ پھیر سے یہ سب انکار آخرت ہی کی شکلیں ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةِ۔ فرشتوں پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ان نورانی اور مجرد مخلوقات کا وجود اللہ کے بندوں اور کارساز مطلق کے قاصدوں، خادموں اور کارندوں کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، نہ یہ کہ خود انہیں کو مستقل قوتوں کی طرح فاعل عامل متصرف مان کر ان سے دعائیں مانگی جائیں، اور انہی کو ایک چھوٹے پیمانہ پر حاجت روا قرار دے لیا جائے، اس ایمان بالملائکہ سے یونان، روم، ہندوستان، ایران کی ان تمام مشرک قوموں کی تردید ہو گئی، جنہوں نے فرشتوں ہی کے تخیل کو مسخ کر کے کائنات کے مختلف شعبوں کے لئے دیویاں اور دیوتا تجویز کر لئے ہیں۔

وَالْكِتٰبِ۔ کتاب یہاں بہ طور اسم جنس آیا ہے اس کا اطلاق صحیفۂ آسمانی کے نفس تخیل پر ہوگا، کتاب آسمانی کا عقیدہ بھی ایک تمام تر اسلامی عقیدہ ہے، مشرک قومیں تو خیر اس تخیل ہی سے ناآشنا ہیں کہ اللہ کے ہاں سے کوئی کتاب کسی بشر پر نازل ہوئی ہے، "اہل کتاب" تک اب اسلامی اصطلاح کے مطابق کسی کتاب الٰہی کے قائل نہیں ان کے ہاں کتاب کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خدا نے ہدایت کے لئے بعض اشخاص کو چن لیا اور ان کے قلوب میں کچھ مضامین بطور الہام القا کر دیئے اور ایسا الہام ہر عارف کو ہو سکتا ہے، نبوت اس کی کوئی لازمی شرط نہیں پھر بعد کو ان بزرگوں اور عارفوں نے انہی مضامین و معانی کو اپنے لفظ و عبارت میں مرتب کر کے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو سنا دیا، پھر ان سامعین نے

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

وہ اس کی محبت میں مال تقسیم کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں

وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ

اور سائلوں پر ۶۳۲ اور گردنوں کے آزاد کرنے میں ۶۳۳

بعض اپنے طور پر لکھا یا (بجز توریت کی ابتدائی پانچ سورتوں کے کہ وہ یہودی عقیدہ کے مطابق خود حضرت موسیٰؑ کی نوشتہ ہیں) گویا ان الہامی کتابوں کی حیثیت کل وہ ہے جو ہمارے ہاں بزرگوں کے جمع کئے ہوئے ملفوظات کی ہوتی ہے! کہاں یہ تحقیق، اور کہاں مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف تک وحی شدہ ہے جس میں غلط اور خطا کا امکان ہی نہیں! اور مسیحی تو جب حضرت مسیحؑ کی رسالت و نبوت ہی کے سرے سے قائل نہیں بلکہ ان کی الوہیت کے مدعی ہیں تو حضرتؑ کا صاحب کتاب رسول ہونا ان کے ہاں کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، کوئی آپ اپنے اوپر بھی بھلا کتاب نازل کیا کرتا ہے؟

وَالنَّبِيّٖنَ یعنی عقیدہ یہ ہو کہ اللہ انسانوں کو پیمبر بنا کر بھیجتا ہے یہ نہ ہو کہ خود حق تعالیٰ مجسم ہو کر اس دنیا میں آجاتا ہے یا کسی قالب میں حلول کر آتا ہے، اسی عقیدہ میں صاف تردید ہو گئی اوتار پرستی کی، مظہر پرستی کی، حلول کی، تجسم باری تعالیٰ کی۔ اوتار ٹھیک ضد اور مقابل ہے پیمبر کے۔ اوتار کا مفہوم یہ ہے کہ خالق کائنات خود کوئی مادی پیکر اختیار کر کے دنیا میں آجاتا ہے اور یہ بھی ضرور نہیں کہ وہ قالب انسان ہی کا ہو، شیو جی، بشن جی جس طرح رام چندر جی بن کر یا سری کرشن بن کر آسکتے ہیں، اسی طرح سانپ بن کر، شیر بن کر، مچھلی یا کچھوے کا قالب اختیار کر کے بھی آسکتے ہیں، غرض یہ کہ اوتار اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا ہوتا ہے اور صورت اور ظاہر کے اعتبار سے انسان یا جانور۔ پیمبر اس کے برعکس صرف بشر ہوتا ہے اور ہمیشہ بشر ہی، نہ کبھی فوق البشر نہ کبھی تحت البشر، اور بجز اس کے کہ صاحب وحی ہوتا ہے (اور اس لئے اخلاق کی پاکیزگی میں بے نظیر اور جرم و عصیان سے پاک) اور کسی حیثیت سے شکل و صورت میں، چلنے پھرنے میں، بولنے چالنے میں، بھوک پیاس میں، غم و مسرت میں، ضعف بشری سے ممتاز نہیں ہوتا۔ آیت کے اتنے جزو میں قرآن مجید نے اپنی معجزانہ بلاغت و ایجاز سے تمام اعتقادی گمراہیوں کی جڑ کاٹ دی، اور سارے مذاہب باطلہ کی تردید کر دی۔ اعتقادی گمراہی جب کبھی بھی انسانوں کو گھیرے گی ہمیشہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء ہی کی کسی نہ کسی غلطی یا غلط فہمی کی راہ سے آئے گی۔

۶۳۲ عقائد کی تصحیح ہو چکی تو اب اعمال کی تصحیح شروع ہوئی اور اعمال میں بھی ابتدا شعبۂ معاملات سے ہوئی۔

عَلٰى حُبِّهٖ۔ اس کی محبت میں، یا اس کی محبت کے باوجود، جائز دونوں ترجمے ہیں، اور حُبِّهٖ کی ضمیر غائب اللہ کی طرف بھی ہو سکتی ہے ــــ اور مال کی طرف بھی۔

اي واعطى المال لاجل حبه تعالى او على حبه اياه المال (المنار)

ایک گروہ ضمیر کو اللہ کی طرف لے گیا ہے۔

يعني يعطون المال على حب الله اى على طلب مرضاته (كبير) قيل على حب الله (كشاف) قيل الضمير لله (بيضاوي)

گویا یہ بتادیا کہ صرفِ مال فی نفسہٖ ہرگز محمود و مطلوب نہیں، مطلوب و مقصود صرف وہ صرفِ مال ہے جو اللہ کی راہ میں، اللہ کی رضاجوئی کے لئے، اللہ کے دین کے فروغ کے لئے ہو۔

لیکن دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ صرفِ مال، مال کی محبت کے باوجود ہو، یعنی ضمیر غائب کا مرجع بجائے اللہ کے لفظ قریب مال کو قرار دیا گیا ہے۔

وَهُوَ قَوْلُ الْأَكْثَرِيْنَ أَنَّهٗ رَاجِعٌ إِلَى الْمَالِ (کبیر) أَيْ مَعَ حُبِّ الْمَالِ وَالشُّحِّ بِهٖ كَمَا قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ (کشاف) قِيْلَ فِيْهِ أَنَّهٗ يَعْنِيْ حُبَّ الْمَالِ (جصاص) أَيْ أَخْرَجَهٗ وَهُوَ مُحِبٌّ لَهٗ رَاغِبٌ فِيْهِ نَصَّ عَلٰى ذٰلِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَسَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَغَيْرُهُمَا مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ (ابن کثیر)

اس میں بھی ایک پختہ مومن کی تصویر آگئی ہے، مال و زر کی محبت اور قدر اس کے دل میں ہے، خواہشیں اس کی زندہ ہیں، اپنی ذات پر، اپنے محبوبات و مرغوبات پر وہ خرچ کرنا چاہتا ہے، لیکن امرِ الٰہی کے آگے اپنی گردن جھکا دیتا ہے، اپنی خواہشات کو دبا دیتا ہے، اپنے شوق کو حکمِ خداوندی پر قربان کر دیتا ہے، وہ عمل اسی پر کرے گا جو حکمِ ربانی ہے، اور خرچ وہیں کرے گا جہاں شریعت حکم دیتی ہے۔

ذَوِي الْقُرْبٰى الخ مصارفِ خیر کی اسلام نے یہ کتنی مناسب اور حکیمانہ ترتیب قرار دے دی ہے، آیت کے اس جزو میں اُمت کا پورا نظامِ معاشی ایک خلاصہ کی شکل میں آگیا ہے، مالی اعانت سب سے پہلے اپنے عزیزوں قریبوں کی کرنا چاہئے، یہ نہ ہو کہ بھائی کی کوٹھیاں تیار ہو رہی ہیں، اور بہن جھونپڑے کو ترس رہی ہے، چچا کے پاس موٹریں ہوں، اور بھتیجے کو ٹکے کے پیسے بھی میسر نہ ہوں، ہر زردار کو سب سے پہلے خبرگیری اپنے نادار عزیزوں، کنبہ والوں، بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے قریبوں کی کرنا چاہئے، اس کے بعد نمبر محلہ کے، بستی کے، شہر کے یتیم بچوں، بچیوں کا آتا ہے، جن کا کوئی والی وارث، سرپرست باقی نہیں رہا ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ نمبر اُمت کے عام مفلسوں محتاجوں، اور پھر اُن مسافروں، راہ گیروں کا آتا ہے جو زادِ راہ سے محروم ہیں، اور اس لئے اپنے ضروری سفروں سے محروم رہ جاتے ہیں، یا بستی میں کہیں باہر سے وارد ہو گئے ہیں، اور کوئی اُن کے ٹھہرانے، کھلانے پلانے کا روادار نہیں ہو رہا ہے، اور پھر آخر میں اہلِ حاجت سوالی رہ جاتے ہیں، اس پورے معاشی پروگرام پر اگر قاعدہ سے عمل ہونے لگے تو اُمت میں کہیں مفلسی، تنگدستی، بے معاشی، بے روزگاری کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟

۶۳۱ (قیدیوں اور غلاموں کی)

فِي الرِّقَابِ۔ رِقَاب، رَقَبَۃٌ کی جمع ہے، لفظی معنی گردن کے ہیں، محاورہ میں اس سے مُراد وہ ہوتے ہیں جن کی گردنیں آزاد نہیں یا جو بندھے ہوئے ہیں، یعنی غلام جو دوسروں کی رعایا ہیں، یا قیدی جو کسی جرمِ فوجداری یا دیوانی کی علت میں گرفتار ہو کر محبوس ہیں۔

اَلرَّقَبَةُ جُعِلَ فِي التَّعَارُفِ اسْمًا لِلْمَمَالِيْكِ كَمَا عُبِّرَ بِالرَّاسِ وَبِالظَّهْرِ عَنِ الْمَرْكُوْبِ (راغب)

فَالرَّقَبَةُ مَجَازٌ عَنِ الشَّخْصِ۔ (روح)

تقدیرِ کلام یوں ہے فِي تَخْلِيْصِ الرِّقَابِ یا فِي فَكَاكِ الرِّقَابِ۔ گویا مضاف محذوف ہے، اور یہ ترکیب قرآن مجید میں عام ہے، مُراد دونوں ذریعہ معاوضہ دے کر قیدیوں کو قید سے اور غلاموں کو غلامی سے آزادی دلانا ہے۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ

اور نماز کی پابندی کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ۶۳۲ اور اپنے وعدوں کو پورا کرتے والے جب کروعدہ کر چکے ہوں

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور تنگی میں اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ۶۳۳ یہی لوگ ہیں جو سچے

صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اُترے اور یہی لوگ تو متقی ہیں ۶۳۴

یَعْنِی الْمُکَاتَبِیْنَ قَالَہٗ اَکْثَرُ الْمُفَسِّرِیْنَ (معالم) وَھُمُ الْمُکَاتَبُوْنَ (ابن کثیر) اَیْ فِیْ تَخْلِیْصِھَا بِمُعَاوَنَۃِ الْمُکَاتِبِیْنَ اَوْ فَکِّ الْاُسَارٰی (بیضاوی) اَیْ فِیْ تَخْلِیْصِھَا الرِّقَابَ وَفِکَاکِھَا (روح) وَقِیْلَ فِدَاءُ الْاُسَارٰی (معالم)
مصارفِ خیر واعانت کی ایک ضروری مد یہی جاتی تھی، قرآن مجید نے آخر میں اس کا بھی اضافہ کر دیا اور اب یہ فہرست اُمت کے اجتماعی نقطۂ نظر سے ہر طرح مکمل ہو گئی۔

۶۳۲ تصحیح عقائد کی ہو چکی، تصحیح معاملات کی ہو چکی اب نمبر عبادات کا آتا ہے عبادات بے شمار ہیں لیکن اور بڑی تقسیم عبادتِ بدنی اور عبادتِ مالی کی ہے یہاں الصَّلٰوۃ والزَّکٰوۃ لا کر دونوں کی جنس کی طرف اشارہ کر دیا، نماز ساری بدنی عبادتوں کی قائم مقام ہو گئی، زکوٰۃ ساری مالی عبادتوں کی۔
اَقَامَ الصَّلٰوۃَ۔ یعنی نمازیں وقت مقرر پر شرائط وقواعدِ معلوم کے ساتھ ادا کرتے رہتے ہیں۔
اٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ یعنی زکوٰۃ حسب آداب وشرائطِ شریعت باقاعدہ ادا کرتے رہتے ہیں۔

۶۳۳ عقائد ہو چکے، معاملات ہو چکے، عبادتیں ہو چکیں اب ذکر اخلاق کا شروع ہوا۔
اَلْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ۔ فقرہ ہر قسم کے معاہدات کا جامع ہے، خواہ وہ معاہدہ بندہ کا اپنے خالق کے ساتھ ہو یا معاہدہ بندوں کا بندوں کے درمیان ہو، مومن جھوٹا وعدہ کرنا یا جھوٹا عہد لینا جانتا ہی نہیں۔
اَیْ فِیْمَا بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَفِیْ مَا بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ النَّاسِ (قرطبی)
اَلْبَاْسَآءِ۔ مصیبت اور تنگدستی میں بأساء کا اصل تعلق مالی پریشانیوں سے ہے۔
اَیِ الشِّدَّۃُ وَالْفَقْرُ (قرطبی) اَلْبَاْسَآءُ فِی الْاَمْوَالِ کَالْفَقْرِ (بیضاوی عن الازہری) ھُوَ الشِّدَّۃُ وَالْفَقْرُ (المنار)
اَلضَّرَّآءِ۔ بیماری کی تکلیفوں میں ضراء کا اصل تعلق جسمانی آزار اور قلبی پریشانی سے ہے۔
اَیِ الْمَرَضُ وَالزَّمَانَۃُ (قرطبی) اَلضَّرَّآءُ فِی الْاَنْفُسِ کَالْمَرَضِ (بیضاوی عن الازہری) مَا یَمَسُّ الْاِنْسَانَ مِنْ نَحْوِ مَرَضٍ اَوْ قَرْحٍ اَوْ فَقْدِ مَحْبُوْبٍ مِنْ مَالٍ وَاَھْلٍ۔ (المنار)
حِیْنَ الْبَاْسِ۔ یعنی جنگ کے وقت دشمنانِ دین کے مقابلہ میں۔
اَیْ وَقْتَ مُجَاھَدَۃِ الْعَدُوِّ (بیضاوی) اَیْ وَقْتَ الْحَرْبِ (قرطبی) وَفَسَّرُوا الْبَاْسَ بِاشْتِدَادِ الْحَرْبِ۔ (المنار)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کردیا گیا ہے ۶۳۵

ثبات وصبر کے ظاہر کرنے میں اور جوہر سیرت ومردانگی کی چمک کھانے کے یہی تو خاص موقع ایک مومن کے لئے ہوتے ہیں۔

۶۳۴ یعنی کمالاتِ حقیقی کے ساتھ موصوف' اور طاعت وپرہیزگاری (بِرّ وتقویٰ) میں پورے اترنے والوں کی علامتیں یہی ہیں جو اوپر بیان ہوچکیں، اس معیار سے جس کو چاہو جانچ لو، پرکھ لو۔

اَيْ صَدَقُوْا فِي الدِّيْنِ وَاتِّبَاعِ الْحَقِّ وَطَلَبِ الْبِرِّ۔ (بیضاوی)

قرآن مجید کی ہر آیت بجائے خود معظم ومحترم وواجب العمل ہے، لیکن اس آیت کے باب میں تو حدیث نبوی میں یہاں تک صراحت موجود ہے کہ مَنْ عَمِلَ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ (جس نے اس آیت پر عمل کرلیا، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا) اور محققین کا قول نقل ہوا ہے کہ یہ آیت اہم ترین آیتوں میں سے ہے، اور اس کے اندر دین وشریعت کے سولہ احکام آگئے ہیں۔

فَاِنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ عَظِيْمَةٌ مِنْ اُمَّهَاتِ الْاَحْكَامِ لِاَنَّهَا تَضَمَّنَتْ سِتَّ عَشَرَةَ قَاعِدَةً الْاِيْمَانَ بِاللّٰهِ وَبِاَسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ وَالنَّشْرَ وَالْحَشْرَ وَالْمِيْزَانَ وَالصِّرَاطَ وَالْحَوْضَ وَالشَّفَاعَةَ وَالْجَنَّةَ وَالنَّارَ وَالْمَلٰئِكَةَ وَالْكُتُبَ الْمُنَزَّلَةَ وَاَنَّهَا حَقٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاِنْفَاقَ الْمَالِ فِيْمَا يَعِنُّ مِنَ الْوَاجِبِ وَالْمَنْدُوْبِ وَاِيْصَالَ الْقَرَابَةِ وَتَرْكَ قَطْعِهِمْ وَتَفَقُّدَ الْيَتِيْمِ وَعَدَمَ اِهْمَالِهِ وَالْمَسَاكِيْنَ كَذٰلِكَ وَمُرَاعَاةَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَالسُّؤَالِ وَفَكَّ الرِّقَابِ (قرطبی)

اور بعض صوفیوں نے آیت کے اجزاء کی جامعیت پر نظر کرکے کہا ہے کہ آیت اصل ومدار ہے شریعت وطریقت کی، آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن کے لئے کافی نہ صرف باطنی اعتقاد ہے اور نہ صرف ظاہری، بلکہ دل میں ایمان ہونا بھی لازمی ہے اور ظاہر میں احکام کی اطاعت بھی۔ اور یہ باتیں تو سب اپنوں کی تھیں، فرنگیوں میں سے ایک ذات شریف پادری ویری (WHERRY) نامی بیچارے ہیں مسلمانوں اور اسلام کے بڑے "عنایت فرما" سن سفید داڑھی کے بال اسلام کی عداوت ہی میں سفید کئے، سیل (SALE) کے انگریزی ترجمۂ قرآن پر تفسیر کا اضافہ انہی کے قلم سے ہے، اس آیت پر پہونچ کر قدرت ان کے قلم سے یوں لکھواتی ہے:

"یہ (آیت) قرآن کی بلند ترین آیتوں میں ہے۔۔۔۔ ذات باری پر ایمان' اور نوع انسانی کے ساتھ حسن سلوک اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہر اصلی بتایا گیا ہے' اس میں لب لباب عقائد اور اعمال کا آگیا!"

خیر یہی بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب کو کچھ تو آیتیں قرآن مجید میں "بلند" نظر آگئیں۔

۶۳۵ (اس حال میں کہ جب تم اپنی حکومت رکھتے ہو اور سزاؤں کے نفاذ پر باقاعدہ قدرت رکھتے ہو) اسلام اپنے پیرووں سے توقع دنیوی سربلندی ہی کی رکھتا ہے اور اسے ایک بطور مسلّمہ کے فرض کئے رہتا ہے کہ امت دنیوی اقتدار کی بھی مالک ہوگی، مسلمانوں کا صدیوں تک مسلسل کافروں کے تسلط واقتدار میں رہنا اسلام کے مفروضات میں گویا داخل ہی نہیں، قانون فوجداری اور قانون دیوانی دونوں کی اکثر دفعات کا نفاذ نظام حکومت کے اسلامی ہونے پر معلق ہے یعنی امت کو ان قوانین الٰہی کے تنفیذ کی باقاعدہ قدرت بھی تو ہو۔

لَاخِلَافَ اَنَّ الْقِصَاصَ فِي الْقَتْلِ لَا يُقِيْمُهُ اِلَّا اُولُو الْاَمْرِ فُرِضَ عَلَيْهِمُ النُّهُوْضُ بِالْقِصَاصِ وَاِقَامَةِ الْحُدُوْدِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ (قرطبی) اِتَّفَقَ اَئِمَّةُ الْفَتْوٰى عَلٰى اَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ لِاَحَدٍ اَنْ يَقْتَصَّ مِنْ اَحَدٍ

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ

آزاد کے بدلے میں آزاد، اور غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت[636]

حقہ دون السلطان ولیس للناس ان یقتص بعضھم من بعض (قرطبی)

قصاص۔ یہ انتقام محض کا مرادف نہیں کہ ہر فرد دوسرے فرد سے از خود لینا شروع کر دے بلکہ قانون فوجداری کے ماتحت سزا کی منظم، مہذب و منضبط ترین شکل کا نام ہے، اُمت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے اس کے اجراء کی ذمہ داری حکومت یا اہل حل و عقد پر عائد ہوتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ میں مومنین سے خطاب اجتماعی حیثیت سے ہے انفرادی حیثیت سے نہیں مسلم حکومت سے ہے، مسلم افراد سے نہیں، جیسا کہ اسی حاشیہ میں ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

قتلیٰ۔ قتلِ عمد کی سزا دنیا کے ہر قانون میں عموماً قتل ہی ہے۔ البتہ خود قتلِ عمد کی تعریف میں بہت کچھ اختلافات ہیں، شریعت اسلامی کی اصطلاح میں قتل عمد وہ ہے کہ کوئی کسی کو ارادہ کر کے کسی آہنی سلاح سے یا کسی اور حربہ سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہ سکے قتل کرے۔

اما العمد فما تعمد ضربه بسلاح او ما يجري مجرى السلاح في تفريق الاجزاء (کافی)

السلاح ما تكون آلته قاتلة اعدت للقتال (نہایہ)

اور فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ قصاص یعنی سزاء قتل اسی قتل کے ساتھ خاص ہے۔

قتلیٰ کے عموم میں غلام اور ذمی، مرد و عورت سب ہی مقتول داخل ہیں۔

سواء كان المقتول عبدا او ذميا ذكرا او انثى لشمول لفظ القتلى للجميع (جصاص)

کُتِبَ عَلَیْکُمْ یعنی قتل عمد کے لئے یہ سزا فرض ہے۔

معناه فرض عليكم فاقتضى وجوب القصاص على كل قاتل عمدا بحديدة (جصاص)

لیکن فرض ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قصاص ہر صورت میں لیا ہی جائے۔ استثناء کی صورتیں تو خود آیت ہی میں ابھی آ رہی ہیں، فرضیت سے مقصود یہ ہے کہ حدود قصاص سے آگے نہ بڑھا جائے اور اندھا دھند انتقام در انتقام کی کارروائی نہ شروع ہو جائے۔

وليس القصاص بلازم انما اللازم ان لا يتجاوز القصاص وغيره من الحدود الى الاعتداء (روح)

كتب عليكم العدل في القصاص ايها المؤمنون ..... ولا تجاوزوا ولا تعتدوا [illegible] منكم (ابن جریر)

کُتِبَ عَلَیْکُمْ۔ قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے فرضیت کے لئے آیا ہے۔

معناه في كل القرآن فرض عليكم (معالم)

[636] مراد یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے گی، اور خون خون سب کا برابر سمجھا جائے گا، یہ نہیں کہ اونچے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے، یا ایک مقتول کے عوض میں پورا کنبہ یا قبیلہ یا قوم تباہ کر دی جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا، تو قصاص میں جان اُس آزاد کی لینے کے بجائے کسی غلام کی لی جاتی، یہود عرب کا دستور یہ منقول ہوا ہے کہ اُن کے اعلیٰ قبیلہ (مثلاً

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ

ہاں جس کسی کو اُس کے فریق مقابل کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے ۶۳۷ سو مطالبہ معقول (اور نرم) طریق پر کیا جانا چاہئے ۶۳۸

بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ

اور مطالبہ کو اُس (فریق) کے پاس خوبی سے پہنچا دینا چاہئے ۶۳۹ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے ۶۴۰

بنی نضیر کے ایک مقتول کے عوض قاتل اگر کسی ادنیٰ قبیلہ (مثلاً بنی قریظہ) سے تعلق رکھتا تو اُس کے دو شخصوں سے قصاص لیا جاتا۔ دنیا کی تاریخ دوسرے ملکوں میں بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں اور امریکہ میں تو آج تک ایک گورے WHITE کا خون ایک کالے (NEGRO) کے خون سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہے اور فرنگی حکومتیں اپنے ایک ایک مقتول کے عوض قاتل قوم کے کتنے کتنے شخصوں کی جانیں بے تکلف لیتی رہتی ہیں یہاں پہنچ کر داد اُن فقہاء و مفسرین کی نکتہ سنجی کی دینا پڑتی ہے جنھوں نے آیت کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے۔ اَيِ الْمُسَاوَاةُ بَيْنَهُمْ لَا الزِّيَادَةُ۔

اسلام نے ان ظالمانہ دستوروں کو مٹایا، اور اعلان کر دیا کہ زندگی ہر مومن کی اُمت کے ہر فرد کی یکساں قابلِ احترام ہے، اور مرد ہو، عورت ہو، آزاد ہو، غلام ہو، کوئی ہو، جس کا جو قاتل ہو گا وہی سزا پائے گا۔

اَلْقِصَاصُ عِبَارَةٌ عَنِ الْمُسَاوَاةِ وَالْمَعْنٰى فُرِضَ عَلَيْكُمْ اِعْتِبَارُ الْمُمَاثَلَةِ وَالْمُسَاوَاةِ فِي الْقَتْلٰى۔ (مدارک)

فقہ حنفی کے دو مسئلے اس سلسلہ میں قابلِ خیال رکھنے کے ہیں:۔

(۱) مقتول اگر کافر ہے لیکن ذمی تو اس کا بھی قصاص قاتل ہی سے لیا جائے گا، اگرچہ وہ مسلم ہو، ہاں کافر حربی چونکہ کھلا ہوا باغی اور دشمن ہوتا ہے اسلامی "اسٹیٹ" کا بھی اور اسی لئے تو اسے حربی کہا ہی جاتا ہے، سو اس کے قتل میں ظاہر ہے کہ قصاص نہیں (۲) دوسرے یہ کہ قتل عمد میں آزاد کے عوض میں تو آزاد قتل کیا ہی جائے گا غلام کے عوض میں بھی آزاد قتل کیا جائے گا اگر وہ قاتل ہے، اور عورت کے عوض میں عورت تو ماری ہی جائے گی لیکن مرد بھی قتل کیا جائے گا، اگر وہ قاتل ہے۔

آیت میں ایک پہلو ایسا بھی ہے، جس سے معتزلہ کا رد نکل آیا، معتزلہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از ایمان سمجھتے ہیں حالانکہ آیت میں اکبر الکبائر یعنی قتلِ مسلم کا بیان ہے اور قاتل کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کیا ہے، مسلمان ہی شمار کیا ہے

وَفِي الْاٰيَةِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْقَاتِلَ لَا يَصِيْرُ كَافِرًا بِالْقَتْلِ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَاطَبَهٗ بَعْدَ الْقَتْلِ بِخِطَابِ الْاِيْمَانِ (معالم)

شریعتِ موسوی کی جو تصریحات اس باب میں درج ہیں وہ قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا وہ مار ڈالا جائے گا (احبار۔ ۲۴: ۱۷)" "اور جو انسان کو مار ڈالے، جان سے مارا جائے" (احبار۔ ۲۴: ۲۱) "توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اُس سے ویسا ہی کیا جائے" (احبار۔ ۲۴: ۲۰)"

۶۳۷ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ ظاہر ہے کہ اس سے مراد قاتل یا قاتلین ہی ہو سکتے ہیں۔

يُرَادُ بِهَا الْقَاتِلُ هٰذَا قَوْلُ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَتَادَةَ وَمُجَاهِدٍ وَجَمَاعَةٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ (قرطبی) مَنْ هُوَ الْقَاتِلُ الْمَعْفُوُّ لَهٗ (مدارک)

مِنْ اَخِیْهِ یعنی مقتول کی طرف سے مدعی یا مستغیث کی طرف سے لفظ اَخِیْهِ کی بلاغت اور معنویت اس سیاق
میں سر دُھننے کے قابل ہے۔ شدید سے شدید جذباتِ انتقام و اشتعال پذیری کا موقع قتل سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے،
اس انتہائی نازک موقع پر یہ لفظ لا کر بتلا دیا کہ قاتل باوجود اتنے سنگین جرم کے کافر نہیں ہو جاتا، اخوتِ اسلامی کے
دائرہ سے خارج نہیں ہو جاتا، مقتول کا ولی و وارث، قاتل کا دینی بھائی اس وقت بھی رہتا ہے۔

وَالْمُرَادُ بِالْاَخِ وَلِیُّ الدَّمِ (روح) سَمَّاهُ اَخًا اِسْتِعْطَافًا بِتَذْكِيْرِ اُخُوَّةِ الْبَشَرِيَّةِ وَالدِّيْنِ (روح) يَعْنِي
وَلِيَّ الدَّمِ وَذَكَرَهُ بِلَفْظِ الْاُخُوَّةِ الثَّابِتَةِ بَيْنَهُمَا مِنَ الْجِنْسِيَّةِ وَالْاِسْلَامِ لِيَرِقَّ لَهُ وَيَعْطِفَ عَلَيْهِ (بیضاوی) وَالْاَخُ
وَلِيُّ الْمَقْتُوْلِ وَذَكَرَهُ بِلَفْظِ الْاُخُوَّةِ بَعْثًا لَهُ عَلَى الْعَطْفِ لِمَا بَيْنَهُمَا مِنَ الْجِنْسِيَّةِ وَالْاِسْلَامِ (مدارک)

شَیْءٌ۔ لفظ اہم ہے یعنی سزائے واجب کا کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے۔

ذَهَبَ جُمْهُوْرُ الْمُفَسِّرِيْنَ اِلٰى اَنَّ شَيْءٌ هٰهُنَا نَائِبٌ عَنِ الْمَصْدَرِ اَيْ عُفِيَ لَهٗ شَيْءٌ مِّنَ الْعَفْوِ (المنار)

یہ نہ ہو کہ تمام تر معاف کر دیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ مقتول کے عزیز اور وارث اگر قاتل کو سزائے قتل نہ دینا چاہیں،
بلکہ اُسے کوئی ہلکی سزا دے کر یا خوں بہا کی پوری رقم میں سے کچھ حصہ معاف کر کے اُسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہوں۔
رومیوں کی مشرک قوم میں قتل تمام تر ایک جرم قانونِ فوجداری کا تھا، قانونِ دیوانی سے اُسے کوئی علاقہ ہی نہ تھا۔
موجودہ فرنگی قانون چونکہ تمام تر رومیوں ہی کے قانون (رومن لا) پر مبنی ہے اس لئے اس میں بھی قتل محض ایک فوجداری کا
جرم ہے۔ شریعتِ اسلامی کی نظر فطرتِ بشری کی گہرائیوں اور مصالحِ اجتماعی کی باریکیوں پر اس سے کہیں زائد ہے، اس نے
اپنے اصولِ قانون میں یہ بات رکھی کہ قتل جس طرح فوجداری کا جرم ہے، دیوانی کا بھی ہے، اس جرم سے محض (اسٹیٹ) حکومت
اور (سوسائٹی) ہیئتِ اجتماعیہ ہی کے ایک قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ یہ فرد پر بھی اس کی شخصی حیثیت میں ایک حملہ ہے،
گویا یہ جرم ایک پبلک حیثیت رکھتا ہے اور ایک پرائیوٹ اور جب اس کی یہ دو گونہ حیثیت ہے، تو مقتول کے وارثوں یا خون کے
مدعیوں کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ چاہیں تو مجرم کو پوری سزا اسٹیٹ (حکومت) سے دلائیں اور چاہیں تو خود مالی معاوضہ
لے کر انتہائی سزا سے دستبردار ہو جائیں۔ اسی مالی معاوضہ کو اصطلاحِ شریعت میں دِیَة یا خوں بہا کہتے ہیں اور اس میں گھٹ بڑھ
برابر ہو سکتی ہے (دیت کا ذکر خود قرآن مجید میں آگے آرہا ہے) آج بھی انٹرنیشنل (بین الاقوامی) قانون میں یہ بالکل جائز ہے کہ
جب ایک (اسٹیٹ) ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک (اسٹیٹ) کے باشندوں کے ہاتھوں ہو جائے اور غیر ملک میں
فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دقتیں اور دشواریاں محسوس ہوں تو بجائے فوجداری استغاثہ اور اس کی پیروی کے صرف
"ہرجانہ" (DAMAGES) کی رقم پر کفایت کر لی جائے، یہ "ہرجانہ" اسی خوں بہا کے لئے ایک خوشنما اور جدید اصطلاح ہے۔

۶۳۸ (اور خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شر و فساد کا موقع نہ نکالنا چاہیئے)

یعنی مقتول کا فریق کہ وہی اب مدعی یا مستغیث ہوگا، خوں بہا کی مطلوبہ رقم کا مطالبہ بمعقولیت آدمیت سے کرے، خواہ مخواہ
ضد اور اشتعال سے فریقِ مقابل کو تنگ نہ کرے اور اس کے جوش کو نہ بڑھائے کہ اس سے فساد کو مزید تحریک ہوگی، عین حدت و اشتعالِ
طبع کے نازک موقعوں پر یہ رکھ رکھاؤ، اتنی احتیاط اور حسنِ معاشرت کو سنبھالے رکھنے کا اہتمام شریعتِ اسلامی کا مخصوص حصہ ہے۔

۶۳۹ اب یہ تاکید قاتل اور اُس کے فریق کو ہو رہی ہے، اُن ملزموں یا مدعا علیہم کو بھی اپنی طرف سے یہی چاہئے کہ
جتنی رقم کی قرارداد ہو چکی ہو اُسے بغیر مزید طوالت یا پیچیدگی و بدمزگی کے، فریقِ مقتول یعنی مدعیوں یا مستغیثوں تک

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي

سو جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا اُس کے لئے (آخرت میں) عذاب دردناک ہے ۶۴۱ اور تمہارے لئے اے اہلِ فہم!

الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

(قانونِ) قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۶۴۲

خوبصورتی اور خوش اُسلوبی سے پہونچا دیں۔

اِلَیْهِ میں ضمیر فریقِ مقتول کی جانب ہے۔

وَالضَّمِيْرُ فِيْ اِلَيْهِ لِلْاَخِ (مدارک)

فطرتِ بشری کی ان نزاکتوں کا لحاظ اور قاتل و مقتول ہر دو فریق کے مصالح و جذبات کی رعایت کون انسانی قانون رکھ سکتا ہے؟ قانون ساز انسان تو محض ایک خشک انسان ہوتا ہے اتنے متعدد اور باریک پہلوؤں کی رعایت تو صرف خدائی ہی قانون کی شان ہوسکتی ہے۔

۶۴۰ ذٰلِكَ یعنی یہی حکم جو اوپر عفو و دیت کے اندر مذکور ہوچکا۔

يَعْنِي الْحُكْمَ الْمَذْكُوْرَ مِنَ الْعَفْوِ وَاَخْذِ الدِّيَةِ (مدارک) اَيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ ذُكِرَ مِنَ الْعَفْوِ عَنِ الْقِصَاصِ وَاَخْذِ الدِّيَةِ

ایک طرف قصاص کی بظاہر سختی، دوسری طرف دیت اور عفو کی نرمی، یہ حسنِ امتزاج اور اعتدال و توازن کا یہ مکمل قوام اسی قانون کا حصہ ہوسکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں، حکمتِ مطلق سے نکلا ہو۔

۶۴۱ (آخرت میں)

اِعْتَدٰى یعنی زیادتی کی صورتیں بہت سی ہوسکتی ہیں، مثلاً ایک یہی کہ کسی بے گناہ پر قتل کا جھوٹا دعویٰ کر دیا، یا یہ کہ قاتل کو پہلے تو معاف کردیا، اور پھر معافی کے بعد پورے قصاص کے درپے ہوگئے، وقس علیٰ ہذا، ایسے بے دردوں اور خدانا ترسوں کو صرف خوفِ آخرت ہی بیجا جسارتوں سے روک سکتا ہے۔

۶۴۲ یعنی تمہارا سارا معاشرہ پرہیزگاروں، عدل شعاروں کی قوم بن جائے۔

قانونِ قصاص عین عدل و مساوات کا قانون ہے اور ہیئتِ اجتماعی کے نظم و قیامِ ریاست کا بہترین ضامن و کفیل کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے، اور قوی و ضعیف سب کے حقوق کا تحفظ ہوجائے، یہ نہ ہو کہ جو زبردست ہوں وہ زیردستوں پر ستم ڈھا ڈھا کر رہیں، اُمت کے مختلف طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اطمینان و دلجمعی پیدا کرنے والا درحقیقت یہی قانون ہے اور جب اس قانون پر عملدرآمد ایک عرصہ تک رہے گا، اس قانون کی روح اُمت میں سرایت کرجائے گی تو ساری قوم کا مزاج صالح ہوجائے گا، اور آئین پسندی، باہم صلح و سازگاری، خدمت و معاونت جزو زندگی بن جائے گی اور اُمت دیکھتے ہی دیکھتے اُمتِ صالحین و ابرار، اُمتِ عادلہ کہلانے کی مصداق بن جائے گی۔ آیت میں اشارہ یہ بھی آگیا کہ بعض مذاہب کے اثر سے یا کسی دوسرے ناقص غیر معقول فلسفہ کے اثر سے قانونِ قصاص کو سرے سے اُڑا دینے اور سزائے موت کو کلیۃً منسوخ کرا دینے کی تبلیغ و تحریک سرتاسر نامعقول و خلافِ حکمت ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی معلوم ہو، بہ شرطیکہ کچھ مال بھی چھوڑ رہا ہو، تو وہ

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾

والدین اور عزیزوں کے حق میں معقول طریقہ سے وصیت کر جائے، یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر ۶۴۳

قصاص کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حنفیہ کے ہاں بالاتفاق اور بعض دوسرے ائمۂ فقہ کے ہاں بھی ذمی کے قصاص میں مسلمان ضرور قتل ہوگا۔

قَالَ أَبُو حَنِيفَةَ وَأَبُو يُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ وَزُفَرُ وَابْنُ أَبِي لَيْلَى وَعُثْمَانُ الْبَتِّيُّ يُقْتَلُ الْمُسْلِمُ بِالذِّمِّيِّ (جصاص)
وَقَالَ أَبُو بَكْرٍ ظَاهِرُ قَوْلِهِ تَعَالَى ... يُوجِبُ قَتْلَ الْمُسْلِمِ بِالذِّمِّيِّ عَلَى مَا بَيَّنَّا إِذْ لَمْ يُفَرِّقْ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالذِّمِّيِّ وَقَوْلُهُ تَعَالَى كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى عَامٌّ فِي الْكُلِّ (جصاص) وَلَيْسَ فِي الْآيَةِ فَرْقٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْكَافِرِ ... حُرْمَةُ ... عَلَيْهِمَا ... وَقَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَقَدْ ثَبَتَ بِالْاتِّفَاقِ أَنَّ السُّلْطَانَ الْمَذْكُورَ فِي هَذَا الْمَوْضِعِ قَدِ انْتَظَمَ الْقَوَدَ وَلَيْسَ فِيهَا تَخْصِيصٌ لِلْمُسْلِمِ مِنَ الْكَافِرِ (جصاص) وَيُقْتَلُ الْمُسْلِمُ بِالذِّمِّيِّ (کنز - ھدایہ)

۶۴۳ یہ حکم وصیت آیت میراث کے نزول سے (جس میں حقداروں کے حصے معین کر کے بتا دیئے گئے ہیں) بہت قبل کا ہے۔
وَكَانَ هَذَا قَبْلَ نُزُولِ الْفَرَائِضِ وَالْمَوَارِيثِ (قرطبی)

اس لئے قدرۃً اب اس پر عملدرآمد آیت متاخر و مابعد ہی کے تحت ہوگا، اور اسی کو مفسرین اپنی اصطلاح میں ایک آیت کا دوسری آیت سے منسوخ ہو جانا کہتے ہیں۔ جائداد کی تقسیم اب آیت میراث کے بموجب ہوگی اور وصیت کا اب کوئی محل نہ رہا بجز جائداد کے ایک ثلث کے کہ اتنے میں وصیت چل سکتی ہے اور اس کی تصریح بھی اسی سورۃ النساء کی آیت میراث میں موجود ہے۔
وَصِيَّةٌ کے لفظی معنی نصیحت کے ہیں، اصطلاح شریعت میں اس سے مراد وہ ہدایتیں ہوتی ہیں جو وصیت کر جانے والے کی موت کے بعد قابل عملدرآمد ہوتی ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ وصیت کی بھی کئی قسمیں ہیں:۔
(۱) بعض وصیتوں کی تعمیل درجۂ واجب میں ہے مثلاً ادائے زکوٰۃ و کفارہ کی وصیت یا ادائے امانات یا ادائے قرض کی وصیت (۲) بعض مستحب کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً کسی کار خیر کے لئے وصیت کر جانا، یا کسی ایسے عزیز کو میراث دے جانا جسے حصہ نہ پہنچ رہا ہو (۳) بعض صرف مباح ہوتی ہیں جیسے کسی امر جائز کے لئے وصیت کر جانا (۴) ان کے علاوہ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی تعمیل ممنوع ہے، وہ وصیتیں کالعدم سمجھی جائیں گی مثلاً کسی کافر حربی کے حق میں یا کسی فعل حرام کے لئے وصیت کر جانا (۵) اور بعض وصیتیں موقوف کہلاتی ہیں، ان کی تعمیل شرط کے ساتھ متعلق ہوتی ہے مثلاً ترکہ کے ایک ثلث سے زائد میں وصیت کر جانا، اس کی تعمیل دوسرے ورثاء کی رضامندی پر موقوف رہے گی۔
اَلْوَصِيَّةُ یہاں اَلْإِيصَاءُ کے معنی میں ہے، اور اسی معنی کا لحاظ کر کے اس کے لئے فعل مذکر (كُتِبَ) لایا گیا ہے ورنہ اصل قاعدہ کے لحاظ سے فعل مؤنث (كُتِبَتْ) آنا چاہئے تھا، اور تاءِ تانیث کے حذف کی ایک وجہ یہ بھی

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ

پھر جو کوئی اُسے اُس کے سُننے کے بعد بدل ڈالے، سو اُس کا گناہ بس اُن ہی پر ہوگا جو اُسے بدل ڈالیں [۶۴۴]

بیان کی گئی ہے کہ اسم وصیت اپنے فعل سے بہت فاصلہ پر ہے اور اتنا فاصلہ حائل ہو جانے پر محاورۂ زبان میں فعل کی تاءِ تانیث حذف ہو جاتی ہے۔ (قرطبی)

خَيْرًا۔ خیر کے ایک معنی علاوہ مشہور معنی کے مالِ طیب کے بھی آتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں اس استعمال کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں، مثلاً قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ (سورۂ بقرہ) وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (سورۂ بقرہ) وقس علیٰ ھذا۔

بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں خیر مال ہی کے معنی میں ہے۔

اَلْخَيْرُ هٰهُنَا الْمَالُ مِنْ غَيْرِ خِلَافٍ (قرطبی) قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ اِنَّمَا سُمِّيَ الْمَالُ هٰهُنَا خَيْرًا تَنْبِيْهًا عَلٰى مَعْنًى لَطِيْفٍ وَهُوَ اَنَّ الَّذِيْ يَحْسُنُ الْوَصِيَّةُ بِهٖ مَا كَانَ مَجْمُوْعًا مِنَ الْمَالِ مِنْ وَجْهٍ الْمَحْمُوْدِ (راغب) اي مالاً كما قاله ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ (روح) اَيْ مَالًا قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَعَطَاءٌ وَسَعِيْدُ ابْنُ جُبَيْرٍ وَاَبُو الْعَالِيَةِ وَعَطِيَّةُ الْعَوْفِيُّ وَالضَّحَّاكُ وَالسُّدِّيُّ وَالرَّبِيْعُ ابْنُ اَنَسٍ وَمُقَاتِلُ بْنُ حَيَّانَ وَقَتَادَةُ وَغَيْرُهُمْ (ابن کثیر)

ایک گروہ نے لفظ وجوب سے استناد کر کے کہا ہے کہ کچھ نہ کچھ وصیت بہرحال کر جانا چاہیے، دوسرے گروہ نے آیتِ میراث کی موجودگی میں اسے بالکل غیر ضروری ٹھہرایا ہے، امام نخعیؒ کا قول اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے دونوں قسم کے اُسوۂ حسنہ موجود ہیں، ابوبکر صدیقؓ وصیت کر گئے تھے، لیکن خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی وصیت نہیں فرمائی۔

وَقَالَ النَّخَعِيُّ مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُوْصِ وَقَدْ اَوْصٰى اَبُوْبَكْرٍ فَاِنْ اَوْصٰى فَحَسَنٌ فَاِنْ لَّمْ يُوْصِ فَلَا عَلَيْهِ شَيْءٌ (قرطبی)

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی پسندیدہ طریقہ پر، عقل کی رعایت سے، حاجت کا لحاظ کر کے، حسنِ معاشرت و حسنِ معاملت دونوں قسم کے احکام کے موقع پر قرآن مجید میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ مُتَّقِیْنَ سے یہاں مُراد مؤمنین ہیں، ان کے وصفِ تقویٰ کا ذکر کر کے مُراد خود ان ہی سے لی گئی ہے۔

مُرَادُ بِالْمُتَّقِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّقَوُا الْكُفْرَ (بحر) وَالْمُرَادُ بِالْمُتَّقِيْنَ الْمُؤْمِنُوْنَ (روح)

۶۴۴ (نہ کہ حاکموں پر جو عالم الغیب نہیں ہوتے بلکہ گواہوں کے بیانات ہی پر فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہیں)

بَدَّلَهٗ اور سَمِعَهٗ دونوں میں ضمیر وصیت کی طرف ہے۔

وَالضَّمِيْرُ فِيْ بَدَّلَهٗ يَرْجِعُ اِلَى الْاِيْصَاءِ وَكَذٰلِكَ الضَّمِيْرُ فِيْ سَمِعَهٗ۔ (قرطبی)

یعنی جن گواہوں کے سامنے وصیت کی گئی کہ فلاں فلاں عزیز کو اتنا اتنا حصہ ملے اور وہ گواہ اُس میں اپنی طرف سے کچھ قطع و برید کر دیں جس سے بعض کی حق تلفی لازم آتی ہے۔

اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ۔ یہ حاکموں، قاضیوں کو اطمینان دلایا ہے کہ تمھارا اس غلط اجراء میں

إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا

بے شک اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا جاننے والا ہے ۶۴۵ البتہ جس کسی کو وصیت کرنے والے سے متعلق کسی بے عنوانی یا گناہ کا

فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ

علم ہو جائے ۶۴۶ پھر وہ ان لوگوں کے آپس میں صلح کرا دے ۶۴۷ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ۶۴۸

کیا قصور، قصور تو بس انہی جھوٹے گواہوں کا ہے۔

۶۴۵ سَمِيعٌ۔ اس پر خوب روشن ہے کہ گواہوں نے کس طرح جھوٹ سے کام لیا، اور اصل وصیت میں کیا کیا کتر بیونت کی۔
عَلِيمٌ۔ اس پر خوب روشن ہے کہ قاضی یا ثالث ایسے موقع پر کیسا معذور و بے بس ہوتا ہے۔

۶۴۶ (اور وہ اس بناء پر ازراہ اخلاص و خیر خواہی وصیت میں تبدیلی کر دے جس سے اُس بے ضابطگی یا معصیت کی اصلاح ہو جائے)
خَافَ۔ خوف عربی میں ہمیشہ اندیشہ اور ڈر کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ کبھی علم کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں بھی یہی معنی مراد ہیں
أَيْ فَمَنْ تَوَقَّعَ وَعَلِمَ وَهٰذَا فِي كَلَامِهِمْ شَائِعٌ (کشاف) وَالْخَوْفُ وَالْخَشْيَةُ الْعِلْمُ (کبیر) وَمَعْنٰى
خَافَ تَوَقَّعَ وَعَلِمَ (روح) أَيْ قَدْ ظَهَرَ لَهُ مِنْ أَحْوَالِ الْمُوصِي مَا يَغْلِبُ مَعَهُ عَلَى ظَنِّهِ أَنَّهُ يُرِيدُ
الْجَوْرَ وَصَرْفَ الْمِيرَاثِ عَنِ الْوَارِثِ۔ (جصاص)

جَنَفًا۔ جنف کہتے ہیں نادانستہ غلطی یا بے ضابطگی کو، مراد ہے سہو یا خطائے فہم سے۔
الْجَنَفُ الْخَطَاءُ (ابن جریر عن ابن عباس) الْجَنَفُ الْخَطَاءُ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُ بِهِ (کبیر) الْمَيْلُ عَنِ الْحَقِّ بِالْخَطَاءِ (کشاف)

إِثْمًا۔ یعنی دانستہ غلطی کھلی ہوئی حق تلفی جس پر گناہ کا اطلاق ہو سکے۔
الْإِثْمُ الْعَمْدُ (ابن جریر۔ عن ابن عباس) الْإِثْمُ هُوَ الْعَمْدُ (کبیر)

۶۴۷ (مضمون وصیت میں ترمیم کر کے اور وارثوں کی حق تلفیوں کو دور کر کے)
بَيْنَهُمْ۔ میں ضمیر جمع غائب وارثوں کی جانب ہے۔
أَيْ بَيْنَ الْمُوصٰى لَهُمْ (روح) أَلْكِنَايَةُ عَنِ الْوَرَثَةِ۔ (قرطبی)

یعنی وصیت اگر بے ضابطہ ہے یا خلاف قاعدۂ شرعی ہے اور کوئی شخص وارثوں کے درمیان وقوع نزاع یا احتمال نزاع ہی دیکھ کر مضمونِ وصیت میں ایسی ترمیم کر دے جس سے حق تلفیوں کی اصلاح ہو جائے اور وارثوں میں باہم مصالحت ہو جائے۔ بعض فقہاء نے اس حکم کے ماتحت وسعت دے کر کہا ہے کہ حکم صرف وصی اور گواہانِ وصیت اور حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں، اُمت کا ہر فرد اس پر عمل کر سکتا ہے۔
فَمَنْ خَافَ مِنْ سَائِرِ النَّاسِ مِنْ مَيْلِ عَنِ الْحَقِّ وَعُدُولٍ إِلَى الْجَوْرِ فَالْوَاجِبُ عَلَيْهِ إِرْشَادُهُ
إِلَى الْعَدْلِ وَالصَّلَاحِ (جصاص) الْخِطَابُ لِجَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ (ابن العربی)

اس لئے کہ اس حکم کا تعلق باب امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے ہے، اور وہ ساری اُمت پر فرض ہے۔
وَلَا يَخْتَصُّ بِذٰلِكَ الشَّاهِدُ وَالْوَصِيُّ وَالْحَاكِمُ دُونَ سَائِرِ النَّاسِ لِأَنَّ ذٰلِكَ مِنْ بَابِ الْأَمْرِ

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٨٢﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ

بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنے والا ہے بڑا رحم کرنے والا ہے ۶۴۹ اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ۶۵۰

الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾

جیسا کہ اُن لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں ۶۵۱ عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ ۶۵۲

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ (جصاص) لِأَنَّ إِصْلَاحَ الْفَسَادِ فَرْضٌ عَلَى الْكِفَايَةِ (ابن العربی)

فقہاء نے اس آیت سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ غلبۂ ظن کے بعد رائے وعمل کا اجتہاد جائز ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وصیّت کرنے والے کی طرف سے ظلم وزیادتی کا اندیشہ تو ظنِ غالب ہی کے حکم میں رہے گا۔

وَفِيْهَا الدَّلَالَةُ عَلَى جَوَازِ الْإِجْتِهَادِ وَالرَّأْيِ وَالْعَمَلِ عَلَى غَالِبِ الظَّنِّ لِأَنَّ الْخَوْفَ مِنَ الْمَيْلِ يَكُوْنُ فِي غَالِبِ ظَنِّ الْخَائِفِ (جصاص) وَفِيْ هٰذَا دَلِيْلٌ عَلَى الْحُكْمِ بِالظَّنِّ (ابن العربی) وَفِيْ هٰذِهِ الْآيَةِ دَلِيْلٌ عَلَى أَنَّ الْحُكْمَ بِالظَّنِّ لِأَنَّهُ إِذَا ظَنَّ قَصْدَ الْفَسَادِ وَجَبَ السَّعْيُ فِي الصَّلَاحِ۔ (قرطبی)

۶۴۸ (اس تبدیل وترمیم مضمونِ وصیّت کے باب میں)

بلکہ وہ تو اور مستحق اجر وثواب کا ہوگا۔

لِأَنَّهُ تَبْدِيْلُ بَاطِلٍ إِلَى حَقٍّ (مدارک۔ بیضاوی)

۶۴۹ اللہ تو گنہگاروں تک کے حق میں غفور و رحیم ہے چہ جائیکہ یہ شخص جو گنہگار ہے بھی نہیں بلکہ اپنی سعی اصلاح میں تو مطیعِ حکم اور مستحقِ اجر ہے۔

غَفُوْرٌ۔ یعنی گناہوں کا بخشنے والا۔

رَحِیْمٌ۔ یعنی خطاکاروں کے حال پر رحم کرنے والا۔

۶۵۰ صیام (روزہ رکھنا) مصدر ہے باب نصر سے۔

صَوْم۔ یا روزہ اصطلاحِ شریعت میں اُسے کہتے ہیں کہ انسان طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک اپنے کو کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے روکے رہے، جو روزے فرض ہیں وہ ماہِ رمضان کے ہیں، غیبت، فحش، بدزبانی وغیرہ زبان کے تمام گناہوں سے روزہ میں بچے رہنے کی سخت تاکید بار بار حدیث میں آئی ہیں، جدید وقدیم سب طبیب اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کے دُور کرنے کا بہترین علاج اور جسمِ انسانی کے لئے ایک بہترین مصلح ہے پھر اس سے سپاہیانہ ہمت اور ضبطِ نفس کی روح جو ساری اُمت میں تازہ ہو جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین نسخہ ہے۔

۶۵۱ روزہ کسی نہ کسی صورت میں تو دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم کی جلد ۹ ص۱۰۱ اور جلد ۱۰ ص۱۹۳ سے ظاہر ہے لیکن قرآن شریف کا مذہبوں سے بحث نہیں کرتا۔ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ سے اس کی اصل مُراد اہلِ کتاب ہی سے ہو سکتی ہے چنانچہ اہلِ نظر مفسّرین بھی اسی طرف گئے ہیں:

یَعْنِیْ بِذٰلِکَ أَھْلَ الْکِتَابِ (ابن کثیر) قِیْلَ ھُمْ أَھْلُ الْکِتَابِ (ابن العربی)

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ

(یہ روزے) گنتی کے چند روز کے (ہیں) ۶۵۳ پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو ۶۵۴ یا سفر میں ہو ۶۵۵

فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) ۶۵۶

اور یہی قول ابن جریر نے مجاہد تابعی سے نقل کیا ہے، اور جصاص نے مجاہد کے ساتھ قتادہ کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے۔ روزہ شریعت موسوی کا ایک اہم اور مشہور جزو ہے۔ مذاہب عالم سے اتنی گہری واقفیت کہ صاف صاف ان میں روزہ کے جزو مذہب ہونے کی خبر دے دی، ڈاک اور ریل کے زمانہ سے صدیوں قبل، ور اخبارات اور کتب خانوں کے دور سے ہزار بارہ سو سال پیشتر، عرب جیسے دور افتادہ اور دنیا کے ہر ملک سے بے تعلق جزیرہ نما میں ایک امی کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔ بجز وحی الٰہی کے ذریعہ کے۔ کَمَا، یہ تشبیہ دوسری ملتوں کے ساتھ صرف فرضیت صیام میں ہے، نہ کہ تعداد و شرائط صیام میں۔

هُوَ تَشْبِيهُ الْفَرْضِيَّةِ وَلَا يَدْخُلُ فِيهِ الْكَيْفِيَّةُ وَالْكَمِّيَّةُ (المنار)

۶۵۲ روزہ تعمیل ارشاد خداوندی میں تزکیۂ نفس و تربیت جسم دونوں کا ایک بہترین دستور العمل ہے، اشخاص کے انفرادی اور امت کے اجتماعی ہر دو نقطۂ نظر سے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کے ارشاد سے اسلامی روزہ کی اصل غرض و غایت کی تصریح ہو گئی کہ اس سے مقصود تقویٰ کی عادت ڈالنا اور امت و افراد کو متقی بنانا ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے۔ جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے احتیاط رکھنے سے جسمانی صحت درست ہو جاتی ہے اور مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، بھوک خوب کھل کر لگنے لگتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، اسی طرح اس عالم میں تقویٰ اختیار کر لینے سے (یعنی جتنی عادتیں صحت روحانی و حیات اخلاقی کے حق میں مضر ہیں ان سے بچے رہنے سے) عالم آخرت کی لذتوں اور نعمتوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت و استعداد انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی روزہ کی افضلیت تمام دوسری قوموں کے رکھے ہوئے روزوں پر علانیہ ثابت ہوتی ہے، اور غیر مشرک قوموں کے ناقص ادھورے اور برائے نام روزوں کا تو ذکر ہی نہیں، خود مسیحی اور یہودی روزوں کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ یا تو کسی بلا کو دفع کرنے کے لیے رکھے جاتے ہیں یا کسی فوری کام خصوص روحانی کیفیت کے حاصل کرنے کو۔ یہود کی قاموس اعظم جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"قدیم زمانہ میں روزہ یا تو بطور علامت ماتم کے رکھا جاتا تھا، اور یا جب کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا، اور یا پھر جب سالک اپنے میں تجلی الہام کی استعداد پیدا کرنا چاہتا تھا۔" (جلد ۵ صفحہ ۳۴۷)

اسلام میں روزہ نام ہے اپنے قصد و ارادہ سے ایک مدت معین تک کے لیے اپنی جائز اور طبعی خواہشوں کی تکمیل سے دستبرداری کا۔ اور اس سے ایک طرف طبی اور جسمانی، دوسری طرف روحانی اور اخلاقی جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، فرد اور امت دونوں کو، ان کی تفصیل کی گنجائش تو یہاں بہرحال نہیں، اس نا چیز کی متعدد تحریریں اس موضوع پر چھپ کر اور چھپ میں چھپ چکی ہیں، اور مختصر طور پر اسی سورہ کے اخیر میں نقل کی جا رہی ہیں۔

۶۵۳ یعنی ان فرض روزوں کی ایک متعین تعداد ہے جیسا کہ ایک سلیم طبع یا باقاعدگی کا اقتضا ہے، یہ نہیں کہ

جب جس کا جی چاہے جتنے دنوں کے لیے رکھ ڈالے، وحدتِ اُمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ ایک متعین زمانہ متعین حدود کے ساتھ ساری اُمت کے لیے مقرر ہو، ضمناً یہ پہلو بھی نکل آیا کہ ان فرض روزوں کی تعداد کچھ بہت بڑی نہیں، نہیں کہ سال سال بھر روزے رکھتے ہی چلے جاؤ، چھ مہینے نہ تین مہینے بلکہ سال بھر میں کل اُنتیس ۲۹ یا تیس ۳۰ دن۔

۶۵۴ (اور بیماری کے باعث روزہ اس پر شاق ہو)

[illegible] (رمد ارشد)

بیماری کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بیماری بہت شدید بھی ہو سکتی ہے اور بہت خفیف بلکہ نام ہی کو ہو سکتی ہے، اور پھر موسم، عمر، جثہ وغیرہ کے اختلافات بھی نظر انداز نہ ہونے چاہییں، یہاں مراد ایسی بیماری ہے جو روزہ رکھنے سے بڑھ جاتی ہو، یا جس کے ساتھ روزہ رکھنے میں شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑے، اگر روزہ رکھا ہی نہ جا سکتا ہو جب تو قضائے روزہ یعنی افطار واجب ہے، اور اگر رکھا تو جا سکتا ہو لیکن ضرر و تعب کے ساتھ تو قضائے روزہ یعنی افطار مستحب ہے۔

[illegible] (قرطبی، ابن العربی)

مرض کی مدت یا شدت میں اضافہ کے اندیشہ سے جمہور علماء کے نزدیک افطار جائز ہے۔

[illegible] (معالم)

ابن سیرین ایک حد تک بھی گئے ہیں ان کی بابت یہ روایت قرطبی، معالم وغیرہ میں طریف بن تمام العطاردی کی زبانی درج ہے کہ میں رمضان میں اُن کے ہاں گیا تو وہ کھا پی رہے تھے، وہ جب فارغ ہو چکے تو مجھ سے بولے کہ میری اس انگلی میں درد تھا۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ خفیف مرض میں بھی افطار کی گنجائش ہے، انہیں ابن سیرین کا یہ قول بھی قرطبی وغیرہ میں نقل ہوا کہ جیسے جب کسی انسان پر مسافر کا اطلاق ہونے لگے اسی طرح جب کسی پر مریض کا اطلاق ہونے لگے وہ اس کے لیے افطار جائز ہو جاتا ہے، عطاء تابعی کا بھی قول قرطبی میں نقل ہوا ہے کہ ان سے جب سوال کیا گیا کہ افطار کس مرض میں جائز ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جو بھی مرض ہو، اور عطاء تابعی ہی کے سلسلہ میں خود امام بخاری سے قرطبی نے یہ حکایت نقل کی ہے کہ میں نیشاپور میں مخصوص طور پر رمضان میں بیمار تھا۔ [illegible] اور میں نے روزہ نہیں رکھا اور عبداللہ بن رجاء، پھر کچھ لوگوں کے ساتھ مجھے دیکھنے آئے تو اُن سے میں نے یہی کہہ دیا۔ خود قرطبی نے ابن سیرین کے مسلک کی تائید کی ہے، [illegible] حسن بصری و ابراہیم نخعی سے یہ قول نقل ہوا ہے کہ جس مرض میں نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے اُس میں روزہ کے بجائے افطار بھی جائز ہے۔

[illegible] (مدارک)

جصاص رازی نے لکھا ہے کہ آیت کے ظاہر الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی مریض ہو اُس کے لیے افطار درست ہے خواہ اس سے کہ روزہ اس کے لیے مضر ہو یا نہ ہو، لیکن فقہائے اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ افطار جائز اُس مریض کے لیے ہے جسے روزہ سے مرض بڑھ جانے کا احتمال ہو، ورنہ افطار جائز نہیں۔

ثبت بما وصفنا أن الرخصة في الإفطار لمريض موقوفة على زيادة المرض بالصوم وأنه لم يخش الضرر بفعله أن يصوم (جصاص). ثم لا نعلم خلافا أن المريض الذي لا يضره الصوم غير مرخص له في فطر. وقال أبو حنيفة وأبو يوسف ومحمد إذا خاف أن تزداد عينه وجعا أو حماه شدة أفطر (جصاص)

خلاصہ یہ کہ بیماری کی متعین حد شریعت نے نہیں بتائی، ہر مریض اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے لئے اپنے ضمیر و دیانت کی روشنی ہی میں فیصلہ کر سکتا ہے۔

۶۵۵ سفر کی بھی کوئی متعین حد جس کے بعد افطار جائز یا ضروری ہو جائے، قرآن و حدیث میں موجود نہیں، البتہ فقہائے امت نے اندازے مقرر کئے ہیں اور ان اندازوں میں اختلاف فاصلہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے شروع ہی سے چلا آتا ہے، کسی نے فاصلہ کا معیار ۴۸ میل کا رکھا ہے، کسی نے ۱۶ فرسخ کا، اسی طرح مدت کے لحاظ سے بھی کسی کا قول ایک دن رات کے سفر کے حق میں ہے، کسی کا دو دن اور کسی کا تین دن کے حق میں۔

اختلف العلماء في السفر الذي يجوز فيه الفطر والقصر ... واختلف العلماء في قدر ذلك فقال مالك يوم وليلة ثم رجع فقال ثمانية وأربعون ميلا ... وقال ابن عمر وابن عباس والثوري الفطر في سفر ثلاثة أيام (قرطبي) والذي في البخاري وكان ابن عمر وابن عباس يفطران ويقصران في أربعة برد وهي ستة عشر فرسخا (قرطبي) وأباح الله تعالى للمسافر الإفطار وليس للسفر حد معلوم في اللغة يفصل به بين أقله وبين ما هو دونه واختلفوا فيه فقال أصحابنا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها وقال آخرون مسيرة يومين وقال آخرون مسيرة يوم (جصاص) فقال مالك والشافعي أقل السفر يوم وليلة وقال أبو حنيفة أقله ثلاثة أيام (ابن العربي) ولم يرد فيه من الشرع نص (ابن عربي)

وقت و مسافت کے اختلافات سے قطع نظر، حدیث نبوی سے ترجیح حالت سفر میں افطار ہی کی معلوم ہوتی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں تو جیسے روزہ رکھنا مسافر کے لئے ایک جرم ہے، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:۔

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج عام الفتح إلى مكة في رمضان فصام حتى بلغ كراع الغميم فصام الناس ثم دعا بقدح من ماء فرفعه حتى نظر الناس إليه ثم شرب فقيل له بعد ذلك إن بعض الناس قد صام فقال أولئك العصاة أولئك العصاة۔ (مسلم، ترمذی)

فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں مکہ کی طرف چلے اور روزہ رکھا یہاں تک کہ مقام کراع الغمیم پہونچ گئے لوگ روزہ سے تھے تو آپ نے پانی کا پیالہ منگایا اور اس کو اوپر اٹھایا یہاں تک کہ لوگوں نے اسے دیکھ لیا، اس کے بعد آپ نے پانی نوش فرمایا پھر آپ کو اطلاع پہونچی کہ بعض لوگ اب بھی روزے سے ہیں (یعنی انھوں نے افطار نہیں کیا) تو آپ نے فرمایا کہ وہ گنہگار ہیں، گنہگار ہیں۔

اور اسی سے ملتی ہوئی ایک حدیث بخاری و مسلم اور مؤطا وغیرہ میں ابن عباسؓ سے روایت ہوئی ہے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت میں تو یہاں تک آگیا ہے کہ:۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم صائم رمضان في السفر كالمفطر في الحضر۔ (ابن ماجہ)

سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گھر میں بیٹھنے والا روزہ نہ رکھے۔

اور حضرت جابرؓ ہی سے یہ مروی ہے کہ :۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَرَاٰى رَجُلًا قَدِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ وَقَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَالَهٗ فَقَالُوْا رَجُلٌ صَائِمٌ فَقَالَ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تَصُوْمُوْا فِي السَّفَرِ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں اور اُس پر سایہ کئے ہوئے ہیں آپ نے پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ یہ روزہ رکھے ہوئے ہے آپ نے فرمایا کہ سفر کی حالت میں روزہ رکھنا کوئی طاعت نہیں۔

بہ حیثیت مجموعی مسافر کے لئے بھی مریض ہی کی طرح حکمِ شریعت یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر بلا زحمت معتد بہ ممکن ہو تو روزہ رکھ ہی لیا جائے اگر زحمت و تعب معتد بہ ہو تو قضا کر دینا جائز ہے اور اگر نوبت ہلاکت ہی کی آئی جاتی ہے تو ترکِ صوم واجب ہو جائے گا۔

باقی اختلافِ مذاق و مسلک اس باب میں شروع سے چلا آ رہا ہے صوم و افطار دونوں کے جواز پر مسافر کے لئے تو سب قائل ہیں۔

يَجُوْزُ لِلْمُسَافِرِ اَنْ يُّفْطِرَ اَوْ اَنْ يَّصُوْمَ۔ (بحر)

اختلاف جو کچھ ہے وہ اس میں ہے کہ افضل کون سا پہلو ہے سو بعض صحابہ اور اکثر ائمۂ فقہ افضلیتِ صوم کے قائل ہیں۔

وَاخْتَلَفُوْا فِي الْاَفْضَلِ فَذَهَبَ اَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَصْحَابُهٗ وَمَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ فِي بَعْضِ مَا رُوِيَ عَنْهُمَا اِلٰى اَنَّ الصَّوْمَ اَفْضَلُ وَبِهٖ قَالَ مِنَ الصَّحَابَةِ عُثْمَانُ بْنُ اَبِي الْعَاصِ الثَّقَفِيُّ وَاَنَسُ بْنُ مَالِكٍ۔ (بحر)

اس کے مقابلہ میں بعض اجلّۂ صحابہ اور متعدد تابعین و فقہاء افضلیتِ افطار کی طرف گئے ہیں۔

وَذَهَبَ الْاَوْزَاعِيُّ وَاَحْمَدُ وَاِسْحَاقُ اِلٰى اَنَّ الْفِطْرَ اَفْضَلُ وَبِهٖ قَالَ مِنَ الصَّحَابَةِ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَمِنَ التَّابِعِيْنَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ وَالشَّعْبِيُّ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَمُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ (بحر) نَقَلَ ذٰلِكَ ابْنُ عَطِيَّةَ عَنْ عُمَرَ وَابْنِهٖ عَبْدِ اللّٰهِ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ الْفِطْرَ فِي السَّفَرِ عَزِيْمَةٌ۔ (بحر)

۶۵۲ (اگر اس بیماری یا سفر کے دوران میں روزے چھوٹ گئے ہیں۔)

اور ان کی تعداد گن کر مرض یا سفر کے بعد پوری کر لی جائے، عام اہلِ سنت نے اس حکم کو صرف رخصت یا اجازت کے معنی میں لیا ہے لیکن ظاہریہ اس کے وجوب کے قائل ہیں اور صحابیوں میں یہی مسلک حضرت ابوہریرہؓ کی جانب منسوب ہے۔

فَحُمِلَ عَلٰى سَبِيْلِ الرُّخْصَةِ وَقِيْلَ عَلَى الْوُجُوْبِ وَاِلَيْهِ ذَهَبَ الظَّاهِرِيَّةُ وَبِهٖ قَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ (بیضاوی) فَرُوِيَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ مَنْ صَامَ فِي السَّفَرِ فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ تَابَعَهٗ عَلَيْهِ شَوَاذُّ مِنَ النَّاسِ (بحر)

اور تابعین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ دونوں میں سے جو آسان تر ہے، وہی افضل بھی ہے۔

وَقَالَ مُجَاهِدٌ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَغَيْرُهُمَا اَيْسَرُهُمَا اَفْضَلُهُمَا (بحر) وَقَالَتْ طَائِفَةٌ اَفْضَلُ الْاَمْرَيْنِ اَيْسَرُهُمَا وَهُوَ قَوْلُ مُجَاهِدٍ وَقَتَادَةَ وَعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ۔ (معالم)

ایک گروہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے یہ بھی کہا ہے کہ مسافر کے لئے روزہ ہے ہی نہیں اُسے ہمیشہ قضا ہی رکھنا چاہیے، اس لئے کہ آیت میں حکم مطلق صورت میں ہے، اور حدیثِ نبوی لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ سے اس کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔

اِسْتَدَلَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ مَنْ قَالَ اَنَّ الصَّوْمَ لَا يَنْعَقِدُ فِي السَّفَرِ وَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ اَبَدًا..... اَيْ فَعَلَيْهِ

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ؕ

اور جو لوگ اُسے مشکل ہی سے برداشت کر سکیں[۶۵۶] اُن کے ذمہ فدیہ ہے (کہ وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے[۶۵۷]

عنہ ولا حذف فی الکلام ولا اضمار ویقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لیس من البر الصیام فی السفر قال ما لم یکن من البر فھو من الاثم فبدل ذالک علی ان صوم رمضان لا یجوز فی السفر۔ (قرطبی)

۶۵۶ یعنی روزہ رکھنے کو رکھ تو ڈالیں لیکن روزہ کا تحمل انھیں دشواری ہی سے ہو سکے مشقت بہت اٹھانی پڑے، جیسے زیادہ بوڑھے اشخاص، یا حاملہ اور مرضعہ عورتوں کے لئے گویا ہوتا ہے۔

یُطِیْقُوْنَہٗ میں ضمیر ہ صوم کی طرف ہے۔

وعلی المطیقین للصیام (بیضاوی۔ مدارک۔ روح) قال الفراء یجوز ان تعود علی الصیام (قرطبی)

فالقائلون ھو شرط علی الصوم وقد ان الھاء راجعۃ الی الفدیۃ والاول اصح۔ (جصاص)

آیت میں اشکال اس لئے پیش آیا ہے کہ یُطِیْقُوْنَہٗ کے مصدر طاقۃ اور وسعۃ کے درمیان فرق نظرانداز ہو گیا، دونوں لفظوں کا مفہوم لغت میں الگ الگ ہے وسعۃ اردو کے مفہوم "امکان" کے مرادف ہے اور طاقۃ میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کام، کرنے والے کی قدرت میں تو ہو لیکن اس کے کرنے میں تعب بہت زائد اٹھانا پڑے، کام ہونے کو ہو تو جائے لیکن بمشکل تمام ہو پائے عربی میں طاقۃ اور استطاعۃ دونوں کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔

ھو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعلہ بمشقۃ منہ (تاج)۔ الطاقۃ اسم لمقدار ما یمکن للانسان ان یفعلہ بمشقۃ (راغب) الوسع فوق الطاقۃ فالوسع اسم لمن کان قادرا علی الشیء علی وجہ السھولۃ واما الطاقۃ فھو اسم لمن کان قادرا علی الشیء مع الشدۃ والمشقۃ (کبیر) وھو من لا یستطیع الصوم الا بمشقۃ شدیدۃ۔ (المنار)

قال الاستاذ الامام الاطاقۃ ادنی درجات المکنۃ والقدرۃ علی الشیء فلا تقول العرب اطاق الشیء الا اذا کانت قدرتہ علیہ فی نھایۃ الضعف بحیث یتحمل بہ مشقۃ شدیدۃ (المنار)

اور یہاں طاقۃ کا مادہ استعمال ہوا ہے جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ "وہ لوگ جو تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکیں، مثلاً بوڑھے اور بوڑھیاں، حاملہ اور مرضعہ"۔

ای یصومونہ جھدھم وطاقتھم ومبلغ وسعھم (کشاف) ای الذین یصومونہ علی الصوم مع الشدۃ والمشقۃ (کبیر) فیصیر المعنی وعلی الذین یصومونہ مع الشدۃ والمشقۃ ویتمل نحو الحبلی والمرضع (روح) یطوقونہ او یتکلفونہ علی جھد منھم وعسر وھم الشیوخ والعجائز (کشاف) فالمراد بالذین یطیقونہ ھنا الشیوخ الضعفاء والحوامل والمراضع ..... وروی البخاری ان ابن عباس حمل الایۃ علی الشیخ والشیخۃ۔ (المنار)

اور ابن عباسؓ کی قرأت میں تو یُطَوَّقُوْنَہٗ ہے جو صاف مرادف یُکَلَّفُوْنَہٗ کا ہے۔

ومشھور قراءۃ ابن عباس یطوقونہ بفتح الطاء وتشدید الواو بمعنی یکلفونہ (قرطبی)

تابعین بلکہ صحابیوںؓ کی متعدد روایتوں میں اس سے مراد بوڑھے اور بوڑھیاں ہی لی گئی ہیں اور متعدد مفسروں نے بھی یہی سمجھا ہے اور آیت کے منسوخ قرار دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ

اور جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے ۶۵۹ اُس کے حق میں بہتر ہے

هو الشيخ والشيخة (ابن جرير عن علي) نزلت هذه الآية في حق الشيخ الهرم كس قال ابن عباس ليست منسوخة هو الشيخ الكبير والمرأة الكبيرة لا يستطيعان أن يصوما (ابن كثير عن عطاء) روى أبو داؤد عن ابن عباس وعلى الذين يطيقونه قال أثبتت للحبلى والمراضع (قرطبي) فروى عنه أيضا أنه قال وعلى الذين يطيقونه فدية طعام ليست بمنسوخة هو الشيخ الكبير والمرأة الكبيرة لا يستطيعان أن يصوما فيطعما مكان كل يوم مسكينا وهذا الصحيح (قرطبي) وحكم هؤلاء الإفطار والفدية وهو على هذا القول محكمة ثابتة غير منسوخ.

مفسر قرطبی کا فیصلہ اس باب میں تو یہ ہے کہ ابن عباسؓ کا قول سند صحیح سے ثابت ہے کہ آیت منسوخ نہیں بلکہ جن کے حق میں نازل ہوئی ہے محکم ہے۔

فقد ثبت بالأسانيد الصحاح عن ابن عباس أن الآية ليست بمنسوخة وأنها محكمة في حق من ذكر.

اور یہی مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔

عن ابن عباس أنه قال رخص للشيخ الكبير أن يفطر ويطعم ولا قضاء عليه فهذا الظاهر في معنى الآية وهو مذهب الشافعية في الشيوخ والعجائز ومن في حكمهم. (المنار)

۶۵۸ یعنی جن بوڑھوں، بوڑھیوں، ناتوانوں کے لئے روزہ رکھنا بہت تعب کا باعث ہوا نہیں پورا اختیار ہے کہ بجائے روزہ رکھنے کے افطار کرتے رہیں اور ایک نادار کو روز کھانا کھلا دیا کریں۔

وأجمعوا على أن المشائخ والعجائز الذين لا يطيقون الصيام أو يطيقونه على مشقة شديدة أن يفطروا (قرطبي)

بلکہ بعض ائمۂ فقہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کے ذمہ کوئی فدیہ واجب نہیں۔

واختلفوا فيما عليهم فقال ربيعة ومالك لا شيء عليهم غير أن مالكا قال لو أطعموا كل يوم مسكينا كان أحب إلي (قرطبي)

لیکن امام ابو حنیفہؒ اور متعدد صحابہؓ و تابعین کا مذہب یہ ہے کہ فدیہ دیتے رہیں۔

وقال أنس وابن عباس وقيس بن سائب وأبو هريرة عليهم الفدية وهو قول الشافعي وأصحاب الرأي وأحمد وإسحاق اتباعا لقول الصحابة. (قرطبي)

اور امام مالکؒ نے اپنے قول کی دلیل میں یہ کہا ہے کہ ایسے معذوروں کے پاس تو کبر سنی کا خود ایک معقول عذر موجود ہے اس لئے ان پر مسافر و مریض کی طرح کھانا دینا واجب نہیں اور اس مذہب کی تائید اور بھی بعض فقہا نے کی ہے۔

والدليل لقول مالك أن هذا مفطر لعذر موجود فيه وهو الشيخوخة والكبر فلم يلزمه إطعام كالمسافر والمريض. وروي هذا عن الثوري ومكحول واختاره ابن المنذر. (قرطبي)

فدیہ یعنی نادار کو اپنے معاوضہ میں کھانا کھلا دینے میں کھانے کا معیار وہی ہو جو خود روزہ دار کا ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار میں مختلف فقہا سے مختلف قول منقول ہیں لیکن سب سے سستا اور آسان جو قول ہے یہ ہے کہ جتنے میں اس نادار کا پیٹ بھر جائے۔

۶۵۹ (اسی ادائے فدیہ کے باب میں)

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ

اور اگر تم علم رکھتے ہو ۶۶۰ تو تمہارے حق میں بہتر ہے کہ تم روزے رکھو ۶۶۱ ماہ رمضان وہ ہے

الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

جس میں قرآن اُتارا گیا ہے ۶۶۲

یعنی اتنا فدیہ تو بہرحال واجب ہے، اب اگر اس میں کوئی اضافہ کرنا چاہے مثلاً ایک شخص کے بجائے دو شخصوں کو کھلا دے، کھانوں کی تعداد بڑھا دے، کھانے کی قسم بہتر کر دے، فدیہ کے ساتھ روزہ کو بھی جمع کرے تو اور بہتر ہے، صحابہ و تابعین سے یہ سب مختلف صورتیں منقول ہیں۔

خیر، خیرات، فیاضی و سیر چشمی، حسن سلوک و حسن معاشرت کی تاکید تو اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال میں موجود ہے لیکن رمضان کے ماہ مبارک میں اس کی اہمیت اور زیادہ ہے چنانچہ ماہ مبارک کے ختم پر یا ختم سے قبل جو صدقۂ فطر واجب بتایا گیا ہے کہ آس پاس کا کوئی کلمہ گو بھوکا نہ رہنے پائے وہ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیاضی، سخاوت، جود و کرم میں اپنی نظیر آپ تھے تاہم متعدد حدیثوں میں آتا ہے کہ اس ماہ مبارک میں آپ کا جوش کرم اور بڑھ جاتا تھا، اور آپ فیاض سے فیاض تر ہو جاتے تھے۔

۶۶۰ (کہ صوم رمضان کی کیا کیا برکتیں اور فضیلتیں ہیں، اس کے کیا کیا منافع و مصالح ہیں، اور پھر اُن پر کیا کیا اجر مرتب ہوتا ہے)

۶۶۱ (اگرچہ معقول عذر روزہ کو قضا کر دینے یا اس کے بجائے فدیہ دینے کے موجود ہوں)

یہاں خطاب میں وہ تمام طبقے شامل ہیں جن کے لئے بطور معذورین اور گنجائشیں رکھ دی گئی ہیں۔

اس میں ترغیب اور تشویق ہے کہ روزہ رکھنے کے جو منافع اور مصالح ہیں، وہ تو روزہ رکھنے ہی سے حاصل ہوں گے، ہاں معذوروں کے لئے دوسری گنجائشیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔

وَعَلَى الْجُمْلَةِ فَاِنَّهٗ يَقْتَضِى الْحَضَّ عَلَى الصَّوْمِ اَىْ فَاعْلَمُوْا ذٰلِكَ وَصُوْمُوْا۔ (قرطبی)

۶۶۲ یعنی اُترنا شروع ہوا۔

اَىْ اُبْتُدِىَ فِيْهِ اِنْزَالُهٗ (مدارک، بیضاوی، روح) بُدِئَ بِاِنْزَالِهٖ فِيْهِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ (معا)

کل قرآن مجید کا نزول تو بڑی تدریج کے ساتھ کوئی ۲۱۔۲۲ سال کی مدت میں ہوا ہے یہاں مراد ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نزول قرآن کی ابتداء ماہ رمضان میں ہوئی، وحی قرآنی کی سب سے پہلی آیتیں سورۃ العلق کا ابتدائی حصہ ہے اور وہ غار حرا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اسی مہینہ میں نازل ہوئی تھیں (سنہ نبوی تقریباً فسنہ)

بہت سے مفسر اس جانب بھی گئے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول آسمان دنیا پر اسی مہینہ میں ہوا، اور پھر وہاں سے فرشتۂ وحی حضرت جبرئیل کے توسط سے بتدریج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ہوتا رہا۔

اَلْقُرْاٰنُ لغوی معنی میں مقروّ وہ چیز ہے جو پڑھی جائے جیسے پینے والی چیز کو شراب اور لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے ہیں

وَهُوَ بِمَعْنَى الْمَقْرُوْءِ كَالْمَشْرُوْبِ يُسَمَّى شَرَابًا وَالْمَكْتُوْبِ كِتَابًا (قرطبی) وَيُسَمَّى الْمَقْرُوْءُ قُرْآنًا عَلَى عَادَةِ الْعَرَبِ فِيْ تَسْمِيَتِهَا الْمَفْعُوْلَ بِاسْمِ الْمَصْدَرِ كَتَسْمِيَتِهِمْ لِلْمَعْلُوْمِ عِلْمًا وَلِلْمَضْرُوْبِ ضَرْبًا وَلِلْمَشْرُوْبِ شُرْبًا. (قرطبی)

اور اَلْقُرْآن اب اصطلاح میں بطورِ علَم کے اس کتابِ الٰہی کے لئے مخصوص ہوگیا ہے اس لئے بھی کہ یہ مختلف سورتوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔

وَقَدْ خُصَّ بِالْكِتَابِ الْمُنَزَّلِ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَارَ لَهُ كَالْعَلَمِ (راغب) . . . .

ثُمَّ اشْتَهَرَ الْاِسْتِعْمَالُ فِيْ هٰذَا وَاقْتَرَنَ بِهِ الْعُرْفُ الشَّرْعِيُّ فَصَارَ الْقُرْآنُ اِسْمًا لِكَلَامِ اللّٰهِ (روح) وَمَعْنَى الْقُرْآنِ مَعْنَى الْجَمْعِ وَسُمِّيَ قُرْآنًا لِاَنَّهُ يَجْمَعُ السُّوَرَ فَيَضُمُّهَا. (لسان)

جس طرح اَرْض کا اطلاق سارے روئے زمین پر بھی ہوتا ہے اور زمین کے ہر ہر ٹکڑے پر بھی اسی طرح قُرآن کا اطلاق ۳۰ پاروں والی مکمل کتاب پر بھی ہوتا ہے اور اُس کے ہر ہر حصہ پر بھی۔

رَمَضَان سنہ قمری اسلامی کے نویں مہینہ کا نام ہے شریعت نے اعتبار قمری مہینوں کا کیا ہے اور اپنے حساب میں اسی تقویم سے کام لیا ہے قمری مہینے چونکہ مختلف موسموں میں اُدل بدل کرتے رہتے ہیں مسلمان روزہ دار بھی رمضان کی اس گردش سے ہلکی گرمی اور ہلکی سردی، شدید گرمی اور شدید سردی، خشک و تر ہر ہر موسم میں بھوک اور پیاس کے ضبط و تحمل کا خوگر ہو جاتا ہے، روزوں کی تعداد تو شریعت نے مقرر کر ہی دی ہے زمانہ بھی ایک متعین و مقرر ہے، یہ نہیں کہ محض تعداد جس کا جب جی چاہے پوری کرے، انفرادی اصلاح تو شاید ان حسب مرضی متفرق روزوں سے ہو بھی جاتی لیکن اجتماعی منافع و مصالح کے لئے تعداد کی طرح تعیین بھی ناگزیر تھی، وحدتِ اُمت کے لئے لازمی تھا کہ عرب و چین، مصر و ہندوستان، طرابلس و جاپان، حبش و آسٹریلیا، افغانستان اور کناڈا، سائبیریا اور میکسیکو، برطانیہ و ترکیہ، غرض سارے روئے زمین پر اسلامی آبادی جہاں کہیں بھی ہو، سب ایک ہی وقت میں روحانیت کی اس سالانہ پریڈ میں شریک ہو، علم الاجتماع کے ماہرین جانتے ہیں کہ وحدتِ اُمت و تنظیمِ ملت میں کتنا زیادہ دخل اس اہم وقتی یا وقت کی ہم آہنگی کو ہوتا ہے۔

قرآن کی مناسبت رمضان کے ساتھ ہر صاحبِ نظر پر بالکل روشن ہے، اہلِ سنت اسی لئے قرآن مجید کے اس نزول کی سالانہ یادگار اس مہینہ بھر راتوں کو اپنی مسجدوں میں مناتے ہیں، اور تراویح کی رکعتوں میں سارے قرآن کو اپنے حافظہ میں تازہ کر لیتے ہیں، تراویح سے متعلق بحثوں کا تعلق حدیثِ نبوی سے ہے، قرآن مجید سے نہیں، تاہم اتنا تو اس مبارک عبادت و عادت سے متعلق قرآن مجید کے ذیل میں کہا ہی جا سکتا ہے۔

حدیثِ نبوی، ماہِ رمضان کے فضائل سے لبریز ہیں، صرف ایک حدیث، جو صحابی عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حوالہ سے سُننِ نسائی میں درج ہے، یہاں نقل کی جاتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى فَرَضَ صِيَامَ رَمَضَانَ عَلَيْكُمْ وَسَنَنْتُ لَكُمْ قِيَامَهُ فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے، اور میں نے اس میں رات کے جاگنے کی سنت قائم کی تو جو کوئی روزہ رکھے گا اور ایمان و حُسنِ نیت کے ساتھ شب بیداری کرے گا وہ گناہوں سے ایسا دُھل جائیگا کہ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ

وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے ۶۶۳ اور (اس میں) کھلے ہوئے (دلائل ہیں) ہدایت اور (حق و باطل میں) امتیاز کے ۶۶۴

مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۚ

سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے ۶۶۵

۶۶۳ یعنی اس میں خفاو التباس کسی قسم کا نہیں اور اس کے سارے ہدایات و احکام لوگوں ہی کے نفع کے لئے ہیں۔
لِّلنَّاسِ۔ سے اس پر بھی روشنی پڑ گئی کہ قرآن کی مخاطب ساری دنیا ہے محض قریش یا عرب نہیں۔

۶۶۴ قرآن مجید ایک کتاب محکم ہے نہ صرف دلالتِ احکام میں وضاحتِ کامل کی بنا پر بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اس کے دلائل حق کو باطل سے واضح اور نمایاں طور پر ممتاز کر دینے والے ہیں۔
اَلْفُرْقَانِ۔ پر حاشیہ پہلے گزر چکا۔

۶۶۵ فَلْيَصُمْهُ۔ بعض کج فہموں نے خدا معلوم کس قاعدۂ زبان سے اس لفظ کے یہ معنی نکال کر کہ رمضان "میں" یا رمضان کے "اندر" روزے رکھے جائیں، یہ حکم لگا دیا ہے کہ صرف تین دن کے روزے بھی کافی ہیں، یہ ایجاد بندہ تمام تر گندہ ہے آیت کے صاف و صریح معنی اس مہینہ کو روزہ میں گزارنے کے ہیں، اور اردو میں اس مفہوم کو "مہینہ بھر" میں ہی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔
فَلْيَصُمْهُ تقدیرہ من شهد جزءا من اجزاء الشهر فليصم كل الشهر (کبیر) ای الشهر كله۔ (معالم)
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ۔ قمری مہینہ کا آغاز ہر ۲۹ یا ۳۰ دن کے بعد چاند دیکھنے سے ہوتا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور یہ رنگ اس کی اخلاقی و معاشرتی، تعبدی، جزئی، کلی ہر تعلیم میں نمایاں ہے، طاعتوں اور عبادتوں کے باب میں جہاں اس نے ایک طرف یہ تاکید رکھی ہے کہ وقتِ مقررہ اور زمانۂ معین ہی میں ادا ہوں، وہاں یہ نہیں کیا کہ خود اوقات کو یا زمان کی مقداروں کو ماہرینِ ہیئت و حساب کا محتاج و پابند بنا دیا ہو جیسی تقویم رکھنے والے بیچارے آج بھی جنتری کے لئے تمام تر دست نگر رہتے ہیں ہیئت دانوں اور فلکیات کا حساب کتاب رکھنے والوں کے، اور اگر کسی ملک یا قوم کا تمدن ابھی اس درجہ تک نہ پہنچا ہو کہ رصد خانے بن سکے ہوں، دوربینیں ایجاد ہو چکی ہوں طرح طرح کے آلات سے کام لیا جانے لگا ہو، ریاضیات کا طویل و عریض نظام وجود میں آ چکا ہو تو وہاں کے لوگ بیچارے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ اسلام تو اس سیدھے سادے فطری حساب کا قائل ہے کہ بغیر کسی آلہ کی مدد کے بغیر ریاضیات عالی کے توسط کے بس آنکھ سے جب چاند دیکھ لو روزہ رکھنا شروع کر دو۔
آیت کے لفظ لفظ نے اسے صاف کر دیا کہ صوم رمضان سارے مکلف انسانوں پر فرض نہیں، بلکہ صرف انھیں پر ہے جنھیں "شہودِ شہر" ہو، جو ماہِ رمضان اپنے ہاں پائیں۔
فيه عدة احكام منها ايجاب الصيام على من شهد الشهر دون من لم يشهده ..... ثم ان لزوم صوم الشهر مقصور على بعضهم دون بعض وهو من شهد دون من لم يشهده (جصاص)
شَهِدَ وسیع معنی میں ہے یعنی جب ماہِ رمضان کے شروع ہونے کا علم ہو جائے خواہ چاند کو براہ راست دیکھ کر خواہ دوسرے ذریعہ سے رویت کی خبر سن کر تو بیماروں، مسافروں، معذوروں کو چھوڑ کر اور سب لوگ روزہ رکھنا شروع کر دیں۔

وشهد من الشهود والركب بذلك عن الحضور انا رأوه (علماء روح) اما بالرؤية واما بالسماع۔

رؤیتِ ہلال معتبر کہاں کی ہوگی؟ فقہاء نے اس کے جواب میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں لیکن صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ اسی شہر یا بستی کی یا قرب وجوار کی بستیوں کی، سیکڑوں ہزاروں میل دور سے رویتِ ہلال کی خبریں منگانے کا تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ سے انتظام کرنا، یا کلکتہ کی رؤیت کو ۱۹۰۰ میل دور بمبئی پر حجت گردانا شریعتِ اسلامی کی اصل روح پر ظلم کرنا ہے، اختلافِ مطالع ایک صریح مشاہدہ کی چیز ہے، اُسے کیونکر جھٹلایا جاسکتا ہے، وحدتِ اُمت یقیناً ایک بڑی اہم چیز ہے لیکن اس کے لئے یہ زبردستی کی کوششیں کرنا طبعی کو غیر طبعی کی حد تک پہونچا دینا ہے۔

واختلفوا اذا اخبر مخبر عن رؤية بلد فلا يخلو انه يقرب او يبعد فان قرب فالحكم واحد وان بعد فلاهل كل بلد رؤيتهم روى هذا عن عكرمة والقاسم وسالم وروي عن ابن عباس وبه قال اسحق واليه اشار البخاري حيث بوب لاهل كل بلد رؤيتهم۔ (قرطبی)

اسی تفسیر قرطبی میں یک روایت صحیح مسلم کے حوالہ سے اس مضمون کی درج ہے کہ ایک بار ماہِ رمضان کے سلسلہ میں شام کی رؤیت کی خبر مدینہ میں پہونچی، دونوں جگہوں کی تاریخوں میں فرق نکلا حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحابی نے حدیثِ نبوی کا حوالہ دے کر فتوی دیا کہ ہم تو مدینہ کی رؤیت کا اعتبار کریں گے، اس کے بعد امام قرطبی لکھتے ہیں قال علماءنا قول ابن عباس هكذا امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم كلمة تصريح برفع ذلك الى النبي صلى الله عليه وسلم وبامره فهو حجة على ان البلاد اذا تباعدت كتباعد الشام من الحجاز فالواجب على اهل كل بلد ان تعمل على رؤيته دون رؤية غيره۔

امام مسلم کا شمار فقہاء محدثین میں ہے انھوں نے اپنی صحیح کی کتاب الصیام کے باب کا عنوان یہی قرار دیا ہے باب بیان ان لكل بلد رؤيتهم وانهم اذا رأوا الهلال ببلد لا يثبت حكمه لما بعد عنهم یعنی باب اس بیان میں کہ ہر شہر کی رویت وہیں کی معتبر ہے اور اس میں کہ جس بستی میں چاند دکھلائی دے وہاں سے دُور کی بستیوں پر وہاں کا حکم عائد نہ ہوگا، اور باب کے تحت میں وہی حدیث لائے ہیں جو قرطبی کے حوالہ سے اوپر گزر چکی، اور اس حدیث کو محدث ابن منذر اور امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔

فحكاه ابن المنذر عن عكرمة والقاسم وسالم واسحق وحكاه الترمذي (فتح الباری)

اور امام نووی شارح مسلم نے لکھا ہے کہ:۔

والصحيح عند اصحابنا ان الرؤية لا تعم الناس بل تختص بمن قرب على مسافة لا تقصر فيها الصلوة وقيل ان اتفق المطلع لزمهم وقيل ان اتفق الاقليم والا فلا۔

صحیح مسئلہ ہمارے علماء کے یہاں یہ ہے کہ رؤیت سارے انسانوں پر حجت نہیں بلکہ صرف اتنی مسافت والوں پر ہے جس میں نماز قصر نہ کی جائے اور ایک قول ہے کہ جہاں تک مطلع متحد ہو، اور ایک قول ہے کہ ایک اقلیم کے حدود کے اندر، ورنہ آگے نہیں۔

اور پھر اس کے آگے یہ لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے غیر مقام کی رؤیت پر بے اعتباری نہیں کی۔

انما ردّه لان الرؤية لا يثبت حكمها في حق البعيد۔

خود بے ایسا عمل کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ رؤیت کا حکم دور دراز مقامات پر صادق نہیں آتا۔

اور فقیہ قاضی ابن رشد مالکی نے اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر بستی کے لئے وہیں کی رؤیت معتبر ہے،

چاہے بستیاں آس پاس کی ہوں یا دُور کی۔

هٰذا هو مذهب الأمر بعضى ان لكل بلد رؤيته قرب أو بعد۔ (بدایۃ المجتہد)

مالکیہ کا مذہب مشہور تو یہ ہے کہ ایک جگہ کی رؤیت سب جگہ کے لئے کافی ہوگی لیکن ابن عبد البر نے اجماع اس کے خلاف نقل کیا ہے یعنی ایسے دور دراز ممالک جیسے خراسان اور اسپین ہیں ان میں ایک کے ہاں کا اعتبار دوسری جگہ نہیں کیا جائے گا۔

نکی حکا ابن عبد البر الاجماع علی خلافه وقال اجمعوا علی انه لا تراعى الرؤية فی ما بعد من البلاد کخراسان والاندلس (فتح الباری) وحکی ابو عمر الاجماع علی انه لا تراعى الرؤية فی ما بعد من البلدان کالاندلس من خراسان قال ولکل بلد رؤيتهم الا ما کان کالمصر الکبير وما تقاربت اقطاره من بلدان المسلمين (قرطبی) وروی المدنيون عن مالك ان الرؤية لا تلزم بالخبر عند غير اهل البلد الذی وقعت فيه الرؤية الا ان يکون الامام يحمل الناس على ذلك وبه قال ابن الماجشون والمغيرة من اصحاب مالك واجمعوا على انه لا يراعى ذلك فی البلدان النائية کالاندلس والحجاز (بدایۃ المجتہد) واختلف فی تاويل قول ابن عباس هذا فقيل رده لانه خبر واحد وقيل رده لان الاقطار مختلفة فی المطالع وهو الصحيح۔ (ابن العربی)

التَّهرُ۔ اس دنیا کے پردے پر کچھ ملک ایسے بھی آباد ہیں، جہاں کا طلوع و غروب ہمارے عام معیار کے لحاظ سے بالکل غیر معمولی ہے، مثلاً فن لینڈ، یا قطبین کے قریب کے علاقے جہاں رُویتِ ہلال کے انتیسویں دن یا تیسویں دن کے واقع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں اور جب یہ نہیں تو وہاں شہود الشہر یعنی طلوعِ ماہِ رمضان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ قرآن مجید کے اس اعجازِ بلاغت کے قربان جایئے کہ صرف ایک لفظ شَهِدَ الشَّهرَ کے لے آنے سے کتنے سوالات اور شبہات کی جڑ کاٹ دی بہ طورِ تطوع یا بہ خیالِ تقوے کوئی وہاں بھی روزہ رکھنا چاہے تو سونے، جاگنے، کھانے پینے، غرض دنیا کے اور سارے کاروبار کے لئے وہاں اوقات کا جو معیار ہو اُسی انداز اور حساب سے روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔

ہمارے زمانہ کے نامور فاضل، محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ اس قابل ہے کہ یہاں پورا نقل کر دیا جائے:۔

"...... یہ امر ناگزیر ہے کہ کرۂ زمین کو اسی ضرورت کے پیشِ نظر معمولی اور غیر معمولی دو منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے، خطِ استواء سے ۴۵ درجہ شمالاً و جنوباً عرض البلد تک تو معمولی معمولی منطقہ ہو اور اس کے آگے قطبین تک دونوں جانب غیر معمولی منطقے شمار کئے جائیں اور ان غیر معمولی منطقوں کے لئے وہی اوقاتِ سحر و افطار ہوں، جو معمولی منطقے کے انتہائی اوقاتِ سحر و افطار ہو سکتے ہیں!"

اس کے آگے ایک مفصل گوشوارہ یکم جنوری سے لے کر ۳۱ دسمبر تک کے نقشہ کے لئے اوقاتِ طلوع و غروب کا تفصیل سے پیش کیا ہے، جو دوکنگ (لندن) کے انگریزی ماہنامہ اسلامک ریویو (مارچ ۱۹۵۶ء) میں دیکھا جا سکتا ہے، نیز لاہور کے ماہنامہ ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۵ء میں، اور اس کے بعد یہ نقشۂ اوقات موصوف نے اپنی انگریزی کتاب (INTRODUCTION TO ISLAM) میں بھی شامل کر دیا ہے۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ

اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (اُس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) ۶۶۶ اللہ تمہارے

بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا ۶۶۷

۶۶۶ ابتدا میں حکم صرف اسی قدر تھا کہ تندرست اور مقیم بھی جو ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا چاہیں قضا کر سکتے ہیں۔ جب آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی اس وقت سے تندرستوں اور مقیموں سے یہ اختیار چھن گیا، اور رمضان کے روزے ان کے لئے اختیاری نہیں رہے، لازمی ہوگئے، لیکن مریضوں، ناتوانوں، مسافروں کے لئے قضا کا اختیار بدستور باقی رہا۔ آیت کے اسی جزو مَنْ كَانَ مَرِيضًا الخ کو ایک بار پھر اسی لئے دُہرا دیا گیا کہ مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کی تعلیم سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ معذوروں سے رعایت ختم کر دی گئی۔ اس لئے حکم کی تکرار صرف صوری اور ظاہری ہے، حقیقی اور معنوی نہیں۔
كَرَّرَ لِئَلَّا يُتَوَهَّمَ نَسْخُهُ بِتَعْمِيمِ مَنْ شَهِدَ (جلالین) مُخَصِّصًا لَهُ لِأَنَّ الْمُسَافِرَ وَالْمَرِيضَ مِمَّنْ شَهِدَ الشَّهْرَ وَلَعَلَّ تَكْرِيرَهُ لِذٰلِكَ لِئَلَّا يُتَوَهَّمَ نَسْخُهُ۔ (بیضاوی)

۶۶۷ چنانچہ شریعتِ اسلامی کے سارے احکام و قوانین اسی ایک اصل پر مبنی ہیں، اور خود اسی روزۂ رمضان کے معاملہ میں معذوروں کے لئے کتنی گنجائشیں کتنی سہولتیں رکھ دی گئیں۔ حدیثِ نبوی میں جو آیا ہے دِينُ اللهِ يُسْرٌ وہ اسی آیتِ قرآنی کی شرح یا تتمہ ہے۔ اور واقعی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو شریعت کا ایک حکم بھی ایسا نہ ملے گا جس میں عامل کے حالات، عمر، صحت، جنس، موسم اور دوسری مشکلات کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو، اور جو احکام بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں اُن کی تہ میں بھی ہمیشہ یہی حقیقت پائی جائے گی کہ فرد یا امت کی راہ میں کچھ آسانیاں ہی پیدا ہوں۔ امتِ اسلامی کے فخر و مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ جو احکام غیروں کو سخت معلوم ہوتے ہیں، اُن کی تعمیل میں وہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد، ساری مخالفانہ فضا و ماحول کے باوجود اسی خوش دلی اور بے تکلفی کے ساتھ لگی ہوئی ہے کہ اغیار دیکھ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔
سر ولیم میور لکھتے ہیں:-
"روزہ کی سختیاں بدستور قائم ہیں، خواہ وہ کسی موسم میں پڑیں اور آج تک مشرق کے میدانوں میں جلاتی دھوپ اور جھلسانے والی سموم میں، گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں بھی، پیروِ محمد صبح سے شام تک پانی کا ایک قطرہ حلق کے نیچے نہیں اُتارتے..... اتنی سخت ریاضت قوتِ ایمانی اور ضبطِ نفس کا پورا امتحان ہے۔" (لائف آف محمد ص ۱۹۳)
اَلْيُسْرَ سے مراد حالتِ سفر میں افطار اور اَلْعُسْرَ سے مراد حالتِ سفر میں صوم سے بھی کی گئی ہے۔
قَالَ مُجَاهِدٌ وَّضَحَّاكٌ اَلْيُسْرُ الْفِطْرُ فِي السَّفَرِ وَالْعُسْرُ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ (قرطبی) رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَّقَتَادَةَ وَمُجَاهِدٍ وَّالضَّحَّاكِ اَنَّ الْيُسْرَ الْإِفْطَارُ فِي السَّفَرِ وَالْعُسْرَ الصَّوْمُ فِيهِ وَفِي الْمَرَضِ (جصاص)
لیکن فقہاء مفسرین نے اس کے عموم میں سارے ہی مسائلِ دین کو شامل سمجھا ہے اور اس کو ایک بڑی اصل قرار دے لیا ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو ۶۶۸ اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمہیں راہ بتا دی ۶۶۹ عجب نہیں کہ

تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ

تم شکر گزار بن جاؤ ۶۷۰ اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں ۶۷۱ تو میں تو قریب ہی ہوں ۶۷۲

وَاَوْجَبَهٗ عُمُوْمُ اللَّفْظِ فِیْ جَمِیْعِ اُمُوْرِ الدِّیْنِ (قرطبی) وَهٰذِهِ الْاٰیَةُ اَصْلٌ فِی اَنَّ کُلَّ مَا یَضُرُّ بِالْاِنْسَانِ وَیُجْهِدُهٗ وَیَجْلِبُ لَهٗ مَرَضًا اَنَّهٗ غَیْرُ مُکَلَّفٍ بِهٖ لِاَنَّ ذٰلِكَ خِلَافُ الْیُسْرِ (جصاص)

یُرِیْدُ اللّٰهُ لفظ یُرِیْدُ سے اہل سنت نے استدلال کیا ہے کہ اللہ صاحب ارادہ ہے اپنے ارادۂ قدیم وازلی کے ساتھ۔

دَلَّتِ الْاٰیَةُ عَلٰی اَنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ مُرِیْدٌ بِاِرَادَةٍ قَدِیْمَةٍ زَائِدَةٍ عَلَی الذَّاتِ هٰذَا مَذْهَبُ اَهْلِ السُّنَّةِ کَمَا اَنَّهٗ عَالِمٌ بِعِلْمٍ وَقَادِرٌ بِقُدْرَةٍ (قرطبی)

۶۶۸ یعنی جتنے روزے قضا ہو جائیں اُن کی تکمیل کر لو تو پورا پورا اجر روزوں کی ادائی ہی کا مل جائے گا۔

وَلِتُكْمِلُوا۔ یہ نحوی حیثیت سے ماتحتی میں یُرِیْدُ اللّٰهُ کے ہے اور عطف اَلْیُسْرَ پر ہے۔

یَجُوْزُ اَنْ یُعْطَفَ عَلَی الْیُسْرِ وَیَنْتَصِبُ بِهٖ یُکْمِلُوْا (بیضاوی)

فراء نحوی نے کہا ہے کہ یہ ل کے کے معنی میں ہے۔

قَدْ یَجْعَلُ اللَّامَ لَامَ کَیْ۔ (معانی)

۶۶۹ (تمہارے ہی نفع اور فلاح کی)

اور راہ بھی ایسی جس میں نہ زیادہ مشقت و تعب بلکہ ہر ایک کے حالات کی پوری پوری رعایت۔

۶۷۰ شکر گزار بن جانے کا کتنا آسان نسخہ اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ ہے۔ بندہ بس اسی پر غور کرتا رہے کہ اللہ نے شریعت اسلامی کے ذریعہ سے کیسے کیسے پرسہولت طریقے اُس کے اجر اور نفع کے بتا دیے ہیں۔

۶۷۱ (اے پیغمبر)

عَنِّیْ یعنی میرے قرب و بُعد کے متعلق کہ آیا وہ ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا بعید ہے کہ اپنی آواز چلا کر اس تک پہونچائیں۔

قَالَ الْحَسَنُ سَبَبُهَا اَنَّ قَوْمًا قَالُوْا لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَقَرِیْبٌ رَبُّنَا فَنُنَاجِیْهِ اَمْ بَعِیْدٌ فَنُنَادِیْهِ (قرطبی)

عجب نہیں کہ ایسا سوال اور وہ بھی مجادلانہ رنگ میں یہود کی طرف سے پیش ہوا ہو جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم بھی ہوتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ کَیْفَ یَسْمَعُ رَبُّنَا وَاَنْتَ تَزْعُمُ اَنَّ بَیْنَنَا وَبَیْنَ السَّمَاءِ خَمْسُ مِائَةِ عَامٍ (قرطبی)

گمراہ قوموں نے باری تعالیٰ کے وجود کا اقرار تو اکثر کیا ہے لیکن ذات باری کو انسان سے اس قدر پرے، مادی و معنوی دونوں حیثیتوں سے فرض کیا ہے کہ وہاں تک بندوں کی رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔

اِذَا سَاَلَكَ اہل لطائف نے اس سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ قربِ قبولِ طلب پر موقوف ہے اور رخ خطاب اس لئے

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ

پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے ۶۷۳ پس (لوگوں کو) چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور

يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

مجھ پر ایمان لائیں ۶۷۴ تاکہ ہدایت یاب ہو جائیں ۶۷۵

اختیار کیا گیا ہے کہ یہ تو شبہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے کسی اور کی طرف گمان نہ جائے۔

۶۷۲ (اور یہ آپ بندوں سے میری طرف سے کہہ دیجئے)

قَرِيبٌ قریب باعتبار کمالِ علم، یا باعتبار قبولِ دعا۔

أَيْ قَرِيبٌ بِالْإِجَابَةِ (ابن عباس) قَرِيبٌ بِعِلْمِهِ (يعني [illegible]) بِالْإِجَابَةِ وَقِيلَ بِعِلْمِهِ (قرطبی) عِلْمًا وَإِجَابَةً لِتَعَالِيهِ عَنِ الْقُرْبِ مَكَانًا (مدارک) إِنَّهُ تَعَالَى يَسْمَعُ دُعَاءَهُمْ وَيَرَى تَضَرُّعَهُمْ أَوِ الْمُرَادُ مِنْ هٰذَا الْقُرْبِ الْعِلْمُ وَالْحِفْظُ. (کبیر)

قرب سے ظاہر ہے کہ قربِ مادی یا مکانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا، قربِ معنوی ہی مراد ہوگا۔

تَمْثِيلٌ لِكَمَالِ عِلْمِهِ بِأَفْعَالِ الْعِبَادِ وَأَقْوَالِهِمْ وَاطِّلَاعِهِ عَلَى أَحْوَالِهِمْ (بیضاوی)

حق تعالیٰ کا قرب اپنے بندوں سے رہتا تو ہمیشہ ہی ہے، ماہِ رمضان میں اسی عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے اور یہ قرب یا تعلق خاص اور بڑھ جاتا ہے۔

بندوں کی تسکین اور تسلی کا کس قدر سامان اس ایک آیت کے اندر موجود ہے! ہمیں اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ تو ہم سے قریب ہی، ہم سے متصل ہی ہے۔

۶۷۳ (اور جن دعاؤں کا قبول کرنا میری حکمتِ کاملہ اور مشیتِ مطلقہ کے منافی نہیں ہوتا)

عَنِّي، إِنِّي، أُجِيبُ، دَعَانِ۔ متکلم کی ساری ضمیریں آیت میں بجائے جمع کے واحد کی ہیں، دونوں صیغوں کا عموی فرق ملحوظ ہے، صیغۂ جمع گویا قدرت، عظمت، قوت کا مظہر ہے، اور واحد اس کے برعکس التفات، اختصاص، توجہ کی جانب مُشیر ہوتا ہے، اور یہاں توجہ و التفات کا مشیر ہونا تو بالکل ظاہر ہے، آیت کے الفاظ سے دعا کی ترغیب و تشویق بھی نکل آئی، اور اشارہ اس جانب بھی ہو گیا کہ دعا بندہ کا کوئی سرتاسر خود غرضانہ اور دنیوی عمل نہیں بلکہ عین عبادت اور موجبِ تقرب ہے، ایک حدیث صحیح میں یہ مضمون آیا ہے کہ جس کے لئے دعا کا دروازہ کھل جاتا ہے یعنی دعا کی توفیق ہو جاتی ہے، اس کے لئے رحمت کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے۔

دَعْوَة کے معنی یہاں عبادت کے بھی لئے گئے ہیں اور اجابت سے مراد قبول سمجھی گئی ہے یعنی بندہ جب میری عبادت کرتا ہے تو میں اُسے قبول کرتا ہوں۔

أَيْ أَقْبَلُ عِبَادَةَ مَنْ عَبَدَنِي فَالدُّعَاءُ بِمَعْنَى الْعِبَادَةِ وَالْإِجَابَةُ بِمَعْنَى الْقَبُولِ (روح)

ثَالِثُهَا أَنْ يَكُونَ الْمُرَادُ مِنَ الدُّعَاءِ الْعِبَادَةَ (کبیر) وَالْوَجْهُ الرَّابِعُ أَنْ يَكُونَ الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ (بحر)

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ

جائز کردیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا ۶۷۶

۶۷۴ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ۔ یعنی میری دعوتِ ایمان و طاعت قبول کریں جس طرح میں اُن کی دعا بتمامہا قبول کرتا ہوں۔
اِذَا دَعَوْتُھُمْ لِلْاِیْمَانِ وَالطَّاعَۃِ کَمَا اَنِّیْ اُجِیْبُھُمْ اِذَا دَعَوْنِیْ لِحَوَائِجِھِمْ (مدارک) اَلْمَعْنٰی
فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ بِمَا دَعَوْتُھُمْ اِلَیْہِ مِنَ الْاِیْمَانِ اَیِ الطَّاعَۃِ وَالْعَمَلِ۔ (قرطبی عن مجاهد وغیرہ)
حکیم مطلق کے کسی حکم کے نامناسب ہونے کا احتمال ہی نہیں بخلاف بندوں کی درخواستوں کے کہ ان میں بہت سی نامناسب بھی ہوتی ہیں اور اس لئے مرتبۂ قبول سے محروم رہتی ہیں۔ (تھانوی)

وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ یعنی یقین رکھیں نہ صرف میرے وجود پر بلکہ میرے حاکم ہونے پر میرے حکیم ہونے پر اور میری عنایت و عطا پر

۶۷۵ (پوری طرح۔ اور ان پر فلاحِ دارین کا دروازہ کھل جائے۔)
احکامِ الٰہی پر تعمیل اور ایمانِ کامل کے بعد درجۂ رُشد تک پہنچ جانے میں امر مانع ہی کون سا ہو سکتا ہے۔
لَعَلَّ۔ اوپر بیان ہو چکا کہ کلامِ الٰہی میں جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی محض اُمید یا احتمال کے نہیں رہتے، بلکہ اس میں یقین پایا جانے لگتا ہے، مُراد یہ ہوئی کہ احکامِ الٰہی پر عمل کرنے اور اُس کے حکیم و حاکم ہونے پر یقین رکھنے سے دروازہ فلاحِ دارین کا کھل کر رہے گا۔

۶۷۶ یہ اجازت شروع میں نہ تھی جیسا کہ لفظ اُحِلَّ سے خود اشارہ نکل رہا ہے ابتداءً روزہ کی حالت میں رات میں بھی دن ہی کی طرح بیویوں سے علٰحدگی کا حکم تھا۔ شریعتِ اسلامی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ رسالت میں بتدریج نازل ہوئی، کہیں تو ایسا ہوا کہ احکام شروع میں نرم تھے، رفتہ رفتہ سخت ہو گئے، مثلاً شراب نوشی کہ پہلے صرف ناپسند کی گئی اور پھر ہوتے ہوتے اس کی حرمت کا حکم آگیا، اور کہیں اس کے برعکس ہوا ہے یعنی ابتداءً قانون سخت تھا، رفتہ رفتہ اس میں سہولتیں اور رعایتیں زیادہ ہوتی گئیں، چنانچہ یہی روزہ کا معاملہ ہے کہ پہلے صحبت رات میں بھی حرام تھی، بعد کو جائز کر دی گئی۔

رَفَثٌ کے لفظی معنی شہوت انگیز کلام کے ہیں لیکن جب صیغۂ متعدّی میں اسے لایا جاتا ہے تو اس سے مُراد صحبت یا مباشرت ہوتی ہے چنانچہ یہاں اَلرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ہے۔

عُدِّیَ بِاِلٰی لِاَنَّہٗ فِیْ مَعْنَی الْاِفْضَاءِ (لسان) جُعِلَ کِنَایَۃً عَنِ الْجِمَاعِ وَعُدِّیَ بِاِلٰی لِتَضَمُّنِہٖ مَعْنَی الْاِفْضَاءِ
(راغب) کُنِّیَ بِہٖ عَنِ الْجِمَاعِ (کشاف) وَالْمُرَادُ بِہٖ ھٰھُنَا الْمُبَاشَرَۃُ (ابن العربی) کِنَایَۃٌ عَنِ الْجِمَاعِ لِاَنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ کَرِیْمٌ یُکَنِّیْ قَالَہٗ ابْنُ عَبَّاسٍ وَالسُّدِّیُّ وَقَالَ الزَّجَّاجُ اَلرَّفَثُ کَلِمَۃٌ جَامِعَۃٌ لِکُلِّ مَا یُرِیْدُ الرَّجُلُ مِنِ امْرَاَتِہٖ (قرطبی)

یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بیوی کی طرف میل و رغبت ذرا بھی کمالِ روحانیت و تزکیۂ نفس کے منافی نہیں جیسا کہ بہت سے مشرکانہ اور جاہلی مذہبوں نے سمجھ لیا ہے اور ماہِ صیام کی طاعت و عبادت اور بیوی سے خلوت و صحبت کے درمیان منافات ذرا بھی نہیں جیسا کہ مذہب کے جوگیانہ اور راہبانہ تخیّل نے دلوں میں بٹھا دیا ہے، شریعتِ اسلامی نے جو چیز سخت پہرا بٹھا رکھا ہے وہ شہوتِ حرام اور اُس کے مبادی و مقدمات ہیں، نہ کہ نفسِ شہوت، بھوک، پیاس، نیند کا جو

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

وہ تمہارے لباس ہیں اور تم اُن کے لباس ہو ۶۶۶ اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا

كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ

کرتے رہتے تھے ۶۶۷ پس اس نے تم پر رحمت سے توجہ فرمائی اور تم سے درگزر کردی ۶۶۸

جنسی بھوک بھی اگر اپنے حدود کے اندر ہے تو ایک طبعی اور بے ضرر خواہش ہے لیکن قصداً اور بلا ضرورت شرعی روزۂ رمضان توڑ دینے کی سزا انتہائی ہے، دو مہینے یعنی ساٹھ دن کے مسلسل روزے رکھنے ہیں۔ اور شوہر و بیوی اگر اپنے مشترک عمل سے روزہ توڑ دیں تو دونوں کو یہی سزا ہے، لیکن اگر بیوی رضامند نہ ہو اور شوہر اُسے دن میں ہمبستری پر مجبور کر دے تو بیوی پر گناہ نہیں، البتہ خود جبر کا تحقق ہونا چاہیئے، مجبور کے لئے صرف ایک روزہ کی قضا کافی ہے کفارہ کی بنا قصد و تعمد پر ہے۔

۶۶۷ (قرب و اتصال کے لحاظ سے یا ایک دوسرے کے پردہ دار اور موجب تسکین ہونے کے لحاظ سے۔)

گویا اُردو محاورہ میں دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ اُن کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہ اُن کے حق میں، یہ لباس کا تشبیہ کس اعتبار سے ہے؟ مختلف زبانوں سے اس کے مختلف جوابات ملتے ہیں بعض نے کہا کہ ایک دوسرے کے محتاج ہونے کی بنا پر، کسی نے کہا کہ اجسام کی ملابست و ملامست کی بنا پر و قس علیٰ ہذا، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے حق میں لباس کا ایک وصف امتیاز اس کی پردہ پوشی ہے، لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے اس کے حسن و خوبی کو اُبھارتا ہے، تشبیہ سے خاص اشارہ اسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے، گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیئے اور ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا، جو انتہائی گہرا رشتہ اور تعلق میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے، اس کی بنا پر ظاہر ہے کہ جتنا موقع ایک کو دوسرے کے جسمانی اخلاقی روحانی عیبوں اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے، اتنا نہ کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو، اور نہ ایک کا راز دوسرے سے مخفی رہ سکتا ہے، اس صورت حال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہ ہے کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے اس پر صبر کرے اسے بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرے اور ع

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من

کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرے، علیٰ ہذا مرد کے بھی کمالِ اخلاق کی یہی معراج ہے۔

دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بغیر کسی شدید اور پُر تعب مجاہدہ میں ڈالے ہوئے، روزمرہ کے لطیف و سہل مجاہدات کے ذریعہ بتا دیا، یہ اُس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی "محققین" کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اُس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے۔! ع

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

کون جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت، کون سا اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہوگا؟ منو سمرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں، عہد عتیق و جدید والے یہودی و نصرانی مذہبوں سے سوال ہے کہ ان کے سارے دفتر کتبِ اسفار میں کون سی

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۔

سو اب تم ان سے ملو ملاؤ۶۸۰ اور اُسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۶۸۱

تعلیم زن و شو کے باہمی تعلق، محبت و اعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے؟

۶۷۷ یعنی رات کو چھپ چھپ کر بیویوں سے صحبت کرتے تھے اور جی میں ڈرتے بھی جاتے تھے کہ کہیں حکم الٰہی کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی ہے۔

عَلِمَ اللّٰهُ یعنی جو بات اللہ کے علم میں تو ہمیشہ سے ہی ہے اب واقع ہو کر مشاہدہ میں بھی آگئی۔

ای علم وقوع هذا منكم مشاهدة۔ (قرطبی)

یہ تفسیر جمہور مفسرین کی تقلید میں تھی لیکن راغب لغوی نے خیانة اور اختیان کے معنی میں فرق کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر عمل خیانت کا صدور مقصود ہوتا تو تخونون انفسکم آتا تختانون سے مراد محض قصد خیانت کے لئے جذبات کا حرکت میں آنا ہے، اور اختیان کے معنی خیانت کرنا نہیں، بلکہ خیانت کے لئے حیلہ کرنا ہے۔

الاختیان مراودة الخیانة...... الاختیان تحرك شهوة الانسان لتحری الخیانة (راغب) ولم یقل تخونون انفسكم لانه لم تكن منهم الخیانة بل كان منهم الاختیان (راغب)

اور آگے تائید ایک اور آیت ان النفس لامارة بالسوء سے حاصل کی ہے۔

اور صاحب تاج نے بھی راغب کے قول کو بلا اختلاف و اعتراض نقل کیا ہے۔

۶۷۹ یعنی پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا، اور آئندہ کے لئے رمضان میں رات کو بیویوں کے ساتھ خلوت اور صحبت کی اجازت دے دی۔

تَابَ اور عَفَا سے لازم نہیں آتا کہ پہلے کوئی گناہ صادر بھی ہو چکا ہے محض توسع اور تسہیل مزید کے موقع پر بھی ان الفاظ کا استعمال جائز ہے۔

يَحْتَمِلُ الْعَفْوُ مِنَ الذَّنْبِ وَيَحْتَمِلُ التَّوْسِعَةَ وَالتَّسْهِيْلَ۔ (قرطبی)

۶۸۰ (اپنے معمولی طریقہ پر جیسے رمضان کے علاوہ دوسرے زمانوں میں کرتے رہتے تھے۔)

بَاشِرُوْا صیغہ امر ہے مراد اجازت ہے نہ کہ حکم، مباشرت سے مراد عورت سے صحبت کرنا ہے۔

كناية عن الجماع (قرطبی) كنى به عن الجماع (بیضاوی)

آیت سے ایک اور حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی، عورت سے صحبت کھانے پینے اور نیند لینے ہی کی طرح تمام تر ایک امر طبعی ہے جس پر نہ کسی قسم کی ملامت ہے اور نہ کسی تحقیر و استہزاء کی گنجائش، ملامت کے قابل صرف اس جنسی قوت کا بے محل استعمال ہے جس طرح ملامت چوری کے کھانے اور حرام کھانوں پر ہے۔

۶۸۱ (بصورت اولاد اور بطور میاں بیوی کی یکجائی کے قدرتی نتیجے کے)

مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے مراد اولاد، اور اولاد صالح ہے، عمل مباشرت اگر صحیح سن میں اور مناسب وقت پر ہو بڑی گہری طبعی لذت بھی رکھتا ہے لیکن اسلام نے اس عمل سے اصلی اور بڑا مقصد افزائش نسل اور حصول اولاد

رکھا ہے کہ اُمت کی قوت اور کثرت میں برابر اضافہ ہوتا ہے، اور ذاتی لذت اجتماعی منفعت کا زینہ بنتی رہے ٹھیک اسی طرح جیسے کھانے پینے کی لذّت طبعی ذریعہ بنتی رہتی ہے فرد کی حیات وبقا کا، اور اس کی تقویت جسم کا۔

ماقضی اللہ لکم من ولد صالح (ابن عباس) یعنی الولد قالہ اکثر المفسرین (معالم)

اور ابن کثیرؒ نے اسی معنی کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، انسؓ جیسے صحابیوں سے لے کر قاضی شُریحؒ مجاہدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، قتادہؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ اکابر تابعین تک سب کا اجماع نقل کر دیا ہے۔ کَتَبَ "لکھ رکھا ہے" یعنی لوحِ محفوظ میں اپنی مشیتِ تکوینی میں۔

ای فی اللوح المحفوظ (معالم) ای اثبت فی اللوح من الولد۔ (کشاف)

وَابْتَغُوْا بعض نے وَابْتَغُوْا سے مراد شب قدر کی تلاش اور کتب اللہ لکم کے معنی اس کے اجر و ثواب کے لئے ہیں لیکن اہل تحقیق نے رد کر دیا ہے۔

ھو قریب من بدع التفاسیر (کشاف) وجمھور المحققین استبعد واھذا الوجہ (کبیر)

ابن قیمؒ نے یہاں ایک نادر نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ جنسی لذّت میں تمام تر محو نہ ہو جاؤ بلکہ اس میں پڑ کر بھی رضائے الٰہی ملحوظ رکھو اور طالب اولادِ صالح وسعید کے رہو۔

وکان الجامع یغلب علیہ حکم الشھوۃ وقضاء الوطر حتی لایکاد یخطر بقلبہ غیر ذالک ارشدھم سبحانہ الی ان یطلبوا رضاہ فی مثل ھذہ اللذۃ ولا یباشروھن بحکم مجرد الشھوۃ بل یبتغوا ما کتب اللہ لھم من الاجر والولد الذی یخرج من اصلابھم یعبد اللہ ولا یشرک بہ شیئا۔ (التفسیر القیم)

وَابْتَغُوْا سے صاف اشارہ نکل رہا ہے کہ مطلوب افزائش نسل ہے نہ کہ ارادی لاولدی یا عزل۔

قیل ھو نھی عن العزل (کشاف) قیل النھی من العزل (بیضاوی) فیھا حث علی طلب الولد (جصاص)

منع حمل اور قطع نسل کی جس جدید تحریک کا اس وقت زور ہے اور جو "ضبط تولید" وغیرہ مختلف خوشنما ناموں سے پیش ہو رہی ہے قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں اس سب کی تردید کر دی اور بتا دیا کہ مباشرت کا جو نتیجہ قدرۃً اور طبعاً نکلتا ہے اسی کی توقع رکھنا چاہئے اور اسی کا انتظار کرنا چاہئے، عام قاعدہ اور اصل کلی یہی ہے باقی اجمل تر و کے قدرتی نتیجوں کو بلا وجہ خاص و ضرورت شدید مصنوعی ذریعوں اور تدبیروں سے روکنا، اور ربڑ وغیرہ کے آلات کو کام میں لانا، مصیبتوں کو دور کرنا نہیں جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور فرد و قوم دونوں کو نئے نئے فتنوں کی دعوت دینا ہے انتہائی سرگرم کوششوں کے باوجود اول تو ابھی تک کوئی پوری طرح "حمل روک" آلہ دریافت ہی نہیں ہو سکا ہے "اب تک کوئی مانع حمل ایسا نہیں دریافت ہو سکا ہے جو ہر طرح قابل اطمینان ہو یعنی قطعی ہو، بے ضرر ہو اور سادہ ہو۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ جلد ۳ ص ۶۵۱ طبع چہاردہم)

اور پھر اگر کوئی بے خطا اور حکمی تدبیر دریافت ہو بھی گئی تو منع حمل کی جسمانی مضرتوں کے تدارک کی کیا صورت ہو گی؟ یہ باور کرنا دشوار ہے کہ یہ عمل (امتناع) بار بار کیا جائے اور اس کے مضر اثرات مرد و عورت کے اعلیٰ صفات پر مرتب ہوں (ایضاً ص ۶۵۱) یہ اگر مان بھی لیا جائے کہ جلد جلد استقرار حمل اور وضع حمل سے عورت کی صحت خراب ہو جاتی ہے تو بھی خود طب جدید کا فتویٰ یہ ہے کہ عورت کو زمانہ حمل میں جن طبعی اعمال سے جو مہلت مل جاتی ہے نیز وضع حمل کے بعد رضاعت وغیرہ کی

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط

الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ

سے نمایاں ہو جائے ۶۸۲

مشغولی و توجہ یہ سب عورت کی صحت کے لئے ضروری ہے، اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اولاد کی پیدائش ہمیشہ والدین کے ارادہ کے تابع نہیں رہتی۔ چنانچہ ایسے والدین کی مثالیں بارہا مشاہدہ میں آچکی ہیں کہ پہلے تو انھوں نے امتناع کی منافی تدبیریں اختیار کر کے اپنے اعضاء تولید کی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا، اور پھر آگے چل کر جب اولاد کی خواہش یا ضرورت محسوس کی تو اپنی سابقہ حرکتوں پر پچھتائے ہیں، یہ سب تصریحات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہی سے ماخوذ ہیں، باقی متعدد دوسرے ڈاکٹروں اور انھیں میں لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں، اور سائنس کے ماہرین نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بیہودگی پر اس سے بھی زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اس کی طبی مضرتیں کھول کر دکھائی ہیں، خصوصاً عورت کے حق میں، بلکہ یورپ کے متعدد ملک تو اس تحریک کے نتائج سے تنگ آکر اور طویل تجربوں کے بعد بالآخر اس پر مجبور ہوئے کہ ماؤں کے لئے انعام قرار دیا اور ہر نئی زچگی پر ایک نیا انعام دیں، جرمنی، اٹلی وغیرہ سے تو یہ خبریں کئی سال سے آنا شروع ہو گئی تھیں، اور بیچ میں اور فرانس وغیرہ سے عین دوران جنگِ عظیم (۱۹۴۲ء) میں آنے لگی ہیں، اور بالآخر بات اسی کی آپہنچی، کہ کلی اور اسی کی بلندی ہے جس نے کہا تھا کہ تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ۔ شادیاں کرو زیادہ بچے پیدا کرنے والی بیویوں سے۔

۶۸۲ یعنی طلوع صبح صادق تک کھانے پینے اور ہمبستری کی اجازت ہے۔

خَیْطُ الْاَبْیَضِ۔ خَیْطُ الْاَسْوَدِ۔ فجر کی سفید دھاری کا سیاہ دھاری سے ممتاز ہو جانا کنایہ ہے تاریکی شب کے دور ہونے اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے یعنی طلوع فجر سے۔

الخیط اللون (مجاز) ای بیاض النھار من سواد اللیل (راغب) یعنی بیاض النھار من سواد اللیل (معالم)

خود شارعِ اسلام علیہ السلام سے یہی تفسیر مروی ہے۔

ھو سواد اللیل و بیاض النھار (صحیح بخاری)

خَیْط سے گویا یہی کنایہ رنگ سے ہوتا ہے، اور یہاں انھیں خَیْط سے یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ شروع میں یہ واقعۃً دھاریاں ہی سی نظر آتی ہیں۔

الخیط فی کلامھم عبارۃ عن اللون (قرطبی) الخیط الابیض ھو اول ما یبدو من الفجر (کشاف)

شبھا بالخیط لان کل واحد منھما یبدو فی الابتداء ممتداً کالخیط۔ (معالم)

احادیث میں بڑی تاکید کے ساتھ ترغیب دی گئی ہے کہ روزہ دار کی رات بھی حتی الامکان ذکر و عبادت میں بسر ہونی چاہئے چنانچہ اہلِ سنت نے اپنے ہاں جو نماز تراویح پر اتنا زور دیا ہے وہ صاف اسی منشاء نبوی کی تعمیل ہے، مشقت و راحت، تعب و لذت کی جو خوشگوار اور حکیمانہ آمیزش، شریعتِ اسلامی کی ساری عبادتوں میں ہے،

اس کا ایک نمایاں نمونہ یہ رمضان کے روزے ہیں، دن بھر صبر و ضبط کی مشق، کھانے پینے کا انتظار جس سے کھانے پینے کا لطف اور بڑھ کر رہتا ہے، شام کے وقت فرحت و تفریح، پھر شام سے لے کر صبح صادق تک عبادتوں اور مادی لذتوں کا ملا جلا ہوا تسلسل، یہ اسلام ہی کے خصوصیات میں سے ہے۔

مِنَ الْفَجْرِ۔ فجر شرعی سے مراد صبح کاذب نہیں جب کچھ دیر کے لئے اُجالا شمال و جنوب میں معلوم ہونے لگتا ہے بلکہ وہ نور کا تڑکا مراد ہے جو صبح کاذب کے کچھ دیر بعد ہوتا ہے اور روشنی شرقاً غرباً پھیلنے لگتی ہے۔

قال الجمهور ذلك الفجر المعترض في الافق يمنة ويسرة وبهذا جاءت الاخبار ومضت عليه الامصار۔ (قرطبی)

فقہاء مفسرین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ طلوع فجر ثانی (صبح صادق) تک رات کا آخری حصہ باقی رہتا ہے اور طلوعِ فجر کے بعد کا وقت دن میں شامل ہوتا ہے۔

وهو ايضا دلالة على ان اخر الليل الى طلوع الفجر الثاني فثبت ان الليل الى طلوع الفجر وان ما بعد طلوعه فهو من النهار۔ (جصاص)

حدیث میں سحری میں تاخیر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے صحیح مسلم میں سمرۃ بن جندب صحابی کی روایت درج ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ بلال جو لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لئے بہت سویرے اذان دے دیتے ہیں ان کی اذان سے یا محض شمال و جنوب میں روشنی دیکھ کر سحری نہ ختم کردو بلکہ روشنی کے پھیل جانے کو یعنی وہی شرقی و غربی پھیلاؤ کی منتظر رہو۔

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يغرنكم من سحوركم اذان بلال ولا بياض الافق المستطيل هكذا حتى يستطير هكذا (كتاب الصيام باب فضل السحور) روى الائمة قال النبي صلى الله عليه وسلم لا يمنعكم اذان بلال من سحوركم فانه يؤذن بليل ليرجع قائمكم ويوقظ نائمكم۔ (ابن العربی)

بلکہ سنن نسائی کی ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ بالکل صبح ہوجانے تک سحری سے شغل فرماتے رہتے بس اس کا لحاظ رہتا کہ کہیں آفتاب ہی نہ نکل آئے۔

عن زر قال قلنا لحذيفة اي ساعة تسحرت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم قال هو النهار الا ان الشمس لم تطلع۔ (كتاب الصيام باب السحور)

زِر کہتے ہیں کہ ہم نے حذیفہ صحابی سے دریافت کیا آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سحری کس وقت تک کھائی ہے؟ انھوں نے کہا کہ صبح تک سوا اس کے کہ آفتاب طلوع نہیں ہوگیا تھا۔

حاصل اس قسم کی روایتوں کا یہ ہے کہ حضرات صحابہ اس وقت تک سحری کھاتے رہتے کہ شبہ طلوعِ فجر کا ہونے لگتا تھا، کوئی سمجھتا تھا کہ فجر ہوگئی، کوئی سمجھتا تھا کہ نہیں ہوئی۔

انهم تسحروا ولم يتيقنوا طلوع الفجر حتى ان بعضهم ظن طلوعه وبعضهم لم يتحقق ذلك۔ (ابن کثیر)

محدثین نے سحری میں اتنی تاخیر مستحب بتائی ہے کہ طلوعِ فجر بالکل قریب آجائے اور حضرت زید بن ثابتؓ صحابی کے حوالہ سے یہ روایت بخاری و مسلم سے نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سحری کھاتے تھے اور اس کے بعد نماز فجر کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔

وانما يستحب تاخيره الى وقت انفجار الفجر كما جاء في الصحيحين عن انس بن مالك عن زيد بن ثابت قال تسحرنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قمنا الى الصلوة۔ (ابن کثیر)

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ

پھر روزہ کو رات (ہونے) تک پورا کرو ۶۸۳ اور بیبیوں سے اس حال میں صحبت نہ کرو جب تم اعتکاف کئے ہو

ائمۂ سلف کا جن میں اجلۂ صحابہ بھی شامل ہیں اور اجلۂ تابعین بھی عام دستور سحری میں اتنی تاخیر کا تھا کہ طلوع فجر بالکل قریب آجاتا تھا۔

وقد روی عن طائفة كثيرة من السلف انهم تسامحوا فى السحور عند مقاربة الفجر (ابن کثیر)

اور ابن کثیر نے نام اس سلسلہ میں حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ و ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ و ابن عمرؓ و ابن عباسؓ وغیرہم صحابہ کرام کا، اور محمد باقر اور ابراہیم نخعی اور عطاء اور حسن بصری اور مجاہد وغیرہم تابعین کے گنائے ہیں چنانچہ ایک گروہ کا تو یہ فتویٰ ہے کہ سحری اس وقت تک درست ہے جب تک کہ صبح کی روشنی راستے اور مکانوں پر نہ پھیل جائے۔

قالت طائفة ذلك بعد طلوع الفجر وتبينه فى الطرق والبيوت. (قرطبی)

اور حضرت عمرؓ اور حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابیوں اور متعدد تابعین سے یہ منقول ہے کہ کھانے پینے سے احتیاط اس وقت سے واجب ہے جب صبح راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ظاہر ہو جائے

ان الامساك يجب بتبين الفجر فى الطرق وعلى رؤس الجبال. (قرطبی)

حاجت غسل کی حالت میں اگر صبح ہو گئی اور ہنوز غسل کی نوبت نہیں آئی تو روزہ بلا اختلاف جائز ہوگا

وفى تجويز المباشرة الى الصبح دلالة على جواز تاخير الغسل اليه وصحة صوم من اصبح جنبا (ابو سعود) والجمهور من العلماء على صحة صوم من طلع عليه الفجر وهو جنب (قرطبی) اذا زوجناله الوطى قبل الفجر ففى ذلك دليل على جواز طلوع الفجر عليه وهو جنب وذلك جائز اجماعا (ابن العربی) ومن جعله تعالى الفجر غاية لاباحة الجماع والطعام والشراب لمن اراد الصيام يستدل على من اصبح جنبا فليغتسل وليتم صومه ولا حرج عليه وهذا مذهب الائمة الاربعة وجمهور العلماء سلفا وخلفا لما رواه البخارى ومسلم من حديث عائشة وام سلمة رضى الله تعالى عنهما. (ابن کثیر)

۶۸۳ اِلَى الَّيْلِ یعنی جب رات داخل ہونے لگے بس اس وقت روزہ کو تمام کر دو۔ یہ مطلب نہیں کہ رات کی تاریکی چھا جانے کے وقت تک روزہ رکھے رہو۔ روزہ رات آتے ہی ختم ہو جانا چاہئے یہ نہ ہو کہ رات کا کوئی جزو روزہ میں شامل و داخل ہو جائے۔

الى الليل اى الى دخول الليل (ابن عباس) فجعل الليل غاية الصيام ولم يدخل فيه رمضان فانه تعالى ذكر حد الصوم بان اخر وقته اقبال الليل (ابن جریر) كلمة الى لانتهاء الغاية فظاهر الاية ان الصوم ينتهى عند دخول الليل (کبیر) الليل ليس من جنس النهار فيكون الليل خارجا عن جنس النهار (کبیر) الى غاية فاذا كان ما بعدها من جنس ما قبلها فهو داخل فى حكمه (قرطبی)

اَلَّیْلُ اور خود لیل کا اطلاق عربی میں دن کے خاتمہ یعنی غروب آفتاب پر شام ہو جاتا ہے اور اعتبار شرع بھی اسی کا کیا گیا ہے

الليل من مغرب الشمس الى طلوع الفجر الصادق (قاموس۔ تاج) الليل عقب النهار ومبدءه من غروب الشمس (لسان)

اَتِمُّوا الصِّيَامَ۔ اس کے معنی صاف یہ ہوئے کہ افطار عین غروب آفتاب کے ساتھ ہونا چاہئے اَتِمُّوا صیغہ امر کا ہے

فِي الْمَسٰجِدِ

مسجدوں میں ۶۸۳ھ

اور وجوب کے معنی دیتا ہے۔

يقتضي الافطار عند غروب الشمس حكما شرعيا (ابن كثير) كما جاء في الصحيحين عن امير المؤمنين عمر بن الخطاب امر يقتضي الوجوب في ... فشرط تعالى تمام الصوم حتى يتبين الليل كما جوز الاكل حتى يتبين النهار (قرطبي) والامر للاتمام حقا للوجوب (ومن جعل الليل غاية الصيام دل من حل فيه (جصاص)

صوم وصال یعنی بلا افطار کئے دن اور رات کے مسلسل روزہ کی ممانعت بھی اسی آیت سے بہت سے فقہاء نے نکالی ہے، اور حدیث میں اس کی ممانعت صراحۃً موجود ہے۔

هذه مادة ... النبي عن الوصال اذا الليل غاية الصيام وقالته عائشة (قرطبي) تدل الآية على ان كون الليل محل الصوم وان يكون صوم اليومين صومة واحدة وقد استنبط النبي صلى الله عليه وسلم منها حرمة الوصال (روح) اي الكلمة هذه الانتهاء دليل على جواز النية بالنهار في صوم رمضان وعلى جواز تاخير الغسل الى الفجر وعلى نفي الوصال (مدارك) ولهذا ورد في الاحاديث الصحيحة النهي عن الوصال (روح)

معصیت کسی قسم اور کسی درجہ کی بھی ہو مسلمان کے لئے ہر زمانہ اور ہر موسم میں حرام ہے، لیکن رمضان کے ماہ مبارک میں یہ ممانعت اشد و اکد ہو جاتی ہے روزہ دار کی رات بھی گویا عبادت میں بسر ہوتی ہے اور دن تو خیر اتنی بڑی عبادت یعنی حکم الٰہی کے احترام میں لذائذ نفس و طبیعت سے اجتناب میں بسر ہوتا ہی ہے، بدگوئی بدنظری بدزبانی حرام ہمیشہ ہی ہیں، رمضان میں کہنا چاہئے کہ حرام تر ہو جاتی ہیں، پورے مہینہ بھر کے رات اور دن کا ایک ایک حصہ بپاس اسلام کی روحانی پریڈ کا زمانہ ہے، غفلت کسی لمحہ نہ ہونا چاہئے، مسٹر ڈبلو۔ٹی آرنلڈ مسلمان نہیں، مسیحی ہیں، تاہم جذبۂ انصاف پسندی و حق گوئی سے مجبور ہو کر بے درد مسیحی معاندین کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"ماہ رمضان کے روزوں کے سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا ہے کہ دین کا یہ رکن بجائے خود اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ اسلام کی ترویج عیش پرستیوں کے جائز کر دینے سے ہوئی ہے کارلائل کے بقول محمد کا مذہب تن آسانی کا مذہب نہیں، سخت سخت روزے، طہارت کے ضابطے، عبادت کے سخت اور پیچیدہ طریقے، دن میں پانچ پانچ مرتبہ نماز، شراب کی حرمت، یہ احکام جس مذہب میں ہوں اس کی مقبولیت تن آسانیوں کا نتیجہ تو نہیں ہو سکتی"۔ (پریچنگ آف اسلام ص۴۲۱ طبع ثالث)

ملاحظہ ہو ضمیمہ سورۂ بقرہ کے خاتمہ پر۔

۶۸۴ھ (بلکہ کسی قسم کا بھی شہوانی میل جول ان سے نہ رکھو)

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ۔ لفظ مباشرت یہاں وسیع معنی میں ہے یعنی عمل مجامعت کے علاوہ اس کے مقدمات و دواعی، بوس و کنار وغیرہ بھی شامل ہیں۔

انه اللمس والقبلة (ابن العربي) لا يمس المعتكف امرأته ولا يباشرها ولا يتلذذ منها بشيء قبلة ولا غيرها (ابن جرير عن مالك بن انس) المراد بالمباشرة انما هو الجماع ودواعيه من تقبيل ومعانقة ونحو ذلك (ابو السعود)

نیز حنفیہ و مالکیہ کے مسلک کے مطابق بھی امام شافعیؒ کے نزدیک یہ چیزیں اعتکاف میں کراہت پیدا کردیتی ہیں، اُسے باطل نہیں کرتیں۔

اما ما دون الجماع من المباشرۃ کالقبلۃ واللمس بالشھوۃ فمکروہ ولا یفسد بہ الاعتکاف عند اکثر اھل العلم وھو اظہر قولی الشافعی۔ (معالم)

عٰکِفُوْنَ۔ اعتکاف کے لغوی معنی ہیں اپنے کو کسی شے پر روک رکھنے یا لازم کرلینے کے۔ اصطلاح شریعت میں اس سے مُراد مسجد میں بیٹھ کر اپنے کو عبادت کے لئے مُقید کرلینا۔

ھو الاحتباس فی المسجد علی سبیل القربۃ (راغب) اعتکف فی المسجد ای اقام بہ ولازمہ وحبس نفسہ فیہ (تاج) الاعتکاف فی اللغۃ الملازمۃ وھو فی عرف الشرع ملازمۃ طاعۃ مخصوصۃ فی وقت مخصوص علی شرط مخصوص فی موضع مخصوص (قرطبی) العکوف ھو الاقامۃ علی الشئ والاعتکاف فی الشرع ھو الاقامۃ فی المسجد علی عبادۃ اللہ۔ (معالم)

معتکف کے لئے لازم ہے کہ ہر وقت مسجد ہی میں رہے سہے، کھائے پئے، سوئے جاگے، اور بغیر بادی یا شرعی ضرورتِ شدیدہ کے مسجد سے باہر قدم نہ نکالے۔

یجب ان لایخرج الالما لابد منہ من حاجۃ الانسان وقضاء فرض الجمعۃ (جصاص) لیس للمعتکف ان یخرج من معتکفہ الا لما لابد لہ منہ۔ (قرطبی)

مدّتِ اعتکاف کے زیادہ سے زیادہ ہونے کی کوئی حد نہیں، البتہ اقل مدت امام شافعیؒ کے نزدیک ایک لحظہ بھی ہوسکتی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے مسلک میں کم از کم ایک شب و روز ہونا چاہئے۔

واقل الاعتکاف عند مالک وابی حنیفۃ یوم ولیلۃ وقال الشافعی اقلہ لحظۃ ولاحد لاکثرہ (قرطبی) ھو غیر مقدر عند الشافعی واقلہ لحظۃ وقال مالک وابوحنیفۃ ھو مقدر بیوم ولیلۃ۔ (ابن العربی)

اعتکاف ایک بہت لطیف قسم کا مجاہدہ ہے اس لئے اُمت پر فرض کیا معنی واجب بھی نہیں، صرف ایک اعلیٰ درجہ کی نفل ہے اور اس کے مرتبے کی بلندی اسی سے ظاہر ہے کہ خود رسول اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ازواج و اصحاب جیسی عالی ظرف ہستیوں نے اس پر عمل کیا ہے۔

واجمع العلماء انہ لیس بواجب وھو قربۃ من القرب ونافلۃ من النوافل عمل بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ وازواجہ۔ (قرطبی)

فِی الْمَسٰجِدِ۔ اس سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ اعتکاف ہمیشہ مسجد ہی میں ہونا چاہئے۔

اجمع العلماء علی ان الاعتکاف لایکون الا فی المسجد۔ (قرطبی)

البتہ عورتوں کا اعتکاف بجائے مسجد کے گھر کے کسی گوشہ میں بھی ہوسکتا ہے جسے نماز و عبادت کے لئے مخصوص کرلیا جائے، بلکہ مسجد میں عورت کے اعتکاف کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔

اما المرأۃ فتعتکف فی مسجد بیتھا ولو لم یکن لھا فی البیت مسجد تجعل موضعا منہ مسجدا فتعتکف فیہ (ھدایہ)

والمرأۃ تعتکف فی بیتھا (شرح وقایہ) ویکرہ فی المسجد ولا یصح فی غیر موضع صلاتھا من بیتھا (در مختار)

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ

یہ اللہ کے ضابطے ہیں سو ان (سے نکلنے) کے قریب بھی نہ جانا ۶۸۵ اللہ اسی طرح اپنے احکام لوگوں کے لئے

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

کھول کھول کر بیان کرتا ہے ۶۸۶ تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں ۶۸۷

دوسرے دنیوی معاملات مثلاً لوگوں سے بات چیت کرنا حالتِ اعتکاف میں جائز ہیں بشرطیکہ ان میں کوئی بات احترام مسجد یا آداب اعتکاف کے منافی نہ پیدا ہو جائے ؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ ماہ مبارک کے آخری عشرہ میں پورے دس دن کے لئے مسجد میں اعتکاف فرماتے اور علائق دنیوی سے انقطاع جو یوں بھی کامل رہتا، اس عرصہ کے لئے کامل تر ہو جاتا، اعتکاف مسنون بھی ہے اور اسی کو فقہاء نے سنت کفایہ قرار دیا ہے یعنی بستی بھر میں اگر کوئی بھی کرلے تو پوری بستی کی طرف سے وہ سنت ادا ہو جائے گی، باقی نفس اعتکاف ہر مدت کے لئے، ہر زمانہ میں بہر حال مستحب و فضیلت کی چیز ہے، روحانی قوت و توانائی کا ذخیرہ اپنے اندر بھرنے کے لئے اپنے کو روحانی و ایمانی اعتبار سے تازہ دم کرنے کے لئے اس سے بہتر اور مؤثر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ بیس دن کی مسلسل طاعت و عبادت اور شب و روز کے ذکر الٰہی و فکر ایمانی سے روح پر صیقل ہو چکی ہو، ملکوتیت بیدار ہو چکی ہو انسان اپنے کو ایک عشرہ کے لئے کامل یکسوئی اور انقطاع کے عالم میں لے آئے اور اخلاص و للہیت کی شمعوں کو دعاؤں سے، عبادتوں سے ذکر و فکر سے منتہائے کمال پر پہونچادے لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ہر کس و ناکس کا ظرف اس مرتبہ کا متحمل نہیں ہو سکتا، عجب عجب غیر متوقع صورتیں ابتلاء کی پیش آجاتی ہیں (جیسا کہ ان سطور کے راقم نامہ سیاہ کو اپنی ذات سے متعلق تلخ و قابل عبرت تجربات ہو چکے ہیں) مثلاً یہی کہ کھانا لانے والا آدمی گھر سے کھانا دیر میں لایا، اور معتکف بے اختیار اس پر غصہ سے برس پڑا تو فقہاء نے کہا ہے کہ ایسی صورت میں اعتکاف ترک کرنا ہی بہتر ہے کہ معصیت مفسد عبادت (اعتکاف) کے اسی طرح منافی و ناقض ہے جس طرح نماز و طہارت کی ناقض جسمانی ناپاکیاں (بول و براز) ہیں اور جو شخص اعتکاف کے حقوق نہ ادا کر سکے اس کے لئے اعتکاف کرنا ہی مکروہ ہے۔

المعتکف اذا اتی کبیرۃ فسد اعتکافہ لان الکبیرۃ ضد العبادۃ کما ان الحدث ضد الطہارۃ والصلوٰۃ

قالہ ابن خویز منداد عن مالک (قرطبی) ویکرہ الدخول فیہ لمن یخاف علیہ العجز عن الوفاء بحقوقہ (قرطبی)

۶۸۵ بہت ہی برمحل یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب ضابطے اور قاعدے خدائے دانا و بینا کے مقرر کئے ہوئے ہیں، یہ احکام و ہدایات حکیم مطلق و حاکم برحق ہی کی طرف سے ہیں، انھیں خاطی انسانوں کے قانون قاعدہ پر قیاس کر کے معمولی باتیں نہ سمجھنا۔

تِلْكَ سے اشارہ اُن چھ یا سات احکام کی جانب ہے، جو آیت میں مذکور ہو چکے۔

ای ھذہ الاوامر والنواھی (قرطبی) ای الاحکام الستۃ المذکورۃ (روح)

فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ یعنی ان پابندیوں سے باہر نکلنے کے قریب بھی نہ جانا۔

ای لا تتجاوزوھا ولا تعتدوھا۔ (ابن کثیر)

۶۸۶ یعنی جس طرح احکام بیان روزہ اور حدود و اوقات اعتکاف اور اس کے متعلقات کے احکام تفصیل سے

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ ۶۸۷ ۶۸۸ اور نہ اُسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾ ع

لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ سے کھا جاؤ، درآں حالیکہ تم جان رہے ہو ۶۸۹

بیان کر دیے ہیں، اسی طرح وہ اپنے سارے ہی احکام و شرائع، انسان کے سود و بہبود کے لئے تفصیل سے بیان فرما رہا ہے۔
المراد انه کما بین ما امرکم به ونهاکم عنه فی هذا الموضع کذلک یبین سائر ادلته علیٰ دینه وشرعه (کبیر) ای کما بین الصیام واحکامه وشرائعه وتفاصیله کذلک یبین سائر الاحکام علیٰ لسان عبده ورسوله. (ابن کثیر)

اٰیٰتِہٖ۔ آیات سے مراد احکام یا دلائل شرعی ہیں۔
ای امره ونهیه (ابن عباس) ای ادلته الدالة علیٰ حقیة مشروعاته (بحر) ای العلامات الهادیة الی الحق (قرطبی)

۶۸۵ (ان احکام الٰہی پر مطلع ہو کر)

احکامِ الٰہی کی عین تعمیل ہی پرہیزگاری ہے۔
لعلّ سے متعلق اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جب اس کا استعمال ہوتا ہے، تو معنیٰ میں شک و تردد نہیں، بلکہ یقین کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، یعنی احکام کی تعمیل تمہیں پرہیزگار بنا ہی دے گی، تجربہ کر لو۔

۶۸۶ (اے اہل ایمان!)

لَا تَاْکُلُوْٓا۔ اکل یہاں لفظی معنیٰ میں نہیں، یعنی صرف کھانا مراد نہیں، بلکہ کسی طرح اپنے تصرف میں لے آنا ہے۔
عبر بالاکل عن انفاق المال (راغب) عبر به عن الاخذ والاستیلاء (بحر)
اُردو محاورہ میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں، فلاں صاحب روپیہ کھا گئے، یا ہضم کر گئے۔

بِالْبَاطِلِ۔ باطل سے مراد ہے ہر ناجائز طریق۔
فاکل المال بالباطل صرفه الی ما ینافیه حق (راغب) ای بالوجه الذی لا یبیحه الله تعالیٰ (بیضاوی) والمراد بالباطل الحرام وکل مالم یأذن باخذه الشرع۔ (روح)

گویا دو مختصر لفظوں میں تقویٰ مالی کی ساری تعلیم آ گئی، ہر خیانت سے احتیاط کی تاکید اور ہر قسم کی امانت و دیانت کا حکم، اور فقہاء نے اکل باطل کی جو تفصیل لکھی ہے، اسی میں قمار، غصب، حق تلفی وغیرہ کے ساتھ ایک مد یہ بھی بڑھا دی ہے کہ وہ مال بھی باطل ہی کے حکم میں آ جاتا ہے جو مالا تطیب به نفس مالکه او حرمه الشریعة وان طابت به نفس مالکه۔ (قرطبی)

(اس مال کے مالک سے بغیر اس کی خوشدلی کے حاصل کیا جائے، یا مالک گو اُسے خوشدلی سے دے رہا ہو، لیکن خود شریعت نے اس مد کو ناجائز قرار دیا ہو)

اَمْوَالَکُمْ۔ خطاب تمام مومنین کو ہے، اور حکم کے مخاطب افراد اُمت ہیں۔

الخطاب بهذه الآية يتضمن جميع امة محمد صلى الله عليه وسلم. (قرطبی)

اردو میں اموالکم کا صحیح مفہوم "اپنا مال" سے نہیں بلکہ "ایک دوسرے کا مال" سے ظاہر ہوگا جیسے اَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے مراد "ایک دوسرے کا قتل کرنا" ہے۔

والمعنى لا يأكل بعضكم مال بعض (بحر) والمعنى لا يأكل بعضكم مال بعض بغير حق. (قرطبی)

ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس نے ایک کتاب قرآن مجید کے قوانین معاشرتی پر لکھی ہے، اس میں اس آیت کو نقل کر کے لکھا ہے:

"یہ آیت اس امر کی شہادتِ مزید ہے کہ محمدؐ نے اپنے پیروؤں میں کتنی تاکید باہمی حسنِ معاملت کی رکھی ہے؟"

(سوشل لاز آف دی قرآن، ص۱۰۱)

بَیْنَكُمْ کے دائرہ کی وسعت میں فقہاء نے ساری نسل آدم کو داخل کیا ہے، اور صرف مسلمانوں کے مال تک حکم کو محدود نہیں رکھا ہے، مسلم ہو یا کافر کسی کا بھی مال دغا، فریب، ظلم وغیرہ سے لینا جائز نہیں، صرف کافر حربی کے مال پر تصرف و تسلط جائز ہے کہ اس سے تو اعلانِ جنگ ہو ہی چکا ہے، لیکن اس سے بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ خاص خاص قیود و شرائط کے ساتھ، رشوت، جعلسازی، خیانت کافر حربی کے معاملات میں بھی درست نہیں۔

۶۸۹ (اگر تم ناحق اور زیادتی پر ہو)

دنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو، اور کوئی حاکم عادل سے عادل سہی، بہرحال دنیوی فیصلے علمِ غیب کی بنا پر نہیں، روداد مقدمہ ہی کی بنا پر صادر ہوں گے، اور ان میں غلطی، لغزش، ناانصافی، دھوکے کا احتمال ہر وقت ہے، آیت اسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ جو حق ہے وہ عند اللہ حق ہی رہے گا، اور جو ناحق ہے وہ اللہ کے ہاں ناحق ہی شمار ہوگا، اگرچہ حکام کا فیصلہ اس کے برعکس ہی ہو، قاضی کے فیصلے حق کو ناحق اور ناحق کو حق نہیں بنا سکتے، اصل شے انسان کی توجہ و لحاظ کے قابل خود اس کا ضمیر اور تقویٰ ہے، حدیث میں اس مضمون کی صراحت بہت زور کے ساتھ آچکی ہے اور مفسرین بھی اسے خوب صاف کر چکے ہیں۔

اعلم ابن آدم ان قضاء القاضي لا يحل لك حراما ولا يحق لك باطلا انما يقضي القاضي بنحو ما يرى ويشهد به الشهود والقاضي بشر يخطئ ويصيب (ابن جرير) ومن الاكل بالباطل ان يقضي القاضي لك وانت تعلم انك مبطل فالحرام لا يصير حلالا بقضاء القاضي لانه انما يقضي بالظاهر وهذا اجماع في الاموال (قرطبی) على القول بهذا الحديث جمهور العلماء وائمة الفقهاء وهو نص في ان حكم الحاكم على الظاهر لا يغير حكم الباطن (قرطبی) وهذا رسول الله صلى الله عليه وسلم المصطفى للاطلاع على الغيب يخبر لمن الباطل فكيف لغيره من الخلق (بحر)

بلکہ جو لوگ اپنی چرب زبانی سے یا سخن سازی سے اپنے "اثر" و "رسوخ" سے جھوٹے مقدمے جیت جائیں انہیں اور زیادہ ڈرنا چاہیے کہ ان پر علاوہ اور دوسرے جرائم اور فریق ثانی کی حق تلفی کے ایک مزید جرم حاکم عدالت کو فریب میں مبتلا کرنے کا بھی عائد ہوگا۔

تُدْلُوْا بِهَا۔ ھا کی ضمیر اموال کی طرف ہے۔ الهاء ترجع الى الاموال (قرطبی) والضمير المجرور للاموال (روح)

فعل اِدْلاء کا صلہ ہے تُدْلُوْا۔ اِدلاء کے معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے اور پھر مجازاً کسی چیز کو کہیں پہونچانے یا اسے ذریعہ یا وسیلہ بنانے کے ہیں۔

ادليتها اي ارسلتها وقيل دلوت بمعنى ارسلتها واستعير للتوصل الى الشيء (راغب) واصل الادلاء

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ

آپ سے (لوگ) نئے چاند کے باب میں دریافت کرتے ہیں ٦٩٠

ب ا الرجل الی الوالی بسبب متعلق به ۔ (ابن جریر)

مطلب یہ ہوا کہ مال کو حکام تک پہونچنے کا، اپنی رسائی اور رسوخ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ اور رشوت وغیرہ مالی تحفہ و تحائف سے حکام پر اثر نہ ڈالو۔

ای لا ترسوها الیهم (کذا) ای ملقوا بعضها الی حکام السوء علی وجه الرشوة (مدارک)

اسلامی حکومت قائم ہونا اور اسلام کے سارے قانون دیوانی و فوجداری کا نافذ ہونا تو خیر بڑی چیز ہے قرآن مجید کی صرف اسی آیت پر اگر آج عملدرآمد ہو جائے تو جھوٹے دعووں جعلی کاغذات جھوٹی گواہیوں جھوٹے حلف ناموں اہلکاروں اور عہدہ داروں کی رشوتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام کی خدمت میں نذر نذرانوں قیمتی ڈالیوں شاندار دعوتوں کا وجود کہیں باقی رہ جائے بِالْاِثْمِ گناہ کا لفظ عام ہے ہر قسم کی معصیتیں جو عدالتی کارروائیوں اور انتظامی معاملت کے سلسلہ میں کام میں لائی جاتی ہیں، اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔

معناه بالظلم والتعدی (قرطبی) بشهادة الزور وبالأیمان الکاذبة او بالصلح مع العلم بان المقضی له ظالم (مدارک)

فریقاً۔ فریق کے معنی یہاں پارٹی یا گروہ کے نہیں، بلکہ حصہ یا جزو کے ہیں۔

ای قطعة وجزء (قرطبی) قطعة وجملة (روح)

٦٩٠ (اے پیغمبر) کہ ان کے گھٹنے بڑھنے کی غایت کیا ہے؟)

اَلْاَهِلَّة۔ نیا چاند یا ہلال تو ایک وقت میں ایک ہی ہوتا ہے، لیکن یہاں سوال اہلّۃ (بصیغۂ جمع) سے متعلق ہے سوال عن الاهلة کے معنی ہوئے چاند کے مہینوں کے بابت دریافت کرنا یعنی پہلے چاند کا طلوع ہونا پھر تاریخ وار اس کا بڑھنا، اور پھر تاریخ وار اس کا گھٹنا یہاں تک کہ اس کا غائب ہو جانا۔

یرید بالاهلة شهورها قد یعبر بالهلال عن الشهر لحلوله فیه (قرطبی) ای عن زیادة الاهلة ونقصانها لماذا (ابن عباس) سئل رسول الله عن زیادة الاهلة ونقصانها واختلاف احوالها (ابن جریر)

ہلال۔ اردو محاورہ میں تو صرف پہلی تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں لیکن عربی میں اس کے مفہوم میں پہلی سے لے کر تیسری تاریخ تک کے چاند شامل رہتے ہیں۔

الهلال اول لیلة والثانیة والثالثة (صحاح) وهو القمر فی لیلتین او ثلاث من اول الشهر وفی الاخیر (اخبار)

چاند کے روزانہ (بلکہ شبانہ) تغیرات مشاہدہ کی چیزیں ہیں، اس لئے سوال بھی ان کی بابت آسانی سے دلوں میں پیدا ہوتا ہے آفتاب کے تغیرات عام نظروں کے لئے غیر مشاہد رہتے ہیں۔

وقد کانوا سألوه عن علة تهلله وتغیّره (راغب)

قرآن کا ایک ایک فقرہ توحید کے اعلان اور شرک کی تردید میں ہے دنیا میں مشرک قومیں کثرت سے قمر پرستی میں مبتلا رہی ہیں اور بعض ہلال پرستی میں بھی نئے چاند کو دیوتا مان کر اس کی پوجا کثرت سے کی گئی ہے اور بڑھتے چاند کو

قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا

آپ کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے آلۂ شناخت اوقات ہیں ۶۹۱ اور یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں کہ تم گھروں میں

الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ

ان کی پشت کی طرف سے آؤ ۶۹۲ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے ۶۹۳

مبارک اور اُترتے چاند کو منحوس سمجھنے کا رواج تو آج خدا معلوم کتنے مسلمان گھرانوں میں موجود ہے اور ہندوستان میں چھپی ہوئی جس جنتری کو چاہئے آج اٹھا کر دیکھ لیجئے ماس کے کتنے خانے اس سے بھرے نظر آئیں گے کہ فلاں تاریخ فلاں کام کے لئے سعد ہے اور فلاں تاریخ نحس! قرآن مجید نے عروج و زوالِ قمر کی یہ غایت بتا کر وہ انسان کے کام آنے والی چیزیں ہیں یعنی مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ ہلال پرستی اور اس کے ماتحت سارے خرافات کی جڑ ہی کاٹ دی!

احمق انسان! تو چاند کی کیا پوجا کر رہا ہے، چاند تو خود تیری خدمت کے لئے ہے!

۶۹۱ مَوَاقِيتُ جمع ہے میقات کی اور اس کے معنی وقت کے بھی ہیں اور نہائے وقت کے بھی اور وقت موعود معین کے بھی۔

جمع الميقات وهو الوقت وقيل الميقات منتهى الوقت (قرطبی) الوقت المضروب للشيء (راغب)

مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ یعنی ان کے معاملات دنیوی اور حسابات شرعی میں بھی سنہ قمری میں دنوں تاریخوں مہینوں کا حساب چاند کے عروج و زوال سے ہوتے رہنا ظاہر ہی ہے۔ مفسر تھانویؒ نے یہاں سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ جب اعمالِ شرعی کا مدار حساب قمری پر ٹھہرا تو اس حساب قمری کا اہتمام و انضباط بھی فرض کفایہ ہوا، جنھیں انگریزی سنہ سے کاروبار رکھنا ضرورت کے درجہ میں آپڑا ہے ان کے لئے تو خیر عذر بھی ہے لیکن بلا ضرورت سنہ ہجری قمری اسلامی کو چھوڑ کر سنہ شمسی عیسوی انگریزی اختیار کر لینا واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔

وَالْحَجِّ۔ قمری مہینے عام معاملاتِ انسانی کا تو کام دیتے ہی ہیں، اور ان کے علاوہ حج اور دوسری طاعتوں اور عبادتوں کے لئے بھی معیار و مدار وہی ہیں، حج کا ذکر تخصیص کے ساتھ شاید اس لئے فرمایا گیا ہو کہ اس کی اہمیت عرب کے ہر شعبۂ زندگی میں بہت نمایاں تھی۔

۶۹۲ (جیسا کہ مشرکین عرب اپنی سفاہت سے سمجھ رہے ہیں)

جاہلی عرب جب احرام حج کی حالت میں ہوتے تو گھر میں جانے کے لئے دروازہ سے داخل ہونے کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے، بلکہ پشت کی دیوار میں ایک بڑا سا روزن پیدا کر دیتے اور اس کے اندر سے مکان میں داخل ہوتے، یا پیچھے کی طرف سے چھت پر چڑھ جاتے اور اس سے اندر پھاند آتے اور اسے اپنے نزدیک کوئی بڑی عبادت اور خانۂ کعبہ کی تعظیم سمجھتے۔

كانوا اذا احرموا فى الجاهلية اتوا البيت من ظهرها (بخاری) كانوا اذا حجوا العرب خلوا بيوتهم من ابوابها كانوا ينقبون فى ادبارها (ابن جرير) اذا احرم الرجل نقب كوة فى ظهر بيته فجعل سلما فجعل يدخل منها۔ (ابن جرير)

بعض قبیلوں کے نومسلم صحابی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، انھیں کے اصلاحِ خیال کے لئے آیت نازل ہوئی، اور عقیدۂ جاہلی کی تصحیح کی گئی!

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٨٩﴾

اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ^٦٩٤ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کئے رہو، تا آنکہ فلاح پا جاؤ^٦٩٥

نزلت فی نفر من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کنانۃ وخزاعۃ کانوا یدخلون بیوتھم فی الاحرام من ظھورھا ومن سطحھا کما فعلوا فی الجاھلیۃ۔ (ابن عباس)

مفسر قرطبیؒ نے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ انصار مدینہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتے تھے تو اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا تقویٰ اور آداب احرام کے خلاف سمجھتے تھے اور واپسی میں اپنے مکان میں دروازوں سے نہیں داخل ہوتے تھے،

وکان الانصار اذا حجوا وعادوا لایدخلون من ابواب بیوتھم... فکانوا یرون ھذا من النسک والبر۔ (قرطبی)

یہ رسم چونکہ حج ہی کے سلسلہ میں تھی، اس لئے اس کا ذکر بھی حج ہی کے متصل فرمایا گیا۔

^٦٩٣ (اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی منع کی ہوئی اور حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے ڈر جائے بچا جائے)

ای فخافہ وتجنب محارمہ والطاعۃ باداء فرائضہ التی امرہ بھا۔ (ابن جریر)

ضمناً یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ اصل نیکی تقویٰ الٰہی ہے، یعنی احکام الٰہی کی خلاف ورزی کا خوف، نہ کہ اپنے کسی گڑھے ہوئے دستور و رواج کا اتباع۔

البر یہاں بار کے معنی میں ہے۔

البر ھنا فی موضع البار۔ (مجاز)

^٦٩٤ (جب آنا چاہو، اور گویا رسوم شرک و جاہلیت کو پامال کرتے ہوئے)

آیت سے فقہاء امت کو ایک بڑی اصل ہاتھ آگئی ہے جس سے صدہا ہزارہا اعمال کا حکم معلوم ہو سکتا ہے وہ اصل یا قاعدہ یہ ہے کہ جو شے شریعت میں صرف مباح ہو یعنی کتاب و سنت میں اس کی کوئی نظیر یا مثال مستحب یا عبادت کے حکم میں نہ ملے اسے اپنے دل سے طاعت و عبادت ٹھہرا لینا، یا اسی طرح اسے بلا دلیل شرعی معصیت و محل ملامت یقین کر لینا، یہ دونوں اعتقاد گناہ ہیں، اور ہر بدعت اسی حکم میں داخل ہے۔

ھذا دلیل علی مسئلۃ من الفقہ وھی ان الفعل بنیۃ العبادۃ لا یکون الا [illegible] وھذا اصل حسن (ابن العربی) فی ھذہ الآیۃ بیان ان مالم یشرعہ اللہ قربۃ ولا ندب الیہ لا یصیر قربۃ بان یتقرب بہ متقرب (قرطبی) قال ابن [illegible] ینظر فی ذلک العمل فلما کان لہ نظیر فی الفرائض والسنن فیجوزان یکون وان لم یکن فلیس بطاعۃ ولا قربۃ۔

قرطبیؒ نے ابن عباسؓ کی سند سے حدیث نبوی بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑا ہے، دریافت فرمایا، معلوم ہوا کہ وہ ابو اسرائیل انصاری ہیں اور اس کی نذر مانے ہوئے ہیں کہ روزہ رکھ کر بیٹھیں گے نہیں، کھڑے ہی رہیں گے، اور سایہ میں نہ کھڑے ہوں گے اور کسی سے بات چیت نہ کریں گے، خاموش رہیں گے، آپؐ نے فرمایا کہ:-

مروہ فلیتکلم ویستظل ... انھیں وہاں سے ہٹا دو، بات چیت کریں اور

وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا

اور اللہ کی راہ میں لڑو ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں ۶۹۶ اور حد سے باہر مت نکلو۔

ولیقعد ولیتم صومہ　ما میں رہیں اور بیٹھے بھی جائیں اور اس حال میں روزہ تمام کریں۔

اسلام تام صرف امتثالِ امر کا ہے اور ایمان کی حقیقت فقط تعمیلِ احکام کی ہے خود رائی اس راہ میں تمام تر کج رائی ہے۔

۶۹۵ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

تقویٰ (خوفِ خدا) اور فلاح (انتہائی کامیابی) کے قریب ترین تعلق کو آیت ایک بار پھر واضح کرتی ہے اور اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتی ہے کہ فلاح دارین کا اصل اصول تقویٰ ہے خشیتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی کے درمیان نسبت تضاد و تخالف بلکہ تباین کی بھی بالکل نہیں، بلکہ علاقہ توافق و مناسبت کا ہے مخلوقات میں جس کسی چیز سے خوف کیا جاتا ہے اس میں خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے بھگاتی ہے ہٹاتی ہے دور کرتی ہے لیکن خشیتِ الٰہی میں تو اس کے برعکس ایک کشش ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف لاتی ہے کھینچتی ہے بلاتی ہے اللہ سے قریب تر کرتی ہے اور اس طرح عملاً محبتِ الٰہی کے مرادف ہے اہلِ تقویٰ اور صالحین سے جس خوف کی نفی کی گئی ہے وہ "دہشت" کے مرادف ہے اور وہ "وحشت" سے پیدا ہوتا ہے خشیتِ الٰہی اس کے ٹھیک برعکس احساسِ عظمت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ ربِ عظیم و معظم سے قریب تر لانے والی ہوتی ہے۔

خوفِ خدا کی ترغیب اور خشیتِ الٰہی کی تاکید سے قدیم صحیفے بھی لبریز ہیں۔ مثلاً:۔

"خداوند کا خوف دانش کی ابتداء ہے" (امثال سلیمانی ۱۔۷) "خداوند کا خوف دانائی کا شروع ہے" (امثال سلیمانی ۹۔۱۰) "خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے" (واعظ کی کتاب ۱۲:۱۳)

۶۹۶ قَاتِلُوۡا (قتال کا یہ حکم ان مظلوم مسلمانوں کو مل رہا ہے جو دو چار مہینے نہیں پورے تیرہ برس مکہ میں ہر طرح کے شدائد پر اور شدائد کیسے، یہ کہئے شقاوت، سفاکی، بہیمیت پر صبر کے امتحان میں پورے اتر چکے تھے اور اب وطن سے بے وطن ہو کر گھر بار چھوڑنے پر بھی مدینہ میں چین سے نہیں بیٹھنے پاتے تھے اللہ تربت ٹھنڈی رکھے لارڈ ہیڈلے انگریز کی نومسلم ہو کر بات پتہ کی کہہ گیا ہے کہ تین ابتدائی اسلامی غزوات کے جغرافی محل وقوع کو دیکھ کر خود فیصلہ کر دو کہ لڑائی کی ابتدا کس نے کی اور چڑھائی کون کس پر کر کے گیا تھا؟ حملہ اور جارحانہ اقدام کون کر رہا تھا اور حفاظت خود اختیاری مدافعت میں کون لڑ رہا تھا؟ مکہ کے جنگجو اہلِ فساد یا مدینہ کے صابر و شاکر مومنین؟

(۱) غزوۂ بدر۔ بدر مدینہ سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

(۲) غزوۂ اُحد۔ اُحد تو مدینہ سے کل ۱۲ ہی میل ہے۔

(۳) غزوۃ الاحزاب۔ یا جنگ خندق، اس میں محاصرہ تو خاص مدینہ ہی کا ہوا۔

غرض ہر دفعہ قریش مکہ یا ان کے حلیف و مددگار ہی مدینہ چڑھ کر آئے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ یہ سب سے پہلی آیت ہے جو سلسلۂ قتال میں نازل ہوئی ہے ورنہ اس سے پہلے جہاد ممنوع تھا

ھذہ الآیۃ اول آیۃ نزلت فی الامر بالقتال۔ (قرطبی)

ورنہ ہجرت کے قبل قتال ممنوع تھا، بلکہ آیتیں اس کے روک تھام کی نازل ہوتی رہتی تھیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

کہ اللہ حد سے باہر نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۶۹۷

قوم کے لئے رہ جاتی ہے یہ خصوصیت صرف اسلامی جہاد "بدنام و رسوا" اسلامی جہاد کی ہے کہ جب کبھی اور جن حالات میں شروع ہو' اللہ کی راہ میں ہو' شرک کو مٹانے اور توحید کو بلند کرنے کے لئے ہو' دین حق کی حمایت و نصرت میں ہو' انسانی حکومت مٹا کر خدائی حکومت قائم کرنے کے لئے ہو' خودی کے لئے نہیں خدا کے لئے ہو' نفس کے لئے قبیلہ کے لئے "حلقہ اثر" کی توسیع کے لئے "آزادئ تجارت" کے لئے "آزادئ سمندر" کے لئے "نوآبادیوں کے تحفظ" کے لئے "برآمد کی منڈیاں" پیدا کرنے کے لئے' غرض نسلی اور ملکی کسی قسم کی بھی عصبیتِ جاہلی کے جھنڈے کے نیچے نہ ہو' صاف فی سبیل اللہ ہو' اور فی سبیل اللہ کے معنی ہیں لاعزاز دین اللہ۔

الجهاد لاعلاء كلمة الله واعزاز الدين (مدارك) اى جاهدوا لاعلاء كلمته واعزاز دينه (بيضاوى) هى دينه واظهار الكلمة (قرطبى) اى فى طاعته وطلب رضوانه (كبير)

قتال' دوسری اُمتوں سے نرالا کچھ امتِ محمدی کے ساتھ مخصوص نہیں بائبل میں اس کا ذکر ایک دو جگہ نہیں' بیسیوں جگہ موجود ہے' اور محارباتِ یہود سے تو تاریخ کے دفتر کے دفتر رنگین ہیں باقی مسیحی قومیں اور اُن کی خونریزیاں اور خون آشامیاں تو ان کی تفصیل تو دنیا کے پردہ پر کہیں نہ ملے گی عیاں راچہ بیاں' البتہ جو نمایاں فرق اسلامی فاتحین کی رحم دلی اور مسیحی فاتحین کی سنگدلی کے درمیان رہا ہے' اس کا اعتراف تو خود مسیحی اہل قلم کو ہے' مثال کے لئے ملاحظہ ہو:

FINLAYS GREECE UNDER THE ROMANS ص ۳۵۳ نیز

BOSWORTH SMITH'S MOHAMMED & MOHAMMEDANISM ص ۲۱۷ و ص ۲۱۸

امام رازیؒ نے فرمایا کہ آیت ماقبل میں ابھی ابھی تقویٰ کی تاکید آچکی ہے' اب اسی مناسبت سے ذکر تقویٰ کی شدید ترین اور نفس کے لئے دشوار ترین قسم یعنی قتال و جہاد کا شروع ہوا ہے۔

لما امرها بالتقوى امر فى هذه الاية باشد اقسام التقوى واشقها على النفس (كبير)

۶۹۷ وَلَا تَعْتَدُوْا۔ اِعْتِدَاء۔ کے لغوی معنی حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں مجاوزۃ الحق اور اس تجاوز کی متعدد صورتیں ممکن ہیں' حد سے مراد حدِ شریعت بھی ہو سکتی ہے' مثلاً یہ کہ انتقام کے جوش یا تمندی کے زور میں بے تحاشا غنیم کے معانی وغیرہ مصافی سب کو قتل کرنا شروع کر دیا جائے' ان کے کھیتوں' باغوں' چراگاہوں میں آگ لگا دی جائے' اُن کے بے زبان جانور تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے جانے لگیں' وقس علیٰ ہذا' قرآن نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ قوت کا استعمال صرف اسی حد تک جائز ہے جس حد تک ناگزیر ہے' حد سے مراد حدِ معاہدہ بھی ہو سکتی ہے' مثلاً یہ کہ بدعہد و پیمان شکن قوموں کی دیکھا دیکھی خود بھی معاہدوں کی پروا نہ کی جائے اور عہد شکنی کی ابتدا اپنی طرف سے کر کے بدلہ لے دیا جائے' اسی طرح اور بھی پہلو تجاوز حدود کے نکل سکتے ہیں' حق یہ ہے کہ اعتداء کا لفظ زیادتی کے ہر پہلو کو جامع ہے اور ہر قسم کی زیادتیوں کی ممانعت اس شکل آتی

اى لا تعتدوا بابتداء القتال او بقتال المعاهد او المفاجاة به من غير دعوة او المثلة او قتل من نهيتم عن قتله (بيضاوى) اى لا تعتدوا والوجه ان الوجوه يؤيد بان الفعل المنهى بنفى العموم۔ (روح)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ

اور انھیں جہاں کہیں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم انھیں نکال دو ۶۹۸

اسلام اس قسم کی زیادتی سے ممانعت کی تاکید عین اس وقت کے لیے ہو رہی ہے، جب دل جوشِ انتقام سے بھرے ہوتے ہیں، اور جب غنیم کے ہر ظلم و زیادتی کا جواب جی یہی چاہتا ہے کہ بھرپور انتقام سے دیا جائے! اس تعلیم کو آج کی "ترقی یافتہ" دنیا دیکھے، جو (REPRISALS) کا نام لے کر ہر سنگدلی، ہر بربریت، ہر درندگی، ہر جلادی کو روا رکھے ہوئے ہے۔ اور اعتداء اور تجاوز کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ قتال علاوہ فی سبیل اللہ کے کسی اور غرض کے لیے شروع کر دیا جائے، چنانچہ بعض دقیق النظر مفسرین نے یہ پہلو بھی لیا ہے:-

ای لا تقاتلوا علی غیر الدین (ابن العربی) ای لا تعتدوا فی القتال لغیر وجہ اللہ [illegible] وکسب المال .... وقیل لا تعتدوا ای لا تقاتلوا من لم یقاتل (روح)

غلبہ و اقتدار کے وقت انتقام کے حدود کے اندر رہنا اخلاق کے مرتبۂ اعلیٰ کا مقام ہے، اچھے اچھوں کی عقل، متانت اور قوتِ عدل و توازن اس وقت جواب دے دیتی ہے، اور کل کے مظلوم بے ساختہ اور شاید بے شعوری کے عالم میں آج کے ظالم بن جاتے ہیں، قرآن مجید کا اس موقع پر اپنے پیروؤں کو ضبط و احتیاط کی تلقین کرنا، افرادِ امت کو حکمت و اخلاقِ فاضلہ کے بلند سے بلند مقام تک پہونچا دیتا ہے، اور پھر جب یاد کر لیا جائے کہ آیت کا موقع نزول ذی قعدہ سنہ ۷ ہجری ہے، جب معاہدۂ حدیبیہ کے دوسرے سال مسلمان عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہو رہے تھے اور اندیشہ تھا کہ مشرکین معاہدہ کو توڑ کر جنگ شروع کر دیں گے، اور اس کے جواب میں قدرۃً مسلمان بھی اشتعال سے لبریز ہو جائیں گے، تو آیت کے اس تاکیدی اور امتناعی حکم کی قدر و منزلت کس درجہ اور بڑھ جاتی ہے! پھر فتحمندی کی گھڑیوں میں ایسی ہدایت پر عمل دنیا کی کسی قوم نے آج تک کیا ہے؟ بجز رسول کے صحابیوں اور خلافتِ اسلامیہ کے سپاہیوں کے؟ سوال عقیدت کا نہیں، محض تاریخ کا ہے۔

۶۹۸ وَاقْتُلُوْهُمْ میں هُمْ کی ضمیر انھیں لوگوں کی طرف ہے جو مسلمانوں سے لڑ رہے تھے۔

والضمیر عائد الی الذین أمر بقتالهم فی الآیة الاولی (بحر)

حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ یعنی ان ظالمین محاربین کو تم جہاں کہیں بھی پکڑ پاؤ، اور جب کبھی ان پر غلبہ حاصل کر پاؤ قتل کر دو۔

ھم الکفار من اھل مکة و مراد اللہ تعالی بقتلھم حیث کانوا فی حل او حرم و فی الشهر الحرام (کبیر) ای حیث وجدتموھم من حل او حرم (ابو سعود)

وَاقْتُلُوْا کے صیغۂ جمع سے فقہاء حنفیہ نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ قتال و جہاد فریضۂ انفرادی نہیں ہے، امام کی معیت میں ہے، لشکر کا وجود و ترتیب بطور جماعت [illegible] اور امام کا بطور نفس، [illegible] انتظام و اجتماع بغیر ایک امام کے ممکن نہیں۔

مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ یعنی سرزمین مکہ سے [illegible]

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ

اور فتنہ تو قتل سے (بھی) سخت تر ہے ۶۹۹؎ اور اُن سے مسجد حرام کے قریب قتال نہ کرو،

الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ

جب تک وہ (خود) تم سے قتال نہ کریں نہ ہاں اگر وہ (خود) تم سے قتال کریں تو (تم بھی) انہیں قتل کرو

وَاقْتُلُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ۔ مراد یہ ہے کہ سرزمین مکہ سے انھیں چاہے مارو چاہے نکالو جو بھی تمھیں اپنی قدرت و مصلحت کے مطابق نظر آئے۔

والمراد افعلوا كل ما يتيسر لكم من هذين الامرين في حق المشركين. (روح)

۶۹۹؎ (اپنی شرارتوں اور مفسدوں کے لحاظ سے)

مفسر تھانویؒ نے خوب لکھا ہے کہ مشرکوں کی شرارت جسے یہاں فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے، وہی تو اصل جرم تھی اور اخراج و قتل وغیرہ اس کی سزائیں تو محض فروع ہوئیں۔

اَلْفِتْنَةُ۔ فتنہ سے مراد شرک یا اس کی ترغیب و تحریص اور اہل توحید کی تعذیب ہے۔

الفتنة، الشرك بالله وعبادة الاوثان (ابن عباس) اقدام الكفار على الكفر وعلى تخويف المؤمنين (كبير) روى عن جماعة من السلف ان المراد بالفتنة ههنا الكفر وقيل انهم كانوا يفتنون المؤمنين بالتعذيب ويكرهونهم على الكفر. (جصاص)

کفر و ترغیب کفر کو فتنہ سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ نظام کفر آخر دنیا کو فتنہ و فساد، کشت و خون، غدر و بدامنی ہی کی طرف لے جاتا ہے۔

انما سمى الكفر بالفتنة لانه فساد في الارض يؤدي الى الظلم والهرج وفيه الفتنة (كبير)

اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ یعنی حرم میں قتل و خون سے بھی شناعت میں کہیں بڑھا ہوا درجہ اس مرکز توحید و ایمان میں شرک و اشاعتِ شرک و تبلیغ شرک کا ہے۔

اشد من القتل في الحرم (ابن عباس) اى شركهم بالله اعظم من القتل الذي يحل بهم منكم (مدارك) يجوز ان يراد فتنتهم اياكم بصدكم عن المسجد الحرام اشد من قتلكم اياهم في الحرم (كشاف)

يعني كفرهم وتعذيبهم المؤمنين في البلد الحرام في الشهر الحرام اشد واعظم ماثما من القتل في الشهر الحرام. (جصاص)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مکہ والوں کی یہ مسلسل و غیر منقطع تعدیاں اور مظالم قتل سے بھی کہیں زیادہ سخت و ناقابل برداشت ہیں، اور بعض قدیم اکابر کی نظر بھی اسی پہلو کی طرف گئی ہے۔

اى المحنة التي تنزل بالانسان كالاخراج من الوطن اصعب من القتل لدوام تعبها وبقاء تالم النفس بها (بيضاوي) اى المحنة والبلاء الذي ينزل بالانسان يتعذب به اشد عليه من القتل (كشاف) الاخراج من الوطن لما فيه من مفارقة المألوف والاحباب وتنغص العيش دائما. (بحر)

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

یہی سزا ہے کافروں کی ۷۱۵۔ پھر اگر وہ باز آجائیں ۷۱۶۔ تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۷۱۷۔

ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ یہاں فتنہ سے مراد وہ ابدی عذاب اُخروی ہے جو انھیں کفر کی سزا میں ملے گا گویا ارشاد یہ ہے کہ وہ دائمی عذاب دنیا کی سزائے قتل سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور عذاب پر اس معنی میں فتنہ کا اطلاق جائز ہے۔

المراد من الفتنة العذاب الدائم الذی یلزمهم بسبب کفرهم [illegible] واطلاق اسم [illegible] علی العذاب جائز وذلك من باب اطلاق اسم السبب علی المسبب [illegible] والکفر بالله [illegible] العذاب دائما والقتل لیس کذلك۔ (بحر)

۷۱۳ (کہ یہاں قتال کی ابتدا بلا وجہ اور بلا ضرورت کر دینے سے حدود حرم کی ہتک لازم آتی ہے) عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی حرم شریف یا مسجد کعبہ کے گرد و نواح میں کئی میل کا پورا رقبہ جو اصطلاح میں حرم کہلاتا ہے اور اس کے احترام کے خاص آداب و قواعد ہیں۔

عندنا المسجد الحرام یقع علی الحرم کله۔ (مدارك)

نزولِ آیت کے وقت مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان عارضی صلح کا معاہدہ تھا۔ یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اس پاسِ معاہدہ کے علاوہ مسلمانوں کے لیے یہ دوسرا مانعِ احترام حدودِ حرم کا بھی تو ہے۔ بعض [illegible] فقہائے حنفیہ نے آیت سے یہ مستقل حکم نکالا ہے کہ مسجد حرام میں قتل و قتال ناجائز ہے تا وقتیکہ [illegible] نہ ہو۔

قال مجاهد لا یجوز قتال احد فی المسجد الحرام الا بعد [illegible] وبه قال ابو حنیفة [illegible] وهو [illegible] یقتضیه نص الآیة (قرطبی) والیه ذهب ابو حنیفة و [illegible] [illegible] حکم قاله مجاهد وابو حنیفة (ابن عربی)

۷۱۴ حفاظتِ خود اختیاری حدودِ حرم کے اندر بھی قتال کو جائز کر دے گی۔

كَذٰلِكَ۔ یعنی یہی سزائیں جو اوپر گزر چکیں، وطن سے اخراج اور حدودِ حرم کے اندر قتل۔

جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی ایسے معاند، پیمان شکن، بے ادب کافروں کی سزا۔

کفار کے ساتھ جب کہ شرائط جواز کے پائے جائیں ابتداءً قتال کرنا درست ہے اور اس مقام پر [illegible] سے ممانعت فرمائی ہے تو وہ صرف بوجہ معاہدہ کے ہے تو معاہدہ میں [illegible] مصلحت نہ ہو تو صاف اطلاع کر دی جائے کہ ہم وہ معاہدہ باقی نہیں رکھتے پھر قتال جائز ہے [illegible] اگر وہ لوگ معاہدہ توڑ دیں تب بھی قتال جائز ہے۔ (بیان القرآن)

۷۱۵ (محض جنگ سے نہیں جسے انھوں نے شروع کیا تھا، بلکہ عقیدہ کفر و شرک سے جو موجب و باعث بنے ہوئے تھے جنگ و قتال کے)

ای عن الکفر والشرك [illegible]

بالله (ابن عربی) عن الشرك والقتال [illegible]

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ

اور اُن سے لڑو یہاں تک کہ فسادِ (عقیدہ) باقی نہ رہ جائے ۷۰۴ اور دین اللہ ہی کے لئے رہ جائے ۷۰۵

وإما بالوالی الاسلام (ابن کثیر) عن الكفر بالتوبة منه كما روی عن مجاهد وغيره او عنه وعن القتال۔ (روح)

فَاِنِ انْتَهَوْا میں ضمیر غائب کفار محاربین کی طرف ہے، حرفِ تعقیب ف سے مراد ہے جنگ شروع کرنے کے بعد۔ جن مفسرین جدید نے اِنْتَهَوْا سے صرف جنگ سے باز آجانا مراد لیا ہے، انھوں نے بہت کمزور پہلو اختیار کیا ہے۔

۷۰۳ (اس لئے ان کی توبہ قبول کرلی جائے گی، انھیں دائرۂ اسلام میں داخل سمجھا جائے گا، اور ان کے اسلام کو لا حاصل یا بے قدر نہیں سمجھا جائے گا)

آیت کے اس جزو نے (فَاِنِ انْتَهَوْا کے اس مفہوم کو خود قرآن ہی سے واضح کردیا کہ مراد کفر و شرک سے باز آجانا ہے نہ کہ محض جنگ و قتال سے، صفاتِ مغفرت و رحمت کا ترتب کفر ہی سے تائب ہونے پر ہوسکتا ہے نہ کہ محض ترکِ جنگ پر۔ جو کفر سے تائب ہوگیا اس کے پچھلے گناہ بھی معاف ہوجائیں گے اور آئندہ بھی اس کے ساتھ معاملہ رحمت کا ہوگا، جیسا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ ہے قل للذين كفروا ان ينتهوا يغفر لهم ما قد سلف۔

— غفور لمن تاب ويحملهم على ما نعلى التوبة (ابن عباس) فان الله يغفر لهم جميع ما تقدم ويرحم كلا منهم بالعفو عما اجترم (ابن العربی) ولذلك علق عليه الغفران والرحمة وهما لا يكونان مع الكفر (بحر) فان الله يغفر لهم ذنوبهم ولو كانوا قد قتلوا المسلمين في حرم الله فانه تعالى لا يتعاظمه ذنب ان يغفره لمن تاب منه اليه (ابن کثیر)

فقہاء مفسرین نے اس آیت سے قاتل کی قبولِ توبہ کا مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جب کفر کی توبہ قبول ہوسکتی ہے تو قتلِ عمد تو کفر سے خفیف تر ہے، اس کی توبہ کیوں نہ قبول ہوگی۔

دلت الاية على ان التوبة من كل ذنب مقبولة وقول من قال التوبة عن القتل العمد غير مقبولة له خطاء لان الشرك اشد من القتل فاذا قبل الله توبة الكافر فقبول توبة القاتل اولى (کبیر) وفيه دلالة على قبول قاتل العمد اذ كان الكفر اعظم مأثما من القتل وقد اخبر تعالى انه يقبل التوبة من الكفر (بحر روح) هذا يدل على ان قاتل العمد له توبة اذ كان الكفر اعظم مأثما من القتل وقد اخبر الله انه يقبل التوبة منه ويغفر له (جصاص)

۷۰۴ (ان لوگوں میں یا سرزمین عرب پر)

قٰتِلُوْهُمْ میں هُمْ کی ضمیر کس کی طرف ہے؟ جنگ جاری رکھنے کا حکم کس کے مقابلہ میں دیا جارہا ہے؟ ظاہر ہے کہ مراد کفار مطلق صورت میں بھی ہوسکتے ہیں اور مشرکین عرب بھی سمجھے جاسکتے ہیں لیکن فقہاء حنفیہ اور بہ کثرت تابعین نے مراد مشرکین مکہ ہی سے لی ہے۔

ومن رآها غير ناسخة قال المعنى قاتلوا هؤلاء الذين قال الله فيهم فان قاتلوكم (قرطبی) وهم كفار مكة والفتنة ههنا الشرك ولا يدخل فيهم سنة اهل الكتاب في قبول الجزية فانه يعني

فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ

سو اگر وہ باز آجائیں ۶۶۸ تو سختی (کسی پر بھی) نہیں بجز (اپنے حق میں ظلم کرنے والوں کے ۶۶۹ حرمت والا مہینہ تو

بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ

حرمت والے مہینہ کے عوض میں ہو تا ہے اور حرمتیں معاوضہ کی چیزیں ہیں ۶۷۰

۶۶۸ (اپنے کفر و انکار سے اور ملتِ اسلامیہ میں داخل ہو جائیں)

عن قتالکم ودخلوا ملتکم واقروا بما الزمکم اللہ من فرائضہ (ابن جریر) عن الکفر واسلموا (معالم)

۶۶۹ (جو اسی بے انصافی کی راہ سے اب تک دین توحید تک سے منکر ہیں)۔

اور جب یہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اب اپنے حق میں ظالم باقی نہیں رہے اور اب ان کے حق میں سزائے قتل وغیرہ کا حکم باقی نہ رہا۔

فلا سبیل لکم بالقتل (ابن عباس)

عُدْوَان۔ کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، یہاں سزا اور سزائے قتل کے معنی میں ہے۔

والمراد من العدوان ههنا المعاقبة والمقاتلة (ابن کثیر) ای العقوبة بالقتل (روح)

عربی اسلوب بیان میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ جزاءِ عمل کے موقع پر بعینہٖ وہی لفظ بول دیا جاتا ہے جو خود اس عمل کے لئے ہوتا ہے، مثلاً مَکْر کے جواب میں مَکْر ہی کا لفظ، کَیْد کی سزا کے موقع پر لفظ کَیْد کا استعمال اِسْتِهْزَاء کے مقابلہ میں لفظ اِسْتِهْزَاء وغیرہ علی ہذا۔ اس صنعت کا نام مشاکلت ہے، اور قرآن مجید نے عربی بلاغت کی دوسری صنعتوں کی طرح اس کا بھی بار بار استعمال کیا ہے۔ چنانچہ یہاں سزائے عُدْوان کے موقع پر خود لفظ عُدْوان کا لانا اسی طرز پر ہے۔

ومن العدوان الذی هو علی سبیل المجازاة قوله فلا عدوان الا علی الظالمین رد علیه به ذلك علی وجه المجازاة لما كان من المشركین من الاعتداء (ابن جریر) سمی جزاء الظالمین ظلما سمت كله (كشاف) اراد هنا بالعدوان الجزاء بقول لا جزاء ظلم الا علی ظالم (ابن قتیبه)

۶۷۰ یعنی کسی مہینہ کی حرمت کی بنیاد تو بس اسی پر ہے کہ دوسرا فریق بھی اس کی حرمت لازم رکھے گا، اگر یہ نہیں تو پھر کسی مہینہ کی حرمت کی بنیاد ہی نہیں، یہ چیز تو محض عوض معاوضہ کی اور طرفین کے تعامل پر مبنی ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ۔ کے لفظی معنی ہیں "حرمت والا مہینہ"۔ عرب قبل اسلام آپس میں سخت جنگجو چلے آرہے تھے، لیکن آپس میں یہ بھی ٹھہر گئی تھی کہ سال میں چار مہینے جنگ بند رہے اور یہ زمانہ امن و صلح کے ساتھ گزارا جائے۔ اور یہ چار مہینے یہ تھے: مُحرّم سنہ قمری کا پہلا مہینہ، رجب سنہ قمری کا ساتواں مہینہ، ذی قعدہ سنہ قمری کا گیارھواں مہینہ، ذی حجہ سنہ قمری کا بارھواں مہینہ۔ یہاں اشارہ ذی قعدہ سنہ ۶ھ کی جانب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقصد عمرہ اس وقت صحابیوں کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے تھے، لیکن مشرکین آمادۂ قتال ہو گئے تھے، چند تیر اندازی اور سنگ باری شروع کر دی تھی۔ عرب جاہلیت اپنی جہالت، تشدد و جنگجوئی کے لئے بدنام اور بالکل بجا طور پر بدنام ہے، لیکن اس کے باوجود سال کے

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۚۖۛ

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو ۷۱۳ اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو ۷۱۴

یہ اسلام کا معجزانہ کمال ہے کہ ایک طرف تو قتال اور انتقام کی اجازت پوری پوری دی اور دوسری طرف آخر میں پھر یہ بھی یاد دلا دیا کہ دیکھنا حدود سے تجاوز کسی حال میں بھی نہ ہو جوش پر قابو ہر صورت رکھنا یہ نہ ہو کہ اُلٹی زیادتی تم اپنی طرف سے حالتِ انتقام میں کرنے لگو، خوفِ خدا، بازپرس کا خیال، ہر وقت مستحضر رہے، جو کچھ بھی ہو شدید اشتعال کے موقع پر بھی ہیجانِ نفس کے ماتحت نہیں خشیتِ الٰہی ہی کے ماتحت ہو!

واعلموا ان المؤمنين في حرماته وحدوده ان تعتدوا فيها۔ (ابن جریر)

اللہ اکبر! اس حکیمانہ امتزاج کی نظیر، دنیا کے کسی قانون کسی آئین کسی نظام کے اندر ملے گی؟

۷۱۲ اللہ اللہ! کتنی بلند و پُرحکمت تعلیم ہے، ابھی ابھی انتقام میں بھی اہلِ ایمان پر تقویٰ کی زبردست قید عائد کی جا چکی ہے اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ان احکام سے کہیں پست ہمت نہ ہو جانا اور یوں نہ خیال کرنے لگنا کہ "حدود و قیود" عائد کرکے ہم کو زور مقابلہ سے روکا جا رہا ہے اور ان کے بعد ہم کے حوصلے پوری طرح کیونکر نکل سکیں گے؟ نوبت یہ نہیں ہے بلکہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ کی فتح و نصرت، رحمت، عنایت شاملِ حال انہی لوگوں کے رہتی ہے جو اس کی خشیت و عظمت اپنے دل میں رکھتے ہیں اور متقی ہوتے ہیں۔ التقویٰ کی تاکید میں نصرت، ہمت افزائی کے لئے ہے ضعف پیدا کرنے کے لئے نہیں۔

مَعَ الْمُتَّقِیْنَ متقین کے ساتھ اللہ کی معیت کی آخر نوعیت کیا ہوتی ہے؟ محققین کا فیصلہ ہے کہ اللہ کی معیت بلحاظ اس کی نصرت، اعانت، حفظ، علم وغیرہ کے ہوتی ہے نہ کہ کسی جسمانی یا مادی اعتبار سے۔

اي بالمعونة والنصرة والحفظ والعلم (كبير) النصر والعون (روح) بالنصرة والتمكين والتائيد (بحر)

اور یہیں سے امام رازیؒ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ حق تعالیٰ نہ مجسم ہے اور نہ وہ کسی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے، جیسا کہ ہر جسم کسی متعین جگہ کو اپنے سے لبریز کر دیتا ہے۔

وهذا من اقوى الدلائل على انه ليس بجسم ولا في مكان. (كبير)

۷۱۳ (اپنا مال)

جان قربان کر ڈالنے کا حکم تو قتال کے ذیل و ضمن میں آ چکا، اب حکم صرفِ مال کا مل رہا ہے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اس قید کا خوب خیال رہے، اسلام میں جس طرح محض جان دے دینا مطلوب و مقصود نہیں، بلکہ وہ جان دینا مطلوب و مقصود ہے جو خدا کی راہ میں ہو، اللہ کے دین کی بڑائی کے لئے ہو، اسی طرح مطلق صرفِ مال کی ہرگز کوئی وقعت و قدر نہیں، قدر صرف اُس صرفِ مال کی ہے، جو باطل کی راہ میں نہیں، حق کی راہ میں ہو، ہوائے نفس کی تکمیل کے لئے نہیں، رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہو، یہاں اشارہ خاص جہاد و قتال کی جانب ہے لیکن فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے الفاظ عام ہیں، ہر دینی خدمت میں مالی امداد اس کے تحت میں آ جاتی ہے۔

يعني في طاعة الله (قرطبي)

۷۱۴ (جان یا مال میں بخل کرکے)

وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٩٥﴾ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ

اور اچھے کام کرتے رہو یقیناً اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۹۱۵ اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو ۹۱۶

قرآن مجید میں جب صیغہ جمع حاضر آتا ہے تو کبھی تو افراد مراد ہوتے ہیں اور کبھی جماعت یہاں اصل مخاطبت امت سے بحیثیت مجموعی ہے اور بیان یہ حقیقت ہو رہی ہے کہ افرادِ امت نے اگر جہاد و قتال سے جان چرائی اور جہاد کو مالی امداد دینے میں بخل کیا تو نتیجہ لازمی طور پر ساری امت کی تباہی، بربادی، ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ۔ اس تقدیر کلام یوں ہے۔ وَلَا تُلْقُوا أَنْفُسَكُمْ بِأَيْدِيكُمْ یا أَنْفُسَكُمْ (اپنے آپ کو) محذوف ہے۔

ـ تقدیرہ ولا تلقوا انفسکم بایدیکم (کشاف) ای لا توقعوا انفسکم فی الھلاک (بیضاوی)

التَّهْلُكَةِ۔ لفظی معنی ہلاکت کے ہیں، یہاں مراد یہ ہے کہ امت کی ضرورت کے موقع پر بخل کر کے امت کو بربادی میں نہ ڈالو، اور یہی معنی ابن عباسؓ، ابو ایوب انصاریؓ اور حذیفہؓ صحابیوں سے اور حسن اور قتادہ اور عکرمہ اور عطاء تابعین سے مروی ہیں، اور محدث جلیل امام بخاری نے بھی یہی معنی اختیار کئے ہیں۔

ترك الانفاق فی سبیل اللہ وھو قول حذیفۃ والحسن وقتادۃ وعکرمۃ وعطاء (معالم) وقال حذیفۃ بن سلیمان وابن عباس وعکرمۃ وعطاء ومجاھد وجمھور الناس المعنی لا تلقوا بایدیکم ان تترکوا النفقۃ فی سبیل اللہ ولا تخافوا عیلۃ والی ھذا المعنی ذھب البخاری اذلم یذکر غیرہ (قرطبی)

التھلکۃ الاقامۃ فی الاھل والمال وترك الجھاد (کشاف عن ابی ایوب انصاری)

بعض نے یہ معنی بھی لئے ہیں کہ بہت زیادہ خرچ کر کر کے اپنے کو تباہ حال نہ کر دو۔

وقال الجبائی التھلکۃ الاسراف فی الانفاق (روح) ای بالاسراف وتضییع وجہ المعاش (بیضاوی) بل ھو الاسراف فی الانفاق حتی لا یجد ما یاکل ویشرب فیتلف (جصاص)

۹۱۵ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جانب رغبت والتفات، ناپسندیدگی و بیزاری کے افعال وصفات بارہا منسوب کئے ہیں، چنانچہ یہاں بھی اللہ کے لئے ہے کہ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ ان سارے افعال وصفات کے لانے سے ایک بڑا مقصود ان گمراہ قوموں کی تردید ہے جو وجود باری کے تو قائل ہیں لیکن خدا تعالیٰ کو صفات کمال وجمال سے معریٰ ایک طرح کا جامد بے جان، بے حس، علت العلل سمجھے ہوئے ہیں ــــ اسلام کا خدا، قرآن کا خدا، ہر معنی میں ایک زندہ خدا، بیدار، متحرک، فعال خدا ہے، خوش بھی ہوتا ہے ناخوش بھی، مخلوق کو محبوب بھی رکھتا ہے، مبغوض بھی، صلہ بھی دیتا ہے اور سزا بھی۔

أَحْسِنُوا۔ یعنی جو کچھ بھی کرو حسن نیت و اخلاص کے ساتھ کرو، محض بیگار سمجھ کر بوجھ سا نہ اُتارو۔ صحابیوں سے اسی قسم کے معنی مروی ہیں۔

ای احسنوا اعمالکم بامتثال الطاعات روی ذلك عن بعض الصحابۃ (قرطبی) احسنوا اعمالکم واخلاقکم۔ (بیضاوی)

۹۱۶ یعنی جب یہ عبادتیں بجا لاؤ تو اللہ کی رضا جوئی ہی کے لئے بجا لاؤ، اخلاص نیت کے ساتھ، اور

فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

پھر اگر گھر جاؤ، تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو (اُسے پیش کردو) ۷۱۵

اللہ کے مقرر کئے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ، تمام ممنوعات سے محترز رہ کر، یہ نہ ہو کہ کسی طرح اُلٹے سیدھے ادا کر کے ان عبادتوں کو بھی ناقص و فاسد بنا دو۔

[illegible] (وظاهر السياق الكمال [illegible]) [illegible]

حضرات صحابہؓ و تابعینؒ سے متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں لیکن سب سے جامع تفسیر مقاتل تابعی کی ہے کہ اس درمیان میں کوئی ایسی چیز نہ کرو کہ جو ان عبادتوں کے خلاف یا سہو۔

[illegible]

... کی تفسیر میں ایک فقیہ مفسر ابن العربی مالکیؒ نے یہ نکتہ بہت خوب پیدا کیا ہے کہ اعمال تو سارے کے سارے اللہ کی جانب منسوب ہونے ہی ہیں، خلق، علم، ارادہ وغیرہ ہر لحاظ سے یہاں اس تاکید و تخصیص سے مقصود اس امر کی تنبیہ ہے کہ حج و عمرہ کا قصد میلہ ٹھیلا سمجھ کر نہ ہو، تفاخر کی راہ سے نہ ہو، تجارتی ضروریات سے نہ ہو، اخلاص محض کے ساتھ قرب و رضائے الٰہی کی نیت سے ہو۔

[illegible] والتفاخر [illegible] (احکام القرآن)

۷۱۵ یعنی اگر کسی دشمن کی روک تھام کے باعث یا کسی بیماری وغیرہ سے معذور ہو کر راستہ ہی میں رک جانا پڑے اور منزل مقصود تک نہ پہونچ سکو تو قربانی کا جانور جو ساتھ میں ہو اُسے وہیں ذبح کر دو اور احرام کھول ڈالو۔ عازمِ حج جب کسی معذوری کی بناء پر راہ ہی میں رک گیا، اور اب قصدِ حج پورا نہیں کر سکتا، تو اب احرام سے باہر آنے کا طریقہ اُسے بتایا جا رہا ہے۔

[illegible] احصار کے لفظی معنی گھر جانے کے ہیں، خواہ کسی سبب سے بھی ہو، ائمہ لغت سے یہی عام مفہوم منقول ہے۔

الاحصار المنع من طريق [illegible] الظاهر كالعدو والمنع الباطن كالمرض (راغب) [illegible] الحصر [illegible] والمنع سواء كان [illegible] العدو [illegible] المرض (كبير) قال الكسائي وابو عبيدة واكثر اهل اللغة الاحصار المنع بالمرض او ذهاب النفقة (جصاص)

چنانچہ فقہاء حنفیہ نے بھی اسی عام معنی میں لیا ہے اور یہی معنی بعض فقہاء صحابہؓ و تابعین سے منقول ہیں۔

[illegible] الامام ابو حنيفة [illegible] كل منع من عدو او مرض [illegible] (روح)

[illegible] ابن مسعود وابن عباس [illegible] (جصاص) [illegible] الحصر [illegible]

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ

اور جب تک قربانی اپنے مقام پر پہونچ نہ جائے اپنے سر نہ منڈاؤ ۵۱۸ لیکن اگر تم میں سے

مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ

کوئی بیمار ہو ۵۱۹ یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو ۵۲۰ تو وہ روزوں سے یا خیرات سے

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ

یا ذبح سے فدیہ دے دے ۵۲۱

ممنوع من مكة بعد الاحرام بمرض او عدو او غير ذلك و حبس بمقتضى الاحصار (مظهري)

اى ممنوعا عن ركان قاله مجاهد وقتادة وابو حنيفة (ابن العربي)

البتہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک احصار صرف دشمن کے باعث ہو سکتا ہے۔

المراد من الاحصار ما حصر العدو عند مالك والشافعي (روح) وعند الشافعي الاحصار

بالعدو وحده (مدارك) اى بالعدو وحده وبه قال ابن عمر وابن عباس وانس والشافعي هو مبارك (ابن عربي)

۵۱۸ (جو علامت ہے مناسکِ حج کے تمام ہو جانے اور حالتِ احرام سے باہر آجانے کی)

مَحِلَّهٗ یعنی موضعِ حرم۔ قربانی کی اصل جگہ وہی ہے۔

اى مكانه الذى يجب نحره فيه وهو الحرم۔ (مدارك)

جب عازمِ حج خود وہاں پہونچنے سے معذور ہو جائے تو قربانی کا جانور وہاں بھیج دے وہیں اس کی قربانی کر دی جائے گی۔
ھَدْی کے لفظی معنی محض اس پیشکش کے ہیں، جو خانۂ کعبہ کے لئے بھیجی جائے۔

الهدى مختص بما يهدى الى البيت (راغب) وهو ما يهدى الى بيت الله من بدنة او غيرها۔ (قرطبی)

حنفیہ نے بھی اسی عام معنی میں رکھا ہے، اور قربانی کا ہر جانور اس سے مراد لیا ہے، اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔

فقال ابو حنيفة وابو يوسف ومحمد وزفر ومالك والشافعي الهدى من اصناف

الثلاثة الابل والبقر والغنم وهو قول ابن شبرمة۔ (جصاص)

بعض ائمہ کے نزدیک اس کا اطلاق قربانی کے صرف اونٹ پر ہوتا ہے۔

۵۱۹ (ایسے مرض میں کہ اس کی وجہ سے سر کے بال اتروانے کی ضرورت پڑ جائے)

مرضا يحوجه الى الحلق۔ (بيضاوی)

۵۲۰ مثلاً درد، زخم وغیرہ سے اور اس لئے سر منڈانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔

۵۲۱ معذوروں کو اجازت ہے کہ قبل از وقت ہی سر منڈا لیں، اور اس کا شرعی فدیہ دے دیں۔

فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ

لیکن جب تم حالت اطمینان میں ہو ۷۲۲ تو پھر جو شخص عمرہ سے منتفع ہوئے حج سے ملا کر تو جو قربانی بھی اُسے میسر ہو وہ کر ڈالے

فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ فِى ٱلْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ

اور جس کسی کو میسر ہی نہ آئے ۷۲۳ وہ تین دن کے روزے زمانۂ حج میں رکھ ڈالے اور سات روزے جب تم واپس ہو

فَفِدْيَةٌ ـــ من راسه کے بعد عبارت مقدر یوں ہے۔ فحلق فعلیه فدیة۔

فیه اضمار ای فحلق فعلیه فدیة۔ (معالم)

اور اس فدیہ کی تین صورتیں ہیں یا روزے رکھ لئے جائیں یا مسکینوں کو صدقہ دیا جائے یا قربانی کر دی جائے۔

مِنْ صِيَامٍ۔ جمہور فقہاء کا مسلک حدیث صحیح کی بناء پر تین روزے رکھنے کا ہے۔

جمهور فقهاء المسلمين على ان الصوم ثلثة ايام وهو محفوظ صحيح فى حديث كعب بن عجرة (قرطبی)

أَوْ صَدَقَةٍ۔ کھانا اگر دیا جائے تو چھ مسکینوں کو صدقۂ فطر کی مقدار کے مساوی دیا جائے۔

على ستة مساكين لكل مسكين نصف صاع من بر (مدارك) فحصل من ذلك ان يكون من

التمر ستة اصع ومن الحنطة ثلاثة أصع وعدد المساكين الذين يتصدق عليهم ستة بلا خلاف (جصاص)

أَوْ نُسُكٍ۔ نسک سے مراد بالاتفاق ذبح ہے۔

يقال نسكت لله اى ذبحت لله (ابن قتيبه) النسكة مختصة بالذبيحة۔ (راغب)

یہ قربانی کم از کم ایک بکری کی ہونی چاہئے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ ایک گائے یا اونٹ کی ہو۔

ولا خلاف بين الفقهاء ان ادناه شاة وان شاء جعله بعيرا او بقرة (جصاص) اعلاه

بدنة واوسطه بقرة وادناه شاة (معالم عن الحسن وقتادة)

روزہ، صدقہ، قربانی یہ تینوں صورتیں فدیہ و کفارہ کی یکساں ہیں جو شق بھی پسند آئے، اختیار کی جا سکتی ہے۔

لا خلاف انه مخير بين هذه الاشياء الثلاثة يبدأ بايها شاء وذلك مقتضى الاية والخبر

(جصاص) وعامة الآثار عن كعب بن عجرة وردت بلفظ التخيير وهو نص القرآن وعليه مضى عمل

العلماء فى كل امصار و فتواهم۔ (قرطبی)

۷۲۲ یہ مقابلہ اس حالت خطر و مرض کے جس کا ذکر شروع آیت فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ میں آچکا ہے اور جس طرح وہاں

ایک عام و جامع لفظ أُحْصِرْتُمْ آیا تھا یہاں بھی ایک عام و جامع لفظ أَمِنْتُمْ آیا ہے جو مرض کے دور ہو جانے پر

بھی اسی طرح حاوی ہے جس طرح خطرۂ دشمن کے رفع ہو جانے پر۔

اصل الامن طمانينة النفس وزوال الخوف (راغب) ... من المرض ... خوف

من العدو ... قاله ابن عباس ... لا ان تعرى الخوف من ... من

منه (قرطبی) جاء بلفظ الامن وهو عام فى العدو والمرض ... عن نظام او ... [illegible]

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ

یہ پورے دس (روزے) ہوئے ۲۳۵ یہ ۲۳۶ اس کے لئے (درست) ہے جس کے اہل مسجد حرام کے قریب نہ رہتے

الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾

ہوں ۲۳۷ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ اللہ سخت گرفت کرنے والا ہے ۲۳۸

ہوگا.

اِذَآ اَمِنْتُمْ۔ فقہاء کہتے ہیں کہ صحت کو بھی امن سے تعبیر کیا ہے اس سے فقہاء نے یہ نکالا ہے کہ بعد حصر اگر وقت حج میں مانع دُور نہ ہو تو عاصی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ صحت اچھی ہو جانے پر بظاہر فوتِ حج کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے

۲۳۳ (اور اگر کسی نے صرف حج یا صرف عمرہ کیا ہو تو اس پر یہ قربانی واجب العمل نہیں)

فَمَنْ تَمَتَّعَ۔ تمتع کے لفظی معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں، اصطلاح فقہ میں مراد حج اور عمرہ کے ملا لینے سے ہوتی ہے یعنی زمانۂ حج میں، ایک احرام باندھ کر عمرہ ادا کیا جائے اور پھر دوسرے احرام سے حج بھی کر لیا جائے، دونوں احراموں کی درمیانی مدت میں حالتِ احرام کے ممنوعات سے پوری طرح تمتع کیا جا سکتا ہے، دینِ ابراہیمی کو چھوڑ کر عرب جاہلی جہاں اور بہت سے اوہام میں گرفتار تھے، وہاں ایک عقیدہ یہ بھی گڑھ لیا گیا تھا کہ موسمِ حج میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہے

لان العرب فی الجاھلیۃ کانت لاتعرف العمرۃ فی أشھر الحج وتنکرھا اشد الانکار (معا)

یُروی عن ابن عباس وعن طاؤس ان ذٰلک عندھم کان من أفجر الفجور۔ (جصاص)

۲۳۴ (ان ایامِ حج میں بسبب ناداری یا کسی اور معذوری کے)

۲۳۵ تین زمانۂ حج میں اور سات زمانۂ حج کے بعد۔ یہ "پورے دس" کی تصریح تاکید در تاکید کی غرض سے ہے

کاملۃ توکید الکلام، کما یقول القائل سمعتہ بأذنی ورأیتہ بعینی (ابن جریر) قیل ھو توکید کما تقول کتبت بیدی وقولہ کاملۃ تاکید آخر۔ (قرطبی)

اِذَا رَجَعْتُمْ۔ فقہاء حنفیہ اور بعض اکابر تابعین کے ہاں اس رجوع سے مراد اعمال حج سے فراغت ہے، خواہ واقعۃً کوئی حج سے واپس ہو جائے یا ابھی وہیں مقیم رہے۔

ای بعد الفراغ من اعمال الحج وھو المراد من الرجوع المذکور فی الآیۃ (معالم) قال ابوحنیفۃ المراد من الرجوع الفراغ من اعمال الحج (کبیر) ای فرغتم ونفرتم من أعمالہ (روح) قال المجاھد وعطاء وابراھیم المعنی اذا رجعتم نفرتم وفرغتم من اعمال الحج وھو مذھب ابی حنیفۃ۔ (بحر)

بعض دوسرے اکابر کے نزدیک گھر سے وطن کی واپسی مراد ہے۔

یعنی الی بلادکم قالہ ابن عمر وقتادۃ والربیع ومجاھد وعطاء قالہ مالک فی کتاب محمد وبہ قال الشافعی (قرطبی) اذا رجع الی اھلہ ومصرہ (ابن جریر)

۲۳۶ یعنی موسمِ حج میں عمرہ کے ساتھ حج کا ملا لینا۔

ذٰلک۔ یہ اشارہ تمتع کی جانب ہے، جس کا ذکر ذرا اوپر فَمَنْ تَمَتَّعَ کے ضمن میں آچکا ہے۔

ای التمتع بالعمرۃ الی الحج (ابن جریر) اشارۃ الی التمتع۔ (مدارک)

یہ تفسیر امام ابو حنیفہ اور بعض تابعین کے مسلک کے مطابق تھی جن کے ہاں حج میں تمتع اور قران یعنی موسم حج میں عمرہ کے ساتھ حج کر لینے کی دو صورتیں صرف آفاقیوں کے لئے درست ہیں، مکہ اور جوار مکہ والوں کے لئے نہیں۔

اذ لا تمتع ولا قران لحاضری المسجد الحرام عندنا (مدارک) وقال ابو حنیفۃ ان قولہ ذلک

اشارۃ الی الابعد وھو ذکر التمتع المفھوم من قولہ فمن تمتع عند ابی حنیفۃ۔ (روح)

امام شافعیؒ کے نزدیک ذلک کا اشارہ اصل حکم یعنی وجوب قربانی کی جانب ہے۔

۷۲۷ یعنی جو مکہ کے باشندے یا شہر مکہ سے بالکل متصل کے باشندے نہ ہوں بلکہ حدود میقات سے باہر کے رہنے والے ہوں۔ میقات اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے حرم کے حدود شروع ہو جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ہر آفاقی پر حج یا عمرہ کی نیت کر لینا اور احرام باندھ لینا واجب ہو جاتا ہے، ہر ہر سمت سے آنے والوں کی میقات الگ الگ ہے۔

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ میں ل بمعنی علیٰ کے ہے۔

ای وجوب الدم علی من لم یکن من اھل مکۃ (قرطبی)

حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے خاص اہل مکہ کا مراد ہونا اور ان کے لئے تمتع کا ناجائز ہونا سب کو مسلّم ہے۔

اجماع جمیعھم علی ان اھل الحرم ممنوعون بہ وانہ لا متعۃ لھم (ابن جریر)

لیکن فقہاء حنفیہ اور بعض تابعین کا مذہب یہ ہے کہ اس میں مکہ کے علاوہ جوار مکہ کے باشندے بھی شامل ہیں، اور حدود میقات کے اندر تک کل رہنے والے حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے حکم میں داخل ہیں۔

عن مکحول قال من کان دون المواقیت (ابن جریر) ھم اھل مواقیت فمن دونھا الی مکۃ (مدارک)

قال عطاء ومکحول من دون المواقیت وھو قول اصحابنا (جصاص)

امام شافعیؒ کے نزدیک مکہ سے قصر نماز کی مسافت تک رہنے والے اہل مکہ ہی کے حکم میں رہتے ہیں۔

المراد بالموصول من کان من الحرم علی مسافۃ القصر عند الشافعی ومن کان مسکنہ وراء المیقات عند ابی حنیفۃ (روح)

اور مفسر طبری نے بقاعدہ عربیت لفظ حاضر کے اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے جو امام شافعیؒ کا اختیار کیا ہوا ہے۔

واولی الاقوال بالصحۃ عندنا قول من قال ان حاضری المسجد الحرام من ھو حولہ ممن بینہ

وبین المسافۃ ما لا تقصر الیہ الصلوۃ لان حاضر الشیء فی کلام العرب ھو الشاھد لہ بنفسہ۔ (ابن جریر)

لیکن محقق جصاص رازی نے قرآن مجید ہی کی متعدد آیتوں کے سیاق سے یہ دکھایا ہے کہ محاورۂ قرآنی میں اَلْبَيْت سے خانہ کعبہ نہیں بلکہ مکہ اور صرف مکہ ہی نہیں بلکہ جوار مکہ مراد لیا گیا ہے۔

کان مراد اللہ تعالیٰ بذکر البیت اقرب من مکۃ وان کان خارجا منھا۔ (احکام القرآن)

اور المسجد الحرام سے بھی مراد مکہ اور مضافات مکہ ہی لی گئی ہے۔

وھی مکۃ وما قرب منھا۔ (احکام القرآن)

۷۲۸ ان کی جو احکام الٰہی کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اور تقوائے الٰہی اختیار نہیں کرتے۔

لمن لم یتقہ۔ (بیضاوی)

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ

حج کے چند مہینے معلوم ہیں ۶۲۹ جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرلے ۶۳۰ تو پھر حج میں نہ کوئی

وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ

فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا ۶۳۱

واتقوا حقہ یعنی اللہ سے ڈرتے رہو ان تمام احکام کی بجا آوری میں۔
اصل شے اور مدار کار تمام احکام و مسائل میں یہی تقویٰ الٰہی یا خوفِ خدا ہے، باقی تعبیر و تفسیر میں جزئی اختلافات تو اپنی اپنی فہم و بصیرت، فکر و نظر کے مطابق علماء و فقہاء، شارحین و مفسرین میں ہوتے ہی رہیں گے۔
شدید العقاب یہاں جس سیاق میں آیا ہے اس سے بعض علماء نے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ مقدس و متبرک مقامات میں جس طرح قبولیت و سعادت کے مواقع بہت زیادہ ہیں، اسی طرح گناہ و عقوبت کا خطرہ بھی زیادہ لگا ہوا ہے۔

۶۲۹ (چونکہ وہ مشہور و معلوم ہیں اس لئے قرآن کو ان کی تصریح کی بھی ضرورت نہیں اور وہ تین مہینے شوالؔ، ذیقعدہؔ، ذی الحجہؔ ہیں) اصل ارکان حج تو ذی الحجہ کے دوسرے ہفتہ میں ادا ہوتے ہیں لیکن احرام حج شوال ہی سے بندھنا شروع ہوجاتا ہے۔ احرام اس خاص پوشش کا نام ہے جو حدودِ حرم یا میقات میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی و زائر پر واجب ہوجاتی ہے، یہ پوشش اور کچھ نہیں، صرف بے سلی ہوئی چادریں ہونی چاہئیں، حنفیہ کے ہاں احرام جب چاہے باندھا جاسکتا ہے گو قبل شوال ناپسندیدہ ہے، جائز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں احرام رکن حج نہیں، صرف شرطِ حج ہے، جیسے وضو کہ رکن نماز نہیں، صرف شرطِ نماز ہے، امام شافعیؒ کے ہاں شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا ناجائز ہے، یہ اس لئے کہ شافعیؒ کے نزدیک احرام رکنِ حج ہے، اور کسی رکن حج کی ادائی قبل موسم حج درست نہیں۔
اَلْحَجُّ۔ روزانہ پنج وقتہ نماز با جماعت، مہینہ بھر کے روزوں، اور مال کے ۱/۴۰ حصہ کی زکوٰۃ کی طرح حج بیت اللہ بھی اسلام کی اُن عبادتوں میں سے ہے، جس نے اپنوں ہی کو نہیں بیگانوں کو بھی خاص طور پر متاثر کیا ہے، اور مستشرقین کے رعب افگن نام سے فرنگی اہل علم و اہل قلم کا جو طبقہ ہے، اُس نے تو اس کے ظاہری منافع اور اجتماعی مصالح پر بار بار رشک کیا ہے اور اسے اکثر نے "عالم اسلامی کی سالانہ کانگریس" سے تعبیر کیا ہے۔

۶۳۰ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ۔ یعنی موسمِ حج میں ادائے حج کی نیت کرلے، اور اُسے اپنے اوپر واجب کرلے۔
ای اوجبہ علی نفسہ (ابن قتیبہ) فمن الزمہ نفسہ (کشاف) الفرض اصلہ وهو الحز (ابن قتیبہ)
لیکن اپنے اوپر لازم کرلینے کی عملی اور معتبر علامت کیا ہے، بعض ائمہ کے نزدیک صرف نیت کرلینا کافی ہے، لیکن حنفیہ نے بعض صحابیوں اور تابعین کی طرح اس کی علامت پوشش احرام کو قرار دیا ہے۔
الفرض الاحرام (ابن جریر عن ابن عباسؓ) فرض الحج الاحرام (ابن جریر عن عطاء والحسن) ولزم علی نفسہ بالاحرام (مدارک) قال ابن عباس والحسن و قتادۃ فمن احرم۔ (جصاص)

۶۳۱ (بلکہ اس سارے زمانہ میں اپنے آپ کو عبادت و ذکر الٰہی میں مشغول رکھو)

ایامِ صوم کی طرح ایامِ حج کو بھی اعمالِ خیر کے ساتھ مناسبتِ خاص حاصل ہے، اور جو چیزیں حرام ہیں، وہ تو خیر ہمیشہ ہی حرام ہیں، باقی جو امور جائز و مباح ہیں، ان میں بھی بہت سی چیزوں سے زمانۂ صیام کی طرح حالتِ احرام میں دستبردار رہنا چاہئے، جملہ صورۃً خبریہ ہے، لیکن معنی نہی ہے، اور وہ بھی تاکید کے ساتھ یعنی اُن سب امور سے ممانعت کا قطعاً حکم ہو رہا ہے۔

وان کان ظاهره الخبر فهو نهي عن هذه الافعال وعبر بلفظ النفي عنها لان المنهي عنه سبيله ان يكون منتفيا غير مفعول (جصاص) بنی على انتفائه على قصد النهي للمبالغة. (بیضاوی)

فِی الْحَجِّ۔ یعنی اس زمانۂ حج میں حالتِ احرام میں۔

لاجدال في وقته ولا في موضعه (قرطبی) ای في ايامه. (روح)

فَلَا رَفَثَ۔ رفث کا مفہوم عام ہے، ہر قسم کی شہوانیت یعنی مباشرت کے دواعی و مبادی اس میں شامل ہیں۔

الرفث كلام متضمن لما يستقبح ذكره من ذكر الجماع ودواعيه (راغب) وهو كلمة جامعة لما يريده الرجل من اهله (قرطبی) وقال قوم الرفث الافحاش بذكر النساء كان ذلك بحضرتهن ام لا (قرطبی) الجماع ومقدماته (المنار)

یہاں مراد شہوانی تذکرے ہیں، تابعین اور بعض صحابیوں سے بھی یہی مروی ہیں، فقہاء حنفیہ نے صراحت کے ساتھ دواعی و مبادی مباشرت کو اس کے تحت میں شامل رکھا ہے۔

قال ابن عمر وطاؤس وعطاء وغيرهم الرفث الافحاش للمرأة بالكلام (قرطبی) قال ابن عباس يعني الرفث بالجماع (ابن جریر) الرفث التعريض للنساء وبالجماع (ابن جرير عن ابن طاؤس) قال عطاء الرفث الجماع وما دونه من قول الفحش (ابن جرير) الجماع ودواعيه محظورة على المحرم (جصاص) وقال الحسن المراد منه كل ما يتعلق بالجماع. (کبیر)

اللہ اکبر! ایک معیار یہ ہے عبادت میں طہارت و پاکبازی کا، اسلام کا قائم کیا ہوا کہ اشارۃً وکنایۃً بھی اس زمانہ میں جائز شہوانی خیالات زبان پر نہ لائے جائیں! اور دوسری طرف مشرک قوموں کے میلے ٹھیلے تیر تھ ہوار تیرتھ جاترا اور نمائشیں اور جلسے ہیں جن کی گرم بازاری ہی فحش کاریوں اور شہوت انگیزیوں سے ہے! اور پھر عرب جاہلیت کے تو ارکانِ حج تک میں فحش داخل تھا۔

وَلَا فُسُوْقَ۔ اس کے تحت میں بڑے چھوٹے ہر قسم کے گناہ کی ممانعت آگئی۔

قال بعضهم الفسوق هي المعاصي كلها (ابن جرير) عن محمد بن كعب القرظي قال الفسوق معاصي كلها (ابن جرير) يعني جميع المعاصي كلها قاله ابن عباس وعطاء وحسن وكذلك قال ابن عمر وجماعة (قرطبی) ای ولاخروج عن حدود الشرع بارتكاب المحظورات (روح) هو الخروج عما يجب على المحرم الى الاشياء التي كانت مباحة في الحل (المنار)

حالتِ احرام میں جب متعدد جائز مشغلے مثلاً شکار، ناجائز ہو جاتے ہیں، تو بڑی چھوٹی کسی قسم کی معصیت کی گنجائش ظاہر ہے کہاں نکل سکتی ہے! یہاں یہ حکم محض تاکید کے لئے ہے۔

وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ

اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا ۷۳۲ اور زاد راہ لے لیا کرو ۷۳۳ اور بہترین زاد راہ تو

وَلَاجِدَالَ۔ جدال اپنے عام و وسیع معنی میں ہے، مار پیٹ، ہاتھا پائی الگ رہی، زبانی حجت و تکرار جو اکثر مسابقت مفاخرت کے موقعوں پر ہو جاتی ہے، سب احرام کی حالت میں ممنوع ہے۔

قال محمد بن کعب القرظی الجدال ان تقول طائفة حجنا ابر من حجکم ویقول الآخر مثل ذلک (قرطبی) وقیل الجدال کان فی الفخر بالاٰباء (قرطبی) ای لاخصام مع الخدام والرفقة (روح) لامراء مع الرفقاء والخدام (مدارک) ای الجدال فی تقریر الباطل وطلب المال والجاہ (کبیر) ہوما کان یجری بین القبائل من التنازع والتفاخر فی الموسم۔ (المنار)

حج کے موقع پر دنیا کے گوشہ گوشہ کی آبادیاں کھنچ کر آجاتی ہیں، ہر قسم، ہر مرتبہ، ہر قماش، ہر مزاج کے لوگ، ادھیڑ بھی، بوڑھے بھی، جوان بھی، بچے بھی، بڑے تیز مزاج اور غصہ ور بھی، آوارہ مزاج بھی، حریص و طامع بھی، حسین و نوجوان عورتیں بھی، پھر تکلیفیں اور صعوبتیں بھی راہ اور سواری کے سلسلہ میں طرح طرح کی پیش آتی ہیں، سب پر مستزاد زبانوں کا اختلاف، وہ اِن کی نہیں سمجھتے یہ اُن کی نہیں، بڑے بڑے حلیم وعفیف بھی دامن صبر وضبط چھوڑ بیٹھتے ہیں، رشک و منافقت، بدنظری و بدکاری، نزاع وجدال کے موقع قدم قدم پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ حکیم مطلق کی حکیمانہ نگاہ نے رفث اور فسوق اور جدال سب کی تصریحاً اور تاکیداً ممانعت کر کے کمزور بندوں کے حق میں کیا خوب انتظام کر دیا ہے۔ محققین نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فقرہ کے آخر میں یعنی فِی الۡحَجِّ میں جو بجائے ضمیر کے اصل اسم لایا گیا ہے یہ تعظیم و تاکید کے لئے ہے۔

الاظہار فی مقام الاضمار لاظہار کمال الاعتناء بشانہ۔ (روح)

۷۳۲ (اور وہ اسی کے مطابق صلہ بھی دے گا۔)

حاجیوں کے اعمالِ خیر کی تشویق و رغبت افزائی کے لئے یہ بہترین و مؤثر ترین یاد دہانی ہے۔ اللہ کے عالم کل و عالم جزئیات ہونے کا پورا استحضار رکھو، اہل جاہلیت کی طرح کہیں اس تذبذب میں نہ پڑ جاؤ کہ ہمارے فلاں فلاں عمل خیر کا صلہ ملے یا نہ ملے، علم الٰہی میں وہ آئے بھی یا آنے سے رہ جائے، مومن کے لئے تو بڑی سی بڑی ہمت بھی اسی عقیدہ کا استحضار پیدا کر سکتا ہے کہ خفی سے خفی باریک سے باریک نیکی بھی عالم الغیب کی نظر سے مخفی نہیں، اطبائے یونانی موسم بہار میں مصفیات پلاتے ہیں، اور جاڑے کے زمانہ میں مقویات استعمال کراتے ہیں کہ ان موسموں کو ان دواؤں کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔۔۔ رمضان کا مہینہ اور حج کا موسم بھی روحانیت کے عالم میں اپنی صحت بخش آب و ہوا کے لئے ممتاز ہیں، تو طبیبِ حقیقی ان موسموں میں اعمالِ خیر کی طرف خصوصی توجہ کیسے نہ دلاتا!

۷۳۳ جب ارادۂ حج سے نکلا کرو۔

اس ہدایت کی قدر اس وقت ہو گی جب جاہلی قوموں کے زائرین کی ذہنیت پر نظر ہو خصوصاً جاہلیت عرب کی تاریخ پر۔ آج بھی ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ایسی ہیں، جو تیرتھ جاترا کے وقت گھر سے مفلس و تہیدست نکلنا ہی اپنی

التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

تقویٰ ہے ۴۳۳ ۵ اے اہل فہم میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو ۴۳۵

روحانیت کا کمال سمجھتے ہیں! راستہ میں مانگتے ہوئے جائیں گے کوئی دوسرا الخیر کھلا پلا دیا کرے گا، یہ اپنے فقیر ہونے پر فخر کریں گے، اس قسم کے سارے تخیلات و اوہام اسلام نے مٹا دیئے اور حکم دیا کہ جب گھر سے حج و زیارت کے لئے نکلو تو ضرورت بھر کا روپیہ پیسہ لے کر نکلو، راستہ میں دوسروں پر بار بننے کی کوشش نہ کرو۔

عرب جاہلیت میں یہ مرض اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، بلکہ بعض گروہوں کو تو یہ غلو تھا کہ احرام پہننے کے بعد جو کچھ سرمایہ ہوتا بھی اُسے بھی پھینک دیتے!

کانوا یحجون بغیر زاد وکان بعضھم اذا احرم رمی بما معہ من الزاد (ابن جریر) کان اھل الیمن یحجون ولا یتزودون ویقولون نحن المتوکلون فاذا قدموا مکۃ سألوا الناس (بخاری عن ابن عباسؓ) طائفۃ من العرب کانت تجیٔ الی الحج بلا زاد ویقول بعضھم کیف نحج بیت اللّٰہ ولا یطعمنا فکانوا یبقون عالۃ علی الناس۔ (قرطبی)

اسلام ایسے دستور کا جو جھوٹی اور نمائشی روحانیت پر مبنی تھا، اور ایک طرف شخصی غیرت و خودداری کے بھی منافی تھا، اور دوسری طرف معاشیاً اجتماعی پر ایک خواہ مخواہ کا بار تھا، کیسے روادار ہو سکتا تھا اور اسے کیونکر باقی رہنے دیتا۔ تَزَوَّدُوْا کے صیغۂ امر سے فقہاء نے نکالا ہے کہ زادِ راہ لینے کا وجوب آیت سے بقاعدہ عبارت النص ثابت ہے، فقہاء نے یہ بھی صاف لکھ دیا ہے کہ آیت اُن "توکل پیشہ" صوفیہ کے مذہب کی بھی تردید کر رہی ہے جو کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھے ہیں، اور اُسے کوئی بڑا روحانی کمال سمجھ رہے ہیں۔

ھذا ابدل علی بطلان مذھب المتصوفۃ الذین یتسمون بالمتوکلۃ فی ترکھم التزود والسعی فی المعاش (جصاص) ھم المقصرون عن درجۃ التوکل الغافلون عن حقائقہ۔ (ابن العربی قرطبی)

ابن جوزیؒ کی تلبیس ابلیسؒ میں ہے کہ:۔

وقد لبس ابلیس علی قوم یدعون التوکل	کچھ لوگوں پر ابلیس نے تلبیس ڈالی تو وہ توکل کے دعویدار ہو کر
فخرجوا بلا زاد وظنوا ان ھذا ھو التوکل	بلا زادِ سفر لئے چل دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہی توکل ہے
وھم علی غایۃ الخطاء۔ (الباب الثامن)	حالانکہ وہ شدید غلطی پر ہیں۔ (باب فی تلبیسہ علی العباد فی العبادات)

۴۳۴ ۵ (خصوصاً گداگری اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے احتیاط)

ای اتقوا الاستطعام وابرام الناس والتثقیل علیھم (کشاف) فان خیر زادھا تکفون بہ وجوھکم عن السوال (کبیر) ای الاتقاء عن الابرام والتثقیل علیھم (مدارک)

زائروں اور جاتریوں کی گداگرانہ عادت اور جھوٹے توکل کو خاص طور پر روکنا تھا، اس لئے حکم تزودوا کے بعد مزید تاکید کے لئے یہ تصریح اور بڑھا دی، ابھی ارشاد ہوا تھا کہ مصارفِ سفر کا انتظام کر کے چلو اب ارشاد ہو رہا ہے کہ بڑا انتظام یہی ہے کہ راہ میں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اور دوسروں کے لئے باعثِ گرانی نہ بننا پڑے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو ۴۳۵ ۴۳۶

فقہاء نے لکھا کہ زادؔ سے جب زادراہ اور زادِ عمل دونوں مراد ہوسکتے ہیں تو واجب یہی ہے کہ دونوں کا اہتمام والتزام رکھا جائے۔

لما احتملت الاٰیة الامرین من زاد الطعام وزاد التقوٰی وجب ان یکون علیهما اذ لم تقم دلالة علی تخصیص زاد من زاد۔ (جصاص)

قرطبی نے ایک حکایت حضرت امام احمدؒ سے متعلق نقل کی ہے کہ ایک شخص نے ان کی خدمت میں آکر کہا کہ میرا ارادہ مکہ معظمہ کی حاضری کا ہے، بغیر کسی زادراہ کے محض توکل پر، آپ نے پوچھا، تنہا یا قافلہ کے ساتھ، اس نے کہا قافلہ کے ساتھ، آپ نے فرمایا تو تمہارا توکل قافلہ والوں کے سامان پر ہے۔

۴۳۵ (ان احکام کی تعمیل کے باب میں)

اس اہم حکم کے بعد تقویٰ الٰہی کی تاکید اس کی دلیل ہے کہ اسلام صرف احکام کی ظاہری تعمیل کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ چاہتا ہے کہ بندوں کی اصلاح باطن سے ہو، جو بھی نیک عمل انسان کرے وہ صرف اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ ضمیر اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ۔

۴۳۶ بسلسلۂ سفرِ حج۔

اسلام جس طرح فلاحِ اُخروی کا ضامن ہے، فلاحِ دنیوی کا بھی داعی ہے، اور اس کی یہ جامعیت اس کی ہر عبادت سے بالکل صاف ظاہر ہورہی ہے، وضو، نماز، نمازِ باجماعت، روزہ، زکوٰۃ سب روح کو جلا دینے اور باطن کو صیقل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیوی، مادی، جسمانی، معاشی فائدوں اور مصلحتوں سے کتنے لبریز ہیں! یہی اصول حج کے بارے میں بھی کام کررہا ہے۔ حج کا منزل درمنزل سفر، بری و بحری طویل سفر، اور امت کے مختلف طبقوں کا دنیا کے مختلف گوشوں سے یہ عظیم الشان اجتماع ایک خشک عبادت اور محض ذکر الٰہی کے لئے نہیں، فرد و ملت دونوں کے لئے یعنی انفرادی واجتماعی ہر قسم کے فائدے اس سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور کئے جانے چاہئیں۔۔۔ حج کے روحانی اسرار وحقائق کا ادراک تو فرنگی دماغوں کے لئے آسان نہیں! لیکن اس ”بین الاقوامی سالانہ کانگریس“ سے جو سیاسی، ملی، اجتماعی ہر قسم کے فائدے وابستہ ہیں اور اس ”بین الاقوامی سالانہ بازار“ سے جو مالی، تجارتی، معاشی فائدے حاصل ہوسکتے ہیں ان کا اندازہ اور ان کا اعتراف تو فرنگیوں کی زبان سے بھی بارہا ہوچکا ہے۔۔۔ یہاں خاص طور پر توجہ اس سفر و اجتماع کے معاشی و تجارتی پہلو پر دلائی ہے اور جو رکاوٹ ایک خالص دیندار شخص کو ان فوائد کے حاصل کرنے سے ہوسکتی ہے، اُسے دُور کردیا ہے۔

فَضْلًا۔ سب کا اتفاق ہے کہ فضل سے یہاں مراد مال اور نفعِ تجارت ہے۔

یعنی المال وما یکتسب (راغب) هو النفع والربح بالتجارة (کشاف)

لوگوں کا غلو اس باب میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جو تاجر مالِ تجارت لے کر منٰی اور مکہ کے بازاروں کے لئے جاتے، یا جو اونٹ والے اپنے اونٹ مزدلفہ، عرفات ومنٰی کے لئے کرایہ پر لے جاتے، سمجھا جاتا تھا کہ ان کا حج ہی نہیں ہوتا کہ جہاں

فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ

پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو ٦٣٤ تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کیا کرو ٦٣٥

تجارت آگئی، وہاں عبادت کا وجود کہاں باقی رہا، قرآن مجید نے اس مغالطہ عامۃ الورود کی تردید کردی۔

نزلت رداً علی من یقول لا حج للتجار والاجراء والجمالین (کبیر) فی ھذا دلیل جواز التجارۃ فی الحج للحاج مع اداء العبادۃ ولا یخرج بہ المکلف عن رسم الاخلاص المفترض علیہ (ابن العربی) دل علی ان الحج لا یمنع التجارۃ وعلی ھذا امر الناس من عصر النبی علیہ السلام الی یومنا ھذا فی مراسم منی ومکۃ فی ایام الحج۔

ابن عباسؓ صحابی سے لے کر حسن، عطاء، مجاہدؒ، قتادہ وغیرہ تابعین تک بلا اختلاف سب سے یہی تفسیر مروی ہے۔ (جصاص)

روی نحو ذلک عن جماعۃ من التابعین منھم الحسن وعطاء ومجاھد وقتادۃ ولا نعلم احدا روی عنہ خلاف ذلک (جصاص)

صرف ایک روایت کسی حد تک اس سے مخالف ملتی ہے لیکن محققین نے تصریح کردی ہے کہ وہ ظاہر قرآن واجماع عام دونوں کے منافی ہے۔

ھذا قول شاذ خلاف ما علیہ الجمھور وخلاف ظاھر الکتاب۔ (جصاص)

مِّن رَّبِّكُمْ۔ یعنی حسب تقدیر الٰہی۔

بات بات میں بات پیدا کرنا قرآن مجید کا تو ایک مستقل اعجاز ہے، یہ ذرا سا لفظ لا کر یاد دلا دیا کہ اس نفع وتجارت کو بھی اپنے قوتِ بازو کا ثمرہ نہ سمجھ لینا، جو کچھ بھی حاصل ہو گا سب کو کارساز حقیقی ہی کے لطف وکرم کا ثمرہ سمجھنا۔ نظر تجارت وکاروبار میں بھی ہر وقت اسی پر رہے، اس ہدایت پر عمل کے بعد تجارت کی کوئی بڑی سی بڑی مشغولیت بھی تجارت باقی رہ سکتی ہے؟ تجارت اس حال میں اگر عبادت نہ بن جائے تو آخر کیا ہو۔

٦٣٤ (٩ ذی الحجہ کی شام کو عرفات میں وقوف اور ادائے آداب وقوف کے بعد)

حج کے اعمال (واجبات، سنن ومستحبات) تو بہت سے ہیں لیکن فرض تین ہی ہیں، احرام پوشی، ٩ ذی الحجہ کو عرفات میں حاضری یا وقوف اور طواف فرض۔ ان تینوں ارکان میں بھی اہم ترین رکن یہی وقوف عرفات ہے۔

أَفَضْتُم۔ افاضہ کے لفظی معنی انبوہ در انبوہ چلنے یا واپس ہونے کے ہیں۔

ای دفعتم منھا بکثرۃ (راغب) الافاضۃ الاندفاع فی السیر بکثرۃ (کبیر)

اصطلاحِ فقہ میں افاضۂ عرفات سے مزدلفہ جانے کو کہتے ہیں۔

عَرَفَٰت۔ مکہ معظمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے، اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل کے رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان پڑتا ہے اور اس کا نام عرفات ہے۔ اسی نام کی ایک پہاڑی بھی اسی میدان میں واقع ہے، سطح زمین سے کوئی ..٢ گز بلند، سال بھر یہ میدان بالکل سنسان پڑا رہتا ہے، صرف ایک دن ٩ ذی الحجہ کو اس کی پوری کسر نکل آتی ہے، اس روز یہ میدان انسانوں اور ان کی سواریوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے، حاجیوں کو ٨ ذی الحجہ کی دوپہر تک منٰی میں آجانا چاہئے اور ٩ کی صبح کو بعد اشراق قافلے عرفات کے لئے روانہ ہو جائیں تاکہ ٨-٩ میل

وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ ۚ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿١٩٨﴾

اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے ٤٣٩ اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے ٤٤٠

درمیانی فاصلہ دو پہر تک طے ہو جائے، دوپہر سے لے کر آخر وقت عصر تک اسی میدان میں رہنا چاہیے، اور اسی کا اصطلاحی نام وقوف ہے، یہی حاضری اعمالِ حج کی جان ہے، اور یہ سارا وقت توبہ استغفار، عبادت، انابت ہی میں صرف ہونا چاہیے قریب غروب مزدلفہ (مشعر الحرام) کے لئے کوچ ہونا چاہیے، اور جس طرح آج ظہر کے ساتھ عصر کی نماز (بطریق تقدیم) عرفات کی مسجد نمرہ میں ملالی گئی تھی اسی طرح آج مغرب کی نماز (بطریق تاخیر) عشاء سے ملا کر اس وقت پڑھی جائے گی جب قافلے مزدلفہ پہونچ جائیں۔

٤٣٨ اَلْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ مشعر کے لفظی معنی نشانی یا علامت کے ہیں، اور حرام یعنی محترم یا مقدس اس کی تعظیمی صفت ہے، نام اس خاص مقام کا بھی ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے، اور خود سارے مزدلفہ کو بھی مشعر الحرام کہتے ہیں

لم یختلف اهل العلم ان المشعر الحرام هو المزدلفة (جصاص) والمشهور ان المشعر مزدلفة كلها۔ (روح)

مزدلفہ مکہ سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر ہے، منیٰ سے عرفات جانے کا ایک تو سیدھا راستہ ہے، حاجی ۹ کو عرفات جاتے اسی راستہ سے ہیں، واپسی میں حکم ہے کہ دوسرے راستہ سے لوٹیں، یہ ذرا چکر کا ہے، اور مزدلفہ اسی راستہ میں پڑتا ہے، حاجیوں کے قافلے شب ۱۰ کے اول حصہ میں یہاں پہونچ جاتے ہیں، اور رات یہاں تسبیح و تہلیل، نماز و استغفار میں گزارتے ہیں، مسجد پہاڑی اور پر ہے

جبل يقف عليه الامام وانما سمّي مشعرا لانه معلم العبادة ووصف بالحرام لحرمته۔ (بیضاوی)

عِنْدَ الْمَشْعَرِ یعنی اس مسجد کے گرد و پیش خصوصیت کے ساتھ، اور یوں تو سارا مزدلفہ (بجز وادی محسر کے) محترم ہے

خص الله تعالى الذكر عنده مع انه مامور به في جميع المزدلفة لانها كلها موقف لمزيد شرفه وفضله۔ (روح)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ نے یاد دلا دیا کہ یہ رات رنگ رلیاں منانے کی نہیں، جاہلی قوموں کے میلوں ٹھیلوں کی طرح روشنی و آتشبازی کے لئے نہیں، خوابِ غفلت میں پڑے رہنے کے لئے نہیں، فخریہ قصیدوں اور شعر و شاعری میں صرف کرنے کے لئے نہیں، ذکر و عبادتِ الٰہی کے لئے ہے۔

٤٣٩ (اپنے رسول کے ذریعہ سے، اور انسان کے اختراعی طریقوں سے بچو) الحاد و انکار سے بڑھ کر دین و مذہب کے دائرہ میں آجانے کے بعد پھر جو خطرہ اہلِ مذہب کو شیطان کے ہاتھوں سب سے بڑھ کر درپیش رہتا ہے، وہ بدعات و محدثات کا ہے، انسان اپنے دل سے طرح طرح کے طریقے عبادت و ذکر الٰہی کے ایجاد کرتا رہتا ہے اور انھیں مذہب میں داخل کرتا رہتا ہے، حالانکہ دین صرف وہ ہے جو شارع ؑ اللہ کی طرف سے پہونچائے یا اپنے اجتہاد سے بتائے، یہاں اگر ایک طرف اس کی تاکید ہے کہ برابر یادِ الٰہی میں لگے رہو تو دوسری طرف اسکی بھی ہم اہمیت ہے کہ اس یاد کے طریقے اپنے ایجاد کردہ نہ ہوں، اللہ اور اللہ کے رسول ہی کے بتائے ہوئے ہوں، حکم ذکر کی تکرار تاکید کے لئے ہے۔

كرره الامر تاكيد (قرطبی) كرر على سبيل التوكيد والمبالغة في الامر بالذكر۔ (بحر)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلا حکم مشعر الحرام میں ذکر کرتے رہنے کے لئے ہو، اور دوسرا حکم اہتمامِ اخلاص کے لئے ہو۔

قيل الاول امر بالذكر عند المشعر الحرام والثاني امر بالذكر على حكم الاخلاص۔ (قرطبی)

٤٤٠ (عبادت اور ذکرِ الٰہی کے صحیح طریقوں سے)

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ط

ہاں تو تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں ۷۲۱ اور اللہ سے مغفرت طلب کرو،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۹۹﴾

بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے ۷۲۲

ضَالّ ہمیشہ گمراہی کے معنی میں نہیں آتا، ناواقف کے معنی میں بھی آتا ہے اور ضلال سے مراد احکامِ الٰہی سے ناواقفیت ہو سکتی ہے۔

الضلال ضربان ضلال فی العلوم النظریة وضلال فی العلوم العملیة کمعرفة الاحکام الشرعیة التی ھی العبادات (راغب)

اور یہاں یہی مراد ہے۔

فالمراد من الضلال الجھل بالایمان ومراسم الطاعات (روح)

اِنْ یہاں اِنَّ کے معنی میں تحقیق و توثیق کے لئے ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ قَدْ کے مرادف ہے۔

ای وانکم کنتم (روح) ان ھنا عند البصریین التی للتوکید المخففة من الثقیلة (بحر) وان مخففة من الثقیلة .... او بمعنیٰ قد (قرطبی)

مِنْ قَبْلِهٖ میں ضمیر ہ، ھُدیٰ کی طرف راجع ہے، جو ھَدٰکُمْ سے مفہوم ہوتا ہے۔

والھاء فی قبله عائدة علی الھدی المفھوم من قوله ھدٰکم (بحر) عائد الی الھدی وقیل الی القراٰن (قرطبی)

۷۲۱ یعنی عرفات سے، قریش کے گڑھے ہوئے عقیدوں میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہمیں حج میں عرفات کی حاضری کی کیا ضرورت ہے، وہاں تک سب کے ساتھ جانا ہماری علوِ شان کے منافی ہے ہمارے لئے مزدلفہ تک جانا کافی ہے۔

کانت قریش ومن دان دینھا یقفون بالمزدلفة وکانوا یسمّون الحمس وکانت سائر العرب یقفون بعرفات (صحیح بخاری عن عائشة) کانت قریش ومن کان علی دینھا وھم الحمس یقفون بالمزدلفة یقولون نحن قطین الله (ابن جریر عن عائشة) کانوا یقولون لانخرج من الحرم فکانوا لایشھدون وقف الناس بعرفة معھم (ابن جریر) کانوا یقولون نحن قطین الله فینبغی لنا ان نعظم الحرم ولانعظم شیئا من الحل (قرطبی)

آیت انہیں کی اصلاح کے لئے ہے۔

اَلنَّاسُ۔ سے مراد جنس انسان ہے۔

المراد من الناس الجنس کما ھو ظاھر۔ (روح)

ثُمَّ۔ یہاں تاخیرِ زمانی کے لئے نہیں فصل کلام کے لئے ہے یعنی ایک بات ختم ہوئی، اب دوسری ہدایت سنو، جیسے اردو میں ایسے موقع پر "اچھا تو" یا "ہاں تو" کہتے ہیں۔

ثم لیست فی ھذه الاٰیة للترتیب وانما ھی لعطف جملة کلام ھی منھا منقطعة (قرطبی)

ثم للترتیب فی الذکر لا للترتیب فی الزمان الواقع فیه الافعال۔ (نھر)

۷۲۲ (تو آج عرفہ کے دن تو اس کی شانِ غفوریت و رحیمیت کا ظہور اور سب دنوں سے زیادہ ہو کر رہے گا)

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر چکو ۷۲۳ تو اللہ کی یاد کرو اپنے باپ دادوں کی یاد کی طرح بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو ۷۲۴

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ حدیث صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں

یَوْمَ عَرَفَةَ سے زیادہ بندے آگ سے آزاد کئے جاتے ہوں۔

حج کا بیان جہاں سے شروع ہوا ہے، دیکھتے آئیے تزکیۂ قلب کا قدم قدم پر کس درجہ اہتمام ہے حرم شریف نہیں حدودِ حرم بھی ابھی منزلوں فاصلہ پر ہیں کہ ساری عمر کا مالوف و مانوس لباس جسم سے اتر گیا، اور اب نہ سر پر ٹوپی ہے نہ کسی قسم کی پگڑی صافہ، اور جسم پر نہ شیروانی ہے نہ کوٹ نہ عبا نہ قمیص، شاہ و گدا، رئیس و رعایا، حکام و عوام سب کے سب دو دو چادروں میں ملبوس! پھر احرام پہنتے ہی جو چیزیں حرام تھیں ان کا ذکر ہی نہیں، جو ہمیشہ حلال تھیں، اور فی نفسہ جائز ہیں، ایک خاصی طویل مدت کے لئے بالکل ممنوع! کتنی ہی مرغوبات و مالوفات اس درمیان میں دست برداری کرنی ہوتی ہے، یہ سب بھی کافی نہیں گھڑی گھڑی لبیک کہتے رہو، اللہ کے دربار میں حاضری بولتے رہو، مسلسل ذکرِ الٰہی کرتے رہو، اور اب یہ حکم مل رہا ہے کہ خطاؤں کو، گناہوں کو، سیہ کاریوں کو یاد کر کر کے ان سے معافی چاہتے رہو ۔۔۔ اتنے پاکیزہ، ایسے ستھرے اس قدر اصلاحی اجتماع سے دنیا جہان کے میلوں ٹھیلوں، بت پرستانہ، وطن پرستانہ، وہم پرستانہ، ہوس پرستانہ میلوں ٹھیلوں کو کوئی بھی مناسبت ہے؟ ع

کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو!

کیسا صریح ظلم وہ اہلِ قلم خود اپنی بصارت و بصیرت پر کرتے ہیں جو اسلام کو دوسرے ادیان و مذاہب کی سطح پر رکھے ہوئے ہیں!

غَفُوْرٌ آیت کے آخر میں یاد دلا دیا کہ تمہارے رب کی صفتِ غفر بہت بڑی ہے اس سے مغفرت طلب کر کے دیکھو تو، طالبینِ مغفرت کی مغفرت وہ کیوں نہ کرے گا؟

رَّحِیْمٌ اور ساتھ ہی اس کی صفتِ رحمت بھی تو بے پایاں ہے، طالبانِ مغفرت کے ساتھ وہ رحمت کا معاملہ کیوں نہ کرے گا!

۷۲۳ (اور ابھی منیٰ سے منتشر نہیں ہوئے ہو)

عرفات و مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام تین دن، ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو لازمی ہے اور بعض ائمۂ فقہ کے نزدیک ۱۳ کو بھی۔ اِذَا کے لفظ سے یہ دھوکا نہ ہو کہ یہاں حکم ادائے مناسک کے بعد کے لئے مل رہا ہے، اِذَا ہمیشہ بعد کے لئے نہیں آتا ہے، ہم زمانی کے موقع پر بھی قرآن مجید میں آیا ہے مثلاً فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا جہاں اس کے معنی ہیں کہ جب تم نماز پڑھتے ہو، نہ یہ کہ جب تم نماز ختم کر چکو، اسی طرح یہاں بھی معنی یہ ہیں کہ جب تم ادائے مناسک کر رہے ہو۔

مَّنَاسِكَكُمْ مناسک شعائرِ حج کو کہتے ہیں۔

قیل هی شعائر الحج (قرطبی) النسك العبادة [illegible] الحج [illegible]

قَضَیْتُمْ قضا کے معنی کسی عبادت کے ادا کر چکنے یا بجا لانے کے ہیں۔

قضیتم هنا بمعنی ادّیتم و فرغتم (قرطبی) [illegible]

۷۲۴ قومی عظمت و قومی خودداری، نسلی مفاخرت جس طرح جدید جاہلی تہذیب کا عنصرِ اعظم ہیں، عرب کے بھی

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي

اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا (ہی) میں دے دے ۴۲۵ اور ایسے شخص کا

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي

آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۴۲۶ اور کوئی ان میں ایسے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو

الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱

دنیا میں (بھی) بہتری دے اور آخرت میں (بھی) بہتری، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا ۴۲۷

دین جاہلی کے رکن اعظم تھے، عرب جب منیٰ میں جمع ہوتے تو ہر ہر قبیلہ اپنے قبائل کی جے پکارتا اور اپنے بزرگوں کے مفاخر و مناقب کے پرزور بیان سے دلوں کو گرماتا۔

کان اھل الجاھلیۃ یجلسون بعد الحج فیذکرون ایام اٰباءھم (ابن عباس) کان القوم فی جاھلیتھم بعد فراغھم من حجھم ومناسکھم یجتمعون فیتفاخرون بمآثر اٰباءھم (ابن جریر)

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ۔ مسلمانوں کو حکم ملتا ہے کہ یہی جوش و خروش تم اللہ کے ذکر میں دکھاؤ، تمہاری نہ کوئی قوم ہے، نہ کوئی نسل، نہ تمہارا کوئی وطن، تم ان سب کے بجائے اللہ کی عظمت دلوں میں بٹھاؤ، بساؤ، اور اللہ کا نام زبانوں پر لاؤ۔

اَوْ یہاں تخییر کے لئے نہیں بلکہ ترقی کا مفہوم دے رہا ہے، مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ربط و تعلق کم سے کم اس درجہ کا تو رکھو جتنا اپنے خاندان، اپنے قبیلے، اپنی قوم کے ساتھ رکھتے ہو، بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر۔

قیل بمعنی بل (بحر)

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ مولانائے رومیؒ نے اسی کو اپنی شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں یوں ادا کیا ہے ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

۴۲۵ دنیا میں ایسی بھی قومیں ہیں جو خدا کی قائل ہوتی ہیں، اُسے معبود اعظم سمجھتی ہیں، لیکن حشر و نشر، جزا و سزا کی قائل نہیں، ایسے لوگوں کی دعائیں، التجائیں، تمنائیں قدرۃً اسی مادی دنیا کی ترقیوں تک محدود رہتی ہیں، مشرکین عرب کے عقیدے بھی اسی قسم کے تھے، اور یہ لوگ جب دعا بھی مانگتے تھے تو تمام تر سامانِ دنیوی اور دشمن پر فتح و نصرت وغیرہ کی، ابن زید، سُدّی وغیرہ تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

المراد المشرکون، قال ابو وائل والسدی وابن زید کانت العرب فی الجاھلیۃ تدعو فی مصالح الدنیا فقط فکانوا یسئلون الابل والغنم والظفر بالعدو ولا یطلبون الاٰخرۃ۔ (قرطبی)

مَنْ يَّقُوْلُ سے یہ لازم نہیں کہ دعائیں بالکل انہیں الفاظ کے ساتھ کی ہی گئی ہوں، "قول" کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے، تمنا کرنا، زبانِ حال سے کہنا، دل میں خیال لانا سبھی میں شامل ہیں۔

۴۲۶ وہی آخرت جس کے تسلیم کرنے سے عمر بھر انکار رہا۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۲۰۲)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ۷۴۷ حصہ ملے گا، بعوض اس کے کہ جو انھوں نے کمایا ہے اور اللہ حساب بہت جلد لے گا ۷۴۹

اذ کانوا لا یرجون ولا یؤمنون بہا (قرطبی)

۷۴۷ یہ اشارہ انسانیت کے پسندیدہ طبقہ یعنی اہل ایمان کی جانب ہے۔ مومنین کی دعائیں، مناجاتیں، آرزوئیں دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کی جامع ہوتی ہیں۔

حسنۃ۔ وہ چیز ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ و بہتر ہے اور اس کے اندر ہر قسم کی خیر و خوبی آگئی

حسنۃ نکرۃ فی سیاق الدعاء فھو محتمل لکل حسنۃ من الحسنات علی البدل (قرطبی) والحسنۃ

الکاملۃ ... ما اشتمل جمیع ما ذکر (روح)

دنیا میں حسنۃ توفیق خیر ہوئی، اور آخرت میں حسنۃ ثمرۂ خیر۔

والذی علیہ اکثر اہل العلم ان المراد بالحسنتین نعم الدنیا والاخرۃ وھذا ھو الصحیح فان اللفظ یقتضی

ھذا کلہ (قرطبی)

دعا کی بے نظیر جامعیت بالکل ظاہر ہے۔

ھذہ الایۃ من جوامع الدعاء التی عمت الدنیا والاخرۃ (قرطبی)

ایسی جامع و ہمہ گیر دعا کی نظیر سے ادیان و ملل کے صحیفے خالی ہیں۔ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم خود اسی دعا کی کثرت رکھتے تھے

کان اکثر دعوۃ یدعو بہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللھم اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا

عذاب النار (بخاری ومسلم عن انس)

مال، اولاد، صحت، الجنۃ وغیرہ جو چیزیں بھی تحصیل خیر میں معین ہو سکتی ہیں خواہ بظاہر کیسی ہی دنیوی اور مادی ہوں، سب مومن کا مقصود و مطلوب بن سکتی ہیں البتہ خود دنیا ہرگز کسی مومن کا مدعا و مقصود نہیں بن سکتی، آیت کی ترکیب بہ نظر رہے

اٰتِنَا کا مفعول صرف حسنۃ ہے یعنی جس چیز کی طلب و تمنا کی جا رہی ہے وہ حسنۃ یا بہتری ہے فِی الدُّنْیَا اور فِی الْاٰخِرَۃِ صرف ظرف یا محل ہیں، ترتیب میں یہ مفعول یا معنی کے لحاظ سے مقصود کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے مراد محض یہ ہے کہ ہمیں تو آپ کے دربار سے صرف بھلائی یا بہتری درکار ہے، دنیا میں بھی ہو تو بھی اور آخرت میں ہو تو بھی، مزید تفسیر یہ کہ دنیا میں ہمیں اعمال خیر عنایت ہوں، اور آخرت میں ثمرات خیر۔

بعض سطحی دماغ والے اہل قلم نے آیت سے یہ عجیب و غریب نتیجہ نکالا ہے کہ آخرت کی طرح دنیا بھی مومن کا مقصود بن سکتی ہے بلکہ قرآن خود طلب دنیا کی تعلیم و ترغیب دیتا ہے۔ فَاَنّٰی اُمَّۃٌ عُتُوًّا کَبِیْرًا۔ مغالطہ کی قلعی اور کھولی جا چکی ہے، مادہ پرست قوموں کی دنیا طلبی اور دنیا پسندی سے مرعوب ہو کر خود مسلمانوں کو طلب دنیا کی تعلیم دینا بلکہ اسے قرآنی تعلیم قرار دینا خدمت اسلام کی عجیب و غریب صورت ہے!

۷۴۸ (دونوں جہانوں میں، اور یہ گمراہ قوموں کی طرح بے بہرہ نہ رہیں گے۔)

۷۴۹ (اور یوم حساب خود ہر لمحہ قریب آتا جا رہا ہے پس اس سے غفلت ہرگز مقتضائے عقل و دانش نہیں!)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ

اور اللہ کو (ان چند) گنے ہوئے دنوں میں (برابر) یاد کرتے رہو ۶۵۰ جو شخص (ان) دو دنوں میں جلدی کرے

فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ

اس پر (بھی) کوئی گناہ نہیں، اور جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ۶۵۱ (یہ) اس کے لئے ہے جو ڈرتا رہتا ہے ۶۵۲

مِنْ تبعیضیہ نہیں، من سببیہ ہے۔

ای من اجل ما کسبوا (بحر) من اجلہ (بیضاوی)

سَرِیْعُ الْحِسَابِ۔ اُس جیسے قدرتِ کاملہ کے مالک کو حساب کرتے بندوں کو اُن کے اعمال کی جزا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے۔

ای سریع المجازاۃ للعباد باعمالھم (قرطبی)

جاہلی قوموں نے اس وصفِ خاص میں بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کے باب میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔

۶۵۰ یعنی ایامِ تشریق میں، زمانۂ قیامِ منیٰ میں۔

منیٰ مکہ معظمہ سے شمال و مغرب میں ۴ میل کے فاصلہ پر ہے، پہلے کبھی محض میدان تھا، اب بہت سی پختہ اور عالی شان عمارتیں بن گئی ہیں، سال بھر تو خالی پڑی رہتی ہیں، موسمِ حج میں خوب آباد ہو جاتی ہیں، صاحبِ حیثیت حاجی انھیں بڑے بڑے کرایوں پر لے لیتے ہیں، بعض سرکاری عمارتیں ہیں، ان دنوں اس زمانہ میں یہاں بہت بڑا اور بہت پُررونق لگتا ہے، دنیا جہان کی چیزیں بکنے آجاتی ہیں۔

تشریق کے معنی قربانی سکھلانے کے ہیں، ایامِ تشریق ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ ہیں، حاجیوں کے قافلے عرفات و مزدلفہ سے واپسی میں ۱۰ کی صبح یہاں پہونچ جاتے ہیں اور ۱۲ کی شام تک تو بہر حال یہاں قیام رہتا ہے، حج کے سلسلہ میں متعدد واجبات، سُنن و مستحبات یہیں انجام پاتے ہیں مثلاً قربانی کرنا، سر کے بال اتروانا، شیطانوں کو کنکریاں مارنا، جامۂ احرام اتارنا۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ۔ ادھر حج کا بیان آیا، اُدھر ذکرِ الٰہی کی تاکید پھر شروع ہو گئی، تکبیر کی کثرت قیامِ زمانۂ منیٰ کا ایک خاص جزو ہے۔

اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ اس پر صحابہ و تابعین سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زمانۂ تشریق ہے۔

لاخلاف بین اھل العلم ان المعدودات ایام التشریق وقد روی ذلک عن علی وعمر وابن عباس وابن عمر وغیرھم۔ (جصاص)

۶۵۱ یعنی منیٰ سے مکہ معظمہ کی طرف روانگی کے لئے، دونوں صورتیں بالکل جائز ہیں، اب اگر کوئی شخص ۱۰ کے بعد صرف دو دن قیام کرکے ۱۲ کی شام کو مکہ چلا آئے تو بھی درست ہے، اور جس کا جی چاہے ۱۳ تک منیٰ میں ٹھہرا رہے، جب بھی درست ہے، امام شافعیؒ کے ہاں اگر ۱۲ کو واپس ہوتا ہے تو قبلِ غروب رمیِ جمرات (کنکریاں پھینکنے) سے فراغت کرلے اور امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اگر ۱۳ تک ٹھہرتا ہے تو قبلِ طلوعِ آفتاب ہی رمیِ جمرات کر ڈالے۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ۔ نفی دونوں صورتوں سے گناہ کی کی گئی ہے گویا بلحاظ جواز دونوں شقیں یکساں ہیں، یہ مراد نہیں کہ دونوں میں کوئی افضل و مفضول نہیں، اور بلحاظ درجہ بھی دونوں مساوی ہیں، فقہائے حنفیہ کے ہاں ۱۳ کا قیام افضل ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَمِنَ النَّاسِ

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ تم (سب) اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے ۵۵۳ اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے ۵۵۴

مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى

کہ اس کی گفتگو جو دنیوی غرض سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اُس پر وہ اللہ کو گواہ

مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

لاتا ہے ا درآں حالیکہ وہ شدید ترین دشمن ہے ۵۵۵

۵۵۲ یعنی یہ سب احکام نافع اسی کے حق میں ہو سکتے ہیں جو دل میں خوفِ خدا و خشیتِ الٰہی رکھتا ہو تقویٰ الٰہی کی اس تشدد سے تاکید یوں ہی اور بیکار نہیں، مومن کے دل پر تقویٰ کی اہمیت نقش کرنے کے لئے ہے وہ مومن ہی کیا جو متقی نہ ہو

۵۵۳ (اور اُسی کے سامنے سارے اعمال کا جواب دِہ ہونا ہو گا.)

یہ یاد دہانی حفظِ اعمال میں کس درجہ مؤثر ہے اسارا کھیل اسی استحضار ہی کا تو ہے.

۵۵۴ (اُس کی چرب زبانی کی بنا پر اس کے دعوئ اسلام و محبّتِ اسلام کے باعث)

اوپر دو قسم کے انسانوں کا ذکر تھا، آخرت کے قائلین و معتقدین کا اور آخرت کے منکرین و منافقین کا اور ابتدا منافقین کے بیان سے ہوتی ہے.

وَمِنَ النَّاسِ۔ لازمی نہیں کہ ایک ہی شخص مراد ہو ایک بھی ہو سکتا ہے بہت سے بھی ہو سکتے ہیں.

اشارۃ الی بعضھم فیحتمل الواحد ویحتمل الجمع۔ (کبیر)

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ فِي اظہارِ مقصودیت کے لئے ہے یعنی گفتگو سے مقصود اُسے محض حصولِ دنیا ہوتی ہے طلبِ آخرت نہیں

یطلب به حظًا من حظوظ الدنیا (کشاف) لطلب مصالح الدنیا (کبیر)

فِي "باب میں" یا "درباره" کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں معنی ہوں گے کہ "دنیوی امور سے متعلق"

ای ما یقوله فی امور الدنیا واسباب المعاش (بیضاوی) درباب زندگانی دنیا (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

شانِ نزول کی روایتوں میں آتا ہے کہ قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص خوش منظر و خوش تقریر اخنس بن شریق نامی تھا مجلسِ رسولؐ میں جب آتا تو خوب لمبے چوڑے دعوے اپنے ایمان و اسلام کے کرتا، بات بات پر خدا کو گواہ ٹھہراتا لیکن جب مجلس سے اُٹھ کر چلا جاتا تو طرح طرح کی عملی شرارتوں میں لگ جاتا.

نزلت فی اخنس بن شریق الثقفی (ابن جریر) کان رجلا حلو الکلام، حلو المنظر (معالم) کان منافقا حسن العلانیة خبیث الباطن (کبیر)

مگر شانِ نزول کی روایتوں سے یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ آیت کا انطباق صرف اسی خاص شخص تک محدود ہے بلکہ جہاں کہیں بھی وہ صفات پائے جائیں گے، وہاں وہ آیت بھی چسپاں ہو گی.

وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ

اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر بگاڑ پیدا کرے اور کھیتی اور جانوروں کو تلف کرے ۷۵۶

القول الثانی فی الآیة وھو اختیار اکثر المحققین من المفسرین ان ھذہ الآیة عامة فی حق کل من کان موصوفا بھذہ الصفات المذکورة۔ (کبیر)

وقال قتادة ومجاھد وجماعة من العلماء نزلت فی کل مبطن کفرا ونفاقا وکذبا او اضرارا وھو یظھر بلسانه خلاف ذلك فھی عامة۔ (قرطبی)

۷۵۵ (اللہ کے دین کا، اللہ کے رسول ؐ کا)

یُشْھِدُ اللّٰہَ۔ یعنی آپ کو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے، قسم کا مفہوم بھی شہادت میں پیش کرنا ہوتا ہے،

یقول انی لاحبك ویحلف باللہ علی ذلك (معالم)

رسول سے علم غیب کلی کی نفی پر دلائل بہت سے قائم ہیں، ایک مزید دلیل اس آیت سے نکلتی ہے منافق کے نفاق کا علم آیت کے ذریعہ سے حق تعالیٰ آپ کو کرا رہا ہے، ورنہ آپ تو اس کی باتوں سے خوش ہو رہے تھے، اگر آپ نے منافق پہچان لئے ہوتے تو ظاہر ہے کہ اس سے گفتگو میں لطف ہی کیوں لیتے۔

۷۵۶ (جیسا کہ اخنس نے کیا بھی کہ قبیلۂ ثقیف کے کھیت جلوا دیئے اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کر ڈالا۔)

کما فعله الأخنس بثقیف اذ بیتھم واحرق زروعھم واھلك مواشیھم۔ (بیضاوی)

آیت اپنے حکم و تعبیر کے لحاظ سے عام ہے یعنی جو کوئی بھی ایسی حرکتیں کرے اس پر یہ صادق آئے گی۔

صارت عامة لجمیع الناس فمن عمل مثل عمله استوجب تلك اللعنة والعقوبة (قرطبی)

وَإِذَا تَوَلّٰى یعنی جب مجلس رسول سے اٹھ کر چلا گیا۔

ای اذا خرج من عندك (ابن عباس) ای ادبر واعرض (روح عن الحسن)

تَوَلّٰى کے دوسرے معنی "حاکم بن گیا" "حکومت پا گیا" کے بھی ہوسکتے ہیں اور کئے گئے ہیں یعنی جب وہ ملک میں حاکم و مسلط ہو جاتا ہے۔

قال مجاھد من الولایة ای صار والیا (بحر) ای ملك الامر وصار والیا (معالم عن الضحاك)

چوں ریاست پیدا کند (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) اور جب حاکم ہوتا ہے (شاہ رفیع الدین دہلویؒ)

لیکن نظم کلام و سیاق عبارت کے لحاظ سے ترجیح معنی اول کو ہے کہ نفاق پر روشنی یہی معنی لے کر پڑتی ہے۔

القول الاول اقرب الی نظم الآیة لان المقصود بیان نفاقه (کبیر)

سَعٰى کے معنی ہیں سرگرم عمل ہونا، دوڑ دھوپ کرنا۔

السعی فی کلام العرب العمل (ابن جریر)

فِى الْأَرْضِ عام طور پر اس سے مراد منافقین کی کثرت سعی اور وسعت عمل تخریب لی گئی ہے۔

یدل علی کثرة سعیه وعمله فی نواحی الارض (بحر)

لیکن الْأَرْض کے ال سے مراد کوئی زمین معہود یعنی شہر مدینہ بھی ہوسکتا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ

درآنحالیکہ اللہ بگاڑ کو (بالکل) پسند نہیں کرتا ۷۵۷ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خوفِ خدا کر تو اسے نخوت گناہ پر

بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

(اور زیادہ) آمادہ کر دیتی ہے ۷۵۸ سو اس کے لئے جہنم بس ہے اور وہ بڑی ہی آرام گاہ ہے۔ اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی

يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

ہوتا ہے جو اپنی جان (تک) اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتا ہے ۷۵۹ اور اللہ بندوں کے حق میں بڑا شفیق ہے ۷۶۰

وان كان المراد الأخنس فلا زرع ارض المدينة فالألف واللام للعهد۔ (بحر)

اَلْحَرْثُ وَالنَّسْلُ۔ کھیتوں میں اس نے آگ لگا دی اور مویشیوں کو ہلاک کر دیا۔ النسل سے ہر قسم کے جانور مراد لئے گئے ہیں۔

النسل نسل كل دابة (ابن عباس) النسل من كل شيء من الحيوان (ابن جرير۔ عن مجاهد)

الحرث۔ ازہری لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ حرث سے یہاں عورتیں مراد ہیں اور نسل سے اولادِ انسانی۔

ذكر الازهري ان الحرث هنا النساء والنسل الاولاد۔ (روح)

اور جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حرث سے مراد دین ہے اور نسل سے انسان۔

عن الصادق ان الحرث في هذا الموضع الدين والنسل الناس (روح)

۷۵۷ شریعتِ اسلام کا تو عین مشن یہ ہے کہ دنیا کو عدل و امن سے بھر دے، بدامنی و فساد عین غضبِ الٰہی کی چیزیں ہیں اور ہدایاتِ اسلامی کے برعکس عمل کرنے ہی سے پھیلتی ہیں۔

اَلْفَسَادُ۔ فساد۔ آیت میں عام ہے، دینی و دنیوی ہر قسم کے فساد کو۔

والآية بعمومها تعم كل فساد كان في ارض او مال او دين وهو الصحيح۔ (قرطبی)

۷۵۸ یعنی جب اسے اس کا کوئی مخلص یا خواہ سمجھاتا ہے اور اسے تقویٰ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو بجائے سنبھلنے کے وہ اور بگڑ جاتا ہے اور اپنی کج روی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتا ہے۔ یہ بیان ہو رہا ہے اس کا کہ ایسے کافر معاندین میں مخالفتِ حق اور ایذاءِ مخلوق کے ساتھ ساتھ کبر و پندار بھی کس درجہ کا ہوتا ہے۔

اَلْعِزَّةُ۔ عزۃ کے معنی یہاں خود بینی اور حمیتِ جاہلی کے ہیں۔

والعزة القوة والغلبة وقيل العزة هنا الحمية وقيل العزة هنا المنعة وشدة النفس (قرطبی)

وقد تستعار العزة للحمية والانفة المذمومة (راغب)

بِالْإِثْمِ۔ ب یہاں ل کے معنی میں ہے۔

الباء بمعنى اللام اي اخذته العزة والحمية عن قبول الوعظ للاثم الذي في قلبه (قرطبی)

۷۵۹ اب بیان پھر مومنینِ کاملین کا ہو رہا ہے۔

فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ

پھر اگر تم بعد اس کے کہ تمہارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں پہونچ چکی ہیں ڈگمگا گئے تو جانے رہو کہ اللہ بڑا

عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّآ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ

زبردست ہے، بڑا حکیم ہے ۷۶۵ (یہ لوگ) تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں

مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ‌ؕ

میں آجائے اور فرشتے (بھی) ۷۶۵ اور قصہ ہی ختم ہو جائے،

حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا یہ ایک شیطانی لغزش ہے، اور یہ بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کے اشد ہونے کے سبب یہ عذاب کا زیادہ مظنّہ ہے۔" (تھانویؒ)

۷۶۳ (وہ تو تمہیں طرح طرح کی آمیزشوں اور جدتوں کا مشورہ دیتا ہی رہے گا، خوشنما سے خوشنما عنوانات کے ساتھ) آیت میں وعید و تنبیہ شدید ہے ایک طرف جاہل و مبتدع اہل تصوف و طریقت کے لئے، دوسری طرف روشن خیال اہل تجدد کے لئے۔

۷۶۴ (ہر سزا پر قادر، اور سزا کو وقت مناسب ہی پر دینے والا)

اَلۡبَيِّنٰتُ۔ مراد اس سے کھلے ہوئے احکام بھی ہو سکتے ہیں جن میں کسی قسم کا خفا یا ابہام نہیں مثلاً عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، حکم نماز، حکم جہاد اور ہر وہ چیز بھی اس میں داخل ہے جو دین اسلام کی حقانیت یا قانون اسلام کی صداقت پر روشن دلیل کا کام دے سکے یہ بَيِّنٰتٌ خواہ جس معنی میں بھی لئے جائیں، بہرحال ان نو مسلم یہود کے پاس پہونچ چکے تھے، اور انھیں کوئی وجہ اب قدم پیچھے ہٹانے یا ادھر ادھر کرنے کی نہیں رہی تھی۔

زَلَلۡتُمۡ۔ زلّت کے لفظی معنی پھسل جانے کے ہیں، جو بے اختیاری میں بھی ہوتا ہے، یہ لفظ لا کر ڈرا دیا ہے، کہ قصداً و دانستہ مخالفت تو پھر بڑی چیز ہے، غلطی یا بے خیالی سے بہک جانے میں بھی گرفت کا احتمال ہے۔

عَزِيۡزٌ۔ سیاقِ آیت میں وہ ہے جو جب اور جو کچھ چاہے سزا دے سکتا ہے۔

حَكِيۡمٌ۔ وہ ہے جو ہمیشہ وقت مناسب ہی پر سزا دیتا ہے۔

۷۶۵ (جن کا کام ہی تعمیل ارشاد کرنا ہوتا ہے)

اب پھر اشارہ انھیں نو مسلم یہود کی طرف ہے، جن کا ذکر دو آیت قبل آچکا ہے، یہ اسلام میں اب بھی داخل ہوئے ہیں لیکن کفر و یہودیت سے پوری طرح نہیں نکل پائے ہیں۔

هَلۡ یہاں، استفہامیہ نہیں، بلکہ قطعیت و اظہار کے لئے ہے قَدۡ کے قریب المعنیٰ۔

على التقرير تنبيها وتبكيتا ونفيا.... ذلك تنبيه على قدرة الله وتخويف من سطوته (راغب) بمعنى قد وذلك مع الفعل (اقرب) مراد به ها الجهد اى ما ينظرون الا ان اى (قرطبى)

يَاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ۔ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ۔ عقائد کا یہ اصولی اور مسلّم مسئلہ ہے کہ ذات باری کے لئے نہ محل ہے نہ ظرف اس لئے

اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے "آنے" یا "جانے" کے کوئی معنی ہی نہیں۔ امام رازیؒ کہتے ہیں:۔

اجمع المعتبرون من العقلاء علی انہ سبحانہ وتعالیٰ منزہ عن المجیء والذہاب (کبیر)

اور آگے اس پر متعدد دلائل قائم کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں:۔

... انہ تعالیٰ لیس بجسم ولا متحیز وانہ لا یصح المجیء والذہاب علیہ (کبیر)

اس لئے اکثر مفسرین نے آیت کو متشابہات میں سے مانا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، تفصیل عقل بشری سے ماوراء ہے۔ چنانچہ مفسر تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ کے لئے آنا وغیرہ جہاں مذکور ہے اس کی کیفیت دریافت ہونا جائز نہیں کیونکہ جس طرح اس کی ذات کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی ہے اسی طرح اس کی صفات وافعال کی کنہ معلوم نہیں ہو سکتی۔ البتہ وجود اور وقوع پر اجمالاً بلا تعیین کیفیت ایمان لے آنا چاہئے کہ اس سے زیادہ فکر میں پڑنا لا انطباق کا قصد کرنا ہے"۔

اور صاحب روح المعانی نے یہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ:۔

او ہو من المتشابہ ... [illegible] ... صفات المتکلم۔

اور سلف صالح کا مذہب یہ نقل ہوتا چلا آ رہا ہے کہ:۔

والاولیٰ ... [illegible] ... الی اللہ تعالیٰ (کبیر)

اور مفسر ومحدث بغوی کو یہ لکھنا پڑا۔

الاولیٰ فی ہذہ الآیۃ وما شاکلہا ان یؤمن الانسان بظاہرہا ویکل علمہا الی اللہ تعالیٰ ویعتقد ان اللہ عز اسمہ منزہ عن سمات الحدث علی ذلک مضت ائمۃ السلف وعلماء السنۃ۔ (معالم)

اور قرطبی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ ممکن ہے یہاں بیان جزا کے معنی میں ہو، جیسا کہ قرآن مجید ہی کی بعض دوسری آیتوں میں ہے۔

وقد یحتمل ان یکون معنی الاتیان راجعا الی الجزاء فسمی الجزاء اتیانا کما سمی التخویف والتعذیب فی قصۃ نمرود اتیانا فقال فاتی اللہ بنیانہم من القواعد وقال فی قصۃ النضیر فاتاہم اللہ من حیث لم یحتسبوا (قرطبی)

اور بعضوں نے آیت میں یاتیہم اللہ کے درمیان کوئی اور لفظ مثلاً امر یا بأس یا آیات وغیرہ محذوف مان کر معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ کا حکم آ پہونچے یا عذاب آ جائے۔

ای یاتیہم ثوابہ وحسابہ وعذابہ (ابن جریر) ای امرہ وباسہ (مدارک) ای آیات اللہ (کبیر) ای امر اللہ (کبیر) بانہم اتاہم متاع ... [illegible] ... الاجماع (بحر)

یعنی بیاید عذاب او (شاہ ولی اللہؒ)

اور ایک جماعت نے ملائکہ کی آمد اور ... [illegible] ... کے پہلو کو مد نظر رکھ کر ان واقعات کو روز قیامت سے متعلق کیا ہے کہ یہ منکرین ومعاندین قبول حق کے لئے اب شاید آمد قیامت ہی کے منتظر ہیں۔

قولہ یاتیہم اللہ اخبار عن حال القیامۃ (کبیر)

یہ سب مذہب اپنی اپنی جگہ صحیح اور حق ہیں، لیکن ان سب میں بنائے مشترک یہ ہے کہ آیت کا روئے سخن عام منکرین یا منافقین واہل کتاب کی جانب سمجھا گیا ہے۔

ای یکذبون بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم (ابن جریر) ارید بہ المنافقون او اھل الکتاب (روح)

لیکن سیاقِ کلام پر نظر کرکے اگر روئے سخن صرف یہود تک محدود کر دیا جائے تو بات بالکل صاف ہوئی جاتی ہے اور بجائے اوپر کی تفسیر کے صرف اتنا بڑھا دینا ہوگا: "حسبِ اعتقادِ یہود" اس لئے کہ یہود کا مذہب تشبیہ و تجسیم کا تھا، وہ لوگ خدا کی جسمانیت کے پوری طرح قائل تھے، اور جلوۂ حق کو بادلوں سے خاص طور پر متعلق سمجھتے تھے بلکہ بادلوں کو گویا حق تعالیٰ کی سواری سمجھے ہوئے تھے، ان کے مقدس صحیفوں اور نوشتوں میں اب تک اس قسم کی تعلیمات محفوظ ہیں:—

"وہ نور کو پوشاک کی مانند پہنتا ہے، اور آسمانوں کو پردہ کے مانند پھیلاتا ہے، وہ اپنے بالاخانوں کو پانیوں میں بناتا ہے، اور بدلیوں کو اپنی رتھ ٹھہراتا ہے، اور ہوا کے بازوؤں پر وہ سیر کرتا ہے" (زبور ۱۰۴: ۳) "خداوند ایک تند رو ابر پر سوار ہو کر مصر کو آئے گا، اور مصر کے بت اس کے حضور میں لرزاں ہوں گے" (یسعیاہ ۱۹: ۱) "کروبی گھر کی داہنی طرف کھڑے ہوئے، اور اندرونی صحن بادل سے بھر گیا، تب خداوند کا جلال کروب سے اٹھ گیا، اور گھر کے آستانہ پر آیا اور گھر بادل سے بھر گیا، اور صحن خداوند کے جلال کی چمک سے معمور ہوا" (حزقی ایل ۱۰: ۴)

غرض خدائے تعالیٰ کا بادلوں سے بطور مرکب یا سواری کے قریب ترین تعلق یہود کے تخیل میں رچ گیا تھا، یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری مکمل اڈیشن (طبع چہاردہم) میں حق تعالیٰ کی جو تصویر نیم یہودی نیم مسیحی تخیل کے مطابق دی ہے (جلد ۲ صفحہ) اس میں (معاذ اللہ) حق تعالیٰ کو صاف صاف بدلیوں پر سوار دکھایا ہے! تو قرآن مجید نے آیت میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے، صرف یہود کے خیال کی ترجمانی، اس کی صحت و غلطی سے بحث کئے بغیر کر دی ہے کہ یہ بنی اسرائیل اسی خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خداوند خدا فرشتوں کے بدلیوں پر سوار ہو کر ان کے سامنے آجائے گا، اور ہر امر قطعی کا فیصلہ کرکے رکھ دے گا؟ الحمدللہ بڑے اونچے مرتبے کے امام المفسرین امام رازیؒ کی نظر سے یہ نکتہ بھی نہ بچا، صاف اپنی تفسیر میں لکھ گئے ہیں اور صرف لکھ ہی نہیں گئے ہیں، اسی کو پہلے وھو اوضح عندی من کل ما سلف اور پھر ھذا الوجہ اظھر عندی من کل ما سبق کہہ کر بہترین توجیہ یہی قرار دے گئے ہیں کہ یہود حق تعالیٰ کی تشبیہ اور تجسیم کے قائل تھے، اور قرآن نے یہاں بجنسہ ان کے اعتقاد کو اس پر تنقید کئے بغیر دہرا دیا ہے! اس لئے اس کے بعد نہ مجاز وغیرہ کسی تاویل کی حاجت رہتی ہے اور نہ کوئی اشکال ہی رہ جاتا ہے۔

اذا کان ھذہ الحکایۃ عن حال الیھود ولم یمنع اجراء الاٰیۃ علی ظاھرھا وذلک لان الیھود کانوا علی مذھب التشبیہ وکانوا یجوّزون علی اللہ المجیٔ والذھاب وعلی ھذا التقدیر یکون ھذا الکلام حکایۃ عن معتقد الیھود القائلین بالتشبیہ فلا یحتاج حینئذ الی التاویل ولا الی حمل اللفظ علی المجاز .. ولیس فی الاٰیۃ دلالۃ علی انھم محقون فی ذلک الانتظار او مبطلون وعلی ھذا التقدیر یسقط الاشکال۔ (کبیر)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ۔ هَلْ یہاں استفہامیہ نہیں بلکہ جب اِلَّا کے ساتھ آتا ہے تو نفی کے معنی دیتا ہے، قرآن مجید میں اس کے اس استعمال کی اور بھی مثالیں ہیں مثلاً هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔

ھل ھنا للنفی ... وکونھا بمعنی النفی اذا جاء بعدھا الا اکثر الاستعمال فی القراٰن وفی کلام العرب (بحر) معناہ النفی ولھذا جاء بعدہ الا۔ (عکبری)

وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾ سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُمْ

اور اللہ ہی کی طرف (سارے) معاملات رجوع کئے جائیں گے ۷۶۶ (آپ) بنی اسرائیل سے پوچھ دیکھئے ہم نے انھیں

مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ

کھلی نشانیاں کتنی دے رکھی تھیں ۷۶۷ اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی

فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾

ہو تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت ہے ۷۶۸

۷۶۶ (آخری فیصلہ اور تصفیہ کے لئے)

کلام بطور تہدید کے ہے۔

۷۶۷ اور پھر وہ ہر آیت کا انکار بھی کس شد و مد سے کرتے رہے۔

اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ۔ یہ کھلی ہوئی نشانیاں کس چیز کی تھیں، خدائے تعالیٰ کے مخصوص فضل و کرم کی اور بنی اسرائیل کی مخصوص سرافرازیوں کی مثلاً کتاب توریت اور دوسرے آسمانی صحیفوں کا نزول یا اس نسل میں انبیاء کرام کا مسلسل ظہور، وقس علی ہذا۔

سَلْ بلفظ سَلْ سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں کہ اسرائیلی ان سے انکار کر ہی نہیں سکتے۔

۷۶۸ (عام اس سے کہ اس سزا کا ظہور فوری اور اسی دنیا میں ہو یا بہ تاخیر عالم آخرت میں)

نِعْمَةَ اللّٰهِ۔ نعمت ادنیٰ بھی ہو جب بھی نعمت ہی ہے اور بہر صورت قابلِ قدر، چہ جائیکہ ایسی اعلیٰ نعمتیں جن سے بنی اسرائیل کو مدتوں سرفرازی رہی۔

يُبَدِّلْ۔ تبدیل کے معنی ہیں، کسی شے کی اصل حقیقت کو کچھ کا کچھ کر دینا، اس شے کے اندر تحریف کر دینا، اُسے مسخ کر دینا، اور اللہ کی نعمتوں کے اندر تبدیلی ایک تو یہ ہوئی کہ جو چیزیں ہدایت و استفادہ کے لئے تھیں الٹا اُنھیں کو فسق و کفر کے کاروبار میں لگا دیا گیا، اور یا پھر یہ کہ جو کلام باعثِ ہدایت ہوتا تھا اسی میں تصحیف و تحریف کا عمل شروع کر دیا گیا، اہلِ تفسیر نے دونوں شقیں اختیار کی ہیں۔

وتبديلهم اياها ان الله اظهرها لتكون اسباب هداهم فجعلها اسباب ضلالتهم او حرفوا ايات الكتاب الدالة على دين محمد صلى الله عليه وسلم (كشاف۔ مدارك) يجعلها سبب الضلالة وازدياد الرجس او بالتحريف والتاويل الزائغ (بيضاوی)

شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ نعمۃ اللہ۔ کی وسعت اطلاق، دینی و دنیوی ہر قسم کی نعمتوں کو شامل ہے اور یہاں ہر نعمت کے مسخ کر ڈالنے پر عذاب شدید کی وعید ہے اب نعمت اگر دینی ہے مثلاً کتاب الٰہی یا ظہور انبیاء تو اس میں تحریف یا انکار پر عذاب اُخروی کا وقوع ظاہر ہی ہے لیکن نعمت اگر محض دنیوی ہے مثلاً دولت، صحت، سلطنت تو اس کے

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا

خوشنما کر دی گئی ہے دنیوی زندگی اُن لوگوں کی نظر میں جو کافر ہیں ۵۶۲ اور وہ ان لوگوں سے تمسخر کرتے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں ۵۶۳

شعور و استعمال کا خمیازہ، بیماری، ناکامی، افلاس، بغاوت، انتشار، غلامی، ذلت، غیروں کی شکل میں اٹھانا بھی مشاہدہ کی چیزیں ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ کا فقرہ زور دینے اور تاکید کے لئے ہے یعنی بعد اس کے کہ اس نعمت کا پوری طرح تحقق ہو چکے اس کے پوری طرح فہم و معرفت میں آجانے کے بعد پھر جو کوئی اس کے ساتھ کفران کرے۔

آیت آج امت کے کس قدر حسب حال اور کس درجہ قابل غور ہے۔ اللہ کی عطا کی ہوئی ہر دینی و دنیوی نعمت کے ساتھ آج ہمارا کیا معاملہ ہے؟ کس نعمت کا حق ہم ادا کر رہے ہیں؟ کون سی نعمت ایسی ہے جس کی روح ہم نے نہیں بدل ڈالی ہے؟ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری ساری عبادتیں تک مغز و روح سے خالی، محض ان عبادتوں کے خالی ڈھانچے رہ گئے ہیں۔ اخلاق و اتحاد کی دولت ہم نے الگ برباد کر ڈالی۔ نتیجہ جو نکلا سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ پاکستان، عراق، انڈونیشیا وغیرہ مسلم ملکوں کا آج جو عبرت انگیز حشر ہو رہا ہے ان سب کی تہ میں یہی خدائی نعمتوں کی ناقدری ہے۔

مسیحیوں کے ہاں ایک عربی داں انگریز پادری ڈاکٹر وہیری (WHERRY) ابھی حال میں گزرے ہیں مسلمانوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے، انگریزی میں مختصر سی تفسیر بھی لکھی ہے۔ اس آیت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں نے متن قرآن کی جو اتنی سخت حفاظت رکھی ہے اس کا ایک سبب اسی قسم کی تہدیدی آیتیں ہیں۔"

خیر اس سے بہر حال محفوظیتِ قرآن پر شہادت تو ایک دشمنِ اسلام کی زبان سے ہاتھ آگئی۔

۵۶۲ (اور دنیا کا ساز و سامان، جاہ و حشم، باغ و مکان، موٹر اور ریڈیو، کوٹھی اور فرنیچر، سب باوجود فانی و بے حقیقت ہونے کے انھیں نہایت اہم و قابلِ وقعت نظر آتا ہے اور ان کے دلوں کے لئے خاص کشش رکھتا ہے) جو کافر ہے وہ اسی دنیوی زندگی کی مادی لذت و دولت عیش و عشرت پر نثار رہتا ہے، اسی کو بہتر با شان سمجھے ہوئے ہے، اسی پیمانہ سے سب کو ناپتا رہتا ہے۔ وہ بے حد تنگ نظر ہوتا ہے، وہ اس پر لئے تمام عیش پر عیشِ سرمدی و عشرتِ لازوال کو قربان کئے رہتا ہے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کافر اس باب میں معذور ہے، محبت دنیا طبعاً اس پر اتنی غالب کر دی گئی ہے کہ وہ اس کے ترک ہی پر قادر نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، کافر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو بلا کسی معذوری کے اپنے قصد و اختیار سے حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کرے اور دنیا کی خوشنمائی کا آنکھوں میں بس جانا، یہ تو کفر کا نتیجہ اور معلول ہے، نہ کہ اس کا باعث و سبب۔ اپنے ارادہ کا سوءِ استعمال تو وہ پہلے ہی کر چکا، محض نتیجہ کے طور پر مشیتِ تکوینی نے اس کی کوشش کو کامیاب کر دیا۔

۵۶۳ (اور سامانِ دنیوی سے محروم ہیں۔)

کافر اسی غلط معیار کی بنا پر اسی کج نگاہی سے کام لے کر اپنے کو بڑا سمجھتا، اور ایمان و طاعت کی بے وقعتی اور تحقیر کرتا رہتا ہے۔ نگاہ کی یہ کجی، یہ غلط بینی ہی دنیا کا شدید ترین ابتلاء ہے۔ حدیث نبوی کی یہ دعا اسی فتنہ سے بچنے کے لئے ہے اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا اور عارفِ رومی کی یہ مناجات بھی اسی موقع کے لیے ہے

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ

درآنحالیکہ جو لوگ ڈرتے رہتے ہیں وہ اُن سے (کہیں) اوپر ہوں گے قیامت کے دن ۷۶۱ اور اللہ جسے چاہتا ہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ

بے شمار رزق دیتا رہتا ہے ۷۶۲ لوگ ایک ہی اُمت تھے ۷۶۳

انچہ در کون است اشیا بہ جہست | وانمایت رابہ صورت کہ ہست
آب خوش را صورت آتش بدہ | اندر آتش صورت آبے منہ

۷۶۱ (کہ وہ دن ہوگا کشف حقائق کا)

اَلَّذِيْنَ اتَّقَوْا۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں یا کفر و شرک سے بچتے رہتے ہیں۔

فَوْقَهُمْ۔ یعنی درجہ و مرتبہ میں ان سے ہزار چند بڑھے ہوئے ہوں گے۔

لانھم فی علیین وھم فی اسفل السافلین۔ (بیضاوی)

۷۶۲ (اُس کے ناپنے کا جو پیمانہ منکرینِ آخرت نے ذہن رکھا ہے وہی غلط ہے)

مطلب یہ ہوا کہ دنیوی مال و دولت کا تعلق مصالح تکوینی سے ہے جو یہ مال و دولت کی افراط، یہ روپیہ کی ریل پیل، یہ بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں اور بڑے بڑے ساہوکارے، ہرگز کوئی معیارِ مقبولیت یا حق و صداقت کا نہیں اچلہے وہ جاہ و تمول ذاتی و شخصی ہو یا قومی و اجتماعی، کوئی اس میں بھول نہ پڑے، اور قومی اقبال مندی پر نہ مغرور ہو، نہ اس سے مرعوب ہو۔

۷۶۳ (آغازِ فطرت میں)

آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی، فرنگی محققین حسبِ معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے اور ان میں سے اکثر یہی کہے گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعددِ آلہ تھا، شروع شروع وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدۂ توحید تک تو نسلِ انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور عقلی و دماغی ارتقاء کے بڑے طویل سفر کے بعد پہونچی ہے، قرآن مجید نے اس خرافاتی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کر دیا کہ نسلِ انسانی آغازِ فطرت میں دینی حیثیت سے ایک اور واحد تھی، اس میں "مذاہب" و "ادیان" کے تفرقے کچھ بھی نہ تھے، نوعِ انسانی فطری اور جبلی طور پر دینِ توحید ہی پر تھی۔

اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ یہاں جس وحدت کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ اس سے دینی و اعتقادی ہی وحدت مراد ہے یعنی عقیدۂ توحید۔

کانوا علی شریعۃ من الحق (ابن جریر عن ابن عباس) کانوا علی الھدی جمیعا (ابن جریر عن قتادۃ)

انھم کانوا علی دین واحد وھو الایمان والحق ھذا قول اکثر المحققین۔ (کبیر)

صدیوں کی اُلٹ پھیر قیل و قال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرینِ اثریات و انسانیات و اجتماعیات کا (سر چارلس مارسٹن، پروفیسر لینگڈن، پروفیسر شمڈٹ کا) یہی ہے کہ انسان کا دینِ اولیں، دینِ توحید تھا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ۷۷۳ اور ان کے ساتھ کتاب حق نازل

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ

کی ۷۷۴ کہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس باب میں وہ اختلاف رکھتے تھے ۷۷۵ اور کسی نے اس میں اختلاف

اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ

نہیں کیا مگر انھیں نے جنھیں وہ ملی تھی آپس کی ضد کے باعث بعد اس کے کہ انھیں کھلی ہوئی نشانیاں پہونچ چکی تھیں ۷۷۶

۷۷۳ (بھٹکے ہوؤں کو)
اور یہ ڈرانا بھی گمراہوں کو واپس لانے اور انھیں راہ دکھانے کی خاطر ہی ہوگا۔
فَبَعَثَ میں فَ سے مراد ہے کہ ایک مدت کے بعد جب اہلِ باطل اپنے اختراعی عقائد و اعمال سے بہت سے فرقے اور مذاہب پیدا کر چکے تھے۔
مُبَشِّرِيْنَ یعنی خوشخبری سنانے والے اہل ایمان کو، اُن لوگوں کو جو خدائی دستورِ حیات کو قبول و اختیار کرلیں۔
مُنْذِرِيْنَ یعنی ڈرانے والے اہل کفر کو، اُن لوگوں کو جو خدائی دستورِ حیات کے مقابلہ میں انکار و طغیان قائم رکھیں۔
۷۷۴ الْكِتٰبَ سے کوئی مخصوص و متعین کتابِ الٰہی مراد نہیں بلکہ "ال" جنس کتاب کے لئے ہے اور کتاب سے مراد وہ تمام کتابیں ہیں جو مختلف پیغمبروں پر مختلف زمانوں میں اُترتی رہیں گویا لفظ کتاب صورۃً واحد ہے اور معنیً جمع۔
یرید به الجنس۔ (بیضاوی)
بِالْحَقِّ۔ حق کو لے کر یا اظہارِ حق کے لئے، ترکیب میں بِالْحَقِّ حال واقع ہوا ہے کتاب کا۔
بتبیان الحق (مدارک) حال من الکتاب ای ملتبسا بالحق شاهدا به۔ (بیضاوی)
۷۷۵ یعنی عقائد و اعمال کے باب میں۔
لِيَحْكُمَ۔ تاکہ وہ فیصلہ کردے انھیں انبیاء یا کتب کے واسطہ سے۔ فیصلہ کون کردے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ، کہ وہی اصلی فیصلہ کرنے والا ہے اس لئے لِيَحْكُمَ کی ضمیر غائب کا مرجع اللہ ہے لیکن بعض نے نبی اور بعض نے کتاب بھی مراد لی ہے، اور یہ دونوں بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔
ای لیحکم اللّٰه او النبی المنزل علیه او الکتاب (کبیر) والضمیر عائد علی اللّٰه هذا هو الظاهر وقیل عائد علی الکتاب (بحر) مسند الی الکتاب فی قول الجمهور (قرطبی)
۷۷۶ (تصدیقِ حق کی) اور اس طرح اصولِ دین کے باب میں کسی قسم کا التباس اور خفاء باقی نہیں رہا۔
بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ یہاں یہ صاف کر دیا کہ اختلاف اور نزاع کا باعث آپس کی ضد اور نفسانیت ہوئی، نہ یہ امر کہ اصل احکام الٰہی یا پیامِ حق میں کسی طرح کا ایچ پیچ تھا، اور نہ یہ کہ مسائل اجتہادی میں رائے یا اجتہاد کا اختلاف ہوا۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ

پھر اللہ نے اپنے فضل سے انھیں جو ایمان والے تھے، وہ امر حق بتادیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کررہے تھے ۷۷۶

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ

اور اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست بتادیتا ہے ۷۷۷ کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ

اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ

جنت میں داخل ہوجاؤ گے ۷۷۸ درآں حالے کہ (ابھی) تم پر ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں ۷۷۹

اَلَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ۔ یعنی وہی لوگ جنھیں کتاب بواسطۂ انبیاء ملی تھی، مراد ہیں علماء ومشائخ وپیشوایانِ قوم۔ گمراہی اور کج روی کی طرح یہی لوگ ڈالتے ہیں، عوام محض ان کے پیچھے ہولیتے ہیں۔

۷۷۶ (چنانچہ اہلِ حق کو نزاع واختلاف کبھی مضر نہیں پڑا۔)

لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ میں ذکر اہلِ حق کے اختلاف کا ہے اہلِ باطل سے۔

بِاِذْنِہٖ میں اِذْن کے معنی فضل، توفیق ولطف کے ہیں۔

(الاذن التوفیق (تاج) بارادتہ ولطفہ (بیضاوی) بتوفیقہ وتیسیرہ (روح)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پر سوال ہوا ہے کہ جو اس کے مصداق ہوچکے تھے وہ تو خود ہی ہدایت یافتہ تھے پھر اب انھیں ہدایت کیسی؟ جواب یہ ہے کہ ایمان سے یہاں مراد قصد ایمان وصلاحیت ایمان ہے یعنی جو ایمان کے طالب تھے انھیں ہدایت حاصل ہوگئی۔

۷۷۷ (اور اس کی مشیتِ ہدایت ہمیشہ ان لوگوں سے متعلق ہوجاتی ہے جو اس کی طرف بڑھنا چاہتے اور ضد وتعصب کو چھوڑ کر طلبِ حق اختیار کرتے ہیں۔)

اس میں مومنین کی تشفی وتسلی کا پہلو بھی نکل رہا ہے کہ مخالفین ومعاندین کی سرگرم کوششوں اور زبردست پروپیگنڈے سے خوف وہراس نہ کریں اپنی طلب اگر صادق ہے تو کوئی مکر وتدبیر کوئی قوت یا شکست انھیں ضرر نہیں پہونچا سکتی۔

۷۷۸ (بلا مشقت اور بغیر امتحان اے گروہ مومنین!)

خطاب براہ راست عہد رسالت کے مومنین سے ہے۔

ایہا المؤمنون باللہ ورسلہ (ابن جریر)

۷۷۹ یعنی ان مومنینِ سابقین، ان انبیاء قدیم کی امتوں کی سی آزمائش اور مصیبتیں۔

مَثَلُ کے معنی غیر معمولی حالات وتجربات کے ہوتے ہیں۔

المثل الشبہ الا انہ مستعار لحال غریبۃ او قصۃ عجیبۃ لہا شان (بحر)

یہاں مراد ان پچھلی امتوں کے تحمّلِ شدائد سے ہے۔

ما ینال من اذی الکفار والفقر والجاہد ۃ فی سبیل اللہ (بحر) حالہم التی ہی مثل فی الشدۃ (کشاف)

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ

انھیں تنگی اور سختی پیش آئی اور انھیں ہلا ڈالا گیا ۷۸۲ یہاں تک کہ پیغمبر اور جو لوگ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے بول اٹھے ۷۸۳ کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی ۷۸۴ سن رکھو اللہ کی مدد یقیناً قریب ہے ۷۸۵

آیت سے یہ مراد نہیں کہ کوئی مومن محض ایمان کی برکت اور فضلِ خدا سے جنت میں داخل ہی نہ ہو سکے گا جب تک مجاہداتِ شدیدہ کی منزل سے گزر نہ لے، بلکہ مراد یہ ہے کہ صحابہؓ جن درجاتِ عالیہ کے طالب تھے اور بقول مرشد تھانویؒ "ہر مومن کو طلب ایسی ہی رکھنی چاہئے" ان درجاتِ عالیہ تک پہونچنے کے لئے عام شرط ان منزلوں سے گزرنے کی ہے، باقی نفسِ مجاہدہ تو ہر مومن کو اپنے درجہ و بساط کے لحاظ سے کرنا ہی ہوتا ہے۔

۷۸۲ (شدتِ تکلیف سے)

ای حرّکوا بانواع البلایا والرزایا۔ (کبیر)

اَلْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ یعنی مخالفین کے ہاتھوں تکلیفیں جھیلنا پڑیں دونوں لفظ قریب المعنی ہیں، فرق یہ کیا گیا ہے کہ بَاْسَآء میں راحت و آسائش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے اور ضَرَّآء میں واقعی درد و اذیت کا۔

البأساء عبارۃ عن تضییق جہات الخیر والضراء عبارۃ عن انفتاح جہات الشر (کبیر)

ان آزمائشوں کے تذکرے قدیم صحیفوں میں بھی بکثرت ملتے ہیں، مثلاً:-

"صادق پر بہت سی مصیبتیں ہوتی ہیں" (زبور۔ ۳۴: ۱۹) "چاندی کے لئے کٹھریا ہے اور سونے کے لئے بھٹی پر خداوند دلوں کو تپاتا ہے" (امثال ۱۷: ۳) "ضرور ہے کہ ہم بہت سی مصیبتیں سہہ کر خدا کی بادشاہت میں داخل ہوں" (اعمال ۱۴: ۲۲)

۷۸۳ (شدتِ غم و حزن سے بے قرار ہوکر)

اَلرَّسُوْلُ۔ سے مراد ہر زمانہ کے پیمبر ہیں۔

المراد من الرسول الجنس لا واحد بعینہ (روح) الرّسول ھٰھنا اسم جنس (معر)

۷۸۴ نَصْرُ اللّٰهِ۔ یعنی نصرتِ موعود۔

انبیاء و مومنین کا یہ قول حالتِ اضطرار میں دعا و مناجات کے طور پر تھا، نہ بہ طور اعتراض و شکوہ، وعدۂ نصرتِ الٰہی کا تھا مگر یہ تعین تو نہ تھا کہ کس وقت ہوگی جب ہجوم شدائد ہوتا تو نصرتِ غیبی کی ضرورت محسوس کرتے اور اپنے اجتہاد سے بہ الحاح و زاری پکارنے کہ حضرت یہی تو وقت دستگیری و نصرتِ غیبی کے نزول کا ہے (تھانویؒ)

آیت میں اشارہ ہے کہ امتِ محمدی کو بھی ہر قسم کی بلائیں پیش آئیں گی جیسی کہ اگلی امتوں کو پیش آچکی ہیں۔

۷۸۵ یہ جواب ان امتوں کو ان کی درخواست کا ملا کرتا، اس میں مومنین کو ہمیشہ کے لئے بشارت اور تسلی مل گئی اور اس حقیقت کا بیان آگیا کہ نصرتِ الٰہی اپنے وقت پر ضرور آکر رہے گی، مجاہدات سے گھبرانا اور بد دل نہ ہونا چاہئے، صوفیہ نے آیت سے یہ تعلیم بھی اخذ کی ہے کہ حالاتِ مخالفت کے ہجوم سے بہ تقاضائے بشریت اضطراب تو کاملین تک کو ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ثابت قدمی اور اتباعِ احکام کی برکت سے نصرتِ الٰہی مدد کرتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟۷۵۵ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہیں مال سے خرچ کرنا ہے ۷۵۶ سو وہ

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ

حق ہے والدین کا اور عزیزوں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا ۷۵۷ اور جو بھی نیکی کروگے،

خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اللہ کو اس کا پورا علم رہتا ہے ۷۵۸

۷۵۵ (اور کن موقعوں پر)

سأل المؤمنون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم این یضعون اموالھم (روح عن ابن جریج)

المطلوب بالسؤال ان مصرفه ای سی ھو رکبر عن الفقال) مرادھم من توھم لیس ھو طلب طاھیة بل طلب المصرف۔

سوال مسلمانوں کی طرف سے تھا، اور اس باب میں تھا کہ اپنی حسب ہمت وحیثیت اور خوش دلی سے کب خرچ کریں (نفلی)

باقی جو خرچ کہ فرض ہو چکا تھا یعنی زکوٰۃ، اس کا حساب تو کھلا ہوا تھا، سوال اس کی بابت نہ تھا۔

الاکثرون علی ان الایة فی التطوع (روح) عن الحسن ھی فی التطوع (مدارک)

قرآن جو مکمل دستور حیات ہے اس میں معاشیات کے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اپنی جگہ پر وہ پوری اہمیت اپنے اندر رکھتے ہیں

۷۵۶ خیر کا ایک مفہوم علاوہ نیکی اور بھلائی کے معروف ومتعارف معنی کے مال کا بھی ہے خصوصاً محمود اور نیک کمائی والے مال کا۔

المال من وجه محمود (راغب) والمال (تاج) والمال مطلقاً (اقرب الموارد)

اور یہاں تو کھلا ہوا بیان انفاق کا ہے اس لئے یہاں یہی مراد ہے۔

۷۵۷ مصارف خیر کی یہ فہرست کیسی جامع اور اس کی ترتیب کس قدر حکیمانہ ہے، سب سے بڑھا ہوا اور اہم ترین حق انسان کے ماں باپ کا ہے جتنی بھی مالی خدمت ہو سکے ان کی جائے پھر دوسرے عزیزوں کا نمبر ہے اور اس میں بھائی بہن، چچا پھوپھی وغیرہ سب آگئے ـــ شریعت نے اپنے نظام میں خاندان کو جو مرکزی اہمیت دی ہے، اس پر یہ ایک اور دلیل ہے ـــ پھر امت کے وہ فرزند ہیں جو معاش کے سب سے بڑے ظاہری سہارے یعنی شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہو چکے ہیں، پھر وہ اللہ کے بندے ہیں، جن پر کسی طبعی معذوری کی وجہ سے یا اور کسی خارجی سبب سے معاش کے عام ذریعے بند یا قریباً بند ہو چکے ہیں اور اپنی ضرورتوں کے پوری ہونے کے لئے بیرونی امداد کے محتاج ہیں، اور آخر میں وہ عام انسان آتے ہیں جو اپنے وطن سے علیحدہ ہونے کے باعث عارضی طور پر احتیاج یا تنگدستی میں مبتلا ہیں، قریبی اور دور کے حقدار اور ملی رشتہ رکھنے والے سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر کس خوبصورتی سے ایک فریم کے اندر "فٹ" ہو گئے! مقصود شریعت یہ ہرگز نہیں کہ پڑوس میں ہمارا بھائی بھوک سے تڑپ رہا ہو اور ہم اس کی طرف سے بے فکر ہو کر چندہ لکھوا رہے ہوں چین یا جاپان کے کسی ریلیف فنڈ میں۔!

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا

تمہارے اوپر قتال فرض کر دیا گیا ۷۹۰ دراں حالیکہ وہ تم پر گراں ہے ۷۹۱ لیکن کیا عجب کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو

وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ

اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور کیا عجب کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں (باعث خرابی) ہو ۷۹۲

۷۸۹ (اور اس لئے اس کا اجر بھی پورا ادا کرے گا۔)
خیر عام ہے بدنی، مالی، بڑی، چھوٹی، ہر قسم اور درجہ کی نیکی کو شامل ہے۔ خَیْر کا تعلق یہاں اِنفاق کے ساتھ نہیں، فعل کے ساتھ ہے، اور اس معنی میں وہ عام ہے۔
آیت میں تنبیہ ہے کہ گمراہ قوموں نے اپنے دیویوں، دیوتاؤں سے متعلق جو عقیدے گڑھ لئے ہیں، اُن پر قیاس کر کے یہ نہ سمجھ لینا کہ اسلام کے خدا کا بھی علم ناقص یا محدود ہے یا جزئیات یا مخفیات پر محیط نہیں۔

۷۹۰ (جب اس کے شرائط کا تحقق ہو جائے اے مسلمانو!)
قتال کے آداب، شرائط و قواعد میں سے کچھ پہلے اسی پارہ میں بیان ہو چکے ہیں، کچھ آئندہ حسب موقع بیان ہوتے رہیں گے۔ غیر مصافی کو قتل نہ کرنے پر اسلام نے جو "زور" دیا ہے اس کو یاد رکھ کے ذرا ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو ایسی کتاب سے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مقدس ہے:۔
"سو اب تو جا، اور عمالیق کو مار، اور جو کچھ اس کا ہے یک لخت حرم کر، اور ان پر رحم مت کر، بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے شیرخوار اور بیل بھیڑ، اور اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر۔" (۱۔سموئیل ۱۵:۳)

۷۹۱ جیسا کہ بالکل قدرتی اور طبعی ہے۔
عَسیٰ ہر جگہ شک ہی کے لئے نہیں آتا، یہاں ممکن ہے کہ تیقن کے لئے ہو۔
قیل عسی بمعنی قد ذلہ الاصم۔ (قرطبی)
اپنی جان کس کو عزیز نہیں ہوتی، اور اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہوئے ہر جاندار قدرۃً ہچکچاتا ہے، پھر مکہ کے غریب مہاجرین جو ابھی ترک وطن کر کے مدینہ میں آ کر پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، وہ تو روپیہ پیسہ میں، ساز و سامان میں، تعداد میں، غرض مادی اعتبار سے کسی معنی میں بھی اپنے حریفوں کے مدمقابل نہ تھے، ان شکستہ دلوں، شکستہ بازوؤں کو حکم جنگ و قتال پا کر اگر طبعی گرانی محسوس ہوئی ہو تو یہ ان کے مرتبۂ اخلاص اور قوتِ ایمانی کے ذرا بھی منافی نہیں۔
شاق علیکم مکروہ طبعا (بیضاوی) مکروہ بالطبیعۃ (بحر) ھذا الکرہ من حیث نفور الطبع عنہ لما فیہ من مؤنۃ المال ومشقۃ النفس وخطر الروح لا انہم کرھوا امر اللہ تعالی۔ (معالم)
هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ۔ آیت پوری تردید کر رہی ہے اُن بے غیرت "مستشرقین" کی جنھوں نے یہ لکھ ڈالا کہ مسلمان مال غنیمت کی حرص میں خود ہی مشتاقِ جنگ و قتال کے تھے۔!
کُرْہٌ لفظاً مصدر ہے، معنی مفعول کے دے رہا ہے، جیسے خُبْز سے مَخْبُوز مراد ہو جاتی ہے اور نقض سے مراد منقوض

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ

اور علم تو اللہ ہی رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے ۷۹۳ اور آپ سے حرمت والے مہینے کی بابت (یعنی) اس میں قتال کی

قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

بابت دریافت کرتے ہیں ۷۹۴ آپ کہہ دیجئے کہ اس میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے ۷۹۵ اور اس سے کہیں بڑھ کے (جرم) اللہ کے نزدیک اللہ کی

ع ۲۶ / ۱۰

۷۹۲ تعداد میں قلیل اور قوت و شوکت میں ضعیف و مضمحل جن مسلمانوں کو جہاد و قتال پر آمادہ کرنے کے لئے قرآن مجید کو اس تصریح واہتمام سے کام لینے کی ضرورت پیش آرہی ہے انہی کی بابت اسلام کے مشہور و معروف کرم فرما "امریکی دنیا کے نامور مؤرخ و سیر نویس پروفیسر گوسپر" کا یہ قول کس قدر "سچائی" اور "دیانت" سے لبریز ہے کہ (نعوذ باللہ) "محمد نے اپنے شوریدہ سروں کو مشغول رکھنے کے لئے جہاد کے ذریعہ لوٹ میں لگا دیا"۔ گویا کمزوروں کا زور آوروں کے سامنے اپنی جانیں دینے کے لئے آنا شکار کی قسم کا کوئی مشغلہ سیر و تفریح تھا!۔۔۔

دین کے دشمنوں پر یہ بھی اللہ کی کیسی پھٹکار ہے کہ عقلیں بھی مسخ ہوجاتی ہیں۔

شَيْئًا صیغۂ نکرہ ہے اور اس سے یہ اشارہ نکل آیا کہ یہاں کوئی کلی قاعدہ نہیں بیان ہو رہا ہے یعنی ہر طبعی مرغوب و محبوب کا شر ہونا اور ہر طبعی مکروہ و مبغوض کا خیر ہونا لازمی نہیں۔

۷۹۳ یعنی اللہ ہی کا علم کامل اور ظاہر و باطن ہر پہلو کو محیط ہے اس لئے اس کے احکام ہمیشہ بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، انسانی علم اس کے برخلاف کسی چیز کا بھی کامل اور جامع نہیں ہوتا ہے اس لئے خود انسان کی عافیت و مصلحت اسی میں ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل بے چون و چرا کر لیا کرے۔

۷۹۴ اوپر اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ قمری سال کے چار مہینے محرم، رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ سو عرب جاہلیت میں متبرک و محترم تھے قتل و غارت تو ان لوگوں کا پیشہ ہی تھا لیکن اس زمانہ میں ہر قسم کی جنگ بند رہتی تھی۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ سے یہاں مراد ماہ رجب ہے، ہوا یہ کہ سنہ ۲ ہجری یعنی ہجرت مدینہ سے کوئی ۱۷ مہینہ بعد ایک بار سفر میں بعض صحابیوں کا مقابلہ مشرکین سے ہوگیا اور ایک مشرک مقابلہ میں جان سے مارا گیا، واقعہ کی تاریخ صحابیوں کے خیال میں ۳۰ جمادی الثانی کی تھی لیکن علم ہوا (جیسا کہ آج بھی قمری مہینوں میں بار بار ہوتا رہتا ہے) کہ چاند ۲۹ کا ہوگیا تھا اور وہ تاریخ یکم رجب کی تھی، مشرکین نے سہو و غلطی کی اس رائی کو لے کر پہاڑ بنا دیا اور طعن و اعتراض شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو اب محترم مہینوں کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں۔

ان محمدًا بعث سرية فلقوا عمرو بن الحضرمي في آخر ليلة من جمادى الاخرى ليلة من رجب ان اصحاب محمد ﷺ كانوا يظنون ان تلك الليلة من جمادى الاخرى وكانت اول رجب ولم يشعروا فقتله رجل منهم وأخذوا ما كان معه (ابن جرير عن ابن عباس) لقي واقد بن عبد الله عمرو بن الحضرمي اول ليلة من رجب وهو يرى انه من جمادى فقتله (ابن جرير عن مقسم)

قِتَالٍ فِيْهِ ترکیب میں بدل ہے اَلشَّهْرِ الْحَرَامِ سے۔

بدل اشتمال من الشهر الحرام (بیضاوی) وهذا يسمى بدل الاشتمال كقولك اعجبني زيد علمه (کبیر)

۷۹۵ (جب کہ دانستہ یعنی ماہ حرام کا علم رکھنے کے باوجود ہو، اور یہ جرم مسلمانوں سے سرے سے سرزد ہی نہیں ہوا)

وما وقع من اصحابه عليه السلام كان من باب الخطاء في الاجتهاد وهو معفو عنه (روح)

وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ

راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روک دینا اور اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال دینا ہیں ۷۹۶

فقہاء مفسرین میں ایک بڑی بحث اس کی ہوئی ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال اب بھی جائز ہے یا نہیں محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کفار اس مہینہ میں قتال شروع کردیں تو مسلمانوں کی جان کی حفاظت کیلئے دفاعی وجوابی قتال تو بہرحال جائز ہے۔

لاخلاف فی جواز القتال فی الشہر الحرام اذا بدأ (زاد المعاد فصل احکام غزوۂ خیبر)

گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے بھی اس میں ابتداء جائز ہے؟

انما الخلاف ان یقاتل فیہ ابتداءً۔ (زاد المعاد)

سو امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ وامام شافعیؒ، امام احمدؒ اور جمہور فقہاء اس کے قائل ہیں کہ قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے یہ حکم حرمت کالعدم ہوگیا ہے اور اب جہاد ان مہینوں میں بھی شروع ہوسکتا ہے۔

والجمہور جوزوہ وقالوا تحریم القتال فیہ منسوخ وھو مذھب الائمۃ الاربعۃ (زاد المعاد) قال سائر العلماء ھی منسوخۃ (ابن العربی)

عن سلیمان بن یسار وسعید بن المسیب ان القتال جائز فی الشہر الحرام وھو قول فقہاء الامصار (جصاص)

لیکن عطاء تابعیؒ اور بعض اکابر اس کے قائل ہیں کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت کا حکم دائمی وقطعی ہے بلکہ عطاء تو اپنے فتوے کی صحت پر حلف اٹھالینے کو تیار تھے۔

مذھب عطاء وغیرہ الی انہ ثابت غیر منسوخ وکان عطاء یحلف باللہ مایحل القتال فی الشہر الحرام (زاد المعاد) کان عطاء یحلف انہا ثابتۃ لان الآیات التی بعدھا عامۃ فی الازمنۃ وھذا خاص والعام لاینسخ بالخاص باتفاق (ابن العربی) قالت طائفۃ محکمۃ یاقی لم ینسخ فیمن قال ذالک عطاء بن ابی رباح (جصاص)

۷۹۷ (سو بالفرض وہ جرم مسلمان سے سرزد ہوا بھی ہوتا جب بھی ایسے شدید بلکہ اشد جرائم کے مجرموں کو کیا حق ہے ایک اتفاقی واقعۂ قتل پر اعتراض واحتجاج کا؟)

صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اللہ کی راہ سے مراد اسلام ہے، اس سے روکنا یعنی اسلام قبول کرنے والوں کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنا، ان پر ظلم وستم توڑنا۔

سَبِيْلِ اللّٰهِ ای الاسلام اومایوصل العبد الی اللہ (بیضاوی)

كُفْرٌ بِهٖ یعنی اللہ سے کفر اختیار کرنا، اللہ کے دین وشریعت کو نہ قبول کرنے اور اللہ کا شریک دوسروں کو ٹھہرانے کا عین کفر ہونا ظاہر ہی ہے۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ مسجد کعبہ خاص اہل توحید ہی کا معبد ومرکز ہے، اس کا ہر وقت اللہ کے پرستاروں کے لئے کھلا رہنا اسلامی حکومت کے فرائض اولیں میں سے ہے۔

اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف ترکیب میں سَبِيْلِ اللّٰهِ پر نہیں، بلکہ تقدیر کلام یوں ہے:۔

ویصدون عن المسجد الحرام۔ ولایحسن عطفہ علی سبیل اللہ (بیضاوی) تقدیرہ ویصدون عن المسجد (عکبری) ولذا ابوالبقا کونہ متعلقا بفعل محذوف دل علیہ الصد ای ویصدون عن المسجد الحرام۔ (روح)

وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ

اور فتنہ قتل سے (کہیں) بڑھ کر ہے ۷۹۵ اور یہ لوگ تو تم سے جنگ جاری ہی رکھیں گے تا آنکہ اگر ان کا بس چلے تو

عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ

تمہیں تمہارے دین سے پھیر ہی کر رہیں ۷۹۶ اور جو کوئی بھی تم میں سے پھر جائے اپنے دین سے

إِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ ۔ دونوں ضمیریں المسجد الحرام کی طرف ہیں یعنی رسول اور مومنین کو ہر طرح تنگ و پریشان کرکے مسجد الحرام سے نکال دینا، وہاں ان کا داخلہ بند کر دینا، انھیں أَهْل اس لئے کہا گیا کہ یہی لوگ تو اس حرمت والی مسجد کے حقوق ادا کرنے والے تھے۔

انما کان اهله لانهم القائمون بحقوقه۔ (روح)

گویا کافروں کے اعتراض کے جواب میں دو باتیں ارشاد ہوئیں، ایک یہ کہ مسلمانوں سے وہ گناہ عمداً زمانۂ حرمت میں قتل کرنے کا عمل صادر ہی نہیں ہوا، دوسری بات یہ کہ بالفرض صادر ہوتا بھی تو تمہارے سنگین و شدید جرائم سے اس کا کیا مقابلہ؟

۷۹۵ (اپنے مفاسد اور اپنی مضرتوں کے اعتبار سے)

اَلْفِتْنَةُ سے مراد وہ شدید مزاحمتیں اور رکاوٹیں ہیں جو معاندین نے دین حق کی راہ میں پیدا کر رکھی تھیں۔ اس دین کی راہ میں جس کا مقصد ہی دنیا کو راہِ امن دکھانا اور تمام زحمتوں اور کلفتوں سے نجات دلانا ہے۔

ای ما یفتن به المسلمون ویعذبون به لیکفروا (روح) والمحنة عند جمهور المفسرین الفتنة التی کانت تفتن المسلمین عن دینهم حتی یهلکوا (بحر) الفتنة هی ما کانوا یفتنون المسلمین عن دینهم تارة بالقاء الشبهات فی قلوبهم وتارة بالتعذیب (کبیر)

فِتْنَة کے معنی یہاں مطلق کفر کے بھی کئے گئے ہیں، لیکن زیادہ چسپاں نہیں ہوتے، یہ قول امام رازیؒ کے وهو عندی ضعیف (کبیر) قول محقق وہی ہے جو اوپر درج ہوا۔

اَلْفِتْنَةُ کی تفسیر ابن عباسؓ صحابی و تابعین کے قول میں اَلشِّرْک سے آئی ہے۔

مِنَ الْقَتْلِ یعنی اس خاص واقعۂ قتل سے۔ مقصد ارشاد یہ ہے کہ دین حق کی راہ میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، اور لوگوں کو اس کی طرف آنے سے طرح طرح کی سازشوں، تدبیروں سے روکتے ہیں، وہ حقیقۃً دنیا کو امن و عدل و عافیت سے محروم کر دینا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ نوع و نسل انسانی کے مجرم ہیں، اسلامی جہاد کی تو غایت ہی دنیا سے ہر قسم کی خود غرضیوں اور فریب کاریوں، ظلم و جور و شورش و بدامنی کو دور کرنا ہے، جو احمق اس کو اور عام دنیوی حکومتوں کے قتل و قتال کو یکساں سمجھ رہے ہیں، وہ جراح کے نشتر اور ڈاکو کے خنجر کو ایک سطح پر رکھ رہے ہیں۔

۷۹۶ یہ بیان ہے اس کا کہ مشرکین عرب اسلام سے کس درجہ بیزار اور حق کے کس درجہ دشمن تھے۔

لَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ میں اشارہ انھیں دشمنانِ حق کی جانب ہے۔

ایک انگریز مترجم قرآن کیمبرج یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر پامر ہوئے ہیں، اس موقع پر طنز و تعریض کا نشتر یوں چلاتے ہیں:

فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ

اور اس حال میں کہ وہ کافر ہے مرجائے، تو یہی وہ لوگ ہیں کہ اُن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے [۷۹۹]

"اب اسلام نے کافروں پر ہر چہار طرف سے دھاوا بول دیا۔"
دھاوا چاروں طرف سے یقیناً بول دیا گیا تھا، لیکن اس جھوٹ میں سچ صرف اتنا ہے کہ یہ دھاوا اسلام کا نہ تھا خود اسلام پر تھا۔
حَتّٰی کے معنی یہاں "تاکہ" کے ہیں، اور غرض و مقصود کے اظہار کے لئے ہے۔

حتی للتعلیل (بیضاوی) یجوز ان یکون بمعنی الی (عکبری) ای الی ان یردوکم وقیل المعنی لیردوکم (کبیر)

اِنِ اسْتَطَاعُوْا میں اشارہ یہ پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا اپنے دین سے ہٹنا اور کافروں کا انھیں اپنی کوششوں سے ہٹا لینا کچھ آسان نہ تھا۔

استبعاد لاستطاعتهم (کبیر) اشارة الی تصلبهم فی الدین وثبات قدمهم فیه کانه قیل وانّی لهم ذلك (ابو سعود)

۷۹۹ حَبِطَتْ ...... الْاٰخِرَةِ حبط اعمال کا اثر آخرت میں تو یوں ظاہر ہوگا کہ یہ بدنصیب مرتد اپنے کو ہر طاعت کے اجر اور ہر عبادت کے ثواب سے محروم پائے گا اور دنیا میں اس کا ظہور یوں ہوگا کہ نہ مسلمان بیوی سے اس کا نکاح قائم رہ سکتا ہے نہ مسلمان کی میراث میں اسے حصہ مل سکتا ہے بلکہ حکومت اگر اسلامی ہو تو ایسے بدعہد باغی و غدار کو زندہ رہنے کا بھی حق باقی نہیں رہتا۔ شریعت یہود میں ارتداد ہی نہیں بلکہ ارتداد اور ترغیب ارتداد کی بھی سزا قتل و سنگساری ہے توریت میں ہے:۔

"اگر تیرا بھائی جو تیری ماں کا بیٹا ہے یا تیرا ہی بیٹا ہے یا تیری بیٹی یا تیری ہمکنار جورو یا تیرا دوست جو تجھے جان کے برابر عزیز ہے، تجھے پوشیدہ میں پھسلاوے اور کہے کہ آج غیر معبودوں کی بندگی کریں جن سے تو اور تیرے باپ دادے واقف نہیں تھے، تو تُو اس سے موافق نہ ہونا، اور اس کی بات نہ سُننا، تو اس پر رحم کی نگاہ نہ رکھنا، تو اس کی رعایت نہ کرنا، تو اُسے پوشیدہ نہ رکھنا، بلکہ اُسے ضرور قتل کرنا، اس کے قتل پر پہلے تیرا ہاتھ پڑے اور بعد اس کے قوم کے ہاتھ، اور تو اُسے سنگسار کرنا، تاکہ وہ مرجائے۔" (استثناء ۱۳: ۶ - ۱۰)

اور نصرانیوں کے ہاں بھی:۔

"دانستہ ارتداد ناقابل تلافی گناہ ہے قتل اور زناکاری کے درجہ کا۔" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ا صـ ۶۲۳)
چنانچہ انگلستان میں ایک چھوٹے پادری نے جب تیرھویں صدی مسیحی میں ایک یہودن سے شادی کے پھیر میں دین نصرانیت کو ترک کر دیا تھا تو اُسے آکسفورڈ میں ۱۷ اپریل ۱۲۲۳ء کو جلا دیا گیا (ایضاً صـ ۶۲۴)

فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ "اسی حالت کفر ہی میں اس کی موت آجائے"۔ یہ فقرہ بڑھا کر گویا یہ ترغیب دے دی کہ اگر خدانخواستہ کوئی مرتد ہو ہی گیا تو اب بھی موقع ارتداد سے پھر اپنے دین کی طرف واپس آجانے کا باقی ہے امام شافعیؒ نے اس فقرہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ محض ارتداد سے اعمال کا حبط نہیں ہو جاتا جب تک کہ مرتد کی موت بھی ارتداد پر نہ ہو۔

وبها احتج الشافعیؒ علی ان الردة لا تحبط العمل حتی یموت علیها (مدارك) قید الردة بالموت علیها فی احباط الاعمال کما هو مذهب الشافعی (بیضاوی)

لیکن حنفیہ کے پاس جواب ہے کہ یہ مسئلہ تو خود قرآن ہی نے صاف کر دیا ہے اور ایک دوسری آیت میں صاف

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

اور یہ اہل دوزخ ہیں، اُسی میں (ہمیشہ) پڑے رہنے والے ۸۲۸ بے شک جو لوگ

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ

ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ۸۲۹

حبطِ عمل کو نفس ارتداد پر معلق کردیا ہے۔

ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله۔ (المائدۃ۔ ۵)

اور یہی قول امام مالکؒ کا بھی ہے۔

قال مالك يحبط بنفس الردة (ابن العربی)

یَرْتَدِدْ۔ باب افتعال سے ہے اور افتعال میں ایک مفہوم تکلف کا بھی نکلتا ہے، چنانچہ بعض اہل معانی نے یہی لکھا ہے کہ فعل کے اس باب میں لانے سے اسی عمل ارتداد کے استبعاد پر توجہ دلاتا ہے۔

وجاء افتعل هنا بمعنى التفعل والتكسب لانه متكلف اذ من باشر دين الحق يبعد أن يرجع عنه

عَنْ دِيْنِهٖ۔ دین سے یہاں کھلی ہوئی مراد دینِ اسلام ہے کہ خطاب یہاں مومنین ہی سے ہے، یہ مراد نہیں کہ کسی دین سے کوئی پھر جائے۔

۸۲۸ (نجات و رہائی کی طرف سے مایوس)

خٰلِدُوْنَ۔ خلود کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر بغیر کسی قسم کا خلل پڑے ہوئے قائم و باقی رہنا۔

الخلود تبرء الاشياء على الحالة التى عليها من غير اعتراض الفساد (راغب)

اس تصریح نے اور صاف کردیا، ورنہ یوں بھی عالم آخرت ہمیشگی کا عالم ہے وہاں کی ہر سزا و جزا (تاوقتیکہ موقت و محدود نہ کردی جائے) دائمی و جاودانی ہوتی ہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم محقق مترجمین نے اپنے ترجموں میں اس پہلو کو واضح کردیا ہے: ایشاں درآں جاویداند (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہیں گے (شاہ رفیع الدین دہلویؒ)

۸۲۹ (خواہ قتال سے یا بغیر قتال کے)

اَلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا۔ دین کے تحفظ و بقا کی خاطر وطن جیسی عزیز و محبوب چیز کو مع وہاں کے تمام مرغوبات و مالوفات کے چھوڑنا اور کفر کی بستی کو ترک کر کے ایمان کی بستی میں آجانے کا نام اصطلاحِ شریعت میں ہجرت ہے۔

الخروج من الكفر الى دار الايمان (راغب)

جٰهَدُوْا۔ جہاد کے معنی شدید کوشش اور جدوجہد کے ہیں، اس میں سب طرح کی بلائیں اور تکلیفیں آگئیں، اور اس کی ایک بڑی فرد قتال ہے۔

ناظرِ کائنات کے قانون میں ہجرت و جہاد دونوں کے بڑے فضائل اور بڑے مرتبے ہیں۔ ایمان خود ہی کیا کم دولت ہے اور جب اس کے ساتھ یہ دونوں مرتبے بھی حاصل ہو جائیں تو اس کے درجہ کا کیا ٹھکانا ہے! نفس ایمان تو

علمائے شریعت نے بھی اسی لغوی مفہوم پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

المیسر وھو القمار [illegible] من انواع القمار والنرد والشطرنج وغیرھا۔ (مدارک)

شراب اور جُوا جس طرح آج فرنگی تہذیب میں جائز ہی نہیں بلکہ عین اس تہذیب کا جزو بنے ہوئے ہیں، اور دلیل اعزاز ہیں، اسی طرح قدیم عربی تہذیب کا بھی جزو تھے، اور لوازم شائستگی سمجھے جاتے تھے، اور اکیلے عرب ہی پر موقوف نہیں، یہ مشغلے سارے روئے زمین پر پھیلے ہوئے تھے، اور ہندی تہذیب، مصری تہذیب، یونانی تہذیب، رومی تہذیب تو خیر خود ہی جاہلی تہذیبیں تھیں، اسرائیلی اور مسیحی تہذیبیں، جو شرف نبوت کے تعلق سے مشرف تھیں، وہ بھی ان کی روک تھام نہ کر سکی تھیں، شریعت اسلامی ہی دنیا کا وہ قانون ہے جس نے آکر ان کی قطعی حرمت کا اعلان کیا، یہ آیت سلسلۂ حرمت کی سب سے پہلی آیت ہے۔ قطعی حکم بعد کو نازل ہوا۔

علامہ آلوسی بغدادی، صاحب تفسیر روح المعانی نے اس مقام پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ کے فاسقوں نے نشیلے مشروبات کے لئے طرح طرح کے خوشنما نام اور لقب رکھ لئے ہیں، مثلاً عنبری، الاکسیر وغیرہا لیکن نام کے بدل دینے سے حقیقت اور حکم شرعی نہیں بدل جایا کرتا، نشہ آور چیزیں بہرحال حرام ہیں، علامہ کا سال وفات ۱۲۷۰ھ ہے اور تفسیر کا زمانہ تصنیف تو اس سے چند سال قبل ہے گویا آج (۱۹۲۳ء) سے سوا سو سال قبل کے عراق میں ان مرحوم کو یہ حسرتناک تجربے ہو چکے تھے غریب کو کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ آج فرنگیوں کے اثر سے ان کے وطن عراق ہی میں نہیں بلکہ مصر، ایران، ترکی، شام، وغیرہ میں شراب نوشی کتنی اور کن کن شکلوں کے ساتھ پھیل چکی ہے! اور خمر ہی نہیں میسر بھی کیسے کیسے نئے اور خوشنما ناموں کے ساتھ "تہذیب و تمدن" کا جزو بن چکا ہے، اور "مہذب" زندگی کے کتنے گوشوں میں اپنی مستقل جگہ بنا چکا ہے۔

۵۰۰ (جیسا کہ مشاہدہ ہے)

اِثم کا لفظ ہر ایسے فعل کے لئے آتا ہے جو نیکی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والا ہو۔

الاثم للافعال المبطئۃ عن الثواب۔ (راغب)

اثم کا اطلاق کسی عمل پر خود اسے حرام قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

الاثم کلہ محرم (جصاص)

چہ جائیکہ جب اس پر تاکید بھی کبیر کے ساتھ موجود ہو! اِثم کبیر ہی سے فقہاء نے نکالا ہے کہ شراب کی مقدار قلیل بھی حرام ہے۔

ولا مد علی تحریم قلیلہ (جصاص)

اور اس لحاظ سے قرآن مجید ان دونوں کے حق میں لفظ اِثم بہت خوب لایا، معاشرہ میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں، اظہر من الشمس ہیں، گالیاں یہ بکوائے، بے حیائی یہ پھیلائے، حرام کاری کی طرف یہ لائے، بلوے دنگے یہ کرادے، طرح طرح کی خطرناک اور مہلک بیماریاں یہ پیدا کر دے، چوری، جھگڑے پر یہ آمادہ کرے، قتل کی نوبت یہ لے آئے، دوستوں عزیزوں کے درمیان جوتا چلوا دے، ہر عبادت سے بہاء دے، پاکیزہ نفسی سے یہ روک دے، اور اسراف شدید تو اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں، پھر قمار بازی کی لائی ہوئی مصیبتیں کچھ کم ہیں؟ فرنگستان کے سب سے بڑے قمار خانہ مونٹے کارلو (MONTE CARLO) میں ہر سال بے شمار بے اندازہ دولت نذر ہوتی رہتی ہے! دیوالی اور جگہٹ کی راتوں کو ہندوستان کے اندر کیا کچھ نہیں ہوتا؟ اور پھر جوئے کی جدید ترین شکلوں بیمہ کمپنیوں کے جوئے، گھوڑ دوڑ کے جوئے، چٹھیوں (لاٹریوں) کے جوئے، سٹے وغیرہ کو کوئی

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

اور ان کا گناہ ان کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے ششہ

کہاں تک شمار کرے ہیچ کہاں! مفسرین نے جنھوں نے کہا کہ ان دونوں شغلوں کے اندر نیکیوں سے بڑی رکاوٹ ہے۔
فی تناولهما انقطاع عن الخیرات (راغب) من حیث ان تناولهما مؤد الی ما یوجب الاثم وهو ترك المامور وفعل المحظور۔ (روح)

بعض صحابیوں، مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ کی بابت منقول ہے کہ انھوں نے شراب کی بابت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ازخود دریافت کرنا شروع کر دیا تھا کہ ایسی چیز جو عقل اور مال دونوں کو غارت و برباد کر دینے والی ہو اس کے باب میں کیا حکم ہے۔
کان المسلمون یشربونها وهی حلال لهم ثم ان عمر و معاذا و نفرا من الصحابة قالوا یا رسول الله افتنا فی الخمر فانها مذهبة للعقل مسلبة للمال (کبیر)
صحبتِ رسولؐ کی برکت سے اگر قلوب میں ازخود اتنی جلا پیدا ہو گئی ہو تو اس میں حیرت ہی کیا ہے!

ششہ (کچھ تھوڑے بہت)
حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سرے سے مضر ہی مضر اور ہر طرح نفع و مصلحت سے خالی کوئی شئے موجود ہی نہیں یہاں تک کہ شراب نوشی اور قمار بازی جیسے گندے مشغلے بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے، بعض شرابیں تقویت رکھتی ہیں، شراب سے وقتی لذت و سرور حاصل ہوتا ہے، بعض قوتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہو جاتی ہے، یا اسی طرح جوئے میں جو جیتتا ہے اسے بلا مشقت و تعب تھوڑی ہی سی دیر میں آمدنی ہو جاتی ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔
ای باللذة والفرح فی الخمر واصابة المال بلا کد فی المیسر (جلالین)
مفسرین نے آیت کے اس جزو کے تحت شراب کے بہت سے منافع و مصالح اپنی اپنی بصیرت و دائرۂ علم کے لائق گنائے ہیں، اور یہیں سے ایک اور مسئلہ نکل آیا۔ کسی حرام اور ناجائز شے کے جزوی منافع و مصالح بیان کرنا اس کی حرمت کے منافی اور اس کی حرمت سے انکار کے مرادف ہرگز نہیں، اور یہ حقیقت اسی آیت سے بالکل واضح ہو گئی کہ کسی شے کے معصیت ہونے اور اس کی نافعیتِ جزئی کے درمیان کوئی تناقض نہیں، خود فرنگی تہذیب بھی اپنے اندر بہت سے محاسن اور روشن پہلو رکھتی ہے، پاسِ عہد، پابندیٔ وقت، عام جذبۂ خدمتِ خلق وغیرہ، تاہم اعلیٰ اخلاق و روحانی قدروں سے انکار اور ان کی ناقدری کی بنا پر اس پر اطلاق بہ حیثیت مجموعی خیر کا نہیں شر کا ہوگا، اور ایسا ہی حال قدیم عرب کے جاہلی تمدن کا تھا، پاسِ عہد، مہمان نوازی، فیاضی، وغیرہ متعدد جوہرِ شرافت اس کے عناصرِ ترکیبی تھے، با ایں ہمہ وہ تمدن رحمانی نہیں شیطانی ہی تھا۔
آج جو اسپرٹ ملی ہوئی انگریزی دوائیں کثرت سے چل پڑی ہیں، یہ عموماً تیزاب کے قسم کی ہوتی ہیں اور فقہاء نے انھیں زہر کے حکم میں رکھا ہے۔

ششہ (اس لئے عقلِ سلیم کے لحاظ سے یہ دونوں چیزیں قابلِ ترک اور واجب الاحتراز ہیں۔)

فقہاء نے کہا اور بالکل صحیح کہا ہے کہ حرمتِ خمر پر دوسری آیتیں اس سے واضح تر اور صحیح تر موجود نہ ہوتیں، جب بھی خود یہ آیت حرمت کے لئے کافی تھی۔

ھذہ الآیۃ قد اقتضت تحریم الخمر لو لم یرد غیرھا فی تحریمھا لکانت کافیۃ مغنیۃ (جصاص)

قال قوم من اھل النظر حرمت الخمر بھذہ الآیۃ لان اللہ تعالیٰ قد قال قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن فاخبر فی ھذہ الآیۃ ان فیھا اثم فھو حرام۔ (قرطبی)

یہ فخر تاریخ میں اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ایک اشارہ سے اپنے حدودِ مملکت سے کہنا چاہیئے کہ ان خبائث کا خاتمہ ہی کر دیا اور اشخاص و افراد کی کارستانیوں سے قطع نظر، امت کی نظر میں بہ حیثیت مجموعی لفظ "شرابی" اور لفظ "جواری" دونوں کو انتہائی تحقیر و ذلت کا لقب ٹھہرا دیا، یہ اسلام ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو جہاں تک ان اخلاقی نجاستوں کا تعلق ہے، پاکیزگی اور ستھرائی کے اس بلند مقام پر پہونچا دیا، جہاں تک باوجود علم و عقل فہم و دانش کے بلند بانگ دعووں کے آج تک نہ کوئی "ٹمپرنس ایسوسی ایشن" (اعتدال احتیاط کی تبلیغ کرنے والی انجمن) پہونچا سکی ہے نہ کوئی پروہیبیشنسٹ (PROHIBITIONIST) گورنمنٹ (قانونِ امتناع جاری کرنے والی حکومت)! مسٹر ولیم میور اپنے نہیں بیگانے ہیں، معتقد نہیں منتقد ہیں، باوجود اس کے لکھتے ہیں:۔

"اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترک میکشی کرانے میں جیسا وہ کامیاب ہوا ہے کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے" (لائف آف محمد ص۵۲۱)

انیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن میں چرچ کانگریس کے ایک اجلاس کے موقع پر ایک ممتاز پادری اسحاق ٹیلر نے کہا تھا:۔

"دنیا میں انسدادِ مے نوشی کی سب سے بڑی انجمن خود اسلام ہے، برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہونچتے جاتے ہیں، مے نوشی و بدکاری اور لوگوں کی اخلاقی پستی بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

ٹمپرنس کے نام سے مے نوشی میں اعتدال و احتیاط پیدا کرنے کے لئے یورپ اور امریکہ اور ہندوستان میں آج بھی خدا معلوم کتنی انجمنیں بہترین نظم و نظام اور شہرتِ کارکردگی کے ساتھ قائم ہیں، اور امریکہ کے مشہور کارکن "پسی فٹ جانسن" (PUSSY FOOT JOHNSON) نے تو ۴۰۔۵۰ سال ہوئے اپنی سرگرمیوں کی دھوم ساری دنیائے تمدن میں مچا دی، اور بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہرین سائنس شراب کے نقصانات پر بیانات اور اعداد برابر شائع ہی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان ساری سرگرم کوششوں کے باوجود خود انھیں لوگوں کو یہ اقرار ہے کہ شراب کو قطعی حرام کئے بغیر کوئی چارہ نہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۲۶ ص۵۹۹ طبع یازدہم) ہندوستان میں ابھی چند ہی سال ہوئے متعدد صوبہ سرکاروں نے اپنے علاقوں میں قانونِ امتناع نافذ کر دیا تھا، لیکن کئی جگہ آگے چل کر وہ قانون واپس لیتے ہی بنا۔ محکمۂ آبکاری کی لکھو کھا روپیہ کی آمدنی سے دستبردار ہو جانا کوئی آسان بات ہے؟ رہی قماربازی سو اس باب میں قانونِ اسلام سے باغی و منحرف ہو کر یورپ اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کر رہا ہے، وہ عالم آشکارا ہے، خودکشی اور اقدامِ خودکشی کے کتنے واقعات، مے نوشی اور قماربازی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے قبل اکیلے ملک انگلستان سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پاؤنڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ میں پہونچتی رہتی ہے (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ۥ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

اور (لوگ) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں ٨٠٧ آپ کہہ دیجئے کہ جتنا (بھی) آسان ہو ٨٠٨ اسی طرح

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١٩﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۥ

تمہارے لئے کھول کر احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچ لیا کرو، دنیا اور آخرت (کے معاملات) میں ٨١٠

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۥ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۥ

اور (لوگ) آپ سے یتیموں کے باب میں دریافت کرتے ہیں ٨١١ آپ کہہ دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے ٨١٢

انیڈا انیکس جلد ٦ صفحہ ١٦٣) یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا، اور وہ بھی پہلی جنگ عظیم سے قبل کا، یورپ کے کل ملکوں (اور اس فہرست میں دنیائے معلوم کا مشہور ترین قمار خانہ مانٹی کارلو بھی شامل ہے) اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کے جدید ترین تخمینہ کے لئے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میزان حساب کن ہندسوں تک پہونچے! رہی قانون وقت کی ناکام کوششیں تو اسی انسائیکلوپیڈیا کے اسی مقالہ میں ہے کہ، "قانون اس میں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سب ہی کوششیں کر رہا ہے بجز اسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے" (صفحہ ١٦٥) یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اس نے "عقلائے فرنگ" کی اس "ناممکن کوشش" کو اپنے حدود میں ممکن ہی نہیں واقع کرکے دکھا دیا۔

٨٠٧ (خیر خیرات میں)

فرض زکوٰۃ کی تو شرح متعین تھی، یہ سوال اس کے علاوہ دوسرے نیک کاموں میں صرف سے متعلق تھا۔

قال جمهور العلماء هي من نفقات التطوع. (قرطبی)

٨٠٨ اور اس آسانی کا معیار قول مفسر تھانوی ؒ یہ ہے کہ اس سے کسی حقدار کا حق ضائع نہ ہو اور اپنے ضروری مصارف میں تنگی نہ اٹھانا پڑے۔

اَلْعَفْوُ۔ عفو سے مراد اتنا خرچ کرنا ہے جو اپنے اوپر بار نہ ہو۔

العفو نقيض الجهد وهو ان ينفق مالايبلغ الطاقة منه الجهد (کشاف) اى مالا يجهد (روح المعانی)

اى انفقوا ما فضل عن قدر الحاجة (مدارک)

٨١٠ (ان احکام پر عمل کے وقت)

امور آخرت میں غور و فکر کرتے رہنے کی اہمیت تو ظاہر ہے یہاں حکم اس کا بھی رہا ہے کہ امور دنیا میں بھی سوچ بچار سے کام لیا کرو ــــ تو گویا دنیا بھی اس قابل ہے کہ اس کے معاملات میں غور و تدبر سے کام لیا جائے۔

مرشد تھانوی ؒ نے فرمایا کہ راز اس کا یہ ہے کہ انسان خلوص ذہن کے ساتھ جس قدر دنیا اور اس کے کاروبار کو سوچے گا، اسی قدر اس کی بے ثباتی اور بے قدری اس کے دل پر جمتی جائے گی۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ

اور اگر تم ان کے ساتھ (خرچ) شامل رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں[۸۱۳] اللہ کو علم ہے کہ مفسد (کون) ہے اور مصلح (کون)[۸۱۴]

۸۱۱ (کہ ان کے خرچ کا کیا نظام رکھا جائے؟ آیا اپنے حساب میں شامل رکھا جائے؟ یا ان کا حساب بالکل الگ کر دیا جائے؟) یہ سوال کرنے والے یتیموں کے اولیا تھے جن کی ولایت و سرپرستی میں یتیم بچے پل رہے تھے۔ اللہ رے صحابہؓ کی احتیاط اور مزید تقویٰ! صراحت کے ساتھ آکر سوال کیا کہ یتیموں کی جائیدادوں سے انتفاع کی آیا کوئی بھی شکل اولیاء اور سرپرستوں تک کے لئے جائز ہے؟ جائداد کی طمع بھی بڑی ہوتی ہے۔ عرب جاہلیت میں بہتیرے لوگ اس لئے یتیموں کو اپنی ولایت و سرپرستی میں لیتے تھے کہ ان کی جائداد میں خورد و برد کا موقع مل جائے گا۔ بلکہ کوئی یتیم لڑکی اگر مالدار نظر آئی تو اسے اپنے لڑکے کی شادی بھی اسی طمع میں کر لیا کرتے تھے۔

اَلْيَتٰمٰى۔ یتیم کی جمع ہے۔ اور یتیم سے مراد وہ لڑکا یا لڑکی ہے جس کے سر سے باپ یا ماں کا سایہ اٹھ گیا ہو۔ احکام شریعت میں یتیمی باپ کی طرف سے معتبر مانی گئی ہے۔

ابیتم المعروف احد ابویہ (جصاص) انما المراد بالایتام الفاقدون لآبائہم وھم صغار (بحر)

۸۱۲ سو وہ جس طریق پر حاصل ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔

یہاں اصل اصول بیان کر دیا کہ مقدم شرط جائداد یتیم کے مصالح کی رعایت ہے۔ اگر اس کا تقاضہ یہ ہو کہ اپنا اور یتیم کا حساب ایک میں رکھا جائے تو یہی کیا جائے ورنہ اس کے برعکس۔

اِصْلَاح۔ کا لفظ عام ہے۔ اگرچہ اس کا قریبی تعلق مالی مصالح سے ہے۔ لفظ کے عموم میں جسمانی، مالی، اخلاقی ہر قسم کی اصلاح آگئی۔ فقہاء نے بہ قاعدۂ اقتضاء النص اس عموم سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یتیم پر جو تہدید، تنبیہ، تعلیم و تربیت کی ضرورت سے ہو وہ بالکل درست ہے۔ اسلام کی یتیم نوازی، یتیم پروری کا اعتراف اپنوں ہی کی طرح بیگانوں اور منکروں کو بھی ہے۔ برطانوی مصنف باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے:-

"پیمبر کی توجہ خصوصی کے مرکز غلاموں کی طرح یتیم بھی رہے ہیں۔ وہ خود بھی یتیم رہ چکے تھے۔ اس لئے دل سے چاہتے تھے کہ جو حسن سلوک خدا نے ان کے ساتھ کیا وہی وہ دوسروں کے ساتھ رکھیں۔" (محمد اینڈ محمڈنزم ص ۲۵۱)

امریکی ماہر اجتماعیات ڈاکٹر راڈ ویل لکھتے ہیں:-

"قرآن کے مطالعہ سے ایک خوشگوار ترین چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمدؐ کو بچوں کا کس قدر خیال تھا خصوصاً ان بچوں کا جو والدین کی سرپرستی سے محروم ہو گئے ہوں۔ بار بار تاکید بچوں کے ساتھ حسن سلوک کی ملتی ہے۔" (سوشل لا آف دی قرآن ص ۱۰۱)

اور پھر کہا ہے:-

"محمدؐ نے یتیموں کے باب میں اپنی خاص توجہ مبذول رکھی۔ یتیموں کے حقوق کا بکثرت ذکر اور ان سے بدسلوکی کرنے والوں اور ان کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت وعیدیں سیرت محمدی کے اس پہلو کو ظاہر کرتی ہیں جس پر مسلمان مصنفین کو بجا طور پر ناز ہے۔" (ص ۱۰۱)

۸۱۳ (بھائی ہیں، اور اس لئے مشترک خرچ میں کوئی مضائقہ نہیں۔)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ

اور اللہ اگر چاہتا تو تم کو پریشانی میں ڈال دیتا ۵۱۵ اللہ بےشک زبردست ہے حکمت والا ہے ۵۱۶ اور نکاح مشرک عورتوں کے

حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

ساتھ نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۵۱۷ کہ مومنہ کنیز بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو ۵۱۸

اِخْوَانُكُمْ۔ لفظ اخ یا بھائی انتہائی اخلاص یگانگت و مودت کا مظہر ہے۔ اس ذرا سے لفظ میں بہت کچھ آگیا۔ جب یتیم اور وہ بھائی ہی بھائی ٹھہرے تو بھائی بھائی میں تکلف کیسا! ــــ اور عرب میں تو یہ رشتہ اور زیادہ قوی تھا۔

فهم اخوانكم والاخوان يعين بعضهم بعضا ويصيب بعضهم من اموال بعض على وجه الاصلاح والرضاء. (معالم)

* چونکہ اس وقت اکثر مسلمانوں کے یہاں مسلمان ہی یتیم تھے اس لئے اخوانکم فرمایا ورنہ اگر دوسرے مذہب کا بچہ بھی اپنی تربیت میں ہو اس کا بھی بعینہٖ یہی حکم ہے اور اس کی دلیل دوسری آیات واحادیث ہیں جو لفاظ عامّہ سے وارد ہیں بلکہ اس کے ساتھ مذہبی رعایت اتنی اور زائد ہے کہ اس بچہ پر بعد بلوغ قبولِ اسلام کے لئے جبر نہیں کیا جاتا، مذہبی آزادی دی جاتی ہے۔ (تھانویؒ)

۵۱۴ یعنی اُس رب کی نیک نیتی اور بدنیتی دونوں خوب روشن ہیں۔

اَلْمُفْسِدَ۔ یعنی یتیموں کی مصلحت کو ضائع کرنے والا۔

الذی یقصد بمخالطة خیانة و فساد مال الیتیم. (معالم)

اَلْمُصْلِحِ۔ یعنی یتیموں کی مصلحت کا لحاظ رکھنے والا۔

الذی یقصد الاصلاح. (معالم)

مفسر ابو سعود نے کہا ہے کہ لفظ اَلْمُفْسِدَ کو اَلْمُصْلِحِ پر مقدم رکھنے میں وعید میں تاکید اور تہدید اور زیادہ پیدا ہوگئی۔

۵۱۵ یعنی بجائے ان آسانیوں کے اس باب میں کوئی سخت قانون بنا دیتا۔

قال العنت الضیق علیکم وشدد (قرطبی)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی اگر اس کی حکمت و مشیتِ تکوینی کا اقتضاء یہی ہوتا۔

۵۱۶ یہاں اپنی دونوں صفات یاد دلا دیں، پہلی صفت عزیز کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ جو حکم چاہتا دے سکتا تھا، کوئی قوت اس سے بالاتر، کوئی حاکم اس کے اوپر ممکن نہیں، سب پر بالادست خود ہی ہے، لیکن دوسری صفت حکیم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ احکام وہی دیتا ہے جو بندوں کے لئے نرم و آسان و قرینِ مصلحت ہوں۔

۵۱۷ (اے مسلمان مردو!)

میاں بیوی کا رشتہ انتہائی الفت و رفیق کا، اور باہمی مناسبت و موانست کا ہوتا ہے، بیوی کو اگر شوہر سے اس درجہ نامناسبت ہے کہ وہ اس کی ساری شعوری اور اختیاری زندگی کے اصل اصول یعنی توحید و رسالت ہی کی منکر ہے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں باہمی مناسبت کی بنیاد درجۂ ضعیف میں بھی موجود نہیں، مرد کو ایسی عورت کے ساتھ عمر بھر

نباہ کرنے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہئے، موافقتِ کامل کے دوسرے اجزاء و عناصر موجود نہ بھی ہوں، نہ سہی، لیکن کم از کم وہ بنیادی عقیدہ تو مشترک ہو جس کے تابع و ماتحت چھوٹے بڑے زندگی کا ہر مرحلہ ہے۔ فطرتِ بشری خود ایسے بے جوڑ ازدواج سے ابا کرتی ہے۔ دینِ فطرت اسے کیونکر جائز رکھ سکتا تھا، پھر نکاح اسلام میں ایک دینی اور مذہبی عمل ہے۔ محض معاہدۂ دیوانی (CIVIL CONTRACT) نہیں۔ جب ایک فریق دین و مذہب کی بنیاد ہی سے منحرف ہے تو اس کے ساتھ معاہدہ ممکن کیونکر ہے؟

الْمُشْرِكٰتِ. لفظ مشرکہ یہاں اپنے عام و وسیع معنی میں ہے ہر قسم کی کافرہ یا غیر مسلم عورت اس حکمِ ممانعت میں داخل ہو گئی۔ اس کا بت پرست ہونا لازم نہیں، قولِ محقق یہی ہے۔

هو … [illegible] … والأكثرون من … [illegible] … لفظ مشرك … من أهل الكتاب وهو المختار (كبير)

امام مالکؒ و امام شافعیؒ اسی آیت پر رک گئے ہیں، اور ان کی فقہ میں ہر قسم کی غیر مسلم عورت سے نکاح ناجائز ہے

لا يجوز العقد بنكاح على مشركة كانت كتابية او غير كتابية … [illegible] … وهو اختيار مالك والشافعي

لیکن فقہاء حنفیہ کی نگاہ مزید نکتہ سنجی کے ساتھ قرآن مجید ہی کی ایک دوسری آیت کی طرف بھی گئی، اور وہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ، اور انہوں نے پہلی آیت کے عموم کو اپنی جگہ پر رکھ کر اس کا خصوص اس دوسری آیت سے پیدا کیا یعنی عام قاعدہ کے لحاظ سے تو ہر غیر مسلمہ کے ساتھ نکاح ناجائز ہے لیکن کتابیہ یعنی یہودی یا نصرانی عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے اور یہی مذہب ابن عباسؓ اور بعض تابعین سے مروی ہوا ہے۔

وهو عموم … [illegible] … بجواز نكاح الكتابيات … عن ابن عباسؓ … ولا تنكحوا المشركات … [illegible] … وحرم المسلمات على … عن الحسن ومجاهد مثل ذلك۔ (روح)

حضرت تھانویؒ کے چند فقہی افادات اس موقع پر نقل کرنے کے قابل ہیں:۔

"(۱) ہندو عورت یا آتش پرست عورت سے نکاح نادرست ہے (۲) کتابی عورت سے نکاح جائز ہے لیکن بہتر نہیں، حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرمایا ہے اور خود حدیث میں نکاح کا حکم دیندار ہی عورت سے کرنے کا ہے (۳) ایسی عورت سے جو وضع و طرز سے کتابیہ معلوم ہوتی ہو لیکن بعد تحقیق اس کے عقائد کتابیوں کے سے نہ نکلیں اس سے بھی نکاح نادرست ہے۔"

یہودیت چونکہ ایک نسلی مذہب ہے، اس لئے اسرائیلیوں کو غیر اسرائیلیوں سے نکاح کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ (خروج ۳۴-۱۶۔ استثناء ۷۔۳۔ عزرا ۹ و ۱۰)

مسیحی مذہب میں بھی "بے ایمانوں" یعنی غیر مسیحیوں سے ازدواج کی ممانعت ہے (۲ کرنتھیوں ۶: ۱۴ و ۱۵) ویسٹرمارک کی کتاب مختصر تاریخ نکاح (شارٹ ہسٹری آف میرج) میں ہے "سینٹ پال کی تعلیم ہے کہ کوئی عیسائی کسی کافر سے ہرگز نکاح نہ کرے" اور ٹرٹولین کے نزدیک تو ایسے ازدواج کا نام حرام کاری ہے۔" (ص۵۵)

اور ہندو دھرم میں نکاح تو نکاح، مذہب سے باہر ہونا کیا معنی "ذات" کے باہر بلکہ برادری کے باہر بھی درست نہیں۔

حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ یہ قید لگا کر بتا دیا کہ ممانعت کی بنیاد تمام تر دینی و اعتقادی ہے نسلی، قومی، جغرافی وغیرہ ہرگز نہیں، جو بھی عورت ایمان لے آئے اسی سے نکاح جائز ہو جاتا ہے۔

۸۱۸ (اپنے حسن و جمال، مال و دولت وغیرہ کی بنا پر)

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ

اور اپنی عورتوں کو (بھی) مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۸۱۹

آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر قرآن کی نظر میں کس قدر مبغوض ہے، کافر عورت میں جو بھی خوبیاں ہوں، کُل ایک طرف اور اُس کے کفر کی گندگی دوسری طرف۔

لَاَمَةٌ۔ میں لَ زور اور تاکید کے لئے ہے، اردو میں ایسے موقع پر "تک" لاتے ہیں۔

لام الابتداء التیہیۃ بلام القسم فی افادۃ التاکید (ابوسعود) واللام فی افادۃ التوکید تشبہ ان (مسلم)

مطلب یہ ہوا کہ ہر مسلم عورت، یہاں تک کہ نعمتِ آزادی سے محروم اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھی جانے والی باندی تک، آزاد، خوش حال، خوش جمال کافر عورت سے بہتر ہے۔ نکاح کی یہ حقیقت اگر پیشِ نظر رہے کہ وہ ایک گہرا اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، ہمہ وقتی، اور ہمہ جہتی رشتہ نہ صرف دو افراد کے، بلکہ دو خاندانوں کے درمیان ہے، تو ایسے حکمِ امتناع پر حیرت ذرا بھی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی حکیمانہ گہرائی کی داد دینا پڑتی ہے، شرک کے جراثیم اپنے ساتھ اسلامی معاشرہ کے لئے اخلاقی و روحانی قدروں کے لئے پورے تباہ کن خطرات بھی رکھتے ہیں اور انھیں ہلکا یا ناقابلِ التفات سمجھنا کیسر بے دانشی ہے

۸۱۹ (اور گروہِ مومنین میں نہ شامل ہو جائیں)

حَتّٰى يُؤْمِنُوْا۔ یہ شرطِ ایمان بھی اسی حقیقت کے زوردار اظہار کے لئے ہے کہ اصل مانع و حائل اُن مردوں کے شوہر ہونے سے ان کا کفر ہے، جب یہ مانع دُور ہو جائے، تو پھر کوئی امر مانع نہیں۔

اَلْمُشْرِكِيْنَ۔ "مشرک" یہاں بھی اسی عام و وسیع معنی میں ہے جیسے "مشرکہ" جو ابھی اوپر آچکا ہے، یعنی ہر قسم کے کافر کے مرادف ہے، قانونِ اسلام کا منکر جو کوئی جس قسم کا بھی ہو، مومن خاتون نہ اُس کے نکاح میں دی جا سکتی ہے، نہ رہ سکتی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ شوہر اگر پہلے سے مسلمان ہے، اور بعد کو خدا نخواستہ مرتد ہو گیا تو مسلمان عورت اسی وقت اُس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی، اور جو نکاح ابھی تک صحیح تھا معاً ٹوٹ جائے گا، اور یہ عورت عدت پوری کر کے کسی مسلمان شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میاں بیوی پہلے سے کافر ہیں، اور عورت مسلمان ہو گئی، تو اب بقائے نکاح کی کوئی صورت نہیں، بجز اس کے کہ شوہر بھی، اسلام قبول کرے، مزید تفصیل اس قسم کے مسائل کی کتبِ فقہ میں ملے گی۔

لَا تُنْكِحُوْا۔ خطاب مَردوں سے ہے، کہ تم اپنی عورتوں کو کافروں کے نکاح میں نہ دو، حکم خود عورتوں کو براہِ راست نہیں مل رہا ہے کہ تم کافروں کے نکاح میں نہ جاؤ، یہ طرزِ خطاب بہت پُرمعنی ہے، صاف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح مَردوں کے واسطہ سے ہونا چاہئے۔

بعض فقہائے مفسرین نے ولایتِ نکاح کا وجوب اسی آیت سے نکالا ہے۔

فی ھٰذہ الآیۃ دلیل بالنص علٰی ان لانکاح الا بولیّ (قرطبی)

فقہائے حنفیہ کے ہاں یہ استدلال مطلق صورت میں درست نہیں۔

واستدل بہا علٰی اعتبار الولیّ فی النکاح مطلقاً وھو خلاف مذھبنا (روح)

وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ

اور مومن غلام تک بہتر ہے مشرک (آزاد) سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو ۸۲۰ وہ لوگ دوزخ کی طرف

اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ

بلاتے ہیں ۸۲۱ اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے اپنی مشیت سے ۸۲۲

وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾

ع ۲۷ / ۵ / ۱۱

اور لوگوں سے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۸۲۳

۸۲۰ (علمی قابلیت کی بنا پر اونچی ڈگریوں کی بنا پر بڑے عہدوں کی بنا پر کسی بھی دنیوی بنیاد پر)

لَعَبۡدٌ کا لَ یہاں بھی تاکید اور زور کے لئے ہے، اردو کے "تک" کے معنی میں یعنی نعمت آزادی سے محروم، اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھے جانے والے غلام تک کو اختیار کر سکتے ہو لیکن نہ اختیار کرو تو کسی کافر کو، خواہ وہ دنیاوی اعتبار سے کیسا ہی بڑا آدمی ہو۔

۸۲۱ (اپنی زبانِ حال سے)

اِلَى النَّارِ۔ دوزخ کی طرف یعنی اُن اعمال اور اُن عقائد کی طرف، اس طریق زندگی کی طرف جس کا انجام دوزخ ہے اور وہ طریق کفر و شرک ہے۔

ای الی الاعمال الموجبۃ الی النار (معالم) ای الکفر المؤدی الی النار۔ (بیضاوی)

اُولٰٓئِكَ۔ اشارہ انہیں کافر مردوں اور کافر عورتوں کی جانب ہے، ان کی طرف سے مزید نفرت دلانے کے لئے یہ فقرہ بھی بڑھا دیا گیا ہے، گویا جتا دیا ہے کہ ایسے گئے گزرے ہوئے اور خطرناک لوگ تو معمولی تعلقات رکھنے کے بھی قابل نہیں، چہ جائیکہ ان سے ازدواج کا سا گہرا رشتہ پیدا کیا جائے۔

۸۲۲ (چنانچہ اس رحمت و مغفرت ہی کے تقاضہ سے اُس نے یہ حکم بھی دے رکھا ہے کہ کافروں سے ازدواجی تعلق نہ رکھو، تا اُن کے گہرے تعلق کا کوئی اثر تم پر پڑنے پائے، اور نہ تم جنت و مغفرت سے دور ہوتے جاؤ)

اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ یعنی اللہ ترغیب دیتا ہے ایمان و اسلام کی اور اس طریق زندگی کی جس کا انجام جنت و مغفرت ہی ہے۔

بِاِذۡنِهٖ۔ اذن کے معنی یہاں توفیق یا ارادہ یا اعلامِ احکام کے ہیں۔

باعلامہ ایاکم سبیلہ وطریقہ (ابن جریر) ای قضائہ وقدرہ وارادتہ (معالم) بتیسیر اللہ وتوفیقہ للعمل (کشاف)

۸۲۳ (اور نصیحت پر عمل کرکے جنت و مغفرت کے حقدار بن جائیں)

اس مفہوم کی اور بھی متعدد آیتیں قرآن میں ہیں، اور اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ جنت انسان کا پیدائشی حق ہے، سوا اس کے کہ انسان اپنی دانستہ بے راہ روی سے راستہ جہنم والا اختیار کرے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي

اور لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں ۸۲۴؎ آپ کہہ دیجئے کہ وہ ایک (طرح کی) گندگی ہے ۸۲۵؎ سو تم عورتوں کو

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ

حیض کے دوران میں چھوڑے رہو ۸۲۶؎ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے قربت نہ کرو ۸۲۷؎

۸۲۴؎ یعنی عورت کے زمانۂ خاص میں اس سے ہم بستری کا حکم۔ قرآن زندگی کا مکمل دستور العمل ہے، وہی زندگی جس میں کھانا، پینا، سونا، جنسی خواہش کا پیدا ہونا، بچہ کا ماں یا باپ بننا، سب کچھ داخل ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ جو کچھ بھی تعلق تعمیرِ سیرت سے رکھتا ہے، اس کی بابت ہدایات و احکام وہ لازمی طور پر دے گا، وہ محض درویشانہ وعارفانہ ملفوظات و مواعظ کا مجموعہ نہیں، معاشیات، معاشرت، اخلاقیات، قانون، غرض انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کے ضروری ابواب کا ذکر اس میں ناگزیر ہے، خدا نخواستہ ایسا نہ ہوتا، تو اس ہدایت نامہ کی جامعیت و کاملیت پر حرف آجاتا۔

مَحِیْض مصدر میمی ہے معنا حیض کے مرادف اور اس کے وقت و موضع کے بھی مرادف۔

المحیض الحیض و وقت الحیض وموضعہ علی ان المصدر فی ھذا الباب من الفعل یجیٔ علی مفعل (راغب) المحیض ھو الحیض المعروف ولاحاجۃ الی نصب علی محل الحیض۔ (المنار)

۸۲۵؎ (جیسا کہ دنیا میں عموماً دوسری قوموں نے بھی سمجھا ہے اور سامی نسل والوں نے علی الخصوص)

• لاذی کب بہ عن القذر علی الجملۃ (قرطبی)

طب قدیم و جدید دونوں کو مسلّم ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا ناقص خون ہے، رنگ، بو و ترکیب میں عام خون سے الگ۔

۸۲۶؎ (عمل ہم بستری کی حد تک)

فَاعْتَزِلُوْا۔ یہ اعتزال یا عورتوں کو چھوڑے رہنے کا حکم صرف ہم بستری کے عمل خاص تک محدود ہے، مجالست و مواکلت وغیرہ عام معاشرت سے اس کا تعلق نہیں۔ بعض قوموں میں عورتیں اپنے اس زمانہ میں نہ دوسروں کے ساتھ کچھ کھا پی سکتی ہیں، نہ لیٹ بیٹھ سکتی ہیں، بعض قوموں میں اس زمانہ میں عورت کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ناپاک سمجھا جاتا ہے، بعض مشرک قوموں میں یہ دستور ہے کہ اس زمانہ میں عورت کو میلے کچیلے کپڑے پہنا کر گھر کے ایک الگ گوشہ میں اچھوت بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے، غرض دوسری قوموں نے عام طور پر اس طبعی ناپاکی سے متعلق بہت مبالغہ آمیز تخیل قائم کر لیا ہے، شریعت اسلامی میں اس قسم کے کوئی امتناعی احکام موجود نہیں۔

۸۲۷؎ مشرک قوموں نے اس باب میں جو سختیاں روا رکھی ہیں، اُن سے قطع نظر خود توریت کے قانون کا تشدد بھی اس باب میں اپنی مثال آپ ہے، عورت اپنے ایام ماہوار کے زمانہ میں خود ہی ناپاک نہیں ہوتی، بلکہ جو شخص یا جو چیز بھی اس سے چھو جاتی ہے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے، اور سلسلہ در سلسلہ یہ ناپاکی متعدی ہوتی جاتی ہے۔

"جو کوئی اُسے چھوئے گا شام تک نجس رہے گا...... اور جو کوئی اُس کے بستر کو چھوئے اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے ــــ اور جو کوئی اُس چیز کو جس پر وہ بیٹھی تھی چھوئے اپنے کپڑے دھوئے

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ

پھر جب وہ پاک ہوجائیں ۸۲۸ تو اُن کے پاس آؤ جس جگہ سے اللہ نے تمہیں اجازت دے رکھی ہے ۸۲۹ بے شک

التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ

اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتا ہے پاک صاف رہنے والوں سے ۸۳۰ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں ۸۳۱

اور پانی سے نہائے اور شام تک ناپاک رہے ..... اگر مرد اس کے ساتھ سوتا ہے اور اس کی نجاست اس پر ہو تو وہ سات دن تک ناپاک رہے گا، اور ہر ایک بستر جس پر یہ مرد سوئے گا، ناپاک ہوجائے گا۔" (احبار ۱۵: ۱۹-۲۴)

یہ احکام تو خود توریت کے ہوئے، باقی فقہاء یہود تو اپنے تشددات میں ان حدود سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے ہیں، اور ایسی ایسی قیدیں بیچاری عورت پر عائد کردی ہیں کہ گویا وہ عورت نہیں ہے کوئی بلا ہے، ملاحظہ ہو جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۱، نیز ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل، جلد ۴ صفحہ ۸۲۶۔

۸۲۸ یعنی خون حیض کا آنا بالکل بند ہوجائے اور عورت غسل کرے، شریعت میں یہ غسل واجب ہے "صفائی" جس چیز کا نام ہے اس سے تو خیر دوسری قومیں بھی واقف ہیں، لیکن جسے "پاکی" سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے قاعدے قانون اسلام کے باہر مشکل ہی سے کہیں ملیں گے۔

۸۲۹ یعنی جائز و فطری طریق کے مطابق، اس عام و فطری طریق قربت کے سوا حصول لذت کے اور سارے طریقے ناجائز ہیں، فراء نحوی نے یہ نکتہ مِنْ حَيْثُ اور فِي حَيْثُ کے فرق سے پیدا کیا ہے۔

ولم يقل في حيث وهو الفرج ..... يقال ايت الفرج من حيث شئت۔ (معالم)

۸۳۰ (اور اس صفائی میں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی گندگی سے پاک ہوجانا آگیا۔)

اَلتَّوَّابِيْنَ۔ تَوَّابِيْنَ۔ اس سیاق میں وہ لوگ ہیں، جن سے قوانین بالا کے باب میں کوئی اتفاقی خلاف ورزی ہوجائے، اور وہ بعد کو توبہ کریں، اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔

اَلْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ مُتَطَهِّرِيْنَ۔ اس سیاق میں وہ لوگ ہیں جو عورت کی مواصلت سے اس کی طبعی ناپاکی کے زمانہ میں محترز رہتے ہیں، اسی لفظ سے فقہاء نے اشارۃ النص سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو اعمال غیر فطری ہیں (مثلاً اغلام) وہ سب حرام ہیں، صفائی و طہارت کی یہ روح قرآنی عام ہے اور اس کے تحت میں جسمانی اور ظاہری صفائی پوری طرح آجاتی ہے، اسلام کی اس لطافت پسندی، نظافت پسندی، طہارت پسندی کے مقابلہ میں دوسرے سرے پر وہ مذاہب ہیں، جن میں قرب حق کا ذریعہ صفائی کو نہیں، بلکہ عین جسمانی گندگی، کثافت و غلاظت کو قرار دیا گیا ہے، مشرک قوموں میں جو فرقے اگھور پنتھی کے نام سے ہیں، ان کے تفصیلی ذکر سے تو ان صفحات کو نجس کرنے کی جرأت نہیں، خود مسیحیت کی تاریخ میں صدیوں تک راہبوں کے لئے غسل یا جسم کی شست و شو ایک مستقل معصیت رہی ہے۔

۸۳۱ اور کھیت کہتے ہیں اس موضع زمین کو جس میں تخم ریزی ہوتی ہے، اور اس میں سبزی، غلہ، نباتات کا نشو و نما ہوتا ہے، کھیت والے اُسے اپنی بہت بڑی دولت سمجھ کر نہایت درجہ عزیز رکھتے اور اس کی ہر طرح نگہداشت

فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ ز

سو تم اپنے کھیت میں آؤ جس طرح چاہو ۸۳۲

اپنے اوپر لازم سمجھنے میں۔ اسلام نے ہم بستری کا اصل مقصد طلبِ ولادہی کو رکھا ہے گو اس کے دوسرے پہلو یعنی طلب لذت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ آیت کے الفاظ سے ضمناً روشنی منع حمل کے مسئلہ پر بھی پڑجاتی ہے اور کسی جہت سے بھی مسئلہ کی عمومی صورت کی تائید نہیں نکلتی بلکہ ایک گونہ تردید ہی نکلتی ہے کون کاشتکار زمین میں بیج محض ضائع کردینے کے لئے ڈالے گا؟ (اس تشبیہ اور اس کے مضمرات کو خوب سوچ سمجھ کر)

۸۳۲ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ کنایہ ہے عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے اور قرآن حکیم ایسے موقعوں پر اکثر کنایہ ہی سے کام لیتا ہے

من الکنایات اللطیفۃ والتعریضات المستحسنۃ (کشاف۔ مدارک)

فقہاء مفسرین نے یہیں سے استنباط کیا ہے کہ ہر ایسے موقع پر مسلمان کو یہی چاہئے کہ حتی الامکان یا اشارہ و کنایہ ہی میں کہے

وھذہ واشباھھا فی کلام اللہ اداب حسنۃ علی المؤمنین ان یتعلموھا ویتأدبوا بھا ویتکلفوا مثلھا فی محاوراتھم ومکاتباتھم (کشاف) فعلی کل مسلم ان یتأدب بھا ویتکلف مثلھا فی المحاورات والمکاتبات۔ (مدارک)

حَرْثَكُمْ "کہاں" کا یہ جواب خوب ملحوظ رہے اتیان یا داخلہ کھیت ہی میں ہونا چاہئے، قبولِ تخم ہی کے موضع یا عضو میں ہونا چاہئے، نہ کہ اس کے سوا اس سے خارج کسی اور موقع اور محل میں۔

ای نساؤکم مزدرع اولادکم فأتوا مزرعکم کیف شئتم واین شئتم۔ (ابن جریر)

أَنّٰى کے مشہور و معروف معنی کَیْفَ اور اَیْنَ کے ہیں یعنی جس طرح کے جس کیفیت کے ساتھ اور جدھر سے جس جہت سے۔

یلیت عن الحال والمکان (راغب) ھو بمعنی این وکیف (راغب) ھو اعم باللغۃ من کیف ومن این ومن متی، ھذا ھو الاستعمال العربی فی انّٰی وفسرھا سیبویہ بکیف ومتی این باجتماعھا (قرطبی) ومجیٔ انّٰی بمعنی این وکیف ومتی مما اثبتہ الجم الغفیر۔ (روح)

بلکہ ادب میں کَیْفَ ہی کے معنی میں زیادہ آیا ہے اور اَیْنَ کے مفہوم میں کمتر۔

تستعمل غالبا بمعنی کیف وتستعمل بمعنی این قلیلاً۔ (المنار)

خود قرآن مجید میں بھی أَنّٰى بار بار کَیْفَ کے معنی میں آیا ہے مثلاً أَنّٰى يُحْيِي هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا یہاں أَنّٰى يُحْيِي صاف کیف یحیی کے معنی میں ہے یا پھر أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ اس آیت میں بھی قرآنیات کے بہترین ماہرین ابن عباسؓ صحابی نے اور مجاہدؒ، قتادہ، عکرمہ وغیرہ تابعین نے أَنّٰى کو اسی معنی میں لیا ہے چنانچہ اس آیت میں بھی أَنّٰى اسی کَیْفَ ہی کا مرادف ہے

ای کیف شئتم (معالم) یأتیھا کیف شاء (ابن جریر عن ابن عباسؓ وعکرمہ ومجاھد) ای کیف شئتم (ابن جریر عن السدی) وقال مجاھد کیف شئتم (روح) معناہ کیف شئتم وحیث شئتم بعد ان یکون فی صمام واحد (معالم) معناہ کیف شئتم۔ (المنار)

گویا یہاں صاف رد ہو رہا ہے یہود کا جو صحبت کی صرف ایک ہی وضع و ہیئت کو جائز سمجھتے تھے، اور باقی سب کو ناجائز، متعدد آثار و روایات اسی مضمون کی تفسیروں میں منقول ملیں گے، اور آیت میں بتایا جا چکا ہے کہ

وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۚ

اور اپنے حق میں آخرت کے لئے کچھ کرتے رہو ۸۳۳ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے ۸۳۴

وضع فطرت کے اندر ہر صورت وہیئت کی اجازت ہے۔

ای مقبلات ومدبرات ومستلقیات یعنی بذلک موضع الولد (قرطبی) معناہ عند الجمہور من الصحابۃ والتابعین وائمۃ الفتوی من ای وجہ شئتم مقبلۃ ومدبرۃ (قرطبی) یجوز ان یکون المستفاد حینئذ تعمیم الجہات من القدام والخلف والفوق والتحت والیمین والشمال لا تعمیم مواضع الاتیان

اس کھلے ہوئے مفہوم کو چھوڑ کر بعض اہل فہم نے اَنّٰی میں ایک مفہوم مکان کا ڈھونڈھ نکالا ہے اور اس معنی کو لے کر ان لوگوں نے اس کی مزید تشریح میں اپنی گندہ مذاقی کے عجیب عجیب مظاہرے کئے ہیں حالانکہ ظاہر ہے کہ لفظ قرآنی سے موضع ومحل میں کسی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ابن کثیر نے تو اس معنی پر ابو حنیفہؒ وشافعیؒ واحمد بن حنبلؒ جیسے ائمہ فقہ اور ان کے شاگردوں اور بہت سے تابعین کا اجماع نقل کرکے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس معنی سے تجاوز کرکے جواز ڈھونڈھنے والوں کا ان تمام علماء وفقہاء نے شدت سے انکار کیا ہے، بلکہ بعض تو اس تجاوز کو کفر کے حکم میں داخل کر دیا ہے۔

انہم انکروا ذلک اشد الانکار ومنہم من یطلق علی فعلہ الکفر وہو مذہب جمہور العلماء (ابن کثیر)

سئل ابن عباس عن الذی یأتی امرأتہ فی دبرہا فقال ہذا یسألنی عن الکفر (جصاص)

غرض وضع ومکان تو بہرحال متعین ہے آزادی صرف وضع ومکان میں داخلہ کے لئے ہر رخ، ہر جہت کی دی جا رہی ہے

ای علی ای شیء من الاحوال وذلک فی مکان الحرث (بحر) قال قتادۃ والربیع من این شئتم (روح)

اور حدیث میں تو وعید شدید اس غیر فطری طریق مقاربت پر آئی ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا من اتی امرأۃ فی دبرہا لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ اور مفسر قرطبی نے تصریح کی ہے کہ ایک نہیں بارہ صحابیوں نے مختلف عبارتوں کے ساتھ احادیث صحیح ومستند میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس عمل لوطیت کی حرمت پر نقل کیا ہے، اور ابن کثیر میں بھی بڑی شرح وبسط کے ساتھ حدیثوں کے حوالہ سے اس پر کلام کیا گیا ہے، لیکن ان دو معروف ومتداول معنوں کے علاوہ اَنّٰی کے ایک تیسرے معنی مَتٰی یعنی جب اور جس وقت کے بھی نقل ہوئے ہیں گویا اَنّٰی یہاں ظرف زمان کے طور پر استعمال ہوا ہے ضحاک تابعی اور بعض محققین قرآن اس طرف گئے ہیں۔

اَنّٰی بمعنی مَتٰی قال الضحاک (بحر۔ روح) ای متی شئتم (ابن جریر عن الضحاک) ای فی ای زمان اردتم (بحر) متی شئتم من لیل ونہار (کبیر) انّٰی شئتم من اللیل والنہار (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

جس خدا کی بنائی ہوئی دنیا کی عملی زندگی میں اس قسم کے سوالات ومسائل روزمرہ پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں اسی خدا کے اتارے ہوئے ہدایت نامہ میں اگر ان سے متعلق ہدایات واحکام صاف ومفصل نہ ہوتے تو یہ بہت عجیب سی بات ہوتی، اور یہ سکوت محض نہیں عیب ہی قرار پاتا۔

۸۳۳ آخرت کے لئے کچھ بھیجنے کی چیز عمل صالح ہی ہو سکتے ہیں۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ

اور آپ ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجیے ۸۳۵ اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے اپنی نیکی کے اور اپنے تقویٰ کے

تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

اور نیز اصلاحِ خلق کے کاموں کے حق میں حجاب نہ بنا لو ۸۳۶ اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے ۸۳۷

[illegible]

بعض لوگوں نے آیت کے اس جزو سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا ہے کہ اپنی نسل کو آگے بڑھاؤ ـــــ اگر یہ مطلب صحیح ہے تو اس نئے شیطانی فلسفۂ منع حمل کے خلاف ایک اور ہدایت ہاتھ آجاتی ہے۔

یہ گو اسی کی تاکید ہے کہ عین لذت و التذاذ کے مشغلوں کے وقت بھی اپنی عبدیت کو، اپنی ذمہ داری کو بھول نہ جاؤ، تمہ تر لذت پرستی ہی میں غرق نہ ہو جاؤ، بلکہ ہو سکے تو اپنی لذتوں کو بھی عین طاعت و عبادت بناؤ۔

۸۳۴ (کہ اسی کا استحضار، تقویٰ و خشیت کو آسان بنا دے گا)

آیت میں تعلیم اسی کی ہے کہ مومن کے ہاتھ سے تقویٰ الٰہی کا سر رشتہ کسی حال میں بھی چھوٹنے نہ پائے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی ہر حال میں، ایامِ حیات کے ہر ہر لمحہ میں، تقویٰ الٰہی پر قائم رہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔ قرآن مجید صرف احکام ہی نہیں دیتا، بلکہ وہ طریقہ اور تدبیر بھی بتاتا جاتا ہے جس سے ان احکام پر عمل آسان ہو جائے، حکم ابھی تقوائے الٰہی کا ملا ہے، اور اب اس کی آسان تدبیر ارشاد ہو رہی ہے کہ وہ لقائے آخرت کا استحضار ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا سے محض جان لینا مراد نہیں، بلکہ اس علم کا تر و تازہ رکھنا مراد ہے۔

۸۳۵ (اے پیغمبر)

یہاں جو اہلِ ایمان مراد ہیں، ان کے صفات ابھی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ وہ اس بات کا اہتمام رکھتے ہیں (وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ) اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں (وَاتَّقُوا اللّٰهَ) اور جزا و سزا کا عقیدہ تر و تازہ رکھتے ہیں (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ)

۸۳۶ عرب جاہلیت کے جاہلانہ دستوروں میں سے ایک دستور یہ بھی تھا کہ خدا کی قسم کھا کر یہ کہہ بیٹھتے، ہم فلاں نیک کام نیکی کا، تقویٰ کا، اصلاحِ خلق کا نہ کریں گے، اور جب کوئی کہتا تو یہی عذر پیش کر دیتے کہ ہم تو اس کی قسم کھا چکے ہیں، ان اعمالِ خیر کا ترک یوں بھی ہر صورت میں مذموم تھا، چہ جائیکہ حضرت حق کے اسمِ بزرگ و برتر کی قسم کو بجائے قربِ حق کے اس سے دوری کا ذریعہ بنایا جائے، آیت اسی شناعت ہی کی تردید میں ہے۔

عُرْضَةً کے عام و متداول معنی ہدف یا نشانہ کے ہیں، اور بعض نے یہاں بھی یہی معنی رکھے ہیں۔

[illegible]

لیکن ایک دوسرے معنی حجاب یا مانع حجاب کے بھی ہیں، اور یہاں یہی زیادہ چسپاں ہیں۔

[illegible]

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا

اللہ تمہاری قسموں میں سے لایعنی (قسم) پر مواخذہ نہ کرے گا، البتہ تم سے اس (قسم) پر مواخذہ کرے گا جس پر

كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ

تمہارے دلوں نے قصد کیا ہے ۸۳۸ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا بردبار ہے ۸۳۹ جو لوگ اپنی بیویوں سے (ہم بستری

نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

کرنے کی) قسم کھا بیٹھے ہیں ان کے لئے مہلت چار ماہ کی ہے ۸۴۰ پھر اگر یہ لوگ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۸۴۱

عن المانع (کبیر)

فقہاء نے بلا ضرورت اور کثرت سے قسمیں کھاتے رہنے کو یوں بھی ناپسند کیا ہے کہ اس میں اللہ کے نام کی بے توقیری ہے، چہ جائیکہ قصداً جھوٹی قسمیں کھانا!

۸۳۷ (اس لئے ہر بات سوچ سمجھ کر منہ سے نکالو، اور اسی لئے نیت میں ہر وقت اخلاص رکھو)
یعنی تمہیں سابقہ ایسے رب سے ہے جو سننے والا تمہارے ایک ایک قول کا، اور جاننے والا تمہارے ایک ایک حال کا ہے۔

۸۳۸ یعنی گرفت اُن قسموں پر ہوگی جن میں جھوٹ کی آمیزش بالقصد کی گئی ہے، آخرت میں بھی انہیں پر داروگیر ہے اور دنیا میں بھی اُن کے لئے کفارہ ہے۔

بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ۔ مراد اُن قسموں سے ہے جو ناواقفیت کی بنا پر یا بے خیالی میں محض عادۃً زبان سے نکل جاتی ہیں، اور جھوٹ کی آمیزش ان میں بلا قصد ہو جاتی ہے۔ فقہاء نے اس نوعیت کی ساتھ اس اعتبار قسموں کی کئی قسمیں کی ہیں، ان کا تعلق ماضی کے واقعات سے بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ کے ارادوں سے بھی، ان کی تفصیلات اور ان کے احکام کتب فقہ میں ملیں گے۔

۸۳۹ (چنانچہ انہیں صفات کے تقاضہ سے اُس نے لایعنی قسموں پر مواخذہ سرے سے معاف کر دیا اور ارادی جھوٹی قسموں پر بھی گرفت فوراً نہ کی، بلکہ اس کو قیامت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔)

۸۴۰ اِیْلَاء۔ عرب جاہلی کا ایک شعار یہ بھی تھا کہ شوہر غصہ میں آکر قسم کھا بیٹھتے تھے کہ اپنی بیویوں سے ہم بستری نہ کریں گے، اصطلاح میں اس کو ایلاء کہتے ہیں۔

لاخلاف انہ قد أضمرت فیہ الیمین علیٰ ترک الجماع (جصاص)

شریعت اسلامی نے اس میں جو اصلاحیں کیں، اور اس باب میں جو احکام دیئے یہاں ان کا ذکر ہے۔

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ۔ عرب جاہلی ایلاء کر لینے کے بعد جو ایک طرح کی طلاق ہی تھی، بیوی کے نان و نفقہ اور ہر قسم کے ادائے حقوق سے مطلقاً دست بردار ہو جاتے تھے، اسلام نے اس کی ایک اصلاح یہ کی کہ اس کو خلع نکاح یا فسخ نکاح کا مرادف نہیں، بلکہ اس کی صرف تمہید قرار دے کر غور و فکر کے لئے ایک مدت مقرر کر دی اور پھر

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ

اور اگر طلاق (ہی) کا پختہ ارادہ کرلیں ۸۴۵ تو بے شک اللہ

اس مدت کی میعاد چار مہینے کی رکھی جو اس کے لئے بالکل کافی ہے کہ سارے پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جائے۔
۸۴۴ (چنانچہ ایسی قسم توڑنے کا گناہ ایک خفیف سے کفارہ کے بعد معاف کر دے گا، اور جو شوہر از سر نو ادائے حقوق پر متوجہ ہو جائے گا، اس پر نظر رحمت سے کرے گا۔)

فَاءُوْ یعنی اگر اپنے قصد انقطاع تعلق سے رجوع کر لیں، اور رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنا چاہیں۔ فیئ کے اصل معنی رجوع کے ہیں، اور بہتر حالت کی طرف رجوع کے ہیں۔

الفئ الرجوع الى الشيء (جصاص) الفئ والفيئة الرجوع الى حالة محمودة (راغب) معناه رجعوا. (قرطبي)

اور رجوع کی ایک عملی شکل صحبت کر لینا ہے چنانچہ یہاں بھی کنایہ سمجھا گیا ہے، اور صحابہ سے لے کر تابعین و سلف کی ایک بڑی تعداد اسی طرف گئی ہے۔

اي رجعوا الى ما كانوا عليه وهو كناية عن الجماع قاله ابن عباس ومسروق وسعيد بن جبير وغير واحد ومنهم ابن جرير رحمه الله (ابن كثير)

غَفُوْرٌ بڑا مغفرت والا ہے۔

رَّحِيْمٌ بڑا مہربان ہے۔

۸۴۵ (اتنے دنوں کے غور و فکر کے بعد بھی)

طلاق۔ شریعت میں نام ہے زن و شو کے باہمی تعلق کے باضابطہ و کامل انقطاع کا، یا نکاح کی گرہ کے کھل جانے کا۔

والطلاق حل عقدة النكاح والمطلقات المخليات (قرطبي)

اسلام سے قبل دنیا میں طلاق سے متعلق عجیب افراط و تفریط قائم تھی، افراط یہود کے ہاں تھی اور تفریط مسیحیوں کے ہاں۔ یہود کے ہاں نہ کوئی قید طلاق پر عائد تھی، نہ شوہر پر اس باب میں کوئی ذمہ داری تھی، اس کا جب جی چاہتا، وجہ بلا وجہ، بس ایک طلاق نامہ لکھ کر بیوی سے چھٹکارا کر لیتا، بیوی اسی وقت دوسرا مرد کر سکتی تھی، توریت کے قانون کے الفاظ یہ ہیں:-

"اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کے اس سے بیاہ کرے، اور یوں ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو، اس سبب کہ اس نے اس میں کوئی پلید بات پائی، تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ میں دے اور اسے اپنے گھر سے باہر کرے، اور جب وہ اس گھر سے نکل گئی تو جا کے دوسرے مرد کی ہو وے"۔ (استثناء۔ ۲۴: ۱ و ۲)

اس آزادی اور بے قیدی کے مقابلہ میں مسیحیوں نے یہ سختی اور تنگی اختیار کی کہ زن و شو میں علیحدگی کی کوئی گنجائش ہی نہ رکھی، انجیل کے موجودہ الفاظ ہیں:-

"جسے خدا نے جوڑا ہے، اسے آدمی جدا نہ کرے..... جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے، اور دوسری سے بیاہ کرے، وہ اس پہلی کے خلاف زنا کرتا ہے، اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے"۔ (مرقس۔ ۱۰: ۱۲)

"میں نہیں بلکہ خداوند حکم دیتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے علیحدہ نہ ہو"۔ (۱۔ کرنتھیوں۔ ۷: ۱۰)

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ

بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے ۸۳۳ اور طلاقنیں اپنے کو تین میعادوں تک رُوکے رہیں ۸۳۴

چنانچہ مسیحی آبادی کے سوادِ اعظم یعنی فرقۂ کیتھولک کے ہاں تو طلاق مطلقاً ناجائز ہے اور بجز موت کے کوئی صورت میاں بیوی میں افتراق کی ممکن نہیں اور یہی فرقہ اسلام سے قبل موجود تھا، پروٹسٹنٹ فرقہ ظہورِ اسلام سے صدیوں بعد پیدا ہوا، اس کے ہاں البتہ اجازت ہوگئی ہے لیکن صرف اس صورت میں کہ پہلے عدالت میں گواہوں کے بیان سے کسی ایک فریق کا ارتکاب زنا یا ظلم وجور ثابت ہولے!

یہ حال اُن قوموں کا تھا جو اہل کتاب تھیں یعنی اصلاً اُن کے قانون کی بنیاد آسمانی کتابوں ہی پر تھی، رہیں قدیم جاہلی اور مشرک "مہذب" "ترقی یافتہ" قومیں سو ایک طرف یونانیوں میں ہندوؤں میں اور ایک عہد خاص تک رومیوں میں طلاق سے کوئی واقف ہی نہ تھا، بلکہ ہندو مذہب میں تو آج تک طلاق ناجائز چلی آرہی ہے گو حالات سے مجبور ہو کر اس کے جائز کرنے کے آج بڑے زور ہند کی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں لگ رہے ہیں۔

دوسری طرف رومیوں میں عہد جمہوریت کے خاتمہ پر طلاق کے جائز ہونے کے ساتھ ہی اس کا جو زور بندھا تو گویا شرافت اور طلاق لازم وملزوم ہوگئے!

دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذہبوں اور بڑی بڑی "مہذب" قوموں کی یہ بے اعتدالیاں اور افراط وتفریط پیش نظر رہیں، جب جاکر شریعت اسلام کی حکمتوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے توازن واعتدال کی قدر ہوگی، اسلام نے فطرت بشری کا بالکل صحیح اندازہ کرکے یہ حکم دیا کہ جب زوجین میں ناموافقت لاعلاج حد تک پہنچ جائے (اور اس ناموافقت کے اسباب کا احاطہ واستقصاء ممکن ہی نہیں، ہر شخص کے لئے الگ الگ سبب محرک ہوتا ہے) اور دوسری صورتیں موافقت پیدا کرنے کی ناکام ہولیں تو آخری علاج یہ ہے کہ فریقین ہنسی خوشی اور باضابطہ معاہدۂ نکاح کو فسخ کرکے ایک دوسرے سے مستقل علیحدگی اختیار کرلیں، اور اسی کا اصطلاحی نام طلاق ہے اور اس انقطاع عمل کو بھی مطلق نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس پر متعدد پابندیاں بھی عائد کردی ہیں، آگے ذکر انھیں قیود وشرائط کا آئے گا۔

۸۳۳ (اس لئے خوب اپنی ذمہ داری محسوس کرکے عمل کا کوئی قدم اٹھاؤ)

سَمِيعٌ ۔ وہ تو بڑا سننے والا ہے، اس لئے زن وشو کے ظاہر قول کو اور شوہروں کی قسموں کو سب کو سنتا رہتا ہے۔

عَلِيمٌ ۔ وہ تو بڑا جاننے والا ہے، اس لئے زن وشو کے دلوں کے اندر کی مخفی باتوں کو جانتا ہے، اُن کے ارادوں اور نیتوں سے واقف ہے، اور ان کے مناسب حال ہی حکم دیتا ہے۔

آیات کے آخر میں صفات باری کا اثبات محض یوں ہی اٹکل سے نہیں ہوتا، ہمیشہ پُر معنی اور سیاق کلام کے لحاظ سے بلیغ ہی ہوتا ہے، یہاں مقصود زن وشو کو خصوصاً شوہروں کو، اُن کی ذمہ داریوں پر متنبہ کرنا ہے، اس لئے انھیں صفات باری کا لانا نہایت موزوں ومناسب ہوا۔

۸۳۴ (دوسرے نکاح سے)

اَلْمُطَلَّقٰتُ ۔ لفظی معنی کے اعتبار سے ہر طلاق شدہ عورت کے لئے وسیع ہے لیکن یہاں مراد صرف اُن بیویوں سے لی گئی ہے،

جو آزاد ہوں (کنیز شرعی نہ ہوں) بالغ ہوں (نابالغ نہ ہوں) اور جن سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو (غیر ملموس نہ ہوں) یہاں احکام صرف انھیں آزاد شوہر دیدہ بیویوں سے متعلق بیان ہو رہے ہیں دوسری قسم کی عورتوں کے طلاق کے احکام دوسرے مقامات پر ملیں گے

امرا والمد خول بهن من ذوات الاقراء (مدارك) اى ذوات الاقراء من الحرائر المدخول بهن (روح)

یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ. اپنے کو روکے رہیں یہ نہ ہو کہ ادھر شوہر نے طلاق دی اور ادھر بیوی نے جھٹ دوسرا شوہر کر لیا، یہ پہلی پابندی طلاق پر عائد ہوتی، اس پہلے نکاح سے آزادی کے بعد کا جو معطل کا زمانہ ہے اُسے اصطلاحِ شریعت میں عدت کہتے ہیں، عورت کے لئے انتظار کی اس مدتِ معین میں متعدد حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، ایک طرف تو شوہر کو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کا پورا موقع مل جاتا ہے، دوسری طرف عورت کے حمل کی بابت پوری طرح تحقیق ہو جاتی ہے، دوسرے مذاہب اور دوسری قومیں سب شریعتِ اسلامی کے قائم کئے ہوئے زمانہ تعطل و وقفہ کے مصالح و فوائد سے محروم ہیں۔

ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ. قرء کے لفظی معنی محض ایک زمانہ معلوم یا مدتِ معین کے ہیں۔

اصل القرء فى كلام العرب الوقت (ابو عبيدة) اهل اللغة اجمعوا على ان القرء الوقت (ابن العربى)

لیکن اس سے میعاد کا آغاز بھی مراد ہو سکتا ہے اور میعاد کا اختتام بھی، دونوں مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں، لیکن لغتِ عرب میں دونوں ہی مستعمل ہیں۔

قال ابو عمرو القرء من الاضداد (كبير) واصل القرء فى كلام العرب الوقت لمجيئ الشئ المعتاد مجيئه لوقت معلوم ولادبار الشئ المعتاد ادباره لوقت معلوم (ابن جرير) كلمة محتملة للطهر والحيض (ابن العربى)

اسی لئے یہاں بھی اہلِ شرح و تفسیر کے دو گروہ ہوئے ہیں، ایک جماعت نے معنی طہر یا پاکی قرار دیے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بعض صحابہ و تابعین سے یہی معنی مروی ہیں، اور امام شافعیؒ اسی طرف گئے ہیں۔

قالت عائشة الاقراء الاطهار (جصاص) قال اهل الحجاز هى الاطهار وهو قول عائشة وزيد بن ثابت والزهرى وابان بن عثمان والشافعى. (قرطبى)

لیکن دوسری طرف حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو موسیٰؓ جیسے بڑے صحابیوں کا قول یہ نقل ہوا ہے کہ یہاں قرء حیض یا ناپاکی کے معنی میں ہے (جصاص) اور یہی قول امام ثوریؒ امام اوزاعیؒ امام ابو حنیفہؒ اور تمام فقہاء حنفیہ کا ہے۔

قال اصحابنا جميعا الاقراء الحيض وهو قول الثورى والاوزاعى والحسن بن صالح (جصاص) قال اهل الكوفة هى الحيض وهو قول عمر وعلى وابن مسعود وابى موسى ومجاهد وقتادة والضحاك وعكرمة والسدى (قرطبى)

اور ائمہ لغت و لسان سے بھی سند اس معنی کی زیادہ مل رہی ہے۔

يقال اقرءت المرأة اذا حاضت ذكره الاصمعى والكسائى والفراء (جصاص) اقرأت المرأة رأت الدم واقرأت صارت ذات قرء (راغب) والقرء فى الحقيقة اسم للدخول فى الحيض عن الطهر (راغب)

اور فقہاء حنفیہ نے حدیثِ نبوی سے قرء کے اس معنی پر شہادت بہم پہونچائی ہے، ملاحظہ ہو جصاص جلد اول ص۳۲۴، اور یہی پہلو زمخشری جیسے ادیب ماہرِ عربیت نے اختیار کیا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيٓ أَرْحَامِهِنَّ

اور ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو پیدا کر رکھا ہے اُسے وہ چھپائے رکھیں ۸۲۴

إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ، وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ

اگر وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں ۸۲۵ اور ان کے شوہر اُن کے واپس لے لینے کے

بِرَدِّهِنَّ فِي ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوٓا

اس (مدت) میں زیادہ حقدار ہیں ۸۲۶ بشرطیکہ اصلاح حال کا

القروء جمع قرء وھو الحیض بدلیل قولہ علیہ السلام دعی الصلوٰۃ ایام اقرائک (کشاف)
بہر حال حنفیہ کے ہاں کا متفقہ مسئلہ یہی ہے کہ مُطلّقہ اپنے تین ایام ماہواری کے آنے تک اپنے کو عدت میں سمجھے اور اس مدت میں نکاح ثانی اپنے لئے جائز نہ سمجھے۔

۸۲۴ اس لئے کہ چھپانے کی یہ کوشش زمانۂ عدت کے شمار و حساب میں خلل انداز ہوگی، اور اس طرح شریعت نے جو مصلحتیں اس کے اندر رکھی ہیں، وہ ضائع ہو کر رہیں گی۔
مَا خَلَقَ اللّٰهُ میں مَا لفظ عام ہے، رحم کے اندر جو چیز بھی ہو، جاندار بچہ ہو یا ایام ماہواری کا خون ہو، دونوں پر شامل ہے، مطلب یہ ہے کہ خواہ حمل قائم ہو چکا ہو خواہ ایام ماہواری کا دور ہو، کوئی بھی صورتِ حال ہو اُسے چھپانا نہ چاہیے۔

۸۲۵ دنیا کے ہر علم و فن کا یہی حال ہے کہ وہ جس درجہ مکمل و منظم ہوگا، اسی قدر اس کا ہر جزو دوسرے اجزاء سے مربوط و مرتبط ہوگا۔
شریعتِ اسلامی جملہ دنیوی علوم و فنون سے منظم تر ہے، اس لئے اس کے کسی حصہ سے جزئیہ کی طرف سے بے التفاتی دوسرے اجزاء اوجیات پر لازمی طور پر مؤثر ہوگی، آیت کا یہ جزو بڑھا کر گویا یہ تاکید و تصریح کر دی ہے کہ جس کسی کو اللہ کی ہمہ گیر حکومت اور آخرت کی باز پرس کا پورا عقیدہ ہے اُس کی یہ شان نہیں کہ ایک جزئیہ کی بھی خلاف ورزی کی دانستہ جسارت کرسکے۔

۸۲۶ (اور یہ واپسی بلا تجدید نکاح ہو جائے گی۔)
فِي ذٰلِكَ۔ یعنی تین مہینے کی میعاد و مدت کے اندر۔

ای فی ذٰلک التربص (مدارک) ای زمان التربص (روح)
أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔ اس سے اشارہ یہی نکلتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اُسے پختہ نہ ہونے دے اور میاں بیوی از سرِ نو آباد ہو جائیں، طلاق کو شریعتِ الٰہی نے صرف ضرورت کے موقع پر بطور علاج اور آخری تدبیر کے جائز رکھا ہے، خواہ مخواہ اس کی ترغیب نہیں دی ہے، اور نہ بلا ضرورت اسے پسند فرمایا ہے، اور حدیث نبوی میں جو اُسے ابغض المباحات سے تعبیر فرمایا ہے یعنی اللہ کی قانوناً جائز ٹھہرائی ہوئی چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسند، اسی حقیقت کی ترجمانی ہے، تین مہینے کی مدت غور و فکر کے لئے اور ناگواری و بیزاری کے ہنگامی جذبات کے سرد پڑ جانے کے لئے بہت ہوتی ہے۔

اِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ

قصد رکھتے ہوں ۸۲۳ اور عورتوں کا (بھی حق) ہے جیسا کہ عورتوں پر (حق) ہے ۸۲۴

اس اثنا میں اگر شوہر بیوی کو واپس لینا چاہے تو طلاق کو قول یا عمل سے منسوخ کر سکتا ہے اور اسی کو اصطلاح میں رجعت کہتے ہیں
۸۲۳ (اس رجوع اور رجعت سے ، نہ یہ کہ فسخ طلاق سے مزید اذیت رسانی مقصود ہو) اگرچہ رجعت کا نفاذ
قانونی وظاہری تو بہر صورت ہو جائے گا۔

تمرض فعل ذالک فالرجعة صحیحة وان ارتکب النهى وظلم نفسه۔ (قرطبی)

قانونی احکام اور اخلاقی ہدایات دو الگ الگ چیزیں ہیں، قانون ظاہری کا نفاذ اسی دنیا تک ہے مومن کو
اپنا معاملہ حق تعالیٰ سے درست رکھنا چاہیے کہ اجر و ترقی درجات کا مدار اسی پر ہے، اسی لئے قانونی احکام کے
بیچ بیچ تصحیح نیت و اخلاص کی تاکید برابر آتی رہتی ہے۔

ف ۸۲۴ یہ قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اتنا بڑا مضمون اتنے مختصر سے فقرہ میں آگیا، اردو میں یہ مضمون اس طرح
ادا ہوگا:۔ "جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے، اسی طرح عورتوں کا حق بھی مردوں پر ہے"
گویا دنیا کو یہ بتا دیا کہ یہ نہ سمجھو کہ بس مردوں کے حقوق عورتوں پر اور شوہروں ہی کے حقوق بیویوں پر ہوتے
ہیں، نہیں بلکہ اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق مردوں پر اور بیویوں کے حقوق بھی شوہروں کے ذمے عائد ہوتے ہیں
حقوق نسواں کا یہ نام عرب کے ایک امی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر اس وقت لایا جا رہا ہے جب کہ دنیا
کی دنیا اس تخیل سے ناواقف تھی، اور یہودیت و نصرانیت کی مذہبی دنیا میں تو عورت گویا ہر برائی کا سرچشمہ تھی،
اور ذلت و حقارت کا ایک مرقع، یہود کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"معصیت اول چونکہ بیوی ہی کی تحریک پر سرزد ہوئی تھی، اس لئے اس کو شوہر کا محکوم کر کے رکھا گیا، اور
شوہر اس کا حاکم ہے، شوہر اس کا مالک و آقا ہے اور وہ اس کی مملوکہ ہے" (جلد ۵ صفحہ ۲۰۱)

اور مسیحی سے متعلق مسٹر لیکی LECKY فرنگی مسیحی اپنی تاریخ اخلاق یورپ HISTORY OF EUROPEAN MORALS میں
لکھتے ہیں:۔

"عقیدہ یہ تھا کہ عورت جہنم کا دروازہ ہے اور تمام آفات بشری کا باعث ہے اسے اپنے کو ذلیل سمجھے
رہنے کے لئے یہی وجہ کافی ہے کہ وہ عورت ہے" (جلد ۲ صفحہ ۱۴۲)

یہ حال وقت کے اونچے اونچے مذہبوں کا تھا، شرک و جاہلیت کے پست مذہبوں کا ذکر ہی بیکار ہے، اور
خود ملک عرب کا یہ حال تھا کہ عورتیں گویا انسان نہیں، جانور یا جائداد تھیں کہ شوہر کے بعد بیویاں بھی ترکہ میں
سوتیلے بیٹوں کے ملک و تصرف میں آنے لگی تھیں۔

مِثْلُ الَّذِىْ یہ مثلیت و مماثلت کس لحاظ سے ہے؟ کیفیت یا کمیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ نفس وجوب کے لحاظ سے ہے
والمراد بالمماثلة الواجب فى كونه حسنة لا فى جنس الفعل (كشاف۔ روح) اى فى الوجوب
واستحقاق المطالبة عليها۔ (بیضاوی)

٢٨ ع ٧ ١٢

بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾

موافق دستور (شرعی) کے ۸۵۵ اور مردوں کو ان کے اوپر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے ۸۵۶ اور اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے ۸۵۷

یعنی یہ مراد نہیں کہ جو حقوق شوہر کی طرف سے بی بی پر عائد ہوتے ہیں بس بالکل وہی بی بی کی طرف سے شوہر پر عائد ہو جاتے ہیں، یکسانیت صرف وجوب ادائے حقوق میں ہے، شوہر کہیں اس بھول میں نہ پڑ جائیں کہ ان کے صرف حقوق ہی حقوق ہیں اور فرائض کچھ نہیں، فرائض ان پر بھی اسی طرح عائد ہوتے ہیں جس طرح ان کی بیویوں پر، اسی طرح بیویاں کہیں اس "فراوانی روشن خیالی" میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ خدمت کرنا ہمارا کام نہیں یہ سب کام مردوں کا ہے، ہمارا کام خدمت لینا ہے۔

۸۵۵ لیکن حقوق باہمی کا آخر معیار کیا ہے؟ آیت کا یہ ٹکڑا اسی سوال کا جواب ہے، یعنی ان حقوق کی جزئیات و تفصیلات کو شریعت ہی کے اصول و کلیات کے ماتحت ہونا چاہئے، یا پھر عقل سلیم کے ماتحت۔

ای بالوجه الذی لا ینکر فی الشرع وعادات الناس. (مدارک)

یہ نہیں کہ محض ہوائے نفس سے یا جاہلی مزعومات کے ماتحت کوئی دستور گڑھ لیا جائے، اور ان کا نام "ضابطۂ حقوق نسواں" رکھ دیا جائے۔

۸۵۶ تہذیب جاہلی ہر زمانہ میں عجیب عجیب بے اصل اور تمام تر غلط دعوے کرتی رہتی ہے اور بعد کو ان دعووں کی عملی تردید بھی ہوتی رہتی ہے، تہذیب جدید کے انھیں بے بنیاد مفروضوں میں سے ایک دعوے یہ بھی ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں، محض دعویٰ کتنی ہی کثرت سے دہرایا جائے دعوے ہی رہے گا، دلیل نہ بن جائے گا، قرآن ابھی ابھی جاہلیت ہی کے ایک مفروضہ کی تردید میں کہہ چکا ہے کہ عورت بے حق نہیں ہے، وہ بھی مردوں کی طرح اپنے حقوق رکھتی ہے، اب وہ جاہلیت کے دوسرے دعوے کی تردید میں بے دھڑک اعلان کر رہا ہے کہ دونوں جنسوں میں مساواتِ مطلق و مساواتِ کامل نہیں، بلکہ مرد کو عورت پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔

دَرَجَةٌ۔ قرآنی لفظ "درجۃ" خوب خیال میں رہے، مرد عورت کے مالک نہیں، عورت اس کی کنیز یا باندی نہیں، بلحاظ حقوق دونوں ایک سطح پر ہیں، پھر بھی مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت و ترجیح حاصل ہے۔

معناه فضیلة فی الحق (معالم) ای زیادة فی الحق (کشاف) ای منزلة. (قرطبی)

جدید علوم و طبیعیات کے ماہرین جنھوں نے مرد و زن کی جسمانی ساخت و ترکیب دماغی و ذہنی قوٰی اور طبعی خصوصیات کے مطالعہ و تحقیق میں عمریں بسر کر دی ہیں، ان کی بڑی جماعت آخر اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و مکمل ہیں، تاہم بہ لحاظ قوت و بہ لحاظ عقل مرد ہی کو فضیلت حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت بھی ہوئی ہے وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کے۔

لیکن اس اثباتِ افضلیت سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ افضل مفضول پر ظلم یا سختی ہی شروع کر دے، بلکہ قوی کو تو کمزور سے اور زیادہ لطف و حسن مراعات رکھنا چاہئے ـــــ اور یہ تعلیم ایک بزرگ اور مفسر صحابی تک سے منقول ہے۔

وقال ابن عباس الدرجة اشارة الی حض الرجال علی حسن العشرة والتوسع للنساء فی المال والخلق ای ان الافضل ینبغی ان یتحامل علی نفسه قال ابن عطیة وهذا قول حسن بارع (قرطبی)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ

طلاق تو دو ہی بار کی ہے ۸۵۳ اس کے بعد (یا تو) رکھ لینا ہے قاعدے کے مطابق یا پھر خوش عنوانی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے ۸۵۴ ۸۵۵

لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا

اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو (مال) تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو ۸۵۶ ہاں بجز اس صورت کے کہ جب اندیشہ ہو کہ اللہ کے

وَلِلرِّجَالِ بجائے ضمیر لَهُمْ لانے کے، صراحۃً لفظ لِلرِّجَالِ لاکر، گویا اس طرف اشارہ کر دیا کہ فضیلت کی بنیاد یہی وصف رجولیت ہے۔

اتی بالمظہر عوض المضمر ... للتنویہ بذکر الرجولیۃ التی بہا ظہرت المزیۃ للرجال علی النساء (معن)

۸۵۲ معاشرتِ انسانی اور معاملاتِ باہمی کے بہت سے مضمون کے اہم مسائل اس آیت میں آگئے، اس لئے حق تھا کہ آیت کا خاتمہ انہیں صفاتِ باری کے اثبات پر کیا جائے۔

عَزِيْزٌ۔ وہ بڑی قوت والا ہے، ہر مانع پر غالب، جو احکام وہ چاہے دے سکتا ہے۔

حَكِيْمٌ۔ لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکمت والا بھی تو ہے، اس لئے وہ وہی احکام دیتا ہے جو بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں، بندوں بیچاروں کی نظریں وہاں تک پہنچ کہاں سکتی ہیں۔

۸۵۳ (جب تک کہ واپسی کی گنجائش باقی ہے)

طلاق سے یہاں مراد طلاق رجعی ہے، دو بار تک الفاظِ طلاق ادا کرنے پر رجوع کر لینے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

۸۵۴ یعنی دو ماہ کے بعد تیسرے مہینہ، تیسری پاکی کے زمانہ میں، زبان سے الفاظ طلاق ادا کرے، یا خاموش رہے، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی، اب بغیر کسی دوسرے شوہر سے نکاح کئے اور طلاق پائے، اُس پہلے شوہر سے نکاح دُرست نہ رہے گا۔

تو ایک صورت تو یہ ہوئی کہ اب پختہ ارادہ کرکے اس طلاق کو مکمل اور قطعی کر دیا جائے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ آخری گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق واپس لے لی جائے اور تعلقِ زناشوئی از سر نو قائم ہو جائے۔

فَاِمْسَاكٌ۔ یعنی اس کچی طلاق پائی ہوئی بیوی کو رجعت کرکے پھر اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔

بِمَعْرُوْفٍ۔ یعنی قواعدِ شرعی کے مطابق، تفصیل احکامِ طلاق کتبِ فقہ میں ملیں گے۔

بِاِحْسَانٍ۔ یعنی طلاق سے مقصود رفعِ نزاع ہو، تاخوشگوار صورتِ حال کا خاتمہ ہو، یہ نہ ہو کہ عورت کی دل شکنی، تحقیر و تذلیل مقصود ہو۔ قرآن مومن کے خاندان کی، اس کے گھر بار کی کتنی عزت و حرمت محفوظ رکھتا ہے! اس کی بے حرمتی کسی حال میں اسے گوارا نہیں، آج مسلمانوں کو خود اپنی اور اپنے خاندان کی عزت و حرمت کا اتنا بھی خیال ہوتا جتنا ان کے خدا کو ہے، تو آج خانگی فضیحتوں کا کوئی وجود بھی کہیں باقی نہ رہتا!

۸۵۵ (طلاق کے وقت)

اکثر انسان جب غصہ میں آکر طلاق دیتا ہے تو یہ بھی گزرتا ہے کہ اب تک جو کچھ بیوی کو دیا لیا ہے اُسے

حُدُوْدَ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ

ضابطوں کو دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے ۸۵۶ سو اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ دونوں اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے ۸۵۷

عَلَیْہِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ ؕ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ

تو دونوں پر اس (مال) کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہوگا جو عورت معاوضہ میں دیدے ۸۵۸ یہ (سب) اللہ کے ضابطے ہیں سو ان سے باہر نہ نکلنا.

چھین لیتا ہے، عرب جاہلیت میں یہ دستور اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، یہاں اسی ظالمانہ دستور کی ممانعت ہے اور بتایا ہے کہ مہر وغیرہ جو کچھ انھیں پہلے دے چکے ہو اب اس کے چھیننے یا واپس لینے کا کوئی محل نہیں۔

مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا۔ عام مفسرین اور فقہا نے اس سے مراد مہر کی رقم رکھی ہے لیکن مسلک مالکی کے ایک مفسر فقیہ نے اُسے ہر اُس مال تک وسعت دی ہے جو شوہر بیوی کو دے چکا ہو اور بعض اور اہل تفسیر بھی اس عموم کی طرف گئے ہیں۔

قال قوم یعنی من الصداق وعندی ان من کل شیء اعطاھا (ابن العربی) وھی مما اٰتیتموھن ظاھر فی عموم ما اتوا علی سبیل الصداق او غیرہ من ھبۃ ومن فسّرہ بعضھم بالصدقات واللفظ عام (بحر) اذا طلقھا لا یأخذ منھا شیئا من الذی اعطاھا من المھر والثیاب وسائر ما تفضل بہ علیھا (کبیر)

حسن معاشرت، حسن معیشت، حسن سلوک کی تاکید ہر صورت میں ہے، بیویوں کو رکھو تو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ، رخصت کرو تو بھی ہنسی خوشی، خوش عنوانی کے ساتھ۔

شَیْئًا۔ یعنی کچھ بھی چھوٹی بڑی کوئی سی بھی چیز واپس نہ لو، یہ تاکید اسی لئے ہے کہ غصہ اور ناگواری کے موقع پر نفس بشری میں عموماً اسی کی تحریک ہوتی ہے۔

شَیْئًا۔ اشارۃ الی حظر الاخذ منہ قلیلا کان او کثیرا و شیئًا نکرۃ فی سیاق النھی فتعم۔ (بحر)

۸۵۶ (ادائے حقوق زوجیت کے باب میں)

یُّقِیْمَا۔ یقیما۔ وہ دونوں، یعنی میاں بیوی۔

خَوْف۔ یہاں ایک ناگوار نتیجے کے اغلباً ظہور پذیر ہونے کے معنی میں ہے، اردو میں "اندیشہ" کا لفظ اسی کا ترجمہ ہے۔

قیل ھذا الخوف ھو بمعنی العلم ای یعلمھا ان لا یقیما حد وداللہ وھو الاشفاق من وقوع المکروہ وھو قریب من معنی الظن (قرطبی) فُسّر ذلک بعر فتم (راغب)

۸۵۷ یعنی حقوق زوجیت درجۂ اقل میں بھی ادا نہ ہو سکیں اور موافقت کی کوئی صورت ہی نظر نہ آئے۔

خِفْتُمْ۔ مخاطبت حکام سے ہے اور ان سے جو ایسے معاملات میں واسطہ اور ثالث بن سکتے ہیں۔

والمخاطبۃ للحکام والمتوسطین لمثل ھذا الامر۔ (قرطبی)

حُدُوْدَ اللّٰہِ۔ یعنی معاشرت زوجی کے فرائض۔

قال طاؤس فیما افترض علی کل واحد منھما فی العشرۃ والصحبۃ (جصاص) ای فیما یجب علیھما من حسن الصحبۃ وجمیل العشرۃ۔ (قرطبی)

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا

اور جو کوئی اللہ کے ضابطوں سے باہر نکل جائے گا، سو ایسے لوگ تو اپنے حق میں ظلم کرنے والے ہیں ۹۵۹ پھر اگر

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ

کوئی بیوی عورت کو طلاق دے بیٹھے (تیسری) تو وہ عورت اس کے لئے اس کے بعد جائز نہ رہے گی یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح کرے ۹۶۱

۹۵۸ یعنی بیوی اگر قید نکاح سے خلاصی پانے اور شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لئے اپنے مہر سے یا اس کے کچھ حصہ سے دست بردار ہونا چاہے تو یہ بھی ایک جائز صورت علیحدگی کی ہے اور اس مال کا قبول کر لینا شوہر کے لئے درست ہوگا، طلاق کی اس خاص صورت کا نام جس میں طلاق کی خواستگار عورت ہو، اصطلاح شریعت میں خلع ہے، اور احکام خلع کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی، تفسیر تھانوی کی بیان القرآن میں بھی کلام مبسوط ملے گا۔

خلع کے جائز صورت طلاق ہونے اور اس کے طلاق بائن کے درجہ پر رکھنے پر حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابیوں اور حسن اور ابی سلمہ اور قاضی شریح اور ابراہیم اور شعبی اور مکحول جیسے تابعین کا اتفاق جصاص نے نقل کیا ہے اور اس کو فقہاء کا متفقہ قول بھی قرار دیا ہے۔

وهو قول فقهاء الامصار لاخلاف بينهم۔ (جصاص)

فقہاء کے ہاں ایک بحث یہ بھی چلی ہے کہ خلع آیا صرف اسی اندیشہ کے وقت جائز ہے جس کا آیت میں ذکر ہے یا یوں بھی عام طور پر جمہور فقہاء و مجتہدین اسی طرف گئے ہیں کہ خلع ہر صورت میں اور ہر حال میں جائز ہے۔

ان جمهور المجتهدين قالوا الخلع جائز فی حالة الخوف وفی غير حالة الخوف (كبير)

صرف کسی کسی کے چند فقیہوں زہری نخعی اور داؤد ظاہری کا مذہب یہ نقل ہوا ہے کہ خلع کی اجازت صرف خوف اور غصہ کی حالت میں ہے اور انھوں نے اس آیت کے ظاہر سے حجت پکڑی ہے۔

وقال الزهری والنخعی وداؤد لايباح الخلع الا عند الغضب والخوف (كبير) تمسك بهذه الاية من رأى اختصاص الخلع بحالة الشقاق والضرر وانه شرط فی الخلع (قرطبی)

جمہور فقہاء نے اس قول کو رد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ آیت میں یہ شرط خلع کی ہرگز مذکور نہیں بلکہ صرف ایک عام حالت کا بیان کیا ہے کہ عموماً خلع کی نوبت ایسی ہی صورتوں میں آتی ہے۔

والذی عليه الجمهور من الفقهاء انه يجوز الخلع من غير اشتكاء ضرر كما دل عليه حديث البخاری وغيره واما الاية فلا حجة فيها لان الله عزوجل لم يذكرها على جهة الشرط وانما ذكرها لانه الغالب من احوال الخلع (قرطبی)

۹۵۹ یہ تاکید ہے اس امر کی کہ احکام شرعی میں کسی خفیف جزئیہ کو بھی ناقابل التفات نہ سمجھا جائے اور شریعت جیسے بے انتہا منظم فن میں ہونا بھی یہی چاہئے تھا، مشین جتنی نازک اور اعلیٰ صناعی کا نمونہ ہوگی، اسی قدر اس کا ایک ایک تنہا پرزہ بھی اپنی جگہ پر بے بدل ہوگا، جس طرح یہ تنبیہ احکام نکاح و طلاق سے متعلق آئی ہے اسی طرح مسائل و احکام صوم کے آخر میں بھی وارد ہوئی ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ فقہاء و مفسرین نے اس کے

یہ نکالا ہے کہ حدود اللہ کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق امر سے ہے اور دوسری کا نہی سے۔

فثمر الحد ود قسمین منہا حد ود الامر بالامتثال وحد ود النہی بالاجتناب۔ (قرطبی)

امام راغب نے اپنی لغت میں حدود الٰہی کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۸۶۰ یعنی ان پہلی دو طلاقوں کے بعد رجعت نہ کرے، اور طلاق پر قائم ہی رہے تو اب تیسری بار یا پہلی طلاق سے تین مہینے گزر جانے کے بعد طلاق قطعی طور پر نافذ ہو جائے گی، تین مہینے کی مدت غور و فکر کے لئے اور سعی مصالحت و مفاہمت کے لئے بہت کافی ہے۔

اس طلاق سے مراد وہ تیسری ہی طلاق ہے جو ہر طرح قطعی ہوتی ہے اور یہ مراد سب کے نزدیک متفقہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

المراد الطلقۃ الثالثۃ فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ وھذا المجمع علیہ لاخلاف فیہ (قرطبی)

۸۶۱ (اور وہ شوہر اس سے ہم بستری بھی کرے)

دوسرے شوہر سے یہ نکاح پہلے شوہر سے طلاق قطعی پانے کے تین مہینہ بعد یعنی ایام عدت گزارنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ تنکح۔ نکح یہاں اپنے اصطلاحی شرعی معنی میں یعنی عقد نکاح کے مرادف نہیں، بلکہ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں یعنی ہم بستری کے مرادف ہے، محض عقد کا مفہوم تو خود لفظ زوجا سے نکل آتا ہے تنکح سے مقصود ہم بستری کو ظاہر کرنا ہے۔

العقد فہم من زوجا والجماع من تنکح (زوج) یحتمل ان تفسیر النکاح بالاصابۃ۔ (بیضاوی)

اور امام ابن جریر اس سوال کے جواب میں کہ ہم بستری کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن میں موجود نہیں تو آخر یہ دلالت کہاں سے پیدا کی گئی ہے، لکھتے ہیں کہ معنی کی یہ دلالت ساری امت کے اجماع نے پیدا کی ہے۔

الدلالۃ علی ذلک اجماع الامۃ جمیعا علی ان ذلک معناہ۔

اور امام رازی نے لکھا ہے کہ قول مختار یہی ہے کہ ہم بستری کی شرط حدیث سے نہیں قرآن ہی سے ثابت ہے۔

واختلف العلماء فی ان شرط الوطی بالسنۃ او بالکتاب قال ابو مسلم الاصفہانی الامران معلومان بالکتاب وھذا ھو المختار۔ (کبیر)

اور آگے اسے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ نکاح کا لفظ جب مطلق صورت میں ہے جب تو مراد عقد زوجیت سے ہوگی، لیکن جب اضافت زوجتہ وامرأتہ کے ساتھ ہوگی تو ہم بستری ہی ہوگی، اور آخر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قولہ نکح یدل علی الوطی وقولہ زوجا یدل علی العقد (کبیر)

بہرحال جمہور فقہاء وائمہ مجتہدین کا مذہب یہی ہے کہ مطلقہ کے ساتھ پہلے شوہر کا نکاح جب ہی درست ہے جب دوسرا شوہر اس کے ساتھ ہم بستری کرکے اسے طلاق دیدے اور اس طلاق پر بھی تین ماہ کی مدت گزر لے۔

مذھب جمہور المجتہدین ان المطلقۃ بالثلاث لا تحل لذلک الزوج الا بخمس شرائط تعتد منہ وتعقد للثانی ویطأھا ثم یطلقہا ثم تعتد منہ (کبیر)

اختلاف صرف دو تابعین سے منقول ہے، ان کے خیال میں مجرد عقد ثانی بھی بغیر ہم بستری کے، طلاق کے بعد شوہر اول سے یا کسی اور سے عقد کے لئے کافی ہے۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ

پھر اگر وہ (بھی) اُسے طلاق دیدے ۵۶۴ تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ پھر مل جائیں ۵۶۵ بشرطیکہ دونوں گمان غالب رکھتے

يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾

ہوں کہ اللہ کے ضابطوں کو قائم رکھیں گے ۵۶۶ اور یہ بھی اللہ کے ضابطے ہیں انہیں وہ کھول کر ان لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ۵۶۷

قال سعید بن جبیر وسعید بن المسیب تحل بمجرد العقد (کبیر) قال سعید بن المسیب

ومن واقعہ مجرد العقد کاف (قرطبی) وقد قال بقول سعید بن المسیب سعید بن جبیر (قرطبی)

لیکن مذہبِ جمہور ہی قوی اور شریعتِ اسلامی کے عین مزاج کے مطابق ہے۔ شریعت نے طلاق کو پسند یقیناً نہیں کیا ہے اس کے نفاذ میں طرح طرح کی قیدیں لگادی ہیں، ترغیب یہ دی ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر ہی طلاق دی جائے لیکن ان سب مرحلوں سے گزر جانے کے بعد جب طلاق نافذ ہی ہو جائے تو پھر اب رعایت کا کوئی موقع نہیں، شوہر کو اب دوبارہ آسانی سے وہ بیوی واپس نہیں مل سکتی اب اُسے ذرا خونِ جگر کھالینا پڑے گا جب وہ حاصل ہو سکتی ہے۔ سزائے زنا میں بھی قانونِ شرعی کی یہی اصل کار فرما ہے ثبوتِ زنا نہایت ہی قوی بلکہ قطعی ہونا چاہئے اور ذرا سے بھی شبہہ کا فائدہ ملزم ہی کو ملے گا لیکن جب یہ سب مرحلے طے ہو چکیں تو پھر اب نفاذِ سزا میں کسی رعایت کی گنجائش نہیں۔

مِنۡۢ بَعۡدُ۔ یعنی طلاقِ ثالثہ کے بعد۔

ای التطلیقۃ الثالثۃ (مدارک)

اس شرط کے ساتھ نئے شوہر کا کسی مطلقہ کے ساتھ نکاح کرنا کہ بعد صحبت طلاق دے دی جائے گی تاکہ وہ اپنے شوہرِ اول کے لئے جائز ہو جائے حلالہ کہلاتا ہے، حدیث میں محلِّل یعنی وہ دوسرا شوہر جو نکاح جیسے اہم سنجیدہ اور مقدس معاہدہ کو پہلے شوہر کی خاطر ایک کھیل اور تفریح کی چیز بنائے دیتا ہے اور محلَّل لہ یعنی وہ پہلا شوہر جس کی خاطر معاہدۂ نکاح کی اہمیت، سنجیدگی و تقدیس خاک میں ملائی جارہی ہے، ان دونوں پر لعنت آئی ہے، اور اکثر فقہاء کے ہاں یہ نکاح، نکاحِ فاسد کے حکم میں آتا ہے۔ حنفیہ کے ہاں ایسا نکاح منعقد ہو جائے گا یعنی اس کا نفاذ قانونی ہو جائے گا، اگرچہ اس سے گناہ عائد ہوگا۔ نفاذِ قانونی اور شرعی و اخلاقی استحسان دو الگ الگ چیزیں ہیں اور اس امتیاز و تفریق کی نظیر شریعت کے اور بھی مسائل میں مل جاتی ہے۔

۵۶۴ (اور اس دوسری طلاق پر بھی تین مہینے کی عدت گزر جائے)

یہ طلاق دینے والا ظاہر ہے کہ دوسرا شوہر ہوگا۔

۵۶۵ (بہ دستورِ سابق، دوبارہ نکاح کرے)

مُطلَّقہ اپنے شوہر کے لئے ہمیشہ کو حرام اب بھی نہیں ہو جاتی، ان درمیانی مرحلوں سے گزرنے کے بعد اب بھی اس کا نکاح اپنے شوہرِ اول سے ممکن ہے، ہر ہر فریقِ معاملہ کے حقوق کی پوری رعایت کا جو کیسا نہ اہتمام و التزام

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو ۸۶۶ اور وہ اپنی مدت گزرنے پر پہنچ جائیں ۸۶۷ تو (اب یا تو) انھیں عزت

اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

کے ساتھ روکے رکھو اور یا عزت کے ساتھ رہائی دے دو ۸۶۸

شریعتِ اسلامی کے سارے اجزاء میں سے اُس کا ایک عملی نمونہ یہ طلاق کے جزئیاتِ احکام ہیں، انسانی ذہن اور بشری دماغ اپنی ساری کوششیں کر تھکے، اتنے دقائق کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔

۸۶۴ (اور آئندہ کی خواہ مخواہ کی رنجشیں پیدا کر کے اتلافِ حقوق میں نہ مبتلا ہوں گے۔)

یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ حدود اللہ کی اقامت اس سیاق میں یہی ہے کہ حسنِ معاشرت کی رعایت رکھی جائے۔

ای یتعاشرا بالمعروف (ابن کثیر) ای یکون بینهما الصلاح وحسن الصحبة (معالم) قال طاؤس ان ظنّا ان کل واحد منهما یحسن عشرة صاحبه (قرطبی)

اِنْ ظَنَّآ یعنی اگر امید و ارادہ بھی رکھتے ہوں، باقی یقین کے ساتھ مستقبل کا حال کون جان سکتا ہے۔

ای رجوا لان احد الا یعلم ما هو کائن الا الله عز وجل (معالم) ای متی حصل هذا الظن حصل لهما العزم علی اقامة حدود الله حسنت هذه المراجعة (کبیر) ای ان کان فی ظنهما انهما یقیمان حقوق الزوجیة (مدارک) ومن فسر الظن هٰهنا بالعلم فقد وهم من طریق اللفظ (کشاف)

۸۶۵ اہلِ فہم و دانش کے لئے، ان لوگوں کے لئے جو احکام و اوامرِ الٰہی کا علم رکھتے ہیں۔

یعنی یعلمون ما امرهم الله تعالٰی به (معالم) یرید من له عقل وعلم (کبیر) ای یفهمون ما بیّن لهم (مدارک)

حُدُوْدُ اللّٰهِ یعنی اللہ کے احکام و قوانین۔

ای احکامه وشرائعه (ابن کثیر)

۸۶۶ یعنی وہی ایک بار یا دو بار دی ہوئی طلاق رجعی، جو ابھی قطعی نہیں ہوئی ہے اور جب ابھی رجوع کر لینے کی گنجائش

۸۶۷ (لیکن وہ مدت ابھی پوری گزر چکی نہ ہو)

یعنی زمانۂ عدت اب ختم ہونے ہی پر ہو، لیکن پوری طرح ختم ہو چکا نہ ہو، ورنہ بالکل ختم ہو جانے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اب کوئی گنجائش ہی رجعت کی نہیں باقی رہتا۔

بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ۔ المراد مقاربة البلوغ والاشراف علیه لا حقیقته (جصاص) المراد مقاربته دون انقضائه ونظائره کثیرة فی القرآن واللغة (جصاص) معناه قارب البلوغ (ابن العربی) معنی بلغن قاربن باجماع من العلماء (قرطبی) ای آخر عدتهن وشارفن منتهاها۔ (مدارک)

اَجَلَهُنَّ۔ اجل کا اطلاق ساری مدت پر بھی ہوتا ہے اور آخر مدت پر بھی۔

والاجل یقع علی المدة کلها وعلی آخرها وکذلک الغایة والامد (کشاف) ویقع فی البلوغ ابدا

وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ

اور اُن کو تکلیف پہونچانے کی غرض سے نہ روکے رہو ۷۶۹ اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم

نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ

کرے گا ۷۷۰ اور اللہ کے احکام کو ہنسی (کھیل) نہ سمجھو ۷۷۱ اور اللہ کی نعمتیں اپنے اوپر یاد

عَلَيۡكُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ

کرو ۷۷۲ اور (اس) کتاب و حکمت کو بھی جو اس نے تم پر اتاری ہے کہ اس سے وہ تمہیں نصیحت کرتا رہتا ہے ۷۷۳

يقال بلغ البلد اذا شارفه وداناه (کشاف) جعل لفظ بلغ بمعنى قارب كما يقال اذا بلغت مكة فاغتسل (ابن العربی) والاجل يقع على المدة كلها وعلى آخرها (مدارک)

۷۶۸ یعنی جب وہ مطلقہ اپنی مدتِ عدت ختم ہونے پر آ جائے تو شوہر کو اب دو اختیار ہیں یا یہ کہ اپنی اُس مطلقہ بیوی کو پھر شرافت و عزت کے ساتھ اپنی زوجیت میں واپس لے لے اور یا پھر اُسے شرافت و عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کر دے اور مستقل علٰحدگی اختیار کرے — غرض دونوں صورتوں میں سے جو بھی اختیار کی جائے تا کہ شریعتِ اخلاق کے قانون و آداب کے موافق ہو۔

۷۶۹ گویا مطلقہ کی حق تلفی کی گنجائش کسی صورت اور کسی حال میں بھی نہیں — زوجیت میں واپسی اگر ہو تو خانہ آبادی کے لئے ہو نہ کہ خانہ بربادی کے لئے۔

۷۷۰ (اور اپنی زیادتیوں کی سزا دنیا یا آخرت میں بھگتے گا۔)

بیویوں کے حقوق ادا نہ کرنے والے حقوقِ زوجیت میں برابر اور شدید کوتاہیاں کرتے رہنے والے خیال کرتے رہیں کہ ایسوں کے حق میں کیسی کیسی وعیدیں کتاب اللہ میں وارد ہو رہی ہیں — وہ لوگ بھی یہ آیتیں غور کر کے پڑھیں جو اس خیال میں ہیں کہ شریعت نے عورتوں کو حقوق دلانے میں بخل سے کام لیا ہے۔

۷۷۱ (کہ جس پر جی چاہا عمل کیا، اور جسے چاہا یوں ہی چھوڑ دیا)

شریعتِ اسلامی میں حیاتِ اجتماعی و معاشری کا سنگ بنیاد خاندان اور خاندانی زندگی ہے اور خاندان کا کلیدی نقطہ میاں بیوی کے صحیح تعلقات ہیں، اس لئے کہ ایک معنی میں کہنا چاہیے کہ سارے نظامِ معاشرت کی بنیاد یہی حقوق زناشوئی کی ادائی ہے، اور جس طرح بعض بظاہر معمولی بے احتیاطیاں بڑی بڑی سخت بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں بعض جزئی احکامِ شریعت سے بے پروائی بڑے بڑے سخت فتنوں کا دروازہ کھول دیتی ہے — ان دقائق کو سنبھالے رہنا شریعت ہی جیسے حکیمانہ نظام کا کام ہے۔

ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ احکام محض ہزل نہیں، پوری سنجیدگی سے ہر حال میں نافذ ہو جائیں گے، یہ نہیں کہ پہلے تو زبان سے صاف الفاظ میں طلاق دیدی، اور پھر بعد کو یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ یہ تو ہنسی میں کہا تھا، بعض تابعین اسی طرف گئے ہیں۔

۷۷۲ (اور انہیں نعمتوں میں سے آئینِ معاشرت کی یہ مکمل، مفصل، جامع تعلیم بھی ہے۔)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۸۵۴ اور جب تم طلاق

طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ

دے چکو اپنی عورتوں کو، اور پھر وہ اپنی مدت کو پہنچ چکیں ۸۵۵ تو تم انھیں اس سے مت روکو ۸۵۶ کہ

اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

وہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں، جب کہ وہ آپس میں شرافت کے ساتھ راضی ہوں ۸۵۷

۸۵۳ یَعِظُكُمْ بِهٖ. اس سے یعنی اس کے ذریعہ وہ تمھیں نصیحت کرتا رہتا ہے۔

بِهٖ میں ضمیر مَآ اَنْزَلَ کی طرف ہے۔

۸۵۴ (اور چھوٹے بڑے ہر حکم کی مصلحتوں سے بھی وہی خبردار ہے)

وَاتَّقُوْا، وَاعْلَمُوْٓا تقوائے الٰہی اور علم الٰہی کی کاملیت کا استحضار یہی دو تو بنیادیں ہیں ہر عمل صالح اور صالحانہ زندگی کی

۸۵۵ (اور عدت پوری کرکے دوسرے نکاح کی آرزومند ہوں)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ. یہاں یہ خطاب صرف شوہروں سے نہیں، عام امت سے ہے۔

خطابا للاولیاء وللازواج ولسائر الناس والعموم یقتضی ذلک (جصاص)

بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ. یہاں زمانۂ عدت کا قرب ختم مراد نہیں جیسا کہ آیت ماقبل میں تھا، بلکہ عین ختم مراد ہے۔

المراد حقیقۃ البلوغ بانقضاء العدۃ (جصاص) البلوغ ههنا حقیقۃ لا مجازه (ابن العربی)

بلوغ الاجل فی هذا الموضع تناهیه (قرطبی) ای انقضت عدتهن ویدل سیاق الکلامین علی

افتراق البلوغین لان النکاح یعقبه وذا یکون بعد العدۃ وفی الاولی الرجعۃ وذا یکون فی العدۃ (مدارک)

۸۵۶ (جیسا کہ عرب میں بہت سے وقتوں پر اولیاء اور اقرباء کی طرف سے روکنے کا رواج تھا۔)

عَضْل کے معنی منع، حبس کے ہیں۔

معانی عضلوهن وقیل العضل التضییق والمنع وهو راجع الی معنی الحبس (قرطبی) تجوز به

فی کل منع شدید (راغب)

۸۵۷ اَزْوَاجَهُنَّ. یعنی ان کے تجویز کئے ہوئے شوہر، عام اس سے کہ وہ نئے ہوں یا وہی پرانے ہوں جو ایک بار انھیں چھوڑ چکے ہیں۔

ای الذین یرغبن فیهم ویصلحون لهن (مدارک)

یَّنْكِحْنَ. اس لفظ سے معلوم ہوا کہ عورتیں خود بھی اپنا نکاح کرسکتی ہیں، اور یہیں سے حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نکاح بغیر ولی کے بھی جائز ہے۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ

اس (مضمون) سے نصیحت کی جاتی ہے تم میں سے اس شخص کو جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے۸۳۴

اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ

یہی تمہارے حق میں پاکیزہ تر اور صاف تر ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۸۳۵ اور مائیں اپنے بچوں کو

يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ

دودھ پلائیں پورے دو سال ۸۳۶ (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو رضاعت کی تکمیل کرنا چاہے ۸۳۷

من دلیل هذه الآیة من وجوه علی جواز النکاح اذا عقدت علی نفسها بغیر ولی ولا اذن

ولیها احدها اضافة العقد الیها من غیر شرط اذن الولی (جصاص) واحتج بها اصحاب ابی حنیفة

علی ان تزوج المرأة نفسها (قرطبی) وفیه اشارة الی انعقاد النکاح بعبارة النساء (مدارک)

فقہائے حنفیہ نے اس لفظ سے استنباط کیا ہے کہ ایجاب و قبول رکن نکاح ہی ہے اور بات ہے کہ کبھی

بجائے زوجین کے ان کے ولی یا وکیل کردیں۔

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یہ قید ان احکام میں ہر جگہ لگی ہوئی ہے اور کس کثرت سے اس کا اعادہ ہو چکا ہے مقصد یہ ہے کہ کوئی

ادنیٰ سی ادنیٰ بات بھی دین و اخلاق کے قانون کے خلاف نہ ہونے پائے اور ایک صالح معاشرہ کے عین معیار شرافت کے مطابق

ای مما یحسن فی الدین والمروءة من الشرائط۔ (مدارک)

۸۳۴ ان تعلیمات وہدایات کی پوری قدر ان ہی کو ہوگی جو مومن کامل ہیں۔

۸۳۵ دینی حکمتوں اور حقیقی مصلحتوں کا علم حقیقی بس اُن خدائے تعالیٰ کو ہو سکتا ہے یا علم کے ناقص عقل کے ناقص گندے بندے کو؟

اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ۔ یعنی احکام مفید، حکیمانہ، قابل عمل، آسان اور وہ بھی ذاتی و ملی ہر اعتبار سے شخصی، ہر لحاظ

اور اجتماعی مصلحتوں دونوں کے معیار سے۔

دوسرے مذہبوں کے برعکس اسلام جس نظام کو لے کر آیا ہے وہ محض صوفیوں، راہبوں، جوگیوں،

فلسفیوں کے لئے نہیں، صرف نفس کشی و ریاضت کرنے والوں کے لئے نہیں، عامۃ الناس کے لئے ہے اور اس

مادی دنیا کے بھی معاشرتی، اجتماعی، فوائد کا تقاضہ یہی ہے کہ عمل اس کے قانون پر کیا جائے۔

ذٰلِكُمْ۔ ای الاتعاظ به والعمل بمقتضاه۔ (روح)

۸۳۶ رضاعت اصلی حق ماں کا ہے اور ماں سے بہتر کوئی مرضعہ ہو نہیں سکتی، پرانے طبیبوں اور نئے

ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں سب کو اس پر اتفاق کرنا پڑا ہے۔

جعل الام احق برضاع الولد هذه المدة (جصاص)

اَلْوَالِدٰتُ۔ خواہ ان ماؤں کا نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ

اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا موافق دستور کے ۸۸۲ کسی شخص کو حکم نہیں

نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ

دیا جاتا بجز اس کی برداشت کے بقدر ۸۸۳ نہ کسی ماں کو تکلیف پہونچائی جائے اس کے بچہ کے باعث اور نہ کسی

بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ

باپ ہی کو تکلیف پہونچائی جائے اس کے بچہ کے باعث ۸۸۴ اور اسی طرح (کا انتظام) وارث کے ذمہ بھی ہے ۸۸۵ ۸۸۶

اَوْلَادَهُنَّ۔ اس قید نے یہ صاف کر دیا کہ مراد مائیں ہی ہیں، نانیاں دادیاں مراد نہیں، رضاعت کامل کے لئے دو برس کی مدت پر بھی طبیبوں کا اتفاق رائے موجود ہے۔

۸۸۱ یعنی جو پورے نصاب کی تکمیل کسی ضرورت یا مصلحت سے نہ کرنا چاہے اس کے لئے کم مدت کی بھی اجازت ہے اور دودھ بڑھائی دو سال سے قبل بھی ہر سن میں جائز ہے۔

دلیل علی ان ارضاع الحولین لیس حتما فانہ یجوز الفطام قبل الحولین (قرطبی)

۸۸۲ مرضعہ کی تنخواہ اور کھانے کپڑے کی ذمہ داری بہر حال باپ کے سر ہے اور مرضعہ عام حالات میں ماں ہی کو ہونا چاہئے، خواہ وہ مائیں ہنوز قید نکاح میں ہوں یا قید عدت میں۔

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی ملک کے عرف شریفانہ کے موافق، جو کسی قاعدۂ شرعی کے خلاف نہ ہو۔

ای بما یحسن فی الدین والمروۃ (مدارک) ای بما لا یکون مستنکرا شرعا ومروءۃ (روح)

ای بما جرت بعادۃ امثالھن فی بلادھن من غیر اسراف ولا اقتار بحسب قدرتہ فی یسارہ وتوسطہ واقتارہ (ابن کثیر)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کھلانے پہنانے میں مرد کی واجبی حالت کا اعتبار کیا جائے گا، اُسے نہ خست سے کام لینا چاہئے، نہ اسراف کی حاجت۔

یدل علی ان الواجب من النفقۃ والکسوۃ ھو علی قدر حال الرجل فی اعسارہ ویسارہ (جصاص)

ای بالمتعارف فی عرف الشرع من غیر تفریط ولا افراط (قرطبی) بلا اسراف ولا تقتیر۔ (مدارک)

۸۸۳ (اور اس کے قوائے ترکیبی کے مناسب حال)

چنانچہ یہاں بھی رضاعت کا حکم ملا تو ماں کو کہ یہ چیز عورت ہی کے فرائض میں داخل ہے اور مرضعہ کو کھلانے پہنانے کی ذمہ داری رکھی گئی ہے باپ کے سر کہ یہ کمانا اور خرچ کرنا مرد ہی کی زندگی سے مناسبت رکھتا ہے، جزئیات در جزئیات کی رعایت کا لحاظ رکھتے ہوئے آنا یہ انشاء قرآنی کے خصوصیات میں سے ہے۔

۸۸۴ آیت میں تنبیہ ہے باپ اور ماں دونوں کو، باپ کو تو یہ کہ وہ لڑکے کی ماں پر خواہ مخواہ سختی روا نہ رکھے اور ماں کو یہ کہ وہ لڑکے کے باپ سے خواہ مخواہ سخت مالی مطالبے نہ کرے، عدل و اعتدال، توازن جو سارے ہی

فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۚ

پھر اگر دونوں اپنی باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑا دینا چاہیں ۵۵ تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

احکام شریعت میں سرایت کئے ہوئے ہے، یہاں بچے کے ماں اور باپ دونوں کے حق میں کیسا نمایاں ہے۔

۵۵۵ (جب باپ زندہ نہ ہو)

اَلْوَارِثِ. وارث سے فقہی اصطلاح میں وہ قرابت ذی رحم مراد ہے، جو بچہ کا شرعی وارث بنے امام ابوحنیفہؒ اور بعض اور قدیم فقہاء سے یہی معنی مروی ہیں۔

خص الامام ابوحنیفہ هذا الوارث بمن كان ذا رحم محرم من الصبي وبه قال حماد (مدارک)

عند ناس كان ذا رحم محرم منه. (مدارک)

مِثْلُ ذَٰلِكَ. یعنی جس طرح باپ پر بچہ کی ماں کا حفظ حقوق واجب ہے، اسی طرح باپ کے بعد اپنے قریب ترین عزیزوں پر بھی واجب ہے۔

عليه مثل ما على والد الطفل من الانفاق على والدة الطفل والقيام بحقوقها وعدم الاضرار بها (ابن کثیر) وبه قول الجمهور وقد استقصى ذلك ابن جرير في تفسيره (ابن کثیر)

باپ کے ہوتے ہوئے بچہ کی پرورش کا خرچ صرف باپ کے ذمہ ہے، اور جب باپ مر جائے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بچہ مال کا مالک ہے تب تو اسی مال میں اس کا خرچ ہوگا، اور اگر مال کا مالک نہیں ہے تو اس کے مالدار عزیزوں میں جو اس کے محرم ہیں یعنی اس بچہ سے ان کا رشتہ ایسا ہے کہ دونوں میں سے ایک کو مرد اور ایک کو عورت فرض کریں تو باہم نکاح درست نہ ہو، اور محرم ہونے کے علاوہ شرعاً اس کے مستحق میراث بھی ہیں، پس ایسے محرم وارث رشتہ داروں کے ذمہ اس کا خرچ واجب ہوگا، اور ان رشتہ داروں میں ماں بھی داخل ہے، مثلاً ایک ایسے بچہ کی ایک ماں ہے ایک دادا ہے تو اس کے خرچ کا ایک ثلث ماں کے ذمہ ہے، اور دو ثلث دادا کے ذمہ کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچہ کی میراث بھی اسی نسبت سے پا سکتے ہیں۔ (تھانویؒ)

شیرخوار کے مصارف جو دوسروں پر واجب کئے گئے ہیں، اس کی علت یہی ہے کہ بچہ بذات خود اپنی پرورش کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسی اشتراک علت سے فقہاء حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ محتاج عورتوں، اپاہج مردوں اور نابالغوں کے مصارف اُن کے اقارب کے ذمہ ہیں، اور یہی مسلک حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے۔

وقد استدل بذلك من ذهب من الحنفية والحنبلية الى وجوب نفقة الاقارب بعضهم على بعض وهو مروي عن عمر بن الخطابؓ وجمهور السلف. (ابن کثیر)

وَمِثْلُ ذَٰلِكَ. ایک گروہ نے اس سے اشارہ صرف تحریم اضرار کی جانب سمجھا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اور تابعین میں قتادہ و حسن بصریؒ نے اس سے مراد اوپر کے کل احکام لئے ہیں یعنی وجوب نفقہ اور تحریم اضرار دونوں، اور یہی معنی حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہیں۔

اشارة الى ما تقدم فمن الناس من رده الى جميعه من ايجاب النفقة وتحريم الاضرار منهم ابوحنيفة من الفقهاء ومن السلف قتادة والحسن ويسند الى عمر. (قرطبی)

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا

اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو (کسی اور انّا کا) دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ

سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

تم (ان کے) حوالے کردو جو کچھ انہیں تم کو دینا ہے موافق دستور کے ٨٨٧ اور اللہ سے ڈرتے رہو ٨٨٨ اور

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ

جانے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے ٨٨٩ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیبیاں

اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ

چھوڑ جاتے ہیں، وہ بیبیاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن تک روکے رکھیں ٨٩٠

٨٨٦ (تکمیلِ رضاعت سے قبل یعنی دو برس کی مدت کے اندر ہی)

تَرَاضٍ. تَشَاوُرٍ. فقہاء نے لکھا ہے کہ ماں کو جذبۂ شفقت اور حقِ پرورش زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اس قسم کے امور کو محض باپ کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، بلکہ ماں کی رائے اور رضامندی کی بھی شرط لگا دی گئی ہے۔ مفسر تھانویؒ نے کہا کہ باہمی مشورہ کی صورت یہ ہے کہ خود بچہ کی مصلحت پر نظر کرلیں۔

٨٨٧ مقصد یہ ہے کہ بعض دفعہ ماں سے چھڑا کر کسی اور سے رضاعت کرانے کی ضرورت یا مصلحت بھی پیش آجاتی ہے، چنانچہ جب ایسی صورت پیش آجائے تو کسی انّا سے رضاعت کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ بالکل جائز ہے بشرطیکہ اجرت حسب قرارداد ادا کردی جائے۔

بِالْمَعْرُوْفِ یعنی حسب معاہدہ و قرارداد۔ بِالْمَعْرُوْفِ کا نحوی تعلق سَلَّمْتُمْ سے بھی ہوسکتا ہے اور اٰتَيْتُمْ سے بھی۔ متعلق بسلّمتم (کشاف) متعلق بسلّمتم وجوّز ان یتعلق باٰتیتم (روح)

٨٨٨ (سارے احکام و اوامر کے باب میں)

چنانچہ یہاں بھی یہ ہے کہ اجرت نہ دو گے تو گنہگار ہو گے — معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے، قرآن مجید نے سارے دائرۂ زندگی میں قدم قدم پر تقوائے الٰہی کو شمع راہ رکھا ہے۔

٨٨٩ انسان کو بدمعاملگی، بددیانتی پر لانے والی چیز صرف یہی ذہول و غفلت ہے اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا، اس کی ہمہ بینی، ہمہ خبری کا استحضار اگر ہر وقت رہے تو کوئی لغزش ہونے ہی نہ پائے۔ قرآن مجید بار بار اسی جذبہ کو بیدار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی خانگی زندگی کی کسی منزل میں بھی اس طرف سے غافل نہ ہونے پائے۔

٨٩٠ (نکاح اور قریبی مقدمات نکاح سے)

دنیا کے عمرانی اور معاشرتی مسائل میں طلاق کے بعد بیوہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، بیوہ کے ساتھ

فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ

پھر جب وہ اپنی مدت تک پہونچ جائیں ۸۹۱ تو تم پر اس باب میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے بارے میں

اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ (۲۳۴)

کچھ (کارروائی) کریں شرافت کے ساتھ ۸۹۲ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے ۸۹۳

دنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص اعتبار ہی نہیں، بلکہ بعض مذہبوں نے تو ستی وغیرہ کے ذریعہ سے بیوہ کو زندہ ہی جلا دیا ہے۔ اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے، پوری طرح زندہ رہنے کا، شوہر کے بعد بھی اسی طرح زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے اور یہ باب بھی جہاں تک دنیوی برکتوں کا تعلق ہے اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے۔

تربص۔ انتظار کی اس مدت کا اصطلاحی نام عدت ہے۔

طلاق کی عدت پورے تین ماہ کی تھی۔ بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن یا کل ۱۳۰ دن تجویز ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں بیوہ کے لئے بناؤ سنگار سب ناجائز ہے۔ بیوہ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے اور اس پر محدثین و فقہاء کا اجماع ہے۔

[illegible] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] التربص فی [illegible]
وھو الامتناع من الزینۃ [illegible] مصبوغ [illegible] (قرطبی)

۸۹۱ یعنی عدتِ بیوگی ختم ہو جائے۔

وھو عبارۃ عن انقضاء العدۃ (قرطبی) ای انقضت [illegible] (ابن کثیر)

۸۹۲ یعنی جب عدت ختم ہو گئی تو اب نکاح کی تجویز وغیرہ میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اس دوران میں احکام ترکِ زینت وغیرہ کی تعمیل کرانا اعزا و اولیاء کے ذمہ ہے۔

[illegible] ھذہ الایۃ دلیل ان للاولیاء [illegible] والمعروف [illegible] (قرطبی)

[illegible] خطاب عام ہے اہلِ ملت کو یعنی تم پر ایسی بات کے [illegible] میں کوئی گناہ یا حرج نہیں

[illegible] لجمیع المسلمین (روح)

اس طرزِ خطاب سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ کوئی شخص اگر خلافِ شرع کام کرے تو دوسروں پر واجب ہو جاتا ہے کہ بہ شرطِ قدرت اُس کو روکیں، ورنہ یہ بھی گنہگار ہوں گے۔

[illegible] یعنی نکاح اور متعلقاتِ نکاح کی تجویزیں بھی جو شرعاً جائز ہوں۔

بالمعروف۔ جو بھی کارروائی ہو، قانونِ شریعت و آئینِ اخلاق کے باہر نہ ہو۔

[illegible]

۸۹۳ چنانچہ کوئی بات خلافِ شریعت اگر خود کرو گے [illegible] مشرک قوموں نے اپنے خداؤں سے علم کامل اور خبر کی نفی کی ہے [illegible] صفات کے اثبات میں علاوہ دوسری مصلحتوں کے ایک پہلو ردِّ شرک کا بھی رکھا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ

اور تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں کہ تم ان (زیر عدت) عورتوں کے پیغام نکاح کے باب میں کوئی بات اشارۃً کہو یا

فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ

(یہ ارادہ) اپنے دلوں ہی میں پوشیدہ رکھو ۹۹۴ اللہ کو تو علم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے ۹۹۵ البتہ ان سے کوئی

سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ

وعدہ خفیہ (بھی) نہ کرو ۹۹۶ مگر ہاں کوئی بات قاعدہ شرعی کے موافق کہہ دو ۹۹۷ اور عقد نکاح کا عزم اس وقت

النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ

تک نہ کرو جب تک کہ میعاد مقرر اپنے ختم کو نہ پہونچ جائے ۹۹۸

۹۹۴ دوران عدت میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی مرد کسی بیوہ سے نکاح کا ارادہ اپنے دل میں قائم کرے اور زبان پر نہ لائے یا اگر لائے بھی تو محض اشارۃً کنایۃً، صراحت کے ساتھ البتہ یہ بات اس زمانہ میں نہیں۔

۹۹۵ (سو محض تذکرہ کی حد تک رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں) یعنی فطرت بشری ہے کہ جو عورت دل میں بس جاتی ہے مرد اس کا [illegible] کا ذکر ضرور لاتا ہے اور اس کا تذکرہ چھیڑنے کا بہانہ ڈھونڈھا کرتا ہے۔ آیت کا یہ جزء [illegible] اسی فطرت بشری کا ترجمان ہے۔

۹۹۶ دوران عدت میں عورت سے وعدۂ نکاح کر لینا خفیہ [illegible] بھی جائز نہیں [illegible] اسی حکم کی تاکید کے لئے ہے۔

سِرًّا کے معنی [illegible] ظاہر ہیں جمہور مفسرین نے وہی قبول کئے ہیں لیکن ایک مجازی معنی خود نکاح کے بھی ہیں [illegible] نے یہاں اس سے کنایۃً نکاح ہی کا سمجھا ہے۔

[illegible] السدۃ وهو كناية [illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں [illegible] لیکن [illegible] کا بھی ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔

[illegible] جبیر ومالك واصحابه والشعبي ومجاهد وعكرمة [illegible] جمهور اهل العلم [illegible]

اس صورت میں آیت کا ترجمہ [illegible]

۹۹۷ [illegible]

۹۹۸ [illegible] نکاح۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

اور جانے رہو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اُسے جانتا ہے ۸۹۹ سو اس سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ اللہ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٣٥﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ

بخشنے والا ہے بڑا بُردبار ہے ۹۰۰ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اُن بیبیوں کو جنھیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ اُن کے لئے

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ

مہر مقرر کیا طلاق دے دو ۹۰۱ اور انہیں خرچ دے دو وسعت والے کے ذمہ اس کی

وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٣٦﴾

حیثیت کے لائق ہے اور تنگی والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ۹۰۲ (یہ) خرچ شرافت کے موافق ہو (اور یہ) واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر

والمقصود منه المبالغة فی النهی عن النکاح فی زمان العدة فاذا ورد النهی عن العزم فلان یکون النهی مناکداً عن الاقدام علی المعزوم علیه۔ (کبیر)

عزم سے مراد قصد مصمم و قطعی ہے۔

۸۹۹ سو جو اُمور ناجائز ہیں، ان کے ارتکاب کا عزم بھی اس کے علم میں رہتا ہے۔

اللہ اللہ! مسلم خاتون کی حفظِ عصمت اور اس کے جزئیات تک کا اہتمام کس درجہ منظور ہے!

۹۰۰ (سو اگر اس باب میں غلطیاں کر چکے ہو تو اب بھی تلافی و استغفار کا پورا موقع باقی ہے)

غَفُوْرٌ۔ چنانچہ توبہ کے بعد نافرمانوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

حَلِيْمٌ چنانچہ بہت دفعہ نافرمانوں کو سزا نہیں دیتا، بلکہ مہلت دے دیتا ہے۔

۹۰۱ یعنی کوئی بازپرس نہیں مہر کے باب میں۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں شوہر کے ذمہ مہر واجب بھی نہیں۔

لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ۔ یہاں مَسّ سے مراد ہم بستری کی دونوں قسمیں ہیں، حقیقی اور واقعی، حکمی اور فقہی (یعنی خلوتِ صحیحہ) طلاق ہم بستری کے قبل بھی بالکل جائز ہے۔ بغیر کسی مہر کی ذمہ داری کے نکاح بلا تعیین مہر بھی صحیح رہتا ہے!

۹۰۲ غرض یہ کہ طالقن کو رخصت کرو، تو خالی ہاتھ اور مفلس بنا کر نہیں، بلکہ اپنے حسبِ حیثیت کچھ دے دلا کر۔

مَتِّعُوْهُنَّ کا لفظ قرآن میں عام ہے اور مذاقِ بشری کی ہمہ گیری اس عموم کو چاہتی بھی ہے یعنی اس میں قید کسی تعیین مقدار یا تعداد کی نہیں۔

معناه اعطوهن شيئا يكون متاعا لهن (قرطبی) ای ملکوهن ما یتمتعن به وذلك الشیئ یسمی متعة (روح)

بلکہ امام مالکؒ نے تو صاف صاف یہ قید اُڑا دی ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

اور اگر تم نے انھیں طلاق دے دی ہے قبل اس کے کہ انھیں ہاتھ لگایا ہو، لیکن ان کے لئے کچھ مہر مقرر

فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ

کر چکے ہو تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اُس کا آدھا واجب ہے، بجز اس صورت کے کہ (یا تو) وہ عورتیں خود

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ

معاف کر دیں یا وہ (اپنا حق) معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔۹۰۹

قال مالك ليس للمتعة عند نا حد معروف في قليلها وكثيرها (قرطبی)

اور متعہ کا اطلاق لباس یا لباس کے ایک جوڑے پر محدود نہیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمہ میں ہے "بہرہ دہید ایں چنیں مطلقات را" اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجمہ میں ہے "اور فائدہ دو اُن کو" اور شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں "اور ان کو خرچ دو" البتہ بعض صحابہ سے کچھ اندازے منقول ہیں۔

متعة الطلاق اعلاها الخادم ودون ذلك الورق ودون ذلك الكسوة (روح عن ابن عباسؓ)

ادنى ما يكون من المتعة ثلاثون درهما (روح عن ابن عمرؓ)

فقہاء حنفیہ نے عموماً تین کپڑوں کا جوڑا مراد لیا ہے لیکن یہ جوڑا بھی یقیناً حسب رواج ملک و قوم ہی ہوگا۔

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ ... قَدَرُهٗ۔ خود اسی فقرہ سے وجوب متاع پر دلالت سمجھی گئی ہے۔

دليل على وجوب المتعة۔ (قرطبی)

۹۰۳ اور خوش معاملہ تو سارے مسلمانوں کو ہونا چاہئے اس لئے مُراد ہیں سارے مسلمان، لفظ مُحْسِنِیْن لا کر اُن کے اس وصف کو نمایاں کر دیا ہے۔

والاحسان انما على وجه التاكيد (جصاص) اى على المسلمين (مدارك) حقا تاكيد للوجوب

ومعنى على المحسنين وعلى المتقين اى على المؤمنين۔ (قرطبی)

طلاق کو کچھ مال دے کر ہی رخصت کرنا چاہئے، اور اس وجوب کے قائل متعدد صحابہ و تابعین ہوئے ہیں۔

وحمله ابن عمر وعلى بن ابى طالب والحسن بن ابى الحسن وسعيد بن جبير وابو قلابة والزهرى وقتادة والضحاك بن مزاحم على الوجوب (قرطبی) فهذه التى دلت هذه الآية الكريمة على وجوب متعتها وهذا قول ابن عمر ومجاهد (ابن كثير) وفى هذا دليل على وجوب المتعة مع الامر بها (قرطبی)

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی ایسے شریفانہ عُرف کے مطابق جو شریعت کو بھی تسلیم ہو۔

اى بما عرف فى الشرع من الاقتصاد۔ (قرطبی)

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ

اور اگر تم (اپنا حق) معاف کر دو تو یہ بہت ہی قریب تقویٰ ہے ۹۰۵ اور آپس میں لطف و احسان کو نظر انداز نہ کرو ۹۰۶

۹۰۴ طلاق کی ایک صورت وہ تھی جو ابھی اوپر بیان ہو چکی یعنی نہ مہر طے ہوا تھا اور نہ ابھی خلوت ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی، دوسری صورت اب بیان ہو رہی ہے کہ مہر تو متعین ہو چکا تھا، لیکن خلوت نہیں ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی عام قاعدہ ایسے موقع کے لئے یہ ہے کہ مہر مقرر کا نصف شوہر کے ذمہ واجب الادا ہو گا، لیکن دو صورتیں اس حکم عام سے استثنیٰ کی ہیں ایک یہ کہ بیوی اپنے حق سے تمام تر دستبردار ہو جائے اور نصف بھی نہ لے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر اپنے حق سے دستبردار ہو جائے یعنی جو نصف مہر سے رکھ لینے کا حق تھا اسے بھی وہ نہ رکھے اور بجائے نصف کے پورا مہر ادا کرے۔ تعفون عورت اپنا حق معاف کر دے اور اس کا حق ہے وہی مہر متعین کا نصف گویا عورت مہر تمام ترچھوڑ دے نصف ما فرضتم۔ تعداد مہر اگر معین بھی ہے تو اس کا نصف تو ظاہر ہے، اور اگر تعداد معین نہ تھی تو فیصلہ مہر مثل پر ہو گا۔ (یعنی خاندانی مہر پر)۔

الذی بیدہ عقدۃ النکاح یعنی جو نکاح کی گرہ کو توڑنے اور جوڑے رکھنے کا اختیار رکھتا ہے، مراد شوہر ہے، یہ الفاظ اس پر ناطق ہیں کہ معاہدۂ نکاح میں شریک غالب کی حیثیت شوہر ہی رکھتا ہے۔

وھو الزوج (معالم)

۹۰۵ قانون اور ضابطہ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے کہ شوہر طلاق کی اس صورت میں نصف مہر روک سکتا ہے، اب مکارم اخلاق کے افضل و اعلیٰ مقام کی طرف رہنمائی کر دی گئی کہ حق وصول کرنے سے کہیں بہتر و برتر اس حق کا معاف کر دینا ہے جائز و برتر، مباح و افضل، ضابطہ و اخلاق فاضلہ کا یہ مسلسل امتزاج قرآن کے معنوی معجزات میں سے ہے۔

۹۰۶ چنانچہ طلاق کے موقع پر بھی، جو تعلقات کی بقا کا نہیں ان کے اختتام و انقطاع کے اعلان کا نام ہے، باہمی حسن سلوک، مروّت، رعایت سے نہ چوکو۔

آیت صاف اشارہ ادھر کر رہی ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آ جانے سے صحبت قدیم و رفاقت سابق کے حقوق زائل نہیں ہو جاتے بلکہ حالت طیش و ناگواری میں بھی لحاظ تقویٰ اور حسن اخلاق اور عفو و احسان برابر رکھنا چاہئے۔

ولا تنسوا۔ نسیان یہاں بھول کے معنی میں نہیں کہ وہ تو غیر اختیاری ہے، بلکہ ترک کرنے اور نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ اہل تفسیر اور اہل لغت دونوں نے کہا ہے۔

قال ابو معمر والنسیان ھھنا الترک (ابن قتیبہ)

المراد منہ الترک فقال لا تترکوا الفضل فی ما بینکم (اب) لا تقصدوا الترک والاھمال

(قرطبی) والمراد اھل اللغۃ فسروہ بالترک وھو المشھور المعانی (تاج)

اور نسیان قرآن مجید میں جہاں جہاں ایسے موقع ہجو و ذم میں آ گیا ہے وہاں مراد اسی نسیان اختیاری یا تغافل شعاری سے ہے

وکل نسیان من الانسان ذمہ اللہ تعالیٰ بہ فھو ما کان اصلہ عن تعمد ما عنہ (راغب)

اور خود نسیان یعنی حافظہ سے کسی چیز کے نکل جانے کی تین قسمیں کی گئی ہیں، ایک ضعف قلب سے، دوسرے غفلت سے، تیسرے قصد و ارادہ سے۔

إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ

تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ یقیناً اس کا خوب دیکھنے والا ہے۔ ۹۰۷ (سب ہی) نمازوں کی پابندی رکھو اور (خصوصاً)

الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ ﴿٢٣٨﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا

درمیانی نماز کی ۹۰۸ اور اللہ کے سامنے عاجزوں کی طرح کھڑے رہا کرو ۹۰۹ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو تو تم پیدل ہی (پڑھ لیا کرو)

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾

یا سواری پر ۹۱۰ پھر جب تم امن میں آ جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے جس کو تم جانتے (بھی) نہ تھے ۹۱۱

النسیان ترک الانسان ضبط ما استودع اما لضعف قلبه واما عن غفلة واما عن قصد حتی ینحذف عن القلب ذکره (راغب)

۹۰۷ سو اس کے ہاں تمہاری کوئی سی نیکی بھی کسی درجہ اور کسی موقع کی ہو رائیگاں نہ جائے گی۔ ایک بار پھر یہ خیال میں لے آیا جائے کہ معاملات اور قانونی ضابطوں میں بھی شریعت کے احکام کتنے تاکیدی ہیں اور قرآن ان کی اہمیت کس کس طرح جتلاتا جاتا ہے۔

۹۰۸ اوپر سے ذکر برابر بیویوں کے حقوق کا چلا آرہا تھا اور آگے پھر یہی ذکر چلے گا، درمیان میں احکام نماز سے متعلق آگئے ہیں۔ اس سے اس حقیقت پر کیسی روشنی پڑ رہی ہے کہ اسلام میں معاشرت، معاملات، قانون، اخلاق کے مسائل عبادت سے الگ نہیں اور نظامِ شریعت میں حق کے حقوق اور مخلوق کے حقوق دوش بدوش چل رہے ہیں۔

حافظوا علی الصلوات۔ محققین نے محافظتِ صلوٰۃ کے تین درجے قرار دیے ہیں، ادنیٰ یہ کہ نماز وقت پر پڑھی جائے اور فرض نفل و واجب ترک نہ کیے جائیں، اوسط یہ کہ جسم ہر طرح طہارتِ ظاہری سے آراستہ ہو، طبیعت اکل حلال کی خوگر ہو، دل میں خشوع و خضوع ہو، سنن و مستحبات کی پوری رعایت ہے، اعلیٰ یہ کہ نماز گویا حق تعالیٰ کے مواجہہ میں ہو رہی ہے ایسا حضورِ قلب و استغراق رہے۔

حافظوا۔ محافظت سے مراد پابندی اور ہمیشگی ہوتی ہے۔

والمحافظة هي المداومة على الشيء والمواظبة عليه (قرطبي) يأمر تعالى بالمحافظة على الصلوات في اوقاتها وحفظ حدودها وادائها في اوقاتها۔ (ابن کثیر)

الصلوٰۃ الوسطیٰ۔ اس درمیانی نماز سے کیا مراد ہے؟ اکثر ائمہ تفاسیر نے نمازِ عصر مراد لی ہے اور یہی معنیٰ ابن جریر میں حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ صحابیوں اور قتادہ و ضحاک تابعین اور امام ابوحنیفہؒ و امام نخعیؒ سے مروی ہیں، اگرچہ ابن جریر ہی میں دوسرے قول نمازِ ظہر اور نمازِ مغرب اور نمازِ فجر کے بھی اسی پایہ کے حضرات سے منقول ہیں، لیکن ابن کثیر نے اجماع نقل کیا ہے، اسی عصر والے قول پر۔

قیل انها صلوٰۃ العصر قال الترمذی والبغوی وهو قول اکثر علماء الصحابة وقال القاضی الماوردی هو قول جمهور التابعين.

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیبیاں چھوڑ جائیں (اُن پر لازم ہے) اپنی بیبیوں کے حق میں

لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ

نفع اٹھانے کی وصیت (کر جانے) کی کہ وہ ایک سال تک (گھر سے) نکالی نہ جائیں ۹۱۲

بعض نے لفظی پہلو پر زور دے کر یہ تفسیر کی ہے کہ ہر نماز چونکہ اپنی جگہ پر بعبادات و حسنات کا درجۂ متوسط ہے اور پھر ہر نماز کے ادھر اُدھر کچھ نمازیں بھی ہوتی ہیں، نماز وسطیٰ کا اطلاق ہر نماز پر ہو سکتا ہے، اور اس سے کسی خاص وقت کی نماز مقصود نہیں۔ معاذ بن جبلؓ نے اسے ہر نماز سے متعلق سمجھا ہے، اور نافع ابن عمرؓ نے اسے غیر معیّن چھوڑ دیا ہے۔ (قرطبی) ابن کثیر میں اور اور اقوال بھی نقل ہوئے ہیں۔

۹۰۹ (حالتِ نماز میں)

قَانِتِيْنَ۔ لفظ قنوت یہاں بہت جامع ہے، اور حاوی ہے ذکر اور دعا اور خشوع و خضوع پر۔ "عاجزی" سے ترجمہ میں اس کا صرف ایک ہی پہلو آپاتا ہے۔

قال ابو محمّد ولا ادری اصل هذا الحرف الا الطاعه لان جميع هذه الخصال من الصلوة والقيام فيها والدعاء وغير ذلك يكون عنها (ابن قتيبه) القنوت لزوم الطاعة مع الخضوع وفسر بكل واحد منهما (راغب)

۹۱۰ (جس طرح بھی بن پڑے اور جس حد تک حالات اجازت دیں)

فَاِنْ خِفْتُمْ۔ یعنی اگر عام قاعدہ کے مطابق نماز با جماعت میں کسی دشمن کے حملہ کا خوف ہو۔

اسلام کی یہ روزانہ پنج وقتہ پریڈ یا دربار الٰہی میں حاضری اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ بالکل معاف عین حالتِ جنگ میں بھی نہیں ہوتی، محافظتِ صلوٰۃ کا حکم بہر حال قطعی اور دائمی ہے، ترکِ نماز کی اجازت اس خطرہ کے حال میں نہیں، البتہ رعایتِ ماحول کی پوری گنجائش دوسرے موقعوں کی طرح اس محل میں بھی رکھ دی گئی ہے۔

نمازِ خوف کی تفصیلات کتبِ فقہ میں ملیں گی۔

بعض محققین نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ نمازِ خوف کی اجازت صرف فوجی دشمن ہی سے خطرے کے وقت تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے سارے خطرات پر بھی حاوی ہے۔

وهذه هي صلاة الفذ الذي قد ضايقه الخوف على نفسه في حال المسايفة او من سبع يطلبه او من عدو يتبعه او سيل يحمله وبالجملة فكل امر يخاف على روحه فهو مبيح ما تضمنته هذه الاية (قرطبی) من عدو او غيره (روح)

۹۱۱ یعنی اب نماز عام قاعدوں کے موافق و ماتحت ادا کرو۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ۔ یعنی جب دشمن کی طرف سے اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے۔

۹۱۲ یہ وصیت کا حکم اُس وقت تھا جب میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، جب میراث کے متعلق

فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ مِن

لیکن اگر (خود) نکل جائیں تو کوئی گناہ تم پر نہیں اس باب میں جسے وہ (بیبیاں) اپنے باب میں شرافت کے

مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوفِ ۖ

ساتھ کریں ۹۱۳ اور اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے ۹۱۴ اور طلاق والیوں کے حق میں بھی نفع پہونچانا دستور کے موافق مقرر ہے ۹۱۵

احکام نازل ہوگئے اور شوہر کے ترکہ میں ایک مستقل حصہ بیوہ کا بھی مقرر ہوگیا، تو ظاہر ہے کہ اب حکم وصیت پر عمل کا کوئی محل باقی نہ رہا ـــ اسی کو مفسرین اپنی اصطلاح میں نسخ سے تعبیر کرتے ہیں ـــ اور اسی کو اُردو خوانوں نے اُردو کی منسوخی کے معنی میں لے کر اس پر اعتراضات شروع کردیے ہیں۔

اُس وقت یعنی احکام میراث کے نزول سے قبل شریعت نے بیوہ عورتوں کے لیے حسب ذیل رعایتیں رکھی تھیں:

(۱) وہ اگر شوہر ہی کے گھر رہنا چاہیں تو ایک سال تک انھیں کوئی بے دخل نہیں کرسکے گا۔

(۲) انھیں کھانا کپڑا بھی اس مدت تک شوہر ہی کے ترکہ سے ملتا رہے گا۔

(۳) وہ خود ہی اگر اپنی کسی مصلحت سے اس گھر میں رہنا نہ چاہیں تو بعد ختم عدت ان کے لئے یہ بالکل جائز تھا، اور دوسرے حقوق کی طرح اس حق سے بھی دستبرداری کا انھیں حق حاصل تھا۔

مَتَاعًا۔ یہ نفع اٹھانا، کھانے اور کپڑے اور سکونت مکان کے متعلق ہوگا۔

المتاع عام شامل للانفاق والاسکان جمیعا۔ (روح)

بیوہ غریب ظہور اسلام کے وقت یوں بھی ہر مذہب میں کس مپرسی میں پڑی ہوئی تھی اور عرب جاہلیت میں تو کوئی اس کی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا، اسلام ہی نے آکر دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بیوہ کی عزت اور اس کے حقوق کی نصرت کی ـــ مشرکانہ مذہبوں میں تو بیوگی اور نحوست مترادف تھیں، اور بیوہ کو عمر بھر کی تحقیر و طعن کا ہدف بننا پڑتا تھا۔

۹۱۳ مثلاً یہی نکاح یا نکاح کی بات چیت۔

مِنْ مَّعْرُوْفٍ کی قید نے اسے واضح کردیا کہ وہ کارروائی نہ کسی ضابطہ شریعت کے خلاف ہوگی (مثلاً قانون عدت کی خلاف ورزی) اور نہ کسی آئین اخلاق کے منافی۔

۹۱۴ آیاتِ احکام کا خاتمہ عموماً ایسی ہی تہدیدی یاد دہانیوں پر ہوتا ہے۔

عَزِيْزٌ یاد دلا دیا کہ وہ بڑا قوت والا ہے، سو اس کے حکم کی خلاف ورزی کیسی زبردست نادانی ہے۔

حَكِيْمٌ یاد دلا دیا کہ اس کے احکام سارے کے سارے قریب و بعید، جلی و خفی مصالح بشری ہی کے جامع ہوتے ہیں۔

۹۱۵ (کسی نہ کسی درجہ میں)

مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے، یہ نہ ہو کہ اُسے ننگا بُوچا کرکے بھوکا پیاسا اسی وقت گھر سے نکال دیا جائے، بلکہ ایک مدت تک اس کی آسائش کا خیال اور اُس کی ضرورتوں کی کفالت شوہر کے ذمہ ہے۔ فقہائے حدیث وسنت کی روشنی میں ایک مدت ہی کی مدت مقرر کی ہے کہ اتنی مدت تک کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام شوہر پر واجب ہے،

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ

(یہ) پرہیزگاروں پر واجب ہے ٩١٦ؑ اسی طرح تمہارے لئے اللہ کھول کر اپنے احکام بیان کرتا ہے شاید کہ تم

تَعْقِلُونَ ﴿٢٤٢﴾ ۞ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ

سمجھو ٩١٧ؑ کیا تجھے خبر نہیں ٩١٨ؑ ان لوگوں کی کہ جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے موت سے بچنے

أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا

کے لئے اور وہ ہزاروں ہی تھے ٩١٩ؑ تو اللہ نے اُن سے کہا کہ مرجاؤ ٩٢٠ؑ

مُطلقہ پر اگر تینوں طلاقیں ابھی نہیں پڑی ہیں جب تو یہ حکم متفق علیہ ہے اور اگر پڑ چکی ہیں تو حنفیہ کے ہاں جب بھی یہی حکم ہے۔

٩١٦ؑ عَلَى الْمُتَّقِينَ یعنی مسلمانوں پر کہ اس درجہ میں پرہیزگار ہر مسلمان ہوتا ہے۔

ای متقی الشرک (بحر) علی کل من کان متقیا عن الکفر (کبیر) بمعنی المؤمنین متقین الشرک (معالم)

٩١٧ؑ (اور سمجھ کر ان پر عمل کرو)

مفسر تھانویؒ نے یہاں یہ خوب لکھا ہے کہ ان احکام طلاق وغیرہ میں اِتَّقُوا اللّٰهَ اور حُدُوْدُ اللّٰهِ اور سَمِیْعٌ اور عَلِیْمٌ اور عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ اور بَصِیْرٌ اور خَبِیْرٌ اور هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وغیرہ کا اس کثرت سے آنا جو سب مخالفت پر وعید ہیں یا امر پر دلیل قطعی ہیں کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں، محض مشورہ کے طور پر نہیں ہیں کہ اُن میں ترمیم و تبدیل کا ہمیں حق و اختیار حاصل ہو۔

٩١٨ؑ (اے مخاطب)

اَلَمْ تَرَ عربی میں یہ طرز خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی بڑے اہم اور معروف واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے۔ رویت سے ہمیشہ چشم بصارت ہی سے دیکھنا مراد نہیں ہوتا، بلکہ وہم و تخیل اور غور و فکر اور عقل کی راہ سے بھی ت نعود ش ہ مراد ہوتا ہے اور جب اس فعل کا صلہ الی کے ساتھ آتا ہے تو مقصود کوئی اہم نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے

واذا عدی رأیت بالی اقتضی معنی النظر المؤدی الی الاعتبار (راغب) هذه رؤیة القلب

بمعنی العلم (قرطبی) هذا کلام جری مجری المثل فی معنی التعجب (کشاف)

٩١٩ؑ (عین موقع جہاد پر)

حَذَرَ الْمَوْتِ یہ تشریح ہے اس کی کہ اتنی بڑی تعداد میں اپنے گھروں سے باہر نکل جانا محض امر اتفاقی نہ تھا موت کے خوف سے تھا، ذکر کسی قدیم قوم کا ہے اور اشارہ کسی ایسے واقعہ کی جانب ہے، جو مخاطبین اوّل اہل عرب کے لئے معروف و متعارف تھا ترکیب میں حَذَرَ الْمَوْتِ کو بِحَذَرِ الْمَوْتِ کے مرادف سمجھا گیا ہے۔

مفسرین نے مختلف قوموں اور مقاموں کے نام لئے ہیں، ممکن ہے ان ہی میں سے کوئی صحیح ہو، ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کوئی قوم و مقام ہو، پوری تحقیق انشاء اللہ مستقبل میں آثاریات کا کوئی متعلم کر کے رہے گا، کچھ کام آخر آئندہ کے مفسرین و محققین کے لئے بھی تو اٹھا رہے

ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ

بعد اس کے انھیں جِلا دیا ۹۲۱ بے شک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے ۹۲۲ البتہ اکثر

أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾

انسان ہی شکر ادا نہیں کرتے ۹۲۳

اُلوف الف کی جمع کثرت ہے، اور اس سے مراد کم سے کم دس ہزار کی جماعت ہوتی ہے۔

هذا مبنی علی الالوف للكثرة (كشاف) وهو جمع ... الجمال فی عشرة ... ومنها الوف

... الی عشرة الآف علی ما استظهره الاكثر - (روح)

بہرحال قرآن کا جو اصل مقصد موعظت و تذکیر ہے، وہ قوم و مقام کے ابہام و عدمِ تعیین کے باوجود بھی حاصل ہے۔
عہدِ عتیق کی کتاب حزقی ایل (۳۷: ۱-۱۰) میں ایک روایت بصورتِ کشف و رؤیا اس سے ملتی جلتی موجود ہے۔
سید رشید رضا مصری صاحبِ تفسیر المنار نے یہاں ایک بالکل ہی دوسرا پہلو اختیار کیا ہے اور آیت میں موت (مُوْتُوْا) اور تجدیدِ حیات (فَأَحْيَاهُمْ) دونوں کو محض معنوی و مجازی قرار دیا ہے کہ قوم کی قوم اپنی آزادی و خود مختاری کو کھو کر اور دشمنوں کی غلامی میں آ کر مُردہ ہو گئی تھی، اور پھر اللہ نے اسے نئے سرے سے زندگی یا آزادی بخشی۔

موتوا ای مات بهم بامكان العدو ومنهم ... نكون (ثم احياهم) وانما يكون الاحياء بعد الموت والكلام فی القوم لا فی افراد . ومعنی حياتهم ... الاستقلال ... ومعنی حياة الامم وموتها فی عرف الناس جميعهم معروف (المنار)

اور موت و حیات کے اس مجازی معنی میں یہ استناد خود قرآن مجید ہی کی دوسری آیتوں سے کیا ہے مثلاً اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (الانفال) اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ (الانعام)
بہرحال گنجائش اس تفسیر و تاویل کی بھی ہے، گو بہ تکلف۔

۹۲۰ (وبا سے یا کسی اور طریق سے اچانک وہ سب مر گئے)
یعنی دشمن سے نکل کھڑے ہوئے جان بچانے کو اور حکمِ جہاد کی تعمیل سے جی چراتے ہوئے، لیکن یہ تدبیر کچھ بھی کام نہ آئی، اور اُلٹے موت کا شکار ہو کر رہے۔
فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا مقصود محض اس قول کا نقل کرنا نہیں، مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کر لیا، تو کوئی امر اس میں مانع نہ ہو سکا، اور عمل ہو کر رہا۔ عربی میں یہ اسلوبِ بیان عام ہے۔
المراد انه تعالی متی اراد ذلك وقع من غير منع وتاخير ومثل هذا اعرف مشهور فی اللغة (كبير)

۹۲۱ (اور انھیں مشاہدہ کرا دیا کہ موت و زندگی کا سر رشتہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے، عقل و تدبیرِ انسانی کے ہاتھ میں نہیں، اور اس لئے جہاد یا دوسرے احکامِ شریعت کی تعمیل سے جی چرانا انتہائی سخافت و نادانی ہے)
فقہاء مفسرین نے یہاں طاعون سے فرار کی بحث چھیڑ دی ہے اور فرمانِ نبوی نقل کیا ہے کہ جس سرزمین پر طاعون ہو،

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۴۴)

اور اللہ کی راہ میں قتال کرو ۹۲۴ اور جانے رہو کہ اللہ بڑا سننے والا ہے، خوب جاننے والا ہے ۹۲۵

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا

کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ قرض دے ۹۲۶

وہاں سے بھاگو نہیں، اور جہاں ہو وہاں جاؤ نہیں، اس پر ایک عقلی اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاعون زدہ مقام میں داخل ہونا، اور طاعون زدہ مقام سے نہ ہٹنا، یہ دونوں عملاً متضاد رہے نہیں ہوئیں، اگر طاعون بچنے کی چیز ہے تو وہاں سے ہٹنے کا بھی حکم ملنا چاہیے، اور اگر بچنے کی چیز نہیں، تو اس شہر میں پہونچ جانے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے!

اصل یہ ہے کہ وبا زدہ مقام سے بھاگنے اور ہٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک کو اجازت ملی تو سب ہی بھاگنا شروع کریں گے اور شہر خالی ہو جائے گا، اس بے تحاشا بھگدڑ (PANIC) سے آبادی کو جن مالی، معاشی، تمدنی، اخلاقی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا — وہ بالکل ظاہر ہیں اور بہ کثرت تجربہ و مشاہدہ میں بھی آچکے ہیں پھر ایک طرف یہ عادت اگر ہمت، ثبات، قلب، شجاعت اور باہمی ہمدردی کے منافی ہے تو دوسری طرف اسباب ظاہری پر ضرورت سے زیادہ تکیہ و اعتماد کی دلیل، اور توکل و اعتماد علی اللہ کے منافی، اور ایک مذہبی قوم کے بالکل غیر شایاں ہے، لیکن جہاں وبا ہے اور موت کا بازار دھڑا دھڑ گرم ہے، وہاں بے دھڑک داخل ہو جانا اور احتیاط نہ برتنا، ایک طرف سلسلۂ اسباب ظاہری کو بالکل نظر انداز کر دینا ہے، اور دوسری طرف انسان میں جو درجۂ خوف و اندیشۂ طبعی کا رکھ دیا گیا ہے اس کے مقتضے کو پامال کرنا ہے، ان متضاد پہلوؤں کے درمیان اعتدال و سلامتی کی راہ ڈھونڈھ نکالنا اسلام ہی جیسے حکیمانہ مذہب کا کام تھا، اس نے عقلی اور طبعی دونوں پہلوؤں کی رعایت رکھ کر یہ معتدل و عادلانہ حکم دیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں نہ خواہ مخواہ جاؤ، نہ خواہ مخواہ وہاں سے نکل بھاگو۔

۹۲۲ (چنانچہ انھیں کے فائدہ والے احکام انھیں دیتا رہتا ہے)

بندے کے دل میں اللہ سے متعلق تمام تر محبت ہی کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں، ایسی آیتیں اسی کیفیت کے استحضار کے لیے ہیں۔

۹۲۳ (بلکہ الٹے احکام الٰہی کی مخالفت میں لگے رہتے ہیں)

حکم قتال مثلاً آگے آتا ہے، اس کے قبل ایسی حکایت بیان کرنا جس سے قلوب میں بے خوفی اور اللہ پر اعتماد پیدا ہو، عین تقاضائے حکمت ہے۔

۹۲۴ (اے امت اسلامی)

قَاتِلُوا۔ وَاقْتُلُوا کے بجائے صیغہ مفاعلۃ (قَاتِلُوا) کے لانے سے اشارہ خود بخود ہو گیا کہ قتل کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہو رہی ہے، مسلمان تو صرف جوابی قتال کریں گے۔

فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ کی قید نے واضح کر دیا کہ قتال اپنے نفس کی خاطر نہیں، جاہ و مال کی خاطر نہیں، صرف اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کے لیے ہوگا۔ اسلامی جہاد اپنی اس نوعیت خصوصی کے لحاظ سے محاربات عالم کی تاریخ میں ایک بے نظیر مقام رکھتا ہے۔ اس تمہیدی حکایت کے بعد کہ موت و زیست سب کا آخری سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے، اب حکم ملتا ہے کہ اسی کی

وقف لازم

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ

پھر اللہ اُسے بڑھا کر اُس کے لئے کئی گُنا کر دے ۹۲۷؎ اور اللہ ہی تنگی بھی پیدا کرتا ہے اور فراخی بھی ۹۲۸؎ اور تم سب

تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۹۲۹؎ کیا تجھے خبر نہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی ۹۳۰؎

حکم ہے اُسی کے دین و آئین کی خدمت و نصرت کے لئے، جہاد و قتال میں مشغول ہو جاؤ۔ حکم کی مخاطب اُمّت بہ حیثیت جماعت ہے، افرادِ اُمّت نہیں کہ ہر فردِ اُمّت کا جب جی چاہے تلوار اُٹھا کر اُسے چلانا شروع کر دے۔

۹۲۵؎ (اس لئے اُس پر ہر ایک کا ظاہر بھی عیاں ہے اور باطن بھی)

سَمِيْعٌ۔ وہ خوب سُن رہا ہے جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں دونوں کی باتوں کو۔

عَلِيْمٌ۔ وہ خوب جانتا ہے جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں دونوں کی نیتوں کو۔

۹۲۶؎ یعنی اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرے۔

اي ينفق في طاعة الله (معالم)

جہاد و قتال کا حکم ابھی ملا ہے، قدرۃً سامانِ جنگ کے لئے اُمّتِ اسلامی کو بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی، اس لئے پہلے ہی تدبیر پر امرائے ملّت کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

قَرْضًا حَسَنًا۔ اصطلاحِ قرآنی میں اس لفظ سے مُراد ہر وہ رقم ہے جو دین کی کسی مد میں خرچ ہو، یہاں مراد مصارفِ جہاد ہیں۔

اس ملّی چندہ کو قرض اور پھر قرض حسنہ سے تعبیر کرنا عین محاورۂ عرب کے مطابق ہے کہ اہلِ عرب ہر اچھے معاوضہ والے عمل کو اچھے قرض اور ہر بُرے معاوضہ والے عمل کو بُرے قرض سے تعبیر کرتے تھے۔

والعرب تقول لكل من فعل اليه خيرا قد احسنت قرضي وقد اقرضتني قرضا حسنا (زجاج) قال الزجاج القرض هو كل ما يفعل ليجازي عليه تقول العرب لك عندي قرض حسن وسيئ (كبير)

عرب ایک مشہور تجارت پیشہ قوم تھے، قرض، ربح، تجارۃ، بیع، شراء وغیرہ کے الفاظ اگر ان کی زبان کے جزو بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ایک بددین، اُردو خواں جاہل، قرآن مجید میں "قرض" کا لفظ دیکھ اور اُسے اُردو کے قرضہ پر قیاس کر تمسخر کی راہ سے بولا کہ خدا بھی محتاج ہو گیا ہے، جو اُسے بندوں سے اُدھار مانگنے کی ضرورت پڑی! ــ جہلِ مرکّب بھی انسان کے لئے کیسی لعنت ہے! ــ ؏ مردم اندر حسرتِ فہم درست!

۹۲۷؎ (یعنی اصل استحقاق سے کہیں بڑھا چڑھا کر)

يُضٰعِفَهٗ۔ اس کو، یعنی اس کے اجر و ثواب کو۔

۹۲۸؎ (سو اس کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرنے سے کیوں رُکو، کیوں گھبراؤ۔)

إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا ٩٣١ کہ ہمارے لئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں قتال کریں ٩٣٢

صاف بتا دیا کہ معاشیات کے سارے قوانین اللہ ہی کے مٹھی میں ہیں، اس کی راہ میں خرچ کرنے سے نہ تم مجبور مفلس ہو جاؤ گے۔ قرآن جہاں اسباب ظاہری، مادی ترقی کی رعایت پوری پوری کرتا ہے، وہیں یہ بھی قدم قدم پر یاد دلاتا جاتا ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں مسبب الاسباب اور احکم الحاکمین حق تعالیٰ ہی ہے۔

٩٢٩ (وہ دین کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو جزا دے گا اور نہ خرچ کرنے والوں کو سزا)
وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ. میں قرآن مجید دوہرے پہلو سامنے رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ مراجعت کو یقینی مجوزہ ہو گا کہ مرنے سے معدوم ہو جاؤ گے، ایک دوسرے عالم میں ایجابی و اثباتی طور پر پہونچنا ہے، دوسرے یہ کہ یہ مراجعت اللہ ہی کی طرف ہو گی، کسی اور کی طرف نہیں، جیسا کہ دوسرے مذہبوں میں غلط طور پر فرض کر لیا گیا ہے۔

٩٣٠ (اے مخاطب)

أَلَمْ تَرَ کی معنویت پر ملاحظہ ہو حاشیہ ٨١٩

اَلْمَلَأُ۔ ملاء اسم جمع ہے جیسے قوم یا رہط، مراد مطلق جماعت نہیں بلکہ اہل الرائے یا اہل حل وعقد کی جماعت ہے۔

اَلْمَلَأُ جماعة يجتمعون على رأي (راغب) الملاء من القوم وجوههم واشرافهم. (معالم روح)

الملاء الاشراف من الناس كأنهم ممتلئون شرف (قرطبی)

توریت میں اس موقع پر اسرائیلی بزرگ ہے۔

مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ. ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی تین صدی بعد اور حضرت داؤدؑ سے کچھ ہی قبل کے زمانہ کا ہے، سنہ مسیحی کے آغاز میں ابھی کوئی ہزار گیارہ سو سال کی مدت باقی تھی۔

٩٣١ مراد حضرت شموئیل (١١٠٠ ق م تا ١٠٢٠ ق م) ہیں، ملک شام قدیم میں ایک کوہستانی علاقہ افرائیم کے نام سے تھا، اس کے شہر رامہ میں آپ رہتے تھے۔

٩٣٢ (اور اس امیر کی ماتحتی میں ہم سب منظم ہو کر دشمنوں سے جنگ کریں)
اسرائیلی اس وقت خاص طور پر دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، اور لڑائی میں ان سے مغلوب و عاجز آ چکے تھے، توریت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ حضرت شموئیل نبی اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، اور آپ کے صاحبزادوں میں امارت وسرداری کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔

مَلِكًا۔ عربی میں مَلِك کا لفظ بہت وسیع ہے، ہر صاحب قوت و اقتدار جو اپنے احکام و قوانین نافذ کر سکے مَلِك ہے۔

اَلْمَلِكُ هو المتصرف بالامر والنهى فى الجمهور (راغب) من تولى السلطنة بالاستعلاء على امة او قبيلة او بلاد مطلقة او مقيدة تقبل الملك (اقرب)

اور یہاں مَلِك سے مراد امیر جیش یا سالار لشکر لی گئی ہے، اور یہی سیاق کے مطابق ہے۔

يقيم لنا ملك الجيش (ابن عباس) اى انهض لنا من تصدر عنه تدبير الحرب ونلتقى على امره (بحر)

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا

(نبی نے) کہا کہیں ایسا تو نہیں کہ اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو تم قتال نہ کرو ۹۳۳؎ وہ بولے بھلا

وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا

ہمارے لئے کون سا ایسا سبب ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نہ لڑیں، درآنحالیکہ ہم نکالے جا چکے

وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ

ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے ۹۳۴؎ لیکن جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو وہ (سب) پھر گئے بجز ان میں ایک قلیل تعداد کے ۹۳۵؎

ای اقم لنا امیرا (روح) طلبوا من نبیھم نحو ما کان یفعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من التامیر علی الجیوش۔ (کشاف)

اردو میں رئیس وامیر کے الفاظ، اور سرحدی قبیلوں میں خان کا لفظ ملک کا مرادف ہے۔

توریت میں اس موقع پر "بادشاہ" کا لفظ آیا ہے اور اسرائیلی تخیل میں بادشاہ کے لئے فوج کی سرداری لازمی تھی، اور ہر سردار اعلیٰ کو بادشاہ کہتے بھی تھے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"بادشاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ فوج کی امارت اور سپہ سالاری کرے۔" (جلد ۷ ص ۵۰۱) اور یہ تصریح بھی ہے کہ "فلسطین میں تقریباً ہر بڑا سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا۔" (جلد ۷ ص ۵۰۰)

توریت میں اسی موقع کا بیان ان الفاظ میں ہے:۔

"تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔" (۱۔ سموئیل۔ ۸: ۴ و ۵)

"ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لئے لڑائی کرے۔" (۱۔ سموئیل ۸: ۱۹ و ۲۰)

۹۳۳؎ یہ جب حضرت سموئیل نے کچھ تو اپنی فراستِ ایمانی سے فرمایا، اور کچھ اپنی قوم کی افتادِ طبیعت کے تجربوں کی بنا پر عَسَيْتُمْ أَلَّا تُقَاتِلُوا کے معنی ہیں کہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نہ لڑوگے۔

معنی اتوقع جبنکم عن القتال (کشاف)

هَلْ عَسَيْتُمْ میں هَلْ تاکیدِ کلام کے لئے ہے۔

اراد بالاستفہام التقریر والتثبیت ان المتوقع کائن۔ (کشاف)

۹۳۴؎ وہ لوگ بولے کہ واہ بھلا یہ بھی کہیں ممکن ہے، حکم شرعی سے قطع نظر ہم لوگ انتہائی مظلوم اور ستائے ہوئے بھی تو ہیں ۔ اس دور میں فلسطینیوں کی جو شدید اور بے پناہ یورش اسرائیلیوں پر جاری تھی اور اسرائیلیوں کا ملک جس بے انداز حد تک ان کے ہاتھوں تاراج ہو رہا تھا اس کی تفصیلات قدیم اسرائیلی مؤرخ جوزیفس

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ

اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے ۹۳۶ اور ان لوگوں سے اُن کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے

لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ

طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے ۹۳۷ وہ بولے اُسے ہمارے اوپر کیسے امیری حاصل ہو سکتی ہے!

اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ

درآنحالیکہ ہم اس سے بڑھ کر امیری کے مستحق ہیں اور اُسے مال میں بھی تو وسعت نہیں دی گئی ۹۳۸

کے صفحات اور یہود کی دوسری تاریخوں میں ملتی ہیں توریت بھی ان معرکہ آرائیوں کے ذکر سے خالی نہیں ایک جگہ ہے:۔

"اور وہ جب باہم مقابل ہوئے تو اسرائیلی نے فلسطینیوں سے شکست پائی اور انھوں نے ان کے لشکر میں سے قریب چار ہزار آدمی مارے" (۱۔ سموئیل۔ ۴:۲)

اور دوسری جگہ ہے:۔

"سو فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی، اور ہر ایک اپنے اپنے خیمہ کو بھاگا، اور وہاں نہایت خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرائیلی مارے مارے پڑے اور خدا کا صندوق لوٹا گیا" (۱۔ سموئیل۔ ۴:۱۰)

۹۳۵ آخر اُن کے نبی کا کہا ان کے آگے آیا، اور بنی اسرائیل اتنے دعوؤں کے باوجود پست ہمتی اور بزدلی کا شکار ہو کر رہے، جوزیفس کی مشہور تاریخ آثار یہود میں ہے:۔

"اُن پر دہشت طاری ہو گئی یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے بعض نے زیر زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردن عبور کر گئے" (باب ۶۔ فصل ۶۔ فقرہ ۱)

۹۳۶ (اور اُن کی سزا پر بھی پوری طرح قادر)

الظّٰلِمِيْنَ سے یہاں مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، یعنی اللہ کے نافرمان بندے۔

هم الذين ظلموا بانفسهم عن القتال وترك الجهاد (روح) وعيد لهم على ظلمهم في القعود عن القتال وترك الجهاد۔ (کشاف)

۹۳۷ طالوت بن کش تاریخ میں قوم اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کئے گئے ہیں زمانۂ حکومت ۱۰۲۰ ق م تا ۱۰۱۲ ق م یہ وہی ہیں جن کا ذکر توریت میں ساؤل (SAUL) کے نام سے آیا ہے توریت میں ان کی نصب حکومت کا ذکر حسب دستور طوالت کے ساتھ موجود ہے:۔

"اور خداوند نے ساؤل کے آنے سے ایک دن پیشتر سموئیل کے کان میں کہہ دیا تھا کہ کل اسی وقت میں ایک شخص کو بنی یامین کی سرزمین سے تجھ پاس بھیجوں گا، سو تو اُس پر تیل ملیو کہ وہ میری قوم اسرائیل کا حاکم ہو تا کہ میرے لوگوں کو فلسطیوں کے ہاتھ سے چھڑائے .... سو جب سموئیل ساؤل سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے

قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

(نبی نے) کہا کہ اُسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں منتخب کرلیا ہے ۹۳۹ اور اُسے علم اور جسم دونوں میں کشادگی زیادہ دی ہے ۹۴۰۔

کہا کہ دیکھو یہی شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھے کہا تھا یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا"۔ (۱۔سموئیل ۹: ۱۵۔۱۶)

مَلِكًا۔ یہاں ترکیب میں طالوت سے حال واقع ہوا ہے۔

۹۳۸ حضرت سموئیل نبیؑ کا کہنا بالکل ٹھیک نکلا، اسرائیلی کہاں تو امیر کے تقرر کا خود ہی تقاضہ کررہے تھے، اور کہاں اب جو اس کا خدائی تقرر ہوگیا تو لگے نکتہ چینی بھی کرنے اور کہنے کہ "ایسے شخص کا انتخاب ہو کیوں کر سکتا ہے"۔

فلما بعث لهم ملكا انكروا ذلك وعجبوا (ابن جریر) واستبعد واحق ان يكون هو ملكا عليهم (كبير)

اَنّٰى بمعنی اَیْنَ کا بھی مرادف ہوسکتا ہے اور کَیْفَ کا بھی، حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی کمالِ تعجب، مقصود نبی کی تکذیب نہیں، صرف اُس کے قول پر کمالِ حیرت ہے۔

كيف ومن اين، وهو انكار لتملكه عليهم واستبعاد له (كشاف) الاستفهام بمعنى او للتعجب لا لتكذيب نبيهم (روح) اى من اى جهة (قرطبی)

ایک خاص قبیلہ کی طرف سے اعتراض و انکار کا ذکر توریت میں بھی ہے:۔

"بنی بعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا اور اس کی تحقیر کی اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے"۔ (۱۔سموئیل ۱۰: ۲۷)

بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کی بارہ اولادوں کی نسل تھے، اسی بنا پر بارہ فرقوں یا قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بنی یامین کا تھا، اور توریت میں تصریح ہے کہ طالوت اسی قبیلہ سے تھے (۱۔سموئیل ۹: ۲۱) تو ایک وجہ تو ان کے حقیر سمجھے جانے کی یہی ہوئی۔

نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے تو ہندؤں کی طرح ذات پات کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے، اسرائیلیوں کا بھی اب یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ نبوت حق مخصوص ہے قبیلہ بنی لاوہ کا اور حکومت حق مخصوص ہے قبیلہ بنی یہوداہ کا۔

وكان فى بنى اسرائيل سبطان سبط نبوة وسبط مملكة ولم يكن طالوت من سبط النبوة ولا من سبط المملكة۔ (ابن جریر)

جیسے آج عام ہندؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص جو نہ برہمن ہو نہ چھتری وہ اعلیٰ حاکم و سردار کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا اعتراض اسرائیلیوں کا یہ تھا کہ یہ مالی اعتبار سے بھی تو منصب امارت کے لائق نہیں — جیسے ہندو کسی کے متعلق یہ اعتراض کریں کہ یہ برہمن اور چھتری نہ سہی یہ شخص ویش (مہاجن یا ساہوکار) کے درجہ کا بھی تو نہیں۔

۹۳۹ (اور اللہ کا انتخاب ظاہر ہے کہ ہر طرح پُر حکمت و پُر مصلحت ہی ہوگا)

حضرت شموئیل نبیؑ نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب انسانی نہیں خدائی ہے اس لئے ہر طرح یہی مناسب و پُر مصالح ہے البتہ تمہارا تو ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک نہیں پہونچ سکتا۔ ع: پیمبر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

توریت میں اس مقام پر ہے:۔

"اور سموئیل نے جماعت کو کہا کہ تم اُسے دیکھتے ہو کہ جسے خداوند نے چن لیا کہ اس کے مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں"۔ (۱۔سموئیل ۱۰: ۲۴)

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ

اور ان سے اُن کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کا نشان یہ ہے ۹۲۳ کہ تمہارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا

فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ

جس میں (سامان) تسکین تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے ۹۲۴ اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں آل موسیٰؑ

۹۲۳ (یا وہ غیبی نصرت جو تمہارے اطمینان کا کام دے سکے)

کچھ عجب نہیں جو بنی اسرائیل نے اپنی قدیم اعجوبہ پرستی کی بنا پر طالوت کے لئے کسی غیبی نشان کا مطالبہ اپنے پیمبر سے کیا ہو اور وہ اس کے جواب میں بہ ایماءِ الٰہی یہ فرما رہے ہوں۔

نَبِيُّهُمْ۔ نَبِيٌّ۔ نَبَأ سے مشتق فعیل کے وزن پر ہے۔ لفظی معنی خبر دینے والے کے ہیں۔ صیغہ مبالغہ کا ہے۔ پیمبر کو اصطلاحِ شریعت میں نبی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے خبر پہنچانے والا ہوتا ہے۔

فعیل بمعنی فاعل للمبالغۃ من النبأ لانہ انبأ عن اللہ (نہایہ)

اور نبوۃ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفارت کا نام ہے جس سے بندوں کو امورِ معاد و معاش میں تعلیمِ الٰہی حاصل ہو۔

سفارۃ بین اللہ وبین ذوی العقول من عبادہ لازاحۃ علتھم فی امر معادھم ومعاشھم (راغب)

۹۲۴ (دراں حالیکہ تم مدت دراز سے اپنی اس متاعِ عزیز سے محروم ہو)

یاتیکم۔ یعنی از خود بغیر تمہاری کسی خاص جد و جہد کے آجائے گا۔

التَّابُوتُ۔ اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام تابوتِ سکینہ ہے۔ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی و قومی ورثہ تھا اس کے اندر اصل نسخۂ توریت مع تبرکاتِ انبیاء محفوظ تھا۔ اسرائیلی اس کو انتہائی برکت و تقدیس کی چیز سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا موجودہ علماءِ یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش حسب ذیل تھی:۔

طول ۲½ فٹ عرض ۱½ فٹ بلندی ۱½ فٹ

بنی اسرائیل اپنی ساری خوش نصیبی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ مدت ہوئی فلسطینی اُسے اُن سے چھین لے گئے تھے۔ اسرائیلی اُسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بدطالعی سمجھ اس کی واپسی کے لئے نہایت درجہ بیتاب و مضطرب تھے۔

فقہائے مفسرین نے اس آیت سے اس کی دلیل حاصل کی ہے کہ بداعمالی اور نافرمانی کرتے رہنے سے قوم دنیوی نعمتوں سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

وھذا ادل دلیل علی ان العصیان سبب الخذلان وھذا بیّن۔ (قرطبی)

طالوت کے وقت میں یہ تابوت واپس آ جانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمانؑ (متوفی ۹۳۳ ق م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں اُسے بھی رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکلِ سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔

وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ

اور آل ہارون چھوڑ گئے ہیں ۹۴۵ اس (صندوق) کو فرشتے لے آئیں گے ۹۴۶ بے شک اس واقعہ میں تمہارے لئے

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ

ایک نشان ہے ۹۴۷ اگر تم ایمان والے ہو پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر بڑھے تو بولے ۹۴۸

سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی توریت کا نسخۂ شفا۔

۹۴۵ یعنی ان دونوں حضرات اور ان کی مقدس اولاد کے آثار و تبرکات۔
بعض اہل طریق نے کہا ہے کہ اولیاء اللہ کے احترام کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے اس کی اصل و سند اس قصۂ تابوت سے مل جاتی ہے۔

۹۴۶ تاریخ کا بیان ہے کہ فلسطینی اس تابوت سکینہ کو چھینے کو تو چھین لائے لیکن جس تاریخ سے اسے لے کر آئے ایک دن بھی چین نہ اٹھانے پائے، کبھی وبا کا زور ہے، کبھی کوئی اور مصیبت، آخر عاجز آ کر یہ طے کیا کہ (نعوذ باللہ) اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھنکوا دیا جائے، ایک بیل گاڑی پر اسے لادا، گاڑی کو بغیر کسی گاڑیبان کے یوں ہی ہانک دیا، بیل سیدھے علاقۂ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہو گئے، اور گاڑی صوبۂ یہوداہ کے شہر بیت شمس میں آ کر ٹھہر گئی۔
تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ کوینی تصرفات جتنے بھی ہوتے رہتے ہیں، سب فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتے رہتے ہیں، چنانچہ بیلوں کا رخ خاص اسرائیلی علاقہ کی جانب کر دینا بھی فرشتوں ہی کا کام تھا، اور یہی غیبی نشان تھا طالوت کی تائید میں۔ بائبل میں تابوت سکینہ کی بازیابی عہد طالوت سے بہت پیشتر درج ہو گئی ہے، قرآن مجید نے یہاں یہ تصریح کر کے حسب معمول بائبل کے بیان کی تصحیح کر دی۔ — مسیحیوں اور ان کے حلیفوں کی یہ کوشش جس قدر مضحکہ خیز ہے اسی قدر عبرت انگیز بھی کہ بجائے اس کے کہ قرآن جیسی محکم محفوظ مستند دستاویز کو بائبل پر پیش کریں، اور اس کی روشنی میں بائبل کے بیانات کو جانچیں، پرکھیں، الٹے بائبل جیسی مشتبہ غیر محفوظ بے سند تحریر کی روشنی میں قرآن مجید کے بیانات کو جانچنا، پرکھنا چاہتے ہیں، گویا آفتاب کی روشنی میں لالٹین کو دیکھنے کی بجائے لالٹین سے آفتاب کے دیکھنے کی کوشش۔

۹۴۷ (نصرت غیبی کا)
فِيْ ذٰلِكَ یعنی اسی واپسی تابوت کے واقعہ میں۔
ای فی رجوع التابوت الیکم (مدارک) ای فی اتیان التابوت (بحر)
لَكُمْ تمہارے لئے، یعنی تمہارے اطمینان کے لئے۔

۹۴۸ (اپنی فوج والوں سے)
فَصَلَ۔ یعنی دشمن کے مقابلہ میں بڑھے۔

۹۴۹ (صبر و ثبات، ضبط اور ڈسپلن میں)
نَهَرٍ۔ دریا سے یہاں مراد دریائے یردن (JORDAN) ہے یہ دریا ویسے براہ راست لمبائی کل ۶۵ میل کی ہے البتہ اس کے خم و پیچ ملا کر کوئی ۲۰۰ میل کی ہے، علاقۂ فلسطین میں اہم ترین دریا یہی ہے اور گویا ملک کی

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ

کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ سے لینا چاہتا ہے ۹۴۹ سو جو کوئی اس میں سے پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہے ۹۵۰

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ

اور جو کوئی اُسے نہ چکھے سو وہی میرا ہے، مگر ہاں جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے (اس کا مضائقہ نہیں) ۹۵۱

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ

لیکن ان (سب) نے اس سے پی لیا بجز ان میں تھوڑے سے آدمیوں کے ۹۵۲ پھر جب طالوت خود اور مومنین بھی ان کے

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ

ساتھ اُس (دریا) سے اُتر گئے تو وہ لوگ بولے کہ آج تو ہم میں جالوت اور اُس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں ۹۵۳

قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے چنانچہ یردن کے اِس پار اور اُس پار علاقوں کی تقسیم خود توریت میں درج ہے (یوشع۔ ۱: ۱۴ و ۱۵) اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی جانب ہے اور یہ بحر جلیل اور بحر طبریہ ہوتا ہوا بحر مردار (DEAD SEA) میں جا گرتا ہے، اس کا پانی سرچشمہ میں تو صاف، شفاف، شیریں ہے لیکن آگے چل کر گندلا، بدبودار اور مضر صحت ہو جاتا ہے۔

۹۵۰ یعنی میرے ہمراہیوں رفیقوں میں سے نہیں یہ معنی نہیں کہ وہ سرے سے ایمان ہی سے خارج ہو گیا۔

ای من اشیاعی (روح) لیس من اتباعی واشیاعی (مدارک) لم یرد بہ نفی الایمان (معر)

سوف منہ۔ یعنی جی بھر کر اُس میں سے پانی پی لے گا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ موسم گرمی کا تھا، اور طالوت کے سپاہیوں کو پیاس قدرۃً زور کی لگی ہوئی تھی۔

۹۵۱ معلوم ہوتا ہے کہ اصل حکم تو یہی پہلا تھا کہ کوئی راستہ میں یہ پانی زبان ہی پر نہ رکھے، اور یہ دوسرا حکم بطور رخصت و اجازت تھا کہ خیر ایک آدھ چلّو سے تھوڑا تر کر لینے میں مضائقہ نہیں۔

مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ۔ طعام یہاں چکھنے کے معنی میں ہے۔

ای من لم یذقہ (روح) من لم یذق منہ من طعم الشئ (مدارک) یقال طعمت الشئ ای ذقتہ (قرطبی)

اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ۔ یعنی چلّو بھر لی لینے میں مضائقہ نہیں۔

معناہ الرخصۃ فی اغتراف الغرفۃ بالید دون الکرع (مدارک)

۹۵۲ (کہ ان کی تعداد حسب روایت توریت چھ سو تھی)

"تب ساؤل نے ان لوگوں کو جو اُس کے پاس حاضر تھے گنا اور وہ مرد چھ سو کے قریب تھے۔" (۱۔ سموئیل۔ ۱۳: ۱۵)

شَرِبُوْا مِنْهُ۔ یعنی خوب سیر ہو کر پیا جس کے بعد چلنا خصوصاً فوجی مارچ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

۹۵۳ (بہ نظر احوال ظاہر)

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

اور وہ لوگ جنہیں یقین تھا کہ اللہ کے روبرو پیش ہوں گے ۹۵۴ بولے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

پر اللہ کے حکم سے غالب آگئی ہیں ۹۵۵ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۹۵۶

چہ میگوئیاں آپس میں ہونے لگی، دشمن کی کثرتِ تعداد اور اس کی عظمت و سامان پر نظر کر کے اس کی ہیبت زدہ ہو جانا اور اپنی طرف سے مایوس ہو جانا ایک امر طبعی تھا، اچھے اچھے اہلِ ایمان کی بھی ہمت ایسے موقع پر طبعی طور پر چھوٹ جاتی ہے، جو زیفس اسرائیلی کی تاریخ آثار یہود میں ہے:۔

"طالوت اور اس کے لشکری یہ سامان دیکھ کر سہم اٹھے" (باب ۶-۹: ۱)

خود توریت کی روایت ہے:۔

"جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اس فلسطی کی بات سنی تو ان کی دلاوری نکل گئی اور وہ نپٹ ڈر گئے" (۱ سموئیل ۱۷: ۱۱)

جالوت فلسطینیوں کے لشکر کا مشہور سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا، انسان کیوں تھا گویا دیو زاد تھا، توریت میں اس کی جسامت، قد و قامت اس کی شہ زوری اس کے ہتھیار اور اس کی بہادری کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قد ۹ فٹ کا تھا بجز چہرہ کے سر سے پیر تک آہن پوش رہتا تھا، اور اس کی سپر کا وزن کوئی تین من کا تھا۔

ھُوَ ضمیر ھُوَ کا استعمال جو بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے تاکید کلام کے لئے ہے۔

ھو توکید۔ (قرطبی)

۹۵۴ (آخرت میں)

لشکر طالوت میں مؤمن تو سب ہی تھے، بہتوں پر لشکرِ جالوت کی ہیبت طبعی طور پر طاری ہو گئی لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا ایمان خدا اور آخرت پر بالکل پختہ و غیر متزلزل رہا، اس وقت بھی ان کے ذہن میں یہ عقیدہ مستحضر تھا اور وہ ہنگامی طور پر بھی مرعوب، و دہشت زدہ نہ ہوئے بلکہ بڑے استقلال کے ساتھ بولے۔

یَظُنُّوْنَ ظن یہاں گمان کے معنی میں نہیں علم و یقین کے معنی میں ہے۔

ای یعلمون ویتیقنون (ابن عباسؓ) ای یوقنون بالشہادۃ (مدارک) یحتمل ان یکون الظن بمعنی الایمان ای یوقنون بالبعث والرجوع الی اللہ قالہ السدی (بحر) قال کثیر من المفسرین انہم یعلمون ویوقنون الا انہ اطلق لفظ الظن علی الیقین علی سبیل المجاز (کبیر) والظن ھنا بمعنی الیقین (قرطبی)

آخرت کا یقین اور اس کا استحضار دلوں میں ہر طرح جرأت و ثبات و بے خوفی پیدا کر دیتا ہے۔

۹۵۵ (اس لئے دشمن کی کثرتِ تعداد سے خوف ہی کیا۔)

ان مؤمنینِ راسخین نے اس وقت بھی کہا کہ اصل شے تو ایمان کی مضبوطی ہے ایمان سے لبریز اقلیت بارہا اکثریت پر غالب آچکی ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابل آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہمارے اوپر صبر ڈال دے

وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں غالب کر کافر لوگوں پر ۹۵۷

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

پھر انھوں نے اُن کو اللہ کے حکم سے شکست دے دی ۹۵۸ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا ۹۵۹

بِاِذْنِ اللّٰهِ میں اذن، مشیتِ تکوینی کے معنی میں نہیں، حکم و توفیقِ الٰہی کے معنی میں ہے۔

ای بحکمه وتیسیره (روح)

بِاِذْنِ اللّٰهِ کی قید نے اسے بھی واضح کر دیا کہ مقابلہ میں اہم ترین شے ذاتی ہمت و شجاعت نہیں بلکہ تائیدِ غیبی ہوتی ہے۔

۹۵۶ (اس لئے اہم و مقدم شے صبر و ثبات و اعتماد علی اللہ ہے)

مَعَ سے اللہ کی معیتِ جسمانی مراد نہیں، اس کی معیتِ نصرت و امداد کے ساتھ مراد ہے۔

المراد معیه بالنصر والاحسان (روح) ای بالنصر (مد) مراد به معیة نصره وتوفیقه (ابو سعود)

۹۵۷ ان دونوں آیتوں میں اللہ کے لشکر کے سپاہیوں کو آدابِ جنگ کی تعلیم ہے کہ بخلاف عام دنیوی سپاہیوں کے ان کا تکیہ قوت و شوکت پر نہیں، بلکہ نصرتِ الٰہی پر ہوتا ہے۔

قرآن اور توریت موجودہ کے بیانوں کا مقابلہ کر دیا جائے تو ثابت نفس جنگ کے خشک خارجی واقعات کی تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے لیکن وہ بس اسی پر قانع ہے گویا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے قرآن مجید اس کے برخلاف ہر موقع پر تعلیم اصولِ دین اور اخلاقِ عالیہ کی دیتا جاتا ہے، اور یہی اُس نے یہاں بھی کیا۔

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا۔ یعنی ہمیں ثباتِ قلب کی توفیق دے۔

ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا۔ یعنی ہمیں ثباتِ قدم نصیب کر۔

وَانْصُرْنَا۔ ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم کے بعد کافروں پر غلبہ تو قدرتی نتیجہ کے طور پر شاید حاصل ہو ہی جاتا لیکن مومنین عارفین کی نظر اپنے سارے انتظامات اور ساری سعی سے کہیں بڑھ کر تائیدِ الٰہی پر رہتی ہے اس لئے صراحت کے ساتھ فتح و غلبہ کی دعا بھی اُن کی زبان سے نقل کی گئی۔

۹۵۸ فَهَزَمُوْهُمْ۔ انھوں نے انھیں یعنی طالوت کے لشکر نے جالوت والوں کو شکست دے دی۔

اِذْن۔ یہاں بھی حکم و توفیق کے معنی میں ہے۔

ای بارادته انهزامهم (روح)

توریت میں فلسطیوں کی اس شکستِ فاش کی منظر کشی یوں کی گئی ہے:۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا

اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی اور جو کچھ چاہا انھیں سکھایا ۹۶۰ ؎ اور اگر اللہ

دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ

بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو روئے زمین پر فساد برپا ہو جاتا ۹۶۱ ؎ لیکن اللہ تو جہان

لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے ۹۶۲ ؎

"اور فلسطیوں نے جو دیکھا کہ ان کا پہلوان مارا پڑا تو بھاگ نکلے اور اسرائیل اور یہوداہ کے لوگ اُٹھے اور للکارے اور فلسطیوں کو وادی تک اور عقرون کے پھاٹک کی راہ تک رگیدا" (۱۔ سموئیل۔ ۱۷: ۵۲)

۹۵۹ ؎ داؤدؑ۔ داؤد بن یسی بن عوبید (۱۰۳۳ ق م تا ۹۶۳ ق م) ایک پیغمبر برحق ہوئے ہیں، قرآن مجید میں آپ کا ذکر سولہ مقام پر آیا ہے، طالوت کی فوج میں محض ایک نوجوان کی حیثیت سے شامل تھے، اس وقت تک نہ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے، نہ ملک و سلطنت سے، توریت میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ درج ہے:۔

"اور ایسا ہوا کہ جب فلسطی اُٹھا اور آگے بڑھ کر داؤد کے مقابلہ کے لئے نزدیک ہوا تو داؤد نے جلدی کی اور صفوں کی طرف داؤد سے مقابلہ کرنے دوڑا، اور داؤد نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک پتھر لیا اور فلاخن میں دھر کے فلسطی کے ماتھے پر ایسا مارا کہ وہ پتھر اُس کے ماتھے میں غرق ہو گیا، اور وہ زمین پر منہ کے بل گر پڑا، سو داؤد ایک فلاخن اور ایک پتھر سے اُس فلسطی پر غالب ہوا، اور اس فلسطی کو مارا اور قتل کیا" (۱۔ سموئیل ۱۷: ۴۸۔ ۵۰)

۹۶۰ ؎ (یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا)

اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ۔ یہ بادشاہی خدا کی عطیہ تھی جیسے تو اسی کو قرآن نے نمایاں کیا، یہ فرمانروائی قوم اسرائیل کو عطا ہوئی تھی حضرت داؤدؑ نسل اسرائیلی کے دوسرے بادشاہ ہیں، تاجدار اول طالوت تھے، آپؑ انھیں کے داماد تھے طالوت جب مع اپنے بڑے فرزند کے میدان جنگ میں کام آگئے تو قبیلۂ یہودا نے داؤدؑ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپؑ ہی پر اتفاق کر لیا، سات سال تک آپؑ نے اپنا پایۂ تخت حبرون (یعنی الخلیل) کو رکھا اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال کر اُسے دار السلطنت بنایا، آپؑ نے اپنے گرد و پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا، اور اپنے حدودِ سلطنت کو خوب وسیع کیا، آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات اور حسن انتظام دونوں کے لئے یادگار ہے۔

الْحِكْمَةَ حکمت سے یہاں مراد نبوت ہے، جو حکمت کا بلند ترین مقام ہے، حکمت کے عام معنی تمیز و دانائی بھی مراد ہو سکتے ہیں

قیل الحکمة العلم والعمل بها وقد رها بعضهم بالنبوة (معالم) التنزیل) ساوی العلمہ بہ وضع الامور مواضعها علی الصواب الصلاح وکمال هذا المعنی یحصل بالنبوة فلا یبعد ان تکون المراد ههنا النبوة (کبیر)

عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ۔ علوم انبیاء کا احاطہ کون کر سکتا ہے؟ مِمَّا يَشَآءُ کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون صنعت آگئے

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم انہیں آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک ۹۶۳ اور آپ یقیناً مرسلین میں سے ہیں ۹۶۴

جو حضرت داؤد کو سکھا دیے گئے تھے۔

یشاء گو صیغہ مضارع ہے، مگر معنی ماضی کے دیتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے۔

ای مماشاء وقد ۔ جمع المستقبل موضع الماضی (قرطبی)

مِمَّا میں مِن تبعیضیہ نہیں، ابتدائیہ ہے۔

۹۶۱ (غلبۂ بدی و بدکاری سے)

بعضھم یعنی مفسدوں، نافرمانوں، قانون شکنوں، باغیوں کو۔

ببعض یعنی دوسرے بندوں کو مشیت تکوینی کا آلۂ کار بنا کر۔

یہاں یہ عام قانون بتا دیا کہ دنیا میں حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوا کرتے ہیں یہ یوں ہی بلا ضرورت و مصلحت "گردش گردوں" سے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ہمیشہ بامقصد و پرحکمت ہی ہوا کرتے ہیں، اور ان سے ظلم و عصیان وطغیان کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے۔

آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس عالم اسباب میں مشیت تکوینی جو کام بھی لیتی ہے بندوں کے واسطہ اور ذریعہ سے لیتی ہے۔

۹۶۲ (اس لئے وہ اپنے فضل و کرم سے روئے زمین پر اس فساد عظیم کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا اور بدکاروں اور نافرمانوں کے غلبہ و تسلط کو نیک کاروں، فرماں برداروں کے ذریعہ سے ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے)

غرض یہ ہر ایسے انقلاب حکومت کے عقب میں رحمت الٰہی ہی کام کرتی رہتی ہے۔

۹۶۳ (اور غرض صحیح کے ساتھ)

بالحق یعنی بالکل بے کم و کاست، اپنی اصلی حالت میں، اور غرض صحیح کے ساتھ۔

بالیقین الذی لایشك فیہ اھل الکتب (مدارك) بالوجہ المطابق الذی لایشك فیہ اھل الکتب وارباب التواریخ (بیضاوی) ای ملبسة بالیقین الذی لایرتاب فیہ احد من اھل الکتب وارباب التواریخ۔ (ابوسعود)

گویا یہاں یہ ظاہر کر دیا کہ صحیح و مستند بیان صرف قرآن ہی کا ہے، دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح اس کے قصے غلط سلط اور مسخ شدہ ہو کر نہیں رہ گئے ہیں، اور اس کی ایک مثال خود یہی قصۂ طالوت ہے، بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

۹۶۴ (پس آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک نہ کیجئے، ان حقائق کا نزول پیغمبروں ہی پر ہوتا ہے)۔

المرسلین لفظ مُرسَلین کی معنویت قابل غور ہے، انبیاء کی حیثیت اسلام میں تمام تر قاصدوں، سفیروں، بھیجے ہوؤں کی ہے اور جو مُرسَل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے ظاہر ہے کہ کسی کی طرف سے کسی اور کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے، یہ مُرسَلین یا پیامبر نہ اوتار ہوتے ہیں، نہ دیوتا، نہ خدائی کے مظہر، نہ ان میں خدائی حلول کئے ہوتی ہے، معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت بیذرا سی بھی نہیں رکھتے ۔ اللہ اکبر! ـــــ شرک بلکہ شائبۂ شرک سے بھی بچنے کا قرآن مجید کو کس درجہ اہتمام ہے اور الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا لحاظ رکھ لیتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م

ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے ۹۶۵

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ

ان میں سے وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے ۹۶۶ اور ان میں سے بعض کے درجے (اللہ نے) بلند کئے ہیں ۹۶۷

لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کی ترکیب سے یہ پہلو بھی نکل آیا کہ آپ دنیا سے نوکھے اور نرالے کوئی رسول نہیں بلکہ آپ اُس زمرۂ مرسلین کے ایک فرد ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکا ہے۔

۹۶۵ (مراتبِ قرب و منزلت میں)

تِلْكَ الرُّسُلُ مراد وہی مرسلین ہیں جن کا ذکر ابھی ابھی آچکا ہے۔ الرسل کے اعتبارِ جمعی کی بنا پر ترکیب میں مونث آگئی ہے۔

تلک الجماعۃ الرسل۔ (کبیر)

اور اسی بنا پر بجائے ذلک کے لفظ تلک آیا ہے، اس لئے کہ جماعۃ مونث ہی ہے۔

قال تلک ولم یقل ذلک مراعاۃ لتانیث لفظ الجماعۃ (قرطبی)

فضل کے لفظی معنی بزرگی کے ہیں یعنی ایسی صفت جس سے انسان دنیا میں مدح و ثنا کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر کا۔ (راغب) فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ میں تفضیل باہمی، فضیلت اضافیہ کا بیان ہے، جو کچھ تعلق خدا سے خدا کے ہاں درجہ و مراتبِ قرب کے لحاظ سے ہے۔ خلق کے لئے بحیثیت مجموعی سب یکساں ہیں، امت کے لئے رسول سب برابر ہیں، اطاعت و تعظیم سب کی یکساں واجب ہے، اور اسی معنی میں قرآن مجید کی دوسری آیت اسی سورت کے آخر میں یہ آئی ہے لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔

لیس مقام التفضیل الیکم انما ہو الی اللہ عزوجل وعلیکم الانقیاد والتسلیم لہ والایمان بہ

اہل لطائف نے آیت سے یہ نکتہ لیا ہے کہ انبیاء کے، نیز اولیاء کا بھی خصوصاً صحابہ کرام کے باہمی فرقِ مدارج کے بارہ میں عوام کو بحث و گفتگو جائز نہیں۔ صحابہ سب کے سب بہرحال فضیلت صحبت نبوی میں شریک ہیں، ان کا تقابل و تفاضل عوام کے منصب سے باہر ہے، ہاں بجائے خود ان کے مقامات، احوال و واقعات، فضائل ذکر کرنے کا مضائقہ نہیں، جیسا کہ یہاں بھی آگے ہو رہا ہے۔

وھکذا القول فی الصحابۃ ان شاء اللہ تعالیٰ اشترکوا فی الصحبۃ ثم تباینوا فی الفضائل بما منحہم اللہ من المواہب والوسائل فہم متفاضلون بتلک مع ان الکل شملتہم الصحبۃ والعدالۃ والثناء علیہم (قرطبی)

۹۶۶ (براہ راست اور بلا توسط فرشتہ)

جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے ساتھ ہوا۔

اتفقوا علی ان موسیٰ علیہ السلام مراد بقولہ تعالیٰ (کبیر) وھو موسیٰ علیہ السلام (مدارک)

ورنہ وسیع و عام معنی میں تو ہر صاحب وحی نبی کلام الٰہی سے مشرف ہوتا ہی ہے۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو ۹۶۷ کھلے ہوئے ۹۶۸ شواہد عطا کئے ۹۶۹ اور ہم نے ان کی تائید روح القدس کے ذریعہ سے کی ۹۷۰

۹۶۷ (بہت زائد)

اشارہ ہے جامع کمالات و خاتم نبوت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف۔

امراد ببعضہم ھنا النبی صلعم (روح) وھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وھو قول مجاھد (بحر) قال ابن عباس بعضہم ھنا علی قول ابن عباس والشعبی ومجاھد محمد صلعم (قرطبی) والظاھر انہ اراد محمد صلعم (کشاف)

زمخشری نے یہاں یہ نکتۂ ادب و بلاغت خوب لکھا ہے کہ جہاں شناخت و تعیین میں کوئی دقت ہی نہ ہو، وہاں کنایہ و ابہام صراحت و تفصیل سے بڑھ کر بلیغ و موثر ہوتا ہے۔

۹۶۸ (کہ وہ بھی انھیں پیمبران برحق میں سے تھے۔)

ابن مریم یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند نہ کہ ابن اللہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باہمہ شرف و سروری بہرحال ایک انسانی شکل و صورت اور بشری گوشت پوست رکھنے والی عورت ہی کے اولاد تھے، نہ خدا تھے نہ خدازادے۔ اُلوہیت کا کوئی سا بھی جزو ان میں نہ تھا۔ انھیں خدا کا بیٹا ٹھہرا لینا بڑی جہالت تھی، اور اس کی وضاحت کے لئے ضرورت تھی انھیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی کہ محض اس نشان دہی اور پتے ہی سے عقیدۂ نصرانیت پر ضرب لگ جائے ورنہ نام تو اور بھی پیمبروں کے لئے گئے ہیں، کہیں ابن فلاں کرکے تعارف نہیں کرایا گیا ہے! نہ ابن داؤد نہ ابن ابراہیم، نہ ابن اسحاق نہ ابن یعقوب، نہ ابن زکریا نہ ابن عمران۔ اس طرح کا تعارف صرف ابن مریم کے لئے مخصوص ہے کہ انھیں کے لئے ابن اللہیت کی تردید کی ضرورت تھی۔

۹۶۹ (اُن کی حقانیت اور پیمبری کے)

یہاں یہ فرمایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام رسول برحق اور مؤید من اللہ تھے، نہ کہ نعوذ باللہ کوئی مُفتری یا کذاب۔ جس طرح نصاریٰ نے غلو و افراط سے کام لے کر آپ کو حدِ عبدیت و عبودیت ہی سے باہر نکال رکھا تھا، اُسی طرح یہود نے تفریط و عناد کو کام میں لا کر آپ کو سرے سے ایک بازی گر اور شعبدہ باز قرار دے لیا تھا۔ قرآن مجید ابھی ابھی نصرانی شرک کی تردید کر چکا ہے، اب یہودی دجل کی تردید کر رہا ہے۔

البیّنات۔ بیّنات کے تحت میں وہ تمام کھلی ہوئی چیزیں شامل ہیں جنھیں دیکھ کر ہر عقل سلیم والا منصف مزاج نبوت عیسوی کا قائل ہو جائے۔

ھی ما یتبین بہ الحق من الآیات والدلائل (المنار) البیّنۃ الدلالۃ الواضحۃ عقلیۃ کانت او محسوسۃ (راغب) کلھا یدل علی نبوتہ (روح) الحجج والدلائل القاطعات (ابن کثیر)

۹۷۰ کہ وہ قدم قدم پر دشمنوں سے ان کی حفاظت کرتے رہتے تھے۔

روح القدس۔ قرآن مجید اور اسلام کی اصطلاح میں اس سے مراد فرشتۂ اعظم حضرت جبرئیل ہیں، نصرانی تثلیث کے اقنومِ ثانی سے یہاں کوئی واسطہ نہیں، جبرئیل ملکوتی مخلوق ہیں، اور بہت مقرب، لیکن بہرحال

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ

اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو ان کے بعد کے لوگ آپس میں خونریزی نہ کرتے بعد اس کے کہ ان کے پاس شواہد آچکے

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ

تھے ۹۷۱ لیکن وہ لوگ آپس میں جھگڑے ۹۷۲ سو کوئی تو ان میں سے ایمان

مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۲۵۳

لے آیا اور کوئی ان میں سے کفر ہی کرتا رہا ۹۷۳ اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ آپس میں خونریزی نہ کرتے لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے

مخلوق ہی تھے، الوہیت کا کوئی شائبہ بھی اپنے اندر نہیں رکھتے۔

ایدناہ۔ ان کی تائید ہم نے کی جو ہر طرح قادر مطلق ہیں، یہ تائید خود بخود نہیں ہو گئی۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح با ایں کمالات و فضائل بہرحال انسان ہی تھے اور دوسرے انسانوں کی طرح دفع ضرر اور حصول نفع دونوں کے محتاج۔ قدرت کاملہ نے ان کی محافظت و تقویت و رفاقت کے لئے ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرئی جنس کی فرد کر دی۔

۹۷۱ البینات پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔ بینات کا مفہوم بہت وسیع و جامع ہے، عقلی و حسی دونوں قسم کے روشن شواہد یعنی ایک طرف دلائل و براہین اور دوسری طرف خوارق و معجزات سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

لو شآء اللہ۔ یعنی اگر مصالح تکوینی کے اعتبار سے مشیت الٰہی کا اقتضاء یہی ہوتا۔

من بعدھم۔ ضمیر پیمبروں (الرسل) کی طرف ہے، یعنی ان پیمبروں کے ظہور کے بعد۔

وقیل من بعد جمیع الرسل وھو ظاہر العبارۃ (قرطبی)

ما اقتتل الذین من بعدھم۔ یہ باہم خونریزی کرنے والے کون لوگ تھے؟ یقیناً پیمبروں کے منکرین اور انکار کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ ظاہری اور صوری تو اقرار ہو لیکن حقیقی و معنوی انکار ہو جیسے یہود و نصاریٰ اہل کتاب کا ظاہر میں اقرار اور معنوی انکار، دوسرے یہ کہ انکار صورۃً و معنیً دونوں طرح پر ہو، جیسے مشرکین کا انکار توحید و رسالت۔

۹۷۲ گویا بینات کا تقاضائے طبعی تو یہی تھا کہ ایمان سب کے سب لے آتے، لیکن ایک گروہ نے کج روی اور کج رائی سے کام لیا، اور یہ لوگ منکر ہی رہے۔ یہاں اس حقیقت کا بیان ہے کہ چونکہ مشیت الٰہی سب کو اضطراراً ایک ہی دین پر جمع کرنے کی نہ ہوئی اور حکمت کاملہ نے اس عالم کو عالم ابتلاء ہی رکھنا چاہا، اس لئے خلقت کا باہم مختلف ہونا بھی ناگزیر ہوا۔

۹۷۳ (تو جب یہ اختلاف دینی شروع سے اور انبیاء سابقین کے وقت سے چلا آرہا ہے تو آپ اے پیمبر اپنے زمانہ کے کافروں پر بہت زیادہ رنج و غم نہ کریں اور اپنے کو اس فکر و مشقت میں نہ ڈالیں کہ سب کے سب ایمان لے ہی آئیں۔

مِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ۔ سو جو لوگ ایمان لے آئے وہ تو نجات پا ہی گئے۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔ جو لوگ کفر پر قائم رہے وہ سزائے ابدی کے مستحق قرار پائے۔

مَنْ اٰمَنَ اور من کفر۔ دونوں کے صیغوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمان اور کفر بندہ کی اپنی اختیاری چیزیں ہیں،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو ۹۷۶ قبل اس کے کہ وہ دن آجائے ۹۷۷

يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

جس میں نہ تجارت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں ۹۷۸

خالق کی طرف سے جبر کسی صورت میں نہیں۔

۹۷۴ یعنی اگر سب کی خلقت ہی یکساں رکھ دی گئی ہوتی، اور کفر و گمراہی کی آزادی ہی سلب کر لی گئی ہوتی، جب البتہ نہ اختلاف ہوتا اور نہ نوبت قتل و قتال کی پہنچتی۔

۹۷۵ یعنی نہ اس کی قدرت و قوت فاعلہ پر کوئی قید ہے، نہ حد بندیاں عائد ہیں، اور نہ اس کی تجویزوں، ارادوں میں کسی غلطی یا سہو و خطا کا امکان ہے، ارسطو جیسے مشہور فلسفی نے خدا کی قدرت و قوت کو محدود مانا ہے اور سہو و خطا کا امکان تو مشرک قوموں نے اپنے خداؤں میں کثرت سے تسلیم کیا ہے۔ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ چھوٹی بڑی اچھی بری کوئی سی شے بھی ہو، بہرحال مشیت الٰہی سے باہر نہیں۔

وفی الآیۃ دلیل علی ان الحوادث تابعۃ لمشیۃ اللہ تعالٰی خیرا کانت اوشرا ایمانا وکفرا۔ (روح)

اللہ یفعل۔ اللہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ بہ مقتضائے قدرت کاملہ۔

ما یرید۔ اللہ جو چاہتا ہے، وہ بہ مقتضائے حکمت بالغہ۔

۹۷۶ (اللہ کی راہ میں، مصارف خیر میں)

رَزَقْنٰكُمْ، ضمیر متکلم لا کر اور رزق کو اپنی جانب منسوب کر کے صاف بتا دیا کہ مال و دولت جو کچھ بھی بندوں کے پاس ہے، خود سے نہیں، خدا ہی کا بخشا ہوا عطیہ ہے، اسی کی دین ہے، اور اسی کو حق حاصل ہے کہ جن کاموں میں چاہے اُن کے صرف کرنے کا حکم دے دے۔

انفقوا۔ انفاق سے یہاں مراد انفاق واجب لی گئی ہے کہ وعید اُسی کے ترک پر ہو سکتی ہے۔

قالوا ان المراد بالانفاق ھنا الانفاق الواجب لان الکلام یتضمن الوعید علی الترک وھو لا یکون الا علی ترک الواجب (المنار)

۹۷۷ یعنی روز قیامت، مطلب یہ ہے کہ مصارف خیر میں صرف کرنے اور نیکیاں جمع کرنے کا موقع جو کچھ ہے اسی دنیا میں ہے وقت کی قدر کرو، فرصت عمر کو نعمت سمجھو۔

۹۷۸ (اپنے حق میں)

ظلم کے اصل معنی وضع الشئ فی غیر محلہ (کسی شے کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنے) کے ہیں۔

اللہ یا اس کے قانون کو نہ ماننے سے بڑھ کر کون سا ظلم انسان کا اپنے حق میں ہوگا۔

لا بیع جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں ایک سے بڑھ کر ایک عجیب رہی ہیں، مشرک قومیں تو سرے سے روز جزا ہی کی قائل نہیں، اہل کتاب نے اس کے وقوع کو مانا، تو اس میں بھی یہ بخیلیں لگا دیں کہ وہاں بھی دنیا کی طرح لین دین ہو سکے گا،

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اللہ (وہ ہے کہ) کوئی معبود اس کے سوا نہیں ۹۷۹ وہ زندہ ہے ۹۸۰ سب کا سنبھالنے والا ہے اُسے نہ اونگھ آسکتی ہے نہ نیند ۹۸۱

کوئی کسی سے نیکیاں خرید لے گا، کوئی کسی کے ہاتھ اپنی بدیاں فروخت کردے گا، وقس علی ہذا۔ قرآن نے اس ساری لغو خیالی کا خاتمہ کردیا
ولا خلۃ. خُلّہ. گہری، جگری دوستی کو کہتے ہیں مقصود ایسی دوستی کے نافع ہونے کا ابطال ہے جو ایمان کے بغیر کام
دے سکے اور کفر کے مجرم کو نجات دلا سکے۔ اہل کتاب نے سمجھ رکھا تھا کہ یہاں کی نسبی رشتہ داریوں اور ذاتی خانگی دوستیوں سے وہاں بھی
کام چل جائے گا۔ جب گہری اور دلی دوستی کے نافع ہونے کی نفی ہو گئی تو محض زبانی رسمی ظاہری تعلق کا لاحاصل ہونا تو اور زیادہ ظاہر ہے
ولا شفاعۃ. پہلی دو گمراہیوں کا بھی تعلق مسیحیوں سے تھا اور تیسری گمراہی تو مسیحیت کے خصوصیات میں سے ہے
مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ابن اللہ کی حیثیت شافع مطلق کی ہے، انسان کے قالب میں مخلوق اسی لئے تو جنم لیا تھا کہ اپنی جان کا
فدیہ سب گنہگاروں کی طرف سے دے کر اور رب کی طرف سے صلیب پر اپنے خون کا چڑھاوا چڑھا کر قیامت میں شافع مطلق
کی حیثیت سے ظاہر و نمودار ہوں اور ان کی شفاعت سب کے حق میں نجات کا حکم قطعی رکھے گی، ہمارے ہاں کے عام واعظوں
اور نعت گو شاعروں نے شفاعت مصطفوی پر حد سے زیادہ زور دینا جو شروع کیا ہے یہ صاف مسیحیت سے تاثر کا نتیجہ ہے
والکافرون. یہاں وہی کافر مراد ہیں جو مذکورۂ بالا قسم کے عقائد کفریہ میں مبتلا ہیں۔
بعض فقہا نے لکھا ہے کہ آیت سے بخیل کی مذمت نکلتی ہے، جو لوگ ضروری مصارف خیر میں خرچ نہیں
کرتے وہ اپنے کو اہل کفر اور اہل جہنم کے حکم میں لا رہے ہیں۔
ایک تابعی سے یہ قول بھی منقول ہے کہ خوب ہوا جو اللہ نے کافروں کو ظالم بتایا، ظالموں کو کافر نہیں قرار دیا۔
قال عطاء بن ابی رباح والحمد للّٰہ الذی قال والکافرون ہم الظالمون ولم یقل والظالمون ہم الکافرون
(قرطبی. کبیر)

۹۷۹ (نہ بڑا نہ چھوٹا، نہ اصلی نہ ظلی، نہ خدا نہ خدازادہ)
خدا کے نفس وجود کے قائل تو جاہلی مذاہب بھی ہوئے ہیں، البتہ وہ اس معبود اعظم (ہندوؤں کی اصطلاح میں
ایشور) کے علاوہ تحتانی معبودوں اور دیوتاؤں کے بھی قائل رہے ہیں، یہ تعلیم اسلام ہی کی ہے کہ اس ایک خدا کے سوا کسی اور
خدا کا سرے سے وجود نہیں، یہ نہیں کہ وہ تو معبود اعظم ہے باقی چھوٹے چھوٹے معبود اور بھی موجود ہیں، عیسائی بھی چونکہ شرک میں
مبتلا ہو چکے تھے اس لئے ان کے مقابلہ میں بھی توحید کامل کے اثبات اور پھر غیر اللہ کی الوہیت کی نفی کی اس قدر ضرورت تھی۔
یہ آیت آیۃ الکرسی کے نام سے مشہور ہے، اس کی برکتوں اور فضیلتوں سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو، احادیث
میں اس کے فضائل بہ کثرت وارد ہوئے ہیں، اس کی معنویت اور جامعیت بھی اتنی نمایاں اور اس درجہ کی ہے کہ اپنے تو خیر
اپنے ہی ہیں، بیگانے (جیسے سیل مترجم قرآن مجید) اور معاندین (جیسے میور اور وہیری) نے بھی بے ساختہ اس کی داد دی ہے۔
روایتوں میں آیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے۔
ھذہ آیۃ الکرسی سیدۃ آی القرآن واعظم آیۃ (قرطبی) ھذہ آیۃ الکرسی ولہا شان عظیم (ابن کثیر)

۹۸۰ الحی۔ وہ مستقلاً زندہ ہے، وہ ازلی اور ابدی ہے، صفت حیات اس کی جزو ذات ہے، موت یا عدم حیات
اس پر نہ پہلے کبھی طاری ہوئی اور نہ آئندہ کبھی طاری ہو سکتی ہے۔

الحی فی نفسه الذی لا یموت ابدا (کبیر)

تو کیا کوئی قوم ایسی بھی ہوئی ہے جس نے اپنے معبود کی ایسی کھلی ہوئی اور موٹی صفت میں بھی شبہ کیا ہے؟
ایک نہیں متعدد قوموں نے شک و اشتباہ کیا معنی انکار تک اس صفت کا کیا ہے۔ خود روم کے ساحل پر متعدد قومیں اس عقیدہ کی گزری ہیں کہ ہر سال فلاں تاریخ پر ان کا خدا وفات پاجاتا ہے، اور دوسرے دن از سر نو وجود میں آجاتا ہے، چنانچہ ہر سال اس تاریخ کو خدا یا جل کا پتلا بنا کر جلایا جاتا تھا، اور دوسری صبح اس کے جنم کی خوشی میں رنگ رلیاں شروع ہو جاتی تھیں۔
ہندوؤں کے ہاں اوتاروں کا مرنا اور پھر جنم لینا اسی عقیدہ کی مثالیں ہیں، اور خود مسیحیوں کا عقیدہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ خدا بیٹے تو انسانی شکل اختیار کر کے دنیا میں آتا ہے اور پھر صلیب پر جا کر موت قبول کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے شروع ہی سے ایک ازلی، ابدی، باقی و غیر فانی خدا کے عقیدہ سے چونکہ مانوس ہو جاتے ہیں، بڑے ہو کر ان کے خیال ہی میں یہ نہیں آتی کہ خدا کبھی اور کسی حال میں کسی معنی میں اور کسی لحاظ سے حادث و فنا پذیر بھی ہو سکتا ہے، لیکن آخر آج بھی کروڑوں کی تعداد میں پڑھے لکھے لوگ خدا کی اسی فنا پذیری کو اپنا عقیدہ بنائے ہوئے ہیں یا نہیں؟
معلوم ہوا مسیحیوں نے جس طرح حضرت حق کی صفت حیات کے باب میں سخت ٹھوکر کھائی ہے، اسی طرح صفت قیومیت سے متعلق بھی عجب گمراہی میں پڑ گئے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ جس طرح بیٹا بغیر باپ کی شرکت و آمیزش کے خدا نہیں اسی طرح باپ پر بھی بغیر بیٹے کو شریک کئے خدا کا اطلاق نہیں ہو سکتا گویا جس طرح نعوذ باللہ مسیح ابن اللہ خدا کے محتاج ہیں، اسی طرح خدا بھی اپنی خدائی کے اثبات کے لئے مسیح کا محتاج ہے، صفت قیومیت کا اثبات کر کے قرآن نے اسی مسیحی عقیدہ پر بھی ضرب لگائی ہے۔
قیوم وہ ہے جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہے بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب و باعث ہے اور سب کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سب محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

هو القائم بنفسه مطلقا لا بغیره وهو مع ذلك یقوم به كل موجود حتى لا یتصور وجود شئ ولا دوام وجوده الا به (بحر) ... القیوم القائم الحافظ لكل شئ والمعطى له ما به قوامه (راغب)

وہ وہ ہے جس کی کوئی ابتدا ہی نہ ہو، شروع ہی سے موجود ہو۔

الذی لا بدء له (اقرب)

ائمہ تفسیر نے بھی اسی معنی میں لیا ہے۔

القیم لغیره وكان ابن مسعود یقرأ القیام فجمیع الموجودات مفتقرة الیه وهو غنی عنها ولا قوام لها بدون امره (ابن کثیر) وقال بعض معناه القائم على كل نفس بما كسبت حتى یجازیها بعملها من حیث هو عالم بها لا یخفى علیه شئ منها وقال ابن عباس معناه الذی لا یحول ولا یزول۔ (قرطبی)

یہ بھی روایتوں میں آیا ہے کہ جسے اسم اعظم کہا جاتا ہے، وہ یہی الحی القیوم ہے۔

وقد قیل ان هذا الاسم هو اسم الله الاعظم۔ (قرطبی)

۹۸۱ (جیسا کہ مشرک قوموں نے سمجھ لیا ہے)
جاہلی مذہبوں کے دیوتا ہمیشہ جھوم بھی جاتے ہیں اور سونے بھی لگتے ہیں اور اسی غفلت کی حالت میں ان سے طرح طرح کی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں، مسیحیوں اور یہود کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے چھٹے روز زمین و آسمانوں

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ

اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے ۹۸۲ کون ایسا ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے

عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ

سفارش کر سکے ۹۸۳ وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اس سب کو ۹۸۴

اور زمین کو بنا ڈالا تو ساتویں دن اُسے ستانے اور آرام لینے کی ضرورت پڑ گئی، اسلام کا خدا دائم، بیدار، ہمہ خبردار، غفلت، سستی اور تھکن سب سے ماوراء خدا ہے۔

۹۸۲ لَهٗ کو مقدم کر دینے سے معنی میں زور اور تاکید آ گئی اور مفہوم حصر کا پیدا ہو گیا، یعنی ساری کائنات کی ملکیت و مالکیت صرف اسی کی ہے کوئی اس صفت میں اُس کا شریک نہیں اور اس کی ملک سے مخلوق کا کوئی گوشہ کوئی شعبہ خارج نہیں، مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو کائنات کا، ایک ایک جزو ہی نہیں، تھوڑے تھوڑے حصہ، تقسیم کر دیا، اسلام نے اس پر زور دیا کہ صحیح رشتہ و تعلق خالق کا مخلوق کے ساتھ ملکیت کامل ہی کا ہے۔ لہ میں ل مستقل طور پر ملک کے معنی میں ہے۔

واللام للملك (بحر۔نهر) ای بالملك فهو مالك الجميع وربه۔ (قرطبی)

۹۸۳ من ذا الذی۔ کون ایسا ہے؟ استفہام انکاری ہے یعنی کوئی ایسا نہیں۔

یشفع عندہ۔ شفاعت پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا، مسیح کی شفاعت کبریٰ مسیحیوں کا، ایک عقیدۂ خصوصی ہے، مسیح کے لئے ان کے ہاں نہ صرف بالاستقلال شفاعت ثابت ہے، بلکہ تخلیق کائنات بھی خدا نے (نعوذ باللہ) اپنے اسی فرزند کے واسطہ سے کی ہے، قرآن مجید مسیحیوں سے مخاطبہ کے وقت اُن کے مخصوص مرکزی عقائد کفارہ و شفاعت وغیرہ پر برابر ضرب لگاتا جاتا ہے۔

باذنہ۔ یہ تصریح بھی بہت ضروری تھی، مسیحیوں نے جہاں نجات کا دار و مدار شفاعت پر رکھا ہے وہیں، اس کے برعکس بعض مشرک قوموں نے خدا کو قانونِ مکافات (ہندی میں "کرم") کے ضابطوں میں ایسا جکڑا ہوا سمجھ لیا ہے کہ اس کے لئے معافی کی اور اس کے ہاں شفاعت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے، اسلام نے توسط و اعتدال کی شاہراہ اختیار کر کے بتایا کہ نجات کا مدار کسی شفاعت پر ہرگز نہیں، البتہ اللہ نے اس کی گنجائش رکھی ہے، اور اپنی اجازت کے بعد مقبول بندوں کو دوسروں کی شفاعت کا (جو درحقیقت دعا کی ہی ایک صورت ہے) موقع دے گا اور ان کی دعائیں قبول کرے گا، اور مقبولین کے سب سے بڑے رئیس و سردار ہمارے رسول کریم صلعم ہیں۔

اہل سنت نے مسئلہ شفاعت کا استنباط اسی آیت اور ایسی ہی آیتوں سے کیا ہے۔

وتقرر فی هذه الاٰیة ان الله یاذن لمن یشاء فی الشفاعة وهم الانبیاء والعلماء والمجاهدون والملائکة وغیرهم ممن اکرمهم وشرفهم الله ثم لا یشفعون الا لمن ارتضی۔ (قرطبی)

۹۸۴ یعنی حاضر و غائب، محسوس و معقول، مدرک و غیر مدرک، سب کا علم اُسے پورا پورا حاصل ہے۔

ماکان قبلهم وماکان بعدهم (کشاف)

نام یہاں آگے اور پیچھے صرف دو ہی سمتوں کا لیا گیا ہے لیکن مراد جمیع جہات ہیں اور یہ کنایہ عربی زبان میں عام ہے

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ

اور وہ اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو بھی گھیر نہیں سکتے ۹۸۵ سوا اس کے کہ جتنا وہ خود چاہے ۹۸۶ اس کی کرسی نے

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۚ

سما رکھا ہے آسمانوں اور زمین کو ۹۸۷

ھذا کنایۃ عن احاطۃ علمہ تعالٰی بسائر المخلوقات من جمیع الجھات ۔ (بحر)

ایدیھم اور خلفھم میں ضمیر جمع یا تو من ذا کے مدلول کی جانب ہے جس میں انبیاء اور ملائکہ سب آگئے اور یا فی السّمٰوات و الارض کی جانب ہے اور ضمیر مذکر اس لئے کہ مراد زمین و آسمان کے اہلِ عقل سے ہے ۔

الضمیر لما فی السّمٰوات والارض لانّ فیھم العقلاء اولما دل علیہ من ذا من الملائکۃ والانبیاء (کشاف) الضمیران عائدان علٰی کل من یعقل ۔ (قرطبی)

صفاتِ باری میں حیات کا، قیومیت کا، مالکیت کا، اثبات اوپر ہو چکا ہے اب بیان اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ حق تعالٰی کی صفتِ علم بھی کامل ہے۔ سعی و سفارش کا ایک موقع دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جس حاکم یا مالک کے سامنے مقدمہ پیش ہو اس کا علم محیط و کامل نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ خارجی ذرائع سے اس کے معلومات میں اضافہ کیا جائے اور اس کے علم کو کامل کر دیا جائے یہاں یہ بتلا کر کہ اللہ کا علم تو ہر خفی و جلی پر حاوی ہے گویا یہ بتا دیا کہ اس کے علم پر کسی اضافہ کرنے اس کے آگے کسی کی خوبیاں جتلانے اسے کسی نامعلوم شے پر آگاہ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اور اس طرح مسیحی عقیدۂ شفاعت پر ایک اور ضرب لگی ۔

۹۸۵ کون نہیں گھیر سکتے ؟ وہی مخلوقات جن میں پیر، پیمبر، فرشتے سب شامل ہیں ۔

من علمہ ۔ علم سے مراد معلومات الٰہی سے ہے ۔

ای من معلوماتہ (کشاف) العلم ھنا المعلوم (بحر)

بڑے سے بڑے صاحبِ علم و معرفت کے بھی بس میں یہ نہیں کہ معلوماتِ الٰہی میں سے کسی ایک ہی چیز کی کنہ و حقیقت سے پوری طرح واقف ہو جائے، محدود و لامحدود کے علم کا مقابلہ ہی کیا ۔

۹۸۶ (اپنی حکمت و مصلحت کے موافق)

یہاں اس حقیقت کا بیان ہے کہ بندہ بڑے سے بڑا بھی عالم و عارف ہو بہرحال اس کا علم محدود ہوتا ہے اور عین مشیتِ الٰہی کے ماتحت و مطابق ۔

ومعنی الاٰیۃ لا معلوم لاحد الّا ما شاء اللہ ان یعلمہ ۔ (قرطبی)

۹۸۷ (تو وہ خود کسی چیز میں کیسے سما سکتا ہے ؟)

اس کی کرسیٔ علم و قدرت تو خود سارے کائنات پر محیط ہے اس کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے تو وہ آسمان پر عرش پر یا کسی وسیع سے وسیع چیز کے بھی اندر کیسے سما سکتا ہے ؟ وہ سب کو گھیرے ہوئے ہے اسے کون گھیر سکتا ہے ؟ اس صفت کے اثبات سے ان مشرکوں کے بھی عقیدہ کی تردید ہو گئی جو خدائے تعالٰی کے مجسّم ہونے اور کسی مکان میں اس کے محدود و مقید ہونے کے قائل ہیں ۔

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾

اور اس پر ان کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں ۹۸۸ اور وہ عالی شان ہے عظیم الشان ہے ۹۸۹

کرسی سے مراد علم الٰہی لی گئی ہے ابن عباسؓ صحابی سے یہی معنی منقول ہیں اور متعدد اہل تفسیر نے اس کی پیروی کی ہے۔
کرسیہ ای علمہ (ابن جریر عن ابن عباسؓ)، الکرسی ہو العلم (کبیر) قیل مجاز عن العلم (روح) ای علمہ
ومنہ الکراسۃ لتضمنہا العلم (مدارک) ای وسع علمہ وسمی العلم کرسیا تسمیۃ بمکان الذی ہو کرسی العالم (کشاف)
کرسی کے عام متعارف معنی وہی ہیں جو اردو میں بھی چلے ہوئے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے سلسلے میں کہیں وہ معنی تھوڑے ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ کیا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی کوئی جسم رکھتا ہے جو وہ اس عام معنی میں کرسی نشین ہوگا۔
ولا کرسی فی الحقیقۃ ولا قاعد۔ (بیضاوی)
کرسی کے اصلی معنی علم ہی کے ہیں اور کراسہ جو علمی صحیفوں کے لئے آتا ہے وہ اسی اصل سے ماخوذ ہے
اور اہل لغت نے کرسی کے جہاں ایک معنی سریر کے دیئے ہیں وہاں دوسرے معنی علم کے کئے ہیں۔
الکرسی السریر والعلم (قاموس) اصل الکرسی العلم ومنہ قیل لصحیفۃ یکون فیہا علم مکتوب
کراسۃ (ابن جریر) الکرسی العلم یقال ہو من اہل الکرسی ای العلم (اقرب)
کرسی کے دوسرے معنی قدرت وحکومت کے بھی ہیں، چنانچہ یہاں بھی بہتیرے اہل لغت اہل تفسیر اسی طرف گئے ہیں
وقیل کرسیہ ملکہ (راغب) المراد من الکرسی السلطان والقدرۃ والملک (کبیر) قیل کرسیہ ملکہ
وسلطانہ والعرب تسمی الملک القدیم کرسیا (معالم) قال قوم کرسیہ قدرتہ التی یمسک بہا السموات والارض (کشاف)
وسع کرسیہ السموات والارض۔ اس کی کرسی علم وملکت نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے۔
ای وسع ملکہ تسمیۃ بمکانہ الذی ہو کرسی الملک۔ (کشاف)
غرض یہ کہ اس کی کرسی علم ہو یا کرسی حکومت وہ جمیع کائنات کو احاطہ کئے ہوئے ہے، بڑی چھوٹی
لطیف وکثیف، جلی وخفی، ہر چیز اس پر عیاں وروشن ہے، اور ہر چیز اس کی محکوم وتابع۔
۹۸۸ (کہ اس سے تھک کر اسے کسی شریک یا مددگار کی ضرورت پڑے)
مشرک قوموں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اتنے وسیع اور دق ودق سلسلہ موجودات کی نگرانی تنہا خدا کہاں تک
کر سکتا ہے اس لئے نعوذ باللہ وہ کبھی غافل بھی ہو جاتا ہے اور یہ سارا کاروبار سنبھالنے کے لئے اسے ضرورت شریکوں اور
مددگاروں کی بھی پڑ گئی ہے خود یہود اور مسیحیوں کا عقیدہ خدا کے سستانے اور آرام لینے کے باب میں بھی اسی تخیل کی طرف مشیر ہے۔
حفظہما میں تثنیہ کے صیغہ سے مراد ہے ایک طرف سلسلہ سماوات اور دوسری طرف زمین اور اسی لئے
قرآن مجید نے ہر ایسے موقع پر صیغہ بجائے جمع کے تثنیہ کا استعمال کیا ہے
۹۸۹ یعنی ایک طرف ہر نقص سے ماوراء، ہر عیب سے بالاتر، دوسری طرف تمام صفات کمال کا جامع۔
علیّ اور عظیم دونوں صفتوں کا لانا معنی سے خالی اور بیکار نہیں، علو کا حاصل ہے تمام صفات نقص کی نفی،
سارے عوارض حدوث سے برتری۔

لَا انْفِصَامَ لَهَا ۖ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ

جس کے لیے کوئی شکستگی نہیں ۹۹۳ اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے ۹۹۴ اللہ ان لوگوں کا حامی ہے

اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ

جو ایمان لے آئے ۹۹۵ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے ۹۹۶

لا یحتاج ای لا یکرہ احد علی الدخول فیہ (ابن کثیر) ای ہو من وضوح الدلائل والحجج بحیث لا یکون فیہ اکراہ بل یجب الدخول فیہ بانشراح صدر واختیار۔ (نہر)

الدین۔ دین سے مراد مطلق دین نہیں کہ کوئی سا بھی ہو، بلکہ دین اسلام ہے۔

والدین ہاہنا الاسلام واعتقادہ۔ (بحر)

۹۹۱ اور دلائل وشواہد نے دونوں کے درمیان علانیہ امتیاز پیدا کر دیا ہے۔

الرشد۔ یعنی راہ اسلام۔

الغی۔ یعنی طریق کفر۔

یعنی اب تو کفر واسلام کے درمیان بہت کھلے ہوئے فرق وامتیازات پیدا ہو چکے ہیں اب کسی اشتباہ والتباس کی کوئی وجہ نہیں۔

۹۹۲ یعنی جس نے دین اسلام قبول کر لیا اور جو باطل کی پیروی سے باز آ گیا اسے دنیا وآخرت میں ایک بڑا زبردست سہارا ہاتھ آ گیا۔

طاغوت۔ طاغوت کا صحیح ترجمہ مشکل ہی ہے اُردو میں اس کے لئے قریب ترین لفظ شیطان کا ہو سکتا ہے، اپنے عام ووسیع معنی میں عربی میں اس کا اطلاق ہر معبود باطل اور ہر سرکش پر ہوتا ہے۔

قال ابو اسحٰق کل معبود من دون اللہ جبتٌ وطاغوتٌ (لسان)۔ طاغوت عبارۃ عن کل معتد وکل معبود من دون اللہ۔ (راغب)

مالک بن انس اور بعض اور اہل تفسیر بھی اسی عموم کی طرف گئے ہیں۔

قال مالک ابن انس کل ما عبد من دون اللہ تعالیٰ (روح) مردۃ من الجن والانس وکل ما یطغی (کبیر) ما عبد من دون اللہ تعالیٰ قالہ الطبری (بحر) وہو کل ما تکون عبادتہ والایمان بہ سببا للطغیان والخروج عن الحق من مخلوق یعبد ورئیس یقلد وہوی یتبع۔ (المنار)

۹۹۳ (نہ دنیا میں نہ آخرت میں)

بندہ کے فاطر کائنات سے صحیح وفطری تعلق ہی کا نام دین اسلام ہے، یہ وہ زبردست سہارا ہے جس کے ہاتھ لگ جانے کے بعد زندگی کا ہر مرحلہ آسان ہو جاتا ہے اور ہر عقدہ کا حل مل جاتا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر آخرت کی بھی منزلیں آسان رہتی ہیں، اس ایک سہارے کے سوا باقی سارے سہارے ناقص، کمزور اور بودے ہیں۔

بعض محققین صوفیہ نے کہا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ نسبت مع اللہ ہے وہ حاصل ہو جانے کے بعد منقطع نہیں ہوتی۔

۹۹۴ سمیع۔ سننے والا الفاظ کا اور اقوال کا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ

اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے حامی طاغوت ہیں جو انھیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے

اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۵۷

ہیں ۹۹۷ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے ۹۹۸

عَلِیْمٌ۔ جاننے والا احوال کا اور اعمال کا۔

یعنی اللہ کو ظاہر و باطن، کلی جزئی ہر قسم کا علم و اطلاع ہے ــــ اللہ کی باخبری و ہمہ علمی مسلمانوں کو ایک معمولی اور موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جاہلی قوموں میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسی ہیں جو حق تعالیٰ کی صفتِ علم میں بھی شبہ کر چکی ہیں، یہاں تک کہ بعض جاہلی فلاسفہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ خدا کو علم صرف کلیات کا ہے، جزئیات کا نہیں۔ کلام مجید کی اس قسم کی آیتوں کی پوری قدر جب ہی ہوتی ہے، جب دنیا کی جاہلی قوموں کے عقائد باطلہ پر نظر ہو۔

۹۹۵ وَلِیُّ۔ ولی کا ترجمہ بھی کسی ایک لفظ سے مشکل ہی ہے، رفیق، دوست، پشت پناہ، سرپرست سب کے مفہوم اس میں شامل ہیں، اور اہل تفسیر سے یہ سب معنی منقول ہیں۔

مُحِبُّھم وَمُتَوَلِّیْ اُمُوْرِھِمْ (بیضاوی) نصیرھم وظھیرھم یتولاھم بعونه (ابن جریر)

الولی المتکفل بالمصالح (کبیر) معینھم ومحبھم او متولی امورھم (روح)

اہل ایمان کے بگڑے کام بنانے والا، آڑے وقت میں ان کے کام آنے والا اللہ ہی ہے نہ کہ ابن اللہ یا کوئی دیوی دیوتا، خفی رد مسیحیوں اور مشرکوں کا یہاں بھی کیا گیا۔

بعض صوفیہ نے آیت سے ولایتِ عامہ کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔

۹۹۶ (اور مومنین کے حق میں یہی سب سے بڑی اور کارآمد نصرت و پشت پناہی ہے)

الظّلمات سے مراد کفر، انواعِ کفر اور متعلقاتِ و ملحقاتِ کفر ہیں، مثلاً شک، ارتیابِ شہوتِ ممنوع میں غلو وغیرہا۔

النّور سے مراد ایمان و انوارِ ایمان ہیں، عقلِ سلیم و ذوق شوق وغیرہا۔

کفر و ظلمات کی قسمیں بے شمار ہیں، اس لئے ظلمات کو صیغۂ جمع میں لائے، انواعِ کفر و اسبابِ کفر بہت زائد ہیں، جیسا کہ دو نقطوں کے درمیان منحنی یا ٹیڑھے خط بے شمار ہو سکتے ہیں، لیکن سیدھا خط ایک ہی ہو سکتا ہے، راہِ راست ایک ہی ہے، اس لئے النّور قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی آیا ہے صیغۂ واحد ہی میں آیا ہے۔

۹۹۷ (ترغیب، تحریص و تخویف کے ہر ممکن حربہ سے کام لے کر)

طاغوت۔ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے، اس کا اطلاق واحد جمع دونوں پر ہوتا ہے، یہاں معنی جمع ہے۔

جب فضا ہی ساری ظلمانی ہو تو ظاہر ہے کہ شیطنت اور بدی کے محرکات کتنے بڑھ جاتے اور ایمان و تقویٰ کے محرکات کتنے گھٹ جاتے ہیں، شیطان بدی کے چہرہ پر طرح طرح کے خوشنما نقاب ڈال اس کے نام طرح طرح کے خوبصورت رکھ اُسے سامنے لانے لگتا ہے، یہاں تک کہ خلقت انھیں کے ساتھ ہو لیتی ہے، اور جو اہل ایمان و اہل تقویٰ ہیں،

قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَ اُمِيۡتُ‌ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ بِالشَّمۡسِ

وہ بولا کہ زندگی اور موت تو میں دیتا ہوں ۱۰۰۴ ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے

مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ‌ؕ

تو اُسے مغرب سے نکال دکھا ۱۰۰۵ اس پر وہ جو کافر تھا دنگ رہ گیا ۱۰۰۶

۱۰۰۳ یعنی حیات وموت کی ساری قوتیں اُسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی سارے نظامِ ربوبیت کا سرچشمہ ہے، کائناتِ حیاتی کی بقا وفنا کے سارے قانون اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھہرتے ہیں، کسی بندہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس نظامِ حیاتی وفنائی کو بدل دے یا اس میں کوئی ادنیٰ تصرف کر دکھائے۔

فقہاء مفسرین نے کہا ہے کہ آیت سے مداہنت کا ابطال ہو رہا ہے۔

محققین نے محاجۂ ابراہیمی سے یہ استنباط کیا ہے کہ ضرورتِ دین کے وقت بحث ومناظرہ ہرگز تجرید وتفرید کے منافی نہیں خصوصاً کامل کے لئے، اور علم کلام کا سنتِ انبیاء میں سے ہونا تو بیان سے بالکل ظاہر ہو رہا ہے۔

وهذه الآية تدل على صحة المحاجة في الدين واستعمال حجج العقول والاستدلال بدلائل الله تعالى على توحيده وصفاته الحسنى (جصاص) تدل على اثبات المناظرة والمجادلة واقامة الحجة وفي القرآن والسنة من هذا كثير لمن تامله (قرطبی)

اور ایک محقق نے یہ نکتہ بھی خوب نکالا ہے کہ حضرات انبیاء توحید باری میں صرف افعالِ حق سے استدلال کرتے تھے اور ایسی صفات کو پیش نہ کرتے جن سے مذہبِ تشبہ وتجسم کے لئے گنجائش نکل سکے۔

تدل على انه تعالى لا يشبه بشئ وان طريق معرفته ما نصب من الدلائل على توحيده لان انبياء عليهم السلام انما حاجوا الكفار بمثل ذالك ولم يصفوا الله تعالى بصفة توجب التشبيه وانما وصفوه بافعاله واستدلوا بها عليه (جصاص)

آیت سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ کافر کو بھی جب اُسے سلطنت واقتدار حاصل ہو، ملک کہنا جائز ہے۔

هذه الآية تدل على جواز تسمية الكافر ملكا اذا اتاه الله الملك والعز والرفعة في الدنيا. (قرطبی)

اور قرطبی نے آگے چل کر اس مناظرہ ومجادلۂ حق کی متعدد نظیریں بھی کتاب وسنّت سے پیش کی ہیں۔

۱۰۰۴ نمرود نے موت وحیات کے اسبابِ بعید وخفی کو چھوڑا اور صرف اسبابِ ظاہری وسطحی کو سامنے رکھ کر جواب دیا کہ سامانِ معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہے، میں جسے چاہوں زندہ رکھوں اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں یا کسی اور طریقہ سے اس کی زندگی ختم کر دوں۔

۱۰۰۵ (اگر تو اپنے دعوائے قدرت وتصرف میں کچھ بھی سچائی رکھتا ہے)
اسی استدلال کو اور زیادہ قریب الفہم بنانے کے لئے موحدِ اعظم نے یہ دوسری مثال پیش کر دی آپ نے فرمایا کہ تم تو سورج دیوتا کے قادر ومتصرف ہونے کے قائل ہو تو زیادہ نہیں یہی کر دکھاؤ کہ سورج اپنے ارادہ سے عام سنّتِ الٰہی کے

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ

اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا ف۱۰۰۷ یا پھر اس شخص (کے حال پر نظر کی) ف۱۰۰۸ جو

وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

ایک بستی سے گزرا تھا اس حال میں کہ وہ (بستی) اپنی چھتوں کے بل گری ہوئی تھی ف۱۰۰۹

خلاف ذرا اپنا رُخ ہی بدل دے! دوسروں پر قدرت رکھنا الگ رہا، خود اپنے ہی پر ذرا اپنا ارادہ صرف کر دکھائے اور ارادہ بھی اتنا ہلکا کہ صرف رُخ بدل دینے کا، کسی خدا کی بے بسی کا منظر اس سے بڑھ کر اور کیا پیش ہو سکتا تھا! حضرت ابراہیم نے استدلال وہی قائم رکھا، صرف مخاطب کی سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے اس کی مثال دوسری پیش کر دی اور فرمایا کہ اچھا کائناتِ حیاتی نہ سہی کائناتِ طبیعی ہی کے خدائی نظام میں ایک ذرا تصرف کر کے دکھا دو، نمرود سورج دیوتا کا اوتار تھا، او سورج کے خدائے اعظم ہونے کا قائل اس کے عقیدہ کے ابطال و تردید میں سورج ہی کو مثال میں پیش کرنا اُس پر بہترین گرفت تھی۔

ف۱۰۰۶ یعنی عاجز و لاجواب ہو گیا۔ اس کا جواب کسی مشرک و آفتاب پرست کے پاس ہو کیا سکتا تھا؟ نہ اُس وقت کسی سے بن پڑا نہ آج کسی سے بن پڑنا ممکن ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ جس ہستی کے متعلق صاحبِ ارادۂ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ حقیقۃً تو ارادۂ خفیف سے بھی محروم ثابت ہو رہی ہے!

ف۱۰۰۷ عاجز و لاجواب ہو جانے کے باوجود وہ ایمان نہ لایا، اور ایمان لاتا ہی کیسے؟ جو لوگ ضد اور عناد سے کجروی اختیار کئے رہتے ہیں انہیں ہدایت کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

الظّٰلمین وہی لوگ ہیں جو خلوصِ ذہن کے ساتھ حق و حقیقت پر غور ہی نہیں کرتے اور اپنی ضد و نفسانیت پر قائم رہتے ہیں، آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمانِ مستقیم اور فہمِ سلیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ف۱۰۰۸ (اے مخاطب!)

آیت کا عطف معنوی ہے آیتِ سابق پر۔ اور تقدیرِ کلام اکثر نحویین کے نزدیک یہ ہے۔

ارأیت کالذی حاجّ ابراھیم او کالذی مرّ علی قریۃ۔ وھو قول الکسائی والفراء و ابی علی الفارسی واکثر النحویین

اور دوسری ترکیب یہ بھی مانی گئی ہے: ارأیت مثل الذی مرّ الخ۔ زمخشری بیضاوی وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (البحر)

ف۱۰۰۹ یعنی اس کی عمارتیں بالکل منہدم و مسمار ہو چکی تھیں۔

خاویۃٌ علی عروشہا عربی کا ایک خاص محاورہ ہے مراد یہ ہے کہ بستی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی پہلے چھتیں گریں پھر چھتوں کے اوپر دیواریں۔

بان سقط السقف اوّلاً ثم تہدمت الجدران علیہ (روح) قال السدی یقول ھی ساقطۃ علی سقفہا ای سقطت السقف ثم سقطت الحیطان علیہا واختارہ الطبری (قرطبی) معناہ وھی خالیۃ من السکان واقعۃ علی عروشہا۔ (المنار)

یہ گزرنے والے کون صاحب تھے؟ اور کس تباہ شدہ بستی سے ان کا گزر ہوا تھا؟

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ

پھر پوچھا تو کتنی مدت (اس حالت میں) رہا، اُس نے کہا میں رہا (اس حالت میں) کوئی دن بھر یا اس کا کچھ حصہ ۱۰۱۲

عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ

کہا نہیں بلکہ تو سو سال (کی مدت تک) رہا ہے، اپنے کھانے پینے کی طرف تو دیکھ (کہ اب تک) وہ سڑا گلا نہیں ہے ۱۰۱۳ اور اپنے گدھے کو دیکھ ۱۰۱۴

معجزات یا خوارق پر کوئی عقلی اعتراض اگر کسی ملحد کی طرف سے ہو تو خیر اس کے لئے تو بہرحال گنجائش بھی ہے لیکن خدا کے ماننے والے کی طرف سے ”عقلی اعتراض“ یا اس کے امکان میں گفتگو بالکل بے معنی ہے۔ جب معجزہ کا فاعل خدا تعالیٰ ہے تو وہ قادرِ مطلق تو جس طرح اپنی عادت یا معمولِ عام کے اجراء و نفاذ پر قادر ہے ٹھیک اسی طرح اور بعینہٖ اسی درجہ میں اس کے ترک و خرق پر بھی۔ اس کے نزدیک تو یہ اور وہ، ایسا اور ویسا، دونوں بالکل یکساں و مساوی ہیں بلکہ اس ہستی مطلق کے لئے ’عادت‘ و ’خلافِ عادت‘ کے معنی ہی کیا؟ یہ ’موافقِ عادت‘ و ’خرقِ عادت‘ کی اصطلاحیں تو محض بندوں کے علم کے لحاظ سے ہیں، یہ تو ہم نے جس چیز کا بار بار اور متواتر مشاہدہ کیا اُسے عادت ہی میں داخل کر دیا اور جس چیز کو ایسا نہ پایا اُسے خلافِ عادت اور خارقِ عادت سے تعبیر کرنے لگے۔ — لفظ ”معجزہ“ تو خود ہمارے جہل کا پردہ پوش ہے، حق تعالیٰ کے لئے کون سی چیز معجز ہو سکتی ہے؟ غرض کوئی منکر کسی بڑے سے بڑے معجزہ کے نفسِ امکان میں تو زبان کھول ہی نہیں سکتا، گفتگو جو کچھ بھی چلے گی رُویت و روایتِ خبر کے لحاظ سے چلے گی اور یہ بحث ظاہر ہے کہ تمام تر نقلی اور تاریخی ہوگی نہ کہ عقلی۔ وقوعِ معجزہ کے راوی اگر معتبر اور شاہدِ عینی ہیں تو وہ خارقِ عادت بھی ہونے کے لئے ویسے ہی قابلِ یقین ہوگا جیسا کہ روزمرہ کے عام واقعات ہوتے ہیں۔ اور پھر جس معجزہ کے راوی خود حق تعالیٰ یا نبی معصوم ہو اس کے باب میں تو ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ آگے کوئی گفتگو چل ہی نہیں سکتی۔ کس وقت کس خارقِ عادت کے ظہور کو کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں، یہ حال بجز حکیم مطلق کے اور کون جان سکتا ہے۔

ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے کہ ”موت“ سے یہاں متعارف موت مراد نہیں جس میں روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے بلکہ صرف ایک طویل مدت کامل بے حسی اور فقدانِ شعور سے مراد ہے۔

ان من الموت ما يمتد زمنًا طويلًا وهو ما يكون من فقد الحس والحركة والادراك من غير ان تفارق الروح البدن بالمرة وهو ما كان لاهل الكهف (المنار)

اور لغت سے بھی اس مفہوم کی سند مل جاتی ہے، راغب نے اپنی ”مفردات القرآن“ میں ”موت“ کے ضد معنی حیات کے متعدد معنوں کے مقابل دیئے ہیں اور ان میں موت کی یہ قسمیں شامل کی ہیں، زوالِ قوتِ نامیہ، زوالِ قوتِ حاسہ، زوالِ قوتِ عاقلہ، حزن و خوف مکدّر، نوم وغیرہا۔ الموت کے اصل معنی ہیں ضد الحیاۃ (صحاح) یا زوال الحیاۃ (اقرب) اس سے ظاہر ہے کہ جن جن صورتوں پر حیات یا زندگی کا اطلاق ہے اتنی ہی ان کی مقابل صورتوں پر موت کا بھی ہوگا۔ — اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے مفردات کے دیئے ہوئے سب معنی نقل کر کے لکھا ہے کہ موت مجازی معنی میں فقر و ذلت، معصیت وغیرہ کے لئے بھی آتا ہے، چنانچہ حدیث نبوی میں بسلسلۂ ابلیس اولین معصیت پر موت کا اطلاق ہوا ہے۔

وقد يستعار الموت للاحوال الشاقة كالفقر والذل والسؤال والهرم والمعصية وغير ذلك ومنه الحديث اول من مات ابليس لانه اول من عصى. (تاج)

وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اور (یہ سب) اس لئے کہ ہم تجھے ایک نشان لوگوں کے لئے بنائیں ۱۰۱۵ اور ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم انھیں کس طرح ترتیب دیتے

نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ

ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں ۱۰۱۶ پھر جب اس پر (یہ سب) روشن ہوگیا تو وہ کہا میں یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز

شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ

پر قادر ہے ۱۰۱۷ اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب ابراہیمؑ نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا ۱۰۱۸

۱۰۱۲ یہ جواب اُس بندہ نے اپنے علم و شعور اور اپنے احساس و اندازہ کے مطابق دیا، اور بشری اندازہ و تخمین کی یہ غلطی ذرا بھی حیرت انگیز نہیں، جب دماغ و دل یعنی شعور و اندازہ کی مشینوں کی حرکت ہی سرے سے باطل ہوگئی تھی تو کوئی بشر اندازہ کر ہی کیونکر سکتا تھا، اور یوں بھی گھنٹوں اور دنوں بلکہ ہفتوں اور برسوں کی مدت کو خواب اور بیہوشی کی حالت میں ہم روز مرہ منٹوں اور سکنڈوں کے اندر سمٹے اور سمٹائے ہوئے آخر دیکھتے ہی ہیں۔

فقہاء مفسرین نے اس جواب سے جواز اجتہاد پر دلیل حاصل کی ہے۔

فیه دلیل جواز الاجتهاد (مدارك)

اور ایسے ظن و تخمین پر اطلاق "کذب" کا نہیں ہو سکتا۔

انما قال هٰذا علی ما عنده وفی ظنه وعلی هٰذا لایکون کاذبا فی ما اخبر به (قرطبی) قال ذلك علی حسب الظن ولا یکون مواخذا بهٰذا الکذب۔ (کبیر)

۱۰۱۳ (اتنی مدت کے باوجود)

اور یہ نظیر ہے اس کی کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو جتنی مدت تک بھی چاہے محفوظ و سالم رکھ سکتا ہے۔

بشری عقل و فہم مادی مثالوں اور نظیروں کی ہمیشہ حریص رہی ہے اور آج کی "روشن خیالی" اور تجربیت کے سارے مطالبات کا لبِ لباب صرف یہی نظیر کی فراہی ہے۔

۱۰۱۴ (جس کی ہڈیاں اس وقت تک باقی تھیں اور گوشت پوست سب خاک میں مل چکا تھا)

جانوروں کے ڈھانچے مدتوں باقی رہتے ہیں بعض بعض ڈھانچے سیکڑوں ہزاروں سال کے بعد سالم و محفوظ برآمد ہوئے ہیں۔ حمار۔ گدھے سے ہندوستان میں تو نہیں لیکن عرب، شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں سواری کا کام گھوڑے ہی کی طرح لیا جاتا تھا، اور اب بھی لیا جاتا ہے توریت اور انجیل دونوں میں گدھے کا ذکر سواری کے جانور کی حیثیت سے بکثرت آیا ہے اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ دونوں کا اس پر سوار ہونا بیان ہوا ہے اس لئے یہاں حضرت عزیر کی سواری میں گدھے کے ذکر پر کوئی حیرت نہ ہونا چاہئے

۱۰۱۵ (اپنی قدرت کاملہ کا، یعنی ایک نظیر واقعہ بعث کی۔)

فاطر کائنات و حکیم مطلق، جب کبھی بھی کوئی واقعہ انسانی معیار سے غیر معمولی یا خارق دنیا ظہور میں لاتا ہے

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۖ

ارشاد ہوا کیا آپ کو یقین نہیں ہے ۱۰۱۹ عرض کی ضرور ہے لیکن (یہ درخواست) اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے ۱۰۲۰

تو اس سے مقصود کسی مقصد اہم ہی پر دلالت کرنا ہوتا ہے۔

۱۰۱۶ یعنی اپنے مردہ صد سالہ گدھے کے ڈھانچے کو بچشم خود دیکھ کہ ہم اس کا جوڑ جوڑ بٹھاتے ہیں اور پھر از سرِ نو روح پھونک کر زندہ کر اٹھاتے ہیں۔

۱۰۱۷ (اور جس چیز کو جس طرح چاہے ظہور میں لا سکتا ہے خواہ اسبابِ عادیہ کے واسطے سے خواہ اسبابِ غیر عادیہ سے)
ان پیمبر پر جب یہ ساری کیفیتیں تجربۃً اور مشاہدۃً گزر لیں تو وہ تر و تازہ جوشِ ایمانی کے ساتھ بے اختیار پکار اٹھے کہ بے شک میرا پروردگار ہر چیز پر قادر ہے اور اب میرا ایمان و اعتقاد بہ مدارج اور بڑھ گیا۔
اَعْلَمُ۔ علم سے یہاں مراد علمِ مشاہدہ و رویت ہے، ورنہ علم بالدلیل تو پہلے ہی سے حاصل تھا۔
تاویلہ انی قد علمت مشاهدة ما کنت اعلمه قبل ذٰلك الاستدلال (کبیر) ای انا عالم بهذا وقد رأیته عیانًا (ابن کثیر) ای اعلم هذا الضرب من العلم الذی لم اکن اعلمه علی معاینة (قرطبی)

۱۰۱۸ (حشر کے دن)
کیف۔ یعنی کسی خاص کیفیت کے ساتھ کسی متعین طریقہ پر۔
فی ای حال او علی ای حال (ابو سعود)
نفسِ وقوع تو انہیں پوری طرح مسلّم تھا، سوال اُس کی صرف کیفیت کے بارے میں کر رہے تھے۔
الاستفهام بکیف انما هو سؤال عن حالة شئ موجود متقرر الوجود عند السائل والمسئول.. انما هی استفهام عن هيئة الاحياء والاحياء متقرر (قرطبی) ای ارنی بعینی کیفیة احیائك للموتٰی۔ (المنار)
محققین نے کہا ہے کہ سوال کے الفاظ سے خود یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ سائل کو کوئی شبہ احیاء موتی کے نفسِ وقوع میں نہیں، وہ صرف اس کی کیفیت جاننا چاہتا ہے۔
صوفیہ اہلِ لطائف نے اس قصۂ ابراہیمی سے ذیل کے نکات پیدا کئے ہیں:۔
(۱) اللہ تعالیٰ سے کشفِ مقامات کا سوال موجبِ قبول ہے (۲) مقبولین کو جو مشاہدات ہوتے ہیں اُن سے مراتبِ عرفان و کمالاتِ ایقان میں اور ترقی ہوتی ہے (۳) اور پھر ان سے ان کے تقرب و اعزاز حضوری میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۰۱۹ سوال سے مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمانِ کامل کا اقرار خود ان کی زبان سے کرا لیا جائے اور دنیا کو یہ تعلیم بھی مل جائے کہ ایسے سوالات ہمیشہ بے اعتقادی یا فقدانِ ایمان ہی سے نہیں پیدا ہوتے۔

۱۰۲۰ (اور علمِ استدلالی علمِ مشاہدہ کی حد تک پہنچ جائے)
ای سألتك لیطمئن قلبی بحصول الفرق بین المعلوم برهانًا والمعلوم عیانًا۔ (قرطبی)
حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے، ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ کے بعد اطمینان اور زیادہ حاصل ہو جائے۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

پھر ان کو اپنی طرف بلائیے (تو) وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس چلے آئیں گے [۱۰۲۳] اور یقین رکھئے کہ اللہ بڑا زبردست ہے بڑا

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ

حکمت والا ہے [۱۰۲۴] جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں ان کے مال کی مثال ایسی ہے [۱۰۲۵] جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ

أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ

اس سے سات بالیاں اُگیں ہر ہر بالی کے اندر سَو دانے ہوں [۱۰۲۶]

اور سہم کے استعمال میں بھی فرق ہے کہ سہم کا اطلاق مسلّم حصہ پر ہوتا ہے اور جزء کا لفظ عام ہے۔

الجزء من کل شیٔ ھو البعض منه کان منقسما جمیعه علیه علی صحة او غیر منقسم فھو بذلك من معناه مخالف معنی السھم لأن السھم من الشیٔ ھو البعض المنقسم علیه جمیعه علی صحة۔ (ابن جریر)

اور ایسا ہی دوسروں نے بھی کہا ہے۔

وظاھر ثم اجعل علی کل جبل منھن جزءً یدل علی ان تلك الطیور جعلت جزأً جزأً (بحر) ای قطعه وبعضًا منھن۔ پہلے تو مراد چاروں پرندوں کا مجموعہ لینا اور پھر جزءً سے مراد اس مجموعہ کا ایک ایک جزء یا ایک ایک (روح) مسلّم پرندہ لینا خواہ مخواہ کا تکلف اور ایک غلط قسم کا لغوی اجتہاد ہے صحابیوں اور تابعین کے بعد سے لے کر اس وقت تک جتنے بھی اہل تفسیر عربی کا ذوقِ سلیم رکھنے والے ہوئے ہیں سب نے مراد ہر ہر پرندے کے ٹکڑے ٹکڑے سے لی ہے۔

جزأھن اجزاءً وجعل علی کل جبل منھن جزأً (ابن کثیر) جزئھن وفرق اجزائھن علی الجبال (کشاف)

لیکن چودھویں صدی ہجری کے ایک مصری فاضل نے اس تفسیر کی اچھی خاصی تضعیف یہ لکھ کر کردی ہے کہ الفاظِ قرآنی سے یہ نہیں نکلتا ولا یدل الکلام علی ذلك۔ (المنار)

[۱۰۲۳] صحیح وسالم اس طرح کہ زندہ ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متفرق ومنتشر اجزاء آپس میں مل ملا کر ٹھیک ہو جائیں گے۔

اُدْعُهُنَّ۔ یعنی آواز دے کر انھیں اپنی طرف پکاریئے۔

[۱۰۲۴] (تو ایسے عزیز وحکیم کے لئے احیاء موتیٰ میں دشواری ہی کیا ہے جب بھی وہ اپنی حکمت کے لحاظ سے مناسب سمجھے گا حشر برپا کردے گا)

عزیز۔ یعنی ایسا زبردست جو ہر شے پر یکساں قادر ہے، محال وممکن، اشد اور اسہل کی تفریقیں اور تقسیم تو انسان کی قائم کی ہوئی ہیں، قادرِ مطلق کے ہاں کسی چیز کے اشد یا محال ہونے کے کوئی معنی ہی سرے سے نہیں۔

حکیم۔ یعنی باوجود عموم قدرت واختیارِ مطلق کے وہ کرتا صرف وہی ہے جو عین اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ صاحب المنار نے بڑی تفصیلی گفتگو کرکے جمہور مفسرین کے قول کو خلافِ نظمِ قرآنی بتایا ہے اور داد ابو مسلم اصفہانی کی قرآن فہمی کی دی ہے۔

[۱۰۲۵] (اللہ کی نظر میں اور برکت وافزائش اجر کے لحاظ سے)

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اَلَّذِيْنَ

اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے ۱۰۲۷، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے ۱۰۲۸ جو لوگ

يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا

اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان و اذیت

مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

سے کام نہیں لیتے ۱۰۲۹ ان کے لئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔

فی سبیل اللہ۔ یعنی احکام شریعت کے مطابق نیک کاموں میں۔

اموالھم۔ اور فی سبیل اللہ دونوں کے عموم میں تمام مصارف خیر ان میں آجاتے ہیں۔

۱۰۲۶ (تو جس طرح غلے کے ایک دانہ سے سات سو دانے پیدا ہو گئے اسی طرح اللہ کا خیر میں صرف کرنے والوں کو ان کے حسن عمل کا اجر سات سو گنا دیتا ہے)

ایک عام فہم مادی مثال دے کر یہ سمجھا دیا کہ اس تکثیر اجر پر اتنی حیرت کیوں کی جائے ایسی مثالیں تو مادیات میں روزمرہ مل جاتی ہیں۔

تجارتی اور کاروباری تلمیحیں تو قرآن مجید میں بہ کثرت ملتی ہی ہیں، زرعی اور کاشتکارانہ تلمیحیں بھی مفقود نہیں۔

۱۰۲۷ (اس کے اجر میں جس حد تک بھی چاہے یا بہ قدر اس کے اخلاص و شفقت کے)

یہ جو نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی لطیف تشبیہ کھیتی سے دی گئی ہے اس سے اہل لطائف نے دو نکتے اور پیدا کئے ہیں: (۱) ایک یہ کہ اپنے مصارف خیر کی حفاظت و نگہداشت بھی اہل زراعت ہی کی طرح کرتے رہنا چاہئے ریا، نمائش، عجب، تکبر، ایذا اور احسان رکھنے سے انھیں برباد نہ کر دیا جائے (۲) دوسرے یہ کہ جس طرح تخم ریزی آبپاشی وغیرہ کے اختلاف سے پیداوار بہ لحاظ محنت و قیمت و نفع مختلف ہوتی رہتی ہے اسی طرح اجر گو مقدار میں برابر ہو تاہم حسن قبول و قرب درجات وغیرہ کی کیفیات میں نیت و اخلاص کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

۱۰۲۸ وَاسِعٌ صفت وسعت لا کر بتا دیا کہ اس کے ہاں کمی کس چیز کی ہے؟ سب کو سب کچھ دے سکتا ہے عَلِيْمٌ صفت علم لا کر یہ جتا دیا کہ وہ ہر ایک کی نیت، ظرف، اخلاص وغیرہ کا بھی تو علم کامل رکھتا ہے اور اسی مناسبت سے سب کو دیتا ہے۔

۱۰۲۹ یعنی جس کے ساتھ کچھ سلوک کیا ہے اس پر نہ کچھ احسان رکھتے ہیں اور نہ اسے اپنے برتاؤ سے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

حقارت سے پیش آنا بھی تکلیف دہ برتاؤ میں داخل ہے کسی کی کچھ خدمت اپنے سے بن پڑ جائے تو یہ خود اپنے لئے باعث اجر و موجب سعادت ہے نہ یہ کہ اس پر فخر کیا جائے اور جس کے ساتھ سلوک کیا گیا ہے اسے کسی درجہ میں بھی ذلیل ٹھہرایا جائے

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ

اور اُن پر نہ کوئی خوف (واقع) ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۰۳۰ مناسب بات اور درگزر ایسی خیرات سے

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾

بہتر ہے جس کے عقب میں اذیت ہو ۱۰۳۱ اور اللہ بڑا غنی ہے بڑا بردبار ہے ۱۰۳۲

قرآن مجید ہی میں ابرار کی ایک علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ لوگ دوسروں کو کھلائیں پلائیں گے اور یہ زبان حال یہ کہتے ہی رہیں گے انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاء ولا شکورا (ہم تو تمہیں کھلاتے پلاتے خالص اللہ کی راہ میں ہیں، نہ کہ تم سے کوئی معاوضہ لینے یا تم سے شکریہ وصول کرنے)

منّا مَنّ کے معنی احسان رکھنے، اپنے احسان کے یاد دلانے کے ہیں۔

یعنی ذکر النعمۃ علی معنی التعدید لھا والتقریع بھا (قرطبی)

اذی اذی اذیت رسانی ہے اور یہ مَنّ سے عام تر ہے۔

والاذی السب والتشکی وھو اعم من المن (قرطبی)

۱۰۳۰ (قیامت کے دن)

اجرھم عند ربھم یعنی ان لوگوں کو پورا پورا اجر ملے گا جس کے درجہ اخلاص کی مناسبت سے۔

اجرھم کے لئے۔ اس کا اجر، قیمت الاالیہ کا اردو محاورہ میں مفہوم اسی سے ادا ہوتا ہے۔

۱۰۳۱ یعنی اس قسم کے احسان سے تو کہیں بہتر یہ ہے کہ سرے سے صدقہ دیا ہی نہ جائے اور نرم الفاظ میں حسن معذرت کر دی جائے۔

قول معروف۔ یعنی معذرت کی نرم بات کہہ دینا۔

ای کلام حسن ورد علی السائل جمیل (معالم)

مغفرۃ یعنی سائل یا حاجت مند کی بات کو اس وقت ٹال جانا جب وہ تنگی یا بدتہذیبی سے پیش آئے گا۔

قیل تجاوز عن السائل اذا استطال علیہ عند ردہ (معالم)

آیت میں صاف تعلیم ہے کہ صدقہ یا خیرات مقصود بالذات نہیں مقصود اصلاح قلب ہے، اور اس کے بعد دینے والا لینے والے پر کوئی احسان نہیں رکھتا، بلکہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے بلکہ الٹا لینے والے کا شکر گزار ہوتا ہے کہ اس نے قبول کر کے اس کو ایک بار سے ہلکا کر دیا۔

اذی کا لفظ عام ہے ہر قسم کے آزار کو شامل، زبان سے یا عمل سے احسان جتانا بھی اس میں آگیا۔

خوش ناداری کے وقت نرمی سے جواب دے دینا، اور سائل کی سختی کو پی جانا موجب قرب و اجر ہے اس لئے انہیں خیر سے تعبیر فرمایا۔

ای قول معروف اولی وامثل۔ (قرطبی)

۱۰۳۲ وہ نہ کسی کے زر و مال کا محتاج، اور نہ بہ اشتعال پر فوری سزا دینے والا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ

اے ایمان والو! اپنے صدقوں کو احسان (رکھ کر) اور اذیت (پہنچا کر) باطل نہ کرو ۱۰۳۳ جس طرح وہ شخص جو اپنا

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ

مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کو، اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ۱۰۳۴

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ

سو اس کی شان تو ایسی ہے کہ جیسے ایک چکنا پتھر ہے جس پر کچھ مٹی ہے پھر اس پر زور کی بارش ہو سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے ۱۰۳۵

غنی۔ وہ خود اول تو محض اپنے ہی فائدے کے لئے خرچ کراتا ہے اور جو کوئی کچھ خرچ کرتا ہے وہ اپنے ہی دائمی نفع کے لئے کرتا ہے کوئی مشرک یا مشرک صفت احمق ہی یہ سمجھے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ خود خدا کو دیا جاتا ہے یا یہ کہ خدا ہمارے زر و مال کا محتاج ہے۔

حلیم۔ اسی لئے مجرموں اور قانون شکنوں کو سزا فی الفور نہیں دیتا، سائل کی بدتہذیبی، غنی کی بددماغی سب کو ایک مدت تک معاف کرتا رہتا ہے۔

۱۰۳۳ (اور اپنے کو اضافۂ اجر وازدیاد ثواب سے محروم نہ کر دو)

لا تبطلوا ابطال سے یہاں مراد مزید فضل و کرم کا ابطال ہے۔

قیل المراد بالابطال ابطال الفضل دون الثواب (بحر)

فقہاء نے لکھا ہے کہ جس طرح صدقہ کا ابطال یہاں حرام و ممنوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح کوئی سا بھی نیک عمل ہو اسے باطل کر ڈالنا حرام و ممنوع ہے، چنانچہ نفل نماز کی نیت باندھ کر اسے توڑ ڈالنے کی حرمت و ممانعت اسی قاعدہ کے ماتحت ہے۔

۱۰۳۴ (اور ایسا شخص صدقہ کے نفس اجر و ثواب ہی کو ضائع کر کے رہتا ہے)

دو صورتیں یہاں الگ الگ بیان ہوئی ہیں، دونوں کا فرق ملحوظ رہے، پہلی صورت میں خطاب اہل ایمان سے ہے، نفس صدقہ تو ان لوگوں کا پورا ہو جائے گا لیکن احسان جتانے یا اذیت پہنچانے سے ترقی درجات و اضافۂ اجر سب سلب ہو جائے گا، دوسری صورت میں ذکر اہل کفر کا ہے، یہ جب خدا اور آخرت پر ایمان ہی سے محروم ہیں تو ان کے صدقہ و خیرات سے بظاہر جو کچھ بھی مقصود ہو سب کا حاصل دنیا ہی ہوگا، ایسوں کو اجر کس چیز کا، رضائے الٰہی کی طلب تو کسی درجہ میں بھی ان کے عمل کا جزو نہیں۔

رئاء الناس۔ انجیل میں بھی اس سے ملتی جلتی ہدایت موجود ہے (متی۔ ۶: ۲)

محققین نے لکھا ہے کہ ریاء کی مذمت میں یہ آیت نص صریح ہے۔

یہ معیار خدمت خلق کا یہ ہے، اسے کیا مناسبت ان لوگوں سے ہے جو چندے دیتے ہی اس غرض سے ہیں کہ اخباروں میں خوب ان کا ڈھنڈورا پٹے اور جلسوں اور کانفرنسوں میں ان کے شکریہ کے رزولیوشن پاس ہوں!

۱۰۳۵ (اور وہ ویسا ہی کورا رہ جائے جیسا پہلے تھا)

لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۲۶۴)

(ایسے لوگ) کچھ بھی نہ حاصل کر سکیں گے اپنی کمائی سے ۱۰۳۶ اور اللہ کافر لوگوں کو راہِ ہدایت نہ دکھلائے گا ۱۰۳۷

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال رضائے الہی کی طلب میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور اپنے نفس میں پختگی (پیدا

اَنْفُسِهِمْ کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ

کرنے کی غرض سے) ۱۰۳۸ ایک باغ کی طرح ہے جو کسی ٹیکرے پر ہو اور اس پر زور کا مینھ پڑا ہو پھر وہ دوگنے پھل لایا ہو ۱۰۳۹

تشبیہ کا ماحصل یہ ہے کہ کافر اسی طرح اپنے کو قیامت کے دن ہر خیر و خیرات کے اجر سے محروم پائے گا، اس کا انفاقِ مال حقیقۃً کسی صدقہ و خیرات کے حکم میں آتا ہی نہیں۔
خوب خیال کر لیا جائے، اسلام میں مقبول وہی صدقہ ہے جو رضائے الہی کی خاطر کسی درجہ میں تو ہو۔
کمثل صفوان۔ تشبیہ محرومیٔ اجر کے لحاظ سے دی گئی ہے۔

۱۰۳۶ ذکر انھیں لوگوں کا ہے جو نعمتِ ایمان سے محروم ہیں۔
مِمَّا کَسَبُوا۔ یعنی جسے وہ اپنے خیال و پندار میں اپنی کمائی سمجھ رہے ہیں، ورنہ بندہ کی کمائی تو حقیقۃً وہی ہے جس پر عملِ صالح کا اطلاق ہو سکے اور عملِ صالح کی پہلی اور بنیادی شرط ایمان ہے۔

۱۰۳۷ (قیامت کے دن، ثواب کے گھر یعنی جنت کی۔)
یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو کفر اختیار کئے ہوئے ہیں اور اپنی قوتِ فیصلہ سے صحیح کام نہیں لے رہے ہیں انھیں زبردستی راہِ ہدایت دکھا دینے کا قانونِ الہی ہے ہی نہیں۔

۱۰۳۸ (جیسا کہ ہر مومن مخلص کا شیوہ ہوتا ہے)
تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ اتنے سے ٹکڑے میں نفسیاتِ بشری کی ایک گہری حقیقت بیان ہو گئی ہے، معصیت کی طرح ہر طاعت کا بھی خاصہ ہے کہ وہ متجانس اعمال کو کھینچتی ہے چنانچہ ہر عملِ صالح کے بعد نفس میں دوسرے اعمالِ صالح کے لئے آمادگی و پختگی پیدا ہو جاتی ہے، اور نفسِ بشری کا یہ ایک خاصہ ہے کہ ہر عمل سے تکرار و عادت کے بعد اس عمل سے متعلق ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے مزاحمت کی قوت مغلوب و ضعیف ہوتی جاتی ہے۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں دلیل ہے کہ عملِ صالح سے جس طرح حصولِ اجر مقصود ہوتا ہے اسی طرح اصلاحِ نفس بھی مقصود ہوتی ہے۔
یہ معنی تو ظاہر ہی ہیں کہ وہ خرچ اس لئے کرتے ہیں کہ کمالِ ایمان اور ثابت قدمی اور اطمینان حاصل ہو، ایک دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ان کے دل اللہ کے کرم اور ثواب پر مطمئن ہیں، وہ صرفِ مال کو نہ نقصان سمجھتے ہیں نہ باعثِ گرانی۔

۱۰۳۹ (کہ ہوا کی لطافت و زمین کی صلاحیت اور بارش کی کثرت مل ملا کر قوتِ بار آوری کو خوب بڑھا دیں گی)

فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور اگر زور کا مینھ نہ بھی پڑے تو ہلکی پھوار (ہی کافی ہے) ۱۰۴۰ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے ۱۰۴۱

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو جس کے نیچے ندیاں پڑی بہ رہی ہوں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ

(اور) اس کے ہاں اس باغ میں اور بھی ہر قسم کے میوے ہوں اور اس کا بڑھاپا آچکا ہو اور اس کے

الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ

عیال کمزور ہوں۔ اس (باغ) پر ایک بگولا آئے کہ اس میں آگ ہو تو وہ (باغ)

فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

جل جائے۔ اللہ اسی طرح تمہارے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر سے کام لو ۱۰۴۲

اصابہا. ضمیر مؤنث ربوۃ کی جانب ہے۔

یعنی الربوۃ (قرطبی)

وابل۔ خوب زور کی بارش، بڑے بڑے بوند والا پانی۔

ای مطر شدید (قرطبی) المطر الثقیل القطار (راغب)

۱۰۴۰ تمثیل کی زبان میں بیان اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ اخلاص اگر درجۂ اعلیٰ میں نہ ہو جب بھی محض ایمان اور عدمِ موانع (یعنی احسان نہ رکھنا اور ایذا نہ پہنچانا) بجائے خود صدقات و خیرات کو مقبول بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔

۱۰۴۱ (اور اس لئے ہر ایک کے درجۂ اخلاص کا بھی خوب جاننے والا ہے)

خطاب یہاں عام نسلِ انسانی سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا فر، مومن مخلص، غیر مخلص سب کے محرکاتِ عمل اور سب کے درجۂ اخلاص و عدمِ اخلاص سے خوب واقف ہے۔

۱۰۴۲ (اور اپنے انجام کو سوچ کر اس کے مطابق عمل کرتے رہو)

من نخیل واعناب۔ قرآن میں تصریح کے ساتھ نام انھیں میووں کا لیا گیا جو اہلِ عرب کے لئے خاص اہمیت اور خصوصی معنویت رکھتے تھے، ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی۔

تحتہا الانہر۔ یہ یہ ظاہر کرنے کو ہے کہ وہ باغ خوب سرسبز و شاداب بھی تھا۔

من کل الثمرات۔ یہ مالک باغ کی مرفہ الحالی اور شانِ غنا ظاہر کرنے کو ہے۔

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن

اور نصیحت تو بس صاحبانِ فہم ہی قبول کرتے ہیں ۱۰۵۱ اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو یا جو بھی نذر

نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۗ وَمَا

مانتے ہو یقیناً اللہ (سب کچھ) جانتا ہے اور ناانصافوں کا حامی

لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ

کوئی بھی نہ ہوگا ۱۰۵۲ اگر تم صدقات کو ظاہر کر دو جب بھی اچھی بات ہے۔

قال ابن زید الحکمۃ العقل فی الدین (قرطبی) قال ابراھیم النخعی الحکمۃ الفہم فی القرآن وقال زید بن مسلم (قرطبی)

اور دین کی اس فہمِ صحیح میں بخل سے بیزاری اور صرف میں توازن بھی شامل ہے۔

من یشاء۔ یہ حکمت کی تقسیم و عطا مشیتِ تکوینی کے ماتحت و مطابق ہوتی رہتی ہے۔

من یؤت الحکمۃ۔ یہ حکمت و دانائی ہرگز نہیں کہ جو کچھ بھی کمایا جائے سب بس اپنے نفس کی لذتوں اور خواہشوں پر اڑا دیا جائے جیسے زمانی اور حکمت یہ ہے کہ اس آج سے کل کا ذخیرہ جمع کیا جائے آج تخم ریزی ایسی کی جائے کہ کل پھل ہی پھل ہاتھ لگیں اور ایمان و طاعت کا ایسا بیمہ کرا دیا جائے جو آیندہ کی دائمی اور غیر منقطع زندگی میں برابر کام آتا ہے

خیرًا کثیرًا۔ صیغۂ نکرہ اظہارِ عظمت کے لئے ہے یعنی بہت ہی بڑی نعمت۔

تنکیر تعظیم۔ (مدارک)

۱۰۵۱ (اس لئے خطابِ خصوصی بھی انہیں سے ہے)

اولو الالباب یعنی عقلِ سلیم سے کام لینے والے۔ نصیحت سے مراد راہِ حق پر چلنے اور اسبابِ دین کی اطاعت کی نصیحت ہے اہلِ لطائف نے کہا ہے کہ آیت میں شیطانی وسوسہ کا علاج علم (حکمت) کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے جس طرح اس سے قبل نفسانیت کا من و اذی میں عمل سے بتایا جا چکا ہے۔

۱۰۵۲ (یوم جزا میں)

مآ انفقتم۔ جو کچھ خرچ کرتے ہو اچھے برے کسی مصرف میں۔

من نذر۔ نذر وہ چیز ہے جسے عوامی زبان میں منت ماننا کہتے ہیں، فقہ میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ کسی مراد کے پورے ہونے پر اپنے اوپر کوئی ایسی چیز لازم کر لینا ہے جو واجب نہ تھی۔

النذر عقد القلب علی شیء والتزامہ علی وجہ مخصوص (روح) النذر ما یلتزمہ الانسان بایجابہ علی نفسہ (کبیر)

یہ نذر عبادتِ بدنی کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے مثلاً نماز یا روزہ اور عبادتِ مالی کی صورت میں بھی۔

یعلمہ یعنی اس کا علم رکھتا ہے کہ وہ کس نیت سے اور کس کی راہ میں مانی گئی ہے اور اس علم کامل کے مطابق جزا و سزا بھی ہوگی

کنایۃ عن مجازاتہ سبحانہ علیہ (روح) لیجازیکم علیہ (بیضاوی)

وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ

اور اگر انھیں چھپاؤ اور فقیروں کو دو جب تو یہ تمھارے حق میں اور بہتر ہے ۱۰۵۳ اور اللہ تم سے

عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۷۱﴾

تمھارے کچھ گناہ بھی دور کر دے گا ۱۰۵۴ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۱۰۵۵

لظلمین۔ یعنی قانونِ الٰہی توڑنے والوں کا، اپنے حق میں ناانصافی کرنے والوں کا۔

۱۰۵۳ نیکی کی طرح صدقات و خیرات کے بھی مخفی ادا کرنے کی فضیلت تو ظاہر ہی ہے لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی برابر پیش آتے رہتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان و اظہار ضروری ہو جاتا ہے، ایک شخص ہے کہ بھوک پیاس سے نڈھال یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے، ہم قریب سے گزر رہے ہیں اور بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اُسے کھلا پلا کر یا دوا دے کر از سرِ نو اٹھا کھڑا کریں! لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں ہماری اس خدمت کا شمار ریا و نمائش میں نہ ہو جائے اس کے پاس سے کترا تے اور خاموش گزرتے چلے جائیں یہ تقویٰ نہیں عین معصیت اور انتہائی وہم پرستی ہوئی، یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی تھی خواہ اس کے لئے اعلان بہ بانگِ دہل ہی کرنا پڑے، نہ یہ کہ شبۂ ریا و شائبہ نمائش سے بچنے کے لئے تلاش پہلے گوشۂ تنہائی کی کر لی جائے، جن مذہبی طبقوں نے نیکی کے اہتمام یا اخفاء میں تاکید حد سے زیادہ کی ہے اور خدمتِ خلق کو اخفاء کے ساتھ محدود و مقید کر دیا ہے ان کی تعلیم یقیناً ناقص ناتمام یک طرفہ ہے اور انھوں نے زندگی میں شب و روز اس قسم کے پیش آنے والے بکثرت واقعات کو نظر انداز ہی کر دیا ہے۔
مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عمل خیر کے اعلان و اخفاء میں اختیار ہے اور ساتھ ہی افضلیت اخفاء کی ہے جب اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔

اِن تبدوا و اِن تخفوا۔ یعنی حسبِ ضرورت و مصلحتِ دین، اعلان و اخفاء جو بھی مناسب ہو۔

تؤتوھا الفقرآء۔ یعنی فقیروں کے حوالے کرو اہتمامِ اخفاء کے ساتھ۔

تخفو۔ یعنی وہی اہتمام اخفاء۔

ای فالاخفاء خیر لکم۔ (روح)

الفقرآء۔ بجائے فقراء کم کے محض فقراء کے لفظ سے استنباط یہ کیا گیا ہے کہ صدقہ دینے کے لئے شرط اسلام کی نہیں، مسلم و کافر سب کو صدقہ دیا جا سکتا ہے، جو بھی حاجت مند ہو۔

العق فی الآیۃ لفظ الفقراء لم یقل فقراء کم فدل ذالک علی ان الصدقۃ تجب علی کل فقیر وان کان غیر ... (جصاص)
فقہاء نے جس مد کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رکھا ہے وہ زکات ہے، جس کی ادائی ارکانِ اسلام میں سے ہے یا پھر صدقۂ فطر، عام صدقات پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

۱۰۵۴ (ان نیکیوں کی برکت سے)
قرآن مجید نے ازالۂ سیئات کی جہاں اور صورتیں رکھی ہیں وہاں ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہو لی رہتی ہیں اور حسنات سیئات کو محو کرتی رہتی ہیں، یہ چیز محض عقیدہ کی نہیں مشاہدہ اور تجربہ کی بھی ہے کہ خلق کی نظر سے

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط

ان کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ۱۰۵۶ بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۱۰۵۷

چنانچہ طاعت اور نیکیوں کی عادت اگر ڈال لی جائے تو ایک عرصہ کی مشق کے بعد نفس کی اصلاح خود بخود ایک بڑی حد تک ہو جاتی ہے، اور جو کچھ خرابیاں پھر بھی باقی رہ جائیں ان سے درگزر کے لئے خدائے رحمٰن ورحیم کا لطف وکرم کافی ہے جو خوبیوں کو خرابیوں کا، اور بھلائیوں کو برائیوں کا عوض بنا تا رہتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مسیحیوں کے اس بنیادی عقیدہ کو ایک بار پھر یاد کر لیا جائے کہ گنہگاروں کی نجات اور گناہوں کے دھلنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ "خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا" انسان کے قالب میں دنیا میں آئے اور اپنی جان کو صلیب پر دے کر سب کی طرف سے کفارہ ادا کرے۔

من سیاٰتکم۔ من تبعیضیہ ہے یعنی یہ صدقہ سارے گناہوں کا نہیں، البتہ کچھ گناہوں کا کفارہ بن جائے گا

من للتبعیض۔ (بحر۔ نہر)

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ تبعیض کا یہ ابہام مصلحۃً رکھا گیا ہے، اور گناہوں کی یہ تفصیل قصداً مخفی رکھی گئی ہے کہ فلاں فلاں گناہوں کا کفارہ صدقات سے ہو جائے گا، تاکہ بندہ ان گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے۔

ابہم الکلام فی ذلک ابعض لان بیانہ کالاغراء بارتکابہا اذا علم انہا مکفرۃ بل الواجب ان یکون العبد فی کل احوالہ بین الخوف والرجاء۔ (کبیر)

بعض نے من کو من اجل کا مرادف قرار دیا ہے اور فقرے کے معنی کئے ہیں من اجل ذنوبکم (کبیر) اور ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ من صلۂ زائد ہے جیسے من کل الثمرات میں اور مراد سارے گناہوں کے کفارے ہے۔

والثالث انہا صلۃ زائدۃ والتقدیر ونکفر عنکم جمیع سیاٰتکم (کبیر) قیل مزیدۃ علی رأی الاخفش (روح)

۱۰۵۵ (اور اس لئے وہ اجر بھی اعمال واحوال کے مطابق دے گا۔)

گناہوں سے باز رکھنے میں خدائے علیم وخبیر کے علم کل ونظر محیط کا استحضار اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور اس لئے قرآن مجید نے اسے ہر ایسے موقع پر دہرایا ہے۔

۱۰۵۶ (اے پیمبر!)

ھُدٰىھُمْ ان کی یعنی کافروں کی۔ ضمیر جمع کا مرجع الناس بھی ہو سکتا ہے۔

اور جب ذمہ داری آپ پر نہیں تو امت پر تو اور بھی نہیں۔ اس لئے مراد میں آپ کے ساتھ امت کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔

المراد بہ ھو وامتہ (کبیر)

۱۰۵۷ (اپنی مشیت تکوینی کے ماتحت ومطابق)

رسول کا کام صرف تبلیغ ہے یعنی ہدایت کا پیام دنیا تک پہنچا دینا، باقی کس کو قبول حق کی توفیق ہوتی ہے اور کس کو نہیں اس کا تعلق تمام تر مشیت الٰہی سے ہے، شان نزول کی روایتوں میں آتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ بعض دفعہ کسی کافر مشرک حسب حاجت کو خیرات دینے سے اس مصلحت سے رک جاتے تھے کہ شاید یہ احتیاج ہی کی بنا پر اسلام قبول کر لیں، آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ اتنے بعید اہتمام کی ضرورت نہیں، محض تبلیغ کافی ہے، فقہاء امت نے کہا ہے کہ کافر کو خیرات دینا بالکل جائز ہے بشرطیکہ وہ حربی نہ ہو

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ

اور تم جو کچھ بھی مال میں سے خرچ کرتے ہو سو اپنے لئے (کرتے ہو) ۱۰۵۸ اور تم اللہ ہی کی رضا جوئی کے لئے خرچ کرتے ہو ۱۰۵۹

المراد اباحة الصدقة عليهم وان لم يكونوا على دين الاسلام وقد روى ذلك عن سعيد بن جبير (جصاص)

حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ تیرا کھانا خاص متقی کھایا کریں، مراد اس سے طعام دعوت ہے اور آیت میں مراد طعام حاجت ہیں تعارض کا شبہ نہ کیا جائے (تھانویؒ)

کافر حربی کو صدقہ وغیرہ جائز نہیں (تھانویؒ)، کافر ذمی یعنی غیر حربی کو زکوۃ دینا تو جائز نہیں اور دوسرے صدقاتِ واجب ونفل سب جائز ہیں (تھانویؒ)

آیت میں ذکر زکوۃ کا نہیں، عام صدقات کا ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ کسی کے زیادہ درپے نہ ہو اور تدبیر میں بھی بہت زیادہ انہماک نہ رکھے۔ کفار کو صدقہ نہ دینا تدبیر ہی کی ایک قسم تھی۔

۱۰۵۸ یعنی اپنے ہی اجر اُخروی کے لئے نہ کہ کسی اور کے لئے۔

فهو لانفسكم لا ينتفع به غيركم۔ (کشاف)

یہاں بعض مشرک قوموں کا یہ عقیدہ مستحضر کر لیجئے کہ نذرانے اور چڑھاوے فلاں دیوی اور فلاں دیوتا کے نفع کے لئے ہوتے ہیں۔

ماتنفقوا۔ یعنی اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہو۔

من خیر۔ یعنی اپنے مال میں سے خیر یہاں مال کے مرادف ہے۔

من مال (کشاف) ای من مال (معالم)

خیر۔ اصلاً شر کے مقابل ہے اور اس کے مفہوم میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کو انسان اچھا سمجھتا ہے مثلاً عقل، اخلاق، پُرمنفعت شے وغیرہ۔

الخير ما يرغب فيه الكل كالعقل مثلا والعدل والفضل والشئ النافع۔ (راغب)

اور قرآن مجید میں مال کے لئے خیر کا لفظ متعدد بار مال ہی کے حسنِ استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے مثلاً ان ترك خيرًا وانه لحب الخير لشديد۔ ما انفقتم من خير فللوالدين وغیرہا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خیر کا اطلاق اُس مال پر ہوتا ہے، جو بڑی مقدار میں ہو اور حلال جائز ذریعہ سے حاصل ہوا ہو۔

وقال بعض العلماء لا يقال للمال خير حتى يكون كثيرا ومن مكان طيب (راغب)

۱۰۵۹ (سو یہ مقصد ہر حاجت مند کی حاجت براری سے پورا ہو جاتا ہے خواہ اُس کے عقائد کچھ بھی ہوں)

كان النبي صلعم لا يتصدق على المشركين فنزلت وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله فتصدق عليهم (ابن جریر)

مطلب یہ ہوا کہ مقصود جب اپنے لئے نفع اُخروی یا حصولِ اجر ہے تو وہ تو ہر حاجت مند کی امداد سے ہو سکتا ہے، صدقہ کو مسلمانوں ہی پر محدود رکھنے کی قید کیوں لگائی جائے۔

وجہ اللہ کے معنی عام طور پر ذاتِ الٰہی کے کئے گئے ہیں۔

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۷۲﴾

اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو (سب) تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تم پر (ذرا بھی) زیادتی نہ کی جائے گی ۱۰۶۰

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

(اصل) حق اُن حاجتمندوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں ۱۰۶۱

ربما عبر عن الذات بالوجه (راغب) وجعله كثير من الخلق بمعنى الذات۔ (روح)
لیکن دوسرے معنی رضاء الٰہی کے بھی ہو سکتے ہیں اور بعض محققین اسی طرف گئے ہیں۔
عبر بالوجه عن الرضا كان ابتغاء مرضاة الله وذلك عادة العرب (بحر) وبعضهم جعله هنا على الرضا (روح)
ای رضاء اللہ (مدارک)
محض للہ کے مقابلہ میں ابتغاء وجہ اللہ کہنے میں ایک تو زور زیادہ پیدا ہو گیا، دوسرے یہ معنی بھی پیدا ہو گئے کہ کسی اور کی شرکت مقصود و مطلوب نہیں صرف اللہ ہی کی رضا مقصود ہے گویا یہ ترکیب تاکید اور حصر دونوں کی جامع ہے۔
ای ما تنفقون بسبب من الاسباب الا لهذا السبب (روح) ای ثوابه لا غيره من اغراض الدنيا۔
آیت میں رد ہے ان جاہل صوفیہ کا جو ثواب اور اجر کے مقصد کو اخلاص کے منافی سمجھتے ہیں (جلالین) قرآن مجید نے تو بارہا ضمناً نہیں صراحتہً ترغیب دی ہے اجر و ثواب کے تلاش کرنے کی۔
آیت کا یہ جزو بہ ظاہر بیانیہ ہے لیکن مقصود اس سے حکم ممانعت یا نہی ہے یعنی تم خرچ نہ کرو بجز اس کے کہ اللہ کی رضا جوئی کے لئے
هذا نفي معناه النهي ای ولا تنفقوا الا ابتغاء وجه الله (مدارک) لفظه خبر ومعناه نهي (معالم) وورد الخبر بمعنى الامر والنهي كثيرا (كبير)

۱۰۶۰ (کہ اجر میں کچھ کسر رہ جائے اور ثواب کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے)
من خیر۔ خیر کے مرادف مال ہونے پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا۔
یوف الیکم۔ سب تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا یعنی آخرت میں سارا اجر و ثواب۔

۱۰۶۱ یعنی صدقات کے اصل مستحق تو وہ حاجت مند ہیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے مبتدا یہاں محذوف ہے اصل ترکیب یوں ہے
هذه الصدقات للفقراء (مدارک)
اُحصروا فی سبیل اللہ یعنی دین ہی کے کسی کام میں گھر گئے اور اب آزادی کسب معاش نہیں کر سکتے اصل مراد یہاں مجاہدین ہیں۔
هم الذين احصرهم الجهاد فمنعهم من التصرف (مدارک)
احصار میں بڑی گنجایش ہے یہ گھر جانا خواہ وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے لحاظ سے، سب اس کے تحت میں آجاتا ہے فقراء المہاجرین کی تصریح تو صرف اس لئے ہے کہ اُس وقت یہی ایک گروہ ایسا تھا۔
انما خص الفقراء المهاجرين بالذكر لانه لم يكن هناك سواهم (قرطبی)
اسی طرح فی سبیل اللہ میں بھی بڑی وسعت ہے دین کا کوئی سا کام، کوئی سی ضرورت ہو، سب اس میں شامل ہو سکتی ہیں گو اصل مراد جہاد ہے

لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ

ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے ۱۰۶۲ ناواقف انھیں غنی خیال کرتا ہے ان کی احتیاط سوال کے

التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا

باعث ۱۰۶۳ تو انھیں ان کے بشرہ ہی سے پہچان لے گا ۱۰۶۴ وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے ۱۰۶۵

ای حبسهم الجهاد او العمل فی مرضاة الله (روح)

مفسر تھانوی نے کہا ہے کہ آیت کے مصداق ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دینیہ میں مشغول ہیں کہ علم دینیہ میں جس مشغولی وانہماک کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ اگر فکر معاش کی مصروفیت کو جمع کر لیا جائے تو علم دین کی خدمت ناتمام رہ جاتی ہے۔

۱۰۶۲ (آزادی سے طلب معاش کے لئے)

یعنی اُن کا وقت خدمتِ دین میں ایسا گھرا رہتا ہے کہ کسب معاش کے لئے انھیں مہلت نہیں ملتی۔

۱۰۶۳ یعنی اُن کی غیرت وخود داری گوارا نہیں کرتی کہ وہ لوگوں سے سوال کریں، ناواقفوں کو اس سے گمان یہ گزرتا ہے کہ یہ لوگ خوش حال ہیں، محتاج ومستحق امداد نہیں۔

غنی یا تونگری شریعت میں حاجتِ اصلی سے مال کے زائد ہونے کو کہتے ہیں۔

[illegible]

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ سالکین کو کوئی ایسی خاص وضع نہ بنانا چاہئے جس سے عام اہل دنیا سے ان کا امتیاز ہو۔

فقہاء نے آیت کے الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ اسم فقیر کا اطلاق ایسے پر بھی جائز ہے جو حیثیت والے کپڑے پہنے ہوئے ہو اور اُسے زکوٰۃ بھی دی جا سکتی ہے۔

[illegible] اسم الفقير [illegible] (قرطبی) [illegible]

۱۰۶۴ (کہ یہ محتاج ومستحق امداد ہیں، اے مخاطب!)

یعنی یہ لوگ زبان سے کچھ بھی نہ کہیں، لیکن ان کا چہرہ بشرہ غور سے دیکھنے کے بعد خود ان کے فقر وفاقہ کی غمازی کرے گا۔ بعض فقہاء نے یہیں سے قرائن اور بشرہ وحلیہ سے استنباطِ نتائج کا جواز نکالا ہے۔

[illegible] (قرطبی)

۱۰۶۵ (شدتِ احتیاج کے باوجود)

اور یہ دلیل ہے ان کے کمال غیرت کی۔

الحافاً اوپر من التعفف کے ضمن میں ابھی آچکا ہے کہ یہ غیور وخوددار لوگ سرے سے سوال ہی نہیں کرتے اور اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ لوگ لگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ الحاف (لگ لپٹ کر مانگنے کی عادت) بُری عادت ہے۔ بعض محققین نے معنی مطلقاً عدم سوال کے کئے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ

اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس کا خوب جاننے والا ہے۱۰۶۶ جو لوگ اپنا مال رات اور دن

اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

(اور) پوشیدہ اور آشکارا خرچ کرتے رہتے ہیں سو ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ

نہ ان کے لئے کوئی خوف (واقع) ہے ورنہ وہ غمگین ہوں گے۱۰۶۷ جو لوگ سود کھاتے رہتے ہیں۱۰۶۸

والمعنی وجه لا یسئلون اصلا وهو المروی عن ابن عباس والیه ذهب الفراء والزجاج والکثرون (بحر)

۱۰۶۶ (تمھارے اخلاص کا، اور اسی نسبت سے اجر بھی دے گا)

وما تنفقوا۔ یعنی ایسے لوگوں پر خرچ کرتے رہو۔

۱۰۶۷ (قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس پہنچ کر)

باللیل والنھار۔ یعنی جس وقت جس گھڑی بھی ضرورت و مصلحت ہو۔

سرًّا وعلانیۃً۔ یعنی پوشیدہ تو حسب عادت اور علانیہ حسب ضرورت و مصلحت۔

الذین ینفقون۔ یعنی اللہ کی راہ اور خدمت دین میں انفاق کی ترغیب یہاں جہاں بھی ہے مطلق انفاق کی نہیں، بلکہ مراد وہی انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدمت دین میں خرچ ہے۔

۱۰۶۸ (اُسے جائز قرار دے کر)

یاکلون الربٰوا۔ محاورہ میں اس سے مراد سود لینا ہے خواہ وہ کسی صرف میں بھی لایا جائے محض کھانا مراد نہیں۔

والمراد یکسبون الربا ویفعلونه فاللباس والسکنی والادخار والانفاق علی العیال داخل فی قوله الذین یاکلون (قرطبی) فالمراد الذین یعاملون به وخص الاکل لانه معظم الامر (کبیر)

اردو محاورہ میں بھی "سود خواری" عام ہے محض "خورش" تک محدود نہیں۔

الربٰوا۔ ربوا کے لغوی معنی ہیں زیادتی اور اضافہ کے ہیں، خصوصًا سرمایہ میں اضافہ کے۔

ربا ای زاد وعلا (راغب) الربا الزیادۃ فی راس المال (راغب)

اصطلاحِ شریعت میں ربوا کہتے ہیں اصل قرضہ پر زیادتی کو، یا بلا معاوضہ مال پر زیادتی کو، خواہ یہ بڑی ہو یا چھوٹی۔

خُصّ فی الشرع بالزیادۃ علی وجه دون وجه (راغب) وفی الشرع عبارۃ عن فضل مال لا یقابله عوض فی معاوضۃ مال بمال (روح) هو فضل مال خال عن العوض فی معاوضۃ مال بمال (مدارک)

اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لئے استعمال کرتے تھے، جو قرض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا تھا، اردو میں اسی کا ترجمہ سود ہے اور سود کا مفہوم ہر ایک سمجھتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ

یہ (سزا) اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے

الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ

اور سود کو حرام کیا ہے سو جس کو نصیحت اس کے پروردگار کی طرف سے پہنچ گئی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا وہ اسی کا ہو چکا

شیطان کی جانب کر دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید بھی دوسری جگہ اسی محاورۂ انسانی سے کام لیا ہے۔

وابعها من عدو الناس انهم اولاد [illegible] تسمية [illegible] في قوله تعالى طلعها كانه رؤس الشياطين (راغب)

اور شیطان عربی میں نہایت وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ ہر خلق ذمیم شیطان ہی ہے۔

سمي كل خلق ذميم للانسان شيطانا فقال عليه السلام الحسد شيطان والغضب شيطان (راغب)

[illegible] (حکم حرمتِ ربو کے جواب میں بطور استدلال کے)

یہ کہنے والے عہدِ جاہلیت کے "روشن خیال" سود خوار اور جوازِ سود کے قائل تھے۔

[illegible] (حصولِ نفع و اضافۂ دولت کے لحاظ سے)

آج کل کے "روشن خیالوں" کی طرح عہدِ جاہلیت قدیم کے بھی بعضوں کا کہنا یہ تھا کہ مالی نفع آخر تجارت میں بھی تو ہوتا ہے پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہو؟ ان نا فہموں نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ دونوں کی ایک سطح معاشی حیثیت سے نہیں۔ سود کی تو ایک متعین رقم بے کھٹکے ہر حال میں مہاجن کو ملتی رہتی ہے بر خلاف اس کے تجارت میں نفع و نقصان دونوں کے احتمالات ہر وقت لگے رہتے ہیں اور تاجر کو نقصان سے بچنے کے لئے وقت محنت ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے پھر تجارتی معاملت تو بروقت ختم ہو جاتی ہے بر خلاف اس کے مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سود خوار کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اکثر اوقات قرضدار کی نوبت بالکل تباہ حالی اور بربادی کی پہنچ جاتی ہے امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں حرمتِ سود کے جو عقلی دلائل لکھے ہیں وہ طرزِ ادا و تعبیر کی تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد آج بھی پوری طرح پڑھنے کے قابل ہیں امام رازیؒ نے نمبر اول پر یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ سود کی رقم آخر کس چیز کا معاوضہ ہوتی ہے؟ بجز مفت خوری کی بدترین شکل کے اور یہ ہے کیا؟

[illegible] (اور معلوم ہے کہ اللہ وہ ہے جو شرائع اور احکام کا مالک ہے اور حکیم بھی ہے اور حاکم بھی)

جب حکیم مطلق نے ایک معاملت کو جائز اور دوسری کو حرام ٹھہرا دیا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ جائز کے اندر بے شمار منافع و مصالح اور حرام کے اندر بے شمار مفاسد و نقصانات ہیں اور بالفرض کسی کی سمجھ میں یہ مصالح و مفاسد نہ بھی آئیں جب بھی حاکم مطلق کا حکم واجب العمل تو بہر حال ہے۔

اسلام کے جو احسانات ساری دنیا پر اور بہت روشن و نمایاں حیثیت سے ہیں اُن میں سے ایک حرمتِ سود بھی ہے اس کے مفاسد روشن سب پر ہو چکے تھے اس سے عاجز سب ہی آ چکے تھے لیکن قطعی اور کلی صورت میں حرام اُسے دنیا کے ضابطوں اور شریعتوں میں صرف اسلام ہی نے قرار دیا، سود خوار کے دل میں قساوت و سنگدلی، اور حرصِ مال، اور

منزل ۱

وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا

اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے رہا۱۰۷۴ اور جو کوئی پھر عود کرے تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں وہ

خَالِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ

ہمیشہ پڑے رہیں گے ۱۰۷۵ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے ۱۰۷۶

بلا مشقت مال ہاتھ آجانے سے نفس میں نامروت اور زرپرستی، اور ساہوکاروں کا بخل اور باہمی حسد، رقابت، اور قرضدار بیچارہ کی بےحرمتی وتذلیل، یہ واقعات ومشاہدات کہنا چاہیے کہ پیش پا افتادہ تھے، لیکن اس کی قطعی بندش کا خیال کسی انسانی دماغ کو نہ آیا، اصلاح حال کی جو کوششیں زیادہ سے زیادہ ہوئیں وہ بس شرح سود کی تحدید تک رہیں، یونان میں سولن، انگلستان میں بیکن اور یورپ میں پائے کلیسا کے جوش اصلاح وافادۂ خلق کی کائنات کل اسی قدر ہے۔ یہ فخر قیامت تک کے لئے عرب کے اُمّی کے ساتھ مخصوص ہو گیا کہ اس انسانیت کش رسم کی حرمت کی منادی اس کی زبان سے کرائی گئی اور حرمت ربوٰا کا زلزلہ افگن نعرہ اس کے دہن سے بلند کرایا گیا۔

۱۰۷۳ (اور وہ اس کھائے ہوئے نوالے کے اگلنے پر مجبور نہیں)

موعظۃ من ربہ۔ یعنی یہی حرمت سود کا حکم۔

فانتھٰی۔ یعنی وہ باز آگیا سود لینے اور اسے جائز ٹھہرانے سے۔

فلہ ما سلف۔ یعنی اسی حکم حرمت سے قبل جو کچھ وہ لے چکا سے چکا، توبہ کے بعد بھی گنجائش ہے کہ اس مال کو اپنے پاس رہنے دے، پچھلی رقموں کی واپسی پر شریعت اسلام نے مجبور نہیں کیا ہے۔

وھذا ھو المروی عن الباقر وسعید بن جبیر۔ (روح)

۱۰۷۴ (جو دلوں کے اسرار وخفایا کا عالم ہے)

مقصود یہ ہے کہ یہاں بیان بندوں کے سامنے معاملہ کے صرف ظاہری اور قانونی پہلوؤں کا ہو رہا ہے، باقی قلب کے تقویٰ وطہارت اور نفس کی اصلاح کا معاملہ اللہ پر چھوڑنا چاہئے۔

امرہ۔ میں ضمیر باز رہنے والے من انتھٰی کی طرف ہے۔

الظاھر ان الضمیر فی امرہ عائد الی من انتھٰی۔ (بحر)

۱۰۷۵ یعنی جو کوئی اس تبلیغ کے بعد بھی عقیدۂ جواز سود پر قائم رہے یا سودی معاملت کرتا رہے۔

اولٰئک اصحٰب النار۔ یہ سزا ہے سودی معاملت کرنے والوں کی، معاملت سود گناہ کبیرہ ہوا اور گناہ کبیرہ کی سزا جہنم ہے۔

ھم فیھا خٰلدون۔ یہ سزا ہے جواز سود کے قائلوں کی، جواز سود کا عقیدہ کفر ہے اور کفر کی سزا خلود جہنم ہے۔

ای ماکثون ابدا لکفرھم (روح) لان من احل ما حرم اللہ عز وجل فھو کافر فلذا استحق الخلود (بحر) معتزلہ نے آیت کے اس جزء سے مومن اہل معاصی کی عدم مغفرت پر استدلال کرنا چاہا ہے لیکن تفسیر کا جو پہلو یہاں اختیار کیا گیا اس پر یہ سوال وارد ہی نہیں ہوتا، امام رازیؒ نے بھی تفسیر کبیر میں اس مقام پر خوب تقریر کی ہے۔

وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور اللہ پسند نہیں کرتا کسی کٹے کافر گنہگار کو ۱۰۷۵ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے اور

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا

نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی ان کے لئے ان کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے نہ اُن پر

خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾

کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۰۷۸

۱۰۷۶ آخرت میں تو اس وعدہ ووعید دونوں کا مشاہدہ پوری طرح ہو کر رہے گا کہ سود میں برکت و خیریت کے نام بھی نظر نہ آئے گی اور صدقات کا اجر بے حساب ملے گا، لیکن دنیا میں بھی اس کا ظہور کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہی رہتا ہے، سود خوار قوموں کا انجام بارہا آپس کی خونریزی اور تباہی و بربادی ہی پر ہوا ہے اور افراد میں بھی مشاہدہ ہے کہ سود خواری کی عادت بنیوں، مہاجنوں کے دل میں روپیہ کو تو نفسِ محبوب بنا دیتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سود خوار زر و دولت سے دنیوی لطف بھی نہیں اٹھا پاتا، اس کے مقابلہ میں صدقہ کی برکتیں یعنی غمخواری و ہمدردی، ایک دوسرے کی مشارکت و معاونت، قوم و افراد دونوں میں مشاہدہ کی چیزیں ہیں، بینکوں کے آئے دن ٹوٹنے، مہاجنوں اور بنیوں کے دیوالہ نکلتے رہنے اور پھر اس سے ہزاروں گھروں کی تباہی و بربادی کس نے نہیں دیکھی ہے؟ معاشرہ کی اس ابتری کا راز یہی سودی کاروبار کی ترویج ہے۔

۱۰۷۷ اس کے اندر دونوں قسم کے نافرمان آگئے، وہ جو سود کا کاروبار کرتے ہیں اور وہ جو اپنے عمل کے ساتھ ساتھ حُرمتِ سود کے عقیدۃً بھی منکر ہیں۔

کَفَّار، کافر کا صیغہ مبالغہ ہے ناشکرے اور کفرانِ نعمت کرنے والے کے مفہوم میں کفود کا مرادف اور اس سے بلیغ تر۔

الکفور المبالغ فی کفران النعمة والکفار ابلغ من الکفور (راغب)

یہاں مُراد وہ لوگ ہیں، جو جوازِ سود کے قائل ہیں۔

مُصِرّ علی تحلیل المحرمات (بیضاوی) ای عظیم الکفر باستحلال الربٰوا (مدارک)

اردو محاورہ میں کافر کے مفہوم کو اور زوردار بنانے کے لئے "کٹّا کافر" بولتے ہیں۔

اثیم، بڑے گنہگار یعنی سود خواری جیسی شدید معصیت میں مبتلا۔

مُتمادٍ فی الاثم بأکلہ (مدارک) مُنهمك فی ارتکابه (بیضاوی)

کَفّار کے لفظی معنی بڑے ناشکرے کے ہیں جس شخص پر اللہ اپنا اتنا فضل کرے کہ اُسے اس کی اپنی ضروریات سے زیادہ مال دے اور وہ اس مال کو بندوں کی آزار رسانی پر صرف کرے تو اس سے بڑھ کر سوء استعمال کی مثال اللہ کے فضل کی اور کیا ہو گی اور ایسے بدبخت سے بڑھ کر ناشکرا اور کون قرار پائے گا۔

۱۰۷۸ (قیامت میں)

وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾

اور اگر تم توبہ کر لوگے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں ۱۰۸۱ نہ تم کسی پر ظلم کروگے اور نہ تم پر کسی کا ظلم ہوگا ۱۰۸۲

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ

اور اگر تنگ دست ہے تو اس کے لئے آسودہ حالی تک مہلت ہے ۱۰۸۳ اور اگر معاف کر دو تو تمہارے حق

لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ

میں اور بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو ۱۰۸۴ اور اس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم (سب) اللہ کی طرف لوٹائے جاؤگے ۱۰۸۵

مالی وکاروباری صورتوں سے بھی احتیاطاً بچتے رہیں جن کا سودی ہونا قطعی نہیں صرف اغلب ہے۔

ان لم تفعلوا۔ یعنی اگر اس حکم حرمت سود پر عمل نہ کروگے۔

۱۰۸۱ یعنی حکومت اسلامی تمہارا اصل سرمایہ تمہیں واپس دلا دے گی۔ اگر توبہ نہ کروگے تو اصل مال بھی بحق حکومت اسلام ضبط ہو جائے گا۔

ان تبتم۔ یعنی اگر سود خواری کی معصیت سے توبہ کر لوگے۔

۱۰۸۲ یہاں شریعت اسلامی کی ایک کلی حقیقت بیان کر دی کہ تم نہ کسی پر زیادتی کرو، اور نہ کوئی تم پر زیادتی کرے۔
لا تظلمون۔ ظالم بننے کی صورت تو یہ ہے کہ کوئی رقم قرض دی اور وصول کرتے وقت اصل سے زائد وصول کر لی یعنی سود لینا

بطلب الزیادة علی رءوس اموالکم (کبیر)

لا تظلمون۔ مظلوم بننے کی صورت یہ ہے کہ جتنی رقم قرض لی تھی اب ادا کرنا اس سے زائد کا پڑ رہا ہے یعنی سود دینا

ای بالنقصان رأس المال (کبیر)

۱۰۸۳ یعنی مدیون یا قرضدار اگر وقت پر تنگدست ہو تو اسے اسی وقت تک کے لئے مہلت دیدی جائے جب تک وہ ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔

۱۰۸۴ (کہ اس احسان و حسن سلوک پر کتنا اجر عظیم موعود ہے)

ان تصدقوا۔ یعنی نادار مدیون کو اپنا مطالبہ بالکل معاف ہی کر دو۔ عقائد اسلامی کی طرح قوانین اسلامی کی بھی پوری قدر اس وقت ہوتی ہے جب ان کے مقابلہ میں اپنے کو مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے والی قوموں کے قوانین رکھے جائیں، خود اس قرض کے معاملہ میں دوسری قوموں کے قانون قرضداروں کے حق میں کتنا سخت ظالمانہ ہیں۔ رومی قانون ایام عروج کی "رومن لا" میں مدیون کو قتل تک کیا جا سکتا تھا، اور رومی تاریخ میں دائنوں کے ظلم و زیادتی سے بار بار نوبت شدید بلووں تک آ گئی ہے۔ ایک درخشندہ اسلامی نظام معاشیات کی بنیاد ہی سرے سے کہیں بڑھ کر انسانیت و روحانیت تقویٰ الٰہی پر رکھی ہے اور یہ خصوصیت اسے دنیا کے قدیم و جدید سارے معاشی نظاموں سے ممتاز کئے ہوئے ہے۔

۱۰۸۵ (اپنے اپنے اعمال کی جانچ کے لئے)

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ يٰٓاَيُّهَا

پھر ہر شخص کو اس کا معاوضہ پورا پورا ملے گا اور ان پر ظلم (ذرا بھی) نہ ہو گا ۱۰۸۶ اے ایمان والو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

جب اُدھار کا معاملہ کسی مدتِ معین تک کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو ۱۰۸۷

مراد یوم حشر ہے۔

وجمهور العلماء على ان هذا اليوم المحذر منه هو يوم القيامة والحساب والتوفية (قرطبی)

یوم موت بھی مراد لیا گیا ہے۔

وقال قوماً هو يوم الموت (قرطبی)

خطاب یہاں نوعِ انسان سے ہے۔

والاٰية وعظ لجميع الناس۔ (قرطبی)

۱۰۸۶ (کہ کسی کا نیک عمل بلا معاوضہ رہ جائے یا کسی کے نامۂ عمل میں کوئی بدی خواہ مخواہ لکھ دی جائے)
تُوَفّٰى مَا كَسَبَتْ۔ یعنی اعمال کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا، ماکسبت میں پورا مفہوم اعمالِ اختیاری کا آگیا، اور ضمناً رد فرقۂ جبریہ کا نکل آیا۔

وفی هذه الاٰية نصّ على ان الثواب والعقاب متعلق بكسب الاعمال وهو رد على الجبرية (قرطبی)

متعدد اقوالِ تابعین میں آیا ہے کہ قرآن مجید کی یہی آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے اور حضور صلعم اس کے بعد جلد ہی وفات پا گئے۔ تفصیلات قرطبی وغیرہ میں درج ملیں گے۔

۱۰۸۷ (اور اس صاف صاف لکھا پڑھی کو نہ دلیل بے اعتمادی کی سمجھو اور نہ اس میں شرماؤ)
دَيْنٍ۔ دَین کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے، عربی میں یہ عین کے مقابلہ میں ہے اور اس کا اطلاق ہر اس معاملت پر ہوتا ہے، جس کے معاوضہ کا ایک جز فی الفور ادا نہ ہو۔

هو عبارة عن كل معاملة كان احد العوضين فيها نقداً والاٰخر فی ذمة النسيئة كان العين عند العرب ما كان حاضراً والدين ما كان غائباً۔ (ابن عربی۔ قرطبی)

تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ۔ دَین یا اُدھار معاملت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ چیز ابھی خریدی اور قیمت کے لئے طے پا گیا کہ اتنی مدت کے بعد دیں گے، دوسری یہ کہ قیمت اسی وقت دیدیں اور چیز کے لئے یہ طے پا گیا کہ اتنی مدت کے بعد لیں گے شرعاً دونوں صورتیں جائز ہیں تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔ تداینتم کے بعد دَین کی تصریح تاکید کے لئے ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ فقہاء مفسرین نے اس سے یہ اشارہ سمجھا ہے کہ قرضہ کے معاملات میں مدت بالکل صاف اور متعین ہونا چاہئے، گول اور مجمل نہ رہے "جاڑوں کے زمانہ میں" "برسات کے موسم میں" "ربیع کی فصل میں" ان مبہم مدتوں کے بجائے تعیین و صراحت ہونا چاہئے کہ فلاں سنہ کے فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ۔ فقیہ ابن العربی مالکی نے اسی ایک آیت سے

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ

اور لازم ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے

كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ

اس کو سکھا دیا ہے ۸۸۲ پس چاہیئے کہ وہ لکھ دے اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق واجب ہے ۸۸۳

ذیل میں ۲۰ مسئلے لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت مسائل بیع میں اہم ترین آیت ہے۔ ھی اصل فی مسائل البیوع وکثیر من الفروع۔
اور قرطبی نے بھی اتنے مسئلے اس کے تحت میں درج کئے ہیں۔
فاکتبوہ۔ یعنی مقدار قرضہ کو بھی اور مدتِ ادائیگی، دونوں کو لکھ لو۔
یعنی الدین والاجل (قرطبی) ای الدین بأجله لانہ اوثق وادفع۔ (روح)
یہ کتابتِ دستاویز کا حکم جمہور فقہاء کے ہاں استحبابی ہے۔
والجمہور علی استحبابہ (روح) مذھب الجمھور الی ان الامر بکتابۃ الدین للندب (المنار)
لیکن ایک معتدبہ جماعت نے اسے وجوب کے معنی میں بھی لیا ہے۔
وذھب اقوام الی ان الامر للوجوب وبہ قال عطاء والشعبی وابن جریر الطبری (المنار)
عامی صوفیہ اور جاہل مشائخ نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ معاملت و معاشرت کی اصلاح و درستی سلوک و طریقت کے منافی ہے وہ غور کریں کہ قرآن کو اس باب میں کتنا اہتمام بلکہ اس کے ادنیٰ جزئیات تک کا انضباط مدِّنظر ہے۔

۸۸۲ باہمی لین دین اور قانونی معاملات کے سلسلہ میں دنی ادنیٰ جزئیات تک کے لئے شریعت کا یہ اہتمام! اللہ اللہ! عالمگیر ہدایت و رہنمائی کا حق اگر کسی کتاب کو پہنچتا ہے تو بے شک وہ یہی کتاب ہو سکتی ہے کہاں ایک طرف یہ مکمل نظامِ زندگی اور مفصل ضابطہ حیات اور کہاں اس کے مقابلہ میں انجیل جس کے صفحات قانون و معاملت کی موٹی موٹی ہدایات تک سے خالی ہیں!
کما علمہ اللہ۔ اللہ کی تعلیم سے مراد محض فن کتابت کی تعلیم نہیں بلکہ سارے علوم فقہ و شریعت کے لئے عام ہے۔
فان تعلم اللہ ایاہ لیس خاصا بصناعۃ الکتابۃ بل ھو یعم ما یعرفہ من علم الاحکام والفقہ فیھا (المنار)
بالعدل۔ یعنی کسی فریق سے متاثر ہوئے، کسی کی رُو رعایت کئے ہوئے بغیر لکھے۔ فقہاء نے یہاں سے یہ بھی نکالا ہے کہ کاتب کو مُتدین اور شرائطِ تحریر کا عالم ہونا چاہیئے اور فریقین پر لازم ہے کہ ایسے ہی کاتب کی تلاش کریں۔
فیہ دلیل ان یکون الکاتب فقیھا عالما بالشروط وھو امر للمتداینین بتخیر الکاتب (مدارک)
لایاب کاتب۔ فقہاء نے کہا ہے کہ کاتب کو اپنی محنت کی اُجرت لینا جائز ہے۔
آیت میں کاتب کے لکھنے سے انکار کی صریح ممانعت ہے۔
نھی اللہ الکاتب عن الاباء۔ (قرطبی)
بالعدل میں ب کا تعلق جس طرح ولیکتب سے جائز ہے اسی طرح کاتب سے بھی درست ہے، اور دونوں ہی قول اختیار کئے گئے ہیں۔

۸۸۳ دستاویز کا حاصل کسی حق کا اپنی طرف اقرار کرنا ہے یہ قدرۃً اسی کو کرنا چاہیے جس کے ذمہ کوئی حق واجب الادا ہو۔

وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ

اور چاہیے کہ وہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرتا رہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے ۱۰۹۰ پھر اگر وہ جس کے ذمہ حق واجب ہے

الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ

عقل کا کوتاہ ہو یا کمزور ہو اور اس قابل نہ ہو کہ وہ خود لکھوا سکے ۱۰۹۲ تو لازم ہے کہ اس کا کارکن

وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ

ٹھیک ٹھیک لکھوائے ۱۰۹۳ اور اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ کر لیا کرو ۱۰۹۴

ولیملل ۔ یعنی دستاویز کو لکھانا۔

۱۰۹۰ یعنی جو حق جس طرح اور جتنا اس پر واجب ہے اس کے کاتب دستاویز کو بتلائے اور لکھاتے وقت کچھ کمی کتر بیونت نہ کرے۔

ولیتق اللہ ربہ ۔ خوف خدا تو مسلمان کے لئے جزو زندگی اور اس کی زندگی بھر رہنا چاہیے، دستاویز لکھاتے وقت اس کی تاکید اور یاددہانی کی حکمتیں اور مصلحتیں بالکل واضح ہیں۔

۱۰۹۱ اور یہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ دستاویز لکھانے والا وہی ہونا چاہیے۔

سفیہا ۔ یہ مراد نہیں کہ پاگل ہو بلکہ صرف ضعیف العقل مراد ہے۔

ضعیف الرأی ناقص العقل من البالغین (کبیر)

ضعیف ۔ یہاں ایک جامع لفظ ہے نابالغ اور پیر فرتوت سب اس کے اندر آجاتے ہیں۔

الصغیر والمجنون والشیخ الخرف وھم الذین فقدوا العقل بالکلیۃ ۔ (کبیر)

۱۰۹۲ (کسی اور عذر یا مانع سے)

مثلاً یہ کہ گونگا ہو، پردیسی ہو، ملک کی زبان سے ناواقف ہو۔

۱۰۹۳ (ایسی ہر صورت میں اس کی طرف سے ٹھیک ٹھیک)

ولی سے مراد ۔ یا سرپرست ہے یا وکیل یا مختار (یا پردیسی کے لئے ترجمان) تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی صورت جب ایسی پیش آجائے کہ صاحب معاملہ کا اقرار اور بیان معتبر رہ جائے تو اعتبار اس کے کارکن کے بیان و اقرار کا کیا جائے۔

ولیہ ۔ ضمیر ہ، الذی علیہ الحق کی طرف ہے۔

قیل ھو عائد علی الذی علیہ الحق وھو الصحیح ۔ (قرطبی)

۱۰۹۴ (جو عاقل ہوں، بالغ ہوں، آزاد ہوں، دیندار ہوں)

من رجالکم ۔ اس تصریح کے بعد علاوہ کافروں کے مسلمان بچے اور عورتیں اور غلام دائرۂ شہادت سے نکل گئے۔

ای من رجال المومنین والحریۃ والبلوغ مشروط مع الاسلام (مدارک) نص فی الکفار والصبیان النساء (قرطبی)

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ

پھر اگر دونوں مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ان گواہوں میں سے جنھیں تم پسند

الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى

کرتے ہو ۱۰۹۵ تاکہ ان دو عورتوں میں سے ایک دوسری کو یاد دلادے اگر کوئی ایک ان دو میں سے بھول جائے ۱۰۹۶

دلالہ علی اشتراط الاسلام والبلوغ والذکورۃ فی الشاھدین والحریہ لان المتبادر من الرجال الکاملون (روح)

فقہ امامیہ میں حُریّت، قبولِ شہادت میں شرط نہیں، صرف اسلام اور عدالت کافی ہیں، اور یہی مذہب تابعین میں سے بعض فقہائے اہلِ سُنّت کا ہے۔

وذھب الامامیۃ الی عدم اشتراط الحریۃ فی قبول الشھادۃ وانما الشرط فیہ عندھم الاسلام والعدالۃ والی ذالک ذھب شریح وابن سیرین وابو ثور وعثمان البستی۔ (روح)

غیر مسلموں کی گواہی غیر مسلموں کے معاملات میں قبول ہو سکتی ہے گو ان کے دین ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔

وشھادۃ الکفار بعضھم علی بعض مقبولۃ عندنا (مدارک) ولم تعرض الآیۃ لشھادۃ الکفار بعضھم علی بعض واجاز ذالک قیاماً الامام ابوحنیفۃ وان اختلفت مللھم۔ (روح)

واستشھدوا۔ گواہوں کی یہ گواہی تحریر ودستاویز کے علاوہ ہونا چاہیے، فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ اصل مدارِ ثبوت انھیں گواہوں کی گواہی ہوگی۔

۱۰۹۵ (یعنی جو تمہارے نزدیک ثقہ وقابل اعتبار ہوں)

فان لم یکونا رجلین۔ یعنی دو مرد گواہی کے لیے اگر میسر نہ آئیں۔

رجل وامراتان۔ یہودی قانون میں گواہی صرف مردوں کی معتبر ہے اور عورت کی شہادت سرے سے قابل تسلیم نہیں، اسلام نے اسے یہ حق تو دیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے علم کامل وتحقیق مطلق کی بنا پر عورت کی گواہی کا مرتبہ مرد کے مقابلہ میں نصف مانا ہے۔

ممن ترضون۔ دیانت، ضمیر، سیرت، کردار کا ایک خاص معیار اسلام نے زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ اور معاشرہ کے ہر گوشہ میں بھی قائم رکھا ہے، چنانچہ یہاں یہ قید لا کر صاف بتا دیا کہ شہادت بھی ایک خاص اعزاز ومنصب ہے، ہر کس وناکس اس کا اہل نہیں اس کے اہل وہی ہیں جن کے سیرت وکردار پر اسلامی معاشرہ کو اطمینان ہو اور جن کی دیانت کم سے کم عام طور پر مشتبہ نہ ہو۔

دوسرے ائمہ فقہ نے آیت سے مراد یہ لی ہے کہ گواہوں کی عدالت بھی ثابت ہونی چاہیے۔

الناس لیسوا محمولین علی العدالۃ حتی تثبت لھم وذالک معنی زائد علی الاسلام وھذا قول الجمہور۔ (قرطبی)

لیکن امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ ہر کلمہ گو، جب تک کہ اس میں فسق کی کوئی کھلی ہوئی علامت نہ ہو، عادل (ثقہ) ہی سمجھا جائے گا۔

وقال ابوحنیفۃ کل مسلم ظاھر الاسلام مع السلامۃ من فسق ظاھر فھو عدل وان کان مجھول الحال (قرطبی)

ممن ترضون۔ میں خطاب عام امت سے سمجھا گیا ہے، بعض نے حکام مراد لی ہے۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا

اور گواہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں ۱۰۹۷ اور اس (معاملت) کو خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو اس کی میعاد

اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا

تک لکھنے میں کاہلی نہ ہو یہ (کتابت) اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل ہے ۱۰۹۸ اور شہادت کو درست تر رکھنے والی ہے اور زیادہ قریب اس کے کہ تم شبہ میں نہ پڑو

والخطاب للمؤمنین وقیل للحکام (روح)

۱۰۹۶ (اور اس طرح شہادت مکمل ہو جائے)

اَنْ تَضِلَّ . بھول جائے شہادت کے کسی حصہ کو واقعہ کے کسی جزو کو رہا یہ امر کہ عورت کی شہادت مرد کے مقابلہ میں ضعیف کیوں مانی گئی ہے اور نسیان کا احتمال مرد کی شہادت میں کیوں نہیں رکھا گیا؟ تو یہ سوالات فی الحقیقت اخلاق کی دنیا میں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے جسم و مادیات کی دنیا میں دریافت یہ کیا جائے کہ حمل و رضاعت کا تعلق صرف عورت ہی سے کیوں رکھا گیا اور مرد کو باوجود اس کی قوت و جسامت کے اس بار کے برداشت کے کیوں ناقابل سمجھ لیا گیا؟ جو فاطر کائنات ظاہر ہے کہ جسمیات و مادیات کے ایک ایک ذرہ سے واقف ہے، اس کے پیش نظر ذہنیات و اخلاقیات کی بھی باریک سی باریک حقیقتیں ہیں۔ مغرب کے ماہر نفسیات ہولاک ایلس HAVELOCK ELLIS نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ عورت کے لئے دھوکا اور فریب بہ منزلہ امر طبعی کے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی)

۱۰۹۷ (کہ اس میں اعانت ہے معاملات امت کی اور خدمت ہے دین کی)

ولا یأب الشهداء آہ. یعنی گواہ بننے اور گواہی دینے سے انکار نہ کریں.

لاداء الشهادة (روح)

آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ شہادت دینا امت کے لئے فرض کفایہ ہے.

ومن هٰهنا استنبط ان تحمل الشهادة فرض کفایة قیل وهو مذهب الجمهور (ابن کثیر)

۱۰۹۸ (یعنی وہی کتابت معاملۂ دین سے متعلق)

عند الله. یعنی اللہ کے قانون و ضابطہ میں.

ای فی حکمه سبحانه (روح)

لَا تَسْـَٔمُوْٓا. بار بار لکھنے لکھانے سے طبیعت میں ایک طرح کی کاہلی یا اکتاہٹ پیدا ہو جانا تقریباً قدرتی ہے.

تَكْتُبُوْهُ. میں ضمیر اسی معاملۂ دین سے متعلق ہے.

خطاب وہی عام امت سے ہے.

والخطاب للمؤمنین. (روح)

ایک شور برپا ہے کہ اب زمانہ اس کا نہیں کہ مذہب خصوصاً اسلام کو عقائد معادسے پرکھا جائے اب تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دنیا کے لئے سب سے زیادہ عملی مذہب کون ہے؟ اور روزانہ مسائل زندگی کے حل کرنے میں کون مذہب سب سے زیادہ زور دے رہا ہے؟ یہ معیار بجائے خود کس حد تک صحیح ہے یہ تو ایک الگ سوال ہے، لیکن بہرحال جو لوگ اسی معیار کو مانے ہوئے ہیں کم سے کم وہ تو

إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ

لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جیسے تم باہم لیتے ہی رہتے ہو سو تم پر اس میں کوئی الزام نہیں کہ تم

عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوٓا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَآرَّ

اسے نہ لکھو ۹۹؁ اور جب خرید و فروخت کرتے ہو (تب بھی) گواہ کر لیا کرو ۱۰۰؁ اور کسی کاتب یا گواہ کو

كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ

نقصان نہ پہنچایا جائے ۱۰۱؁ اور اگر (ایسا) کرو گے تو یہ تمہارے حق میں ایک گناہ (شدید) ہوگا ۱۰۲؁ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۱۰۳؁

خلوئے ذہن کے ساتھ غور کریں کہ ساری شریعتوں میں اسلام سے بڑھ کر کس شریعت نے روزانہ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کے حل کرنے کا اہتمام رکھا ہے۔

۹۹؁ یہ اس لئے کہ دستگرداں معاملتیں کثرت سے برابر واقع ہوتی رہتی ہیں اور عموماً مقداریں بھی انکی خفیف ہوتی ہیں اور عموماً ان میں احتمال نزاع و اختلاف کا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسے موقعوں پر کتابتِ دستاویز کے التزام سے ہرج لازم آتا تھا، اس لئے شریعت نے التزام کو یہاں سے اٹھا دیا، لیکن اگر کوئی معاملت ایسی ہو کہ شکل کے اعتبار سے تو دست بدست لیکن مالیت بڑی ہو یا آیندہ اختلاف و نزاع کے احتمالات موجود ہوں یا اور کسی اعتبار سے حالات وہاں وہ نہ ہوں جو عموماً تجارت حاضرہ یا معاملۂ دستگرداں میں ہوا کرتے ہیں تو ایسے موقع پر ترک کتابت کی علت مفقود ہو گی اور اہتمام کتابت مطلوب ہو گا۔

۱۰۰؁ یعنی ایسے موقع پر گواہی کرا لینا بہتر ہو گی۔
وَأَشْهِدُوٓا ۔ صیغۂ امر یہاں وجوب کے لئے نہیں صرف استحسان کے لیے ہے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور اکثر ائمہ کی یہی رائے ہے۔

وذهب الشعبي والحسن الى ان ذالك على الندب والارشاد لا على الحتم ويحكى ان هذا قول مالك والشافعي واصحاب الرأى (قرطبی) والامر للندب (مدارك) والاوامر التى فى هذه الأية للاستحباب عند اكثر الائمة (بيضاوى)

۱۰۱؁ یعنی کوئی فریق اپنی مصلحت کی خاطر کاتب یا گواہ کو زحمت میں نہ ڈالے اور کاتب اور گواہوں کو حکم مل چکا ہے کہ کتابت اور گواہی سے پہلو تہی نہ کریں اب فریقین کو حکم مل رہا ہے کہ وہ بھی کاتب اور گواہوں کی مصلحت و آسائش کا خیال رکھیں۔
وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ ۔ کاتب کو نقصان پہنچانا مثلاً یہ کہ اُسے بلا اُجرت کتابت پر مجبور کیا جائے یا اس کے کسی ضروری شغل میں ہرج ڈال کر اس سے کتابت کرائی جائے۔
ولا شهيد ۔ گواہ کو تکلیف میں ڈالنا مثلاً یہ کہ باوجود احتیاج اسے آمد و رفت کا خرچ بھی نہ دیا جائے یا اس کے کسی ضروری شغل میں ہرج ڈال کر اُسے گواہی کے لئے طلب کیا جائے۔

۱۰۲؁ (کہ جس کام سے منع کیا گیا وہی کر رہے ہو)
فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ ۔ کی تصریح کر کے حکم کی اہمیت کو کس درجہ بڑھا دیا ہے ـــــ انّهٗ یعنی وہی نقصان پہنچانا

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ

اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے ۱۱۰۴ اور اللہ ہر چیز کا بڑا جاننے والا ہے ۱۱۰۵ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ ۱۱۰۶

وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

تو رہن رکھنے کی چیزیں ہی قبضہ میں دے دی جائیں ۱۱۰۷ اور تم میں سے اگر کوئی کسی پر اعتبار رکھتا ہے ۱۱۰۸ تو جس کا

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا

اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ دوسرے کی امانت (کا حق) ادا کر دے اور چاہیے کہ اللہ یعنی اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے ۱۱۰۹

الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو کوئی اسے چھپائے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا ۱۱۱۰ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کا بڑا جاننے والا ہے ۱۱۱۱

ع ۳۹ / ۲

یعنی المضارۃ (قرطبی)

مطلب یہ ہوا کہ اس تکلیف دہی کو معمولی بات نہ سمجھو یہ ایک مستقل معصیت ہے۔

۱۱۰۳ (چھوٹے بڑے سارے معاملات اور کارروائیوں میں)

سبحان اللہ! تقویٰ الٰہی کی تاکید کن کن موقعوں پر کی ہے، اور حقوقِ عباد کی ادائی پر کتنا زور دیا ہے۔

۱۱۰۴ (تمام تر حکمت کی باتیں)

بعض اہلِ علم نے ’’یُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ‘‘ کو فقرۂ سابق ’’وَاتَّقُوا اللّٰہَ‘‘ سے بالکل مربوط کر کے استنباط یہ کیا ہے کہ علمِ حقیقی عین نتیجہ ہوتا ہے تقویٰ الٰہی کا، تقویٰ اختیار کرو اور تم خود علمِ الٰہی مرحمت ہونے لگے گا۔

وعدٌ من اللّٰہ تعالٰی بانّ من اتقاہ علّمہ [illegible]

لیکن بعض دوسرے اہلِ علم نے اسی شدت کے ساتھ اس کا انکار بھی کیا ہے جن کی [illegible]

۱۱۰۵ چنانچہ وہ اپنے اس علم کے مطابق معاملت بھی مطیع و عاصی سے کرے گا، اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس کا کوئی خفیف سا عمل بھی اللہ کے علم سے باہر رہ جائے گا۔ مختصر سے جملہ میں لفظ ’’اللّٰہ‘‘ کا تین بار لانا، جو جلال و تاکید کے لئے ہے

کرر لفظ اللّٰہ فی الجمل الثلاث لاستقلالها فان الاولی حث علی التقوی والثانية وعد بانعامه [illegible]

والثالثة تعظيم لشانه (بيضاوى) [illegible]

۱۱۰۶ (کتابتِ دستاویز کے لئے جبکہ معاملہ رہن کی ضرورت آپڑے)

رہن کے سلسلہ میں سفر کی تصریح شاید اس لئے کر دی گئی ہے کہ سفر کی حالت میں اس معذوری کے پیش آجانے کا احتمال زیادہ ہے، ورنہ بیان دراصل معذوری کا ہے، اور یہ سفر کے ساتھ محدود و مقید نہیں۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ عام معذوری کے [illegible]

نص علی احوال العذر علی الغالب [illegible] (قرطبی)

من اعطاء الوثیقۃ فی السفر بعثۃ الرھن ولی الحضر بالسنۃ بسنۃ الرسول صلعم (قرطبی)

ولم تجدوا کاتبا۔ یعنی کاتب نہ موجود ہو، یا سامان کتابت (قلم، دوات، کاغذ وغیرہ) نہ موجود ہو۔

قال ابن عباس او وجد ولم یجد قرطاسا او دواۃ او قلما (ابن کثیر)

۱۰۰۷ (صاحب حق کے مدیوں کی طرف سے)

یعنی جب کتابت ممکن نہ ہو تو رہن بالقبضہ ہی اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔

رھن۔ ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ یہی ہوتا ہے، فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ رہن بالقبضہ تو صرف قرض دینے والے کے اطمینان کے لئے ہے، اسے یہ حق نہیں کہ وہ شے مرہون سے فائدہ بھی اٹھاتا رہے۔

۱۰۰۸ (اور اس نے رہن کی ضرورت نہیں سمجھا)

۱۰۰۹ معاملات کے سلسلہ میں یہ تقویٰ الٰہی کی تاکید ایک بار پھر ملاحظہ ہو۔

الذی اؤتمن امانتہ۔ یعنی مدیون۔

فلیؤد۔ ادا کرے پورا پورا، حکم وجوبی ہے۔

وھو امر معناہ الوجوب (قرطبی)

۱۰۱۰ (اور اصل شے قلب ہی کی گنہگاری ہے)

آثم قلبہ۔ سب سے بڑا گناہ تو قلب ہی کا گناہ ہے، چنانچہ کفر جو سارے کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے قلب ہی کا گناہ ہے اس لئے اس اسلوب بیان نے خود یہ ظاہر کر دیا کہ کتمان شہادت شدید ترین گناہ ہے۔

الاثم فان اصل الحسنات والسیئات الایمان والکفر وھما من افعال القلوب واذا جعل کتمان الشھادۃ من آثام القلوب فقد شھد لہ بانہ من معاظم الذنوب (مدارک) وقلوب فی الکلام مبالغۃ فی ان الکتمان من اعظم الذنوب (روح)

قلبہ سے، اشارہ اس جانب بھی ہو گیا کہ اخفاء شہادت گناہ زبان کا نہیں، گناہ قلب کا ہے۔

ولا تکتموا الشھادۃ۔ اور گواہی کو مت چھپاؤ ادائے شہادت کے وقت۔

یہ ادائے شہادت کا حکم عام ہے تمام معاملاتِ قانونی کے لئے، مثلاً نکاح، مہر، وصیت وغیرہ، صرف معاملۂ رہن کے ساتھ مخصوص نہیں، اور شہادت چھپانے کی ساری صورتیں اس ممانعت کے اندر آجاتی ہیں، مثلاً ادائے شہادت سے گریز کرنا یا شہادت میں واقعات صحیح نہ بیان کرنا، وقس علیٰ ہذا۔

ومن یکتمھا۔ اور یہ کتمان خواہ جزئی ہو یا کلی بہرصورت معصیت ہے، ایک صحت مند معاشرہ کے لئے لازمی ہے کہ اس کا ہر فرد سچی گواہی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ رہے، شریعت کی نگاہ میں اخفائے شہادت اور جھوٹی شہادت دونوں سخت ترین جرم ہیں۔

قال ابن عباس وغیرہ شھادۃ الزور من اکبر الکبائر وکتمانھا کذلک (ابن کثیر)

فرنگی تمدن و معاشرت نے اسلام کی اس تعلیم کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

ادائے شہادت چونکہ واجب ہے فقہاء نے اس پر اجرت لینا ناجائز قرار دیا ہے البتہ آمد و رفت وغیرہ کا جو کچھ خرچ ہو اس کا بقدر واقعی وصول کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۱۱ (اور وہ اپنے اسی علم کامل کے مطابق جزا و سزا دے گا)

بما تعملون۔ مثلاً ایک عمل اخفاءِ شہادت ہے جو معصیت ہے اور دوسرا عمل ادائے شہادت ہے جو طاعت ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ

اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱۱۱۲ اور جو کچھ تمہارے نفسوں کے اندر ہے اگر اس کو

اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

ظاہر کرو ۱۱۱۳ یا اسے چھپائے رکھو بہرحال اللہ اس کا حساب تم سے لے گا ۱۱۱۴ پھر جسے چاہے گا بخش دے گا ۱۱۱۵ اور جسے چاہے گا عذاب

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ

دے گا ۱۱۱۶ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۱۱۱۷ پیغمبر ایمان لائے اس پر جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے

رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟

نازل ہوا ہے ۱۱۱۸ اور مومنین بھی۔ یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر

۱۱۱۲ (اور کسی دیوی، دیوتا، بزرگ، مظہر، اوتار وغیرہ کی شرکت اس میں نہیں)

قرآن مجید کی طویل ترین سورہ کا اب آخری رکوع شروع ہو رہا ہے۔ عقیدۂ توحید کا ایک بار پھر اعادہ و اثبات ہو رہا ہے۔ آغاز اصولِ دین سے متعلق جامع تعلیم سے ہوا تھا، سورہ کا خاتمہ بھی اسی جامعیت و بلاغت کے ساتھ انہی کی تلخیص پر ہو رہا ہے۔

۱۱۱۳ (زبان سے یا عمل سے)

مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ جو کچھ دلوں کے اندر ہے افعالِ ارادی و اختیاری میں سے، جیسا کوئی عقیدۂ فاسدہ یا عزم معصیت، اس میں وسوسہ اور گزرنے والے خیالات داخل نہیں کہ وہ حدودِ مواخذہ سے خارج ہیں۔

ولا تدخل الوساوس وحدیث النفس فیما یخفیه الانسان لان ذلك مما لیس فی وسعه ... (روح)

۱۱۱۴ (شرک اور تمام معصیتوں کے)

یہ چھپانے اور ظاہر کرنے کا فرق تو بندوں کے اعتبار سے ہے، ورنہ اللہ کے لئے تو دونوں حالتیں یکساں ہیں۔

والمعنی ان الله یعلم ما الاخفاء والابداء بالنسبة الی الله تعالی سواء (روح)

۱۱۱۵ (قانونِ فضل و رحمتِ عامہ کے مطابق)

ذکرِ مغفرت کی تقدیم ذکرِ تعذیب پر شاید اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خود صفتِ مغفرت مقدم ہے صفتِ غضب پر۔

وتقدیم المغفرة علی التعذیب لان رحمته سبقت غضبه (روح)

آیت سے اہلِ سنت نے مومن عاصی و صاحبِ کبائر کی مغفرت پر استدلال کیا ہے اس لئے کہ مومن مطیع تو بہر صورت ماجور ہوگا اور کافر و مشرک بہر صورت معذب، درمیانی حالت مومن صاحبِ کبائر ہی کی باقی رہ جاتی ہے۔

الاعتصام ... اجمعوا ... الامة علی جواز غفران ذنوب المؤمن ... الکبائر (بحر)

۱۱۱۶ (اپنے قانونِ عدل و حکمتِ کاملہ کے تحت)

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ

ہم اس کے پیمبروں میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار!

رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

ہم تجھ ہی سے بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف واپسی ہے اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اس کی بساط کے مطابق اُسے ملے گا وہی

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ

جو کچھ اُس نے کمایا اور اس پر پڑے گا وہی جو کچھ اُس نے کمایا اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں

تعذیب کو مشیتِ الٰہی پر معلق رکھنے سے اہلِ سنت کو ایک دلیل اپنے مسلک کی تائید میں ہاتھ آگئی ہے۔

وفي الآية دليل لأهل السنة في نفي وجوب التعذيب حيث علق بالمشيئة. (روح)

۱۱۱۷ اللہ فاعل بالارادہ ہے مختارِ کُل ہے اور اس سے منزہ ہے کہ عفو و مغفرت کے لئے اُسے ضرورت بطور فدیہ یا کفارہ کے کسی "خدائے مصلوب" کی ہو۔ آیت میں اشارۃً رد آگیا عقیدۂ نصاریٰ اور متعدد مشرک قوموں کے عقائد کا۔ خدا اپنے ہی ارادہ یا مشیت کے سوا کسی اور قانون کا پابند نہیں، جیسا کہ ہندی مشرک قوموں نے عقیدۂ "کرم" (مکافات) سے خیال کر رکھا ہے۔

۱۱۱۸ (یعنی قرآن پر)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ۔ اپنی رسالت یعنی پیامِ حق کی حقانیتِ کامل پر ایمان لانے والے سب سے پہلے خود پیمبر ہی ہوتے ہیں۔ ایمان ایمان تو سب کا برابر ہے لیکن بہ اعتبارِ ظرف و بہ لحاظِ کیفیت پیمبر کے ایمان اور عام افرادِ امت کے ایمان کے درمیان آسمان اور زمین کا فرق ہے، ہر ایک کے ایمان کا مرتبہ بھی اس کی حیثیت اور مرتبہ کے متناسب ہوتا ہے۔

۱۱۱۹ اس جامع آیت کے اندر تمام لوازمِ ایمان بیان ہو گئے ہیں۔

اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس کی ذات اور صفت دونوں کی تصدیق کی جائے حسبِ تصریحاتِ قرآنی و تعلیماتِ نبوی، یہ تردید ہو گئی دہریت، لاادریت، ارتیاب وغیرہ کی، خدائے واحد کی تصدیق جزم کے ساتھ کرنا لازمی ہے۔

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ۔ فرشتہ کی تعریف اوپر گزر چکی ہے کہ وہ ایک نوری مخلوق ہے جس سے صدورِ معصیت کا امکان نہیں، کثرت سے مشرک قوموں کو ٹھوکر اسی عقیدہ میں لگی ہے، فرشتوں کو بجائے تمامتر خدائی کارندے سمجھنے کے ان کی عظمت سے متاثر ہو کر انھیں کائنات کے مختلف شعبوں میں مستقلاً متصرف سمجھنے لگے اور انھیں دیوی دیوتا کہہ کر پکارنے لگے مثلاً فلاں آگ کا دیوتا ہے، فلاں ہوا کی دیوی ہے، فلاں بارش کا دیوتا ہے وقس علیٰ ہذا۔ قرآن مجید نے جو فرشتوں کے عقیدہ پر بار بار زور دیا ہے اس کا مقصد شرک کی اس خاص قسم یعنی دیوتا پرستی کا استیصال ہے، فرشتے گو نوری ہوتے ہیں، معصوم ہوتے ہیں لیکن بہرحال خالقِ کائنات کے سامنے انسان ہی کی طرح ایک عاجز و بے بس مخلوق ہوتے ہیں، اللہ کے ساتھ اُن کی ذات یا صفات کو مدغم کر دینا انتہائی جہل و عناد ہے۔

وَكُتُبِهٖ۔ آسمانی نوشتوں اور ہدایت ناموں کے باب میں بھی بڑی افراط و تفریط ہوتی آئی ہے، کسی کسی قوم نے تو ان کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ خدا ہے تو سہی لیکن کوئی ہدایت نامہ نہیں بھیجتا، اور بہت سی قوموں نے ان کتابوں کو ذہنِ انسانی کی

پیدا وار قرار دیا، جنھیں چند بڑے اور ہدایت یاب نہ ماننے والوں نے مل کر گھڑ لیا۔

وَرُسُلِہٖ رسالت کا عقیدہ بھی شرک تو موحد بنی بالکل مسخ کر دیا تھا دنیا رسولوں کو بھول چکی تھی اور قائل اس کی رہ گئی تھی کہ حق کے ذریعہ سے ہدایت اور پھر نجات ہوتی ہے وہ یا تو خدا کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے یا خود خدا کسی انسانی یا حیوانی قالب میں۔ قرآن مجید نے آکر بتایا کہ یہ انسان اور بندے ہی ہوتے ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہتی ہے سلسلۂ وحی کو ماننا ہی گویا "اوتار" کے عقیدہ پر ضرب لگانا ہے آیت سے واضح ہو گیا کہ ایمان کے ارکان ضروری یہ چار ہیں: ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل۔

اعلم ان ھذہ الاٰیۃ دلت علی ان معرفۃ ھذہ المراتب الأربعۃ من ضرورات الایمان۔ (کبیر)۔

۱۱۲۰؎ (کہ بعض کے قائل ہوں اور بعض کے منکر، بلکہ سب کو برحق سمجھتے ہیں اور سب کے مسلک ہدایت پر اللہ کی طرف سے ہونے کا یقین رکھتے ہیں) یہ مقولہ مومنین کا ہے۔

ای یقولون لانفرق (بیضاوی۔ مدارک)

یہود کی طرح نہیں کہ بجز اپنی نسل یعنی اسرائیلی انبیاء کے اور کسی کو نہ مانیں اور ان میں سے بھی جس کے لئے جی چاہے انکار کر دیں، یہاں تک کہ سلسلۂ اسرائیلی کے خاتم (حضرت مسیحؑ) سے تو وہ عداوت رکھیں کہ اپنے خیال میں ان کی جان ہی لے ڈالیں، اور نہ نصرانیوں کی طرح کہ ایک اسرائیلی نبی کے ماننے میں تو وہ غلو کریں کہ پیمبری سے اٹھا کر اوہیت کے مرتبہ تک پہنچا دیں اور اسمٰعیلی شاخ سے پیمبر کا پانے والے سے عداوت ہی ٹھان لیں۔ انگریزوں میں ایک مشہور مؤرخ گبن ہوا ہے قرآن مجید اس کے نزدیک کلامِ الٰہی نہیں کلامِ محمدی ہے با ایں ہمہ اس آیت کی وسعت پر حیران ہو کر کہتا ہے: "محمد کی وسیع المشربی نے اپنے پیش روؤں کے لئے بھی وہی درجہ رکھا جو خود اپنے لئے اور ہبوطِ آدمؑ سے لے کر نزولِ قرآن تک سلسلۂ وحی کو قائم رکھا" (تاریخ زوال رومن امپائر، جلد ۵ صفحہ ۳۴۲)

حضرات انبیاء میں باہم جو تفاضل و فرق مراتب ہو آیت کو اس سے بحث نہیں آیت میں تو ذکر اس کا ہے کہ تفریق سے انکار کسی نبی کا بھی جائز نہیں لانفرق۔ بعض اہل طریق نے اسی پر قیاس کر کے کہا ہے کہ اولیاء کاملین میں بھی یہ تفریق نہ کرنا چاہیے کہ کسی سے اعتقاد رکھے اور کسی سے انکار کرے۔

۱۱۲۱؎ سَمِعْنَا۔ سن لیا ہم نے اللہ کے پیام کو گوشِ قبول سے۔

فیہ حذف ای سمعنا سماع قابلین وقیل سمع بمعنی قبل کما یقال سمع اللہ لمن حمدہ (قرطبی) ای سمعنا وھو المعنی العرفی للسمع (روح)

اَطَعْنَا۔ اطاعت کی ہم نے اللہ کے پیمبر کی، رضا و رغبت کے ساتھ۔

الطاعۃ قبول الامر (قرطبی) ای قبلنا عن طوع ما دعوتنا الیہ فی الاوامر والنواھی (روح)

۱۱۲۲؎ (نہ کہ کسی اور کی طرف)

غُفْرَانَکَ رَبَّنَا۔ یعنی وہ مغفرت جو تو ہی عطا کرے گا، اس میں رد آ گیا نصرانیوں اور دوسری قوموں کا، جو مغفرت کو عطیۂ الٰہی نہیں، بلکہ "ابن اللہ" یا کسی اور کی عنایت کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔

ترکیب میں عامل فعل مقدر سمجھا گیا ہے۔

تقدیرہ اغفر غفرانک قالہ الزجاج وغیرہ نطلب او اسأل غفرانک (قرطبی)

وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ میں بھی رد ہے نصرانیوں کا، جو خلقت کی واپسی حشر میں "ابن اللہ" کی جانب سمجھتے ہیں۔

۱۱۲۳؎ (احکامِ شرعیہ میں)

احکامِ شرعی کی قید لگا دینے سے امور تکوینی خارج ہو گئے اور ذمہ دار بنا دینے سے مراد ہے ان اعمال سے متعلق سوال و باز پرس ما

۱۱۲۵ یہ مومنین کو ایک جامع و کامل دعا کی تعلیم ہو رہی ہے۔
اِنْ نَّسِيْنَآ۔ یعنی باوجود یاد رکھنے کی کوشش کے بھول جائیں۔
اَخْطَاْنَا۔ یعنی باوجود عزم اہتمام کے بھی چوک جائیں۔

۱۱۲۶ (اور جیسی جیسی آزمائشوں سے انھیں دو چار ہونا پڑا، وہ ہم پر نہ ڈال)
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ یعنی بعض سابق اُمتوں پر۔ انجیل میں پطرس حواری مسیح کا قول غیر اسرائیلی مسیحوں کے باب میں نقل ہوا ہے کہ اب تم ان کی گردن پر ایسا جُوا رکھو کہ جس کو نہ ہمارے باپ دادا اٹھا سکتے تھے نہ ہم۔ خدا کو کیوں آزماتے ہو؟ (اعمال ۱۵: ۱۰)
گویا اسرائیلی شریعت اُن کے حق میں ایسا سخت جُوا تھا جو اُٹھائے اُٹھ نہ سکتا تھا۔
اِصْرًا سے مراد ہے سخت حکم جو حدِ بشری سے خارج تو نہ ہو لیکن اس کی تعمیل میں مشقت و کلفت زیادہ پڑے۔

استعیر للتکلیف الشاق (کشاف) والمراد به التکالیف الشاقة. (روح)

قرآن مجید نے ضمناً اس انجیل میا لغہ بیانی کی بھی اصلاح کر دی اور یہ اشارہ کر دیا کہ گو وہ احکام سخت ضرور تھے لیکن نہ ایسے کہ اُن پر نا قابلِ برداشت ہونے کا اطلاق ہو سکے۔

۱۱۲۷ (نہ حوادثِ تکوینی میں نہ احکامِ شرعی میں، اور حق پرستی کو ہمارے لئے آسان کر دے)
دعا کا یہ جز و کمالِ عبدیت کا مظہر ہے۔ شانِ رحمت کا اقتضاء تو خود ہی یہ ہے کہ ایسا بار ہم پر نہ ڈالا جائے گا لیکن عقلاً اس کا امکان تو بہر حال تھا اور ہے ــــ مالکِ کامل کو مملوک پر اور خالق کو عبد پر اختیارِ تصرف تو ہر قسم ہر طرح کا حاصل ہے

۱۱۲۸ (بلا کسی رکاوٹ کے، بغیر ادنیٰ شائبۂ سزا کے)
عَنَّا۔ ہم سے یعنی ہماری بھول چوک سے۔

۱۱۲۹ (ہر عالم میں)
وَارْحَمْنَا۔ یعنی ہم پر رحمتِ کامل ہو دنیا اور آخرت دونوں میں۔
اَنْتَ مَوْلٰىنَا۔ فقرہ کا اضافہ دعا میں غایتِ تذلل و خضوع کے لئے ہے۔

هذه الكلمة تدل على نهاية الخضوع والتذلل والاعتراف بانه سبحانه هو المتولى لكل نعمة يصلون اليها (کبیر)

عفو۔ مغفرت، اور رحمت تینوں کی طلب کی تعلیم یہاں مل گئی۔

۱۱۳۰ (کہ یہ دشمن ہیں تیرے دین اور تیرے آئین کے)
فَانْصُرْنَا عَلٰى۔ نصر کا صلہ جب عَلٰى کے ساتھ آتا ہے تو معنی غالب کرنے یا غلبہ دینے کے ہو جاتے ہیں۔

نصر فلانًا على عدوه: نجاه منه وخلصه واعانه وقواه عليه. (اقرب)

اور غلبہ سے مراد دونوں ہیں یعنی بہ لحاظ دلائل و علوم غلبۂ علمی و معنوی، اور بہ لحاظ تسخیرات جہاد غلبۂ مادی و ملکی

اے فی محاربتنا معهم وفی مناظرتنا بالحجة معهم وفی اعلاء دولة الاسلام علی دولتهم (کبیر)

انصرنا على الجاحدين والمرتابين منهم بالحجة والبرهان وعلى المعتدين بالسيف والسنان (المنار)

النصر بالحجة هو اعلى النصر وافضله لانه نصر على الروح والعقل والنصر بالسيف انما هو نصر على الجسد (المنار)

دعا کے اِس جزو سے معلوم ہوا کہ اعدائے دین پر غلبہ بھی مسلمانوں کا ایک مطلوب بلکہ مقصود ہے۔

ضمیمہ

سورۃ البقرۃ، آیت ۱۸۳، حاشیہ ۶۵۲

[اس نامۂ سیاہ کی متعدد تحریریں روزہ کے موضوع پر پرچہ "صدق" اور "سچ" میں چھپ چکی ہیں، ناظرین کے استفادہ کے لئے یہاں بطور ضمیمہ پیش ہے۔]

روزہ

(۱)

کھانا انسان کی زندگی قائم رکھنے کے لئے ہے، یا انسان کی زندگی اس لئے ہے کہ اُسے کھانے پینے کی لذتوں میں بسر کیا جائے؟ موجودہ مادّی دنیا نے شق دوم کو اختیار کیا ہے، اور اس کا عمل بھی اسی پر ہے۔ مذہب نے شق اوّل کو اختیار کیا ہے اور اپنے پیرووں کو اس پر عمل کی ہدایت کی ہے۔

اسلام دینِ فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس میں کوئی شے فطرتِ انسان و فطرتِ کائنات کے مخالف ہو نہیں سکتی وہ ایک طرف اپنے پیرووں کو جائز لذتوں سے لطف اُٹھانے کی بار بار دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف قدم قدم پر "لَا تُسْرِفُوْا" دائرۂ اعتدال سے قدم باہر نہ رکھو کی بھی تاکید کرتا جاتا ہے۔ لذتوں پر جھک پڑنے کا نام فسق ہے، اور لذتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کو رہبانیت کہتے ہیں۔ اسلام نے جو شاہراہِ ہدایت دنیا کے سامنے پیش کی ہے، وہ فسق ورہبانیت، دونوں سے بچ کر ان کی درمیانی راہ ہے۔

خواص جب گمراہ ہوتے ہیں تو رہبانیت کے ڈھرّے پر پڑ جاتے ہیں۔ عوام کی گمراہی کا نام فسق ہے نفسِ انسانی میں لذتوں پر جھک پڑنے کا قدرتی میلان موجود ہے۔ انسان اکثر انہی لذتوں پر گرتا ہے اور ایسا گرتا ہے کہ انسانیت سے گزر کر بہیمیت کے غار تک پہنچ جاتا ہے۔ رُوح کو چاہیے کہ روز بروز لطافت کی جانب ترقی کرتی جائے تاکہ جب جسم سے جُدا ہو جانے کا وقت آئے تو اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کرکے، جو از سرتاپا نور و لطافت ہے، وصل و وصال کا وہ انتہائی لطف و سرور حاصل کرے جس کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت ہے لیکن انسان جب فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی اُن مادّی لذتوں میں پڑ جاتا ہے (جو اس کی رُوحانی صحت کے حق میں مُضر ہیں) تو رفتہ رفتہ اس کی رُوح کثافت اور گندگی میں آلودہ رہنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جسم سے جُدا ہونے کے بعد اُس میں اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور مجبوراً اُسے تنزّل کرکے مادّہ کی کثافتوں اور آلائشوں کے مرکز سے آمیز ہونا پڑتا ہے جو اس سے کوئی بھی طبعی و خلقی مناسبت نہیں رکھتے اس لئے اسے انتہائی اذیت و تکلیف کا سامنا ہوتا ہے، اور اس کو مذہب کی اصطلاح میں دوزخ کہتے ہیں۔

اسلام خلق اللہ کو راحت و سُرور کی انتہائی منزل تک پہنچانے کا بہترین راہبر ہے۔ اس نے چُن چُن کر اپنے

نظام وآئین میں وہی باتیں رکھی ہیں جو رُوح کی فطری صلاحیت کو بڑھائیں اور گندگی وکثافت میں آلودہ ہونے سے اُسے محفوظ رکھیں۔ ان سب تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر کا نام روزہ ہے محض بھوکا اور پیاسا رہنا یا خواہ مخواہ کسی کو اپنے نفس گرسنگی وتشنگی کی تکلیف میں مبتلا کرنا ہرگز روزہ کا مدعا نہیں۔ روزہ کی غرض وغایت صرف یہ ہے کہ انسان کچھ دیر کے لئے تمام اہم لذّاتِ مادّی کی طرف سے بے توجہ ہو کر رُوح کو اپنی صفائی وپاکیزگی کی جانب متوجہ ہونے کا موقع دے۔ قرآن پاک میں روزہ کی غایت دو لفظوں میں فرما دی ہے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" (تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ) "تقویٰ" کے معنی "بچنے" کے ہیں۔ بچنا کس شے سے؟ ہر اُس شے سے جو رُوح کی پرواز ترقی میں حائل ہوتی ہے۔ ہر اُس شے سے جو رُوح کے جوہرِ لطیف کے حق میں زہر کا اثر رکھتی ہے۔ ہر اُس شے سے جو رُوح کو کثافتوں اور آلائشوں کی دلدل میں پھنسائے رکھتی ہے' قرآنی بلاغت کا یہ معجزہ ہے کہ اس سارے مفہوم کو ایک لفظ "تَتَّقُوْنَ" کے ذریعہ سے ادا کر دیا۔

نماز اور روزہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے دو جداگانہ چیزیں نہیں' بلکہ ایک ہی حقیقت کے ایجابی وسلبی' مثبت ومنفی دو پہلو ہیں۔ نماز کی حیثیت فاعلی ہے یعنی دربارِ خداوندی میں حاضری دو' اپنی رُوحِ جزئی کا براہِ راست تعلق رُوحِ کلی سے پیدا کرو۔ روزہ کی حیثیت انفعالی ہے یعنی ان چیزوں سے بچو جو اس راہ میں حائل ہوتی ہیں جو رُوح کو اس رفتارِ ترقی کے ناقابل بناتی ہیں۔ طبیبِ حاذق علاج بھی کرتا ہے' اور پرہیز بھی بتاتا ہے۔ شفا اُسی وقت ممکن ہے جب مریض دونوں ہدایتوں پر عمل کرے۔ نماز بمنزلۂ دوا ہے' اور روزہ بمنزلۂ پرہیز۔ دوا اور پرہیز دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ظاہر ہے۔

یہی سبب ہے کہ دنیا کے کامل ترین انسان کو نماز کے بعد جو عبادت سب سے زیادہ محبوب تھی' وہ روزہ تھا۔ رسولِ خدا صلعم اس کثرت سے روزہ رکھا کرتے تھے کہ اہلِ خاندان اور اصحابؓ بعض اوقات دنگ رہ جاتے، وجہ یہی ہوتی ہے۔ اعلیٰ ترین رُوح کو رُوحانی پاکیزگی وصفائی کے نمونے بھی بہترین اور کامل ترین دکھانے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا جس جس نے عمل کیا وہ اپنی مراد کو پہنچ کر رہا۔

کھانے پینے میں زیادتی کرنا، عورت سے میل ملاپ، بے چین ہونا، جھوٹ بولنا، سخت کلامی کرنا، کسی کا دل دکھانا، کسی کے پیچھے اس کا بُرائی سے ذکر کرنا، مال ودولت کی ہوس کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو رُوح کی لطافت کو صدمہ پہنچاتی ہیں، اس کی بالیدگی کو روک دیتی ہیں، اس میں تازگی کے بجائے پژمردگی پیدا کرتی ہیں۔ اور جسم ومادہ کی کثافتوں کو بڑھاتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے بچنے اور پرہیز کرنے کا نام روزہ ہے۔ اور روزہ دار کے لئے یہ سب اُمور ممنوع ہیں۔

انسان اگر اپنی عمر کا بیشتر حصہ ان پابندیوں کے ساتھ گزار سکے تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا' لیکن کم از کم سال کا بارہواں حصہ تو اس طرح گزارنا اپنے لئے لازمی سمجھے۔ اور اگر بہت سے بندے مل کر ایک خاص زمانہ اس کے لئے مقرر کرلیں جس میں وہ سب شریک ہوں تو شرکت واجتماع کی بنا پر نفسِ روزہ کی برکتیں بدرجہا بڑھ سکتی ہیں۔ مگر سب کا اپنے ارادہ سے ایک خاص زمانہ مقرر کرنا ممکن نہیں کسی کو کبھی سہولت ہوگی، کسی کو کبھی۔ اس لئے خود شریعت نے (راحت وسرورِ ابدی کی منزل کے بہترین، ہموار ترین ومحفوظ ترین راستہ کا نام شریعت ہے) ایک خاص

مہینہ کا تعین کر دیا۔ جسے رمضان سے موسوم کرتے ہیں۔

خدائے اسلام جس طرح ہمارے رکوع و سجود، ہماری تکبیر و تسبیح سے بے نیاز ہے اسی طرح اُسے ہمارے بھوکے اور پیاسے رہنے، ہمارے روزہ و تراویح ہماری سحری و افطار کی بھی کوئی حاجت نہیں۔ یہ تمام اُمور صرف ہمارے نفع و فائدہ کے لئے ہیں، ہماری طبیعتیں اور سرشتیں چونکہ شیطانی اثرات سے مسخ ہو چکی ہیں۔ اس لئے آج بہتوں کو روزہ کی پابندی ایک بار معلوم ہوتی ہے لیکن کل جب حجابات دُور ہو جائیں گے، جب آنکھیں کھُل جائیں گی، اس وقت اندازہ ہو سکے گا کہ رُوح میں اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کرنے کے لئے اور ابدی سرور و دائمی راحت حاصل کرنے کے لئے روزہ کتنا سہل، آسان، مفید، مؤثر نسخہ تھا۔ کاش ہمارے سب بھائیوں کی آنکھیں آج ہی کھُل جائیں۔ (منقول از "سچ" لکھنؤ ہفتہ وار، مورخہ ۳ اپریل ۱۹۲۵ء۔ ایڈیٹر عبد الماجد)

(۲)

بہار کا موسم آتے ہی چمنِ دہر میں رُوح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، خشک درخت سبز ہو جاتے ہیں، پھول کھلنے لگتے ہیں، جسم انسانی کی رگوں میں تازہ خون کی گردش ہونے لگتی ہے، سوئی ہوئی اُمنگیں جاگ اٹھتی ہیں اور چستی و توانائی کا دَور دَورہ شروع ہو جاتا ہے جسم و مادّہ کی کائنات میں آفتاب کا ایک پورا دَورہ گزر جانے کے بعد یہ موسم آتا ہے، اور طبیبوں کا بیان ہے کہ جسم سے مادّۂ فاسد کے دفع کرنے اور مُسہل لینے کا یہ بہترین زمانہ ہے، ٹھیک اسی طرح رُوح و جان کی کائنات میں بھی چاند کا ایک پورا دَورہ گزر جانے کے بعد موسم بہار آتا ہے، ماہتاب کو عشق کے سودا زدوں سے مناسبت ہے۔ ظاہر ہے، ماہتاب جب اپنے سالانہ سفر کا چکر ختم کرتا ہے تو عشق و محبت کی اقلیم میں پھر شوریدگی و جنون کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اور سال کے گیارہ مہینے کے اندر غیریت کی جو کدورتیں جم جاتی ہیں، طبیعت ان کے دفع کرنے کے لئے بیقرار ہو جاتی ہے، اسی لئے رحمتِ کاملہ و محبوبیتِ مُطلقہ نے اپنے وفا شعاروں، اپنے سرمستوں کے لئے ایک خاص مہینہ، ماسوا سے بے تعلق و بے نیاز رہنے کا مقرر کر دیا جس کو اصطلاح میں ماہِ رمضان سے موسوم کرتے ہیں: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ" اے حسنِ ازل سے پیمانِ وفا باندھنے والو! اپنے محبوب کی یکتائی کا کلمہ پڑھنے والو! اگر اپنے دعوی میں سچّے ہو، آؤ، اپنے طریقِ عشق و آئینِ اُلفت میں ایک مہینہ تک ماسوا پر نظر کرنا تک ناجائز سمجھو، اور اپنی تمام نفسانی لذّتوں کو اس بڑی اور حقیقی لذّت کے تصوّر پر قربان کرتے رہو، کہ یہی نفسانی لذّتیں اس شاہدِ حقیقی کے وصال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

یہ شرط محض تمہارے ساتھ مخصوص نہیں، اکیلے تم ہی اس آزمائش میں نہیں ڈالے گئے ہو، بلکہ تمہارے اگلوں میں سے جس جس گروہ نے ہم سے پیمانِ وفا باندھا، جس جس جماعت نے راہِ اُلفت میں قدم رکھنے کا دعویٰ کیا، اُن سب کو اپنے دعوے کا کچھ ایسا ہی ثبوت پیش کرنا پڑا ہے، ان سب کو کچھ ایسی ہی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، ہر اساں نہ ہو، بہتوں کی آزمائش اسی طرح ہو چکی ہے: "كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" اور اس حکم سے غرض تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں،

لہ صوم کے معنی ہیں باز رہنے اور رُکنے کے، خواہ کھانے سے یا کلام کرنے سے یا کسی اور چیز سے جس پر نفس حریص ہو یا جو طبیعت کو مرغوب ہو۔ "الصوم فی الاصل الإمساك عن الفعل مطعماً كان او كلاماً او شيئاً" (راغب) "الصوم إمساك عن طعام او كلام او نحوهما" (سجستانی) "الصوم فی اللغة الإمساك عمّا تنازع اليه النفس" (صاوی)

تمہاری جان کو ہلکان کرنا نہیں، بلکہ مقصود صرف تمہاری ہی فلاح و بہبود ہے۔ تمہارے ہی کمالات کی نشوونما، اور تمہاری ہی ترقی ہے۔ تمہی میں ضبطِ نفس پیدا کرنا ہے۔ تمہی کو خواہشاتِ نفسانی پر حاکم بننے کی تعلیم دینا ہے۔ تمہاری پاکیزگی کی چھپی ہوئی قوت کو ابھارنا، اور تمہیں حیوانیت کے غار سے نکال کر ملکوتیت کے آسمان پر پہنچانا ہے۔ تمہاری بوالہوسی جو تمہاری خودداری پر غالب آجاتی ہے اسی کو توڑنا منظور ہے۔ تمہاری ہی راہِ عروج میں ہر طرح کی سہولت پیدا کرنی مدِ نظر ہے، اور تمہارے ہی چھپے ہوئے اندرونی دشمنوں یعنی بدی کی طاقتوں کو ہلاک و نابود کرنا مقصود ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اور پھر یہ آزمائش بھی دائمی نہیں، تمہاری ساری عمر کے لئے نہیں، کسی بڑی طویل مدت کے لئے نہیں، بلکہ صرف گنتی کے چند روز یعنی گیارہ مہینہ کے بعد رمضان کا ایک مہینہ[1]۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ۔

پھر ان عاشقین صادقین اور مومنین مخلصین میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو باوجود اپنے صدق و خلوص کے، اپنی جسمانی کمزوری یا پردیس میں ہونے کی بنا پر آسانی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل نہ کرسکیں گے، ان کے لئے یہ آزمائش زیادہ سخت ہوگی۔ ایسے معذوروں کے لئے اس کی اجازت ہے کہ انہیں جب اطمینان و فراغت نصیب ہو تو اس ماہِ مبارک کے چھوٹے ہوئے روزوں کو پورا کرلیں۔ "بلبلِ بیمار" اگر اپنے جذبۂ دل میں صادق ہے تو اس کے لئے سال کا ہر موسم، موسمِ گل کا حکم رکھتا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ بعض بیچارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہ سبب اپنی جسمانی کمزوری یا کسی اور مجبوری کے ماہِ مبارک کے بعد بھی روزہ رکھنے میں سخت مشقت محسوس کرتے ہیں[2]۔ ایسوں کے لئے یہ رعایت ہے کہ وہ اپنی معذوری کے کفارہ کے طور پر کسی صاحبِ احتیاج کو پوری طرح کھانا کھلا دیا کریں۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔ اس رخصت و اجازت کے باوجود بھی اگر کوئی شخص محنت و مشقت گوارا کرکے اس بڑی نیکی یعنی روزہ کو اختیار کرتا ہے یا ایک مسکین سے زائد کو کھلاتا پلاتا ہے تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا۔ ایسی نیکی جو فرض نہ رہی ہو، اگر اختیار کی جائے تو اس کے افضل و برتر ہونے میں کیا شبہ۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ۔ یہ ایک عام اصول بتایا گیا۔ باقی اگر روزہ کی حقیقت پر نظر ہو جائے، روزہ سے جو باطنی ترقیاں مقصود ہیں۔ اگر ان کا علم ہو جائے تو کون ایسا ہے جو روزہ کی جانب بہ شوق و رغبت نہ دوڑے۔

یہ ماہِ مبارک صرف اسی لحاظ سے مبارک نہیں کہ اس میں انسان صبر و ضبط کی خدائی طاقتوں سے نوازا جاتا ہے، بلکہ اس خیر و برکت والے مہینہ کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اسی ماہ میں اول اول دنیا کے لئے بہترین کامل زین

---

[1] واولی ذلک بالصواب عندی قول من قال عنی اللہ جل ثناءہ بقولہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ أيام شهر رمضان (ابن جریر) والمراد بها رمضان (بیضاوی) المراد بهذه الايام المعدودات شهر رمضان [illegible]

[2] عن عبد اللہ قال يقول وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ای يجشمونه (ابن کثیر) وقرأ ابن عباس يطوقونه بمعنى الطاقة والقلادة ای يكلفونه او يتكلفونه على جهد منهم وعسر وهم الشيوخ والعجائز (زمخشری) يصومونه جهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم (زمخشری) وهو الرخصة لمن يتعبه الصوم ويجهده وهم الشيوخ والعجائز في الافطار والفدية (بیضاوی) من صام بالكلفة والمشقة فعليه فدية طعام مسكين (کالروح)

وجامع ترین ہدایت نامہ اُتارا گیا۔ اسی چاند میں انسانیت کے ظلمت کدہ کو نورانیت کے بدرِ کامل سے پُر انوار بنایا گیا، اور اسی بابرکت موسم میں انسان کے کان میں پہلی بار[1] نغمۂ ازل کی سُریلی آواز، بیہوشوں کو بیدار اور ہوشیاروں کو مست کرنے والی پکار پہنچی جس سے بڑھ کر کوئی دولت جس سے اونچی کوئی نعمت جس سے برتر کوئی رحمت عالمِ تصور میں بھی موجود نہیں۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔ قیس عامری کے پاس اگر لیلیٰ کا کوئی مکتوب یا پیام آجاتا، تو کس طرح وہ اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہو جاتا اور اس مبارک گھڑی کو کس قدر عزیز رکھتا! حسنِ ازل کے شیدائی بھی، نامۂ یار کے ورود کے زمانہ کو کیونکر بھول سکتے ہیں، جب جب یہ زمانہ آئے گا، اس کی یاد میں بیتاب ہو جائیں گے، اور اس پاک گھڑی کی پاک سالگرہ منانے میں اپنی بھوک پیاس تک کو بھول جائیں گے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ۔

موسم بہار کی فرحتیں، طراوتیں اور نشاط انگیزیاں، بڑے سے بڑے افسردہ دلوں تک میں اُمنگ پیدا ہی کر دیتی ہیں اور گل و گلزار کی سیر سے کوئی محروم رہنا نہیں چاہتا۔ ماہ مبارک کی برکتوں، فضیلتوں اور نعمتوں کا ذکر سُن کر بڑے سے بڑے بدہمت اور افسردہ دل کی رگوں میں جوش پیدا ہو جاتا، اور بڑے سے بڑے فرزانہ و دوراندیش میں شورش و شوریدگی کا اُبھر آنا قدرتی ہے۔ حالانکہ یہ آزمائش صرف ان کے لئے ہے جو اس کی جسمانی قوت بھی رکھتے ہیں۔ معذوروں پر خواہ مخواہ بارِ مشقت ڈالنا ہرگز مقصود نہیں۔ ان کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے ایک بار پھر اس ارشاد کی ضرورت ہوئی کہ معذوروں کو ان دنوں کی گنتی بعد میں پوری کر لینی چاہئے کہ مقصد آسانی دینا ہے نہ کہ تنگی۔ اللہ کی بڑائی کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کا مقصد بعد کو بھی گنتی کے دن پورے کر لینے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

یہ پُر بہار موسم جب کسی کے شوق و ارمان میں گزرے گا۔ یہ متبرک گھڑیاں جب کسی کی یاد میں بسر ہوں گی، یہ مبارک دن جب کسی کے اشتیاق میں بغیر بھوک پیاس کے صرف ہوں گے، یہ برکت والی راتیں جب کسی کے انتظار میں آنکھوں ہی میں کٹیں گی، تو ناممکن ہے کہ روح میں لطافت، قلب میں صفائی، اور نفس میں پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے۔ حیوانیت دُور ہو گی، ملکوتیت نزدیک آئے گی اور انسان خود اپنی ایک جدید زندگی محسوس کرے گا، ایسی حالت میں بالکل قدرتی ہے کہ سوزِ دل اور تیز ہو جائے، قرب و وصل کی تڑپ اور بڑھ جائے، تزکیہ و مجاہدہ کے اثر سے زنگ دُور ہو کر، کسی کا عکس قبول کرنے کے لئے آئینۂ قلب بے قرار و مضطر ہونے لگے۔ ٹھیک یہی گھڑی، ذوقِ طلب اور ذوقِ عطا، سوال اور اجابت، دعا اور مقبولیت، حاجت مندی اور کریمی، گدائی اور شاہی، بندگی و بندہ پروری کے درمیان ناز و نیاز کی ہوتی ہے، اس لئے قدرۃً اس منزل پر پہنچتے ہی

---

[1] ای ابتدئ فیہ انزالہ (بیضاوی) ابتدئ فیہ انزالہ (زمخشری) ابتدئ فیہ انزالہ (روح المعانی)
یکون ابتداء نزول القراٰن علی محمد صلعم فی شہر رمضان وھو قول ابن اسحاق وابی سلیمان الدمشقی (خازن)
اولت الاٰیۃ بان المراد انہ ابتدئ فیہ انزالہ ھذا قول محمد بن اسحاق (نیشاپوری)

حجلۂ غیب سے یہ صدائے بشارت کان میں آنے لگتی ہے کہ اے ہمارے پیام پہنچانے والے! اے ہمارے شیدائی، ہمارے پرستار، ہمارے بندے! اگر تم سے ہمارا پتہ پوچھیں تو ان کو بتا دو کہ ہم اُن سے کچھ دُور نہیں! ہم تو ان سے بہت ہی قریب ہیں، ہمیں دل کی تڑپ کے ساتھ پکاریں تو سہی، ہم فوراً اُن کی پکار کو سنیں گے۔ وہ صرف ہم سے اپنی لو لگائے رہیں، اور ہم پر بھروسہ رکھیں، اس سے وہ سیدھی راہ پاکر اور منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہیں گے۔ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ

(منقول از سچ (لکھنؤ) ہفتہ وار - ۳ اپریل ۱۹۳۲ء ایڈیٹر عبدالماجد)

(۳)

دو شخص ہیں۔ ایک وہ جو اپنی خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے، دوسرا وہ جو اُن پر حاکم و آقا ہے۔ ایک وہ جو اپنی ہر ہوائے نفس سے مغلوب ہو جاتا ہے، دوسرا وہ جو اُسے اپنے قابو و اختیار میں رکھتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو اپنی بھوک، اپنی پیاس، اپنی نیند، اپنی حرص، اپنے غصہ، کسی شے پر قابو نہیں رکھتا، دوسرا وہ جو ان میں سے ہر شے کے ضبط پر قدرت رکھتا ہے۔ آپ ایسے دو شخصوں میں سے کس کو ترجیح دیں گے؟ آپ خود ان دونوں میں سے کیا بننا پسند کریں گے؟ آپ کے نزدیک نفس کی غلامی بہتر ہے؟ یا اس پر حکمرانی؟ اگر آخر الذکر بہتر و پسندیدہ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ ماہِ رمضان کی پیشوائی کو آپ ذوق و شوق، مسرت و خندہ جبینی کے ساتھ نہیں بڑھتے؟

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ دائم القوم تھے۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی عمر کے سالہا سال روزہ رکھ کر گزارے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا مقولہ مشہور ہے کہ مجھے جو کچھ ملا سب بھوک اور گرسنگی ہی کی طفیل میں ملا۔ حضرت مولانائے رُومؒ کا عمل خود انہی کی اس تعلیم پر تھا کہ منزلِ حق کی جتنی راہیں کھلتی ہیں سب بھوک اور پیاس سے۔ ہر سلسلے کے جتنے مقدس بزرگ اور مستند صوفی گزرے ہیں سب کا عمل یہی رہا ہے اور تعلیم بھی یہی۔ مگر پھر یہ کیوں ہے کہ آپ باوجود ان حضرات سے اعتقاد ظاہر کرنے اور باوجود ان کے ماننے کے اس باب میں ان کی تعلیم سے اس قدر بے پروا، اور ان کے عمل سے اس قدر بے نیاز ہیں؟

نماز میں جس طرح عبدیت کی تکمیل ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح روزہ دار کو اخلاقِ الٰہی کے ساتھ کس درجہ مناسبت و مشابہت پیدا ہو جاتی ہے؟ بھوک اور پیاس سے بے نیازی، صبر و ضبط، قوت و اختیار، حلم و تحمل، عفو و درگزر، یہ سب شانیں بندہ کی ہیں، یا مولیٰ کی؟ عبد کی یا معبود کی؟ خاک کے پتلے کی یا آسمان کے فرمانروا کی؟ پھر یہ کیوں کر ہے کہ جو شے کچھ ہی دیر کے لئے سہی آپ میں اس کیفیت سے مناسبت پیدا کر رہی ہو، جو شے ذرہ میں آفتاب کا پرتو ڈال رہی ہو، جو شے آئینہ میں جلا پیدا کر کے اُسے نورانیتِ کاملہ کا عکس قبول کرنے کے قابل بنا رہی ہو، آپ اُس نعمتِ عظیمہ کی جانب لپکنے میں تامل کر رہے ہیں؟

حدیثِ قدسی کے الفاظ یاد کیجئے: "الصوم لی وانا اجزی بہ"۔ روزہ میرے لئے ہے اور اس کا اجر خود میں ہوں۔ "حوریں نہیں، جنت کے قصر و محل نہیں، کوئی اور ایسی نعمت نہیں، جسے مادّی عقل سمجھ سکے بلکہ میں خود اس کا اجر ہوں۔" یہ کون کس سے کہہ رہا ہے؟ آفتاب ذرہ سے نہیں، مخدوم خادم سے نہیں، شاہ گدا سے

نہیں، بلکہ خالق مخلوق سے، معبود عبد سے، خدا بندہ سے ایک ہو؟ زمینوں اور آسمانوں کی ساری نعمتیں، ساری برکتیں، ساری بادشاہتیں، مل کر بھی اس ایک اجر کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں؟ کیسی دردناک نادانی ہوگی، کہ اتنے ارزاں سودے کو بھی اپنی غفلت و بے پروائی کے نذر کر دیا جائے!

(منقول از سچ (لکھنؤ) ہفتہ وار، ۲۶ مارچ ۱۹۲۶ء ایڈیٹر عبدالماجد)

(۴)

کھانا کھانے میں آپ کو لطف کس وقت آتا ہے؟ اُس وقت جب کہ بھوک کھل کر لگی ہو یعنی کچھ دیر پیشتر سے کھانا نہ کھایا ہو، پانی کے گلاس میں مزہ کس وقت ملتا ہے؟ اُس وقت جب کہ پیاس لگی ہوئی ہو اور پانی پینے کی طلب بے قرار کر رہی ہو۔ نیند سکھ سے کس وقت آتی ہے؟ اُس وقت جبکہ کچھ گھنٹے قبل سے آپ برابر جاگ رہے ہوں۔ ان ساری مشاہدوں میں آپ کو روزمرہ ہر وقت اور ہر جگہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ مادی لذتوں سے بھی پوری طرح لطف اٹھانے کے لئے کسی قدر ضبط و صبر و احتیاط لازمی ہے۔ یہی آپ کا مشاہدہ ہے، یہی آپ کا تجربہ ہے اور اسی پر آپ کا عمل ہے۔ یہ آپ کبھی نہیں کرتے کہ مسلسل چوبیسوں گھنٹے منہ میں نوالے چباتے رہیں۔ یہ کوئی بھی نہیں کرتا کہ ہر منٹ لگاتار پانی کے گھونٹ اُتارتا رہے۔ یہ کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ دن اور رات، صبح اور شام، ہر وقت برابر پڑا سوتا ہی رہے۔

"روشن خیالی" جب ایک قدم آگے بڑھاتی ہے تو تعطیل اور چھٹی کو بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو بنا دیتی ہے، اسکولوں کے کمرے، کالجوں کے ہال، عدالتِ عالیہ کے ایوان، ہفتوں سے بند چلے آ رہے ہیں، اس لئے کہ موسم گرما کی تعطیل کلاں کا زمانہ ہے، کچہریاں اور دفتر بند ہیں، اس لئے کہ آج بڑا دن ہے۔ ڈاک خانہ اور تار گھر، بینک اور خزانے بند ہیں، اس لئے کہ آج اتوار ہے، یہ سب اس لئے ہے کہ دماغ کو آرام ملتا ہے اور تازہ دم ہونے کے بعد کام بہتر طور پر انجام پاتا ہے، آپ اپنے اس نظام اور اس انتظام پر شرماتے نہیں فخر کرتے ہیں۔ اور آپ کی عقلیت و روشن خیالی کا یہ ایک مسلمہ ہے کہ کام میں زیادہ مستعدی اور بہتر کارگزاری EFFICIENY کے لئے جسم اور اعضائے جسم کو آرام دیتے رہنا لازمی ہے، یہ نہیں کہتے کہ اس سے کام میں خواہ مخواہ ہرج اور نقصان ہوتا ہے۔

لیکن جب مذہب آپ سے کہتا ہے کہ سال کے ایک خاص زمانہ میں چند گھنٹوں کے ایک محدود وقت کے لئے معدہ کو آرام دیتے رہو، بھوک اور پیاس کو ضبط کرتے رہو تو معاً آپ کی عقلیت و روشن خیالی بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ اپنے روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ، نظریات و عملیات سب کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، رمضان کی آمد کو اپنے لئے ایک قہر و مصیبت سمجھنے لگتے ہیں، اور اگر زبان سے نہیں تو کم از کم دل میں تو یہ ضرور کہنے لگ جاتے ہیں کہ روزہ کی یہ قیدیں کیسی سخت ہیں۔ اور آپ کے کمزور قویٰ ہرگز اتنی بڑی محنت کو نہیں برداشت کر سکتے! بیشک اگر آپ ہزاروں روپیہ کمانے اور اڑانے والے بیرسٹر ہیں، اگر آپ اپنی تمسکات اور اقرار کے بنائے ہوئے جج یا کلکٹر ہیں، اگر آپ صوبہ یا ملک کی کونسل کے ممبر ہیں، اگر آپ لاٹ صاحب اور بڑے لاٹ صاحب کی

پارٹیوں میں شریک ہونے والوں میں ہیں، اگر آپ کے پاس سواری کے لئے موٹریں اور رہنے کے لئے اونچی اونچی کوٹھیاں موجود ہیں تو آپ کی محرومی اور حرماں نصیبی نے اجر روحانی و راحتِ سرمدی کی طرح روزمرہ کی مادی لذتوں اور جسمانی فرحتوں کا بھی دروازہ آپ پر بند کر رکھا ہے اور آپ کی یہ نصیب ناگفتنی پر جتنی بھی حسرت و رنج کیجئے کہاں کم ہے لیکن اگر آپ اپنی خوش بختی سے کوئی غریب کاشتکار ہیں، کوئی مفلس مزدور ہیں، کوئی کم حیثیت خدمت گار ہیں بھاری بھاری بوجھ کی گٹھریاں اور گٹھے اپنے سر پر لادنے والے ہیں، دھوپ میں جل جل کر اور گھٹ گھٹ کر کام کرنے والے ہیں تو انشاء اللہ آج آپ اپنے خالق و مالک کے حکم کی تعمیل میں رمضان مبارک کے بارانِ رحمت سے سیراب ہو رہے ہوں گے! یقین کیجئے کہ آج آپ کے مرتبہ پر زمین پر بسنے والے نہیں، آسمان پر اڑنے والے فضائے قدس میں سانس لینے والے، حاملانِ عرش کے پاسبان مقدس والے رشک کر رہے ہیں! ممکن ہے کہ آج یہ شاعری معلوم ہو رہی ہو لیکن کل انشاء اللہ حقیقت ہو کر رہے گی، اور ان بے خبروں کو بھی خبردار کر کے رہے گی، جو آج روزہ داری کے طبی فوائد اور مادی لذتوں سے بھی محرومی میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں!

(منقول از سچ لکھنؤ ہفتہ وار ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء ایڈیٹر عبدالماجد)

(۵)

نیند پورے سکھ کے ساتھ کس کو آتی ہے؟ اس کاہل کو جو رات دن بستر پر پڑا رہتا ہے، یا اس محنتی کو جو دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد تھک کر اپنے دماغ و جسم کو چند گھنٹوں کے لئے آرام دینے کو لیٹتا ہے؟ کھانے میں اصلی مزہ کس کو ملتا ہے؟ اس امیر کو جو سارے دن اپنے ذائقہ کی خاطرداریوں میں لگا رہتا ہے، اور طرح طرح کی بدپرہیزیاں کرتا رہتا ہے یا اس غریب کو جو محنت و مشقت کے بعد دن میں ایک یا دو بار سادہ اور معمولی کھانا کھاتا ہے؟ سو کر اٹھنے کے بعد فرحت اور چابکی کس کو حاصل ہوتی ہے؟ اس کو جو ساری رات پریشان اور ہولناک خواب دیکھتا رہتا ہے یا وہ جو شروع سے آخر تک میٹھی نیند بیتا رہتا ہے؟ پس اگر کسی کو نیند پورے سکھ کے ساتھ نہیں آتی کھانے میں پورا مزہ نہیں ملتا، یا سو کر اٹھنے کے بعد طبیعت سے کسل پوری طرح دور نہیں ہوتا تو اس کی ذمہ داری اور تنہا ذمہ داری، اسی کی بے احتیاطیوں، بدپرہیزیوں، اور بے اعتدالیوں پر آتی ہے۔

روزہ جسم و روح دونوں کے ایک خاص ضبط و انضباط، تزکیہ، تنقیہ، پرہیز و احتیاط کا نام ہے اس کے تمام ہونے پر انتہائی لطف و راحت، لذت و فرحت محسوس ہونی چاہئے۔ اگر آپ اس میں کمی محسوس کرتے ہیں تو یقیناً یہ آپ ہی کا قصور ہے اور یہ لازمی ہے کہ روزہ کی کچھ شرطیں آپ توڑ چکے ہیں، اور اس کے جو آداب نگاہ رکھنے کے تھے وہ آپ نے نہیں رکھے جسم و دماغ کو اگر آپ دن بھر صحیح طور پر کام میں لگائے ہوئے ہیں تو شب کو نیند کی حالت میں بھی سکھ ملے گا اور نیند پوری کرنے کے بعد بھی فرحت حاصل ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر جسم و روح کو آپ ٹھیک طور پر دن بھر مشغول رکھے ہوئے ہیں، اگر آپ وہی کرتے رہے ہیں جو ایک روزہ دار کو کرنا چاہئے تو آپ کا دن اور آپ کی رات آپ کی صبح اور آپ کی دوپہر آپ کا سہ پہر اور آپ کی شام، غرض آپ کے وقت کی ہر گھڑی آپ کے دل کی کلی کو کھلی رکھے گی۔ افسردگی اور اداسی آپ کے لئے بے مفہوم ہوگی اور سرور و نشاط کی ہوائیں آپ کی

روح کو تر و تازہ رکھیں گی۔

روزہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے پیدا کرنے والے، آپ کے سامانِ زندگی کے مہیا کرنے والے اور آپ کی موت و زندگی، بیماری و تندرستی، ہر چیز پر قدرت رکھنے والے کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ سارے دن آپ اپنے تئیں اپنی آنکھ اور کان، اپنے منہ اور زبان، اپنے دل اور اپنے دماغ، اپنے ہاتھ اور پیر، اپنے جسم اور جان، غرض اپنے سارے وجود کو ہر ٹیڑھی راہ سے روکے رہیں گے، ہر کجی و کج روی سے باز رکھیں گے اور صرف اسی کے لئے وقف رکھیں گے جو اُس کا اصلی کام اُس کی سیدھی راہ اُس کا فطری حق اور اُس کی سچی غایت ہے۔ زبان اگر کھلے گی تو صرف کلمۂ حق پر، کان اگر سنیں گے تو صرف سچی آواز، آنکھ اگر دیکھے گی تو صرف امرِ حق کو، دل کو اگر سوچے گا تو صرف سچائیوں کو، ہاتھ اور پیر اگر حرکت کریں گے تو صرف سچائی کی راہ میں۔۔ مادی زندگی کے سب سے بڑے اور طاقتور مظہر، سورج کے ڈوب جانے پر جب آپ اُس ذات کے شکر کے ساتھ جس نے آپ کو یہ توفیق دی، اپنا جائزہ لیں اور اپنی اس نذر کی ہر شرط کو پوری طرح ادا کیا ہوا پائیں تو —— دنیا کے کس لفظ، و کس عبارت میں اس کیفیت کو ادا کرنے کی قدرت ہے! رضائے الٰہی آپ میں اور آپ رضائے الٰہی میں جذب ہوں گے۔ راحت و لذت، لطف و مسرت، سرور و نشاط، شادی و انبساط یہ سارے الفاظ اس بڑی فرحت (افطار) کی کیفیت کو ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں جو اُس سب سے بڑی فرحت (دیدارِ الٰہی) کا پیش خیمہ ہے، جس سے موسیٰ کلیم اللہ جیسے برگزیدہ پیمبر باوجود شوق و تمنا اس دنیا میں محروم رہے!

(منقول از سچ لکھنؤ۔ ۱۴ مارچ ۱۹۳۶ء)

(۶)

آپ کو معلوم ہے کہ اطبائے یونانی کتنے متعدد امراض میں فاقہ کو مفید بتاتے ہیں؟ آپ کو خبر ہے کہ ڈاکٹروں کے اصول سے اب فاقہ کتنے امراض کا علاج ثابت ہو چکا ہے؟ آپ واقف ہیں کہ ہر طریقۂ علاج کے ماہرینِ فن نے کتنی شدید اور خطرناک بیماریوں کا علاج اپنے تجربہ میں فاقہ ہی کو پایا ہے؟ خود آپ کا ذاتی تجربہ کیا ہے؟ آپ کو جب کبھی بیماری میں طبیب یا ڈاکٹر فاقہ کا مشورہ دیتے ہیں تو آپ کیسی خاموشی کے ساتھ بے چون و چرا اور بغیر بحث و مناظرہ اُس کے حکم کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں اور اُس کی ہدایتوں کے مطابق کھانے اور پینے کی لذتوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں! لیکن جب اس سے کم تکلیف اور اس سے ہزاروں گنی زاید راحتوں اور نعمتوں کے وعدہ کے ساتھ اس قسم کی احتیاطِ خورد و نوش کا حکم آپ کو سب سے بڑے حکیم کے مطب سے ملتا ہے تو یہ کیا ہے کہ آپ اس خوش دلی کے ساتھ اُس کی تعمیل پر آمادہ نہیں ہو جاتے بلکہ طرح طرح کی تاویلوں سے جن سے اکثر خود آپ کا دل بھی مطمئن نہیں ہوتا اُسے ٹال جانا چاہتے ہیں۔!

آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے فضل سے روزہ دار ہیں اور ماہِ رمضان کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں، لیکن تجربہ کیا ہے کہ آپ کی اندرونی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں محسوس ہوتا، غصہ اب بھی آپ کو برابر آتا رہتا ہے بلکہ شاید کچھ اور بڑھ ہی گیا ہے۔ دوسروں کے عیب چینی میں اب آپ کو ویسا ہی مزہ آ رہا ہے۔ نفسانی خواہشوں اور لڑنے جھگڑنے کے منصوبوں میں اب بھی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ دن میں بے شبہ آپ کھاتے پیتے نہیں ہیں، لیکن وقت کا بڑا حصہ

بجائے عبادتوں کے، سوتے اور بیکاری میں گزارتے ہیں یا پھر سحری، طعام شب اور افطار پارٹیوں کے اہتمام و انتظام میں! وہ وہ لذیذ اور ثقیل غذائیں جن سے آپ کا ذائقہ سال میں گیارہ مہینے بالکل نامانوس رہتا ہے آپ صرف اسی ماہِ صبر و تقویٰ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور وقت اور روپے کا اچھا خاصا حصہ اسی ماہِ مبارک کی دعوتوں اور ضیافتوں میں صرف فرماتے رہتے ہیں! کیا اسی روزہ داری پر آپ خوش ہیں؟ کیا اسی کا نام آپ کے خیال میں ماہِ مبارک کا احترام ہے؟

ایک شخص قند اور دودھ کا نفیس شربت تیار کرتا ہے مگر اس میں کچھ مکھیاں بھی پیس کر ملا دیتا ہے آپ ایسے شخص کی صحتِ دماغی کی بابت کیا رائے قائم کریں گے؟ ایک شخص لذیذ سے لذیذ اور بہتر سے بہتر کھانا خوان میں لگا کر رکھتا ہے لیکن اس میں ایک جزو غلاظت کا بھی ملا دیتا ہے آپ اس بدنصیب کی عقل و فہم پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟ یقین فرمائیے کہ اس سے کہیں زائد موجبِ تأسف و مستحقِ ماتم اس بےعقل و بدنصیب کی حالت ہے جو روزہ رکھ کر بھی غیبت کرکے عیب چینی میں مصروف رہ رہ کے نفسانی خواہشوں کے منصوبوں میں مبتلا رہ رہ کے، روزہ کی نعمتوں اور راحتوں، لذتوں اور فرحتوں کو اپنے ہاتھوں غارت کرتا رہتا ہے! اور جو حرماں نصیب سرے سے روزہ ہی کو ترک کئے ہوئے ہیں، ان بیچاروں کو تو بس اللہ ہی سیدھی سمجھ اور نیک ہدایت کی توفیق نصیب کرے!

(منقول از سچ لکھنؤ۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۲۶ء)

(۳)

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ

رکوعہا ۲۰ — بیس رکوع

آیاتہا ۲۰۰ — دو سو آیتیں

سورۂ آل عمران ۱ مدنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ نہایت مہربان باربار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۝١ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝٢

الف، لام، میم ۲ اللہ وہ ہے کہ کوئی خدا نہیں بجز اس کے ۳ زندہ (خدا ہے) سب کا سنبھالنے والا (خدا ہے) ۴

۱ عرب کا نقشہ سامنے ہو تو جنوب مشرق میں جو علاقہ یمن کے نام سے موسوم ملے گا اس کے شمالی حصہ میں ایک مقام نجران ہے عہد نبوت میں یہاں مسیحیوں کی آبادی تھی سنہ ۹ ہجری میں ان کے چودہ اکابر ایک وفد کی صورت میں رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے آنحضورؐ نے دوران گفتگو میں ان کے عقائد تثلیث و ابنیت کی لغویت ان پر پوری طرح واضح کردی، سورہ میں اشارے جابجا اسی طرف ہیں، سورۂ بقرہ میں خطاب جس طرح خاص طور پر یہود کی جانب تھا، کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح اس سورۃ میں مسیحیوں کی جانب ہے، سورۂ بقرہ ہی کی طرح آل عمران کے فضائل بھی احادیث میں بکثرت وارد ہوئے ہیں!

۲ یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں، ان پر حاشیہ سورہ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا، منقول ہے کہ یہاں بھی یہ حروف مخفف ہیں فقرہ أنا اللہ اعلم کے۔

۳ (نہ بہ حیثیت اقنوم کے، نہ کسی اور حیثیت سے)

یعنی اس خدائے واحد کا شریک کوئی نہ ذات میں ہے نہ صفات میں نہ افعال میں، دنیا میں بکثرت ایسے مشرک مذہبوں کا وجود رہ چکا ہے اور اب بھی ہے جو کہتے ہیں کہ خدائے اعظم تو بیشک ایک ہی ہے لیکن اس کے ماتحت شعبہ وار چھوٹے چھوٹے خدا، دیوتا اور دیویاں تو بہت سی ہیں، قرآن مجید ان سب کی تردید کر کے کہتا ہے کہ نفس وجود ہی کسی دوسرے خدا کا نہیں نہ چھوٹے کا نہ بڑے کا، الوہیت و ربوبیت تمام تر ایک ہی ذات حق کی ہے۔ آیت علاوہ ان جاہلی مذاہب کے خاص طور پر مسیحی عقائد کے بھی رد میں ہے۔

۴ اَلْحَیُّ۔ وہ وہ خدا ہے جو ہمیشہ زندہ ہی ہے زندہ ہی رہا ہے اور زندہ ہی رہے گا، موت کا اس کے لئے کوئی امکان ہی نہیں، نہ صلیب پر اور نہ کسی اور طرح۔ اس کی حیات جس طرح آج قائم ہے ہمیشہ سے قائم ہے، یہ نہیں کہ اسے بار بار قالب بدلتے رہنے کی ضرورت پیش آئے کبھی وہ انسان بن جائے اور کبھی نعوذ باللہ حیوان پھر وہ نہ اس طرح کا نہیں کہ ہر سال اس پر موت طاری ہوا کرے اور پھر وہ حیات تازہ حاصل کرتا ہے، الحی کے ایک لفظ نے اس کی قدیم ولازوال صفت حیات کا اثبات کر کے ان سارے خرافات کی تردید کر دی جو دوسرے مذہبوں میں اس وقت تک موجود ہی تھیں، ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۵۱ سورۂ بقرہ

اَلْقَیُّوْمُ۔ وہ بذات خود قائم ہے اور ساری مخلوقات اس کے وجود سے قائم ہے، یہ نہیں کہ وہ خود بھی کسی معنی

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ

اس نے (یہ) کتاب آپ پر نازل کی ہے قطعیت کے ساتھ شہ ان کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پیشتر آچکی ہیں لہ

التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ

اور اس نے اتارا تھا توریت اور انجیل کو (اس سے) پیشتر لوگوں کی ہدایت کے واسطے شہ

یہ کسی دوسرے کا محتاج ہو جیسا کہ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ:۔
"جس طرح بیٹا بغیر باپ کے تنہا خدا نہیں اسی طرح باپ بغیر بیٹے کے تنہا خدا نہیں" (انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۷ صفحہ ۵۳۶)
گویا (نعوذ باللہ) ابن اللہ اور اللہ دونوں اپنی خدائی میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، صفت قیومیت کا اثبات کر کے قرآن مجید نے فرزندیٔ خدا کے عقیدہ کی جڑ ہی کاٹ دی، بہت سے جاہلی مذہب ایسے بھی ہیں جو ایک طرف خدا کو خدا بھی مانتے چلتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے بھی قائل ہیں کہ وہ پیدا کسی اور سے ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۹ سورۂ بقرہ) قرآن مجید کا یہ خصوصی وامتیازی اعجاز ہے کہ اپنے ایک ایک لفظ سے وہ تردید متعدد اور بڑی بڑی گمراہیوں کی کرجاتا ہے

شہ (لفظاً لفظاً اے پیغمبر!)
نَزَّلَ کا مصدر تنزیل ہے یہ لفظ قرآن مجید میں، قرآن مجید کے لئے بکثرت آیا ہے بخلاف اَنزل (مصدر، انزال) کے جو عموماً دوسری کتب آسمانی کے لئے آیا ہے۔
تَنْزِیل۔ میں تدریج اور ٹکڑے ہو کر نازل ہونے کا تخیل تو موجود ہی ہے۔
القرآن نزل نجوماً شیئاً بعد شیئ والتنزیل مرۃ بعد مرۃ (قرطبی) [illegible] والانزال الدفعۃ (اقرب)
لیکن عجب نہیں کہ اس کے مفہوم میں قرآن کا لفظاً بہ لفظ حرف بہ حرف نازل ہونا بھی شامل ہو اور کیا عجب ہے کہ اس معنی کی سند آگے چل کر کسی محقق کو عربی لغت وزبان ہی سے ہاتھ آجائے۔
بالحق۔ حق کے تحت میں حکمت بھی داخل ہے اور راستی بھی اور قوتِ دلائل بھی اور یہ لفظ هزل کے مقابل بھی ہے
انہ قول فصل ولیس بالہزل (کبیر) نزل بالحق لا بالمعانی الفاسدۃ [illegible] (قرطبی)

ﻪ (کتب آسمانی میں سے)
مُصَدِّقًا۔ قرآن نے بار بار صراحت کر دی ہے کہ اس کا تعلق کتب قدیم سے تصدیق کا ہے اور قرآن اجمالاً ان کے مضامین کی تصدیق وتوثیق ہی کرتا ہے، یہیں سے ان دشمنانِ دین کی نادانی بھی ظاہر ہوجاتی ہے جو کسی قرآنی بیان کے مثل کوئی مضمون توریت انجیل وغیرہ کا اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے کوئی خاص انکشاف کیا ہے اور نعوذ باللہ گویا قرآن کی بڑی چوری پکڑی گئی

ﻪ (ان کے زمانہ میں)
اَلتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ۔ توریت اور انجیل قرآن مجید کی اصطلاح میں دو مستقل آسمانی کتابوں کے نام ہیں اور قرآن تصدیق انہی کی کرتا ہے۔

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ

اور اسی نے فرقان کو اتارا شہ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے کفر کیا ان کے لئے عذاب سخت ہے ۹ اور اللہ بڑا زبردست

عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝

ہے (بدی کا) بدلہ لینے والا ہے بے شک اللہ ایسا ہے کہ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں

لیکن موجودہ بول چال میں توریت نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا جن میں سے ہر صحیفہ کسی نہ کسی نبی کی جانب منسوب ہے لیکن ان میں سے کسی ایک صحیفہ کی بھی سند میں لفظی کا جو کسی یہودی کو نہیں اسی طرح انجیل نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا جن میں حضرت مسیح سے متعلق مجہول الحال لوگوں کی جمع کی ہوئی حکایتیں اور ملفوظات ہیں لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی مسیحیوں کے عقیدہ میں آسمانی نہیں بلکہ مسیحی فضلاء خود کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ "تواریخ کے دور میں بلا ارادہ اور بلا توقع تیار ہو گیا" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۳ ص ۵۱۳ طبع چہار دہم) خوب سمجھ لیا جائے کہ ایسے بے سند "مقدس نوشتوں" کی تصدیق و توثیق کی ذمہ داری قرآن ہرگز نہیں لیتا اور موجودہ بائبل یعنی عہد عتیق و عہد جدید کا کوئی جزو بھی قرآن مجید کے ماننے والوں پر حجت نہیں۔

من قبل یعنی قرآن سے قبل عہد موسوی اور عہد عیسوی میں ان کی امتوں کے لئے۔

شہ (اب سب کی ہدایت کے لئے)

الفرقان۔ اور فرق اصلا ہم معنی ہیں مگر اس کے فرق کے معنی تو محض اور مطلق امتیاز کے ہیں خواہ وہ کسی کے درمیان ہو اور فرقان مخصوص اس امتیاز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان ہو۔

الفرقان ابلغ من الفرق لانه يستعمل في الفرق بين الحق والباطل (راغب)

بعض کے نزدیک الفرقان اسم جنس ہے کل کتب آسمانی کے لئے۔

جنس للكتب السماوية (كشاف)

ایک محقق کا قول ہے کہ اس سے مراد معجزات و دلائل نبوت ہیں جو ہر پیغمبر کو عطا ہوتے رہتے ہیں۔

والمختار عندي ان المراد من هذا الفرقان المعجزات التي قرنها الله تعالى بانزال هذه الكتب (كبير)

لیکن محققین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔

هو القرآن انزل على محمد وفرق به بين الحق والباطل (ابن جرير عن قتادة) ای الفرقان (قرطبی)

الفرقان ههنا القرآن (ابن كثير عن قتادة والربيع) المراد هو الفرقان (كبير)

۹ (آخرت میں تو یقیناً اور دنیا میں بھی احتمالاً)

کفروا۔ یعنی باوجود اس کے کہ ان پر تبلیغ دین پوری طرح ہو چکی تھی، وہ کفر اختیار کئے رہے۔

آیات اللہ۔ سے مراد آیات قرآنی بھی ہو سکتی ہیں اور نشانیاں بھی یعنی توحید کے دلائل و شواہد۔

نلہ خوب خیال رہے کہ سورۃ کا اصل موضوع مسیحیت کی تردید ہے اس لئے عموماً ایسی ہی صفات کا اثبات کیا گیا ہے جن سے مسیحیت ہی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرب لگے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

وہ وہی (خدا) ہے جو تمہاری صورتیں رحموں کے اندر بناتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے [۱۲]۔ کوئی خدا نہیں بجز اس کے [۱۳]

هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

وہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے [۱۴]۔ وہ وہی (خدا) ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ

اس میں محکم آیتیں ہیں اور وہی کتاب کا اصل مدار ہیں [۱۵] اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں [۱۶]

عزیز ہر سزا پر قادر ہے اور ہر حال میں سب پر بالادست وقوی تر ہے۔ وہ (معاذ اللہ) مسیحیوں کا خدا نہیں کہ انسانی قالب اختیار کرکے طرح طرح کی کمزوریوں اور بیچارگیوں کا شکار بن جائے اور دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر سولی پر موت تک پا جائے، اس کی صفتِ عزیزیت اس سارے تخیل ہی سے اباکرتی ہے۔ ذوانتقام۔ وہ رحمن ورحیم ورؤف ہونے کے ساتھ عادل بھی ہے اور صفتِ معدلت کا اظہار مجرموں اور سرکشوں کے مقابلہ میں سزا وانتقام ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسے سزا دینے میں ہرگز کوئی عار نہیں تا کہ اس عار سے بچنے کے لئے اسے "مصلوبیت" اور کفارہ کے پیچ در پیچ راستے اختیار کرنے پڑیں۔ جن مذہبوں نے خدا کو صرف رحیم ہی رحیم مانا ہے ان کا خدا کامل نہیں، یک پہلو ہے ناقص ہے۔

۱۱ جاہلی قوموں اور مذہبوں کی حکمتوں تک آخر جاہلی تھے! یونان کے نامی گرامی عقلاء وحکماء یہ کہہ گئے اور کھلا کہہ گئے کہ علمِ باری صرف کلیات تک محدود رہتا ہے، جزئیات کو محیط نہیں ہوتا، اور مسیحیوں نے خیر نبوت کی برکت سے کھلم کھلا اس عقیدہ کو تو نہ مانا، تاہم مرعوب اس "حکیمانہ" تعلیم سے اچھے خاصے رہے۔ قرآن مجید نے للکار کر بتا دیا کہ یہ علمِ باری کا کمال نہیں عین نقص ہوا، علمِ باری ہر حیثیت سے کامل ہے اور چھوٹی بڑی ہر چیز پر حاوی ہے۔

الارض والسماء۔ آسمان اور زمین کے نام اس سلسلہ میں اس لئے لے دیئے گئے کہ علمِ انسانی کی وسعت گرفت انہی حدود کے اندر محدود ہے۔ ضمناً خطاب مسیحیوں سے بھی ہے کہ تم جو مسیح کو خدا مانتے ہو تو بتاؤ ان کا علم کامل کہاں سے تھا اور خدا نے بندہ کی شکل اختیار کرکے کیسے اتنا بڑا نقص اپنے اندر گوارا کر لیا؟

۱۲ (خواہ بغیر باپ کے بنائے خواہ باپ کی وساطت سے)

قادر وہ ہر طرح اور ہر صورت سے ہے، باپ محض واسطۂ تخلیق ہوتا ہے اور خالق جس واسطہ کو جب چاہے ہٹا دے۔

یُصَوِّرُکُمْ۔ میں خطاب عام ہے، سارے انسان مخاطب ہیں۔

فِی الْاَرْحَامِ۔ یعنی ماؤں کے رحم میں، اور حضرت مسیحؑ کی صورت بھی رحمِ مادر ہی میں بنی تھی۔

اوپر ذکر اللہ کے علمِ کامل کا آچکا ہے اب اشارہ اس کی قدرت کی طرف ہو رہا ہے کہ جس طرح اس کا علم کامل محیط کل وغیر محدود ہے اسی طرح اس کی قدرتِ تخلیق بھی غیر محدود و نامتناہی ہے، انسان کا اس کی حد بندی کرنا خود انسان کا جہل ہے۔

۱۳ (نہ ذات کے لحاظ سے نہ صفات کے)

پھر یاد دلا دیا کہ کون اُس کے معاملاتِ تخلیق میں دخل دے سکتا ہے یا مشورہ کا حق رکھتا ہے، وہ ذاتِ پاک ہر اعتبار سے یکتا، بے مثل اور بے مثال ہے۔

۱۴ے الْعَزِیْزُ عزیز۔ پر حاشیہ ابھی گزر چکا، خدائے تعالیٰ تخلیق کی ہر صورت پر یکساں قادر ہے۔ الحکیم۔ اس کی صفتِ حکمت کا اثبات ہے۔ یعنی جو صورت جہاں قرینِ حکمت و مصلحت ہوتی ہے وہ وہاں وہی اختیار کرتا ہے۔

۱۵ے (اور انھیں کو معیار بنا کر ان پر باقی کلام کو پیش کرنا چاہیے)

مُحْکَمٰتٌ۔ محکم قرآن مجید کی وہ واضح و صریح آیتیں ہیں جن کی دلالتیں متعین ہیں اور ان کے معانی میں کوئی خفا و اشتباہ نہیں۔

المحکم مالا یعرض فیہ شبہة من حیث اللفظ ولا من حیث المعنی (راغب) واضحة المعنی، ظاهرة الدلالة، محکمة العبارة، محفوظة من الاحتمال والاشتباه (روح) المحکمات فی آی القرآن ما عرف تاویله وفهم معناه وتفسیره (قرطبی عن جابر بن عبد اللہ والشعبی وسفیان الثوری) قال النحاس احسن ما قیل فی المحکمات أن المحکمات ما کان قائمًا بنفسه لا یحتاج ان یرجع فیه الی غیره (قرطبی) فالمراد به اتفاق الاشتراک فیه ولا یحتمل عند سامعه الا معنًی واحدًا (جصاص)

اُمٌّ ہر شے کی اصل کو کہتے ہیں۔

من کل ما کان اصلًا لوجود شیء او تربیته او اصلاحه او مبدئه اُمٌّ (راغب) ای اصله والعمدة فیه یرد الیها غیرها (روح)

یہاں اس حقیقت کو بیان کر دیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں بالکل واضح و صاف ہیں جن سے ایک ہی معنی نکلتے ہیں، وہی اصل مدار و معیار ہیں، دوسری آیتوں کو جن کے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں، انھی پر پیش کرنا چاہیے۔

فبیّن اللہ تعالی ان القرآن یشتمل علی محکم وعلی متشابه والتمسک بالمتشابهات غیر جائز (کبیر) والام هی التی منها ابتداؤه والیها مرجعه فسماها اُمًّا فاقتضی ذلک بناء المتشابه علیها ورده الیها (جصاص)

۱۶ے مُتَشٰبِہٌ۔ ایسے کلام کو کہتے ہیں جو دوسرے کلام سے ایسا ملتا جلتا ہو کہ باہم تفریق و تمیز مشکل ہو اور اس کی تعبیر و تفسیر میں مختلف پہلو نکلتے ہوں۔

ما اشکل تفسیره لمشابهته بغیره اما من حیث اللفظ او من حیث المعنی (راغب) واما المتشابه فهو ان یکون احد الشیئین مشابهًا للآخر بحیث یعجز الذهن عن التمییز (کبیر) انما المتشابه فی هذه الآیة من باب الاحتمال والاشتباه وقیل ان المتشابه ما یحتمل وجوهًا (قرطبی) المتشابهات لهن تصریف وتحریف وتاویل ابتلی اللہ فیهن العباد (قرطبی۔ عن مجاهد وابن اسحٰق)

آیت متشابہ کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس پر ایمان رکھنا تو بہر حال واجب ہو لیکن اس پر عمل کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا ہو، مثلاً گزشتہ قوموں سے متعلق خبریں، یہ رائے ابن تیمیہؒ کی ہے۔

ان المتشابه ما یؤمن به ولا یعمل به ذکره ابن تیمیه والظاهر انه جمیع الاخبار (المنار)

اور ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ صفاتِ باری سے متعلق آیات، متشابہات میں داخل ہیں اور یہ قول بھی ابن تیمیہؒ کا ہے۔

ان المتشابه آیات الصفات (ای صفات اللہ) خاصة ذکره ابن تیمیة ایضًا۔ (المنار)

اور اس پر کہنا چاہیے کہ سب کا اجماع ہے کہ قرآن مجید میں متشابہات صرف وہی آیات ہیں جن میں اخبار

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ

سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے (اسی حصہ کے) پیچھے ہو لیتے ہیں جو متشابہ ہے ۳۱؎ شورش کی

الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ

تلاش میں اور اس کے (غلط) مطلب کی تلاش میں ۳۲؎ درآنحالیکہ کوئی اس کا (صحیح) مطلب نہیں جانتا بجز اللہ کے ۳۳؎

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ

اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لے آئے

غیب یعنی صفاتِ آخرت وغیرہ کا بیان ہے۔

ھٰذا رای جمہور المفسرین وذھب جمہور عظیم منھم الی انہ لامتشابہ فی القرآن الا اخبار الغیب کصفۃ الاٰخرۃ واحوال الناس نعم وعذاب۔ (المنار)

۳۱؎ (اور محکمات سے قطع نظر کر لیتے ہیں)

اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ۔ کھلا ہوا اور براہ راست اشارہ ہے مسیحیوں کی جانب جنھوں نے اپنے پیروں کی صاف واضح وصریح ہدایاتِ توحید کو پس پشت ڈال کر ان کی بعض تشبیہات کو توڑ مروڑ کر اصل قرار دے لیا تھا، لیکن الفاظ عام و وسیع ہیں اور ہر کج رائے وکج رو ہر زندیق وصاحبِ بدعت اس کے تحت میں آجاتا ہے۔

ھذہ الاٰیۃ تعم کل طائفۃ من کافر وزندیق وجاھل وصاحب بدعۃ وان کانت الاشارۃ بھا فی ذالک الوقت الی نصاریٰ نجران (قرطبی) ھم اھل البدع۔ (مدارک)

محققین نے اہلِ اسرار کے باب میں تصریح کر دی ہے کہ ان سے اگر ایسا کلام منقول ہو جو اپنی ظاہری صورت میں شریعت کے مطابق نہ ہو تو سلامتی اس میں ہے کہ نہ اس کلام کے ظاہر کو قبول کیا جائے اور نہ ان اشخاص ہی سے انکار کر دیا جائے۔

۳۲؎ (تاکہ عقائد واحکام کے باب میں اس کلام سے اپنی گمراہیوں کی سند حاصل کریں)

جن کے دلوں میں حق طلبی، حق جوئی وتلاشِ صداقت نہیں ہوتی وہ اسی دھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ دین میں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کریں اور بجائے اس کے کہ خود دین کی راہ پر چلیں، دین کو اپنی راہ پر چلانا چاہتے ہیں اور یہ لوگ نصوص کلامِ الٰہی کو توڑنے مروڑنے میں کوئی باک نہیں رکھتے جیسا کہ آج کل بھی ہر فرقۂ باطل کی تاویلات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے

الفتنۃ ھی الکفر والضلال فی ھذا الموضع (جصاص)

اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ۔ اس غلط تعبیری میں بھی یہ لوگ مخلص نہیں مقصود بس ان کا عوام مسلمین کو تشویش میں ڈالنا اور وحدتِ دین میں رخنہ پیدا کرنا ہے۔

طلبًا للتشکیک فی القرآن واضلال العوام کما فعلتہ الزنادقۃ والقرامطۃ (قرطبی)

وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ۔ یعنی تاکہ اس سے غلط سلط معنی اپنی مرضی کے موافق تلاش کر لیں۔ تاویل یہاں تحریف کے مرادف ہے

كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ

(وہ) سب ہی ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۲۰ اور نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں ۲۱ اے ہمارے پروردگار!

قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ

ہمارے دلوں کو کج نہ کر بعد اس کے کہ تو ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا کر ۲۲

ای تحریفہ علی ما یرید ہ۔ (ابن کثیر) لاضافۃ فی تاویلہ للعھد ای بتاویل مخصوص وھو ما لم یوافق الحکم بل ما کان موافقا للتشھی (روح) المراد منہ انھم یطلبون التاویل الذی لیس فی کتاب اللہ علیہ دلیل ولابیان (کبیر) ای التاویل الذی یشتھونہ (مدارک)

۱۹ (اور وہی جس کو جتنا چاہے بتلا دے چاہے نصوص قرآنی سے اشارۃً یا دلالۃً یا اقتضاءً چاہے اقوال رسول سے صراحۃً)

۲۰ (اور سارے کا سارا حق ہے۔ متشابہات کے معنی جو کچھ بھی ہوں بہر حال وہ بھی حق ہی)

الرّٰسخون فی العلم یعنی علم دین میں پختہ اور صاحبان عقل سلیم۔ اکثر محققین کا مذہب یہ ہے کہ وقف تام وما یعلم تاویلہ الا اللہ پر ہے اور الرّٰسخون فی العلم سے دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے جس کی خبر یقولون ہے قرطبی نے صحابہ تابعین میں حضرت عائشہؓ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ عروہ بن زبیرؓ ابی بن کعبؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا اور ائمہ لغت ونحو میں کسائیؒ اور اخفشؒ اور فراء اور ابو عبید کا مذہب یہی بتلایا ہے اور حنفیہ بھی عموماً اسی کے قائل ہوئے ہیں۔

وھو الذی ذھب الیہ الحنفیۃ (روح) والوقف عند الجمھور علی قول الا اللہ (مدارک)

بلکہ اکثر صحابہ وتابعین ومحققین اہل سنت کا یہی مذہب ہوا ہے۔

ھو مذھب الاکثرین من اصحاب رسول اللہ والتابعین واتباعھم خصوصا اھل السنۃ وھو اصح الروایات عن ابن عباس۔ (روح)

رسوخ کے معنی مضبوط ہو جانے اور جڑ جم جانے کے ہیں۔

الرسوخ الثبوت فی الشئ کل ثابت راسخ۔ (قرطبی)

تو الرّٰسخون فی العلم وہ ہوئے جن کے دلوں میں دین کے حقائق ثبت ہو چکے ہیں۔

کل من عند ربنا۔ خواہ اس کے بعض حصوں کے معنی بالکل ظاہر وواضح ہوں اور خواہ اس کے بعض حصوں کے مفہوم میں خفا واشتباہ ہو تقدیر کلام یوں ہے کلہ من عند ربنا او کلہ میں ضمیر کتاب اللہ کی طرف ہے

۲۱ (جو دین کے باب میں عقل وفہم سے کام لیا کرتے ہیں)

بیان فہم سلیم رکھنے والوں کی عادت کا ہے کہ ان لوگوں نے جب قرآن کے مجموعہ اور کل کو کلام الٰہی مان لیا تو اب اس کے کسی حصہ کے متعلق بھی بے اعتقادی اور ریب دل میں نہیں لاتے۔

۲۲ یعنی ہم کو اس صراطِ مستقیم پر قائم رکھ اور ہمارا حال کہیں یہود ونصاریٰ کا سا نہ ہو جائے جو کتاب ونبوت

إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ

بیشک تو ہی تو بڑا عطا کرنے والا ہے ۲۲ اے ہمارے پروردگار بیشک تو (تمام) لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن جس کے

إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ

وقوع میں ذرہ بھی شک نہیں ۲۳ بیشک اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں جاتا ۲۴ ۲۵ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد

أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾

اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور یہی لوگ آگ کے ایندھن ہوں گے ۲۶

کے بعد بھی گمراہ ہو گئے، یہ ساری دعا الرّٰسخون فی العلم کی زبان سے ہے یعنی علم دین میں پختہ کاروں کی زبان سے۔ یہ لوگ اپنے رسوخ فی العلم اور پختہ کاری پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ اس نعمت کے زوال سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔

مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً۔ انہیں خود اپنے کسی عمل پر ناز یا دعویٰ نہیں ہوتا، یہ نہیں کہتے کہ ہمیں ہمارے حسنِ عمل کے انعام میں راہِ راست پر قائم رکھ بلکہ کہتے ہیں کہ محض اپنے فضل و کرم، لطف و عنایت سے راہِ ہدایت پر مستقیم رکھ۔

ای من عندک ومن قبلک فضلاً لا عن سبب منّا ولا عمل (رضی)

گویا اس میں ادبِ دعا کی تعلیم آگئی۔

رَحْمَةً کا صیغۂ نکرہ اس کی عظمت اور بڑائی کے لئے ہے۔

وتنوینہ للتعظیم (روح)

۲۳ (تو ایسے کے لئے اس درخواست کا قبول کر لینا مشکل کیا ہے)

مفسر قرطبی نے کہا ہے کہ جاہل صوفیہ اور باطنیہ، زنادقہ نے اس آیت سے یہ مَن گھڑت مسئلہ نکالا ہے کہ علم وہی ہے جو اللہ کی طرف سے محض وہبی ہو، کسبی نہ ہو اور علم کتابی حجاب کے حکم میں ہے۔

۲۴ (اس لئے قیامت کا آنا برحق اور بندوں کو اس کی یاد اور اس کا اہتمام ضروری)

مومنینِ کاملین کی یہ دعائیں خوفِ آخرت سے ہوتی ہیں، کسی مادّی دنیوی غرض سے نہیں۔

جَامِعُ النَّاسِ۔ یعنی لوگوں کی موت کے بعد اٹھانے والا اور اکٹھا کرنے والا۔

ای باعثھم و مجیبھم بعد تفرقھم (قرطبی)

۲۵ (جیسا کہ بعض جاہلی قوموں اور فرقوں نے گمان کر رکھا ہے)

جاہلی قوموں کے عجیب عجیب معتقدات میں سے یہ عقیدے بھی ہیں کہ خدا کے لئے جائز ہے کہ وعدہ کر کے بھول جائے یا وعدہ کا ایفاء اسے خلافِ مصلحت نظر آئے اور اس لئے اسے وہ ٹال جائے اور افسوس ہے کہ بعض مسلمان کہلانے والے فرقوں نے ان خرافات میں ان کی تقلید شروع کر دی ہے۔ خلفِ وعید کا مسئلہ جو اہلِ سنّت کے ہاں ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے اور اس سے حق تعالیٰ کی شان میں کوئی منقصت نہیں نکلتی بلکہ عظمت و کرمت کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

جیسا کہ معاملہ فرعون والوں کے ساتھ ہوا اور ان سے قبل والوں کے ساتھ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾

سو اللہ نے ان کی گرفت کی ان کے گناہوں کے باعث، اور اللہ بڑا سخت سزا دینے والا ہے ۲۷؎

۲۶؎ (عالم آخرت میں)

اَلنَّارِ۔ یعنی آتش جہنم جہنم کے عذاب آتشیں پر توریت وانجیل کے حوالے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں، آیۂ کریمہ فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ کے تحت میں۔

مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی عذاب الٰہی سے نہ بچا سکیں گے۔

ای من عذاب اللّٰہ۔ (قرطبی)

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ۔ یعنی جاہلی قوموں کا ایک عقیدہ یہ بھی رہا ہے کہ اولادِ نرینہ اگر مرے ہوئے ماں باپ کی طرف سے دان پُن کردے تو والدین کی نجات ہوجائے گی خواہ وہ ایمان سے محروم ہی دنیا سے اٹھے ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ سوال ہوا ہے کہ کون سے کافر یہاں مراد ہیں، اور مختلف جوابات دیئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ الفاظِ قرآنی عام ہیں، کافروں کی ہر صنف و نوع پر شامل۔

الظاھر ان المراد بھم جنس الکفرۃ الشامل لجمیع الاصناف۔ (روح)

۲۷؎ (مجرموں اور باغیوں کو)

ذُو انْتِقَامٍ۔ پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔

اللہ کوئی بے بس اور بے عجز قسم کا مہاتما نہیں کہ بندوں کو ہر طرح کے ظلم و عدوان کا مرتکب دیکھے اور پھر دم نہ مارے، وہ جب بالآخر سزا دینے پر آجاتا ہے تو سب کو پتا چل جاتا ہے کہ کوئی گرفت اس کی گرفت سے شدید تر و الیم تر نہیں۔

كَدَأْبِ۔ دأب کے معنی حالت یا معاملہ کے ہیں۔

الدأب العادۃ والشان۔ (قرطبی)

ف۔ یہ تثلیث بے سود ہونے میں ہے، گویا تاریخ سے استشہاد ہے کہ جس طرح ماضی میں فرعونیوں کے کام ان کا مال [illegible] کچھ نہ آسکا، ورنہ عذابِ الٰہی سے انھیں کوئی چیز نہ بچا سکی، اسی طرح ان کافروں کے حق میں بھی یہ سارے [illegible] بالکل عبث ولاحاصل ثابت ہوں گے۔

اٰلِ فِرْعَوْنَ۔ فرعون اور فرعونیوں پر مفصل حاشئے پارۂ اول میں گزر چکے، فرعونیوں کی ہلاکت کے ذکر میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ ان کی ہلاکت مسیحیوں کو مسلّم تھی اور سورہ کا روئے سخن خاص طور پر مسیحیوں ہی کی جانب ہے۔

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ یعنی وہ نافرمان قومیں جو عہدِ موسوی سے بھی قدیم تر ہوئی ہیں۔

اٰيٰتِنَا۔ یہ نشانیاں خواہ آسمانی صحیفوں اور نوشتوں کی صورت میں ہوں یا معجزات و خوارقِ نبوت ہوں یا دلائلِ توحید ہوں

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ

آپ (ان) کفر والوں سے کہہ دیجئے کہ تم عنقریب مغلوب کئے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے اور وہ

الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ

برا ٹھکانا ہے ۲۵ بیشک تمہارے لئے ایک نشانی (ان) دو گروہوں میں ہے جو باہم مقابل ہوئے ایک گروہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ

اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافر (تھا) ۲۶ یہ (کافر) ان کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے اپنے سے کئی گنا ۲۷

یحتمل ان یرید الآیات المتلوۃ ویحتمل ان یرید الآیات المصوبۃ للدلالۃ علی الوحدانیۃ (قرطبی)

اما المتلوۃ فی کتاب اللہ تعالی او العلامات الدالۃ علی توحید اللہ تعالی وصدق انبیائہ (روح)

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۔ اور انہیں ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں مع ان کی ساری عظمت و شوکت کے نیست و نابود کر دیا خطاب بنی حق سے بغض و عناد رکھنے والوں سے ہے رسول کے واسطہ سے۔

۲۵ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۔ کا تعلق تو ظاہر ہے کہ آخرت ہی سے ہے سوال آیت کے وعید اول ستغلبون سے متعلق ہے کہ معاصر دشمنانِ دین کی اس مغلوبیت و مقہوریت کا تحقق کہاں ہوگا؟ آخرت میں تو خیر ہوگی لیکن آیا اس کے قبل اہلِ حق کے ہاتھوں سے اس دنیا میں بھی؟ اہلِ تفسیر نے بالاتفاق اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور تصریح کی ہے کہ اس کا وقوع عنقریب اس دنیا میں ہوگا، چنانچہ ہوا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ باقی یہ کہ اس سے کافروں کا کون سا گروہ متعین طور پر مراد ہے بعض نے پیش گوئی کا مصداق بدر میں مشرکین مکہ کی ہزیمت کو ٹھہرایا ہے۔

المراد مشرکی مکۃ (معالم عن مقاتل) قل لمشرکی مکۃ ستغلبون یعنی یوم بدر (بیضاوی)

قیل نزلت فی قریش قبل بدر بسنتین۔ (بحر)

لیکن اکثر نے مدینہ میں یہود کے پُرقوت جتھوں اور جرگوں کی شکست و پامالی مراد لی ہے۔

یعنی الیہود ای تھزمون (قرطبی عن ابن عباس) فالمراد من الموصول الیہود (روح)

ستغلبون میں س قُربِ وقوع کے لئے ہے یعنی اس دنیا میں اس کا مشاہدہ ہو کر رہے گا۔

والسین لقرب الوقوع ای ستغلبون عن قریب واُرید منہ فی الدنیا (روح)

بہتر یہ ہوگا کہ لفظ کے اطلاق کو عام رکھا جائے اور یہود و مشرکین جو بھی رسول اللہ صلعم کے عہد میں مسلمانوں کے ہاتھ خوار و مغلوب ہوئے سب کو آیت کا مصداق یکساں ٹھہرایا جائے۔

والظاہر ان الذین کفروا یعم الفریقین المشرکین والیہود وکل قد غلب بالسیف والجزیۃ والذلۃ وظہور الدلائل والحجج۔ (بحر)

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭاِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

اور اللہ اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے مدد کر دیتا ہے ۳۱ بیشک اس (واقعہ) میں اہل بصیرت کے لئے (بڑا) سبق ہے ۳۲

بہرحال قرآنی پیشگوئی کا اعجازی رنگ ہر صورت میں عیاں ہے، نزول آیت کے وقت مسلمانوں کی بے بسی اور بے سروسامانی دیکھ کر کوئی بھی انسانی دماغ یہ پیشگوئی نہیں کر سکتا تھا کہ مشرکین مکہ یا یہود مدینہ کسی سے بھی یہ ایسی زبردست ٹکر لے سکتے ہیں۔

۲۹ (جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا)

اشارہ غزوۂ بدر کی جانب ہے، جو ۲ھ ہجری یا ۱۵ نبوی میں ہوا تھا۔

لَكُمْ۔ مخاطب خصوصی یہاں یہود مدینہ ہیں جنہیں اپنے فنون حرب پر بڑا غرہ تھا۔

اٰيَةٌ۔ نشان اللہ کی قدرت و کارسازی اور رسول اللہ صلعم کی صداقت کا۔

يعني علامة ودلالة على صدق ما اقول انكم ستغلبون وعبرة۔ (ابن جریر)

فِيْ فِئَتَيْنِ۔ یعنی دو گروہوں کے واقعہ میں ایک گروہ مومنین بے سروسامان کا، دوسرا گروہ مشرکین باساز و سامان کا۔

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ گروہ مومنین کا تھا، تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر تعداد میں کل ۳۱۳ تھے اور وہ بھی بغیر سامان حرب کے، اونٹ اتنے کم کہ چار چار پیادوں کے حصہ میں ایک ایک پڑتا تھا، گھوڑے لشکر بھر میں کل دو، آہنی زرہ پوش تعداد میں کل ساٹھ۔

وَّاُخْرٰى كَافِرَةٌ۔ یہ لشکر ریاست مکہ کا تھا، تعداد میں مسلمانوں سے سہ چند تھا یعنی ۹۵۰ افراد پر مشتمل قریش کے بہترین سواروں کے زیر قیادت اور ہر ضروری سامان سے آراستہ شتر سوار ان میں ۷۰۰ تھے اور اسپ سوار و زرہ پوش ۱۰۰ تھے

۳۰ (لیکن یہ کثرت تعداد پھر بھی کچھ کام نہ آئی اور آخرکار ذلت و شکست لشکر مکہ ہی کو نصیب ہوئی)

يَرَوْنَهُمْ رَاْيَ الْعَيْنِ۔ یعنی یہ محض وہم و خیال نہ تھا بلکہ واقعۃً مشاہدہ کر رہے تھے۔

رُؤْيَة۔ آیت میں رویت چشم کے لئے ہے۔

قال ابو علي الرؤية في الاٰية رؤية عين ولذٰلك تعدت الى مفعول واحد (قرطبی) يعني رؤية ظاهرة مكشوفة (کشاف)

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ۔ کون کس کو کتنا دیکھ رہے تھے؟ سوال کے جواب یا ضمیروں کی تعیین میں اہل تفسیر کے درمیان شدید اختلاف ہے لیکن سب سے سہل و بے تکلف ترکیب وہ ہے جو امام ابن جریر طبری نے اختیار کی ہے اور وہی یہاں لے لی گئی ہے، علامہ آلوسی نے بھی اسی کو سدی تابعی کے حوالہ سے اختیار کیا ہے۔

والمراد كما قال السدي ترى الفئة الاخيرة الكافرة الفئة الاولى المؤمنة مثلي عدد الرائين۔ (روح)

مِثْلَيْهِمْ سے مراد دو چند بھی لی گئی ہے اور سہ چند بھی اور مطلق کثرت تعداد بھی بغیر کسی عدد خاص کے تعین کے۔

زعم الفراء ان معنى يرونهم مثليهم ثلاثة امثالهم (بحر) المراد بالمثلين مطلق الكثرة لا خصوص المثلين۔ (جمل)

۳۱ (چنانچہ اس موقع پر اس کی مشیت نصرت مومنین سے متعلق ہو گئی اور کافروں کے کام نہ ان کی تیاریاں آ سکیں نہ ان کی کثرت تعداد ہی)

مَنْ يَّشَآءُ۔ اس جزو نے یہ صاف کر دیا کہ اس تائید کی تعیین اس عالم ابتلاء میں مصالح تکوینی کے لحاظ سے ہوتی ہے یہ لازمی نہیں کہ ہر حال میں اور ہر موقع پر تائید و نصرت اہل حق ہی کی ہو۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

لوگوں کے لئے خوشنما کردی گئی ہے مرغوبات کی محبت (خواہ) عورتوں سے ہو یا بیٹوں سے یا ڈھیر لگے ہوئے

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

سونے اور چاندی سے یا نشان پڑے ہوئے گھوڑوں سے یا مویشیوں سے یا زراعت سے ۳۳ھ

۳۲ھ یعنی بڑا سبق ہدایت کا اُن لوگوں کے لئے ہے جو بصیرت سے کام بھی لیتے رہتے ہیں۔

عِبْرَةً۔ تنوین عظمت کے لئے ہے یعنی ہدایت و بصیرت کا بہت بڑا سبق۔

التنوين للتعظيم اى عبرة عظيمة كائنة۔ (روح)

۳۳ھ اور انہی سب کی محبت اکثر افراد میں حدود جائز سے تجاوز کرکے معصیت کا سبب بن جاتی ہے

لِلنَّاسِ۔ الناس سے یہاں مراد مکلف افراد ہیں، اس لئے مجنون اور بچے خود بخود اس فہرست سے نکل گئے

الناس هم المكلفون۔ (المنار)

حُبُّ الشَّهَوٰتِ۔ شہوات یہاں شہیات کے معنی میں ہے یعنی مرغوب و دلپسند چیزیں، عربی زبان میں یہ استعارہ تعلق و اتصال کی بنا پر عام ہے۔

وقد يسمى المشتهى شهوة (راغب) الشهوات ههنا هي الاشياء المشتهيات سميت بذلك على الاستعارة للتعلق والاتصال .... وهذه استعارة مشهورة في اللغة (كبير) والمراد بها هنا المشتهيات على طريق مالغه وهي سائغة الاستعمال (المنار) جعل الاعيان التي ذكرها شهوات مبالغة في كونها مشتهاة (كشاف)

ان مرغوبات کے نام صرف مثال اور نمونہ کے طور پر دیئے گئے ہیں، شوق و رغبت کی چیزوں کا حصر مراد نہیں

الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ یعنی نشان زدہ گھوڑ دوڑی گھوڑے جو بڑی قیمتی اور قابل قدر چیز سمجھے جاتے تھے۔

خیل۔ اسم جمع ہے بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اس کا واحد فرس ہے اور اصلاً اس کا تعلق جانور ہے سواری اور سوار دونوں کا۔

الخيل في الاصل اسم للافراس والفرسان جميعا ويستعمل في كل واحد منفردا (راغب) اجمعت العرب على غير معظمها فقيل خيل؟ (اقرب) وقال قوم لا واحد له من لفظه بل هو اسم جمع واحده فرس (روح) قال الواحدي الخيل جمع لا واحد له من لفظه كالقوم والنساء والرهط۔ (كبير)

زُيِّنَ لِلنَّاسِ۔ اس سے واضح ہو گیا کہ انسان کی نظر میں ان چیزوں کی رغبت و کشش بطور امر طبعی کے ہے اور بذات خود معصیت نہیں انسان مکلف ان کے شوق کے ازالہ کا نہیں انہیں صرف عقل سلیم و احکام شریعت کے ماتحت رکھنا چاہئے

ويراد به خلق حبها في القلوب وهو بهذا المعنى مضاف اليه تعالى (روح)

مِنَ النِّسَآءِ۔ عورتوں کا ذکر شاید اس لئے سب پر مقدم رکھا گیا ہو کہ یہی لذت ساری مادی لذتوں کی سردار ہے۔

وانما قدمهن على الكل لان الالتذاذ بهن اكثر والاستئناس بهن اتم۔ (كبير)

القناطير۔ قنطار کی جمع ہے مفسرین نے اس کی کچھ مقداریں اور تعدادیں بھی لکھی ہیں لیکن سب سے بہتر قول یہ ہے کہ اس کا اطلاق عام ہے

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿١٤﴾ قُلْ

یہ (سب) دنیوی زندگی کے سامان ہیں ۳۴؎ اور حسن انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے ۳۵؎ آپ کہئے کہ کیا میں تمہیں

اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ

ایسی چیز کی خبر دوں جو ان (چیزوں) سے (کہیں) بہتر ہے ۳۶؎ ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے رہتے ہیں ان کے پروردگار

جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ

کے پاس باغ ہیں کہ ان کے نیچے ندیاں پڑی بہ رہی ہیں یہ ان میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ۳۷؎ اور صاف ستھری کی ہوئی

مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿١٥﴾

بیویاں ہوں گی ۳۸؎ اور اللہ کی خوشنودی ہوگی ۳۹؎ اور اللہ اپنے بندوں کا خوب دیکھنے والا ہے ۴۰؎

هو المال الكثير كما اخرجه ابن جرير عن الضحاك (روح) وقيل القنطار عند العرب وزن لا يحد (روح) والكثرة تختلف بحسب الاعتبارات والامصار (روح) وقد اختلف المفسرون في مقدار القنطار على اقوال وحاصلها انه المال العظيم (ابن كثير)

۳۴؎ (سو اس حقیقت کو سمجھ کر ان کی محبت جائز حدود کے اندر محدود رکھنی چاہیے)
متاع کہتے ہی اس چیز کو ہیں جس سے کسی حیثیت سے نفع کچھ مدت کے لئے حاصل کیا جائے۔

المتاع انتفاع ممتد الوقت (راغب) وكل ما ينتفع به على وجه ما فهو متاع (راغب)

مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی ساری چیزیں ہیٹھیا دل لگانے کے قابل نہیں البتہ دنیوی زندگی برتنے میں مفید و معین یقیناً ہیں، سو ان کی قدر اسی حد تک کرنا چاہیے یہ نہ ہو کہ یہ مقاصد حیات بن جائیں دنیا خود ہی فانی ہے اور اس کے یہ سارے ساز و سامان بھی فانی۔

والمعنى تحقير امر الدنيا والاشارة الى فنائها وفناء ما يستمتع به فيها (بحر)

۳۵؎ (سو دائمی اور غیر فانی راحت کے لئے فکر و اہتمام صرف اللہ کی رضا کا رکھنا چاہیے، اس کے آگے دنیا کی آنی و فانی بڑی سے بڑی لذت بھی بے بساط ہی ہے۔

ومعنى الآية تقليل الدنيا وتحقيرها والترغيب في حسن المرجع الى الله في الآخرة (قرطبی)

امام رازی نے اس کے تحت میں یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ انسان کا اصل مرجع تو جنت ہی ہے اس لئے کہ اللہ نے خلقت و تکوین رحمت ہی کے لئے کی ہے نہ کہ عذاب کے لئے، اور دوزخ جو مرجع ہے وہ محض ضمناً اور ثانوی حیثیت سے ہے۔

المآب المقصود بالذات هو الجنة فاما النار فهي المقصود بالعرض لانه سبحانه خلق الخلق للرحمة لا للعذاب (کبیر)

۳۶؎ (کیا بہ لحاظ کیفیت، کیا بہ لحاظ کمیت اور کیا بہ لحاظ قیام و دوام)
خطاب عام انسانوں سے رسول علیہ السلام کے واسطہ سے ہے۔

الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

(یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے رہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم یقیناً ایمان لے آئے سو ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے

ذٰلکم۔ یعنی یہ چیزیں جو سرتاسر بے ثبات و بے حقیقت ہیں۔

۳۷ الذین اتقوا۔ یعنی جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں۔

خوفِ خدا پر رحمتِ الٰہی کے مرتب و متوجہ ہونے کا ذکر قرآن مجید ہی میں نہیں اگلے صحیفوں میں بھی بار بار آیا ہے، چنانچہ توریت کے حوالے پارۂ اول کے حواشی میں گزر چکے، مسیحیوں کے مقدس نوشتے بھی خوف و خشیت کے ذکر سے خالی نہیں۔

"اور اس کا رحم ان پر جو اس سے ڈرتے ہیں پشت در پشت رہتا ہے"۔ (لوقا ۱ : ۵۰)

"آؤ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی آلودگی سے پاک کریں اور خدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں"۔ (۲۔ کرنتھیوں ۷ : ۱)

"وہ وقت آپہنچا ہے کہ تیرے بندے نبیوں اور مقدسوں اور ان چھوٹے بڑوں کو جو تیرے نام سے ڈرتے ہیں اجر دیا جائے"۔ (مکاشفہ ۱۱ : ۱۸)

۳۸ (اُن کے لئے جنت ہیں)

مطھرۃ۔ پاک صاف کی ہوئی ہر جسمانی آلودگی و نجاست سے۔

المطھرات ممایعھد فی نساء الدنیا من الشوائب۔ (المنار)

قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ اہلِ جنت کے لئے راحت و لذت کا سامان ہر قسم کا ہوگا، مادی لطف کا بھی، ذہنی لطف کا بھی، روحانی لطف کا بھی، پھر اگر انھیں وہاں بیویاں بھی عنایت ہوں ہر طرح پاک صاف اور لطف ازدواجی بھی پوری طرح اٹھانے کا موقع ملے تو اس میں "روشن خیالی" کے آخر شرمانے کی کون سی بات ہے؟

۳۹ (جو حاصل اور عطر ہے ساری نعمتوں، لذتوں، راحتوں کا)

رضوانٌ۔ کی تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے۔

ای رضاء عظیم علی ما یشعر بہ التنوین۔ (روح)

۴۰ (اور ان کے احوال، اقوال، اعمال کے ایک ایک جزئیہ سے پوری طرح خبردار ہے۔)

پس اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی حساب یا صدورِ جزاء سے رہ جائے۔

۴۱ یہ کہنے والے کون ہیں؟ وہی ہیں جن کا ذکر الذین اتقوا کے ماتحت چل رہا ہے، یہ اپنے اعمال و احوال پر نازاں ہونا الگ رہا، اُلٹے فرطِ خشیت و ہیبت سے اپنی مغفرت و حسنِ خاتمہ کے لئے مناجات کرتے رہتے ہیں۔

اٰمَنَّا۔ یعنی ہم اللہ اور اس کے رسول اور اس کی شریعت پر ایمان لے آئے۔

اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا۔ ایمان پر مطالبہ مغفرت کو مرتب کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ مغفرت میں اصل حائل عدمِ ایمان ہی ہوتا ہے جب یہ مانع رفع ہوگیا تو اب کیا ہے اب ہماری باقی خطاؤں لغزشوں کو تو معاف کرہی دیجئے، ایمان بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی انتہائی اہمیت اس آیت سے ظاہر ہو رہی ہے، امام المفسرین امام رازیؒ نے اس موقع پر بہت خوب تقریر کی ہے

ذالک یدل علی انھم توسلوا بمجرد الایمان الی طلب المغفرۃ واللہ تعالٰی حکی ذالک عنھم فی معرض المدح لھم والثناء علیھم فدل ھذا علی ان العبد بمجرد الایمان یستوجب الرحمۃ والمغفرۃ من اللہ تعالٰی۔ (کبیر)

اَلصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡمُنۡفِقِیۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ (۱۷)

(یہ) صبر کرنے والے ہیں اور راستباز ہیں اور فروتنی کرنے والے ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلے پہر گناہوں سے بخشش چاہنے والے ہیں ۴۲

اور ان ہی کی پیروی صاحب بحر و صاحب روح اور قاضی بیضاوی نے بھی کی ہے۔

علی مجرد الایمان دلیل علی کفایۃ فی استحقاق المغفرۃ والوقایۃ من النار من غیر توقف علی الطاعات (روح) فدل علی ان الایمان یترتب علیہ المغفرۃ ولا یکون الایمان عبارۃ عن سائر الطاعات (بحر) علی مجرد الایمان دلیل علی انہ کاف فی استحقاق المغفرۃ او الاستعداد لھا (بیضاوی)

ذُنُوۡبَنَا۔ ذنوب کے تحت میں گناہ کبیرہ اور صغیرہ سب ہی آگئے۔

والمراد من الذنوب الکبائر والصغائر (روح)

۴۲ مغفورین و مقبولین کے کتنے طبقات اس ایک آیت کے اندر شمار کردیئے گئے۔

بِالۡاَسۡحَارِ۔ سحر نام اس وقت کا ہے جب رات کی تاریکی صبح کی روشنی سے مل رہی ہو۔

السحر والسحرۃ اختلاط ظلام آخر اللیل بضیاء النہار وجعل اسمًا لذالک الوقت (راغب)

آخر شب کی خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ وقت خاص طور پر دلجمعی اور روحانی قویٰ کی بیداری بالیدگی کا ہوتا ہے اور نفس پر اس وقت کا اٹھنا شاق بھی زائد ہوتا ہے یہ مراد نہیں کہ استغفار بجز اس وقت کے اور کسی وقت ہو نہیں سکتا۔ پچھلے پہر توبہ و استغفار میں مشغول رہنے والے یہ نہیں کہ ناچ رنگ کی محفلوں کو زینت دینے والے، مشاعروں اور قوالیوں کی مجلسیں جمانے والے۔

اَلصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰدِقِیۡنَ۔ یعنی صبر کرنے والے اور راستی برتنے والے اپنے سارے معاملات میں۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ بجائے صیغۂ فعل یعنی یصبرون اور یصدقون کے اسم فاعل الصابرین اور الصادقین اس لئے لائے گئے کہ ان سے ان اشخاص کی یہ عام و مستقل عادت ظاہر ہو۔

یدل علی ان ھٰذا المعنی عادتھم وخلقھم وانھم لاینفکون عنھا (کبیر)

اَلۡقٰنِتِیۡنَ۔ یعنی فروتنی کرنے والے اللہ کے حضور میں۔

اَلۡمُنۡفِقِیۡنَ۔ یعنی خرچ کرنے والے اللہ کی راہ میں۔ اس کے تحت میں وہ تمام نیک اور جائز خرچ آگئے جو انسان اپنی ذات پر یا اپنے بیوی بچوں پر یا بہ سبیل زکات و جہاد وغیرہ کرتا ہے۔

ویدخل فیہ انفاق المرء علی نفسہ واھلہ واقاربہ وصلۃ رحمہ وفی الزکاۃ والجہاد وسائر وجوہ البر (کبیر)

عارفوں نے کہا ہے کہ یہ تمام صفات اولیاء اللہ کے ہوتے ہیں۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ میرے خیال میں کوئی ایک صفت بھی ان صفات پنجگانہ سے کسی میں موجود ہوئی تو وہ بھی اسی اجر و مدح میں داخل ہوگا۔

واظن والعلم عند اللہ ان کل من کان معہ واحدۃ من ھٰذہ الخصال دخل تحت المدح العظیم واستوجب ھٰذا الثواب الجزیل۔ (کبیر)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا

اللہ کی گواہی ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے بجز اس کے اور فرشتوں اور اہل علم کی (بھی گواہی یہی ہے) وہ عدل سے

بِالْقِسْطِؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُؕ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

انتظام رکھنے والا (بھی وہی ہے) کوئی معبود نہیں ہے بجز اس زبردست حکمت والے کے یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

۴۳ (اس لئے شرک ہر درجہ اور نوعیت کا باطل ہے۔)

شہد اللہ۔ اللہ کی یہ گواہی کتب آسمانی سے بھی ظاہر ہو رہی ہے اور صحیفۂ کائنات سے بھی۔

وهو بما نصبه من الدلائل الدالة عليها وانزال الآيات القاطعة بها (بیضاوی)

کتب الٰہی کی شہادت دلیل نقلی کا حکم رکھتی ہے اور مصنوعات فطرت کی دلالت دلیل عقلی کا۔

شہادت سے مراد وہ گواہی ہے جو یا بصارت سے حاصل ہو یا بصیرت سے، مشاہدات حسی سے یا معنوی سے۔

الماصل ان الشهادة بالشئ هی الاخبار به عن علم بالمشاهدة الحسية اوالمعنوية وهی الحجة والدليل

وهو المراد هنا (المنار)

ملائکۃ۔ یہ وہی مخلوق ہے جسے اکثر مشرک قوموں نے دیوتا کا لقب دے کر شریک خدائی سمجھ رکھا ہے۔

اولوا العلم۔ علم سے مراد علم حقائق ہے نہ کہ علوم دنیوی و تجربی۔ محققین نے آیت سے علماء کا خاص شرف و فضل نکالا ہے۔

وفی هذه الآية دليل على فضل العلم وشرف العلماء (قرطبی)

۴۴ (ساری کائنات کا)

قائما بالقسط۔ عدل سے مراد ہے کہ ہر شے اپنے محل مناسب میں ہو۔ بعض جاہلی قوموں نے خدا کا وجود تو تسلیم کیا ہے لیکن وجود معطل یا ایسی صفات سے موصوف جو کمالات الٰہیہ کے منافی ہیں، اسلام کا خدا خدائے معطل نہیں، منتظم ہے کارساز ہے، ہر ایک کا اور ہر کام بنانے والا ہے۔

فقرے کی ترکیب میں قول مختلف ہیں۔ جمہور کا قول ہے کہ یہ شہد اللہ کا حال واقع ہوا ہے۔

وهو قول جمهور المفسرين انه حال من شهد الله (کبیر)

۴۵ (اس لئے اُسے کسی شریک کی حاجت ہی نہیں، نہ قوت کے لحاظ سے نہ علم کے اعتبار سے)

العزیز۔ وہ جس کی قوت سب پر غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔

اشارة الى كمال القدرة (کبیر)

الحکیم۔ وہ جس کی حکمت سب سے بڑھی ہوئی ہے۔

اشارة الى كمال العلم (کبیر)

اور جو العزیز بھی ہے اور الحکیم بھی، اس کے لئے قائماً بالقسط ہونا دشوار ہی کیا ہے۔

۴۶ (نہ کہ مطلقاً ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔)

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

اور جو اختلاف کیا اس میں اہل کتاب نے سو وہ آپس کی ضد سے کیا [۴۷] بعد اس کے کہ انھیں صحیح علم

الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ

پہنچ چکا تھا۔ اور جو اللہ کی آیتوں سے انکار کرے گا سو اللہ یقیناً جلد حساب لینے والا

الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ

ہے [۴۸] پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت کیے جائیں [۴۹] تو خیر آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہو چکے [۵۰]

یہ رد ہے بادشاہ اکبر اور دوسرے بددینوں کے اس عقیدہ کا کہ ہر دین، دین حق ہے اور ہر مسلک خدا ہی کی راہ ہے اور دیر و حرم، کفر و ایمان میں فرق صرف لفظی و اصطلاحی ہے۔ خط مستقیم حقیقت یہ ہے کہ دو نقطوں کے درمیان صرف ایک ہی ممکن ہے، باقی سب خطوط منحنی و کج ہوں گے۔ راہ مستقیم خدا اور بندہ کے درمیان صرف ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے جو انبیاء و ہادیان حق کا دین ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

الدّین یعنی دین مقبول۔ الدّین اور الاسلام دونوں کا معرفہ ہونا حصر کے معنی دے رہا ہے یعنی دین مقبول صرف یہی ہے اور قرآنی فقرہ کا مفہوم یہی ہے کہ الاسلام کے سوا کوئی سا بھی دین اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔

وتعریف الجزئین للحصر ای لا دین مرضی عند اللّٰہ تعالٰی سوی الاسلام (روح) لا دین مرضی عند اللّٰہ سوی الاسلام (بیضاوی) ہو الدّین عند اللّٰہ وما عداہ فلیس عندہ فی شیء من الدین (کشاف)

[۴۷] (نہ کہ کسی اجتہاد فکری اور اختلاف فہم کی بناء پر)

یہاں پھر ایک بار اسے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اہل کتاب کا راہ حق سے انحراف کسی خطاء اجتہادی کی بناء پر نہیں، نفسانیت و ہوا پرستی کی بناء پر ہے۔ یہود پہلے سے بھی یہی کہتے چلے آ رہے تھے کہ راہ حق ہماری راہ ہے اس لئے کہ فلاں فلاں بزرگ ہمارے مورث ہوئے ہیں، اور سرور کائنات کے زمانہ میں بھی ان کا کہنا یہ تھا کہ نبوت تو اسرائیلیوں ہی کا حق رہی ہے، یہ نعمت ایک اسمٰعیلی کے حصہ میں کیوں کر جا سکتی ہے۔؟

[۴۸] (اور حساب کا جو انجام منکرین و معاندین کے حق میں ہونے والا ہے، بالکل ظاہر ہے)

بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ۔ یعنی نفسانفسی اور ضد م ضدا۔ آپس میں بھی اور دین حق سے بھی۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ۔ یعنی ان پر دین حق کی تبلیغ پوری طرح ہو چکی اور دین برحق کی حقانیت و صداقت کے دلائل واضح انھیں پہنچ چکے۔

[۴۹] (خواہ مخواہ ازراہ عناد اور پوری تبلیغ کے بعد بھی۔)

اشارہ اہل کتاب کی جانب عموماً ہے اور نصرانیوں کی جانب خصوصاً۔

حَآجُّوْكَ۔ یہاں کٹ حجتی کے معنی میں ہے، نہ کہ کسی استدلال صحیح کے مفہوم میں۔

وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

اور آپ اہل کتاب سے اور اُمّیوں سے دریافت کیجیے کہ آیا تم اسلام لاتے ہو ۵۱ سو اگر وہ اسلام لے آئے تو

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ

بس راہ ہدایت پا گئے ۵۲ اور اگر وہ روگردان رہے تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ ہی ہے ۵۳

اے جادلوك بالاقاویل المزورة والمغالطات (قرطبی)

۵۰ (اب تم مانو یا نہ مانو تمہیں اختیار ہے)۔
اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ۔ پورا رُخ اللہ کی جانب کر لینا مترادف ہے اسلام کے یعنی میرا اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کرنا
وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ میں ہو سکتا ہے کہ و عطف کا نہ ہو بلکہ مع کا مُرادف ہو۔

ویجوز ان یکون الواو بمعنی مع (کشاف)

اہل طریق نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جب وضوح حق کی پوری کوشش ہو لے اور مخاطب پھر بھی قبول نہ کرے تو اب بحث و مباحثہ قیل و قال ترک کر دینا چاہیئے۔

۵۱ ءَاَسْلَمْتُمْ کے ایک مشہور صریح معنی تو وہی ہیں جو متن ترجمہ میں درج ہو چکے ہیں لیکن بعض اہل علم نے صیغہ امر میں معنی "اسلام لاؤ" کے بھی لئے ہیں اور نحویین نے کہا ہے کہ ادات استفہام کبھی امر کے بھی معنی دیتا ہے بلکہ امر کے معنی میں زور اور زیادہ پیدا کر دیتا ہے۔

المقصود منه الامر (کبیر) قال النحویون انما جاء الامر فی صورة الاستفهام (کبیر) لفظه استفهام ومعناه امر (معالم)

استفہام کی صورت میں بھی استفسار محض مراد نہیں بلکہ مقصود تہدید ہے جیسے اردو محاورہ میں بھی تہدید کے موقع پر کہتے ہیں "کیوں جی سنتے ہو کہ نہیں"۔

قال الزجاج ءاسلمتم تهدید وهذا حسن لان المعنی ءاسلمتم ام لا (قرطبی)

وَالْاُمِّیّٖنَ ۔ مطلقًا ان پڑھ۔

الامی هو الذی لا یکتب ولا یقرء من کتاب (راغب)

یا وہ لوگ جو کتب آسمانی سے لاعلم و نابلد ہیں۔

ای الذین لا کتاب لهم (ابن جریر) الذین لا کتاب لهم (قرطبی) الذین لم یاتهم الانبیاء بالکتب (مدارک)

مراد بہر صورت مشرکین مکہ ہیں۔

وهم مشرکو العرب (قرطبی) انما وصف مشرکی العرب بانهم امیون (کبیر)

۵۲ (اور اب ان کی نجات و مغفرت میں بھی شبہ نہ رہا)
جاہلیت کے نظریۂ حیات (IDEOLOGY) میں انقلاب و اصلاح ہو جانے ہی کا نام اسلام ہے بس جس کسی نے اسلام کے نظریۂ حیات کو قبول کر لیا وہ کسی بھی نسل، قوم، رنگ، وطن کا ہو، بہرحال اب اس کا تعلق کائنات و خالق کائنات کے ساتھ صحیح نوعیت کا قائم ہو گیا

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اور اللہ اپنے بندوں کا خوب دیکھتے رہنے والا ہے ۵۴ بیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ

پیغمبروں کو ناحق ہلاک کر ڈالتے ہیں ۵۵ اور ان لوگوں کو جو عدل کا حکم دیتے ہیں انھیں مار

بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

ڈالتے ہیں۔ بس آپ انھیں عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دیجیے ۵۶ یہی وہ لوگ ہیں

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۵۷

۵۳ (اور آپ پر نتائج کی ذمہ داری ذرا بھی نہیں)
رسول اللہ صلعم کو تسکین دی گئی ہے کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو آپ ملول و فکرمند نہ ہوں آپ کا کام تو صرف تبلیغ ہے۔

۵۴ (وہ خود ہی سب کے اعمال و احوال دیکھ کر سب جزا و سزا دے گا۔)
اللہ اور رسول کے باہمی فرق کو قرآن مجید کتنی بار واضح کرتا چلا گیا ہے۔

۵۵ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ کسی کتاب الٰہی سے یا اس کے کسی جزو سے انکار یہ سب کفر بآیات اللہ کی صورتیں ہیں۔ بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی خود قاتلوں کے بھی آئین قانون و ضابطہ کے خلاف، ورنہ قتلِ انبیاء فی الحقیقت اور عند اللہ تو ہمیشہ ہی ناحق رہے گا۔ یہود کے قتلِ انبیاء و قتلِ ناحق پر حاشیہ پارۂ اول رکوع ۷ میں گزر چکا۔

۵۶ (آخرت میں)
يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ۔ یعنی لوگوں کو اخلاق و معاملات میں عدل کی ہدایتیں کرتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ مراد انبیاء اور ان کے نائبین ہیں۔ يَقْتُلُوْنَ۔ یہ سب تنابے یہود کی حق دشمنی سے متعلق اور ان کی تاریخ کی جانب ہیں۔ عہد عتیق کے متعدد صحیفوں میں یہود کی حق بیزاری کی تصریح موجود ہے مثلاً "وہ اس کا کینہ رکھتے ہیں جو دروازہ پر سرزنش کرتا ہے، اور وہ اس سے نفرت رکھتے ہیں جو حق بات کہتا ہے" (عموس ۵: ۱۰)
"قتل" یہاں اپنے اصلی اور لغوی معنی یعنی مطلق ہلاک کر ڈالنے کے مفہوم میں ہے فقہی اصطلاح یعنی "دھاردار آلہ سے ہلاک کرنے" کے معنی میں نہیں۔
عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ ایسے مجرموں و خطاکاروں پر ذہنیوں کی لعنت حضرت داؤد نبی کی کتاب میں مفصل موجود ہے:۔
"وہ جلد ہی گھاس کے مانند کاٹ ڈالے جائیں گے اور ہرے سبزے کی طرح مرجھا جائیں گے، اور شریر نہ ہوگا تو غور کرکے اس کا مکان ڈھونڈے گا، اور وہ نہ ہوگا۔ ان کی تلوار انھی کے دلوں میں پیٹھے گی، ان کی کمانیں ٹوٹ جائیں گی" (زبور ۳۷: ۱۰۔ ۱۵)
آیت سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سابق امتوں میں امر بالمعروف واجب تھا، اور یہ فرض انبیاء اور ان کے نائبین انجام

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب الٰہی سے حصہ دیا گیا تھا، انھیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ

كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم

وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر ان میں سے ایک فریق بے رُخی کرتا ہوا منہ پھیر لیتا

مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا

ہے ۵۵۷ یہ اس سبب سے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز (چند) گنے ہوئے

مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

دنوں کے ۵۵۹ اور جو کچھ یہ تراشتے رہتے ہیں اس نے انھیں ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے

دیتے تھے۔

وتدل ھذہ الآیۃ علی ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کان واجبا فی الامم المتقدمۃ وھو فائدۃ النبوۃ (قرطبی)

۵۵۶ (سزا کے وقت کہ انھیں عذاب سے چھڑا لے یا اس میں کچھ تخفیف ہی کرا دے۔)

اَعْمَالُهُمْ منکرین کے وہ اعمال جن پر انھیں دنیا میں فخر و ناز تھا، اور جنھیں وہ اپنے حسنات و فضائل میں شمار کرتے تھے

۵۵۸ حق و داعیان حق سے پے در پے انحراف و اعراض تاریخ بنی اسرائیل کا کوئی نیا یا انوکھا واقعہ نہیں، اُن کے مقدس نوشتے اور صحیفے ان شکایات سے بھرے پڑے ہیں، مثلاً:۔

"تم کاہے کو مجھ سے محبت کرو گے، تم سب مجھ سے پھر گئے ہو۔" (یرمیاہ۔ ۲: ۲۸ و ۲۹۔ نیز ہوسیع ۱: ۲۷)

مفصل حاشیے پارۂ اول رکوع ۶، ۷ کے ذیل میں گزر چکے۔

اَلَمْ تَرَ۔ خطاب یہاں رسول اللہ صلعم سے ہے۔

(الم تر یا محمد۔ (ابن جریر)

اَلَّذِيْنَ . . . مِنَ الْكِتٰبِ۔ ذکر وہی یہود کا چل رہا ہے۔

اَلْكِتٰبِ۔ یہاں بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے یعنی کتاب الٰہی اپنے عمومی و کلی مفہوم میں کہ اسی کا ایک جزو توریت ہے۔

كِتٰبِ اللّٰهِ۔ اسی عمومی و کلی کتاب کا دوسرا جزو قرآن ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ۔ یعنی مذہبی اختلافات کے باب میں فیصلہ کرے۔

۵۵۹ ذٰلِكَ یعنی یہ سرکشی اور تمرد ان کی عادت اس سبب سے قائم ہے کہ یہ لوگ اپنے کافر ہونے ہی کے قائل نہیں۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ۔ یعنی وہ چالیس روز کی مدت جو بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی میں بسر کی تھی۔ آیت کا یہ جزو پارۂ اول میں بھی یہود کی زبان سے نقل ہو چکا ہے، اور وہیں اس پر مفصل حاشیہ بھی گزر چکا ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ

سو اس روز جس میں ذرا شک نہیں جب ہم انھیں اکٹھا کریں گے تو کیا حال ہوگا ۶۱ اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي

کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر (ذرا) ظلم نہ کیا جائے گا ۶۲ آپ کہہ دیجئے اے سارے ملکوں کے مالک!

الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ۥ

تو جسے چاہے حکومت دے دے اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے ۶۳

یہود کا یہ ایک مستقل عقیدہ بن گیا تھا کہ ہم عذاب آخرت سے اصلاً بالکل محفوظ ہیں، بجز اس قلیل مدت کے جو ہمارے اسلاف نے گوسالہ پرستی کے شرک میں گزاری تھی۔

۶۰ (چنانچہ اپنی نجات کا یقین کئے ہوئے بیٹھے ہیں)

مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ۔ عقائد کے باب میں کوئی بات بے دلیل عقلی یا نقلی کے اپنی طرف سے گڑھ لینا افترا علی اللہ کی ایک صورت ہے۔ یہود کے پیشواؤں اور سرداروں نے اس طرح قسم قسم کے عقائد کا ایک طومار گڑھ رکھا تھا، اور ان ہی میں ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہود پر آتش دوزخ (بجز برائے نام مدت کے) حرام ہے۔ ان کے لئے ان کے بزرگوں کی نسبت و شفاعت کافی ہے اور ان کی نجات و مغفرت بلا ایمان صحیح و عمل صحیح خود بخود محض نسلاً اسرائیلی ہونے کی بنا پر ہو جائے گی۔

۶۱ (ان بدبختوں اور شامت زدوں کا)

لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ۔ یعنی قیامت کے دن۔ اس طرز تسمیہ سے مقصود قیامت کا محض ذکر ہی کر دینا نہیں بلکہ اس کے وقوع کی قطعیت کو ذہن میں تازہ کر دینا ہے۔

فَكَيْفَ۔ اس طرز استفہام سے مقصود عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے۔

وهو استعظام لما اعد لهم وتهويل لهم وانه لا استعظام لما يحيق بهم في الآخرة (بیضاوی)

برہان زرکشی میں ہے کہ "کیف" موقع توبیخ کے لئے بھی ہے۔

لِيَوْمٍ میں ل فی کے معنی میں ہے۔

واللام في قوله ليوم بمعنى في قاله الكسائي (قرطبی)

۶۲ (کسی کو سزا بلا جرم یا زائد از جرم مل جائے یا کسی کی کوئی نیکی بغیر اجر کے چھوٹ جائے)

مَّا كَسَبَتْ۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے خواہ وہ حسنات ہوں یا سیئات۔

۶۳ رسول کے واسطہ سے طریق دعا کی تعلیم امت کو دی جا رہی ہے۔

مٰلِكَ۔ مالک کا لفظ دعا کے شروع ہی میں لا کر یاد دلا دیا کہ مالکانہ تصرف کا حق و اختیار اسی کو حاصل ہے جس سے دعا کی جا رہی ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ

اور تو جسے چاہے عزت دے ۶۴ اور تو جسے چاہے ذلت دے ۶۵ تیرے ہی ہاتھ ہے بھلائی ۶۶ بے شک تو ہی

شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ

ہر چیز پر قادر ہے ۶۷ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات میں دن کو داخل کرتا ہے۔

الملک. ملک سے مراد سارا جہان ہے۔

مثل الدنیا والآخرۃ (قرطبی۔ روح)

تؤتی ... وتنزع. حکومت کی نعمت دینا یا اس نعمت کو واپس لے لینا تمام تر احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے اور نفس بادشاہت یا حکومت میں تقدس یا الوہیت ذرا سی بھی نہیں، اس میں رد آگیا کثرت سے پھیلے ہوئے اس جاہلی عقیدہ کا، کہ بادشاہی خود ایک درجۂ الوہیت یا نیم الوہیت کا ہے اور کسی کا بادشاہ ہو جانا گویا خدا کے اوتار کے مرتبہ پر پہنچ جانا ہے، مصر میں فرعون کی پرستش ہوتی رہی، ہندوستان میں چندربنسی اور سورج بنسی راجہ مہاراجہ خدائی اوتار سمجھے گئے، جاپان میں میکاڈو ابھی کل تک مظہر خدا کی حیثیت رکھتا رہا، یہ سب اسی عقیدۂ شاہ پرستی کے مظاہر ہیں، اسلام نے آکر بتلایا کہ بادشاہی بھی ساری دوسری نعمتوں کی طرح ایک خدائی عطیہ ہے، اور بادشاہ بھی بندگی کی بے بسی و بے چارگی میں بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے دوسرے سارے بندے، یہ حقیقت ہمیشہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے، ہمارے زمانہ میں اس کا نظارہ پوری قوت و شدت کے ساتھ مسولینی (آمر اٹلی) و ہٹلر (آمر جرمنی) کے انجام سے کرا دیا گیا، دوسرے چھوٹے چھوٹے آمروں (ڈکٹیٹروں) کا ذکر ان کے علاوہ

۶۴ (اپنی حکمت کاملہ کے مطابق)

اس من تشاء (جسے تو چاہے) کی وسعت اطلاق میں قومیں بھی آگئیں اور فرد بھی اور عزت کا سب سے بڑا ممکن مرتبہ یاد کر لیا جائے کہ نبوت ہے، اس طرح گویا اہل کتاب کو یہ بھی یاد دلا دیا کہ جس قوم کے جس فرد کو وہ چاہے مرتبۂ نبوت سے سرفراز کر دے، اس پر حسد بالکل بے معنی ہے۔

۶۵ (اس کے پاداش عمل میں)

من تشاء کا عموم اطلاق یہاں بھی فرد و قوم دونوں پر حاوی ہے، کوئی فرد تو مرتبۂ نبوت سے معزول ہوا نہیں ہے، البتہ یہ نعمت قوموں سے سلب ہو سکتی ہے، چنانچہ قوم اسرائیل صدیوں تک اس نعمت سے سرفراز رہنے کے بعد معزول کی گئی اور یہ نعمت اپنی انتہائی اور آخری شکل میں اسمٰعیلی نسل اور قوم کے ایک ممتاز فرد کے حصہ میں آئی۔

۶۶ (تو اہل کتاب اس پر حیرت کیوں کر رہے ہیں کہ نعمت نبوت سے عرب قوم کے ایک فرد کو سرفراز کیا جا رہا ہے)

الخیر. یعنی بھلائی ہر قسم کی اور ہر مرتبہ و درجہ کی۔

کائنات میں وجود ایجابی صرف خیر کا ہے اس لئے ذکر اسی کا کیا گیا اس کے مقابل کی چیز یعنی شر محض ایک سلبی حقیقت کا نام ہے، یہاں جو بجائے بیدک الخیر والشر کے صرف بیدک الخیر کا ارشاد واقع ہے، اس سے عارفین صوفیہ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جس چیز میں بندہ کے ارادہ و اختیار کو دخل نہ ہو وہ محض خیر ہی ہے، اسے ناگوار نہ جانے اور اسے اپنے حق میں عذاب و مصیبت نہ سمجھے

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ، وَتَرْزُقُ

اور تو بے جان سے جاندار کو نکالتا ہے اور تو جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے

مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ

بے حساب رزق دیتا ہے ۶۷ مومنوں کو نہ چاہیے کہ مومنوں کے ہوتے ہوئے کافروں

اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ

کو (اپنا) دوست بنائیں ۶۸ اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں کسی شمار میں

فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ،

نہیں ۶۹ مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم ان سے کچھ اندیشہ ضرر کا رکھتے ہو ۷۰

۶۷ (غرض یہ کہ تقلبات و تصرفات کائنات کا ہر ہر جزئیہ تیری ہی مشیت و قدرت کے تابع و محکوم ہے)

تُوْلِجُ الَّيْلَ۔ تُوْلِجُ النَّهَارَ یہ سارے تصرفات و تقلبات بغیر کسی کی شرکت و اعانت کے محض ارادۂ الٰہی سے رات دن ہوتے رہتے ہیں جاہلی قوموں نے لیل (رات) اور نہار (دن) دونوں کو دیوی دیوتاؤں کی حیثیت دے رکھی ہے آیت میں ضمناً ان خرافات کا بھی رد آگیا۔

تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ۔ اس کی ایک نمایاں مثال پرند کو انڈے سے نکالنا ہے۔

تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ اس کی ایک نمایاں مثال پرندے انڈے کی پیدائش ہے۔

تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ سو ایسا قادر مطلق اگر ــــــ ضعیفوں، عاجزوں کو بڑی بڑی سلطنتوں کا بھی مالک بنادے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

اور تقسیم رزق، عطائے دولت وغیرہ تکوینی انعامات کے سلسلہ میں من تشآء کی قید جو ہر جگہ لگی ہوئی ہے اس سے محققین نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ دولت، حکومت امارت وغیرہ کی تقسیم محض مشیت تکوینی کے مصالح کائناتی کے اعتبار سے ہوتی رہتی ہے اسے قرب الٰہی، اخلاقی افضلیت وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۸ (کیا ظاہر میں اور کیا باطن میں)

جسے دوستی کا علاقہ کہتے ہیں، وہ ایک کیفیت قلب و رفیقی و یگانگت کا نام ہے مسلمانوں کو کافروں منکروں اللہ کے باغیوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کی قطعی ممانعت ہے اور عقلاً بھی یہ ملی خودداری اور قومی تشخص کے بالکل منافی ہے۔

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یعنی مومنین کے ہوتے ہوئے۔

بعض اہل حق نے یہیں سے تمسک کر کے اپنے مریدوں معتقدوں شاگردوں کو منکروں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کر دیا ہے۔

۶۹ یعنی دشمنان خدا کے ساتھ دوستی رکھنے والے کی دوستی اللہ کے ساتھ کسی درجہ میں بھی معتبر و مقبول نہیں لَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ۔ من اللّٰه سے مراد من دین اللّٰه یا من ولایۃ اللّٰه سمجھی گئی ہے۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۲۸

اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے ۷۰ اور اللہ ہی کی طرف آنا ہے ۷۱

اے من ولایتہ فی شیء (بیضاوی) اے من ولایتہ او من دینہ. (روح)

۶۹ (رفع ضرر کے لئے بہ قدر ضرورت ظاہری تعلقات دوستانہ کی اجازت ہے)

کافروں کے ساتھ حسن سلوک کی تین ہی ممکن صورتیں ہیں :-

(۱) موالات یا دوستی (۲) مدارات یا ظاہری خوش خلقی و خاطرداری (۳) مواسات یا احسان و نفع رسانی.
علمائے شریعت کی تحقیق ہے کہ شق اول یعنی موالات یا حقیقی دوستی تو کسی حال میں جائز نہیں شق سوم بھی اختلافی نہیں، مواسات صرف اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے باقی کے ساتھ جائز، رہی شق دوم اسو وہ تفصیل طلب ہے مدارات تین حالتوں میں درست ہے ایک اپنے رفع ضرر کے لئے، دوسرے خود اس کافر کی مصلحت دینی ہو یعنی توقع ہدایت کے موقع پر تیسرے اکرام ضیف کے طور پر یعنی کافر جب مہمان ہو اس وقت کے لئے ان تین صورتوں کے سوا اپنے نفع یا حصول مال وجاہ کے لئے مدارات درست نہیں اور جب اس سے ضرر دین کا اندیشہ ہو تو یہ اختلاط بدرجۂ اولی ناجائز ہوگا.

تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً. یہ لحاظ ہے کہ آیت میں ذکر اندیشہ کا ہے محض توہم یا احتمال بعید اس کے لئے کافی نہیں. اور جس ضرر کا خوف و اندیشہ ہو، اُسے بھی معتد بہ ہونا چاہیئے.

الا ان تخافوا من جہتہم امرا یجب اتقاؤہ الکاف. بیضاوی)

یہ بہ ظاہر عام ہے لیکن اہل سنت نے اذیت عظیم کی قید صاف لگا دی ہے.

التقیۃ لا تحل الا مع خوف القتل او القطع او الایذاء العظیم (قرطبی) یعنی ان تخافوا تلف النفس او بعض الاعضاء. وہذا ہو ظاہر ما یقتضیہ اللفظ وعلیہ الجمہور. (جصاص)

آیت میں ایک طرف رد ہے فرقۂ امامیہ کا جس نے تقیہ کے حدود بہت وسیع کر کے اُسے اپنے مذہب کا ایک جزو بنا لیا ہے اور دوسری طرف فرقۂ خوارج کا جس نے جواز تقیہ سے سرے سے انکار کر دیا ہے.

وقد استدل بعضہم بالآیۃ علی جواز التقیۃ وہی ما یقال او یفعل مخالفا للحق لاجل توقی الضرر.. ... وقیل انہا خاصۃ بحال الضعف وقیل بل عامۃ وینقل عن الخوارج انہم منعوا التقیۃ فی الدین مطلقا وان اکرہ المؤمن وخاف القتل. (المنار)

عدل و اعتدال کا مسلک افراط و تفریط دونوں سے یکساں الگ اہل سنت کا ہے صاحب روح المعانی نے اس ذیل میں ماشاء اللہ بہت خوب لکھا ہے.

۷۰ (کہ حقیقۃً صاحب اقتدار و قابل عظمت صرف وہی ہے)

نفسہٗ. مراد یہ لی گئی ہے کہ اللہ اپنے عذاب سے تم کو ڈراتا ہے.

المعنی یحذرکم اللہ عقابہ (قرطبی) اے عقاب نفسہ. (روح)

۷۱ (سو اس کے احکام کی ظاہری یا باطنی ہر مخالفت سے باز رہو)

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي

آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے خواہ پوشیدہ رکھو یا ظاہر کرو اللہ اس کو جانتا ہے اور

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس سب کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے جس روز

تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ

ہر شخص اپنے ہر نیک عمل کو سامنے موجود پائے گا اور (اسی طرح) ہر برے کام کو بھی (اس روز)

سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ

وہ تمنا کرے گا کہ کاش اس شخص اور اس دن کے درمیان مسافت بعید حائل ہوتی اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے

خطاب عام تمام ناس سے ہے رسول اللہ صلعم کے واسطے سے۔

ہر معصیت سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ یہی مسئولیت آخرت کا استحضار ہے

۷۳ یعنی اس کا علم ہر شے کو کامل، جزئیات و کلیات سب پر حاوی، حاضر و غائب سب پر یکساں ہے۔ ظاہر ہو یا مخفی دونوں یکساں ہیں۔ اس میں رد آگیا یونان اور دوسری قوموں کے ان جاہلی فلسفیوں کا جو صرف خدا کی صفت علم کو ناقص مانتے رہے ہیں

۷۴ سمٰوات والارض کی تصریح صرف محاورۂ زبان کے مطابق ہے جو تمام زمین و آسمان کے وجود کے لئے آتی ہے مراد صفت علم کی کاملیت و جامعیت کا اثبات ہے۔ یہ مراد ہرگز نہیں کہ کائنات صرف انہی تک محدود ہے اور بہت سی دوسری کائنات اللہ تعالیٰ کی نہیں

۷۵ (اور جب علم کے ساتھ اس کی قدرت بھی کامل ہے تو وہی اس کا مستحق ہے کہ اسی کی سزا سے ڈرا جائے)

مشرک قوموں کو اصلی ٹھوکر صفت علم کے ساتھ صفت قدرت ہی میں لگی ہے اسی لئے بار بار قدرت کی صفت پر زور دیا گیا ہے

۷۶ (جزاء اعمال کے لئے)

یوم۔ یعنی قیامت کے دن۔

ماعملت۔ محضرا یعنی دنیا میں جو کچھ بھی عمل کیا ہے اس کو سامنے موجود پائے گا یعنی اس کی جزا سے دوچار ہوگا۔

لدیہا منبہا فی الصحف۔ وقیل تجد جزاء عملہا محضرا (روح) تقدیرہ یوم تجد کل نفس جزاء

ماعملت محضرا (قرطبی) صحائف اعمالہ وجزاء عملہ (بیضاوی)

بعض صوفیہ عارفین نے یہ معنی کئے ہیں کہ انسان بجنسہ اس عمل کو کرتے ہوئے اپنے کو پائے گا۔

قیل ظاہرا فی صور (روح)

اکبر الٰہ آبادی اردو کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ہی حکیم و عارف بھی تھے فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہر وقت کہا کرتے ہیں کہ وقت چلا گیا، وقت جاتا کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں چلا جاتا ہے اور وہیں جمع رہتا ہے قیامت کے دن حق تعالیٰ

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے۷۹ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو۸۰ تو تم میری پیروی

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

کرو۸۱ اللہ تم کو چاہنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۸۲

اسی "وقت" کو واپسی کا حکم دے دیا گیا ہے، پس جب "وقت" واپس آئے گا تو مع اپنے مشمولات کے یعنی جو کچھ بھی وقت کے اندر ہوتا رہتا ہے اس سب کو لئے ہوئے آئے گا، اس لئے کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا ہے سب اس روز بجنسہ دوبارہ واقع ہو رہے گا۔

۷۷ (کہ اعمالِ بد یا ان کی جزاء کا معاینہ نہ کرنا پڑتا)

حسرت آن لوگوں میں پیدا ہوگی جن کے پاس اعمال خیر و شر کا مجموعہ ہوگا، تو جس بدنصیب کے پاس شر ہی شر ہوگا، اس کی حسرت نصیبی کا کیا کہنا!

بَيْنَهَا میں ضمیر نفس کی طرف اور بینہ یوم کی طرف ہے۔

والضمير في بينه لليوم حين تجد كل نفس خيرها وشرها حاضرين. (کشاف)

۷۸ (کہ قابلِ عظمت وصاحب اقتدار ذات صرف اسی کی ہے۔)

نَفْسَهٗ۔ سے مراد عقاب نفسہ سمجھی گئی ہے اور آیت کا یہ ٹکڑا ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

۷۹ (چنانچہ یہ بار بار کی تنبیہ و تہدید بھی اسی شفقت ورافت ہی کا نتیجہ ہے کہ کاش بندے اب بھی سنبھلیں اور راہِ ہلاکت پر چلنے سے باز رہیں)

شریف طبیعتوں کو نافرمانی سے باز رکھنے کے لئے صرف اس حقیقت کا استحضار کافی ہے کہ ان کا مالک و خالق کس درجہ رحیم و شفیق ہے!

۸۰ (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے اور اپنے اسی زعم کی بنا پر توقع رکھتے ہو کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا)

خطاب رسولؐ کے واسطے سے عامۃ الناس سے ہے۔

تُحِبُّوْنَ۔ محبت کے معنی عربی میں ہیں اس میں ارادہ کا شمول ضروری ہے۔

قال ابن عرفة المحبة عند العرب ارادة الشئ على قصد له. (قرطبی)

۸۱ (کہ میں جامع کمالات انسانی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری زندگی ساری کائناتِ انسانی کے لئے ہر شعبہ میں معیار اور نمونہ کا کام دے گی۔)

محبت الٰہی کے دعوے کی جانچ کے لئے کیا اچھا معیار بتا دیا گیا، یعنی جتنا اتباعِ رسولؐ ہوگا اسی قدر اس کی محبتِ الٰہی مسلم و معتبر ہوگی، اسی معیار پر آج بڑے بڑے مدعیانِ مشیخت و مدعیانِ محبتِ الٰہی کے دعووں کو جانچئے تو بہتوں کی قلعی کھل کر رہے۔

۸۲ (کہ اس کے آگے اور کوئی درجۂ کمال نہیں)

یہ طریقہ جو پچھلوں کو بتایا گیا یہی آواز اگلوں کے کان میں ڈال دی گئی ہے حضرت مسیحؑ کے جو الفاظ اناجیل

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو ۵۵۴ اس پر بھی اگر وہ روگرداں رہیں تو اللہ کافروں سے (ذرا) محبت نہیں رکھتا ۵۵۵

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۳﴾

بے شک اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمرانؑ کو سارے دنیا جہان پر برگزیدہ کیا ہے ۵۵۶

مروّجہ میں نقل ہوئے ہیں، حسب ذیل ہیں:۔ "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"۔ (یوحنا ۱۴: ۱۵و۱۶)

یہ "مددگار" کا لفظ اردو انجیلوں کے متن میں ہے حاشیہ پر "وکیل" اور "شفیع" دونوں لفظ درج ہیں گویا اصل یونانی لفظ کے یہ سب معنی ہو سکتے ہیں، انگریزی انجیل میں لفظ "کفارہ" COMFORTER آیا ہے جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں تو چوتھا مفہوم اس لفظ کا یہ ہوا۔ بہرحال وہ سب "مددگار" اور "وکیل" اور "شفیع" اور "تسلی دہندہ" اس پیشگوئی کرنے والے مسیحؑ کے پانچ صدی بعد آیا، اور ایک ابدی اور غیر منسوخ شریعت لے کر ابد تک ساتھ رہنے ہی کے لئے آیا، اور اسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے خاتم النبیینؐ کہلایا۔

یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ۔ اللہ کی بڑی محبت بندہ کے ساتھ یہی ہے کہ اسے مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

محبۃ اللہ للعباد انعامہ علیہ بالغفران۔ (قرطبی)

۵۵۳ غَفُوۡرٌ۔ اس کی شانِ غفر کا تقاضا ہے کہ تمہارے معاصی و ذنوب کی مغفرت کرے گا۔

رَحِیۡمٌ۔ اس کی شانِ رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ۔ وہ تمہاری تقصیروں کو نظر انداز کر دے گا اور تمہارے مراتبِ قرب میں ذرا کمی نہیں آنے دے گا۔

۵۵۴ خطاب پیمبرؐ کے واسطے سے عامۂ ناس سے ہے۔

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ۔ اللہ کی اطاعت اصالۃً اور بہ طورِ مقصود کے ہے۔

وَالرَّسُوۡلَ۔ رسول کی اطاعت تبعاً و نیابتہً ہے بطورِ آلہ و واسطہ کے یعنی اس حیثیت سے کہ پیمبر اللہ ہی کا پیام لے کر آتا ہے۔

۵۵۵ (اور یہ لوگ کافر ہی تو ہیں جو اطاعتِ رسول سے منہ موڑے ہوئے ہیں، خواہ محبتِ الٰہی کے کیسے ہی دعوے ان کی زبانوں پر ہوں)

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا یعنی ایسے صاف و صریح حکم کے ماننے سے انکار کریں۔

۵۵۶ (چنانچہ وہ خود اور اُن کے گھرانے والے توحید کے علمبردار رہے ہیں)

اِصۡطَفٰی۔ یہ برگزیدگی توحید کے علمبرداری کی حیثیت سے رہی ہے۔

اٰدَمَ۔ حاشیے پارۂ ۱ رکوع ۴ کے ذیل میں گزر چکے۔

نُوۡحٌ۔ حضرت نوحؑ بن لامخ (یا لمک) عراق میں ایک نہایت قدیم پیمبر گزرے ہیں حسبِ روایت توریت حضرت آدمؑ سے دسویں پشت میں تھے، عمر ۹۵۰ سال پائی، زمانہ غالباً ۲۹۴۸ تا ۱۹۹۸ ق،م۔

اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ۔ آلِ ابراہیمؑ ہی کے تحت میں اسمٰعیلؑ اور خاندانِ اسمٰعیلؑ بھی آگئے، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ دونوں پر حاشیے پارۂ ۱ رکوع ۱۵ میں گزر چکے ہیں۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ

ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ (خوب) سننے والا ہے (خوب) جاننے والا ہے ۵۵۶ (اور وہ وقت) ذکر و جب عمران کی

عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۚ

بیوی نے عرض کیا ۵۵۸ اے میرے پروردگار میں نے تیری نذر مانی ہے اس (بچہ) کی جو میرے پیٹ میں ہے کہ (وہ) آزاد رکھا جائے گا ۵۵۹ سو تو اسے مجھ سے قبول کر

آلِ عِمْرَانَ۔ عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گزری ہیں ایک حضرت موسیٰؑ کے والد ماجد عمران بن یصہر دوسرے ان کے کئی صدی بعد حضرت مریمؑ کے والد ماجد اور حضرت مسیحؑ کے جد مادری عمران بن ماثان، یہاں مراد دونوں سے ہوسکتی ہے لیکن بلحاظ سیاق ترجیح عمران ثانی کو ہے۔ حسنؒ اور وہبؒ تابعین سے یہی قول منقول ہے۔

والمراد بعمران ھھنا ھو والد مریم بنت عمران (ابن کثیر) والمراد بال عمران عیسیٰ علیہ السلام وامہ مریم بنت عمران قالہ الحسن و وھب (روح)۔ وقد اختلفوا فیہ فمنھم من قال المراد عمران والد موسیٰ وھارون ومنھم من قال بل المراد عمران بن ماثان (کبیر) والظاہر فی عمران انہ ابو مریم (بحر)

لیکن مفسرین کا ایک گروہ ادھر بھی گیا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد عمران کا تو ذکر ابھی آگے آئے گا، اور اس خاص آیت میں ذکر حضرت موسیٰؑ کے والد عمران کا ہے۔

ورد ذکر عمران فی ھذہ الآیات مرتین فیعضھم یقول انھما واحد وھو ابو مریم بنت (عی) ... وھما فی سیاق واحد واکثرھم یقول ان الاول ابو موسیٰ والثانی ابو مریم وبینھما نحو الف وثمان مائۃ سنۃ (المنار)

۵۵۶ (سو اس کے علم وخبر کے احاطہ سے کون چیز باہر رہ سکتی ہے؟)

سَمِيعٌ۔ سننے والا تمام زبان سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات کا۔

عَلِيمٌ۔ جاننے والا تمام دل کے اندر کے جذبات و خیالات کا۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ حضرت آدمؑ کی اولاد میں حضرت نوحؑ ہیں اور حضرت ابراہیمؑ ان دونوں کی اولاد میں، اور حضرت عمران ان تینوں کی اولاد میں۔

۵۵۷ (ربط۔ مناجات)

امْرَأَتُ عِمْرَانَ۔ یہ حضرت مریمؑ کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی جدۂ مادری تھیں۔ مسیحی نوشتوں میں ان کا نام حنّہ (Hannah) آیا ہے ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ کے مسیحی کلیسا، کلیسائے حنّہ کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی قبر دمشق میں ہے۔

ودیرحنّۃ بالشام معروف وثم دیر آخر یعرف بہ بحنّہ (بحر) وقیل ھذہ علی ظاھر دمشق (بحر)

۵۵۹ (دنیا کے دنیوی کاروبار سے اور تیری ہی خدمت و عبادت کے لئے وقف رہے گا۔)

حضرت مریمؑ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ نے جو نذر یا نیاز مانی تھی اس کی بابت بہت سی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں درج تھیں لیکن بزرگان کلیسا نے جب کانٹ چھانٹ کر کے "مستند" اناجیل یا مجموعہ مرتب کرنا شروع کیں تو ان مضامین اور بیانات کو ان سے خارج کر دیا، اور اس کی شہادت آج انھیں کے اکابر دے رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو کیتھولک ڈکشنری ۵۶۵ نیز ہسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل جلد ۲

إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي

تو تو خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے ۹۰ پھر جب اس نے (مریمؑ) کو جنا تو بولی کہ اے میرے پروردگار میں نے

وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ

تو لڑکی جنی ۹۱ اور اللہ تو خوب جانتا تھا کہ اس نے کیا جنا ہے اور لڑکا (اس) لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا تھا ۹۲

وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾

اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اُسے اور اُس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ۹۳

نَذَرْتُ۔ سادہ اردو میں "میں نے منت مانی ہے"۔

لَكَ۔ میں لام تعلیل ہے یعنی خصوص تیری خدمت وعبادت کے لئے۔

اے لعبادتك (قرطبی) لخدمة بيتك (روح)

مُحَرَّرًا۔ اے خبیثا خالصا للہ تعالی خادما للکنیسۃ حبسا علیہا۔ (قرطبی)

ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت اور مجاوری کے لئے اولادِ ذکور کو نذر کر دینے کا دستور یہود کے ہاں جاری تھا

۹۰ (سننے والا میری دعاؤں کا، جاننے والا میرے اخلاص کا)

اللہ اللہ! اللہ والوں کی طرح اللہ والیاں بھی اپنی دعاؤں میں کس درجہ باادب ہوتی ہیں!

۹۱ (اور لڑکی کس طرح تیرے معبد میں مجاور بن سکے گی؟)

حضرت مریمؑ کی والدہ ماجدہ بصد حسرت و یاس بارگاہِ الٰہی میں مناجات کر رہی تھیں کہ تمنا تو لڑکے کی اٹھی تھی کہ اُسے ہیکل کی نذر کر دیا جاتا، اور وہ اس کی جاروب کشی اور مجاوری میں عمر بسر کر دیتا، اولاد تو ہوئی مگر لڑکی نکلی لڑکی سے کیسے یہ نذر پوری ہو سکتی ہے؟ — اسرائیلی قانون و معاشرہ میں لڑکی کے لئے اس خدمت کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ والدۂ حضرت مریمؑ کا یہ قول بطور اخبار نہ تھا، بطور انشاء تھا۔ اس میں کسی واقعہ کی خبر دہی نہ تھی اظہار رنج و ملال تھا۔

خبر لا یقصد بہ الاخبار بل التحیر والتحزن والاعتذار فہو بمعنی الانشاء (امداد)

۹۲ یہ پورا فقرہ والدۂ مریمؑ کی تقریر کا حصہ نہیں، بطور ایک مستقل جملۂ معترضہ کے براہِ راست ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس لڑکی کی عظمت و منزلت سے تو خدائے تعالیٰ ہی خوب واقف تھا، ماں غریب کیا سمجھ سکتی تھی۔

قال مکی ہو اعلام من اللہ تعالی لنا علی طریق التثبیت۔ (قرطبی)

الذَّكَرُ۔ یعنی جو لڑکا والدۂ مریمؑ کے حسبِ خواہش ہوتا۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ۔ یعنی اس مولود سے جو جو عظمتیں وابستہ تھیں اُن کی خبر ماں غریب کو کیا ہو سکتی تھی، ان سے تو بس اللہ ہی خوب واقف تھا۔

اے اللہ اعلم بالشیء الذی وضعتہ وما علق بہ من عظائم الامور ودقائق الاسرار وواضح الآیات وھی

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

پھر ان کے پروردگار نے اس کو بوجہ احسن قبول کرلیا ۹۴ اور اس کو اچھی نشو و نما دیا ۹۵ اور اس کا سرپرست زکریا کو بنا دیا ۹۶

عمله عن ذلك كله۔ (روح)

۹۳ (کہ خدمت دین سے کسی منزل میں بھی منحرف نہ ہونے پائیں)

والدۂ مریمؑ کی توحید پرستی مناجات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اللہ والوں اور اللہ والیوں کو اپنی اولاد کے لئے فکر ان کے دینی و اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے۔

وَذُرِّيَّتَهَا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ والدۂ مریمؑ اللہ سے امید لگائے ہوئے تھیں کہ لڑکی کا سلسلۂ نسل چلے گا

مریم۔ سُریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بلند کے ہیں۔

علم امرأة سريانية معناه مرتفعة (قرطبی)

اسرائیلیوں میں عورتوں کا ایک چلا ہوا نام تھا۔

۹۴ یعنی والدۂ مریمؑ کی نذر کو اس لڑکی کی شکل میں بھی اللہ نے قبول کرلیا، اور یہ خدمت ہیکل کی ساری تاریخ میں ایک نئی بات تھی۔ مسیحی نوشتوں کے بموجب حضرت مریمؑ تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کرلی گئی تھیں اور معبد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر خوب خوش ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو ہیسٹنگز (HASTINGS) کی ڈکشنری آف دی بائبل جلد ۳ ص ۲۸۸ ۔ بج (BUDGE) کی حکایات خاتون مریمؑ (LEGENDS OF LADY MARY)

۹۵ یہ اچھا نشو و نما ممکن ہے کہ قوائے جسمانی کے اعتبار سے ہو اور ممکن ہے قوائے روحانی و اخلاقی کے اعتبار سے ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں حیثیت سے ہو۔

يعني سوى خلقها من غير زيادة ولا نقصان (قرطبی) لم ربّاها الرب تربية حسنة في عبادة وطاعة لربها قاله ابن عباس (روح) مجاز عن تربيتها بما يصلحها في جميع احوالها بما دين في حسن النشأة والجودة في خلق وخلق و نشأها على الطاعة والعبادة (بحر)

عجب لطیفہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے شرف و عظمت کی یہ ساری تفصیلات انجیل میں نہیں، قرآن مجید میں مل رہی ہیں! انجیل اس قسم کے جزئیات سے خاموش ہے۔

۹۶ زکریا، اللہ کے پیغمبر تھے۔ مسیحی صحیفے ان کے تذکرہ سے گویا بیگانہ ہیں۔ چاروں مستند انجیلوں میں لے دے کر صرف ایک جگہ ان کا ذکر انجیل لوقا میں آتا ہے، وہ بھی پیغمبر کی حیثیت سے نہیں، صرف ایک بزرگ و راستباز کاہن کی حیثیت سے "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن کا تھا۔" (لوقا ۱: ۵)

یہ حضرت زکریاؑ رشتہ میں حضرت مریمؑ کی والدہ کے بہنوئی تھے۔ یعنی آپ کی والدہ کی بہن کے شوہر۔ حضرت مریمؑ کے والد ماجد جناب عمران کی وفات آپ کے بچپن ہی میں ہوگئی تھی اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں (یہود کی اصطلاح میں کاہنوں) کی سرداری حضرت زکریاؑ کے حصہ میں آئی تھی۔ آپ ایک تو مریمؑ کے عزیز قریب اور پھر خدام ہیکل کے سردار، حضرت مریمؑ کی تربیت کا واسطہ و ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو بنایا۔ آپ حضرت یحییٰ کے والد ماجد تھے جو حضرت عیسیٰ کے

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ

جب کبھی زکریا اُن کے پاس حجرہ میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے (پینے) کی پاتے ۹۷

کے ہم سن تھے اسی سے آپ کے زمانہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
کفّلھا۔ کے لفظ میں اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ یہ سب خدائی انتظامات تھے زکریاؑ کی حیثیت محض واسطہ یا ذریعہ کی تھی۔

۹۷ (اور اس پر وہ قدرۃً حیرت کرتے)

المحراب۔ محراب حجرہ کو کہتے ہیں یا جہاں کوئی سب سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھے، محراب مسجد کو بھی محراب اسی لئے کہتے ہیں کہ اس در میں امام نماز سب سے الگ اور تنہا کھڑا ہوتا ہے۔

المحراب الغرفة (قاموس) قال الازھری وسمی المحراب محرابًا لانفراد الامام فیہ وبُعدہ من الناس (لسان)

كُلَّمَا۔ ہیکل سلیمانی کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے اِدھر اُدھر زاویئے حجرے یا خلوت خانے بنے ہوئے تھے انہی میں سے ایک حجرہ حضرت مریمؑ کا تھا حضرت زکریاؑ ایک تو یوں بھی سردارِ خدام تھے اور اس حیثیت سے ہر خادم و خادمہ کی نگرانی رکھنا آپ کے فرائض میں داخل تھا، اور پھر حضرت مریمؑ کے تو آپ عزیز قریب بزرگ سرپرست بھی تھے ان کے حجرہ میں قدرۃً آپ کی آمد و رفت رہا کرتی، قرآن حکیم کے ایک ذرا سے لفظ کُلَّمَا نے اس سارے مفہوم یعنی حضرت زکریاؑ کی کثرتِ آمد و رفت اور غیر متوقع وجودِ رزق سب کی طرف اشارہ کر دیا۔

وکلما مقتضی التکرار فیدل علی کثرۃ تعھدہ وتفقدہ لاحوالھا ودلّت الاٰیة علی وجود الرزق عندھا کل وقت یدخل علیھا۔ (بحر)

رِزْقًا۔ کھانے پینے کا سامان مثلاً تر و تازہ میوے بعض قدیم "جدت پسندوں" نے یہاں رزق کے معنی فیض اور علم و حکمت کے لئے ہیں لیکن محققین نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود سے تجاوز کر جانا، اور باطنیہ کی زبان اختیار کرنا ہے

ابعد من فسر الرزق ھنا بانہ "فیض" (بحر) ھذا اشبیہ بتفسیر الباطنیة (بحر)

رِزْقًا کی تنوین تعظیم و تفخیم کے لئے ہے یعنی وہ رزق کوئی ندرت کا پہلو رکھتا تھا۔

التنکیر فی قولہ رزقًا یدل علی تعظیم حال ذٰلک الرزق کانہ قیل رزقًا ای رزق غریب عجیب (کبیر)

مریمؑ اپنی ساری عظمت و جلالت کے باوجود بہر حال پیمبر نہ تھیں اسی بنا پر محققین اہل سنت نے آیت کو اثباتِ کراماتِ اولیاء کے باب میں بمنزلہ نص قرار دیا ہے، اور علمائے فرقہ شیعہ بھی اس باب میں اُن سے متحد ہیں، اختلاف صرف معتزلہ کو ہے

واستدل بالاٰیة علی جواز الکرامة للاولیاء لان مریم لانبوۃ لھا وھذا ھو الذی ذھب الیہ اھل السنة والشیعة وخالفت فی ذٰلک المعتزلة (روح) وھو دلیل جواز الکرامة للاولیاء (بیضاوی) احتج اصحابنا علی صحة القول بکرامة الاولیاء بھذہ الاٰیة (کبیر)

لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس "رزق" میں کرامت اور خرقِ عادت کا کوئی پہلو نہ تھا۔

دلیل فی الاٰیة علی ان الرزق کان من خوارق العادات واسناد المومنین الامر الی اللہ فی مثل ھذا المقام معھود فی القدیم والحدیث (المنار)

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ

ایک بار) بولے اے مریمؑ یہ کہاں سے تجھے مل جاتی ہیں؟ ۹۸ وہ بولیں یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں ۹۹ بے شک اللہ

يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ

جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے ۱۰۰ (بس) وہیں زکریاؑ اپنے پروردگار سے دعا کرنے لگے ۱۰۱

اور عجائب و خوارق رزق کے باب میں کوئی بات نہ اللہ و رسول سے منقول ہے اور نہ تاریخ ہی سے ثابت ہے۔

و منه مرحل ذلك ولا قاله رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا هو مما يعرف. لو لم

يتبعه ما يصح يستند به (المنار)

۹۸ یعنی اماں تو میں ہی رہتا، میرے سوا اور کون اس سامان کا پہنچانے والا ہو سکتا ہے؟ سوال اظہار حیرت کے لئے ہے۔

سوف زكريا وجود الرزق عندها وهو لم يكن اتى به فسأل على سبيل التعجب من وصول الرزق اليها.

آیت سے اس مسئلہ کا بھی اثبات ہو گیا کہ پیمبر تک کے لئے بھی اسباب ظاہر تک محدود و مقصور رہنا بالکل جائز ہے۔

۹۹ (براہ راست اور بلا کسی واسطۂ ظاہری کے)

اہل اللہ کے ساتھ اس قسم کے خوارق کا ظہور کوئی انوکھی بات نہیں، ہوتے ہی رہتے ہیں اور بالفرض اس نوشتہ قاتہ

کو یہ سامان کسی ظاہری واسطہ ہی سے پہنچ رہے تھے جب بھی اس کی نظر تو اس واسطہ پر نہیں براہ راست اللہ تعالیٰ پر تھی۔

۱۰۰ (خواہ واسطوں سے ہو، خواہ بلا واسطہ اور بلا استحقاق)

اللہ جس طرح اپنی مشیت تکوینی کے ہر جزئیہ میں آزاد ہے، اسی طرح تقسیم رزق کے باب میں بھی ہے اس میں

رد آگیا اُن مشرک قوموں کا جنھوں نے خوشحالی اور بدحالی کو لازمی نتیجہ پہلے جنم کے اعمال کا قرار دیا ہے۔

۱۰۱ (قدرت الٰہی کے ان کرشموں سے متاثر ہو کر)

هُنَا کا دوسرا ترجمہ "وہیں" کے علاوہ "وہاں" بھی ہو سکتا ہے۔ هُنَا ظرفیت کے لئے ہے اور اس میں ظرف

مکان اور ظرف زمان دونوں شامل ہیں، یعنی اسی جگہ بھی اور اسی وقت بھی۔

اسم يشار به للمكان القريب وقد يشار به للزمان اتساعًا (جمل)

گو اصلی مفہوم ظرف مکان ہی کا ہے۔

يستعمل للزمان والمكان واصله للمكان (قرطبی) اسم اشارة للمكان القريب (اعرب) اى فى ذلك المكان

او فى ذلك الوقت فقد يستعمل هنا وثم وحيث للزمان (كشاف) هنا ظرف مكان وهو ان ترادبه الزمان مجازا

(روح) والاستعمال لحقيقة فيه انها المكان اى فى ذلك المكان الذى خاطبته فيه مريم (ابن)

هُنَالِكَ دَعَا۔ آیت سے استدلال مکان مبارک میں دعا کی مقبولیت پر کیا گیا ہے علیٰ ہذا، وقت مبارک میں بھی دعا

کی مقبولیت پر حضرت زکریاؑ کو جب یہ مشاہدہ ہو گیا کہ یہ مقام خرق عادت کے صدور کا ہے تو آپ بھی وہیں دعا کرنے لگے

فى قوله هنالك دعا دلالة على ان تتوقى العبد بين عائه الامكنة المباركة والازمنة المشرفة (بحر)

قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (٣٨)

عرض کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے کوئی پاکیزہ اولاد عطا کر ١٠٢ بے شک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے ١٠٣

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى

پس انہیں فرشتوں نے آواز دی اس حال میں کہ وہ حجرہ میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ آپ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے ١٠٤

١٠٢ (جو میرے سلسلۂ روحانی کو آگے چلا سکے)

هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ۔ مجھے بھی اپنی عنایت سے اسی طرح دے جیسے کہ والدۂ مریمؑ کو مریمؑ عنایت ہو چکی ہیں۔ حضرت زکریاؑ کا سن زیادہ ہو چکا تھا اور بیوی صاحبہ بھی عقیم سمجھی گئی تھیں۔ ایک خارقِ عادت واقعہ کو دیکھ کر آپ کا ذہن معاً اس طرف منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری یہاں پر تر و تازہ میوے پہنچا دے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ اس سن میں مجھے نعمتِ اولاد سے سرفراز کر دے۔

مِنْ لَّدُنْكَ ۔ یہ خبر صاف ظاہر کر رہی ہے کہ دعا کرنے والے کی نظر اس عالم اسباب میں بھی اسباب سے کہیں زیادہ مسبب الاسباب پر ہے۔

ذُرِّيَّةً ۔ اولاد کی خواہش ایک امر طبعی ہے اور زہد کیا معنی کمالِ زہد کے بھی منافی نہیں۔ قرآن مجید نے بار بار پیغمبروں کی زبان سے اس قسم کی دعائیں نقل کر کے بتا دیا کہ وہ مذاہب حقیقت سے کتنی دور ہیں جنھوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے۔ ہماری شریعتِ حقہ میں اولاد کی خواہش تو عین سنتِ انبیاء و صدیقین بتائی گئی ہے اور صحیح بخاری میں تو مستقل عنوانات طلبِ ولد کے فضائل میں ہیں۔

دلت هذه الآية على طلب الولد وهي سنة المرسلين والصديقين (قرطبی) وقد ترجم البخاري على هذا باب طلب الولد والاخبار في هذا المعنى كثيرة حاثة على طلب الولد ومندوب اليه (قرطبی)

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۔ طیبہ کے اضافہ نے اسے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر بہرحال رہتی ہے کوئی صرف نفس اولاد کی مطلق خواہش ہی کبھی نہ تھا لیکن حضرت زکریاؑ اپنی دعا میں محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولادِ صالح چاہتے ہیں، جو ان کے بعد تبلیغ توحید کے مشن کو جاری رکھے۔ اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی فضائل بہرصورت مقدم رہتے ہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایسے امور کے لئے دعا کرنا جو اسباب قریبہ سے ہٹ کر ہوں، آدابِ دعا کے منافی نہیں۔

انجیل میں ہے کہ "زکریا نام کا ایک کاہن تھا، اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا، اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی، اور دونوں عمر رسیدہ تھے"۔ (لوقا۔ ١: ٥۔٧)

١٠٣ (اور بڑا قبول کرنے والا ہے)

حق تعالیٰ کی اس صفت پر بار بار زور دینا مادی اور نیچری عقیدہ کے لوگوں کے رد میں ہے جو واقعات کو تمام تر اسباب ظاہری ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اور ارادۂ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔

١٠٤ دعا معاً قبول ہو گئی، اور آپ کو حالتِ نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔

الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ صیغۂ جمع اسم جنس کا بھی کام دیتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ آواز دینے والا فرشتہ ایک ہی ہو، عربی میں یہ محاورہ عام

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳۹)

جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا ہوں گے اور بڑے ضبطِ نفس کرنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے

ہے فلان یرکب الخیل (فلاں شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) حالانکہ وہاں مراد گھوڑے کی صرف جنس ہوتی ہے۔

وجائز فی العربیۃ ان یخبر عن لفظ الجمع (قرطبی) انما قیل الملائکۃ علی قولھم فلان یرکب الخیل (کشاف) قال الزجاج ای اتاہ النداء من ھذا الجنس الذین ھم الملائکۃ (ابو سعود) قالوا ان العرب تخبر الواحد بلفظ الجمع ترید بہ الجنس (المنار) ذلک جائز فی کلام العرب بان تخبر عن الواحد بمذھب الجمع (ابن جریر)

یَحْیٰی۔ عہدِ جدید کے صحیفوں میں ان کے نام کا املا یُوحنّا آتا ہے۔ انجیل میں اس موقع پر ہے:۔
”فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سُنی گئی اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی“۔ (لوقا۔ ۱: ۱۴)
حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی اور آپ سے سن میں حسب روایت انجیل صرف چھ مہینے بڑے تھے، ۳۰ء میں والیٔ شام ہیرود کے حکم سے شہید کردیئے گئے۔

۱۰۵ كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ جبرئیل روح القدس لقب حضرت جبرئیلؑ کا ہے کلمۃ اللہ سے مراد حضرت مسیحؑ ہیں۔

یعنی عیسیٰ فی قول اکثر المفسرین (قرطبی) وھو اختیار الجمھور (کبیر) قالہ ابن عباس ومجاھد والحسن وقتادۃ والسدی وغیرھم (بحر)

مُصَدِّقًا۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق کرنے والا۔
مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی اصل حیثیت مسیحؑ کے پیش رو اور نقیب ہی کی تھی۔
بعض اہل تفسیر نے مراد کتاب اللہ بھی لی ہے۔

قال ابو عبیدۃ معنی بکلمۃ من اللہ بکتاب من اللہ (قرطبی)

سَيِّدًا۔ یعنی دین کے باب میں مقتدا و پیشوا۔ مسیحی تو خیر آپ کے تقدس کے قائل ہی ہیں، یہود جو آپ کے منکر اور آپ کے سخت دشمن ہیں، وہ بھی آپ کی مرجعیت و مقبولیت سے انکار نہیں کرتے۔
حَصُوْرًا۔ یعنی لذات و شہوات پر اسے قابو حاصل ہوگا، اور وہ نہایت درجہ متقی و متورع ہوگا۔ انجیل میں آپ کے زہد و تبتل کا ذکر تصریح کے ساتھ ہے مثلاً: ”وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا، اور ہرگز نہ مے، کوئی اور شراب پیئے گا، اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔“ (لوقا۔ ۱: ۱۶) ”اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا، اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے“ (لوقا۔ ۱: ۱۷، ۱۸) ”اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا، اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن تک جنگلوں میں رہا“۔ (لوقا۔ ۱: ۸۰)
نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ حضرت یحییٰؑ کی نبوت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں ہے جو نعوذ باللہ آپ کو ایک معمولی انسان سمجھتے تھے، اور آپ کی صالحیت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں تو ہونا ہی تھا، خود مسیحیوں کے مقابلہ میں بھی ہے

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ

(زکریا) بولے اے میرے پروردگار! میرے بیٹا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہیں ٦٦ف

قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۞ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ

ارشاد ہوا اسی طرح اللہ کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے ٦٧ف (زکریا) بولے اے میرے پروردگار! میرے لئے کوئی

اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ

نشانی مقرر کردے ٦٨ف ارشاد ہوا کہ تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کرسکو گے تین دن تک بجز اشارہ کے ٦٩ف

جن کے نزدیک عصمت وتقویٰ لازمۂ نبوت نہیں، صالحیت تو نبوت سے پست اور ہلکی چیز ہے لیکن یہ صرف اسلامی عقیدہ ہے اہل کتاب کا یہ عقیدہ نہیں، ان کے ہاں نبی غیر صالح بھی ہوسکتا ہے۔

٦٦ف انجیل میں اس موقع پر ہے:۔ "زکریا نے فرشتہ سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بھی عمر رسیدہ ہے" (لوقا۔ ١: ١٨) "ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے"۔ (لوقا۔ ١: ٧)

اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ۔ یعنی اس بشارت کے تحقق کی متعین صورت آخر کیا ہوگی؟ آیا میری جوانی عود کر آئے گی یا اور کوئی خاص انقلاب ہوگا؟ وعدۂ الٰہی سے بے اعتباری کا یہاں کوئی سوال نہیں، حضرت تو محض متعین صورت جاننا چاہتے تھے! لیکن بالفرض عدم اطمینان مراد لی جائے جب بھی خلاف اسباب عادیہ کسی شے کی خبر وقوع پر حیرت بالکل طبعی ہے اور پیمبر بھی امور طبعی میں بالکل بشر ہی ہوتے ہیں، امر طبعی اور خارق عادت پر حیرت جس طرح ہر بشر کے لئے جائز ہے، پیمبر کے لئے بھی ہے۔

٦٧ف (کہ اس حقیقت کا مراقبہ ہر استبعاد کے رفع کردینے کے لئے کافی ہے)

استحضار قدرت الٰہی کے لئے پیمبر کو ایک اشارہ کافی ہوگیا۔

كَذٰلِكَ۔ عود شباب وغیرہ کچھ بھی نہ ہوگا بس اسی موجودہ حالت کے ساتھ ولادت فرزند ہوگی۔

٦٨ف (جس سے مجھے معلوم ہوجائے کہ حمل رہ گیا ہے اور زمانۂ ولادت قریب ہے اور میں ادائے شکر کا سامان کرسکوں)

اٰيَةً۔ ہر ایسی چیز ہے جس سے قدرت الٰہی، نصرت غیبی خاص طور پر ظاہر ہورہی ہو، ایسی چیز کو قدرۃً معمول عام سے کسی قدر جدا ہونا چاہئے اور اس نشان میں اعجازی رنگ ضرور ہونا چاہئے۔

٦٩ف (اور تسبیح و عبادت الٰہی اس حال میں بھی جاری رہے گی۔)

اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ۔ انجیل کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی معصیت حضرت زکریا سے سرزد ہوگئی تھی اور اس کی سزا میں ان کی قوت گویائی چند روز کے لئے سلب کرلی گئی تھی "اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا، اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا، جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا پس انہوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا، اور وہ گونگا ہی رہا" (لوقا۔ ١: ٢٠۔ ٢٢)

قرآن مجید جو تمام قدیم صحیفوں پر مہیمن یا نگران و نگہبان ہے اور ان کی تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

اور اپنے پروردگار کو بہ کثرت یاد کرتے رہو اور تسبیح کرتے رہو دن ڈھلے بھی اور صبح بھی [illegible]

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ

(اور وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بے شک اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا ہے [illegible]

جو بے ایمان بھی حسب معمول اپنا فرض ادا کیا اور حضرت زکریا سے یہ بہتان رفع کرکے صحیح صورت حال بیان کی کر ایک علامت غیبی و اعجازی کی تو انھوں نے خود ہی درخواست کی تھی اور اُن کی اس درخواست پر یہ علامت غیبی عطا ہوئی تھی کہ آپ تسبیح و ذکر الٰہی تو اپنی جگہ پر بدستور کرتے رہیں گے البتہ لوگوں سے بات چیت کی قوت آپ کو تین دن کے لئے حاصل نہ رہے گی.

نکتہ امام میں شاعر ہی تو فقرہ کی جان ہے کہ لوگوں سے بات چیت پر قدرت نہ رہے گی ورنہ ذکر الٰہی کے لئے تو زبان چلتی رہے گی.

ان حق نطم الناس مع انه مع سلامة عن القدرة على تكلمهم خاصة مع ابقاء قدرته على التكلم بذكر الله (کبیر).

تلٰثة ایام. تین دن و رتین راتیں، دن کہنے سے رات اس میں تبعاً شامل ہو گئی ہے سکوت تحویلی خصوصاً شوم سکوت کی حالت میں قدیم مذاہب و ادیان میں جزو عبادت رہ چکا ہے.

رمزا. رمز عام ہے اس میں سر کے اشارے بھی آگئے اور ہاتھوں کے بھی اور ان کے علاوہ بھی.

الاشارة بيد او راس او غيرهما. (کشاف)

انجیل میں اس مقام پر یہ ہے:۔ "اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا" (لوقا۔ ۱: ۲۲)

فقہاء مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ اشارہ بھی کلام کا قائم مقام ہے.

فی هذه الاٰیة دلیل علی ان الاشارة تنزل منزلة الکلام وذٰلك موجود فی کثیر من السنة (قرطبی)

[illegible] (دل و زبان سے)

فَاذْكُرْ. وَسَبِّحْ. یعنی ذکر الٰہی و تسبیح کا شغل دل میں بھی جاری رہے اور زبان سے بھی، یہ نہ ہوگا کہ آپ کی زبان بطور مرض یا عذاب الٰہی کے مطلقاً بند ہو جائے اور آپ بالکل "گونگے" ہو جائیں (جیسا کہ غلط طور پر انجیل میں درج ہے) بلکہ ذکر و تسبیح میں آپ برابر لگے رہیں گے، البتہ لوگوں سے گفتگو پر قادر نہ رہیں گے اور یہی اس امر کی علامت ہوگی کہ حمل قرار پا گیا اور ظہور یحییٰ کا زمانہ قریب آگیا

عَشِیّ. زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک کا سارا وقت اس میں آگیا.

العشی من حین ان تزول الشمس الیٰ ان تغیب (کشاف)

اِبْكَار. طلوع فجر سے دن چڑھے تک کا وقت اس میں شامل ہے.

الابکار من طلوع الفجر الیٰ وقت الضحیٰ. (کشاف)

محاورہ میں مراد صبح و شام کے اوقات کی تعیین و تخصیص ہی نہیں بلکہ مطلق دوام بھی ہو سکتی ہے.

[illegible] (بعض خصوصیات کے لحاظ سے)

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ. یہ قول خواہ بطور الہام ہو جس کا تعلق محض قلب باطن سے ہے، خواہ بطور ندا ہو جس کا تعلق سماعت اور ظاہر سے ہے.

وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ

اور پاک کر دیا ہے اور آپ کو دنیا جہان کی بیویوں کے مقابلہ میں برگزیدہ کر لیا ہے ۱۱۲ اے مریمؑ! اپنے پروردگار کی اطاعت

وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ

کرتی رہئے اور سجدہ کرتی رہئے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہئے ۱۱۳ یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم آپ کے

نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠

اوپر اُن کی وحی کر رہے ہیں ۱۱۴ اور آپ تو اُن لوگوں کے پاس تھے نہیں اُس وقت جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے ۱۱۵ کہ ان میں سے کون مریمؑ کی سرپرستی کرے

مَلٰٓئِكَۃُ کے صیغۂ جمع سے یہ لازم نہیں آتا کہ کہنے والے کئی کئی فرشتے ہوں، مَلٰٓئِكَۃ سے مراد جنس ملائکہ بھی ہو سکتی ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ ملائکہ کا غیر انبیاء کے ساتھ ہم کلام ہونا آیت سے ثابت ہے، البتہ ملائکہ کے لائے ہوئے پیام تبلیغ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اِصْطَفٰىكِ۔ اس اصطفاء کا تعلق مریم علیہا السلام کے بچپن سے ہے یعنی اللہ نے تو شروع ہی سے آپ کو بزرگی دے رکھی ہے، آپ کی والدہ کی دعاؤں کو سُن کر آپ کو خلعتِ وجود بخشا گیا، پھر ہیکل کی خدمت کا کام لڑکوں اور مردوں کے لئے مخصوص تھا، آپ کو لڑکی ہونے کے باوجود اس کا موقع عنایت کیا گیا، پھر آپ کو آپ کے حجرہ میں غذا اُس حسن اعجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اُس نے زکریا نبی تک کو متحیر کر دیا، یہ سب شواہد آپ کی برگزیدگی ہی کے تو ہیں۔

طَهَّرَكِ۔ یعنی آپ کو گناہوں کی آلائش سے پاک صاف کر دیا، آپ کو اخلاق پاکیزگی کا ایک نمونہ بنا دیا۔

اے نزھلکِ عن الاخلاق الذمیمۃ والطباع الردیۃ (روح) روی عن الحسن و ابن سیرین امرا مطہرتک بالایمان عن الکفر و بالطاعۃ عن المعصیۃ (روح) طہرک من الافعال الذمیمہ والعادات السیئۃ (کبیر) عن مجاھد عما یصیب النساء فی خلق و خلق و دین (بحر)

یہ خصوصیت کے ساتھ یہود کی زد میں ہے جو گندے الزامات حضرت مریمؑ پر لگائے ہوئے تھے اور آج تک لگاتے چلے آرہے ہیں۔

۱۱۲ اِصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۔ پہلے اصطفاء کا تعلق مریمؑ کے بچپن سے تھا یعنی پیدائش ہی ایسی ہوئی، اس اصطفاء کا تعلق اُن کے بلوغ کے بعد سے ہے، یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیات سے تھی مثلاً اس صفت میں کہ مرد کے توسط کے بغیر محض کنواری سے انھیں ماں بنا دیا گیا، انجیل میں بھی فضیلت مریمؑ کا ذکر ہے، لیکن قرآن مجید سے کہیں ہلکے لفظوں میں:۔

"اس کنواری کا نام مریم تھا اور فرشتے نے اس کے پاس اندر آکر کہا سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے خداوند تیرے ساتھ ہے" (لوقا ۱: ۲۷، ۲۸)

۱۱۳ آیت ماقبل اگر یہود کے رد میں تھی جنھوں نے مریمؑ کی ذات کو اتہامات کا ہدف بنا رکھا تھا تو یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے رد میں ہے، یہود کو تو یہ بتایا گیا کہ آپ بڑی عبادت گزار و طاعت شعار خاتون تھیں اور نصرانیوں کو یہ جتلا دیا گیا کہ مریمؑ نہ (نعوذ باللہ) خدا کی ماں تھیں ..... کسی قسم کی دیوی کہ اُن کی پرستش کی جائے یا انھیں کسی درجہ میں بھی شریک عبادت کیا جائے بلکہ اُن کی ساری بزرگی و برگزیدگی تو بس یہ تھی کہ وہ اپنے مالک و مولیٰ کی مخلص پرستار، فرمانبردار اور نہایت درجہ

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ

اور نہ آپ ان کے پاس اُس وقت تھے جب وہ باہم اختلاف کر رہے تھے[۱۱۶] (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ

إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اے مریمؑ! اللہ آپ کو خوش خبری دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی ان کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰؑ ابن مریمؑ ہوگا[۱۱۷]

عبادت گزار و طاعت شعار تھیں ــــ آیت سے مقصود حضرت مریمؑ کے کمالِ عبدیت کا اظہار ہے "سجدہ" اور "رکوع" کے الفاظ سے فقہ اسلامی کے اصطلاحی سجدہ ورکوع لازم نہیں آتے، مطلق عبادت مراد ہے۔

۱۱۴ (اے پیغمبر!)

یعنی یہ واقعات وہ ہیں جو آپ سے کئی سو سال قبل اور وہ بھی ایک دوسرے ملک میں پیش آئے تھے اور اب دنیا سے ان کی صحیح تاریخ تک مٹ چکی ہے اور ان کے علمِ واقعی کا کوئی ذریعہ بھی اب بجز وحی الٰہی کے باقی نہیں آپ کو بالکل ٹھیک ٹھیک وحی کے ذریعہ سے القاء کئے جا رہے ہیں اور یہ بجائے خود ایک دلیل آپ کی صداقت کی ہے۔

۱۱۵ (شام کے دریائے یردن میں تفاؤل کے لئے)

إِذْ يُلْقُونَ۔ اس فعل کے فاعل کون تھے؟ یروشلم کے ہیکلِ مقدس کے خدام اور کاہن (یہ اصطلاح یہود) أَقْلَامَهُمْ۔ ہیکلِ سلیمانی کی خدمت و نگہداشت کے لئے خادموں کی ایک بڑی جماعت رہا کرتی تھی جیسے کہ بڑی مسجدوں کی خدمت کے لئے جاروب کشوں، فراشوں، دربانوں، مؤذنوں وغیرہ کا پورا عملہ رہتا ہے حضرت مریمؑ کے والد حضرت عمران اپنے زمانہ میں ان خادمانِ حرم کے سردار تھے اُن کی وفات پر سوال یہ پیدا ہوا کہ اب مریمؑ کا سرپرست کون ہو، رشتہ ان خادموں میں سب سے قریب حضرت زکریاؑ کا تھا کہ آپ مریمؑ کے خالو تھے طے یہ پایا کہ سوال کا حل فال کے ذریعہ سے کیا جائے، فال اشارۂ غیبی کی قائم مقام تھی، اور اس کا طریقہ یہ رائج تھا کہ نے کے قلم جو توریت کے لکھنے کے ہوتے تھے، ان پر توریت شریف ہی کے کچھ کلمات لکھ کر انھیں دریائے یردن میں ڈال دیا جاتا تھا، اور قلم عموماً دریا ہی کے رُخ بہنے لگتے، لیکن بعض قلم مخالف رُخ کو بہتے اور یہی مخالف بہاؤ کامیابی کی علامت سمجھی جاتی، جیت ایسے ہی قلم کے مالک کی سمجھی جاتی، گویا غیب سے ڈگری اُس کے حق میں ہو گئی یہی صورت یہاں ہوئی اور قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام پر پڑا۔

۱۱۶ (مریمؑ کی سرپرستی کے باب میں)

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ۔ خطاب رسول اللہ صلعم سے ہے، یعنی جب مریمؑ کی کفالت و سرپرستی کا قضیہ طے ہو رہا تھا تو آپ خود وہاں موجود نہ تھے اور نہ کوئی معتبر چشم دید شہادت ہی آپ تک پہنچی، پھر جو آپ اتنی صحیح اور سچی خبریں اپنی زبان سے ادا کر رہے ہیں، اُن کا ذریعہ بجز وحی الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

۱۱۷ الْمَلٰٓئِكَةُ کے صیغۂ جمع پر حاشئے دو بار ابھی اوپر گزر چکے۔

يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ۔ کلمۃ اللہ پر حاشیہ ابھی چند آیتیں قبل گزر چکا ہے، بشارت یہاں مریمؑ کو بیٹے کی مل رہی ہے وہ بیٹا جسے بن باپ کے ہونے کی بنا پر کلمۃ اللہ کہا گیا ہے حضرت مریمؑ اس وقت تک دنیوی رسم و رواج کے لحاظ سے نا کتخدا اور کنواری تھیں البتہ آپ کی

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٣٥﴾

دنیا اور آخرت (دونوں) میں معزز اور مقربوں میں سے ۱۳۱

منگنی آپ ہی کے کفو وقبیلہ آل داؤد کے ایک نوجوان یوسف نامی سے ہو چکی تھی جن کے ہاں کاروبار لکڑی کا ہوتا تھا انجیل کا بیان ہے۔ "جبریل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اُس کنواری کا نام مریم تھا۔" (لوقا ۱: ۲۶، ۲۷) "یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب آپ کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی" (متی ۱: ۱۸)
رسم منگنی کی جو اہمیت یہود کے ہاں تھی اس کے لحاظ سے ہمیں اپنے ہاں کی اصطلاح وزبان میں کہنا چاہیے کہ آپ کا عقد ہو گیا تھا مگر رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی گویا خلوت کی اجازت ابھی عرفاً نہیں ہوئی تھی۔
اِسْمُهُ۔ اسم کی وسعتِ مفہوم وجامعیت پر حاشیہ پارۂ اول میں عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کے تحت میں گزر چکا ہے اسم مسمّٰی کے تعارف کے لئے ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰ کے تعارف کے لئے یہ پوری عبارت ضروری تھی۔ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ۔
اَلْمَسِيحُ۔ لفظ مسیح کے اشتقاق میں اختلاف ہے لیکن خواہ یہ لفظ عربی الاصل ہو خواہ عبرانی کے کسی لفظ کا معرب بہر صورت اپنے معنی کے لحاظ سے اردو کے "مبارک" کا مرادف ہے۔

الممسوح بالدهن وبالبركة (اقرب)

روایتوں میں یہ جو آتا ہے کہ دجال کی داہنی آنکھ ممسوح ہوگئی اور حضرت عیسیٰ کی بائیں آنکھ تو اس سے مراد یہ ہے کہ دجال نیکی کی قوتوں سے محروم ہوگا، اور حضرت عیسیٰؑ سے بدی کی صفات فنا ہو چکی ہوں گی۔

يعني بانه الدجال قد مسحت عنه القوة المحمودة من العلم والعقل والحلم والاخلاق الجميلة وان عيسى مسحت عنه القوة الذميمة من الجهل والشره والحرص وسائر الاخلاق الذميمة (راغب)

عیسی۔ انجیل کے تلفظ اور املا میں "یسوع" اصلاً عبرانی یا سُریانی زبان کا لفظ ہے۔

اسمٌ عبرانيٌ او سُريانيٌ وقيل هو مقلوب يسوع۔ (اقرب)

۱۳۱ (اللہ تعالیٰ کے)

یہودیت اور مسیحیت دونوں کے رد ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔
ابن مریم۔ کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کردی کہ عیسیٰ علیہ السلام خود تو بشر تھے ہی، فرزند بھی کسی دیوی دیوتا کسی مافوق البشر کے نہ تھے، محض عورت ذات کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔
ابن مریم۔ سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ دنیا کے عام قاعدہ کے خلاف عیسیٰ علیہ السلام کا انتساب بجائے باپ کے ماں کی جانب رہے گا، اور اس سے روشنی آپ کی خارقِ عادت طریقِ ولادت پر بھی پڑ گئی۔
وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ یہود کے روبرو مسیح کرم جس کے حق میں ہر قسم کی توہین افتراء روا رکھتے ہو وہ عزت اکرام ہیں۔ یہود کی قدیم کتابوں میں کوئی دقیقہ حضرت مسیح کی توہین وتحقیر کا اٹھا نہیں رہا ہے یہ قرآن ہی کی برکت و اعجاز ہے کہ اس کے نزول کے بعد سے رفتہ رفتہ اب خود یہود کے لہجہ کی تلخی نرمی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے اور تالمود کے الزامات دہرانے ہوئے

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور وہ لوگوں سے گفتگو کریں گے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے ۱۱۹

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ

وہ بولیں اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے ۱۲۰

یہود کو تو مرتے دم تک یہ آخرت کے اعزاز کا شاہد تو خیر جب ہوگا، ہوگا، دنیا کا اعزاز اسی سے ظاہر ہے کہ روئے زمین کے ۴۰-۵۰ کروڑ مسلمان آج انہیں اللہ کا پیغمبر و رحمان مانے ہوئے ہیں، ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے اور کروڑوں کی تعداد میں عیسائی ہیں جو انہیں نبوت کے مرتبہ سے بھی بلند سمجھے ہوئے ہیں یہ عقیدہ گو باطل اور احمقانہ ہے لیکن بہرحال آپ کی تعظیم و احترام ہی کا نتیجہ ہے۔

مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ قرآن مجید کا یہ کمال اعجاز ہے کہ اس کے ایک ہی لفظ سے پورا پورا مضمون ادا ہو جاتا ہے یہاں اس لفظ نے ایک طرف تو مسیحیت کے رد میں آپ کا اصل مقام بتا دیا یعنی خدا کے مقرب نہ کہ خود خدا، دوسری طرف یہودیت کے رد میں آپ کی مقبولیت کی شہادت دے دی تیسری طرف من المقربین کی ترکیب نے یہ ظاہر کر دیا کہ اس مقبولیت میں وہ منفرد نہیں دوسرے بندے بھی ان کے ساتھ شریک ہیں اور مسیح با ایں عظمت و اجلال بہرحال عبدیت سے مافوق کوئی مرتبہ کیتائی نہیں رکھتے

۱۱۹ (نہ کہ معاذ اللہ ساحر یا شعبدہ باز یا بد اخلاق جیسا کہ یہود نے افتراء کر رکھا ہے)

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ یعنی با ایں عظمت و اجلال بہرحال دوسرے ہی بندگانِ صالح کی طرح ہوں گے۔ نہ کہ ان سے مافوق کچھ اور جیسا کہ مسیحیوں نے اپنے دل سے ٹھہرا لیا ہے۔

يُكَلِّمُ النَّاسَ اس سے اشارہ نکلتا ہے آپ کے جوشِ تبلیغ کی جانب، لوگوں سے آپ کی گفتگو قصہ کہانی کی نہیں یقیناً توحید و تصحیح عقائد ہی پر ہوگی، انجیلوں سے بھی جتنی شہادتیں ملتی ہیں سب سے تائید آپ کے جوشِ تبلیغ ہی کی ہوتی ہے۔

فِي الْمَهْدِ۔ یعنی بالکل بچپن سے یا اس سن سے جو گہوارہ میں لیٹے رہنے کا ہوتا ہے۔

ای طفلاً (کشاف) حال کونہ طفلاً (بیضاوی)

اتنی کم سنی سے گفتگو پر یہ قدرت اعجازی رنگ میں تھی، انجیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بارہ سال کے سن میں تبلیغ کرنے لگے تھے اور اچھے اچھے دانا آپ کی گفتگو سن کر دنگ رہ جاتے تھے (لوقا۔ ۲: ۴۲، ۴۶، ۴۷)

كَهْلًا سے مراد پختہ عمر ہے یعنی جوانی اور بڑھاپے کا درمیانی زمانہ۔ اس کا اطلاق ۳۰ یا ۳۴ سے اوپر ۵۰ سال کی سن تک ہوتا ہے

الکھل بین حال الغلومۃ وحال الشیخوخۃ (قرطبی) الکھل ما بین الشاب والشیخ (روح)

حضرت مسیح کے بچپن اور پھر پختہ عمری کے ذکر سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ ہر انسان کی طرح آپ کا نشو و نما بھی تدریجی ہوتا رہا، اور یہ نشو و نما خود ایک مستقل دلیل ردِ الوہیت میں ہے۔

۱۲۰ (بہ طریق مواصلت)

حسب بیان انجیل حضرت مریمؑ کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی، اور رخصتی کے قبل نامزد شوہر سے خلوت یہودی قانون میں بالکل ممنوع تھی۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ

ارشاد ہوا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے ۱۲۱ جب وہ کسی بات کو پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ

كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ

ہو جا سو وہ ہو جاتی ہے ۱۲۲ اور (اللہ) اُسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھا دے گا ۱۲۳

وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ

اور وہ پیغمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے ۱۲۴

قَالَتْ رَبِّ انجیل میں اس مقام پر ہے کہ "مریم نے فرشتہ سے کہا" (لوقا ۱: ۳۴)
قرآن مجید نے اپنے حسب دستور اس موقع پر بھی انجیل کے بیان کی تصحیح کر کے یہ بتا دیا کہ مریمؑ کی مخاطبت ایک فرشتے سے نہیں براہِ راست حق تعالیٰ سے تھی اور یہ صاحب نظر پر واضح ہے کہ اس سے مریمؑ کا مرتبہ معرفت و ایمان کتنا بڑھ جاتا ہے۔
اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ فرشتے کی زبان سے وہ پوری تقریر سن کر اب حضرت مریمؑ اپنے مالک و مولیٰ سے یہ عرض کر رہی تھیں۔ آپ کا یہ سوال ظاہر ہے کہ حیرت اور واقعہ کی غرابت کی بنا پر تھا نہ کہ شک یا انکار کی بنا پر۔ فرشتے یا فرشتوں کے دو بدو ہو جانے اور ان کی گفتگو سن لینے کے بعد انکار کا تو اب کوئی محل ہی نہیں تھا، استبعاد البتہ باقی تھا جو عین لازمۂ بشریت تھا
فالمس کنایة ظاھرة والاستفھام علی حقیقته فی وجه ومعناه ھل یکون ذلک بتزوج بطریق أم بمحض القدرة وفی وجه آخر للتعجب من قدرة الله والاستعظام لشانه۔ (المنار)
انجیل نے اس موقع پر جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:-
• "فرشتہ نے اس کے پاس اندر آ کر کہا، سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے خداوند تیرے ساتھ ہے، وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلام ہے، فرشتہ نے اس سے کہا اے مریم خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی، اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا۔۔۔۔ مریم نے فرشتہ سے کہا یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی اور فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا، اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی۔" (لوقا ۱: ۲۸-۳۴)
۱۲۱ رفعِ استبعاد کے لئے حضرت مریمؑ کو یہاں یاد دلایا جا رہا ہے کہ نظر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہئے کہ وہی فاعل حقیقی ہے نہ کہ اسباب طبعی و ظاہری پر کہ ان کی حیثیت محض واسطہ اور ذریعہ کی ہے۔
كَذٰلِكِ یعنی مس بشر کے بغیر ہی۔
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ابھی چند ہی آیتیں قبل ذکر زکریا علیہ السلام اور بڑھاپے میں اُن کی اولاد کا آ چکا ہے وہاں اس موقع کے لئے جو آیت تھی اس کے الفاظ تھے کہ "يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ" وہاں يفعل ہے اور یہاں يخلق کا استعمال محض اتفاقی نہیں، مفسر محقق ابوحیان غرناطی نے خوب لکھا ہے کہ وہاں تو ولادت عام سنتِ الٰہی کے مطابق یعنی مرد و زن کے اتصال سے تھی، اگرچہ وہ مرد و زن سن سے اتر چکے تھے، وہاں قدرت الٰہی کے اظہار کے لئے يفعل بالکل کافی تھا، برخلاف اس کے یہاں

عام وجاری سنّتِ الٰہی سے ہٹ کر بغیر مرد وزن کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق کرانا ہے اس لئے یہاں لفظ بھی یخلق لایا گیا جو حق تعالٰی کی صفتِ ایجاد واختراع پر دلالت کر رہا ہے۔

هنالك يفعل لانه ممكن اذ هو من ذكر وانثى مسنين وهنا يخلق لانه لم يعهد مولود من غير ذكر فجاء بلفظ يخلق الدال على الاختراع الصرف من غير مادة ولا ذكر (نهر) من حيث ان امر زكريا داخل في الامكان العادي الذي يتعارف وان قل وفي قصة مريم يخلق لانه لا يتعارف مثلا وهو وجود ولد من غير والد فيه ايجاد واختراع من غير سبب عادي فلذلك جاء بلفظ يخلق الدال على هذا المعنى (بحر)

اور ایسا ہی مفسر آلوسی بغدادی نے بھی لکھا ہے :۔

التعبير هنا بيخلق وهناك بيفعل لاختلاف القصتين في الغرابة فان الثانية اغرب (روح)

اور صاحب المنار نے اسی کو اور زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔

۱۲۲ (اور وہ ہو جاتا ہے، خواہ اسباب کے واسطہ سے ہو یا بلا کسی سببِ ظاہری کے)

اس قسم کی آیتیں بر ابر فلسفیوں اور باطل مذہبوں کے رد میں ہیں جو حادث پر قیاس کر کے قدیم کو بھی سلسلۂ اسباب کا پابند سمجھتے ہیں۔ کم نادانوں نے ایک سوال یہ پیدا کیا ہے کہ کوئی شے جب ابھی سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو حق تعالٰی کا خطاب اس سے ہوتا کس طرح ہے؟ کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں تو موجود ہی ہے تو اب اس کو حکم ہوتا ہے کہ خارج میں بھی موجود ہو جا۔ يقول له كن فيكون. قول کن سے مراد اس دو حرفی لفظ کا تلفظ نہیں کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں، مراد اللہ تعالٰی کا قول اس کیفیت کے ساتھ ہے جو اس کی شانِ کمال کے لائق ہے اور جس طرح اس کی تمام صفات کی تفصیلات فہمِ بشری کی گرفت سے باہر ہیں اس کے قول کی بھی کیفیت تفصیل سے نہیں سمجھی جا سکتی، مراد صرف یہ کہ ارادۂ الٰہی اور اس کی تعمیل کے درمیان کوئی شے حائل یا حاجب نہیں۔

قَضٰٓى اَمْرًا۔ قضاء کے معنی اس سیاق میں تہیہ کر لینے، ارادہ کر لینے کے ہیں۔

فالقضاء بمعنى الارادة (المنار) القضاء فصل الامر قولاً كان ذلك او فعلاً (راغب)

۱۲۳ (جیسا کہ اللہ کا معاملہ دوسرے انبیاء کے ساتھ بھی رہتا ہے)

يُعَلِّمُهٗ میں ضمیر ہ صاف ظاہر ہے کہ ولدِ مریمؑ یعنی حضرت عیسٰیؑ کی جانب ہے حضرت کا جو مقامِ عظمت ان الفاظ سے بیان کرنا مقصود ہے وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود مریمؑ کی بھی تشفیِ خاطر کا کتنا سامان ضمناً ہوا جا رہا ہے ارشاد گویا یہ ہو رہا ہے کہ تم غم نہ کرو اور پریشان نہ ہو، بے شوہری اولاد کی بنا پر خلق تمہیں جتنا بدنام اور مطعون کرے گی اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمہیں کس پایہ کی مرحمت کی جا رہی ہے!

الكتاب۔ یعنی کتبِ سماوی لفظ کتاب بطورِ اسمِ جنس استعمال ہوا ہے۔

ذهب كثيرون الى ان ال فيه للجنس والمراد جنس الكتب الالهية. (روح)

الحكمة۔ حکمت سے مراد یا تو جمیع امورِ دین ہیں (اور اس سے ضمناً اس پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ پیمبر دینی تعلیم اپنی کتاب یا صحیفہ کے علاوہ بھی لے کر آتے ہیں) اور یا تہذیبِ اخلاق۔

جميع ما علمه من امور الدين (روح) المراد بالحكمة تعليم العلوم وتهذيب الاخلاق. (كبير)

أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ

(اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ بیشک میں تمہارے لئے مٹی سے پرندوں کی مانند

الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ

صورت بنا دیتا ہوں پھر اس میں دم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور

وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ

کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے ہو۔

۱۲۴ھ (جیسا کہ اب تک ہر پیمبر اپنی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا ہے)

رَسُوْلًا۔ آپ کا مرتبہ پیمبری کا ہوگا، نہ آپ معاذ اللہ ساحر و شعبدہ باز ہوں گے جیسا کہ بدتمیز یہود نے آپ کو سمجھا، اور نہ (نعوذ باللہ) آپ خود خدا یا فرزند خدا ہوں گے، جیسا کہ نصرانیوں نے گڑھ لیا۔

اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ یہ بالکل صریح ہے اس باب میں کہ آپ کی دعوت بنی اسرائیل تک محدود تھی، اور دوسرے بنی اسرائیلی پیمبروں کی طرح آپ بھی صرف قومی نبی تھے، انجیل تک میں یہ تصریح اتنی تحریفوں کے بعد بھی باقی رہ گئی ہے: "ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا" (متی ۱۰: ۵-۷) "اس نے جواب میں کہا کہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس بھیجا نہیں گیا" (متی ۱۵: ۲۴)

تقریباً دو ہزار سال کی کلیسا کی ساری مسخ سازیوں کے بعد بھی آج بھی خود مسیحی فاضلوں کو اقرار ہے کہ تبلیغ نصرانیت کی یہ عالمگیری ایجاد بندہ ہے ورنہ خود حضرت مسیح کے ہاں اس تعلیم کا پتہ نہیں، مسیح نے اسرائیل کے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کئے"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ جلد ۵ ص ۶۳۲ طبع چہاردہم) اور مسیح تو مسیح حواریوں تک کا بھی یہ خیال نہ تھا۔

"اولین شاگردوں کو تعلیم مسیح کی عالمگیری کا احساس نہ ہوا"۔ (ایضاً ص ۶۳۲)

۱۲۵ھ (جیسا کہ دوسرے پیمبر بھی خدائی نشانیاں لے لے کر آتے رہے ہیں)

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ۔ اٰيَة کے لفظی معنی نشان کے ہیں، یہاں معجزہ کے مفہوم میں آیا ہے۔ معجزہ ایسے واقعہ کے ظہور کا نام ہے جو عام و متعارف سلسلۂ اسباب سے الگ ہو، پیمبر کے ذریعہ سے ایسے غیر عادی واقعہ کا وقوع اس امر کی دلیل ہوتا تھا کہ نصرت حق و تائید الٰہی پیمبر کے ساتھ ہے۔ معجزہ کا فاعل کائنات کے بڑے چھوٹے معمولی غیر معمولی ہر واقعہ کی طرح صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے، پیمبر محض واسطہ یا ذریعہ ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک قادر مطلق کے وجود کے قائل ہیں، اُن کے لئے کسی بڑے سے بڑے معجزہ کا تعقل امکان تو قابل انکار بلکہ قابل اشتباہ بھی نہیں ہو سکتا، طبعی و غیر طبعی، عادی و غیر عادی، متعارف و مجہول، جلی و خفی اسباب کی تفریق تو بشری تجربات کے لحاظ سے ہے، قادر مطلق کے لئے سب بالکل یکساں ہیں، اب رہا کسی متعین معجزہ کا ثبوت تو اس کا تعلق منطق سے نہیں تاریخ سے، عقل سے نہیں نقل سے، درایت سے نہیں روایت سے ہے، ظن و تخمین کا یہاں دخل نہیں، اب گفتگو صرف سند متصل اور شہادت معتبر کی رو سے ہوگی۔ معجزات مسیح کا ذکر انجیلوں میں بہ کثرت آیا ہے۔

فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾

وہ تمھیں بتلا دیتا ہوں۔ بے شک ان (سارے واقعات) میں تمھارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔[۱۲۶]

مِنْ رَّبِّكُمْ۔ یہ اضافہ اس حقیقت کی تاکید اور اس پر زور دینے کے لئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ پیمبر کے اختیار و قدرت سے، یہ اور بات ہے کہ اس سے مقصود پیمبر ہی کی تائید و نصرت ہو۔

۱۲۶ یعنی اگر تم خبثِ باطن اور ضد و عناد کو چھوڑ کر ایمان کے طالب اور یقین و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہو۔

اَخْلُقُ فعل خلق کا انتساب جب خالق کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مراد نیست سے ہست کرنا، عدم سے وجود میں لانا ہوتا ہے اور جب انسان کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے اندازہ کرنا، ایک خاص انداز سے بنانا، اور صورت پیدا کرنا، اور یہاں محل دوسرے ہی معنی مراد ہیں۔

خلقه تقديره وله مردانه يحدث معدوما (تاج) الخلق اصله التقدير المستقيم (راغب) الذي يكون بالاستحالة فقد جعله الله تعالى بغيره في بعض الاحوال والخلق لا يستعمل في كافة الناس الا على وجهين احدهما في معنى التقدير (راغب) اي اقدر واصور (كبير) والمراد بالخلق التصوير والابراز على مقدار معين (روح)

لَكُمْ یعنی تم میں یقین پیدا کرنے کے لئے۔

ای لاجل تحصیل ایمانکم ودفع تکذیبکم ایای (روح) واللام فی لکم معناه التعلیل (بحر)

عوام ہمیشہ بجائے دلائل و عقلیات کے معجزہ و خارقِ عادت ہی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور یہود تو اپنی عجوبہ پسندی میں خصوصیت کے ساتھ بڑھے ہوئے تھے۔

مِنَ الطِّيْنِ۔ اس فقرہ نے اور زیادہ کھول کر اس حقیقت کو حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے ادا کر دیا ہے کہ میں عدمِ محض سے وجود میں ہرگز نہیں لاتا، صرف مادہ میں ایک خاص ترکیب و ترتیب کے ساتھ تصرف کر دیتا ہوں۔

تقييده بانه لا يوجد من العدم الصرف بل ذكر المادة التي يشكل منها صورة الطير (بحر)

كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ۔ یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بناتا ہوں۔

طَيْرِ۔ یہاں بطور اسم جنس کے ہے۔

فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا۔ یعنی میرے نفخِ دم سے ان میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ سچ مچ کے پرندے بن کر اڑنے لگتے ہیں، چاروں انجیلیں جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے نزدیک مستند ہیں ان میں اس معجزہ کا ذکر نہیں لیکن جو انجیل کلیسائے قبط (مصر) COPTIC CHURCH کی مستند الیہ ہے اس میں یہ صاف مذکور ہے جیسا کہ ڈاکٹر بج BUDGE نے اپنی کتاب LEGENDS OF LADY MARY کے مقدمہ ص۲۹ میں نقل کیا ہے:۔

"وہ پرندوں کی شکل کے جانور بنا دیتے تھے جو اڑ سکتے تھے"۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ یعنی یہ جو کچھ بھی میں کر دکھاتا ہوں اسے کہیں میری قوت و قدرتِ تخلیق کا نتیجہ نہ سمجھ لینا، یہ جو بھی ہوتا ہے سب محض ارادۂ خداوندی و قدرتِ الٰہی کا ثمرہ ہے۔

اَلْاَكْمَهَ۔ اندھوں کو بغیر آپریشن کے بینا کر دینا یوں بھی آسان نہیں چہ جائیکہ مادرزاد اندھوں کو، اور کمہ ایسے ہی کو کہتے ہیں، اس معجزۂ مسیح کا ذکر انجیلوں میں متعدد مقامات پر ہے مثلاً انجیل متی۔ ۹: ۲۷و۳۰ میں اور انجیل مرقس ۸: ۲۲۔

میں لیکن سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا ۹: ۱-۷ میں ہے، اور اس میں تصریح اندھے کے مادر زاد یا پیدائشی ہونے کی ہے۔

الْاَبْرَصَ۔ کوڑھیوں کے چنگا کرنے کا ذکر انجیل میں دو جگہ ہے ایک جگہ ایک کوڑھی کو شفا دینے کا اور دوسری جگہ دس کوڑھیوں کا۔
"جب وہ اس پہاڑ سے اترا تو بہت سی بھیڑ اُس کے پیچھے ہولی اور دیکھو ایک کوڑھی نے پاس آکر اُسے سجدہ کیا اور کہا:
اے خداوند اگر تو چاہے تو مجھے پاک صاف کر سکتا ہے اس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھوا اور کہا میں چاہتا ہوں تو پاک صاف ہو جا اور
فوراً کوڑھ پاک صاف ہو گیا" (متی ۸: ۱-۳) "اور ایسا ہوا کہ یروشلم کو جاتے ہوئے وہ سامریہ اور گلیل کے بیچ سے ہو کر جا رہا تھا
اور ایک گاؤں میں داخل ہوتے وقت دس کوڑھی اس کو ملے، انہوں نے دور کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا، اے یسوع، اے صاحب ہم پر رحم کر
اس نے انہیں دیکھ کر کہا جاؤ اپنے تئیں کاہنوں کو دکھاؤ اور ایسا ہوا کہ وہ جاتے جاتے پاک صاف ہو گئے" (لوقا ۱۷: ۱۱-۱۴)
انجیل کے جدید ناقدوں نے طرح طرح پر جرح کر کے پچھلی صدی میں اناجیلِ اربعہ کا گوشہ گوشہ مجروح کر ڈالا ہے لیکن
اتنے جزو پر یہ ناقدین بھی متفق ہیں کہ مسیحؑ کے معجزات شفا بخشی ثابت شدہ ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۵
ص ۶۳ طبع چہاردہم) نیز انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جو خاص انہی تنقیدات کے لئے ہے اس کا کالم ۲۴۲۵۔

اُحْیِ الْمَوْتٰی۔ برنباحواری کی جو انجیل چلی آ رہی ہے اس میں تو معجزۂ احیاء اموات کی تصریح بھی موجود ہے،
(ص ۲۳۷، ۲۲۱ انگریزی ایڈیشن) رہیں اور اناجیل جو موجودہ مسیحیوں کو مسلّم اور اُن کے نزدیک مستند ہیں وہ بھی اس ذکر سے
خالی نہیں بلکہ ان میں متعدد مثالیں اس قسم کے معجزہ کی مذکور ہیں چنانچہ لوقا جو یونانی میں طبیب کی حیثیت سے مشہور تھے ان کی جانب
منسوب انجیل میں یہ درج ہے:۔ "تھوڑے عرصے کے بعد ایسا ہوا کہ وہ نائین نامی ایک شہر کو گیا اور اس کے شاگرد اور بہت سے لوگ اس کے
ہمراہ تھے جب وہ شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچا تو دیکھا ایک مردے کو باہر لئے جاتے تھے وہ اپنی ماں کا اکلوتا تھا اور وہ بیوہ تھی،
اور شہر کے بہتیرے لوگ اس کے ساتھ تھے اُسے دیکھ کر خداوند کو ترس آیا اور اس سے کہا رو نہیں پھر اس نے پاس آکر جنازے کو چھوا اور
اٹھانے والے کھڑے ہو گئے اور اس نے کہا اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ۔ وہ مردہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا اور اس نے اُسے اس کی
ماں کو سونپ دیا اور سب پر دہشت چھا گئی" (لوقا ۷: ۱۱-۱۶) نیز (۷: ۲۲) انجیل متی (۹: ۱۸-۲۵) میں ایک نازوتیت (ایک سردار
کی لڑکی) کے جلا اٹھانے کا ذکر ہے اور انجیل یوحنا (۱۱: ۱-۴۴) میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک چار روز کے دفن شدہ مردہ لعزر کے احیاء کا۔

بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ مزید تاکید و تصریح کے لئے اس فقرہ کو مکرر لایا گیا ہے کہ کہیں ان اعجازی تصرفات کو میری جانب
نہ منسوب کر دینا، جو کچھ بھی ہوا محض خدائے برحق کی قدرت و مشیت سے ہوا۔

صوفیۂ عارفین نے کہا ہے کہ بعض اہلِ حال سے جو ایسے اقوال منقول ہیں جن میں وہ اپنی جانب ایسے افعال کو منسوب
کر گئے ہیں جو حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، تو بشرطِ صحتِ نقل وہ دعوائے غلبۂ حال پر محمول ہوں گے لیکن اُن میں جو اہل
ادب ہیں وہ ہر ایسے موقع پر حضرت مسیحؑ ہی کی طرح باذن اللہ یا اس کے مرادف کسی فقرہ کی قید لگا دیتے ہیں۔

اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ۔ یہ بات آپ نے مثال اور نمونہ کے طور پر فرمائی یعنی
تمہاری مخفی چیزوں پر بھی اللہ مجھے مطلع کر دیتا ہے۔

اٰیَةً۔ یعنی نشان میرے پیمبر اور مؤید من اللہ ہونے کا۔ حضرت مسیحؑ کے ہاتھ سے خوارق کا بہ کثرت صادر ہونا
تاریخ کا ایک مسلّم واقعہ ہے خواہ ان کی توجیہ منکرین کچھ بھی کرتے رہے ہوں۔ یہود نے انہی خوارق کو دیکھ کر آپ کو ساحر
و شعبدہ باز کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جوزیفس (متوفی سنہ ۱۰۰ء) نے اپنی تاریخ "آثار یہود" میں آپ کا ذکر اُسی

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی توریت کی اور (اس لئے آیا ہوں) کہ تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا

حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾

تھا ان میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں[۱۲۶] اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان لیکر آیا ہوں[۱۲۷] سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو[۱۲۸][۱۲۹]

جنبش سے کیا ہے اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے:۔

یسوع نے بہ حیثیت معلمِ دین یا قانون ساز کے نہیں بلکہ بہ حیثیت شعبدہ باز کے اپنی زندگی میں شہرت وناموری گلیلی کے سادہ مزاج باشندوں میں حاصل کی۔ (جلد ۷، صفحہ ۱۶۷)

۱۲۷ (بہ ارشادِ خداوندی)

مُصَدِّقًا ... التَّوْرٰىةِ۔ کوئی نیا نبی پرانے نبی کی تردید وتغلیط کے لئے نہیں آتا (اس قسم کی تحقیقات صرف حکماء وفلاسفہ کو مبارک رہے) بلکہ ہر جدید پیامبر پیامِ قدیم کی تجدید وتکمیل ہی کے لئے آتا ہے۔ حضرت مسیحؑ بھی یہاں یہی فرما رہے ہیں کہ میں شریعتِ موسوی کے مٹانے کے لئے نہیں، ان کی تجدید وتصدیق کے لئے آیا ہوں، اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں، بلکہ پورا کرنے آیا ہوں" (متی۔ ۵: ۱۷) "آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے مٹ جانے سے آسان ہے"۔ (لوقا۔ ۱۶: ۱۷) (انجیلی زبان میں شریعت سے مراد شریعتِ موسوی ہی ہوتی ہے)۔

حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔ یعنی شریعتِ موسوی میں جو چیزیں تم پر حرام تھیں ۔۔۔ قانونی جزئیات اور فقہی فروع میں ترمیم وتسہیل، عمومی تصدیق وتائید کے ذرا بھی منافی نہیں۔

اُحِلَّ لَكُمْ۔ مسیحی تعلیم نے قدیم موسوی شریعت میں جو بعض سہولتیں اور آسانیاں پیدا کر دی تھیں ان کا ذکر انجیل مروجہ میں بھی موجود ہے۔ مثلاً:۔

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا، میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا"۔ (متی۔ ۱۲: ۲۸۔ ۳۰)

یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے حبروں اور ربیوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں خلط ملط کر دیئے ہیں، میں اس سارے بوجھ کو تم سے دور کرنے آیا ہوں۔

۱۲۸ (اور اپنی نبوت ورسالت کا)

اٰيَةٍ۔ نشان کا لفظ دلائل ومعجزات دونوں پر حاوی ہے، اور لفظ کے مفرد ہونے سے یہ خیال نہ ہو کہ معنی بھی صیغۂ واحد میں ہے، اور کوئی ایک مخصوص نشان مراد ہے۔

اٰيَةٍ۔ بہ طور اسمِ جنس کے ہے اور مراد اس سے سارے ثبوت اور شواہد حضرت کی صداقت کے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

بے شک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے سو اُس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے ۱۳۰

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ

پھر جب عیسیٰؑ نے اُن کی طرف سے انکار ہی پایا ۱۳۱ تو بولے میرا کون مددگار ہوگا اللہ کے لئے

انما وحّد وھی ایات لانھا من واحد فی الدلالة علیٰ رسالته (قرطبی)

خطاب بنی اسرائیل سے ہے۔

۱۲۹ (بہ حیثیت رسولِ خدا ہونے سے)

فَاتَّقُوا اللّٰہَ۔ یعنی اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول کی تکذیب کی جرأت نہ کرو۔

۱۳۰ (جس کی تعلیم ابتداء سے لے کر آخر تک سارے ہی پیمبر دیتے آئے ہیں)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم اسی عبدیت اور اسی توحید کی تھی، ظالموں نے اُسے مسخ کر کے تثلیث بنادیا جو شرک ہی کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے۔

رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کے مخلوق، مربوب اور عبد ہونے کے اعتبار سے پیمبر اور اُمتی سب یکساں ہیں۔

فَاعْبُدُوْہُ۔ یعنی صرف اسی کی پرستش کرو، بغیر کسی کی شرکت وآمیزش کے۔ آج جو انجیلیں مسیحیت کے پردہ پر موجود ہیں، اُن میں سے ایک انجیل برنابا بھی ہے اس کے انگریزی، عربی، اُردو ترجمے موجود ہیں اور وہ حضرت برنابا سا نامی حضرت مسیحؑ کے ایک حواری کی جانب منسوب ہے، اس میں ظہورِ اسلام کی خبریں اور حضرت ختم رسل کی بابت پیش گوئیاں ایسے صاف وصریح لفظوں میں موجود ہیں کہ مسیحیوں کو مفر اسی میں نظر آیا کہ اُسے جعلی کہہ کر الگ کردیں خیر وہ تو ہر سچے پیغمبر الٰہی کے کلام کی طرح توحید کی تعلیم وتاکید سے لبریز ہی ہے، لیکن دوسری انجیلیں بھی جو خود کلیسا کے نزدیک مستند ہیں، وہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ مثلاً:۔

"یسوع نے اس سے کہا، اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (متی ۴:۱۰)

تثلیث کا شرک جن ظالموں کی بھی ایجاد ہو بہرحال حضرت مسیحؑ کا دامنِ اقدس اس کی آلودگی سے بالکل پاک ومنزہ ہے۔

۱۳۱ (اپنی ہر سعی اور تبلیغ کے باوجود)

اَحَسَّ۔ یعنی پایا یا محسوس کیا حواسِ ظاہری سے۔

معناہ علم ووجد قاله الزجاج وقال ابو عبیدة معنی احس عرف (قرطبی) لا یقال ذالك الا فی ماکان من جهة الحاسة (راغب) تحقق ما یدرك بالحواس (بیضاوی)

مِنْھُمْ۔ یعنی اپنے مخاطبین کی طرف سے جو بنی اسرائیل یا یہود تھے۔

ای من بنی اسرائیل۔ (قرطبی)

اَلْکُفْرَ۔ یعنی انکارِ نبوتِ عیسوی سے اور انکار بھی ظلم وتعدی کے ساتھ۔

یہ انکار وطغیان علانیہ اور برملا تھا، کوئی دقیق ومخفی شے نہ تھی، جو مستنبط کی جاتی بلکہ حواسِ ظاہری ہی سے محسوس ہونے والی

قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۵۲﴾

حواری بولے ہم ہیں اللہ کے مددگار ۱۳۲ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہئے کہ ہم فرمانبردار ہیں ۱۳۳

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۳﴾

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے اس پر جو کچھ تو نے نازل کیا ہے اور ہم نے پیروی اختیار کر لی رسول کی سو ہم کو بھی گواہوں کے ساتھ لکھ لے ۱۳۴

کھلی ہوئی چیز تھی، وہیں یہ مقتضب کریمانہ لفظ احس استعمال کیا گیا جس کے معنی بالکل جانتے بوجھ لینے کے ہیں۔

فتنبيه انه قد ظهر منهم الكفر ظهورا بان للحس فضلا عن الفهم (راغب)

۱۳۲ آپ نے اپنی قوم کو نصرت دین کے لئے جو پکارا اس سے محققین نے یہ استنباط کیا ہے کہ اہل دین سے دین کے بارے میں مدد طلب کرنا توکل کے ذرا بھی منافی نہیں، ان سے یہ مدد طلب کرنا اسی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انصاری الی اللہ کے معنی ہیں

الی اللہ یعنی اللہ کی راہ میں، اللہ کے دین کے لئے۔

وقال الحسن المعنى من انصاري في السبيل الى الله (قرطبی) قال ابو علی نصاری معنی الی الله

ای فهو معنی مع اوفق او لائم (بیضاوی)

الحواریون۔ حواری کے لفظی معنی کپڑا دھو کر اُسے صاف اور اُجلا کر دینے والے کے ہیں۔

حورت الشئ بیضته ودورته ... واصل الحور في اللغة البياض وحورت الثياب بيضتها (قرطبی)

حضرت مسیح کے ابتدائی مرید چونکہ عموماً دریا کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر تھے اس لئے آپ کے بعد بھی مقبول شاگردوں کا یہی لقب پڑ گیا، مجازی معنی مخلص و مددگار کے ہیں، چنانچہ حدیث میں حضرت زبیرؓ کے لئے یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے

الحواری ایضا الناصر (قرطبی)، وقوله صلی اللہ علیہ وسلم لکل نبی حواری وحواری الزبیر (راغب)

حواری الرجل صفوته وخالصته (کشاف)

بہرحال وجہ تسمیہ جو کچھ بھی ہو، مسیح کے صحابیوں کے لئے لقب یہی چلا ہوا تھا۔

نحن انصار اللہ۔ حضرت عیسیٰ نے تو اپنے مددگار طلب کئے تھے (من انصاری)، گو وہ مدد خدا ہی کے کام کے لئے ہو، حواری جواب میں اپنے کو خدا کے مددگار انصار اللہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ نحن انصارک۔

محققین نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا۔

۱۳۳ مسلمون۔ مسلم کا لفظی ترجمہ فرمانبردار ہے۔ "مسلم" کا اطلاق ہر نبی کے پیرو پر ہوتا ہے کہ حقیقۃً ہر نبی کی دعوت اللہ کی فرمانبرداری ہی کی ہوتی ہے۔

امنا باللہ۔ حواریوں کا سارا زور ایمان باللہ پر ہے، "ابن اللہ" کے تخیل سے بھی وہ بیچارے آشنا نہ تھے۔

۱۳۴ مسیح کے صحابی ابھی مسیح سے گفتگو کر رہے تھے، دفعۃً براہ راست حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے۔ قرآن مجید اکثر ایسے موقعوں پر یہی کرتا ہے کہ بندوں کے خطاب کا رخ یک بیک اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیتا ہے، کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا!

واتبعنا الرسول۔ حضرت مسیح کے معاصر مسیحی آپ کو رسول ہی تسلیم کرتے تھے، "ابن اللہ"، "اقنوم" وغیرہ کے

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿٥٤﴾

اور انھوں نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔[۱۳۵]

خرافات اس وقت تک نہ ایجاد ہوئے تھے نہ ہو سکتے تھے۔

الشٰهدین۔ گواہ تیری توحید کے اور تیرے پیمبروں کی پیمبری کے۔

۱۳۵ (اس لئے اس کی تدبیر کو تو سب پر غالب رہنا ہی تھا)

مَكَرُوا۔ کا اسم فاعل یہود ہیں۔ یہود کے اکابر اور سرداروں نے تحقیقات وایذا کے بہت سے درجے طے کرنے کے بعد بالآخر یہ طے کیا کہ یسوع نامی اسرائیلی مدعیٔ نبوت کو ختم ہی کر دینا چاہئے چنانچہ پہلے اپنی مذہبی عدالت میں الحاد کا الزام لگا کر آپ کو واجب القتل قرار دیا، پھر رومی حاکموں کی ملکی عدالت میں لا کر آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔

حضرت عیسیٰ اور آپ کے مخالفین کا یہ معرکہ ملک شام کے صوبۂ فلسطین میں پیش آیا تھا۔ شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک جزو تھا، اور یہاں کے یہودی باشندوں کو اپنے معاملات میں آزادی اور نیم خود مختاری حاصل تھی جیسے انگریزی حکومت کے تحت ہندوستان میں ریاست حیدر آباد وغیرہ کو حاصل تھی۔ شہنشاہ روم کی طرف سے ایک نائب السلطنت (وائسرائے) سارے ملک شام کا تھا، اور اس کے ماتحت ایک والی یا امیر صوبۂ فلسطین کا تھا، رومیوں کا مذہب شرک و بت پرستی کا تھا، یہود کو اتنا اختیار حاصل تھا کہ اپنے لوگوں کے مقدمات اپنی مذہبی عدالتوں میں لائیں لیکن سزاؤں کے نفاذ کے لئے انھیں پھر انھی مجرموں کو ملکی عدالت کے سامنے لانا پڑتا تھا، جرم الحاد میں فتوائے قتل خود یہود کی مذہبی عدالت دے سکتی تھی اور اس نے اسی سزا کا حکم سنایا، لیکن واقعۃً سزائے موت کا نفاذ صرف رومی ملکی عدالت کے ہاتھ میں تھا اور سزائے موت رومی حکومت میں سولی کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ یہود کی اس گہری اسکیم کی جانب اشارہ قرآن مجید کے لفظ مَكَرُوا میں ہے۔

وَمَكَرَ اللّٰهُ۔ یعنی اللہ نے مخالفین و معاندین کی ساری تدبیریں، ساری سازشیں الٹ دیں اور حضرت مسیح کو سولی کی موت سے بچا لیا۔ عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے یعنی کسی فعل کی سزا یا جواب کو بھی بعینہٖ اسی فعل کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے اور اس طرز ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا، اور زید نے اس کا جواب دیا، تو عربی محاورہ میں یوں کہیں گے کہ اس نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس پر حملہ کیا حالانکہ زید کا "حملہ" مطلق صورت میں نہ ہوگا، بلکہ صرف سزائے حملہ ہوگی بازیادہ سے زیادہ اسے "جوابی حملہ" کہہ دیا جائے، یا مثلاً کوئی مجھے ٹھگ لے اور میں اس سے انتقام لوں تو عربی میں پیرایۂ ادا یہ ہوگا کہ اس نے مجھے ٹھگا، اور میں نے بھی اسے ٹھگ لیا، حالانکہ ظاہر ہے کہ میری طرف سے ٹھگنے کی سزا یا ٹھگنے کا انتقام ہی ہوگا۔

اس اصل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں سے کہ:۔

(۱) مکروا ومکر اللّٰہ۔ انھوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی "مکر" کیا۔

(۲) انھم یکیدون کیدا و اکید کیدا۔ وہ "کید" سے کام لیتے ہیں اور میں بھی "کید" سے کام لیتا ہوں۔

(۳) جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا۔ "برائی" کا بدلہ ویسی ہی ایک "برائی" ہے۔

(۴) قالوا انما نحن مستھزءون اللّٰہ یستھزئ بھم۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو محض تمسخر کرتے ہیں، اللہ ان سے تمسخر کرتا ہے۔

(۵) فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ۔ جو تم پر "زیادتی" کرتا ہے، تم اس پر "زیادتی" کرو۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ مُطَهِّرُكَ

(وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب اللہ نے فرمایا[۱۳۵] اے عیسیٰ! میں تم کو موت دینے والا ہوں[۱۳۶] اور تم کو اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں[۱۳۷]

جو اشکال محض ترجمہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے وہ از خود ساقط ہو جاتا ہے اس لئے کہ دوسری زبانوں میں یہ جوابی محاورہ رائج ہی نہیں، ان تمام مثالوں میں جوابی اور سزائی "مکر" نہ مکر ہے نہ "کید" کید ہے نہ "سیئہ" سیئہ ہے نہ "استہزاء" استہزاء ہے نہ "زیادتی" زیادتی ہے، بلکہ ہر موقع پر مراد صرف سزائے مکر، سزائے کید، سزائے سیئہ، سزائے استہزاء اور سزائے اعتداء ہے تو اس جوابی و تعزیری مکر الٰہی پر کوئی سوال ہی نہیں عائد ہوتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں لفظ مکر میں (بہ خلاف اردو زبان کے) لازمی طور پر کوئی پہلو ذم کا ہے بھی نہیں۔ مکر عربی میں محمود بھی ہو سکتا ہے اور مکر مذموم بھی، اصل معنی صرف خفیہ تدبیر، گہری تدبیر یا انگریزی میں PLAN کے ہیں۔

المکر الخدیعة والاحتیال وقال اللیث الاحتیال فی خفیة (تاج) وفی مفردات المکر ضربان محمود وهو ما یتحری

به امر جمیل ومذموم وهو ما یتحری به فعل ذمیم (تاج) المکر صرف الغیر عما یقصده بحیلة وذلک ضربان مکر محمود

ومذموم۔ (راغب)

پس جس کسی ہندی نے اردو کے مکر و فریب پر قیاس کر کے قرآن کے مکر اللہ پر حرف گیری کی ہے اُس نے خود اپنی جہالت کا پردہ فاش کیا ہے۔

واللہ خیر الماکرین۔ اور اللہ کی تدبیریں سب سے اونچی اور سب پر غالب آنے والی ہیں اس کا تقابلہ جس طرح کوئی جسمانی قوت اور مادی زور سے نہیں کر سکتا، اسی طرح کسی کی عقل و تدبیر بھی اس سے پیش نہیں پا سکتی چنانچہ یہاں بھی اسی کی حکمت و تدبیر کارگر رہی، حضرت عیسیٰؑ زندہ و سلامت رہے اور صلیب دیتے وقت یہود عوام نے تو ہجوم و اژدہام کے گڑبڑ اور وقت کی تنگی سے اور سولی گھر کے رومی سپاہیوں نے شناخت نہ ہونے کی بنا پر یوں سمجھا کہ سولی حضرت عیسیٰؑ ہی کو دے رہے ہیں، حالانکہ آپؑ کے دھوکے میں آپ ہی کے کسی ہم شکل، ہم عمر، ہم وضع، ہم قوم کو سولی پر چڑھا دیا۔

کلیسائے مسیحی کا آج عام عقیدہ حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہو جانے، صلیب پر وفات پا جانے اور پھر تیسرے دن جی اٹھنے کا ہے لیکن مسیحیوں کے بعض قدیم فرقے BASILIDES (باسلیدیہ وغیرہ) ٹھیک اسی اسلامی عقیدہ کے قائل گزرے ہیں۔

۱۳۶ (حضرت عیسیٰؑ سے اُن کی گرفتاری کے موقع پر)

واقعات و حالات کی رفتار سے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا انجام یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہود انھیں گرفتار کئے اُن پر مقدمہ چلائے بغیر نہ رہیں گے اور پھر رومیوں کی ملکی عدالت میں لے جا کر انھیں سزائے موت دلوا کر رہیں گے۔ یہ ارشادِ الٰہی حضرتؑ سے اُن کی تسکین کے لئے اسی موقع گرفتاری پر ہو رہا ہے۔

۱۳۷ (تمہارے وقتِ معہود پر، سو تم ان ظالموں کی سازش و عداوت سے گھبراؤ نہیں یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)

لفظ مُتَوَفِّيْكَ سے یہ لازم نہیں آتا کہ موت اسی وقت اور فی الفور واقع ہو گی، ہمارے اکابر مفسرین اسی طرف گئے ہیں، بلکہ امام رازی نے تو اسی کو بہتر تفسیر قرار دیا ہے۔

ای مستوفی اجلک ومعناه انی عاصمک من ان یقتلک الکفار ومؤخرک الی اجل کتبته لک (کشاف) ممیتک

حتف انفک لا قتلا بایدیھم (مدارک) مؤخرک الی اجلک المسمّٰی عاصمًا ایاک من قتلھم (بیضاوی) ای متمم عمرک فحینئذ اتوفاک فلا اترکھم حتی یقتلوک بل انا رافعک الی سمائی ومقربک بملائکتی واصونک عن ان یتمکنوا من قتلک وھذا تاویل حسن (کبیر)

توفّی میں مفہوم "پورا پورا لینے کا" بھی شامل ہے اس سے اشارہ گویا یہ بھی ارشاد ہوگیا کہ تمہیں طول حیات پورا پورا ملے گا۔

التوفّی فی اللغۃ اخذ الشئ وافیًا تامًا ومن ثم استعمل بمعنی الاماتۃ والمتبادر فی الاٰیۃ انی ممیتک وجاعلک بعد الموت فی مکان رفیع عندی (المنار)

اور ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ توفی سے یہاں مراد وفات موت نہیں، بلکہ مرتبہ کی بلندی ہے۔

وقد قیل توفی رفعۃ واختصاص لا توفی موت (راغب)

۱۳۵ (اس درمیان میں)

یعنی تمہاری وفات تو اپنے وقتِ مقرر پر جب ہوگی، ہوگی، تمہارے دشمن تمہاری ہلاکت کے کسی منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوسکتے، سردست اس کا انتظام یوں کیا جا رہا ہے کہ تمہیں ان کے درمیان سے اٹھا لیا جائے گا۔

اِلَیَّ یعنی آسمان کی طرف، ملاء اعلیٰ کی جانب۔ امام رازیؒ نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ محاورہ عام ہے جہاں تعظیم و تفخیم مقصود ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنی جانب منسوب کر دیتا ہے مثلاً ہجرتِ ابراہیمی کی عظمت کا اظہار مقصود تھا تو پیرایۂ بیان میں یہ کہا گیا اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ حالانکہ ظاہر ہے کہ ہجرتِ ابراہیمی ایک ملک سے دوسرے ملک، ملکِ عراق سے ملکِ شام کی طرف ہوئی تھی۔

ای الی سمائی ومقر ملائکتی (کشاف) ای محل کرامتی ومقر ملائکتی (بیضاوی) ای سمائی ومقر ملائکتی (مدارک) واللہ تعالیٰ یضیف الیہ ما یکون فیہ الابراز من عالم الغیب قبل البعث وبعدہ۔ (المنار)

رَافِعُکَ حضرت مسیحؑ کے رفع جسمانی کی صراحت تو قرآن مجید میں موجود نہیں لیکن قریب بہ صراحت ہونے کے یہ عقیدہ قرآن مجید کی اسی آیت میں موجود ہے اور احادیث نے اسے اور صاف اور مؤکد کر دیا ہے۔

واولیٰ ھذہ الاقوال بالصحۃ عندنا قول من قال معنی ذلک انی قابضک من الارض ورافعک الیّ لتواتر الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن جریر) ممیتک فی وقتک بعد النزول من السماء ورافعک الاٰن (مدارک)

ابن جریر کی عبارت میں لتواتر الاخبار عن رسول اللہ کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں اور یہی عقیدہ اب جمہور اہلِ سنت کا ہے۔

حضرت مسیحؑ کی جب پیدائش، عام انسانی قاعدۂ توالد و تناسل سے الگ یعنی بغیر باپ کے توسط کے محض نفخۂ جبرئیل سے ہوگئی تو اب رفع جسمانی میں آخر اس قدر استبعاد کیا ہے بلکہ یہ تو بالکل قرین قیاس ہے کہ آپ کا انجام ظاہری بھی معمول عام سے ہٹ کر ہوا ہو اور عجب کیا مسّ ملکی نے آپ کے جسم میں لطافت بھی شروع سے ایسی رکھ دی ہو جو آپ کے صعود آسمانی میں معین ہوسکے۔

— اور یہ دلیل تو بالکل بودی ہے کہ آپ کے رفع آسمانی سے آپ کی افضلیت دوسرے انبیاء خصوصاً سید الانبیاءؐ پر لازم آجاتی ہے آخر خدا معلوم کتنے فرشتے دن رات زمین سے آسمان پر جاتے ہی رہتے ہیں تو کیا اس بنا پر وہ سب سید الانبیاء سے افضل ہوگئے؟ ایک یورپین فاضل DE BUNSEN ڈی بنسن نے پچھلی صدی عیسوی میں ایک مختصر لیکن فاضلانہ کتاب "اسلام یا حقیقی مسیحیت" ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY کے نام سے لکھی تھی اس کے ص ۱۳۴ کے حاشیہ میں اس قدیم مسیحی

مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ

اور اُن لوگوں سے جو کافر ہیں تمہیں پاک کرنے والا ہوں ۱۳۹؎ اور جو تمہارے پیرو ہیں انہیں قیامت تک

كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ

اُن لوگوں پر غالب رکھنے والا ہوں جو منکر ہیں ۱۴۰؎

فرقوں ہی سے متعدد کے نام لے لے کر لکھا ہے کہ فلاں فلاں فرقہ کا عقیدہ مسیحؑ کے رفع جسمانی کا تھا، نہ کہ وفات مسیحؑ کا جس پر اب عیسائی صدیوں سے چلے آتے ہیں، اسی طرح SALE نے بھی اپنے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں اس عقیدہ کے مسیحی فرقوں کے نام گنائے ہیں۔ حیرت ہے کہ کلمہ گویوں کے ایک جدید فرقہ نے وفات مسیحؑ کا عقیدہ مسیحیوں سے لے لیا ہے اور اُسے اپنی خوش فہمی سے کمال "روشن خیالی" سمجھ رہا ہے۔

۱۳۹؎ یعنی ان کے لگائے ہوئے گندے الزامات سے۔

الذین کفروا۔ لفظ میں تو عموم ہے لیکن سیاق سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں جو حضرتؑ کی نبوت و صداقت کے منکر تھے یعنی یہود۔

المراد من الموصول الیھود (روح)

من الذین کفروا۔ یعنی ان لوگوں کی تہمتوں سے اُن کی افترا پردازیوں سے۔

معاذ ہو لا فیك وفی امك (بحر) واما تطھیرہ من الذین کفروا فھو انجی ذہ مما کانوا یرمونه منه (المنار)

مطلب یہ ہے کہ یہود کی ساری سازشیں کل کر رہیں گی اور انھوں نے جیسے جیسے گندے الزام تراشے ہیں سب کی قلعی اُتر رہے گی

۱۴۰؎ (تمہاری نبوت و صداقت کے)

الذین کفروا سے یہاں بھی مراد یہود ہی ہیں، جیسا کہ ابھی اوپر کے حاشیہ میں گزر چکا ہے۔

وھم الیھود (کبیر) وھم الیھود وسائر من شمله ھذا لمفھوم (روح)

الذین اتبعوك یعنی جو لوگ عیسیٰؑ کی رسالت و نبوت کے قائل ہیں مراد مسلمان تو ہیں ہی اور سچے عیسائی بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

وقیل اراد به النصاری (معالم) قال قتادة والربیع والشعبی ومقاتل والکلبی ھم اھل الاسلام (معالم) واما بعد الاسلام فھم المسلمون واما النصاری فھم ان اظھروا من انفسھم موافقته فھم مخالفوه اشد المخالفة من حیث ان صریح العقل یشھد انه علیه السلام ما کان یرضی بشیء مما یقوله ھؤلاء الجھال (کبیر)

فوق الذین کفروا الی یوم القیمة۔ یہ مسلمانوں اور سچے عیسائیوں کا غلبہ یہود و معاندین مسیحؑ پر قیامت تک کس معنی میں اور کس حیثیت سے رہے گا؟ قوت دلائل کے لحاظ سے اور معنوی حیثیت سے تو بالکل ظاہر ہے لیکن اگر مادی، حربی، ملکی و سیاسی حیثیتیں مراد ہوں تو بھی اس وقت تک جو کیفیت یہود کی دنیا کے غالب حصہ میں ہے وہ بھی ان کی فوقیت کا نہیں، ان کی پستی ہی کا اظہار کر رہی ہے۔

بہر حال احتمال اگرچہ دوسری شق کا بھی ہے لیکن اظہر و اغلب شق اول ہی ہے۔

ای ظاھرین قاھرین بالعزة والمنعة والحجة (معالم) المراد من ھذه الفوقیة فوقیة بالحجة والدلیل (کبیر)

ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

پھر تم سب کی واپسی میری طرف ہوگی سو میں تمہارے درمیان اُس باب میں فیصلہ کروں گا جس میں تم (باہم) اختلاف کرتے رہتے تھے ۱۴۱

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا

سو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انھیں دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۱۴۲

وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٥٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل (بھی) کیے سو اللہ انھیں ان کے پورے پورے

الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٥٧﴾

صلے دے گا اور اللہ ناانصافوں کو دوست نہیں رکھتا ۱۴۳

ای بالعهود والسلمان والإسعلاء (کبیر) بعلو بهم بالحجة (ک ف. بصادی. بحر. جلالین. مدارک) فوقية روحانية دينية. (المنار)

اور راغب نے اپنے لغت مفردات القرآن میں "فوق" کا ایک مفہوم فضیلتِ اُخروی کا دیا ہے اور اس کی مثال میں اسی ٹکڑے فوق الذین کفروا کو پیش کیا ہے۔

الی یوم القیٰمۃ۔ محاورہ میں اس سے مراد دوام یا ہمیشگی ہوتی ہے۔

وجعل القيد بيوم القيٰمة للتأبيد (روح) مستبقى كذلك مادامت السمٰوت والارض (المنار)

۱۴۱ (اور وہ فیصلہ عملی شکل میں اور انقطاعی طور پر ہوگا، ورنہ جہاں تک حجت اور دلیل کا تعلق ہے وہ فیصلہ تو اس وقت بھی ہو چکا ہے)

مرجعکم۔ خطاب یہاں مومن و کافر مسلمان و یہود و نصاریٰ سب سے ہے۔

فیہ تختلفون۔ لفظ عام ہے لیکن سیاق میں جس اختلافی و نزاعی امر کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت ہے۔

۱۴۲ (جو انھیں اس گرفت سے بچا سکے)

فی الدنیا۔ دنیوی سزا کا حال تاریخ یہود کے صفحات سے پوچھ دیکھیے، کون سی تباہیاں ہیں جو اس دو ہزار سال کی مدت میں بیچاروں پر نہیں آچکی ہیں، بلکہ جیسا کہ جیوش انسائیکلوپیڈیا کے حوالہ سے پارۂ اول کے ایک حاشیہ میں گزر چکا ہے ان کی قومی ثروت و دولت کا خیال بھی ایک فسانہ ہی ہے ورنہ حقیقتاً قوم پر بجائے دولت کے افلاس مسلط ہے جرمنی، اٹلی، ہنگری، رومانیہ وغیرہ مختلف ملکوں سے جس بے سر و سامانی سے انھیں چند ہی سال قبل نکلنا پڑا ہے وہ داستانِ خونی ابھی تازہ ہے۔

والآخرۃ۔ رہی آخرت تو سزا کا پورا پورا ظہور تو وہیں ہوگا۔

۱۴۳ (اور ناانصاف اُن سے بڑا کون ہوگا، جو انبیاء مرسلین کے باب میں افراط یا تفریط سے کام لیتے ہیں)

الظلمین۔ ظلم کی حقیقت افراط و تفریط ہے یہاں ظالموں سے مراد یہود کا ہونا تو ظاہر ہی ہے، جو حضرت عیسیٰؑ

ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَيۡكَ مِنَ الۡاٰيٰتِ وَالذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى

یہ جسے ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں، نشانیوں میں سے ہے اور پُرحکمت مضمون میں سے ہے ۱۴۴ بے شک عیسیٰؑ کا حال اللہ

عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ‌ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۵۹﴾

کے نزدیک مثل آدمؑ کے حال کے ہے اللہ نے اُن کو مٹی سے بنایا پھر اُن سے کہا وجود میں آجا! چنانچہ وہ وجود میں آگئے ۱۴۵

کی نبوت وصداقت بلکہ شرافتِ نسب تک کے منکر تھے لیکن دوسری طرف اس کے تحت میں مسیحی بھی آئے جاتے تھے، جو حضرتؑ کو عبد کے بجائے معبود اور رسول کے بجائے مظہر یا اوتار قرار دے رہے ہیں اور اس طرح حضرتؑ کے باب میں یہود و نصرانی دونوں ہی ظالم ہیں، یعنی مقامِ عدل واعتدال سے بہت ہٹے ہوئے۔

الذین اٰمنوا اور عملوا الصالحات۔ یہ دو وصف الگ الگ بیان کرنے سے ظاہر ہوگیا کہ عملِ صالح کا اطلاق ایمان سے خارج ہے۔

وذلك یدل علی ان العمل الصالح خارج عن مسمی الایمان (کبیر)

۱۴۴ (اے ہمارے پیغمبر!)

ذٰلك۔ یعنی یہ صحیح قصۂ مسیح۔ اشارۂ بعید اظہارِ شرف وتکریم کے لئے ہے۔

اشارة الی ما تقدم من نبأ عیسیٰ وزکریا وغیرهما (کبیر) والاتیان بما یدل البعد للاشارة الی عظم شأن المشار الیه وبُعد منزلته فی الشرف (روح)

من الاٰیٰت۔ یعنی آپ کی صداقت ونبوت کی نشانیوں میں سے ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے حالات وواقعات جن پر یہود اور نصرانیوں دونوں کی تاریخوں نے غلو وافتراء کے گہرے پردے ڈال رکھے ہیں یہ جو آپ قرآن کے ذریعہ سے بالکل صحیح ومعتبر طور پر سنا رہے ہیں یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپ مؤیّد من اللہ ہیں اور آپؐ وہی کہہ رہے ہیں جو عالم الغیب والشہادۃ آپؐ سے کہلا رہا ہے۔

الذکر الحکیم۔ اشارہ اس طرف ہے کہ آپ کی رسالت پر دلیل ہونے سے قطعِ نظر یہ مضامین بجائے خود بھی پُرحکمت و پُرمعرفت ہیں

۱۴۵ (اسی طرح عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ بشرِ محض اور حادث ومخلوق ہیں انھیں قدیم اور غیر مخلوق کس طرح مان رہے ہو)

کمثل۔ یہ مثلیت کس لحاظ سے ہے؟ بشرِ محض ہونے اور بغیر باپ کے پیدا ہونے میں ہے۔

والمثل هنا لیس هو المثل المستعمل فی التشبیه بل بمعنی الحال والصفة العجیبة (روح)

اٰدم۔ جو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے اور پھر بھی بشرِ محض تھے۔

ای کصفته وحاله العجیبة التی لا یرتاب فیها مُرتاب (روح)

لهٗ۔ ضمیر حضرت آدمؑ کے خاکی پتلے کی طرف ہے، یہ جواب ہے اس مشہور مسیحی شبہ کا کہ جب مسیحؑ کی پیدائش ساری دنیا کے عام ضابطہ کے خلاف بغیر باپ کے توسّط کے ہوئی، تو انھیں بجائے فوق البشر کے محض بشر کیسے تسلیم کیا جائے! جواب یہ ہے کہ آدمؑ کو بشر تو تم خود تسلیم کرتے ہو درآنحالیکہ اُن کی پیدائش تو عجیب تر طور پر واقع ہوئی تھی یعنی وہاں ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کا بھی توسّط نہ تھا، مخلوق ہونے اور حادث ہونے کا دار ومدار کسی خاص ومتعیّن

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ

یہ امر حق تیرے رب کی طرف سے ہے سو (کہیں) تو شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا ۱۲۶ پھر جو کوئی آپ سے اس باب

فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ

میں حجت کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم (صحیح) پہنچ چکا ہے ۱۲۷ تو آپ کہہ دیجئے ۱۲۸

طرز ظہور و وجود پر نہیں بلکہ مطلق حدوث پر ہے اور وہ آفرینش عیسیٰ میں پوری طرح موجود تھا۔

مسیحیوں میں ایک قدیم فرقہ ایرین ARIANS ہوا ہے اس کا بانی ARIUS چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کا لاٹ پادری تھا، اس کی تعلیم یہی تھی کہ مسیح قدیم و غیر مخلوق نہیں، مخلوق و حادث ہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۲۵ طبع چہاردہم)

اس سے قبل انطیوخ (انطاکیہ) کے بطریق پال سموسطوی (مشہور و معروف پولوس طرسوسی سے اسے خلط نہ کیجئے) کی تعلیم تیسری صدی عیسوی میں یہی تھی کہ عیسیٰ مسیح کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی بواسطۂ روح القدس اس لئے وہ بشر محض تھے روح القدس کے توسط نے انھیں بھی مقدس بنا دیا تھا، اور اس لئے وہ مسیح تھے لیکن شریک الوہیت بہر حال نہ تھے (ایضاً جلد ۱۷، ص ۳۹۵ نیز انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱ ص ۷۸۱)

مسیحیوں کے صاحب فہم طبقہ میں برابر اس طرح کی تحریکیں صحیح عقیدہ کی اٹھتی رہی ہیں لیکن کلیسا کے عام جمود و تصلب نے کبھی ان اصلاحی تحریکوں کو عام اور سرسبز نہ ہونے دیا۔

کن فیکون۔ ہو سکتا ہے کہ یہی کلمۂ تکوین ہو، اور مراد یہ ہے کہ جس وقت ارادۂ الٰہی کسی وجود کی خلقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، معاً اس کی تکوین ہو جاتی ہے۔

یجوزان تکون کلمۃ التکوین مجموع کن فیکون والمعنی ثم قال لہ کلمۃ التکوین التی ھی عبارۃ من توجہ الارادۃ الی الشئ ووجودہ بہا حالاً۔ (المنار)

۱۲۶ (اس حقیقت کے باب میں اے مخاطب!)

قرآن مجید میں خطاب بہ صیغۂ واحد کہیں براہ راست رسول اللہ صلعم سے ہے اور کہیں مخاطب عام افراد اُمت ہیں اور ضمیر واحد حاضر دونوں کے لئے یکساں و مشترک ہے دونوں کے درمیان فرق و امتیاز مفسر کے ذوق پر منحصر ہے ان سطور میں زیادہ سے زیادہ اتباع مفسر تھانوی کے ذوق کا کیا گیا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب تو رسول اللہ صلعم سے ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے اس لئے کہ خود آپ تو اس کا احتمال ہی نہ تھا

الخطاب للنبی صلعم والمراد اُمتہ۔ (قرطبی)

الحق من ربک۔ یہ حقائق پروردگار عالم کی طرف سے بیان ہو رہے ہیں اس لئے شک و شبہ کی گنجائش سے بالاتر ہیں۔

فقہائے مفسرین نے آیت سے قیاس شرعی کی صحت پر استدلال کیا ہے۔

دلیل علی صحۃ القیاس۔ (قرطبی)

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾

کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے اور بے شک اللہ ہی تو زبردست ہے حکمت والا ہے ۱۵۰

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ

سو اگر یہ (اب بھی) سرتابی کریں تو بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے مفسدوں کا ۱۵۱ آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب!

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا

ایسے قول کی طرف آجاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی نہ عبادت کریں اور

نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں ۱۵۲ اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا پروردگار ٹھہرائے ۱۵۳

عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے حق تمام تر انہیں کے ساتھ ہے، درانحالیکہ ان کے خیال میں مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے اور کچھ نہ تھا۔" (میور کی "لائف آف محمد" صفحہ ۲۶۰)

۱۵۰ (نہ کہ کوئی اور)

ان ھذا یعنی یہ سارا سلسلۂ واقعات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح و مادرِ مسیح دونوں بشر محض تھے۔

ای المذکور فی شان عیسیٰ علیہ السلام قالہ ابن عباس (روح) ای ما قص من نبأ عیسیٰ ومریم (بیضاوی) وقیل الضمیر للفصل والتاکید وعلیہ الجمہور (روح)

ما من الٰہ الا اللہ کوئی بھی شریکِ الوہیت نہیں، نہ بلحاظ ذات اور نہ بلحاظ صفات، اور اقنوم وغیرہ کے قصے سب خرافات ہیں۔

من۔ زائد و تاکیدِ کلام کے لئے۔

من زائدۃ للتوکید (قرطبی) فی افادۃ معنی الاستغراق (کشاف)

القصص اسم ہے جس سے مصدر کا بھی کام لیا جاتا ہے۔

القصص بالفتح وضع موضع المصدر رلیس ماھو انسب علیہ الجوھری مصدر وانما ہم (عرس)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں فعل بہ معنی مفعول استعمال ہوا ہے۔

ای ھنا فعل بمعنی مفعول ای المقصوص الحق (روح)

العزیز۔ ہر ارادہ پر غالب، قادرِ مطلق۔ اس صفت میں مسیح وغیرہ کوئی بھی باری تعالیٰ کا شریک نہیں۔

الحکیم۔ حکیم مطلق، ہر جزوی اور ہر کلی ارادہ میں حکیم۔ اس صفت میں مسیح وغیرہ کوئی بھی باری تعالیٰ کا شریک نہیں۔

۱۵۱ (اور اپنے اسی علم کامل و محیط کے مطابق ہر ایک کو سزا دینے والا)

فان تولوا۔ یعنی اتنی توضیحات کے بعد بھی اپنی سرتابی جاری رکھیں۔

المفسدین یعنی جو لوگ دین و اعتقاد میں فساد برپا کرتے ہیں اور بجائے توحید کے شرک کی طرف بلاتے رہتے ہیں۔

ای من عدل عن الحق الی الباطل فھو المفسد (ابن کثیر) الذین یعبدون غیر اللہ ویدعون الناس الی عبادۃ غیر اللہ۔ (معالم)

۱۵۲ (نہ فرزند کہہ کر، نہ اقنوم ٹھہرا کر، نہ مظہر یا اوتار بنا کر نہ کسی اور حیثیت سے)

لا نعبد الا اللہ۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کئی صدی بعد کی چیز ہے۔ قرآن کے معاصر جو مسیحی تھے، وہ کیتھولک فرقہ یا کلیسائے رومی کے متبع تھے، اور اس فرقہ میں مسیح پرستی اور روح القدس پرستی تو خیر تھی ہی، اس کے علاوہ بھی خدا معلوم اور کتنی پرستیاں موجود تھیں، مریم پرستی، پاپا پرستی، ولی پرستی وغیرہا، آیت کا یہ ٹکڑا شرک کی جلی خفی ساری صورتوں کی تردید کر رہا ہے۔

قل۔ خطاب رسول اللہ صلعم کو ہے۔

اھل الکتاب۔ لفظ کی تشریح سورۂ بقرہ کے حاشیوں میں ہو چکی ہے، مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہو سکتے ہیں، گو یہاں اصلاً اشارہ نصرانیوں ہی کی جانب ہے۔

کلمۃ صیغۂ واحد میں ہے لیکن اس سے مراد صیغۂ جمع، کلمات بھی ہوتی ہے اور یہ کلام کے مرادف استعمال ہوتا ہے۔

عبر بالکلمۃ عن الکلمات لان الکلمۃ قد تطلقھا العرب علی الکلام والی ھذا ذھب الزجاج (بحر)

الکلمۃ تطلق علی الجملۃ المفیدۃ (ابن کثیر) والعرب تسمی کل قصۃ لھا شرح کلمۃ (معالم)

بیننا اس صیغۂ جمع شکل سے مراد مسلمان ہیں۔

سواء بیننا وبینکم یعنی وہ اصل جو ہم کو تم کو دونوں کو مسلّم ہے، جس کی قدر و قیمت و افادیت پر ہم سب کو اتفاق ہے، جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیمبران برحق ہمیشہ دیتے آئے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت دونوں دینوں کی بنیادی اصل رہی ہے۔ توریت تو خیر تاکیدِ توحید و ممانعتِ شرک سے لبریز ہی ہے، انجیل تک میں بھی یہی تعلیم موجود ہے: ”تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر“ (متی ۴۰:۱۰)

انجیل میں یہ کہیں بھی نہیں ہے، نہ صراحۃً نہ اشارۃً کہ کچھ پرستش صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں خدا کے ساتھ فرزند خدا اور روح القدس کو بھی شامل کر لیا کرو۔

۱۵۳ (کہ عملاً اسے مرتبۂ خدائی پر رکھ دے)

ارباباً من دون اللہ۔ مخلوق پرستی اور مخلوق کی الوہیت کی تردید تو اوپر ہو چکی، اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے، مخلوقین میں سے کسی کو مطاعِ مطلق مان لینا بھی اس کو رب قرار دے لینا ہے۔

دون۔ یہاں غیر یا بجز کے معنی میں ہے۔

دون ھنا بمعنی غیر (قرطبی)

پاپا کی عصمت کیتھولک مسیحیوں کا اور پادریوں کے اجماع یعنی کلیسا CHURCH کی عصمت کل مسیحیوں کا متفقہ عقیدہ ہے: ”ایک محسوس کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں، اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے، اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکانِ خطا ہی نہیں“ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۶ صفحہ ۹۲۰)

قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی ہے، یہیں سے اُن گمراہ فرقوں کی بھی تردید نکل آئی جو اپنے مرشدوں یا اماموں کے مجرد قول بلا دلیلِ شرعی کو واجب القبول ٹھہراتے ہیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

پھر اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہہ دو ۱۵۴ کہ گواہ رہنا ہم تو فرمانبردار ہیں ۱۵۵ اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے

تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ

میں کیوں جھگڑ رہے ہو ۱۵۶ درآنحالیکہ توریت و انجیل تو ان کے بعد ہی اتری ہیں تو تم عقل سے

بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ

کام کیوں نہیں لیتے ۱۵۷ ہاں تم لوگ وہی تو ہو جو اس امر میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تو علم تھا

فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

سو اب ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں (کچھ بھی) علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۱۵۸

هذا يدل على بطلان القول بالاستحسان المجرد الذي لا يستند الى دليل شرعي وفيه رد على الروافض الذين يقولون يجب قبول قول الامام دون ابانة مستند شرعي (قرطبي) اي لا نتبع احبارنا في ما احدثوا من التحريم والتحليل (مدارك) او لو هم منزلة ربهم في قبول التحريم والتحليل بحض

کسی کو رب قرار دینے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس لفظ کا بھی اطلاق اس پر کیا جائے بلکہ اس کے اندر اگر صرف صفاتِ ربوبیت مان لئے گئے تو علاوہ رب ٹھہر ہی گیا۔

وان لم يطلقوا عليه لفظ الرب الا انهم انزلوا في عقيدة معنى الربوبية. (آلوسی)

بعضنا بعضا۔ مفسر ابن حیان نے کیا نکتہ خوب کہا ہے کہ الوہیت و ربوبیت کی تردید تو اس ایک فقرہ ہی سے ہو گئی۔ جب ایک دوسرے میں تثلیث اور رشتہ ہم نسبی قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے، الوہیت و ربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔

وفي قوله بعضنا بعضا اشارة لطيفة وهي ان البعضية تنافي الالهية اذ هي تماثل في البشرية (بحر)

۱۵۴ (اے مسلمانو!)

یعنی اگر اب بھی قبولِ حق سے روگردانی کرتے رہیں اور اپنے اس گڑھے اور ٹھہرائے ہوئے شرک سے باز نہ آئیں۔

۱۵۵ (اور بہرحال و بہرصورت ہم ہی توحیدِ خالص کے علمبردار و مبلغ ہیں)

مسلمون۔ لفظی معنی فرمانبردار کے ہیں اور یہی اصطلاحی نام بھی اس امت کا پڑ گیا۔

اشهدوا۔ اور یہود و نصاریٰ تو آج بھی مسلمانوں کی توحیدِ خالص کی شہادت دے رہے ہیں، قرآن مجید کے اعجاز کا یہ ایک نمونہ!

۱۵۶ (اور انہیں خواہ مخواہ یہودی یا نصرانی ٹھہرا رہے ہو)

خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔

فی ابراهيم۔ یعنی ابراہیم کے دین و مذہب کے بارہ میں۔

مَا كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا

ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ راہ راست والے مسلم تھے اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھے ۱۵۹

مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾ إِنَّ أَوْلَى ٱلنَّاسِ بِإِبْرَٰهِيمَ

بے شک ابراہیمؑ سے سب سے قریب لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی تھی، اور یہ نبی ہیں

لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِىُّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَٱللَّهُ وَلِىُّ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾

اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے اور اللہ ایمان لانے والوں کا حامی ہے ۱۶۰

لہ مصحف میں ہا کا خبر کے التباس سے بچانے اور وصف استفہام کا مفہوم رکھنے کے لئے آخر سے الف گرا دیا گیا.

الاصل ءاھا فحذف الالف ... الاستفہام والخبر (قرطبی)

۱۵۷ یعنی جن کتابوں کو تم اپنی نام نہاد یہودیت اور نصرانیت کی بنیاد قرار دیتے ہو وہ تو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد کی چیزیں ہیں، تو کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو کہ متاخر کتابوں کے سہارے اپنا مذہب ان کے سر چپکانا چاہتے ہو.

۱۵۸ یعنی اسی دین ابراہیمی سے متعلق، مراد یہ ہے کہ جب تم توریت و انجیل ہی کے مسائل میں جھگڑے اور ایسا جھگڑے حالانکہ تم کو کچھ تو واقفیت اور علم تحقیقی حاصل تھا تو اب دین ابراہیمی کے بارے میں کیوں کٹ حجتی پر اترے ہو جس کے بارے میں تو سرے سے علم تحقیقی حاصل نہیں.

ھانتم میں ھا کا اشارہ مخاطبین کی تحقیر و تنقیص کے لئے ہے.

والاشارۃ للتحقیر والتنقیص (روح)

۱۵۹ (بلکہ شرک سے سخت بیزار تھے اور دنیائے شرک میں توحید کے پہلے علمبردار)

حنیفا مسلما حنیف اردو میں "سیدھے سادے مسلم"

یھودیا ولا نصرانیا جس یہودیت اور جس نصرانیت کی نفی ہو رہی ہے وہ رواج پائی ہوئی گڑھی ہوئی یہودیت اور نصرانیت ہے، ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے جو دین حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تھا وہی حضرت ابراہیمؑ کا بھی تھا، حضرت کی توحید پرستی یہود و نصاریٰ دونوں کو مسلّم تھی۔ حضرت کے دین توحید پر حاشیے پارۂ اول کے رکوع آخر میں گزر چکے. فقہائے مفسرین نے لکھا ہے کہ ان آیتوں سے دین حق کی حمایت میں دلائل قائم کرنے اور اہل باطل کے جواب دینے کا وجوب ثابت ہوتا ہے.

وفی ھذہ الآیات دلیل علی وجوب المحاجۃ فی الدین واقامۃ الحجۃ علی المبطلین (جصاص)

۱۶۰ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

اولی الناس بابراھیم ابراہیمؑ سے قریب بہ لحاظ دین و عقائد.

للذین اتبعوہ۔ وہ لوگ جنھوں نے آپؑ کے زمانہ میں آپ کی پیروی کی تھی.

وھذا النبی۔ اور یہ نبیؐ جو گویا انہی کا پیام لے کر آئے ہیں اور انہی کی نیابت اس زمانہ میں کر رہے ہیں.

والذین امنوا۔ یعنی مسلمان. فرنگی مورخین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم اسرائیلی مذہب کا جانشین اب اگر کوئی

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا

اہل کتاب میں سے ایک گروہ تو یہی چاہتا ہے کہ تمہیں گمراہ کر کے رہیں حالانکہ وہ بجز اپنے اور کسی کو بھی گمراہ

يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

نہیں کرتے اور (اس کی بھی) خبر نہیں رکھتے ۱۶۱ اے اہل کتاب اِتم اللہ کی آیتوں سے

تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

کیوں انکار کئے جاتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو ۱۶۲ اے اہل کتاب اِتم حق کی تلبیس

تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

باطل کے ساتھ کئے جاتے اور حق کو چھپا جاتے ہو حالانکہ تم جانتے بوجھتے ہو ۱۶۳

رکوع ۱۵

تو وہ مسیحیت نہیں جس کے اندر یونان اور روما کے جاہلی مشرکانہ عقائد جمع ہو گئے ہیں، بلکہ اسلام ہے۔ ملاحظہ ہو "مورخین کی تاریخ عالم" HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD

۱۶۱ روایتوں میں آتا ہے کہ یہود کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے اور انھیں باطل کی قوت پر اتنا زعم تھا کہ خود تو اسلام قبول کرنا الگ رہا، مسلمانوں کو بھی ان کے عقائد سے برگشتہ کر دینے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ آج بھی کتنے مسیحیوں کے دل میں یہ تمنا چھپی جاگتی موجود ہے کہ مسلمان خواہ مسیحیت قبول کریں یا نہ کریں، لیکن اسلامی عقائد سے تو دگر گاہی جائیں۔

طائفۃ من اھل الکتاب۔ خاص اشارہ یہود کی جانب ہے۔

یضلونکم۔ خطاب عام مسلمانوں سے ہے۔

ما یضلون الا انفسھم۔ یعنی حقیقۃً وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں تو کامیاب ہوتے نہیں، خود اپنے ہی نامۂ اعمال کو اور زیادہ سیاہ کرتے رہتے ہیں۔

مایشعرون۔ یعنی ایسے بے عقل و نافہم ہیں کہ حقیقتِ حال کا مطلق شعور نہیں رکھتے۔

۱۶۲ (ان کی واقعیت و صداقت کے)

بایت اللہ۔ یعنی اللہ کی ان آیتوں سے جو خود تمھاری کتابوں کے اندر موجود ہیں اور جن میں نبوتِ محمدی کی پوری پوری علامتیں اور بشارتیں درج ہیں۔

وانتم تشھدون۔ یعنی یہ انکار کچھ ناواقفیت اور لاعلمی کی بنا پر نہیں، جان بوجھ کر ان آیتوں میں تحریف کرتے ہو لفظی بھی اور معنوی بھی۔

۱۶۳ یہاں یہود پر تین الزامات متعین طور پر لگائے گئے ہیں:۔

۱۔ تلبسون الحق بالباطل۔ اپنی کتابوں کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ حق بالکل باطل کے تحت میں دب کر

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے ۱۶۴ کہ ایمان لانے والوں پر جو نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

دن کے آخر میں اس سے انکار کر بیٹھو، عجب کیا کہ (وہ بھی) پھر جائیں ۱۶۵

رہ جاتا ہے، باطل حق کو ڈھانپ لیتا ہے اور تاویل بڑھ کر صریح تحریف بن جاتی ہے۔

فسترالبس بالخلط والتخطئة (بحر)

۲۔ تکتمون الحق۔ حق کو سرے سے چھپا ڈالتے تھے اور جہاں جہاں بشارتیں ظہور اسلام کی نصاً موجود ہیں وہاں عبارتیں کچھ کی کچھ کر دیتے ہو۔

۳۔ وانتم تعلمون۔ یہ سب کچھ اپنے قصد و ارادہ سے کر رہے ہو، محض اتفاقی طور پر یہ نہیں ہو رہا ہے، تحریفاتِ اہل کتاب پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔

۱۶۴ (آپس میں)

قال بعضھم لبعض (قرطبی) فی ما بینھم (مدارک)

یہ اشارہ ہے یہود خیبر و عرینہ کی جانب۔

کان احبار قری عرینة اثنی عشر حبرا فقالوا لبعضھم ادخلوا فی دین محمد اول النھار فاذا کان اخر النھار فاکفروا (ابن جریر)

۱۶۵ (اس چال اور تدبیر سے)

۱۔ امنوا وجه النھار۔ یہاں ایمان اظہارِ ایمان کے معنی میں ہے یعنی صبح ایمان ظاہر کرو۔

اے اظھروا الایمان (کشاف) ادخلوا فی دین محمد باللسان دون الاعتقاد (معالم عن الحسن وقتادہ)

والمراد اظھروا الایمان لا یمکن ان یراد به التصدیق۔ (بحر)

وجه النھار۔ یعنی صبح، دن کا اوّل حصہ۔

یعنی اوّله (قرطبی) اوّل النھار (بیضاوی)

انزل علی الذین امنوا۔ یعنی جو اِن مومنین کے خیال میں ان پر نازل ہوا ہے۔

اے علی زعمھم۔ (بحر)

لعلھم۔ ضمیر اُن لوگوں کی جانب ہے جو واقعۃً مسلمان تھے۔

مدینہ و مضافاتِ مدینہ کے یہود کی چالیں مسلمانوں کے خلاف عجیب عجیب رہتی تھیں، ایک بار آپس میں صلاح و مشورہ کے بعد یہ سوچا کہ ہم میں بعض صبح کے وقت صداقتِ اسلام کا اقرار کر لیا کریں اور پھر چند گھنٹوں کے بعد اس اقرار سے رجوع کر لیا کریں اور کہہ دیا کریں کہ غور و فکر اور مطالعۂ توریت کے بعد اس نئے دین کی تصدیق نہ ہوئی اس لئے ہم اس سے نکل آئے ہیں، اہل عرب پر ہمارے علم و اخلاق دونوں کی دھاک تو بیٹھی ہی ہوئی ہے لوگ کہیں گے آخر کوئی خرابی

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ

اور واقع میں بجز اس کے کہ جو تمہارے دین کا پیرو ہو اور کسی پر ایمان نہ لاؤ[۱۶۶] آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے[۱۶۷]

اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ

اور یہ سب اس غصہ میں کر رہے ہو کہ کسی اور کو وہ چیز مل گئی جو تمہیں ملی تھی یا وہ لوگ تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں غالب آجائیں[۱۶۸]

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۷۳)

آپ کہہ دیجئے کہ فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا کرتا ہے[۱۶۹] اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے[۱۷۰]

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے

تو اس نئے دین میں ہے جو ایسے ایسے لوگ اس سے باہر نکل گئے، اور عجب نہیں کہ اس تدبیر سے کچھ پرانے مسلمان بھی اکھڑ جائیں۔ تاریخ یہود میں منافقت کی یہی ایک مثال نہیں، خود اُن کی کتابوں میں یہ واقعہ بصراحت درج ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب اسپین میں اسلامی حکومت تھی تو حکومت کے "مظالم" فرضی یا واقعی کی بنا پر بہت سے یہود نے اپنے ربیوں کی اجازت اور فتوی کے مطابق اپنے قبولِ اسلام کا اظہار شروع کر دیا تھا اور آنحالیکہ دل میں سب کے سب منکر ہی تھے (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد اول ص۴۳۲ و ص۴۳۳) اور آج یہ جو بڑے بڑے فرنگی "محققین" یہود و مسیحی مستشرقین نے فرنگی زبانوں میں سیرۂ نبوی لکھنے کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنے علم و تحقیق، وسعتِ مشرب، بے تعصبی کی دھاک بٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھاتے ہیں اور معلوم یہی ہوتے لگتا ہے کہ "پیغمبر عرب" اور "مصلح عالم" کی نعت اور "مقنن اعظم" اور "مثیل موسیٰ" کی منقبت میں دریا کے دریا بہا دیں گے لیکن آگے چل کر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) انھیں کچھ خلل دماغ سا تھا یا یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے مضامین کہیں سے سن سنا کر انھیں چرا لیتے تھے، وقس علیٰ ہذا، تو یہ بھی ٹھیک اُسی قدیم یہودیانہ دجل و تلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ ہے اور بس۔

۱۶۶ یعنی حقیقۃً اور دل سے تصدیق تو بس اپنے ہی والوں کی کیا کرو ــــ وہی یہود کا قول چل رہا ہے۔

۱۶۷ (جو اب اسلام کے نام سے ظاہر ہوئی ہے اور جس کی صداقت پر دلائل عقلی و نقلی قائم ہیں، نہ کہ تمہارے محدود ذہن کی مخترعات)
قُلْ۔ خطاب پیغمبر علیہ السلام سے ہے، اور یہ فقرہ کلام یہود کے جواب میں ہے۔

۱۶۸ (اور اسی ڈر سے سہمے جا رہے ہو)
مِثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ یعنی دولتِ نبوت خطاب قوم یہود سے ہے یعنی تمہاری اصل خلش تو بس اس کی ہے کہ انبیاء تو ہمیشہ ہماری نسل و قوم سے پیدا ہوتے رہے ہیں، اب ایک عرب اور اسمٰعیلی کو یہ دولت کیسے مل جا رہی ہے۔
يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ یعنی قیامت کے دن مسلمان یہود پر یہ کہہ کر غلبہ نہ حاصل کر لیں کہ ان لوگوں نے بھی تو دنیا میں

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ

کیوں نہیں جو شخص بھی اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بے شک اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۱۷۴

الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ

بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو قلیل قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ۱۷۵ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لئے

لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ

کوئی حصہ آخرت میں نہیں اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا نہ اُن کی طرف دیکھے گا،

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۱۷۶

اے ماداما علیہ قائما ای ملازما له بالمطالبة ... والشاد ... فی

مطالبته اداء المال ... قال ابو علی الفارسی ... (کبیر)

۱۷۳ (کہ ایسا کوئی مسئلہ ہرگز شریعت اسرائیلی و موسوی میں موجود نہیں)

الاُمّیّین یعنی اُمّ القریٰ مکہ کے باشندے۔ یہود نسلی نخوت و عصبیت اور قومی غرور سے بھرے ہوئے یہود ان مکہ کو اپنے سے بہت فروتر رکھتے تھے۔

لیس علینا فی الاُمّیّین سبیل یہود غیر یہود یا Gentiles کے ساتھ کاروباری تعلق کے سلسلہ میں بدمعاملگی کے لئے برابر بدنام رہے ہیں۔ قومی مفاخرت اور نسلی نخوت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے۔ گوروں کا برتاؤ کالوں کے ساتھ آج دنیا کے ہر علاقہ میں کیا ہے؟

سبیل سبیل کے معنی یہاں حجت کے ہیں اور یہ معنی قرآن اور کلام عرب میں عام ہیں۔

وبه تعبر عن الحجة ... وقوله ... من سبیل من هذا المعنی

وهو کثیر فی القرآن وکلام العرب ... (بحر)

یقولون علی اللّٰه الکذب یہ جھوٹے ہیں اپنے اس دعویٰ اور اس انوکھے اصول مذہب و اخلاق میں۔ اس تفصیل نے یہود کے جرم کی شناعت کہیں زیادہ بڑھادی، وہ صرف فسق عمل ہی میں مبتلا نہ تھے بلکہ ایک بے اصل عقیدہ بھی گڑھ لیا تھا، اور اعمال سے کہیں گزر کر عقائد کی خرابی میں مبتلا ہو چکے تھے۔

۱۷۴ (اور یہی خوف خدا اور تقویٰ ہی ساری خوش معاملگی کی بنیاد ہے)

بلیٰ۔ یعنی ذمہ داری کیوں نہ ہوتی ہے اور ضرور ہے۔

عہد۔ عہد خالق کے ساتھ ہو یا مخلوق کے، اس کی پابندی بہرحال لازمی ہے۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا

اور انھیں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی زبانوں کو کتاب میں کج کرتے ہیں ۲۵۱ تاکہ تم اُس (جزو) کو بھی کتاب میں سے

هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ

سمجھو درآنحالیکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے درآنحالیکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ

یہ اللہ پر جھوٹ گڑھتے ہیں درآنحالیکہ (خوب) جانتے ہوتے ہیں ۲۵۲ کسی بشر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تو اُسے

اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ

کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ تم میرے بندے بن جاؤ بجائے اللہ کے ۲۵۳ بلکہ

اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

(وہ تو یہی کہے گا) کہ اللہ والے بن جاؤ ۲۵۴ (یہ) اس لئے (اور بھی) کہ تم پڑھاتے ہو کتاب (آسمانی) کو اور خود بھی (اُسے) پڑھتے ہو ۲۵۵

آیت سے وفاء عہد کی بڑی تعظیم نکل رہی ہے اس لئے کہ تمام طاعات کا خلاصہ صرف دو ہی چیزیں ہیں، ایک احکام الٰہی کی تعظیم، دوسری خلق اللہ پر شفقت، اور وفاء عہد ان دونوں قسموں کی طاعتوں کا مجموعہ ہے (کبیر)

۲۴۸ یعنی کسی دنیوی طمع میں آکر ان پابندیوں کو توڑ رہے ہیں۔

ثمنا قليلا۔ دنیوی معاوضہ ہمیشہ اُخروی اجر کے مقابلہ میں قلیل ہی ہوگا، یہ مراد نہیں کہ اگر زیادہ معاوضہ مل رہا ہو تو بددیانتی اور عہد شکنی جائز ہو جائے گی۔ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ اپنے معاہدوں کی پابندی نہ کرنا اور بدعہدی کرنا کسی بھی معاوضہ پر جائز نہیں۔

عهد الله۔ یعنی وہ عہد متابعت جو اللہ سے کر چکے ہیں۔

ايمانهم۔ یعنی جو قسمیں آپس میں معاملات سے متعلق کھاتے رہتے ہیں۔

فقہاء مفسرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ جو فریق یہ جانتا ہے کہ وہ باطل پر ہے، وہ اس بنا پر اپنے کو حق پر قرار نہیں دے سکتا کہ عدالت ظاہری سے فیصلہ اس کے موافق ہو گیا ہے۔

ودلت هذه الاية والاحاديث ان حكم الحاكم لا يحل المال في الباطن بقضاء الظاهر اذا علم المحكوم له بطلانه (قرطبی)

۲۴۹ (اس کفر وفسق کے پاداش میں)

لاخلاق۔ یعنی بھلائی کا کوئی حصہ نہیں۔

اے لاخير۔ (بخاری)

لا یکلمھم۔ یعنی بطریقِ لطف اُن سے خطاب نہ کرے گا، جو خطاب برائے عتاب ومواخذہ ہو اس کی نفی مراد نہیں۔

لا ینظر الیھم۔ یعنی نگاہِ مہر والتفات سے ان کی طرف نظر نہ کرے گا، نگاہِ قہر کی نفی مراد نہیں۔

لا یزکیھم۔ یعنی گناہوں کی گندگی سے پاک صاف نہ کرے گا۔

الیم۔ درد پہنچانے والے یا مؤلم کے معنی میں ہے۔

ای مؤلم موجع من الالم وھو فی موضع مُفعِل (بخاری)

۱۷۷ (اپنے صحائفِ آسمانی پڑھتے وقت)

منھم۔ یعنی انھیں یہود میں۔

یلوٗن السنتھم۔ اس کے اندر تحریفِ لفظی ومعنوی کی ساری صورتیں آگئیں، لَیِّ لسان سے عربی محاورہ میں مراد یہی ہوتی ہے جھوٹ، تلبیس، تحریف۔

لوی لسانہ بکذا کنایۃ عن الکذب وتخرص الحدیث (راغب)

اور یہاں تحریف بالقصد مراد ہے۔

والمعنی یحرّفون الکلم ویعدلون بہ عن القصد (قرطبی)

۱۷۸ یعنی ان کی یہ تحریفیں دانستہ ہوتی ہیں۔

لتحسبوہ۔ میں ضمیرِ مخاطب سے مراد سامعین ہیں اور ضمیرِ غائب سے مراد کتاب کا اختراعی حصہ۔

وھو المحرَّف (کبیر)

یقولون۔ ضرور نہیں کہ ان کا یہ کہنا لفظاً وصراحۃً ہو، اگر اجمالاً ودلالۃً ہو جب بھی کافی ہے۔

وَمَا ھو من عند اللہ۔ فقیہ جلیل ابوبکر رازیؒ نے اس کے تحت میں لکھا ہے کہ آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ معاصی کی نسبت اللہ تعالیٰ یا اس کے فعل کی جانب کر دینا درست نہیں۔

فیھا دلالۃ علیٰ ان المعاصی لیست من عند اللہ ولا من فعلہ (جصّاص)

لیکن مفسر ومحدث ابوحیان غرناطی کی تنقید اس پر یہ ہے کہ یہ مذہب تو معتزلہ کا ہے اور ابوبکر رازی کا میلان خود اسی مذہب کی جانب ہے۔

ھٰذا مذھب المعتزلۃ وکان الرازی ینتح الیٰ مذھبھم۔ (بحر)

صاحبِ کبیر اور صاحبِ روح المعانی دونوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ عربی داں ناظرین کے پڑھنے کے قابل ہے۔

۱۷۹ (جیسا کہ مسیحیوں نے دعوت وپیامِ مسیح کا خلاصہ گڑھ رکھا ہے)

درمیان میں مناسبتِ مقام سے ردِّ یہود آگیا تھا، اب یہاں سے ردِّ نصاریٰ پھر شروع ہوتا ہے۔

مَا کان لبشر۔۔۔ والنّبوّۃ۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی، جنھیں یہ ساری نعمتیں ملی تھیں، یہ نہیں ہو سکتا جن کے نفس ایسے طاہر ومطہر ہوں، ان سے ایسے دعویٰ کا صدور ممکن ہی کیوں کر ہے۔

الحکم۔ حکم یہاں حکمت یا احکامِ شریعت کے معنی میں ہے۔

الحکم العلم والفھم وقیل ایضاً الاحکام (قرطبی) قیل بمعنی الحکمۃ والظاھر ان الحکم ھنا القضاء (بحر)

الکتٰب۔ کتاب۔ یہاں جنسِ کتاب کے معنی میں ہے۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ

اور وہ نہ تمہیں اس کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیمبروں کو پروردگار قرار دو ۱۸۲ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا

إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ

بعد اس کے کہ تم اسلام لا چکے ہو ۱۸۳ اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و

الکتب ھنا اسم جنس (بحر)

۱۸۰ (جیسا کہ فی الواقع مسیح کی دعوت رہی ہے)

ربانیین۔ ربانی وہ ہے جو رب کی جانب منسوب ہو اور رب ہی کا مرادف ہے، درمیان کلمہ میں الف نون کا اضافہ زور اور تاکید کے لئے ہے یعنی بڑا اثر والا۔ بڑا با خدا۔

معنی الربانی العالم بدین الرب الذی یعمل بعلمہ (قرطبی) قال محمد بن حنفیۃ یوم مات ابن عباسؓ الیوم مات ربانی ھذہ الامۃ (قرطبی) ھو شدید التمسک بدین اللہ وطاعتہ (مدارک)

۱۸۱ یعنی اس لئے تو تمہیں اور زیادہ ایسے لغو و مشرکانہ عقائد سے بچنا چاہئے۔

ای بسبب کونکم معلمین الکتاب وبسبب کونکم دارسین لہ (بیضاوی)

امام رازیؒ نے اس موقع پر لکھا ہے کہ علم و تعلیم و دراست کا اقتضاء ہی یہ ہے کہ انسان باخدا بن جائے پس اگر کوئی ان شغلوں سے یہ مقصود نہیں رکھتا تو وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اور ایسے ہی علم اور قلب سے حدیث نبوی میں پناہ مانگی گئی ہے۔

نعوذ باللہ من علم لا ینفع وقلب لا یخشع (کبیر)

خطاب نصاریٰ سے ہے یعنی تمہارے پاس تعلیم و تعلم کے لئے کتاب آسمانی موجود اور پھر تم ایسے جہل و ضلالت میں گرفتار!

۱۸۲ (جیسا کہ بعض گمراہ قوموں نے اپنے اکابر کی جانب منسوب کر رکھا ہے)

لا یامرکم میں لا معنی نفی کی تاکید مزید کے لئے ہے۔

لا مزیدۃ لتاکید معنی النفی (مدارک)

مسیحیوں کی تثلیث تو ایک معلوم و معروف حقیقت ہے لیکن یہ کمتر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ملائکہ پرستی بھی ان کے ہاں زوروں پر رہ چکی ہے اور صدیوں تک یہ تعلیم ان کے ہاں جاری رہی ہے کہ خدا نے انسانوں اور آسمانوں کے نیچے ساری چیزوں کے انتظامات تمام تر فرشتوں پر چھوڑ رکھے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۴) نیز یہ کہ خدا کائنات کی صرف کلی ربوبیت کرتا ہے باقی جزئیات سب ملائکہ کے حوالے ہیں۔ (ایضاً) مسیحیت کی تاریخ ملائکہ کی باضابطہ عبادت و پرستش سے بھی نا آشنا نہیں ان کی مورتیاں تک ان کے ہاں پوجی گئی ہیں۔ ہمارے قدیم مفسرین بھی اس سے بے خبر نہ تھے

ھذا موجود فی النصاریٰ یعظمون الملٰٓئکۃ والانبیاء حتی یجعلوھم لھم اربابا (قرطبی)

۱۸۳ (اور توحید خالص کا اقرار کر چکے ہو)

ایامرکم بالکفر۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء پرستی و ملائکہ پرستی قطعاً کفر کے حکم میں داخل ہے آیت سے سبق ان مسلمانوں

كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ

حکمت (کی قسم) سے دوں پھر تمہارے پاس رسول اس (چیز) کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور ا

وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ

(رسول) پر ایمان لانا اور ضرور اس کی نصرت کرنا پھر (اللہ نے) فرمایا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ہم اقرار کرتے ہیں

کو بھی لینا چاہیے جو اپنے شیوخ واکابر کی خواہ وہ زندہ ہوں یا گزر چکے ہوں، تعظیم وعقیدت میں غلو کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

جملہ کا سوالیہ انداز اظہارِ حیرت وانکار کے لیے ہے، جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

علیٰ طریق الانکار والتعجب (قرطبی) والهمزة للانکار (کشاف)

۱۸۴ (یہ ایمان دل وجان سے ہو، اور نصرت دست وزبان سے)

اخذ اللہ میثاق النبیّین۔ یعنی ارواحِ انبیاء سے عہد لیا، عالمِ ارواح میں اس ناسوتی دنیا کے وجود سے قبل۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جو احکام انبیاء کو ملے اُن میں اُن کی اُمّتیں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں۔

من کتاب وحکمة۔ کتاب سے مراد کتابِ آسمانی ہونا ظاہر ہے، حکمۃ سے مراد معرفتِ الٰہی بھی ہو سکتی ہے اور نبوت بھی۔

مصدّق۔ یعنی وہ بعد کا آنے والا رسول خود اُن پچھلی تعلیمات وہدایات کا مُصدِّق بھی ہو۔

لتؤمننّ به ولتنصرنّه۔ عارفین صوفیہ نے کہا ہے کہ شیوخ پر لازم ہے کہ ان کا جو معاصر علم وعمل میں اُن سے فوق ہو بلکہ ان کا مساوی ہو اس سے دعا کرانے میں عار نہ کریں۔

رسول۔ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ ایک فردِ معیّن کی جانب کر رہا ہے اور یہ اُسلوب قرآن میں عام ہے چنانچہ یہاں مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، اور صحابہ میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ اسی طرف گئے ہیں۔

الرسول هنا محمد صلى الله عليه وسلم فى قول علىؓ وابن عباسؓ واللفظ وان كان نكرة فالاشارة الى مُعيّن (قرطبی) وهو مرویٌّ عن علی وابن عباس وقتادة والسدی رضوان الله عليهم (کبیر)

اور یہی مذہب عموماً اکابر مفسّرین کا ہے۔

فالرسول محمد خاتم الانبياء صلوات الله وسلامه عليه الى يوم الدّين (ابن کثیر) يعنى محمداً صلى الله عليه وسلم (معالم) هو محمد صلى الله عليه وسلم۔ (کبیر)

اور ہمارے زمانے کے علّامہ انور شاہ کاشمیری کی ”مشکلات القرآن“ میں ہے:۔

رسولٌ مُعیّن لا رسول وکونه مُصدّقاً لما معهم علّم فی رسولنا صلی الله علیه وسلم (ص۶۲)

اور عارفوں سے یہ بھی منقول ہے کہ رسولِ حقیقی اور شارعِ مستقل تو حضرت محمد مصطفیٰ صلعم ہی ہیں اور باقی دوسرے انبیاء بطور آپ کے تابعین کے ہیں۔

ذهب العارفون الى انه صلى الله عليه وسلم هو النبى المطلق والرسول الحقيقى والمشرع الاستقلالى وان من سواه من الانبياء فى حكم التبعية له (روح) فذكر اخذ الميثاق على انبياءهم بالايمان برسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (بحر)

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو ہمارے اوپر اتارا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ

اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد (یعقوبؑ) پر اتارا گیا ہے اور اس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور (دوسرے) نبیوں کو دیا گیا ان کے

رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ

پروردگار کی طرف سے ۱۸۸ ہم ان میں سے باہم کوئی فرق نہیں کرتے ۱۸۹ اور ہم تو اسی (اللہ) کے فرمانبردار ہیں ۱۹۰ جو کوئی اسلام کے

غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا ۱۹۱

۱۸۸ یہاں یہ حقیقت ایک بار پھر دہرا دی گئی ہے کہ اسلام کوئی نیا، تو پیدا اور انوکھا دین نہیں وہی پرانا دین توحید ہے سارے انبیاء و مرسلین اسی کی تبلیغ کرتے چلے آئے ہیں اور مسلمان کا ایمان سارے پیغمبروں پر یکساں ہوتا ہے۔

قُلْ۔ یعنی اے پیغمبر! آپ اپنی امت کی طرف سے کہہ دیجئے۔

اُنزل علینا۔ یعنی قرآن مجید۔ نزول قرآن کا انتساب جس طرح عموماً پیمبرؐ کی طرف کیا گیا ہے اسی طرح کبھی کبھی پیمبرؐ کی امت کی جانب بھی کر دیا گیا ہے۔ اور فعل انزال کا صلہ قرآن مجید میں حرف علی اور الی دونوں کے ساتھ آتا ہے

الاسباط یعنی اولاد یعقوبؑ جو جو پیمبر ہوئے ہیں، اس لفظ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔ انبیاء کے اسماء گرامی پر بھی حاشیے گزر چکے ہیں

۱۸۹ (ان کی صداقت کے لحاظ سے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو جھٹلائیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ بقیہ مذہب والوں کا شیوہ تھا) یہ مراد نہیں کہ انبیاء کے درمیان فرق مراتب ہی نہیں ہوتا۔ تفاضل پر تو خود آیۂ کریمہ تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض ناطق ہے۔

۱۹۰ (اور اسی لفظی معنی کی مناسبت سے ہمارا اصطلاحی نام بھی "مسلم" ہی ہے)

۱۹۱ آیت بڑی اہم اور ایمانیات میں کلیدی حیثیت کی ہے۔

الاسلام سے یہاں کھلی ہوئی مراد اصطلاحی دین اسلام ہے ورنہ لفظی معنی کے لحاظ سے تو کائنات کا ذرہ ذرہ مسلم ہے۔

اعلم ان ظاهر هذه الآية يدل على ان الايمان هو الاسلام (کبیر)

ان الدین عند الله الاسلام۔ وغیرہ متعدد آیتوں میں یہ مضمون صاف صاف بیان ہو چکا ہے کہ سچا اور مقبول دین صرف یہی دین ہے جس کی کتاب قرآن ہے اور جس کے لانے والے اور سکھانے والے محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔ اس ایک دین کے علاوہ اور جتنے بھی دین و مذہب اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں ان کی مثال فرسودہ اور ٹکسال باہر سکوں کی سی ہے کہ کبھی کھرے وہ بھی رہے ہیں لیکن جب چل نہ سکے تو ان کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر۔ یہ آیت اس حقیقت کو اور زیادہ موکد و آشکار کر رہی ہے۔

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ

اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر (اختیار) کرلیا اور (بعد اس کے کر) شہادت

حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ

دے چکے تھے کہ رسول برحق ہیں اور (بعد اس کے کہ) ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آچکی تھیں اور اللہ (ایسے) ظالم لوگوں کو

جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ۙ

ہدایت نہیں دیتا ۱۹۲؎ ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور انسانوں کی سب کی لعنت ہوتی ہے ۱۹۳؎

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ۙ اِلَّا

وہ اس میں (ہمیشہ ہمیش) پڑے رہنے والے ہیں نہ ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ۱۹۴؎

الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اور (اپنے کو) درست کرلیں سو بے شک اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحم والا ہے ۱۹۵؎

دوسرے ادیان و مذاہب کو بھی (گو وہ اصلاً کیسے ہی ہوں) ان کی موجودہ صورت میں اسی دین حق کی طرح سچا سمجھنا ہر دین و مذہب کو نجات کے لئے کافی سمجھنا یا سب مذہبوں کو ملا جلا کر ان کا ایک ملغوبہ تیار کرنا، یا یہ کہنا کر دیر و حرم کعبہ و کلیسا سب یکساں ہیں ضلالت ہی کی دینی ہی کی شکلیں ہیں اکبر، دارا شکوہ وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں اور بڑے قلق کا مقام ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی بعض اہل قلم ایسی ہی نامراد کوششیں کر چکے اور کر رہے ہیں۔

۱۹۲؎ (جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں اتنے بے باک ہیں)

کفروا بعد ایمانهم۔ یعنی دین حق سے مرتد ہو گئے۔

البینات۔ کھلی ہوئی نشانیاں رسول اسلام اور دین اسلام کی صداقت کی، دلائل معجزات سب ان بینات کے تحت میں داخل ہیں۔

۱۹۳؎ (اور لعنت کی حقیقت رحمت الٰہی سے دوری و مہجوری ہے)

لعنت۔ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔

۱۹۴؎ (جہنم میں پڑنے سے قبل)

لا یخفف عنهم العذاب۔ یعنی جہنم میں پڑنے کے بعد بھی کوئی تخفیف عذاب میں نہ ہو گی۔

فیها۔ یعنی اسی حالت ملعونیت و مغضوبیت میں۔

ای خالدین فی اللعنة۔ (کبیر، ابن کثیر)

دوسرے معنی جہنم میں پڑے رہنے کے بھی مروی ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ

بے شک جن لوگوں نے بعد اپنے ایمان (لانے) کے کفر اختیار کیا پھر کفر میں بڑھتے رہے اُن کی توبہ ہرگز قبول نہ

تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

کی جائے گی ۱۹۶ اور یہی لوگ تو گمراہ ہیں ۱۹۷ بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ

وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا

مرگئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے سو ان میں سے کسی سے ہرگز نہ قبول کیا جائے گا زمین بھر (بھی) سونا

وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٩١﴾

اگرچہ وہ اسے معاوضہ میں دینا چاہے ۱۹۸ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے عذاب دردناک ہے اور جن کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوں گے

ع ۱۷ ۹ ۱۱

قال ابن عباسؓ لمن فی جهنم. (کبیر)

۱۹۵ (سوا ایسے کے لئے قبول توبہ دشوار ہی کیا ہے)

تابوا۔ یعنی صدق واخلاص کے ساتھ توبہ کرلیں۔

غفورٌ۔ سو وہ اپنی اس صفتِ غفر کے تقاضے سے اُن کی پچھلی خطاؤں کو بخش دے گا۔

رحیمٌ۔ سو وہ اپنی صفتِ رحیمیت کے تقاضے سے ان پر مزید فضل فرمائے گا۔

۱۹۶ (دوسرے معاصی وسیئات سے)

یعنی پڑے تو رہیں کفر وارتداد میں اور چاہیں کہ انھیں ان کے دوسرے اعمالِ حسنہ کا صلہ مل جائے، سو بغیر ایمان واعتقادِ صحیح کے اُن اعمال پر سرے سے "حسنہ" "وصالحہ" کا اطلاق ہی نہ ہوسکے گا جو اُن پر اجر وصلہ کی توقع رکھی جائے۔

۱۹۷ یعنی گمراہ کامل۔ انتہا درجے کے گمراہ، ورنہ گمراہ تو سب ہی کافر ہوتے ہیں۔

هذا محمول على انهم هم الضالون على سبيل الكمال. (کبیر)

۱۹۸ (قیامت کے دن)

یعنی بالفرض قیامت کے دن کا قربال کا مالک ہو اور اس کے دے ڈالنے پر بھی قادر ہو۔

ذهبًا ذهب سے مقصود یہاں سونا نام مخصوص وتعین سے تھا ہی مراد نہیں بلکہ مراد عزیز سے عزیز اور زیادہ سے زیادہ قیمتی شے بطور فدیہ کے ہے۔

الذهب كناية عن اعز الاشياء (کبیر)

دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ کوئی شخص آج چاہے کہ حالتِ کفر میں قائم رہ کر روئے زمین کے برابر روپیہ کارِ خیر میں خرچ کردے اور اس کے معاوضہ میں قیامت میں نجات حاصل کرے تو ایسا ہرگز نہیں ہونے کا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ

جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو گے (کامل) نیکی (کے مرتبہ) کو نہ پہنچ سکو گے ۱۹۹ء

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

اور جو کچھ بھی کسی چیز سے خرچ کرتے رہتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے ۲۰۰ء

ای من بعض ما تحبون. سفر علی بعض منه حتی انفقوا لو كان هو من الادنى ذهبا فيما يراه قريبا كثيرا

۱۹۹ء (اے مسلمانو!)

البر۔ مطلق نیکی کو کہتے ہیں یہاں مراد کمال خیر ہے اور نیکی کا درجہ اعلیٰ پایہ کہا جائے کہ حقیقت خیر یا ابواب خیر کی جنت مراد لی گئی ہے۔

البر الاحسان وكمال الخير وروح اي لن تبلغوا حقيقة البر (مدارک) قال ابو منصور البر هو الدنيا والآخرة

یعنی اللہ اور اس کے دین کی راہ میں نہ خرچ کرو گے انفاق پیارا ہے یہ معنی ہیں اس میں خیر یا نیکی کے سارے ابواب آ گئے (روح)

خير من بعض الصبر كما هو الصحيح لعموم الآية (ابن عربی) وقال ابن حاتم كل ما تقرب به الى الله من

عمل خير فهو بر والمراد به كل ما تقرب به الى الله عزوجل من عمل خير فهو انفاق. (روح)

مما تحبون۔ محبوب چیز کے۔ تحت ہر وہ چیز آ جاتی ہے جسے انسان عزیز رکھتا ہے مال، دولت، عزت، حکومت،

قوت، وقت وغیرہ، تنہا مال و دولت ہی مخصوص نہیں بعض اوقات جاہ کی قربانی مال کی قربانی سے کہیں زیادہ سخت و دشوار ہوتی ہے

من المال وما يعمه وغيره كبذل الجاه في معاونة الناس والبدن في طاعة الله وفي سبيله (بیضاوی)

مما میں من تبعیض کے لئے ہے۔

من في مما تحبون للتبعيض (بحر)

آیت کا اتنا ٹکڑا کلام موزوں ہے اور ایسا ہی وزن قرآن مجید کی اور بھی متعدد آیتوں میں پایا جاتا ہے لیکن محض موزونیت کے پائے جانے سے کلام پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود متکلم شعر کا قصد بھی نہ کرے اسی بنا پر علماء نے یہ کہنا جائز نہیں رکھا ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ شعر میں بھی ہے۔

ولا يجوز ان يقول ان في القرآن شعرا۔ (بحر)

صاحب مثنوی، مولانائے رومی نے آیت کے ایک جز کو لے کر اسے ایک مصرعہ بنا دیا ہے ؎

ہر چہ داری صرف کن در راہ او لن تنالوا البر حتی تنفقوا

۲۰۰ء (اور وہ جزا بھی اسی کے مطابق دے گا)

فيجازيكم بحسبه (کشاف)

مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لئے جو کچھ بھی لگاؤ گے اس کا اجر تو بہرحال ملے گا لیکن خیر کا جو درجہ اعلیٰ ہے، وہ تو اسی وقت حاصل ہو گا جب راہ حق میں اپنے محبوبات و مرغوبات کی قربانی پیش کرو۔

واعلم ان الوصول الى المطلوب الا باخراج المحبوب۔ (مدارک)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ

ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا. بجز اس کے جو خود اسرائیل نے اپنے اوپر حرام

اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا

کر لیا تھا قبل اس کے کہ توریت اترے. تو آپ کہئے کہ

بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾

توریت لاؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو[۲۰]

من شیءٍ یعنی عام اس سے کہ وہ محبوب ہو یا نہ ہو.

مِنْ. یہاں تبیین کے لئے ہے.

من للتبیین اے من ای شیءٍ کان (مدارک) یبین ما تنفقوا اے من ای شیءٍ کان طیبًا تحبونہ او خبیثًا تکرھونہ (کشاف) اے من ای شیءٍ محبوب او غیرہ و من لبیان ما (بیضاوی)

بہ علیم. آیت سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ جس مالک ومولیٰ کی رضا کے لئے خرچ کر رہے ہو وہ تو ہر حال واقف وباخبر ہے پھر اس کار خیر کا اعلان اپنی طرف سے کیوں کرتے پھرو.

وفی الاٰیۃ ترغیبٌ وترھیبٌ قیل وفیھا اشارۃٌ الی الحثّ علی اخفاء الصدقۃ (روح)

[۲۰] (اپنے اس دعوی میں کہ فلاں فلاں غذائیں تو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے حرام چلی آتی ہیں) یہود کو تو روز ایک نیا فتنہ مسلمانوں کے خلاف اٹھانا تھا آپ پر ایک نیا الزام یہ لگایا کہ فلاں فلاں غذائیں تم جائز سمجھتے ہو اور اپنے کو دین ابراہیم کا متبع بھی کہے جاتے ہو حالانکہ یہ چیزیں تو ابراہیم کے وقت سے حرام ہیں.

الطعام. طعام ہر وہ چیز ہے جو کھائی جائے.

الطعام ما یطعم اے یتناول لاجل الغذاء (المنار)

کل الطعام. یعنی وہ غذائیں جن کے باب میں یہود سے بحث وگفتگو ہو رہی ہے ساری دنیا کے کھانے مراد نہیں.

اے مطعومات التی فیھا النزاع (مدارک)

حرم اسرائیل علی نفسہٖ. اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام ہے آپ نے بعض طبی ضرورتوں سے بعض جائز غذائیں بالکل ترک کر دی تھیں. اسرائیلی روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کو مرض عرق النساء کی شکایت تھی تو آپ نے اونٹ کے دودھ اور گوشت سے پرہیز شروع کر دیا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس طبی پرہیز کا حرمت شرعی سے کوئی تعلق نہیں.

قیل فعل ذالک للتداوی باشارۃ الاطباء (بیضاوی) قیل اشارت علیہ الاطباء باجتنابہ ففعل ذالک باذن من اللہ فھو کتحریم اللہ ابتداءً (کشاف)

لیکن اس روایت کی صحت سے اس کے اسرائیلی الاصل ہونے کی بنا پر انکار ہی کیا گیا ہے.

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

سو جو شخص اللہ پر اس کے بعد بھی جھوٹ گڑھے تو بس ایسے ہی لوگ تو ظالم

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۚ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

ہیں ۲۰۴ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچی بات فرما دی ہے ۲۰۵ تو تم سیدھی راہ والے ابراہیم کے دین کی

حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

پیروی کرو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے ۲۰۶

کل ذالک من الاسرائیلیات وصحۃ السند فی بعضہا عن ابن عباس وغیرہ کما زعم عاصم لایمنع ان یکون مصدرہا اسرائیلیا۔ (ماجد)

بعض جاہل صوفیہ کا یہ سمجھنا کہ ترک حیوانات یا بعض دوسری غذاؤں کے ترک کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل ہے تمام تر نادانی ہے، عاموں کی شققتیں اور ریاضتیں بالکل دوسری چیز ہیں، ورنہ جو غذائیں انسان کی روحانی ترقی میں مانع ہیں وہ خود ہی حرام کر دی گئی ہیں، کسی غذا کے حلال ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس راہ میں مانع نہیں۔

وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ علی بطلان قول الممتنعین من اکل اللحوم والاطعمۃ اللذیذۃ تزھدا لان اللہ تعالٰی قد نھی عن تحریمہا۔ (جصاص)

قُلْ۔ یعنی ان یہود سے کہئے جو معترض ہو رہے ہیں۔

فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ۔ توریت میں تو آج تک یہ لکھا چلا آ رہا ہے۔

"وہ سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے لئے ہیں، میں نے ان سب کو نباتات کی مانند تمہیں دیا ہے" (پیدائش ۹:۳)

تفسیر میں ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ اسرائیل کی سے مراد یعقوبؑ کی ذات نہیں بلکہ مجموعی طور پر قوم اسرائیل یعنی ان کے بارھوں قبیلے ہیں، اور مفہوم یہ ہے کہ قوم اسرائیل کی مسلسل نافرمانی کی پاداش میں بہت سی نعمتیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔

فالمراد باسرائیل شعب اسرائیل کما ھو مستعمل عندھم لا یعقوب نفسہ ومعنی تحریم الشعب ذالک علی نفسہ انہ ارتکب الظلم واجترح السیئات التی کانت سبب التحریم۔ (المنار)

۲۰۴ (اپنے حق میں)

یعنی واضح اور صریح شہادتوں کے بعد بھی اپنے جھوٹ پر قائم رہیں اور یہ کہے جائیں کہ فلاں فلاں چیزیں خدا کی طرف سے حرام کی ہوئی ہیں۔

من بعد ذالک۔ یعنی اس واضح شہادت کے بعد۔

ای من بعد ما لزمتہم الحجۃ (بیضاوی) بعد ظہور الحجۃ (جلالین)

غذاؤں میں اصل ان کی حلّت ہی ہے، حرمت صرف حکم خداوندی ہی سے ہو سکتی ہے۔

والاصل فی الاشیاء الحل حتی یرد النص بالتحریم۔ (المنار)

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾

سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا ۲۰۵ وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہان کے لئے راہنما ہے ۲۰۶

۲۰۳ یعنی قرآن نے امر حق واضح کر دیا، اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے مقدس نوشتوں کی بابت گڑھ رکھے تھے ان کی قلعی کھول دی۔

۲۰۴ (ابراھیم۔ ملة ابراھیم، حنیف، سب پر حاشیے پارہ اول کے ختم کے قریب رکوع ۱۵ اور ۱۶ میں گزر چکے)

فاتبعوا ملة ابراھیم یعنی انھیں ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جنھیں تم بھی اپنا مقتدا و پیشوا مانتے ہو۔

۲۰۵ (دنیا میں بطور عبادت گاہ کے)

مراد خانہ کعبہ ہے جس کی اولین تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور اس کے منہدم ہو جانے کے بعد از سر نو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے۔

وُضِعَ للناس یعنی لوگوں کی طاعت و عبادت کے لئے بنایا گیا۔

اے وضعه الله موضعا للطاعات والخیرات والعبادات (کبیر) اے لعموم الناس لعبادتهم ونسکهم یطوفون به ویصلون الیه ویعتکفون عنده (ابن کثیر) وضع للناس یعبد الله فیه (معالم)

اوّل بیت۔ حدیث نبوی اور اقوال تابعین سب میں اس اوّلیت اور اقدمیت کی تشریح ملتی ہے۔

ثبت فی صحیح مسلم عن ابی ذر قال سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن اوّل مسجد وضع فی الارض قال المسجد الحرام (قرطبی) قال مجاھد خلق الله موضع ھذا البیت قبل ان یخلق شیٔ من الارض بالفی سنة (قرطبی)

۲۰۶ (بطور قبلہ کے)

کعبہ کو سب سے پہلا معبد بتا کر یہود کو یہ بھی جتلا دیا گیا کہ کعبہ تو بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔

بکّة مکہ ہی کا دوسرا نام بکّة ہے، صرف عربی کے ایک قاعدہ کے مطابق جس سے حرف م اور حرف ب میں اکثر تبادلہ ہو جاتا ہے چنانچہ لازم اور لازب۔ راتم اور راتب، غمیط اور نبیط اسی کی مثالیں ہیں اسی قاعدہ کا عمل یہاں بھی ہوا۔

ھی علم للبلد الحرام ومکة وبکة لغتان فیه (کشاف) بکة لغة فی مکة عند الاکثرین (روح) قال مجاھد بکة ھی مکة (قرطبی) من اسماء مکة علی المشھور۔ (ابن کثیر)

ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ نام ہے کل شہر کا اور بکہ کا اطلاق ہے مسجد حرام اور مطاف پر۔

بکّة ھو موضع المسجد (ابن عباس) بکّة موضع البیت ومکة ما سوی ذلك (ابن جریر عن ابی مالك) بکة موضع البیت ومکة سائر البلد عن مالك بن انس (قرطبی) قال ابو مالك وابو صالح وابراھیم النخعی وعطیة العوفی ومقاتل بن حیان بکة موضع البیت وما سوی ذلك مکة (ابن کثیر)

بائبل میں بھی ایک جگہ ذکر وادی بکہ کا، تحریفات کے باوجود رہ گیا ہے "وہ بکا کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے" (زبور۔ ۸۴: ۶) بائبل کے قدیم مترجموں نے اپنی بے احتیاطی کی عادت کے مطابق ترجموں میں اسے بجائے علم کے اسم نکرہ قرار دے کر اس کا ترجمہ رونے کی وادی، کر ڈالا، صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا اور اب جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ صفحہ ۴۱۵)

القرآن کو اتنا سمجھنے کی توفیق اور دے دے کہ یہی "بے آب وادی" مکہ معظمہ ہے۔

فِيهِ ءَايَٰتٌۢ بَيِّنَٰتٌ مَّقَامُ إِبْرَٰهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُۥ كَانَ ءَامِنًا ۗ

اس میں کھلے ہوئے نشان ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیمؑ ہے ۲۰۷ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے وہ امن سے

وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن

ہو جاتا ہے ۲۰۸ اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لئے اس مکان کا (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو ۲۰۹

كَفَرَ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ عَنِ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٩٧﴾

اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے ۲۱۰

مبارکًا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مادی اور روحانی، دُنیوی اور دینی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

للّذی میں لام تاکید کا ہے۔

واللام توکید۔ (قرطبی)

مکہ کی قدامت پر مسیحی مورخین کو بھی اب شہادت دینی پڑی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی)
مورخ مسعودی کے ایک بیان سے مکہ کی قدامت پر جاہلی نقطۂ نظر سے بھی روشنی پڑتی ہے اس عقیدہ کا تمام تر ایک مُشرکانہ وہم ہونا ظاہر ہے تاہم قدامت کی شہادت کا مقصد تو اس سے حاصل ہی ہو جاتا ہے۔

وقد ذھب قوم الی ان البیت الحرام علی مرور الدھور معظم فی سائر الاعصار لانه بیت زحل وان زحل تولاہ وان زحل من شانه البقاء والثبوت فما کان له فغیر زائل ولا دائر عن التعظیم غیر خامل۔
(مروج الذھب الجزء الاول ص ۲۶، مطبوعہ مصر ۱۳۴۶ھ)

ایک گروہ کا خیال ہے کہ بیت الحرام جو اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ہر زمانہ میں معزز رہا ہے وہ اس لئے کہ وہ ستارۂ زحل کا ہیکل ہے اور زحل ہی اس کا مُربی ہے اور زحل کی خصوصیت بقاء و دوام ہے جو چیز بھی اس کے نام پر ہوگی اس میں زوال و تغیر نہیں ہوگا مگر اس کی تعظیم و تکریم ہمیشہ باقی رہے گی۔

۲۰۷ تقدیر کلام یوں ہے۔ مِنْهَا مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ۔

والتقدیر منھا مقام ابراھیم قال الاخفش (قرطبی)

فیه۔ یعنی اس اوّل بیت میں۔

ءَايَٰتٌۢ بَيِّنَٰتٌ۔ کھلے ہوئے توحید الٰہی کے شعائر یا حج کے شعائر۔

والمراد بالآیات شعائر الحج (کبیر)

مقام ابراھیم پر حاشیہ سورۂ بقرہ (پ ۱) کے رکوع ۱۲ میں گزر چکا ہے۔
بیت سے یہاں مراد خانۂ کعبہ نہیں سارا حرم شریف ہے مقام ابراہیم کے نام سے جو پتھر رکھا ہوا ہے وہ خانۂ کعبہ کے اندر نہیں باہر حرم میں ہے۔
المراد بالبیت ھنا الحرم کله لان ھذہ الآیات موجودۃ فی الحرم ومقام ابراھیم لیس فی البیت انما ھو خارج البیت (جصاص)

۲۰۸ (شریعت الٰہی کی نظر میں)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى

آپ کہئے کہ اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی نشانیوں سے کفر کر رہے ہو۔ درانحالیکہ اللہ تمہارے کرتوتوں کا

مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ

گواہ ہے ۲۱۱ آپ کہئے کہ اے اہل کتاب! جو ایمان لا چکا اسے تم کیوں اللہ کی راہ سے ہٹا رہے ہو اس (راہ) میں

اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کجی نکال نکال کر درآں حالیکہ تم (خود) گواہ ہو اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ۲۱۲

آمنا پر حاشیہ سورۂ بقر (پ ۱ کے رکوع ۱۶) میں گزر چکا۔

۲۰۹ (بہ لحاظ زاد سفر و امن راہ وغیرہ)

استطاع الیہ سبیلا۔ استطاعت سبیل سے مراد وہاں تک پہنچ جانے کے ذرائع و اسباب ہیں۔

استطاعة السبیل الیہ ھی امکان الوصول الیہ (جصاص) استطاعة السبیل الی الشیء عبارۃ عن امکان الوصول الیہ (کبیر)

استطاعت سبیل کی تفصیل و تشریح، فقہ کا موضوع ہے۔

حج البیت۔ حج و فرضیت حج پر حواشی پارۂ دوم کے وسط میں گزر چکے۔

علی الناس میں علیٰ شدت تاکید کے لئے ہے۔

ھی من اوکد الفاظ الوجوب عند العرب فاذا قال العربی لفلان علیّ کذا فقد وکّدہ و اوجبہ (قرطبی)

۲۱۰ (سو وہ سیاہ بخت اپنا نقصان آپ کرے گا، اللہ تعالیٰ کو کیا نقصان پہنچا سکے گا)

اللہ تعالیٰ کی صفت غنا کا اثبات ان مشرک قوموں کے رد میں ہے جن کے دیوی دیوتاؤں کا وجود ان کے پجاریوں ہی کے دم سے قائم ہے اور وہ دیوتا اپنے کھانے پینے تک کے لئے اپنے پجاریوں کے محتاج رہتے ہیں۔

۲۱۱ (اور اس حاضر و ناظر، ہمہ بیں، ہمہ داں حاکم کے آگے کوئی حیلہ بہانہ نہ چل سکے گا)

اھل الکتاب سے اشارہ خاص طور پر یہود کی جانب ہے جو مسلمانوں کو طرح طرح بہکاتے رہتے تھے۔

تکفرون بآیات اللّٰہ۔ آیات اللہ سے مراد خاص طور پر نبوت محمدی کے شواہد و دلائل ہیں اور کفر سے مراد نبوت محمدی سے انکار

المراد من آیات اللّٰہ الآیات التی نصبھا اللّٰہ تعالیٰ علی نبوۃ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام والمراد بکفرھم بھا کفرھم بدلالتھا علی نبوۃ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ (کبیر)

مشرکوں کو بار بار یہ جتلانے اور یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ اللہ صرف موجود ہی نہیں بلکہ ذرہ ذرہ سے باخبر بھی ہے مشرکوں کے دیوتاؤں کی طرح بے خبر ناقص العلم اور گم سم نہیں۔

۲۱۲ (سو اس کی گرفت اور عذاب سے اپنے کو باہر نہ سمجھو)

تصدون عن سبیل اللّٰہ۔ یہود خود تو اسلام سے منکر تھے ہی اب ان کی جرأتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تُطِيعُواْ فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلْكِتَٰبَ

اے ایمان والو اگر تم ان لوگوں میں سے کسی گروہ کا کہا مان لوگے جنھیں کتاب دی جا چکی ہے تو وہ تمھارے ایمان

يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ ﴿١٠٠﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ

لانے کے پیچھے تمھیں کافر بنا چھوڑیں گے ۲۱۳ اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو درآنحالیکہ

تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُۥ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِٱللَّهِ

تمھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تمھارے درمیان اس کے رسول موجود ہیں ۲۱۴ اور جو کوئی

فَقَدْ هُدِىَ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾ ع

اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے وہ ضرور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے ۲۱۵

طرح طرح کے مکروفن سے دوسروں کو بھی دینِ حق سے ہٹانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

تبغونها عوجا۔ یہود مسلمانوں کے آپس میں طرح طرح کی مخفی فتنہ انگیزی اور مفسدہ پردازی کرتے رہتے تھے کہ اگر اور کچھ نہیں بن پڑتا تو یہی ہو کہ آپس ہی میں کٹ کٹ کے تباہ ہو جائیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مجمع میں جہاں مدینہ کے دونوں مشہور اور جنگجو قبیلوں اوس اور خزرج کے مسلمان جمع تھے، ایک یہودی شماس بن قیس نے ان کی عہد جاہلیت کی مشہور لڑائی جنگ بعاث کے پرجوش جنگنامہ کے اشعار پڑھوا دیئے، دلوں میں گزشتہ عداوتوں کی یاد تازہ ہو گئی اور فریقین قدرۃً بھڑک اٹھے اور عین موقع پر اگر رسول اللہ صلعم خود تشریف نہ لے آتے تو خانہ جنگی شروع ہی ہو چکی ہوتی۔

تبغونها میں ضمیر مونث غائب سبیل کی طرف ہے۔

الهاء فی تبغونها عائدة الی السبیل (کبیر)

وانتم شهداء۔ یعنی تمھارا ضمیر خود گواہی دے رہا ہے کہ اسلام دینِ حق ہے۔

۲۱۳ (عقیدۃً نہ سہی عملاً سہی، تو یہ عملی ارتداد بھی کیا کم ہے)

ان تطیعوا۔ یعنی اگر اپنے عقائد و اعمال میں ان لوگوں سے متاثر ہونے لگوگے۔

فریقا من الذین اوتوا الکتب۔ یہ نام کے تو اہلِ کتاب ہیں لیکن تُلے ہوئے ہیں عداوتِ اسلام پر۔

اہلِ کتاب کا فروں کی مخالطت، مجالست اور خلا ملا بڑھانے سے ممانعت کا صاف اشارہ آیت سے نکل رہا ہے۔

اور یہ حکم جب کتابی کافروں سے متعلق ہے تو مشرکوں، ملحدوں کے تسلط اور ان کے عقیدوں کے تاثر کے احکام تو ظاہر ہی ہیں۔

۲۱۴ مطلب یہ ہے کہ تمھارے لئے دینِ حق سے ارتداد کی گنجائش ہی کب ہے جبکہ تم میں قرآن اور حضرت رسول موجود مجسم ہیں

ذالک لان تلاوة آیات الله علیهم حالا بعد حال مع کون الرسول فیهم الذی یزیل کل شبهة ویقرر کل حجة کالمانع من وقوعهم فی الکفر (کبیر)

ع ۱۰

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے ۲۱۶ اور جان نہ دینا بجز اس حال کے کہ

مُّسۡلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُواْۚ وَٱذۡكُرُواْ

تم مسلم ہو ۲۱۷ اور اللہ کی رسّی سب مل کر مضبوط تھامے رہو اور باہم نااتفاقی نہ کرو ۲۱۸ اور اللہ کا

نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءً فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ

یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ جب تم (باہم) دشمن تھے تو اس نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی ۲۱۹

کیف تکفرون۔ یہ کفر سے مراد اعمالِ کفر کی بازگشت ہے اور کیف اظہارِ تعجب کے لئے ہے۔

قاله تعالى على جهة التعجب (قرطبی) قیل المراد بکفرهم فعلهم افعال الكفر (روح)

ایاتُ اللہِ۔ یعنی قرآن کی آیتیں اور قرآن تمہارے درمیان موجود و محفوظ ہے۔

وفیکم رسولہ۔ یعنی سرِدست تو وہ بنفسِ نفیس تشریف فرما ہیں، ہر شبہ مٹا سکتے اور راہ بتا سکتے ہیں، باقی ان کے بعد ان کے سنن و آثار یہی کام دیں گے۔

قیل الخطاب لجميع الامة لان آثاره وسننه فيهم وان لم يشاهدوه (بحر)

۲۱۵ یہ صراطِ مستقیم یا سیدھی راہ دنیا میں فلاحِ کامل کی ہے اور آخرت میں جنت کی۔

فقد هُدِیَ۔ یعنی اللہ سے تمسک کرتے رہو، یہ راہِ راست ضرور ہی مرتب ہو کر رہے گی۔

۲۱۶ (تمہاری طاقت اور استطاعت کے لحاظ سے)

ورنہ حق تعالیٰ سے اس کے مرتبہ کے لائق خشیت بھلا کون بشر اختیار کر سکتا ہے۔

والمعنى حق تقاته ما استطعتم (قرطبی)

۲۱۷ یعنی جیو تو قانونِ تقویٰ الٰہی کے ماتحت اور مرو تو قانونِ اسلام کے مطیع، زندگی اور موت دونوں کی منزلوں سے مسلمان کو اللہ کا تابع فرمان ہو کر ہی گزرنا ہے ـــ اعتبار انجام و خاتمہ ہی کا ہوتا ہے پس بندے کو زندگی ایسی ہی بسر کرنا چاہئے کہ موت بھی آئے تو اسلام ہی پر آئے۔ آیت کا مقصود دینِ اسلام پر استقامت و دوام کی تاکید ہے۔

فمعناه على الجملة استمروا على الاسلام وحافظوا على اعماله حتى الموت (المنار)

۲۱۸ اس تعلیم کے ایک عملی پہلو کا اعتراف ایک غیر مسلم کی زبان سے:۔

"اسلام نے ان قبیلوں کو متحد کر دیا جو اس وقت تک برابر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔" (آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام ص ۴۳)

حبل اللہ۔ محاورۂ عربی میں حبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔

يستعار الحبل للعهد (روح) واستعير للوصل ولكل ما يتوصل به الى شیء (راغب)

یہاں مراد شریعتِ اسلامی یا قرآن ہے، متعدد قول نقل ہوئے ہیں اور وہ سب متقارب ہیں۔

فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

سو تم اس کے انعام سے (آپس میں) بھائی بھائی بن گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اُس نے

فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾

تمہیں اُس سے بچا لیا ۲۲۰ اسی طرح اللہ اپنے احکام کھول کر سناتا رہتا ہے تاکہ تم راہ یاب رہو،

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

اور ضرور ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾

اور بدی سے روکا کرے اور پورے کامیاب یہی تو ہیں ۲۲۱

قال ابن مسعود حبل الله القرآن و رواه علی وابو سعید الخدری عن النبی صلعم وعن مجاهد وقتادة مثل ذالک (قرطبی) حبل الله هو القرآن كما ورد فی الحدیث الصحیح عن ابن مسعود وروی ابن ابی شیبة وابن جریر عن ابی سعید مرفوعاً (المنار) العهد او القرآن او الدین او الطاعة او اخلاص التوبة او الجماعة او اخلاص التوحید او الاسلام اقوال للسلف یقرب بعضها من بعض (بحر)

جمیعاً۔ یعنی اُمت مجموعاً بھی اور افرادِ اُمت بھی۔

۲۱۹ (اور سب کو رشتۂ اسلام میں متحد و منسلک کردیا۔)

نعمة الله اس انعام کے تحت میں علاوہ فلاحِ اُخروی کے اتحادِ قومی کی فلاحِ دنیوی بھی شامل ہے اتحادِ امت بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

اذ کنتم اعداءً۔ ظہورِ اسلام سے قبل یعنی زمانۂ جاہلیت میں عرب قبائل کی باہمی دشمنی اور جنگجوئی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی لڑائی بات بات میں چھڑ جاتی تھی جو لڑائیاں تاریخی روایات میں محفوظ رہ گئی ہیں انہیں کی تعداد ... ۱۷ ہوتی ہے۔

۲۲۰ (دینِ اسلام اور شریعتِ اسلامی مرحمت کرکے)

دنیا میں یوں انقلاب عظیم برپا کردینا اسلام کا معجزہ ہی تھا، اس کا اعتراف آج فرنگی محققین بھی کررہے ہیں ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

فاصبحتم بنعمته اخواناً۔ جس طرح عرب قبل اسلام کی عداوت حدِ ضرب المثل تک پہنچی ہوئی تھی اُسی طرح بعد اسلام عرب کی آپس کی محبت یگانگت، اخلاص بھی بے نظیر رہا جہاں مکی مکی کا اور مدنی مدنی کا دشمن تھا، وہاں اسلام نے مکہ کے مہاجرین اور مدینہ کے انصار کو ایسا شیر و شکر کرادیا کہ دونوں واقعی آپس میں بھائی بھائی معلوم ہونے لگے ان سائیکلوپیڈیا برٹانیکا، اور مورخ گبن دونوں کے صفحات میں اس کا اعتراف موجود ہے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

علیٰ شفا حفرة من النار۔ ذکر زمانۂ قبل اسلام کا ہے کہ اس وقت عقائد و اعمالِ مشرکانہ کی بنا پر اہل عرب

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ

اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے بعد اس کے کہ انہیں نشان پہنچ چکے تھے باہم تفرقہ کر لیا اور مختلف ہو گئے [۵۲۲]

وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ

عذاب عظیم انہیں کو تو ہونا ہے — اس روز (جس روز) بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض

فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

چہرے سیاہ ہوں گے، پھر جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم ہی کافر ہو گئے تھے اپنے ایمان کے بعد [۵۲۳]

دوزخ کے کنارے تک پہنچ ہی چکے تھے.

۵۲۱ کسی درجہ میں اور ایک چھوٹے پیمانہ پر تو یہ فرض ہر فرد امت کا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ایک مستقل جماعت خاص اسی کام کے لئے ہو، اس کا کام ہی یہی ہو کہ خلق کو دعوت خیر، بمعروف (بھلے کاموں) کی طرف بلائے اور منکر (برے کاموں) سے روکے.

اُمّة یہ بھی کمال رحمت اور ضعف بشری کی انتہائی رعایت ہے کہ ساری امت کے بجائے اس فریضہ پر ایک مخصوص جماعت ہی کو مامور کیا گیا، ورنہ اس فریضہ کی ادائی کے لئے جن اوصاف اور شرائط کی ضرورت ہے کیا عجب کہ بہتوں کو وہ سخت گراں گزرتے.

منکم مِن کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ بیانیہ ہے (کل کے معنی میں) یا تبعیضیہ ہے (بعض کے معنی میں).

ذهب مفسرنا الجلال الى الاول لان ذلك مرحق لما به وسعه اليه بلسان وغيره وقال بعضهم بالثاني (احكام)

۵۲۲ (توحید، رسالت، وحی، جزا و سزا وغیرہ اصولی و بنیادی عقائد کے باب میں)

کالذین. مراد سابق اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں.

یعنی الیہود والنصاریٰ فی قول جمہور المفسرین. (قرطبی)

تفرقوا واختلفوا یعنی از راہ نفسانیت و شرارت وحدت دینی کو پارہ پارہ کر دیا، اور اپنے الگ الگ مذہب گڑھ لئے. مسائل و جزئیات احکام میں اختلاف جو اخلاص نیت کے ساتھ اجتہاد کی بنا پر ہو، وہ اسلام میں ہرگز ممنوع نہیں بلکہ وہ تو امت کے حق میں رحمت ہے ــ اختلاف ماحول و اختلاف مذاق و طبیعت کی بنا پر کسی کو کسی مسلک میں آسانی معلوم ہوتی ہے اور کسی کو کسی میں.

البینات. اس کے تحت میں احکام، دلائل، معجزات سب آگئے.

۵۲۳ یہ خطاب اہل دوزخ سے تو بہرحال ہو گا، گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ ان سب سے ہو گا یا ان کے صرف بعض گروہوں سے؟ ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب منافقین سے ہو گا اور ایمان سے یہاں مراد اظہار ایمان ہے.

هم المنافقون. (ابن جریر عن الحسن)

ایک قول ہے کہ مخاطب اہل کتاب ہیں اور حجت ان پر تمام کی جا چکی کہ تمہاری کتابوں میں نبی آخر الزمان کا ذکر پوری طرح موجود ہے اور تم پھر گئے.

المراد اهل الكتاب (كبير عن عكرمه والاصم والزجاج)

بعض اہل نظر نے ترجیح اسی قول کو دی ہے.

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ

سو عذاب چکھو اپنے اپنے کفر کے پاداشں میں ۔ اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ

وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ

اللہ کی رحمت میں ہوں گے ۲۲۴ ؎ اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں

نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ ﴿١٠٨﴾

ہم انہیں تم کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ مخلوقات پر ظلم نہیں چاہتا ۲۲۵ ؎

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿١٠٩﴾ ع ١١ / ٢

اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف (سارے) امور لوٹائے جائیں گے ۲۲۶ ؎

والظاهر من السياق والسباق ان هؤلاء اهل الكتاب (روح)

ابن جریر نے بعض تابعین سے استناد کرکے یہ تحقیق اختیار کی ہے کہ خطاب سارے کافروں کے لئے عام ہے اور جس ایمان کا بیان ذکر ہے وہ اظہار ایمان عالم ارواح میں عہد الست کے وقت کا ہے۔

هو الايمان الذى كان قبل الاختلاف فى زمان آدم (ابن جرير عن ابى بن كعب) عنى بذالك جميع اهل الكتاب (ابن جرير)

تبیض وجوہ۔ یوم حشر تو کشف حقائق کا وقت ہوگا ضرور ہے کہ اہل حق کے چہرے اس دن انوار حق سے چمکتے جگمگاتے نظر آئیں۔ تسود وجوہ۔ کشف حقائق کے وقت یہ بالکل قدرتی ہے کہ اندر کی سیاہیاں اور باطن کی کدورتیں نکل کر اہل باطل کے چہروں پر چھا جائیں۔

عربی محاورہ میں ابیضاض وجہ اور اسوداد وجہ سے مراد علی الترتیب محض مسرت و غم بھی ہو سکتی ہے۔

عبر عن الفضل والكرم بالبياض ..... فابيضاض الوجوه عبارة عن المسرة واسودادها عن الغم (راغب)

قيل ان بياض الوجوه وسوادها هما من باب الحقيقة ..... وقيل وهو الراجح انه من باب الكناية (الخ)

۲۲۴ ؎ اور اسی محل رضا و محل رحمت کا نام جنت ہے۔ جنت کی ایک ایک نعمت کو قرآن مجید نے محل ترغیب میں ذکر کیا ہے وہ رضائے الٰہی سے الگ کوئی چیز نہیں جیسا کہ جاہل صوفیہ اور گستاخ شاعروں کے کلام سے مترشح ہوتا ہے۔

۲۲۵ ؎ (اس لئے اس کے فیصلے ہمیشہ عادلانہ اور حکیمانہ ہوتے ہیں)

اسلام کا خدا تمام تر رحیم ہے، عادل ہے، شفیق ہے۔ مشرک قوموں کے دیوی دیوتاؤں کی طرح ظالم و خونخوار نہیں ہے۔ قرآن مجید کو بار بار خداوند تعالیٰ کی تنزیہ کا اثبات ان صفات ذمیمہ سے کرنا ضروری ہو گیا تھا، اور توراۃ اور توریت تک کے خدا میں صفات قہری کہیں زیادہ زور و قوت کے ساتھ جلوہ گر نظر آ رہے ہیں۔

بالحق یعنی بالکل صحیح جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

اى بالصدق (قرطبى)

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ

تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے ۲۲۷ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ

روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۲۲۸ اور اہل کتاب بھی اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت خوب ہوتا ۲۲۹

۲۲۶ اور کوئی دیوی دیوتا نہ اس مرجعیت احدیہ میں اس کا شریک و سہیم ہے، نہ آسمان و زمین کسی جزو کی ملک و تصرف میں) جاہل قوموں کی ان گمراہیوں کا ذکر پچھلے حاشیوں میں بار بار آچکا ہے۔

مرجع الاحدیہ تاکید اس امر کی ہے کہ آخری فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کا ناطق ہوگا، کسی کو بھی اس میں دخل دینے کی مجال نہیں۔

۲۲۷ یعنی تم اس لئے بنائے گئے ہو کہ لوگ تمہارے نقش قدم پر چلیں، تم ساری دنیا کے لئے ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے ہو۔ خطاب امت محمدی اور ملت اسلامی سے ہے۔

کنتم کان یہاں یا تو زائد ہے یا تامہ استعمال ہوا ہے اور اگر ناقصہ ہے جب بھی مراد دوام نسبت ہے۔

قیل: ھی کان التامۃ والمعنی خلقتم ووجدتم خیر امۃ، وقیل کان زائدۃ والمعنی انتم خیر امۃ (قرطبی) بل المراد دوام النسبۃ (بحر)

۲۲۸ (پورا پورا جیسا کہ حق ہے ایمان باللہ کا)

آیت کے اس جزو میں امت اسلامی کی اعتقادی، اخلاقی و عملی زندگی کے کامل و مکمل ہونے کا پورا نقشہ آگیا، مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرو، تم توحید کے امانت دار ہو، زمین پر اللہ کے نائب و خلیفہ ہو، بطور اس کی پولیس کے ہو، الٰہی قانون کے نفاذ و تحفظ کے لئے دنیا کے نظام عدل کو برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تمہاری زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ کو چلاؤ، نظام حق کے ایک ایک کل پرزہ کو درست رکھو اور نظام باطل کا نہ چلنے دو، ظلم ہوتا اگر اس ذمہ دار فعال (اگرچہ مختصر) جماعت کو جدال و قتال کی آزادی کسی حال میں نہ ملتی، بلا اجازت جہاد بلا اجراء حدود و تعزیرات اس قوم پر ذمہ داریاں ڈال دینے کے معنی یہ ہوتے کہ ہاتھ پیر باندھ کر حکم دریا میں تیرنے کا دیا جا رہا ہے۔

کیا تماشہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دیں تو وہ ملک کے محسن، ہندوؤں میں کمسنی کی شادیوں کے دستور کو روک دیں تو اس کا شکریہ واجب، لیکن اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیارے اگر یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانون الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امن عالم کو غارت کر کے رکھ دینے والوں کی دار و گیر کریں تو روشن خیالی کے جبین تحمل پر شکن آجائے اور تہذیب کے پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگیں!

تنہون عن المنکر۔ منکر کے تحت میں آج کے شراب خانے اور تھیٹر سینما اور کنسرٹ ہال ناچ گھر اور میوزک کلب اسکول آف آرٹ اور تصویر خانے سب آجاتے ہیں۔ آیت سے ظاہر ہے کہ اس امت کی خیریت و افضلیت اسی وقت تک ہے جب تک وہ ان صفات کی حامل ہے یعنی ایمان باللہ میں مضبوط، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (ایجابی و سلبی دونوں قسم کی اخلاقی خوبیوں) پر قائم ہے — حضرت عمرؓ کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ جو کوئی اس امت میں داخل ہونے کی تمنا رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اللہ کی بتائی ہوئی شرط پوری کرے

مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنۡ يَّضُرُّوۡكُمۡ اِلَّاۤ اَذًى ؕ

ان میں سے (کچھ تو) ہیں ایمان لائے ہیں مگر اکثر ان میں سے نافرمان ہیں ۲۳۰ وہ تم کو بجز خفیف اذیت کے ہرگز

وَاِنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ يُوَلُّوۡكُمُ الۡاَدۡبَارَ ثُمَّ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتۡ

کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے ۲۳۱ اور اگر وہ تم سے مقابلہ کریں گے تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے ۲۳۲ پھر ان کو مدد بھی

عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ

نہ پہنچ سکے گی ۲۳۳ ان پر پیس دی گئی ہے ذلت خواہ کہیں بھی وہ پائے جائیں سوا اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو

مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ

یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے ہیں ۲۳۴ اور ان پر

عن عمر بن الخطاب قال من سرہ ان یکون من ھذہ الامۃ فلیود شرط اللہ فیھا (ابن جریر)

اور جس کسی میں یہ صفات نہ ہوں، وہ بس انھیں اہل کتاب جیسا ہے جن کی ہجو و مذمت یہاں آئی ہے۔

ومن لم یتصف بذالک اشبہ اھل الکتاب الذین ذمھم اللہ (ابن کثیر)

۲۲۹ (حالاً بھی اور قالاً بھی، فی الفور بھی اور بہ لحاظ انجام کار بھی)

یہ ایمان لانا تو ان اہل کتاب کا فرض بھی تھا، اور عملی مثال مسلمانوں کی وہ دیکھ بھی رہے تھے۔

۲۳۰ (اور حدِ عبودیت سے قدم باہر رکھنے والے)

فاسق یہاں کافر کے معنی میں ہے یعنی حدِ عبودیت سے بالکل باہر نکل جانے والے۔

کامل فی فسقہ متمرد فی کفرہ (بحر) المتمردون فی الکفر (بیضاوی) عبر عن الکفر بالفسق (روح)

ای الکافرون (معالم) الضلالۃ والکفر والفسق والعصیان (ابن کثیر)

منھم المؤمنون۔ اس گروہ میں عبد اللہ بن سلام یہودی کی طرح دوسرے اہلِ کتاب بھی داخل ہیں جو رسول اللہ صلعم ہی کے زمانے میں ایمان لے آئے تھے۔

۲۳۱ اشارہ ہے یہود کی طرف جن کا خاص مرکز مدینہ اور حوالی مدینہ میں بڑا زور و غلبہ تھا۔ قرآن نے وقوع سے بہت قبل پیشگوئی کر دی کہ یہود اپنے بڑے بڑے مضبوط قلعوں کے باوجود اور بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود مسلمان کو ہرگز کوئی قابلِ ذکر نقصان نہ پہنچا سکیں گے

اذیٰ۔ ضرر کے مقابلہ میں بہت ہلکی اور چھوٹی چیز ہے۔

ای ضررًا یسیرًا لطعن وتھدید (بیضاوی) الاذی بمعنی الضرر الیسیر۔ (روح)

۲۳۲ یعنی اگر وہ اتنی ہمت کر بھی جائیں کہ تم سے مقابلہ و مقاتلہ کو آئیں تو ہرگز غلبہ نہ پا سکیں گے بلکہ الٹی شکست کھا کر بھاگ جائیں گے پیشین خبری ایک نہیں مجموعہ ہے کئی پیش خبریوں کا، اور سب کی سب ظاہری قرائن و قیاسات کے خلاف اور آخر یہی پیش خبریاں صحیح نکلیں۔

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ

پستی بھی دی گئی، یہ (سب) اس سبب سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کے منکر ہوجاتے تھے، اور نبیوں کو بلاوجہ

الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ۚ

قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ (سب) اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے نکل جاتے تھے ۲۳۵ سب یکساں نہیں ۲۳۶

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿١١٣﴾

انھیں اہل کتاب میں ایک جماعت قائم ہے، یہ لوگ اللہ کی آیتوں کو اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں ۲۳۷

بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع، یہود خیبر سب کے باب میں اس جزم کے ساتھ بجز خدائے علیم و خبیر کے اور کون جرأت بھی اس پیش خبری کی کرسکتا تھا

۲۳۳ ایک اور پیش خبری، یہاں یہ بھی بتادیا گیا کہ خود مظفر و منصور ہونا الگ رہا، عرب کے جن مشرک قبیلوں کی حمایت کا غرہ ان یہود کو ہے ان میں سے کوئی ان کی مدد کو بھی تو نہ آئے گا اور نہ مدینہ کے منافقین ان کے کام آسکیں گے۔

۲۳۴ بنی اسرائیل کی مغضوبیت اور پستی و ذلت پر حاشیے پارۂ اول رکوع ۷ کے ذیل میں مفصل گزر چکے۔

ضربت علیھم الذلة یعنی ان کی جانوں، ان کے مالوں، ان کی عزتوں سب کی بے وقعتی اور ناقدری خلق اللہ کے دل میں پیدا ہوگئی ہے اور تاریخ کی شہادت ہے کہ یہود کی یہ خستہ حالی اور شکستہ پائی نہ صرف زمانۂ نزول تک ہی بلکہ اس کے بعد بھی صدہا سال تک اسی طرح قائم رہی

این ما ثقفوا چنانچہ ابھی بیسویں صدی عیسوی کے ہی ثلث اول تک یہود کی جو گت جرمنی میں، ہنگری میں، اٹلی میں، زیکوسلاویکا میں اور دوسرے ملکوں میں باوجود ان کی خوش حالی و زرداری کے بن چکی ہے وہ بجائے خود اس آیت کی ایک تفسیر ہے۔

حبل من اللہ سے مراد ان کی ایسی آبادی ہو سکتی ہے جسے خود شریعت الٰہی نے قتل، ہلاکت اور تعزیری انتقامی کارروائیوں سے مستثنیٰ رکھا ہے مثلاً ان کے بچے، ان کی عورتیں، ان کے گوشہ نشین زاہد، درویش وغیرہ۔

حبل من الناس. مراد ان کی وہ جماعتیں ہو سکتی ہیں جو معاہدوں کے ذریعہ سے امن حاصل کرلیتی ہیں۔

حبل. کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں، مراد عہد و ذمہ سے ہے۔

الحبل العهد والذمة والامان (لسان)

وحبل. و یہاں عطف کے لئے نہیں بلکہ او کے معنی میں ہے۔

۲۳۵ یعنی حد و عبدیت و طاعت سے۔ یہود کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کی داستان سے عہد عتیق، عہد جدید اور خود یہود کی لکھی ہوئی تاریخیں سب بھری پڑی ہیں، وعیدوں کی اس سختی سے بظاہر ایسا متبادر ہوتا ہے کہ جیسے یہ مقہوریت اسرائیلیوں یا یہود کے حق میں ہمیشہ کے لئے مقدر ہوگئی۔

کانوا یکفرون و کانوا یعتدون. دونوں موقعوں پر فعل کے ساتھ کانوا لانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی استثنائی یا اتفاقی واقعہ ان کی تاریخ میں نہ تھا، بلکہ کفر و عدوان جیسے ان کی قومی خصلت بن گئے تھے، ان کی سرشت میں داخل ہوچکے تھے، وہ ان چیزوں کے عادی ہوچکے تھے۔

يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ہیں اور اچھی باتوں کی طرف دوڑتے ہیں یہی لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں ۲۳۸ھ

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور جو بھی نیک کام یہ کریں گے اس سے ہرگز محروم نہ کیے جائیں گے، اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے ۲۳۹ھ

عَصَوْا۔ نافرمانی ان لوگوں نے اپنے ہی خدا کے رسولوں کی نہیں کی بلکہ آخر میں خود خاتم رسل کی بھی کی۔

بغیر حق۔ یعنی انبیا کو خود اپنے معیار عدل وقانون کے بھی خلاف ہی قتل کرتے تھے۔ مسکنت، قتل انبیاء،

کفر بآیات اللہ وغیرہ پر مفصل حاشیے پارہ اول رکوع ۶ کے ذیل میں گزر چکے

۲۳۶ھ (اپنی حق ناشناسی اور اسلام سے تعلق اپنے طرز عمل کے لحاظ سے)

لیس اھل الکتاب مستویا (بحر) والضمیر لاھل الکتاب (بیضاوی)

اوپر جو کچھ ذکر ہوا، اہل کتاب کی اکثریت کا تھا، باقی ان میں سے بعض بعض حق شناس، انصاف دوست بھی تھے،

اور یہ لوگ بالآخر مشرف بہ اسلام ہو کر رہے۔

۲۳۷ھ یعنی نماز پڑھتے رہتے ہیں۔

والمراد ھم یصلون (روح) ای یصلون، عن الفراء والزجاج (قرطبی)

نماز شب کے فضائل آیت سے ظاہر ہیں۔

اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ۔ یہ وہ جماعت تھی جو دین حق پر قائم وثابت رہی۔

ای المستقیمة العادلة (بیضاوی) انھا ثابتة علی التمسک بالدین الحق ملازمة له (کبیر)

آیات اللہ۔ یعنی قرآن کی آیات۔

والمراد یقرءون القرآن (روح)

مفسرین نے یہاں عبداللہ بن سلامؓ، ثعلبہؓ بن سعید، اسیدؓ بن سعید، اسد بن عبیدؓ وغیرہم کے نام درج کیے ہیں

جو یہودیت سے نکل کر رسول اسلامؐ پر ایمان لائے تھے۔

۲۳۸ھ قرآن مجید جنھیں صالح قرار دیتا ہے ان کے اوصاف وخصوصیات یہاں کس جامعیت وایجاز کے ساتھ ارشاد

کر دیئے گئے ہیں پہلی بات یہ بتائی کہ وہ ایمان میں کامل ہوں گے، اور جو کچھ بھی خرچ کریں گے مقصد صحیح کے ساتھ اور راہ حق میں

کریں گے دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ وہ لوگ نہ صرف خود ہی ایجابی وسلبی ہر حیثیت سے اخلاق اور پاکیزہ کرداری کے پتلے

ہوں گے بلکہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر لائیں گے اور لگائیں گے اور نیکیوں کی طرف دلی شوق اور رغبت کے ساتھ بڑھیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ

بے شک جن لوگوں نے کفر (اختیار) کیا ہرگز ان کے ذرا بھی کام اللہ کے مقابلے میں نہ ان کے مال آئیں گے نہ ان کی

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ

اولاد۔ اور یہی لوگ تو دوزخ والے ہیں، اس میں (ہمیشہ) پڑے رہیں گے ۲۴۰ یہ جو کچھ

مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ

اس دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے ایک ہوا ہے جس میں سخت

أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ

سردی ہے (اور) وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو لگ جائے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے پھر وہ (ہوا) اس

اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٧﴾

(کھیتی) کو برباد کر دے تو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ۲۴۱

یسارعون فی الخیرات۔ یعنی نیکیوں کی طرف بے دلی اور بدشوقی کے ساتھ گویا بار اور تھک کر نہیں بلکہ جوش شوق واشتیاق، چاؤ اور رغبت کے ساتھ لپکیں گے۔

المسارعة فی الخیر ناشئة عن فرط الرغبة (بحر)

من الصلحین کے معنی مع الصلحین کے بھی کئے گئے ہیں (قرطبی)

۲۳۹ (اور چونکہ یہ پرہیزگار ہیں اس لئے انھیں بھی خوب جانتا ہے)

یہ خیال نہ گزرے کہ کوئی مستحق اللہ تعالیٰ کے علم میں آجانے سے رہ جائے گا، غیر قوموں کے عقائد کی تردید کے لئے اس جزو کا اضافہ فرمادیا تھا فلن یکفروہ۔ یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ جب ماضی خراب رہ چکا ہے تو اب نجات و مغفرت کی امید ہی کیا، اور اب ایمان و حسن عمل سے حاصل کیا ہو، غیر مذہب والوں نے ایسے ہی عقائد گڑھ رکھے تھے اس لئے تنبیہ ضروری تھی۔

یکفروہ۔ میں ضمیر عمل خیر کے اجر و ثواب کی جانب ہے اور کفر سے مراد حرمان یا محرومی ہے۔

ای لن تمنعوا ثوابہ وجزاءہ (کبیر) فکانہ قیل فلن تحرموہ بمعنی فلن تحرموا جزاءہ (کشاف)

۲۴۰ (اور ان کی جہالتوں اور خام خیالیوں کا بطلان اس روز ان پر پوری طرح واضح ہو کر رہے گا)

اولٰئک سے مراد ایمان سے محروم کفار ہیں اور چونکہ اس لفظ سے حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اہل سنت نے اس آیت سے معتزلہ کے خلاف استدلال کر کے کہا ہے کہ خلود نار کی سزا صرف کافروں منکروں کے لئے ہے، گنہگار مومنین کے لئے نہیں۔

فلما افادت ھٰذہ الکلمة معنی الحصر ثبت ان الخلود فی النار لیس الا للکافر۔ (کبیر)

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ

اور تمہارے دکھ پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں، بغض تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں

صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

وہ اور بھی بڑھ کر ہے ۲۲۳ ہم تو تمہارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کر چکے ہیں ۲۲۴

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ

اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو، تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو اور یہ تم سے ذرا محبت نہیں رکھتے،

كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ

تم کتاب (آسمانی) پر اس کے کل پر ایمان رکھتے ہو ۲۲۵ اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر

وفی ھذہ الآیة دلیل علی ان شہادة العدو علی عدوہ لا تجوز وبذالك قال اهل المدینه والحجاز وروی عن ابی حنیفة جواز ذالك۔ (قرطبی)

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے آیت کے حکم پر عمل میں سستی اور مداہنت شروع سے برتنی شروع کر دی اور ابھی رسول اللہ صلعم کے زمانہ کو چند صدیاں بھی نہیں ہونے پائی تھیں کہ سلطنت کے کاروبار میں علم کھلا مسیحیوں، مجوسیوں وغیرہ کو شریک کیا جانے لگا۔ امام قرطبی کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے، حسرت، قلق اور درد کے لہجہ میں لکھتے ہیں:۔

وقد انقلبت الاحوال فی ھذہ الازمان باتخاذ اھل الکتاب کتبة وامناء وتسودوا بذالك عند الجھلة الاغبیاء من الولاة والامراء۔ (قرطبی)

یہ حال جب اس زمانہ کا تھا تو آج چودھویں صدی ہجری میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں منکروں کا غلبہ و تسلط مسلمانوں پر نمایاں ہے صورت حال پر اظہار خیال کن لفظوں میں کیا جائے!

فقہاء مفسرین نے آیت کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ کافر ذمی تک جب جائز نہیں تو ان کے ساتھ تعلق جب تو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہوگی۔

لا خلاف بین علماء نا ان المراد به النهی عن مصاحبة الکفار من اهل الکتاب حتی یمتنع التشبه بهم (ابن العربی)

۲۲۳ یعنی ان کی مخفی عداوت کا درجہ تو اس سے بھی کہیں بڑھا ہوا ہے۔

ودّوا ما عنتم فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے، اس کے اندر گہری تعلیم اس بات کی آگئی کہ کوئی کافرِ معاند مسلمین کا حقیقی دوست اور ہوا خواہ ہو نہیں سکتا۔

بدت البغضآء من افواھھم۔ شدت عداوت میں غیر اختیاری طور پر زبان سے بھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں، اشارہ زیادہ تر یہود مدینہ کی جانب ہے، یہ لوگ اب اپنا بغض اسلام و مسلمانوں سے چھپا بھی نہیں رکھ سکتے تھے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے ظاہر ہی ہو ہی جاتا تھا۔

الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ

(شدت) غیظ سے انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں ۲۴۶ آپ کہہ دیجئے کہ تم غیظ میں مر رہو بے شک اللہ دلوں کی باتوں کو

الصُّدُورِ ﴿۱۱۹﴾ إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ

خوب جانتا ہے ۲۴۷ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پیش آجاتی ہے تو یہ ان لوگوں کو دکھ پہنچاتی ہے اور اگر تم پر

سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ

کوئی بری حالت آپڑتی ہے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں ۲۴۸ اور اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کئے رہو تو تم کو ان کی چالیں

شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی بے شک اللہ ان کے اعمال پر (پورا) احاطہ رکھتا ہے ۲۴۹

ع ۱۲ ۱۱ ۴

۲۴۴ آیت کے معنی دو طرح پر کئے گئے ہیں ایک یہ کہ ان کافروں کے بغض و عداوت کے آثار و علامات تم پر روشن ہوگئے ہیں جن سے تم انہیں فوراً پہچان سکتے ہو۔

ثم بین اللہ تعالیٰ ان اظہار ھذہ الاسرار للمؤمنین من نعمہ علیھم۔ (کبیر)

دوسرے معنی یہ کہ تمہارے لئے ان سے ترکِ موالات کی آیتیں کھول کر بیان کی جاچکی ہیں۔

ای اظھرنا لکم الآیات الدالۃ علی النھی عن موالاۃ اعداء اللہ تعالیٰ ورسولہ (روح) الدالۃ علی موالاۃ المومنین ومعاداۃ الکافرین۔ (بیضاوی)

۲۴۵ یعنی ساری کتبِ الٰہی پر۔

الکتٰب۔ بطور اسمِ جنس استعمال ہوا ہے۔

والکتاب اسم جنس قالہ ابن عباس (قرطبی) بجنس الکتاب کلہ۔ (بیضاوی)

تحبونھم۔ یہ مسلمانوں کی سادہ دلی اور نیک طبعی کا ذکر ہے۔

ولا یحبونکم۔ یہ محبت تو تم سے کیا رکھتے الٹے عداوت رکھتے ہیں اور تمہاری کتاب الٰہی کے منکر ہیں مطلب یہ ہوا کہ تم تو ان کی کتابوں تک پر ایمان رکھتے ہو اور وہ پھر بھی تم سے کسی درجہ میں بھی علاقہ محبت نہیں رکھتے۔

۲۴۶ غصہ سے انگلیاں کاٹ کاٹ کھانا عربی محاورہ میں کنایہ شدید جھنجلاہٹ سے ہے جیسے اردو محاورہ میں "اپنی بوٹیاں نوچنا" "بوٹیاں چبانا" "دانت پیسنا" وغیرہ۔

ذکر منافقینِ مدینہ کا ہے۔

یعنی المنافقین (قرطبی)

۲۴۷ (چنانچہ اس نے تمہارے دلوں کے اندر کے کینہ اور عداوت کو کھول کر بیان کردیا ہے)

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ

اور (وہ وقت یاد کیجئے) جب آپ صبح کو اپنے گھر والوں (کے پاس) سے نکلے مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ

پر لے جاتے ہوئے [۲۵۰] اور اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا جاننے والا ہے [۲۵۱] جب تم سے دو جماعتوں نے خیال کر لیا تھا کہ ہمت ہار دیں [۲۵۲]

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

درانحالیکہ اللہ دونوں کا مددگار تھا [۲۵۳] اور مسلمانوں کو تو اللہ ہی پر اعتماد رکھنا چاہیے [۲۵۴]

موتوا بغیظکم یعنی شدتِ ناکامی و نامرادی میں مر رہو۔ اس لئے کہ جو تمہاری تمنا ہے یعنی اسلام کی مغلوبیت، ہزیمت وہ پوری ہونے کی نہیں۔

۲۴۸ منافقوں کی خباثتِ نفس اور کینہ پروری کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی تکلیف سے خوش ہوتے ہیں اور ان کی خوشی اور خوشحالی سے رنجیدہ۔

حسنۃ۔ مسلمانوں کی اندرونی تنظیم یا کافروں پر ان کا فتح و غلبہ۔

سیئۃ۔ مثلاً کوئی ہنگامی شکست۔

۲۴۹ (اللہ ان کی سزا پر ہر طرح قادر ہے)

وان تصبروا۔ منافقین کے کید و مکر اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا کتنا آسان اور سہل الحصول نسخہ یہاں مسلمانوں کو بتا دیا گیا ہے تم اپنے کام سے کام رکھو اپنی اصلاح میں لگے رہو استقامت علی الحق کا دامن ہاتھ سے نہ دو، کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

وان تصبروا و تتقوا۔ صبر و تقویٰ، ان دو مختصر سے عنوانات کے اندر امت کی ساری تنظیمی جد و جہد و مشغولیت کس ایجاز و جامعیت کے ساتھ آگئی، آیت میں اس کی تعلیم بھی آگئی کہ دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے بہترین حربہ صبر و تقویٰ کا ہے

ھذا تعلیم من اللہ و ارشاد الی ان یستعان علی کید العدو بالصبر و التقوی (مدارک)

۲۵۰ (دامن جبل احد کی طرف اور آپ سب کی جگہیں متعین کر رہے تھے کہ یہاں سوار کھڑے ہوں، یہاں پیادے یہاں تیر انداز وغیرہا) اب کہ جنگ احد کا شروع ہو رہا ہے احد مدینہ منورہ سے شمال کی جانب ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ہے بدر میں شکست کھائے ہوئے مشرکین مکہ جوش انتقام سے دیوانے ہو رہے تھے ہجرت کا تیسرا سال قریب ختم کے تھا اور واقعہ بدر کو ایک سال گزر چکا تھا، کہ مکہ والوں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اب کی تیاریاں بڑے انتظام و اہتمام کے ساتھ اور بہت بڑے پیمانہ پر ہوئی تھیں، قریش کی جمعیت ۳ ہزار کی تھی ان میں ۷۰۰ جوان زرہ پوش تھے، ۲۰۰ سوار اور باقی شتر سوار تھے، قوم اور قبیلہ کے بڑے بڑے سردار سب ساتھ ہوئے بڑی بات یہ کہ عورتیں بھی شریک جنگ ہوئیں ہاتھوں میں باجے لئے ہوئے پرجوش ترانے گاتی جاتی تھیں اور مقتولین بدر کے انتقام پر اپنے عزیزوں، قریبوں کو ابھارتی جاتی تھیں — جنگ میں عورتوں کی

عورتوں کی شرکت آج بیسویں صدی کی "جدت" نہیں جاہلی مشرک قوموں کا پرانا شعار ہے۔

اسلامی فوج اس کے مقابلہ میں کل ایک ہزار تھی اور سامان کی کیفیت یہ تھی کہ علاوہ رسول اللہ (صلعم) کی سواری مبارک کے فوج بھر میں صرف ایک گھوڑا اور تھا۔ اس سے بڑھ کر ستم یہ ہوا کہ صبح سویرے عین اس وقت جب غنیم سامنے نظر آیا اور مسلمان اپنے مقدس امیر الجیش کے ساتھ ابھی نماز ہی میں مشغول تھے، عبداللہ بن اُبی مدینہ کا پرانا اور ذی اثر لیڈر یہ عذر کرکے کہ جب ہماری رائے نہیں سُنی جاتی اور شہر کے اندر ہی محصور ہو کر نہیں لڑا جاتا تو ہم بیکار اپنی جانیں دوسروں کے کہنے پر کیوں دیں اپنے ۳۰۰ ساتھیوں کو لے کر شہر کو واپس چلا گیا، اور اب لشکر اسلام کی کل جمعیت ۷۰۰ کی رہ گئی، ان میں بھی زرہ پوش کل ۱۰۰۔ مقابل فوج تعداد میں چوگنی سے زائد اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی کہیں زیادہ آراستہ!

وادعدوت من اهلك من یہاں عند کے معنی میں ہے اور آنحضرتؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے حجرہ سے برآمد ہوئے تھے۔

کان الخروج من حجرة عائشة (روح) یعنی خرجت بالصباح من منزلك من عند عائشة (قرطبی)

یہ ۷ شوال ۳ ہجری، یوم شنبہ کی صبح کا وقت تھا۔

مقاعد للقتال۔ ترتیب صفوف اور مورچوں کی مناسب موضعیت کی اہمیت جس طرح سکندر و دارا کے زمانہ میں تھی جدید فن حرب میں بھی مسلّم ہے اور ملٹری سائنس کی کتابوں میں "پوزیشن" POSITION کی اہمیت کی تشریح پر صفحے کے صفحے وقف رہتے ہیں، امت کا رہبر کامل، مقدس نبی ہونے کے علاوہ سپہ سالار اعظم کی حیثیت سے بھی بے نظیر تھا۔

TOM ANDRE نامی بیسویں صدی کا ایک فرنگی مورخ اسلام ہے وہ اپنی سوانح محمدی میں آپ کے اس کمال خصوصی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت و شجاعت ہی رکھتے تھے، محمدؐ نے کہنا چاہیے کہ فن حرب کی بھی نئی راہ نکالی، لڑاکوں کی بے دھڑک اور لاتعداد جنگجوؤں کے مقابلہ میں محمدؐ نے خوب دور اندیشی اور سخت قسم کے نظم و انضباط سے کام لیا۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

مولانا شبلی مرحوم نے الفاظ کے ذریعہ سے گویا پورا معرکہ احد کا کھینچ دیا ہے: "آنحضرت صلعم نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا، زبیر بن عوام رسالہ کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں اس لئے پچاس تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں، عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے، قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، اور سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔" (سیرة النبی جلد ۱ ص ۲۷ طبع اول)

۲۵۱ سمیع و علیم کی دونوں صفات کو یاد دلا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین جو کچھ اپنی اپنی جگہ پر کہہ سن رہے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں آ چکا، اور اس موقع پر مخالفین و موافقین دونوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس میں سے کوئی شے اس سے مخفی نہ رہی۔

۲۵۲ (اور جنگ سے الگ ہو بیٹھیں لیکن اس ارادہ پر عمل نہیں کرنے پائیں)

ہمّت۔ همّ کے معنی عربی میں پختہ قصد و عزم کے بھی ہیں اور محض خفیف سے خیال اور شائبہ قصد کے بھی۔

الهم قد یراد به العزم وقد یراد به الفکر وقد یراد به حدیث النفس۔ (کبیر)

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی بدر میں حالانکہ تم پست تھے، تو اللہ سے ڈرتے رہو۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

عجب کیا کہ شکر گذار بن جاؤ ۲۵۵

یہاں مراد یہی آخری معنی ہیں، یعنی حدیثِ نفس یا وسوسہ۔

والظاہر ان ھذا الھم لہ یکن عن عزم لانہ محمود حدیث نفس ووسوسۃ (روح) لانہ دل علی انہ معصیۃ وقعت منہما

طائفتان۔ ان دو جماعتوں سے مراد قبیلۂ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلۂ خزرج کے بنی سلمہ ہیں۔ (کبیر)

الطائفتان بنو سلمۃ من الخزرج وبنو حارثۃ من الاوس۔ (ابن ہشام)

ان دونوں دستوں نے عبداللہ بن ابی کی مثال دیکھ کر آن کی آن کمزوری اور بدہمتی محسوس کی لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور وسوسہ کو وسوسے کے درجہ سے آگے بڑھنے نہ دیا اور خیال بھی جو انھیں پیدا ہوا اپنی قلتِ تعداد، قلتِ سامان غرض ضعفِ مادی کی بنا پر پیدا ہوا، جو ایک امر طبعی تھا، نہ کہ ضعفِ ایمان سے، یا دین کی حقانیت میں کسی شک و شبہ سے اور بالفرض خیال جرم و معصیت کے درجہ تک پہنچ جاتا جب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا، مومنین مخلصین کی جماعت بہرحال معصومین کی جماعت نہ تھی۔

انما کلہ ذلک منہما من ضعف او وھن اصابہم من غیر شک فی دینہما (ابن ہشام)

انیسویں صدی عیسوی کا انگریز پادری سیر (Sale) تک ابتدائی غزوات سے متعلق جو عموماً تاریخی استناد رکھتے ہیں، کہتا ہے کہ یہ مظاہرے اخلاص و ایثار و شجاعت کے لحاظ سے فوق کے افسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ (محمد اینڈ محمڈنزم ص ۲۰)

۲۵۳ (چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے دستگیری کی اور اپنا فضل قائم رکھا)

آیت ان دونوں ٹکڑیوں پر اظہارِ عتاب کے لئے نہیں اظہارِ عنایتِ خاص و التفات کے لئے ہے۔

ما وطہما ودلاہما عن ذلک (ابن عباسؓ)

۲۵۴ (اور چاہئے کہ آیندہ یاس و بدہمتی کے جذبات کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں)

توکل۔ طریقت کے اعلیٰ صفات میں سے ہے اور محققین صوفیہ نے اس کی حقیقت پر مفصل بحثیں کی ہیں۔

۲۵۵ یعنی تقویٰ کی عادت تمھیں شکر گزار بنا دے گی۔

بدر۔ مدینہ کے جنوب و مغرب میں اس سے کوئی ۸۰ میل کے فاصلہ پر اور ساحلِ بحر احمر سے ایک منزل پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے یہ مقام نہ صرف شام اور مکہ و مدینہ کی سڑکوں کا نقطۂ اتصال تھا اور قریش کے تجارتی قافلے آمد و رفت میں یہیں سے گزرتے تھے، بلکہ اسے اہمیت اس لئے بھی حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی اور یہ عرب میں ایک بڑی چیز تھی توحید اور شرک کے درمیان سب سے پہلا قابلِ ذکر عسکری تصادم یہیں بروز جمعہ ۱۷ رمضان ۲ ہجری (۱۱ مارچ ۶۲۴ء) کو پیش آیا تھا، اس غزوہ نے گویا اسلام کی بنیاد اس طرح بالواسطہ ساری دنیا کی تاریخ کا رخ ہی پلٹ دیا، فرنگی مورخین بھی اس کی اہمیت کی پوری طرح قائل ہیں۔ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے ”فتوحاتِ اسلامی کے سلسلہ میں جنگِ بدر انتہائی اہمیت رکھتی ہے“ (جلد ۸ ص ۱۲۲)

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ

(وہ وقت یاد کیجیے) جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد تین ہزار

مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ

اتارے ہوئے فرشتوں سے کرے ۲۵۶ کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر و تقویٰ قائم رکھا ۲۵۷ اور اگر وہ تم پر

فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

فوراً آپڑیں گے ۲۵۸ تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کئے ہوئے فرشتوں سے کرے گا ۲۵۹

اور امریکی پروفیسر ہٹی HATTI کی ہسٹری آف دی عربس میں ہے: "یہ اسلام کی سب سے پہلی فتح مبین تھی" (ص ۱۱۷)

وانتم اذلّة یعنی تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر، مسلمان تعداد میں کل ۳۱۳ تھے۔
اس فوج کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے اور اونٹ ۷۰ کی تعداد میں، انہی پر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔

ای لقلّة العدد والسلاح (جلالین) معناہ قلیلون (قرطبی) فی حالة قلة وذلة (بحر) یعنی ما کانوا علیه

من الضعف وقلة السلاح والمال والرکوب (بحر)

فاتقوا الله یعنی جیسا کہ ابھی واقعۂ بدر کی مثال میں تم نے دیکھ لیا، تم نے اپنی طرف سے تقویٰ کا حق ادا کر دیا
تو ادھر سے فضلِ باری اور نصرتِ الٰہی نے بھی کیسی دستگیری کی۔

ولقد نصرکم الله ببدر۔ خطاب مومنین سے ہے، انہیں مستقبل میں ثابت قدم رکھنے کے لئے ماضی قریب سے نظیر لائی جا رہی ہے
کہ دیکھو ابھی پچھلے ہی سال تم نے کس قدر نازک موقع پر اعتماد علی اللہ سے کام لیا تو فضلِ الٰہی نے تمہیں کیسے حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب کر دکھایا۔
لعلکم یعنی پر حاشیہ گزر چکا ہے کہ اس کا استعمال جب حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تو مفہوم میں شک و احتمال کے
نہیں، جزم و یقین کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی مراد یہی ہے کہ تقویٰ الٰہی اختیار کرو تو شکر گزار بن جاؤ گے
یہ نہیں کہ شاید شکر گزار بن جاؤ۔

آیتوں کا موقع نزول غزوۂ احد کا زمانہ ہے۔

۲۵۶ (جو آسمان سے خاص اسی غرض کے لئے اتارے گئے ہوں)
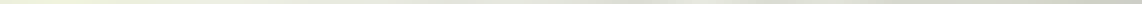
اذ تقول۔ میں ذکر اس وقت کا ہے جب میدانِ بدر میں یہ خبر آگئی تھی کہ غنیم کو زبردست کمک پہنچ گئی ہے،
اور آپ مومنین کو تسلی دے رہے تھے۔

الن یکفیکم۔ تمہارے لئے کافی نہیں، یعنی کیا تمہاری تسکین و تسلی کے لئے یہ کافی نہیں۔
یمدّکم ربکم۔ امدادِ غیبی کے موقع پر صفتِ ربوبیت کا اظہار اور وہ بھی مخاطبین کی طرف اضافت کے ساتھ بہترین
پیرایۂ بلاغت و اسلوب بیان ہے، آج کے ماہرین فن حرب پر بھی خوب روشن ہے کہ سپاہ کی ہمت قائم رکھنا ان کے
MORALE کا درست رکھنا جنگ میں کامیابی کا ایک بڑا اور اہم عنصر ہے۔

۲۵۷ف (میدانِ جنگ میں، اور اطاعتِ رسولؐ سے منہ نہ موڑا)
غور کرکے دیکھ لیا، سارا زور صبر و ثبات اور اطاعتِ رسول پر ہے جنگِ اُحد سے قبل اُمت کے پیغمبرِ اعظمؐ نے جو خطبہ اپنی سپاہ کے سامنے دیا تھا، اور جو حدیث کی کتابوں میں منقول چلا آتا ہے، اس میں یہ مضمون خصوصیت کے ساتھ ہے کہ: "اگر ثابت قدم رہوگے تو اللہ تم ہی کو مظفر و منصور کرے گا، اپنے پروردگار پر اعتماد رکھو، ثابت قدم رہو، اور فتح تم ہی کو نصیب ہوگی۔"
اور یہ شرط بڑی اہم ہے اور اس کی اہمیت کا عملی ظہور بدر و اُحد کے دونوں معرکوں میں ہوگیا، وہی خدا مدد دینے والا، وہی مسلمان امداد کے محتاج، لیکن بدر میں لشکرِ اسلام ہر طرح رسول کا مطیع و منقاد رہا، اور اسباب ظاہر پر تکیہ نہ کیا، اللہ نے امدادِ غیبی فرشتوں سے پہنچائی، اُحد میں صورتِ حال اس کے برعکس رہی، لشکر ہی کے ایک حصہ نے عدول حکمی کی اور بہت خاصہ اعتماد اپنی طاقت پر ہونے لگا، اللہ نے ایک وقت معین تک کے لئے امداد سے دست کشی کرلی، اور شکست کا تجربہ بھی کرادیا۔
حصولِ برکت و نزولِ برکت کے لئے بڑی شئے، بندوں کی طرف سے اطاعت و انقیاد ہے۔

۲۵۸ف (اور اچانک حملہ کی حالت میں امدادِ بشری عادۃً ممتنع ہوتی ہے)
یأتوکم۔ کے فاعل وہی مخالفین و معاندین ہیں۔
ای المشرکون (روح)
من فورھم۔ یعنی بالکل اچانک۔
لفظۃ الفور تدل علی السرعۃ والعجلۃ (بحر) استعیر للسرعۃ۔ (بیضاوی)

۲۵۹ف (اور تمھاری ہمت و حوصلہ کے لئے یہ کتنی بڑی خوشخبری ہے!)
مُسوّمین۔ یعنی کسی امتیازی علامت کے ساتھ ممتاز۔
ای معلّمین بعلامات (قرطبی)
رہا یہ امر کہ واقعۃً نزولِ ملائکہ ہوا اور انھوں نے کافروں سے قتال کیا، تو قرآن اس باب میں خاموش ہے اور روایتوں میں قول دونوں قسم کے ملتے ہیں، دلیلِ قطعی کسی فریق کے پاس نہیں۔
لم تتعرض الآیۃ الکریمۃ لنزول الملئکۃ ولا لقتالھم المشرکین وقتلھم بل ھو امر مسکوت عنہ فی الآیۃ (بحر) قال ابن عباسؓ ومجاھد لم تقاتل الملائکۃ الا یوم بدر وقال بعضھم انما کانت الفائدۃ فی کثرۃ الملئکۃ انھم کانوا یدعون ویسبحون ویکثرون الذین یقاتلون یومئذ فعلی ھذا لم تقاتل ملائکۃ یوم بدر وانما حضروا للدعاء بالتثبیت والاول اکثر۔ (قرطبی)
عامر شعبی کی روایت ہے کہ مسلمانوں کو خبر یہ پہنچی تھی کہ مشرکین کی مدد کے لئے کرز بن جابر محاربی آرہا ہے، اس ڈر کو مسلمانوں کے دل سے دور کرنے اور انھیں ڈھارس بندھانے کے لئے ان سے کہا گیا کہ تمھاری کمک پر بھی تو فرشتوں کے جھنڈ موجود ہیں، لیکن ادھر نہ کرز مع اپنی جماعت کے آیا اور نہ ادھر فرشتوں کو قتال کی ضرورت پڑی۔
فبلغت الکرز الھزیمۃ فرجع ولم یمدھم بالخمسۃ (ابن جریر) فبلغ کرزا واصحابہ الھزیمۃ فلم یمدھم ولم تنزل الخمسۃ۔ (ابن جریر)
علامہ آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ اگر اس کلام کا تعلق غزوۂ اُحد سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس موقع پر امدادِ ملائکہ نہیں آئی

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ

اور یہ تو اللہ نے اس لئے کیا کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہیں اس سے دلجمعی حاصل ہو جائے، ورنہ نصرت

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ

تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے ۲۶۰ (اور یہ نصرت

طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

اس غرض سے تھی) تاکہ کفر کرنے والوں میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انہیں خوار کر دے کہ وہ ناکام ہو کر واپس جائے ۲۶۱

اور اگر غزوۂ بدر سے ہے، تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

وفی ذلک تردید وتوجیہ لأن ھذا الکلام ان کان فی غزوۃ اُحد فلا شبھۃ فی عدم وقوع ذلک ولا یملک واحد لعدم وقوع الشرط ولذا وقعت الھزیمۃ وان کان فی غزوۃ بدر کما ھو المعتمد فمن وقع الخلاف فی انھم امدّوا وامدوا بالخمسۃ الآلاف اولا فذھب الشعبی الی انھم امدوا وانتشروا (روح)

اکثر کا قول تو یہ ہے کہ بدر میں امدادِ ملائکہ نازل ہوئی تھی لیکن ابو بکر اصم تابعی کو اس سے شدید انکار ہے۔

اجمع اھل التفسیر والسیر ان اللّٰہ تعالیٰ انزل الملٰئکۃ یوم بدر وانھم قاتلوا الکفار .. وھذا قول الاکثرین ولما ابو بکر الاصم فانہ انکر ذلک اشد الانکار واحتج علیہ بوجوہ (کبیر)

پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا ہے کہ نزولِ ملائکہ سے بدر میں نصرت کس طور پر ہوئی ہے آیا انہوں نے واقعی قتال کیا، یا یہ کہ مسلمانوں کے دل کو قوی کر دیا، اور مشرکین کے دل پر رعب بٹھا دیا۔

اختلفوا فی کیفیۃ نصرۃ الملٰئکۃ قال بعضھم بالقتال مع المومنین وقال بعضھم بل بتقویۃ نفوسھم واشعارھم بان النصرۃ لھم وبالقاء الرعب فی قلوب الکفار (کبیر۔ مص)

۲۶۰ (نہ کہ فرشتوں، یا اور کسی مخلوق کی طرف سے)

یہاں صاف طور پر بتا دیا کہ حقیقۃً متصرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے، فرشتے ہوں یا کوئی اور کسی کا بھی ذریعۂ امداد ہونا سببِ ظاہری یا سببِ قریبی کے درجے سے زیادہ نہیں۔ ملائکہ پرستی، دیوتا پرستی کی جڑ یہیں سے کٹ جاتی ہے ضمناً اس جانب بھی اشارہ ہو گیا کہ اسلام کی کامیابی اور فتحمندی حقیقۃً تمام تر تائیدِ غیبی کا نتیجہ ہے۔

وما جعلہ میں ضمیر اسی وعدۂ امدادِ ملائکہ کی جانب ہے۔

الھاء للوعد او الامداد (قرطبی) الھاء لان یمدکم (کشاف) ای الامداد (روح)

اِلَّا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ۔ یعنی یہ تو فتح و نصرت کا صرف مقدمہ تھا۔

وما النصر۔ سے مراد نصرتِ حقیقی و واقعی ہے۔

العزیز۔ اس پر قادر کہ جب اور جس کو چاہے بلا اسبابِ ظاہری بلکہ خلافِ اسبابِ ظاہر فتح دلا دے اور کامیاب کرا دے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ

آپ کو اس امر میں کوئی دخل نہیں (اللہ) خواہ ان کی توبہ قبول کرے، خواہ انھیں عذاب دے اس لئے کہ وہ

ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ

ظالم ہیں ۲۶۲ اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ جسے چاہے

يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے ۲۶۳

الحکیم۔ عام فطرت بشری کی رعایت سے اسباب ظاہری کا جمع کر دینے والا۔

۲۶۱ ذکر ابھی غزوہ بدر کا چل رہا ہے، اور اشارات و تلمیحات اسی کی جانب ہیں۔

لیقطع طرفاً۔ قطع یہاں ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔

لیھلک جماعۃ منھم (راغب) لیھلک طائفۃ منھم بالقتل والاسر (کشاف)

ل کا تعلق آیت ماقبل کے نَصَرَکُمُ سے ہے اور نظم آیت یوں ہے ولقد نصرکم اللہ ببدر لیقطع طرفا من الذین کفروا۔ یعنی کافروں کو تمہارے ہاتھوں تباہ و ہلاک کرائے جیسا کہ جنگ بدر کے موقع پر ہوا کہ قریش کے لیڈروں میں سے ستر کی تعداد میں اس روز قتل ہوئے اور اسی تعداد میں قید بھی۔

یکبتھم۔ یعنی انھیں دنیا کی نظروں میں ذلیل و رسوا کریں۔

۲۶۲ (اور اس لئے فوری عذاب کے مستحق!)

روایتوں میں آتا ہے کہ آپ نے چند شریر اور موذی قسم کے کافروں کے حق میں بددعا کی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یتوب علیھم۔ یعنی انھیں قبول اسلام کی توفیق دے دے اتنے ہی ٹکڑے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ مکہ کے کافروں میں سے کچھ ضرور ایمان لے آئیں گے، چنانچہ لے آئے۔

یعذبھم۔ یعنی اسی دنیا میں عذاب دے دے۔

لیس لک من الامر شیئ۔ ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مشیت الٰہی میں دخل کسی مخلوق اور بندے کو نہیں یہاں تک کہ مقرب ترین بندے کو بھی نہیں ــ چہ جائیکہ کسی ولی کسی بزرگ کو اس کی مشیت میں دخیل سمجھ لیا جائے!

۲۶۳ (سو معاملۂ مغفرت و رحمت کرنے کے لئے اسے کسی خاص سبب کی ضرورت نہیں)

یغفر لمن یشآء۔ یہ مغفرت اس کے عام قانون رحمت کے مطابق ہو گی۔

یعذب من یشآء۔ یہ عذاب اس کے خاص قانون حکمت کے ماتحت ہو گا۔

وللہ ۔ ۔ ۔ ۔ الارض۔ یعنی ایک اسی معاملہ پر کیا موقوف ہے، زمین و آسمان کی ساری ہی حکومت میں دخل و تصرف اللہ ہی کا ہے ــ نہ کوئی اس کا شریک، نہ کوئی اس کا وزیر، نہ کوئی اس کا مشیر۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۲۶۶ اور مغفرت کی طرف جو تمہارے

مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ

پروردگار کی طرف سے ہے، دوڑو اور جنت کی طرف (دوڑو) ۲۶۷ جس کا عرض سارے آسمان اور زمین ہیں اور

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ

جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۲۶۸ وہ لوگ ہیں جو فراخت اور تنگی (دونوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو

الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۲۶۹

ان لم يتبعوه فی اجتناب محارمه (مدارک)

۲۶۶ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

لعل پر حاشیہ ابھی اوپر گذر چکا ہے۔

واطیعوا۔ یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت خوش دلی کے ساتھ کرو۔

آیت سے واضح ہوگیا کہ رحمتِ الٰہی کے جلب وجذب کرنے کا ذریعہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔

۲۶۷ (اپنے اعمال کے ذریعہ سے)

الی مغفرة من ربكم۔ ہر مومن کا منتہائے عمل اور حاصل زندگی یہی مغفرتِ پروردگار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام محض ایک سلبی حقیقت کا نام نہیں، محض گناہوں سے بچنا کافی نہیں بلکہ مسلمانوں کو حکم اس کا بھی ملا ہے کہ اسلام کے ایجابی پہلو کا بھی پورا حق ادا کریں، نیکیوں کی جانب لپکیں اور اس طرح جنت کو حاصل کرکے رہیں جو رضائے الٰہی کا محل اور ظہورِ رحمتِ کامل کا مقام ہے۔

۲۶۸ (اور گویا انھیں کے انتظار میں ہے)

عرضها السموٰت والارض۔ وہ بے انتہا وسیع ہے، اس میں سب کی گنجائش ہے، وہاں چپقلش اور عدمِ گنجائش کا احتمال ہی نہیں۔ جنت کی بجنسہٖ پیمائش بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی بے انتہا وسعت اور گنجائش کا اظہار مقصود ہے۔ عربی محاورہ میں انتہائے وسعت کے اظہار کا یہی پیرایہ ادا ہے۔

كناية عن غاية السعة بما هو فی تصور السامعين (روح) للعمو المبالغة فی وصف سعة الجنة وذالك لانه لاشئ عندنا اعرض منهما (كبير)

عرض سے مراد یہاں چوڑان نہیں، بلکہ مطلق وسعت وگنجائش ہے۔

قال القفال لیس المراد منہ ما ھو خلاف الطول بل ھو عبارۃ عن السعۃ (کبیر)

۲۶۹ ٹیلنڈ وغیرہ فرنگی فاضلوں نے کہا ہے کہ عرب جیسی تند خو جنگجو جدل پیشہ قوم کے سامنے حلم و ضبط و صلح و آشتی کے ایسے معیار پیش کرنا، اور پھر اس تعلیم کو کامیاب بنانا بجائے خود ایک اعجاز ہے۔

ینفقون۔ یعنی راہ حق میں، دین کی خدمات میں خرچ کرتے رہتے ہیں، مطلق خرچ کرنا ظاہر ہے کہ شریعت میں ہرگز پسندیدہ نہیں

فی السرآء والضرآء یعنی ہر حال اور ہر صورت میں دین اور امت کی مالی ضرورتوں سے متعلق خرچ کرتے ہیں، یہ نہیں کہ خوش حال ہوئے تو شرفانہ عیش پرستیوں میں پڑ کر نیک کاموں سے ہاتھ ہی روک لیا، یا تنگ دست ہوئے تو ناشکری میں آکر اپنی بساط بھر بھی خرچ کرنے سے رک گئے۔

الکاظمین الغیظ۔ کظم کہتے ہیں غصہ کے ضبط کر جانے کو، تو یہ لوگ وہ ہوئے جو غصہ سے مغلوب نہیں ہو جاتے، بلکہ اس سے مقابلہ کر کے اسے زیر کر لیتے ہیں، اور اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں، بعض اہل تحقیق نے یہ خوب لکھا ہے کہ یہاں فاقدین الغیظ ارشاد نہیں ہوا ہے یعنی مدح اس کی نہیں آئی ہے کہ غصہ سرے سے آتا ہی نہ ہو، بلکہ اس کی آئی ہے کہ غصہ قابو میں رکھا جائے اور عقل جذبات کے اوپر حاکم رہے ان کی محکوم نہ ہو جائے، غصہ پیدا ہونے سے حرارت جسمی یا حمیت سے اسے فنا کر دینا ہرگز اسلام کا مقصود نہیں، مقصود اسے صرف حدود کے اندر رکھنا ہے، غصہ مطلق صورت میں ہرگز ممنوع نہیں، نہ شرعاً معصیت نہ عقلاً مضر، بلکہ اگر حدود کے اندر رہے اور محل مناسب پر پیدا ہو تو عیب نہیں ہنر ہے، غصہ کے ضبط کر جانے کی فضیلتیں حدیث نبوی میں بہ کثرت وارد ہوئی ہیں، مثال کے لئے صرف ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

من کظم غیظا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللہ قلبہ امنا وایمانا۔

قدرتِ نفاذ کے باوجود جو شخص اپنے غصہ کو روک لے جائے اللہ اس کا قلب امن اور ایمان سے لبریز کر دے گا

مثنوی میں حضرت رومیؒ نے حکایت لکھی ہے کہ کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ کائنات میں سخت ترین چیز کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ خدا کا غضب جس سے دوزخ تھرتھراتی رہتی ہے اس نے پوچھا کہ پھر اس سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے غصہ کو پی جانا ؎

گفت عیسیٰ را یکے ہشیار سر — چیست در ہستی زجملہ صعب تر
گفت اے جاں صعب تر خشم خدا — کز ہماں دوزخ ہمی لرزد چو ما
گفت ازاں خشم خدا چہ بود اماں — گفت کظم خشم خویش اندر جہاں

العافین عن الناس۔ یعنی لوگوں کے قصوروں اور خطاؤں کو معاف بھی کر دیتے ہیں، یہی نہیں کہ باوجود قدرت و استطاعت خطاواروں سے انتقام نہیں لیتے، بلکہ اسے معاف بھی کر دیتے ہیں یہ درجہ کاظمین الغیظ سے بلند تر ہے، وہ اگر محض ایک سلبی کیفیت تھی تو یہ ایک ایجابی مرتبہ ہے۔

المحسنین۔ محسنین۔ کا درجہ کاظمین وعافین دونوں سے بلند تر ہے یعنی عفو سے بھی آگے بڑھ کر یہ لوگ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں، اخلاقی تعلیم کے موقع پر قرآن نے اکثر تدریج کو پیش نظر رکھا ہے، اور اس کی بہترین مثال یہ آیت ہے، تینوں مقامات فضیلت کے ہیں، لیکن یہ تیسرا مقام فاضل ترین ہے۔

محدث بیہقی نے سیدنا علی بن حسینؓ سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ آپ کو ایک جاریہ وضو کرا رہی تھی کہ لوٹا

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی بیجا حرکت کر بیٹھتے یا اپنے ہی جان پر کوئی ظلم کر ڈالتے ہیں تو اللہ کو یاد کر لیتے ہیں

اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا

اور اپنے گناہوں سے معافی طلب کرنے لگتے ہیں ۲۷۸ اور کون معاف کر سکتا ہے گناہوں کو بجز اللہ کے؟

اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور یہ (لوگ) اپنے کئے ہوئے پر ہٹ نہیں کرتے درآنحالیکہ وہ جان رہے ہوں ۲۷۹

اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ پر گرا، غصہ آنا امر طبعی تھا، جاریہ نے فوراً الفاظ قرآنی الکٰظمین الغیظ اپنی زبان سے ادا کئے، آپ کا غصہ دور ہو گیا، پھر جاریہ نے العافین عن الناس پڑھا، آپ نے فرمایا میں نے معاف کر دیا، اب جاریہ کی زبان پر واللہ یحب المحسنین آیا، آپ نے فرمایا، جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔" (روح)

رسولِ اسلام کی زندگی تو خیر متن وحی قرآنی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ہی، رسول سے متعلق قرب قرابت رکھنے والے بھی کس بڑی حد تک نفس قدسی کے مالک بن چکے تھے!

۲۷۸ (قاعدۂ شرعی کے مطابق)

فعلوا فاحشةً۔ فاحشة کا اطلاق ہر گناہ کے لئے عام ہے۔

الفاحشة مطلق على كل معصية (قرطبی) اصل الفحش مجاوزة الحد فی السوء (روح)

یہاں مراد وہ برائی ہے جو کسی دوسرے کے ساتھ کی جائے یعنی کسی حق عبد کی ادائی میں کوتاہی ہو جائے۔

قیل الفاحشة الذنب الذی فیه تبعة للمخلوقین۔ (بحر)

او ظلموٓا انفسهم۔ یعنی حقوق اللہ کا اتلاف اگر ان سے ہو جائے۔

ظلم النفس ما بین العبد و بین ربه (بحر)

ذکروا اللہ کا اشارہ اس طرف ہے کہ نافرمانیاں ان سے پورے قصد و تعمد کے بعد خباثتِ نفس کی بنا پر سرزد نہیں ہوا کرتیں، بلکہ احکامِ الٰہی کا ذہول ان کے ذہن سے وقتی طور پر ہو جاتا ہے۔

آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گاہ گاہ لغزشوں کا صادر ہوتے رہنا، قرب و تعلق مع اللہ کے منافی نہیں، اصل اور مقدم شے ہر غلطی اور کوتاہی کی تلافی اور تدارک کی فکر اور اس کی مناسب تدبیر ہے۔

فاستغفروا۔ استغفار صحیح و معتبر وہی ہے جو محض زبان سے نہیں دل کی حسرت و ندامت کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ ہو کہ اب وہ گناہ دوبارہ نہیں ہونے پائے گا، ورنہ اگر ہاتھ میں تسبیح چل رہی ہے اور دل بدستور گناہوں سے لذت لے رہا ہے تو اکابر نے کہا ہے کہ یہ استغفار خود قابلِ استغفار ہے اور عجب نہیں کہ ایسے استغفار کا شمار استہزاء میں ہو جائے۔

الاستغفار المطلوب هو الذی یحل عقد الاصرار و یثبت معناه فی الجنان لا التلفظ باللسان۔ (قرطبی)

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا

ایسے لوگوں کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے اور (بہشت کے) باغ ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی

الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾ قَدْ خَلَتْ مِن

ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے اور کام کرنے والوں کے لیے کیسا اچھا معاوضہ ہے ٢٧٢ یقیناً تم سے قبل

قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾

(مختلف) طریقے (والے) گزر چکے ہیں، سو تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے ٢٧٣

روی عن الحسن البصری انه قال استغفارنا یحتاج الی استغفار (قرطبی) هذا یفعله فی زمانه فکیف فی زماننا هذا الذی یری فیه الانسان قائمًا علی الظلم حریصًا علیه لا یقلع والسبحة فی یده زاعما انه یستغفر الله من ذنبه وذلك استهزاء منه واستخفاف (قرطبی)

٢٧١ (یعنی اپنی کسی غلطی پر جان بوجھ کر ہرگز جمے نہیں رہتے)

ومن یغفر الذنوب الا الله۔ یہ تنبیہ ہے اس پر کہ گناہوں کی معافی صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کسی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کے ہاتھ میں نہیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ رد ہے اس مسیحی عقیدہ کا کہ گناہوں کی معافی مسیح بلکہ ان کے نائبوں کے اختیار میں ہے، ملاحظہ ہو انجیل مروجہ کا بیان:۔

"جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے، میں تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر اُن پر پھونکا اور ان سے کہا کہ روح القدس کو جن کے گناہ تم بخشو ان کے بخشے گئے ہیں اور جن کے گناہ تم قائم رکھو، ان کے قائم رکھے گئے ہیں" (یوحنا۔ ٢٠: ٢١-٢٣)

وھم یعلمون۔ یعنی اپنے عمل کی بُرائی جانتے بوجھتے ہوئے۔

ای یعلمون قبح فعلھم (روح) والمراد لم یصروا عالمین (روح)

٢٧٢ (ہر دنیوی مزد و صلے سے کہیں بالاتر)

اولٰئك۔ کا اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ابھی آچکا ہے، غلطیاں، خطائیں، لغزشیں بھی ان سے صادر ہوتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی وہ ان کی تلافی اور تدارک بھی کرتے رہتے ہیں انہی کے لئے یہ جنت کی نعمتیں بیان ہو رہی ہیں۔
عاملین۔ لفظی معنی عمل کرنے والے کے ہیں، محاورۂ قرآنی میں اس سے مراد عملِ صالح کرنے والے ہیں۔

٢٧٣ (اور اس انجام سے عبرت حاصل کرو)

سنن۔ یعنی مختلف طور طریقے اور یہاں مراد ہیں طور طریقوں پر عمل کرنے والے، مختلف مسلکوں اور مشربوں کے لوگ، مشرک و کافر بھی، موحد و مومن بھی۔

قال الزجاج والمعنی اهل سنن فحذف المضاف (قرطبی)

ساری گذشتہ امتوں اور قوموں کی طرف جامع اشارہ ان الفاظ میں آگیا، اور سنة کے معنی خود اُمة

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوا

یہ ایک اعلان ہے (سارے) لوگوں کے لئے اور ڈرنے والوں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے ۲۷۴ اور نہ ہمت ہارو

وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ

اور نہ غم کرو تم ہی غالب ہو گے اگر تم مومن رہے ۲۷۵ اگر تمھیں کوئی زخم پہونچ جائے

فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

تو ان لوگوں کو بھی تو ایسا ہی زخم پہونچ چکا ہے ۲۷۶ اور ہم ان ایام کی اُلٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں ۲۷۷

کے بھی کئے گئے ہیں اس لئے سنن مرادف اُمم ہوگا۔

السنۃ الامۃ والسنن الامم (قرطبی) وقال المفضل ان المراد بہا الامم وقد جاءت السنۃ بمعنی الامۃ فی کلامہم (روح)

سیروا۔ فانظروا۔ دونوں صیغے امر کے ہیں لیکن مقصود سیاحت نہیں بلکہ سرکش جاہلی قوموں کے انجام سے تذکیر و عبرت ہے خواہ جس ذریعہ سے بھی وہ حاصل ہو سیاحت سے یا مطالعۂ تاریخ سے۔

لیس المراد الامر بذلک لا محالۃ بل المقصود تعرف احوالہم فان حصلت ہذہ المعرفۃ بغیر السیر فی الارض کان المقصود حاصلاً (کبیر)

جغرافیہ، تاریخ، اثریات، معاشیات وغیرہ کا مطالعہ اگر صحیح نقطۂ نظر اور ایمان و معرفت کے پہلوؤں سے کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک عبادت ہے۔

المکذبین۔ یعنی دین حق کے جھٹلانے والی قوموں اور اُمتوں کا۔

۲۷۴ مطلب یہ ہوا کہ قرآن اعلان نامہ تو ہے ساری دنیا کے لئے لیکن اس سے نفع وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے دلوں میں خوفِ خدا موجود ہوگا۔

ھٰذا۔ اشارہ قرآن مجید کی جانب ہے۔

یعنی القرآن عن الحسن وغیرہ (قرطبی) قال الحسن وقتادہ وابن جریج والربیع الاشارۃ الی القرآن (بحر) ای ہذا القرآن (معالم) ای القرآن او ما تقدم من الکتب (مدارک)

بعض نے وہ امر و نہی، وعدہ و وعید مراد لئے ہیں جو اوپر گزر چکے ہیں۔

یعنی یقول ہذا ما تقدم بین امرہ ونہیہ ووعدہ ووعیدہ (کبیر) الاشارۃ الی ما خص من امر الکفار والمتقین والتائبین۔ (روح)

۲۷۵ (اے ایمان والو)

ان کنتم مؤمنین۔ وعدۂ غلبہ کے لئے خوب خیال رہے کہ شرط ثباتِ ایمان کی لگی ہوئی ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

نہیں رکھتا ۲۷۸ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو میل کچیل سے صاف کردے اور کافروں کو مٹا دے ۲۷۹

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ

شاید تم اس گمان میں ہو کہ جنت میں جا داخل ہوگے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو جانا ہی نہیں

وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ

جنھوں نے جہاد کیا اور نہ صبر کرنے والوں کو جانا ۲۸۰ اور تم تو موت کی تمنا کر رہے تھے قبل اس کے کہ اس کے سامنے آؤ

الاعلون۔ یہ علو و غلبہ کا وعدہ ہر قسم کے علو و غلبہ کو حاوی ہے، خواہ وہ مادی ہو یا روحانی، گو سیاق پر نظر کر کے غلبۂ مادی ہی اغلب ہے۔

معنی الغالبین علی الاعداء (قرطبی)

۲۷۶ (تو تمھاری کسی اُفتاد سے اُن مخالفوں کو آخر کیا خوشی ہو سکتی ہے، انھیں بھی تو ایسی اُفتاد پیش آچکی ہے)

ان یمسسکم قرح۔ اشارہ ہے ہونے والی جنگِ اُحد کی طرف، اس میں مسلمانوں کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

مس القوم قرح مثلہ۔ اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف، اس میں قریش کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

۲۷۷ (مصالح تکوینی کے اعتبار سے)

سو مجرد فتح و شکست کو حق و باطل کا معیار نہ سمجھا جائے۔

تلک الایام۔ یعنی فتح و ظفر کا زمانہ۔

والمراد بالایام اوقات الظفر والغلبۃ (کشاف)

۲۷۸ (سو ظالموں کے برسرِ حق ہونے کا تو گمان بھی نہ کیا جائے، خواہ تکوینی مصلحتوں کی بنا پر انھیں عارضی اور ہنگامی کامیابیاں کیسی ہی حاصل ہو جائیں)

لیعلم اللہ الذین اٰمنوا یعنی مومنین کا ایمان عالمِ آشکار ہو جائے، ان کے اعمال، ایثار اور جانبازی کی بنا پر۔

ویتخذ منکم شھدآء۔ شہادت راہِ حق، معلوم ہے کہ شریعتِ اسلامی میں روحانی ترقی کی معراج اور قربِ الٰہی کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

۲۷۹ (انھیں اسی عارضی کامیابی پر اور زیادہ مغرور کر کے)

ذکر اسی غزوۂ اُحد کا چل رہا ہے، ایک فرنگی مورخ نے حال میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ گو قریش اُحد میں

فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ

سو اس کو تو اب تم نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا ۲۸۱؎ اور محمد تو بس ایک رسول ہی ہیں ۲۸۲؎

فتحمند ہوئے لیکن یہی عارضی فتحمندی ان کے مستقل زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ولیمحص اللہ الذین امنوا۔ اہلِ ایمان کو ابتلاءِ تکوینی جب کبھی پیش آتا ہے یا کفارۂ سیئات کے لئے ہوتا ہے اور یا رفع درجات کے لئے۔

۲۸۰؎ (اُن کے اعمال کے ذریعہ سے)

اللہ تعالیٰ کے علم سرمدی میں جو کچھ بھی ہو، اشخاص کا استحقاق جنت کسی درجہ میں بھی اس مادّی دنیا میں ان کے اعمال کے بعد ہی ثابت ہو سکتا ہے۔

اَمْ یہاں بَلْ کے معنی میں لیا گیا ہے اسی لئے ترجمہ میں مفہوم "شاید" سے ادا کیا گیا ہے۔

ام بمعنی بل (قرطبی) ام ای بل (جلالین)

ان تدخلوا الجنّۃ۔ یعنی جنت میں امتیازِ خاص کے ساتھ پہنچ جاؤ گے، خطاب یہاں صحابۂ کرامؓ سے ہے، صحابۂ کرامؓ حصولِ جنت ہی کے مشتاق نہ تھے بلکہ اس کے اعلیٰ درجوں اور مرتبوں کا بھی حوصلہ اور ظرف رکھتے تھے او ان مدارج کے لئے جہاد کی کڑی کڑی منزلوں سے گزرنا ناگزیر تھا۔

۲۸۱؎ (پھر اس سے خوف و ہراس کیوں ہے؟)

خطاب صحابہؓ کی ایک جماعت سے ہے۔

الخطاب للمؤمنین وظاھرہ العموم والمراد الخصوص (بحر) خوطب بہ الّذین لم یشھدوا بدرًا (مدارک) الخطاب للّذین لم یشھدوا بدرًا ولو تمنّوا ان یشھدوا مع رسول اللہ صلعم (بیضاوی)

معرکۂ بدر میں مسلمانوں کی غیر متوقع بلکہ خلاف ظاہر کامیابی سن کر بعض اشخاص کو خیال پیدا ہوا کہ افسوس ہے ہم اس موقع پر حاضر نہ تھے اب کاش کوئی معرکہ پھر اس قسم کا پیش آئے تو ہم بھی اپنی جانوں کی بازیاں لگا لگا کر شہداءِ بدر کا سا مرتبہ حاصل کریں یہاں انہی کو جواب دیا جا رہا ہے کہ پہلے تو یہ ہمت تھی، سو اب ایسی پست ہمتی کا اظہار کیوں؟

ویعلم الصّٰبرین۔ و یہاں حتّٰی کے معنی میں بھی لیا گیا ہے یعنی جب تک ان کا صبر نہ ثابت ہو جائے۔

الواو ھنا بمعنی حتّٰی قالہ الزجاج (قرطبی) ای حتّٰی یعلم صبرھم (قرطبی)

من قبل ان تلقوہ۔ یعنی اس معرکۂ اُحد کے وقوع سے قبل۔

تمنّون الموت سے مراد یا تو سببِ موت اور ذریعہ موت یعنی جہاد و قتال ہے یا خود موتِ شہادت۔

الموت او الموت بالشھادۃ (بیضاوی)

رَاَیْتُمُوْہُ۔ میں ضمیر واحد مذکر غائب موت یا سببِ موت کی جانب ہے۔

یعنی الموت (ابن کثیر) یعنی اسباب الموت (معالم)

۲۸۲؎ (اور ان سب فنا پذیروں ہی میں ہیں، کوئی خدا یا جزوِ خدا یا مظہرِ خدا تو ہیں نہیں جو قانونِ حیات و ممات سے بالاتر ہو سکیں)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

ان کے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں ۲۸۳ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں

عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ

واپس چلے جاؤ گے ۲۸۴ اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں واپس چلا جائیگا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا ۲۸۵

محمدؐ۔ اسم مبارک قرآن میں پہلی بار آیا ہے۔ لفظی معنی ہیں وہ شخص جس کی مدح بہت یا بار بار کی جائے یا جو صفاتِ حسنہ کا مجموعہ ہو۔

یقال فلان محمد اذا کثرت خصاله المحمودة (راغب)

اسمِ علم ہے ہمارے رسولؐ اور دنیا کے آخری نبی کا۔ حضورؐ کی بعثت سے قبل اس نام کا رواج بہت کم تھا۔ علامہ ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے کل سات آدمی اس نام کے گنائے ہیں (کتاب المحبر ص۱۳۰)

اور ان میں سے ایک محمد بن سفیان بن مجاشع کی بابت یہ لکھا ہے کہ ان کے والد نے ایک شامی راہب سے یہ سن کر آئندہ پیمبر کا نام محمد ہوگا، یہ نام اپنے لڑکے کا رکھ دیا۔

کان سفیان اتی الشام فنزل علی راهب فاعجبته فصاحته وعقله فسأل الراهب عن نسبه فانتسب له الی مضر فقال له اما انه یبعث فی العرب نبی یقال له محمد فسمی سفیان ابنه محمدًا۔

تاج العروس اور لسان العرب میں بھی یہی سات نام نقل ہوئے ہیں۔ عام طور سے یہ نام عرب میں شائع نہ تھا، اور تصریحات اس قسم کی ملتی ہیں کہ لم یکن شائعًا بین العرب هذا الاسم (لسان) اور تاج میں بھی اسی سے ملتا جلتا قول موجود ہے۔ ملاحظہ ہو اسم پاک "محمد" پر ضمیمہ اسی سورہ کے اخیر میں۔

۲۸۳ (اور ان سب نے اپنے اپنے وقت پر دنیا کو خیرباد کہا سو یہ بھی اپنے وقتِ موعود پر وفات پا جائیں گے اور اس میں نہ کوئی بات حیرت کی ہوگی اور نہ کوئی پہلو آپؐ کی اہانت کا نکلے گا)

رسول کا مرتبہ اسلام میں خوب سمجھ لیا جائے، رسول محض عبد ہوتے ہیں، صاحبِ وحی۔ عقیدۂ حلول، مظہریت، ابنیت وغیرہ پر ضرب لگانے کے لئے مرتبۂ رسالت اور رسولیت کی باربار تصریح ضروری تھی۔ حضورؐ کی وفات کا حادثہ اس قدر سخت تھا کہ حضرت فاروقؓ جیسے باوقار عالی ظرف بھی صبر وضبط کھو بیٹھے اور بے اختیار ہوگئے۔ عین اس وقت ایک ان سے بھی برتر شخصیت ابوبکر صدیقؓ اسی آیت کی برمحل تلاوت کرکے اُن کے اور سب کے جذبات کو قابو میں لے آئے تھے۔

۲۸۴ (کفر اور بے دینی کی طرف)

مطلب سوال کا یہ ہے کہ جب دین کی حقیقت تمہاری نظر میں ثابت ہو چکی تو اب تمہارا پیامبر کی زیست یا وفات کا اس حقیقت وصداقت پر کیا اثر؟ غزوۂ اُحد میں جب حضور صلعم کو زخم پہنچا اور کسی شیطان نے یہ افواہ اڑا دی کہ آپؐ دنیا سے رخصت ہوگئے تو بعض صحابہ نے اس انتہائی صدمہ انگیز خبر سے بددل اور شکستہ خاطر ہو کر میدانِ جنگ چھوڑنا شروع کر دیا تھا اور منافقین کی وقتی طور پر بن آئی تھی، انھوں نے برابر طنز کرنا اور ارتداد کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی۔ آیت میں ان سب پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ رسول اللہ صلعم کی وفات میں ابھی کئی سال کی مدت باقی تھی، لیکن امت کو ابھی سے اس کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔

افائن مات اشارہ طبعی اسباب سے آنے والی موت کی طرف ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ وغیرہم اپنی

وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا

اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا ۲۸۶ اور ممکن نہیں کسی جاندار کے لئے کہ وہ ایک میعاد

بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ

مقررہ پر حکمِ الٰہی کے بغیر مرجائے ۲۸۷

میعادِ عمر پوری کر کے طبعی اسباب سے فوت ہوئے۔

او قتل اشارہ معرکۂ جنگ میں یا بغیر جنگ کے یوں ہی کسی دشمن دین کے ہاتھوں شہادت کی طرف ہے — جیسے حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ وغیرہم دشمنانِ دین کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

انقلبتم علیٰ اعقابکم من ینقلب علیٰ عقبیه. محاورہ میں کنایہ ہے ارتداد سے، جنگ سے فرار بھی مراد ہو سکتی ہے۔

مجاز من الارتداد او الانهزام (مدارک) ای صرتم کفارًا بعد ایمانکم ، یقال لکل من عاد الیٰ ماکان علیه: رجع وراءه وانقلب علیٰ عقبه ونکص علیٰ عقبیه (کبیر)

۲۸۵ (بلکہ اس کا وبال خود اپنے ہی سر لائے گا)

جاہلی مذہبوں میں دیوتاؤں اور ان کے پوجنے والوں کے درمیان ایک طرح کی مساوات ہمیشہ رہی ہے یعنی معبود بھی اپنی پرستش و عدم پرستش سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں، قرآن نے بار بار اسی جاہلی ذہنیت پر ضرب لگائی ہے۔

۲۸۶ (اور سب سے بڑی شکر گزاری اقرار توحید و رسالت ہے)

شاکرین۔ یہ شکر، کفر کے مقابلہ میں ہے، مطلب یہ ہوا کہ عنقریب جزائے خیر ان لوگوں کو ملے گی جو اللہ کی اصلی اور بڑی نعمت دینِ حق کا شکریہ اس کے قبول و اختیار کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔

الشاکرین علیٰ نعمة الاسلام بالثبات علیه (بیضاوی) سماهم شاکرین لانهم شکروا نعمة الاسلام فی ما فعلوا (کشاف)

یہ شکر، کفر کی ضد ہے۔

الشکر تصور النعمة واظهارها ویضاده الکفر۔ (راغب)

لیکن شکر کے عموم میں وہ تمام اجزاء و عناصر داخل ہیں جو انسان کو مخلوق کے حق میں نافع و قدر شناس بناتے ہیں، اور خالق کے مقابلہ میں مطیع و فرمانبردار۔

۲۸۷ (اور اس میعادِ مقررہ کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں، پھر آخر شرکتِ جنگ میں اتنا خوف کیوں؟) موت جب بھی آئے گی حکمِ خدا ہی سے آئے گی اس کے بدون نہیں آ سکتی، اور پھر جب آئے گی وقتِ موعود ہی پر آئے گی اس کے قبل نہیں آ سکتی خواہ خطرات کیسے ہی شدید ہوں، ان حقائق کا اگر استحضار رہے تو موت کا طبعی خوف بھی حدِ اعتدال سے زیادہ نہ بڑھنے پائے۔

کتٰبًا مؤجّلًا۔ یہ فقرہ اپنے فقرۂ ماقبل الا باذن اللہ کی تاکیدِ مزید میں ہے۔

ای اثبته مقرونًا باجل معیّن لا یتغیر وموقتًا بوقت معلوم لا یتقدم ولا یتأخر (المنار)

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ

اور جو کوئی دنیا کا فائدہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا کا حصہ دے دیتے ہیں۔ اور جو کوئی آخرت کا نفع چاہتا ہے تو اسے

نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٥﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ

اس آخرت کا حصہ دے دیں گے اور عنقریب ہم شکرگزاروں کو بدلہ دے دیں گے ۲۸۸ اور کتنے ہی نبی ہو چکے ہیں کہ ان کے ساتھ

مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ

ہو کر بہت سے اللہ والے لڑے ہیں ۲۸۹

۲۸۸ (جنھوں نے نعمت الٰہی کا شکریوں ادا کیا کہ جنگ میں شریک ہوئے اور جہاد سے جی نہیں چرایا۔)
الشاکرین سے اصلاً اور براہ راست وہ لوگ مراد ہیں جو ان اعمال میں آخرت کی نیت کئے ہوئے جہاد میں شریک ہوئے۔
الذین شکروا نعمۃ اللہ فلم یشغلهم شئ عن الجهاد (بیضاوی)
ومن یرد ثواب الدنیا۔ دنیا کا نفع چاہنا مطلق صورت میں ممنوع نہیں ہے یہاں مراد اس نفع سے ہے،
جو خالص دنیا ہی کے لئے ہو اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ ہی نہ ہو۔
ثواب الدنیا سے مراد ہے کہ مقصود یہی دنیا ہو اور اسے فی الدنیا حسنۃ سے خلط نہ کیا جائے جس سے مراد
یہ ہے کہ بھلائی حاصل ہو اور اس کا محل حصول یہ دنیا ہی ہو۔ دونوں فقروں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔
نؤتہ منها۔ یعنی اگر ہماری مشیت ہوئی تو اس کی یہ آرزو پوری کر دیں گے اور آخرت سے محروم کر کے اسے
یہیں نقد کا نقد معاوضہ دے دیں گے۔
ومن یرد ثواب الاٰخرۃ نؤتہ منها۔ یہ ثواب آخرت اللہ کی طرف سے موعود اور اس کے ذمہ ہے۔
سورہ بنی اسرائیل رکوع ۳ کی آیتوں میں نفع دنیوی اور اجر آخرت کی نوعیت کے فرق کو خوب واضح کر دیا گیا
ہے من کان یرید العاجلۃ عجلنا فیها ما نشآء لمن نرید۔ یہاں نفع دنیوی کو اپنی مشیت پر معلق و موقوف
رکھا ہے ومن اراد الاٰخرۃ وسعی لها سعیها وهو مؤمن فاولٰئک کان سعیهم مشکورا۔ یہاں مومن
کے لئے آخرت کا وعدہ اس کی سعی پر وعدہ کی صورت میں ہے۔
آج جو قومیں توحید الٰہی کی منکر اور آخرت فراموش ہیں، وہ بھی بظاہر نیکی کے بڑے بڑے کام کر ڈالتی ہیں، بڑے بڑے
اسپتال، بڑے بڑے محتاج خانے قائم کر دیتی ہیں، بڑی بڑی نہریں کھدوا دیتی ہیں، بڑے بڑے بند بندھوا دیتی ہیں، بڑے بڑے پل بنوا دیتی
ہیں اور اسی طرح کے دوسرے کام بھی رفاہِ خلق کے، لیکن غایت ان کی محض دنیا ہوتی ہے، آخرت کسی درجہ میں بھی مقصود
نہیں ہوتی اس لئے قدرۃً ان کا شمار خداوندی رجسٹر میں "حسنات" میں نہ ہوگا، اور نہ انھیں کوئی توقع اجرِ اخروی کی ہو سکتی ہے
۲۸۹ (راہِ حق میں یا جہاد فی سبیل اللہ میں)
یہاں یہ بتلایا ہے کہ جہاد کی سنت انبیاء قدیم کے وقت سے چلی آتی ہے اور اس راہ کے رہروؤں کو برابر ان منزلوں سے

فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا

سو جو کچھ انہیں اللہ کی راہ میں پیش آیا اس سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور

وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٦﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ

پڑے اور نہ وہ دبے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۲۹۱ اور ان کا کہنا تو بس اتنا ہی

اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا

تھا کہ وہ کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور ہمارے باب میں ہماری زیادتی کو بخش دے

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤٧﴾

اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور ہم کو کافروں پر غالب کر ۲۹۱

گزرنا پڑتا ہے۔

ربّیّون۔ ربّی۔ ربّانی کے مرادف ہے یعنی اللہ والے، اور مراد علماء و فقہاء بھی لئے گئے ہیں۔

اے ربّانیون (کشاف)

اخرج سعید بن منصور عن الحسن انھم العلماء الفقھاء واخرجه ابن جبیر عن ابن عباس رضؓ

ایضًا فھو منسوب الی الرب (روح)

ایک معنی جماعتِ کثیر کے بھی اکابر سے منقول ہیں۔

اے الوف وقال ابن عباسؓ ومجاھد وسعید بن جبیر وعکرمة والحسن وقتادة والسدّی

والربیع وعطاء الخراسانی الرّبّیّون الجموع الکثیرة (ابن کثیر) وقال الزجاج ھم الجماعة الکثیرة (کبیر)

کاین۔ کم کے مرادف ہے یعنی بہت سے، کتنے ہی۔

کاین بمعنی کم (قرطبی) صارت بمعنی کم (بیضاوی)

۲۹۰ (اور دنیا اور آخرت میں ان کا درجہ اور مرتبہ بڑھتا رہتا ہے۔)

ما اصابھم فی سبیل اللہ۔ یعنی طرح طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں۔

وما ضعفوا۔ یعنی ہراس و دہشت کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیا۔

وما استکانوا۔ یعنی کفر و اہلِ کفر کے سارے ساز و سامان، شان و شوکت سے ذرا مرعوب نہ ہوئے۔

وھن۔ ضعف۔ استکانة۔ تین متقارب المعنی الفاظ کے درمیان ایک فرق امام رازیؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ

وھن تو کہتے ہیں قلب کی کمزوری یا بدہمتی کو اور ضعف مطلق ہے اس کا تعلق جسمانی قوت و مادی قدرت کے انحطاط سے خصوصی

ہے اور استکانة اظہارِ عجز کو کہتے ہیں۔ ایک دوسرا فرق بھی امام موصوف ہی نے یہ نقل کیا ہے کہ وھن کی تفسیر علاوہ خوف

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ

سو اللہ نے انھیں دنیا کا بھی عوض دیا اور آخرت کا بھی عمدہ عوض — اور اللہ نیکوکاروں سے

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ

محبت رکھتا ہے ۲۹۲ اے ایمان والو اگر تم ان لوگوں کا کہنا مانو گے جو کافر ہیں تو وہ تمھیں پچھلے پیروں

عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

واپس کر دیں گے اور تم گھاٹے میں پڑ کر رہ جاؤ گے ۲۹۳ تمھارا دوست تو اللہ ہے اور وہی بہترین مددگار ہے ۲۹۴

ع ۱۵ / ۵ / ۲

سے کی جائے اور ضعف کی ضعفِ ایمانی اور شکوک و شبہات سے اور استکانة کی تبدیلِ دین سے۔

واللہ یحب الصبرین۔ یہ جو اللہ کی راہ میں اس کے دین کی راہ میں، دنیا میں طرح طرح کی تکلیفیں اور آزار جھیلتے رہتے ہیں ان کے مرتبہ کا کیا کہنا! یہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں۔

۲۹۱ف آیت سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ ابرار کی بھی زبان اعترافِ عجز و قصور کے لئے وقف رہتی ہے۔

ذنوبنا۔ اسرافنا۔ ذنوب سے یہاں مراد صغائر سے لی گئی ہے اور اسراف سے کبائر مراد ہیں۔

ذنوبنا یعنی الصغائر واسرافنا یعنی الکبائر۔ (قرطبی)

امام رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ ذنوب عام ہے بڑے چھوٹے سارے گناہوں کے لئے اور اسراف امر سے مراد ہیں معاصی کبیرہ خصوصیت سے۔

ابن فورکؒ نے کہا ہے کہ اس سے قدریہ کا رد بھی نکل رہا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ افعالِ عبد کا خالق نہیں (بحر) امام رازیؒ نے اس سے معتزلہ کا رد بھی نکالا ہے۔

مدل علی ان فعل العبد خلق اللّٰه تعالیٰ والمعتزلة یحملونه علی فعل الالطاف (کبیر)

۲۹۲ف آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے انھیں دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب بنایا اور آخر میں نیکوکاری کی بشارت اللہ کی محبوبیت کی صورت میں دی — دنیا و آخرت کے سارے انعامات سے بڑھ چڑھ کر۔

ثواب الدنیا۔ یعنی فتح و ظفر۔

حسن ثواب الاٰخرة۔ یعنی جنت اور وہاں کی نعمتیں۔

آیت کے الفاظ پر ذرا غور کر لیا جائے "دنیا" کے ساتھ محض "ثواب" (نتیجۂ عمل یا معاوضہ) کا لفظ ہے اور "آخرت" کے ساتھ "حسن ثواب" کا — حسن تو آخرت ہی کے ساتھ مخصوص ہے، دنیا غریب کی قسمت میں حسن کہاں، یہاں تو نری نمائش ہی نمائش رہتی ہے۔

۲۹۳ف سو کافروں کی ہم خیالی، ہم مذاقی سے بچو۔

یردوکم علی اعقابکم۔ یعنی تمھیں الٹے پاؤں ارتداد اور بے دینی کی طرف ڈھکیل لے جائیں گے۔

۲۹۴ف (سو اس کے ہوتے ہوئے تم نصرت و اعانت کے لئے مخلوق پر کیوں نظر رکھتے ہو؟)

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ

ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس لئے کہ انھوں نے اللہ کا شریک ایسی چیز کو ٹھہرایا جس کے

مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى

لئے کوئی دلیل (اللہ نے) نہیں اتاری۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور وہ کیسی بری جگہ ظالموں

الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ

کے لئے ہے ۲۹۵ اور یقیناً تم سے اللہ نے سچ کر دکھایا اپنا وعدہ (نصرت) جب کہ تم انھیں اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے ۲۹۶

اللہ مولٰکم۔ اللہ تمھارا دوست و محافظ ہے، سو وہی تمھیں بچائے گا۔ اللہ والوں کے دل اس بشارت اور تیقن کے بعد کتنے بڑھ جائیں گے!

بل کا مفہوم ترجمہ میں اردو "تو" سے ادا کیا گیا ہے۔

۲۹۵ (یعنی ان کے لئے جو خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہتے ہیں)

مالم ینزل بہ سلطانا۔ یعنی شرک کی تائید میں نہ کوئی عقلی ہی دلیل موجود ہے اور نہ نقلی۔

سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب۔ دشمنان دین کے دلوں میں القاء رعب یا ہیبت حق کے معجزانہ ظہور کی ایک یادگار مثال تاریخ کے صفحات میں یوں محفوظ ہے کہ معرکۂ اُحد میں جب آخری فتح بظاہر مشرکین مکہ کو ہو گئی تو اب قدرتی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ وہ لوگ وہیں سے شہر مدینہ پر چڑھ دوڑتے، فاصلہ اب رہ ہی کتنا گیا تھا۔ لیکن اس کی ہمت انھیں کسی طرح نہ پڑی بلکہ الٹے انھیں واپس ہی جاتے بنی۔ اور تعاقب اس کے برعکس خود شکست خوردہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی زیر قیادت کیا۔ سپہ سالار لشکر کے ماتحت مدینہ سے آٹھ میل دور حمراء الاسد تک کیا، یہاں تین دن تک مسلمانوں کا کیمپ رہا اور لگے ہاتھوں غنیم کا ایک آدمی بھی گرفتار کرتے لائے۔

قال ابن اسحاق فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی انتھی الی حمراء الاسد وھی من المدینۃ علی ثمانیۃ امیال فاقام بھا الاثنین والثلثاء والاربعاء (ابن ھشام)

اور یہ اہم جنگی کارروائی اس خدائی سپہ سالار اعظم نے کی ہی اس غرض سے کہ مشرکین مکہ پر پورا رعب پڑ جائے اور ان کا یہ وہم و گمان مٹ کر رہے کہ مسلمانوں نے ہار مان لی ہے۔

وانما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرھبا للعدو ولیبلغھم انہ خرج فی طلبھم لیظنوا بہ قوۃ وان الذین اصابھم لم یوھنھم عن عدوھم۔ (ابن ھشام)

بما اشرکوا میں ب تعلیل کے لئے ہے، یعنی یہ رعب ان کے شرک کی بنا پر ڈالا گیا۔

ای کان سبب القاء الرعب فی قلوبھم اشراکھم (قرطبی) الباء للسبب ای بسبب اشراکھم باللہ الھۃ (بحر)

۲۹۶ (غزوۂ اُحد کے اندر)

حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

یہاں تک کہ جب تم (خود ہی) کمزور پڑ گئے اور باہم جھگڑنے لگے حکم (رسول) کے باب میں اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ

مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ

اللہ نے تمہیں دکھا دیا تھا جو کچھ کہ تم چاہتے تھے ٢٩٧ ؎

پوری آیت میں بیان غزوۂ اُحد کے مختلف پہلوؤں کا ہے یہاں ذکر اس وقت کا ہے جب تک مسلمان ابتداء معرکہ میں اطاعتِ احکام رسول ؐ پر قائم تھے۔

تحسونھم۔ ھم سے اشارہ دشمنانِ دین مشرکین مکہ ہیں۔

حس کے معنی قتل کے ہیں۔

عبّر بہ عن القتل (راغب) ای تقتلونھم قتلا ذریعا (کشاف) قال ابو عبیدۃ الحس الاستئصال بالقتل (قرطبی)

باذنہ میں اذن سے مراد اللہ کا حکم تکوینی ہے۔

ای بعلمہ او بقضاءہ و امرہ (قرطبی) ای بتیسیرہ و توفیقہ (روح) ای بارادتہ (جلالین)

٢٩٧ ؎ یعنی اپنی فتح اور غنیم کی شکست جس کا مشاہدہ تم براہ راست کر رہے تھے۔

حتّٰی اذا فشلتم یعنی فتح و فیروزمندی کی کیفیت اس وقت تک قائم رہی جب تک تم اپنی استقامت میں کمزور نہ پڑ گئے، اس وقت تم اپنی رائے میں مذبذب و متزلزل ہو گئے اور تمہارے تیر اندازوں کے دستے نے خود رائی سے کام لے کر اطاعت رسول کی پروا نہ رکھی۔

معرکۂ اُحد میں جنگ شروع ہونے سے قبل مسلمانوں کے مقدس اور نہایت درجہ بالغ نظر سالار لشکر ؐ نے امکانات نقشۂ جنگ کا بالکل صحیح اندازہ کر کے ایک گھاٹی میں ایک بلند ٹیکری پر پچاس چیدہ و ماہر تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کر دیا تھا اور احکام دے دیئے تھے کہ اس مورچہ سے کسی حال میں نہ ٹلنا، یہاں تک کہ اگر ہماری اصل فوج شکست کھا جائے جب بھی اس کی مدد کے لئے نہ جھپٹنا، بلکہ اپنے عقب کا خیال رکھنا۔ جنگ شروع ہوئی اور مسلمانوں نے پورے جوش شجاعت کے ساتھ یلغار کی، مشرکین کا لشکر بہ ایں فراوانی و بہ ایں سر و سامانی اس زبردست ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمان اور آگے بڑھے اور بدر کا جوش و خروش تازہ ہو گیا، لیکن افراطِ جوش میں توازن قائم نہ رہا، ان کا خط ٹوٹ گیا اور صفوف میں ترتیب باقی نہ رہی اور انہیں کی ایک جماعت نے مزید پیش قدمی کر کے غنیم کے خیمے ڈیرے لوٹنے شروع کر دیئے۔ ادھر ٹیکری والے تیر انداز دستے نے جو یہ دیکھا کہ دشمن میدان چھوڑ چکا ہے اور مالِ غنیمت لٹنا شروع ہو گیا ہے، تو یہ سوچا کہ اب یہاں مورچہ پر جمے رہنے کے کوئی معنی نہیں، حکم جس وقت تک کے قیام کے لئے تھا، اس کی تعمیل ہو چکی، چنانچہ اس خیال کے ماتحت ٥٠ میں ٤٠ تیر انداز سپاہی اپنی پوزیشن چھوڑ نیچے میدان میں دوسروں کے ساتھ غنیمت کی تاخت میں شریک ہو گئے۔ خالد بن ولید جو بعد کو ایمان لے آئے اور سیف اللہ کہلا کر مسلمانوں کے مشہور جنرل ہوئے اس وقت تک مشرکوں کے رسالے کے سردار تھے، ان کی دوربین نگاہ موقع کے گھات

مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ‌ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمۡ

بعض تم میں وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے ۲۹۸ اور بعض تم میں ایسے تھے جو آخرت چاہتے تھے ۲۹۹ پھر اللہ نے تم کو ان سے

عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ‌ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾

ہٹا دیا تاکہ تمہاری (پوری) آزمائش کرے ۳۰۰ اور اللہ نے یقیناً تم سے درگزر کی اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے ۳۰۱

ہی رہا تھی، اپنے سواروں کے ساتھ کاواکاٹ، اسی درہ کی طرف سے حملہ بول دیا گنتی کے دس سپاہی کتنی دیر ٹھہر سکتے تھے جنگ کا پانسا آناً فاناً پلٹ گیا، اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ آکر چھن گئی۔ قرآن اپنے معجزانہ رنگ میں اس سارے پس منظر پر تبصرہ کر رہا ہے۔

وتنازعتم فی الامر یعنی اپنے قائد اعظم کے حکم کے باب میں بحث کرنے لگے کہ آیا اب بھی وہ حکم قائم اور واجب الاتباع ہے! ۵۰ میں سے ۴۰ ناوک افگن سپاہی لوٹ پر ٹوٹ پڑے تھے اور باقی ۱۰ امیر لشکر کے حکم پر آخر تک قائم رہے۔
وعصیتم یعنی اپنے سالار لشکر اور رسول برحق کے حکم کی خلاف ورزی کی یہ حالت ایک استثنائی تھی، اور اسی لئے اس پر گرفت بھی اتنی سخت ہوئی ورنہ اسلامی فوج علی العموم تو نظم و ضبط، اطاعت و انضباط (ڈسپلن) کی تصویر ہوتی تھیں ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۲۹۸ (اور اسی لئے غنیمت کی لوٹ میں پڑ گئے)

اشارہ انہی ۴۰ جلد باز تیر اندازوں کی طرف ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ لوٹ بھی مبنی و متفرع دشمنان دین کی شکست ہی پر تھی اس لئے ایسی دنیا طلبی بھی تمام تر مذموم نہیں یہاں برا اسے اس لئے ٹھہرایا گیا کہ اس میں مخالفت تھی حکم رسول کی، گو وہ بھی اجتہاداً ہی تھی۔
احد کی پہاڑی شہر مدینہ کے شمال میں شہر سے تقریباً تین میل پر واقع تھی اور شرقاً غرباً پھیلی ہوئی تھی، شمالی جنوبی جبل ثور کہلاتی تھی، شمالی علاقہ کھلا ہوا تھا، مگر اس میدان کی زمین شور ہونے کی وجہ سے اس میں زراعت نہیں ہو سکتی تھی مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر اسی راستے سے حملہ کا ارادہ کیا، اور جنوب کے راستے کو جو دشوار گزار وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتا ہے استعمال نہیں کیا، اس میں لاوے کے پتھر اس طرح حائل ہیں کہ قافلے والے بھی اسے استعمال نہیں کرتے ـــــ اس پہاڑ سے صرف ایک دشوار گزار پگڈنڈی گزرتی ہے جو نعل کی شکل کی وادی سے ہو کر اس کی بلند چوٹیوں تک چلی گئی ہے یہ وادی ایک مسطح و مرتفع میدان ہے جس میں دو چشمے بہتے ہیں، اس وادی میں ایک چھوٹا سا پہاڑی ٹیلا ہے جسے ان چشموں کی وجہ سے جبل عینین کہتے ہیں آنحضرت صلعم نے یہاں تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تھا۔ (حدیث دفاع ۲ از میجر جنرل محمد اکبر خاں ص ۱۷۴، ۱۷۵)

۲۹۹ یہ وہ دس تیر انداز تھے جو نقش نبوی کے تمام تر متبع ہو کر آخر تک اپنی جگہ پر قائم رہے ان پر جذبہ دینی اس قدر غالب تھا کہ نفع مادی کی بڑی سی بڑی تحریک و ترغیب بھی انہیں جگہ سے نہ ہلا سکی۔

۳۰۰ (ایک عارضی و ہنگامی شکست کے ذریعہ سے)

یہ ثبوت ہے صحابۂ نبوی پر کمال رحمت کا، اور یہاں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ عارضی شکست بھی غضب الٰہی یا عذاب کی کوئی فرد نہ تھی، بلکہ اس سے بھی مقصود صحابہ کی قوت ایمانی کا مزید امتحان ہی تھا۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ

(وہ وقت یاد کرو) جب تم چڑھے جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو پکار رہے تھے تمہارے

فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ

پیچھے کی جانب سے ۳۰۲ سو اللہ نے تمہیں غم دیا غم کے پاداش میں ۳۰۳ تاکہ تم رنجیدہ نہ ہوا کرو اس چیز پر جو تمہارے

وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾ ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ

ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس مصیبت سے جو تم پر پڑے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے ۳۰۴ پھر اس نے اس غم کے

مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ ۖ

بعد تمہارے اوپر راحت نازل کی (یعنی) غنودگی کہ اس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا ۳۰۵

ثم صرفکم عنھم۔ یعنی جب تم میں عدم ثبات و تزلزل پایا تو اللہ نے اپنی وہ آسمانی امداد و نصرت روک لی اور تمہیں مخالفین کے مقابلہ میں شکست سے دوچار کر دیا۔

ای ردکم عنھم بالھزیمۃ (معالم)

۳۰۱ (اس لئے اب مواخذۂ آخرت کا کھٹکا نہیں)

کیا ٹھکانا ہے مومنین پر بالعموم اور صحابۂ رسول پر بالخصوص شفقت کا! کن کن عنوانات سے تسلی دی جا رہی ہے!

۳۰۲ (کہ ادھر آؤ، میں ادھر ہوں)

یہ بیان ہو رہا ہے مسلمان سپاہ کی بھگدڑ اور شدتِ بدحواسی کا، اور واقعی بات ہے کہ جب فوج میں بھگدڑ پڑتی ہے تو ایسی ہی بدحواسی پھیل جاتی ہے نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے کوئی کسی کی نہیں سنتا ہر ایک کو اپنی ہی جان بچانے کی فکر پڑ جاتی ہے۔

اذ تصعدون۔ یعنی جب بھاگتے ہوئے چڑھے جا رہے تھے۔

والرسول یدعوکم۔ رسولِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام، علاوہ اپنے دوسرے کمالات و فضائل کے ہمت و شجاعت میں بھی فردِ بے عدیل تھے، حال کے ایک مسلمان جنگی مورخ کے الفاظ میں:۔

"اس پورے معرکہ میں اسلامی جھنڈا کسی وقت بھی سرنگوں نہیں ہوا، جھنڈے کو اونچا رکھنے اور آنحضرت صلعم کی جان کی حفاظت کے لئے غزوۂ احد میں مجاہدین نے جس جانبازی، ایثار کا ثبوت دیا، وہ ابد تک یادگار رہے گا۔۔۔۔ آنحضرت صلعم بھی انتہائی ماندہ اور زخمی ہونے کے باوجود دشمن سے برابر لڑتے رہے، بھالے سے لڑتے رہے آپ نے اس کمال کا ثبوت دیا کہ مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو گئیں لوٹ مار میں عجلت اور تیر اندازوں کے مورچوں سے ہٹ جانے کی وجہ سے لشکرِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا تھا، مگر آپ انتہائی مستقل مزاجی سے باقی آدمیوں کو ساتھ لے کر جنگ کرتے رہے" (عہد نبوی کے میدان جنگ۔ دفاع ص۱)

۳۰۳ یعنی اس رنج کے عوض میں جو تمہاری ذات سے رسول اللہ صلعم کو اٹھانا پڑا تھا تمہیں بھی ایک رنج دیا گیا

وَطَآئِفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاهِلِيَّةِ ؕ

اور ایک جماعت وہ بھی کہ اسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی یہ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت خیالات جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے ۳۰۷

يَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ

یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے؟ ۳۰۸ آپ کہہ دیجیے کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے ۳۰۹

اے انا لکم عتاب بعد عم اذ فتموہ رسول اللہ صلعم بعصیانکم لہ بما فتکم امرہ۔ (روح)

۳۰۴ (اور اسی باخبری کے مطابق جزا و سزا بھی دے گا)

لکیلا تحزنوا الخ۔ یہ اشارہ ہے ان حکمتوں اور مصلحتوں کی جانب جو اس واقعۂ شکست میں پوشیدہ تھیں۔

لکی۔ یعنی تاکہ آئندہ کے لئے اس واقعہ سے سبق لو اور ہمت و استقلال کو کام میں لاتے رہو۔

۳۰۵ مسلمان تو تھکے ماندے تھے ہی، دوپہر کے وقت ان پر نیند کا غلبہ ہوا، اس سے تازہ دم ہو گئے۔ تھکی ہوئی فوج کو نیند جیسی نعمت کے میسر آجانے کی قدر کوئی خستہ و ماندہ اہل فوج ہی کے دل سے پوچھے۔

۳۰۶ (اور مسلمانوں سے حجت و تکرار کر رہے تھے کہ تم سے جو وعدۂ فتح و نصرت تھا، وہ کیا ہوا؟)

مراد منافقین ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے ہوئے تھے اس لئے خطاب بھی ان سے اکثر مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہی ہے۔

یعنی المنافقین (قرطبی) هم المنافقون (بیضاوی)

اهمتهم انفسهم یعنی اس قسم کا سوچ بچار کہ دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جانا ہوتا ہے؟ اپنی جان کی فکر بجائے خود کوئی بری چیز نہیں اگر یہ امر طبعی کے درجہ میں ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ان منافقین کو اپنی ہی پڑی تھی اور عشقانہ دین کی کوئی فکر تھی نہ رسول کا کوئی خیال تھا۔

ماهمهم الا انفسهم وخلاصها لاهم الدین ولاهم رسول اللہ (مدارک)

یظنون غیر الحق۔ اللہ سے متعلق ان کی بدگمانیاں خلاف واقعیت و حقیقت تھیں انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مومنین کو نصرت حق و تائید غیبی نصیب نہ ہوگی۔

ظن الجاهلیة۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کے خیالات اس حد تک پہنچ گئے تھے جو مشرک اور جاہلی ہی تو ہو سکتے ہیں یعنی ان منافقین کے نزدیک یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ کسی سے وعدۂ تائید و نصرت کرے اور پھر اسے پورا نہ کرے۔ ایسے عقائد مشرک قوموں میں عام تھے

الجاهلیة۔ جاهلیة۔ محاورۂ قرآنی میں اسلام سے قبل کا دور شرک ہے۔ یہ جاہلیت توحید کے منافی ہے۔

ظن الجاهلیة کی ترکیب یوں سمجھی گئی ہے۔ لظن اهل الجاهلیة۔

۳۰۷ (اور ہم تو شروع ہی سے اس جنگ سے منع کر رہے تھے کسی نے ہماری رائے نہ مانی، ہماری سن لی گئی ہوتی تو آج یہ مصیبت ہی کیوں آتی)

یہ منافقین اپنی خفت و ندامت مٹانے کے لئے کہہ رہے تھے۔

۳۰۸ (اور قضائے الٰہی ہر انسانی تدبیر پر غالب و حاکم ہے)

بلاغت قرآنی کا یہ ایک عام انداز ہے کہ جزئیات کے ضمن میں کلیات بھی بیان کر جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی

يُخْفُونَ فِيٓ أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ

یہ لوگ دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے ف۳۰۹ کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہمارا اختیار چلتا تو ہم

الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ

یہاں نہ مارے جاتے ف۳۱۰ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے (جب بھی) وہ لوگ جن کے

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ

لئے قتل مقدر ہو چکا تھا، اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل ہی پڑتے ف۳۱۱ اور (یہ سب اسی لئے ہوا) کہ اللہ تمہارے

وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۵۴﴾

باطن کی آزمائش کرے اور تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے صاف کر دے ف۳۱۲ اور اللہ باطن کی باتوں کو خوب جانتا ہے

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ

یقیناً تم میں سے جو لوگ اس دن پھر گئے تھے جس دن کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئی تھیں ف۳۱۳ تو یہ تو بس اس سبب سے

الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ

ہوا کہ شیطان نے انہیں ان کے بعض کرتوتوں کے سبب لغزش دے دی تھی ف۳۱۴

اس حقیقت کا اعلان ہو رہا ہے کہ ایک واقعۂ نصرت ہی پر کیا موقوف ہے اختیار تو چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں اللہ ہی کا ہے۔

ف۳۰۹ یعنی اپنا کفر و نفاق، اسی کو رسولؐ اور مومنین سے مخفی رکھنے کا تو خاص اہتمام ان منافقین کو تھا۔

ف۳۱۰ یعنی اگر ہمارے مشورہ پر عمل ہوتا تو نہ لڑائی ہی کی نوبت آتی اور نہ اس شکست اور نہ اتنے مقتولین کی۔

ف۳۱۱ مطلب یہ ہوا کہ احکامِ تکوینی تقدیری سے باہر رہنا کسی کے لئے کسی صورت میں ممکن نہیں، کوئی نہ کوئی ظاہری سبب بھی مقتل تک ان کے کھنچ آنے کا ضرور نکل آتا۔

ف۳۱۲ (شیطانی اور نفسانی میل کچیل سے)

ولیمحص۔ تمحیص کے معنی ہیں آمیزشوں سے، کدورتوں سے پاک کرنا۔

ما فی صدورکم۔ یعنی تمہارے اخلاص کی آزمائش ہو جائے۔

ف۳۱۳ (میدانِ اُحد میں)

ان الذین تولوا سے مراد وہی صحابی ہیں جن سے اُحد کے موقع پر کمزوری کا اظہار ہوا تھا، انہی کی تسکین و تسلی کے لئے نیز آئندہ کی تنبیہ و ہدایت کی غرض سے یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور بےشک اللہ انھیں معاف کر چکا ہے ۳۱۵ یقیناً اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا حلم والا ہے ۳۱۶ اے ایمان والو!

اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو (حقیقتاً) کفر اختیار کئے ہوئے ہیں ۳۱۷

۳۱۴ اور ان کرتوتوں سے یہاں مراد ہے حُبِّ حیات اور مالِ غنیمت کی ہوس۔

وقال بعض العلماء حُبّهم الغنيمة والحرص على الحياة (بحر) جوّزوا ان يكون المراد بذلك تحوّلهم عن ذالك الموقع بان يكون رغبتهم في الغنيمة۔ (كبير)

آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ہر پچھلی معصیت سبب بن جاتی ہے مزید وجدید معصیت کی جیسا کہ ہر پچھلی طاعت موجب بن جاتی ہے طاعتِ جدید و مزید کی۔

لان الذنب يجرّ الى الذنب كما ان الطاعة تجرّ الى الطاعة (كشاف) فان المعاصي يجرّ بعضها بعضًا كالطاعة (بيضاوي)

انما استزلهم الشيطٰن۔ اس میں اس ادب کی تعلیم آگئی کہ گناہ جو بھی سرزد ہو جائے اس کی نسبت اللہ سے نہیں بلکہ شیطان کی جانب دینا چاہئے۔

قال الكعبي الاٰية تدلّ على ان المعاصي لا تنتسب الى الله فانه تعالى نسبها في هٰذه الاٰية الى الشيطان (كبير) فالاضافة الى الشيطان لطف وتقريب والتعليل يكسبهم وعظ وتاديب (مدارك) خود کلام مجید میں بھی دوسری آیتیں اس قسم کی ہیں مثلاً حضرت موسیٰؑ کی زبان سے هٰذا من عمل الشيطان یا حضرت یوسفؑ کی زبانی من بعد ان نزغ الشيطان بيني وبين اخوتي یا خادمِ موسیٰؑ کی زبان سے وما انسانيه الا الشيطان۔

۳۱۵ (ان کے توبہ و استغفار کی بنا پر)

یہی مضمون تین آیت قبل بھی بیان ہو چکا ہے ولقد عفا عنكم۔ تکرار سے ان صحابیوں کی مزید تسلّی و اطمینان مقصود ہے جو لوگ ان صحابیوںؓ کو اس واقعۂ احد کی بنا پر موردِ طعن سمجھ رہے ہیں سمجھ لیں کہ یہ تو صاف آیاتِ قرآنی کی خلاف ورزی ہے۔

۳۱۶ یہاں دو صفاتِ باری کا اثبات کیا ہے۔

غفورٌ۔ ایک صفتِ غفر کا۔ اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔

حلیمٌ۔ دوسرے صفتِ حلم کا۔ اس کا ظہور اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے کہ فوراً مواخذہ نہیں کرتا بلکہ توبہ و استغفار کا موقع برابر دیتا رہتا ہے۔

۳۱۷ (لیکن زبان پر دعویٰ اسلام و ایمان کا رکھتے ہیں)

مراد منافقین ہیں۔

يعني المنافقين (بيضاوي) [illegible]

وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا

اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جبکہ وہ لوگ زمین پر سفر کرتے ہیں یا کہیں غزوہ کرنے جاتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس

عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۗ

رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے ۳۱۸ (یہ بات اس لئے ان کی زبان پر آئی ہے) تاکہ اللہ اسے ان کے دلوں میں سبب حسرت بنادے ۳۱۹

لا تکونوا کالذین کفروا۔ ہدایت مومنین کو ہو رہی ہے کہ تم اپنی گفتگو میں منافقین کے مثل نہ ہو جاؤ، ان کی سی باتیں نہ کرنے لگو کہ اس قسم کی باتیں صرف ان ایمان سے محروموں کے شایاں ہیں۔

نهى تعالى المؤمنين ان يكونوا مثلهم فى هذه المقالة الفاسدة (بحر)

امام رازی نے فرمایا ہے کہ یہاں منافقین پر الذین کفروا کا اطلاق ہوا ہے، حالانکہ منافقین کو زبانی دعویٰ اسلام کا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ مجرد دعوائے اسلام ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک کہ تصدیقِ قلب بھی شامل نہ ہو۔

والآية تدل على ان الايمان ليس عبارة عن الاقرار باللسان كما تقول الكرامية (كبير)

۳۱۸ (اور مزے سے زندگی بسر کرتے رہتے اور کسی خطرہ میں نہ پڑتے)

لاخوانهم میں ل تبلیغ کا نہیں اس لئے اس کے معنی "سے" کے نہیں بلکہ تعلیل یا سببیت ہے، اس کے معنی "کی بابت" یا "کے باب میں" کے ہوں گے۔

لاجل اخوانهم (كشاف) واللام لام السبب اى لاجل اخوانهم وليست لام التبليغ (بحر) اى لاجلهم وفيهم (بيضاوى)

اخوانهم سے مراد نسبی بھائی یعنی مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اعتقادی بھائی یعنی دوسرے منافقین بھی، ترجیح نسبی بھائیوں یا مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں کی موت یا شہادت کی خبر جب منافقین سن پاتے تو اسی طرح کے فقرے کہتے۔

ومعنى الاخوة اتفاق الجنس او النسب (كشاف) فى النسب والكفر وقيل فى النسب (معالم)

اذا ضربوا فى الارض۔ یعنی کسی اسلامی، دینی مقصد سے سفر کو جاتے اور وہیں وفات پا جاتے۔

او كانوا غزّى۔ یعنی جہاد پر جاتے اور اسی میں شہید ہو جاتے۔

اذا۔ اگرچہ عموماً مستقبل کے لئے ہے، لیکن اذا اور اذ دونوں کا ایک دوسرے کے بجائے لانا بھی درست ہے، چنانچہ یہاں اذا۔ اذ کے معنی میں ہے۔

قال قطرب كلمة اذ واذا يجوز اقامة كل واحد منهما مقام الاخرى واقول هذا الذى قاله قطرب كلام حسن (كبير) فوقع اذا موقع اذ كما نقع الماضى فى الجزاء موضع المستقبل (قرطبى)

لو كانوا عندنا۔ یعنی اگر پہلے ہی پاس ٹھہر گئے ہوتے اور جہاد یا اسلامی سفر پر روانہ نہ ہوئے ہوتے۔

۳۱۹ یعنی ایسے خیالات کا دماغ میں محیح زن ہونا اور ان کا زبان پر لانا یہ خود ایک وبال ان کی منافقت کا اور نور ایمان سے محرومی کا ہے، دل میں وہ ایقان ہوتا ہی نہیں جو تسکین پیدا کرتا ہے اس لئے ہر امر تکوینی تقدیری سے ان کے دلوں میں

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ

اور اللہ ہی جلاتا اور مارتا ہے ۳۲۰ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا رہتا ہے ۳۲۱ اور اگر تم اللہ کی راہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا

میں مارے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی مغفرت و رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر رہے

يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

ہیں ۳۲۲ اور تم لوگ خواہ مرجاؤ یا مارے جاؤ ضرور اللہ ہی کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے ۳۲۳

حسرت اور کڑھن ہی کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ای یجعل ظنھم انھم لو لم یخرجوا ما قتلوا حسرۃ۔ (قرطبی)

۳۲۰ موت و زندگی دونوں کے اسباب تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس مسبب الاسباب و علتِ حقیقی کو چھوڑ کر نظر ظاہری اور فوری اسباب پر جانا اور سفر یا جہاد کو موت یا قتل کی علتِ تامہ قرار دینا ایک شدید جہالت و سفاہت۔ امریکہ میں اس وقت سوشیالوجی (عمرانیات) کا ایک ماہر فاضل ڈینی سن DENISON ہے وہ اپنی کتاب EMOTION AS THE BASIS OF CIVILISATION میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کے اس عقیدۂ تقدیر یا ہر امر تکوینی کو خدا کے تفویض کر دینے کی عادت نے نیز عقیدۂ شہادت نے (کہ شہید معاً جنت میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اسے بہشتی حوریں ملتی ہیں اور کھانے کے لئے سونے کے ظروف) مسلمانوں میں معرکۂ جنگ کے اندر بڑی ہی قوت اور استقامت پیدا کر دی تھی"۔ (ص ۲۰۶)

امریکی فاضل کا ایمان نہ عقیدۂ تقدیر پر ہے نہ عقیدۂ شہادت پر، اس پر بھی وہ ان عقیدوں کی نافعیت اور ان کی حیثیتِ افادی کی داد دینے پر اپنے کو مجبور پا رہا ہے۔

واللّٰہ یحیی ویمیت۔ قرآن مجید نے بار بار اس کلیدی حقیقت کی یاددہانی کی ہے کہ زیست و موت دونوں کے اسبابِ حقیقی صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اس لئے نظر اسبابِ ظاہری پر جمائے رکھنا ایک شدید نادانی ہے۔

۳۲۱ (اس کا علم کامل بھی ہے اور محیط بھی، سو اگر کہیں خدانخواستہ تم نے منافقین کے طرزِ خیال و گفتگو کی تقلید کی تو یہ بھی سب اس خدائے دانا و بصیر، ہمہ بیں و ہمہ داں کے علم میں آ کر رہے گا)

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفتِ علمِ کامل و محیط کے استحضار پر برابر توجہ دلاتا گیا ہے۔

۳۲۲ (حظوظِ دنیوی میں سے)

مطلب یہ ہے کہ موت تو اپنے وقتِ موعود ہی پر آئیگی، جہاد یا سفر فی سبیل اللہ سے خواہ مخواہ تو نہ آجائے گی، البتہ اگر اس دینی خدمت کی حالت میں ہی وقتِ موعود آگیا تو اجر اور ابدی زندگی کی نعمتیں بے شمار ہیں۔

اَوْ مُتُّمْ۔ یعنی چاہے وہ موت طبعی ہی ہو لیکن مشغولی اس وقت اللہ کے کام میں ہو۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ

پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرم رہے ۳۲۴ اور اگر آپ تند خو سخت طبع ہوتے تو

الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ

وہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوگئے ہوتے ۳۲۵

۳۲۳ (سو مومن کے لئے تو یہ کوئی خوف و ہراس کی بات ہی نہیں)
مُتُّمْ یعنی طبعی موت سے اپنے وطن میں وفات پاگئے۔
قُتِلْتُمْ یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں مارے گئے۔
اسی حقیقت کا استحضار اگر قلبِ مومن کو برابر رہے تو ایک تو فسق و معصیت سے ہر طرح کی احتیاط رہے گی،
دوسرے اپنے رحیم و شفیق مالک کے حضور میں حاضری کا انتظار بھی شوق و رغبت کے ساتھ رہنے لگے گا۔

۳۲۴ (حالتِ جنگ میں اُن کی نافرمانی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی)
نافرمان سپاہیوں کے ساتھ، یعنی ان سپاہیوں کے ساتھ جو عین معرکۂ جنگ میں خود رائی سے کام لے کر لشکر کی تفضیح و رسوائی کا سبب بنے بجائے کورٹ مارشل کردینے کے شفقت و ملاطفت کا معاملہ قائم رکھنا دنیا کی جنگی تاریخ میں شاید اپنی نظیر آپ ہی ہو۔
بما میں ما زائدہ تاکید کے لئے ہے، ترجمہ میں اسی لئے "ہی" لایا گیا ہے۔
وما مزیدۃ للتاکید والتنبیہ (بیضاوی) وما مزیدۃ للتاکید وعلیہ اجلۃ المفسرین وھو المأثور عن قتادۃ وحکی الزجاج الاجماع علیہ (روح) صلۃ فیہا معنی التاکید (قرطبی)

۳۲۵ حضورِ انور کے حلم و تحمل، نرمی و خوش خوئی، شفقت و ملاطفت کے واقعات سے تو حدیث اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، کوئی کہاں تک گنائے، اور یہ حقیقت تو خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنی ذات کے لئے آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا، غیروں (اور غیر بھی کیسے بعض معاندوں تک) کے دو ایک قول سننے کے قابل ہیں، لین پول نے کہا ہے:-
"ظلم محمد کی سرشت ہی میں نہ تھا" اور باسورتھ اسمتھ کا بیان ہے:-
"انھوں نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے نہ از خود اس سے الگ ہوتے، گفتگو بہت نرم و شیریں کرتے"
اور ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے:-
"پیمبر کا میلانِ طبع ہمیشہ نرمی ہی کی جانب رہتا"
مفصل حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔
لیکن نرمی و ملاطفت کے بھی شریعت میں حدود مقرر ہیں، جہاں دین کی توہین ہو رہی ہو یا احکامِ دین کے اجرا کی ضرورت ہو، وہاں سختی اور سزا لازمی ہوجاتی ہے۔
اللین والرفق انما یجوز اذا لم یفض الی اہمال حق من حقوق اللّٰہ فاما اذا ادی الی ذالک لم یجز (کبیر)

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ

سو آپ ان سے درگزر کیجئے اور ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور اُن سے معاملات میں مشورہ لیتے رہئے ۳۲۶ لیکن

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾

جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ رکھئے ۳۲۷ بے شک اللہ ان سے محبت رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں ۳۲۸

آیت سے ایک بڑی اصل بھی ہاتھ آ گئی معلوم یہ ہوا کہ غلظت قلب یا درشت خوئی میں طبعی خاصیت لوگوں کو بھگانے، دُور کرنے، متنفر کرنے کی ہے اور تقضیہ بالعکس یہ ہے کہ دین کے داعی و مبلغ کو خصوصیت کے ساتھ خوش خلق و خندہ رُو ہونا چاہئے، دین کی طرف خلقت اگر کھنچے گی تو اسی راہ سے، داعی و مبلغ کی طرف سے خشونت یا تنگ دلی کا اظہار خود مقصد تبلیغ کے حق میں ایک مانع قوی ثابت ہوگا۔

۳۲۶ (حسبِ دستورِ سابق)

گویا اسلام کے نظامِ شوریٰ جمہوری میں حکم یہ ہے کہ ایسے مجرموں کو بھی مسائلِ ملّی میں رائے زنی سے محروم نہ کیا جائے اور ان سے ووٹ کا حق سلب نہ کیا جائے ـــ کیا حد ہے اس رحمت کی!

آج دنیا کی بڑی بڑی آزاد جمہوریتیں بھی اس وسعتِ قلب کی نظیر پیش کر سکیں گی؟

فاعف عنهم۔ یعنی جہاں تک آپ کے حقوق کے اتلاف کا تعلق ہے آپ معاف کر دیجئے چنانچہ آپ نے اس حکم کی تعمیل میں ان خطاکاروں کو زبانی تہدید بھی نہ فرمائی۔

لم يخاطبهم الرسول صلعم بالتغليظ والتشديد وانما خاطبهم بالكلام اللين (كبير)

واستغفر لهم۔ یعنی جہاں تک حقوق اللہ کے اتلاف کا تعلق ہے آپ ان کے لئے دعائے مغفرت کر دیجئے۔

امام رازیؒ نے یہاں یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ جہاد میں بھاگنے سے بڑھ کر گناہ کبیرہ اور کیا ہوگا لیکن قرآن مجید نے اُن اصحابِ نبی کے عفو و مغفرت کی بار بار تصریح کر کے یہ صاف کر دیا کہ ان حضرات کے کبائر بھی معاف ہو گئے تھے۔

وشاورهم في الامر۔ مشورہ کی بڑی فضیلتیں حدیث میں آئی ہیں، اور ظاہر ہے کہ مشورہ کا حکم جب رسولؐ صاحبِ وحی کو مل رہا ہے تو دوسروں کے لئے اس کی احتیاج کتنی زائد رہے گی۔

فقہائے مفسرین نے اس آیت سے اجتہاد اور قیاس شرعی کے جواز کی دلیل پکڑی ہے۔

فيه دلالة جواز الاجتهاد وبيان ان القياس حجة (مدارک)

اسلام کے نظامِ سیاسی کو شخصی اور جمہوری (یا عموی) دونوں سے الگ جو نظامِ شوریٰ قرار دیا گیا ہے، اس کی ایک اہم بنیاد یہی آیتِ قرآنی ہے۔

اسی مشورت کے بارے میں دو قول فقہاءِ اُمت سے منقول ہیں، ایک یہ کہ رسول پر مشورہ لینا واجب تھا، دوسرا یہ کہ محض مستحب تھا۔

وقد اختلف الفقهاء هل كان واجبا عليه او من باب الندب تطييبا لقلوبهم على قولين (ابن کثیر)

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي

اگر اللہ تمہارا ساتھ دے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا ٣٢٩ اور اگر وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون

يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾

ایسا ہے جو اس کے بعد تمہارا ساتھ دے؟ ٣٣٠ اور ایمان والوں کو تو چاہیے کہ صرف اللہ پر بھروسہ رکھیں۔

ظاھر الامر للوجوب فقوله شاورھم یقتضی الوجوب وحمل الشافعیؒ ذالک علی الندب (کبیر)

بہر صورت عادتِ مبارک مشورت کی تھی بہت ہی زائد۔

عن عروة عن عائشةؓ قالت ما رأیت رجلاً اکثر استشارة للرجال من رسول اللہ صلعم (معالم)

٣٢٧ یعنی جب کسی امر میں شورہ ہو لے تو بس اب تذبذب تأمل کو دخل نہ دیجئے، اور عمل بلا تأمل اللہ کے بھروسہ پر اسی پختہ عزم پر کرنے لگئے۔ شخصیت و اجتماعیت، فردیت و جموعیت کا یہ کیسا حکیمانہ امتزاج ہے! اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ اعتماد کی چیز اللہ کی ذات ہے، نہ کہ انسانی مشورے۔

قال قتادة امر اللہ نبیہ علیہ السلام اذا عزم علی شیءٍ ان یمضی ویتوکل علی اللہ لا علی مشاورتھم۔ (قرطبی)

والمقصود ان لا یکون للعبد اعتماد علی شیءٍ الا علی اللہ فی جمیع الامور۔ (کبیر)

توکل کے معنی یہ نہیں کہ انسان اسبابِ ظاہری کی رعایت چھوڑ دے، ورنہ پھر توکل مشورے کے ساتھ جمع کیونکر ہو سکتا تھا بلکہ توکل کے لیے بھی رعایت اسبابِ ظاہری ضروری ہے البتہ اصل اعتماد و تکیہ صرف حق تعالیٰ پر رکھنا چاہیے توکل کے معنی ترکِ اسباب کے نہیں، بلکہ حدود و قیود کے ساتھ اختیارِ اسباب کے ہیں۔

دلّت الآیة علی انہ لیس التوکل ان یھمل الانسان نفسہ کما یقولہ بعض الجھّال بل التوکل ھو ان یراعی الانسان الاسباب الظاھرة ولکن لا یعوّل بقلبہ علیھا بل یعوّل علی عصمة الحق (کبیر) التوکل انما یکون مع الاخذ بالاسباب وان ترک الاسباب بدعوی التوکل لا یکون الا عن جھل بالشرع او فساد فی العقل (المنار)

٣٢٨ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی نظامِ شرعی سے اس قدر بُعد کے بعد بھی مسلمانوں کو صبر و قناعت کی دولتِ لازوال حاصل ہے، اور خودکشی کے فیشن سے یہ امت اب تک ناواقف ہے۔

اور اہلِ توکل کے مرتبہ کا کہنا ہی کیا! یہ ارشاد نہیں ہو رہا ہے کہ وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ ہو رہا ہے کہ اللہ ان سے محبت رکھتا ہے! گویا وہ مرتبۂ محبوبیت پر فائز ہیں! اور اللہ کی محبوبیت جس طرح صبر سے (ان اللہ یحب الصابرین) احسان سے (ان اللہ یحب المحسنین) طہارت سے (ان اللہ یحب المطھرین۔ قتال فی سبیل اللہ سے (ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ) سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح توکل سے بھی۔

٣٢٩ (جیسا کہ معرکۂ بدر میں تم نے دیکھ بھی لیا، اور یہ ثمرہ طاعت کا تھا)

المقصود من الآیة الترغیب فی الطاعة والتحذیر عن المعصیة۔ (کبیر)

٣٣٠ (جیسا کہ معرکۂ احد میں تمہیں تجربہ ہو گیا اور یہ ثمرہ خود رائی کا تھا)

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ

اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے ۳۳۱؎ اور جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

حاضر کرے گا ۳۳۲؎ پھر ہر شخص کو اس کے کئے ہوئے کا پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا ۳۳۳؎

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ

کیا جو شخص رضاء الٰہی کا تابع ہے ۳۳۴؎ وہ بھلا اس جیسا ہو جائے گا جو غضبِ الٰہی کا مستحق ہے ۳۳۵؎

من بعدہ ۔ یعنی اس کی ترکِ نصرت کے بعد

ای من بعد خذلانہ (کشاف)

آیت سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ ایمان ثمرہ ہوتا ہے اعانتِ الٰہی کا اور کفر خذلانِ الٰہی کا۔

احتج الاصحاب بھذہ الاٰیۃ علی ان الایمان لا یحصل الا باعانۃ اللّٰہ والکفر لا یحصل الا بخذلانہ۔ (کبیر)

۳۳۱؎ یعنی یہ شانِ نبوت کے بالکل منافی ہے۔

المراد ان النبوۃ والخیانۃ لا یجتمعان (کبیر) والمعنی انہ لا یمکن ذالک منہ لان الغلول معصیۃ والنبی صلعم معصوم وھذا النفی اشارۃ الی انہ لا ینبغی ان یتوھم فیہ ذالک (بح)

آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جنگِ بدر کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا تھا تو ایک سرخ رنگ کا جبّہ ذخیرہ سے غائب معلوم ہوا، اس پر کوئی بول اٹھا کہ رسول نے لے لیا ہوگا، یہ قول اب اگر کسی منافق کا تھا تو اس بدبخت نے کھلا ہوا حملہ رسول اللہ صلعم کی دیانت پر کر دیا اور اگر کسی نو مسلم کی زبان سے نکلا تھا تو وہ یقیناً اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگا کہ رسول کو بغیر اطلاع بھی تصرّف کا حق حاصل ہے، آیت ان سب مفروضہ کی تردید کر رہی ہے اور ایسے عمل کو خیانت سے تعبیر کر رہی ہے، مشرک غریب تو سرے سے جانتے ہی نہ تھے کہ مرتبۂ نبوت کس منصبِ عظیم کا نام ہے اور پیمبرانہ اخلاق کے معنی کیا ہوتے ہیں، یہود و نصاریٰ البتہ پیمبروں کے نام اور کارناموں سے آشنا تھے، لیکن ان ظالموں نے بھی رفتہ رفتہ مرتبۂ نبوت کی اخلاقی عظمت کو بالکل ہی بھلا دیا تھا اور نبی کو کاہن قسم کا محض ایک پیشگوئی کرنے والا انسان سمجھ رکھا تھا، آیت ان سب غلط خیالیوں کی اصلاح کر رہی ہے۔

وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون۔ توکل اور اہلِ توکل کی عظمت و مدح ابھی ایک آیت قبل گزر چکی ہے۔

۳۳۲؎ اتنی بڑی رسوائی اور فضیحت کو پیمبرانہ تقدیس سے کوئی دور کا بھی واسطہ ہو سکتا ہے۔؟

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ غلول یا خیانت معصیتِ کبیرہ ہے۔

قال العلماء الغلول کبیرۃ من الکبائر (قرطبی) وقد عظم النبی صلعم امر الغلول حتی اجراہ مجری الکبائر۔ (جصاص)

اور یہ بھی لکھا ہے کہ حکام کا ہدیہ کو قبول کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

ومن الغلول ھدایا العمال وحکمہ فی الفضیحۃ فی الاٰخرۃ حکم الغال۔ (قرطبی)

وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُری جگہ ہے وہ لوگ اللہ کے نزدیک (مختلف) طبقوں میں ہوں گے اور

بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ

اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے ۳۳۶ حقیقت میں اللہ نے (بڑا) احسان مسلمانوں پر کیا جبکہ اُنہی میں سے

فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

ایک پیغمبر ان میں بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک صاف کرتا ہے

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۳۳۷ اور بے شک یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے ۳۳۸

۳۳۳ پیغمبروں کا اعزاز و اکرام قطعی ہے تو کسی نبی کی جانب خیانت جیسے ذلیل جرم کی نسبت کی ہی کیونکر جا سکتی ہے!

۳۳۴ (جیسا کہ ہر نبی لازمی طور پر ہوتا ہے)

اور یہاں نبی ہی کا ذکر ہے۔

۳۳۵ (جیسے خائن یا اور کوئی مجرم)

یعنی ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا — مومن مطیع اور کافر فاسق ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

۳۳۶ (اور اپنے اسی علم کامل کے مطابق جزا و سزا دینے والا)

هم یعنی یہ سب لوگ جو رضائے حق پر چلنے والے ہیں وہ، اور جو راہ کی مخالفت کرنے والے ہیں وہ، دونوں قسم کے۔

هم درجاتٌ۔ اللہ کے یہاں طبقات کا یہ اختلاف محبوبیت اور مغضوبیت کے لحاظ سے ہوگا۔

اے هم متفاوتون کما تتفاوت الدرجات (کشاف)

تقدیر کلام یوں ہے هم ذو درجاتٍ یا یوں لهم درجتٌ۔

معنی هم درجت اے ذو درجت او لهم درجت (قرطبی) وقيل ذو درجت والمعنى تفاوت منازل المثابين منهم ومنازل المعاقبين (کشاف) قال الحسن البصریؒ ومحمد بن اسحٰق یعنی اهل الخیر واهل الشر درجات۔ (ابن کثیر)

عند اللہ سے مراد ہے اللہ کی عدالت میں۔

اے فی حکم اللہ وعلمه (کبیر)

۳۳۷ اللہ کی بہترین نعمت ہونے کے لحاظ سے بعثت رسولؐ کا احسان ہے تو سارے ہی عالم پر۔ باقی مسلمانوں کی تخصیص ذکر کی وجہ ظاہر ہے کہ بعثت سے فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ تھے۔

من انفسهم یعنی انہی کی جنس میں سے۔ اس میں مومنین کے لئے بڑی بشارت ہے کہ پیغمبر بھی بس تمہارے ہی جیسے ایک بشر ہیں

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ

اور جب تمہیں ایسی ہار اٹھانی پڑی جس کی دوگنی تم (فریق مقابل پر) ڈال چکے تھے ٣٣٩ تو تم کہنے لگے یہ

قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾

کدھر سے ہوئی آپ کہہ دیجیے کہ وہ تمہارے ہی طرف سے ہوئی ٣٤٠ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ٣٤١

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ

اور جو مصیبت تم پر اس روز پڑی جبکہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے سو وہ اللہ کی مشیت سے

الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ

ہوئی ٣٤٢ تاکہ اللہ مومنین کو جان لے۔ اور ان کو بھی جان لے جنہوں نے منافقت اختیار کی ٣٤٣

اراد بہ المؤمنین کلھم ومعنی من انفسھم انہ واحد منھم وبشر مثلھم۔ (قرطبی)

رسول کی تلاوتِ آیات، تزکیۂ تقوی، تعلیم کتاب و حکمت پر حاشیے پارۂ اول کے اسی مضمون کی آیت کے ذیل میں گزر چکے۔

٣٣٨ قرآنی دستور العمل اور محمدی نمونۂ عمل سے قبل دنیا پر عقائد، معاملات، عبادات، اخلاق ہر اعتبار سے اندھیرا ہی چھایا ہوا تھا اور انسانی آبادی صحیح معنی میں فی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کی تصویر تھی۔

اِنْ یہاں اِنَّ کا مخفف ہے اور تاکید کے معنی دے رہا ہے۔

ان ھی المخففۃ یعنی الثقیلۃ (کشاف) ای ولقد کانوا (قرطبی)

٣٣٩ (اس کے قبل بدر میں)

اصابتکم مصیبۃ۔ یعنی اُحد میں جب تمہیں شکست ہوئی اور تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے۔

اصبتم مثلیھا۔ یعنی بدر میں جب مشرکین کے ستر آدمی قتل ہوئے تھے اور ستر گرفتار۔

اَ و میں وَ عطف کا ہے اور اَ تقریع و استفہام کا۔

الھمزۃ للتقریع والتقریر والواو عاطفۃ (بیضاوی) الالف للاستفھام والواو للعطف (قرطبی)

٣٤٠ یعنی تمہارے اپنے ہاتھوں ہوئی ہمارا وعدۂ فتح و نصرت تمہاری طاعت و اطاعت کے ساتھ مشروط تھا جب تم نے اس کا لحاظ نہ رکھا تو اب وعدہ کہاں باقی رہا۔

اَنّٰی ھٰذا۔ حیرتِ طبعی میں مسلمان بار بار استعجاب سے کہتے تھے کہ ہم صاحبِ ایمان بندے اللہ کی راہ میں لڑنے والے، پھر ہم میں نبی بھی موجود اور فریقِ مقابل مشرکین، اور پھر بھی شکست ہم ہی کو!

٣٤١ فتح دینے پر بھی قادر اور فتح سے محروم کر دینے پر بھی قادر۔

٣٤٢ اور اللہ کی ہر مشیت، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی حکمتوں اور مصلحتوں کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ

اور ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا دفعیہ بن جاؤ ۳۲۴ تو وہ بولے کہ اگر کوئی ڈھنگ

قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ

کی جنگ دیکھتے تو ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے ۳۲۵ یہ لوگ اس روز ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہو گئے ۳۲۶

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ۳۲۷ اور جو کچھ یہ چھپائے ہوئے ہیں اللہ

يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا

اسے خوب جانتا ہے۔ یہ لوگ وہ تھے کہ (خود بیٹھے رہے) اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کہا مانتے ۳۲۸ تو نہ مارے جاتے

بِاِذنِ اللہ۔ اذن یہاں مشیت کے معنی میں ہے۔

المراد من الاذن قضاء اللہ بذالک (کبیر ابن عباسؓ) ای بقضاءہ وقدرہ (قرطبی) ای بقضاء اللہ وقدرہ (روح)

یوم التقی الجمعان۔ یعنی معرکۂ احد میں، جب مکہ کا ایک لشکر جرار ابوسفیان کی کمان میں تھا اور مدینہ کی فوج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں۔

المراد یوم اُحد (کبیر) جمع المسلمین وجمع المشرکین یوم اُحد۔ (بیضاوی)

۳۲۳ یعنی علانیہ اس کا امتحان ہو جائے کہ مومن کون کون ہے اور منافق کون کون۔ لیعلم کا صیغہ جب اللہ کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے تو مراد اسی علانیہ امتحان سے ہوتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو ہر چیز ہوتی ہی ہے۔

۳۲۴ یہ منافقین سے کہا گیا تھا۔

لھم میں ضمیر ھم، منافقین کی جانب ہے۔

ای للمنافقین۔ (مدارک)

ادفعوا یعنی اگر لڑتے نہیں ہو تو کم از کم اپنے شمول ہی سے مسلمانوں کی تعداد کافروں کی نظر میں بڑھائے رہو۔

یعنی کثروا سواد المسلمین (ابن کثیر عن ابن عباسؓ وعکرمہ وسعید بن جبیر والضحاک وابو صالح والسدی) قال السدی وابن جریج وغیرھما کثروا سوادنا وان لم تقاتلوا معنا (قرطبی)

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب عبداللہ بن اُبی مدنی کی زیر قیادت منافقین کا تین سو کا گروہ آغاز جنگ میں مسلمانوں سے کٹ کر مدینہ کو واپس آ رہا تھا۔

۳۲۵ (لیکن یہ تو جنگ نہیں صریح خودکشی ہے)

ولا یقال لمثلہ قتال ھو القاء بالانفس الی التھلکۃ (کشاف)

قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِكُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (۱۶۸) وَلَا تَحۡسَبَنَّ

آپ کہہ دیجئے کہ (اچھا تو) اگر تم سچے ہو تو اپنے کو موت سے بچا لینا ۳۴۹ف اور جو لوگ اللہ کی راہ میں

الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ (۱۶۹)

مارے گئے انہیں ہرگز مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں رزق پاتے رہتے ہیں ۳۵۰ف

فَرِحِيۡنَ بِمَآ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۙ وَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ لَمۡ

ان نعمتوں سے مسرور ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور جو لوگ ان کے بعد والے ابھی ان سے نہیں

يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (۱۷۰)

جا ملے ہیں ۳۵۱ف ان کی بھی اس حالت سے خوش ہیں کہ ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

منافقین مدینہ کا یہ کہنا تھا کہ دشمن اول تو تعداد میں تم سے چوگنا پھر ساز و سامان میں کہیں زائد ایسی حالت میں شہر سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا سارے اصولِ جنگ کے خلاف، صریح دیوانگی ہے۔

۳۴۶ف (یعنی ایمانِ ظاہری و لفظی سے بھی بہت دور ہو گئے، (حقیقی ایمان تو خیر کبھی تھا ہی نہیں) اور کفر سے قریب تر علانیہ بھی ہو گئے تو تم پر۔ یعنی جس روز ایسی باتیں زبان سے نکالیں۔

۳۴۷ف (چنانچہ ان کا یہ عذر بھی مخلصانہ نہیں)

اصل نیت ان منافقین کی کسی حال میں بھی مسلمانوں کی اعانت کی نہ تھی اور کیوں ہونے لگی تھی، جب کہ سرے سے ایمان ہی دلوں میں نہ تھا۔

یقولون بافواھھم۔ بافواھھم کا اضافہ زور اور تاکید کے لئے ہے جیسے اردو محاورہ میں کہتے ہیں۔ "یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا اپنے کانوں سے سنا ہے"۔

والتقییل بالافواہ للتاکید (مدارک) واضافۃ القول الی الافواہ تاکید و تصویر (سیاق)

۳۴۸ف (اور ہماری ہی طرح جنگ سے علٰحدہ رہتے)

لاخوانھم۔ اخوان سے مراد اخوانِ دینی و اعتقادی نہیں، بلکہ اخوانِ نسبی و وطنی ہیں۔

ذکر منافقین کی زبان سے مسلمان شہداء کا ہو رہا ہے۔

فی النسب لا فی الدین ھم شھداء احد (معالم) وھم اخوۃ نسب ومجاورۃ لاخوۃ الدین۔ (قرطبی)

ل۔ واسطہ کا ہے۔

معناہ لاجل اخوانھم (قرطبی)

"اخوان" اور "ل" دونوں پر حاشیہ اوپر قریب ہی گزر چکا ہے، آیت ۱۵۶ کے تحت۔

۳۴۹ف یعنی اگر تمہارا نظریہ یہ ہے کہ موت معرکۂ جنگ ہی میں جانے سے ہوتی ہے تو تم تو بہر حال جنگ سے

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ

وہ لوگ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع

الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا

نہیں کرتا ۳۵۲ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو مان لیا ۳۵۳ بعد اس کے کہ انھیں

اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِينَ اَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۲﴾

زخم لگ چکا تھا ۳۵۴ اُن میں سے جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے اجر عظیم ہے ۳۵۵

احتراز کئے ہوئے ہو دیکھنا ہے کہ موت سے کب تک اپنے کو بچائے رہتے ہو۔

۳۵۰ عالم برزخ میں ایک حیاتِ مخصوص کے ساتھ)

ولا تحسبن۔ ۔۔امواتا۔ شہداء کی موت عام انسانوں کی موت کی طرح نہیں ہوتی بلکہ انھیں برزخ میں ایک مخصوص قسم کی زندگی حاصل رہتی ہے۔

احیاءٌ۔۔۔۔ یرزقون۔ یہ حیات اور یہ رزق سب اسی عالم برزخ کے مناسب ہوتے ہیں۔

عند ربھم۔ یہ اپنے پروردگار کے مقرب بھی ہوتے ہیں۔

عند ھنا تقتضی غایۃ القرب (قرطبی) بمعنی القرب والشرف (روح)

سورۃ البقرۃ، ع ۱۹ (پ ۲) کے حاشیے ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات کے تحت بھی ملاحظہ کرلئے جائیں۔

۳۵۱ (دیگر آنے والے شہید ہو کر ان سے جاملنے والے ہیں)

من فضلہ۔ اس فضلِ خداوندی کے اندر ہر قسم کی نعمتیں اور سرفرازیاں آگئیں۔

۳۵۲ اس حقیقت کا تو انھیں عینی مشاہدہ ہو رہا ہے۔

نعمۃٍ من اللہ۔ نعمت یہ کہ اجر انھیں پورا پورا مل رہا ہے۔

ای ثوابا لاعمالھم (بیضاوی)

فضلہ۔ فضل یہ کہ انعام و اکرام استحقاق سے کہیں بڑھ کر ملا۔ ای زیادۃ علیہ (بیضاوی)

لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ پر حاشیے پہلے بھی گزر چکے۔

۳۵۳ (اور رسول کی اطاعت میں خوش دلی کے ساتھ جنگ کے لئے نکل پڑے)

استجابوا۔ یہاں اجابوا کے معنی میں ہے اور بارہا دونوں لفظ بہ طور مترادف آئے ہیں۔

الاستجابۃ قیل ھی الاجابۃ ۔۔۔۔ عبّر بہ عن الاجابۃ بقلۃ انفکاکھا۔ (راغب)

بمعنی اجابوا (قرطبی) استجاب بمعنی اجاب (کبیر) ای اطاعوا (بیضاوی)

۳۵۴ (جنگِ اُحد میں۔ اور وہ زخم ابھی تازہ ہی تھا)

الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان سے کہنے والوں نے کہا کہ ٣٥٦ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑا سامان اکٹھا کرلیا ہے ٣٥٧ ان سے ڈرو

فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿١٧٣﴾

لیکن اس نے ان کا (جوش) ایمان اور بڑھا دیا۔ اور یہ لوگ بولے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے ٣٥٨

مع

معرکۂ اُحد میں لشکر اسلام کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس نے مشرکین مکہ کی ہمتیں بڑھا دی تھیں، سال ہی بھر بعد ایک بار پھر ابوسفیان صخر قریشی اموی کی قیادت میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے، جنگ بدر میں ابوجہل، ابولہب، عتبہ وغیرہ کے کام آجانے کے بعد اب قوم قریش کی سرداری کی باگ خاندان امیہ کے لیڈر ابوسفیان صخر بن حرب ہی کے ہاتھ میں تھی اس کی جمعیت ٣ ہزار پیادہ فوج اور ٢٠٠ سواروں کی تھی، لیکن ظاہری اور وقتی کامیابی کے باوجود دوسرے ہی روز بعد خود ان لوگوں پر کچھ ایسی ہیبت سوار ہوئی کہ بھاگے چلے گئے اور الٹا تعاقب خود مسلمانوں نے ان کا کیا۔ آیات قرآنی میں اشارہ انہی واقعات کی جانب ہے

٣٥٥ (اور نیک اور متقی تو یہ سب ہی ہیں)

منھم۔ من جس طرح تبعیض کے لئے آتا ہے یعنی کل میں سے کسی ایک جزو کے بتانے کو اسی طرح تبیین یعنی توضیح کے لئے بھی آتا ہے، چنانچہ یہاں اسی معنی میں ہے۔

ومن للبیان (بیضاوی) ذھب غیر واحد انھا للبیان۔ (روح)

احسنوا اور اتقوا کے لے آنے سے مقصود اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ الذین استجابوا کی ممدوحیت کی علت یہی دو اوصاف، احسان و تقویٰ ہیں۔

والمقصود من ذکر الوصفین المدح والتعلیل لا التقیید لان المستجیبین کلھم محسنون متقون (بیضاوی)

قد احسنوا کلھم واتقوا لا بعضھم (مدارک)

٣٥٦ (اور یہ کہنے والے ابوسفیان صخر کے سکھائے پڑھائے ہوئے تھے اور اس کی طرف سے پروپیگنڈا کرنے والے) تاریخ میں اس پروپیگنڈسٹ جماعت کے لیڈر کا نام نعیم بن مسعود اشجعی آتا ہے، یہ شخص قبیلہ ثقیف کا تھا۔

٣٥٧ (اور تم کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے)

ان الناس۔ یہاں ناس سے مراد قوم قریش ہے اس روایت کی نشر و اشاعت سے مقصود مسلمانوں کے دلوں پر قریش کا رعب بٹھانا اور ان کی طرف سے دہشت پیدا کرنی تھی۔ "حرب اعصاب" جس طرح آج حرب سلحہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کا ایک اہم جزو ہے، زمانہ قدیم میں بھی ہوتی رہتی تھی اور ابوسفیان صخر اپنے وقت اور اپنی قوم میں اس فن کا ماہر تھا، اس نے اپنے آدمی چھوڑ رکھے تھے کہ مسلمانوں سے مل جل کر انہیں قریش کی عسکری قوت اور حربی عظمت سے ایسا مرعوب کردیں کہ ان کی ہمت پست پڑ جائے اور مقابلہ کا حوصلہ ہی ان میں باقی نہ رہے۔

٣٥٨ (ہماری حمایت، حفاظت، سب کے لئے)

یعنی اس خبر کی اشاعت اور پروپیگنڈے نے بجائے ان میں پست ہمتی پیدا کرنے کے مسلمانوں میں جوش ایمانی اور تیز کردیا" اور وہ

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا

سو یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری (ذرا) نہ پیش آئی، اور یہ لوگ

رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ

رضائے الٰہی کے تابع رہے ۳۵۹ اور اللہ بڑا فضل والا ہے ۳۶۰ یہ تو شیطان ہی ہے جو تمہیں اپنے دوستوں کے ذریعہ

اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا

ے ڈراتا ہے ۳۶۱ سو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھی سے ڈرو اگر ایمان والے ہو ۳۶۲ اور آپ کے

يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ

لئے یہ لوگ جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں باعث غم نہ بنیں ۳۶۳ یقیناً یہ لوگ اللہ کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۶۴ کے

توکل اور اعتماد علی اللہ کی پوری قوت کے ساتھ بول اٹھے کہ غنیم جو چاہے کرے ہمارا کارساز تو اللہ ہے اور وہی ہمارے لئے کافی ہے۔

زادھم قول الناس ایمانا۔ (قرطبی)

۳۵۹ (اور یہی رضائے الٰہی سرچشمہ ہے دنیوی اور اخروی ہر قسم کے نفع و راحت کا)

فانقلبوا۔ یعنی مقام بدر تک جا کر مسلمان واپس آئے۔ اہل سیر و تاریخ کی زبان میں یہ واقعہ غزوۂ بدر ثانیہ کے نام سے موسوم ہے اور اس کا زمانہ شعبان ۴ ہجری کا ہے۔ مہاجر مسلمان عام اہل قریش کی طرح، اہل تجارت بھی تھے، جب دیکھا کہ میدان رزم خالی ہے تو بساط تجارت بچھا دی۔

سیرت ابن ہشام میں ہے۔" آپ نے ابوسفیان کے چیلنج کے جواب میں بدر کا قصد فرمایا چنانچہ وہاں پہونچ گئے اور یہاں آپ نے ابوسفیان کا انتظار آٹھ دن تک کیا اور ابوسفیان بھی مکہ والوں کو لے کر روانہ ہوا، مگر ظہران میں پہونچا تو اس کی رائے مکہ واپس چلے آنے کی ہوئی اور اس نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے سفر کے لئے تو ایسا موسم مناسب ہے جس میں تم اپنے جانور وں کو چرا بھی سکو اور دودھ بھی خوب پی سکو اور یہ موسم تو خشکی کا ہے سو میں تو واپس جاتا ہوں تم بھی واپس چلے چلو چنانچہ وہ لوگ واپس ہو گئے"۔

بنعمۃ من اللہ۔ یعنی نعمت مقبولیت اور ترقی ایمان کے ساتھ۔

فضل۔ یعنی دنیوی نفع کے ساتھ بھی چنانچہ مال کی نکاسی خوب ہوئی۔ فضل کے ایک معنی مال اور آمدنی کے بھی ہیں۔

ھو الربح فی التجارۃ (کشاف) یعنی المال وما یکتسب (راغب)

۳۶۰ چنانچہ یہاں اس کا فضل مسلمانوں پر ان صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ان کے درجۂ ایمان میں ترقی ہوئی، انہیں جہاد میں نکلنے کی توفیق ہوئی، وہ پرقوت دشمن کی شوکت و صولت سے ذرا مرعوب نہ ہوئے، مقابلہ کی ہمت قائم رکھی، مالی و تجارتی نفع حاصل ہوئے، اجر عظیم کی بشارت ملی۔

۳۶۱ شیطان کہیں بھی اپنی اصلی صورت میں آکر حملہ نہیں کرتا جب وار کرتا ہے کسی نہ کسی انسانی شکل

يُرِيدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷٦﴾

اللہ کی یہی مشیت ہے کہ ان کے لئے آخرت میں ذرا بھی حصہ نہ رکھے ۳٦۵ اور انہیں کے لئے بڑا عذاب ہے

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ

یقیناً جن لوگوں نے ایمان کے عوض کفر کو خرید لیا ہے وہ اللہ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳٦٦ اور انہیں کے

عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ

لئے دردناک عذاب ہے۔ اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں یہ نہ خیال کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے

لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿۱۷۸﴾

ہیں ۳٦۷ یہ ان کے حق میں بہتر ہے ہم تو انہیں بس اس لئے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ جرم میں اور بڑھ جائیں ۳٦۸ اور انہیں کے لئے رسوا کن عذاب ہے

وقائع ہی میں آکر، اور یہی اولیاء الشیطان کہلاتے ہیں یہاں اس جماعت کا لیڈر نعیم ثقفی تھا۔

اولیاءہ اے باولیاءہ (قرطبی) یخوفکم اولیاءہ الذین هم ابوسفیان واولیاءہ (کشاف)

۳٦۲ (کہ اللہ کے خوف کو مخلوق کے خوف پر غالب رکھنا لازمۂ ایمان تھا)

لاتخافوهم۔ ھم سے مراد ہیں شیطان کے دوست یا اللہ کے دشمن، اور ضمیر کا مرجع یا الناس ہے

(ان الناس قد جمعوا لکم) یا اولیاءہ ہے۔

۳٦۳ یعنی ان لوگوں کے لئے آپ فکر و غم میں نہ پڑیں۔

الذین یسارعون فی الکفر۔ مراد منافقین ہیں، ادھر مسلمانوں کو خفیف سی بھی شکست ہوئی اور ادھر یہ کھلم کھلا کفر میں جا پڑے اور کافروں کے شریک علانیہ بھی ہونے لگے۔

نزلت فی المنافقین (کبیر) وهم المنافقون من المتخلفین (بیضاوی)

۳٦۴ یعنی اللہ کے دین کو ذرا نقصان نہیں پہنچا سکتے، آیت سے مقصود پیغمبر کو تسکین دینا ہے کہ آپ کو بڑی فکر اس کی تھی کہ منافقین کی چالوں سے کہیں اشاعتِ اسلام نہ رک جائے، سو اطمینان رکھئے ان کی چالیں ذرا بھی کامیاب نہ ہوں گی۔

۳٦۵ (خود ان کے کفرِ اختیاری کی پاداش میں)

ارادته ان لایکون لهم ثواب فی الاخرة لاتکون بدون ارادة کفرهم ومعاصیهم (مدارک)

۳٦٦ (بلکہ الٹے خود ہی ہر طرح کے خسارہ میں رہیں گے)

الذین اشتروا الکفر بالایمان۔ اس میں اسلام کے دشمن خفیہ و علانیہ ہر قسم کے آگئے۔

۳٦۷ یعنی حسب اقتضائے حکمت کاملہ فوراً انہیں عذاب کی گرفت میں نہیں لے رہے ہیں۔

۳٦۸ (عمر و مہلت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ

جس حال پر تم ہو اللہ اس پر ایمان والوں کو چھوڑے رکھنے کا نہیں جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے

الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

الگ نہ کرے ۳۶۹ؔ اور نہ اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا ہے ۳۷۰ؔ البتہ اللہ جس کو چاہتا

يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ

ہے اپنے رسولوں میں سے انتخاب کرلیتا ہے ۳۷۱ؔ تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ ۳۷۲ؔ اور اگر تم

تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

ایمان لے آئے اور تم نے تقویٰ اختیار کرلیا تو تمہارے ہی لئے اجر عظیم ہے

یعنی ہمارے قانونِ تکوینی کا اقتضاء یہی ہے کہ جب گرفت فوری نہیں ہوتی تو غفلت وجسارت اور بڑھتی جاتی ہے۔

۳۶۹ؔ (طرح طرح کے امتحانوں سے اور آزمائشوں کے ذریعہ سے)

علیٰ ما انتم علیہ من اختلاط المؤمن بالمنافق (قرطبی) من اختلاط المؤمن المخلص والمنافقین (مدارک) المعنی لا یترککم مختلطین لا یعرف مخلصکم من منافقکم۔ (بیضاوی)

خطاب عام نوعِ انسانی سے ہے۔

علیٰ ما انتم ایہا الناس (جلالین)

لیذر میں ل تاکید نفی کے لئے ہے۔

واللام لتاکید النفی (مدارک) قال الکوفیون اللام مزیدۃ للتاکید (روح)

الخبیث اور الطیب سے ظاہر ہے کہ منافقین اور مومنین مراد ہیں۔

۳۷۰ؔ (مثلاً یہی کہ وہ بتلادے کہ فلاں فلاں شخص منافق ہیں اور فلاں فلاں مومن)

یہ منافقین کے جواب میں ارشاد ہوا ہے جو مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اچھا بڑے سچے بنتے ہو تو یہی بتادو کہ منافق کون کون سے ہیں۔

لیطلعکم میں خطاب یا عالم انسانی سے ہے یا صرف مسلمانوں سے۔

الغیب سے مراد وہ تکوینی حقیقتیں ہوسکتی ہیں جو انسان سے پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔

۳۷۱ؔ (بعض امورِ غیب کی اطلاع کے لئے)

من یشاء یعنی جسے وہ چاہتا ہے اپنی مصلحت وحکمت تکوینی کے ماتحت۔

متکلمین نے کہا ہے کہ آیت نص ہے عقیدۂ باطنیہ کے مقابلہ میں جو علم غیب کا اثبات علاوہ رسول کے اپنے اماموں کے لئے بھی کرتے تھے۔

وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ هُوَ خَيۡرًا

اور جو لوگ اُس مال میں بخل کرتے رہتے ہیں ۳۷۳ اور جو کچھ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ

لَّهُمۡ‌ؕ بَلۡ هُوَ شَرٌّ لَّهُمۡ‌ؕ سَيُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِهٖ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ‌ ؕ

۳۷۴ یہ ان کے حق میں اچھا ہے نہیں بلکہ ان کے حق میں (بہت) بُرا ہے۔ یقیناً ان لوگوں کو قیامت کے دن طوق پہنایا جائے گا

وَلِلّٰهِ مِيۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝۱۸۰

اس (مال) کا جس میں انھوں نے بخل کیا ۳۷۵ اور اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا ۳۷۶ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے ۳۷۷

الآية حجة على الباطنية فانهم يدعون ذلك العلم لامامهم (مدارك)

۳۷۲ (کہ یہی ایمان کی اصل و بنیاد ہے)

رسلہ۔ صیغۂ جمع میں ہے مقصود تو اب صرف نبوتِ محمدیؐ پر ایمان لانے کی ترغیب دینا ہے لیکن اس ضمنی موقع پر بھی حکم تمام انبیاء پر ایمان لانے کا ہو رہا ہے۔ کس قدر اہتمام قرآن کو وحدتِ پیام اور سلسلۂ وحی کی اہمیت و عظمت کا ہے!

۳۷۳ (یہاں تک کہ زکوٰۃ اور صرفِ واجب کے موقع پر بھی)

البخل فى اللغة ان يمنع الانسان الحق الواجب عليه (قرطبی) نزلت فى مانعى الزكوٰة المفروضة قاله ابن مسعود وابو هريرة وابن عباس والشعبى والمجاهد (بحر)

۳۷۴ (یعنی یہی شیوۂ بخل)

هو اى البخل (مدارك۔ بیضاوی)

۳۷۵ (اور یہ طوق سانپ کی شکل میں ہوں گے ان کی گردنوں میں لپٹے ہوئے)

حشر میں جب مجردات اور معانی مادی جسم اور شکلیں اختیار کر لیں گے بخل اور منعِ زکوٰۃ حدیث میں آیا ہے کہ سانپ بن کر مجرموں کی گردن میں لپٹے گا۔

قال رسول الله صلعم ما من احد لا يؤدى زكوٰة ماله الا مثل له شجاع اقرع يطوقه (ابن جرير عن ابن مسعود) اور ابن کثیر میں اس مفہوم کی متعدد حدیثیں بخاری، واحمد، و ترمذی، و نسائی و ابن ماجہ وغیرہم سے نقل کی ہوئی ملتی ہیں۔

سیطوقون میں س تاکید کے لئے ہے۔

السين مزيدة للتاكيد (روح)

۳۷۶ (اور وہی آج بھی سب کا مالکِ حقیقی ہے)

سو یہ لوگ بخل درحقیقت اپنے مال میں نہیں بلکہ اُس کے مال میں کر رہے ہیں جو اور بھی قبیح ہے۔

وليس هذا ميراث فى الحقيقة لان الوارث فى الحقيقة هو الذى يرث شيئا لم يكن ملكه قبل والله سبحانه تعالى مالك السموات والارض وما بينهما (قرطبی) والمقصود من الآية انه يبطل ملك جميع المالكين الا ملكه

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ

بے شک اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں ۳۷۷

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا

ہم لکھ رہے ہیں ان کے اس قول کو ۳۷۸ ۳۷۹ اور ان کے (اپنے) انبیاء کے ناحق مار ڈالنے کو بھی ۳۸۰ ہم کہیں گے

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ

کہ (اب تم) آگ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ اس (کرتوت) کی وجہ سے ہوا جو تم آگے بھیج چکے ہو اور اس لئے کہ اللہ بندوں

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ۳۸۲

اللہ سبحانہ وتعالیٰ (کبیر)

۳۷۷ (اس لئے اخلاص کا اہتمام قدم قدم پر رکھنا لازمی ہے)

۳۷۸ یہ کہنے والے یہود تھے اور ان کا یہ قول بطور ضحکہ و تمسخر کے تھا، یہود کا ایک قبیلہ بنی قینقاع کے نام سے نواح مدینہ میں آباد تھا، یہ زرگروں اور مہاجنوں ساہوکاروں کا گروہ تھا، انہی نے آیۂ کریمہ من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنا سن کر بہ طور تعریض و تضحیک اس قسم کی بدگوئی شروع کر دی تھی۔

یہود کی بدتمیزیوں اور گستاخانہ طنز و تمسخر کو کوئی آج سمجھنا چاہے تو آریہ سماجیوں کا وہ مناظرانہ لٹریچر اللہ اور رسول کے متعلق اٹھا کر پڑھے جو انیسویں صدی کے ثلث اخیر اور بیسویں صدی کے ثلث اول میں رائج رہا تھا اسے پورا اندازہ ہو جائیگا۔

۳۷۹ یعنی فرشتوں کے ہاتھ سے ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں لکھا رہے گی اور ایسی گستاخانہ پھبتیوں کو ہرگز نظر انداز نہ ہونے دیں گے سنکتب ۔ س یہاں بھی تاکید کے لئے ہے۔

السین للتاکید ای لن یفوتنا ابدًا لثبتہ (روح)

۳۸۰ جو اس درجہ شقی القلب ہوں کہ اپنے پیغمبروں تک کو ہلاک کر ڈالیں ان سے ایسی گستاخی کے کلمے بعید کیا ہیں، قتل انبیاء اور ناحق قتل انبیاء پر حاشیے سورۃ البقرہ رکوع ۷ میں گزر چکے۔

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ جو یہود قتل انبیاء سے راضی و مطمئن رہے وہ بھی گویا عملاً قتل میں شریک اور قتل کے ذمہ دار ہوئے ہیں، اور پھر یہ حقیقت کلی درج کی ہے کہ رضا بالمعصیت بھی معصیت ہے۔

ھذہ مسألۃ عظمی حیث یکون الرضا بالمعصیۃ معصیۃ۔ (قرطبی)

رسول اللہ صلعم کے معاصر یہود بھی اپنے اسلاف کی طرح ان حضرات انبیاء کی نبوت کے منکر، اور انھیں جھوٹے مدعیان نبوت سمجھنے والے تھے، اور اس لئے انھیں واجب القتل بھی سمجھتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا

(یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے ہیں ۳۸۴ کہ خدا نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے

بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ

سامنے ایسی نیاز نہ پیش کرے جسے آگ کھا جائے ۳۸۵ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پیشتر تمہارے پاس رسول دلائل کے ساتھ

وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ

اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی آچکے جسے تم کہہ رہے ہو تو تم نے انہیں کیوں مار ڈالا اگر تم سچے ہو ۳۸۵ سو اگر یہ آپ کی تکذیب

فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

کر رہے ہیں تو آپ سے پیشتر بھی پیغمبروں کی تکذیب ہو چکی ہے جو شواہد اور نوشتوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے ۳۸۶

۳۸۱ (قیامت کے دن)

۳۸۲ یعنی اس کی صفت عدل کا تقاضا ہوگا کہ ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے نہ یہ کہ اس میں ذرا بھی شائبہ ظلم ہو ایسے ناانصافوں، ظالموں کا سزا سے بچ نکلنا خود مظلوموں پر ایک طرح کا ظلم ہوا۔ مشرک قوموں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کو ظلم و جبر سب ہی کچھ مانا ہے۔ یہاں ان عقائد کی بھی پوری تردید ہو گئی۔

بما قدمت ایدیکم۔ حشر میں عذاب بصورت متشکل ہو کر سامنے آجائے گا، ورنہ ہوگا تو حقیقتاً ان مجرموں کے دنیوی کرتوتوں ہی کا ثمرہ۔

۳۸۳ (اور تمام تر جھوٹ کہتے ہیں)

۳۸۴ یعنی مدعی نبوت کے لئے یہ دکھانا ضروری ہے کہ جو قربانی مذبح میں پیش کی جائے اسے آگ آسمان سے آ کر جلا جائے۔ سوختنی قربانی کا ذکر توریت میں بکثرت سے آیا ہے۔

عہد الینا۔ یعنی ہم نے نسل اسرائیل کو حکم دیا تھا۔

۳۸۵ یعنی اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ مرتبہ نبوت اور اس خاص معجزہ کا ظہور لازم و ملزوم ہیں تو آخر تمہاری قوم کے جن انبیاء نے یہ معجزہ دکھایا، تم خود ان کے بھی منکر کیوں ہوئے؟

جاء کم رسل۔ یعنی تمہاری ہی نسل و قوم کے پیمبر جو تمہارے پاس آچکے ہیں۔

بالذی قلتم۔ توریت میں اس قسم کے متعدد واقعات مندرج ہیں مثلاً:۔

"ایلیا نبی نزدیک آیا اور بولا۔۔۔ تب خداوند کی طرف سے آگ نازل ہوئی اور اس نے اس سوختنی قربانی اور لکڑیوں اور پتھروں اور پانی کو جلایا" (۱۔ سلاطین۔ ۱۸: ۳۶ و ۳۸) "اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تو آسمان سے آگ اُتری اور سوختنی قربانی اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا" (۲۔ تواریخ ۷: ۱)

۳۸۶ (اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں، یہ معاملہ تو سارے ہی انبیاء و مرسلین کے ساتھ ہوتا آیا ہے)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے ۳۸۷ اور تم کو تمھاری پوری مزدوری تو بس قیامت ہی کے دن ملے گی ۳۸۸

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ

تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو وہی کامیاب ہوا اور دنیا کی زندگی تو کچھ بھی

الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

نہیں بجز ایک دھوکے کے سودے کے ۳۸۹ یقیناً تم اپنے مال اور جان سے آزمائے جاؤ گے ۳۹۰

بالبیّنٰت۔ بینات دلائل عقلی اور معجزات سب کا جامع ہے۔

ای الحجج والمعجزات (کبیر) الحجج والبراهین القاطعة (ابن کثیر)

الزّبر۔ زبور کی جمع ہے مراد وہ رسالے ہوتے ہیں جن میں صرف اخلاقی موعظے ہوتے ہیں، اس کی بہترین مثالیں اناجیل اربعہ ہیں۔

قیل الزبر المواعظ والزواجر (بیضاوی)

الکتاب۔ اصطلاح قرآنی میں اس سے مراد ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں احکام و شرائع سب ہوں۔

والکتاب فی عرف القران ما یتضمن الشرائع والاحکام۔ (بیضاوی۔ روح)

۳۸۷ (خواہ وہ جاندار کوئی اور کیسا ہی ہو)

گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ موت ایک طبعی تتمہ اور تکملہ ہے حیات ناسوتی کا، اسے گنہگاری اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ یہ انسان کے لئے بطور سزا کے مقرر ہوئی ہے، اس میں مسیحیوں اور یہود دونوں کا رد آگیا، جن کے عقیدہ میں موت نام ہے گناہ کی سزا کا۔ مسیحیوں کا انجیل کے صحیفوں میں ہے: "جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور موت سب آدمیوں میں پھیل گئی" (رومیوں ۵: ۱۲) "گناہ کی مزدوری موت ہے" (رومیوں ۶: ۲۳) "خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے" (یعقوب ۱: ۱۵) یہود کا عقیدہ ہے کہ موت نتیجہ ہوتی ہے شخصی گناہ کا، اُن کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۴۸۴ میں اُن کے ربّیوں کے حوالے سے درج ہے۔

۳۸۸ (سو اگر آج کوئی شخص یہاں قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ بھی گیا تو اس کی یہ محفوظیت عارضی ہے کہ یہ دنیوی زندگی سلسلۂ حیات کا ایک بہت ہی ناقص اور ناتمام حصہ ہے)

خطاب یہاں عام نوعِ انسانی سے ہے۔

المراد بالاٰیة المکلفون الحاضرون فی دار التکلیف۔ (کبیر)

اُجور۔ اجر کا لفظ اپنے وسیع معنی میں جزاء کی طرح عذاب و ثواب دونوں کے لئے عام ہے۔

فاجر المومن ثواب واجر الکافر عذاب (قرطبی) تعطون جزاء اعمالکم خیرا کان او شرا تاما وافیا (بیضاوی)

۳۸۹ (اور یہاں کے سارے عیش تمام تر عارضی، فانی اور بے ثبات ہیں)

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ

اور یقیناً تم بہت سی دلآزاری کی باتیں ان سے (بھی) سنو گے جنھیں تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے اور

أَشْرَكُوٓا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ

ان سے (بھی) جو مشرک ہیں ۳۹۱ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ تاکیدی احکام

مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَٰقَ الَّذِينَ أُوتُوا

میں سے ہے ۳۹۲ اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد

الْكِتَٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُۥ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُۥ

لیا تھا کہ کتاب کو پوری طرح ظاہر کر دینا (عام) لوگوں پر اور اسے چھپانا مت ۳۹۳

اس ایک عقیدہ کا استحضار رہے تو ہر انسان فرشتہ خصلت ہی بن جائے۔

زحزح عن النار۔ یہ بچنا خواہ شروع ہی سے ہو خواہ کچھ سزا بھگتنے کے بعد۔

حیٰوۃ الدنیا۔ حیاتِ دنیا سے یہاں مراد اس کی لذتیں، خواہشیں، زینتیں ہیں۔

ای لذاتھا وشھواتھا وزینتھا (روح)

فمن..... فاز بشری زندگی کا مقصودِ اعظم بس یہی دو چیزیں ہیں، جو یہاں فوزِ عظیم کی صورت میں جمع کر دی گئی ہیں۔ ایک عذاب سے نجات دوسرے منزلِ ثواب تک رسائی۔

اعلم انہ لا مقصود للانسان وراء ھٰذین الامرین الخلاص عن العذاب والوصول الی الثواب۔ (کبیر)

متاع الغرور اردو محاورے میں مرادف ہے "دھوکے کی ٹٹی" کے یعنی اس مادی، فانی دنیا کے کسی بھی سازوسامان پر تکیہ کرنا اور غفلت میں پڑ کر اسے پائدار سمجھنے لگنا، انتہائی جہل وحمق ہے۔

۳۹۰ (اے مسلمانو!)

یعنی نقصانِ مال اور نقصانِ جان دونوں طرح تمھاری آزمائش ہوگی۔

وانفسکم اس سے رد نکل آیا ان فلاسفہ اور متکلمین کا جنھوں نے مادیین کی طرح نفس کو جسم مادی ومرئی کے مرادف قرار دیا ہے۔

وھٰذہ الآیۃ دلیل علی ان النفس ھی الجسم المعاین وان ما فیہ المعنی الباطل کما قال بعض اھل الکلام والفلاسفۃ (مدارک)

۳۹۱ (سو صبر وثبات، تحمل واستقامت کی عادت برابر قائم رکھنا چاہیے)

اذی کثیرا میں دین کی تحقیر، پیمبر کی توہین وغیرہ سب چیزیں آگئیں، قرآن مجید کی یہ پیش گوئی آج تک کیسی صحیح چلی آتی ہے! یہود کی، مسیحیوں کی، ہندوؤں کی زبانوں سے ہم مسلمانوں کو اپنے پیمبر، اپنے دین اور اپنی کتاب کے بارہ میں کیا کچھ سننا نہیں پڑ چکا ہے۔

۳۹۲ (اور اس لئے ہر طرح واجب العمل)

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

سو انہوں نے اس (عہد) کو اپنے پس پشت پھینک دیا اور اس کو ایک حقیر قیمت کے عوض میں بیچ ڈالا ۳۹۴ سو کیسی بُری چیز ہے جسے وہ خرید رہے ہیں!

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ

ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام نہیں کئے ہیں ان پر بھی ان کی

يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

مدح کی جائے ۳۹۵ سو ایسے لوگوں کے لئے ہرگز یہ خیال کرو کہ وہ عذاب سے حفاظت میں رہیں گے۔ ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے ۳۹۶

عزم۔ یہاں معزوم کے معنی میں ہے۔

اے من معزوماتها التی یعزم علیها (جلالین) فالعزم مصدر بمعنی المعزوم (روح) اے الامور التی ینبغی ان یعزمها (روح) این از کارهائے مقصود است (ولی اللہ دہلویؒ)

ذالك یعنی یہی صبر و تقویٰ۔

یعنی الصبر والتقوی (بیضاوی) اشارۃٌ الی المذکور ضمنًا من الصبر والتقوی (روح)

۳۹۳ چنانچہ اس حکم کی شہادت کسی درجہ میں تو موجودہ محرّف توریت اور انجیل بھی دے رہی ہے۔

"تم اس کلام میں جو میں تمھیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو" (استثناء ۴۰: ۲)

"تو یہ باتیں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو سکھلا" (استثناء ۴-۹)

"اس نے ..... بنی اسرائیل میں ایک شریعت بنا رکھی جس کی بابت اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلا دیں تاکہ آنے والی پشت وہ فرزند جو پیدا ہو دیں سیکھیں اور وہ اٹھ کر اپنی اولاد کو سکھلا دیں" (زبور ۷۸: ۵ و ۶) "جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اُجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" (متی ۱۰: ۲۷)

لتبیننه۔ تبیین کے معنی خوب کھول کر بیان کرنے کے ہیں۔ ہ کی ضمیر کتاب کی طرف ہے یعنی جو کتاب تمھیں ملے اس کو اور اس کے مضامین کو خوب پھیلاؤ۔

ولا تکتمونه۔ یعنی اس کے کسی حصہ کسی مضمون کو کسی غرض سے بھی نہ چھپاؤ۔

۳۹۴ یعنی احکام الٰہی کو سستے داموں بیچ کر دنیا خرید کی!

ثمنا قلیلا۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ہمیشہ کم قیمت ہی رہے گی، یہ مراد نہیں کہ ان نافرمانوں نے تحریف کا معاوضہ ہلکا لیا، انھیں اس سے زیادہ لینا تھا۔

نبذوہ۔ ضمیر اسی عہد کی طرف ہے۔

اے المیثاق (بیضاوی) من المیثاق (روح)

۳۹۵ حکم تو عام ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اشارہ ہے معاصر علماء یہود اور منافقین کی جانب۔

۱۹ ع ۹ ۱۰

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۹۸

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں اہل عقل کے لئے

لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا

(بڑی) نشانیاں ہیں ۳۹۹ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر

وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ

(برابر) یاد کرتے رہتے ہیں ۴۰۰ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں ۴۰۱

عُنی بذالک قومٌ من اھل النفاق (ابن جریر) عُنی بذالک قومٌ من احبار الیھود (ابن جریر)
بما اٰتوا۔ چنانچہ اپنی اس کارگزاری پر اتراتے ہیں کہ حق کا اخفا اور اپنی بدکرداریوں کا کتمان کرتے رہے۔
مالم یفعلوا۔ چنانچہ اس کو فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ دینِ حق کی نشر و اشاعت نہ کی۔

۳۹۶ (آخرت میں)

بمفازۃ من العذاب۔ اس عذاب سے مراد اسی دنیا میں سزائیں ہیں۔ چنانچہ یہود چند ہی سال کے اندر قتل ہوئے، گرفتار ہوئے، جلاوطن ہوئے، اور منافقین بیجد ذلیل و رسوا ہوئے۔

۳۹۷ (چنانچہ مجرموں کی دنیوی و اخروی سزاؤں پر بھی)

اللہ کی ملکیتِ تامہ اور قدرتِ کاملہ کا استحضار رہے تو انسان سے شاید ایک بھی معصیت نہ سرزد ہونے پائے۔

۳۹۸ (اللہ کی توحید اور فردیت کی، اللہ کی حکمت و صنعت کی اور اللہ کی قدرت و حاکمیت کی)

نظامِ فلکی اور اس کی تفصیلات، چاند، سورج، ستاروں کی تعداد، ان کے درمیانی فاصلے ان کے باہمی تعلقات و تاثرات ان کی گردشوں کی پیمائش، گہن کے اسباب، اوقات ان کے طلوع و غروب، نور و حرارت وغیرہ کے قاعدے ضابطے، اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں! یہی زمین تو ہیئتِ ارض، مساحتِ ارض، طبقاتِ ارض، معدنیاتِ ارض، کشش ارض، ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لئے تو کوئی ایک پورا فن بھی کافی نہ ہوا، بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، فزالوجی، میٹرولوجی، آرکیالوجی، خدا جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آرہے ہیں! اور حکمتِ باری اور صنعتِ باری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے کے قریب بھی نہیں آرہے ہیں۔

آیت میں ضمناً ان مشرک قوموں کا بھی رد آ گیا جنھوں نے آسمان یا زمین یا رات دن کو دیوی دیوتا سمجھا ہے معبودیت کی صلاحیت ان میں کسی میں بھی نہیں، یہ سب کے سب مملوک و مسخر ہیں ایک صانعِ اعظم کے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ

اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ (سب) لایعنی نہیں پیدا کیا ہے ۴۰۱ تو پاک ہے ۴۰۲ سو محفوظ رکھیو ہم کو دوزخ کے عذاب سے ۴۰۳

اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

اے ہمارے پروردگار! تو نے جسے دوزخ میں داخل کیا اسے واقعی رسوا ہی کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ۴۰۴

۳۹۹ یعنی یادِ الٰہی خواہ دل سے ہو یا زبان سے، ہر حال اور ہر حیثیت کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ مقصود مداومتِ ذکر الٰہی کا اظہار ہے

امرادمنه كون الانسان دائم الذكر فان الاحوال ليست الا هذه الثلاثة (كبير) قال سائر المفسرين

اراد به المداومة على الذكر فی عموم الاحوال. (معالم)

علٰی جُنُوْبِھِمْ. سے مراد ہے لیٹے ہوئے۔ ای مضطجعين (قرطبی)

۴۰۰ کائنات کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانینِ طبعی اور قواعدِ تکوینی سے صانعِ اعظم و خالقِ عالم کی قدرت، حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہی نہیں، ایک اعلیٰ و اشرف عبادت ہے۔

هو افضل العبادات كما قال عليه الصلوٰة لا عبادة كالتفكر لانه المخصوص بالقلب والمقصود من

الخلق (بيضاوی) دلت الاٰية على ان اعلٰى مراتب الصديقين التفكر فی دلائل الذات والصفات (كبير)

کاش آج ہماری قوم کے ماہرینِ فنِ ہیئت، فلکیات، ریاضیات وغیرہ علومِ طبعی پر دینی و ایمانی نقطۂ نظر سے قلم اٹھاتے!

۴۰۱ یعنی بلا غایت و بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے، بڑے بڑے مصالح و مقاصد اس کے اندر رکھے ہیں۔ اس میں رد آگیا علاوہ مادئیین و دہریین کے جو کائنات کو محض بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، ان مذاہبِ باطلہ کا بھی جن کے نزدیک یہ نظامِ کائنات محض کسی دیوتا کا کھیل تماشہ یا ایک طرح کا طلسم و شعبدہ ہے۔

۴۰۲ (ہر فعلِ عبث و لاحاصل سے)

تنزيها عن الوصف بخلق الباطل (مدارك) ای عن ان تخلق شيئا باطلا. (ابن كثير)

۴۰۳ (اور وہ اس طرح کہ ہمیں راہِ ہدایت پر چلا، اور راہِ ضلالت کے سایہ سے بھی بچا)

یہ مراد نہیں کہ ہم تو اندھا دھند ہر طرح کے کفر و شرک میں مبتلا رہیں اور تو ہمیں فقط ان کے قدرتی انجام سے محفوظ کر دے

۴۰۴ (کہ انہیں میرے عذاب سے کچھ بھی بچا سکے)

الظّٰلمين۔ ظالم سے یہاں کھلی ہوئی مراد کافر سے ہے۔

ای الكفار (قرطبی) والمراد الكفار (مدارك) قال ابن عباس الظالمون هنا هم الكافرون وهو قول

جمهور المفسرين (بحر) القراٰن دل على ان الظالم بالاطلاق هو الكافر. (كبير)

مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک کی حالت میں مرے اور عذابِ ابدی کے لئے دوزخ میں جھونکے جائیں گے، وہ گنہگار مسلمان مراد نہیں ہیں جو گناہوں سے پاک و صاف ہونے کے لئے اور تطہیرِ روح کی غرض سے عارضی و وقتی طور پر آگ کی بھٹی میں ڈالے جائیں گے

قال سعيد بن المسيب الاٰية خاصة فی قوم لا يخرجون من النار. (قرطبی)

حکماء و علماء کے ایک گروہ نے آیت سے نکالا ہے کہ عذابِ روحانی عذابِ جسمانی سے بھی بڑھ کر زبردست و شدید ہوگا، اس لئے کہ

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ

اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی پکار کرتے ہوئے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، سو ہم ایمان لے آئے

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (١٩٣)

اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہماری خطاؤں کو زائل کردے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ موت دے

قرآن مجید (رسوائی) کا ذکر عذاب دوزخ کے بعد کرتا ہے۔

۴۰۵ (اس داعی حق کی ہدایات کے مطابق)

ایمان شریعت میں وہی معتبر و مستند ہے جو پیمبر کی ہدایت کے مطابق ہو نہ کہ اپنے ظن و تخمین کے ماتحت، امام ماتریدی نے یہیں سے یہ نکالا ہے کہ اپنے ایمان کو انشاء اللہ کے ساتھ مقید و مشروط کرنا درست نہیں۔

قال الشیخ ابو منصور رحمہ اللہ فیہ دلیل بطلان الاستثناء فی الایمان (مدارک)

منادیا پکارنے والے سے مراد رسول اللہ صلعم ہیں۔

وھو الرسول صلعم (ابن کثیر) یعنی محمدا صلعم قالہ ابن مسعود وابن عباس واکثر الناس (معالم)

اور منادیا کا صیغہ نکرہ منادی کی عظمت کے اظہار کے لئے۔

والتنوین فی المنادی للتعظیم (روح) ولو النداء مطلقا ثم مقیدا بالایمان تفخیما لشان المنادی (کشاف)

ینادی للایمان یہ ضرور نہیں کہ پیمبر کی دعوت براہ راست ہی پہنچی ہو، کسی واسطہ سے بھی پہنچے بہرحال پیمبر ہی کی دعوت ہوگی۔

للایمان میں ل الی کے معنی میں ہے، نداء اور دعا اور اسی قبیل کے افعال کا صلہ ل کے ساتھ بھی آتا ہے اور الی کے ساتھ بھی انتہاء اور اختصاص کے اظہار کے لئے۔

اللام بمعنی الی ای الی الایمان (قرطبی) والنداء والدعاء ونحوھما یعدی بالی واللام لتضمنھا معنی الانتہاء والاختصاص (بیضاوی)

ربنا۔ آیت میں ربنا کی تکرار کمال تضرع و اعتراف ربوبیت کے اظہار کے لئے ہے۔

تکریر للتضرع واظہار لکمال الخضوع وعرض للاعتراف بربوبیتہ تعالی مع الایمان بہ (روح)

فاغفر لنا۔ آیت سے محققین اہل سنت نے استدلال کیا ہے کہ مغفرت بغیر توبہ بھی ہو جائے گی۔

احتج اصحابنا علی حصول العفو بدون التوبۃ (کبیر)

اور اس نظریہ کی بنیاد دوہری قائم کی ہے ایک یہ کہ بیان توبہ کا کوئی ذکر نہیں صرف سوال مغفرت ہے، اور دعا قبول ہو گئی، جیسا کہ ابھی آتا ہے فاستجاب لھم ربھم۔

وھذا صریح فی انہ تعالی قد یعفو عن الذنب وان لم توجد التوبۃ (کبیر)

دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے اپنے ایمان کی خبر دینے ہی کے مابعد طلب مغفرت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغفرت کا ترتب مجرد ایمان پر ہو جاتا ہے

فدلت ھذہ الآیۃ علی ان مجرد الایمان سبب لحصول الغفران (کبیر) فاغفر لنا مرتب علی الایمان

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ

اے ہمارے پروردگار! ہمیں عطا کر وہ چیز جس کا تو ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت وعدہ کر چکا ہے اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا ۴۰۹

اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

بے شک تو تو وعدہ خلافی نہیں کرتا ۴۱۰

سو تعالیٰ والاقرار بربوبیته کما تدل علیه الفاء ای فاغفرلنا۔ (روح)

۴۰۶ (اور آخرت میں ان کی رفاقت نصیب کر)

مخصوصین بصحبتهم ومعدودین فی زمرتهم (بیضاوی) ای امتنا علیٰ حالتهم وطریقتهم۔ (المنار)

ذنوبنا۔ ذنوب سے مراد بڑے گناہ ہیں۔

ای کبائر (بیضاوی) الذنوب هی الکبائر (بحر عن ابن عباسؓ)

سیّئاتنا۔ سیّات سے مراد چھوٹے گناہ ہیں۔

ای صغائر (بیضاوی) السیّات هی الصغائر (بحر عن ابن عباسؓ)

ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ ذنوب سے مراد وہ گناہ ہیں جو بندہ سے اپنے ربّ خالق کے معاملہ میں ہوں، اور سیّات سے مراد وہ کوتاہیاں ہیں جو بندہ سے بندوں کے معاملات میں ہوں۔

الذنوب هی التقصیر فی عبادة الله تعالیٰ وکل معاملة بین العبد وربّه والسیّات هی التقصیر فی حقوق العباد ومعاملة الناس بعضهم بعضًا۔ (المنار)

اور ذنوب کی مغفرت یہ ہے کہ ان پر گرفت نہ کی جائے، اور کفارۂ سیّآت یہ ہے کہ انھیں محو کر دیا جائے۔

وغفر الذنوب عبارة عن سترها وعدم العقوبة علیها البتة وتکفیر السیّات عبارة عن اسقاطها۔ (المنار)

۴۰۷ یعنی ہم پر ابتدا ہی سے برابر فضل و کرم رکھ۔

جہنم وغیرہ کے جو شدید ترین عذاب ہیں، وہ تو خیر انتہائی چیزیں ہی ہیں، باقی میدانِ حشر میں رسوائی، عام تفضیح یہ کچھ کم ہے! ذرا اس پر خیال تو کیا جائے۔

اٰتنا ما وعدتنا۔ یعنی اجرِ موعود، جنتِ معہود۔

علیٰ رُسُلِكَ۔ اللہ کے وعدے معتبر تمام تر وہی ہیں جو پیمبروں کی وساطت سے ہوں، مہرِ تصدیق صرف انہی پر لگی ہے نہ کہ اپنی عقل و ذہانت سے فرض کیے ہوئے وعدوں پر۔

ربّنا۔ دعا میں بار بار اس لفظ کی تکرار، اللہ کی صفتِ ربوبیت کو بار بار مخاطب کرنا اور گویا اسے اس کی صفت کا واسطہ دینا دلیل ہے، دعا کرنے والے کی خشیت اور الحاح اور تضرّع کی۔

۴۰۸ (اس لیے تیرے وعدہ پر تو قطعاً بھروسہ ہے لیکن اس کا اطمینان تو نہیں کہ ان وعدوں کا تحقق ہمارے ہی حق میں ہو، ہم ہی ان وعدوں کے مصداق ٹھہریں)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ

سو ان کی دعا کو ان کے پروردگار نے قبول کر لیا ۴۰۹ اس لئے کہ میں تم میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ وہ مرد ہو

ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا

یا عورت ضائع نہیں ہونے دیتا تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو ۴۱۰ تو جن لوگوں نے ہجرت کی (راہ

مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

خدا میں) اور اپنے شہروں سے نکالے گئے اور (اور بھی) تکلیفیں انھیں میری راہ میں دی گئیں اور وہ لڑے

عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ

اور مارے گئے ان کی خطائیں ضرور ان سے

۴۰۹ (اور انھیں اپنے فضل و کرم کی جنت میں داخل کر دیا)

استجاب۔ یہاں بھی اَجاب کے معنی میں ہے۔

استجابہ لے اجابہ (قرطبی)

۴۱۰ (اور تم دونوں الگ الگ قسم کی مخلوق نہیں ایک ہی نوع کی دو شاخیں ہو۔)

اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ۔ ہر زبان کا ایک مخصوص اسلوب بیان و طرز انشا ہوتا ہے اوپر سے برابر صیغۂ غائب چلا آ رہا ہے۔ اب دفعۃً اس آیت کے اندر صیغۂ متکلم آ گیا، عربی ادب و انشا میں یہ فوری انتقال صیغہ داخل عیب نہیں، داخل ہنر ہے اور اپنے موقع و محل پر ایک خاص صنعت، جسے صنعتِ التفات کہتے ہیں۔ یہاں صیغۂ متکلم دلالت کر رہا ہے تخصیص و تحقیق پر

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ جاہلی مذہبوں میں بلکہ مسیحیت میں بھی عورت ہونا بجائے خود ایک نقص بلکہ جرم تھا۔ عورت غریب محض اس لئے کہ عورت تھی، بہت سے درجات، بہت سے ثوابوں سے محروم تھی۔ اس گمراہی کو مٹانے کے لئے صراحت کے ساتھ یہ بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ جنس مذکر و مؤنث سے عمل و اجر عمل پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عمل کے لحاظ سے مرد ہو یا زن، ہر ایک یکساں ہے، نماز اس کی بھی مقبول، اس کی بھی، روزہ اس کا بھی قبول، اس کا بھی، جنت اس کی بھی قابل تعداد اس کی بھی۔ وعلیٰ ہذا

لَاۤ اُضِیْعُ۔ صیغۂ متکلم لا کر یہ بھی بتا دیا کہ عمل پر ثمرات کا ترتب تمام تر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، یہ نہیں کہ ارادۂ الٰہی کے بغیر ثمرات کا ترتب از خود اور میکانکی طور پر ہو جایا کرے۔

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ۔ یہ تصریح ہے اس کی کہ انسانیت دونوں جنسوں میں مشترک ہے۔ اس لئے حکم بھی دونوں کا مشترک ہی رہے گا۔ اور عمل اور قبول عمل کے لحاظ سے دونوں جنسیں بالکل ایک ہیں۔

لانہما من اصل واحد (بیضاوی) لا تفاوت فی الاجابۃ ولا فی الثواب بین الذکر والانثی (کبیر) بیّنت فیہا شرکۃ النساء مع الرجال فی ما وعد اللہ عبادہ الصالحین (مدارک)

وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ

معاف کر دی جائیں گی ۲۱۱ اور میں ضرور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریاں بہہ رہی ہوں گی (یہ) اللہ کے

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ

یہاں سے بدلہ ملے گا۔ اور اللہ ہی کے پاس تو بہترین ثواب ہے ۲۱۲ (یہ) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا کہیں تجھے دھوکے

كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۟ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ

میں نہ ڈال دے ۲۱۳ (یہ) چند روزہ بہار ہے ۲۱۴ پھر تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ

اور وہ کیسی بری آرام گاہ ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ذرا اسے بھی یاد کر لیا جائے کہ دونوں جنسوں کے درمیان اشتراکِ انسانیت کی یہ تعلیم بیسویں صدی عیسوی میں نہیں ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مل رہی ہے، جبکہ فرنگستان اور ہندوستان دونوں میں عورت ہونا خود ایک جرم تھا اور عورت کا وجود مرادف تھا گندگی اور ناپاکی کے، اس تعلیم کی پوری قدر تاریخ کے اس استحضار کے بعد ہی ہوگی۔

مِنْ ذَكَرٍ میں مِنْ تاکید کے لئے ہے۔

دخلت من للتاکید (قرطبی) بیان لعامل وتاکید لعمومه۔ (روح)

۲۱۱ (اور یہ کفارۂ سیئات والا انعام علاوہ اُس اجر کے ہوگا جو انہیں اپنے اعمالِ شاقہ اور حسنات پر ملے گا)

الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا ..... وَقُتِلُوْا۔ یہ ذکر ہو رہا ہے حضورؐ کے رفیقوں اور صحابیوں کی جاں نثاریوں کا، اور بیان میں چند اعمال کا جو نام لے کر ذکر کیا گیا ہے یہ بطور مثال و نمونہ کے ہے فہرستِ حسنات کے چند نمایاں عنوان لا کر گویا بتا دیا کہ انہی پر سلسلے اعمالِ حسنہ کا قیاس کر لیا جائے۔ اس سے اُن حسنات کا حصر مقصود نہیں کہ یہی چند اعمال کفارہ کا کام دے سکیں گے

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ۔ اس تصریح سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ حضرات باوجود ان مرتبوں کے یا وجود صحابی، مہاجر اور مظلوم فی سبیل اللہ اور غازی اور شہید ہونے کے معصوم نہ ہوں گے لغزش و خطا سے اور وہ ہوں گے صاحبِ سیئات ہوں گے، عام بشری لغزشوں کے یہ بھی مرتکب ہوں گے البتہ فضلِ خداوندی ان کے حسنات کو ان کے سیئات پر کہیں غالب رکھے گا ــــــ آج جو ہر "شیخ" اور ہر "بزرگ" کو عملاً تقدس مآب و معصوم اور بشریت سے ماورا سمجھا جانے لگا ہے، اس عقیدۂ فاسد کی تردید قرآن مجید قدم قدم پر کر رہا ہے۔

۲۱۲ صیغۂ حصر کا وارد ہوا ہے، یعنی یہ بہترین و برترین نعمت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں۔

ای یختص به ولا یقدر علیه غیره (مدارک) ای یختص به وبقدرته وفضله لا یثیبه غیره ولا یقدر علیه (کشاف)

۲۱۳ یعنی اے مخاطب اہلِ کفر کا حظوظِ دنیوی سے بہرہ ور ہونا، مادی نعمتوں کا حصہ دار ہونا کہیں تجھے اس دھوکے میں نہ ڈال دے کہ ان کی حالت بھی قابلِ وقعت اور مستحقِ احترام ہے ــــــ یہ دھوکا بھی کتنا عام ہے اور آج دنیا کتنا زیادہ

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا

ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے (یہ تو) مہمانی (ہو گی)

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ

اللہ کی طرف سے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیکوں کے حق میں کہیں بہتر ہے ۴۱۵ اور اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی

الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ

ضرور ہیں جو اللہ پر اور تم پر جو کچھ اتارا گیا ہے اور جو کچھ اُن پر اتارا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ سے

خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

ڈرنے والے ہیں، اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے ۴۱۶

اس دھوکے میں پڑی ہوئی اور اس فریب پر بنی ہوئی ہے۔

الخطاب لکل احد (مدارک) ھذا الخطاب لکل من سمعہ من المکلفین کانہ قیل لا یغرنک ایھا السامع۔ (کبیر)

۴۱۴ آخرت کی ابدی نعمتوں اور سرفرازیوں سے ان حظوظ دنیوی کو نسبت ہی کیا؟

حدیث نبوی میں آیا ہے کہ دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں کوئی سمجھنا چاہے تو موجیں مارتے ہوئے سمندر میں انگلی کی نوک ڈالے اور نکال لے اور پھر دیکھے کہ کتنا پانی اس میں آیا ہے ـــــ دنیوی لذتوں کی بے حقیقتی بے ثباتی بے قدری کا سبق قرآن مجید نے قدم قدم پر دیا ہے اور اس کا استحضار اگر رہے تو کسی معصیت کے سرزد ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔

متاع۔ کے لفظ میں خود ہی عارضی اور زود فنا ہونے کا تصور آگیا۔ اس کی تاکید در تاکید صفت "قلیل" لاکر کر دی گئی

۴۱۵ (ہر دنیوی لذت و نعمت سے کیا کیفیت میں کیا کمیت میں کیا پائیداری میں، غرض ہر اعتبار و ہر حیثیت سے)

وما عند اللہ۔ یعنی اخروی نعمتوں کی قسموں میں سے۔

ای من الامور المذکورۃ الدائمۃ لکثرتہ ودوامہ۔ (روح)

اتقوا ربھم۔ اور اس تقوی الہی کی پہلی منزل قبول اسلام ہے۔

نزلا من عند اللہ۔ اللہ نے اہل جنت کو اپنا "مہمان" ٹھہرا کر ان کا مرتبہ اعزاز و اکرام جس حد تک اونچا کر دیا ہے، الفاظ ان کے ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

النزل ما یھیأ للضیف (کبیر)

۴۱۶ یعنی کسی بھی مصلحت و منفعت کے خیال سے اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف، ترمیم، تصحیف، تلبیس گوارا نہیں کرتے۔

ثمنا قلیلا۔ پر حاشیے اوپر گزر چکے ہر دنیوی معاوضہ خواہ ہو یا چھوٹا، آخرت کے مقابلہ میں بالکل حقیر ہی قیمت کا کہا جائیگا

یؤمن باللہ یعنی اللہ کی ذات و صفات پر ان کا ایمان پورے توحیدی رنگ میں ہے اس میں شرک کی آمیزش نہیں۔

ما انزل الیکم۔ خطاب مؤمنین سے ہے یعنی قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ مدح جیسا کہ ظاہر ہے ان اہل کتاب کی ہو رہی ہے جنھوں نے رسول اللہ کی تصدیق کی اور اسلام قبول کر لیا۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾ يَا أَيُّهَا

انھیں ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ضرور دے گا، بے شک اللہ حساب بہت جلد لے لینے والا ہے ۲۱۷ اے ایمان والو

الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

(خود) صبر کرو اور مقابلے میں صبر کرتے رہو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو عجب نہیں جو فلاح پا جاؤ ۲۱۸۔

ع ٢٠ / ١١

۲۱۷ (سو وہاں کسی کو انتظار کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی)
حشر کے مجمع عظیم کو دنیوی مجموں کی چپقلش اور دنیوی عدالتوں کی تعویق اور تاخیر پر ہرگز قیاس نہ کیا جائے، دم بھر میں وہاں سب کے حساب چک جائیں گے ـــــ اور نافرمانوں کو جو وہاں امتداد وقت کی تکلیف ہوگی وہ بطور عذاب کے ہوگی۔

۲۱۸ آیت میں جامع و مانع ہدایت فلاح ساری امت کے لئے آگئی، کیا انفرادی و شخصی اور کیا اجتماعی و ملی۔
اصْبِرُوا۔ یعنی جو صعوبتیں راہ حق میں از خود پیش آئیں، ان پر صبر کئے جاؤ۔ خواہ اس صبر کا تعلق مشقت و تعب عبادات سے ہو، خواہ نفس کی مرغوب و محبوب خواہشوں کے ضبط سے۔
ای علی مشاق الطاعات وما یصیبکم من الشدائد (بیضاوی) ای الصبر بالطاعات وعن الشہوات (قرطبی) قال الحسن وقتادۃ وابن جریج والضحاک اصبروا علی طاعۃ اللہ (جصاص)
صَابِرُوا۔ یعنی جو مصیبتیں مخالفین و معاندین کے ہاتھوں پیش آئیں، انھیں بھی برداشت کرو۔
ای غالبوا اعداء اللہ بالصبر علی شدائد الحروب (بیضاوی)
رَابِطُوا۔ یعنی خارجی دشمنوں اور اپنے اندرونی دشمن (نفس) دونوں سے مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔
الرباط حمل النفس علی النیۃ الحسنۃ والجسم علی فعل الطاعۃ ومن اعظمہ ارتباط الخیل فی سبیل اللہ وارتباط النفس علی الصلوٰۃ (ابن العربی)
مرابطہ۔ کے معنی دشمنوں سے مقابلہ کی تیاری (مبارزۃ الاعداء) کے ہیں۔ اور اس تحت میں ہر قسم کی جنگی تیاریاں آجاتی ہیں۔ جو عصر جدید کے تقاضوں کے تحت دشمنان دین کے مقابلہ میں کی جائیں۔
فیدخل فی ذالک مبارزتہم فی ہذا العصر بالبنادق والمدافع والسفن البحریۃ والبریۃ والہوائیۃ وغیر ذالک من الفنون والعدد العسکریۃ ویتوقف ذالک کلہ علی البراعۃ فی العلوم الریاضیۃ والطبیعیۃ فہی واجبۃ علی المسلمین فی ہذا العصر (المنار) مترصدین الغزو مستعدین لہ بالخیل فی ذالک المبلغ الاوفی الکثر من اعدائکم (روح)
وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ صبر یا مصابرہ یا مرابطہ سب کا اصلی مصدر اور آخری ماخذ تقویٰ الٰہی ہے آخر میں اسی کی تاکید ہے اور اسی کا نتیجہ دنیا و عقبیٰ میں فلاح ہے۔
ولا بد للانسان فی کل فعل یفعلہ من داعیۃ وغرض ویجب ان یکون للانسان فی ہذہ المجاہدۃ غرض وباعث وذالک ہو تقوی اللہ لنیل الفلاح والنجاح (کبیر) فاخبر سبحانہ ان ملاک ذالک کلہ التقوی وان الفلاح موقوف علیہا (ابن القیم)
اب جن لوگوں نے تحمل شدائد و مصائب کا آخری مقصود و غایت، حب وطن وغیرہ کسی چیز کو بجز رضائے الٰہی کے بنا رکھا ہے وہ اپنے حال پر ذرا ایک بار غور فرمائیں۔

ضمیمہ

سورۃ آل عمران، آیت ۱۴۴، حاشیہ ۲۸۲

[راقم عاصم کے ایک قدیم اور جو انمرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کا ایک مستقل مقالہ اسم پاک "محمدؐ" پر ہے، اس مقالہ کا بیشتر حصہ قارئین کے استفادہ کے لئے یہاں بطور ضمیمہ پیش ہے۔]

اسم پاکؐ "محمدؐ"

حضورؐ کا نام نامی آپ کے دادا "عبدالمطلب" نے رکھا تھا۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ رجحان تجمس عبدالمطلب نے آثار نیک دیکھ کر محمدؐ نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولودِ سعید آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم مجموعۂ محامد اور مرجع خلائق بنے۔ ارباب تصوف موشگافی کی انتہا کر دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ لفظ "محمدؐ" خدا کے نام "احد" سے مشتق ہے۔

اگرچہ عام طور پر نام کی صرف اس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ چند چیزوں میں باہم امتیاز قائم رہے لیکن نام کی صحیح اور حقیقی غرض یہ نہیں۔ اسم کو اپنے مسمّیٰ کے صفات خواص اور حالات کا آئینہ ہونا چاہئے۔ افراد کے نام رکھنے میں تو اس کا کم لحاظ کیا جاتا ہے لیکن عموماً انواع و اجناس کے نام اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں، مثلاً انسان بلحم، آدم شاذ و نادر طریقہ پر افراد و اشخاص کے ناموں میں بھی اس کا لحاظ کر لیا جاتا ہے جیسے "مسیح" اور "بدھ" یہ دونوں نام اپنے مسمّیٰ کے اوصاف اور خواص کو بتلاتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ سے پہلے عرب میں کہیں اس نام کا پتہ نہیں چلتا مؤرخین اکثر لکھتے ہیں۔ ولم یکن شائعاً بین العرب ھذا الاسم۔ اس حالت کو تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اتفاقی طور سے "نام مبارک" کا "عبدالمطلب" کے ذہن میں آنا منشاء خداوندی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نام کا محل کامل دنیا کو اپنے وجود گرامی سے مشرف کر چکا تو پھر اسم بھی فطری طور سے نام رکھنے والے کے ذہن میں وارد ہوا۔

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ "وہ ذات جس کی تعریف کی گئی" اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس جامعیت کبریٰ، برزخ کامل اور مقصود آفرینش کے فضائل و کمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجب توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح و ستائش ہیں اس لئے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تخصص کو اور زیادہ وسعت دیں، صاحب مفردات "محمدؐ" کے معنی لکھتے ہیں: الذی اجتمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمدؐ کے معنی مجموعۂ خوبی کے ہیں

ع

لے کر تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

کارساز قدرت کی وسعت لا محدود اس کے کرشمے ناقابل شمار اس کی خلقت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے وا ہے۔ غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لئے ایک معیار مقرر کیا ہے مخلوقات

کی ہر نوع کا ایک درجۂ کمال ہے کہ جس کے آگے اُس کا قدم نہیں بڑھتا، حیوانات "نباتات" اور "جمادات" تک میں اس کے
شواہد مل سکتے ہیں، صورتیں ایک ہی شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں، لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس
اعلیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جا کر
ختم ہوتے ہیں، ہم مقصود فطرت اور نقطۂ تخلیق کہہ سکتے ہیں ——— اس نقطۂ تخلیق کی اصطلاح کو
پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہئے یہ بات تھوڑے غور و فکر سے بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے تفحص اور تفتیش کے بعد
تمام انواع مخلوقات کے اوصاف کا ایک درجۂ اعلیٰ پاتے ہیں کہ جس کے آگے انسانی معلومات میں کوئی درجہ نہیں۔

دوسرے تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے دوسری مخلوقات
اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سیکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے
ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوع مستقل ہے۔ آفرینش انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی
شکل و شباہت اس کے اعضاء و جوارح اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے سب چیزیں وہی ہیں جو دنیا کے پہلے
انسان کی تھیں لیکن دماغی کیفیتوں کا حال اُن سے جداگانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء و اختلاف جاری ہے۔ اب اگر انسان کی
اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد دونوں زمانوں کی تاریخ میں ارتقائے دماغی کی آخر
ترین سرحد اگر کوئی معلوم ہو سکتی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے لغات قاموس نے
لفظ "حمد" کے ایک معنی قضاءُ الحق کے بھی بتلائے ہیں پس لفظ "محمد" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو یعنی
قدرت کی جانب سے نوع انسان کو جس سرحد کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق تخلیق مقرر تھا
وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا علم و عمل خلق و تخلق، دماغ و کیرکٹر ارتقائے ذہنی و ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان
کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لبِّ لباب ہیں، اوّل ثانی کے لئے بنیاد ہے عمل علم پر کیرکٹر دماغ پر خلق تخلق پر قائم ہے، یہ ایک
عجیب نکتہ ہے جس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی کہ جتنی ہی کسی انسان کی حالت مکمل ہوگی اسی قدر اس کی خلقی
کیفیت راسخ و مستحکم ہوگی ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے
تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ کیرکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت صلعم کی ذات مبارک نے
پیش کیا عالم انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے حتی کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو فرما دیا گیا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ
محاوراتِ عرب سے حمد کے یہ بھی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا جاہلیت میں نیزہ کے بھرپور
پڑنے کے وقت حَمِدتُ بلاءَہٗ (میں نے وار پورا کیا) کا محاورہ بہت مشہور ہے۔ اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر
کے مضمون کو پیش نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی مخلوق کامل کے بھی ہیں۔

منجملہ دیگر کمالاتِ نبوت و معجزاتِ رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضور اقدس کا نامِ نامی بھی ہے۔ یہ زندۂ جاوید
معجزہ بعثت کے وقت سے تاہنوز اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ محمد الذی حمد
مرۃ بعد مرۃ، جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں
بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی و کوشش کے مطابق جس درجہ ترقی کرتا جاتا ہے محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعۃً
رسالت مآب روحی فداہ صلعم کے کمالات سے پردہ اٹھتا جاتا ہے علماء و فضلاء یورپ کی اکثریت تاریخ اسلام کے ماتحت

اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے، دنیا کی مختلف پریشانیوں اور بے قراریوں کو معدوم کرنے کی ضرورت جتنی ہی اس کے نزدیک بڑھتی جاتی ہے، بادلِ ناخواستہ انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبانِ اعتراف کھولنا پڑتا ہے کہ بے شبہ پیغمبر عرب کے قانون دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور ان کی زندگی عالمِ انسان کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہلِ ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت، ورسادگی کی طرف بڑھ رہا ہے اسی قدر وہ پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو برس پیشتر سے، اس آنے والی حالت کا پتہ دے رہا ہے۔ مستقبل میں دنیا کی عمر جس قدر دراز ہوگی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر امید نہیں اور خواہ اپنے پچھلے سبق دہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالاتِ نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا اس حیثیت سے نامِ مبارک محمد صلعم کا ترجمہ سلسلۂ اوصاف و محامد ہوگا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ اور اس کے شعبہائے حیات کی تفصیل ہو۔ مگر نام نامی آقائے نامدار اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام کے رکھنے کے متعلق ضرور عبدالمطلب کو ایک غیبی تحریک ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دشمن کی یکساں تنقید، حاضر و غائب کی متفق رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم و عمل، ظاہر و باطن، خلق و خلق ہر حیثیت سے حضور کی زندگی قابلِ تعریف تھی اور اسی خلاصۂ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے بھی زیادہ عجیب امر یہ ہے کہ نام مبارک حضور کے صرف نبی بلکہ خاتم النبیین ہونے کی دلیل بھی ہے۔ کمال و کمالِ اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں، دوسرے انبیاء علیہم السلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا لیکن حضور کی جامعیت آپ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ لفظ "محمد" کے معنی "مجموعۂ خوبی" اور "مخلوق کامل" کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس کے آگے کوئی نقطہ ہی نہیں ہے۔ اسی حالت پر کمالِ کلی کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔ مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے آنحضرت کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے وہ باوجود ہزار تنقیص اعترافِ کمال پر مجبور ہوئے ہیں۔ سر ولیم میور اور مارگولیتھ جیسے سخت لوگوں کو بھی کھلے اور چھپے لفظوں میں اس کا اقرار کرنا پڑا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم انتہائی سچائی اور حقیقی صداقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ عہدِ نبوت میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں کہ بعض سخت ترین منکر ایک توجہ نظر اقدس کی تاب نہ لا سکے۔ عبداللہ بن سلام جو نامور علماء یہود میں سے تھے وہ جس طرح اسلام لائے معلوم ہے بعثت کے حالات سیرتِ طیبہ، تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی خاصیت اور بے اختیارانہ کشش کو نام مبارک میں بیان کیا گیا لفظ "محمد" عربی زبان میں تحمید سے مشتق ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے اس باب کے معنی کے خواص میں سے ہے کہ کسی کام کا وجود میں آنا اس طور پر مانا جائے کہ گویا کسی مخفی یا ظاہر طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لئے مجبور کیا جیسے صرّف (پھیر دیا) یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کر کے پھیر دیا اسی طرح "محمد" کے معنی ہیں وہ جس کی تعریف بے اختیار کی گئی ہو۔ اس معنی سے اسی قوتِ جاذبہ اور کششِ اصلی کی طرف اشارہ ہے۔ عبداللہ بن سلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ چہرۂ اقدس کو دیکھتے ہی پکار اٹھے

هذا الیس یوحنا کہ آج یورپ میں بڑی ہوشیارانہ تدبیر سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدترین پیرایوں میں دکھانے کی کوششیں کی گئی ہیں لیکن اب آج کل بعض جماعتوں اور خداترس بندوں کی طرف سے جو مساعی جمیلہ کی جا رہی ہیں انھوں نے تجربہ کرا دیا کہ جب کبھی اصل صورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے تو انھوں نے یہی کہا کہ یہی تو ہمارا گنجینۂ مقصود ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کے اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصاء کئے ہوئے ہے کوئی جزو اس سے چھوٹا ہوا نہیں استعمال میں آتا ہے ﴿فَقَتَّلَهُ تَقْتِيلًا﴾ یعنی خوب خوب قتل کیا اس خاصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے نام مبارک کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ "محمد" یعنی جس کا جزو جزو قابل تعریف ہے اصلاح نفس "تدبیر منزل اور تدبیر مدن" کی وہ کونسی شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلعم نے پیش نہیں کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمالِ اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی رکھتا تھا یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد و نہایت کو پہنچا تو ضرورت ہوئی کہ عالم انسان کے سامنے ایک ایسا نمونۂ کامل پیش کیا جائے جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو جس کی زندگی کو سامنے رکھنے سے موسویانہ سختی مسیحانہ اخلاق ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آجائے۔ اور پھر ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی جامع اور برزخ کامل ذاتِ پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی لئے حضرت مسیحؑ نے اپنی بشارت میں لفظ "احمد" فرمایا یعنی وہ آنے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہو گا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب نے اپنی کامل نشو و نما جب ہی پائی ہے جب وہ معرفت و روحانیت کی آغوش سے نکل کر سلطنت اور حکومت کی گود میں چلے گئے ہیں مسیحی مذہب کی ترقی رومی بادشاہوں کی رہین احسان ہے۔ بودھ نے بہت کچھ تبلیغ کی لیکن اس کا عالمگیر مذہب بھی اسی وقت اپنی تکمیل کر سکا جب وہ اشوک خاندان کی سرپرستی میں آگیا لیکن اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے وہ جن جن ملکوں میں گیا اور جن جن جماعتوں میں پھیلا اخلاق و روحانیت سے گیا غرب تلوار اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے افریقہ اور ہندوستان کی نظیریں اس بارہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خاص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ بظاہر اسباب ان مفاسد کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی لیکن فطرت کی تدبیریں اندر اندر جاری رہتی ہیں اور ایک وقت معین پر ظاہر ہو جاتی ہیں فطرت کی رفتار ہوا کی طرح تیز اور سیلاب کی طرح نرم ہوتی ہے۔ خوش تدبیری اور حسن اسلوب کے موقع پر بھی حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، پس لفظ محمد کے ایک یہ بھی معنی قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش تدبیری نے ترقی کی آپ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا جس کی شریعت اور حیرت انگیز جد و جہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دنیا متحیر ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع بہتیرے فضائل کا خلاصہ ہے، ایک طرف وہ اپنے مسمّٰی کے کام اور کام کے انجام کی پیشین گوئی ہے، دوسری طرف اُس کے کاموں کی تاریخ اور اس کی تعلیم کا لُبّ لباب ہے۔

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے نبی کا ایسا پاک نام رکھا، اور پاکیزہ ہے وہ نبی جسے اس کے معبود نے ایسی فضیلتوں سے آراستہ کیا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۴)

سُورَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ

رکوعاتها ۲۴ — آیاتها ۱۷۶

سورۂ نساء ۔ مدنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ نہایت مہربان باربار رحمت کرنے والے کے نام سے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اے لوگو اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا [۱]

[۱] یعنی ابوالبشر حضرت آدمؑ سے۔

وحدتِ نوعِ انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دوررس نتائج کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ آخری جدِ اعلیٰ گورے اور ہر کالے کے، ہر وحشی اور ہر مہذب کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اور وہ آدمؑ ہیں، یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلیٰ کوئی اور تھے، اور فلاں نسل کے کوئی اور، اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہماجی کے مُنہ سے پیدا ہوئے اور چھتری نسل والے ان کے سینے سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شُدر ذات والے اُن کی ٹانگوں سے نہیں، بلکہ اصلاً انسان انسان سب ایک ہیں۔

خَلَقَكُمْ مسئلۂ ارتقاء کس حد تک کس معنی میں صحیح ہے، قرآن مجید کو اس سے مطلق سروکار نہیں۔ انسان بہرحال و بہرصورت خلق ضرور ہوا ہے۔ قرآن انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کر رہا ہے اور ہر اس نظریہ اور عقیدہ کی تردید کر رہا ہے جو انسان کی "تخلیق" کے منافی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے، خواہ کوئی کسی نسل، کسی رنگ، کسی قوم، کسی جنس، کسی ملک کا ہو، ایمان اور ایک درجہ میں تقویٰ کے مکلّف سب ہیں ــ قرآن کا پیام سارے ہی بنی آدم کے لئے ہے، جن مفسرین نے اسے اہلِ مکہ کے لئے خاص سمجھا ہے، ان کے پاس اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں، خصوصاً جبکہ سورت مکی ہے بھی نہیں بلکہ بالاتفاق مدنی ہے، اور لفظ ناس ہے بھی نوعِ بشر کے لئے۔

خطاب عام ليس خاصًا بقوم دون قوم فلا وجه لتخصيصها باهل مكة ... ولفظ الناس اسم لجنس البشر (المنار)

اتَّقُوْا رَبَّكُمْ پروردگار سے ڈرنا، اُس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے، ورنہ پروردگارِ عالم بجائے خود کوئی خوف کھانے والی چیز نہیں، وہ تو تمام تر محبت اور عظمت والی ہستی ہے، لفظ رب میں خود یہ اشارہ موجود ہے کہ جن احکام کی مخالفت سے ڈرایا اور روکا جا رہا ہے، خود ان کی غایت بھی بندے کی ربوبیت اور پرورش ہی ہے۔

وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً ۚ

اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ؎۲ اور ان دونوں سے بہ کثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے ؎۳

؎۲ یعنی حضرت حوّا ؑ کو۔

تخلیقِ حوّا ؑ کی تفصیلی کیفیت سے قرآن مجید تو یکسر ساکت ہے، اور تقریباً یہی حال حدیث کا بھی ہے۔ جس مشہور حدیث کی رُو سے حضرت حوّا ؑ کا حضرت آدم ؑ کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ حضرت آدم ؑ کا ہے نہ حضرت حوّا ؑ کا، بلکہ محض عورت کی پیدائش اور اس کی کج سرشتی کا بیان ہے۔

آثار میں جو روایت ملتی ہے، وہ روایت توریت کی آواز بازگشت ہے، اور توریت کا بیان حسب ذیل ہے:

"خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا، اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا" (پیدائش ۲: ۲۱، ۲۲)

منہا۔ ضمیر ھا عموماً نفس کی طرف پھیری گئی ہے، لیکن ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ منہا یہاں من جنسہا کے مرادف ہے

القول الثانی ما ھو اختیار ابی مسلم الاصفہانی ان المراد من قولہ وخلق منہا زوجہا ای من جنسہا (کبیر) ویحتمل ان یکون المعنی من جنسہ لا من نفسہ حقیقۃً۔ (نہر)

اور یہی قول علاوہ ابو مسلم کے ابن بحر سے بھی منقول ہوا ہے۔

وقیل ھو علی حذف مضافٍ التقدیر وخلق من جنسہا زوجہا قالہ ابن بحر وابو مسلم (بحر)

اور نفس کو جنس کے معنی میں قرآن مجید میں بار بار لایا گیا ہے، جیسا کہ صاحب المنار نے تصریح کے ساتھ اپنے ہاں نقل کر دیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے محض بطور تشبیہ کے ارشاد فرمائی گئی ہو، اور مقصود محض اس کے عدم ثبات کو ظاہر کرنا ہو جیسا کہ قرآن مجید ہی میں ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی سے ہوئی ہے۔

یحتمل ان یکون ذالک علی جہۃ التمثیل لاضطراب اخلاقہن وکونہن لا یثبتن علی حالۃ واحدۃ کما جاء خلق الانسان من عجل (بحر)

اور اس معنی کی "تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث میں ذکر جنس عورت کا ہے نہ کہ شخصاً حضرت حوّا ؑ کا۔

ویؤید ھذا التاویل قولہ ان المرأۃ فاتی بالجنس ولم یقل ان حوّاء (بحر)

اور بعض شارحین حدیث مثلاً کرمانی حدیث مذکور کی شرح میں اسی طرف گئے ہیں کہ یہ فطرتِ نسوانی کی کجی کی طرف صرف استعارہ ہے

استعارۃ للمعوج ای خلقہن خلقا فیہ اعوجاج (مجمع بحار الانوار جلد ۲ ص ۲۹۴) وقد حمل العوج بعض العلماء علی المجاز والمعنی ان العوج ھو المیل عن الاعتدال وحب الند ودھو شان المرأۃ (حاشیہ تفسیر ابن کثیر مطبوعہ مصر)

بخاری کی ایک حدیث میں تو بالکل صاف ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلعم قال المرأۃ کالضلع ان اقمتہا کسرتہا (صحیح بخاری۔ کتاب النکاح)

اور یہی حدیث مسلم نے بھی (کتاب الرضاع میں) حضرت ابوہریرۃؓ ہی کی سند سے نقل کی ہے۔

خود ضلع کا مفہوم پسلی کا تو ثانوی ہے، اصل معنی کجی و انحراف ہی کے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ

اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو ۔ اور قرابتوں کا بھی لحاظ رکھو بے شک اللہ

رَقِیْبًا ① وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ

تمہارے اوپر نگران ہے اور یتیموں کو ان کا مال پہنچا دو اور پاکیزہ کو گندی (چیز) سے مت تبدیل کرو

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ②

اور ان کا مال مت کھاؤ اپنے مال کے ساتھ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے

الصلع للمیل (کشاف، معالم، زمخشری) الصلع الاعوجاج ای الربع حتی یمیل صاحبہ عن الاستواء والاعتدال (نہایہ)

۳ دونوں جنسیں اسی ایک جوڑے یعنی حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ سے دنیا میں چلی ہیں۔

منھما خیال رہے کہ یہ ساری انسانی آبادی جو چلی ہے تنہا آدمؑ سے نہیں اس جوڑے سے مل کر چلی ہے۔

کثیرا۔ آدمؑ کے وقت سے لے کر آج تک جو آبادی ہر ملک اور ہر زمانہ کی رہی ہے یا جو قیامت تک ہوگی اس کے مجموعہ پر بھی اگر کثیر کا اطلاق نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟

۴ (اپنے حقوق اور مراعات)

قال الزجاج تطلبون بہ حقوقکم (بحر)

بہٖ یعنی اس کے نام کا واسطہ دلا دلا کر۔ آیت سے اللہ کے واسطہ سے مانگنے کا جواز نکل آیا۔

وفی الآیہ دلالۃ علی جواز المسئلہ باللہ تعالٰی (جصاص)

۵ (اور اس حکم کو ہلکا نہ سمجھو)

الارحام۔ رحم کی جمع ہے اور اس کا اطلاق بڑا وسیع ہے سارے عزیز و قریب اہل خاندان اس کے اندر آجاتے ہیں۔

الرحم اسم لکافۃ الاقارب من غیر فرق بین المحرم وغیرہ (قرطبی) ہو ابعاز الرحم اعرابہ و ستھمام ای قرابہ (ماجد)

الارحام۔ کا عطف آیت میں خوب غور کر لیا جائے، اللہ پر ہے — یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی اہمیت اسلام میں! در حقیقت امت کے نظام اجتماعی کا سنگ بنیاد ہے، شریعت نے قرابت یا رحم ہی کو قرار دیا ہے، عزیزوں، قریبوں، خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حسن سلوک اسلام میں کوئی دوسرے درجہ کی چیز نہیں، اول درجہ کی اہمیت رکھنے والی ہے

وفی عطف الارحام علی اسم اللہ دلالۃ علی عظم ذنب قطع الرحم (بحر) وقرن سبحانہ تعالٰی الارحام باسمہ الکریم علی ان صلھا بمکان منہ (بیضاوی) فیہ تعظیم لحق الرحم وتاکید النھی عن قطعھا (جصاص)

اور اسی معنی میں یہ حدیث بھی آئی ہے۔

الرحم معلقۃ بالعرش تقول اَلَا مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَہُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَہُ اللّٰہُ

(رحم بھی عرش الٰہی سے معلق دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رکھے اللہ اسے جوڑے رہے اور جو مجھے کاٹے اللہ اسے کاٹے)

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے باب میں انصاف نہ کر سکو گے ۵ تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ۹

فقہاء اس پر متفق ہیں کہ قرابت کا لحاظ واجب ہے اور اسے قطع کرنا جرم ہے۔

اتفقت الملۃ علی ان صلۃ الرحم واجبۃ وان قطیعتہا محرمۃ (قرطبی)

۶ (تمہارے ذاتی، خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات میں)

اگر اس کا استحضار رہے تو آج افرادِ اُمت کی خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار ہو جائیں!

۷ یتیم یعنی بن باپ کے بچوں اور بچیوں کا مسئلہ ہر قوم میں اہم و نازک رہا ہے۔ قرآن اب بیان اسی باب میں ہدایتیں دے رہا ہے۔

واٰتوا الیتٰمٰی اموالہم یعنی ان یتیموں کے بالغ ہونے پر ان کی جائداد، ان کا سامان ان کے حوالہ کر دو، اور اس کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ یتیم اپنی جائداد کا مطالبہ کرے بھی۔

وفی ہذہ الآیۃ دلالۃ علی وجوب تسلیم اموال الیتٰمٰی بعد البلوغ وایناس الرشد الیہم وان لم یطالبوا بادائہا (جصاص)

خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے۔ یتیموں کے سپرد ان کی جائداد ان کے بالغ اور سمجھدار ہو جانے کے بعد ہی کرنا چاہئے۔ اس کے قبل نہیں۔

ان الیتیم لا یجب اعطاء مالہ قبل البلوغ (جصاص) انما یجب الدفع الیہم بعد البلوغ وایناس الرشد (جصاص)

ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب یعنی ایسا نہ ہونے پائے کہ ان نابالغ یتیموں کی اچھی چیز نکال کر اپنے مال میں ملالی اور اپنی طرف کی کوئی گھٹیا چیز اُن کے حصہ میں شامل کر دی۔

ولا تاکلوا اموالہم الٰی اموالکم یعنی اپنے حصہ کے ساتھ یتیموں کے حصہ کو بھی خلط ملط کر کے۔

ای لا تاکلوہا مضمومۃ الٰی اموالکم (بیضاوی) الٰی اموالکم ای مع اموالکم (بحر)

لا تاکلوا میں اکل سے مراد کھانا لفظی معنی میں نہیں، بلکہ اپنے تصرف میں لانا، وسیع معنی میں ہے۔

وعُبّر بالاکل بانفاق المال (راغب) اراد بہ جمیع التصرفات المہلکۃ للمال (معالم) لیس المراد نفس الاکل... عُبّر عن التصرفات بالاکل (قرطبی)

"اردو محاورہ میں بھی کھانا علاوہ اپنے لفظی معنی کے مجازی معنی میں بھی مستعمل ہے، مثلاً دو روپیہ کھا گیا"۔

انّہ ضمیر اسی دست درازی اور یتیموں کے مال میں گڑبڑ کرنے کی طرف ہے۔

ای الاکل (قرطبی)

حوبًا حوب کے معنی بڑے گناہ کے ہیں۔

ای ذنبًا عظیمًا (کشاف) الحوب الاثم الکبیر (کبیر)

ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس مسلم نہیں، منکر ہیں۔ اس پر بھی اس کے قائل ہیں کہ قرآن او پیمبر نے یتیموں کے حقوق کے تحفظ کا بہترین انتظام کر دیا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۸ یعنی جو یتیم لڑکیاں تمہاری نگرانی و سرپرستی میں ہیں ان کے حقوقِ مہر وغیرہ پوری طرح ادا نہ کر سکو گے۔

مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ

ان میں سے دو دو تین تین، چار چار سے تو نکاح کر ہی سکتے ہو ۹ ۱۰

خطاب یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں سے ہے۔ جاہلیت میں ایک دستور یہ تھا کہ یتیم لڑکیاں جو مردوں کی سرپرستی میں پڑتیں تو ان کے وہی سرپرست اکثر یہ دیکھ کر کہ کوئی اور ان کی طرف سے مہر وغیرہ کا مطالبہ کرنے والا اور ان کی حمایت پر کھڑا ہونے والا ہے نہیں ان کے حقوق مار لینا آسان ہے، انہی کو اپنے نکاح میں لے لیتے ان کی جائداد اپنی طرف منتقل کر لیتے، اور اداء معمول سے ان کے ادائے حقوق کی طرف سے بے التفاتی برتتے۔ یہاں خطاب اصلاً ایسے ہی اولیاء اور سرپرستوں سے ہے۔

۹ (ان یتیم، صاحب جائداد، مگر بے حمایتی لڑکیوں کے علاوہ)

ای غیرھن (قرطبی) أمروا ان ینکحوا سواھن من النساء (جصاص) من غیرھن (بیضاوی)

ماطاب لکم۔ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حسن و جمال کے معیار سے بھی طبیعت کے مقتضی پر عمل کی پوری اجازت شریعت میں موجود ہے

واصل الطیب ما تستلذہ الحواس وما تستلذہ النفس (راغب) قیل ما مالت لہ نفوسکم (روح)

قیل ما استطابتہ النفس ومال الیہ القلب۔ (بحر)

ما۔ ما یہاں من کے معنی میں ہے، اور کلام عرب میں دونوں لفظ ایک دوسرے سے ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔

والعرب تضع من و ما کل واحد ۃ موضع الاخریٰ (معالم)

اور خود قرآن مجید میں اس کے نظائر موجود ہیں۔ والسماء وما بنٰھا۔ وما رب العٰلمین او ما ملکت ایمانکم وغیرھا۔

اور یہاں بجائے من کے ما اس لئے آیا ہے کہ مقصود یہاں صفات نساء کا ذکر ہے یعنی جس قسم کی بھی عورتیں پسند ہوں، نہ کہ ان کی ذات یا شخصیت کا ذکر۔

النکتۃ فی اختیار ما علی من۔۔۔۔ وھی ارادۃ الوصف کانہ قال فانکحوا التی صنف من اصناف (المنار)

چنانچہ جب کسی کی ذات یا شخصیت سے متعلق سوال مقصود ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں۔ من ھذا الرجل؟

اور جب سوال اس کی صفات سے متعلق کرنا ہوتا ہے، تو کہتے ہیں۔ ما ھذا الرجل؟ (المنار)

من النسآء۔ اس میں بالغ نابالغ سب آ گئیں۔

والصغار والکبار داخلات فیھن۔ (جصاص)

۱۰ یعنی تم پر نکاح کے باب میں کوئی تنگی نہیں اپنی زیر نگرانی یتیم لڑکیوں کو زیر عقد لانے میں اتلاف حقوق کا اندیشہ بھی ہو تو اس خیال کو جانے دو، اور بجائے ان کے باہر والی آزاد عورتوں میں سے اپنے حسب پسند انتخاب کر لو، ایک ہی کا نہیں، بلکہ ایک سے لے کر چار تک کی گنجائش ہے۔

مثنٰی و ثلٰث و رُبٰع۔ میں واو عطف کا نہیں، تخییر کا ہے اور اَوْ کے مرادف ہے۔

وقد تخرج الواو عن افادۃ مطلق الجمع وذالک علٰی اوجہ لھذا نکون بمعنی اَوْ (راح)

چنانچہ یہاں اسی معنی میں ہے۔

والواو بمعنی اَوْ للتخییر (معالم) والواو بمعنی اَوْ فی ھذا المحل (فارن)

[illegible] کہ مجموعہ یعنی نو زوج کا جواز نکالا ہے اور بعض نے
[illegible] کے نفس تعدد کا جواز نکالا ہے۔

[illegible] وذهب بعضهم الى انه يجوز نكاح تسع
[illegible] جواز نكاح ثمانية عشر. (بحر)

جو بعض کتابوں میں یہ قول بعض متقدمین اہل سنت مثلاً امام ابن ابی لیلیٰ اور امام ابراہیم نخعی کی جانب بھی
منسوب کیا گیا ہے۔

[illegible] انه يجوز الجمع بين تسع نسوة [illegible] رضى الله عنه
[illegible] كتاب النكاح فصل مانع العدد
بس حدیث نبوی اور اجماع امت دونوں نے اس ابہام کو بالکل دور کر دیا ہے اور تعداد جواز وقت واحد میں چار تک محدود کر دی ہے۔

[illegible] لعمه الخلافية واجمع فقهاء الامصار
على انه لا يجوز [illegible] واعتمد معظم الفقهاء في اثبات الحصر على امرين الاول
[illegible] الامصار على انه لا يجوز الزيادة على الاربع وهذا هو المعتمد
[illegible] عليهما الفقهاء في هذا المقام في غاية الإحكام۔۔۔ واقوى الامرين
[illegible] على جواز نكاح اربعة من النساء [illegible] واما فوق
الاربع [illegible] كتاب النكاح فصل مانع العدد) وليس له
ان يتزوج اكثر من ذلك [illegible] على العدد ومنع الزيادة عليه (هدايه) والمراد هو التخيير بين هذه
الاعداد لا الجمع (كفايه) اجمعت الامة على [illegible] على اربع نسوة (معالم [illegible])

اگر نو ہی کی تعداد منظور تھی تو صاف یہی کیوں نہ ارشاد ہو گیا، اس قدر گھما پھیر کر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔
یہ تعدد ازدواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی مسلمان کو شرمانے اور اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی
ضرورت محسوس ہو۔ مرد کے قویٰ اور اس کی جسمانی ساخت و ترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ بہ کثرت مردوں میں ایک
بیوی مرد کی طبعی خواہش کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ مرد و عورت کے اتحاد و تناسل کا جہاں تک تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ
کے اندر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی۔ برخلاف اس کے عورت کے لئے اس وقتی عمل کے
نتائج کا سلسلہ دنوں اور مہینوں نہیں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر ڈھائی ڈھائی سال بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیلا ہوا رہتا ہے پھر
زمانۂ حمل کے علاوہ بھی ہر جوان تندرست عورت کے لئے ہر مہینے ایک ایک ہفتہ کی معذوری ایک امر طبعی ہے اور وہ قانونی نظام کامل نہیں
ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھ بند کر لے اور عورت کی طبعی معذوریوں کا لحاظ کر کے مرد کے لئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے
پھر یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین جنسیات کی شہادتیں اور عام تجربے اور مشاہدے کی تائیدیں ہیں کہ نفس خواہش جنسی سے
قطع نظر مرد کی شہوانی جبلت تنوع پسند بھی ہے اس لئے جو شریعت مرد کی اس جبلت کی کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی
وہ اور کچھ بھی ہو بہرحال خدائی اور مطابق فطرت نہیں کہی جا سکتی یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے پتا دیتی ہے داعیانِ توحید
و پیمبرانِ برحق نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اسے اور زیادہ قوت پہنچا دی ہے حضرت ابراہیم،

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو ۱۱۵ یا جو کنیز تمہاری ملک میں ہو ۱۱۶

حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ میں سے کسی کے یہاں بھی یک زوجی روایت کی سند نہیں ملتی بلکہ بعض کی حرم سرا تو مشہور ہی کثرت تعداد کے لئے ہے، ہندو قدیم میں کا ہندو کی بابت بھی زوجی روایتیں وحدت کی نہیں تعدد ہی کی ہیں، اور یورپ و امریکہ میں آج عقد نکاح کو درمیان میں لائے بغیر جو شہوانی اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے اس کی نقل و حکایت کی بھی تاب ان صفحات میں نہیں ۔۔۔ اسلام نے ایک طرف تو یک زوجی کی قید اڑا کر تعدد کو سند جواز دے دی اور دوسری طرف اس کی مناسب حد بندیاں بھی کئی کئی طرح کر دیں اور یہی اس کی حکمت کا کمال ہے۔

وان خفتم۔ اِن کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جواز تعدد ازواج کے لئے یتیم لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی کا اندیشہ، بطور شرط لازم کے ہے، یکسر غلط فہمی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیات احکام ایسی ہیں جو شروع اِن سے ہوتی ہیں مگر یہ مراد نہیں ہوتی، اگر وہ شرط پوری نہ ہوئی تو حکم کا نفاذ بھی نہ ہوگا، مثلاً ایک آیت سورۃ النور کی ہے :۔

ولاتکرھوا فتیاتکم علی البغآء ان اردن تحصنا۔ اپنی باندیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب کون لے سکتا ہے کہ اگر باندیاں پاکدامن نہ رہنا چاہیں تو انہیں زناکاری پر مجبور کر دو؟ اسی طرح ان تعذبہم فانہم عبادک (اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں) کا یہ مطلب کون لے سکتا ہے، اگر تو انہیں عذاب نہ دے تو یہ تیرے بندے نہیں؟ علی ھذا وان جنحوا للسلم فاجنح لہا (اگر یہ لوگ صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی صلح کے لئے جھک جائیے) سے یہ مفہوم کون لے سکتا ہے کہ کافروں سے صلح صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ پہلے صلح کے لئے جھک لیں اور اس کے سوا کوئی اور صورت جائز نہیں؟ اسی طرح جہاں قصر صلوٰۃ کا حکم ہے وہاں الفاظ یہ ہیں واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا گویا قید یہ لگی ہوئی ہے کہ قصر نماز کا حکم مسافر کو اس صورت میں ہے جب کافروں سے ستائے جانے کا خطرہ درپیش ہو، لیکن کس مفسر، کس فقیہ نے آج تک یہ معنی لئے ہیں؟ کس نے نماز قصر کے حکم کو سفر میں اس خوف کے ساتھ مقید کیا ہے؟ اجماع امت اور اسوۂ رسول دونوں ہی سے قصر صلوٰۃ سفر کا حکم عام ہے۔ پھر اگر آیت کا مطلب یہی ہو جو بیسویں صدی کے مغرب زدہ مفسرین نے نکالا ہے تو خود رسول کریمؐ نے اور صحابۂ کرامؓ نے جو اس کثرت سے تعدد ازواج کو برتا ہے تو کیا ہر جگہ یا اکثر جگہ یہی صورت یتیم عورتوں سے ناانصافی کے اندیشہ کی پیش آ رہی تھی؟

فانکحوا۔ صیغۂ امر یہاں جواز و اباحت کے لئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے گو فرقۂ ظاہریہ اسی طرف گیا ہے۔

الظاھریۃ قالوا ان الامر للوجوب فالزواج واجب فی العمر مرۃ والجمہور علی ان الامر فیہ للاباحۃ. (المنار)

۱۱۵ (کہ جب تعدد کی صورت ہی نہ ہوگی تو عدل کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا)

الا تعدلوا۔ یعنی بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے اور ان کے حقوق واجب ادا نہ کر پاؤ گے۔

عدل سے یہاں مراد ادائے حقوق واجب میں عدل و مساوات ہے جو انسان کے قصد و اختیار کے اندر کی چیز ہے، مثلاً یہ کہ کوئی بیوی بغیر کھانے، کپڑے، مکان کے نہ رہے، باقی جہاں تک محبت طبعی اور تعلق قلب کا سوال ہے اس میں مساوات قدرت بشری سے باہر ہے اور اس باب میں شریعت نے کوئی گرفت نہیں رکھی ہے۔

اور عدلِ اختیاری میں بھی یہ لازم نہیں کہ ہر معاملہ مساواتِ عددی ہی کے ساتھ کیا جائے، ایک افریقی بیوی تو گر
بالکل دوسری چیزوں کی ہوگی اور امریکی بیوی دوسری چیزوں کی شوقین، اور ادھیڑ عمر کی بیوی کی ضرورتیں، خواہشیں،
دلچسپیاں سب ایک کم سن نوجوان بیوی کی ضرورتوں، دلچسپیوں، خواہشوں سے مختلف ہوں گی، مقصود یہ نہیں کہ ساری
بیبیاں بے تحاشا ایک ہی لاٹھی سے ہانکی جانے لگیں، مقصود ہر ایک کو بقدرِ اپنے مکان اور بہ لحاظ اس کے مرغوبات،
مالوفات کے راحت پہنچانا ہے اور عمر، صحت، ماحول و عادات کے اختلاف پر نظر رکھنا بہرحال ضروری ہے۔

فقہاء نے عدل بین الازواج کو فرض قرار دیا ہے لیکن خود عدل کی تفسیر عدمِ ظلم سے کی ہے کہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

وظاهر الآية انه فرض ان يعدل لئلا يجور (الدر المختار)

فواحدۃ کوئی شوہر اگر ظلم و بے انصافی کے ساتھ دو یا زائد بیویاں رکھے گا تو اس ظلم و بے انصافی کا گناہ
برابر ہوتا رہے گا لیکن یہ نہیں کہ دوسری بیوی یا بیویوں سے نکاح منعقد ہی نہ ہوگا۔ ظلم وجہ قانونی انعقادِ نکاح کا مانع نہیں۔

فان خفتم الا تعدلوا خوب خیال کر لیا جائے کہ آیت کے مخاطب کون ہیں، اور وحدتِ ازدواج کا
حکم کس کو مل رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ خود شوہروں کو، نہ کہ حکامِ وقت کو۔
عقلاً بھی ظاہر ہے کہ عدل و حسنِ معاشرت کا فیصلہ شوہر خود ہی کر سکتا ہے نہ کہ کوئی دوسرا، اس لئے جو لوگ
اس سراسر نجی اور ذاتی معاملہ میں حکومت کو مداخلت کی دعوت دیتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔

۲۲ (جن کے ادائے حقوق کی ذمہ داریاں ہلکی ہیں اور یہ بمقابلہ ایک آزاد خاندانی بیوی کے ہلکی ہیں)
ما ملکت ایمانکم کے لفظی معنی ہیں وہ جن کے مالک تمہارے داہنے ہاتھ ہوں، محاورہ میں اس سے مراد شرعی
مملوک غلام اور کنیزیں ہوتے ہیں جن کا اب مدتِ دراز سے ہندوستان بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں میں کہیں وجود ہی نہیں، ایامِ جنگ
کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم و دشوار معاملہ رہا ہے یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے یہاں سے گرفتار ہو کر آئیں ان کے
ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، انہیں کہاں اور کیسے رکھا جائے، کسی نے اس کا حل جبری مزدوری FORCED LABOUR پایا
کو نکالا، کسی نے کچھ اور، ہماری شریعت نے نہایت سہل اور سادہ حکم یہ دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بار حکومت STATE
پر ڈالا جائے، اس تعداد کو افراد میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر ایک فرد اس نو وارد کو اپنے خاندان کا ایک جز بنائے، اس سے کام کاج
یقیناً لے لیکن اس کے آرام کا بھی بہ طریقِ احسن لحاظ رکھے اور ان میں جو عورتیں ہوں ان سے ہم بستری کا حق بھی حاصل ہے، اس کا قیدی ہو کر آنا
یہ خود اعلانِ نکاح کا قائم مقام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید ایجاب و قبول اور شاہدین کی ضرورت نہیں، پھر یہ لوگ
آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں (شرائط کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی) بلکہ ان کے آزاد کرنے کی فضیلتیں
اور اس کے لئے طرح طرح کی ترغیبات خود قرآن مجید ہی میں درج ہیں اور حدیث میں تو اور زائد ہیں ـــ حیرت ہے کہ ایسے صاف
سیدھے، شریفانہ، حکیمانہ قانون سے شرمانے اور اسے چھپانے کی ضرورت بعض تجدد زدہ مسلمان بھی محسوس کرنے لگے ہیں،
اس کی نفسیاتی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا ذہن انگریزی کے لفظ SLAVE اور ان ساری تلخیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے
جو اس لفظ کے تخیل کے ساتھ بجا طور پر وابستہ ہیں، حالانکہ ہمارے یہاں تو غلاموں و غلام زادوں نے بارہا بادشاہتیں تک کی ہیں،
اور امراء تو ان میں کثرت سے ہوئے ہیں، یہ تو دنیوی حیثیت ہوئی، باقی دینی حیثیت سے بڑے بڑے علماء، فقہاء، وائمۂ فن بھی غلاموں اور
غلام زادوں میں تابعین کے زمانے سے پیدا ہونے لگے تھے، کنیز شرعی کے حقوق بی بی سے کمتر ہوتے ہیں اس لئے ان کا ادا کرنا بھی نسبۃً سہل تر ہے

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ

اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے ۱۳؎ اور تم بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو ۱۴؎ لیکن اگر وہ

طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴

خوش دلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جزو چھوڑ دیں تو تم اسے ہنسی خوشی کھاؤ (پیو) ۱۵؎

جن مفسرین جدید نے شرط عدل کے نہ پائے جانے کی صورت میں جائز صرف وحدت ازواج کو مانا ہے وہ اپنی تحریروں میں خدا معلوم آیت کے اس ٹکڑے کو کیوں ہضم کر جاتے ہیں۔

۱۳؎ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا تو ظلم اور زیادتی کے امکانات بھی بہت گھٹ جائیں گے۔

ذٰلِكَ یعنی بیبی ایک پر قناعت۔

اشارة الی اختیار الواحدة (مدارک)

اَلَّا تَعُوْلُوْا عول کے معنی ایک طرف جھک جانے اور جور کرنے کے ہیں لا تعولوا کے معنی ہوئے کہ ظلم اور زیادتی نہ کرو۔

العول هو ترك النصفة باخذ الزيادة (راغب) من قولهم عال المیزان عولاً اذا مال وعال الحاکم فی حکمه اذا جار (کشاف) معناه لا تجوروا ولا تمیلوا وهذا هو المختار عند اکثر المفسرین (کبیر) لا خلاف بین السلف وكل من روی عنه معنی هذه الآیة ان معناه ان لا تمیلوا وان لا تجوروا (جصاص)

۱۴؎ (اور اس کے ادائے حقوق کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھو)

صَدُقٰتِهِنَّ۔ صداق یا مہر شریعت اسلامی میں بی بی کی وہ قیمت نہیں جو شوہر اس کے اولیاء کو دے کر ان سے بی بی حاصل کرتا ہے، بلکہ مہر بطور ایک نذرانہ کے ہے جو شوہر بہ غرض اکرام و اعزاز براہ راست بی بی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے، ہمارے فقہاء نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے۔

المهر واجب شرعًا ابانة لشرف المحل (هدایه)

عورت کی شرمگاہ نکاح ہو جانے سے شوہر کی ملک نہیں ہو جاتی، ملک عورت ہی کی رہتی ہے، شوہر کے لئے صرف جائز ہو جاتی ہے۔

الزوج لا یملك بدله شیئًا لان البضع فی ملك المرأة بعد النكاح كهو قبله (جصاص) وانما الذی یملکه الزوج منها بعقد النكاح به الاستباحة لا الملك (جصاص)

وَاٰتُوا النِّسَآءَ شوہروں کو حکم مل رہا ہے کہ یہ تم مہر اپنی بیبیوں کو دو نہ کہ ان کے اولیاء و والدین کو، مہر کی اہمیت اور ادائے مہر کی تاکید شریعت میں بالکل ظاہر ہے، افسوس ہے کہ امت کا موجودہ عمل اس کے برعکس ہے، مہر کو عملاً محض ایک نمائشی اور فرضی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ خطاب یہاں شوہروں سے ہے، ادائے مہر واجب انھیں پر ہے۔

والخطاب علی ما هو المتبادر للازواج والیه ذهب ابن عباس ومجاهد واختاره الطبری والجبائی وغیرهما۔ (روح)

قال الاكثرون الخطاب للازواج وهذا اصح (معالم) القول الثانی ان الخطاب للازواج أمروا بایتاء النساء مهورهن۔ وهذا قول علقمة والنخعی وقتادة واختیار الزجاج (کبیر)

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ

اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ عمر نکاح کو پہونچ جائیں [۱۱]

اور انسان کی حیاتِ مادّی و معاشی کا دار و مدار ہے۔

وبه قوام الأبدان ومعاش الأهل والأولاد (مدارک) إذ به تقوم معايشهم من التجارات وغيرها (ابن کثیر) المراد من القيام ما به القيام (روح) أراد بها قوام عيشكم الذي تعيشون به (معالم)

مطلب یہ ہے کہ مال اللہ کی بڑی نعمت ہے اور بڑی قدر کی چیز ابھی اُسے نافہم یتیموں کے ہاتھ میں نہ دے دو کہ وہ اس کی قدر و مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ ناقدری سے اُسے اڑا دیں گے۔

فقہاء نے آیت سے حفظِ مال و عدمِ تضییعِ مال کے وجوب پر بھی استدلال کیا ہے۔

وفيه الدلالة على النهي عن تضييع المال ووجوب حفظه وتدبيره والقيام به (جصاص)

وارزقوهم ..... معروفا مطلب یہ ہوا کہ اسی جائداد سے یتیموں کی ضرورتیں پوری کرتے رہو ان کی راحت و آسائش کے سامان کرتے رہو اور بجائے ان کے ہاتھ میں جائداد دے دینے کے اُن سے تسلی کی باتیں کرتے رہو کہ یہ ملک تمھاری ہی ہے تمھاری ہی بہی خواہی کا تقاضا ہے کہ اسے ابھی تمھارے ہاتھ میں نہ دیا جائے بلکہ انتظار کیا جائے کہ تم میں پوری بات سمجھ آجائے ان کی یہ سفاہت ان کے نان و نفقہ میں حائل نہیں ہوسکتی، اور یہیں سے فقہاء نے نالائق اولاد اور نا سمجھ بیوی کے نان و نفقہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے:۔

في ذلك دليل على وجوب نفقة الأولاد السفهاء والزوجات (جصاص)

معروفا۔ معروف کے اندر ہر وہ چیز داخل ہے جو علماً خواہ عملاً عقل و شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہو۔

كل ما سكنت إليه النفس لحسنه عقلا أو شرعا من قول أو عمل فهو معروف وما أنكرته لقبحه فهو منكر (روح)

آیت کی تعلیم اس باب میں جامع ہے کہ اپنے زیرِ ولایت اولاد ازواج و اہلِ خاندان کے ساتھ حُسنِ سلوک و حسنِ معاشرت کھانے پہننے اور بات کرنے سب میں رکھنا چاہئے۔

وهذه الآية الكريمة تقتضي الإحسان إلى العائلة ومن تحت الحجر بالفعل من الإنفاق في الكساوي والأرزاق بالكلام الطيب وتحسين الأخلاق (ابن کثیر)

۱۱ یعنی بیانے اور بالغ ہو جائیں۔

يعني القدرة على الوطء ... وهو البلوغ ... في باب الرجال والنساء (معالم)

اور بلوغ کی عمر حنفیہ کے ہاں لڑکے کے لئے ۱۸ سال اور لڑکی کے لئے ۱۷ سال کی رکھی گئی ہے۔

ونقل عن الإمام الأعظم أن السن للغلام تمام ثماني عشرة سنة وللجارية تمام سبع عشرة سنة (روح) فعليه الفتوى ... (روح)

وابتلوا الیتامی یعنی ان کے بلوغ سے پہلے ان کی جانچ انتظامی معاملات میں ہوشیاری اور تمیزداری کی کرلیا کرو۔

والابتلاء في استبراء حاله في المعرفة بالبيع والشراء وضبط أموره وحفظ ماله (جصاص)

فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَأْكُلُوهَا

تو اگر تم ان میں ہوشیاری دیکھ لو تو ان کے حوالے ان کا مال کردو ۱۸ اور مال کو جلد جلد

إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ

اسراف سے اور اس خیال سے کہ یہ بڑے ہوجائیں گے مت کھاڈالو ۱۹

خطاب وہی یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے چل رہا ہے۔

۱۸ (بغیر اُن کے عمرِ بلوغ کا انتظار کئے)

من غیر تاخیر عن حد البلوغ (مدارک)

فان انستم منھم رشدا۔ یعنی آزمائش کے بعد قبل بلوغ ہی اگر ان میں انتظام اور صرفِ مال کا سلیقہ پاؤ۔ یہاں دیکھنے کی چیز ان کی صرف انتظامی صلاحیت ہوگی نہ کہ ان کی عبادت وتقویٰ۔

رشدًا۔ رشد یہاں سلیقہ مندی اور انتظام کے مفہوم میں ہے نہ کہ تقویٰ وہدایت کے عام معنی میں۔

ای نوعا من الرشد وھو الرشد فی التصرف والتجارۃ (کشاف) ای ھدایۃ فی التصرفات وصلاحا فی المعاملات (مدارک) وتنکیر الرشد یفید ان المراد رشد مخصوص وھو الرشد فی التصرف والتجارۃ (مدارک)

وہ رشد جو تقویٰ وتدین کے معنی میں ہے، اس سے بہت مختلف ہے۔

وبین الرشدین اعنی الرشد المونس من الیتیم والرشد الذی اوتی ابراھیمؑ بون بعید (راغب)

فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ فاسق یتیم اگر انتظامی صلاحیت وسلیقہ مندی رکھتا ہے تو اس کا مال بلا تامل اس کے حوالہ کردیا جائے گا، اور اس کا فسق اس راہ میں مانع نہ ہوگا۔

فاعتبار الدین فی دفع المال غیر واجب باتفاق الفقہاء لانہ لو کان رجلا فاسقا ضابطا لامورہ عالما بالتصرف فی وجوہ التجارات لم یجز ان یمنع مالہ لاجل فسقہ (جصاص)

۱۹ (اور اُس وقت تو بہر حال ان کے حوالہ کرنا ہی پڑے گا)

ومایکبروا فیطالبوا باموالھم۔ (جصاص)

حدِ کبر میں داخل ہونے کے بعد جائداد بہر حال صحیح الحواس اصل مالک کو مل جائے گی، خواہ رُشد سے انتظامی صلاحیت حاصل ہو یا نہ ہو، فاترالعقل کے احکام الگ ہیں۔

فیھا دلالۃ علی انہ اذا صار فی حد الکبر استحق المال اذا کان عاقلا من غیر شرط ایناس الرشد (جصاص)

اور حدِ کبر میں داخل ہونے کی عمر امام ابوحنیفہؒ کے یہاں ۲۵ سال کی ہے کہ اس سن میں انسان دادا بن سکتا ہے۔

وجعل ابوحنیفۃ حد الکبر فی ذلک خمسا وعشرین سنۃ لان مثلہ یکون جدا ومحال ان یکون جدا ولا یکون فی حد الکبر (جصاص)

بدارًا کے معنی جلدی کرنے کے ہیں۔

بدارا ای مسارعۃ (راغب) بدارا ای مبادرۃ (صحیح بخاری)

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ

بلکہ جو شخص خوشحال ہو وہ تو اپنے کو بالکل روکے رکھے ۲۰؎ البتہ جو شخص نادار ہو وہ مناسب مقدار میں

بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ

کھا سکتا ہے ۲۱؎ اور جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ بھی کر لیا کرو، اور اللہ

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ

حساب کر لینے والا کافی ہے ۲۲؎ مردوں کے لئے بھی اس چیز میں حصہ ہے جس کو والدین اور نزدیک کے

وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

قرابت دار چھوڑ جائیں۔ اور عورتوں کے لئے بھی اس چیز میں حصہ ہے جس کو والدین اور نزدیک کے قرابت دار

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿٧﴾

چھوڑ جائیں اس (متروکہ) میں سے تھوڑا ہو یا زیادہ (بہرحال) ایک حصہ قطعی ہے ۲۳؎

۲۰؎ (جائداد یتیم میں تصرف سے)

ومن کان غنیا۔ ذکر انھیں اولیاء یتامی کا ہے جکم اُن کو مل رہا ہے کہ اگر وہ خوش حال ہیں تو انھیں فیس، کمیشن وغیرہ کے نام سے کوئی رقم بھی یتیم کے مال میں سے نہ لینا چاہئے بلکہ اسے محض حسبۃً للہ کرتے رہنا چاہئے۔ یہ ہے اہمیت اسلام میں مال یتیم کی تولیت کی۔

۲۱؎ یعنی بقدر اپنی ضرورت کے۔

ای بقدر الحاجة (ابن العربی) بقدر حاجته الضرورية (روح)

یہ رقم محققین حنفیہ نے صاف کر دیا ہے کہ بطور اُجرت کے نہ ہوگی کہ نگرانی تو ولی کے فرائض میں ہے اور معلوم ہے کہ ادائے فرائض پر اُجرت جائز نہیں بلکہ یہ رقم تو الگ سے اللہ کی مقرر کی ہوئی ایک مد ہے۔

ان الرزق لیس بالاجرة لشئ وانما هو شئ جعله الله له (جصاص)

فاخذ الاجرة للقاضي ولمن قام بشئ من امور الدين غير جائز (جصاص)

بالمعروف یعنی یہ نہیں کہ اس آمدنی سے خوب عیش کی زندگی بسر کرنے لگے بلکہ صرف اتنا معاوضہ لے جتنا اس جائز میں متعارف ہو

۲۲؎ یعنی یہ گواہوں کا حکم تو دنیوی ضابطہ کی تکمیل کے لئے دیا جا رہا ہے ورنہ حقیقتاً نجات اور سزا کا پورا علم تو اللہ ہی کو ہے

فاذا دفعتم الیھم یعنی جب بعد تحقق شرائط مذکور (بلوغ و قابلیت انتظام) یتیموں کے سپرد ان کی جائداد کرنے لگو۔

فاشھدوا علیھم۔ گواہ اس امر پر کہ یتیموں کا مال اُن کے سپرد کر دیا گیا۔

آیت کا خاتمہ قرآن مجید کے عام دستور کے مطابق وعید عام پر ہوا ہے یعنی ہر حق تلفی کرنے والا یہ سمجھے رہے کہ اللہ تعالیٰ

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ

اور جب تقسیم کے وقت اعزہ اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو انہیں بھی اس مال سے (کچھ) دے دو

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ

اور ان سے ہمدردی کی بات کہو ۲۴؎ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے چھوٹے بچے

ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

چھوڑ جائیں، تو ان کی انہیں (کیسی) فکر رہے پس چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور بات پکی کہیں ۲۵؎

ہر حال و صورت میں حساب لینے والا ہے۔

ففی ھذا وعید لکل تعامد حق (قرطبی)

۲۳؎ یعنی یہ مورث کی رائے اور اختیار پر موقوف نہیں حصوں کی ہر تقسیم اور ترکہ کا ہر استحقاق شریعت الٰہی کا مقرر کیا ہوا قانون ہے یہ نہیں کہ جو روشن خیال جب چاہیں انہیں اور جدید حالات کا عذر کر کے اس قانون میں قطع و برید کر کے رکھ دیں۔

قال الفراء ھو کقولک قسما واجبا وحقا لازما۔ (قرطبی)

للرِّجَالِ نَصِيْبٌ .... وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ۔ یعنی حق میراث مردوں عورتوں دونوں کو یکساں پہنچتا ہے اس میں رد آگیا ان مذہبوں کا جنھوں نے عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بنا پر حق وراثت سے محروم رکھا ہے ہندوؤں کی طرح جاہلیت عرب میں بھی عورتوں کا کوئی حصہ ہی نہ تھا

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ۔ منہ میں ضمیر غائب ترکہ یا مال کی طرف ہے۔

والضمیر یعود الی ماترک (مدارک) الضمیر عائد علی معنی القسمۃ (قرطبی)

۲۴؎ یعنی نرمی اور شیریں زبانی سے کام لو خشونت کو کام میں نہ لاؤ۔

اذا حضر القسمۃ۔ یعنی جس وقت وارثوں کے درمیان تقسیم ترکہ ہو رہی ہو۔

ای قسمۃ الترکۃ (مدارک)

اولوا القربٰی۔ ایسے عزیز مراد ہیں جن کا میراث میں کوئی حق نہیں۔

ای من لایرث (مدارک) ممن لایرث (بیضاوی)

منہ۔ ضمیر ترکہ کی طرف ہے۔

ای مما ترک الوالدان والاقربون۔ (مدارک)

یہ تقسیم صرف بالغوں کے حصہ میں ہوگی، نابالغوں کے حصہ میں سے خیر و خیرات یا کسی کی مراعات جائز نہیں۔

فارزقوھم منہ۔ یعنی انہیں بھی کچھ دے دلا کر انہیں خوش وقت کر دو۔

فاعطوھم شیئا من المقسوم تطییبا لقلوبھم وتصدقا علیھم (بیضاوی)

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَٰمَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي

بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں، وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے

بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ

ہیں ۲٦ اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ اللہ تمھیں تمھاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں حکم دیتا ہے

اس پر بڑی بحث و گفتگو ہوئی ہے کہ یہ حاضر الوقت غیر وارثوں کو ترکہ میں سے دینے کا حکم وجوبی ہے یا محض استحبابی۔ تحقیق یہ ہے کہ یہ درجۂ استحباب کی چیز ہے، واجب نہیں ہے، اور اگر ابتداء میں واجب تھا بھی تو اب حکمِ وجوب منسوخ ہے۔ ابن عباسؓ صحابی ابن جبیرؒ تابعی حسن بصریؒ تابعی اور محققین حنفیہ کا یہی مذہب ہے، اور شافعی اور مالکی بھی اسی طرف گئے ہیں۔

قال ابن عباسؓ وابن جبیر والحسن ھو ندب (عن) ھذا کلہ یوجب ان یکون اعطاء ھٰؤلآء الحاضرین عند القسمۃ استحبابا لا ایجابا (جصاص) والصحیح ان ھذا علی الندب (قرطبی) وھو امر ندب (بیضاوی)

۲۵ (اور اُن یتیموں کے حسب مصلحت)

یعنی ان کی تعلیم، تادیب، تسلی، دلجوئی ہر پہلو کا لحاظ رہے۔

ذلو وابالنطق مصلحتہ (ابن العربی) القول السدید من الاوصیاء ان لا یؤذوا الیتامی ویکلموھم کما یکلمون اولادھم بالادب الحسن والترحیب (کشاف)

مفسرین کا ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے کہ یہ خطاب اولیاء کو نہیں بلکہ قریب الموت شخص کے عزیزوں قریبوں کو ہے کہ وہ اسے سمجھائیں کہ اسے حق صرف ایک ثلث میں صدقہ کا ہے اور باقی مال مقررہ وارثوں کے لئے چھوڑ جائے۔

فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہیں کہ کہیں خود ان کے چھوٹے یتیم بچوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش آ کر رہے۔

ذُرِّيَّةً ضِعَافًا۔ ضعیف سے مراد بوڑھی نہیں، کمزور اور کم سن اولاد ہے۔

ای اولادا صغارا۔ (معالم۔ جلالین)

قَوْلًا سَدِيدًا۔ یعنی سچی اور صحیح بات جس میں کوئی پہلو شر و فساد و اتلافِ حقوق کا نہ نکلتا ہو۔

ھو العدل والحق الذی لا خلل فیہ ولا فساد فی رجحان بجارت او حرمان لذی قرابۃ (جصاص)

اور قولِ سدید (پکی، کھری بات) کی تعلیم اسلام میں اس موقع کے لئے نہیں، زندگی کے ہر قدم کے لئے ہے۔

۲٦ خیانت، غصب، بددیانتی ہر صورت میں بری ہے، یتیموں کے مال میں ان کا وقوع قبیح تر ہے۔

يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ۔ يَأْكُلُونَ سے مراد یتیم کا مال کسی طریقہ سے بھی بے جا صرف میں لے آنا ہے، یہ مراد نہیں کہ صرف کھانے ہی کے کام میں آئے

خص الاکل بالذکر لانہ اعظم ما یبتغی لہ الاموال (جصاص)

إِنَّمَا..... نَارًا۔ یعنی اس حرام خوری کا انجام یہی ہونا ہے۔

اردو محاورہ میں بھی روپیہ کھا جانا ایسے موقع پر بڑے وسیع معنی میں آتا ہے۔

۲۷ ترکہ کی تقسیم اجتماعی و معاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کی عادلانہ تقسیم پر معاشرہ کی فلاح

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ

مرد (کا حصہ) دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے ۲۸ اور اگر دو سے زائد عورتیں (ہی) ہوں ۲۹

فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ

تو ان کے لئے دو تہائی (حصہ) اس (مال) کا ہے جو مورث چھوڑ گیا ہے ۳۰ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے نصف (حصہ) ہے

وبہبود کا بہت کچھ مدار ہے اور وہ تمام زہادہ آسمانی کتابیں دنیا کے ہدایت نامہ کی حیثیت سے کامل نہیں تاہم ایسے اہم مسئلہ کی تفصیلات سے خالی ہو
یوصیکم اللہ۔ ابتدا ہی میں یہ یاد دلا دیا کہ یہ احکام کسی بندے کے تجویز کئے ہوئے نہیں حکیم مطلق اور عالم الغیب حاکم
برحق کے ارشاد کئے ہوئے ہیں۔

فی اولادکم۔ اولاد کے معنی بھی سمجھ لینے کے قابل ہیں اولاد جمع ہے ولد کی اور ولد کے معنی جنے ہوئے کے ہیں گویا ترکے
کے یہ احکام حقیقی یا صلبی بیٹوں یا بیٹیوں کے حق میں ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے پوتے پوتیوں کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا اور اگر صلبی
اولاد نہ موجود ہو تو مراد بیٹوں کی اولاد ہوگی، یعنی پوتے پوتیاں، بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسے نواسیاں مراد نہ ہوں گی اس لئے کہ
نسب لڑکے ہی سے چلتا ہے لڑکی سے نہیں، فقہاء مفسرین نے اسے صاف کر دیا ہے۔

ولا یختلف اهل العلم فی ان المراد بقوله تعالی یوصیکم الله فی اولادکم اولاد الصلب وان ولد الولد غیر
داخل مع ولد الصلب وانه اذا لم یکن ولد الصلب فالمراد اولاد البنین دون اولاد البنات فقد انتظم اللفظ
اولاد الصلب و اولاد الابن اذا لم یکن ولد الصلب۔ (جصاص)

۲۸ یہ ایک عام اصل بیان کر دی کہ ہر لڑکے کو دوہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا خواہ لڑکا اور لڑکی ایک ایک ہوں یا کئی
حظ الانثیین۔ دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں،
اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد (اور مردوں میں بھی صرف بالغ اور قابل حرب مرد) تھے ایسے قانون کا ظالمانہ اور
خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے لیکن اب اس کے رد عمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ مساوی ہونا
چاہیئے، یہ دوسری بے اعتدالی اور افراط کی جگہ تفریط ہے، عورت کی فطری ساخت جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے
اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تولید، رضاعت اور تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں قدرت نے اور
اسی لئے صحیح اور سچی شریعت نے، اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اسی کے سر رکھا ہے اس لئے ظلم نہیں عین عدل
ہے کہ ترکہ میں مرد کو حصہ بھی بڑا ملے پھر شادی شدہ عورت کو ترکے کے موقع پر دوہرے حصے حاصل رہتے ہیں ایک ادھر میکے میں باپ کے ترکہ
میں حصہ دوسرا ادھر سسرال میں شوہر کے ترکہ میں سے حصہ اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی

۲۹ (یا صرف دو ہی ہوں)
ان کن نساء۔ یعنی اگر وارث صرف لڑکیاں ہی ہوں۔
یعنی بنات لیس معهن ابن (کشاف)
فوق اثنتین۔ فوق کے معنی یہاں لازمی طور پر "زائد" کے نہیں، یہ صلہ بقول بعض مفسرین کے محاورہ عرب میں

وَلِأَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٖ مِّنۡهُمَا ٱلسُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُۥ وَلَدٞۚ

اور مورث کے والدین یعنی ان دونوں میں ہر ایک کے لئے اس (مال) کا چھٹا حصہ ہے جو وہ چھوڑ گیا ہے۳۲؎ بہ شرطیکہ مورث کے کوئی اولاد

فَإِن لَّمۡ يَكُن لَّهُۥ وَلَدٞ وَوَرِثَهُۥٓ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ ٱلثُّلُثُۚ فَإِن كَانَ

ہو۳۳؎ اور اگر مورث کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے۳۴؎ لیکن اگر مورث کے

لَهُۥٓ إِخۡوَةٞ فَلِأُمِّهِ ٱلسُّدُسُۚ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍۗ

بھائی (بہن) ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے۳۵؎ وصیت کے نکالنے کے بعد کہ مورث اس کی وصیت کر جائے یا ادائے قرض کے بعد۳۶؎

اکثر زائد بھی آجاتا ہے اور خود قرآن مجید میں بھی صلہ کے زائد استعمال کی مثال موجود ہے مثلاً فاضربوا فوق الاعناق:

ان ذکر فوق فهاصلة للکلام (جصاص) فوق صلة کقوله تعالیٰ فاضربوا فوق الاعناق (معالم)

لیکن مفسر ابن کثیر نے اس معنی ترکیب کے اختیار اور اس مثال قرآنی دونوں پر سخت کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ بلا معنی کوئی زائد کلمہ لے آنا بلاغت قرآنی کے منافی ہے۔ وهذا غیر مسلم لاهنا ولاهناك فانه لیس فی القرآن شیٔ زائد لا فائدة فیه وهذا ممتنع اور ایسا ہی اس قول کو رد صاحب بحر المحیط نے بھی کیا ہے۔

امام رازیؒ نے یہاں یہ سوال پیدا کیا ہے کہ نساء تو خود ہی صیغۂ جمع ہے پھر اس کے ساتھ فوق اثنتین لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور خود ہی جواب دیا ہے کہ یہ تاکید کلام کی غرض سے ہے جیسا کہ قرآن مجید کی بعض دوسری آیتوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً انما یاکلون فی بطونهم نارا۔ یا لا تتخذوا الٰهین اثنین۔

۳۰؎ لڑکیاں اگر صرف دو ہوں تو ان کا کل حصہ ⅔ ہونا ظاہر ہے ہر ایک کو ⅓ کے حساب سے لیکن یہ شرح یہیں ختم ہو جاتی ہے تین کو ⅔ یعنی کل کا کل نہیں مل جائے گا، بلکہ لڑکیاں جتنی بھی ہوں ان کا مجموعی حصہ ترکہ کا ⅔ ہی رہے گا، باقی ⅓ میں اور اعزہ خاص شریک ہوں گے تفصیل فرائض کی کتابوں میں ملے گی۔

۳۱؎ (کل ترکہ کا)

اور بقیہ نصف حصہ میں دوسرے متعین اعزہ شریک ہوں گے لیکن اگر وہ نہ موجود ہوئے تو پھر وہ نصف بھی اسی لڑکی کی طرف عود کر آئے گا

۳۲؎ اور بقیہ ⅚ اولاد اور دوسرے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

۳۳؎ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، اور خواہ تعداد میں ایک ہو یا زاید۔

۳۴؎ (اور بقیہ ⅔ دو تہائی باپ کا)

وورثه ابواه۔ یعنی علاوہ اولاد کے بھائی بہن بھی نہ ہوں صرف ماں باپ ہی وارث ہوں۔

۳۵؎ (اور بقیہ ⅚ حصہ باپ کا)

باپ کے باعث بھائی بہنوں کو حصہ نہ ملے گا۔

ان کان له اخوة۔ یہ بھائی بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یہ وہ صورت ہے کہ میت کے اولاد کوئی نہیں لیکن

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً

تمہارے باپ ہوں کہ تمہارے بیٹے، تم نہیں جانتے ہو کہ ان میں سے نفع پہنچانے میں تم سے قریب تر کون ہے ۳۷ یہ سب

مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

اللہ کی طرف سے مقرر ہے، بے شک اللہ ہی علم والا ہے، حکمت والا ہے ۳۸

ماں باپ بھی ہیں اور بھائی بہن بھی۔

اخوة کا لفظ یہاں بھائی بہن دونوں کے لئے ہے صیغہ مذکر قاعدۂ زبان کے مطابق محض تغلیباً لایا گیا ہے۔

سواء کان من الاخوة او الاخوات (بیضاوی) ذکوراً کانوا او اناثاً (معالم)

۳۶ (اگر کچھ ہو)

وارثوں کو حصہ اس وقت ملے گا جب پہلے مورث کا قرض ادا ہو لے اور اگر وہ ایک ثلث جائداد سے متعلق کچھ وصیت کر گیا ہے تو اس وصیت کا اجرا ہو لے۔ فقہائے یہاں دو قاعدے اور بیان کئے ہیں ایک یہ کہ قرض اور وصیت میں ادائے قرض مقدم ہے گو قرآن مجید میں لفظ وصیت پہلے ہی مذکور ہے۔

الدّین مؤخر فی اللفظ وھو مبتدأ بہ فی المعنی علی الوصیة (جصاص) انما قدم الدّین علی الوصیة لقوله علیه السلام الا ان الدّین قبل الوصیة (مدارک) قدّم الوصیة علی الدّین وھی متاخرة فی الحکم (بیضاوی)

دوسرے یہ کہ ادائے قرض اور اجراء وصیت ان دونوں سے بھی پہلے مورث کی تجہیز و تکفین کے لئے خرچ نکالنا ضروری ہے۔ او، لفظ او لانے سے اشارہ ادھر نکل رہا ہے کہ وجوب کے لحاظ سے اجراء وصیت اور ادائے دین برابر ہیں۔

وایثار أو علی الواو للایذان بتساویهما فی الوجوب (روح) انما قال بأو التی للاباحة دون الواو للدلالة علی انهما متساویان فی الوجوب (بیضاوی)

اور ادائے دین کا تقدم حکم نبوی کی بنا پر ہے۔

۳۷ یعنی نفع دنیوی ہو یا اخروی، تمہیں کون زیادہ پہنچا سکے گا۔

اس لئے ان احکام میں تمہیں عقلی گدے لگانے کا کوئی موقع ہی نہیں۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ۔ اٰبَآؤُكُمْ کے تحت میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا، پردادا، اوپر کے سارے اصول آگئے، اسی طرح ابناؤکم کے تحت میں نہ صرف صلبی بلکہ اولاد در اولاد نیچے کے سارے فروع آگئے، یہاں یہ جتا دیا ہے کہ ترکہ کی تقسیم مورث کی رائے و اجتہاد پر نہیں چھوڑی گئی ہے حکیم و خبیر حاکم مطلق نے خود ہی سب قاعدے ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔ آیت سے حسن معاملت کے ساتھ ساتھ حسن معاشرت کی بھی تعلیم نکل آئی، انسان کو چاہیے کہ شفقت، رحمت اور نرمی کو اپنے سارے بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ رکھے، اسے کیا خبر کہ کون اس کے زیادہ کام آ کر رہے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

۳۸ اور اللہ کے علم و حکمت سے بھلا کسی بندہ کی فہم و دانش کو کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ آیت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ احکام ترکہ کے باب میں قرآن مجید کو کس درجہ تاکید اور اہتمام منظور ہے تفریع یوصیکم اللہ سے کیا اور آیت کے خاتمہ پر پھر دوہری مہر کا

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ

اور تمہارے لئے اس (مال) کا آدھا حصہ ہے جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جائیں بشرطیکہ ان کے کوئی اولاد نہ ہو ۳۹ اور اگر ان کے

لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا

اولاد ہو تو تمہارے لئے بیبیوں کے ترکہ کی چوتھائی ہے ۴۰ وصیت (نکالنے) کے بعد جس کی وہ وصیت کر جائیں یا ادائے قرض

أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ

کے بعد ۴۱ اور ان بیبیوں کے لئے تمہارے ترکہ کی چوتھائی ہے ۴۲ بشرطیکہ تمہارے کوئی اولاد نہ ہو لیکن اگر تمہارے کچھ اولاد

وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ

ہو تو ان (بیبیوں) کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا ۴۳ بعد وصیت (نکالنے) کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے

بلکہ تہری تصریح و تاکید موجود ہے ــــ اور پھر ہم لوگ بھی ٹھیک اس کے مقابل غفلت اور بے پروائی میں کس قدر پڑے ہوئے ہیں۔
یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ فقہ کے باب معاملات میں علمائے اُمت کا جتنا اتفاق اس مسئلہ میراث و فرائض میں ہے،
شاید ہی اتنا اتفاق رائے معاملات کے کسی دوسرے مسئلہ میں ہو۔

کان۔ یہاں ماضی کے معنی میں نہیں، بلکہ دوام و استمرار کے اظہار کے لئے ہے۔

کان کذٰلک لانہ لم یزل موصوفا بھٰذہ الصفات۔ (روح)

فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ چند حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں میراث جاری نہ ہوگی مثلاً:۔
(۱) وارث مرتد ہو جائے (۲) وارث اپنے مورث کے قتل عمد کا مجرم ہو (۳) وارث جا کر دارالحرب میں قیام
اختیار کرے۔ تفصیل ان موانع میراث کی، فقہ و فرائض کی کتابوں میں ملے گی۔

۳۹ (نہ تم سے نہ ان کے کسی اور شوہر سے)

ظاہر ہے کہ اس جزو میں خطاب شوہروں ہی سے ہے۔

۴۰ (اور بقیہ ¾ دوسرے وارثوں کا حصہ ہے)

بی بی کے ترکہ میں ¼ حصہ شوہر کا ہر صورت میں ہے، خواہ بی بی کوئی اولاد چھوڑے یا نہ چھوڑے۔

ان کان لھن ولد۔ یہ اولاد خواہ تم سے ہو یا متوفیہ کے پہلے شوہر سے۔

۴۱ حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ میراث کی تقسیم ہر حال میں اجرائے وصیت اور ادائے قرض کے بعد ہی ہوگی
اور ان دونوں میں بھی ادائے قرض مقدم ہے۔

۴۲ اور بیبیاں اگر کئی ہوں تو شوہر کے ترکہ کی وہی چوتھائی سب میں برابر تقسیم ہو جائے گی۔

۴۳ (اور شوہر کے ترکہ کا بقیہ ⅞ دوسرے وارثوں کی طرف جائے گا)

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ

اگر کوئی مورث مرد ہو یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں

وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي

میں سے ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ ہے۔ اور اگر یہ لوگ اس سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک

الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ

ہوں گے ۴۴ بعد وصیت (نکالنے) کے جس کی وصیت کر دی جائے یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی کو نقصان پہونچائے ۴۵

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ

یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے ۴۶ اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا بردبار ہے ۴۷ یہ سب خداوندی ضابطے ہیں ۴۸

بیبیوں کو ۱/۸ بہر صورت ملے گا خواہ اولاد ہو یا نہ ہو۔

ان کان لکم ولد۔ یہ اولاد خواہ انہی بیبیوں سے ہو یا کسی اور عورت سے۔

۴۴ (اور بقیہ ۱/۲ حصہ دوسرے وارثوں کی طرف جائے گا)

فھم شرکآء۔ یہ شرکت برابری کی رہے گی یعنی مذکر و مؤنث کا حصہ برابر رہے گا۔

کلالۃ۔ اردو میں اس کے لئے کوئی ایک لفظ موجود نہیں کلالہ عربی میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے

نہ باپ دادا میں سے کوئی موجود ہو اور نہ اولاد، اولاد در اولاد میں سے۔

۴۵ یعنی خود کسی وارث کو نقصان نہ پہنچائے نہ عملاً نہ ارادۃً۔ عملاً کی مثال یہ کہ وصیت ۱/۳ سے زائد کر دی ایسی وصیت

قانونِ شریعت کے خلاف ہونے کی بنا پر ناقابلِ نفاذ ہو گی۔ ارادۃً یہ کہ وصیت رکھے تو ۱/۳ کے اندر ہی لیکن نیت و مقصود

یہ ہو کہ وارث کا حصہ کٹ جائے۔

ایسی وصیت نفاذ قانونی تو ہو جائے گا لیکن وصیت کرنے والا عند اللہ گنہگار ٹھہرے گا، اسلام اپنے پیرؤں

سے قدم قدم پر عمل کے ساتھ ساتھ نیت کا بھی اخلاص و صداقت چاہتا ہے۔

مراد یعنی کسی وارث کو نقصان پہونچانے اسے حصہ کے کل یا جزو سے محروم رکھنے کو شریعت نے ایک سخت گناہ قرار دیا ہے۔

قال ابن عباس الضرار فی الوصیۃ من الکبائر ورواہ عن النبی صلعم من حدیث ابی ھریرۃ من جار

فی وصیتہ القاہ اللہ فی وادی جھنم۔ (بحر)

۴۶ ختم کے قریب پھر یاد دلا دیا کہ یہ سارا قانونِ میراث شریعت کے ہر دوسرے حکم کی طرح حاکم مطلق اور حکیم برحق کا ازل

کیا ہوا ہے کسی انسانی عقل و دماغ کا سوچا ہوا، کسی کونسل کمیٹی مجلس کا وضع کیا ہوا نہیں جو آج پاس ہوا اور کل اس میں ترمیم ہونے لگے۔

۴۷ چنانچہ علمِ کامل کی بنا پر وہ خوب واقف ہے کہ کون اس قانون پر عامل ہے اور کون اس سے منحرف اور

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی (پوری) اطاعت کرے گا اللہ اسے (بہشت کے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۴۹ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی

وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

نافرمانی کرے گا اور اس کے ضابطوں کے حدود سے باہر نکل جائے گا اسے وہ (دوزخ کی) آگ میں داخل کرے گا اس میں وہ

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً

ہمیشہ ہمیش پڑا رہے گا اور اسے ذلت دینے والا عذاب ہوگا۵۰ اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں۵۱ ان پر چار (آدمی)

مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ

اپنے میں سے گواہ کرلو سو اگر وہ گواہی دے دیں تو ان (عورتوں) کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے۵۲

حلم کامل کے اقتضاء سے بہت دفعہ مجرموں کی گرفت وہ فوراً نہیں کرتا۔

۴۸ (تعمیل ہلکا سمجھنا خود اپنے کو خدائی عدالت میں مجرم بنانا ہے)
تلک کا اشارہ اُن تمام احکام کی جانب ہے، جو یتیموں اور وصیتوں اور ترکہ کے باب میں ابھی گزر چکے ہیں۔
اشارۃ الی الاحکام التی ذکرت فی باب الیتامی والوصایا والمواریث (مدارک۔ بیضاوی)

۴۹ اور یہ فوزِ عظیم جس اطاعتِ کامل پر مشروط ہے اس کے اندر اس قانونِ میراث کی پابندی بھی آگئی۔
یطع اللہ ورسولہ۔ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت سے مراد اس قانون کی پابندی ہے جو اللہ کا اتارا ہوا اور رسولؐ کا لایا ہوا ہے، خدائی قانون کی تشریح رسولؐ کی کی ہوئی بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

۵۰ یہ عذاب ابدی بھی ہوگا اور معذب کے حق میں ذلت آفریں بھی۔ اس عذاب کے مورد کافر ہی ہوں گے۔
یتعد حدودہ۔ یعنی حد سے اس قدر باہر نکل جائے کہ ان احکام کے احکامِ الٰہی ہونے ہی سے انکار کردے
الکافر ھو الذی تعدی الحدود کلھا (مدارک) ای یتعد حدودہ استحلالا (معالم عن الکلبی)
ومن یعص اللہ میں معصیت سے مراد معصیتِ کفر و شرک ہے۔
فسر الضحاک المعصیۃ بالشرک وقال الکلبی ومن یعص اللہ یکفرہ (مدارک)
احکامِ میراث کے خاتمہ پر ایسی شدید وعید کا آنا اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ کے ہاں ان احکام کی عظمت و اہمیت کس درجہ ہے
وفی ختم آیات المواریث بھذہ الآیۃ اشارۃ الی ان امر المواریث ولزوم الاحتیاط والتحری وعدم الظلم فیہ (روح)

إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿١٦﴾ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ

بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان ہے ۵۴ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ تو بس

يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ

انھیں لوگوں کی ہے جو بُری حرکت نادانی سے کر بیٹھتے ہیں ۵۸ اور پھر قریب ہی

ارتکابِ زنا سے حق شوہری کا بھی اتلاف ہورہا ہو یعنی عورت بیاہی ہوئی ہو تو ایسے جرم کی سزا سنگساری ہے۔

وھذا کلہ قبل نزول الحدود فنسخت بالجلد والرجم والجلد فی القران والرجم فی السنۃ (معالم)

۵۴ یعنی سزا اس جرم کے سارے ہی مجرموں کے لئے ہے کوئی طبقہ اس سے مستثنیٰ نہیں۔

بہت سی قومیں اپنے کو مُہذّب کہلانے والی آج بھی موجود ہیں، جن کے ہاں حرام کاری (جب تک کہ بہ جبر نہ ہو) سرے سے قابلِ تعزیر ہی نہیں! بہت سی قوموں میں حرام کاری صرف شادی کے بعد جُرم ہے بن بیاہیوں اور بن بیاہو کے لئے یہ کوئی جرم ہی نہیں آیت ان سارے غلط و گمراہ کن نظریات کی تردید کر رہی ہے۔

والّذان یاتینھا میں ھا کی ضمیر فاحشۃ کی طرف ہے یعنی کوئی بھی جوڑا جو حرام کا مرتکب ہوا اس عموم میں اس کے مرتکب آگئے بچے، فاتر العقلوں کے، الذان صیغۂ تثنیہ مذکر ہے لیکن تغلیباً یہ ایک مرد اور ایک عورت کے لئے بھی آتا ہے، چنانچہ حنفیہ نے اس کو اسی معنی میں لے کر اس کا مفہوم زانی مرد اور زانیہ (عورت) کا رکھا ہے، دوسرے ائمہ نے البتہ لفظ کے معنی "دو مرد" لے کر اس کا تعلق زنا سے نہیں بلکہ لواطت سے سمجھا ہے تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی، پہلی آیت کا تعلق صرف زانیہ سے ہے' اور دوسری کا زانی و زانیہ دونوں سے۔

فاٰذوھما۔ اجراءِ سزا کا یہ حکم عامۃ الناس کو نہیں، صرف حکام یا اہلِ حل و عقد کو ہے۔

الخطاب ھنا للحکام۔ (روح)

۵۵ (اجرائے سزا کے بعد)

جن جرائم کی حدِ شرعی مقرر ہے ان میں سزا کا نفاذ اسلامی حکومت میں بہرحال ضروری ہے۔

۵۶ یعنی مجرم جب سزا بھی بھگت چکا اور اب تائب بھی ہے تو اب اس پر مزید طعن و ملامت وغیرہ جائز نہیں۔

۵۷ اسلام کا خدا محدود و مقید قسم کا خدا نہیں کہ مغفرتِ ذنوب پر قادر نہ ہو اور کائنات کو ایک مشین کی طرح قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت چلتا ہوا بس بیٹھا ہوا صرف دیکھ رہا ہو! یا اگر مغفرت پر قادر ہے جب بھی کفارہ کا محتاج ہے ہندومت اور مسیحیت دونوں باطل عقیدوں کی تردید آیت سے ہو گئی۔

۵۸ جو طبائع غیر سلیم ہیں ان کے لئے ہر قسم کی بدعملی کی گنجائش آیت ماقبل سے نکل سکتی تھی اور وہ اپنے دل میں کہہ سکتے تھے کہ جب توبہ قبول ہو ہی جائے گی تو پھر اطمینان سے ہم ہر قسم کے فسق و فجور میں پڑے رہ سکتے ہیں جب مرنے لگیں گے توبہ کرلیں گے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ قبولِ توبہ کے قیود و شرائط کو صاف کر دیا جاتا۔

السُّوٓءَ۔ لفظ جامع ہے گناہِ کبیرہ اور صغیرہ دونوں کے لئے۔

(۱۷)

مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

(وقت میں) توبہ کر لیتے ہیں ۵۹ ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے ۶۰ اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے

ای المعصیۃ صغیرۃ کانت اوکبیرۃ (روح) ھو العمل القبیح الذی یسوء فاعلہ اذا کان عاقلاً

سلیم الفطرۃ کریم النفس او یسوء الناس ویصدق علی الصغائر والکبائر (المنار)

المؤبقۃ. توبہ کی حقیقت شریعت میں یہ ہے کہ ماضی پر ندامت ہو اور مستقبل کے لئے ترکِ معصیت کا عزم ہو

اور یہاں توبہ سے مُراد قبولِ توبہ ہے۔

التوبۃ عبارۃ عن الندم علی ما مضیٰ والعزم علی الترک فی المستقبل (کبیر) ای ان قبولھا (مدارک)

بجھالۃ. مُراد یہ ہے کہ معصیت کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہو گیا ہو اور عقل

شدتِ جذبات (یا ہوائے نفس) سے وقتی طور پر اندھی ہو گئی ہو۔

علی اللہ. بہ خلاف معتزلہ کے اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ اللہ پر حقیقۃً واجب تو کوئی بھی چیز نہیں یہاں

مقصود محاورۂ عرب کے مطابق وعدہ کی تاکید ہے۔

ولیس المراد بہ الوجوب اذ لا یجب علی اللہ شیء ولکنہ تاکید للوعد (مدارک) لیس ایجاب موجب لہ

سلطۃ یوجب بھا علی اللہ تعالیٰ اللہ عن ذلک علوا انما ذلک من جملۃ الکمال الذی اوجبہ تعالیٰ علی نفسہ بمشیئتہ

واختیارہ وھذہ العبارۃ وامثالھا مما ظاھرہ وجوب بعض الاشیاء علی اللہ قد جاءت علی طریق العرب فی التخاطب (المنار)

۵۹ معصیت پر ندامت اور اس کے ترک کا عزم عملِ معصیت کے بعد جس قدر جلد بھی ہو سکے اس کا مطلوب

ہونا ظاہر ہے اور اس میں جتنی تاخیر ہوتی جائیگی قبولِ توبہ کے امکانات ضعیف ہی ہوتے جائیں گے۔

کلما قرب وقت التوبۃ من وقت اقتراف الذنب کان الرجاء اقویٰ وکلما بعد الوقت بالاصرار

وعدم المبالاۃ والتسویف کان الخوف من عدم القبول ھو الارجح (المنار)

لیکن شریعت نے انتہائی شفقت سے کام لے کر اس قُرب (من قریب) کی میعاد حضورِ موت سے قبل تک وسیع

کر دی ہے صحابیوں اور تابعین سے یہی مروی ہے۔

والقریب فی ما بینہ وبین ان ینظر الی ملک الموت (ابن جریر عن ابن عباسؓ) کل شیء قبل الموت

فھو قریب (ابن جریر عن الضحاک) قال الحسن البصری ما لم یغرغر وقال عکرمۃ الدنیا کلھا قریب

(ابن کثیر) وھو ما قبل حضرۃ الموت (مدارک) قال عکرمۃ الموت وقال الضحاک قبل معاینۃ ملک الموت (معالم)

دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں اور یہ معنی بھی لگتے ہوئے ہیں کہ قبل اس کے کہ بُرائی نفس پر چھا جائے اور نیکیوں کو سوخت کر جائے۔

قیل معناہ قبل ان یحیط السوء بحسنات فیحبطھا. (معالم)

من قریب میں مِن تبعیض کے لئے ہے۔

معناہ التبعیض ای یتوبون بعض زمان قریب (کشاف)

۶۰ یعنی وعدۂ مغفرت مرتب ایسے ہی لوگوں کی توبہ پر ہوتا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ

اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں ہے ۶۲ جو (برابر) گناہ کرتے رہیں یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کے سامنے آکھڑی ہو ۶۳

قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا

(اور تب) وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن لوگوں (کی توبہ) جو اسی حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں ۶۴

لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اے ایمان والو! تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم عورتوں

النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْھُنَّ

کے جبراً مالک ہو جاؤ ۶۵ اور نہ انہیں اس غرض سے قید رکھو کہ تم نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے اس کا کچھ حصہ وصول کر لو

فاولئك میں ف سببیہ ہے۔

الفاء للسببیہ اے اولئك الموصوفون (المنار)

۶۱ سو وہ اپنی شانِ علم سے خوب جانتا ہے کہ کس کس نے دل سے توبہ کی ہے اور اپنی شانِ حکمت سے دل سے توبہ نہ کرنے والے کو بھی رسوا نہیں کرتا اور تائب مخلص ہو یا غیر مخلص بہرصورت اس کے لئے وہ مزید ملامت روا نہیں رکھتا۔

۶۲ یعنی ایسے لوگوں سے قبول توبہ کا وعدہ نہیں باقی اگر اور کسی کے ساتھ محض فضل وکرم ہی کا معاملہ کرنا چاہے تو اس غفور رحیم کی راہ میں حائل ہونے کی مجال کس کو ہے؟

۶۳ (اور عالمِ برزخ اس پر منکشف ہونے لگے)

یعنی حالتِ نزع و سکرات شروع ہو جائے کہ اب عذاب و ملائکۂ عذاب کے مشاہدہ کے بعد جو توبہ ہوگی وہ اضطراری ہوگی اور اس لئے کسی درجہ میں بھی مقبول نہیں۔

الذین یعملون السیّئات۔ فقہاء نے کہا ہے کہ معصیت کا صدور اگر ایک ہی آدھ بار ہو لیکن اس سے توبہ نہ کی جائے تو اس کا شمار بھی اصرار علی المعصیت میں ہونے لگے گا، اور یہ عمل گناہ متواتر کرتے رہنے کے حکم میں داخل ہو جائے گا۔

سیّئات صیغۂ جمع لانے سے یہ لازم نہیں کہ گناہوں کی مختلف قسمیں صادر ہوتی رہیں بلکہ ایک ہی معصیت کی عرصۂ دراز تک تکرار اسے صیغۂ جمع میں لانے کے لئے کافی ہے۔

جمعت باعتبار تکرر وقوعها فی الزمان الممتد (روح)

آیت ماقبل میں التوبۃ بہ صیغۂ واحد آیا ہے، اور یہاں السیّئات بہ صیغۂ جمع وارد ہوا ہے یہ فرق قابلِ غور و لحاظ ہے پہلی آیت میں ذکر جلد ہی توبہ کر لینے والوں کا ہے اور اس دوسری آیت میں ذکر ان کا ہے جو بے پروائی، نفسانیت یا ضد سے توبہ میں دیر کرتے جاتے اور اپنے مرض کو برابر بڑھاتے جاتے ہیں۔

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

بجز اس صورت کے کہ وہ صریح بدکرداری کی مرتکب ہوں[۶۶۶]۔ اور بیبیوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو[۶۶۷]

۶۶۴ کافر کے ایمان کا مرتے وقت نامقبول رہنا تو اوپر کے فقروں میں شامل تھا، مزید تصریح عجب نہیں کہ تاکید اور مزید تفضیح کے لئے ہو۔

۶۶۵ عرب جاہلیت میں میت کی جائداد کی طرح اس کی بیویاں بھی سوتیلے لڑکوں کے ورثہ میں آجاتی تھیں اور یہی دستور یونانی تمدن اور رومی تمدن کے بھی کسی کسی دور میں رہ چکا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی) — قرآن مجید کتنے دور دراز کے پہلوؤں کو بھی سامنے رکھتا ہے، مفسر غریب یہ ہمہ گیر نظر کہاں سے لاسکتا ہے؟ عرب جاہلیت میں وارث اگر چاہتا تو اُن سے جبراً یا خود نکاح کر لیتا یا دوسرے کسی سے نکاح میں دے دیتا۔

ترثوا النساء۔ میں بیویوں کے جسم کا مالک ہونا بھی آگیا اور ان کے مال و جائداد کا بھی۔ عورتوں کے مال کے مالک ہو جانے کی تین صورتیں مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ عرب میں رائج تھیں، ایک یہ کہ عورت کا جو حقِ شرعی میراث میں نکل رہا ہو اسے خود لے لیا جائے اور عورت کو نہ دیا جائے، دوسرے یہ کہ عورت کو نکاحِ ثانی نہ کرنے دیا جائے اور جب وہ مر جائے تو اس کے مال پر خود قبضہ کر لیا جائے، تیسرے یہ کہ خاوند اپنی بیوی کو مجبور کرے کہ وہ اسے کچھ مال دے جب وہ اسے چھوڑے — دنیا بداخلاقی اور بدعملی کی کتنی مختلف صورتوں میں مبتلا تھی اور اسلام نے آکر کن کن چیزوں کی اصلاح کی ہے!

۶۶۶ (کہ اس صورت میں البتہ عورتوں کو قید رکھنا یا ان سے کچھ مال وصول کرنا جائز ہوگا)

ایک دستور عرب جاہلیت میں یہ بھی تھا کہ مالدار بیوی کو وارث اس خیال سے کہیں نکاح نہ کرنے دیتے کہ یہ اپنا مال اپنے ساتھ لے جائے گی، یہاں تک کہ وہ مجبور و محبوس بیوہ اس کے گھر میں اپنی جان دے دیتی یا پھر اسے اپنا مال و متاع حوالہ کر کے اپنی جان چھڑاتی۔

مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ۔ یعنی جو چیزیں خود تم نے دی ہوں یا تمہارے قرابت والوں نے۔

فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ اس سے مراد زناکاری ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

وهو الزنا (ابن جرير۔ عن السدى) اى الزنا (ابن جرير۔ عن الحسن)

ابن کثیرؒ نے یہ معنی دو صحابیوں، ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ اور چودہ تابعین سے نقل کئے ہیں۔

لیکن دوسرے معنی شوہر کی نافرمانی کے بھی ائمہ فن سے منقول ہیں۔

وهو النشوز (ابن جرير عن ابن عباسؓ) وهو النشوز (ابن جرير۔ عن قتادة) وقال ابن عباسؓ وعكرمة والضحاك الفاحشة المبينة النشوز والعصيان (ابن كثير)

فیصلہ یہ ہے کہ لفظ کے اندر زناکاری اور نافرمانی دونوں ہی کے مفہوم شامل ہیں۔

كل فاحشة من بذاءة باللسان على زوجها واذى له وزنا بفرجها (ابن جرير) ولهذا رأى ابن جرير انه يعم ذالك كله الزنا والعصيان والنشوز وبذاء اللسان وغير ذالك ... وهو اجيد والله اعلم (ابن كثير)

ويجوز ان يراد بها ما هو اعم من الامرين ... والصواب عدم تعيينها وتخصيصها باحد هذه الامور (المنار)

خلاصہ یہ کہ سوءِ معاشرت کا سبب ان بیویوں کا پیدا کردہ نہ ہو۔

والمعنى إلا أن يكون سوء العشرة من جهتهن فقد عذرتم (كبير) اى الا ان يكون سوء العشرة من جهتهن (كشاف)

۶۶۷ قرآن مجید کا ایک عام اسلوبِ بیان ہے کہ جزئیاتِ احکام کے درمیان ایک کلی مسئلہ بھی بتا کر دیتا ہے اور کلیات

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا

اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ

كَثِيْرًا ﴿١٩﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ

دے ٦٨ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ (دوسری) بیوی بدلنا چاہو ٦٩ اور تم اس بیوی کو (مال کا)

قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٢٠﴾

انبار دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس مت لوٹ کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اسے (واپس) لوگے ٧١

کے ضمن میں جزئیات بھی بے آئے ہیں یہاں بھی یہی ہے کہ جزئی احکام بیان کرتے کرتے اچانک ایک اہم اصل بیان کر دی جو زوج کے ساتھ معاشرت کی یعنی معاشرت کا مرکزی، بنیادی، کلیدی حکم سہاگنوں، بیواؤں، طلاقنوں سب کے معاملہ میں واجب العمل ہے۔ — یہ ہدایت وہ مذہب دے رہا ہے جو کتنے ہی کور چشم معاندین کے نزدیک عورت کے حق میں ظالمانہ ہے!

٦٨ (حال یا مستقبل میں)

شکایت کرنے والے شوہروں کو صبر و تسکین قلب کے لئے اس مراقبہ سے بڑھ کر اور کون شے مؤثر ہو سکتی ہے اور مراقبہ کی افادیت بعض شوہروں تک کیوں محدود ہے آیت کے الفاظ بالعموم ہیں ہر گلہ مند بندہ بجائے شکوۂ تقدیر کرنے کے صبر و تسلی اسی مراقبہ سے حاصل کر سکتا ہے اللہ جس بندہ کو جس بھی تکوینی حالت میں رکھنا چاہتا ہے خود بندے ہی کی کتنی مصلحتیں اس میں مضمر ہیں۔

خیرا کثیرا۔ خیر کے اندر دنیوی و اخروی، عاجل و آجل ہر قسم کی فلاح اور بھلائی آ گئی اور پھر محض خیر ہی نہیں خیر کثیر، بھلائیوں کا ایک ڈھیر ایک انبار! — تسکین دہ اس سے بڑھ کر کون خیال ہو سکتا ہے۔

ان کرھتموھن۔ مراد وہ کراہت ہے جو طبعی طور پر یا خواہ مخواہ ہو نہ کہ کوئی ایسا قابل شکایت امر جو عورت کے ارادی قصور سے پیدا ہوا ہو۔

٦٩ بلا اس کے کہ اس پہلی بی بی کا کوئی قصور ہو یعنی محض اپنی رغبت و خواہش سے تم ایک بی بی چھوڑ کر دوسری کرنا چاہتے ہو

٧٠ (اور اسی طرح اقرار کئے ہوئے مال کو روک بھی مت رکھو)

احدٰھن۔ یعنی اس پہلی بی بی کو جسے اب چھوڑ رہے ہو۔

قنطارا۔ کے معنی مال کے انبار کے ہیں۔

القنطار المال العظیم (کبیر۔ کشاف)

اس پر ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ حدیث میں تو مہر کی زیادتی کی ممانعت آئی ہے لیکن خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ نے ایک بار مسجد میں برسر منبر گو پہلے مہر کی زیادتی سے روکا لیکن ایک ضعیفہ کے ٹوکنے پر اس کا جواز بھی تسلیم کر لیا اور خود اس آیت سے بھی ڈھیروں مال کا جواز ثابت ہوتا ہے سوال کا ایک مشہور جواب تو امام رازیؒ کے قلم و دماغ سے ہے یعنی آیت سے جواز کہاں ثابت ہوا آیت نے تو محض ایک مفروض و مشروط حالت کا ذکر کیا ہے کہ اگر تم ڈھیروں مال دے چکے ہو جب بھی اس کی واپسی کا مطالبہ درست نہیں اس سے

وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ

اور تم کیسے اسے (واپس) لے سکتے ہو درانحالیکہ ایک دوسرے سے خلوت کر چکے ہو اور وہ (بیبیاں) تم سے ایک مضبوط

مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ

اقرار لے چکی ہیں ۳ سے   اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے

النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ

ہیں، مگر ہاں جو کچھ ہو چکا (ہو چکا) ۴ سے   بے شک یہ بڑی بے حیائی اور نفرت کی بات تھی۔

اس مفروضہ یا شرط کا صحیح ہونا تو لازم نہیں آتا لیکن اس کے بھی صاف، دل نشین اور بے تکلف جواب ہمارے زمانہ کے امام شریعت مفسر تھانویؒ کے قلم سے نکلا ہے فرماتے ہیں کہ یہ جواز مفہوم من القرآن بمعنی صحت نفاذ ہے اور حدیث میں جواز بمعنی اباحت مطلقہ و عدم کراہت کی نفی ہے بس کچھ تعارض نہیں، اور حضرت عمرؓ کا ایک اقدام زیادہ مہر کے جواز کو مان لینا اس لئے تھا کہ سامعین اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں پس اس سے کراہت کا عدم ثابت نہیں ہوتا، نہ حضرت عمرؓ پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے۔

۱ سے یعنی بلا وجہ واپس لوگے تو یا تو صریح ظلم کے مرتکب ہوگے اور یا پھر بات بنانے کے لئے عورت پر کوئی جھوٹا سنگین الزام زناکاری یا نافرمانی کا لگا رکھوگے۔

۲ سے (نکاح کے وقت)

اور وہ عہد مستحکم یہی کہ تم مہر ادا کروگے۔

میثاقًا غلیظًا۔ یعنی عہد بھی کیسا، موثق و محکم۔

وصفه بالغلظ لقوته وعظمه (کشاف) عهدًا وثيقًا (مدارک)

وقد افضی بعضکم الی بعض۔ یعنی جب انھوں نے اپنا جسم تمتع و تلذذ کے لئے تمہارے سپرد کر دیا تو اب مہر ان سے واپس لینا یا اسے انھیں ادا نہ کرنا بڑی بے حمیتی بلکہ کم ظرفی کی بات ہے۔

افضی۔ افضاء لغۃً خلوت صحیحہ اور اصل عمل صحبت دونوں کو شامل ہے جیسا کہ فراء لغوی وغیرہ سے منقول ہے اور حنفیہ نے مراد خلوت صحیحہ لی ہے۔

افضی الی امرأته ای خلا بها (راغب) قال الكلبي الافضاء ان يكون معها في لحاف واحد جامعها او لم يجامعها وهذا القول اختيار الفراء ومذهب ابی حنيفة (کبیر) ذکر الفراء ان الافضاء هو الخلوة وان لم يقع دخول وقول الفراء حجة فی ما يحكيه من اللغة (جصاص) ای خلا بلا حائل (مدارک)

اور فقہائے امامیہ کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی منقول ہے۔

وهو احد قولين للامامية (روح)

حنفیہ کے ہاں مہر خلوت صحیحہ ہی پر واجب ہو جاتا ہے۔

وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٢٢﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَ

اور بہت برا طریقہ تھا ۶۰ تمہارے اوپر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور

عَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ

تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ

دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیبیوں کی مائیں اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو تمہاری

حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ

پرورش میں رہتی ہیں اور جو تمہاری ان بیبیوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے لیکن اگر ابھی تم نے ان بیبیوں سے

بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ

صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اور جو بیٹے تمہاری نسل سے ہوں ان کی بیبیاں

والاسمہ جمعنا فی لحمہ والتحییمہ انہا توکد المہر (مدارک)

۵۹ یعنی اس حکم کے نزول سے قبل جو ہو چکا اب اس پر بازپرس نہیں۔

ای قبل نزول آیۃ التحریم فانہ معفو عنہ (کبیر)

لا تنکحوا۔ نکاح عقدِ تزویج کے معنی میں تو ظاہر ہے ہی لیکن یہاں اس کے وسیع تر لغوی مفہوم مطلق صحبت کرنے کا بیان ہے۔

فیہ محرم وطی موطوئۃ الاب بنکاح او بملک یمین او بزنا کما ھو مذھبنا وعلیہ کثیر من المفسرین۔ (مدارک)

ما نکح اٰباؤکم۔ عرب جاہلیت کے اس دستور کی طرف اشارہ ہے کہ سوتیلی ماؤں سے بھی نکاح کر لیا جاتا تھا اور مدینہ میں یہ دستور زیادہ تھا۔

قال ابن عباس وجمہور المفسرین کان اھل الجاھلیۃ یتزوجون ازواج اٰبائھم (کبیر)

وکانت ھذہ السیرۃ فی الانصار لازمہ، وکانت فی قریش مباحۃ مع التراضی۔ (قرطبی)

ما نکح میں ما مَن کے معنی میں ہے۔

ما بمعنی مَن (جلالین) وتکون ما بمعنی الذی ومَن والدلیل علیہ ان الصحابۃ تلقت الآیۃ علی ذلک المعنی (قرطبی)

اٰباؤکم۔ اس کے ذیل میں وہ بیویاں بھی آ گئیں جو دادا یا نانا کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔

واسم الاٰباء ینتظم الاجداد (روح) والاٰباء ھنا یحتمل الاب ومن قبلہ من عمود النسب۔ (بحر)

۶۰ قرآن مجید نے تین لفظ استعمال کئے ہیں اور تینوں سے الگ الگ انتہائے ہیں۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

اور یہ بھی (حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو یکجا کرو مگر ہاں جو ہو چکا (ہو چکا) بے شک اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے

فاحشۃ۔ یہ دستور بجائے خود اور عقلاً بھی بڑی بے حیائی کی چیز تھا۔

مقتاً۔ مذاقِ سلیم رکھنے والوں کے عرف میں بڑی بے حیائی کی چیز تھا۔ مقت کہتے ہیں ایسی بری چیز کو جسے دیکھ ہی کر طبیعت میں گھن یا کراہت پیدا ہو۔

المقت بعض شدید لمن تراہ تعاطی القبیح۔ (راغب)

خود اہل جاہلیت بھی اس نکاح کو بہت بری نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا نام ہی نکاح المقت پڑ گیا تھا۔

ساء سبیلا۔ یعنی اس کے نتائج بھی بڑے قبیح تھے۔

امام رازیؒ نے فرمایا کہ قبح کے تین درجے ہوتے ہیں، ایک قبح عقلی دوسرے قبح شرعی تیسرے قبح عرفی۔ فاحشۃ میں اشارہ اول کی جانب ہے مقتاً میں دوم کی جانب ساء سبیلا میں سوم کی طرف۔

۷۵ (اس لئے جو غلطیاں نزولِ حکم سے قبل ہو چکیں، ان پر وہ گرفت نہیں کرتا، اور ان پر وہ خط عفو کھینچ دیتا ہے) قرآن مجید نے یہاں ایک مفصل فہرست دے کر بتا دیا کہ ان ان عورتوں سے مطلقاً یا فلاں فلاں صورتوں میں نکاح حرام ہے، اور یہ فہرستِ محرمات قرآن مجید کی کاملیت کے دلائل میں سے ایک قوی دلیل ہے، موجودہ انجیل اور خدا معلوم کتنی نام نہاد آسمانی کتابوں میں تعلیم کا یہ ورق سرے سے سادہ ہی چھوٹ گیا ہے، اور ان کے پیرو اس باب میں صاف و واضح تعلیم سے محروم ہیں۔

اُمّھٰتکم۔ تمہاری مائیں اور اسی طرح ماں کی مائیں، دادیاں، نانیاں وغیرہا۔

والجدۃ من قبل الام والاب ملحقۃ بھن (مدارک) والام حقیقۃ ھی الوالدۃ وفی معناھا کل امرأۃ رجع نسبک الیھا بالولادۃ من جھۃ ابیک او من جھۃ امک (نص الامھات جمع ام ویدخل فیہ الجدات وان علون من قبل الام ومن قبل الاب) (معالم)

بنٰتکم۔ تمہاری بیٹیاں اور اسی طرح بیٹیوں کی بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں وغیرہا۔

وبنات الابن وبنات البنت ملحقات بھن (مدارک) وفی معناھا کل انثی رجع نسبھا الیک بالولادۃ بدرجۃ او درجات باناث او ذکور (نھر) ویدخل فیھن بنات الاولاد وان سفلن (معالم)

اخواتکم۔ اس میں حقیقی کے علاوہ سوتیلی بہنیں بھی آگئیں۔

لاب وام اولاب اولام (مدارک) الاخت المحرمۃ کل من جمعک وایاھا صلب او بطن (نھر) سواء کان من قبل الاب والام او من قبل احدھما۔ (معالم)

عمّٰتکم۔ اس باب میں باپ کی اور باپ سے اوپر والوں کی بہنیں آگئیں۔

من الاوجہ الثلاثۃ۔ (مدارک)

خٰلٰتکم۔ اس میں ماں کی اور ماں سے اوپر والوں کی بہنیں آگئیں۔

من الاوجہ الثلاثۃ (مدارک)

بنٰت الاخ۔ یعنی سگی اور سوتیلی بھتیجیاں۔

کذلک۔ (مدارک)

بنات الاخت۔ یعنی سگی اور سوتیلی بھانجیاں کذلک (مدارک)

امھتکم التی ارضعنکم۔ خیال کرکے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید دودھ پلائیوں کو ماں کے لقب سے یاد کر رہا ہے کیا حد ہے اس رعایت حقوق کی۔

اخوتکم من الرضاعۃ۔ رضاعت کے اوقات گو مختلف ہوں، مگر دودھ ہو ایک ہی ماں کا۔

امھات نسائکم۔ اس میں بی بی کی نانیاں، پرنانیاں وغیرہ بھی آگئیں اُن کی حرمت محض عقد سے لازم آجاتی ہے۔

وھن محرمات بمجرد العقد۔ (کشاف)

ربائبکم۔ اس میں بیوی کی بیٹیوں کے علاوہ نواسیاں وغیرہ بھی آگئیں۔

فی حجورکم۔ لفظی معنی ہیں کہ "تمھاری گودوں میں ہوں" مراد ہے تمھاری تربیت و پرورش میں ہونا، یہ محض عام عادت و عرف کا بیان ہے کوئی قید یا شرط نہیں۔

ذکرا لحجر علی علیہ الحال دون الشرط (مدارک)

من نسائکم التی دخلتم بھن۔ یعنی ماں سے مجرد نکاح اس کی بیٹی کی حرمت کے لئے کافی نہیں، حرمت کے لئے ماں سے صحبت کا ہو چکنا ضروری ہے۔

دخلتم بھن۔ اصلاً کنایہ تو صرف صحبت سے ہے۔

وھو کنایۃ عن الجماع۔ (بیضاوی۔ کشاف)

لیکن حنفیہ نے لمس شہوانی اور بوس و کنار کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے اور امام مالکؒ وامام شافعیؒ اور بہت سے ائمہ فقہ اس میں حنفیہ کے ہمراہ ہیں۔

واللمس ونحوہ یقوم مقام الدخول (مدارک) ھو التمتع من الجماع والقبل قال مالک وابو حنیفۃ (ابن العربی)

واتفق اصحابنا والثوری ومالک والاوزاعی واللیث والشافعی ان اللمس بشھوۃ بمنزلۃ الجماع فی تحریم ام المرأۃ وبنتھا (جصاص) الجماع ھو الاصل ویحمل علیہ اللمس لانہ استمتاع مثلہ ویدخل تحت عمومہ (ابن العربی)

حنفیہ و مالکیہ نے علاوہ لمس شہوانی کے شہوانی نظر کو بھی سبب تحریم قرار دیا ہے۔

قال اصحابنا ایضا اذا نظر الی فرجھا بشھوۃ کان ذلک بمنزلۃ اللمس فی ایجاب التحریم (جصاص) وقال مالک اذا نظر الی شعر جاریتہ تلذذا او صدرھا او ساقھا او شیء من محاسنھا تلذذا حرمت علیہ امھا وبنتھا (جصاص) واما النظر فانہ فی الدرجۃ الثالثۃ شبہ فی الزنا ذریعۃ الذریعۃ (ابن العربی)

فلاجناح علیکم۔ یعنی ایسی غیر مدخول بہا بیوی کی بیٹی سے نکاح کر لینے میں مضائقہ نہیں۔

من اصلابکم۔ یہ صلب یا نسل کی قید اس لئے لگا دی کہ متبنّٰی یا محض مُنہ بولے بیٹوں کی بیبیاں اس میں شامل نہ ہو جائیں جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا۔

دون من تبنیتم (کشاف)

ان تجمعوا بین الاختین۔ بہنیں خواہ حقیقی ہوں یا رضاعی اُن کا نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔
جن آسمانی کتابوں کے صحیفے ان ضروری فقہی ہدایتوں سے خالی ہیں، وہ خود اپنی جگہ انصاف کریں کہ وہ عالمگیر اور آفاقی مذہب کا سرچشمہ ہونے کے کہاں تک قابل ہیں!

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ

اور وہ عورتیں بھی (حرام کی گئی ہیں) جو قید نکاح میں ہوں بجز ان کے جو تمہاری ملک میں آجائیں ۲۸

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

اللہ نے فرض کردیا ہے (ان احکام کو) تم پر اور جو ان کے علاوہ ہیں وہ تمہارے لئے حلال کردی گئی ہیں ۲۹ یعنی تم

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۚ

انھیں اپنے مال کے ذریعہ سے تلاش کرو (اس طور پر کہ) قید نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے ۳۰

۲۸ (یعنی کنیز شرعی)

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ یعنی ایسی بیاہی ہوئی عورتیں جو اب مسلمانوں کے قید میں جہاد کے بعد آگئی ہیں ان کی ازواج جنگی ہیں باوجود اس کے کہ ان کے شوہر زندہ اور دار الحرب میں موجود ہیں ان کا وہ نکاح کا قرانہ دار الاسلام میں ان کے مسلمانوں کے ملک میں جانے سے مانع نہیں ہو سکتا۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے لئے ملاحظہ ہو پ ۴ حاشیہ ۱۲ آیت ۳ کے تحت۔

لفظی معنی ہیں "وہ جن کے مالک تمہارے دونوں ہاتھ ہو جائیں" مراد شرعی کنیزیں ہیں۔

اَلْمُحْصَنٰتُ احصان کے معنی ہیں روک میں آجانا، قید میں آجانا۔

[illegible] بمعنی الشیٔ و یمنع منه (ابن قتیبه) الاحصان فی اللغة المنع (کبیر)

مُحْصَنٰتٌ کے معنی ہوئے قید میں آجانے والیاں، مراد شادی شدہ عورتیں ہیں، عقدِ نکاح کو قید سے تعبیر کرنے سے یہ اشارہ نکلا کہ ازدواج خود محافظِ عفت ہے۔

[illegible] هن النساء ذوات الازواج لان الازواج احصنوهن ومنعوا منهن (ابن قتیبه) المحصنت [illegible] تصوّرا ان زوجها هو الذی احصنها (راغب) والمراد بالاحصان هنا العفة (روح)

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے اب دوسرا نکاح حرام ہے یہ تو عام قاعدہ ہوا، استثناء اس سے شرعی کنیزوں کا ہے جو کافر شوہروں کی زوجیت سے آئی ہیں۔

وَالْمُحْصَنٰتُ کا عطف نحوی اعتبار سے ان محرمات پر ہے جو قبل میں مذکور ہو چکے۔

عطف على المحرمات المذكورات قبل. (قرطبی)

یعنی حرام ہے نکاح فلاں فلاں رشتہ دار عورتوں سے اور ہر اُس عورت سے جو کسی کے نکاح میں ہو۔

۲۹ نظامِ خانگی ہی کی درستی پر ساری ہیئتِ اجتماعی کی درستی کا انحصار ہے اور نظامِ خانگی کا ایک بڑا اہم جزء یہ ہے کہ منکوحہ کس کس کے ساتھ جائز ہے اور کس کس کے ساتھ ناجائز، ضروری تھا کہ اس کے اصول قرآن مجید ہی میں محفوظ کر دیے جاتے

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ تاکید و اظہار اہمیت کے لئے ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ

پھر جس مال کے عوض تم نے بعض عورتوں سے لطف اٹھایا ہے، سو انھیں ان کے طے شدہ مہر دے دو، اور تم پر اس مقدار کے

عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

بارے میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم آپس میں مہر طے ہو جانے کے بعد رضامند ہو جاؤ ؎ بے شک اللہ بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے ؎

اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ حدیث و سنّت سے جن دوسری عورتوں سے حرمتِ نکاح ثابت ہے، مثلاً رضاعی بہنوں کے ساتھ یا پھوپھی اور بھتیجی کا جمع کرنا، یا خالہ اور بھانجی کا جمع کرنا تو یہ سب بھی قرآن مجید کی آیاتِ بالا میں آگئیں، لیکن حدیث نے انھیں صاف اور کھول کر بیان کر دیا ہے۔

لان تحریم من ذکر داخل فی ما تقدم بطریق الدلالة کما مر الیه الاشارة عن بعض المحققین ثم تخصیص هذا العموم بالکتاب والسنة مشهور۔ (روح)

كَتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ تقدیرِ کلام یوں مانی گئی ہے اور یوں بھی کہ:

الزموا ما کتب اللہ علیکم (معالم) کتب اللہ علیکم کتابا (مدارک) ای کتب اللہ علیکم تحریم هؤلاء۔

؎ یعنی مقصود فریقین دونوں کے نزدیک یہ ہے کہ زوجین نکاح کے ذریعہ سے پاک منزہ باعفت مستقل زندگی بسر کریں گے۔

المراد بالاحصان هنا العفة وتحصین النفس عن الوقوع فی ما لا یرضی اللہ تعالی (روح) معناه متعففین عن الزنا (قرطبی)

اور نکاح کی شرطیں معلوم و معروف ہیں، مثلاً میاں بیوی دونوں کا اعلانِ رضامندی کم سے کم دو گواہوں کے سامنے یا عقدِ نکاح کا موقت نہ ہونا وغیرہا۔

غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ یعنی مقصود حیوانات کی طرح تمام تر ایک مادی شہوت یا جنسی تقاضہ کا پورا کرنا نہ ہو، بیوی کے ساتھ مستقل تاہل، رہنے سہنے نباہ کرنے کا ارادہ اور اس کی وقعت و محبت کسی درجہ میں تو ہو۔

تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ۔ مال سے مراد مہر ہے، یا ملکِ یمین کی قیمت۔

ان تبتغوا النساء باموالکم بالصرف فی مهورهن (بیضاوی) ای تطلبوا بصداق او بثمن (مدارک) یعنی المهور (مدارک)

فقہاء نے یہیں سے استدلال کیا ہے کہ مہر نکاح کا لازمی جزو ہے گو تعدادِ مہر متعین نہ ہو۔

وفیه دلیل علی ان النکاح لایکون الا بمهر وانه یجب وان لم یسم (مدارک)

مہر کی بار بار تاکید سے ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامی کو عورتوں کے حقوق کا کس درجہ اہتمام مطلوب ہے۔

نفس خرچ نکاح و سفاح دونوں میں مشترک رہتا ہے، فرق یہ ہے کہ نکاح سے زندگی انسانوں کی طرح مقیّد و پابند ہو جاتی ہے اور سفاح میں انسان جانوروں کی طرح بے مہار چھوٹا ہوا رہتا ہے۔

تَبْتَغُوْا۔ بغی کے معنی تلاش کرنے، طلب کرنے کے ہیں اور حکم کے مخاطب مرد ہیں، گویا نکاح کی درخواست کرنا یا انگریزی محاورہ میں (پروپوز) کرنا مرد کا کام ہے، عورت کا کام صرف قبول کرنا منظوری دینا ہے، نر اور مادہ کے درمیان

یہ فاعلیت والفعالیت کا فرق زندگی کے ہر شعبہ پر محیط وحاوی ہے۔

فــ۸ــه یعنی تعداد مہر ایسی شے نہیں جو ایک مرتبہ بندھ جانے کے بعد پھر کسی طرح قابل تبدیل نہ ہو میاں بیوی باہمی رضامندی سے اُسے گھٹا سکتے ہیں، بڑھا سکتے ہیں یا بالکل معاف بھی کر سکتے ہیں۔

مِنْهُنَّ۔ مِن یہاں بیانیہ بھی لیا گیا ہے اور تبعیضیہ بھی۔

یحتمل ان یکون تبعیضا وقیل یحتمل ان یکون للبیان (بحر) مبانیة او تبعیضیة (روح)

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ یعنی ان عورتوں کی صحبت سے لطف اٹھایا ہے، لذت حاصل کی ہے۔

الاستمتاع التلذذ (قرطبی) یعنی دخلتم بهن والاستمتاع هو الانتفاع وهو ههنا كناية عن الدخول (جصاص)

اجر سے مراد مہر ہے۔

الاجور المهور (قرطبی) اجورهن ای مهورهن (معالم۔ بیضاوی)

استمتاع سے مراد نکاحی بیویوں سے لطف اُٹھانا تو ظاہر ہی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں لیکن اسی لفظ کے تحت ایک زمانہ میں بحث متعہ کی بھی چھڑ گئی ہے اور سوال یہ اٹھا ہے کہ آیا اس سے مراد متعائی بیویاں بھی ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ مسلک اہل سنت میں اب متعہ نکاح کی کوئی شرعی قسم نہیں اور اس لئے یہ عمل بالکل ناجائز ہے، البتہ فقہ امامیہ میں جائز ہے، اور کچھ اقوال اس کی تائید میں ہمارے قدماء کے ہاں بھی مل جاتے ہیں۔

متعہ ایک طرح کا نکاح موقت یا عقد عارضی ہے، مرد، عورت کو اپنی زوجیت میں اس شرط کے ساتھ لاتا ہے کہ فلاں رقم کے معاوضہ میں فلاں مدت تک یہ تعلق باقی رہ کر از خود ختم ہو جائے گا، نہ اس کے لئے طلاق کی ضرورت ہو گی اور نہ کوئی حق وراثت قائم ہو گا۔

هو النكاح الى اجل معين (نهاية) ومتعة النكاح هی ان الرجل كان يشارط المرأة بمال معلوم يعطيها الى اجل معلوم فاذا انقضى الاجل فارقها من غير طلاق (راغب) ليس بينهما ميراث ليس يرث واحد منهما صاحبه (ابن جرير) هو ان ينكح امرأته الى مدة معلومة بشئ معلوم فاذا انقضت تلك المدة بانت منه بغير طلاق ويستبرئ رحمها وليس بينهما ميراث (خازن) وصورة المتعة اذ يقول اتمتع بك كذا مدة بكذا من المال۔ (شرح وقايه)

استمتاع سے اگر مراد صرف وہ لطف لیا جائے جو نکاح صحیح سے حاصل ہوتا ہے جب تو آگے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور جمہور عامہ اور مفسرین نے یہی پہلو اختیار بھی کیا ہے، لیکن بعض اجل صحابہ (مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ) کی قرأت میں اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی بھی منقول ہے۔

عن عمير ان ابن عباس قرأ فما استمتعتم به منهن الى اَجَلٍ مُّسَمًّى (ابن جرير) وقرأ ابی فما استمتعتم به منهن الى اجل مسمى وكذلك قرأ ابن عباس وابن مسعود رضی الله عنهم (روح) وكان ابن عباس وابی بن كعب وسعيد بن جبير والسدی يقرؤن فما استمتعتم منهن الى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (ابن كثير)

اور اسی لئے ابن عباسؓ اور بعض اکابر تابعین مثلاً مجاہدؒ، سدیؒ اس سے مراد عقد متعہ لیتے تھے، اور عمران بن حصین صحابی تو اور آگے بڑھ گئے تھے۔

قال آخرون هو نكاح المتعة (معالم) وقد استدل بعمومها [illegible] نكاح المتعة [illegible] ومجاهد والسدی وغيرهم الآية فی نكاح المتعة (بحر) وهذا القول مروی عن [illegible]

عمران بن الحصین فانه قال نزلت اٰیة المتعة فی کتاب اللّٰہ تعالٰی لم ینزل بعدھا اٰیة تنسخھا وامرنا بھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وتمتعنا بھا ومات ولم ینھنا عنھا)۔ وروی عن ابن عباس جواز نکاح متعه مطلقاً (بحر)

اور عمران بن حصینؓ کے علاوہ خود حضرت علیؓ کے بھی ایک قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متعہ عہد رسالت میں بلکہ اس کے بعد بھی عرصہ تک جائز رہا ہے اور اس کی حرمت صرف حضرت عمرؓ کے ایک حکم سے قرار پائی ہے۔

وقال علیؓ لولا عمرؓ نھی عن المتعة ما زنی الا شقی۔ (ابن جریر)

حضرت ابن عباسؓ آیت کو منسوخ نہیں محکم قرار دیتے تھے اور انھیں کی سند پر بعض صحابہ بعض اہل بیت، مجاہد تابعی اور مکہ و یمن کے فقیہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دے رکھا تھا۔

وقال ابوبکر الطرسوسی لم یرخص فی نکاح المتعة الا عمران بن حصین وابن عباس وبعض الصحابة وطائفة من اھل البیت ... وقال ابو عمر اصحاب ابن عباس من اھل مکة والیمن کلھم یرون متعة حلالا علی مذھب ابن عباس (قرطبی) وکان مذھب ابن عباس ان الاٰیة محکمة وترخص فی نکاح المتعة (معالم) وان مجاھد یرخص فی نکاح المتعة (ابن کثیر) واشتھر عن ابن عباس تحلیلھا وتبع ابن عباس علی القول بھا اصحابه من اھل مکة واھل الیمن (بدایة المجتھد) واشتھر عن ابن عباس تحلیلھا وتبعه علی ذلک اکثر الصحابة من اھل الیمن ومکة (فتح القدیر حنفی) وکان ابن عباس یقول ھو بمنزلة المیتة الخ (جصاص)

بلکہ بعض اکابر حنفیہ مثلاً امام سرخسی صاحب مبسوط اور علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ کے ہاں تو قول جواز ائمہ اربعہ میں امام مالکؒ کی جانب منسوب ملتا ہے۔

ھذا باطل عندنا جائز عند مالک بن انس (المبسوط، سرخسی، نکاح المتعة باطل) وقال مالک ھو جائز (ھدایة) خلاف مالک وھو جائز عنده لانه کان مشروعا فیبقی الی ان یظھر ناسخه۔ وقال مالک ھو جائز لانه کان مشروعا فیبقی الی ان یظھر ناسخه

لیکن امام مالکؒ کی جانب اس نسبت جواز پر بڑی نفیلی تنقید ہوئی ہے بعض اکابر حنفیہ نے جن میں پیش پیش ہدایہ کے نامور شارح ابن ہمام ہیں نے اس انتساب کو غلط ٹھہرایا ہے۔

النسبة الی مالک غلط (فتح القدیر) ونقل الحل عن مالک لا اصل له (روح)

اور بڑی بات یہ ہے کہ خود مالکیہ کی کتابوں سے بھی اس فتویٰ کے جواز کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ براہ راست یا بالواسطہ اس کی مخالفت ہی نکلتی ہے۔

بعض النکاح الصحیح (ابن العربی) واما متعة النساء فھی من غرائب الشریعة لانھا ابیحت فی صدر الاسلام ... ثم حرمت بعد ذلک استقر الامر علی التحریم (ابن العربی) والاحادیث التی وردت فی تحریم نکاح المتعة (بدایة المجتھد) تواترت الاخبار عن رسول اللّٰہ صلعم بتحریمه۔ (بدایة المجتھد)

سب سے بڑھ کر یہ خود حدیث نبوی میں اس کی صاف ممانعت آچکی ہے۔

صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث السبرہ بن معبد جہنی سے نقل ہوئی ہے جس کے آخر میں حضور کا یہ ارشاد موجود ہے:۔

یا ایھا الناس انی کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللّٰہ تعالٰی قد حرم ذلک الی یوم القیامة فمن کان عنده منھن شیٔ فلیخل سبیله ولا تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئا	اے لوگو! میں نے تمھیں اجازت دے رکھی تھی عورتوں سے متعہ کر لینے کی لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے سو جس کسی کے پاس ان میں سے کوئی ہو وہ اسے آزاد کر دے اور جو کچھ تم نے ان عورتوں کو دے رکھا ہے وہ ان سے واپس نہ لو۔

دوسری حدیثیں بھی بخاری، مسلم، نسائی وغیرہ میں نقل ہوئی ہیں، حاصل ان کا بھی یہی تحکیم حرمت متعہ ہے۔
اسی لئے ابن عباسؓ سے رجوع فتوئے جواز سے منقول ہے۔

وقیل عنه بجوازها عند الضرورة والاصح عنه الرجوع الی تحریمها (بحر) وابن عباس صح رجوعه [illegible] (هدایه) قال ابن عباسؓ رجع عن ذالك (معالم)

اور اب فقہائے اہل سنت کا حرمت متعہ پر اتفاق ہے اور ان کے ساتھ مفسرین نے یہی مسلک اختیار کیا ہے، اختلاف صرف فرقہ امامیہ تک محدود رہ گیا ہے۔

وجمع الجمهور علی حرمة متعه بوجوه (کبیر) وبالجملة الاستدلال به [illegible] لانه [illegible] [illegible]
کما لا یخفی ولاخلاف الان بین الائمة وعلماء الامصار الا الشیعة فی عدم جوازها [illegible] [illegible]
الحل والقول بانها مرتب فی المتعة غلط و [illegible] المعنی بها [illegible] غیر مقبول لان نظم القران [illegible]
والامر علی تحریمها فقهاء الامصار (بحر) والی هذا ذهب جمهور العلماء من الصحابة [illegible] [illegible] المتعة حرام
والایه منسوخه (خازن) وقال ابو عبید المسلمون الیوم مجمعون علی ان متعة النساء قد نسخت بالتحریم نسخها الکتاب
والسنة هذا قول اهل العلم جمیعا من اهل الحجاز والشام والعراق من اصحاب الاثر واهل الرای وانه لارخصة فیها لمضطر
ولا لغیره (ر ب) وفی الباب اخبار کثیرة مرویة فی الصحاح والمسانید والاجماع منعقد علی عدم جوازها [illegible] (شعب الایمان)

اور جنھوں نے اس مذہب کے لئے صحابہ کے اجماع عام کا دعویٰ نہیں کیا ہے انھوں نے بھی اسے مذہب "جمہور" اور مسلک "کثیر" صحابہ اور فتوئ "عام" اہل علم تو بہر حال بتایا ہے۔

واکثر الصحابه وجمیع فقهاء الامصار علی تحریمها (بدایة المجتهد) والی هذا ذهب [illegible] اهل العلم ان
نکاح المتعة حرام والایة منسوخه (معالم) وفی هذه الایة قولان احدهما وهو قول اکثر علماء الامة ان
المراد منه ابتغاء النساء بالاموال علی طریق النکاح (کبیر) وسائر العلماء والفقهاء من الصحابة والتابعین
والسلف الصالحین علی ان هذه الایة منسوخة وان المتعة حرام وحرمها سائر الناس (قرطبی)

مفسروں میں اس باب میں بہترین کلام احکام القرآن (جصاص) و روح المعانی میں ملے گا، اور پھر خازن میں۔
تاریخی روایتوں اور حدیثوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ یا طویل سفر کے موقع پر عقد موقت یا عارضی نکاح کی جو صورت مجرد یا ہوتی لئے حسب ضرورت و مصلحت ایک بار یا چند بار جائز کردی گئی تھی اور بعض صحابہ اسی خیال میں عرصہ تک رہے باقی مستقل حکم وہی عدم جواز ہی ہے۔
ابن مسعود صحابی جلیل کی یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں نقل ہوئی ہے۔

کنا نغزو مع النبی صلعم لیس معنا نساء فقلنا الا نختصی فنهانا عن ذلك ثم رخص لنا ان نستمتع۔	ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں تھے اور بیویاں ہمارے ساتھ نہ تھیں تو ہم لوگوں نے کہا کہ کیا ہم آختہ کرالیں تو رسول اللہ نے ہم کو اس سے روکا پھر ہمارے لئے متعہ کی اجازت دیدی۔

اور یہ روایت بھی سلمہ بن اکوع کے حوالہ سے صحیحین میں نقل ہوئی ہے۔

رخص النبی صلعم عام اوطاس فی المتعة ثلاثا ثم نهی عنه۔	رسول اللہ صلعم نے غزوۂ اوطاس کے سال متعہ کی اجازت تین بار دیدی تھی مگر اس کے بعد اس کی ممانعت کردی۔

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن

اور تم میں سے جو کوئی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مومنات سے نکاح کرسکے ۸۱ تو وہ تمہاری (آپس کی) مسلمان کنیزوں

مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُم ۚ

سے جو تمہاری ملک (شرعی) میں ہوں (نکاح کرلے) ۸۲ اور اللہ تمہارے ایمان (کی حالت) سے خوب واقف ہے ۸۳

اور صحیحین نے اور بعض ارباب سنن نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے۔

ان علیا قال لابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن متعۃ النساء یوم خیبر۔

کہ آپ نے ابن عباسؓ سے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے خیبر کے وقت ہی متعہ سے ممانعت کردی۔

چنانچہ اب بجز فرقہ امامیہ کے سب کا اتفاق اس کی حرمت پر ہے۔

[illegible] (مہذب)

قول فیصل محدث حازمی کا ہے جسے ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے:۔

قال الحازمی [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] اباحہا لہم وہم فی بیوتہم واوطانہم [illegible] علیہ فی آخر سنتہ فی حجۃ الوداع وکان تحریم تابید لاخلاف فیہ من الائمۃ وعلماء الامصار الا طائفۃ من الشیعۃ۔

حازمی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے متعہ لوگوں کے لئے جب کہ وہ اپنے وطن یا گھروں میں بیٹھے ہوں، [illegible] آپ نے اسے صرف سفر ہی کے موقعوں پر جائز کیا ہے، پھر آخر عمر میں حجۃ الوداع کے موقع پر اسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا جس میں ائمہ اور علماء ملک کے مابین کسی کو بھی اختلاف نہیں بجز شیعوں کے ایک فرقہ کے۔

۸۰ عَلِیْمًا اور حَکِیْمًا۔ یہ دو صفات باری قانونی احکام کے موقع پر اکثر بیان ہوئی ہیں۔ یہاں بھی انہیں لاکر یہ یاد دلا دیا کہ اللہ کا علم کامل بھی ہے اور بندوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں پر محیط بھی اور اسی علم کامل و محیط کے لحاظ سے اس نے قانون اور ضابطے بھی حکیمانہ مقرر کئے ہیں، کوئی انسان تمدن کے کسی دور میں اپنی حماقت سے یہ زعم نہ کر بیٹھے کہ میں شریعت الٰہی کے کسی جزئیہ میں کوئی مناسب ترمیم اپنی رائے سے کرسکتا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر یہ منقول ہے کہ وہ علیم ایسا ہے کہ ہمارے اضطرار پر نظر کرکے اس نے متعہ کو حلال کردیا تھا اور حکیم ایسا کہ اپنی حکمت کاملہ کے تقاضہ سے اسے حرام بھی قرار دے دیا۔

علیما فی ما احل لکم المتعۃ وحکیما فی ما حرم علیکم المتعۃ وقیل علیما باضطرارکم الی المتعۃ وحکیما فی ما حرم علیکم المتعۃ (تنویر المقباس)

۸۱ یعنی آزاد شریف بیویوں کا مہر، نفقہ وغیرہ پوری طرح ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔

المُحْصَنٰتِ سے یہاں مراد شریف آزاد بیویاں ہیں۔

ای الحرائر (معالم) یرید الحرائر [illegible] العفائف وھو ضعیف (قرطبی)

بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٍۚ فَٱنكِحُوهُنَّ بِإِذۡنِ أَهۡلِهِنَّ وَءَاتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ

تم (سب) آپس میں ایک ہو ۸۵۴ سو ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لیا کرو ۸۵۵ اور ان کے مہر انہیں

بِٱلۡمَعۡرُوفِ مُحۡصَنَٰتٍ غَيۡرَ مُسَٰفِحَٰتٍ وَلَا مُتَّخِذَٰتِ أَخۡدَانٍۚ

دیدیا کرو دستور کے موافق ۸۵۶ اس طرح کہ وہ قید نکاح میں لائی جائیں نہ کہ مستی نکالنے والیاں ہوں اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں ہوں ۸۵۷

طول کے معنی وسعت و مقدرت کے ہیں۔

الطول السعة والغنیٰ قاله ابن عباس ومجاهد وسعید بن جبیر والسدی وابن زید (قرطبی)

۸۵۲ (اور کنیز کو بیوی بنا لینے میں عار محسوس نہ کرے)

یہ مشورہ اس مصلحت سے دیا گیا ہے کہ باندی کا مہر نفقہ وغیرہ نسبۃً ہلکا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ ان کے مالک انہیں غریب شوہروں کے نکاح میں دے دینے میں عار بھی محسوس نہ کریں گے۔

فَتَيَٰتِكُمُ۔ فتاۃ کا لفظ جب باندیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس میں جوان عمر کی قید باقی نہیں رہتی۔ جوان ہر سن و سال کی باندیاں فتیات ہی کہی جائیں گی۔

الفتی الفتاة [illegible] الامة [illegible] والعجوز كل واحد منهما [illegible]

اماتكم (راغب) ای المملوکات [illegible] (قرطبی)

فَتَيَٰتِكُمُ ٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ۔ حنفیہ کے ہاں کنیز کتابیہ سے بھی نکاح جائز ہے اور آیت میں مومنات کی قید محض استحبابی ہے۔

ونكاح الامة الكتابية يجوز عندنا والتقييد في النص للاستحباب (مدارك)

۸۵۳ (اور ایمان ہی معیار و مدار فضیلت ہے)

پھر کوئی آزاد کیوں بہ وقت ضرورت کسی باندی سے عقد کرنے میں عار محسوس کرے۔

فقہاء مفسرین نے آیت سے ظاہر ایمان کے قبول کرنے پر استدلال کیا ہے نیز اس پر کہ ایمان تصدیق قلب کا نام ہے نہ کہ اقرار زبانی کا۔

فیه تنبیه على قبول ظاهر ایمانهن ودلیل على ان الایمان هو التصدیق دون عمل اللسان (مدارك)

قیل جیء بها للاشارة الی ان الایمان الظاهر کاف في صحة نکاح الامة ولا یشترط في [illegible]

علما یقینیا اذ لا سبیل الى الوقوف على الحقیقة الا لعلام الغیوب (روح)

۸۵۴ (خواہ آزاد ہو خواہ غلام مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی اور اولاد آدم ہونے کے لحاظ سے بھی۔)

[illegible] من آدم ودینكم الاسلام [illegible]

الاماء فكلكم بنو آدم (مدارك) [illegible] (روح)

عرب سوسائٹی میں باندیوں سے نکاح کرنا عار اور ذلت کی چیز سمجھی جاتی تھی کہ ان سے جو اولاد ہوگی وہ کنیز زادی کہلائے گی قرآن مجید نے اس عار کو مٹایا اور بتایا کہ بوقت ضرورت اس میں ذرا تکلف نہ کرنا چاہئے۔

ان العرب كانوا يفتخرون بالانساب [illegible]

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى

پھر جب وہ (کنیزیں) قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اگر وہ (بڑی) بےحیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لئے

الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ

اس سزا کا نصف ہے ۵۸۸ جو آزاد عورتوں کے لئے ہے ۵۸۹ یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے بدکاری کا اندیشہ رکھتا ہو ۵۹۰

۵۸۵ مجرد نکاح سقوطِ ملک کے لئے کافی نہیں، اس لئے مالک کی اجازت بہرحال ضروری ہے۔

لاھلھن۔ اہل سے اس سیاق میں مراد مالک یا مولا ہے۔

المراد بہ الموالی لانہ لاخلاف انہ لایجوز لھا ان تتزوج بغیر اذن مولاھا وانہ لااعتبار باذن غیر المولی (جصاص) والمراد من الاھل الموالی (روح)

لیکن خود مولا سے مراد اس سے لی گئی ہے جو ولایتِ تزویج رکھتا ہو، عام اس سے کہ مالک ہو یا نہ ہو۔

وحمل الفقہاء ذلک علی من لہ ولایۃ تزویج ولو غیر مالک فقد قالوا الاب والجد والقاضی والوصی تزویج امۃ الیتیم (روح)

بہرحال نفسِ نکاح میں رضامندی خود باندیوں کی معتبر ہوگی نہ کہ ان کے مالکوں کی۔

وھو حجۃ لنا فی ان لھن ان یباشرن العقد بانفسھن لانہ اعتبر اذن الموالی لاعقدھم (مدارک)

۵۸۶ (اور ان کے کنیز ہونے کی بنا پر ادائے مہر کو غیر اہم یا غیر ضروری نہ سمجھو)

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ مالک اپنی باندیوں کی کمائی کے مالک ہوتے تھے اس لئے باندیوں کا مہر بھی ان کے مالکوں ہی کو دیا جائے گا اور تقدیر کلام یوں ہوگی:۔

واٰتوا الیھن مھورھن۔ فکان اداؤھا الیھن اداء الی الموالی لانھن وما فی ایدیھن مال الموالی۔ (مدارک)

۵۸۷ یعنی یہ ادائے مہر یہ معاوضۂ نکاح ہو، بطور اُجرتِ زنا نہ ہو۔

آزاد شریف بیویوں کے مقابلہ میں باہر نکلنے والیوں کے بدچلنی کے امکانات یوں بھی زائد ہوتے ہیں چہ جائیکہ باندیاں جو عرفاً حقیر و غیر معزز سی سمجھی جاتی ہیں اس لئے ان کے ذیل میں ان قیدوں کا ذکر صراحت کے ساتھ ضروری ہوا۔

مُسٰفِحٰتٍ سے مراد ہیں کھلی ہوئی اور عام کسبیاں اور مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ سے مراد ہیں وہ جن کا کوئی ایک آدھ معین آشنا ہوتا تھا، دنیائے فسق میں بیسواؤں کی دو قسمیں تقریباً ہر جگہ قائم رہی ہیں، ایک کھلی ہوئی کسبیاں، دوسرے چھپی ہوئی خانگیاں، یہی تفریق جاہلیت عرب کے تمدن میں بھی قائم تھی۔

قال اکثر المفسرین المسافحۃ ھی التی تؤاجر نفسھا مع ای رجل ارادھا والتی تتخذ الخدن فھی التی تتخذ خدناً معیناً، وکان اھل الجاھلیۃ یفصلون بین القسمین وما کانوا یحکمون علی ذات الخدن بکونھا زانیۃ (کبیر)

۵۸۸ (جیسا کہ قبل نکاح بھی تھا)

باندیاں خواہ نکاحی ہوں یا کنواری ان کی سزائے زنا ہر حال میں آزاد شریف بےنکاحی عورتوں کی سزا کی نصف ہے باندیاں جس طرح اکثر حقوق میں بیویوں کا نصف مرتبہ رکھتی ہیں اسی طرح اس جرم کی سزا بھی ان کے لئے

وَأَن تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٥﴾

اور اگر تم ضبط سے کام لو تو تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے ۹۱ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے اور بڑا مہربان ہے ۹۲

نصف ہی رکھی گئی ہے شاید اس لئے کہ جرم کی ترغیبات بھی ان کے لئے زائد ہیں اور موانع کمتر۔

بِفَاحِشَةٍ. جرم بے حیائی یہاں زناکاری کے معنی میں ہے۔

وھی الزنا (ابن جریر)

من العذاب. سزا سے مراد حدِ شرعی ہے۔

ای من الحد (مدارک)

عَلَى الْمُحْصَنٰتِ. محصنات سے یہاں مراد بیاہی ہوئی نہیں بلکہ بن بیاہی شریف خواتین ہیں۔ احصان کے تحقق کے لئے اس کا محض حُرّہ (آزاد) ہونا ہی کافی ہے۔

المحصنات ھنا الحرائر اللاتی لم یتزوجن (مدارک) ای الابکار ... (قرطبی) ... ای ما علی الحرائر الابکار

ایک آیت اوپر اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ کے ذیل میں بھی محصنات مطلق شریف عورتوں کے معنی میں آ چکا ہے۔

۸۹ یعنی باندی کی زناکاری کی سزا پچاس درّے ہے، شریف کنواری عورت کی سزائے زناکاری سو درّے ہے فاجلدوا کل واحد منھما مائة جلدة اس کے نصف پچاس ہی درّے ہوتے ہیں شریف نکاحی عورت کے لئے سزائے زنا سنگساری ہے اور اس کی تنصیف ممکن نہیں، پھر مملوک پر سرے سے رجم ہی نہیں اس کی سزا ہر صورت میں پچاس درّے ہے۔

نصف ما علی المحصنات یدل علی انه الجلد لا الرجم لان الرجم لا یتنصف (مدارک)

غلاموں کی حرام کاری کی سزا قرآن مجید میں مذکور نہیں فقہاء نے اسی آیت سے استنباط کر کے ان کی سزا بھی یہی پچاس درّے رکھی ہے آج کے بعض نوپیدا فرقوں کے علاوہ، قدیم فرقہ خوارج سزائے رجم کا بالکل منکر رہا ہے اور اس کا مستدل یہی آیت ہے (کبیر)

۹۰ (خواہ اس لئے کہ طبعی تقاضہ مجبور کر رہا ہو، خواہ اس لئے کہ شریف بیوی میسر نہ آ رہی ہو)

ذٰلِكَ یعنی باندی سے نکاح۔

یعنی نکاح الأمة عند عدم الطول (معالم) ای نکاح الاماء (مدارک)

الْعَنَتَ. عَنَت کے لفظی معنی ضرر وزیاں کے ہیں۔

اصل العنت الضرر والفساد (ابن قتیبہ)

یہاں مراد زنا میں پڑ جانا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کون ضرر مسلمان کے لئے ہو سکتا ہے۔

ای الزلة والفجور منکم (ابن عباسؓ) العنت الزنا (ابن جریر عن ابن عباسؓ) ای الاثم الذی تؤدی الیه غلبة الشهوة (مدارک)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید ضبط جس سے انسان جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے مثلاً اختناق الرحم کی شکایت ہو جائے یا مردوں کو ورم خصیت وغیرہ کی۔ امام رازیؒ جو خود بھی اپنے زمانہ کے نامور طبیب تھے اس قول کو یوں نقل کرتے ہیں۔

والثانی ان الشبق الشدید والغلمة العظیمة قد تؤدی بالانسان الی الامراض ... فی حق النساء

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اللہ کو منظور ہے کہ تم سے (احکام) کھول کر بیان کر دے، اور تم کو تم سے قبل والوں کے حالات بتلا دے اور

وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫

تم پر توجہ فرمائے ۹۳ اور اللہ بڑا علم والا ہے اور بڑا حکمت والا ہے ۹۴ اور اللہ کو منظور ہے کہ تمہارے حال پر توجہ فرمائے ۹۵

وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

اور جو لوگ خواہشوں کے بندے ہیں ۹۶ انہیں یہ منظور ہے کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ ۹۷

فقد تؤدی الی اعنات الرجل وامۃ [illegible] فقد تؤدی الی اوجانع او رکب و مطهر (کبیر)

۹۱ یعنی اگر خواہشِ نفس کا اتنا غلبہ نہیں ہے جس سے حرام کاری میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہو رہا ہو تو پھر کنیزوں سے نکاح کرنے سے یہی بہتر ہے کہ خود خواہشِ نفس پر قابو حاصل کر لیا جائے۔

ای الصبر عن نکاح الاماء خیر لکم (ابن جریر) ھذہ الاخبار عن صبرکم عن نکاح الاماء و لہ ابن عباس و مجاھد و ابن جبیر و السدی (بحر)

۹۲ چنانچہ اس کی صفتِ رحیمی اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے نکاحوں کی حرمت کا حکم نہیں دیا، اور نشاءِ مغفرت یہ ہے کہ کنیزوں سے بلا ضرورتِ شدید بھی نکاح کر لیا کراہتِ تنزیہی کے باوجود نجات کی راہ میں حائل کسی طرح نہیں۔

۹۳ (رحمت و مغفرت کے ساتھ)

لِيُبَيِّنَ لَكُمْ چنانچہ آیاتِ احکام و مسائل وہ تمہاری ہی مصلحت و نفع کے لئے نازل کرتا ہے۔
يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ چنانچہ آیاتِ قصص و حکایات وہ تمہاری ہی مصلحت و نفع کے لئے نازل کرتا ہے

۹۴ چنانچہ بندوں کی کوئی سی بھی ضرورت و مصلحت اس کے علمِ کامل سے باہر نہیں، اور اپنی حکمتِ کاملہ سے اس نے احکام ایسے رکھے ہیں جو ہر مصلحت کی پوری پوری رعایت کرنے والے ہیں۔

۹۵ (شفقت و رحمت کے ساتھ انہیں احکام و تعلیمات کے ذریعہ سے)

۹۶ (اور ہوائے نفس ہی کو اپنا دین و ایمان بنائے ہوئے ہیں)

یہ کون لوگ ہیں؟ الفاظ کا مصداق کفار کا ہونا تو ظاہر ہی ہے باقی فسق پیشہ افراد بھی مراد ہو سکتے ہیں صحابہ و تابعین سے اس کے معنی اہلِ کتاب کے بھی مروی ہوئے ہیں یہود کے بھی اور زانیوں کے بھی۔ وقِس علیٰ ہٰذا۔

قیل المجوس (کبیر) قیل المجوس و قیل الیھود (بیضاوی) قال بعضھم ھم الزناۃ وقال آخرون بل ھم الیھود والنصاری (ابن جریر) ھم الزناۃ او الیھود والنصاری او الیھود خاصۃ او المجوس۔ (بحر)

قولِ فیصل یہ ہے کہ الفاظ ان سارے معانی کے متحمل ہیں اس طرح کہ جو شخص بھی نافرمانی پر دلیر ہے وہی اپنی خواہشِ نفس کا بندہ ہے

[illegible] الذین یتبعون الشھوات الیھود والنصاری والزناۃ وکل متبع ... کل متبع ما نھاہ اللہ عنہ فمتبع شھوۃ

وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِيۡهِ نَارًا ‌ؕ وَكَانَ

اور جو کوئی ایسا کرے گا سرکشی اور ظلم کی راہ سے تو ہم عنقریب اس کو آگ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ

ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۳۰﴾ اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبٰٓٮِٕرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ

کے لئے آسان ہے ف۱۰۳ اگر تم ان بڑے کاموں سے جو تمہیں منع کئے گئے ہیں بچتے رہے تو ہم

عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾

تم سے تمہاری معمولی برائیاں دور کردیں گے ف۱۰۴ اور تمہیں ایک معزز مقام پر داخل کردیں گے ف۱۰۵

بعض مذہبوں میں خودکشی خود ایک عبادت گنی گئی ہے مثلاً جاپانیوں میں یا بعض قدیم ہندی تہذیبوں میں ایک شکل اس کی خودستی بھی ہے۔
بالمحج کما یفعله جهلة الهند (بیضاوی)

ف۱۰۲ (چنانچہ یہ سارے احکام بھی اسی شفقت ورحمت کا نتیجہ ہیں۔)

ف۱۰۳ یہ وعید اُن لوگوں کے لئے ہے جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی اتفاقی طور پر یا بطور خطائے اجتہادی کے نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ کرتے رہتے ہیں۔

ذٰلك ای ما نهی عنه (جلالین) معه ما سبق ذکره من المحرمات (معالم)

عُدۡوَانًا۔ یعنی حدودِ شرعی سے تجاوز کرتے ہوئے یا دوسروں پر ظلم کرتے ہوئے۔

قیل اراد بالعدوان التعدی علی الغیر (بیضاوی)، العدوان مجاوزة الحد (قرطبی)

ظُلۡمًا۔ یعنی اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے۔

قیل اراد بالظلم ظلم النفس (بیضاوی)

كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا۔ اللہ کی قوت لامحدود اور بے اندازہ کو یہ دیوتا پرست مشرک کہیں انسانوں یا دیوتاؤں کے محدود قوتوں پر قیاس نہ کریں۔

ف۱۰۴ (اور نتیجۃً تمہیں عذاب سے بچالیں گے)

یہ قانون الٰہی ہے جس کی تکرار قرآن مجید میں کئی بار آئی ہے اور ایک جگہ اسے بالکل کلی اور عمومی صورت میں یوں بیان کیا گیا ہے اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ اس قسم کی آیتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اولیاء واتقیاء مقبولین میں بھی کوئی معصوم نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ان کی کثرتِ طاعات پر نظرِ رحمت کرکے اُن کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر کردیتا ہے اور انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبوں سے سرفراز کرتا رہتا ہے۔ عصمتِ انبیاء کا مسئلہ ایک دوسرے قانون سے ثابت ہے۔
كَبٰٓٮِٕرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ۔ کبائر یعنی بڑے بڑے گناہ لیکن خود کبیرہ کا اطلاق کس عمل پر ہوتا ہے؟ اس کے جوابات متعدد دیئے گئے ہیں۔ سفیان ثوری تابعی کا قول نقل ہوا ہے کہ کبیرہ نام ہے بندوں کے اتلافِ حقوق کا اور صغیرہ صرف اللہ کے اتلافِ حقوق کا۔

قال سفیان الثوری الکبائر ما کان فیه المظالم بینک وبین العباد والصغائر ما کان بینک وبین الله تعالیٰ (معالم)

اور حسین بن فضل کا قول ہے کہ کبیرہ وہ عمل ہے جس پر قرآن مجید نے اطلاق کبیر یا عظیم کا کیا ہو۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ

اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دے رکھی ہے ٦٠٦

قال الحسین بن الفضل ما سماه الله تعالیٰ فی القرآن کبیرا أو عظیما (معالم)

یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ کبیرہ وہ معصیت ہے جسے حلال قرار دے کر کیا گیا ہو جیسے ابلیس کا سجدہ سے انکار، اور صغیرہ وہ معصیت ہے جس پر استغفار کیا گیا ہو جیسے آدم کی ندامت شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لینے پر۔

قیل کبائر ذنوب المستحلین مثل ذنوب ابلیس والصغائر ذنوب المستغفرین مثل ذنب آدم (معالم)

اس ہیچدان کے خیال میں کبیرہ وہ عمل ہے جس کی ممانعت صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آچکی ہو، اور اس کا معصیت ہونا کسی دقیق استنباط یا دلالتِ خفی کا محتاج نہ ہو، یا کم از کم یہ کہ حدیث صحیح میں اس کی ممانعت صراحت اور تاکید کے ساتھ آچکی ہو، ممتاز صحابیوں کے نزدیک کچھ ایسا ہی پایا جاتا ہے۔

وعن علی بن ابی طالب هی کل ذنب ختمه الله بنار او غضب ولعنة او عذاب معالم أنها المعصية

التی یلحق صاحبها الوعید الشدید بنص کتاب او سنة وهذا اکثر ما یوجد لهم. (ابن کثیر)

اور حضرت علیؓ ہی کی تفسیر ابن جریر نے عبداللہ ابن عباسؓ سے بھی نقل کی ہے۔

سَيِّـَٔاتِكُمْ۔ سیئات سے مراد چھوٹی برائیاں یا گناہِ صغیرہ ہیں۔

ای صغائرکم (بیضاوی)

سدی تابعی سے منقول ہے کہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس سے اللہ نے روکا ہے اور سیئہ اس گناہ کے مقدمات ہیں۔

وقال السدی الکبائر ما نهی الله عنه من الذنوب الکبائر والسیئات مقدماتها (معالم)

یک قول یہی نقل ہوا ہے کہ کبیرہ نام ہے شرک اور اس کے مقدمات کا، اور باقی جو گناہ ہیں وہ سیئات ہیں۔

قیل الکبائر الشرک وما یؤدی الیه وما دون الشرک فهو من السیئات (معالم)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ کبیرہ پر عتاب کے ساتھ ساتھ عفو کا احتمال اور صغیرہ پر عفو کے ساتھ ساتھ عتاب کا احتمال خاص اہلِ سنت کا مذہب ہے، بہ خلاف معتزلہ کے جن کے نزدیک صغائر واجب المغفرۃ ہیں اور کبائر غیر مغفور ہیں۔

ف٦٠٥ یعنی جنت میں پہلا وعدہ عذاب سے محفوظ رکھنے کا تھا، اب بشارت دخولِ جنت کی مل رہی ہے، یہ بشارت خوب خیال کر لیا جائے کہ معصوموں کو نہیں بلکہ ان لوگوں کو مل رہی ہے جو صاحب سیئات ہیں گناہوں کے باوجود مغفور۔

ف٦٠٦ (طبعی و وہبی طور پر بلا دخل کسی عمل و کسب کے)

مثلاً مردوں ہی کو ایک طبعی فضیلت عورتوں پر حاصل ہے، یا پھر مردوں ہی میں کوئی دولت مند ہے، کوئی حسین جمیل ہے، کوئی خوش آواز ہے، کسی کے قوائے جسمانی بہت مضبوط ہیں ــــ اس قسم کے وہبی و طبعی فضائل کو قربِ حق میں مطلق دخل نہیں، آیت میں تعلیم ہے کہ ان کی بنا پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کی جگہ پر ہونے کی حسرت و تمنا کرنا درست نہیں، قربِ حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے۔

شانِ نزول کی روایتوں میں آیا ہے کہ کچھ عورتوں نے اپنے احساسِ کمتری کی بنا پر مردوں پر رشک کا اظہار کیا

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ

مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے

وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٣٢﴾ وَلِكُلٍّ

اور اللہ سے اس کے فضل کی طلب کرو بےشک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے اور ہر ایک کے لئے ہم نے

جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ

اس ترکہ کے وارث مقرر کر دیئے ہیں جسے والدین اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے

أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾

ہوئے ہیں انہیں ان کا حصہ دے دو بےشک اللہ ہر چیز پر مطلع ہے۔

اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ نجات و مغفرت اور قرب حق کا مدار تو اپنے اعمال ارادی اختیاری پر ہے اور اس لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے، عورتوں کے لئے بھی قانون حسن عمل وہی ہے جو مردوں کے لئے ہے اور اس لئے انہیں مردوں پر رشک کا کوئی محل نہیں، طبعی فرق تو محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دیئے گئے ہیں۔

(لان ذلک [illegible] قسمة من [illegible] صادرة عن حکمة و [illegible] علم باحوال العباد [illegible])

۷ (یعنی نہ ہوگا کہ مرد کا اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر کچھ بڑھ جائے اور عورت کا اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر کچھ گھٹ جائے) مرد بحیثیت مرد ہرگز اللہ کے ہاں اقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں اور عورت اپنی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی، جیسا کہ بعض دوسرے مذہبوں نے قرار دے رکھا ہے اس میں عورت کے لئے تعلیم ہے کہ وہ اپنا احساس کمتری دور کرے اور سمجھ لے کہ ایک مکلف مخلوق کی حیثیت سے وہ اور مرد دونوں بالکل ایک سطح پر ہیں اور حصول نجات و قرب حق میں وہ مردوں سے ذرا بھی فروتر نہیں، مسیحیوں نے اپنی سوسائٹی کے اوراق میں دیکھو کلیسائے صدیوں تک اپنی کونسلوں میں جو فیصلے عورت کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں آیت ان سب کی تردید کر رہی ہے۔

مما اکتسبوا۔ مما اکتسبن۔ اکتساب سے مراد دونوں جگہ اعمال خیر کا کسب ہے۔

۸ (توفیق اعمال میں)

رشک و تمنا کے قابل اور دعاؤں میں طلب کے قابل اصل چیز دنیوی اور طبعی نعمتیں نہیں بلکہ توفیق حسن عمل ہے۔

۹ (چنانچہ اپنے اس علم کامل کے مطابق اس نے مخلوق کو صلاحیتیں مستعد کر بخشی اور وہی ہر ایک کے حسن عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے) اسلام کا خدا جزئی و کلی ہر شے کا عالم ہے بخلاف بعض یونانی فلسفے کے جنہوں نے خدا کو صرف عالم کلیات ہی مانا ہے۔

۱۰ (اپنی میراث کے ذریعہ سے)

وارثوں کی تفصیل اسی سورت میں ابتداء میں قبل گزر چکی۔ تقسیم ترکہ کی کچھ عام تمہید تھی آیت [illegible]

الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں ۱۱۳ اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دے رکھی ہے

وہ کل دونوں میراث کے نازل ہونے کے بعد اب قدرۃً منسوخ ہوگئیں ـــ یہ دونوں میراث شریعت ہی کو ایک حکم قانون بنگئی۔ من مضاف الیہ محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہے [illegible]

۱۱۱ یعنی کل ترکہ کا ۱/۶ حصہ۔

الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ صدر اول میں یہ لوگ تھے، موالات کہلاتے تھے۔ عرب قدیم میں دستور تھا کہ دو شخص باہم قول و قرار کرکے ایک دوسرے کے اس طرح دوست و مددگار ہو جاتے کہ اگر ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا ادا کرے اور ایک کی وفات پر دوسرا اس کی میراث پائے۔ اسی عہد کو عقد موالات کہتے تھے۔ شریعت نے شروع شروع میں اس دستور کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد قائم رکھا اور انصار و مہاجرین میں مواخات قائم کرکے باہم میراث جاری کرادی، پھر اس عہد والے کو حصہ ۱/۶ متعین کر دیا۔ پھر جب سورۂ احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی [illegible] تو صرف نسبی رشتہ داروں کے حصے متعین ہوگئے، اور اب اس کے لئے گنجائش نہیں۔ شریعت کے کسی جزو کے منسوخ ہونے کے معنی بس اسی قدر ہوتے ہیں۔

۱۱۲ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ روحانیت کی دنیا یعنی قرب حق و حسن عمل کے لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے۔ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور دوسری عبادتیں جس طرح مرد کی قبول ہو سکتی ہیں بالکل وہی راہیں عورت کے لئے بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مرد و زن کی مساوات دنیوی معاملات میں اور انتظامی حیثیت سے قائم نہیں۔ باپ اور بیٹے دونوں کی حیثیت بالکل ایک ہی ہے، بلحاظ اعمال کی مقبولیت کے معیار سے دونوں بالکل مساوی ہیں، لیکن دنیا میں شریعت ہی کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے اور بیٹا ماتحت ہو کر۔ باپ حکم دے اور بیٹا حکم مانے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ معاشرتی انتظامی حیثیت میں [illegible] مرد کو عورت پر [illegible] حق حاکمیت ہے

[illegible] درجة بفضل القوامة (ابن عربی)

قَوّٰمُوْنَ۔ قوّام کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ، منتظم، مدبر کے، اور یہاں مراد یہ ہے کہ مرد عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، ان پر احکام نافذ کرنے والے ہیں۔ اہل لغت سے یہی تصریح منقول ہے:—

[illegible] الرجال [illegible]

ائمۂ تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں:—

[illegible]

[illegible]

قوّام اور قیّم ہم معنی ہیں، قوّام فصیح تر ہے۔

[illegible]

بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی عبارتوں سے ہوگا۔

"خداوند خدا نے عورت سے کہا [illegible] اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا، اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" (پیدائش ۳: ۱۶)

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ

اور انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو ف۱۱۸ اور انہیں مارو ف۱۱۹

ف۱۱۶ ذکر مہذب، شریف و شائستہ بیویوں کا ابھی اوپر ہو چکا ہے اب اس کے مقابل ناشائستہ اور رذیل فطرت کی بیویوں کے باب میں کچھ احکام بیان ہو رہے ہیں ــــ وہ نظام قانون کامل نہیں ناقص ہے جو ذکر صرف اچھوں کے انعام و اکرام کا کرتا ہے اور بدوں بدکرداروں کا تذکرہ ہی چھوڑ جاتا ہے۔

نُشُوْزَهُنَّ۔ عورت کے نشوز کے اصل معنی یہ ہیں کہ شوہر کی نافرمانی پر کمربستہ ہو جائے۔

نشزت المرأة بزوجها اي استعصت على زوجها وارتفعت عليه وأبغضته وخرجت عن طاعته (تاج) نشوز المرأة بغضها لزوجها ورفع نفسها عن طاعته (راغب) واصل النشوز الترفع على الزوج بمخالفته (جصاص)

ائمۂ تفسیر نے اسی معنی کی توثیق کی ہے۔

اي استعلاءهن على ازواجهن وارتفاعهن عن فرشهم بالمعصية منهن والخلاف عليهم فيما لزمهن طاعتهم فيه بغضا منهن واعراضا عنهم. (ابن جرير عن محمد بن كعب)

گویا مسرت ازدواجی زندگی کے بجائے گھر میں تصادم و بغاوت شروع ہو جائے۔

تَخَافُوْنَ۔ خوف یہاں علم کے معنی میں ہے، یعنی جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے، یہ نہیں کہ محض بدگمانیاں یا دور کے احتمالات کو اس کے لئے کافی سمجھ لیا جائے۔

والخوف هاهنا بمعنى اليقين وذهب في ذلك الى ان الاوامر التي بعد ذلك انما يوجبها وقوع النشوز لا توقعه (بحر) حمل الخوف على العلم. (معالم) تخافون اي تعلمون (ابن عباسؓ)

فارسی مترجمین قرآن نے بھی یہاں خوف کا ترجمہ علم یا دانستن سے کیا ہے:

"آں زناں کہ معلوم کنید سرکشی ایشاں" (ولی اللہ دہلویؒ) "آں زنانے کہ پدید آید نافرمانی ایشاں را" (سعدیؒ)

ف۱۱۷ اب انہیں سرکش و نافرمان بیویوں کا علاج بیان ہو رہا ہے، پہلی منزل یہ ہے کہ انہیں نرمی و آشتی سے سمجھایا جائے، اگر عورت شریف طینت ہے تو اتنا کافی ہو جائے گا، اسی میں شوہروں کو بھی تعلیم ہے کہ فوراً غصہ میں آکر کوئی سخت کارروائی نہ کر بیٹھیں۔

ف۱۱۸ یعنی اس سے تعلقات ہم بستری منقطع کر لو اور اس کے پاس لیٹنا چھوڑ دو، یہ سزا کی دوسری منزل ہے جب زبانی گفتگو و فہمائش سے اصلاح حال نہ ہو اور نافرمانی و سرکشی بدستور قائم رہے تو اب پہلا عملی قدم یہ اٹھاؤ، لیکن تحقیق و تجربہ کے بعد، اس کے قبل محض ظن و بدگمانی کی بنا پر نہیں، فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ محض بدگمانی پر دوسری اور تیسری سزاؤں کا قدم اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

وَاهْجُرُوْهُنَّ۔ ہجر کے دوسرے معنی ترکِ کلام کے بھی لئے گئے ہیں، یعنی ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دو۔

قال ابن عباس وعكرمة والضحاك والسدى هجرها الكلام (جصاص) اى لا يكلمها وان وطئها قاله عكرمة وابو الضحى (ابن العربي)

ف۱۱۹ (ہلکے ہلکے)

ضربا غير مبرح ولا شائن (ابن عباس) قال الحسن ضربا غير مبرح وغير مؤثر (جصاص)

یہ تیسرا علاج اس وقت کے لئے ہے جب دوسرا علاج بھی ناکام ثابت ہو لے۔

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا

پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو ۱۳۰ بے شک اللہ بڑا ہی رفعت والا

كَبِيرًا ﴿٣٤﴾ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا

بڑا ہی عظمت والا ہے ۱۳۱ اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو ۱۳۲

والامور الثلاثة مرتبة ينبغي ان يتدرج فيها (بیضاوی) الذی يدل عليه السياق والقرينة الحسية ان هذه الامور الثلثة مرتبة فاذا ابيت نشوز امراة منعت ثم تهجر ثم تضرب (روح) قال ابن عطية هذه العظة والهجر والضرب مراتب ان وقعت الطاعة عند احدها لم يتعد الى سائرها (کبیر)

اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی قسم کی ہو ایسی نہ ہو جس سے چوٹ زیادہ آجائے یا جس سے رفیقِ زندگی کی توہین لازم آتی ہو بلکہ مفسر صحابی ابن عباسؓ سے تو یہ منقول ہے کہ یہ مار مسواک جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔

قال ابن عباس بالسواك ونحوه (بحر)

قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار اُسے یاد کر لینے کی بھی ضرورت ہے) کہ کسی ایک طبقہ کسی ایک قوم کسی ایک زمانہ سے نہیں اس کے مخاطب عرب و عجم، چینی اور حبشی، انگریز اور ہندی، رومی اور جاپانی، اعلیٰ اور ادنیٰ، شریف و رذیل، عالم و عامی، فہیم اور کودن، چمار اور چوہڑے، نائی اور دھوبی، شہری اور دیہاتی، نیک بخت اور بد باطن ہر طبقہ، ہر سطح، ہر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک ہر زمانے اور ہر دور والے ہیں اور اس کے احکام و مسائل میں بلحاظ ہر انسانی ضرورت اور ہر بشری ماحول کا کر لیا گیا ہے چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے معاشرے اور طبقے ایسے ہیں جہاں عورت کے لئے جسمانی سزا ہی عام ہی علاج کی صورت ظاہر ہے کہ انہیں طبقوں کے لئے ہے پھر اتنی اجازت بھی ضرورتاً دینی پڑی ہے ورنہ سیاق عبارت نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے

وسوق الكلام للرفق في اصلاحهن (جمل) فالتخفيف مراعى في هذا الباب على ابلغ الوجوه (کبیر)

وقال الشافعیؒ والضرب مباح وتركه افضل. (کبیر)

اور اہل تحقیق نے تصریح کر دی ہے کہ نرم تدبیر اگر کافی ہو جائے تو سخت تر صورت ہرگز جائز نہیں۔

مهما حصل الغرض بالطريق الاخف وجب الاكتفاء به ولم يجز الاقدام على الطريق الاشق (کبیر)

اور امیر المومنین حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے کہ پہلے شوہر زبان ہی سے فہمائش کرے اور اس سے مقصد حاصل ہو جائے تو بس آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہاں اگر یہ ناکافی ثابت ہو تو البتہ دوسرا قدم اٹھائے ترکِ ہم خوابی کا یہ بھی بے اثر رہے جب البتہ ضرب سے کام لے۔

قال امير المؤمنين علي بن ابي طالبؓ يعظها بلسانه فان انتهت فلا سبيل له عليها فان ابت هجر مضجعها فان ابت ضربها

یورپ میں بیویوں کی مار پیٹ کا دستور جیسا جاری رہا ہے اس کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی قرآن مجید۔ یہ حکم کامنا قرآن مجید کے حق میں ذرا بھی مضر نہیں جیسا کہ بعض یورپ زدہ مسلمان سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ اور ہر مزاج اور ہر سطح انسانی کے لئے ہیں۔

۱۳۰ (ان پر سختی اور زیادتی کرنے کے لئے)

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ

تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کر دو ۱۲۳ اگر دونوں کی نیت

اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا ۱۲۴ بے شک اللہ بڑا علم رکھنے والا ہے بڑا باخبر ہے ۱۲۵

اوپر کی تدبیر تو محض ضرورت کے لئے ہے بلا ضرورت اس کا استعمال بیوی کو ستانے اور تکلیف پہنچانے کے لئے ہرگز درست نہیں۔

۱۲۱ (اور تم ایسی رفعت وعظمت والے پروردگار کے حقوق میں کوتاہی سے خود کب بالاتر ہو؟)

یہ یاد دلا کر شوہروں کو گویا تنبیہ کر دی کہ بیبی سے ادائے فرائض کے بارے میں اپنے مطالبے بہت سخت نہ رکھو۔

۱۲۲ خطاب عام امتِ اسلامیہ کو ہے اور حکام اور اہلِ حل وعقد کو بدرجہ اولیٰ۔

الخطاب كما قال ابن جبير والضحاك وغيرهما للحكام (روح) وعن الفرون المراد كل واحد من صالحي الامة (كبير) خطاب لجميع المؤمنين (كبير)

بَيْنِهِمَا یعنی میاں بیوی کے درمیان۔

شِقَاقَ یعنی ایسی کشمکش جسے وہ باہم نہ سلجھا سکیں۔ امت اور افراد امت کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے افراد کے باہمی اور خانگی مناقشوں سے معاشرۂ اسلامی کا دامن بالکل الگ اور بے تعلق رہ ہی نہیں سکتا کہ افراد ہی کی صالحیت پر تو امت کی صالحیت کا مدار ہے۔ آیت میں تعلیم اس کی ہے کہ افراد کی خانگی نزاعوں کو امت اپنا ہی معاملہ سمجھے۔

اِنْ خِفْتُمْ۔ خوف یہاں بھی علم یا ظنِ غالب کے معنی میں ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۱۶

والمراد فان علمتم كما قال ابن عباس (روح) والخوف بمعنى اليقين وقيل هو بمعنى الظن يعني ان طننتم شقاقا بينهما. (معالم)

۱۲۳ (جو تصفیہ کی اہلیت رکھتے ہوں وہ جا کر تحقیق حال کریں۔)

فَابْعَثُوْا۔ یعنی تصفیہ کی غرض سے ان دو حکموں کو ان میاں بیوی کے پاس بھیجو۔

اسلامی معاشرہ میں میاں بیوی میں نزاع ہونے کی صورت میں یہ ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ فوراً طلاق قطعاً ہو جائے یا نوبت کسی ایسی ہی شدید کارروائی کی فوراً آجائے بلکہ پہلے ہر کوشش مصالحت ومفاہمت کی ہو جانا چاہئے، رشتۂ ازدواج ایک اہم ترین رشتہ ہے اس پر بے پروائی سے ضرب نہیں لگائی جا سکتی۔

۱۲۴ اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ اِنْ يُّرِيْدَآ میں ضمیر دونوں حکموں کی جانب ہے اور بَيْنَهُمَا میں زوجین کی جانب

الضمير الاول للحكمين والضمير الثاني للزوجين (بيضاوي) والضمير في ان يريدا للحكمين في بينهما للزوجين (مدارك)

لیکن ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی موقعوں پر ضمیریں زوجین ہی کے لئے ہوں۔

وقيل كلاهما للزوجين (بيضاوي) والضميران للزوجين. (مدارك)

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا۔ یعنی اگر اخلاص ودیانت کے ساتھ نیت مصالحت ومفاہمت کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي

اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اُس کا شریک نہ کرو <u>۱۲۶</u> اور حُسنِ سلوک (رکھو) والدین کے ساتھ اور

الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ

قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور پاس والے پڑوسی اور دور والے پڑوسی اور ہم مجلس اور راہ گیر

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

کے ساتھ اور جو تمہاری ملک میں ہیں اُن کے ساتھ <u>۱۲۷</u>

نیت میں برکت ضرور دے گا، اور قلب کی صفائی کی کوئی صورت نکال ہی دے گا۔ فقہاء حنفیہ نے لکھا ہے کہ فیصلہ کرنا حکام کے لئے واجب ہے اگر زوجین ان سے رجوع کریں اور دوسروں کے لئے مستحب ہے اور میں اخضاء واخفاء کی نیت سب کے لئے مستحب ہے۔

۱۲۵ ہر انسانی ضرورت، ہر بشری مصلحت پر اس کا علم محیط ہے ـــ کون سا راز اُس سے راز رہ سکتا ہے؟ اور کس جزئی سے جزئی خبر سے وہ بے خبر رہ سکتا ہے؟

۱۲۶ (نہ ذات میں نہ صفات میں)

۱۲۷ خیال کر کے دیکھا جائے کہ حسنِ سلوک کی تاکید والدین سے لے کر غلاموں اور باندیوں تک معاشرہ کے ہر طبقہ کے ساتھ وہ بھی اس حکم کا عطف توحید الٰہی پر! دنیا کی کسی دوسری آسمانی کتاب میں اس بے نظیر تعلیم کی نظیر ملے گی؟ اور اس کے ساتھ محققین کی یہ تصریح بھی ملا لی جائے کہ اہلِ حقوق اگر کافر ہوں تب بھی ان کے ساتھ احسان کرے البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے زائد ہوگا۔

وَالْجَارِ۔ حدیث میں آیا ہے جیسا کہ مفسرین نے حدیث ابو نعیم اور محدث بزاز کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پڑوسی (اصولی) تین قسم کے ہیں (۱) ایک وہ جن پر تہرے حق ثابت ہیں یعنی حقِ جوار، حقِ قرابت، حقِ اسلام (۲) دوسرے وہ جن پر دوہرے حق ثابت ہیں یعنی حقِ جوار وحقِ اسلام (۳) تیسرے وہ جن پر ایک ہی حق ثابت ہے یعنی حقِ جوار اور وہ وہ پڑوسی ہے جو مشرک کتابی ہو۔

قرآن مجید کی یہ تصریح بھی ذہن میں رہے کہ حق دونوں قسم کے پڑوسی رکھتے ہیں، قرب والے اور قرابت والے بھی اور دور والے اور اجنبیت والے بھی، مسلمان اگر آج ایک اسی تعلیم کو یاد رکھیں تو کتنی خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو جائے بلکہ ایک تفسیر تو یہ بھی منقول ہے کہ جار ذی القربیٰ سے مراد مسلمان پڑوسی ہے اور جار الجنب سے یہودی ونصرانی۔

والجار ذی القربی قال نوف الشامی هو الجار المسلم والجار الجنب هو الجار الیهودی والنصرانی فهی عنده قرابة الاسلام واجنبیة الکفر ولا یخفی انه یحتمل ان یراد بالجار ذی القربی من له مع الجوار قرب واتصال بنسب او دین وبالجار الجنب الذی لا قرابة له ولو مشرکا (روح)

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ۔ اس ہم مجلسی یا صحبت میں وقت کی کوئی قید نہیں، رفاقت ومصاحبت خواہ سالہا سال کی ہو، خواہ چند منٹ کی، بہرحال اپنا حق قائم کر دیتی ہے۔ اس تعریف کے ذیل میں ہم جماعت، ہم سبق، ہم مدرسہ، ہم سفر، کھیل کود کے ساتھی، ریل اور جہاز کے ساتھی، شریکِ تجارت، شریکِ صنعت، شریکِ پیشہ سب آجاتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴿٣٦﴾ الَّذِينَ

قطعی اللہ ایسوں کو دوست نہیں رکھتا جو خود بیں فخار ہیں ۱۲۸ جو بخل کرتے رہتے ہیں

يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ

اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کچھ انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دے

اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٣٧﴾

رکھا ہے اُسے چھپاتے ہیں ۱۲۹ اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۱۳۰

وَابْنِ السَّبِيلِ. چیز وہیں مسافر مہمان ہی بن کر آئے۔ خاطر تواضع بہ قدر وسعت وہمت ہر آئندہ و روند کی ضروری ہے
ابن السبیل۔ کا اصل مفہوم ایسا مسافر تھا جو اپنے وطن اپنے عزیزوں سب سے اس قدر دور اور بے تعلق ہو کہ
گویا مسافرت ہی اس کا گھر بار، اہل وخاندان بن کر رہ جائے۔

ھو المنقطع فی السفر لایتصل باھل ولا قرابۃ کان السبیل ابوہ وامہ ورحمہ واھلہ (امار)

اور اس سے معنی بہرحال مطلقاً مسافر کے نکل آئے۔
اسلامی نظامِ معاشرت عالی شان ہوٹلوں بلکہ مہمان سراؤں کا بھی محتاج نہیں، وہ اپنے قلمرو کے اندر
مہمانداری، مسافر نوازی، بہ قدر وسعت وظرف ہر ہر فرد پر عائد کرتا ہے۔
۱۲۸ اب یہاں سے ان موانع کا بیان ہے جو ادائے حقوق کی راہ میں حائل ہوتے رہتے ہیں ان میں سے
پہلی چیز خود بینی ہے اور دوسری چیز نمائش وحبِ جاہ۔
مُخْتَال وہ ہے جو پندار تفوق میں گرفتار رہتا ہے، عزیزوں، قریبوں، پڑوسیوں کی طرف التفات
کرنے میں کسر شان سمجھتا ہے، اور اپنی بڑائی کے مظاہرے اپنے عمل سے کرتا رہتا ہے۔

ھو المتکبر الذی علی بدنہ اثر من کبرہ فی الحرکات والاعمال (المدارک)

فَخُور وہ ہے جو دوسروں پر اپنا فخر زبان سے جتلاتا رہتا ہے۔

ھو المتکبر یظہر اثر الکبر فی قولہ (المدارک)

۱۲۹ (اور یہ تینوں قسم کے لوگ اللہ کے ہاں ناپسندیدہ مخلوق میں داخل ہیں)
ادائے حقوق میں خود بینی اور فخاری کے بعد تیسرا بڑا مانع یہی بخل ہوتا ہے۔
مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ سے مراد مال و دولت کا ہونا تو ظاہر ہی ہے، دوسرے معنی علمِ دین کی دولت
کے بھی کئے گئے ہیں اور وعید میں وہ لوگ بھی شامل سمجھے گئے ہیں جو مسائل دین کے اظہار میں بخل کرتے رہتے ہیں۔

.... والحمل علی ھذہ الروایۃ ظاھر فی البخل بالمال وفی الروایۃ الاخری انہ البخل بالعلم (روح) العی دانعم

(بیضاوی) عام فی بخل العلم والدین وفی البخل بالمال لاتساقط، ثم والکل مذموم رکہ، وقال ابن عب لم مرد البخو

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا

اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے رہتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور

بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۳۸

نہ روزِ آخرت پر (تو یہ سب کافروں ہی کے حکم میں داخل ہیں) ۱۳۱ اور جس کا مصاحب شیطان ہو سو برا مصاحب ہوا ۱۳۲

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ

اور انہیں کیا خرابی لاحق ہو جاتی، اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دے رکھا ہے

اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۳۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ

اس میں سے خرچ کرتے رہتے ۱۳۳ اور اللہ ان سے خوب واقف ہے بے شک اللہ ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا ۱۳۴

بالمال بل بجمیع ما فیہ نفع للغیر بجز والبخل انواع بخل بالمال وبخل بالعلم ۔۔۔ وکانھ نفائس ودلائل مجموعہ عقلاً ونقلاً

۱۳۰ انسان عموماً بخل اسی لئے کرتا ہے کہ مال بچا کر اس سے اپنے جاہ میں اضافہ کرے اس جاہ پرستی کی سزا (بھی) قدرۃً یہ ملے گی کہ عذاب سخت دردناک ہونے کے علاوہ ایسے خلق کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنے والا بھی ہوگا۔

۱۳۱ یعنی جن لوگوں کا ایمان خدا اور روزِ جزا پر نہیں ہوتا، وہ جس موقع پر اور جس مقصد سے بھی خرچ کریں گے بہرحال کوئی نہ کوئی صورت رضائے خلق ہی کی ہوگی، حالانکہ اسلام نے جان کی طرح (گو یقیناً اس سے کم درجہ میں) مال کی بھی خرچ کی اجازت رضائے خالق ہی کے تحت دی ہے۔

رِئَآءَ النَّاس۔ یعنی یہ لوگ اہلِ حقوق پر خرچ نہیں کرتے بلکہ موقع نمود ہی پر خرچ کرتے ہیں۔

۱۳۲ (جو ہمیشہ برائی ہی کی ترغیب دیتا رہے گا)

مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا۔ یعنی جس کا مصاحب شیطان ہوا جیسا کہ ان سب لوگوں کا ہے۔

۱۳۳ (دین کی راہ میں اور اخلاص کے ساتھ)

مَاذَا عَلَيْهِمْ۔ محاورۂ عربی میں ایسے موقع پر آتا ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں: کیا غضب ہو جاتا یا کون سی قیامت آجاتی!

۱۳۴ (اور اس کے لئے اس کا امکان ہی کیا ہے جب کہ اس کا علم کامل ذرہ ذرہ کو محیط ہے)

یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کی کوئی نیکی بلا اجر رہ جائے یا کوئی بدی کسی کے حساب میں خواہ مخواہ لکھ لی جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ۔ اللہ جو قادرِ مطلق ہے حقیقۃً ظلم کا اطلاق تو اس کے کسی فعل پر کسی حال میں ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ وہ ظاہر میں اور مجازی معنی میں بھی ظلم نہیں کرتا۔

آیت میں دو پہلو اور بھی ہیں، ایک تو مشرک قوموں نے اپنی دیوی دیوتاؤں کو جو ظالم، ستمگر، خونخوار مانا ہے (مثلاً درگا دیوی یا کالی مائی کو)

وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دوگن کر دے گا، اور اپنے پاس سے اجرِ عظیم دے گا ۱۳۵ھ

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ

سو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت سے ایک ایک گواہ حاضر کریں گے ۱۳۶ھ اور ان لوگوں پر آپ کو

شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى

بطور گواہ پیش کریں گے ۱۳۷ھ جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور پیمبر کی نافرمانی کی ہے وہ اس روز تمنا کریں گے کہ

بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے ۱۳۸ھ

حق تعالٰی کی تنزیہ اس قسم کی صفات سے کلیۃً ہوگئی، دوسری جن آیتوں میں حق تعالٰی کی قدرتِ مطلق اور اختیارِ کامل کا اثبات ہے ان سے ممکن تھا کہ مسلمانوں کو بھی یہ خیال ہو جاتا کہ ہر طرح کا ظلم اُس قادرِ مطلق کے لئے روا ہے اس کی تردید بھی آیت سے ہوگئی۔

۱۳۵ھ (سو کیا ٹھکانا ہے ایسے پروردگار کی رحمت و کرم کا!)

مِنْ لَّدُنْهُ۔ اپنے پاس سے یعنی زائد از استحقاق بلکہ بلا استحقاق، اسلام کا خدا نہ کوئی خونخوار دیوتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی پر ظلم کرے نہ ایسا معذور کہ کسی پر کرم کرنا چاہے بھی تو اپنی صفتِ عدل کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اور پر ظلم اُسے کرنا پڑے!۔ شرک اور مسیحی شرک دونوں کی تردید آیت سے ہوگئی۔

۱۳۶ھ (قیامت کے دن، اس اُمّت سے متعلق اظہار دینے)

یہ گواہ ہر اُمّت کے مقابل اس اُمّت کے رسول ہوں گے جو اس کی شہادت دیں گے کہ وہ احکام کی پوری پوری تبلیغ کر آئے تھے۔

۱۳۷ھ (اے پیمبر!)

هٰٓؤُلَآءِ (ان لوگوں) کا اشارہ کس جانب ہے؟ بظاہر وہ لوگ مراد معلوم ہوتے ہیں جو قرآن کے براہِ راست یا بالواسطہ مخاطب تھے، اور جن سے رسول اللہ (صلعم) کا سابقہ تھا۔

ای علی امتک (ابن جریر) یعنی قومہ المخاطبین بالقرآن (کبیر)

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اشارہ اُمّت کی جانب نہیں بلکہ گواہوں کی جانب ہے، یعنی ان گواہوں کے صدقِ بیان پر گواہ ہو کر۔

تشہد علی صدق ھؤلاء الشہداء لعلمک بعقائدھم (بیضاوی) اشارۃ الی الشہداء المدلول علیہم بما ذکر (روح)

بہرصورت جب رسول اللہ (صلعم) اس آیت پر پہنچتے تھے تو اپنی ذمہ داری کے احساس اور فرطِ خشیت سے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنسو چشمِ مبارک سے جاری ہو جاتے تھے۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتی علیہا فاضت عیناہ (ابن جریر)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا

اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ (منہ سے) کہتے ہو اسے

مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ

سمجھنے لگو ۱۳۹ اور نہ حالتِ جنابت میں جب تک کہ غسل نہ کرلو ۱۴۰ بجز اس حال کے کہ تم مسافر ہو ۱۴۱ اور اگر تم

كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ

بیمار ہو یا سفر میں ہو ۱۴۲ یا تم میں سے کوئی استنجا سے آیا ہو ۱۴۳ یا تم نے بیویوں سے قربت

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا

کی ہو ۱۴۴ پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کرلیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

پر ہاتھ پھیر لیا کرو ۱۴۵ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے بڑا بخشنے والا ہے ۱۴۶

جن بے دردوں نے قرآن کو کلامِ محمدی ٹھہرایا، وہ غور کریں کہ کہیں اپنے گڑھے ہوئے کلام سے بھی انسان کے آنسو جاری ہو سکتے ہیں؟

۱۳۸ (بلکہ ہر گہرے سے گہرا چھپا ہوا راز اس روز ظاہر ہو کر رہے گا۔)

يَوْمَئِذٍ۔ اس روز سے ظاہر ہے کہ روزِ حشر مراد ہے۔

تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ۔ زمین ان کے اوپر برابر کردی جائے تاکہ وہ پیوندِ زمین ہو کر حشر کی رسوائی اور عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔

۱۳۹ یعنی نشہ اتر جائے اور زبان قابو میں آجائے۔

آیت اس وقت کی ہے جب کہ حرمتِ شراب کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اوقاتِ نماز میں تو شراب پینے سے باز رہو۔ یہ مطلب نہیں کہ شراب تو اسی طرح پیتے چلے جاؤ اور نشہ کی حالت میں نماز چھوڑتے رہو۔

۱۴۰ یعنی حالتِ جنابت کے بعد غسل کرنا فرض ہے بغیر اس کے نماز درست نہ ہوگی۔ مرد کو انزال ہو جانا، عورت کو ماہواری آجانا، مرد و عورت دونوں کا عمل مباشرت کرنا (خواہ انزال کے بغیر ہو) یہ سب حالتیں جنابت کی ہیں۔

الصلوٰۃ سے مراد مسجدیں بھی لی گئی ہیں۔ أی مواضع الصلاۃ وھی المساجد (مدارک)

ای مواضع الصلوۃ وھو قول الشافعی (قرطبی) قیل اراد بالصلوۃ مواضعها وھی المساجد۔ (صاوی)

۱۴۱ یعنی بجز حالتِ سفر کے جب پانی کا ملنا اور غسل کا انتظام ہونا دشوار ہو۔ ایسی حالت کا حکم ابھی آگے آتا ہے۔

ولا یجوز لاحد ان یقرب الصلوٰۃ وھو جنب لا بعد الاغتسال الا المسافر فانه یتیمم وھذا قول ابی حنیفه (قرطبی)

جن فقہاء نے الصلوٰۃ سے مراد مواضع الصلوٰۃ لی ہے انھوں نے اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ سے جنبی کے لئے

خروج کے وقت مسجد سے گزرنے کا جواز نکالا ہے۔

ای لا تقربوا الصلوٰۃ ... ای مواضع الصلوٰۃ ... عابری سبیل ... (مدارک)

۱۴۲ اور مرض و سفر دونوں صورتوں میں پانی کا استعمال یا مضر ہو یا اس کا بہم پہنچنا دشوار ہو یا کل کا انعدام ہو چکا ہو

۱۴۳ (اور اس لئے وضو باقی نہ رہا ہو)

۱۴۴ (اور اس لئے غسل فرض ہو گیا ہے)

لمس اور مس دونوں کے لفظی معنی چھونے کے ہیں، اس لئے بعض فقہاء نے یہاں بھی محض ملامست مرادلی ہے اور ملامستِ نساء کو موجباتِ وضو میں سے قرار دیا ہے، لیکن لمس کے مجازی معنی ہم بستری کے ہیں۔

... عن الجماع (راغب) من مجاز اللمس والملامسۃ المجامعۃ (تاج)

اور مس تو قرآن مجید میں بھی ہم بستری کے معنی میں آیا ہے تو طلقتموهن من قبل ان تمسوهن اس لئے فقہاء حنفیہ نے یہاں لمس سے ہم بستری ہی مرادلی ہے اور یہی مذہب قوی ہے حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابیوں اور مجاہد وطاؤس، الحسن بصری سعید بن جبیر وغیرہم تابعین سے بھی یہی منقول ہے۔

ای جامعتم النساء (ابن عباس) قال قوم هو المجامعۃ وهو قول ابن عباس والحسن والمجاهد وقتادۃ (معالم) روی عن علی وابی بن کعب ومجاهد وطاؤس والحسن وعبید بن عمیر وسعید بن جبیر والشعبی وقتادہ ومقاتل بن حیان محمود ... (ابن کثیر) وکنی بالملامسۃ عن الجماع والی ذلک ذهب علی کرم اللہ تعالی وجهه و ابن عباس رضی اللہ تعالی عنهما والحسن۔ (روح)

۱۴۵ یعنی ایسی مٹی ہو جو خود غیر طاہر یا گندی نہ ہو، دو دو بار ہاتھ مار کر پہلی بار پورے چہرے اور دوسری بار ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیر لیا کرو۔

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً۔ یعنی کسی سبب سے بھی سہی پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو۔

ماء کے صیغۂ نکرہ میں آنے سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ پانی کسی قسم کا بھی ہو، وضو کے لئے درست ہے۔

فهو عام فی کل ما کان من سماء او نهر او عین عذب او ملح۔ (قرطبی)

امام ابو حنیفہؒ نے اس میں اتنی وسعت پیدا رکھی ہے کہ رنگ، مزہ یا بُو بدلے ہوئے پانی تک کی اجازت دے دی ہے۔

واجاز ابو حنیفۃ الوضوء بالماء المتغیّر۔ (قرطبی)

پانی کی معدومیت ایک تو حقیقی ہے وہ یہی کہ پانی موجود نہ ہو، دوسری حکمی ہے یعنی موجود تو ہو لیکن اس کا استعمال مرض پیدا کر دے یا مرض کو بڑھا دے یا کسی اور وجہ سے اس کے استعمال سے معذوری ہو، فقہاء نے نام صرف چند چیزوں کے گنا دیئے ہیں۔

فلم تقدروا علی استعماله لعدمه او بعده او فقد آلۃ الوصول الیه او لمانع من حیّۃ او سبع او عدو (مدارک) لو کان یجد الماء الا انه مریض یخاف ان استعمل الماء اشتد مرضه تیمم (هدایه) واما ان یخاف فوات الرفیق او علی الرجل بسبب طلبه او لصوصًا او سباعًا او فوات الرفیق او عطشًا علی نفسه او علی غیره ولذلک بطبخ بطبخه لمصلحۃ بدنه واذا کان احد هذه الاشیاء تیمم وصلّٰی۔ (قرطبی)

صَعِیْدًا طَیِّبًا۔ صعید لغت میں کہتے ہیں زمین کے بالائی رُخ کو، نہ کہ نفسِ مٹی کو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جنھیں کتاب سے حصہ ملا تھا وہ گمراہی کو مول لے رہے ہیں ، چاہتے ہیں کہ تم (بھی)

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۚ وَكَفٰى

گمراہ ہو جاؤ ۱۴۷ اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے ۱۴۸ اور اللہ کا

بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۫ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا

حامی ہونا کافی ہے اور اللہ کا مددگار ہونا کافی ہے ۱۴۹ جو لوگ یہودی ہو گئے ہیں ان میں سے

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا

ایسے بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقعوں سے پھیرتے رہتے ہیں ۱۵۰ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا مگر ہم نے

وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ

مانا نہیں اور (ہماری) سنو اور تمہیں سنوایا نہ جائے اور "راعنا" یہ زبانوں کو توڑ موڑ کر دین میں طعنہ زنی کی راہ سے

الصعید یقال لوجه الارض (راغب) قال الزجاج لا اعلم اختلافا بين اهل اللغة انما هو وجه الارض ترابا كان او غيره (زج) والذى يقصد الاستعمال وهو صريح للحنفية ان وجه الارض على اى وجه كان من رمل او حجر او مدر او تراب او غيره

اس لئے حنفیہ کے ہاں جنس ارض کی تمام چیزوں پر تیمم جائز ہے خواہ ان پر گرد پڑی یا نہ پڑی ہو اور امام مالکؒ اور ثوریؒ وغیرہ دوسرے ائمہ فقہ بھی اس باب میں حنفیہ کے ہم زبان ہیں۔

وهو المذهب عند ابى حنيفة ومحمد فكل ما كان من جنس الارض (هداية) بسبب المطر من جنس الارض وان لم يكن عليه نقع (در مختار) تيمم بوجه الارض كله ترابا كان او رملا او حجرا او معدنا او سبخة هذا مذهب مالكؒ وابى حنيفة والثورى والطبرى (قرطبى)

جنس ارض میں سے ہونے کی شناخت یہ ہے کہ وہ آگ میں نہ جل جائے نہ اس سے پگھل جائے چنانچہ حنفیہ کے ہاں گرد، پتھر، سرمہ، یاقوت، زبرجد وغیرہ پر اس قاعدہ کے موافق اور چونے پر اس قاعدہ کے خلاف عمل تیمم جائز ہے، البتہ خاکستر (راکھ) پر جائز نہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک تیمم صرف مٹی ہی پر جائز ہے۔

۱۴۶ (چنانچہ دشوار موقعوں کے لئے اس نے کیسے آسان حکم دے رکھے ہیں اور بھول چوک اور معمولی غلطیوں کو وہ برابر معاف کرتا ہی رہتا ہے)

۱۴۷ (اے مسلمانو!)

یہود خود تو علم توریت کے باوجود کفر و ضلالت اختیار کئے ہوئے تھے ہی، مسلمانوں کو بھی اسلام سے

وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا

اور اگر وہ لوگ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے قبول کیا اور (ہماری) سنو اور "اُنظُرنا" تو ان کے حق میں کہیں بہتر

لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۶﴾

اور درست تر ہوتا ۱۵۲ لیکن اللہ نے تو ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے ۱۵۳ سو وہ ایمان نہ لاویں گے مگر تھوڑے سے ۱۵۴

برگشتہ کرنے کی طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

مِنَ الْكِتٰبِ۔ کتاب سے مراد جنس کتاب ہے یعنی توریت۔

اَلَمْ تَرَ میں خطاب عام ہے ہر مخاطب کے لئے۔

۱۴۸ (اور اس نے تم کو بھی خبردار کر دیا)

اہل کتاب کی طرف سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں نئے نئے ناموں اور کناروں سے آج بھی پوری طرح جاری ہیں۔

۱۴۹ اللہ کا حامی (ولی) ہونا یہ ہے کہ وہ مومن بندوں کی مصلحتوں کی رعایت کرتا رہتا ہے اور اس کا مددگار (نصیر) ہونا یہ ہے کہ وہ انھیں دشمنوں کی نقصان رسانی سے محفوظ رکھتا ہے۔

۱۵۰ (اور لفظی و معنوی ہر قسم کی تحریف کرتے رہتے ہیں)

اَلْكَلِمَ۔ کلام سے مراد کلامِ الٰہی یا توریت ہے۔

اَلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نسلاً اسرائیلی نہیں بلکہ عرب تھے لیکن یہود کی طویل صحبت سے متاثر ہو کر خود بھی یہود کے شعائر و عقائد اختیار کر کے رفتہ رفتہ ان میں جذب ہو چکے تھے شرارت و خباثت میں یہ بھی نسلی یہود سے کچھ کم نہ تھے تفصیل پارۂ اول میں گزر چکی۔

نحویین کہتے ہیں کہ هَادُوْا اور يُحَرِّفُوْنَ کے درمیان مَنْ محذوف ہے۔

قال الفراء المحذوف من المعنی من الذین هادوا من یحرفون (قرطبی)

۱۵۱ (یعنی ان کے حق میں نافع بھی اور مطابقِ واقعہ بھی)

یہودِ عرب کی مستقل شرارتوں اور خباثتوں میں سے یہ امر بھی تھا کہ رسول اللہ (صلعم) کو مخاطب کرتے وقت ایسے الفاظ قصداً بولتے جن میں پہلوئے ذم بھی نکلتا رہتا اور تحقیر یا بد دعا پیدا ہوتی پارۂ اول میں یہ ذکر پوری وضاحت سے آچکا ہے۔ یہود کی ان گستاخیوں کا دار و مدار چونکہ تلفظ اور الفاظ ہی کے سوءِ استعمال پر ہے اس لئے ترجمہ سے اصل مفہوم پوری طرح ظاہر ہی نہیں ہو سکتا، اصل عربی الفاظ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا۔ ظاہری مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپ کا ارشاد سن لیا اور آپ کے گمراہ کن مخالف و معاند کا قول نہیں مانا لیکن اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم نے تمھاری بات تو سن لی لیکن اسے قبول نہیں کیا۔

اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ۔ ظاہراً مطلب یہ تھا کہ کوئی مخالف اور رنج دہ بات آپ کے کان میں نہ جائے لیکن اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ تمھیں کوئی اچھی بات سنائی ہی نہ دے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا

اے وہ لوگو جنھیں کتاب مل چکی ہے اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے تصدیق کرنے

مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ

والی اس (کتاب) کی جو تمھارے پاس ہے ۱۵۴ قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور چہروں کو ان کے پیچھے کی جانب

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

الٹا دیں ۱۵۵ یا ہم ان پر (اسی طرح) لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی تھی ۱۵۶ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے ۱۵۷

رَاعِنَا۔ راعنا کا ظاہراً مطلب یہ تھا کہ ہماری رعایت سے دوبارہ فرمایئے لیکن تلفظ میں "ع" کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے بالکل گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا تھا۔

لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ۔ یعنی بہ ظاہر لہجہ سے تعظیم و توقیر نظر آتی تھی لیکن زبانیں تقیہ سے کام لیتی ہوتی تھیں اور دل کے بغض و عناد کو چھپائے ہوئے رہتی تھیں۔

طَعْنًا فِى الدِّيْنِ۔ اس تصریح نے بتا دیا کہ یہود عرب کی ساری حرکتیں بے خیالی سے ناشی تھیں اور نہ تفریح طبع کے طور پر تھیں، بلکہ اللہ کے دین پر طعن کرنا، اُسے مجروح کرنا مقصود ہی تھا۔

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ اسمع۔ انظرنا۔ ان الفاظ کے استعمال کی خوبی کہ یہ پہلوئے ذم سے خالی ہیں۔

۱۵۲ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اللہ نے ان کے دلوں کو اپنی رحمت خاصہ سے دور کر دیا۔

لعنت۔ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔

بِكُفْرِهِمْ۔ اس سے یہ صاف ہو گیا کہ رحمت خاصہ سے بھی یہ دوری اور مہجوری خود بخود اور ابتداءً نہیں ہوئی بلکہ یہ انہی کے کرتوتوں کا ثمرہ ہے۔

۱۵۳ اور یہ تھوڑے سے وہی تھے جو آگے چل کر مسلمان ہو گئے باقی سب کا خاتمہ علم الٰہی کے مطابق کفر ہی پر ہوا۔

۱۵۴ یعنی توریت کی، اس کی اصلی اور غیر محرف صورت میں۔

اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ میں کتاب سے مراد توریت ہے۔

بِمَا نَزَّلْنَا۔ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے ہم نے اب اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے یعنی قرآن پر۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ یعنی قرآن تو اصل توریت کی تصدیق ہی کرنے والا ہے نہ کہ اس کی تردید کرنے والا۔ کسوٹی یہ ہے کہ تصدیق و تائید اسی توریت کی جو اپنی اصلی و غیر محرف صورت میں موجود ہو۔

۱۵۵ (یا اسی طرح کے کسی بھی عذاب شدید و ہولناک میں مبتلا کر دیں)۔

نَّطْمِسَ وُجُوْهًا۔ طمس وجہ سے مراد ہے، چہرہ کے نقش و نگار اور آنکھ، ناک، منھ وغیرہ اعضاء کو مٹا دینا۔

فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَا۔ یعنی اُن لوگوں کے چہروں کو گدّیوں کی طرف پلٹ دیں۔

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن

اللہ اس کو تو بے شک نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے ۱۵۸ لیکن اس کے علاوہ جس کسی کو بھی چاہے گا

يَشَآءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱفْتَرَىٰٓ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾

بخش دے گا۔ اور جو کوئی (کسی کو) اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس نے یقیناً ایک بڑا گناہ سمیٹا ۱۵۹

ف ہمیشہ تعقیب ہی کے لئے نہیں آتی کبھی تفصیلِ اجمال کے لئے بھی آتی ہے، چنانچہ یہاں اسی غرض سے ہے اور یہ دوسرا فقرہ پہلے فقرہ کی تفصیل و توضیح کر رہا ہے۔

یہ ڈراوے سب عذابِ اخروی کے ہیں لیکن وجوہ کے معنی مجازاً سرداروں اور رئیسوں کے بھی آئے ہیں۔

[illegible] (کشاف)

اس لئے فقرہ کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان کے سرداروں کو ذلیل و خوار کریں، چنانچہ کشاف و کبیر وغیرہ میں یہ معنی بھی نقل ہوئے ہیں، اسی طرح اس کے متصل فقرہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان کی وجاہت و اقبال کو سلب کر لیں اور ان پر ذلت و ادبار نازل کریں، جیسا کہ کشاف، بیضاوی وغیرہ میں یہ قول بھی نقل ہوا ہے۔

مِنْ قَبْلِ۔ کا صحیح مفہوم پیشِ نظر رہنے سے ایک سوال رفع ہو گیا ہے کہ طمس و مسخ کی سزا ملی ہی کب؟ ظاہر ہے کہ ان سزاؤں کا ظہور تو آخرت میں ہو گا اور من قبل ہمیشہ کسی واقعہ کے واقع ہو جانے ہی پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ صرف اس کے ہو سکنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور محلِ تہدید میں آتا ہے تو اس معنی میں اس کا استعمال قرآن مجید میں کثرت سے ہوا ہے جب بھی تو یہاں ایک جاتی ہے؟

[illegible]

قبل کے یہاں کوئی معنی بھی نہیں سمجھنا کہ وعدہ کا واقعہ صرف زمانہ مؤخر ہے اور واقع ہو کر رہے گا بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس کے وقوع سے اپنے کو بچایا جائے، اردو ہی کے محاورہ میں ہم برابر کہتے رہتے ہیں کہ قبل اس کے کہ ذبح میں آ جاؤ گناہ سے توبہ کر لو، اسی طرح آیت کا خلاصۂ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ طمس و مسخ کی سزاؤں سے بچنے کے لئے قرآن اور صاحبِ قرآن کی تصدیق کر لو۔

۱۵۶ أَصْحَٰبَ ٱلسَّبْتِ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا ہے۔

۱۵۷ (سو طمس، مسخ، لعن، جس چیز کا بھی حکم ہو گیا، وہ بہر حال پورا ہو کر رہے گا۔)

۱۵۸ (سو مشرک عذابِ دائمی میں مبتلا رہے گا)

مشرک کی نجات کی کوئی صورت ہی نہیں، اس نے جنت کی نعمتوں کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت ہی اپنے میں باقی نہ رکھی۔

۱۵۹ (اور اس جرمِ عظیم کی بنا پر وہ قابلِ مغفرت نہ ہو گا)

اَفْتَرٰى إِثْمًا عَظِيمًا۔ "گناہ سمیٹا" کا محاورہ خاص اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے ہے۔

مَا دُونَ ذٰلِكَ۔ یعنی اور جتنے بھی گناہ ہو سکتے ہیں، وہ بہر حال شرک سے کمتر ہی ہوں گے۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ۔ یعنی شرک تو آسمانی حکومت سے صریح بغاوت کے مرادف ہے، بس اُسے چھوڑ کر باقی ہر معصیت مغفرت کی گنجائش رکھتی ہے، اور جس کسی کے حق میں مشیتِ الٰہی ہو گی اُسے معافی مل جائے گی، خواہ اس نے توبہ نہ بھی کی ہو۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ

کیا تو نے ان پر نظر نہیں کی جو اپنے کو پاکیزہ ٹھہراتے ہیں ۱۶۰ حالانکہ اللہ جسے چاہے پاکیزہ ٹھہرائے ۱۶۱ اور

فَتِيلًا ﴿٤٩﴾ انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾

ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ۱۶۲ دیکھ تو یہ لوگ اللہ پر کیسا جھوٹا طوفان باندھتے ہیں اور یہی کافی ہے جرم صریح کے لئے ۱۶۳

وھذا ابانت ھذہ الآیۃ ان کل صاحب کبیرۃ ففی مشیئۃ اللہ ان شاء عفا عنہ وان شاء عاقبہ علیہ مالم تکن کبیرتہ شرکا باللہ (ابن جریر) ای یغفر ما دون الشرک وان کان کبیرۃ مع عدم التوبۃ (مدارک)

آیت میں رد ہے خوارج وغیرہ اُن گمراہ فرقوں کا جو سمجھتے ہیں کہ ہر گناہ شرک ہے اور ہر گناہ کی سزا عذاب ابدی ہے۔ لِمَن يَشَاءُ۔ مشیت کا اطلاق بلا کسی قید و شرط کے ہے یہیں سے رد نکل آیا معتزلہ کا جو کہتے ہیں کہ مغفرت ان کی ہوگی جو توبہ کریں نہ ان کی جو توبہ نہ کریں گے توبہ کے بعد تو ظاہر ہے کہ اہل کفر و شرک کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے تھے کہ جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل نفع نہیں پہنچا سکتا ہے، اسی طرح میرا خیال ہے کہ توحید کے ساتھ کوئی عمل ضرر نہیں کرتا، یہ قول حضرت عمرؓ کے سامنے دہرایا گیا تو آپ نے اس پر سکوت اختیار کیا

۱۶۰ (محض اپنی عالی نسبی کی بنا پر یا اور کسی غیر شرعی بنا پر)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ۔ یعنی ایسے لوگوں کی حماقت بھی قابل دید ہے۔

الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُمْ۔ یعنی اللہ نے توحید و تقویٰ کو جو معیارِ فضیلت و مقبولیت رکھ دیا ہے، اُسے چھوڑ چھاڑ لوگوں نے نسل وغیرہ کے طرح طرح کے معیارِ شرف و بزرگی گڑھ لئے ہیں، اور ان بنیادوں پر اپنے کو معظم و مقدس سمجھنے لگتے ہیں، یہ تمام تر حماقت و ضلالت ہے۔

آیت کا اشارہ خاص یہود کی جانب ہے، اپنے کو نسلِ انبیاء میں سے ہونے کی بنا پر مقدس سمجھ بیٹھے تھے، باقی ہندوستان میں برہمن چھتری وغیرہ اپنے کو محض اونچے خاندانوں سے انتساب کی بنا پر مقدس سمجھنے والے اپنے چندر بنسی، سورج بنسی ہونے پر فخر و ناز کرنے والے یا جاپانیوں کی طرح اپنے کو دیوتاؤں کی نسل میں قرار دینے والے سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں، اور پھر اسی طرح کسی درجہ میں وہ مسلمان بھی جو اپنی پیرزادگی، مخدوم زادگی، سیّدزادگی کے زعم میں اپنے کو دوسروں سے بالاتر سمجھتے رہتے ہیں

۱۶۱ یعنی معتبر پاکیزگی تو اسی کی ہے جسے اللہ پاکیزہ قرار دے ورنہ اپنے زعم و پندار میں اپنے کو پاکیزہ ٹھہرا لینے سے کیا ہوتا ہے

۱۶۲ یعنی جو سزا انھیں ملے گی، وہ اُن کے جرم سے ذرہ بھر بھی زائد نہ ہوگی، اُن کا جرم ہے ہی اسی سخت سزا کا مستحق، سزا استحقاق سے زائد نہیں۔

فَتِيلًا۔ فتیل کے لفظی معنی دھاگے کے ہیں، عربی محاورہ میں مراد حقیر سی حقیر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے ہوتی ہے، جیسے ایک دوسری جگہ ولا یظلمون نقیرا بھی آیا ہے۔

یضرب بہ المثل فی الشیٔ الحقیر (راغب) موضع الی الکنایۃ عن تحقیر الشیٔ وتصغیرہ (قرطبی) اشارۃ الی اقل شیٔ (بحر)

جیسے اُردو میں ایسے موقع پر "ذرہ بھر" "رتی بھر" "بال برابر" استعمال ہوتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ

کیا تو نے اُن لوگوں پر نظر نہیں کی جنہیں کتاب سے بہرہ ور کیا گیا تھا ۶۶۴ (اس پر بھی) یہ جبت اور شیطان کو مانتے ہوئے

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (۵۱)

ہیں ۶۶۵ اور کفر کرنے والوں کی بابت کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی لوگ زیادہ ہدایت یاب ہیں ۶۶۶

۶۶۳ (تو ایسے صریح جرم پر ایسی سزا کیا کچھ ظلم و زیادتی ہے؟)
بہ میں ضمیر افتراء یعنی افتراء علی اللہ کی جانب ہے۔
والضمیر فی بہ عائد علی الافتراء وھو الذی انکر علیھم (بحر)

۶۶۴ یعنی یہود۔ اور کتاب سے مراد کتاب الٰہی یا توریت ہے۔
أَلَمْ تَرَ پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے کہ یہ فقرہ موقعِ حیرت پر آتا ہے۔

۶۶۵ الجبت۔ جبت کا اطلاق تو اللہ کے سوا ہر معبود پر ہوتا ہے۔
یقال لکل ما عبد من دون اللہ جبت۔ (راغب)
لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا استعمال ساحروں اور کاہنوں کے لئے ہوتا ہے۔
سمی الساحر والکاھن جبتا (راغب)
صحابہ اور تابعین دونوں سے یہ معنی منقول ہیں۔
قال ابن عباس و ابن جبیر و ابو العالیۃ الجبت۔ الساحر (قرطبی) قال عمر الجبت السحر (ابن جریر)
یہود میں عملیات کا اور سحر، کہانت، نجوم وغیرہ علوم سفلی کا ذوق ابتداء سے چلا آ رہا ہے جیسا کہ پارۂ اوّل میں آیت واتبعوا ما تتلوا الشیاطین کے تحت میں دکھایا جا چکا ہے۔
جبت کا لفظ لاکر عجب نہیں کہ اشارہ ان کی اسی قومی خصلت کی جانب کرنا مقصود ہو۔
الطاغوت پر حاشیہ پارۂ سوم پر گزر چکا۔
طاغوت ہر وہ چیز ہے جو انسان میں طغیان و عدوان پیدا کردے۔
الطاغوت کل ما یطغی الانسان (قرطبی)
عجب نہیں کہ یہ لفظ لاکر یہود کے رجحانِ مادیت اور ذوقِ مادہ پرستی کی طرف توجہ دلانا منظور ہو۔

۶۶۶ روایتوں میں آتا ہے کہ سردارانِ یہود مکہ میں آئے تو قریش نے ان سے پوچھا کہ ہمارا دین بہتر ہے یا پیروانِ محمد کا، اور سوال میں اپنے دینی کارناموں مثلاً خدمتِ حجاج، خدمت کعبہ کا ذکر بھی کردیا۔ سردارانِ یہود بولے کہ ان کے دین سے تو تمہارا ہی دین بہتر ہے اور ان سے زیادہ ہدایت یاب تم ہی ہو۔
لِلَّذِينَ كَفَرُوا۔ الذین کفروا سے مراد قریش و مشرکینِ مکہ ہیں۔
ل کے معنی "بابت" یا "متعلق" کے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے ۱۶۷ اور جس پر اللہ لعنت کرے تو اس کا کوئی مددگار تو ہرگز نہ پائے گا ۱۶۸

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾

کیا انھیں بھی کچھ اقتدار نصیب ہے؟ تو ایسی حالت میں تو یہ لوگوں کو تل بھر بھی نہ دیں ۱۶۹

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ

کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں ان چیزوں کے باعث جو انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھی ہے ۱۷۰

آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

سو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت دی ہے اور انھیں بڑا اقتدار بھی دیا ہے ۱۷۱

لِلَّذِينَ ای فی حقہم (روح) واللام للتبلیغ (بحر)

الَّذِينَ آمَنُوا۔ سے مراد مسلمان ہیں۔

۱۶۷ خود دین توحید رکھ کر اور آئین انبیاء سے آشنا ہو کر دین توحید سے اتنی بیزاری اور ذات رسول سے اتنا بغض کہ شرک اور مشرکین تک کو اُن سے بہتر بتا رہے ہیں ملعونیت کا تحقق اُن سے بڑھ کر اور کس پر ہوگا۔

۱۶۸ (جو عذاب سے اُسے بچالے یا اس میں کچھ کمی ہی کرادے)

مشرک قوموں اور قبیلوں نے خدا کے ساتھ ساتھ اپنے اور بھی حامی، سفارشی گڑھ رکھے تھے یہ دانعیں پر چوٹ ہے

۱۶۹ یعنی دینی مقبولیت اور روحانی عظمت الگ رہی یہود کو اگر دنیوی امارت یا سیادت نصیب ہوتی تو یہ اپنے بخیل اور تنگ دل ہیں کہ اس میں بھی کسی کو شریک نہ ہونے دیتے بلکہ لوگوں کے حقوق تک نہ ادا کرتے اور شاید اسی بخیلی اور تنگ دلی کی قومی جبلت کی بنا پر یہود دنیوی اقتدار سے بھی صدیوں محروم رکھے گئے۔

نَقِيرًا۔ نقیر کے لفظی معنی اس گڑھے کے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے عربی محاورہ میں مثل فتیل کے اس سے مراد حقیر سے حقیر اور چھوٹی سے چھوٹی چیز ہوتی ہے جیسے اردو میں رائی بھر، رتی بھر، وغیرہ بولتے ہیں تل برابر ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ہے۔

یضرب بہ المثل فی الشیٔ الطفیف (راغب) ہو مثل فی القلۃ (کشاف) لایؤتون نقیرا ای یبخلوا العفو (قرطبی)

فتیلا پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔ فتیلا نقیرا تقریباً ایک ہی مفہوم کے ادا کرنے کو عربی میں آتے ہیں

۱۷۰ (مثلاً نعمت نبوت)

النَّاسَ کے لفظی معنی تو "لوگوں" کے ہیں لیکن محاورۂ قرآنی میں مراد متعین گروہ بھی لئے گئے ہیں یہاں اشارہ عرب یا بنی اسمٰعیل یا خود رسول اور مومنین کی طرف سمجھا گیا ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

تو ان میں سے کوئی کوئی تو اس پر ایمان لائے اور کوئی کوئی اس سے رکے رہے اور دہکتا ہوا جہنم ہی کافی ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ

بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ کفر کیا ہم انہیں عنقریب (دوزخ کی) آگ میں جھونکیں گے جب کبھی

بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾

ان کی جلدیں پک جائیں گی ہم ان کی جلد کو بدل کر دوسری کر دیا کریں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے

[illegible] (کبیر)

یہود کو اصلی خلش اسی کی تھی کہ انبیاء تو ہمیشہ اسرائیلیوں میں ہوتے رہے ہیں یہ ایک عرب کو کیسے نبوت مل گئی۔

اٰتٰھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ مراد نبوت ہے۔ قتادہ و ابن جریج تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

[illegible] (ابن جریر)

اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔

وأولى الأقوال في ذلك بالصواب قول قتادة وابن جريج الذي ذكرناه قبل (ابن جرير)

۱۷۲ ابراہیمی نسل کی دو بڑی شاخیں ہیں، بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل یہاں بنی اسرائیل کو جتلایا گیا ہے کہ ہماری نعمتوں کے وعدے تو کل نسل ابراہیمؑ سے ہیں نہ کہ اس کی ایک ہی شاخ سے پھر تم تنہا اپنے ہی کو ان نعمتوں کا حقدار کیسے سمجھنے لگے ہو اور جب ایک اسماعیلی کو یہ نعمتیں مل رہی ہیں تو تمہیں اس پر حسد یا حیرت کیسے؟

اَلْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ یہ دونوں روحانی نعمتیں ہیں، ان کا ذکر یکساں کیا ہے اور مُلْكًا عَظِيْمًا دُنیوی نعمت ہے اس کا ذکر الگ کرکے کیا ہے۔

۱۷۳ (اسی لئے دنیا میں سزا ملنا اور نہ ملنا چنداں قابلِ التفات نہیں)

مَنْ اٰمَنَ بِهٖ۔ میں ضمیر کس طرف ہے؟ بعض نے مراد کتاب لی ہے۔

[illegible] الكتاب (بحر)

بعض نے دوسرا فقرہ جو آلِ ابراہیمؑ سے متعلق گزرا ہے۔

من ذكر من حديث آل ابراهيم (كشاف. بيضاوي)

اور بعض نے ذاتِ محمدیؐ کو۔

بمحمد صلى الله عليه وسلم (بيضاوي. [illegible]) (قرطبي)

اور ماحصل ان تینوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے انھیں ہم عنقریب باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَھُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُھُمْ

نہریں پڑی بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے ان کے لئے ان باغوں میں صاف ستھری بیویاں ہوں گی

ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِھَا ۙ

اور ہم انھیں بڑے گنجان سایہ میں لا اُتاریں گے۱۷۵ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ذمہ داریاں اُن کے اہل کو سپرد کرو۱۷۶

۱۷۳ آیت کا مقصود اہل دوزخ کے دوامِ عذاب کا اعلان ہے۔

نَضِجَتْ۔ نضج کے لفظی معنی پک جانے کے ہیں، یہاں مراد جل چکنے سے ہے، مقصود یہاں یہی ہے کہ عذاب منقطع نہ ہوگا اور احساسِ عذاب ہمیشہ تازہ ہوتا رہے گا۔

لیدوم لهم ذوقه ولا ینقطع (کشاف) المقصود بیان دوام العذاب وعدم انقطاعها (کبیر)

صاحبِ بحر نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے اگرچہ قبول نہیں کیا ہے، ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ کھال جب جل جائے گی تو اس میں مزید الم کا ادراک ہی کہاں باقی رہے گا، نہیں بلکہ کھال کا احساس ہر دم تازہ ہوتا رہے گا اور جلد بے حس کبھی بھی نہ ہونے پائے گی، آخرت میں تو اصل اشیاء کو دنیا کے خواصِ طبعی پر قیاس کرنا یوں بھی کمال بے دانشی ہے۔

۱۷۴ چنانچہ صفتِ عزیز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نئے پرانے ہر قسم کے عذاب پر ہر وقت قادر ہے اور صفتِ حکیم کا تقاضا یہ ہے کہ عذاب ہو یا تجدیدِ عذاب، کوئی بھی شے حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی نہیں۔

۱۷۵ یعنی انھیں عیش و راحت ہر طرح کی اور ہمیشہ حاصل رہے گی۔

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ پر حاشیہ پارۂ اوّل میں گزر چکا۔

۱۷۶ (اے انسانو!)

الامانات۔ امانة کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، ہر قسم کی ذمہ داریاں اس کے تحت میں آجاتی ہیں اور یہ لفظ حقوق اللہ و حقوق العباد کا جامع ہے۔

الامانة کل ما فرض علی العباد (اقرب)

اور ائمۂ تفسیر بھی اسی وسعت و جامعیت کی طرف گئے ہیں، چنانچہ امام رازی نے تصریح و تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کے تحت میں اعتقادیات، اخلاق و معاملات سب ہی آگئے۔

امر المؤمنین فی هذه الآیة باداء الامانات فی جمیع الامور سواء تلك الامور من باب المذاهب والدیانات او من باب الدنیا والمعاملات (کبیر)

دوسروں نے بھی ایسا ہی کچھ کہا ہے۔

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو ؎ بے شک اللہ تم کو بہت ہی اچھی

يَعِظُكُم بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٥٨﴾

بات کی نصیحت کرتا ہے ؎ بے شک اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا دیکھنے والا ہے ؎

ھو یعم جمیع الامانات الواجبۃ علی الانسان من حقوق اللہ علی عبادہ ومن حقوق العباد بعضھم علی بعض (ابن کثیر) تعم الحقوق المتعلقۃ بذمتہ من حقوق اللہ تعالٰی وحقوق العباد سواء کانت فعلیۃ او قولیۃ او اعتقادیۃ (روح) وقیل المراد من الامانات جمیع الامانات (معالم)

اور اسی لئے ان حضرات نے آیت کا خطاب صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ جمیع بنی آدم سے سمجھا ہے۔

حکمھا عام ولھذا قال ابن عباس ومحمد بن الحنفیۃ ھی للبر والفاجر ای ھی امر لکل احد (ابن کثیر) والامانۃ تؤدی الی البر والفاجر والعھد یوفی بہ البر والفاجر (روح) قیل نزلت عامۃ وھو مروی عن ابی وابن عباس والحسن وقتادۃ (بحر) والظاھر فی بامرکم ان الخطاب عام لکل احد فی کل امانۃ (بحر) والاظھر فی الآیۃ انھا عامۃ فی جمیع الناس (قرطبی) والاظھر ان الخطاب عام یتناول الولاۃ فیما الیھم من الامانات فی قسمۃ الاموال ورد الظلمات وعدل الحکومات ومن دونھم من الناس فی الودائع والعواری والشھادات (بحر)

آیت باب احکام میں اہم ترین آیتوں میں سے ہے۔

ھذہ الآیۃ من امھات الاحکام تضمنت جمیع الدین والشرع (قرطبی)

مفہوم کی یہی وسعت صحابہؓ و تابعینؒ سے بھی منقول ہے۔

قال ابن عباس ھی مبھمۃ للبر والفاجر وقال محمد بن الحنفیۃ ھی عامۃ للبر والفاجر (ابن کثیر) وقال ابو العالیۃ الامانۃ ما امروا بہ ونھوا عنہ (ابن کثیر)

ضمناً یہ بات نکل آئی کہ نظامِ شریعت میں کوئی گنجائش بھی سعی و سفارش اقربا پروری وغیرہ کی نہیں حکومت میں عہدے صرف انہیں کو ملنے چاہئیں جو ان خدمتوں اور منصبوں کے واقعی اہل ہوں۔

؎ (ان کے آپس کے حقوق کے باب میں)

اب خطاب حکام اور اہلِ حل و عقد سے ہو رہا ہے۔

انما نزلت فی الامراء یعنی الحکام بین الناس (ابن کثیر) والمراد بالحکم ما کان عن ولایۃ عامۃ او خاصۃ وادخلوا فی ذلک ما کان عن تحکیم (روح) وقال علی وابن اسلم وشھر وابن زید خطاب لولاۃ المسلمین خاصۃ فھو للنبی صلعم وامرائہ ثم یتناول من بعدھم (بحر)

؎ (کہ اس طریق معدلت سے دنیا میں بھی انتظاما درست رہیں گے اور آخرت میں بھی اجر اسی کا ہے) يَعِظُكُم بِهِ سے اشارہ اسی طریق معدلت کی جانب ہے کہ اسی سارے نظامِ حکومت معاشرت و معیشت کی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے اہل اختیار کی اطاعت

مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

کرو ۱۸۰؎ پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لیا

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾

کرو ۱۸۱؎ اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو ۱۸۲؎ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوشتر ہے ۱۸۳؎

شیرازہ بندی قائم رہے گی۔

۱۷۹؎ چنانچہ وہ ادائے حقوق اور عدل گستری کے باب میں تمہارے لفظ و قول کو بھی سنتا رہتا ہے اور تمہاری نیتوں اور حرکاتِ عمل پر بھی نظر رکھتا ہے۔

۱۸۰؎ (کہ ان کے احکام بھی احکامِ خدا اور رسول پر مبنی اور ان ہی سے ماخوذ ہوں گے)
أَطِيعُوا اللَّهَ۔ مطاعِ اصلی اور حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔
أَطِيعُوا الرَّسُولَ۔ رسول مطاع مطلق اس اعتبار سے ہیں کہ اللہ کے احکام وہی پہنچانے والے اور وہی ان احکام کی شرح و تفصیل کرنے والے ہیں۔

أُولِي الْأَمْرِ۔ اولوالامر کون ہیں؟ اس پر اچھی خاصی قیل و قال ہوئی ہے علماء و فقہاء امت بھی مراد لئے گئے ہیں، اور امراء و حکام بھی، اور بہتر یہ ہے کہ دونوں ہی مراد لئے جائیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یہ دونوں ہوتے ہیں۔

ای الولاۃ او العلماء (مدارک) روی عن جابر بن عبد اللہ و ابن عباس روایۃ والحسن عطاء و مجاھد انھم اولوا الفقہ والعلم وعن ابن عباس فی روایۃ وابی ھریرۃ انھم امراء السرایا ویجوز ان یکونوا جمیعا مرادین بالآیۃ لان الاسم یتناولھم جمیعہ (جصاص)

اولوالامر خواہ علماء و فقہاء ہوں یا امراء و حکام بہر حال ان میں مستقل مطاع ہونے کی صلاحیت ذرا سی بھی نہیں، وہ مطاع صرف اس حیثیت سے ہیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یا بعض جزئیات میں شرح کرنے والے ہیں، اس حد کے آگے ان کی کوئی اطاعت نہیں۔

مِنْكُمْ۔ اس تصریح کے ہوتے ہوئے اس آیت سے جن صاحبوں نے کسی غیر اسلامی حکومت کی اطاعت پر استدلال کیا ہے انھوں نے اپنی فہم سلیم پر بڑا ظلم کیا، اطاعت تو مسلم امیر کی بھی ہر صورت و حال میں جائز نہیں، چہ جائیکہ کسی غیر مسلم کی، وہ اگر جائز ہے بھی تو کم از کم اس آیت سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۸۱؎ (اور اس کی تحقیق مزید کر لیا کرو کہ اولوالامر کا حکم احکامِ شریعت کے کہاں تک مطابق ہے)
إِلَى اللَّهِ۔ اللہ کے احکام کی طرف مراجعت کرنا تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہر وقت ممکن

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ

کیا آپ نے اُن لوگوں پر نظر نہیں کی جو دعوے رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں جو آپ پر نازل

مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن

کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل ہو چکی ہے ۱۸۴ (لیکن) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں ۱۸۵

يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾

حالانکہ انھیں حکم مل چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کفر اختیار کریں ۱۸۶ اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انھیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے ۱۸۷

لیکن الی الرسول کی تعمیل کی کوئی صورت رسول اللہ کی وفات کے بعد بجز اس کے ممکن نہیں کہ قرآن احادیث وسنن کی طرف رجوع کیا جائے ــــ حدیث وسنت کی حجیت اس طرح فرقۂ اہل قرآن کی سطحیت کے علی الرغم خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔
اِنْ تَنَازَعْتُمْ ضمیر جمع مخاطب سے مراد اولو الامر اور عام افراد اُمت ہیں۔ اس تصریح نے یہ حقیقت اور کھول دی کہ حکام وعلماء سے عوام تک کا اختلاف بالکل جائز ہے آخری اپیل کتاب وسنت ہی کی عدالت میں ہونی چاہئے اور وہی ساری شریعت کا ماخذ ہے یہیں سے اس فرقہ کا بھی رد نکل آئے گا جو رسولِ معصوم کے علاوہ مستقل ائمۂ معصوم کا بھی وجود تسلیم کئے ہوئے ہے، ہر امام وقت اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہر حال غیر معصوم ہے۔
۱۸۲ (اور اس لئے شتر بے مہار نہیں ہو، بلکہ اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس رکھتے ہو)
یہ سوال آخرت کا استحضار ہی تو ہے جو مومن کو جادۂ مستقیم پر ہر وقت قائم رکھتا ہے۔
شیخ رشید رضا مصری نے کہا ہے کہ قرآن مجید کی یہی دو آیتیں اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ الخ اور يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا الخ حکومتِ اسلامی کی پوری بنیاد کا کام دے سکتی ہیں اور اگر ان کے علاوہ قرآن مجید میں کچھ بھی اس موضوع پر نہ ہوتا تو یہی دو آیتیں ہی کافی تھیں سارے احکام کے استنباط کے لئے۔
هاتان الآيتان هما اساس الحكومة الاسلاميه ولو لم ينزل فى القرآن غيرهما لكفى المسلمين فى ذلك اذا هم بنوا جميع الاحكام عليهما (المنار)
۱۸۳ یعنی دنیا میں بھی یہی ذریعۂ امن وراحت ہے اور آخرت میں بھی وسیلۂ نجات وسعادت۔
ذٰلِكَ یعنی یہی طریق عمل جس کا ذکر ابھی ہو چکا ــ اصل اور غیر مشروط اطاعت اللہ کی اللہ ہی کے نائب معصوم کی حیثیت سے اطاعت رسول کی اور پھر ان دونوں کے واسطہ سے اور پھر ان ہی کی موافقت و سازگاری کے ساتھ مشروط اطاعت حکام وعلمائے اسلام کی
۱۸۴ مراد یہود اور منافقین ہیں۔
مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی توریت۔
يَزْعُمُوْنَ۔ زعم کے اصل معنی مطابق قول کے ہیں خواہ وہ حق ہو یا باطل لیکن عموماً اس کا استعمال جھوٹ یا مشکوک بات کے لئے ہوتا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی

رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَآ

طرف آؤ تو آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ کی طرف سے بڑی پہلوتہی کر رہے ہیں ۱۸۸ پھر کیسی گزرتی

اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ

ہے جب ان پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے اپنے ہی ہاتھوں ۱۸۹ پھر آپ کے پاس آتے ہیں

يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾

اللہ کی قسم کھاتے ہوئے کہ ہمارا مقصد تو محض بھلائی اور مصلحت تھا ۱۹۰

الزعم القول الحق والباطل واكثر ما يقال فيما يشك فيه ولا يحقق (تاج) واذا شك فيه فلم يدر لعله كذب او باطل قيل يزعم فلان (لسان)

محاورۂ قرآنی میں یہ ہمیشہ ذم ہی کا پہلو لئے ہوئے آیا ہے۔

جاء في القرآن في كل موضع ذم القائلون به (راغب) الزعم يستعمل في الباطل والكذب وهو يرد على الزاعمين فلا يقرهم على شئ۔ (المنار)

اَلَمْ تَرَ۔ اس عنوانی ترکیب سے ظاہر ہوگیا کہ آگے ذکر کسی اہم وعجیب ہی واقعہ کا آنے والا ہے۔

۱۸۵ (بجائے اس کے کہ اُسے شریعت کی عدالت میں لائیں)

طاغوت۔ پر حاشیہ پ ۳، رکوع ۲ میں گزر چکا ہے یہاں مراد ہر غیر اللہ کی حکومت واقتدار ہے۔

وكل من يتحاكم اليه من دون الله ورسوله ممن يتحاكم بغير ما انزل الله على رسوله فهو راغب عن الحق الى الباطل وذلك عين الطاغوت (المنار)

۱۸۶ یعنی اس کی حاکمیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور طاغوت کے اقتدار کے آگے گردن نہ جھکائیں۔

۱۸۷ یعنی بنی آدم کے دشمنِ ازلی شیطان کی تو تمنا ہی یہ رہتی ہے کہ آدم زادوں کو راہِ حق سے زیادہ سے زیادہ دور کردے

۱۸۸ منافقین یوں تو اسلام کے مدعی تھے لیکن جب کبھی کوئی مقدمہ معاملہ آ پڑتا تو فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے سے بہت ہی گھبراتے کہ یہاں تو بہر حال بلا رو رعایت دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو کر رہے گا، اور کسی قسم کی سخن سازی وخیانت نہ چل سکے گی۔

تَعَالَوا.... الى الرسول۔ رسول کی طرف آؤ کہ آپ قانونِ شریعت کے موافق فیصلہ کردیں۔

۱۸۹ مثلاً یہی کہ ان کی خیانت یا منافقت کا راز کھل گیا، اور اس پر اُن کی دھر پکڑ شروع ہوگئی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ

یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اسے سب جانتا ہے تو آپ ان سے چشم پوشی کر جایا کیجئے ۱۹۱ اور انہیں نصیحت کرتے رہئے

لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿۶۳﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

اور انہیں ان کی بابت پر اثر بات کہتے رہئے ۱۹۲ اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اس غرض سے کہ اس کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جائے ۱۹۳

۱۹۰ یعنی جب ان کی دورنگی کھل جاتی ہے اور باز پرس شروع ہو جاتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے لگتے ہیں کہ ہم بھی تو مومن ہیں اور ہمیں تو رسول کی حاکمیت سے کچھ انکار تھوڑے ہی ہے ہم تو محض نیک نیتی اور فریقین کی خیر خواہی کے خیال سے مقدمہ کو دوسری جگہ لے گئے تھے۔

آیتوں کی شان نزول میں آتا ہے کہ ایک یہودی اور ایک مسلمان یعنی منافق کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوا۔ یہودی نے رسول اللہ صلعم کی دیانت پر اعتماد کر کے کہا کہ چلو آپ کے پاس چلیں منافق کا پہلو کمزور تھا، بولا کہ نہیں بلکہ سردار یہود کعب بن اشرف کے پاس چلیں۔ بالآخر مقدمہ رسول اللہ صلعم ہی کی خدمت میں آیا اور یہاں سے فیصلہ یہودی کے موافق ہوا کہ وہی اس معاملہ میں حق پر تھا۔ منافق نے کہا کہ چلو اب عمرؓ کے پاس چلیں، وہ غالباً اپنے دل میں یہ سمجھا کہ عمرؓ کی شدت و غلظت کافروں پر بہت بڑھی ہوئی ہے اور میں ظاہر میں تو بہرحال مسلمان ہوں وہاں میری ہی چل جائے گی۔

آیات میں تلمیح اسی واقعہ کی جانب ہے۔ منافقین اپنا یہ عذر پیش کرتے تھے کہ ہم کسی اور کے پاس مقدمہ کچھ اس خیال سے تھوڑے ہی لے جاتے ہیں کہ فیصلہ کا حق رسولؐ کے سوا کسی اور کو حاصل ہے، بلکہ ہم تو اس لئے لے جاتے ہیں کہ وہاں حق و انصاف و قانون سے زیادہ فریقین کی مصلحت اور دلجوئی پر نظر رہے گی۔

۱۹۱ (اور اُن کے کرتوتوں کو علم خداوندی اور مؤاخذۂ خداوندی کے حوالہ رکھئے، خود مؤاخذہ سر دست نہ فرمایئے)

مَا فِي قُلُوبِهِمْ۔ یعنی جو کچھ یہ اپنے دلوں میں کفر و نفاق کی قسم سے چھپائے ہوئے ہیں۔

۱۹۲ یعنی خاص ان کی اصلاح سے متعلق ان پر کافی مضامین کی تبلیغ کرتے رہئے کہ ان پر حجت الٰہی قائم رہے

وَعِظْهُمْ۔ انہیں نصیحت کرتے رہئے جیسا کہ منصب رسالت کا اقتضاء ہے۔

۱۹۳ یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ رسول کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کو حاکم اعلیٰ اور مقتدا تسلیم کیا جائے اور اُمت اُسی کے لائے ہوئے قانون اور بتائی ہوئی شریعت پر چلنا سیکھے ورنہ محض زبانی رسول مان لینے سے تو کوئی حاصل ہی نہیں

مِن رَّسُولٍ میں مِن زائدہ تاکید کی غرض سے ہے۔

اور یہ ترکیب محض رسولاً سے اطلاق نفی میں کہیں زیادہ مؤکد ہے۔

من زائدۃ للتاکید (قرطبی) ... رسول اطلع فی استغراق النفی ... وما ارسلنا رسولاً (المدارک)

بِإِذْنِ اللَّهِ۔ اس قید نے واضح کر دیا کہ مطاع ذاتی و حقیقی رسول بھی نہیں ہوتا، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، رسول مطاع اُس کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

باذن اللہ تعالیٰ الاحتراس لان الطاعۃ فی الاصل ... تعالیٰ ... (قعود القرآن المجید)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ

اور کاش کہ جس وقت یہ اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے تھے آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے مغفرت چاہتے اور

الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

رسول بھی اُن کے حق میں مغفرت چاہتے تو یہ ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ۱۹۴ سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ

حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے ۱۹۵ جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا

آپ کردیں اُس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں ۱۹۵ اور اگر ہم نے اُن پر فرض کردیا ہوتا کہ اپنے آپ کو

اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ

مار ڈالو یا یہ کہ اپنے وطن سے نکل جاؤ تو اس کو ان میں سے نہ کرتے کوئی مگر بجز تھوڑے سے لوگوں کے ۱۹۶

السلاهية يظنون من يظنون ان الرسول يطاع لذاته بلا شرط ولا قيد (المنار)

۱۹۴ (اوران کی توبہ قبول ہو گئی ہوتی)

اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ اپنی جان پر ظلم اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ رسول زندہ وسلامت اپنے درمیان موجود اور پھر ان کی عدالت سے اعراض۔

فَاسْتَغْفَرُوا۔ مغفرت چاہتے اپنے اس گناہ کی اور گناہ نفاق کی۔

جَآءُوْكَ۔ آپ کے پاس ندامت کے ساتھ حاضر ہوتے، تقدیر کلام یہاں یوں سمجھی گئی ہے۔

ثم جاءوك فآمنوا واستغفروا استغفار کے لفظ میں خود ایمان کا مفہوم بھی شامل ہے اس لئے آمنوا کی تصریح کی ضرورت نہ رہی' ورنہ ظاہر ہے کہ بغیر ایمان لائے محض حاضری ہرگز کافی نہ تھی۔

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ۔ رسول کی خدمت میں ایمان کے ساتھ حاضری اور پھر اللہ سے طلب مغفرت یہ دونوں چیزیں یقیناً آپ کے قلب سے اثر ناگواری کو دور کردیتیں اور اس کے بجائے انشراح پیدا کردیتیں اور آپ ضرور ان کے لئے مغفرت طلب کرنے لگتے۔ ایک تو پیدا باطل فرقہ کا آیت کے یہ معنی کرنا کہ کتاب اللہ بھی انھیں معانی دے دیتی، لغت اور قرآن دونوں کے سادہ مفہوم

۱۹۵ (عند اللہ)

یعنی اللہ کے ہاں ان کا ایمان اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جائے گا۔

اور ان لوگوں سے مراد وہی منافقین اور اسلام کے ظاہری اور زبانی دعوے دار ہیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا

اور اگر یہ (لوگ) وہ کر ڈالتے جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر ہی ہوتا اور انہیں ثابت قدم رکھنے والا بھی ۱۹۸

لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

اور اس وقت ہم انہیں ضرور اپنے پاس سے اجر عظیم دیتے ۱۹۹ اور ہم انہیں سیدھی شاہراہ دکھا دیتے ۲۰۰

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ

اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا (خاص) انعام

النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

کیا ہے (یعنی) پیمبر اور اولیاء اور شہید اور صالحین اور یہ کیسے اچھے رفیق ہیں ۲۰۱

۱۹۸ (ایمان کے معاملہ میں)

یعنی اگر شک، تذبذب، تزلزل کی راہ چھوڑ کر اطاعتِ رسول میں یکسوئی کے ساتھ لگ جائیں تو انھیں ایمان میں ثبات و استقلال اور اس کی برکتیں از خود نصیب ہونے لگیں۔ ذکر انھیں منافقین اور کمزور ایمان والوں کا چل رہا ہے۔

فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ۔ یعنی اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت اگر انھوں نے بہ دل و جان کرلی ہوتی۔

ای ما یؤمرون بہ من التوبۃ والاخلاص (ابن عباس) من متابعۃ الرسول صلعم و طاعتہ طوعا و رغبۃ (بیضاوی)

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ یعنی دنیوی و اخروی، انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے ان کے فلاح کی صورت پیدا ہوجاتی۔

تَثْبِيْتًا پہلے یہ بتایا کہ احکامِ دین پر اگر عمل کرتے تو یہ چیز انہی کے کام آتی اور انہی کے حق میں بہتر ہوتی۔ اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ احکام پر عمل کرنے سے خود قوتِ ایمانی ضعیف سے قوی اور قوی سے قوی تر ہوجاتی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ تجربہ سے ثابت ہے کہ دین کا کام کرتے رہنے سے اعتقاد و یقین کی باطنی کیفیت کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

۱۹۹ (آخرت میں)

اذًا یعنی اگر انھوں نے احکامِ خدا و رسول کا اتباع کیا ہوتا تو نتیجۃً انھیں خیر و صلاح بھی حاصل ہوچکتی اور دین میں ثبات و استقامت بھی نصیب ہوچکتی۔

ای لو ثبتوا۔ (جلالین)

۲۰۰ (کہ بے روک ٹوک سیدھے رضاءِ الٰہی کے مقام جنت میں داخل ہوجائیں)

اور عجب نہیں کہ اسی کی برکت سے دنیا میں بھی سعی و عمل کی صراط مستقیم ان پر خوب روشن ہو کر رہے۔

۲۰۱ دنیا کی مادی اور حسی نعمتیں جا ہے جتنی بھی ہوں انسان ان سے لطف و لذت لینے میں کچھ کمی ہی محسوس کرتا رہتا ہے اگر ساتھ میں یاران بزم اور شرکاء صحبت بھی اپنے ہم مذاق اور دل پسند نہ ہوں۔ یہاں جنت والی اسی نعمت عظیم کی دل رہی ہے کر

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾ ع

یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ ہی کا علم کافی ہے ۲۰۲

اہلِ جنت کو مادی و روحانی ہر قسم کی نعمتوں کے علاوہ صحبت بھی پاکیزہ ترین اور بہترین انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے والوں کی نصیب ہوگی۔
حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ میں ایک پہلو حیرت کا بھی ہے اور اسی لئے ترجمہ "کیسے اچھے" سے کیا گیا ہے۔

فیہ معنی التعجب کانہ قیل وما احسن اولٰئک رفیقا (کشاف۔ بحر)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ۔ اس اطاعت کا تعلق فرائض و واجبات سے ہے ورنہ اگر فرائض و واجبات کے علاوہ مستحبات، نوافل و تطوعات کا بھی اسی قدر اہتمام ہو جائے تو پھر درجۂ ولایت خود ہی حاصل ہو جائے گا، اور رفاقتِ اولیاء بطورِ انعام نصیب ہونے کے کوئی معنی نہ رہ جائیں گے۔

اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ یعنی باوجود اپنے اعمال میں کمی اور کوتاہی رہ جانے کے اور باوجود بالذات اُن کاملین سے مرتبہ میں فروتر ہونے کے انھیں ان کاملین کی معیت نصیب ہو جائے گی۔

اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ یہ انعام کمالِ قرب و وصول کی صورت میں ہوگا۔

صِدِّيْقِيْنَ۔ یعنی بات کے کھرے اور معاملے کے سچے۔ ایسے کہ سچائی اور حق پسندی گویا اُن کی فطرت میں رچ گئی اور ان کی طبیعت کا جزو بن گئی ہے، ایمان کے ہر جزو کے متعلق ان کی تصدیق کامل ہوتی ہے، ریب و شک کے حدود سے بالاتر۔

کل من صدق بکل الدین لا یتخالجہ فیہ شک فھو صدیق (کبیر) المبالغ فی الصدق اوفی التصدیق (قرطبی)

اُردو میں ان ہی کو اولیاء اللہ یا محض اولیاء کہتے ہیں، قربِ حق میں ان کا نام انبیاء کے بعد ہی ہوتا ہے۔

افضل الخلق ھم الانبیاء علیھم السلام وبعدھم الصدیقون (کبیر)

شُهَدَآءِ۔ شہید وہ ہے جو دین کی محبت میں اپنی جان تک سے دریغ نہ کرے اور عمل سے ثابت کر دے کہ جس چیز پر وہ ایمان لایا تھا، وہ اُسے اس قدر عزیز تھی کہ اس کی خاطر اس نے اپنی جان تک قربان کر دی لیکن محاورۂ قرآنی میں یہ لقب مقتولین فی سبیل اللہ تک محدود نہیں بلکہ ہر وہ شخص اس طبقہ میں آجاتا ہے جو اپنے قول و عمل سے دین کے ساتھ اپنی انتہائی شیفتگی کی شہادت پیش کرے۔

الشھادۃ لیست عبارۃ عن القتل بل نقول الشھید فعیل بمعنی الفاعل وھو الذی یشھد بصحۃ دین اللہ تعالٰی تارۃ بالحجۃ والبیان واخری بالسیف والسنان فالشھداء ھم القائمون بالقسط (کبیر) وقال الاستاذ الامام وھم اھل العدل والانصاف الذین یؤیدون الحق بالشھادۃ لاھلہ بانھم محقون ویشھدون علی اھل الباطل انھم مبطلون۔ ...واقول ان الشھادۃ التی تحوم بھا حجۃ اھل الحق علی اھل الباطل تکون بالقول والعمل والاخلاق والاحوال فالشھداء ھم حجۃ اللہ تعالٰی علی المبطلین فی الدنیا والآخرۃ بحسن سیرتھم۔ (المنار)

اور مقتولیت کوئی اپنے اختیار کی چیز ہے بھی نہیں۔

الصّٰلِحِيْنَ۔ صالحین وہ افرادِ امت کہلاتے ہیں جو پورے دیندار اور متبع شریعت ہوتے ہیں اور جن کی حسنات ان کے غالب اعمال میں رہتی ہے گو ان کی شخصیتیں اس درجہ کی نہ ہوں جو دنیا کے سامنے بطور حجت و شہادت کے پیش ہو سکیں۔

ھم الذین صلحت نفوسھم واعمالھم ولم یبلغوا ان یکونوا حجۃ ظاھرۃ من کل الدین قبلھم (المنار)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا

اے ایمان والو! اپنی احتیاط رکھو پھر گروہ گروہ کر کے ... یا ... ۲۰۳

جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ

اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر لگا دیتا ہے ۲۰۴ اور پھر تم پر اگر کوئی

قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾

مصیبت آ پڑتی ہے تو کہتا ہے کہ بے شک مجھ پر اللہ نے بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہوا ۲۰۵

۲۰۲ اور اللہ کا علم ہے وہی محیط ہے ان کی نیتوں کو بھی ... عمل کو بھی ان کے مقتضائے عمل کو بھی۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ یعنی تمام مومنین کو تو کاملین کی معیت و رفاقت نصیب ہوگی یہ محض فضل خداوندی کا ظہور ہوگا، ان کے اعمال کا ثمرہ نہ ہوگا۔

۲۰۳ (جیسا موقع اور جیسی مصلحت ہو)

قرآن مجید کی اکثر آیتوں کی طرح ان آیتوں کو بھی پوری طرح سمجھنے کے لئے ان کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ **اُحُد** میں ابھی حال ہی میں مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تھی اور مشرکین کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں اس سے فزوں تر بڑھ گئی تھیں اور اکیلے قریش مکہ ہی نہیں گرد و پیش کے دوسرے قبیلے بھی متحد ہو کر اسلام کے خلاف زبردست محاذ تیار کر چکے تھے، مسلمانوں کو ہمت، ثبات و استقامت کے یہ درس عین اس وقت دیے جا رہے ہیں۔

خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔ حذر کا مفہوم بہت وسیع و جامع ہے۔ ہر وہ چیز جو دشمن سے بچاؤ کے کام میں آتی ہے اس میں شامل ہے خواہ ہتھیار ہوں خواہ تدبیریں یا قوت عملی بہ الفاظ دیگر کہا یہ جا رہا ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں ہر طرح کیل کانٹے سے درست اور آمادہ رہو۔

حذركم اي ما فيه الحذر من السلاح وغيره (راغب) ما يحذر به كالحزم والسلاح (بيضاوي) خذوا حذركم

اي استعدوا بانواع ما يستعد به للقاء من تلقاء (بحر)

۲۰۴ (ایسی کہ جہاد میں شریک بھی نہیں ہوتا اور پیچھے رہ جاتا ہے)

یہاں مراد منافقین ہیں جو جہاد میں شریک ہی نہیں ہوتے تھے۔

المبطؤن منافقوهم تثاقلوا وتخلفوا عن الجهاد (بيضاوي)

مِنْكُمْ۔ خطاب یہاں مومنین اور ظاہری مومنین (منافقین) کے مجموعہ سے ہے اور اس مضمون کی آیتوں میں قرآن مجید کا عام طریق خطاب یہی ہے۔

الخطاب لعسكر رسول الله صلعم المومنين منهم والمنافقين (بيضاوي) انما جمع بينهم في الخطاب من جهة الجنس والنسب لا من جهة الايمان۔ (قرطبي)

۲۰۵ (نہیں تو میں بھی اسی مصیبت کا شکار ہوتا)

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ

اور اگر تمہیں اللہ کا فضل پیش آتا ہے تو بول اٹھتا ہے (اس بے تعلقی کے ساتھ کہ) گویا تمہارے اور اس کے

وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ

درمیان کوئی (رشتۂ) محبت تھا ہی نہیں کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا ۲۰۶ تو

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ

(اگر یہ ہے تو) اُسے چاہیے کہ اللہ کی راہ میں لڑے ۲۰۷ اُن لوگوں سے جو دنیا کی زندگی خریدے ہوئے ہیں آخرت کے عوض میں ۲۰۸

اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ۔ مصیبت مثلاً جنگ میں شکست۔

قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ۔ یہ فخر و مسرت کے ساتھ کہتا ہے۔

۲۰۶ منافقین کی دورنگی اور سیرتِ منافقانہ کو آشکار کیا ہے کہ مومنین کو جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو منافقین اپنی بے تعلقی اور علٰحدگی پر جھٹ اپنی مسرت و فخر کا اعلان کرنے لگتے ہیں کہ خوب ہوا جو ہم شریک نہ تھے ورنہ ہم بھی اسی بلا میں پھنستے اور مسلمانوں کو جب فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے تو رشک کرنے لگتے ہیں کہ کاش! مالِ غنیمت ہمارے حصہ میں بھی آتا

فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ مثلاً جنگ میں فتح و نصرت۔

كَاَنْ ..... مَوَدَّةٌ یعنی اس خود غرضی کے ساتھ کہتا ہے جیسے تم مسلمانوں کی خوشی سے اس منافق کو کوئی تعلق ہی نہیں، اور اُسے تأسف و حسرت صرف اپنی ہی قوت و دولت پر ہے۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ اُمتِ اسلامیہ کی خوشی سے خوش ہونا علاماتِ ایمان میں سے ہے۔

فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ منافق کی زبان سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں بھی خوب دولت حاصل کرتا مالِ غنیمت میں میرا بھی بڑا سا حصہ ہوتا!۔

۲۰۷ (اخلاصِ کامل اور اللہ کی رضاجوئی کی نیت سے)

فَلْيُقَاتِلْ۔ میں فَ کے معنی ہیں کہ اگر واقعی اُسے فوز عظیم ہی منظور ہے۔

۲۰۸ یعنی کافروں سے قتال کرے جو دین کی صحیح تعلیم کو بھلائے ہوئے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔

يَشْرُوْنَ۔ شراء لغات اضداد میں سے ہے یعنی اس کے معنی خریدنے کے بھی ہیں اور فروخت کرنے کے بھی، کچھ اس بنا پر اور کچھ آیت کی ترکیب لفظی کی بنا پر آیت کے ایک بالکل دوسرے معنی بھی کئے جا سکتے ہیں اور کئے گئے ہیں یعنی وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے عوض میں فروخت کر چکے ہیں، اور اس صورت میں آیت کا تعلق تمام تر مومنین مخلصین سے ہوگا جو اپنی ہر دنیوی خوشحالی اور کامرانی کو رضائے الٰہی پر قربان کرنے کو تیار رہتے! ائمہ تفسیر نے دونوں ہی پہلو اختیار کئے ہیں۔

(وللمفسرین وجہان الاول یشرون معناہ یبیعون والقول الثانی معنی قولہ یشرون ای یشترون۔ کبیر)

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو مارا جائے یا جیت جائے (بہرصورت) ہم اس کو عنقریب اجر عظیم دیں گے ۲۰۹

عَظِيْمًا ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

اور تمہیں کیا (عذر) ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں ۲۱۰ اور ان لوگوں کے لئے جو کمزور ہیں

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا

مردوں میں سے اور عورتوں اور لڑکوں میں سے ۲۱۱ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی

مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ

سے باہر نکال جس کے باشندے (سخت) ظالم ہیں ۲۱۲ اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے کوئی دوست پیدا کردے

یشرون بمعنی یشترون ویبیعون (کشاف) نزلت فی المنافقین ومعنی یشرون یشترون وقیل نزلت فی المؤمنین المخلصین ومعنی یشرون یبیعون (معالم)

۲۰۹ (آخرت میں)

یہ آخرت کا اجر عظیم مجاہدین کے لئے غلبہ اور شکست (کہ اس کی انتہائی صورت کو قتل سے تعبیر کیا ہے) کی ہر صورتوں میں موجود ہے مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ فوز عظیم کو اجر سے تعبیر کرنا وعدہ کے تاکد اور ترتب کے تیقن کے لئے ہے۔

۲۱۰ (جب کہ اعلاء کلمۃ اللہ تو خود جہاد کا ایک مستقل محرک اور قوی داعی ہے)

مَا لَكُمْ. استفہام سے مقصود ترغیب و تحریض ہے اور خطاب مومنین صادقین سے ہے۔

خطاب للمامورین بالقتال علی طریقۃ الالتفات مبالغۃ فی التحریض والحث علیہ وھو المقصود من الاستفہام (روح)

۲۱۱ یہ دوسرا داعی جہاد کے لئے ارشاد ہوا، کمزوروں کی دستگیری و نصرت اور مظلوموں کی اعانت اور انھیں ظالم کافروں کے پنجہ سے رہائی دلانا بجائے خود مقاصد جہاد میں سے ہے۔

والمستضعفین کا عطف لفظ اللہ پر ہے۔

یعنی فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ. زجاج اور زہری سے یہی ترکیب منقول ہے۔

عطف علی اسم اللہ عزوجل ای وفی سبیل المستضعفین وھذا اختیار الزجاج وقالہ الزہری۔ (قرطبی)

۲۱۲ (اور ہم ان کے ظلم و ستم کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔)

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ. مراد مکہ کا شہر اور مکہ کی حکومت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

القریۃ ھنا مکۃ باجماع من المتاولین۔ (قرطبی)

الظَّالِمِ اَهْلُهَا. مکہ والے ظالم دہرے معنی میں تھے ایک تو مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھا رہے تھے

وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ

اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے کوئی حامی کھڑا کردے ۲۱۳؎ جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی راہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ

میں لڑتے ہیں ۲۱۴؎ اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں ۲۱۵؎

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾ ع

سو تم لڑو شیطان کے ساتھیوں سے اور شیطان کی چال تو کچھ ہی ہوتی ہے ۲۱۶؎

دوسری طرف شرک کرکر کے خود اپنی جانوں پر بھی ظلم کر رہے تھے۔

ووصف اھلھا بالظلم اما لاشراکھم واما لما حصل منھم من شدۃ الوطأۃ علی المومنین واذلالھم (بحر) لاجل انھم کانوا یؤذون المسلمین ویوصلون الیھم انواع المکارہ (کبیر) بالشرک الذی ھو ظلم عظیم وباذیۃ المؤمنین ومنعھم عن الھجرۃ (روح)

۲۱۳؎ آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بچوں، عورتوں، مردوں کی ایک خاصی تعداد اسلام لا چکی ہے مگر یہ لوگ سرداران قریش کے تشدد کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس پا رہے ہیں، نہ دفع ظلم ہی پر قادر ہیں اور نہ ہجرت پر، یہاں مناجات اور فریاد ان ہی لوگوں کی زبان سے ادا ہو رہی ہے آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ظلم و شقاوت سے بچے، عورتیں، بوڑھے کوئی بھی محفوظ نہ تھے۔

مِنْ لَّدُنْكَ۔ لفظی معنی ہیں "اپنے پاس سے" اردو محاورہ میں ایسے موقع پر اپنی قدرت سے آتا ہے یعنی غیب سے اس کا سامان کردے۔

وَلِيًّا۔ ایسا دوست و ہمدرد جو اس مصیبت میں ہمارے ساتھ رہے ہم سے ہمدردی و غمخواری کرے۔

نَصِيْرًا۔ ایسا حامی جو ان ظالموں سے ہمیں نجات دلائے۔

۲۱۴؎ (اور جیسا کہ خود حق تعالیٰ ہر قسم کی نفسانی آمیزش و آلائش سے منزہ و پاک ہے اللہ والوں کا لشکر بھی کبھی عدوان و طغیان، ظلم و خیانت، بے نوشی و بدکاری کے آلاتِ حرب سے مسلح ہو کر جنگ کر ہی نہیں سکتا۔)

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کی قید جو بار بار لگائی جا رہی ہے بے معنی نہیں بہت ہی پُر معنی ہے۔ درحقیقت یہ آیت سلسلۂ جہاد کی آیتوں میں ایک کلیدی آیت ہے، اس نے صاف صاف اسلامی جہاد کا فرق دنیا جہان کی تمام جنگوں اور جاہلی محاربات سے واضح کر دیا، اس نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ سچا مسلمان جب اپنے ابنائے جنس پر ہاتھ اٹھائے گا تو توسیع ملک کے لئے نہیں، قومی تفوق کے لئے نہیں، تجارتی منڈیاں قائم کرنے کو نہیں، دوسرے کو نیچا دکھانے کو نہیں، دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کو نہیں، رشک و ہوس اور جاہ پرستی کے جذبات سے متاثر ہو کر نہیں، بلکہ دنیا کے بلند ترین مقصد انسانیت کے برترین نصب العین کلمۂ توحید کی برتری اور سربلندی کے لئے! ——— رنگ و نسل، مرز بوں اور قوم و وطن اور قبیلہ کی عزت و حمیت پر کٹ مرنے والے اسلامی نقطۂ نظر کی بلندی کو کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں؟ اسلامی جہاد جب تک اسلامی جہاد رہا، کیا وہاں کبھی کسی لشکر کے لئے ہزاروں من اور سیکڑوں من شرابوں کی ضرورت پڑی ہے؟ کیا اس لشکر میں بھی ہوا کی وارننگ کے سیکڑوں ہزار دو ہزار بعض سپاہیوں اور افسروں کے لئے امراض خبیثہ کے مخصوص اسپتالوں کا انتظام کرنا پڑا؟

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ

کیا (اے مخاطب) تو نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور

وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ

نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو ۲۱۷؎ پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے

يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ

ایسا ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا (ہوتا) ہے یا اس سے بھی بڑھ کر ڈرنا ۲۱۸؎

مسلمان سپاہی کے سینہ میں تو یہ زندہ ایمان رہتا ہے کہ اُسے ایک ایک قدم کا حساب دینا ہے کبھی اس کا قدم ان گندہ راستوں پر پڑ بھی سکتا ہے؟!

۲۱۵؎ (اس لیے ان لڑنے والوں میں خصوصیات بھی سب طاغوتیوں ہی سے ملتے ہیں۔)

طاغوت کے لفظی معنی پر حاشیہ پ ۳ میں آیۂ مَن يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ کے تحت گزر چکا۔ یہاں اس لفظ کو لا کر طاغوتی، جاہلی سپاہیوں کے تمرد، خدا فراموشی، نفس پرستی اور تجاوز عن الحدود کے پہلو کو نمایاں کرنا ہے۔ طاغوت کا ترجمہ اگر اس موقع پر نفس سے کیا جائے تو اردو میں شاید پورا مفہوم ادا ہو جائے، طاغوت اور نفس کی راہ میں آج بھی جو قومیں وطن دوستی، قوم پروری، ملکی آزادی کے خوشنما لفظوں اور نقشوں کے ساتھ جنگ کرتی رہتی ہیں ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لے لیا جائے، قساوت و سنگدلی، فریب و خیانت، شراب خواری و حرام کاری، غرض جس معیار سے چاہیے جانچ لیا جائے، جانوروں اور درندوں سے بھی بدتر حالت نکلے گی، یہ سب کرشمے فی سبیل الطاغوت لڑنے کے ہیں۔ محاسبۂ آخرت سے بے نیاز ہو کر جنگ و جدال کرنے کے ہیں۔ نفس قتال دونوں میں مشترک ہے لیکن آگے طاغوتیوں کو کوئی مناسبت لاہوتیوں سے نہیں رہ جاتی

۲۱۶؎ (اور شیطانی اور طاغوتی قوتوں کو کبھی بھی مستقل اور پائدار فتح حق کے مقابلہ میں نصیب نہیں ہو سکتی)

فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۚ مسلمانوں کو لڑنے کا حکم مل رہا ہے مگر کس کے مقابلہ میں؟ شیطانوں اور طاغوتیوں کے مقابلے میں مقاتلین فی سبیل الطاغوت کے مقابلے میں جو دنیا میں شر و فساد، فسق و شرک ہی کی حکومت پھیلانا چاہتے ہیں

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا۔ اس میں مسلمانوں کو ہمت دلائی ہے کہ شیطان کوئی ڈرنے اور سہمنے کی چیز نہیں، وہ تم پر حاکم و آمر نہیں، تم ذرا ہمت کر جاؤ تو وہ خود تم سے پناہ مانگتا ہوا بھاگے گا، اس میں جان تو ہے ہی نہیں۔ حربی زندگی سے قطع نظر، اخلاقِ و معاشرت، معاملات، عبادات کے میدان میں بھی شیطان سے مقابلہ کر لینا کچھ دشوار نہیں، ضرورت صرف ہمت کی ہے۔ كَيْدَ الشَّيْطَانِ جس کے ضعف کا یہاں اعلان ہے اپنے اعلان میں عام ہے حربی و غیر حربی ہر شعبۂ زندگی پر

۲۱۷؎ (کہ حالتِ امن میں اس قسم کی عبادات پر عمل کافی ہے)

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ یعنی جوشِ انتقام اور قتال سے ابھی باز رہو۔ یہ ذکر کن لوگوں کا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے اس وقت کے حالات پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ مسلمانوں کو مکہ میں قریش کے مظالم سہتے سہتے ایک زمانہ ہو گیا تھا،

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا

آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سامان (بہت ہی) تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لئے کہیں بہتر ہے جو تقوے (اختیار) کرے ۲۲۰

تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿۷۷﴾ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ

اور تم پر دھاگے کے برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا ۲۲۱ تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہیں تمہاری موت آئے گی خواہ تم مضبوط

فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ

قلعوں ہی میں ہو ۲۲۲ اور اگر انھیں کوئی سکھ پہنچ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تو خدا کی طرف سے ہے

اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ

اور اگر انھیں کوئی دکھ پیش آجاتا ہے تو کہتے ہیں یہ آپ کے سبب ہوا ۲۲۳

یحتمل انھم ما تفوھوا بہ ولکن قالوہ فی انفسھم فحکی اللہ تعالیٰ عنھم (صاوی) بالسنھم او بقلوبھم (روح) یجوز ان یکون اعتقدوہ و قالوا فی انفسھم فحکی ذلک تعالیٰ عنھم (بحر) قد یجوز ان یکون ھذا مما نطقت بہ السنۃ حالھم من غیر ان یتفوھوا بہ صریحا۔ (ابو سعود)

بہر صورت آیت اُن ظالم پادریوں کی پُر زور تردید کر رہی ہے جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ مسلمان تو غنیمت کی طمع میں جنگ کے لئے تُلے بیٹھے تھے، رسولؐ کو صرف اشارہ کی دیر تھی، یا معاذ اللہ یہاں اُلٹے ان کو ترغیب دینے اور آمادہ کرنے کی ضرورت تھی۔

۲۲۰ (اور حکم الٰہی کو بہ خوشی بجا لائے)

عدمِ فرضیتِ جہاد اور زلیست مزید کی مہلت کی تمنا چونکہ حُبِّ دنیا اور ما فی الدنیا سے پیدا ہوئی تھی اس لئے نہایت حکیمانہ انداز میں اصل جڑ پر بس ضرب لگائی گئی اور ارشاد ہوا کہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے، جو کچھ ہے وہ بھی بالکل فانی اور سراسر بے ثبات طلب و تمنا کے قابل شے تو آخرت ہے اور اس کی لذتوں اور نعمتوں کے حصول کا ذریعہ تقوے اور احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔

مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۔ سو ایسی حقیر اور بے ثبات چیز کی خاطر التوائے حکم جہاد کی تمنا!

خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ ۔ اور اس تقویٰ ہی کی ایک فرد جہاد ہے۔

۲۲۱ (سو یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاد کے اعلیٰ ثمرات سے محروم رہ جاؤ)

فَتِيلًا بھی عربی میں نقیرًا ہی کی طرح تحقیر و تصغیر کے اظہار کے لئے آتا ہے جیسے اردو محاورہ میں رتی بھر، رائی برابر، ذرہ بھر وغیرہ۔

۲۲۲ اور موت کچھ میدانِ جنگ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

یہاں یہ سمجھایا ہے کہ جب موت ایسی یقینی اور بے پناہ شے ہے تو آخرت میں جہاد کے اجر و مراتب بے حساب سے محروم اور خالی ہاتھ کیوں پہنچو؟ کیوں نہ غزا و قتال میں سُرخ رُو ہو کر وہاں پہنچو۔

۲۲۳ ذکر اب منافقین کا ہو رہا ہے، ان کا حال یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں کی بات بنی رہتی یہ لوگ بھی برابر ان کے

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ

کہہ دیجئے کہ ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے، سو ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ گویا یہ بات ہی نہیں سمجھتے

حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ

تجھے جو بھی سکھ پیش آتا ہے وہ بس اللہ ہی کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تیرے ۲۲۴

سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

اپنے ہی سبب سے ہے ۲۲۵ اور ہم نے آپ کو انسانوں کی طرف پیمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۲۲۶

شریک بنتے اور کہتے کہ یہ تو عین فضلِ خداوندی ہے جس میں ہم تم سب یکساں شریک ہیں، اور جب بات بگڑ جاتی تو جھٹ سارا الزام مسلمانوں اور ان کے سردارِ اعظم پر رکھ دیتے کہ یہ جو کچھ پیش آیا، سب آپ ہی کی بے تدبیریوں کا نتیجہ ہے۔

تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ۔ مثلاً جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور اس میں حصہ رسدی ان منافقین کو بھی مل گیا۔

تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ۔ مثلاً جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور اس کا خمیازہ بحصۂ رسدی منافقین کو بھی اٹھانا پڑا۔

يَقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یعنی یہ کامیابی تو طبعی حالات کی بنا پر تکوینی اسباب سے حاصل ہو گئی، اس میں مسلمانوں یا اُن کے سردارِ اعظم کے کسی حسنِ تدبیر کو کیا دخل۔

منافقین کا یہ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کہنا بھی بطور حمد نہ تھا، یا بطور اثباتِ قدرتِ باری نہ تھا، بلکہ بطور محاورۂ زبان تھا، جیسے اردو میں لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو تقدیری امور ہیں۔

۲۲۴ یہ توجہ دلائی ہے منافقین کی حماقت شعاری اور بے غوری کی عادت پر۔

كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یعنی دکھ ہو یا سکھ، رنج ہو یا راحت، سب کا مسبب الاسباب حقیقی اللہ ہی ہے۔ سکھ اور راحت اگر ہے تو یہ براہِ راست اس کے فضل و کرم کا ظہور ہے بلا توسطِ اعمال، اور دکھ یا رنج اگر پیش آ رہا ہے تو یہ اس کے عدل کا ثمرہ ہے بتوسطِ اعمال۔

۲۲۵ (اے انسان!)

خطاب اب عام نوعِ انسانی سے ہے۔

یا انسان خطابا عاما (کشاف) الخطاب عام کانّہ قیل ما اصابک یا انسان (بحر) والخطاب فیہ کما قال الجبائی وروی عن قتادۃ عام لکل من یقف علیہ لا للنبی صلعم۔ (روح)

فَمِنَ اللّٰهِ۔ یعنی اس کے فضل و کرم کا نتیجہ۔

مِنَ اللّٰهِ وَمِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ دو محاورے الگ الگ ہیں، زبان و ادب کے ماہرین نے دونوں میں فرق یہ بتایا ہے کہ دوسرا محاورہ بُرے بھلے سارے افعالِ تکوینی کے لئے عام ہے، برخلاف اس کے پہلے محاورے کا استعمال صرف محلِ رضا پر ہوتا ہے۔

نقل عن الراغب: بأن من عند اللّٰہ أعم من حیث أنّہ یقال فیما کان برضاہ سبحانہ وبسخطہ ...... ولا یقال ھو من اللّٰہ إلّا فیما کان برضاہ وبأمرہ۔ (روح۔ بحر)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی ٢٢٧ اور جو کوئی روگردانی کرے سو ہم نے آپ کو

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ

ان پر نگران کر کے نہیں بھیجا ہے ٢٢٨ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ طاعت (قبول ہے) ٢٢٩ لیکن آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ

ان میں سے ایک جماعت شب کے وقت اس کے برخلاف مشورہ کرتی ہے جو کچھ کہ وہ کہہ چکے تھے اور اللہ اُن کے رات

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾

والے مشوروں کو لکھتا جاتا ہے تو آپ اُن کی طرف سے بے التفات رہئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے ٢٣٠

فَمِنْ نَّفْسِكَ ۔ یعنی اے بندے تیری ہی بداعمالی کے سبب سے اور بہ اقتضائے عدلِ الٰہی۔

سَيِّئَةٍ ۔ کا اطلاق اس سیاق میں صرف اس برائی پر ہوتا ہے جو واقعۃً بھی برائی ہو محض صورۃً ہی برائی نہ ہو، صالحین و ابرار کو جو حوادث و مصائب پیش آتے رہتے ہیں وہ صرف صورۃً ہی مصائب ہوتے ہیں حقیقت میں ان کی بلندیٔ مراتب کے لئے ذریعۂ رحمت ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے حق میں بداعمالی کا ثمرہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

٢٢٦ اور اللہ کی یہ گواہی دنیا میں رسولؐ کے کمالات کے ظاہر ہو رہی ہے معجزات و خوارق بھی انہی کمالات کا ایک جزو ہیں۔

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۔ یہاں صاف للناس فرمایا ہے للعرب نہیں فرمایا۔

خاتم النبیین کے پیام کی عالمگیری پر دوسری آیات کے علاوہ یہ آیت بھی ایک نصِ قاطع ہے۔

والناس عام عربهم وعجمهم (بحر) فيه ردّ لمن زعم اختصاص رسالته عليه السلام بالعرب

فتعريف الناس للاستغراق (روح) تعريف الناس للاستغراق اى مرسلا لكل الناس لا لبعضهم. (ابو سعود)

٢٢٧ (کہ عام انسانوں کے پاس کوئی ذریعہ احکامِ الٰہی کی معرفت کا نہیں بجز واسطۂ رسول کے)

لان الله تعالى لا يأمر الناس ولا ينهاهم الا بواسطة رسل منهم (المنار)

آیت میں رد آگیا ان گمراہ فرقوں کا جو رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے مستلزم نہیں سمجھتے آیت عصمتِ رسولؐ کے مضمون کو بھی واضح طور پر بیان کر رہی ہے یوں کہ اگر رسولؐ سے بھی خطا و غلطی کا امکان ہوتا تو اُن کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی کیسے قرار پا سکتی

من اقوى الدلائل على انه معصوم فى جميع الاوامر والنواهى وفى كل ما يبلغه عن الله. (كبير)

اور علاوہ حدیثِ نبوی کے جہاں یہ مضمون تصریحاً آیا ہے فقہاء نے خود اس آیت سے بھی نکالا ہے کہ رسولؐ کی نافرمانی عین حق تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔

افادبذالك ان معصيته معصية الله (جصاص)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ (کلام) اللہ کے سوا کسی (اور) کی طرف سے ہوتا تو اس کے اندر بڑا

اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ

اختلاف پاتے ۲۳۱ اور انھیں جب کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو یہ اُسے پھیلا دیتے ہیں ۲۳۲

۲۲۸ (سو اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں اور نہ آپ اس لئے زیادہ فکر و غم میں پڑیئے)
فَمَنْ تَوَلّٰى. یعنی جو آپ کا کہنا نہ سُنے اور آپ کی طرف سے بے توجہی اختیار کرے۔

۲۲۹ ذکر منافقین کا چل رہا ہے۔
یعنی المنافقین۔ (ابن عباسؓ)
یہ زبانی تو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں یہی عرض کرتے تھے کہ آپ کے احکام سر آنکھوں پر آپ کے ارشادات کی تعمیل ہمیں قبول و منظور۔
طَاعَةٌ خبر ہے مبتدا محذوف ہے۔
وبہ امرنا وشاننا طاعۃ (کشاف)

۲۳۰ اس کی کارسازی یہ ہے کہ وہ دنیا میں آپ کو اُن کے شر سے اور سازشوں سے محفوظ رکھے گا اور آخرت میں انھیں شدید سزائیں دے گا۔
طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ. یعنی ان منافقوں کے سردار اور سرغنہ۔
بَيَّتَ. رات کی تاریکی اور پوشیدگی میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں اور منصوبے بنائے جاتے تھے۔
وَاللّٰهُ يَكْتُبُ. یعنی خدائی ریکارڈ میں اُن کی سازشیں اور منصوبے سب مندرج و محفوظ ہیں وقت آنے پر پیش ہو جائیں گے۔

۲۳۱ (جو بشری تالیف و تصنیف کا لازمہ ہے)
اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا. اس کے مفہوم میں بہت کچھ قیل و قال ہوئی ہے، کسی نے کہا کہ بیان میں تناقض مراد ہے اور کسی نے کہا کہ پیشگوئیوں میں فرق مراتب اور کسی نے کہا کہ عبارت کی عدم یکسانی لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود اختلاف کثیر کا لفظ بڑا وسیع اور جامع ہے، معنوی اور ادبی ہر قسم کی بے آہنگی بے ربطی کا جھول جھال اس کے اندر داخل ہے۔ قرآن مجید نے اس آیت میں دنیا کے سامنے اپنی یکتائی کا ایک مستقل چیلنج پیش کر دیا کہ جس طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لو، ہر طرح جانچ پڑتال کر لو، مضمون کی پستی و عبارت کی ناہمواری کسی قسم کی کوئی کمی کوتاہی اس کے اندر نہ پاؤ گے اور یہی دلیل ہے اس کی کہ یہ بشر او مخلوق کا کلام نہیں، قرآن کے حملہ منکرین کے خلاف خواہ وہ کسی وجہ اور کسی پہلو سے ہوں یہ قیامت تک کے لئے تحدی ہے۔
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ. قرآن میں تدبر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا لفظی و معنوی اعجاز بالکل واضح ہو جائے گا، اور اس وضوح سے آپ کی رسالت کی جانب سے شبہات کافور ہو جائیں گے۔
لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ. جیسا کہ معاصر و متاخر منکرین کا خیال تھا اور جیسا کہ آج بھی بعض

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلَىٰ أُوْلِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ

اور اگر یہ لوگ اُسے رسولؐ کے یا اپنے میں سے صاحبانِ امر کے حوالہ کر دیتے ۲۳۳ تو ان میں سے جو لوگ استنباط کی

يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ ؕ

صلاحیت رکھتے ہیں اس کی حقیقت بھی جان لیتے ۲۳۴

"روشن خیال" مرتدین کا خیال ہے ـــ دنیا کا قدیم و جدید کوئی سا بھی علم و فن ہو، منطق، فلسفہ، طبیعیات، فلکیات، شعر و ادب، تاریخ، غرض عقلی، نقلی کسی قسم کا بھی اس کے کسی بڑے سے بڑے ماہر و فاضل کے کلام میں معاصرین و متاخرین نے طرح طرح کے نقص و عیب نکال کر انہیں پیش کر دیئے ہیں، اور یہی دلیل اس کلام کے "غیر اللہ" ہی کی طرف سے ہونے کی ہے۔
يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ سے صحتِ قیاس پر بھی دلیل نکل آئی اور اُن فرقوں کا بھی رد ہو گیا جو سمجھتے ہیں کہ تفسیرِ قرآن کا حق صرف رسولؐ اور امام معصوم کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۳۲ (بغیر اس تحقیق کے کہ وہ خبر کہاں تک صحیح ہے اور بغیر اس پر غور کیے کہ اگر صحیح ہے بھی تو اس کی فوری اشاعت کہاں تک مناسب و قرینِ مصلحت ہے)
اشارہ منافقین اور کمزور ایمان والوں کی طرف ہے۔

نزل فی جماعة من المنافقین او ضعفاء المسلمین (جلالین)

ملتِ اسلامی شروع ہی سے ایک حد تک منظم بلکہ نیم عسکری جماعت تھی، اور یہ امر ہر اجتماعی تنظیم کے منافی عموماً اور عسکری تنظیم کے منافی تو خصوصاً ہے کہ اُمت کے عوام جس خبر کو جہاں اور جب سُن پائیں بلا اپنے سردار و اور اہلِ حل و عقد کی طرف رجوع کئے بے تحقیق اُسے لے دوڑیں اور بے تحاشا اُسے پھیلانا شروع کر دیں۔
أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ. مثلاً کہیں باہر سے لشکرِ اسلام کی فتح و ظفر کی خبر آئی۔
الْخَوْفِ. مثلاً کہیں باہر سے مسلمانوں کی شکست و ہزیمت کی خبر آئی۔

۲۳۳ (بجائے اس کے اُلٹے خود اس خبر کی شہرت و اشاعت میں لگ گئے)
أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ یعنی صاحبانِ فہم سلیم خصوصیت کے ساتھ مراد ہیں اکابر صحابہ، مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ

ذوی العقل والرأی من المؤمنین یعنی ابا بکرؓ واصحابه (ابن عباسؓ)

باقی اس کا اطلاق اُمت کے سارے ہی اہلِ حل و عقد پر ہو سکتا ہے۔

ذوی العلم والرأی منهم (کبیر) وهم اهل العلم والفقه عن الحسن وقتادة وغیرهما (قرطبی) یجوزان یرید به فریقین من اهل الفقه والولاة لوقوع الاسم علیهم جمیعا۔ (جصاص)

۲۳۴ یعنی اس خبر کی صحیح حیثیت متعین کر لیتے۔
الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ. اس سے ایک بڑی اہم فقہی حقیقت روشنی میں آ گئی معلوم ہوا کہ استنباطِ مسائل و اجتہادِ احکام، ہر ایک کا کام نہیں اس کے لیے ایک خاص فہم و سلیقہ اور درجۂ تحقیق کی ضرورت ہے، ہر فردِ اُمت اس کا اہل و مجاز نہیں ہوتا

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

اور اگر تم پر اللہ کی رحمت شامل نہ ہوتی تو تم (سب) بجز تھوڑے سے لوگوں کے شیطان کی پیروی کرنے لگ جاتے ۲۳۵

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

تو آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجیے ۲۳۶ آپ پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی بجز آپ کی اپنی ذات کے ۲۳۷ اور آپ مسلمانوں کو بھی آمادہ کرتے رہیے ۲۳۸

مِنْهُمْ آیت میں دو جگہ آیا ہے، دونوں جگہ اس سے مراد مجموعۂ امت ہے، اس میں حسبِ دعویٰ ظاہر منافقین بھی شامل تھے۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے چار امور ثابت ہوتے ہیں:۔

(۱) ایک یہ کہ نئے نئے مسائل جو پیش آئیں گے ان کی بابت احکام نص سے نہیں استنباط سے حاصل ہوں گے۔

(۲) دوسرے یہ کہ استنباط بھی ایک حجتِ شرعی ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ احکام میں عامیوں پر اہلِ علم کی تقلید واجب ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ رسول اللہ صلعم اس پر مامور تھے کہ استنباطِ احکام کرتے رہیں۔

آیت سے عقیدۂ امامت کا بھی رد نکل رہا ہے، اگر کسی امامِ معصوم کا وجود امت میں ہوتا تو استنباطِ احکام کی ضرورت کیا تھی، امام خود ہی الہاماً ان احکام سے واقف ہوتا۔

هذه الآية تدل على بطلان قول القائلين بالامامة لانه لو كان كل شيء من احكام الدين منصوص عليه لعرفه الامام ولزال موضع الاستنباط ۔ (جصاص)

۲۳۵ (اے امتِ محمدیہ!)

اے مسلمانو! تم گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتے تو تم کو ان نعمتوں کی قدر خاص طور پر کرنی چاہیے کہ اللہ نے تمہیں قرآن دیا، شریعت دی، صاحبِ شریعت رسولؐ دیا۔

اِلَّا قَلِيْلًا۔ اور یہ تھوڑے سے جو محفوظ رہ جاتے وہ عقلِ سلیم کی بدولت رہتے کہ وہ خود بھی فضل و رحمتِ خاص ہی کا ثمرہ ہے۔

۲۳۶ (اے پیمبر!)

اوپر مضمون جہاد و قتال کا چل رہا تھا، درمیان میں دوسرے مضمون ضمنی مناسبتوں سے آگئے تھے اب پھر اس مستقل مضمون کی طرف رجوع ہے۔

۲۳۷ (نہ کہ کسی دوسرے کے عمل کی)

مقصد یہ ہے کہ آپ خود جہاد پر آمادہ ہو جائیے خواہ کوئی دوسرا ساتھ دے یا نہ دے آپ پر ذمہ داری کسی دوسرے کے عمل کی نہیں۔ تاریخ کا بیان ہے کہ غزوۂ احد جب شوال میں پیش آچکا تو اس کے متابعد ذیقعدہ میں آپ مشرکین کی دھمکی کا خیال کر کے بدر کی طرف پھر چلنے پر آمادہ ہو گئے، منافقین تو اس وقت اپنی بے اعتقادی کے باعث نکل ہی گئے، باقی مومنین بھی ساتھ دینے میں پس و پیش کرنے لگے کچھ تو اس لیے کہ ابھی احد کے زخم بالکل تازہ تھے اور کچھ اس لیے بھی کہ دشمن کی غیر معمولی قوت کی افواہی خبروں پر یقین کر بیٹھے تھے۔ مسلمانوں کا سپہ سالار اعظم یہ رنگ دیکھ تن تنہا چل کھڑے ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ کیا ٹھکانا تھا

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ

اور عجب نہیں کہ اللہ کافروں کا زور روک دے ۲۳۹ف اور اللہ بڑا ہی زور والا ہے بڑا ہی سزا دینے والا

تَنْكِيْلًا ۝۸۴ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ

ہے ۲۴۰ف جو کوئی اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں سے حصہ ملے گا ۲۴۱ف اور جو کوئی بری سفارش

يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ

لائے گا اس پر اس میں سے بار رہے گا ۲۴۲ف اور اللہ ہر چیز پر طاقت

شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝۸۵ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا

رکھنے والا ہے ۲۴۳ف اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو یا اُسی کو لوٹا دو۔

فرض شناسی اور نصرتِ الٰہی پر اعتماد کا، قلت و کثرت اور اکائی اور سیکڑوں کی عددی نامناسبت کا گویا خیال بھی سامنے نہ رہا۔

۲۳۸ف (جہاد پر)

یعنی درجۂ ترغیب میں تبلیغ آپ کے فرائضِ رسالت میں داخل ہے۔

حَرِّضْ۔ تحریض کے معنی ہیں کسی شے کی خوبیاں بکثرت بیان کر کے اس کی جانب شوق و رغبت لانا، گویا ہیجان اور پروپیگنڈا کرنا

التحریض الحث علی الشیء بکثرۃ التزیین وتسہیل الخطب فیہ (راغب)

آیت ان ظالم اور بے درد پادریوں کا پول کھول رہی ہے جنھوں نے یہ جھوٹ اُچھال رکھا ہے کہ "پیروانِ محمد لوٹ مار کے شوق میں جہاد پر ٹوٹے پڑتے تھے" کیا بار بار ترغیب دلانے اور آمادہ کرنے کی ضرورت لٹیروں کو ہوا کرتی ہے؟

۲۳۹ف (اور انھیں ان کی زور آوری کے باوجود مغلوب کر دے)

قرآن مجید کی یہ پیش خبری مستقبل قریب و بعید دونوں میں پوری ہو کر رہی، مخالفین و معاندین یعنی قریش کا زور تو اسی زمانہ میں ختم ہو کر رہا، رہیں دُور دراز کی پُرقوت و پُرشوکت بادشاہتیں اور حکومتیں سو وہ رفتہ رفتہ مغلوب ہوتی گئیں۔

عَسٰی۔ پہلے بھی حاشیے گزر چکے ہیں کہ اس کلمہ کا استعمال جب اللہ تعالیٰ کے کسی قول میں ہوتا ہے تو اس میں معنی محض امید یا توقع کے بجائے وعدہ اور یقین کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

عسیٰ من اللہ واجب (ابن عباسؓ) الطماع۔ والاطماع من اللہ عزوجل واجب (قرطبی)

۲۴۰ف (دنیا و آخرت میں)

اَشَدُّ بَاْسًا۔ اس قوت و شدت کا ظہور اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔

اَشَدُّ تَنْكِيْلًا۔ اس صفتِ سزا دہی کا پورا ظہور آخرت میں ہوگا۔

۲۴۱ف یعنی جو کوئی عملِ خیر میں بطریق مشروع ساعی ہوگا اُسے اس کا اجر مل کر رہے گا کہ وہ کسی درجہ میں

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ

بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے ۲۲۴ؐ اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں بجز اس کے وہ ضرور

إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿٨٧﴾

تم (سب) کو قیامت کے دن جمع کرے گا اس میں کوئی شبہ نہیں اور کون اللہ سے بڑھ کر بات میں سچا ہے ۲۲۵ؐ

سبب بنا عملِ خیر کا ۔ ہر قسم کے مخلصانہ صلاح مشورے اس وعدہ کے تحت میں آجاتے ہیں۔

۲۲۲ؐ (اس لئے کہ وہ سبب اور ذریعہ بنا معصیت کا)

شَفَاعَةً سَيِّئَةً۔ اس کے تحت میں علاوہ عملِ بد کے وہ عملِ خیر بھی آجاتے ہیں جو غیر مشروع طریق پر کئے جائیں۔

۲۲۳ؐ تو ہر نیکی پر اجر اور ہر بدی پر عذاب کا ترتب اس کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں چھوٹے سے چھوٹے عمل پر بڑے عمل اس کی مُٹھی میں ہے۔

۲۲۴ؐ (اس لئے معاشرت کے ان جزئیات کو حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے)

سلام کے جواب میں سلام تو بہر حال واجب ہے اس کے بعد اختیار دو دیے گئے ہیں ایک یہ کہ جواب سلام سلام سے بہتر ہو دوسری یہ کہ ویسا ہی ہو۔ بہتر جن تو بعض صحابہ و تابعین کا یہ ہے کہ سلام کرنے والا اگر مسلمان ہے تو اس کا جواب زیادتی کے ساتھ دیا جائے اور اگر غیر مسلم ہے تو اس کے الفاظ دہرائے جائیں۔

ردّھا یا افضل منہا فی الزیادۃ علی اھل دینہ وملتکم اوردّھا مثل ما سلم علیکم علی غیر اھل دینکم (ابن عباس)

اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ۔ یعنی جب تمہیں سلام کیا جائے طریق مشروع پر سلام کے شرعی طریقوں کی تفصیل کتب فقہ میں ملے گی۔ تَحِيَّةٍ۔ حَيَّاكَ اللهُ کے اصل معنی تو زندگی سے خبر دینے کے ہیں، پھر دعا، زندگی کے معنی ہو گئے۔

ذلک اخبار ثم جعل دعاءً (راغب)

اہل عرب جب آپس میں ملتے تھے تو اس کلمۂ دعا کو استعمال کرتے تھے اسلام نے اسے سلام کے معنی میں کر دیا۔

فلما جاء الاسلام ابدل ذلک بالسلام فجعلوا التحیۃ اسما للاسلام (کبیر)

۲۲۵ؐ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے چھوٹے بڑے سارے ہی ارشادات سے تعلق قلب میں یقین محکم اور اذعان کامل قائم رہنا چاہئے اگر ریب و تذبذب ذرا بھی باقی رہ گیا تو عمل بلکہ عزم عمل میں بھی کوتاہی رہ جائے گی۔

اِلٰی یہ کبھی فی کے معنی میں آتا ہے اور یہاں تو اسی معنی میں ہے۔

الی بمعنی فی (جمل) المراد لیجمعنکم فی الموت (کبیر)

فِیْهِ میں ضمیر یَوْم کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور جمع کی طرف بھی۔

فی الیوم او فی الجمع۔ (بیضاوی)

معنی بہر صورت یہ ہیں کہ کوئی شبہ اس بیان کی حقیقت اور اس خبر کی صداقت میں نہیں۔

لاشک فی حقیقۃ ما اقول لکم فی ذلک واخبرکم من خبری (ابن جریر)

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ

سو تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقین کے باب میں دو گروہ ہو گئے ہو ۲۴۶ درانحالیکہ اللہ نے ان کے

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ

کرتوتوں کے باعث انھیں اُلٹا پھیر دیا ۲۴۷ کیا تم چاہتے ہو کہ انھیں راہ دکھاؤ جنھیں اللہ نے

تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ

گمراہ کر رکھا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اُن کے لئے تو ہرگز راہ نہ پائے گا ۲۴۸ یہ لوگ تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم

سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

بھی کفر کرو جیسے یہ لوگ کفر کر رہے ہیں تاکہ تم (سب) برابر ہو جاؤ ۲۴۹ سو تم ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بنانا جب تک کہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں ۲۵۰

۲۴۶ (اے مسلمانو! کہ تم میں سے بعض ان کو اب بھی مومن کہے جا رہے ہیں)
یہ آیت کس گروہِ منافقین کے باب میں ہے؟ روایتیں اس بارہ میں مختلف ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ وہ منافقین ہوں جو غزوۂ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی سیادت میں جنگ سے قبل ہی واپس چلے آئے تھے، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وہ گروہ ہو جس نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا تھا، اس کا بھی امکان ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں جو دارالحرب مکہ سے دارالہجرت مدینہ میں آئے، اپنا اسلام ظاہر کیا، مالِ تجارت لے کر مکہ گئے اور پھر واپس نہ آئے، مشرکوں میں گھل مل گئے اور دارالحرب میں رہ پڑے اور سیاقِ قرآنی کی رو سے یہی قول سب سے زیادہ قوی ہے بہرحال وہ کوئی سے بھی ہوں، تھے منافقین ہی، جو مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف شرکتِ جنگ سے جی چراتے تھے بلکہ ان کے خلاف طرح طرح کی سازشوں اور منصوبوں میں لگے رہتے تھے جیسا کہ قبل والے رکوع میں ذکر آ چکا ہے بلکہ بعض تو دارالاسلام کا قیام جو اس وقت عین علامتِ اسلام تھی، ترک کر کے دارالحرب میں جا بسے تھے۔

۲۴۷ (ان کے علانیہ کفر کی جانب)
کافر تو حقیقۃً وہ پہلے ہی سے تھے، اب ان کی جسارتیں اتنی بڑھ گئیں کہ علانیہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ ہو کر میدان میں مسلمانوں کے مقابل آ گئے۔

بِمَا كَسَبُوْا۔ یہ ان کا اکتسابی ردِّ عمل تھا کہ باوجود قدرت انھوں نے دارالاسلام کو چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت جب کہ ترک اقرارِ اسلام کی طرح یہ بھی ایک علامت کفر کی تھی۔

من ارتداد هم ولحوقهم بالمشركين (مدارك)

۲۴۸ یعنی جب انھوں نے گمراہی کا قصد کر لیا تو اللہ کا قانون تکوینی یہ ہے کہ ہر عزم فعل پر فعل پیدا کر دیا جاتا ہے، اور اسی قاعدہ کے مطابق مشیتِ تکوینی نے انھیں گمراہی میں ڈال دیا تو اب انھیں نکال کون سکتا ہے؟
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ۔ اللہ کی طرف اس اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت منافقین کے کفر اختیاری کے نتیجہ کے طور پر ہے

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا

اور اگر وہ روگردانی کریں تو انھیں پکڑو اور جہاں کہیں انھیں پاؤ انھیں قتل کرو اور ان میں سے (کسی کو) دوست

مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ

اور مددگار نہ بناؤ ۲۵۱ بجز ایسوں کے جو ان لوگوں سے جا ملتے ہیں جن کے اور تمھارے درمیان عہد

مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا

ہے ۲۵۲ یا تمھارے ہی پاس اس طرح آتے ہیں کہ ان کے سینے اس سے تنگ ہو رہے ہیں کہ تم سے لڑیں یا اپنی ہی

قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ

قوم سے لڑیں ۲۵۳ اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں تمھارے اوپر مسلط کر دیتا تو وہ تم سے ضرور لڑتے ۲۵۴

اَتُرِيْدُوْنَ ..... اللّٰهُ. کیا تم اُن کے قلوب میں زبردستی ایمان ڈال سکو گے جو سرے سے ارادہ ہی ایمان کا نہیں کرتے۔

۲۴۹ یعنی ان کے مومن ہونے کا کیا ذکر ہے، اُن کے غلو و کفر کا تو یہ حال ہے کہ اُلٹے وہ تم ہی کو اپنے رنگ میں رنگ لینے اور اپنے میں جذب کر لینے کی دُھن میں ہیں۔

۲۵۰ (اور دار الحرب کو ترک کرکے دار الاسلام میں نہ آجائیں)

اس وقت ہجرت بھی اسلام کے لئے اقرارِ شہادتین کی طرح لازمی تھی۔

لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ. یعنی اُن سے مسلمانوں کا سا برتاؤ مت رکھو کہ دوستی کے جواز کے لئے شرط ہے۔

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. یہ قید بہت ضروری تھی ورنہ یوں تجارت وغیرہ کی غرض سے تو کافر بھی دار الہجرت میں آسکتے تھے، دنیا کے قانون میں اسلام کا ثبوت ان ہی ظاہری چیزوں سے ملتا ہے رہی تصدیقِ قلب سو وہ صرف عند اللہ ہے، بندوں کے ذمہ اس کی تفتیش نہیں۔

۲۵۱ یعنی کسی حال میں کوئی علاقہ ان سے محبت کا نہ رکھو نہ حالتِ امن میں دوستی کا، نہ حالتِ خوف میں استعانت کا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا. یعنی اگر یہ ہجرت اور اسلام سے رُوگردانی رکھیں اور بدستور دار الحرب میں کافر ہی بنے رہیں۔

عن الایمان والھجرۃ (ابن عباس) عن الایمان الظاھر بالھجرۃ (بیضاوی)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ. اس لئے کہ یہ بھی مشرکین محاربین کے حکم میں داخل ہو گئے اور اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو مشرکین محاربین کے ساتھ ہوتا ہے۔

کما کان حکم سائر المشرکین۔ (مدارک)

۲۵۲ (اور اُن سے بھی جا کر ہم عہد ہو جاتے ہیں تو گویا اس طرح تمھارے بھی حلیف ہو جاتے ہیں)

حلیف کا حلیف بالواسطہ سہی اپنا ہی حلیف ہو جاتا ہے اور اسی سے مصالحت و امن حاصل ہو جاتا ہے،

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ

پس اگر وہ تمہیں چھوڑے رہیں اور تم سے قتال نہ کریں اور تمہارے ساتھ سلامت روی رکھیں تو اللہ نے ان کے

اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ

خلاف تمہارے لئے کوئی راہ نہیں رکھی ہے ۲۵۵ عنقریب کچھ لوگ اور بھی پاؤگے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی

يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا

امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں ۲۵۶ انہیں جب کبھی فساد کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو اس میں پلٹ پڑتے ہیں ۲۵۷

ایسوں کے احوال وقتل کا حکم ان کا کفر نہیں بلکہ مادۂ ضرر رسانی ہے۔

۲۵۳ یعنی نہ وہ اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑنا چاہتے ہیں بلکہ دونوں سے صلح و آشتی رکھنا چاہتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مسلمان ان کی طرف سے بھی امن میں ہیں۔ ان دونوں قسم کے منافقین کو حکم قتل واسیری سے مستثنیٰ کر کے قرآن مجید نے یہ بالکل صاف کر دیا کہ اصل مقصد مسلمانوں کو اذیت و نقصان سے محفوظ رکھنا ہے۔

۲۵۴ (لیکن اللہ نے ایسا نہیں ہونے دیا، اور تمہیں کلفت و پریشانی سے بچا لیا)

لَوْ شَاءَ اللَّهُ۔ یعنی اگر مشیت تکوینی یہ ہوتی۔

۲۵۵ یعنی ایسوں سے جنگ جائز نہیں، اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے نہ لڑیں اور ان کے ساتھ صلح و سازگاری سے رہنا چاہیں اگرچہ وہ مسلمانوں کا بھی ساتھ کافروں کے مقابلہ میں نہ دیں تو ان سے جنگ و قتال جائز نہیں۔

۲۵۶ اور ان کا یہ چاہنا مکر و خدع کی راہ سے ہے نہ اس لئے کہ ان کا دل واقعی لڑائی سے بجھ گیا اور وہ اخلاص کے ساتھ صلح و امن چاہتے ہیں، یہ وہ منافقین تھے جو اپنی عقیدۂ اسلامی کی طرح اس صلح جوئی اور مصالحت پسندی میں بھی منافقت برت رہے تھے۔

سَتَجِدُونَ میں س زمانہ مستقبل کے معنی میں بھی لیا گیا ہے اور استمرار کے معنی میں بھی۔

قیل السین للاستمرار لا للاستقبال۔ (جمل)

۲۵۷ (اور موقع پا کر مسلمانوں سے لڑنے پر بلا تامل آمادہ ہو جاتے ہیں)

الْفِتْنَةِ سے مراد کفر و شرک یا فسادِ عقائد بھی ہو سکتی ہے لیکن سیاق کھلا ہوا اشارہ قتالِ مسلمین کی جانب کر رہا ہے، فسادِ عقائد میں تو وہ پہلے ہی سے مبتلا تھے اب موقع پا جانے پر مسلمانوں پر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ای کلما دعاهم قومهم الی قتال المسلمین۔ (کبیر)

أُرْكِسُوا فِيهَا یعنی اس میں اندھا دھند اُلٹے منہ گر پڑتے ہیں، یہ ان کی شانِ کفر و بغضِ مسلمین کے اظہار کے لئے ہے۔

هذا الاستعارة لشدة اصرارهم علی الکفر وعداوة المسلمین۔ (کبیر)

گویا ان کے کفر اور بد نفسی اور عداوتِ مسلمین کا اب عملی ثبوت بھی مل جاتا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ

تو اگر یہ تمہیں چھوڑے نہ رہیں اور نہ تمہارے ساتھ سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تم سے)

فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ

روکیں تو تم بھی انہیں پکڑو اور انہیں قتل کرو جہاں کہیں بھی انہیں پاؤ، یہی لوگ تو ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو صاف

عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿٩٠﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا

ع ۱۲

گرفت دے رکھی ہے ف۲۵۸ اور یہ کسی مومن کے شایاں نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے بجز

إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے ف۲۵۹ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر ڈالے تو ایک مسلمان غلام کا

وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَّصَّدَّقُوا ۚ

آزاد کرنا (اس پر واجب ہے) اور خون بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائے گا ف۲۶۰

ف۲۵۸ یعنی ان کا حکم کھلے ہوئے محاربین کا ہے اور ان پر کھلی ہوئی گرفت ان کی بدعہدی اور عملی عداوتِ اسلام کی ہے۔

لظہور عداوتہم ووضوح کفرہم وخیانتہم (روح) لظہور عداوتہم وانکشاف حالہم فی الکفر والعدد واضرارہم باہل الاسلام۔ (بحر)

سلطان۔ یہ لفظ قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے گرفت اور دلیل ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔

قال عکرمۃ حیثما وقع السلطان فی کتاب اللہ فالمراد بہ الحجۃ (بحر)

ف۲۵۹ (خواہ وہ غلطی غصہ میں ہوئی ہو یا نفسِ عمل میں)

شرک کفر وغیرہ اعتقادی معصیتوں سے قطع نظر عملی گناہوں میں انسان کے لیے اَکْبَرُ الْکَبَائِر قتل مومن ہے اتنے بڑے گناہ کی جسارت کسی مومن سے بہ ثبات ہوش وسلامتیِ عقل بہت مستبعد ہے ہاں غلطی اور دھوکہ ہی سے ہو جائے تو اور بات ہے۔

اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا جرم قتل کی فقہاء نے دو قسمیں کی ہیں ایک قتلِ عمد جس میں آلۂ قتل سے کام لیا گیا ہو دوسرے قتل شبہ عمد جس میں کام آلۂ قتل سے نہ لیا گیا ہو جو قتل کسی حجتِ شرعی کی بناء پر مثلاً قصاص میں کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس پر جرم قتل کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔

اِلَّا خَطَأً۔ فقہاء نے قتل خطا کی دو بڑی قسمیں کی ہیں، ایک یہ کہ غلطی قصد وظن میں ہوئی مثلاً دور سے آدمی کو شکار کا جانور سمجھ لیا یا آدمی ہوتا تو پہچانا مگر مومن کے اوپر کافرِ حربی کا دھوکا ہوا، دوسرے یہ کہ غلطی نفسِ عمل میں ہو گئی مثلاً نشانہ لگایا جانور کے مگر پڑ گیا آدمی کے اوپر۔

ف۲۶۰ (جو مقتول کے شرعی وارثوں کے درمیان بہ قدر ان کے حصۂ میراث کے تقسیم ہوگا)

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

سو اس کے کہ وہ لوگ (خود ہی) اُسے معاف کر دیں ۲۶۱ؒ تو اگر وہ ایسی قوم میں ہو جو تمہاری دشمن ہے درانحالیکہ

مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

(وہ بذاتِ خود) مومن ہے تو ایک مسلم غلام کا آزاد کرنا واجب ہے ۲۶۲ؒ اور اگر ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ

تو خون بہا واجب ہے جو اس کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائے گا اور ایک مسلم غلام کا آزاد کرنا (بھی) ۲۶۳ؒ

اگر کوئی وارث نہ ہوا تو ان کا قائم مقام بیت المال قرار پائے گا۔

دِیَۃٌ۔ اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے دِیت کی مقدار سنّت سے صرف سَو اونٹ ثابت ہے امام ابو حنیفہؒ نے اس پر قیاس کر کے ایک ہزار دینارِ شرعی یا دس ہزار درہم شرعی ٹھہرا دی ہے لیکن جس طرح عراق و مصر و شام کے حالات عرب سے مختلف تھے، اسی طرح ہندستان وغیرہ کے حالات خود ان ملکوں سے مختلف ہیں اس لئے دِیت کی مقدار کو ہر ملک کے عُرف کے ماتحت قاضی کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے مگر شرط یہ ہے کہ قاضی شرعی مقدار سے کم و بیش نہ کرے البتہ مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے کہ خون بہا بالکل معاف کر دیں یا کم کر دیں۔

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔ اس کے تحت میں جس طرح غلام ہے، کنیز بھی شامل ہے۔

۲۶۱ؒ (خواہ کل، خواہ کوئی جزء)

اَنْ يَّصَّدَّقُوْا۔ خون بہا کی معافی کو لفظ تصدق سے تعبیر کرنے میں خود اشارہ اس طرف ہو گیا کہ افضل یہی ہے۔

سمّی العفو عنہا صدقۃ حثا علیہ وتنبیہا علی فضلہ (بیضاوی)

۲۶۲ؒ (اور دِیت اس موقع کے لئے نہیں)

ظاہر ہے کہ مقتول جب کافروں کے درمیان رہتا تھا تو اس کی دِیت بھی کافروں ہی کے ہاتھ میں جائے گی، اور کافر کے لئے مسلم کی میراث ممنوع ہے۔

مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ یعنی مقتول تھا تو مومن لیکن کسی سبب سے حربی کافروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ عَدُوٌّ۔ لفظاً واحد ہے لیکن معنیً یہاں جمع ہے اعداء کے مرادف۔ مومن اگر دار الحرب ہی میں رہ گیا اور ہجرت کر کے دار الاسلام میں نہ پہنچ سکا تو اس کی جان تو بہرحال اس کے اسلام کی بنا پر محفوظ بھی جائے گی اور اس کے لئے کفارہ دینا پڑے گا لیکن دِیت کا تعلق اس کے ایمان سے نہیں بلکہ اس کے مقام سے ہے اور وہ دار الاسلام ہے نہیں اس لئے یہ واجب نہ آئے گی۔

سقطت الدیۃ لوجہین احدہما ان اولیاء القتل کفار فلا یصح ان تدفع الیہم فیتقووا بہا

والثانی ان حرمۃ ھذا الذی لم یہاجر قلیلۃ (قرطبی)

۲۶۳ؒ (صلح کا یا ذمّہ کا)

فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ

پھر جس کو یہ نہ میسر ہو اس پر دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنا (واجب ہے) یہ توبہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ

اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ

بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۲۶۵ اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں

خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾

وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار رکھے گا ۲۶۶

یہاں حکم اس صورت کا بیان ہو رہا ہے کہ مقتول گو غیر مسلم ہے لیکن ایسی قوم کا فرد ہے جو مسلمانوں سے معاہدۂ صلح واتحاد کئے ہوئے یا فقہاء کی اصطلاح میں ذمّی یا مستامن ہے۔

هم اهل الذمة من اهل الكتاب (كبير عن ابن عباسؓ) هم المعاهدون من الكفار (كبير عن الحسن) هذا في الذمي والمعاهد يقتل خطأ فتجب الدية والكفارة قاله ابن عباس والشعبي والنخعي والشافعي واختاره الطبري (قرطبی)

۲۶۴ گویا کفارہ یا دیت کے لحاظ سے ذمّی اور معاہد کافر بھی ایک مسلم کے برابر حق رکھتا ہے۔

وان كان من قوم كفرة معاهدين او اهل الذمة فحكمه حكم المسلمين في وجوب الكفارة والدية (بیضاوی) ان كان المقتول ذميا فحكمه حكم المسلم وفيه دليل على ان دية الذمي كدية المسلم. (مدارک)

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ۔ یعنی اس کافر کا بھی خون بہا اس کے کافر وارثوں کو دیا جائے گا۔

۲۶۵ بس ایسے علیم کل اور حکیم مطلق کے قانون میں کسی ترمیم، کسی تنسیخ کی گنجائش کسی بندہ کو نہیں۔

تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ لفظ توبہ بہت اہم اور بلیغ ہے "ندامت، شرمساری، اصلاح کے سارے پہلو اس کے اندر آگئے، مِنَ اللّٰهِ میں اس کی تاکید و تصریح ہے کہ کفارہ اور دیت کے یہ طریقے اللہ کی طرف سے شروع ہیں، کسی بندہ کی طرف سے نہیں۔

فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ۔ یعنی جس کو باندی یا غلام کی استطاعت ہی نہ ہو اور یہ صورت اس وقت ہندوستان میں تمام تر عائد ہے جبکہ شرعی کنیز اور غلام کا وجود نہیں۔

صِيَامُ شَهۡرَيۡنِ۔ تقدیر کلام یوں ہے۔

فعليه صيام شهرين (قرطبی)

مُتَتَابِعَيۡنِ۔ ان دو مہینوں میں اگر ایک دن کا بھی ناغہ بلا عذر شرعی ہو جائے گا تو پھر سے ان دو مہینوں کا شمار پورا کرنا ہوگا۔

حتى لو افطر يوما استأنف هذا قول الجمهور۔ (قرطبی)

۲۶۶ اتنی سخت وعیدیں بجز کفر و شرک کے اور کسی جرم کی قرآن مجید میں وارد نہیں اور اسی لئے قتل مومن اشاعرہ اور معتزلہ سب کے نزدیک بالاتفاق اکبر الکبائر ہے اور یہ ڈرنے اور لرز جانے کی چیز ہے۔

مَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا۔ قتل عمد کی جو معروف اور براہ راست صورتیں ہیں وہ تو ہیں ہی لیکن

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا

اے ایمان والو! جب تم سفر کرو اللہ کی راہ میں تو خوب تحقیق کر لیا کرو ٢٦٥ اور جو تمہیں سلام

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ

کرتا ہو ٢٦٦ اُسے یہ مت کہہ دیا کرو کہ تو تو مسلمان ہی نہیں ٢٦٧

مجھے نہیں کہ اس وعید کے تحت قتل مسلم کی وہ ساری صورتیں بھی آجائیں جو کسی غیر شرعی قانون کے مطابق اور کسی کافرانہ آئین ونظام کے تحت کی جاتی ہیں، مثلاً کسی کافر حکومت کی فوج یا پولیس میں داخل ہو کر اس حکومت کے باغی اور مجرم مسلمان پر گولی چلا دینا یا کسی غیر اسلامی عدالت کی کرسی پر مجسٹریٹ یا جج کی حیثیت سے بیٹھ کر کسی مسلمان کو سزائے موت کا حکم سنا دینا وقس علیٰ ہذا۔
مُتَعَمِّدًا۔ تعمد کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ مقتول کے ایمان ہی کی بنا پر اُسے قتل کیا جائے، یہ صورت تو صاف کفر کی ہے، دوسری یہ کہ قتل مسلم کو جائز سمجھ کر، یہ صورت بھی کفر ہی کی ہوئی۔

ای قاصدا قتله لایمانه وهو کفر او قتله مستحلا لقتله وهو کفر ایضا۔ (مدارک)

فَجَزَآؤُهٗ۔ آگے سزا ایسے قاتل کی مذکور ہو رہی ہے جو اس قتل کو جائز سمجھے یا بلا توبہ مر جائے۔

والجمهور علی انه مخصوص بمن لم یتب (بیضاوی) وهو عندنا مخصوص بالمستحل له (بیضاوی)

پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ نوعیت جرم کی شدت کے لحاظ سے اصل سزا یہی ہے جو یہاں مذکور ہوئی، لیکن یہ لازمی نہیں کہ ہر مومن کو بھی انتہائی سزا مل کر ہی رہے، اور یہ تفسیر حدیث نبویؐ سے ماخوذ اور اسی پر مبنی ہے، دنیوی قانون میں بھی جرائم کی ایک انتہائی سزا مقرر ہوتی ہے، لیکن یہ حاکم کی رائے تمیزی پر ہوگا کہ اس حد کے اندر جتنی سزا مناسب سمجھے دے۔

معناه هی جزاؤه ان جازاه ولکنه ان شاء عذبه وان شاء عفا عنه بکرمه يغفر لمن يشاء (معالم) قال عليه السلام هی جزاؤه ان جازاه (مدارک)

جمہور اہل سنت کا مذہب ہے کہ قاتل اگر مسلم ہے تو اس کی توبہ بھی بالآخر قبول ہو جائے گی اور خلود فی النار کی سزا صرف کافروں ومشرکوں کے لئے رہ جائے گی، اس عقیدہ کے دلائل کتاب وسنت سے ماخوذ کلام وعقائد کی کتابوں میں اپنی جگہ پر مبسوط درج ملیں گے۔

٢٦٧ (ہر امر کی اور خصوصاً قتل کے باب میں)
یہ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ جب تم وطن سے باہر سفر جہاد میں ہو تو بلا خوب چھان بین کئے محض شک شبہ کی بنا پر قتل میں جلد بازی نہ کر دیا کرو۔

فَتَبَيَّنُوْا۔ خوب سوچ بچار لو، ایسا نہ ہو کہ کافر کے خیال میں کسی کلمہ گو کو قتل کر ڈالو۔

فتفحصوا اعنی بینوا لکی المؤمن من الکافر ... المقصود من هذه الآیة المبالغة فی تحریم قتل المؤمنین (کبیر)

یہ تحقیق واحتیاط سفر وحضر ہر حال میں واجب ہے، سفر جہاد کی قید آیت میں صرف اس لئے ہے کہ نزول آیت سے قبل ایسا واقعہ اتفاق سے سفر جہاد ہی میں پیش آیا تھا۔

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ

تم دنیوی زندگی کا سامان تلاش کرتے ہو تو اللہ کے پاس تو (بہت) کثرت سے مالِ غنیمت ہے ؎۲۷۰

والتبیین ای التثبت فی القتل واجب حضرا وسفرا لاخلاف فیه وانما خص السفر بالذکر لان الحادثة التی فیها نزلت الآیة وقعت فی السفر۔ (قرطبی)

احادیثِ نبوی میں یہ مضامین بار بار آئے ہیں کہ ایک کلمہ گو کا قتل ہو جانا اللہ کے ہاں ہزار کافروں کے زندہ بچ جانے سے، بلکہ ساری دنیا کے فنا ہو جانے سے شدید تر ہے۔

فان ابقاء الف کافر اهون عند الله من قتل امرئ مسلم (بیضاوی) وفی الحدیث زوال الدنیا اهون علی الله من قتل امرئ مسلم (کشاف)

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ یعنی راہِ جہاد میں۔

ای خرجتم فی الجهاد۔ (ابن عباسؓ)

؎۲۶۸ (مسلمانوں کے طریقہ پر یا اور کسی ایسی ہی علامت سے اپنے اسلام کا اظہار کر رہا ہو۔)

؎۲۶۹ (بلکہ محض جان بچانے کو اظہارِ اسلام کر رہا ہے)

مقصد یہ ہے کہ قتل سے دست کشی اس شخص کے مجرد اظہارِ اسلام سے واجب ہو جاتی ہے اس کے باطن کی تفتیش ہرگز تمہارے ذمہ نہیں۔ فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جان و مال کو محفوظ کر دینے والی شے کلمۂ شہادت ہے کافر غیر معاہد بھی اگر اُسے پڑھ دے گا تو مسلم کے لئے اس پر تلوار اُٹھانا حرام ہو جائے گی۔

المسلم اذا لقی الکافر ولا عهد له جاز له قتله فان قال لا اله الا الله لم یجز قتله لانه قد اعتصم بعصام الاسلام المانع من دمه وماله واهله (قرطبی)

آیت سے بعض فرقوں نے استدلال یہ کیا ہے کہ ایمان مجرّد قول کا نام ہے لیکن اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ ایمان فقط اقرارِ لسانی کا نام نہیں اور زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے بلکہ ایمان کی حقیقت میں تصدیقِ قلب بھی شامل ہے، البتہ بندوں کے پاس علم کا کوئی ذریعہ بجز لفظ و قول کے نہیں۔

استدل بهذه الآیة من قال ان الایمان هو القول۔ ولیس فی ذالک ان الایمان هو الاقرار فقط الا تری ان المنافقین کانوا یقولون هذا القول ولیسوا بمؤمنین فثبت ان الایمان هو الاقرار وغیره وان حقیقته التصدیق بالقلب ولکن لیس للعبد طریق الیه الا ما سمع منه فقط (قرطبی)

؎۲۷۰ یعنی اگر مالِ غنیمت کی طمع تمہیں ایک مدعیٔ اسلام کے قتل میں جلد بازی اور بے احتیاطی کی طرف لا رہی ہے تو یہ یاد رکھو کہ مال اور مالِ غنیمت کا سرچشمہ بھی تو اللہ ہی کی ذات ہے اور وہ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہیں اس کی بڑی سے بڑی مقدار قانونِ شریعت کے اتباع ہی سے دے۔

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ عرض وہ چیز ہے جو بذات خود قائم نہ رہ سکے اور اسی لئے متکلمین نے جوہر کے مقابل کی اصطلاح رکھی ہے۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

ایسے ہی تم بھی تو پہلے تھے ۲۷۱؎ پھر اللہ نے تم پر کرم کیا ۲۷۲؎ تو (خوب) تحقیق کرلیا کرو بے شک تم

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خوب خبر رکھتا ہے ۲۷۳؎

العرض مالا یکون له ثبات ومنه استعار المتکلمون العرض لما لاثبات له الا بالجوهر (راغب)

یہاں عرض سے مُراد مال ہے اور بجائے مال کے عرض اسی لئے لایا گیا ہے کہ اس سے مال کی بے ثباتی اور زُود فنائی کی جانب بھی پورا اشارہ ہو جائے۔

ثم نبّه تعالٰی بتسمیته عرضا علی کونه سریع الفناء قریب الفرض والمال سمّی به لسرعة فنائه (مدارک) (الانتصاف)

۲۷۱؎ یہ نو مسلم صحابیوں اور دوسروں کو یاد دلایا ہے کہ آخر تمہارے اوپر بھی تو یہ دور گزر چکا ہے کہ تمہارے پاس تمہارے (کبیر) اسلام و ایمان کا ثبوت بجز تلفظِ کلمہ اور زبانی دعوے کے اور تھا کیا؟ تمہارے اخلاصِ قلب اور تمہارے حسنِ اعمال کی شہادت تو بہت بعد کو پیش ہوئی۔

اوّل ما دخلتم فی الاسلام سمعت من افواهکم کلمة الشهادة فحصنت دماءکم واموالکم من غیر انتظار الاطلاع علی مواطاة قلوبکم لألسنتکم۔ (کشاف)

۲۷۲؎ (کہ تمہارے اس اسلام اور دعوے کو کافی سمجھ لیا گیا اور تمہارے ایمان کو معتبر قرار دینے کے لیے تفتیشِ باطن کا حکم نہیں دیا)

فعلیکم بان تفعلوا بالداخلین فی الاسلام کما فعل بکم وان تعتبروا ظاهر القول۔ هذا هو الذی اختاره اکثر المفسرین (کبیر)

دوسری صورت اللہ کے فضل و کرم کی یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ کہ اس نے تمہارے اس ابتدائی اسلام کو اب مشہور و معلوم کرادیا اور تمہیں استقامت اور حسنِ عمل کی توفیق دی۔

بالاشتهار بالایمان والاستقامة فی الدین (بیضاوی) حیث قوّی نور الایمان فی قلوبکم واعانکم علی العمل به والمحبة له (کبیر) بالاستقامة والاشتهار بالایمان (مدارک)

۲۷۳؎ (سو اگر تم نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اس کے ساتھ تمہارا کون سا عذر چل سکے گا)

فَتَبَيَّنُوْا۔ تحقیق و احتیاط کے لیے یہ تکرار دعوت یا اہتمامِ حکم کی غرض سے۔

اعادة الامر بالتبیین تدل علی المبالغة فی التاکید من ذلك الفعل (کبیر) کرر الامر بالتبیین لیؤکد علیهم (مدارک) اعاد الامر بالتبیین للتاکید۔ (قرطبی)

ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ آیا زندیق کی توبہ قبول ہوگی؟ فقہاء نے اس آیت کی رُو سے جواب دیا ہے کہ قبول ہوگی۔

اختلفوا فی ان توبة الزندیق هل تقبل ام لا فالفقهاء قبلوها واحتجوا علیه بوجوه الاوّل هذه الآیة (کبیر)

امام ابوحنیفہؒ نے اس آیت سے استدلال کرکے فرمایا ہے کہ بچوں کا اسلام بھی قبول ہوگا، اس لئے کہ آیت عام

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ

مسلمانوں میں سے بلاعذر (گھر) بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد

الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ

کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے ۲۷۴

ہے، بالغ اور نابالغ کی اس میں کوئی قید نہیں۔

قال ابو حنيفة دلت هذه الآية على صحة اسلام الصبي لان قوله ولا تقولوا لمن القى اليكم السلام لست مؤمنا عام في حق الصبي وفي حق البالغ (جصاص)

بلکہ منافقین خود بھی جو اپنے جان و مال کو مسلمانوں سے بچائے ہوئے تھے، وہ کلمۂ اسلام کے تلفظ ہی کی بنا پر تو تھا، درانحالیکہ عند اللہ ان کا کفر بالکل ظاہر تھا اور رسول اللہ پر بھی اکثر صورتوں میں روشن ہو گیا تھا۔

وقد كان المنافقون يعصمون دماءهم واموالهم باظهار هذه الكلمة مع علم الله تعالى باعتقادهم الكفر وعلم النبي صلعم بنفاق كثير منهم (جصاص)

۲۷۴ (اللہ کے ہاں درجہ اور مرتبہ میں)

اُولِي الضَّرَرِ کے لفظی معنی تو ہوئے ”دکھ والے“، لیکن یہاں ضرر مرض سے کہیں زیادہ وسیع معنی میں ہے اور ہر قسم کے عذر و مانع کو شامل ہے اور اہل الضرر اہل الاعذار کے مرادف ہے۔

قال العلماء اهل الضرر هم اهل الاعذار (قرطبي) الضرر النقصان سواء كان بالعمى او العرج او المرض او كان بسبب عدم الأهبة (كبير)

الْقٰعِدُوْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ کی تقدیر کلام یوں ہے۔

القاعدون الذين هم غير اولي الضرر (قرطبي)

مطلب صاف: اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے والے اور بلاعذر گھر میں بیٹھ رہنے والے اللہ کے ہاں فضیلت و مقبولیت میں برابر نہیں ہو سکتے۔

یہیں سے یہ مطلب بھی صاف ہو گیا کہ جہاد فرض عین نہیں، فرض کفایہ ہے، اگر فرض عین ہوتا یعنی ہر ہر فرد پر فرض ہوتا تو ان بیٹھ رہنے والوں اور نہ شریک ہونے والوں پر یقیناً عتاب و وعید کے الفاظ وارد ہوتے رہتے۔

فيه دلالة على ان الجهاد ليس بفرض عين بل هو فرض كفاية (ابن كثير) قال الفقهاء فيه دليل على ان فرض الجهاد على الكفاية وليس على كل احد بعينه (كبير) وهذا يدل على ان فرض الجهاد على الكفاية وليس على كل احد بعينه (جصاص)

فرقۂ شیعہ نے آیت سے استدلال یہ کیا ہے کہ حضرت علیؓ کی افضلیت حضرت ابوبکرؓ پر ظاہر ہو رہی ہے، اس لئے کہ حضرت علیؓ نے جہاد و قتال حضرت ابوبکرؓ سے کہیں زیادہ کیا ہے اور اس کو آیت میں معیار فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ استدلال باطل ہے، اگر مطلق قتل کفار ہی معیار فضیلت ہوتا تو بقول امام رازیؒ حضرت علیؓ خود رسول اللہ صلعم سے بھی افضل و اشرف ہوتے حالانکہ اس کے قائل

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ

اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں فضیلت دے رکھی ہے

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

اور بھلائی کا وعدہ تو اللہ نے سب (ہی) سے کر رکھا ہے ۲۷۵ اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم کے لحاظ

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

سے برتری دے رکھی ہے ۲۷۶ یعنی اللہ کی طرف سے (بہت سے) درجے اور بخشش اور رحمت اور اللہ ہے ہی بڑا بخشش والا بڑا رحمت والا ۲۷۷

ع ۱۳ ۵ ۱۰

شبہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ افضلیت کلی کے اجزاء اور بھی متعدد ہیں مثلاً تبلیغ دین میں مصروفیت (اقامت احکام و استحکام ملت میں مشغولیت وغیرہا) اور ان سارے امور میں حضرت صدیقؓ ٹھیک اپنے آقا و سردار کے نقش قدم پر چلنے والے تھے چنانچہ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے جلیل القدر صحابی بڑی تعداد میں آپ ہی کی سعی و تبلیغ سے ایمان لائے اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کے مجاہدانہ جوہر مدینہ میں آکر چمکے جب اسلام کو گو نہ غلبہ حاصل ہو چکا تھا، برخلاف اس کے ابوبکر صدیقؓ نے دین کی گراں بہا خدمتیں اس وقت سے انجام دینا شروع کر دی تھیں جب ملت غایت ضعف و پستی میں تھی اور امت ہر طرف سے زغہ اعداء میں محصور تھی۔

۲۷۵ (مجاہدین سے ان کے جہاد کی بنا پر اور قاعدین سے ان کے دوسرے اعمال حسنہ کی بنا پر)

كُلًّا یعنی مجاہدین اور قاعدین دونوں سے۔

(ای کل فریق من القاعدین والمجاھدین۔ (قرطبی)

اَلْحُسْنٰى۔ یعنی جنت اور آخرت کی نعمتیں۔

المثوبۃ الحسنی وھی الجنۃ (بیضاوی) الجنۃ والجزاء الجزیل۔ (ابن کثیر)

اَلْمُجٰهِدِيْنَ وَالْقٰعِدِيْنَ۔ دونوں لفظوں میں جہاد اور قعود کے عموم مفہوم کو پیش نظر رکھنا چاہیے، بیان یقیناً میدان جہاد میں جانے والوں اور میدان جنگ سے رہ جانے والوں کا ہے لیکن لفظ جہاد کو قتال کے معنی میں مخصوص و محدود کر دینا صحیح نہیں بلکہ نصرت دین کی ہر سعی و فکر اس کے اندر آجاتی ہے جس کی ایک فرد یقیناً قتال بھی ہے (وعلی ھذا) قعود یا خانہ نشینی کے تحت میں ہر امر شریعت میں سستی آجاتی ہے اور اسی کی ایک اہم فرد قتال سے جی چرانا بھی ہے گویا فضیلت دین کے ہر کام کرنے والے کو نہ کرنے والے پر حاصل ہے اور اس کا تو یہ شبہ مٹ گیا کہ لشکر قتال کا ایک ایک سپاہی ہر غیر مقاتل سے افضل ہے خواہ وہ غیر مقاتل کسی پایہ و مرتبہ کا محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، صوفی وغیرہ خادم دین ہو۔

۲۷۶ اہل لطائف نے یہاں یہ نکتہ لکھا ہے کہ اَلْمُجٰهِدُوْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (جان و مال سے جہاد کرنے والوں) کا ذکر تو اوپر آچکا ہے اب یہاں ذکر مطلق مجاہدین کا بغیر کسی قید کے ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا رخ تمام تر غیر اللہ سے اللہ کی طرف پھیر لیں اور یہ مجاہدات صوفیہ کا اعلیٰ مقام ہے۔

وجب ان یکون المراد منہ من کان مجاھدا اعلی الاطلاق فی کل الامور وھو اشرف انواع المجاھدۃ

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ

بے شک ان لوگوں کی جان جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے (جب) فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ

كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ

تم کس کام میں تھے ۲۷۸ وہ بولیں گے ہم اس ملک میں بے بس تھے ۲۷۹

وحاصل هذه ... وصرف العمل من ... الى عبادته اى الاستغراق في طاعة الله (كبير).

۲۷۷ چنانچہ شانِ غفوریت کے تقاضہ سے وہ ان کا ہر عذر قبول کرے گا اور شانِ رحیمیت کے تقاضہ سے انھیں اجر مزید عنایت کرے گا۔

۲۷۸ یعنی دار الکفر دار الحرب میں رہ کر دین کے کن کن کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ ہجرت کو نہ نکلے؟ یہ تعریض ہے اُن کے ہجرت نہ کرنے پر اور دار الحرب میں رہنے پر قانع و راضی ہو جانے پر۔

التوبيخ بانهم لم يكونوا في شيء من الدين حيث قدروا على المهاجرة ولم يهاجروا۔ (كبير)

یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ اقرارِ اسلام کر چکے تھے لیکن جب ہجرت فرض ہوئی تو یہ مسلمانوں کے ساتھ نہ آئے، مکہ ہی میں رہ گئے، یہاں تک کہ پھر مشرکین کا ساتھ دینے لگے۔

المراد بالجماعة من اهل مكة كانوا قد اسلموا واظهروا للنبي صلعم الايمان به فلما هاجر اقاموا مع قومهم وفتن منهم جماعة فافتتنوا (قرطبي) نزلت في اقوام من اهل مكة كانوا قد اسلموا وآمنوا بالله وبرسوله وتخلفوا عن الهجرة مع رسول الله صلعم حين هاجر وعرض بعضهم على الفتنة فافتتن (ابن جرير) نزلت في قوم من المنافقين كانوا يظهرون الايمان للمؤمنين خوفا فاذا رجعوا الى قومهم اظهروا لهم الكفر ولا يهاجرون الى المدينة (جصاص)

یہ عتاب خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہجرت اس وقت فرضِ عین تھی۔

هذا يدل على فرض الهجرة في ذلك الوقت (جصاص)

فتحِ مکہ کے بعد ہجرت واجب نہ رہی، حدیثِ نبوی میں ارشاد ہوا ہے: "لا هجرة بعد الفتح"۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ہجرت کا وجوب اس وقت اس لئے تھا کہ منکرین کی ایذا اور مزاحمت سے محفوظ رہ کر مسلمان حکومتِ الٰہی کے اندر رہیں اور قانونِ الٰہی کا نفاذ اپنے ہاں کر سکیں، جب لشکرِ اسلام کو کافی قوت حاصل ہو گئی اور منکرین کی مزاحمت کا زور ٹوٹ گیا تو ہجرت بھی واجب نہ رہی، لیکن پھر بھی کہیں اور جب بھی وہی وجوہِ ہجرت پائے جانے لگیں گے ہجرت واجب ہو جائے گی۔

الْمَلَائِكَةُ۔ صیغۂ جمع ہے، مراد ہیں ملک الموت اور ان کے انصار۔

المراد ملك الموت واعوانه۔ (بحر)

لیکن جمہور کا قول یہ ہے کہ تنہا ملک الموت مراد ہے اور صیغۂ جمع ان کے لئے ان کی عظمت کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ

(فرشتے) کہیں گے کہ اللہ کی سر زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ

ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے ٢٨٠ بجز اُن لوگوں کے جو مردوں اور عورتوں

الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

بچوں میں سے کمزور ہوں (کہ) نہ کوئی تدبیر ہی کر سکتے ہوں اور نہ کوئی راہ پاتے

سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾

ہوں ٢٨١ تو یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا اور اللہ تو ہے ہی بڑا معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا ٢٨٢

الملٰئكة هنا قيل ملك الموت هو من باب اطلاق الجمع على الواحد تعظيما له وتعظيما لشانه هذا قول الجمهور (بحر)

اور واحد پر لفظ جمع کا اطلاق محاورۂ عرب میں عام ہے۔

والعرب قد تخاطب الواحد بلفظ الجمع. (معالم)

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اب تک ذکر جہاد کا تھا جس کا خلاصہ ہے شرِ کفار کا دفع عام اب ذکر ہجرت کا شروع ہو رہا ہے جس کا ماحصل ہے شرِ کفار کا دفع خاص، پہلا حکم اجتماعی تھا، اور یہ دوسرا انفرادی ہے، دونوں میں غرض مشترک اقامتِ دین ہے۔

٢٧٩ یعنی ہم اپنے ملک میں محض مغلوب اور بے بس تھے، احکامِ دین پر عمل کرنا ہمارے بس میں نہ تھا، اس لئے ترکِ فرائض میں معذور رہے۔

٢٨٠ فقہا نے لکھا ہے کہ جب ایک ملک میں رہ کر فرائض دین پوری طرح نہ ادا ہو سکتے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک ہے جہاں فرائض دین ادا ہو سکتے ہیں تو پہلے سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔

والآية تدل على ان من لم يتمكن اقامة دينه فى بلده كما يجب وعلم انه يتمكن من اقامته فى غيره حقت عليه المهاجرة (مدارك) هذا يدل على الخروج من ارض الشرك الى اى ارض كانت من ارض الاسلام (جصاص)

٢٨١ یعنی ایسے لوگ جو فی الواقع اپنے ضعفِ جسمانی کی بنا پر نہ سفرِ ہجرت پر قادر ہیں اور نہ کسی دار الاسلام کا پتہ نشان انہیں ملا ہو

اى لايجدون اسباب الهجرة ومباديها ولايعرفون طريق الموضع المهاجر اليه (روح)

حِیْلَةً۔ عربی میں تدبیر کے لئے عام ہے، اردو کے "بہانہ" کے مرادف نہیں۔

٢٨٢ عفو کا تعلق ماضی سے ہے اور غفر کا مستقبل سے یعنی ان کی پچھلی کوتاہیوں کو معاف کر دینے والا ہے اور آیندہ ان کے حق میں مغفرت کرنے والا ہے۔

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین پر جانے کی بہت جگہ اور گنجائش پائے گا ۲۸۳

وَسَعَةً ۚ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ

اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کرتا ہوا نکلے اور اسے پھر موت

يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٠٠﴾

آ لے ۲۸۴ تو اس کا اجر یقیناً اللہ کے ذمہ ثابت رہا۔ اور اللہ تو ہے ہی بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ۲۸۵

أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ۔ یعنی ان سے یہ فریضۂ ہجرت سرے سے ساقط ہی کر دیا جائے۔
عَسَى اللَّهُ۔ عسیٰ سے متعلق اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ جب اس کے فعل کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے تو مراد
محض توقع یا امید نہیں رہ جاتی ہے بلکہ تیقن پیدا ہو جاتا ہے۔

وعسى ان كان للاطماع فهو من الله واجب (مدارک)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ عدم ہجرت کا گناہ فی الاصل اس قدر سخت ہے کہ عَفُوًّا لا کر ادھر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ
باوجود عذر موجود ہونے اور اس لئے گناہ نہ ہونے کے مشابہ اس کے ہے کہ گناہ ہوا، اگرچہ معاف بھی کر دیا ہے۔

۲۸۳ (اقامتِ دین اور اظہارِ کلمۂ حق کے لئے)
یعنی کوئی ہجرت کر کے دیکھے تو، اللہ کی زمین تنگ نہیں۔ اس زمین پر بڑے متعدد جگہیں مل جائیں گی جہاں
وہ آزادی سے اپنے دین کا اظہار کر سکے گا۔ بعض اہلِ لطائف نے کہا کہ مُراغماً اور سعۃً دو الگ الگ لفظ لانے
میں اشارہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اظہارِ دین کی جگہیں مل جائیں گی اور آخرت میں فراخ اور وسیع بہشتیں ملیں گی۔

۲۸۴ (قبل اس کے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود یا ہجرت گاہ تک پہنچ سکے اور اس لئے گو بظاہر ناکام رہے)
فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر ایسی مجبوری جو انسان کو عاجز و بے بس کر دے موت ہی کے حکم میں داخل ہے۔
مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ یعنی ایسے مقام کی طرف چلے جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کا اظہار کر سکے۔

اى الى حيث امر الله ورسوله (مدارک)

محققین نے لکھا ہے کہ ہر ایسا سفر جو رضاءِ الٰہی کے لئے ہو مثلاً سفرِ حج، یا طلبِ علمِ دین کے لئے سفر،
اجر کے لحاظ سے سفرِ ہجرت کے حکم میں داخل ہے۔

فالواكل هجرة لطلب علم او حج او جهاد او فرار الى بلد يزداد فيه طاعة او قناعة او

زهدا او ابتغاء رزق طيب فهي هجرة الى الله ورسوله (مدارک)

۲۸۵ (تو اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اس ناکامی پر بھی پورا وہی اجر دیدے جو کامیابی پر موعود تھا)

هذا يدل على ان من خرج متوجها لفعل شئ من القرب ان الله يجازيه بقدر نيته وسعيه وان انقطع دونه
(جصاص)

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کر دیا کرو

مِنَ الصَّلٰوۃِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر لوگ تمہیں ستائیں گے ۲۸۶ؑ

۲۸۶ؑ یہ آخر کا فقرہ جیسا کہ شارع علیہ السلام کا عمل اس پر گواہ ہے اور سارے اہل علم بجز خوارج کے اس پر متفق ہیں بطور شرط کے نہیں کہ صرف اسی حالت میں نماز قصر کی جائے بلکہ اس فقرہ میں نزول آیت کے وقت کی صرف حالتِ واقعی کا بیان ہے ورنہ قصرِ صلوٰۃ کا حکم ہر سفر کے لئے عام ہے خواہ موقع خوف کا ہو یا نہ ہو۔

والخوف شرط جواز القصر عند الخوارج لظاهر النص وعند الجمهور ليس بشرط (مدارك) والذي عليه الائمة ان القصر المشروع في الامن ايضا وقد تظاهرت الاخبار على ذلك (روح)

اذا ضربتم فی الارض۔ ضرب فی الارض، سے مراد سفر ہوتا ہے۔

الضرب في الارض عبارة عن السفر (المنار) الضرب في الارض الذهاب فيها (راغب)

اور یہ لفظ عام ہے ہر نوع سفر کے لئے، خواہ وہ دینی ہو مثلاً جہاد کے لئے خواہ محض دنیوی ہو تجارت یا سیاحت کے لئے۔

هذا اعم في رخصة لكل مسافر (المنار)

رہا یہ کہ سفر کتنی دور کا ہو جس پر سفرِ شرعی کا اطلاق ہو سکے گا تو قرآن مجید اور سنت صحیح اس کے جواب سے خاموش ہیں فقہاء نے مختلف اندازے اور تخمینے قرار دیئے ہیں، حنفیہ کے ہاں مسافت تین منزل کی ہونی چاہیے اور شافعیہ و مالکیہ کے ہاں دو منزل کی، اور منزل کا اندازہ بیس میل کا ہے، مسافت سے متعلق اور بھی بہت سے قول نقل ہوئے ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک ایسے اقوال بیس سے بھی زائد ہیں۔

وفي فتح الباري ان ابن المنذر وغيره نقلوا في المسئلة اكثر من عشرين قولا (المنار)

جمہور فقہاء کا قول ہے کہ سفر جس جائز غرض و مقصد سے بھی ہو شرعی سفر کے حکم میں داخل ہے۔

الجمهور على جواز القصر في السفر المباح كالتجارة ونحوها (قرطبی)

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ یعنی بادی النظر میں رکعات نماز میں کمی کر دینا ایک گناہ کی چیز معلوم ہوتی ہے اور وسوسہ تمہیں بھی گناہ کا ضرور ہو رہا ہے لیکن اطمینان رکھو کہ اس میں مضائقہ نہیں اللہ کی طرف سے یہ جائز کیا جا رہا ہے۔

الصَّلٰوۃ۔ صلوٰۃ (نماز) سے مراد صلوٰۃ مکتوب یا نماز فرض ہے حنفیہ کے ہاں سفر میں نماز قصر مستحب ہی نہیں واجب ہے

ان القصر عزيمة غير رخصة ولا يجوز الاكمال (مدارك) روي عن جماعة انه فرض وهو قول عمر بن عبد العزيز والكوفيين والقاضي اسمعيل وحماد بن ابي سليمان (قرطبی)

اور یہ قصر چار رکعتوں والی تینوں نمازوں میں ہوتا ہے ظہر، عصر، عشاء میں فرض کی دو دو رکعتیں رہ جاتی ہیں، مسائلِ قصر کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَأَقَمْتَ

بے شک کافر تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہی ہیں . اور جب آپ ان کے درمیان ہوں اور ان کے لیے

لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا أَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَإِذَا

نماز قائم کریں تو چاہیے کہ ان میں کا ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لئے رہیں ۲۸۷

سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۖ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا

پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو اب چاہیے کہ وہ تم لوگوں کے پیچھے ہو جائیں اور وہ دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے

فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ

آجائیں اور وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار (ساتھ) لئے رہیں ۲۸۸

فِی الْاَرْضِ سے مراد یہ نہیں کہ سفر صرف خشکی ہی میں ہو بلکہ اَرض کا لفظ بر و بحر کے لئے عام و مشترک ہے اور مقصد یہ ہے کہ کوئی سا بھی سفر ہو۔

المراد من الارض ما یشمل البر والبحر والمقصود التعمیم ای اذا سافرتم فی ای مکان یسافر فیه من بر و بحر (روح)

۲۸۷ یعنی حالتِ نماز میں بھی مسلح رہیں.

إِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ صیغۂ واحد حاضر ہے محض رسول اللہ ہی مراد نہیں آپ ہوں یا آپ کا کوئی قائم مقام۔

قال الائمة نوّاب عن رسول اللّٰه صلعم فی کل عصر (مدارک) هذه الآیه خطاب للنبی صلعم وهو یتناول الامراء الی یوم القیمة هذا قول کافة العلماء (قرطبی)

فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ ۔ یعنی جب وقت نماز آجانے پر آپ میدان جنگ میں امامتِ نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اندیشہ ہو کہ دشمن موقع پاکر حملہ کر دے گا۔

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ ۔ یعنی ایسے موقع پر چاہیے کہ سپاہ کے دو گروہ ہو جائیں، کچھ لوگ تو نماز شروع کر دیں اور کچھ لوگ نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابل کھڑے ہو جائیں، یہ سب بیان صلٰوۃ الخوف کا ہو رہا ہے۔ پوری تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۸۸ فقہاء نے یہاں سے یہ استنباط کیا ہے کہ عین عبادتِ مخصوص کی حالت میں بھی اسبابِ انتظام پر نظر رکھنا اولیٰ ہے

فَإِذَا سَجَدُوْا ۔ یعنی پہلا گروہ ایک رکعت تمام کرلے۔

فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۔ یعنی پہلے گروہ والے تمہارے پاس سے ہٹ کر دشمن کے مقابلے میں آجائیں۔

وَلْتَأْتِ ..... لَمْ يُصَلُّوْا ۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے ابھی نماز شروع بھی نہیں کی ہے اور ابھی تک وہ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے، وہ اب پہلے گروہ کی جگہ پر آجائیں۔

فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ ۔ یعنی نماز کی جو رکعت ابھی امام کے لئے باقی ہے اس میں یہ آکر اُس کے شریک ہو جائیں۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ

کافروں کی تو خواہش ہی یہ ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو یہ لوگ

عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى

تمہارے اوپر یک بارگی ہی ٹوٹ پڑیں ۲۸۹؎ اور تمہارے لئے اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش سے

مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ

تکلیف ہو رہی ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار رکھو۔ اور اپنے بچاؤ کا سامان لئے رہو ۲۹۰؎

اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٠٢﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا

بے شک اللہ نے کافروں کے لئے ایک رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پھر جب تم (اس) نماز کو ادا کر چکو تو

اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ

اللہ کی یاد میں لگ جانا کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ۲۹۱؎ اور پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کی اقامت کرو ۲۹۲؎

۲۸۹؎ کیا ٹھکانا ہے ہماری شریعت کی پیدا کی ہوئی اس چستی، مستعدی، جز رسی اور ہمہ وقتی بیداری کا، دشمن سامنے ہے قتل و خون کا بازار گرم ہے جان کا سودا ہو رہا ہے عین اس وقت نماز بھی ہو جائے اور ہتھیار بھی برابر ساتھ رہیں، سستی، کاہلی، غفلت، آرام طلبی کہیں شریعت اسلامی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟

۲۹۰؎ نمازِ خوف کی جو صورتیں یہاں ارشاد ہوئی ہیں وہ سب اس فرض کے لئے ہیں جب سب سپاہی ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں اور حضور صلعم کی موجودگی میں سب کا آپ ہی کے پیچھے پڑھنے پر حریص ہونا بالکل قدرتی تھا جب امام ہی دو یا زائد ہوں تو پھر ان انتظامات کی ضرورت ہی نہیں رہتی فقہائے لکھا ہے کہ خوف کی بھی دو حالتیں ہیں اور دونوں کے حکم الگ الگ ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ عین معرکۂ قتال گرم ہو اور جماعت کا اہتمام ہی سرے سے نہ بن پڑے ایسی حالت میں نماز جماعت سے ادا کی جائے گی اور اس کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۲۳۹ میں موجود ہے شدتِ خوف کی حالت میں نماز الگ الگ پڑھی جائے گی سوار یا پیادہ ہر حال میں جائز ہے رکوع و سجدہ کے لئے اشارہ کافی ہے استقبال قبلہ بھی ضروری نہ رہے گا۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہو تو میدان جنگ میں لیکن قتال ابھی شروع نہ ہوا ہو اور نماز باجماعت کا موقع ہو جیسا کہ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ سے اشارہ ہو رہا ہے اس آیت میں جن انتظامات کی ہدایت ہوئی ہے وہ اسی صورت سے متعلق ہے۔

۲۹۱؎ (غرض ہر صورتِ حال کے مناسب)

علٰی ای حال کنتم (قرطبی)

عَلٰی جُنُوْبِكُمْ کے لفظی معنی ہیں اپنے پہلوؤں پر یا اپنی کروٹوں پر، اردو محاورہ میں مراد لیٹنے سے ہے۔

إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾ وَلَا تَهِنُوا فِي

بے شک نماز تو ایمان والوں پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض ہے ۲۹۳ اور (مخالف) قوم

ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ

کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو ۲۹۴ اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو وہ بھی تو دکھ اٹھائے ہوئے ہیں جیسے تم دکھ اٹھائے

وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾

ہوئے ہو، اور تم اللہ سے وہ امید لگائے ہوئے ہو جو وہ نہیں رکھتے ۲۹۵ اور اللہ تو ہے ہی بڑا علم والا بڑا حکمت والا ۲۹۶

فَاذْكُرُوا اللَّهَ مطلب یہ ہوا کہ تخفیف نماز میں تو یہ ہو گئی، باقی ذکر الٰہی میں کوئی تخفیف نہیں اور اسی لئے ہے یہاں تک کہ عین قتال کے وقت بھی ذکر الٰہی دل سے تو جاری ہی رہ سکتا ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ احکام شریعت کا اتباع بجائے خود ذکر الٰہی ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَوٰةَ۔ الصَّلوٰۃ سے یہاں مراد وہی نماز خوف ہے جس کی ایک ہیئت مخصوص ہے عام نماز کی ہیئت سے ہٹی ہوئی۔ اس نماز کے لئے لفظ قَضَيْتُمْ ارشاد فرمانا اس کی دلیل ہے کہ یہ بظاہر نامکمل نا تمام نماز بھی عند اللہ ادا ہو جاتی ہے۔

۲۹۲ (اصلی قاعدہ کے مطابق اور پورے شرائط کے ساتھ)

أَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ۔ صلوٰۃ اصلی کے لئے یہاں لفظ اقامت استعمال کرنا اس کی دلیل ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نماز کا اس کے جملہ شرائط ہی کے ساتھ ادا کرنا ہوتا ہے۔

فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ۔ یعنی سفر اور خوف کی حالتیں ختم ہو جائیں۔

۲۹۳ یہاں نماز کی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ علاوہ فرض ہونے (كِتَٰبًا) کے پابندیٔ وقت کے لحاظ سے فرض ہے۔ مَّوْقُوتًا۔ اس لئے سوا حالتِ معذوری کے اسے وقت سے ہٹا دینا جائز نہ ہوگا۔

موقوتا ای محدود الاوقات لا یجوز اخراجہا من اوقاتہا فی شئ من الاحوال۔ (روح)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ فرض ہونے کی وجہ سے اس کا ادا کرنا ضرور ہے اور موقت ہونے کی وجہ سے وقت پر ہی ادا کرنا ضرور، اسی لئے مخصوص حالات میں اس کی ہیئت کچھ تبدیل کر دی گئی تھی جب وہ عارض دور ہو گیا تو اس کی اصل ہیئت واجب الحفظ ہو گئی۔

۲۹۴ (جب تعاقب کی ضرورت آپڑے)

روایتوں میں آتا ہے کہ آیت غزوۂ حمراء الاسد کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی، اس کا ذکر غزوۂ احد کے سلسلہ میں سورۂ آل عمران رکوع ۱۸ میں آچکا ہے آیت الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ کے ماتحت

۲۹۵ یعنی اجرِ آخرت کی جس کے مقابل کوئی چیز منکروں کے پاس نہیں، تو قوتِ قلب کے لحاظ سے تم ان سے کہیں بڑھے چڑھے رہے، دنیوی فتحمندیوں اور کامیابیوں کی پیش گوئیاں بھی اس کے تحت میں آسکتی ہیں۔

۲۹۶ چنانچہ علیم کل ہونے کی بنا پر اس پر اعداء دین کا ضعف جسیم ضعفِ قلب خوب روشن ہے اور حکیم مطلق

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ

یقیناً ہم نے آپ پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں مطابق اس کے جو اللہ نے آپ کو سمجھا دیا ہے ۲۹۷

وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾

اور (ان) خائنوں کے طرفدار نہ ہو جایئے ۲۹۸ اور آپ اللہ سے مغفرت چاہئے بیشک اللہ بڑا ہی مغفرت والا ہے بڑا ہی رحیم ہے ۲۹۹

ہونے کی بناء پر اس نے تمہاری قوتِ تحمل سے زیادہ سے تمہیں کوئی حکم نہیں دیا۔

۲۹۷ (اسی قرآن کے ذریعہ سے)

اَرٰىكَ۔ یہاں بتا دیا، سمجھا دیا، سکھا دیا کے مفہوم میں ہے۔

بما اراك الله اى بما علمك (راغب) بما عرفك الله فى القرآن (ابن عباس)

بالحق یعنی قانون عدل کے مطابق۔ آیت اس باب میں صریح ہے کہ فیصلہ جو کچھ بھی کئے جائیں قرآن ہی کے مطابق وماتحت کیے جائیں نہ کہ اپنے ہوائے نفس کے موافق یا کسی انسانی دماغ کے گڑھے ہوئے آئین و دستور کے ماتحت آیت کا پس منظر یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنو اُبیرق کے ایک گھرانے میں تین بھائی بشیر، بشر اور مبشر مسلمان تھے اور ان کا ایک بھائی بُشیر منافق تھا۔ ایک مرتبہ جو حضرت رفاعہ بن زید انصاری کے گھر میں نقب لگا کر ان کے ہتھیار اور میدہ کی ایک بوری لے گئے، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ بُشیر منافق اور اس کے بدمعاش ساتھیوں نے چوری کی ہے حضرت رفاعہؓ نے اپنے برادر زادہ جناب قتادہ بن نعمان سے کہا کہ تم آستانِ نبوت میں جا کر قصہ بیان کرو تو عجب نہیں کہ ہمارا مال مل جائے۔ انھوں نے جا کر سارا واقعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا جب بُشیر کے اقرباء نے سنا کہ نبی علیہ السلام کے پاس استغاثہ ہوا تو وہ آ کر کہنے لگے یا رسول اللہ! قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا رفاعہ ہمارے آدمی پر جو مسلمان ہو چکا ہے ناحق چوری کی تہمت لگاتے ہیں" اس کے بعد قتادہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا تم ایسے شخص پر بغیر کسی ثبوت کے چوری کی تہمت لگاتے ہو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا ہے؟ یہ سن کر قتادہ کے دل میں آرزو ہوئی کہ کاش میں نے آپ سے چوری کی شکایت نہ کی ہوتی، تھوڑی دیر گزری تھی کہ خالق کردگار نے اپنے رسول پاک پر یہ آیت نازل فرمائی (ترمذی ابواب تفسیر القرآن)

۲۹۸ خائنوں سے بنو اُبیرق مراد ہیں، جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو بنو اُبیرق نے بُشیر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر کے چوری کا مال برآمد کر لیا اور تمام اسلحہ نبی صلعم کے پاس بھجوا دیے بُشیر نفاق کا لباس فریب اتار کر علانیہ مشرکوں سے جا ملا (ترمذی)

۲۹۹ یہ استغفار کا حکم رسولؐ کو کس کے لئے مل رہا ہے؟ اپنے حق میں یا امت کے حق میں یا بظاہر یہ حکم استغفار ان لوگوں کے حق میں معلوم ہوتا ہے جو برادری کے خیال سے اس مجرم منافق کے حق میں ساعی اور سفارشی تھے اور قرآن مجید میں اس اُسلوب بیان کی مثالیں اور جگہوں پر ملتی ہیں۔ مثلاً یایها النبی اتق الله یا وان کنت فی شك۔ وغیرھما۔ چنانچہ اہلِ تفسیر کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔

قيل الخطاب للنبى صلعم المراد بنو أبيرق (قرطبى) والمعنى استغفر الله للمذنبين من أمتك والمتخاصمين بالباطل (قرطبى) يحتمل ان يكون المراد واستغفروا الله لاولئك الذين

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ

اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت نہ کیجئے جو اپنے حق میں خیانت کرتے رہتے ہیں ۳۰۰ اللہ کسی ایسے شخص کو نہیں چاہتا

كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ

جو بڑا خائن اور گنہگار ہو ۳۰۱ یہ لوگ آدمیوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے درانحالیکہ وہ اُن کے

وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا

ساتھ اس وقت بھی رہتا ہے جب وہ رات میں اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اُسے پسند نہیں اور وہ جو کچھ بھی

يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۳۰۲ تم لوگوں نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے وکالت کرلی لیکن

فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

قیامت کے دن ان کی طرف سے اللہ کے سامنے کون وکالت کرے گا یا کون ان کا کام بنانے والا ہوگا ۳۰۳

يذبون عن طعمة ويريدون ان يظهروا براءته عن السرقة . (كبير)

لیکن اگر دوسرے مفسرین کے مذاق کے مطابق یہ معنی لئے جائیں کہ اے پیمبر آپ اپنے حق میں مغفرت طلب کیجئے تو اس سے اشارہ آپ کے صرف اس میلانِ طبع کی جانب ہے کہ آپ نے بنو اُبیرق کی شکایت پر حضرت قتادہ بن نعمان سے اظہار ناراضی فرمایا۔ یہ میلانِ طبع ظاہر ہے کہ معصیت کبیرہ کیا معنی صغیرہ کا بھی درجہ نہیں رکھتا لیکن پیمبر تقوٰے اور طہارت قلب کے جس بلند ترین مقام پر ہوتے ہیں اس لحاظ سے اس قدر ارادہ اور میلانِ طبع بھی قابل استغفار قرار پایا۔

۳۰۰ (یہ ہدایت آئندہ کے لئے ہے جیسا کہ اب تک بھی آپ نے پیش کیا ہے)

۳۰۱ خوّان اور اثیم کے لانے سے یہ مقصود نہیں کہ جو کم درجہ کے خائن اور گنہگار ہیں وہ اللہ کی نظر میں چنیں محبوب ہیں، بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ منافق کی برادری کے جن لوگوں نے اُسے مجرم جان کر بھی خواہ مخواہ حق پوشی اور باطل کوشی کی، وہ خائن اور گنہگار بڑے درجہ کے تھے۔

اَلَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ خیانت کا ضرر و وبال بالآخر خود خائن ہی کو بھگتنا پڑتا ہے اس لئے خیانت کو خیانتِ نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جعلت خيانة الغير خيانة لانفسهم لانّ وبالها وضررها عائد عليهم (روح)

۳۰۲ (اس کے احاطہ علم سے کون سی کارروائی مخفی سے مخفی بھی باہر رہ سکتی ہے؟) اس حقیقت کا استحضار ہر جرم، ہر معصیت سے باز رکھنے کو کافی ہے۔

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ

اور جو کوئی بھی برائی کرے یا اپنی جان پر زیادتی کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو بڑا مغفرت

غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا يَكۡسِبُهٗ عَلٰى

والا بڑی رحمت والا پائے گا ۳۰۵ اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ارتکاب اپنی ہی جان کے

نَفۡسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ خَطِيۡٓـئَةً

خلاف کرتا ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۳۰۵ اور جو کوئی کسی قصور یا گناہ کا ارتکاب کرے

اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ يَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡٓـئًـا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۱۲﴾

پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو درحقیقت اس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا ۳۰۶

ع ۱۶ ۱۴

يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ۔ یعنی خلق کے سامنے ذلت و رسوائی سے شرماتے ہیں۔

لَا يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ کے حضور میں بطور مجرم پیش ہونے سے نہیں شرماتے ہیں۔

اِذۡ يُبَيِّتُوۡنَ.... الۡقَوۡلِ۔ اشارہ ہے اس طرف کہ اس خاص معاملہ میں رات کو باہم رازدارانہ مشورہ ہوا تھا کہ صبح کو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں گفتگو اسی طریقہ پر کی جائے گی۔

وَهُوَ مَعَهُمۡ۔ معتزلہ، قدریہ، جہمیہ وغیرہ نے اس قسم کی آیتوں سے حق تعالیٰ کی معیتِ مکانی پر استدلال کیا ہے۔

قال الجهمية والقدرية والمعتزلة هو بكل مكان تمسكا بهذه الآية وما كان مثلها (قرطبی)

لیکن اہلِ سنت اسے شانِ تنزیہی کے منافی سمجھتے ہیں اور انھوں نے مراد صرف معیتِ علمی لی ہے۔

اى بالعلم والرؤية والسمع هذا قول اهل السنة (قرطبی) محيط بالعلم والقدرة والرؤية (کبیر)

۳۰۳ اس حقیقت کبریٰ کو یاد دلایا ہے کہ اصل پیشی اور جواب دہی تو عدالتِ آخرت ہی کی ہے یہاں کسی طرح اگر بات بنا بھی لی گئی تو کیا ہوتا ہے مومن کے لئے اصل خوف کی چیز تو یہی آخرت کی عدالت ہے جہاں کسی قسم کی بھی تلبیس کی گنجائش نہیں۔

هٰۤاَنۡتُمۡ۔ خطاب ہے مجرم کی برادری اور محلہ والوں کی طرف جنھوں نے سازش کر کے مجرم کی پشت پناہی کی تھی۔

۳۰۴ اوپر کی وعیدوں و انذاری آیتوں کے بعد گنہگاروں کو دل دہی اور ایمان والوں کے لئے پیش بینی کا سامان اور مناسب حال دلدہی ہے

مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا۔ متعدی برائی مراد ہے یعنی کسی دوسرے کے ساتھ برائی کی جائے مثلاً ظلم و دغا، سود خواری، رشوت ستانی وغیرہا۔

يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ۔ وہ برائی جو خود اپنے ہی حق میں کی جائے مثلاً ترکِ نماز، شراب خواری وغیرہا۔

يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ۔ یہ استغفار قواعد شرعی کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۰۵ علیم کل ہونے کی حیثیت سے وہ سب کے چھوٹے بڑے گناہوں سے باخبر ہے، حکیم ہونے کے اعتبار سے وہ جزا و سزا اسی کے مناسب حال ہی تجویز کرتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ

اور اگر آپ پر اللہ کا فضل (خاص) اور رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تہیہ ہی کر لیا تھا کہ آپ کو بھٹکا کر

اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ

رہیں گے حالانکہ یہ بس اپنے ہی آپ کو بھٹکا رہے ہیں اور آپ کو کسی چیز میں بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۰۷

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھا دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے ۳۰۸

تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور آپ پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے ۳۰۹

اِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ۔ یعنی گناہ کا ضرر و وبال خود اسی کو بھگتنا ہوگا، اس لئے توبہ و استغفار تدارک و تلافی لازمی ہے۔

۳۰۵ (اور اپنے جرم کو کئی گنا بڑھا دیا)

توبہ نہ کرنا، اپنی جگہ پر نادم و منفعل نہ ہونا، تلافی و کفارہ اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا، یہ جرائم بجائے خود کیا کم ہیں، چہ جائیکہ اپنا گناہ اٹھا کسی بے گناہ کے سر تھوپ دیا جائے۔ قرآنی اخلاقیات میں یہ جرم ضمیر و اخلاق کی انتہائی پستی کا نمونہ ہے اور اس لئے لازمی طور پر اس پر گرفت بھی سخت رکھی گئی ہے۔

خَطِيْٓئَةً۔ وہ چھوٹا گناہ ہے جس میں قصد و تعمد لازمی نہیں، یا وہ گناہ ہے جو صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہو۔

الخطیئة قد تکون من قبل العمد وغیر العمد (ابن جریر) ای صغیرة او ما لا عمد فیه من الذنوب (روح) ذنب بینه وبین ربه (مدارک)

اِثْمًا۔ وہ بڑا گناہ ہے جس میں قصد و تعمد لازمی طور پر ہو، یا جو بندوں کا گناہ ہو۔

الاثم لا یکون الا من العمد (ابن جریر) او کبیرة او ما لا یکون من العمد (روح) ذنب فی مظالم العباد (مدارک)

۳۰۶ یعنی اپنی اس ناپاک کوشش میں کامیاب تو کیا ہوتے ان کے لئے ممکن نہیں، البتہ اس سعی سے اپنے ہی کو مستحق عقوبت بنا رہے ہیں۔

لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ۔ اللہ کا فضل و کرم تو آپ پر عموماً اور ہر حال میں تھا، لیکن اس خاص قضیہ میں خصوصیت کے ساتھ اس کا ظہور رہا۔

اَنْ يُّضِلُّوْكَ۔ یعنی آپ کو غلطی اور دھوکے میں مبتلا کر کے آپ سے غلط فیصلہ حاصل کریں۔

ان یخطؤک فی الحکم (ابن عباس) ای بان یضلوک عن القضاء بالحق۔ (روح)

۳۰۷ (احکام دین و قضایا کے باب میں)

یعنی شیطان اور اس کے چیلوں (منافقین) کو یہ قوت نہیں دی گئی کہ وہ آپ کو دینی کسی شعبہ میں کچھ بھی مغالطہ میں ڈال سکیں۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ

سرگوشیاں بہت سی ایسی ہیں جن میں کوئی بھلائی نہیں ہاں البتہ بھلائی یہ ہے کہ کوئی صدقہ کی ترغیب یا کسی

أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اور نیک کام کی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی ۳۱۰ اور جو کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کو ایسا کرے گا ۳۱۱

اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ

سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم دیں گے — اور جو کوئی بعد اس کے کہ اس پر (راہ)

مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ

ہدایت کھل چکی رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے علاوہ (کسی راستہ) کی پیروی کرے گا ہم اُسے

نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾

کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے اور پھر ہم اُسے جہنم میں جھونکیں گے ۳۱۲ اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

۳۰۹ یہ کتاب کا نزول حکمت کا نزول علومِ خاصہ کی تعلیم یہ سب اسی فضلِ عظیم کے شواہد ہیں اور اللہ کا فضل جس پر عظیم ہو اس پر کسی کا قابو چل سکتا ہے؟

أَنزَلَ الْكِتَابَ۔ اور اس کتاب ہی کے ذریعہ سے منافقین کی معاندانہ روش کا پردہ بھی چاک کیا گیا۔

عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ۔ یعنی جو علوم عالیہ آپ پر قبل نبوت نزولِ قرآن منکشف نہ تھے اب سب منکشف ہو گئے۔

۳۱۰ (اور ان اغراض کے لئے خفیہ گفتگو اور سرگوشی کی ضرورت پڑ جائے تو اس میں البتہ کوئی حرج نہیں بلکہ ایسے موقع پر خیر و برکت ہوگی)

نَّجْوَاهُمْ۔ میں ضمیر هُمْ مطلق انسان کی جانب ہے۔

ای نجوی الناس جمیعا (ابن جریر)

یعنی کلام الناس (ابن کثیر)

۳۱۱ (نہ کہ اپنے ذاتی دُنیوی کی اغراض کے لئے)

اخلاصِ نیت اور حصولِ رضاءِ الٰہی کی شرط ہر اہم موقع کے لئے یہاں بھی لگی ہوئی ہے۔

۳۱۲ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ۔ اُسے صاف کر دیا کہ آیت میں بیان مرتد کے خصائلِ رذیلہ کا ہو رہا ہے

نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ۔ یعنی ہم اُسے اُسی طرف چھوڑے رکھتے ہیں اپنے قانونِ مشیت تکوینی کے موافق۔ مقصود یہ ہے کہ جبر و اکراہ سے کسی کو راہِ حق کے قبول کرنے اور ماننے پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ وضوحِ حق کے بعد جو بدبخت اپنی کجروی پر قائم رہنا چاہتا ہے اُسی پر اُسے قائم رہنے دیا جاتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ

یقیناً اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا (اور گناہوں کو) بخش دے گا

يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۱۶﴾ إِنْ

جس کے لئے منظور ہوگا اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے وہ یقیناً بڑی دور کی گمراہی میں پڑ گیا ۳۱۳

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۚ

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے بھی ہیں تو بس زنانی چیزوں کو ۳۱۴

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ۔ اس اتباع کا تعلق امورِ دین سے ہے۔
يَتَّبِعْ ...... جَهَنَّمَ۔ آیت کے اس جزو سے فقہاء کو ایک بہت بڑی اصل ہاتھ آگئی ہے اور اس کو انھوں نے اجماعِ امت کے حجتِ شرعی ہونے کا مبنیٰ قرار دیا ہے اور تقریرِ استدلال یہ ہے کہ طریقِ مومنین سے الگ ہونا جب حرام اور مستحقِ جہنم ٹھہرا تو لازمی ہے کہ اس کا عکس یعنی اتباعِ طریقِ مومنین واجب ہو اور اس کی مخالفت بھی کتاب و سنت کی مخالفت کے بعد ناجائز ٹھہرے اور یہاں قرآن مجید نے عدم اتباعِ طریقِ مومنین کو مخالفتِ رسول کے ساتھ جمع کر کے فرمایا ہے۔

هو دليل على ان الاجماع حجة لا تجوز مخالفتها كما لا تجوز مخالفة الكتاب والسنة لان الله تعالى جمع بين اتباع غير سبيل المؤمنين وبين مشاقة الرسول في الشرط وجعل جزاءه الوعيد الشديد فكان اتباعهم واجبا كموالاة الرسول (مدارک) وقرن اتباع غير سبيل المومنين الى مباينة الرسول فی ما ذكر له من الوعيد فدل على صحة اجماع الامة لالحاقه الوعيد بمن اتبع غير سبيلهم (جصاص) وتقرير الاستدلال ان اتباع غير سبيل المؤمنين حرام فوجب ان يكون اتباع سبيل المؤمنين واجبا (کبیر) وهو من احسن الاستنباطات واقواها۔ (ابن کثیر)

۳۱۳ (ایسا کہ اب حق کی طرف اس کی مراجعت ممکن نہیں)

أَنْ يُشْرَكَ بِهِ۔ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ۔ شرک ضد ہے توحید کی اور جس طرح توحید اصل اصول ہے تمام ممکن بھلائیوں اور نیکیوں کی اسی طرح شرک اصلی بنیاد ہے ساری شرابیوں اور برائیوں کی، اس لئے اور کسی معصیت پر شرک کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، راہرو کا رُخ اگر منزلِ مقصود کی طرف ہو تو گو کتنا پڑتا، وقت ضائع کرتا کبھی نہ کبھی منزل تک پہنچ ہی جائے گا، لیکن اگر رُخ ہی غلط ہے تو ظاہر ہے کہ ہر قدم اسے منزل سے دور تر ہی کرتا رہے گا اور قیامت تک بھی اگر چلتا رہے تو منزل تک نہ پہنچ سکے گا، شرک قبولِ رحمت کی ساری صلاحیتوں و استعدادوں ہی کو سوخت کر دیتا ہے اس لئے وہ آخرت کی کسی نعمت، کسی لذت، کسی راحت کے قابل ہی نہیں رہ جاتا، ملاحظہ ہوں اسی سورت کی آیت ۴۸ کے حاشیہ ۱۵۸۔۱۵۹۔ آیت میں خوارج کے اس عقیدہ کا بھی رد آگیا کہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔

فيه ردّ على الخوارج حيث زعموا ان مرتكب الكبيرة كافر۔ (قرطبی)

۳۱۴ مشرک قوموں کی دیومالا (میتھالوجی) میں ہمیشہ دیویوں دیوتاؤں کی ایک بڑی اور اہم تعداد رہی ہے

وَاِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ

اور یہ لوگ پکارتے بھی ہیں تو بس شیطان سرکش کو ۳۱۵ اس پر لعنت کی ہے اللہ نے ۳۱۶ اور وہ کہہ چکا ہے کہ

مِنۡ عِبَادِكَ نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمۡ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمۡ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ

میں تیرے بندوں میں اپنا مقرر حصہ لے کر رہوں گا ۳۱۷ اور میں انہیں گمراہ کر کے رہوں گا اور ان میں ہوس پیدا کر کے رہوں گا اور انہیں

فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ ؕ

حکم دوں گا ۳۱۸ چنانچہ وہ چوپایوں کے کانوں کو تراشیں گے ۳۱۹ اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے ۳۲۰

ہندوؤں میں درگا دیوی، کالی مائی، لکشمی جی، سرسوتی دیوی کے نام ایک ایک کی زبان پر ہیں۔ عرب جاہلی میں یہ دیوی پرستی اور زیادہ زوروں کے ساتھ جاری تھی، چنانچہ قرآن مجید میں بھی جاہلی معبودوں کے سلسلہ میں صراحت جن ناموں کی آئی ہے وہ دیویوں ہی کے ہیں یعنی لات، منات اور عُزّٰی، ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

اِنَاث۔ لغت میں اس کے ایک معنی دیوی، کمزور اور ضعیف اعمل چیزوں کے بھی آتے ہیں۔

قیل لما یضعف عمله انثی۔ (راغب)

پھر چونکہ جمادات تمام تر انفعالیت کے مظہر ہوتے ہیں اور پتھر کے بت یا مورتیاں انہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جن میں نہ جان ہوتی ہے اور نہ کوئی قوتِ فاعلی' اس لئے لغت نے لفظ اناث کا مجازی استعمال ان کے لئے بھی جائز رکھا ہے۔

لما کان معبوداتهم من جملة الجمادات التی هی منفعلة غیر فاعلة سمّاها الله تعالیٰ انثی (راغب) من کل شیئ اخسته (ابن جریر)

چنانچہ اکابر مفسرین میں سے بھی بہت سے اسی طرف گئے ہیں۔

ای اصناما بلا روح (ابن عباسؓ) میّت لا روح فیه (ابن جریر عن قتادة)

۳۱۵ یہ مشرکوں کی حماقت کو واضح کیا ہے کہ ان بتوں اور دیویوں کو پکارنا عین شیطان کو پکارنا ہے۔

۳۱۶ (اور لعنت کی باعث اس کی یہی سرکشی اور بے حکمی ہوئی ہے)

۳۱۷ یعنی آدم کو وضاحت سے بتا دیا ہے کہ شیطان تو ان کا پرانا دشمن اور بدخواہ ہے۔

لَاَتَّخِذَنَّ ..... نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا۔ یعنی اپنی راہ پر لگا کر رہوں گا۔

۳۱۸ یعنی ان کے عقائد اور بنیادی خیالات کو بھی ڈگمگا دوں گا، اور ان کے نفسانی جذبات اور خواہشات کو بھی اُبھار دوں گا۔ گمراہیاں دو ہی طریقوں سے آسکتی ہیں اور انسان شیطانی اثر دو ہی شکلوں سے قبول کر سکتا ہے، ایک عقل و فکر کی راہ ہے دوسرے جذبات اور احساسات کا راستہ ہے، قرآن مجید کے دو جامع لفظوں نے ان سب کا احاطہ کر لیا۔ ضلال کے تحت میں ہر قسم کی عقلی، فکری، نظری گمراہیاں آگئیں، اور تمنّی کے تحت میں معاصی و فواحش کی جانب میلان اور نظر سے اُن کی مضرتوں کا غائب ہو جانا آگیا۔

وَمَنۡ يَّتَّخِذِ الشَّيۡطٰنَ وَلِيًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا

اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے گا وہ یقیناً کھلے ہوئے نقصان میں رہے گا ۳۲۱ ؎

مُّبِيۡنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمۡ وَيُمَنِّيۡهِمۡ‌ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲۰﴾

(شیطان) ان سے وعدے ہی کرتا اور ہوسیں ہی دلاتا رہتا ہے اور شیطان ان سے وعدہ صرف فریب کی راہ سے کرتا ہے ۳۲۲ ؎

۳۱۹ ؎ (بتوں کے نام پر)
عرب جاہلیت کے ایک خاص دستور کی طرف اشارہ ہے، کان کے پیچھے جو غدود ہوتے ہیں، وہ غدود بندروں کے کاٹ کاٹ کر انسان کے جسم میں ان کی تعلیم کی ہوا جو اس زمانہ میں چل پڑی شروع ہوئی ہے اور عجیب نہیں کہ کل بندروں سے گزر کر دوسرے جانوروں اور چوپایوں تک پہنچ جائے، ادھر اگر فاطرِ کائنات کے کلام میں اشارہ ہے تو کچھ عجب نہیں۔

۳۲۰ ؎ تغییر خلق اللہ کی دو بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں ایک خلقِ تکوینی میں تغییر دوسرے خلقِ تشریعی میں تغییر، قدیم مفسرین نے تغییرِ خلقِ تکوینی کی مثال میں ڈاڑھی منڈانے اور جسم گدانے کو پیش کیا ہے لیکن جاہلیت جدید کی ترقیوں نے اُن سے کہیں بڑھ بڑھ کر مثالیں نہ صرف ایجاد کر لی ہیں بلکہ انھیں پھیلا کر فیشن میں داخل کر دیا ہے، مثلاً مردوں کا چہرہ کے بال بالکل صاف کر کے اور طرح طرح کی زناکتیں اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک عورت بن جانا، عورتوں کے سر کے بال کٹا کر اور مردانہ وضع و لباس اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک مرد بن جانا، ایسے آپریشن کرانا جن سے جنس تبدیل ہو جائے یعنی عورت مرد بن جائے اور مرد عورت ہو جائے۔ وقس علیٰ ھذا۔

خلق تشریعی میں تغییر کے معنی دین اور احکامِ دین تحریف کر دینا ہے۔

قیل معناہ یغیرون حکمہ (راغب)

ابن جریر نے خلق اللہ کے معنی دین اللہ کے ابن عباسؓ صحابی اور مجاہدؒ تابعی اور عکرمہؒ تابعی سے نقل کئے ہیں اور دوسروں نے بھی یہی معنی لئے ہیں۔

ای دینہ بالکفر واحلال ماحرم وتحریم ما احل (جلالین) قیل معناہ ابن عباس وعن عکرمۃ وابوصالح وذلک کلہ ذھب للحیوان وتحریم وتحلیل بالطغیان وقولہ بغیر حجۃ ولا برھان (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب پرستی، آتش پرستی، شجر پرستی، حیوان پرستی وغیرہ سب اس تغییر خلق اللہ کی صورتیں ہیں کہ مشرک ان سے وہ کام لے رہا ہے جس کے لئے ان کی خلقت ہوئی ہی نہ تھی۔ (قرطبی)

۳۲۱ ؎ شیطان کا دوست بنانا یہی ہے کہ احکامِ شریعت کو چھوڑ کر خود ساختہ طور طریقوں کو اختیار کیا جائے اور مخلوق کے چلائے ہوئے رسم و رواج کو دلیلِ راہ بنا لیا جائے۔

۳۲۲ ؎ چنانچہ ان وعدوں کی بے حقیقتی اکثر تو اسی دنیا میں روشن ہو کر رہتی ہے ورنہ موت کے وقت تو بہرحال کھلتی ہی ہے۔ یَعِدُھُمۡ شیطانی وعدے مثلاً یہ کہ حشر نشر حساب کتاب کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے یہی مادی دنیا ہے، عقلِ جزوی ہی سب سے بڑا معیار اور آخری معیار ہے، وحیِ الٰہی محض وہم ہے، مادہ کی قوتیں اور قوانین ہی سب کچھ ہیں،

أُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ

یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ لوگ اس سے بچنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

نے عمل نیک کئے ہم انہیں عنقریب (بہشت کے) باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

ان میں ہمیشہ ہمیش کو رہیں گے اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات کا سچا ہے؟ ۳۲۳ف

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا

نہ تمہاری تمناؤں پر ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر (بلکہ) جو کوئی بھی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا ۳۲۴ف

يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ

اور وہ اللہ کو چھوڑ کر اپنے لئے نہ کوئی دوست پائے گا نہ مددگار، اور جو کوئی نیکیوں پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو

ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے (سب) لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا ۳۲۵ف

اُن کے اوپر کوئی مشیت اعلیٰ حاکم نہیں، وَقِسْ عَلٰی ہٰذا۔
یُمَنِّیْہِمْ شیطانی جذبات مثلاً یہ کہ نقش کاری میں کوئی عیب و حرج نہیں، شراب صحت کے لئے ضروری ہے،
قانونِ حجاب ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

۳۲۳ف دائمی راحت کی زندگی صرف قرآن اور شریعت کے اتباع سے ممکن ہے۔

۳۲۴ف (اس برائی کے مناسب اور اس شخص کے مناسب حال)
یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ مدارِ کار طاعت ہے، محض آرزوئیں اور خوش خیالیاں لاشی محض ہیں خواہ وہ کسی کی بھی ہوں۔
سُوْٓءً کے معنی یہاں شرک کے بھی کئے گئے ہیں لیکن جمہور مفسرین نے اسے عام ہی رکھا ہے۔
قال الجمہور لفظ الآیۃ عام والکافر والمؤمن مجازی بعملہ السوء۔ (قرطبی)

۳۲۵ف (کہ اُن کی کوئی نیکی لکھنے سے جزءًا یا کلاً رہ جائے)
وَھُوَ مُؤْمِنٌ۔ ایمان کی قید بہت ضروری ہے ہر عمل کے واقعۃً صالح ہونے کے لئے لازم ہے کہ محرکِ عمل بھی
صحیح ہو، ریا، نمائش یا وہم پرستی مقصود نہ ہو، اسی اخلاصِ نیت کا نام اصطلاحِ شریعت میں ایمان ہے اور بغیر اخلاصِ نیت

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

اور دین میں اس سے بہتر کون ہے جو اپنا رُخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو ۳۲۶ اور ابراہیمؑ

وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

راست رَو کے مذہب کی پیروی کرے ۳۲۷ اور اللہ نے تو ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا ۳۲۸

کے کوئی عمل مقبول نہیں، اس کے بغیر عملِ صالح صرف صورۃً ہی صالح ہوگا، حقیقتِ صالحیت سے خالی، یہیں سے اس بحث کا بھی خاتمہ ہوا جاتا ہے جو بعض سطحی دماغ والوں نے آج کل پیدا کر رکھی ہے یعنی آیا کافروں کے اعمالِ صالحہ قبول ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ بغیر اخلاصِ نیت یا ایمان کے کسی عمل پر عملِ صالح کا اطلاق ہی درست نہیں تو اس کے اجر کا کیا سوال ہے۔ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ کے بعد هُوَ مُؤْمِنٌ کے اضافہ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ ایمان اور عملِ صالح دو الگ الگ چیزیں ہیں، باہم مرادف نہیں۔

فیہ اشارۃ الی ان الاعمال لیست من الایمان۔ (مدارک)

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ اس میں تردید آگئی ان تمام جاہلی مذہبوں کی جو حسنِ عمل کے باوجود عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بنا پر ثمرۂ حسنِ عمل سے محروم ٹھہرائے ہوئے ہیں، اسلام میں عورت کو اس کی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر سے محروم نہیں کیا ہے۔

نقیر۔ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے۔

۳۲۶ یعنی فرمانبرداری دل سے ہو، منافقانہ نہ ہو۔

موحّد محسن بالقول والفعل (ابن عباس)

متابعا للشریعۃ فیصح ظاہرہ بالمتابعۃ وباطنہ بالاخلاص (ابن کثیر)

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ۔ یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی، اعمال میں بھی۔

ای اخلص دینہ وعملہ للّٰہ (ابن عباسؓ)

۳۲۷ (کہ اسی ملّتِ ابراہیمی کا دوسرا نام دینِ اسلام ہے)

۳۲۸ توریت میں بھی ابراہیم علیہ السلام کا لقب خدا کا "دوست" آیا ہے:۔

"کیا تو ہمارا خدا نہیں، جس نے اس سرزمین کے باشندوں کو اپنے گروہ اسرائیل کے آگے سے خارج کیا اور اسے اپنے دوست ابرہام کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دیا"۔ (۲۔ تواریخ ۲۰: ۷)

"اے اسرائیل میرے بندے اے یعقوب جسے میں نے پسند کیا، جو میرے دوست ابرہام کی نسل سے ہے"۔ (یسعیا ۴۱-۸)

خَلِيْلًا۔ خلۃ کہتے ہیں محبتِ خالص کو اور خلیل دوستِ خالص کو۔

الخلۃ ھی المودۃ التی لیس فیہا خلل (یعنی محبۃ تامۃ لاخلل فیہا) (تاج) قال الزجاج الخلیل ھو المحب الذی لاخلل فی محبتہ (تاج) سمی خلیلا لان اللّٰہ احبّہ واصطفاہ (معالم) قال ثعلب انما سمی الخلیل خلیلا لان محبتہ تخلل القلب فلا تدع فیہ خللا الاملأتہ (قرطبی)

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴿۱۲۶﴾

اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۳۲۹؎ لوگ

وَیَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِیْهِنَّ ۙ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ

آپ سے عورتوں کے باب میں فتویٰ طلب کرتے ہیں ۳۳۰؎ آپ کہہ دیجئے اللہ تمہیں ان کے بارہ میں (وہی) فتویٰ دیتا ہے ۳۳۱؎

فِی الْكِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ

وہ (آیات بھی) جو تمہیں کتاب کے اندر ان یتیم عورتوں کے باب میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جنہیں وہ نہیں دیتے ہو جو ان

اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی

کے لئے مقرر ہو چکا ہے ۳۳۲؎ اور اس سے بیزار ہو کر ان سے نکاح کرو ۳۳۳؎ اور جو (آیات) کمزور بچوں کے (باب میں ہیں) اور جو

بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا ﴿۱۲۷﴾

(آیات اس باب میں ہیں) کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر قائم رہو ۳۳۴؎ اور تم جو کچھ بھی نیکی کرو گے سو اللہ اس کا خوب علم رکھتا ہے ۳۳۵؎

خلتِ الٰہی سے مراد ہے تقرب و مقبولیت کا اعلیٰ مقام۔ قرآن مجید نے ایک طرف تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی ضروری قرار دی اور دوسری طرف ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا۔ اس میں صاف اشارہ یہ نکل آیا کہ اسی ملت کی پیروی سے آج بھی کوئی نہ کوئی درجہ خلت کا حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۲۹؎ (اپنے علم و قدرت سے)

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ میں بیان کیا گیا اللہ کے کمالِ قدرت و وسعتِ سلطنت کا اور كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا میں بیان آگیا اس کے کمالِ علم کا۔ یعنی چھوٹی بڑی کوئی سی شے کائنات میں نہ اس کی ملک و سلطنت سے باہر ہے اور نہ اس کے احاطۂ علم سے۔ مشرکین کو علی العموم انہی دو صفاتِ باری (صفتِ علم و صفتِ ملک و قدرت) میں ٹھوکر لگی ہے اس لئے انہی صفات کا اثبات قرآن مجید بار بار کرتا ہے۔

۳۳۰؎ یعنی ان کے مہر، میراث وغیرہ کے باب میں، ان کے حقوق و فرائض کے بارہ میں۔

ای یطلبون منك تبیین المشكل من الاحكام فی النساء وما یجب لهن وعلیهن (روح)

یہ سوال کرنے والے صحابی حضرات تھے۔

نزلت بسبب سوال قوم من الصحابة امر النساء واحكامهن فی المیراث وغیر ذلك (قرطبی)

آیت کے مضمون کا ربط سورت کی ابتدائی آیتوں کے مضمون سے ہے۔

هذه الآیة مرجوع الی ما افتتحت به السورة من امر النساء (قرطبی)

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا

تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھلک جاؤ ۳۴۱ اور اُسے اِدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو ۳۴۲ اور اگر تم (اپنی) اصلاح کرو اور تقویٰ

فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٢٩﴾ وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ

اختیار کرو تو اللہ بے شک بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۳۴۳ اور اگر دونوں جدا ہی ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنے (فضل کی) وسعت سے بے نیاز کردے گا ۳۴۴

یکہ ہی پر قناعت رکھنا۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً۔ اس موقع پر عدل سے مراد تھی عدل معاملات میں، عدل امور اختیاری میں یعنی ہر بیوی کی ضروریات کا، مزاج و مذاق کا لحاظ رکھنا، بہ خلاف اس کے یہاں جس عدل کی نفی کی جارہی ہے اور ارشاد ہو رہا ہے کہ ایسے عدل پر تم قادر ہی نہیں ہو سکتے، چاہے لاکھ اس کی تمنا کرو۔ وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ۔ اس عدل سے مراد ہے مساوات امور غیر اختیاری میں، کیفیات قلب میں، مثلاً محبت و رغبت میں اور ایسی مساوات کامل تو والدین عادۃً اپنی ساری اولاد کے درمیان نہیں رکھ سکتے۔

لفظ عدل دونوں جگہ مشترک ہے لیکن مفہوم الگ الگ ہے۔ اور اس اسلوب بیان کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے ملتی ہیں۔

اخبر تعالیٰ بنفی الاستطاعة فی العدل بین النساء وذلک فی میل الطبع فی المحبة والجماع والحظ فی القلب (قرطبی) المیل القلبی وهو مما لا یملکه المرء ولا یحیط به اختیاره (المنار) المراد بغیر المستطاع من العدل هو العدل الکامل الذی یحرص علیه اهل الدین والورع (المنار) روی عن ابی عبیدة قال یعنی المودة ومیل الطباع وکذلک روی عن ابن عباس والحسن وقتادة (جصاص)

پس بعض جدید محققین نے اس آیت سے یہ جو نکالنا چاہا ہے کہ قرآن مجید نے عدل بین الازواج کو ناممکن بتایا ہے اور تعدد ازواج کی اجازت عدل کے ساتھ دی ہے تو اس طرح اس اجازت کو ایک ہاتھ سے دے کر پھر واپس لے لیا ہے تو ایسے لوگوں نے نادانستہ سہی لیکن بہرحال قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے اور اس کی جانب بے تکلف اس عیب کو منسوب کر دیا ہے کہ وہ جس چیز کو روکنا چاہتا ہے اُسے براہ راست منع نہیں کر دیتا بلکہ اس کے لئے خواہ مخواہ ایک پرپیچ راستہ اختیار کرتا ہے۔

۳۴۱ (کہ مساوات کامل اور رغبت قلب کی بے اختیاری کو بہانہ کر کے بیوی کے ظاہری اور اپنے اختیار کے اندر والے حقوق بھی پامال کرنے لگو)

قال مجاهد لا تتعمدوا الاساءة بل الزموا التسویة فی القسم والنفقة لان هذا مما یستطاع (قرطبی)

۳۴۲ (کہ وہ بیچاری نہ تو عام شوہر والیوں کی طرح اپنے حقوق سے مستفید ہوتی رہے اور نہ طلاق والیوں کی طرح اپنے کو آزاد و خود مختار پائے)

فَتَذَرُوْھَا۔ میں ضمیر مونث مظلوم بیوی کی جانب ہے۔

ای لاهی مطلقة ولا ذات زوج قاله الحسن (قرطبی) التی لیست ذات بعل ولا مطلقة (بیضاوی)

شریعت نے اس اُدھر میں پڑی رہنے والی کی حالت کو بدترین قرار دیا ہے، شوہر کو چاہیے کہ اپنے امکان بھر پوری کوشش حسن معاشرت کی اور تعلق زوجیت کے حق کی کرے لیکن جب دیکھے کہ کوئی صورت اس میں کامیابی

وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿١٣٠﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

اور اللہ ہے ہی بڑا وسعت والا، بڑا حکمت والا ۳۴۵ اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کی ملک ہے ۳۴۶

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

اور ہم نے ان لوگوں کو جنہیں تم سے قبل کتاب مل چکی ہے اور خود تمہیں بھی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو ۳۴۷

وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا

اور اگر ناشکری کروگے تو (یاد رہے کہ) جو کچھ بھی آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کی ملک ہے ۳۴۸ اور اللہ بڑا بے نیاز ہے

حَمِيْدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾

ستودہ صفات ہے ۳۴۹ اور جو کچھ بھی آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کی ملک ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے ۳۵۰

کی نہیں تو پھر صاف طور پر قاعدہ شرعی کے مطابق طلاق دے دے، یہ ظالمانہ صورت بہرحال نہ اختیار کرے کہ عورت بظاہر سہاگن اور شوہر دار ہو لیکن حقیقۃً اپنے کسی حق سے بھی متمتع نہیں ہو رہی ہے۔

۳۴۳ (سو اس کے ہاں ماضی کی اصلاحِ حال کی احتیاط، اور مستقبل کے عزمِ احتیاط کے بعد تمام تر مغفرت رحمت ہی ہے)

اَنْ تُصْلِحُوْا۔ یعنی اپنی پچھلی بدعنوانیوں کی اصلاح حسب قاعدۂ شرعی کرلو۔

وَتَتَّقُوْا۔ اس تقوے کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے۔

۳۴۴ (ایک کو دوسرے سے)

یعنی اگر صلح و موافقت کی ہر تدبیر ناکام رہے اور نوبت بالآخر علیحدگی ہی کی آجائے تو زیادتی (نشوز) اور بے التفاتی (اعراض) کرنے والا فریق یہ نہ سمجھے رہے کہ اللہ کسی کے کام کو کسی سے اٹکائے نہیں رکھتا، وہ بغیر کسی بندہ کی شرکت اور مدد کے ہر ایک کا کام چلا دینے کے لئے کافی ہے۔

۳۴۵ (اُسے ہر ایک کے لئے مناسب سبیل نکال لینا کیا مشکل ہے)

۳۴۶ سو اس مالک الملک اور ملک الملوک کی رضاجوئی کے بجائے کسی اور کی رضاطلبی کیسی شدید حماقت ہے، وہ زمین و آسمان کے سارے خزائن کا مالک ہے، اُسے دوسروں کو غنی بنا دینے میں کیا دیر لگ سکتی ہے۔

۳۴۷ (کہ یہی خوفِ خدا و تقویٰ الٰہی بنیاد ہی تمام احکام الٰہی کی تعمیل کی ہے اور اُسے آسان اور خوشگوار بنا دینے والی بھی) انسان کی ساری زندگی کا سنگِ بنیاد یہی تقویٰ ہے اور اس لئے یہ عین مقتضائے حکمت ہے کہ قرآن مجید اس کی تاکید سے لبریز ہے، مسیحیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہب کی بنا خوفِ خدا پر نہیں، بلکہ محبتِ الٰہی پر ہے اور ان کے پادری اُسے بہت فخر سے پیش کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان کی انجیل ان تاکیدوں سے خالی نہیں، مثلاً:۔

"اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے"۔ (متی ۱۰: ۲۸) "اس سے ڈرو جس کو

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ

وہ اگر چاہے تو اے لوگو! تم (سب) کو لے جائے اور دوسروں کو لے آئے ۳۵۱ اور اللہ

اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ﴿١٣٣﴾ مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ

اس پر قادر ہی ہے ۳۵۲ جو کوئی دنیا کا انعام چاہتا ہے تو اللہ کے پاس تو دنیا اور

اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿١٣٤﴾

آخرت (دونوں) کا انعام موجود ہے ۳۵۳ اور اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا دیکھنے والا ہے ۳۵۴

۱۹ ع ۸ ۱۶

قتل کرنے کے بعد اجنبی رب کے جہنم میں ڈالے جاں میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی سے ڈرو۔ (لوقا ۱۲: ۵)

رہی توریت تو اس کے حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

۳۴۸ (سو ایسے کی ناشکری اور نافرمانی سے اُس کا کیا حرج، ضرر تو خود تمہارا ہی ہے۔

إِنْ تَكْفُرُوا۔ احکامِ الٰہی کی مخالفت ہی کا نام ناشکری ہے۔

۳۴۹ مشرک جاہلی قوموں کے دیوی دیوتا اپنی صفات میں ناقص اور اپنی ذات کے لحاظ سے محدود ہوتے ہیں ان کے پرستار اور پجاری جو منتر وغیرہ جاپ کرتے رہتے ہیں اس سے ان کے نقائص کی تکمیل ہوتی رہتی ہے اور وہ اپنی اُلوہیت و معبودیت کے لئے غذا حاصل کرتے رہتے ہیں، قرآن مجید نے یہاں ان دو صفات کا ذکر کرکے ان خرافات کی تردید کردی کہ اللہ تو خود ہر طرح کامل و مکمل ہے کسی کی عبادت سے اس کی تکمیل کا خیال ہی مہمل ہے اور اس کی صفات عالی و محمودہ میں نقص کا گزر نہیں۔

۳۵۰ (اس کی کارسازی عالم کو ناکافی سمجھ کر کسی مخلوق کی طرف التفات کرنا اور اس سے کارسازی کی توقع رکھنا کیسی خرافت ہے)

خلقت کائنات و تدبیر کائنات سب اس کے لئے آسان ہیں۔

۳۵۱ (اور جو کام اُسے لینے ہیں، وہ اسی نئی مخلوق سے لے)

یہ بیان اُس کے کمال قدرت کا ہے۔

آخرین یعنی نوعِ انسان کے علاوہ کوئی اور ہی نئی مخلوق۔

ای خلقا آخرین مکان الانس (بیضاوی) جوزہ الزمخشری وابن عطیۃ وغیرہ وھما ان یکون المراد جنسا غیر جنس الناس۔ (روح)

۳۵۲ (سو اس قدرت کے باوجود وہ اگر ایسا نہیں کرتا اور تمہارے بجائے کسی جدید مخلوق کو وجود میں نہیں لا رہا ہے تو اس کا تمہارے ہی اوپر کمال احسان ہے کہ وہ اس طرح حصولِ اجر کا موقع دیے جا رہا ہے۔)

کَانَ۔ لانے سے مفہوم ماضی مقصود نہیں، بلکہ صفتِ قدرت کی ازلیت اور غیر ازلیت کا اثبات مقصود ہے۔

القدرۃ صفۃ ازلیۃ لاتتناھی مقدورا تہ کما لاتتناھی معلوماتہ والماضی المستعمل فی صفاتہ بمعنی الحال (قرطبی)

صیغۂ ماضی لانے میں نکتہ یہ ہے کہ صفت کے قدیم ہونے کی طرف اشارہ ہو جائے ذات و صفات کو کوئی حادث نہ سمجھ لے

وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾

اور اگر تم کجی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے خوب خبر دار ہے ۳۶۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ اور (اُس) کتاب پر ایمان لاؤ جو اُس نے اپنے رسولؐ پر

نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ

نازل کی ہے اور اس (جنس) کتاب پر بھی جو وہ اُس سے قبل نازل کر چکا ہے ۳۶۱

اور ان کی روایتوں پر دین کے ایک حصہ کا مدار ٹھہر گیا۔

۳۵۷ یعنی جس کے خلاف اگر تمہاری سچی گواہی پڑ رہی ہے اور اس کی خاطر تم سچے اظہار سے بچنا چاہتے ہو، اس پر جتنا حق تمہارا ہے اس سے کہیں بڑھ کر حق اللہ کا ہے جھوٹی گواہی کے محرک عموماً دو ہی ہوتے ہیں فریق اگر امیر ہے تو اُس کا دباؤ، لحاظ، مروّت اور اگر غریب ہے تو اس کے ساتھ جذبۂ ہمدردی یہاں دونوں کی جڑ کاٹ دی ہے اور بتایا ہے کہ دونوں صورتوں میں جتنا تمہارا تعلق اس کے ساتھ ہے اُس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اللہ کا تعلق اس کے ساتھ ہے

۳۵۸ (ادائے شہادت میں)

تاکید ہے کہ شہادت بالکل واقعہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ شاہد کے ذاتی رجحانات کا دخل بھی نہ آنے پائے۔

۳۵۹ یعنی ذاتی رجحانات کو دخل دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ قدم راہِ حق سے اِدھر یا اُدھر ہو جائے گا۔

اَنۡ تَعۡدِلُوۡا۔ تقدیرِ کلام یوں ہے۔

اَنۡ لَّا تَعۡدِلُوۡا۔ (جلالین) ای مخافۃ ان تعدلوا۔ (ابوسعود)

۳۶۰ ہر معصیت اور ہر بداخلاقی کی طرح ادائے شہادت کی بھی ہر بے عنوانی سے روکنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ بھی اللہ کی ہمہ بینی ہمہ دانی کا استحضار ہے جتنا یہ عقیدہ قوی زندہ و تازہ ہوگا اُسی قدر سخت پہرہ انسان کے نفس پر قائم رہے گا۔

اِنۡ تَلۡوٗا۔ یعنی شہادت تو دی جائے لیکن بددیانتی خیانت اور ایچ پیچ کے ساتھ۔

تُعۡرِضُوۡا۔ یعنی سرے سے شہادت ہی نہ دی جائے۔

۳۶۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا۔ آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو کلمۂ اسلام پڑھ کر اجمالاً تو ایمان لا چکے ہیں اور اسی لئے لقب مومنین سے مشرف ہیں اور ان ہی کو تاکید ہو رہی ہے کہ تفصیل کے ساتھ ایمانیات کے ایک ایک جزء پر اپنا عقیدہ مضبوط کریں

اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ۔ یعنی اللہ کی ذات و صفات پر اس کی اور توحید کے تضمنات پر بہ تفصیل ایمان لاؤ۔

وَرَسُوۡلِهٖ۔ رسول پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شریعت کے ہر ہر جزء کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔

الۡكِتٰبِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ مراد یہاں جنس کتاب ہے یعنی اُن کتابوں پر ایمان لایا جائے جو قرآن سے قبل نازل ہو چکی ہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ

اور جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیمبروں اور قیامت کے دن سے کفر کرتا ہے وہ

ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ

گمراہی میں بہت دور جا پڑا ۳۶۲ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں ترقی

ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ؕ

کرتے گئے اللہ ہرگز نہ ان کی مغفرت کرے گا اور نہ انہیں سیدھی راہ دکھائے گا ۳۶۳

ای بجنس ما انزل على الانبیاء قبله من الكتب (کشاف) نزلت فی جمیع المؤمنین والمعنى یا ایها الذین صدقوا اقیموا على تصدیقكم واثبتوا علیه (قرطبی) یا ایها الذین آمنوا بحسب الاستدلالات الجملیة آمنوا بحسب الدلائل التفصیلیة (کبیر)

۳۶۲ ان میں سے ہر ہر عقیدہ پر فرداً فرداً ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے کسی ایک عقیدہ سے بھی انکار، دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کے لئے کافی ہے۔ وَ یہاں چاروں جگہ اَوْ کے معنی میں ہے۔
یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ۔ اللہ کی ذات سے انکار کی طرح اس کی صفات سے بھی انکار داخلِ کفر ہے۔
وَمَلٰٓئِکَتِہٖ۔ بجائے فرشتوں کے جاہلی قوموں کی طرح دیوتاؤں کو ماننا فرشتوں ہی سے کفر کی ایک شکل ہے۔
وَکُتُبِہٖ۔ جاہلی مشرک قومیں چونکہ عقیدۂ وحی سے محروم ہیں اس لئے کتبِ آسمانی کی بھی قائل نہیں۔
وَرُسُلِہٖ۔ بجائے پیمبروں کے اوتاروں یا خدا کے مظہروں کو ماننا رسولوں سے کفر کرنا ہے۔

ای من یکفر بشیء من ذلك (بیضاوی۔ بحر۔ مدارک) لان الكفر ببعضه كفر بكله (مدارک)

۳۶۳ (جنّت وہدایت کی)
ذکر ان لوگوں کا ہے جو اسلام پر قائم نہ رہے بلکہ مرتد ہو گئے، اور دوبارہ ایمان لا کر بھی ایمان پر قائم نہ رہے، اور توبہ کی بجائے اسی حالتِ کفر وارتداد پر ختم ہو گئے، مگر متعین طور پر کون گروہ مراد ہے؟ ایک قول ہے کہ یہود مراد ہیں پہلے حضرتِ موسیٰ پر ایمان لائے پھر ان ہی کی زندگی میں گوسالہ پرستی کی اور کافر ہو گئے، تائب ہوئے اور ان کی ذریت حضرت عیسیٰ سے انکار کر کے پھر کافر ہو گئی اور آخر میں رسول اللہ صلعم سے انکار کر کے اپنا کفر بڑھاتے ہی رہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مرتدین کا کوئی خاص گروہ مراد ہے جو مکرر مرتد ہوا اور آخر تک مرتد رہا۔ تیسرا قول اور سب سے زیادہ لگتا ہوا یہ ہے کہ مراد منافقین و متردّدین و مذبذبین ہیں اور مقصود ان کے تردد و تذبذب کا اظہار ہے نہ کہ حقیقی ارتداد کا نقشہ، سیاقِ قرآنی بھی منافقین ہی کو چاہتا ہے۔

کنا نعنی به المنافقین ومن دخل فی ذلك من كان مثلهم (ابن جریر عن مجاهد) هؤلاء المنافقون (ابن جریر عن ابن زید) روی عن ابن عباس ان الآیة فی المرتدین... لیس المراد بیان هذا العدد بل المراد ترددهم كما قال مذبذبین بین ذلك (کبیر عن القفال)

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ

آپ منافقین کو سنا دیجئے کہ ان کے لئے عذاب دردناک ہے ۳۶۴ (یعنی وہ لوگ) جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ

بنائے ہوئے ہیں کیا ان کے پاس عزت کی تلاش کر رہے ہو سو عزت تو ساری اللہ ہی کی

جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

ہے ۳۶۵ اور وہ تمہارے اوپر یہ (فرمان) کتاب میں نازل ہی کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر

يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ

اور تمسخر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں کہ اس حالت میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے ۳۶۶

۳۶۴ بَشِّرْ۔ تبشیر کے معنی بعینہٖ خوشخبری ہی کے نہیں اہل لغت میں عام ہے ہر ایسی خبر کے لئے جس کا اثر چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔

(التبشير الاخبار بما يظهر اثره على البشرة (قرطبی)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بشارت یہاں طنز و زجر کے معنی میں ہو اور عرب ایسے موقع پر ایسا ہی استعمال کرتے ہیں۔

قوله بشّر تهكم بهم والعرب تقول تحيتك الضرب وعتابك السيف (کبیر) ولذا قول الشاعر

تحية بينهم ضرب وجيع اردو میں تو طنزیہ موقع پر کہتے ہیں لو اب اپنا انعام لو، اب تو مزہ پایا، اب دیکھو اپنا تماشہ۔

۳۶۵ یعنی اعزاز تو تمام تر اللہ کی ملک اور قبضہ میں ہے وہ جسے چاہے معزز بنا دے، منکرین کے بڑے بڑے امراء و رؤسا تک حقیقی عزت سے خالی ہیں۔

يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی منافقین جو ایمان کے سے دعوے تو کیا رکھتے ظاہری تعلقات بھی ان سے قائم نہ رکھ سکے اور بجائے ان کے کافروں سے لپٹے ہوئے ہیں نبھاتے آئے ہیں کہ منکروں کا فروغ بلا ضرورت میل جول، خلط ملط ان کی وضع قطع بلا ضرورت بنانا، ان کا فیشن اختیار کرنا، ان کے لباس تمدن معاشرت کو فخر و عزت کی چیز سمجھنا سب اہل نفاق

۳۶۶ (نفس معصیت میں)

یہ مثلیت اور یکسانی نفس معصیت میں ہوگی، ورنہ منکرین کا استہزاء ظاہر ہے کہ کفر اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کے جلسوں محفلوں میں مسلمانوں کی شرکت محض فسق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اى فى العذاب لانكم ان قعدتم معهم ولم يوجبه المعنى من كل وجه فان خوض المنافقين فيه كفر ومكر - هذا ان معهم معصيته [illegible] فى العصيان وان لم يبلغ معصيتهم مرتبة الكفر (روح)

فِی الْکِتٰبِ۔ حوالہ اسی کتاب قرآن کا ہے۔

واذا رأيت الذين يخوضون فى آياتنا فاعرض عنهم حتى يخوضوا فى حديث غيره (سورۂ انعام پ ۷)

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى

تو اللہ ہی تم (سب) لوگوں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ۳۶۹؎ اور اللہ کافروں کا ہرگز

الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ

مومنوں پر غلبہ نہ ہونے دے گا ۳۷۰؎ بیشک منافقین اللہ سے چال چل رہے ہیں حالانکہ اللہ ان کی چالوں کو ان پر الٹ رہا ہے

[illegible] الدوائر [illegible] (ابن عباس)

اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۔ معیت کا تعلق سفر جہاد سے ہے۔

اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ ۔ یہاں صیغۂ جمع متکلم ہے منافقین اپنے کو مجموعۂ لشکر اسلام میں شامل کر رہے ہیں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین کو مال غنیمت میں حصہ نہیں ملتا تھا جب ہی وہ اسے مانگتے اور اس کے لئے مطالبہ کرتے۔

والآية تدل على ان المنافقين كانوا لا يعطونهم الغنيمة ولهذا طلبوها (قرطبی)

فتح کے لفظ میں شان وعظمت ہے اس لئے مسلمانوں کی کامیابی کو اس سے تعبیر کیا گیا اور نصیب میں حقارت اور پستی ہے اس لئے کافروں کی کامیابی کے لئے یہ لفظ دیا گیا۔

سمّی ظفر المسلمین فتحا [illegible] وسمّی ظفر الکافرین نصیبا [illegible]

۳۶۹؎ یعنی آج تو اظہار اسلام کر کے ہر قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں اور مسلمانوں میں ملے جلے رہتے ہیں لیکن قیامت میں کیا کریں گے، وہاں تو ان کا کفر علانیہ ظاہر ہوگا اور یہ مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر رہیں گے

۳۷۰؎ (اپنے اسی آخری اور اخروی فیصلہ میں)

آخرت دار الجزاء ہے وہاں اس دار العمل کی طرح کسی کو بھی امتحان التباس و اشتباہ کی گنجائش نہیں، وہاں دودھ کا دودھ پانی کا پانی بہرحال و بہرصورت الگ ہو کر رہے گا، دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسی دنیا میں کافروں کو مومنوں پر غالب نہ آنے دے گا، حجت عقلی و شرعی کے لحاظ سے۔

قال علی [illegible] یوم القیامة [illegible] ابن عباس [illegible] یوم القیامة وقال ابن عطیة [illegible] [illegible] اهل التاویل [illegible] [illegible] (قرطبی)

اس نفی غلبہ و ولایت کفار کا تعلق اسی عالم تکوینی سے مان کر بعض فقہاء نے اسی دلیل کے استنباطات کئے ہیں:

(۱) کافر کی گواہی اگر مسلمان کے مضر پڑ رہی ہو تو قبول نہ کی جائے گی۔

(۲) کافر کی ولایت کسی مسلمہ نابالغ کے نکاح میں جائز نہ ہوگی۔

(۳) کافر کو کسی مسلمان کی وراثت نہ پہنچے گی۔

۳۷۱؎ (ان کی چالوں کو ناکام دیکھ کر ان کی چالوں کی سزا ان کو دے گی)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ یعنی اپنے اسلام کا جھوٹا اقرار کر کے اللہ تک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اپنے حمق سے

وَإِذَا قَامُوٓا إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَآءُونَ ٱلنَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ

اور یہ لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں (صرف) لوگوں کو دکھاتے ہیں

ٱللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٤٢﴾ مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ

اور اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں ۳۷۲ درمیان ہی میں معلق نہ (پورے) اِدھر ہی کے ہیں نہ (پورے) اُدھر ہی کے،

هَٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُۥ سَبِيلًا ﴿١٤٣﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ

اور جسے اللہ گمراہ رکھے تو اُس کے لئے تو کوئی راہ نہ پائے گا ۳۷۳ اے ایمان والو!

ءَامَنُوا لَا تَتَّخِذُوا ٱلْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۚ

مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ۔

یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ ہو رہا ہے اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ خداع کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اُس سے مراد مجازاتِ خداع ہوتی ہے

الخداع من الله مجازاتهم على خداعهم اولياءه ورسله (قرطبی) سمّی الجزاء على العمل باسمه

على مجاوزة الكلام (جصاص) ای یجازیهم بالعقاب على خداعهم (کبیر) ای هو الذی یستدرجهم فی

طغیانهم وضلالهم ویخذلهم عن الحق والوصول الیه فی الدنیا وکذلک یوم القیمة۔ (ابن کثیر)

۳۷۲ یعنی یہ منافقین اول تو نماز پڑھتے ہی کہاں ہیں، جب مسلمانوں کے مجمع میں شرماشرمی پڑھنا ہی پڑی تو صرف ہیئتِ ظاہری کے لحاظ سے کچھ دیر اُٹھک بیٹھک سی کر لی۔

قَامُوا كُسَالَىٰ۔ عبادت میں نشاط، مستعدی اور چستی تو صرف ایمان و اعتقاد کی قوت سے پیدا ہوتی ہے جب سرے سے یہی مفقود ہے تو ظاہر ہے کہ کاہلی اور بددلی کیسے نہ پیدا ہوتی۔ یہاں تو مقصود تمام تر ظاہر داری تھی خلقت کی نظر میں اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا۔

إِلَّا قَلِيلًا۔ عارفین نے کہا ہے کہ یہ عمل قلیل ہی اگر اللہ کے لئے ہوتا تو اللہ اسے کثیر ہی قرار دیتا۔

قال الحسن لو كان ذلك القليل لله تعالى لكان كثيرا (مدارک) انما سماه قليلا لانه لغير وجهه

فهو قليل فی المعنی وان كثر الفعل منهم (جصاص)

يُرَآءُونَ ٱلنَّاسَ بعض لوگوں کے دکھانے کو تاکہ یہ بھی مسلمان ہی سمجھے جائیں اور ان کے ساتھ بھی مسلمانوں ہی کی سی مراعات ہوتی رہے۔

ریاء۔ کے معنی ہیں کسی اچھی چیز کو دکھاوے کے لئے اختیار کرنا نہ کہ حکم الٰہی کی تعمیل میں۔

الرياء اظهار الجميل ليراه الناس لا لاتباع امر الله۔ (قرطبی)

إِذَا قَامُوٓا إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ۔ جب نماز جیسے اہم ترین رُکنِ اسلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو دوسری عبادتوں

أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿١٤٤﴾ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی حجت صریح قائم کر لو؟ ٣٧٤ یقیناً منافق دوزخ کے

فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا

سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے اور تو ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا ٣٧٥ البتہ جو لوگ توبہ کریں

وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ

اور (اپنی) اصلاح کریں اور اللہ کا سہارا پکڑے رہیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر لیں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے ٣٧٦

کے ساتھ جو معاملہ ہوگا ظاہر ہے۔ نماز کی تصریح خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی ہے کہ اعمال میں نماز ہی ایمان و اسلام کا ظاہری معیار ہے۔ فقہاء نے کہا ہے کہ جس نماز ریائی کا بیان ذکر ہے اور جو معصیت کے درجہ میں ہے اور جس نماز کا دہرانا لازم ہے وہ وہ ہے جو عقیدہ کے بغیر لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے پڑھی جائے کہ اس سے لوگ مسلمان کہنے لگیں باقی جو نماز اس ارادہ سے پڑھی جائے کہ لوگ اسے دیکھ کر اس کے مومن اور مقبول الشہادۃ ہونے کی اور اس کے جواز امامت کی شہادت دیں تو ایسی نماز اس وعید کے تحت میں نہیں آتی۔

یعنی انھم یفعلونھا لیراھا الناس وھم متھدونھا الغوا لیرھد اھو الریاء والتراثی فاما ان صلاھا لیراھا الناس ویرونہ فیھا فیشھدون لہ بالایمان فلیس ذلک الریاء المنھی عنہ ولکن للاظہار لھا طلب المنزلۃ والظھور لقبول الشہادۃ وجواز الامامۃ لم یکن علیہ حرج وانما الریاء المعصیۃ ان یظھرھا صیدا للدنیا وطریقا الی الاکل بھا فھذہ نیۃ لا تجزی وعلیہ الاعادۃ (ابن عربی)

٣٧٣ (ایمان اور ہدایت کی)

مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ۔ یعنی کافروں اور مومنوں کے درمیان۔

لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ۔ یعنی ظاہر اور صورت کے اعتبار سے مومن اور معنی اور حقیقت کے لحاظ سے کافر۔

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ۔ اللہ کا یہ فعل اضلال اس کی سنت تکوینی کے مطابق ہے جس کے ماتحت وہ ہر عمل پر اس کا ثمرہ مرتب کر دیتا ہے۔

٣٧٤ (اپنے مجرم اور مستحق سزا ہونے کی)

اتنی صریح وعیدوں کے باوجود ہم لوگ جو بلا ضرورت ہر قسم کے غیر مسلموں بے دینوں بد دینوں سے دوستی اور صحبت کے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں تو ہم لوگوں کا کیا انجام ہونا ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا۔

لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ۔ کافروں کے تحت میں پوری طرح وہ چھپے ہوئے کافر بھی داخل ہیں جنہیں منافق کہا گیا ہے۔

اقتضت الآیۃ النھی عن الاستنصار بالکفار والاستعانۃ بھم والرکون الیھم والثقۃ بھم (جصاص)

فقہاء حنفیہ نے ذمیوں کو وکیل مال بنانا اور ان سے شرکت تجارت (مضاربت) میں بھی کراہت کی ہے۔

وقد کرہ اصحابنا توکیل الذمی فی الشری والبیع ودفع المال الیہ مضاربۃ وھذہ الآیۃ دالۃ علی صحۃ ھذا القول (جصاص)

وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ

اور اللہ مومنوں کو عنقریب اجر عظیم دے گا ۳۷۷ اللہ کو تمہارے عذاب سے کیا کرنا

بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

ہے، اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ بڑا قدردان ہے بڑا علم والا ہے ۳۷۸

۳۷۵ (کہ انھیں بچاسکے یا ان کی سزا کچھ ہلکی ہی کراسکے)

فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ۔ ہر منافق اصلاً کافر ہی ہوتا ہے منافق کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے جرم کفر پر ایک مزید جرم مکروفریب کا اضافہ کئے ہوئے ہے اس لئے اگر اُسے کھلے ہوئے کافر سے سخت تر سزا ملے تو یہ عین مقتضائے عقل ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۔ سے فقہاء مفسرین نے محض گنہگاروں کی شفاعت پر استدلال کیا ہے اور تقریر استدلال یہ ہے کہ یہ عدم نصرت کی تہدید چونکہ اہل نفاق کے لئے مخصوص ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ جو منافق نہ ہوں گے ان کی نصرت و شفاعت ہو سکے گی۔

واحتج اصحابنا بهذا على اثبات الشفاعة فى حق الفساق من اهل الصلوٰة (کبیر)

۳۷۶ (جنت اور درجات جنت میں)

مومنین کے ساتھ ان نئے تائبین کا ذکر لانے سے مومنین ہی کی تکریم اور شرف مرتبت نکلتی ہے۔

او قع اجر المومنين فى التشريف لانضمام المنافقين اليهم (کبیر)

مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ کے معنی من المومنین کے بھی کئے گئے ہیں۔

قال الفراء اى من المؤمنين۔ (قرطبی)

تَابُوْا۔ یعنی اپنے عقائد شرک و کفر سے توبہ کرلیں۔

اَصْلَحُوْا۔ یعنی اپنے افعال واحوال کو شریعت کے مطابق وماتحت کرلیں۔

وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ۔ اور اس اعتصام باللہ کے تحقق کے لئے کافروں کی رفاقت کا ترک لازمی ہے۔

اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ۔ اللہ کے ساتھ اخلاص کی یہ شرط منافقت کی جڑ کاٹ رہی ہے، فقہاء نے آیت کے اس جزء سے یہ نکالا ہے کہ اعمال تقرب عبادت ہر قسم کے شائبۂ ریا اور ہر قسم کے دنیوی معاوضہ و نفع سے خالی ہونا چاہیے۔

يدل على ان كل ما كان من امور الدين على منهاج الحق فسبيله ان يكون خالصا لله سالما من شوب الرياء وطلب عرض من الدنيا (جصاص)

اور یہ بھی نکالا ہے کہ نماز، اذان، حج وغیرہ اعمال عبادات پر معاوضہ قبول کرنا جائز نہیں۔

هذا يدل على امتناع جواز اخذ شئ من اعراض الدنيا على ما سبيله ان لايفعل الا على وجه القربة من نحو الصلوٰة والاذان والحج (جصاص)

پوری آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین جو اس قدر وعیدوں کے مستحق ہیں وہ بھی اللہ کی رحمت ومغفرت سے ہمیشہ کے لئے مایوس نہ ہو جائیں توبہ اور اصلاح حال تو ان کی اپنی اختیاری چیز ہے جب اور جس وقت چاہیں سیدھی راہ اختیار کرکے مومنین کی معیت حاصل کر سکتے ہیں کوئی بڑے سے بڑا گناہ بھی ایسا نہیں جو موروثی یا پیدائشی ہو یا ناقابل اصلاح ودائمی ہو۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ

اللہ منہ پھوڑ کر برائی کرنے کو (کسی کے لئے بھی) پسند نہیں کرتا سوا مظلوم

ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ

کے اور اللہ تو ہے بڑا خوب سننے والا، خوب جاننے والا ۳۷۹ تم کسی بھلائی کو ظاہر کرو یا چھپاؤ یا کسی برائی

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

سے درگزر کر جاؤ ۳۸۰ تو اللہ تو (بہرصورت) بڑا معاف کرنے والا ہے بڑا قدرت والا ہے ۳۸۱

۳۷۷ (وجب یہ تائبین اور مخلصین مومنین کے ساتھ ہوئے تو ظاہر ہے کہ اجر عظیم ان کے حصہ میں بھی آکر رہے گا) اس میں سبق ہے ان خاندانی اور پشتینی مسلمانوں کے لئے جو آج کفر و نفاق سے تائب نومسلم یا نومسلموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں یہ اسلامی اور ایمانی برادری میں نئے شامل ہونے والے بھائی ہیں جو اور زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہوتے ہیں۔

۳۷۸ خطاب منافقوں سے ہے انھیں بتایا ہے کہ تمھاری سزا دینے پر اللہ تعالیٰ کا کوئی کام تو معلق ہے نہیں، یہ تو محض تمھارا کفر اور کفران نعمت ہے جو تمھیں جنت کی نعمتوں سے استفادہ کے قابل نہیں بنائے ہوئے ہیں۔ اگر اپنے اس عناد کو چھوڑ دو تو رحمت حق تو خود بخود تمھیں لے لے گی۔ اس میں یہ تنبیہ بھی آگئی کہ اسلام کا خدا مشرک اور جاہلی قوموں کے خونخوار و سفاک دیوی دیوتاؤں کی طرح نہیں جسے بندوں کی آزار دہی ہی میں لطف آرہا ہے۔

شَاكِرًا۔ یعنی خدمت اور عبودیت اور اخلاص کا قدردان۔

عَلِيْمًا۔ یعنی ہر ایک کے درجۂ اخلاص سے واقف۔ آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ مومن شاکر عذاب الٰہی سے دور رہے گا۔ فقہاء مفسرین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ مومن صاحب کبیرہ پر عذاب نہیں ہے۔

وقال اصحابنا دلت هذه الآية على انه لا يعذب صاحب الكبيرة (كبير)

۳۷۹ آیت نے مذہب اخلاق کی اصطلاح میں غیبت و بدگوئی کو اور قانون کی زبان میں ہتک عزت کو بالکل ناجائز قرار دیا ہے اور فرد و جماعت، شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و اصلاح کی ایک بڑی اصل دے دی ہے۔ اَلْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ کے تحت میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر آگئی اور اس کے روبرو تلخ کلامی بھی۔ بلا ضرورت اور بلا مصلحت شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں بھی جائز نہیں، نہ سامنے نہ پیچھے۔

اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ مظلوم البتہ اپنے دل کا بخار ایک حد تک کبھی نکال سکتا ہے اور حاکم کے سامنے فریاد بھی لے جاسکتا ہے۔ انسان کے طبعی تقاضوں اور اضطراری یا نیم اضطراری ضرورتوں کا اس حد تک لحاظ بجز شریعت اسلامی کے اور کہیں کیا ہے؟ فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ جھوٹی بات کی شہرت مظلوم کو بھی جائز نہیں ـــــ مظلوموں کے ساتھ ساتھ ظالموں کے بھی حق اسی سچی، فطری، الٰہی شریعت نے تسلیم کرلئے۔

سَمِيْعًا۔ اس میں ایک طرف تو ظالم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد کر جائے نہ جانے اللہ تو بہ جو اس کی سن ہی

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے پیمبروں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیمبروں کے درمیان

وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ

فرق رکھیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی پر تو ایمان لائے ہیں اور کسی کے ہم منکر ہیں ۳۸۲

رہا ہے اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب دی ہے کہ خلق کے آگے خواہ مخواہ زیادہ روتا گاتا نہ پھرے بلکہ یقین رکھے کہ اللہ تو سننے والا ہے۔ ضعیف یہ کہ یہی ظالم و مظلوم دونوں کو دلا دیا ہے کہ کوئی زبان سے نکالے یا نہ نکالے اللہ پر تو ہر ظلم کی نوعیت و حقیقت عیاں ہے۔ بند تھانوی نے فرمایا کہ آیت سے انتقام کی اجازت نکل رہی ہے جس کی ایک فرد شکایت بھی ہے اور ضعفاء کی اس میں بڑی رعایت ہے کہ اس سے دل کا کینہ دور ہو جاتا ہے۔

۳۸۰ء (جو بہر صورت افضل اور اولیٰ ہے)
انسان اپنے نفس کو ٹٹولے تو نظر آئے کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے یا اس پر مال خرچ کرنے سے کہیں زیادہ شاق نفس پر یہ گزرتا ہے کہ کوئی ہمیں دکھ پہنچائے اور ہم اس سے درگزر کر جائیں اور انتقام نہ لیں اس لئے فعل خیر سے الگ اور ممتاز کر کے اس وصف چشم پوشی اور عدم انتقام کو بیان کیا ہے۔

فندب الی العفو ورغب فیہ۔ (قرطبی)

۳۸۱ء اخلاقی حیثیت سے یہ تین مرتبے الگ الگ ہیں اور انہیں یہاں کیسی صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔
إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ انسان نے نیکی کی، ساتھ ہی وہ اس کا اظہار و اعلان بھی کر دیا، خلق سے داد لینے کی خواہش ایک حد تک طبعی ہے، نیکی یہ بھی ہوئی مگر ہلکی قسم کی، بلندی کی سطح کی۔
أَوْ تُخْفُوهُ اس سے اونچا مرتبہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور خلق سے داد و صلہ کی پروا ہی نہ رکھے، بلکہ اسے خلق کے علم میں آنے ہی نہ دے اور مقصود اس سے تمام تر رضائے الٰہی ہی رکھے۔
تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ انہیں نظر انداز کر جائے اور برائی کرنے والے سے بدلہ نہ لے، نفس کے لئے بہت ہی شاق ہے اور یہ مرتبہ سلوک و اخلاق کے منتہی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔
عَفُوًّا۔ اس صفت کو لا کر یہ یاد دلا دیا کہ درگزر کی صفت تو صفات کمالیہ الٰہیہ میں سے ہے کیا خوب ہو جو بندہ بھی اپنے کو اسی رنگ میں رنگ لے۔
قَدِيرًا۔ یہ لفظ لا کر ادھر اشارہ کر دیا کہ بندہ بیچارہ انتقام لے ہی کیا سکتا ہے، انتقام پر قدرت کامل تو اللہ ہی کو حاصل ہے اور وہ اس کمال قدرت کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتا رہتا ہے ـــــ بندوں کو عفو و درگزر کی راہ پر لانے کا کتنا مؤثر و حکیمانہ طریقہ یہ ہے!
امام رازیؒ نے جن کی نکتہ رسی قرآن فہمی میں قابل صد رشک ہے، یہاں خوب بات فرمائی ہے کہ آیت کے ان دو مختصر سے فقروں میں سارا خلاصہ اخلاق و سلوک آ گیا۔

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک راہ درمیانی نکالیں ۳۸۳ تو یہی لوگ حقیقی کافر

حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ

ہیں ۳۸۴ اور ہم نے کافروں کے لئے ایک عذاب رسوا کرنے والا تیار کر رکھا ہے ۳۸۵ اور جو لوگ اللہ اور اس کے پیمبروں

وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۔

پر ایمان لائے اور وہ لوگ ان کے درمیان فرق بھی نہیں کرتے ۳۸۶ تو ایسے لوگوں کو (اللہ) ضرور ان کا اجر دے گا

دخل فی هاتین الکلمتین جمیع انواع الخیر واعمال البر. (کبیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس طرح پہلی آیت میں ضعفاء کی رعایت تھی، یہ آیت اہل ہمت کے مناسب حال ہے، اس میں مصلحت عروج الی القرب ہے۔

۳۸۲ یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے اس باب میں بہت کچھ بحث ہوئی ہے، بہرحال اتنا تو صاف ہے کہ اصل اشارہ یہود کی جانب ہے، جو انبیاء سابقین میں سے بہتوں کے تو قائل تھے، لیکن اپنے ہی سلسلہ کے انبیاء میں سے حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے منکر تھے، اور پھر نبوت مصطفوی کے بھی، لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں، اور ان کے تحت میں نصرانی مسیحی آجاتے ہیں، جو نبوت مصطفوی کے تو صاف منکر ہی ہیں، اور رسالت مسیح کے بھی منکر ہو کر الوہیت مسیح کے قائل ہو گئے ہیں، بلکہ آج کل کے بہت سے "آزاد خیال" اور "روشن خیال" بھی اس ذیل میں آجاتے ہیں، یورپ میں ایک فرقہ DEISTS (خداپرستوں) کا کہلاتا ہے، اور ہندستان میں بھی برہمو سماج ہے، یہ لوگ توحید کے تو قائل ہیں، لیکن عقیدۂ وحی و نبوت کے منکر — یہ سب مثالیں اسی ناقص اور غلط ذہنیت کی ہیں، جیسے اسلام گھٹانا اور بڑھانا، اور پیدا کرنا نہیں بلکہ مٹانا اور فنا کرنا چاہتا ہے، اسلام و حقیقت تعلیم انبیاء کا قائل ہے، اس کے اندر گنجائش اس کی نہیں کہ فلاں فلاں پیمبروں پر ایمان لایا جائے اور فلاں فلاں کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے آیت میں تنبیہ ان روشن خیال مسلمانوں کے لئے بھی ہے جو شریعت میں سے صرف اپنے پسند مذاق کی چیزیں چن کر لے لینا چاہتے ہیں۔

۳۸۳ جیسے دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر و اسلام کو ملا جلا کر ایک دین الٰہی ایجاد کیا تھا، اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش شروع کی تھی، اور بعض ملحد طبع آج بھی شرک و توحید، کفر و اسلام کو مخلوط و ممزوج کر کے طرح طرح کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی ترکیب و اختراع کی فکر میں لگے رہتے ہیں — ان لوگوں کی نظر دین اسلامی کی وحدت اور اس کے عقائد و ارکان کے اندرونی نظم و ارتباط پر سرے سے ہے ہی نہیں!

۳۸۴ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ایسے لوگوں کا مرتبہ کافروں سے تو بہرحال بہتر ہوگا، نہیں بلکہ یہ لوگ پکے کافر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. جملہ کی ترکیب خود ہی زور پیدا کرنے کے لئے ہے۔

حَقًّا. کا اضافہ تاکید مزید کے لئے ہے۔

ای وهم الکاملون فی الکفر (کشاف) ای لاعبرة بایمانهم هذا (مدارک) وهو تاکید لمضمون

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٥٢﴾ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ

اور اللہ تو ہے ہی بڑا مغفرت والا بڑا رحمت والا۔[٣٨٧] آپ سے اہل کتاب فرمائش کرتے ہیں کہ آپ

عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ

ان کے اوپر ایک نوشتہ آسمان سے اُتروا دیں[٣٨٨] سو یہ تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑی فرمائش کر چکے

فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ

ہیں[٣٨٩] ان سے کہہ بیٹھے تھے کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو، سو ان کی اس زیادتی پر انہیں کڑک بجلی نے آ پکڑا

عمدتهم ... ان هؤلاء ... كفراً كاملاً ثابتاً حقاً يقيناً (كبير)

٣٨٥ ایسے لوگوں کے خیالات ونظریات کی تہ میں اصلی روگ یہی بڑائی کا ہوتا ہے، شعوری یا لاشعوری طور پر بہرحال یہ لوگ سمجھتے یہی ہیں کہ ان کی عقل وحی الٰہی کے مقابلہ میں زیادہ وزن دار ہے اور پیمبر ویسے (نعوذ باللہ) جو کچھ بیان رہ گئیں، ان کی تلافی یہ اپنی عقل آرائیوں سے کر دیں گے ــــ اس کبر وخود بینی کی سزا انہیں آخرت میں بیشک ملے گی، علاوہ جسمانی تعذیب کے یہ خلق کی نظر میں ذلیل ورسوا ہو کر بھی رہیں گے۔

٣٨٦ (ایمان میں)

یعنی یہ نہیں کرتے کہ کسی پیمبر کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں۔ قرآن مجید نے وحدتِ وحی پر بڑا زور دیا ہے اور سارے انبیاء کو ایک مستقل نظام وسلسلہ کے اندر منسلک قرار دیا ہے۔ مومن وہی ہے جو ایمان سارے ہی پیمبروں پر رکھتا ہو گو عمل صرف آخری پیمبر کی شریعت پر کرتا ہو۔

في ... كما فعله الذين ... الاشرية (خبر مبتدأ) (مدارك)

٣٨٧ (تو ایسے ایمان والوں کے لئے کیوں نہ عفو ورحمت سے کام لے گا۔)

سَوْفَ۔ یہاں قرب زمانی کے لئے نہیں، جزم وتیقن کے لئے ہے۔

معناه ان ايتاءه كائن لا محالة وان تأخر ... فالغرض به توكيد الوعد وتحقيقه لا كونه متأخراً (كبير)

متکلمین نے آیت سے معتزلہ کا رد بھی نکالا ہے جو مرتکب گناہ کبیرہ کے دوامِ عذاب کے قائل ہیں، حالانکہ آیت میں صاف مضمون موجود ہے کہ ایمان محض پر بھی اجر ملے گا۔

والاية تدل على بطلان قول المعتزلة في تخليد المرتكب الكبيرة لانه اخبر ان من امن بالله ورسله ولم يفرق بين احد منهم يؤتيه اجره ومرتكب الكبيرة فيمن امن بالله ورسله ولم يفرق بين ... فيدخل تحت الوعد (مدارك) تمسك اصحابنا بهذه الاية في اثبات العفو ... الاحباط فقال انه تعالى وعد من امن بالله ورسله بان يؤتيهم اجورهم والفاسق ... يؤتيهم اجورهم على ذلك الايمان (كبير)

٣٨٨ یہ فرمائش کرنے والے یہود مدینہ تھے، خصوصاً کعب بن اشرف اور اس کی پارٹی۔

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ

پھر بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آچکی تھیں انھوں نے گوسالہ کو (معبود) تجویز کر لیا لیکن

ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

ہم نے اس سے (بھی) درگزر کیا اور ہم نے موسیٰ کو ایک صریح اقتدار عطا کیا۔ ۳۹۰

(ای کعب واصحابہ (ابن عباسؓ)

یہود کہتے تھے کہ ہم ایسی وحی کے قائل نہیں جو فرشتہ کے ذریعہ سے قلب نبی پر نازل ہو، ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ جیسے پیمبر موسیٰ پر لکھے لکھائے ہوئے احکام عشرہ نازل ہوئے تھے تو اگر آپ دعوائے نبوت میں سچے ہو تو اسی طرح کا کوئی لکھا لکھایا صحیفہ منگوا دیجئے۔

قال الیھود ان کنت صادقا فجئنا بکتاب من السماء جملۃ کما جاء موسیٰ بالکتاب (ابن جریر عن السدی)

سأل الیھود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ینزل علیھم کتابا من السماء کما نزلت التوراۃ علی موسیٰ مکتوبۃ

(ابن کثیر عن محمد بن کعب القرظی والسدی وقتادہ) وان یأتیھم بکتاب من السماء جملۃ کما جاء موسیٰ بالالواح (کبیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے اس شخص کی مذمت نکل رہی ہے جو برکات سماوی کو شیخ کے اختیار میں سمجھ کر اس سے افاضہ کی درخواست کر رہا ہے۔

۳۸۹ (سو ایسی قوم سے ایسی فرمائشیں کچھ انوکھی اور نادر نہیں)

ضمناً جواب بھی نکل آیا کہ حضرت موسیٰؑ تو خود ہی ایسی چیز لائے تھے پھر اس پر ان ظالموں نے کب بس کیا؟ اُن سے تو یہ فرمائش کر دی کہ براہ راست اللہ میاں کا دیدار ہی ہمیں کرا دیجئے، یہ سارے واقعات اس غرض کے لئے یاد دلا دیئے گئے کہ ان لوگوں کی تو قومی تاریخ ہی ضد و عناد سے بھری پڑی ہے، ایسی فرمائشوں سے ان کا مقصود تحقیق حق نہیں بلکہ محض مجادلہ و مکابرہ تھا۔

ھذا یدل علی ان طلب ھؤلاء لنزول الکتب علیھم من السماء لیس لاجل الاسترشاد بل لمحض العناد۔ (کبیر)

۳۹۰ (چنانچہ وہ محض نبی و رسول ہی نہ تھے بلکہ اپنی قوم کے حاکم اعلیٰ اور صاحب اقتدار لیڈر بھی تھے)

اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً ۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ ۔ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ ۔ ان سب الفاظ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔ محققین نے کہا ہے کہ آیت میں اس گروہ کا رد نکل رہا ہے جو وقوع رویت باری کا اسی دنیوی زندگی میں قائل ہے۔

یدل علی الانکار علی من یعتقد وقوع الرؤیۃ فی الدار الدنیویۃ۔ (روح)

بِظُلْمِهِمْ میں ب سببیہ ہے۔

بسبب ظلمھم۔ (بیضاوی)

ثُمَّ یہاں تأخر زمانی کے لئے نہیں استبعاد کے لئے ہے یعنی ایسی بیہودہ فرمائشیں ہی کیا کم تھیں کہ اس سے بڑھ کر حرکت یہ کہ گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

اَلْبَيِّنٰتُ ۔ اپنے وسیع مفہوم میں ہے، دلائل و معجزات سب کو جامع۔

ای البراھین والدلالات والمعجزات الظاھرات (قرطبی)

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کردیا تھا ان سے قول و قرار کے لئے، اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازہ (شہر) میں داخل ہو

وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ﴿۱۵۴﴾

عاجزی کے ساتھ اور ہم نے ان سے کہا کہ سبت کے بارہ میں زیادتی نہ کرنا، اور ہم نے ان سے سخت قول و قرار لیا ۳۹۱ سو ہم نے

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

بسبب ان کی عہد شکنی کے اور بسبب آیات الٰہی سے ان کے کفر کے اور بسبب ان کے قتل ناحق انبیاء کے اور بسبب ان کے اس قول کے کہ

وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵۵﴾

ہمارے قلوب محفوظ ہیں ۳۹۲ ہم نے انہیں سزا میں مبتلا کیا نہیں بلکہ (یہ ہے کہ) اللہ نے ان پر مہر لگادی ہے بسبب ان کے کفر کے ۳۹۳ سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت تھوڑا سا ۳۹۴

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ یعنی حضرت موسیٰؑ کے پیش کئے ہوئے دلائل و معجزات جاننے سمجھنے دیکھنے کے بعد۔ شرک اور وہ بھی اپنی بدترین صورت یعنی گوسالہ پرستی، ایسا بھی تمام تر بُرا تھا، فطرت سلیم خود اس سے ابا کرتی ہے لیکن ایک پیمبر برحق کے لائے ہوئے دلائل قوی اور شواہد مبین کے بعد تو اس پستی میں گرنا بدبختی کی انتہا تھی۔

۳۹۱ (ان احکام نیز دوسرے احکام کی تعمیل کے لئے)

رفع طور، داخلۂ باب، احترام سبت، سب پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔

بِمِيثَاقِهِمْ میں ب اظہارِ غرض وغایت کے لئے ہے۔

اي بسبب ميثاقهم ليقبلوه (بيضاوي) والباء للسبب (بحر)

سُجَّدًا۔ یہاں سجدۂ اصطلاحی شرعی مراد نہیں، بلکہ سجدہ اپنے لفظی معنی میں ہے یعنی تواضع کے ساتھ۔

اي متطامنين خاضعين۔ (روح)

۳۹۲ یہود کے نقضِ میثاق پر اور کفر بآیاتِ الٰہی پر اور انبیاء کے قتلِ ناحق پر اور ان کے قول قُلُوبُنَا غُلْفٌ ان سب پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ کی اصل تقدیرِ کلام یوں ہے۔

فبنقضهم ميثاقهم لعناهم عن قتادة وغيره۔ (قرطبي)

عربی اسلوبِ بیان میں ایسے محذوفات عام ہیں، مخاطبین کے علم کی بنا پر محذوف کردیے جاتے ہیں۔

حذف هذا لعلم السامع (قرطبي) قال ابن عطية وحذف جواب هذا الكلام بليغ متروك على ذهن السامع (بحر)

بِمَا میں مَا زائدہ تاکیدِ کلام کے لئے ہے۔

ما زائدة مؤكدة (قرطبي)

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ

نیز بہ سبب اُن کے کفر کے اور بہ سبب اُن کے مریمؑ پر بہتان عظیم رکھنے کے ۳۹۵ اور (نیز)

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ

بہ سبب اُن کے (اس) قول کے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو مار ڈالا جو مسیح اور اللہ کے پیمبر تھے ۳۹۶

۳۹۳ یہ مہر ابتداءً خواہ کبھی نہیں لگتی، جزاءً ہی لگتی ہے، اور یہاں تو اس کی تصریح ہی موجود ہے۔

بکفرھم ای جزاءً لھم علی کفرھم۔ (قرطبی)

۳۹۴ (اور وہ بہت تھوڑا سا ایمان نجات کے لئے کافی نہیں)

یہ ایمانِ قلیل غیر نافع اسی لئے ہوگا کہ یہ کل انبیاء کے ایمان پر شامل نہیں۔

ای الا ایمانا قلیلا ای ببعض الانبیاء وذلک غیر نافع لھم (قرطبی) وھو غیر مفید لان الکفر بالبعض کفر بالکل۔ (روح)

اہل کتاب کا "ایمان" بس ایسا ہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا اقرار کیا، اور عیسیٰ علیہ السلام سے انکار کرتے رہے حضرت اسحٰقؑ کی تصدیق کی لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی تکذیب یا مثلاً حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کو تو مان لیا، لیکن خود خاتم النبیینؐ سے انکار کر گئے۔ ایسی حالت میں لفظ ایمان یا ایمانِ شرعی کا اطلاق ہو ہی کا ہے کو سکتا ہے، ایمان اصطلاحِ شریعت میں تو وہ ہے جو سارے سلسلۂ نبوت پر محیط ہو، نہ ایک نبی پر ایمان لا کر دوسرے انبیاء سے انکار کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

لانہ ایمان لغوی لا شرعی (بغوی) فقد بیّنا ان من کفر برسول واحد فانہ لا یمکنہ الایمان باحد من الرسل البتۃ (کبیر)۔

۳۹۵ (کہ نعوذ باللہ وہ بدوضع تھیں)

بُهْتَانًا عَظِيْمًا۔ یہود کی کتابوں میں ایسی ایسی گندہ روایتیں اس پاک سرشت خاتون کی بابت لکھی ہوئی ہیں کہ ان صفحات پر بغرضِ رد بھی نقل ہونے کے قابل نہیں، قرآن مجید نے اس سارے طومارِ خرافات کی طرف بہ کمال عفت بہتان اور بہتانِ عظیم لا کر اشارہ کر دیا یعنی یہی نہیں کہ الزام میں بڑے مبالغہ سے کام لیا، بلکہ ایسا الزام لگایا جس کی کوئی بنیاد ہی سرے سے نہ تھی

مَرْيَمَ۔ پر حاشیہ پ ۳ میں گزر چکے، یہ عمران کی صاحبزادی اور حضرت عیسیٰؑ کی والدۂ ماجدہ تھیں، نکاح حسبِ روایاتِ انجیل یوسف سے ہوا تھا اور ولادتِ عیسیٰؑ تک صرف منگنی ہوئی تھی (متی۔ ۱: ۱۹۔ لوقا۔ ۱: ۲۴۔ ۲: ۴) یہ یوسف نجاری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے، اور میاں بیوی دونوں بڑے عابد و خدا رسیدہ تھے، معاشرتِ یہود میں منگنی ہمارے ہاں عقد کی جگہ پر تھی اور اُن کے ہاں کا نکاح ہمارے ہاں کی رخصتی کا مرادف تھا۔

بِكُفْرِهِمْ۔ ذکر یہود کی سزا کا چل رہا ہے کہ اُن پر جو یہ عذاب مسلط ہے، فلاں فلاں اسباب سے ہے، یہاں کفر یہود سے مراد اُن کا کفر حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہے۔

ای بعیسیٰ علیہ السلام۔ (بیضاوی)

۳۹۶ یہ [illegible] ہے کہ یہودی کا تھا، جو اس پر خوش بھی ہوئے تھے اور اس کا دعویٰ بھی فخر کے ساتھ کرتے رہتے
چاروں انجیلوں میں یہ داستان بڑی تفصیل اور تکرار کے ساتھ درج ملے گی مثلاً متی۔ باب ۲۶ و ۲۷ میں، مرقس
باب ۱۴ و ۱۵ میں، لوقا باب ۲۲ و ۲۳ میں اور یوحنا باب ۱۸ و ۱۹ میں۔

المسیح۔ رسول اللہ۔ یہ دونوں الفاظ یہود کے نہیں، وہ انہیں دونوں منصبوں یعنی مسیحیت اور رسالت کے منکر تھے، قرآن مجید نے نفس واقعہ کے لحاظ سے ان کا صحیح منصب بیان کر دیا۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب بیان عام ہے۔
[illegible] بصفة عيسى (بحر عن ابن عطية) ويجوز ان يضع الله الذكر الحسن مكان [illegible] ويحتمل ان يكون استئناف من الله تعالى بمدحه [illegible] وصفه بالرسول وان لم يقولوا ذلك (مدارک)

انجیل میں ایک جگہ رومی حاکم کی زبان سے یہ فقرہ درج ملتا ہے: پیلاطس نے ان سے کہا کہ یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں؟ (متی۔ ۲۷: ۲۲) سے اتنا اندازہ تو بہرحال ہو جاتا ہے کہ یسوع کے لئے لقب "مسیح" اس وقت بھی چل نکلا تھا۔

انا قتلنا۔ قتل کے معنی روح کو جسم سے جدا کر دینے کے ہیں، خواہ کسی طریقے پر ہو، تلوار سے، تیر سے، زہر سے، [illegible] اسی کو اردو محاورہ میں "ختم کر دینا" یا "کام تمام کر دینا" کہتے ہیں۔
[illegible] الروح عن الجسد (راغب) [illegible] قتله اى اماته بضرب او حجر او سم او علة (تاج)
[illegible] نے ایک دوسری آیت [illegible] لا تقتلوا الصيد کے تحت میں لکھا ہے، اصل هو [illegible] وهو انواع [illegible] والخنق [illegible] یہاں اصطلاح فقہ یا زبان اردو کا "قتل عمد" نہیں جس کے معنی محض کسی دھاردار آلے سے ہلاک کرنے کے ہوتے ہیں۔

تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سزائے موت اگرچہ رومی عدالت سے ملی اور رومی ملکی عدالت نفاذ سزا پر قادر بھی تھی لیکن آپ کو سزا دلوانے میں اور آپ کے لئے سزائے موت تجویز کروانے میں [illegible] تمام تر یہود ہی کا کام کر رہا تھا، اسی لئے قرآن مجید نے بھی جو تاریخ کی ذہنی حقیقتوں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، بالکل صحیح طور پر آپ کے قتل یا اقدام قتل کی ذمہ داری یہود ہی پر رکھی۔ انجیلیں اتنے جزو پر متفق المعنی (بلکہ ایک حد تک متفق اللفظ بھی) ہیں کہ رومی عدالت کا حاکم پیلاطس [illegible] آپ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس سے برابر بچ رہا تھا، یہ یہودی تھے کہ جنہوں نے استغاثہ پیش کیا، گواہیاں جھوٹی فراہم کیں اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دے کر عدالت کو سزائے موت سنانے پر مجبور کر دیا۔ انجیل متی کا ایک مختصر سا بیان ملاحظہ ہو:-

"جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں، تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔" (۲۷: ۲۴: ۲۶)

یہی [illegible] دوسری انجیلیں بھی کرتی ہیں، بلکہ لوقا میں تو اتنی تصریح اور زائد ہے کہ حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین تین بار کوشش کی لیکن یہود نے ہر دفعہ اس کی بات کو رد کر دیا۔ (۲۳: ۲۲)
یہ بیانات تو مسیحیوں کے تھے، خود یہود کی بھی [illegible] جو قدیم ترین تاریخ عہد مسیح و ما قبل و ما بعد کی دنیائے معلوم میں موجود ہے

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ

حالانکہ نہ وہ آپ کا کام تمام کرسکے اور نہ آپ کو سولی پر چڑھا سکے ۵۹۷ بلکہ ان پر شبہ ڈال دیا گیا ۵۹۸

یعنی جوزیفس کی اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ANTIQUITIES OF JEWISH کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں
اس واقعہ کو قتل کے ساتھ اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے۔ انجیلوں میں بھی جو پیش گوئیاں حضرت مسیح کی زبان سے اپنے قتل کئے جانے کی
بابت منقول ہیں ان میں بھی ساری ذمہ داری سرداران یہود کے سر رکھی ہے اور رومیوں یا حاکموں کا ذکر نہیں آتا:۔

"اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور
فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں۔" (متی ۱۶: ۲۱) "پھر وہ انہیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم
بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔" (لوقا ۹: ۲۲)

۵۹۷ یعنی حضرت عیسیٰ کا کام تمام کر دینا تو الگ رہا، یہود تو واقعۃً اس کی بھی نہ کرسکے کہ آپ کو سولی پر چڑھوا ہی
لیتے، رومی حکومت میں جس کے تحت شام و فلسطین تھے سزائے موت کا طریقہ سولی ہی کے ذریعہ سے تھا۔
وَمَا صَلَبُوْهُ۔ صلب کے اصل معنی محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کے ہیں، چڑھا کر جان لینے کے نہیں۔

هو تعليق الانسان للقتل۔ (راغب)

اردو میں یہ مفہوم تعلیق "سولی دینے" سے نہیں، "سولی چڑھانے" ہی سے ادا ہوتا ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے
فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادرؒ اور علامہ تھانویؒ نے اپنے اپنے اردو ترجموں میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

۵۹۸ یا "وہ دھوکے میں ڈال دیے گئے" یا "حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی"۔
یہ شبہ میں کون پڑ گئے یا حقیقت کن پر مشتبہ و ملتبس ہو گئی؟ ظاہر ہے کہ مراد وہی یہود یا اعدائے مسیح ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔

كأنه قيل وقع عليهم الشبه (مدارك) النبي عليه السلام (بيضاوي)

یا یوں کہا جائے کہ شبہ انہیں مقتول سے متعلق ہوا، اور وہ دھوکے میں اس کی شخصیت کے بارہ میں پڑ گئے۔

شبه لهم المقتول والمصلوب۔ (جلالين)

بہرحال اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکا ہوا، اور وہ حضرت مسیح کے دھوکے میں کسی
اور کو سولی پر چڑھا گئے، لیکن یہ شخص کون تھا، اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی، اس کا قطعی جواب نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی
حدیث صحیح میں، اب سوائے اس کے چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کے جزئیات کو ایک ایک کرکے ملایا جائے، اس وقت کا پس منظر
سامنے رکھا جائے اور جو صورت واقعہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال معلوم ہو اسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا ہے۔
پہلی بات اس سلسلہ میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلم کے لوگوں کے لئے نئے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام،
خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے، چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لئے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں
کا ایک پورا گروہ مل کر بھی اس ضرورت کے لئے کافی نہ ہوا، بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق
و غدار کو ساتھ لینا پڑا، یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے، لیکن امام رازیؒ اس راز سے بھی واقف ہیں، فرماتے ہیں:۔

والناس ما كانوا يعرفون المسيح الا بالاسم لانه كان قليل المخالطة للناس۔ (كبير)

گرفتار کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی شامل تھی، اس پر بھی گرفتاری بلا شناخت کے لئے انھیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسوع نے ان سے پوچھا تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو، یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ تو چکا ہوں کہ میں ہی ہوں" (۱۸: ۳-۹) حضرت مسیح کا عظیم قبیل وجاہت بھی کی پیداوار ہے معاصرین فی الیقین معاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نام ایک بدنام وغیر معروف مجرم کی تھی، وہ سامنے موجود تھا، اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا، حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

دوسری بات اس سلسلے میں یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرت کو نیا یہ الفاظ یہود یسوع ناصری کو تبدیل ہیئت پر خاص قدرت تھی، انجیلوں میں حضرت کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے۔ چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا۔" (متی ۱۷: ۱-۲) "جب وہ دعا کر رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔" (لوقا ۹: ۲۹، نیز مرقس ۹: ۲)

یہ گو معجزانہ تھا، یہ ایک الگ بحث ہے بہر حال تبدیل ہیئت پر آپ کو نفس قدرت حاصل تھی۔

تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لینا چاہئے کہ ملک (شام و فلسطین) کی عام آبادی اس وقت اسرائیلیوں (یہود) ہی کی تھی اور اسی برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے، لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی، اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھے بلکہ صورت شکل، وضع و لباس، نسل و زبان، معیشت و معاشرت وغیرہ میں بھی ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے کل تک ہندوستان کے حاکم انگریز ہندوستانیوں سے نمایاں طور پر مختلف و ممتاز تھے، اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے یکساں اور گوروں کو سارے کالے ایک سے معلوم ہوتے تھے، اسی طرح بدیسی حکمران رومیوں کی نظر میں سارے یہود یا اسرائیلی بھی ایک ہی سے تھے۔

چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملا لیجئے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی، وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف (ٹی) T کے مشابہ یا اس سے ملتی جلتی ہوتی تھی، وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی، صرف اس کا سیدھا اور کھڑا استون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا، باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی پڑتی تھی، اس کے لئے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا، اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے:-

(۱) حکم جب سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا، اور دن آخر ہو رہا تھا، اور یہود کو جلدی تھی کہ کسی طرح فراغت پا کر شام ہوتے شام گھر واپس آ جائیں، جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا، اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کو سزا دہی وغیرہ بھی ممنوع تھی، اور پھر یہود کا اہم تہوار یعنی عید فسح (PASSOVER) بھی شروع ہو رہی تھی، الغرض یہود کو اس کی بہت ہی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

(۲) لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیح) کے لئے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں، جمہ صاحب کہ یہودی تھے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انھیں چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے

اب اس ساری صورتِ حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیشِ نظر رکھ کر فرمایئے کہ رومی سپاہی جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سولی کے لئے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لئے ہوئے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے، ایسے موقع پر کیا کرتے — خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے، انھوں نے وہی کیا جو ان کی جگہ پر کوئی بھی ان کا ساحکمران قوم کا فرد کرتا، انھوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اس پر لاد دی! — انگریز گارد ایسے موقع پر اپنے کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لئے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؟ خصوصاً جب کہ ہندوستانی تماشائیوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ بھی اس مجرم کے ساتھ جاری تھی یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا اور چوبِ صلیب اس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں، انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے:

"انھیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا، اُسے بیگار پکڑا کہ اس کی صلیب اُٹھائے" (متی ۲۷: ۳۲) "اور شمعون نامے ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا، انھوں نے اُسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے"۔ (مرقس ۱۵: ۲۱) "اور جب اس کو لئے جاتے تھے تو انھوں نے شمعون نام ایک کرینی کو جو دیہات سے آتا تھا پکڑ کے صلیب اسی پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے"۔ (لوقا ۲۳: ۲۶)

جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ منظم مجمع نہیں بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اس سے تمسخر کرتا ہوا سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارد جو ساتھ تھا اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل و دخل شروع ہوتا ہے، وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس شخصیت کا نام ہے، وہ اپنے حسبِ دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لدی ہوئی تھی — ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کی نظر میں سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس لئے باہم گرہم شکل اور یکساں، انھیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا، انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آسکتا تھا، شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ اُدھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اُسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا، اور وہ چیختا چلاتا رہا، حضرت مسیح قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیے مارتے رہے۔!

ہمارے اکابر نے اس شخص کا نام جس کو حضرت عیسیٰؑ کے دھوکے میں سولی پر چڑھا دیا گیا، حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے یودس (GU DOS) لکھا ہے اور یہی عقیدہ بعض مسیحیوں کی جانب بھی منسوب کیا ہے (البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۹۴ طبع مصر) وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ یہ عقیدہ تو ایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ۔ BASILIDES کے نام سے گزرا ہے (بانیِ فرقہ کا سالِ وفات سنہ ۱۳۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا، اور کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے، قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے، لیکن پولوس (متوفی سنہ ۶۷ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی اس کی تو بنیاد ہی عقیدہ کفارہ پر ہے یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہو کر اور صلیب پر جانکنی کی تکلیف اٹھا کر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، اس لئے یہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیتِ مسیح کو مانے اور فرض کئے ہوئے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی اس لئے لامحالہ اسی پولوسی اور کلیسائی مسیحیت نے

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ

اور یہ لوگ آپؑ کے بارہ میں اختلاف کررہے ہیں ۳۹۹ وہ آپؑ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۰۰ اُن کے پاس کوئی علم

عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ

(صحیح) تو ہے نہیں بجز گمان کی پیروی کے ۴۰۱ اور یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپؑ کا کام تمام نہیں کیا ۴۰۲ البتہ آپؑ کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا ۴۰۳

کل قدیم صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "بدعتی" اور "مبتدع" قرار دے کر کلیسا سے خارج کردیا اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنانِ عیسیٰ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے، یعنی یہی کہ عیسیٰؑ صلیب پر وفات پاگئے! گو ظاہر ہے کہ اس اشتراکِ عقیدہ میں بھی دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود وفاتِ عیسیٰؑ کو موقع تحقیر واہانت میں بیان کرتے ہیں اور مسیحی بعینہ اسی واقعہ سے آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں، لیکن نفس عقیدہ بہرحال دونوں میں مشترک ہے اور بڑے تاسف اور قلق کا مقام ہے کہ آج بیسویں صدی عیسوی میں بعض کلمہ گو فرقے بھی اسی گمراہی کی طرف واپس جارہے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ وفاتِ مسیحؑ کے اس باطل اور خلافِ تحقیق عقیدہ کو "روشن خیالی" کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں!

۳۹۹ (آپس میں اس طرح کہ کوئی آپ کو مرتبۂ اُلوہیت پر پہنچائے دیتا ہے اور کوئی مرتبۂ عبدیت کاملہ سے بھی نیچے اتارے لاتا ہے)

فیہ۔ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔

ای فی شان عیسیٰ علیہ السلام (روح) ای فی عیسیٰ (مدارک) ای فی عیسیٰ (جلالین)

الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ سے مراد یہود ونصاریٰ اور ان کے مختلف فرقے ہیں کہ کوئی آپؑ کو (نعوذ باللہ) شعبدہ باز قرار دے رہا ہے، اور کوئی (نعوذ باللہ) آپؑ کی خدائی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

المراد من الموصول مایعم الیھود والنصاریٰ جمیعا (روح) قیل الضمیر عائد علی الیھود والنصاریٰ۔ (بحر)

۴۰۰ یعنی نظریہ پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں اور کوئی بات بنائے نہیں بنتی۔ مسیحی یہودیوں سے دست وگریباں ہیں اور یہودی یہودیوں سے اندر ہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے دونوں قوموں میں ہوگئے ہیں اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں۔

شَكٍّ۔ یہاں اصطلاحِ منطق میں نہیں یعنی قول مساوی الطرفین نہیں جس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے بلکہ اپنے لغوی مفہوم میں یعنی قول بلا دلیل، غیر مستند، غیر محقق۔

الشک ضد الیقین، واما معناہ فی اصل اللغۃ فھو قریب من معنی الجھل وعدم استبانۃ مایحصل فی الذھن من الامر (المنار) المعروفۃ فی مقابلۃ الشک (المنار)

۴۰۱ (اور گمان یا اٹکل حقیقت رسی میں کہاں تک کافی ہوسکتی ہے!)

مسیحیوں نے تو غضب ہی کر رکھا ہے اپنے سارے مذہب یعنی اُلوہیتِ مسیحؑ، وفاتِ مسیحؑ اور احیاءِ مسیحؑ کی بنیاد ہی ظن وتخمین پر رکھی ہے۔

لَهُم۔ میں ضمیر اِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا کی طرف ہے یعنی وہ لوگ جو حضرت مسیحؑ کے باب میں جھگڑ رہے ہیں یہود ونصاریٰ اور ان کے اندرونی فرقے۔

مِنْ عِلْمٍ. علم سے مراد علم صحیح قطعی ثابت بالدلائل ہے اور مِن نحویوں کی اصطلاح میں زائد ہے۔

من زائدۃ (قرطبی)

مراد یہ ہے کہ علم صحیح کا کوئی حصہ بھی ان لوگوں کے پاس نہیں۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ یہود اور مسیحی دونوں قوموں کی روایتوں اور کتابوں کی باطل تحریفوں پر قرآن مجید نے ان تصریحات سے خط تنسیخ کھینچ دیا ہے۔

لکن یتبعون فیہ الظن الذی تخیلوہ (جلالین)

ظن یہاں مقابل علم کے ہے یعنی ایسا قول جو بے دلیل ہو اور جس کا مبنی نہ کوئی نقل ہو نہ اس سے کوئی استنباط۔ بعض لوگوں نے آیت کے الفاظ سے نفی قیاس فقہی پر جو دلیل قائم کرنا چاہی ہے وہ بے اصل ہے قیاس فقہی تو خود ایک دلیل شرعی ہے استنباط و استخراج کے مراد ہے۔

۴۲۰ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا. میں یقیناً نفی قتل کی تاکید کے لئے ہے۔

ای انھم ما قتلوہ حقا (کشاف) ما قتلوہ حقا فجعل مثالا للقوۃ وما قتلوہ (مدارک) حال مؤکد لنفی القتل (جلالین)

جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یقین خود یہود کو بھی آپ کے قتل کا نہیں بلکہ یہ تو محض وہم و ظن کی بنا پر وہ کہہ رہے ہیں۔

ای ما قتلوہ قتلا متیقنا بل انما حکموا تخمینا و وھما (راغب)

عقیدۂ قتلِ مسیح چونکہ بہت بڑی غلط فہمی یا گمراہی کا باعث ہے اور دنیا کی دو بڑی قومیں یہود اور مسیحی اسی غلطی میں مبتلا ہیں، اس لئے قرآن مجید نے بھی اس کی تردید میں اتنا اہتمام کیا۔

۴۲۱ (اور اس امتیاز خاص سے آپ کو سرفرازی بخشی)

اِلَيْهِ. لفظی معنی ہیں اپنی طرف لیکن مفسرین نے مراد اپنے آسمان کی طرف لی ہے، قرآن مجید میں اس طرح کے حذفِ مضاف کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور جس طرح "اللہ نے اپنی طرف بلا لیا" سے مراد لی جاتی ہے کہ آخرت کی طرف بلا لیا، اسی طرح عربی اور اردو دونوں محاوروں میں اللہ کی طرف اٹھا لینے سے مراد آسمان کی طرف اٹھا لینا ہوتی ہے۔

ای الی السماء واللہ تعالی متعال عن مکان (قرطبی) الی السماء (مدارک) الی سمائہ (بحر)

اہلِ لغت نے بھی یہ معنی جائز رکھے ہیں۔

یحتمل رفعہ الی السماء (راغب)

رَفَعَهُ. رفع کے اصلی معنی رفعِ جسمانی یا رفعِ مادی ہی کے ہیں۔

الرفع یقال فی الاجسام الموضوعۃ اذا اعلیتھا عن مقرھا (راغب)

مجازی معنی یعنی رفعِ مراتب کے بھی جائز ہیں۔

ای رفعہ من حیث التشریف (راغب)

لیکن حقیقت کو چھوڑ کر مجاز اختیار کرنے کی کوئی وجہ قوی موجود ہونا چاہئے اور وہ یہاں موجود نہیں۔ بعض فرقوں کا یہ استدلال کہ چونکہ رفع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہے اس لئے رفعِ جسمانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا، اور اس لئے لامحالہ رفع مجازی یعنی قربِ منزلت ہی مراد ہوگی، قرآن فہمی سے بُعد پر مبنی ہے، آخر قرآن مجید ہی میں اس طرح کی آیات دوسری بھی تو موجود ہیں:۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ

اور اللہ بڑا قوت والا ہے، بڑا حکمت والا ہے ۴۰۴ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ پر اپنے مرتے وقت

بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

ایمان نہ لے آئے ۴۰۵ اور آپ قیامت کے دن اُن پر گواہ (کی حیثیت سے پیش) ہوں گے ۴۰۶

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ. یہاں ہجرت الی اللہ سے کھلی ہوئی مراد ہجرت الی دارالاسلام یا ہجرت الی المدینہ ہے، اسی طرح قال ابراہیم انی ذاہب الی ربی. یہاں بھی سب کے نزدیک ذہاب الی رب سے مراد ذہاب الی الشام ہی ہے وقس علی ھذا۔

امام رازیؒ نے خوب لکھا ہے کہ تعظیم و تشریف کے جس سیاق میں یہاں ذکر رفع الی اللہ کا ہے، وہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ رفع کوئی امتیازی اور مخصوص چیز ہے، متقین و صالحین کے عام دخولِ جنت اور وہاں کی لذاتِ جسمانی و حسی سے الگ۔

مسیح کے رفعِ جسمانی کا عقیدہ لازمۂ ایمان اور شرطِ اسلام ہو یا نہ ہو، بہرحال ظاہرِ قرآن سے قریب تر تو ہے اور جمہور علماء سلف کے مطابق۔ رفعه اليه اعظم في باب الثواب من الجنة ومن كل ما فيها من اللذات الجسمانية (کبیر)

۴۰۴ صفت عَزِيْزًا لا کر یہ یاد دلا دیا کہ وہ اپنے نبی کو بچا لینے پر بھی قادر، اور اُسے اٹھا لینے پر بھی قادر، رفعِ جسمانی و رفعِ روحانی دونوں پر قادر۔ صفتِ حَكِيْمًا لا کر ادھر اشارہ کر دیا کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کے دشمنوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ عین مقتضائے حکمت تھا۔

۴۰۵ (جب عالمِ برزخ کا مشاہدہ شروع ہو جاتا ہے اور اس لئے وہ ایمان نافع نہیں ہوتا)

قَبْلَ مَوْتِهٖ میں ضمیر کتابی کی طرف ہے اور مراد ہے موت کے وقت۔

يؤمن بعيسىٰ اذا عاين الملكُ ولكنه ايمان لا ينفع لانه ايمان عند الياس وحين التلبس بحالة الموت (قرطبی) لا يموت يهودي حتى يؤمن بعيسىٰ (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) كل صاحب كتاب يؤمن بعيسىٰ قبل موته (ابن جریر عن مجاهد) هذا قول اكثر المفسرين واهل العلم (معالم) يعني اذا عاين قبل ان تزهق روحه حين لا ينفعه ايمانه لانقطاع وقت التكليف۔ (کک ف)

اور اس معنی کو بڑی تقویت دوسری قرأت سے ہو جاتی ہے جو موتہ کے بجائے موتہم کی ہے۔

يؤمن كل يهودي بعيسى عند موته وتحقيق ذلك في قراءة اُبي الا ليؤمنن به قبل موتهم۔ (معانی)

قبل کا اطلاق عربی میں جس طرح تقدمِ منفصل پر ہوتا ہے، تقدمِ متصل پر بھی ہوتا ہے۔

يستعمل في تقدم المتصل والمنفصل۔ (راغب)

اور یہاں تقدمِ متصل ہی مراد ہے یعنی مرتے وقت۔

بِهٖ میں ضمیر بالاتفاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ۔ یعنی آپ کا جو صحیح مرتبہ عند اللہ ہے اُسے وہ جان کر اور اس کا اعتراف و اقرار

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ

سو یہود کی (ایسی ہی) زیادتیوں کے باعث ہم نے ان پر بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں حرام کر دیں ۴۰۷

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۱۶۰)

اور اس سبب سے بھی کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے ۴۰۸

لگ رہے ہیں گے۔
اَھْلِ الْکِتٰب۔ لفظ عام ہے لیکن محاورۂ قرآنی میں اکثر اس سے مراد یہود ہی ہوتے ہیں اور یہاں بھی عبارت کا سیاق و سباق انہی کی جانب مشیر ہے۔

ان من اليهود [illegible] لا [illegible] يهودي [illegible] يؤمن بعيسى (ابن جرير عن ابن عباسؓ) [illegible]
[illegible] (روح)

اور اگر وہی عام مفہوم لیا جائے اور یہود و نصاریٰ دونوں مراد سمجھے جائیں، جب بھی معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

يعني اليهود والنصارى [illegible] (روح)

مراد یہ ہوگی کہ مسیحیوں یعنی منزلت عیسیٰؑ میں افراط کرنے والوں اور یہود یعنی منصب عیسیٰؑ میں تفریط کرنے والوں، دونوں پر موت کے وقت صحیح مقام عیسیٰؑ کا انکشاف کر دیا جائے گا۔

۴۰۶ یعنی یہ بتلائیں گے کہ فلاں فلاں نے میری تصدیق کی تھی اور فلاں فلاں نے تکذیب۔

يعني شاهدا عليهم [illegible] (ابن جرير)

شہید کے معنی حکم لگانے والے کے بھی ہوتے ہیں

[illegible] الشهادة [illegible] الحكم (راغب)

۴۰۷ جس طرح افراد کے نفس سرکش کی اصلاح کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض مباحات بھی اسے روک لیا جائے اسی طرح جب قوم کا مزاج اعتدال سے منحرف ہو جاتا ہے تو اس کے لئے بھی مناسب صورت یہی ہوتی ہے کہ جن جائز چیزوں کی وہ عادی تھی، ان سے اسے محروم کر دیا جائے۔
بِظُلْمٍ میں بَا سببیہ ہے، اس سے یہ صاف نکل آیا کہ امت اسرائیلی پر بعد کو جو کچھ بھی سختیاں ہوئیں خود انہی کی زیادتیوں کی بدولت ہوئیں، بلاوجہ نہیں ہوئیں۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی کے سبب سالک سے واردات کا قبض اسی کے مشابہ ہے۔
۴۰۸ یہود کی قومی فرد جرم کی یہ دوسری دفعہ ہے یعنی خود اپنی جانوں پر تو وہ ظلم کر ہی رہے تھے ان کی گمراہی متعدی بھی تھی، دوسروں کو بھی بھٹکا رہے تھے۔
کَثِیْرًا کثیر کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ وہ بہت لوگوں کو راہ حق سے روک دیتے تھے، دوسرے معنی یہ بھی

وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ

اور (اس سبب سے بھی کہ) وہ سود لیتے تھے حالانکہ وہ اس سے منع کردیے گئے تھے ۴۰۹ اور (اس سبب سے بھی کہ) وہ

بِالۡبَاطِلِ‌ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

دوسروں کا مال ناحق کھالیتے تھے ۴۱۰ اور اُن میں سے جو کافر ہیں ان کے لئے ہم نے عذاب دردناک تیار کر رکھا ہے ۴۱۱

ہو سکتے ہیں کہ ان کی روک یا گمراہ کرنے کی خصلت بہت زائد تھی۔ تفسیر سے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ مدتِ طویل تک روک تھام کرتے رہے، غرض کثرت کا تعلق کمیت و کیفیت اور زمانہ تینوں سے ہو سکتا ہے۔

اى جمعا عظيما من الناس اوصد اكثيرا او قد رو بعضهم زمانا كثيرا. (مجن)

۴۰۹ (ان کے پیمبروں کے ذریعہ سے ان ہی کی کتابوں میں)

توریت میں ممانعت سود کے اس طرح کے احکام آج تک لکھے چلے آرہے ہیں۔

"اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور سود مت لے" (خروج ۔ ۲۲ : ۲۵)

"تو اس سے سود اور نفع مت لے، اپنے خدا سے ڈر تا کہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے، نہ اُسے نفع کے لئے کھانا کھلا" (احبار ۔ ۳۵ : ۳۶ ۔ ۳۷)

یہ اور بات ہے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم یہی یہود ہو، اور ان کے "شائیلاک" دنیا کے ادبیات میں ضرب المثل بن گئے ہوں۔

۴۱۰ یعنی ان کی شریعت میں سود، رشوت، خیانت وغیرہ آمدنی کے جن ذریعوں کو حرام کردیا گیا تھا انہی کو اختیار کرکے۔ جن نعمتوں سے یہود محروم کردیے گئے تھے، وہ جتنی اور جو کچھ بھی ہوں، بہر حال اُن سے محرومی کے اسباب یہاں کھول کر بیان کردیے گئے ہیں:۔

(۱) اُن کی ذاتی زبردستیاں، زیادتیاں، گنہگاریاں۔ (فبظلم من الذين هادوا)

(۲) ان کی متعدی گمراہیاں۔ (بصدهم عن سبيل الله كثيرا)

(۳) ان کی سود خواری، وہ بھی ممانعت کے بعد۔ (اخذهم الربوا وقد نهوا عنه)

(۴) ناجائز آمدنیوں سے ان کا تامل نہ کرنا۔ (اكلهم اموال الناس بالباطل)

۴۱۱ (آخرت میں)

اور دُنیوی سزاؤں میں خود یہ نعمتوں سے محروم ہو جانا کیا کچھ کم ہے؟ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیوی سزائیں تو عمومی و اجتماعی رنگ میں ملتی ہیں، چنانچہ فلاں فلاں نعمتوں سے ساری قوم محروم کردی گئی، لیکن آخرت میں سزائیں تمام تر انفرادی اور شخصی حیثیت سے ملتی ہیں، ہر ہر فرد اپنے اپنے اعمال کو بھگتے گا، جہنم کا عذاب الیم صرف انہی افراد کو ہوگا جو کافر ہوں گے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

البتہ ان میں جو لوگ علم میں پختہ اور ایمان والے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر جو آپ پر اتری ہے اور

اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

اس پر بھی) جو آپ سے قبل اتر چکی ہے اور نماز کے پابند اور زکوٰۃ کے ادا کرنے والے ہیں اور اللہ اور

وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں ایسوں کو ہم اجر عظیم ضرور دیں گے ۴۱۲

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ ۚ

یقیناً ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے جیسی کہ ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں پر وحی بھیجی تھی اور ہم نے ابراہیمؑ

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى

اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ اور عیسٰیؑ اور

وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی بھیجی تھی ۴۱۳ اور ہم نے داؤدؑ کو ایک صحیفہ دیا تھا ۴۱۴

۲۲ ع ۱۰ ۲

۴۱۲ (آخرت میں)

آیت میں ایمان کے بھی اہم ترین اجزاء (اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، آسمانی کتابوں پر ایمان) آگئے اور عبادات کے بھی اہم ترین عنوانات، یعنی اقامتِ صلوٰۃ و ادائے زکوٰۃ۔

اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ علم سے مراد علمِ دین ہے۔

اَلْمُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی جو ایمان لے آنے والے ہیں۔

سَنُؤْتِيْهِمْ۔ سَ یہاں تیقن کے لئے ہے۔

والسین لتوکید الوعد (روح)

۴۱۳ یہ جتنے نام یہاں آئے ہیں ان سب پر حاشیے پہلے گزر چکے۔

خطاب کا رُخ زیادہ تر یہود ہی کی جانب ہے، انہی کو بتایا اور سمجھایا ہے کہ سلسلۂ وحی کو تو آخر تم مانتے ہو، اور حضرت نوحؑ اور ان کے بعد کے انبیاء کی نبوت کو بھی تسلیم کرتے ہو، پھر ایک نئے نبی کی شناخت و معرفت میں تمہیں اتنی دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟ حضرت ابراہیمؑ وغیرہ ایسے انبیاء کے ساتھ جن کی نبوت یہود کو مسلم تھی،

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ

اور (دوسرے) پیمبروں پر کہ ان کا حال ہم پیشتر ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں (ہم نے وحی بھیجی تھی) اور ایسے پیمبروں پر (بھی)

عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾

کہ ان کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا ۴۱۵ اور اللہ نے موسیٰ سے (خاص طور پر) کلام فرمایا ۴۱۶

چند ایسے پیمبروں کے نام بھی لے دیئے گئے ہیں جن کی نبوت کے یہود منکر تھے (مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام) یا تقریباً منکر تھے (مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام)۔

۴۱۴ (جیسا کہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کو عنایت ہو چکا ہے)

زَبُوْرًا۔ مادہ زبر کے لفظی معنی کتابت یا لکھنے کے ہیں۔

الزبر الكتابة، زبر الكتاب كتبه (لسان) زبرت الكتاب كتبته كتابة عظيمة۔ (راغب)

اور زبور کے معنی بھی لکھی ہوئی کتاب کے ہیں۔

الكتاب الزبور (لسان) الكتاب المسطور (تاج) وكل كتاب غليظ الكتابة يقال له زبور (راغب)

الزبور بمعنى المزبور كالركوب بمعنى المركوب۔ (المنار)

زبور کے نام سے اس وقت جو کتاب حضرت داؤدؑ کی جانب منسوب موجود ہے، وہ عہد عتیق کے مجموعۂ صحائف میں سے ایک صحیفہ ہے، اور اس مجموعہ کے نمبر ۱۸ پر ہے، اس زبور میں احکام و مسائل شریعت درج نہیں، بلکہ صرف حمد، مناجات، دعائیں وغیرہ ہیں، اور جابجا آخری نبی کی بابت پیش گوئیاں بھی پیش گوئیوں کے ڈھکے چھپے ہوئے انداز میں موجود ہیں۔

۴۱۵ (اب تک)

پھر بعض پیمبر ایسے ہیں جن کا ذکر اس آیت کے نزول کے بعد قرآن مجید میں آگیا، اور بہت سے ایسے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں سرے سے آیا ہی نہیں۔

والاكثرون غير مذكورين على سبيل التفصيل۔ (كبير)

متکلمین نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ضروری نہیں، البتہ سب نبیوں کی اجمالاً تصدیق ضروری ہے۔

والآية تدل على ان معرفة الرسل باعيانهم ليست بشرط لصحة الايمان بل من شرطه ان يؤمن بهم جميعا اذ لو كان معرفة كل واحد منهم شرطا لقص علينا كل ذلك (مدارك)

مِنْ قَبْلُ۔ یعنی اس آیت کے نزول کے پیشتر۔

باقی ہر امت میں تعلیم توحید کا پہنچ جانا خواہ رسول اصطلاحی کے ذریعہ سے، خواہ اس کے کسی نائب کے، قرآن مجید سے ثابت ہی ہے۔ ولقد بعثنا في كل امة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت (النحل پ ۱۴۔ آیت ۳۶)

رشید رضا مصری نے کہا ہے کہ جن پیمبروں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، وہ مشرق میں چین، جاپان، ہند وغیرہ اور

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ

اور پیمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) تاکہ لوگوں کو پیمبروں کے (آجانے کے) بعد اللہ کے

حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾ لَّٰكِنِ اللَّهُ

سامنے عذر نہ باقی رہ جائے ۴۱۷ اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست بڑا حکمت والا ۴۱۸ لیکن (اس کے ساتھ) اللہ

يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ۖ

گواہی دے رہا ہے ۴۱۹ اس (کتاب) کے ذریعہ سے جو اس نے آپ پر نازل کی (اور) اسے اس نے اپنے (کمال) علم سے نازل کیا ہے ۴۲۰

مغرب میں یورپ امریکہ وغیرہ کی طرف بھیجے ہوئے پیمبر ہیں اس لیے کہ ان کی تاریخیں مجہول ہیں اور ان کے ذکر سے اہل عرب کو عبرت وغیرہ کا کوئی فائدہ نہ تھا، باقی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس نے رحمتِ رسالت سے کسی قوم و ملک کو محروم نہیں رکھا ہے۔

فحسبنا المعلم ان الله تعالى ارسل رسلا في كل الامم فكانت رحمته بهم عامة لا محصورة في شعب معين احتكرها لنفسه كما كان يزعم اهل الكتب۔ (المنار)

۴۱۶ (اور اسی خصوصی نعمت سے انہیں سرفراز کیا)

تَكْلِيمًا۔ فعل کلام کے بعد اسی مصدر کو اور اسے بھی تنوین کے ساتھ لانے سے معنی یہ نکلے کہ کلام کی کوئی بہت ہی مخصوص نوعیت مراد ہے ورنہ کلام و مخاطبہ اپنے عام معنی میں تو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے ۔ ایسا کلام جو ہم کلامی و مخاطبۂ انبیاء میں بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے ظاہر ہے کہ عام عقول کے لیے تو ناقابلِ فہم ہی ہوگا۔

مصدر معناه التاكيد (قرطبی) هو الكلام الحقيقي الذي يكون به المتكلم متكلما (قرطبی)

والمعنى ان التكليم بغير واسطة منتهى مراتب الوحي واعلاها۔ (روح)

۴۱۷ یعنی پیمبروں کے آجانے کے بعد اب کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہیں کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر رہی، متکلمین نے یہیں سے یہ اخذ کیا ہے کہ بندوں پر حجتِ الٰہی ارسالِ رسل کے بعد ہی تام ہوئی ہے نہ کہ مجرد عقل کی بنا پر۔

يدل على ان قبل البعثة يكون للناس حجة في ترك الطاعات والعبادات (كبير) احتج اصحابنا بهذه الآية على وجوب معرفة الله تعالى لا يثبت الا بالسمع (كبير) في هذا كله دليل واضح انه لا يجب شئ من ناحية العقل (قرطبی) فيه تنبيه على ان بعثة الانبياء الى الناس ضرورة لقصور الكل عن ادراك جزئيات المصالح والاكثر عن ادراك كلياتها۔ (بیضاوی)

۴۱۸ صفتِ عَزِيزٌ لا کر یاد دلا دیا کہ وہ مالکِ حقیقی ہے، فاعلِ مختار، پیمبروں کے بھیجے ہوئے بغیر بھی ہر عذر کو قطع کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی تو ہے اس صفت کو لا کر یہ بتا دیا کہ اس کی حکمتِ کاملہ مقتضی

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿١٦٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور فرشتے بھی گواہی دے رہے ہیں، اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۲۲۱؎ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور

وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

اللہ کی راہ سے (دوسروں کو) روکا، وہ بڑی ہی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا

كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾ اِلَّا

اور ظلم کیا ۲۲۲؎ اللہ ایسا نہیں کہ انہیں بخش دے اور نہ یہ ہے کہ انہیں کوئی راستہ

طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾

دکھائے بجز راہِ جہنم کے ۲۲۳؎ اس میں وہ پڑے رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ کو اور اللہ کے نزدیک یہ آسان ہے ۲۲۴؎

اس کی ہوئی کہ وہ ظاہری عذر بھی باقی نہ رہنے دے۔

۲۱۹؎ لٰکن۔ کلمۂ استدراک ہے اور استدراک قول ماسبق پر ہوتا ہے یہاں مراد ہے کہ اگر یہ لوگ خصوصاً یہود اب بھی اور اس کے باوجود بھی نبوت محمدی کو نہ مانیں تو ــــ روایتوں میں آتا بھی ہے کہ یہود نے پچھلی آیات انا اوحینا الیک الخ کوسُن کر کہا تھا کہ ہم آپ کی رسالت کی گواہی نہیں دیتے۔

لما نزل انا اوحینا الیک قال القوم لانشھد لک فنزلت لکن اللہ یشھد (کبیر) فی الکلام حذف دل علیہ الکلام کانّ الکفار قالوا ما نشھد لک یا محمد فی ما تقول فمن یشھد لک (قرطبی)

۲۲۰؎ (اور اسی کمال علمی ہی نے تو قرآن کو معجزہ بنا دیا ہے)

اَللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ یعنی اللہ کی شہادت اسی قرآن کے ذریعہ سے ظاہر ہو رہی ہے۔

اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ۔ اس میں قرآن کے لئے صفتِ کمال کا اثبات ہے۔

والمراد من قولہ وصف القرآن بغایۃ الحسن ونہایۃ الکمال۔ (کبیر)

معتزلہ نے جو صفاتِ باری سے انکار کیا ہے اس کا رد بھی متکلمین اہلِ سنت نے یہیں سے نکالا ہے۔

فیہ نفی قول المعتزلۃ فی انکار الصفات فانہ اثبت لنفسہ العلم (مدارک) دلت الآیۃ علی انہ تعالیٰ عالم بعلم (معالم)

۲۲۱؎ یعنی حقیقت نفس الامر کے اعتبار سے اللہ کی شہادت ہر دوسری شہادت سے بے نیاز ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ۔ اللہ کی گواہی تو قرآن کے ذریعہ سے ظاہر ہی ہے لیکن فرشتوں کی گواہی سے کیا مراد ہے؟ عام مفسرین نے یہ پہلو اختیار کیا ہے کہ فرشتے جو ان منکرین سے کہیں افضل و اشرف ہیں جب وہ رسول کی صداقت پر گواہ ہیں تو ان منکرین کی ہستی اور حقیقت کیا ہے لیکن ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سارا تکوینی کاروبار فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تو گویا کائنات کی فعلی شہادت جو درحقیقت

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس (یہ) رسولؐ تمہارے پروردگار کے پاس سے آئے ہیں، سچی بات لے کر ۴۲۵ ۴۲۶ پس ایمان لاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا ۴۲۶ اور اگر تم کفر کرتے رہے ۴۲۷ تو جب بھی اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے، بڑا حکمت والا ہے ۴۲۸

فرشتوں ہی کی شہادت ہے، خود تمام تر رسولِ اسلام اور دینِ رسول کی تصدیق و تائید میں ہے۔
باللّٰہِ میں ب نحویوں کی اصطلاح میں زائد ہے۔
والباء زائدۃ (قرطبی)

۴۲۲ اس ظلم سے مراد دونوں قسم کے ظلم ہو سکتے ہیں، ایک ظلم تو خود اپنے نفس پر ایمان پر کفر و انکار کر کے، دوسرا ظلم یہ ہے کہ دوسروں کو اسلام و ایمان کے راستہ سے ظلم یا مکر سے روکا جائے۔

۴۲۳ یہ بیان ہو رہا ہے قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل کا، کفر اور ظلم کے نتیجے قدرۃً اسلام اور عدل کے نتیجوں سے بالکل مختلف نکلیں گے۔

۴۲۴ اسلام کا خدا مشرک قوموں کے خداؤں کی طرح محدود اور ناقص قوتیں رکھنے والا خدا نہیں، جو اُسے اس سزا ہی کے لئے کسی خاص اہتمام یا تکلف کی ضرورت پڑے، وہ مطلق الاختیار ہے وہ فعّالٌ لّما یرید ہے، جو کچھ چاہے بات کی بات میں کر سکتا ہے، ایسی تمام آیتوں سے اُن قوموں کا رد بھی نکل آتا ہے جو خدا کے اختیارات پر کچھ پابندیاں عائد کئے ہوئے ہیں۔

۴۲۵ (مع قوی دلائل کے)
یٰاَیُّھَا النَّاس خطاب صرف اہلِ عرب یا اہلِ مکہ کو نہیں سارے جہان کو ہے اور یہ دعوتِ قرآنی کی عالمگیری کا ایک اور ثبوت ہے۔
ھذا خطاب للکلّ (قرطبی) خطاب لجمیع المکلفین (روح) ذکر خطابا عاما یعمھم و یعم غیرھم (کبیر)
اَلْحَقّ، اس میں سچے دعوے اور سچے دلائل دونوں آ گئے۔

۴۲۶ ایمان لانے اور زندگی کو شریعت کے مطابق ڈھالنے میں نفع تمام تر بندوں کا اپنا ہی ہے حق تعالیٰ کی کوئی غرض اس سے اٹکی ہوئی نہیں ہے جیسا کہ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کے بارہ میں تصور کر رکھا ہے۔
فَاٰمِنُوْا میں فَ سے اشارہ اس جانب ہے کہ صحیح دعوی اور صحیح دلیل کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ایمان لے آیا جائے۔

۴۲۷ (سو اس کا ضرر کسی طرح بھی نہیں، ضرر سرتاسر تمہارا ہی ہے)
مشرکوں کو یہ حقیقت بار بار یاد دلانے کے قابل تھی، وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو بھی اپنا ہی جیسا محتاج اور غرض مند تصور کرتے تھے۔

۴۲۸ صفت عَلِیْم لا کر یاد دلا دیا کہ ہر ایک کا کفر و ایمان اللہ پر روشن ہے، اس کے حدود علم سے باہر کوئی چیز نہیں۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّۚ

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو ۴۲۹ اور اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو ۴۳۰

إِنَّمَا ٱلۡمَسِيحُ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ

مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک پیمبر ہی ہیں ۴۳۱ اور اس کا کلمہ ۴۳۲

اور صفتِ حکیمٌ ۔ لاکر یہ اشارہ کردیا کہ وہ سزا بھی موقع مناسب ہی پر دے گا۔

۴۲۹ دین میں غلو کرنا یہ ہے کہ عقائد و مسائل میں اضافہ و افراط کو اپنی طرف سے دخل دے دیا جائے خواہ کسی نیت سے ہو۔

الغلو فی الدین ہو مجاوزۃ حد الحق فیہ (جصاص)

اَهۡلَ الۡكِتٰبِ سے یہاں مراد اہلِ انجیل یا نصاریٰ ہیں

ای اہل الانجیل من النصاریٰ (ابن جریر) والمراد بیاہل الکتٰب من النصاریٰ (کبیر) نہی تعالٰی

اہل الکتٰب عن الغلو والاطراء وہذا کثیر فی النصاریٰ (ابن کثیر) نزلت فی النصاریٰ (معالم)

یہود کے مطاعن کا ذکر کرکے اور ان کا جواب دے کر اب ذکر عیسائیوں کا شروع ہو رہا ہے جو یہود کی تفریط کے مقابلہ پر افراط کی حد پر پہنچ گئے تھے اور عیسیٰ مسیح کو بجائے ایک برگزیدہ نبی کے خدا یا خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے۔ اور اللہ کے بتائے ہوئے دین میں کچھ زیادتی یا اضافہ کرنا، ویسا ہی حدودِ ایمان سے خارج ہو جانا ہے جیسا اُس دین کے کسی جزو کو گھٹا دینا۔

فتجاوزوا الحدود التی حدہا اللہ لکم فان الزیادۃ فی الدین کالنقص منہ کلاہما مخرج لہ عن وضعہ (المنار)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہود کا غلو احکامِ ظاہری میں متعلق تھا اور مسائل باطن کی طرف سے اعراض تھا اور مسیحیوں کا غلو مسائلِ باطن میں متعلق اور ظاہری کی طرف سے اعراض تھا، طریقِ حق ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

۴۳۰ یعنی اُلوہیت کے باب میں کوئی عقیدہ اپنی رائے سے گڑھ کر پیش نہ کرو اور توحید میں کوئی شائبہ بھی شرک کا نہ آنے دو

۴۳۱ (نہ کہ خود معبود یا خدا یا مظہرِ خدا)

اللہ کے بھیجے ہوؤں کو، اس کے نائبوں اور رسولوں کو خود معبود سمجھ بیٹھنے کا مرض مشرک قوموں میں عام رہا ہے مسیحیوں نے بھی مصری، یونانی، رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیمبر برحق کو بھی مظہرِ خدا یا فرزندِ خدا کا درجہ دے دیا تھا، یہاں اُس کی تردید ہو رہی ہے۔

۴۳۲ یعنی ان کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا نتیجہ ہے۔

ای صار بکلمۃ من اللہ مخلوقا (ابن عباس) والمعنی انہ وجد بکلمۃ اللہ وامرہ من غیر واسطۃ ولا نطفۃ (کبیر) ای ہو مکون بکلمۃ کن (قرطبی) الکلمۃ التی آلۃ علی التکوین بمحض قدرۃ اللہ تعالٰی عند ارادتہ خلق الشیء وابداعہ وقد خلق المسیح بہذہ الکلمۃ (المنار) وہو تفسیر الکلمۃ التی القاہا الی اُمّہ مریم ومصداقہا والمراد کلمۃ التکوین او البشارۃ (المنار)

اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ

جسے اللہ نے پہنچا دیا تھا مریم تک ۴۳۳ اور ایک جان ہے اس کی طرف سے ۴۳۴ سو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ۴۳۵ اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں ۴۳۶

کلمہ سے مراد یا تو کلمہ کُنْ ہے یا وہ کلمہ جو بواسطۂ جبریل حضرت مریمؑ پر القاء کیا گیا تھا۔

ومعنی کونه کلمة انه حصل بکلمة کن من غیر مادة معتادة والی ذلك ذهب حسن وقتادة (روح) ای قوله کن (معالم) لیست الکلمة صارت عیسیٰ ولکن بالکلمة صار عیسیٰ (ابن کثیر۔ عن شاذان بن یحیی) وتسمیة عیسیٰ بکلمة لکونه موجداً بکن۔ (راغب)

۴۳۳ (بہ واسطۂ فرشتۂ جبریل کے)

ای القاء الکلمة کان من الله ثم من جبرئیل۔ (ابن العربی)

اَلْقٰهَا۔ القاء کا استعمال مادی چیزوں کے علاوہ کلام وغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔

والالقاء یستعمل فی المعانی والکلام کما یستعمل فی المتاع (المنار) ای اوصلها الیها وبلغها ایاها (المنار)

۴۳۴ یعنی اللہ کے زندہ کئے ہوئے اور اللہ کے بنائے ہوئے میں، جو بلا اسباب عادی ظاہری مریمؑ کے بطن میں مجسم ہو گئے

ای تخلیقه وتکوینه (مدارک) ای بامر منه صار ولدا بلا اب (ابن عباسؓ) ای احیاه الله بان تکوینه (ابن جریر) نسبه الی انه روح من الله لانه بامره (ابن جریر) ای من خلقه ومن عنده (ابن کثیر) ای مخلوق من روح مخلوق منه (ابن کثیر)

رُوْحٌ مِّنْهُ۔ روح کا انتساب اللہ کی جانب محض اس کے شرف وعظمت کے لئے ہے جیسے بیت الله یا نعمة من الله میں نسبت تشریفی وتعظیمی ہوتی ہے۔

والمراد من قوله منه التشریف والتفضیل کما یقال هذه نعمة من الله (کبیر) اضیف الروح الی الله علی وجه التشریف کما اضیفت الناقة والبیت الی الله (ابن کثیر) هو روح کسائر الارواح الا انه تعالی اضافه الی نفسه تشریفا (معالم) لما فه الله تعالی الیه تشریفا له کما یقال بیت الله وسماء الله۔ (جصاص)

یہ مراد نہیں کہ صرف انہی میں اللہ کی روح تھی، کسی اور میں اللہ کی روح نہیں ہوتی۔ اللہ کی روح تو ہر فرد بشر میں ہے، ونفخت فیه من روحی۔ قرآن مجید میں بموقع تخصیص وامتیاز کبھی کسی کو عبدنا سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی کسی کو عبدنا سے، حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے عبد سب ہی ہیں۔

اور اللہ کی روح سے تائید عام مومنین کے حق میں بھی آئی ہے اولئك كتب فی قلوبهم الایمان وایدهم بروح منه (المجادلة، آیت ۲۲)

۴۳۵ (اُن ہی پیمبروں کی تعلیمات کے مطابق)

فَاٰمِنُوْا۔ کی فَ میں اشارہ اس طرف ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد وخیالات کو چھوڑ کر ایمان اللہ اور اس کے رسولوں کی ہدایات پر لاؤ۔

۴۳۶ خواہ وہ تین اقنوم ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں۔ مسیحی تثلیث کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

انْتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ

(اور) باز آجاؤ ۴۳۶ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے ۴۳۸ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بیٹا ہو ۴۳۹

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنْ

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ۴۴۰ اور اللہ کا کارساز ہونا کافی ہے ۴۴۱ نہ مسیح

يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ

ہرگز اس سے عار کریں گے کہ وہ اللہ کے بندہ ہیں اور نہ مقرب فرشتے ہی ۴۴۲

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر، عظمتِ ازلی یکساں جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے، باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق، باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود، اور روح قدس غیر محدود، باپ ازلی، بیٹا ازلی، اور روح قدس ازلی، تاہم تینوں ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تینوں غیر محدود نہیں، اور نہ تینوں غیر مخلوق، بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود ——
یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح قدس قادر مطلق، تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے، ویسا باپ خدا، بیٹا خدا، اور روح قدس خدا، بس بھی تینوں خدا نہیں بلکہ ایک خدا!"
ایک طرف یہ گورکھ دھندا، اور دوسری طرف اسلام کا صاف وسادہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ۔ کوئی مناسبت بھی دونوں میں ہے؟

۴۳۷ کہ یہ غالیانہ عقائد کفر بلکہ شرک تک پہنچا دینے والے ہیں۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ آیت حلول و اتحاد کے بطلان صریح پر دال ہے جس کے قائل بعض جہلاء صوفیہ ہوئے ہیں

۴۳۸ واحد ہر اعتبار سے اور اپنے ہر معنی میں، نہ وہ ایک تین میں تقسیم ہے نہ وہ ایک اپنے کو تین شکلوں میں ظاہر کرنے والا ہے، نہ زیوری کی کوئی قسم بھی صحیح ہے — نہ کوئی اس کا اوتار، نہ کوئی اس کا اقنوم، نہ کوئی اس کا بروز، نہ وہ کسی میں حلول، وہ واحد عدد کے اعتبار سے بھی، اور ہر دوسرے اعتبار سے بھی کیا ظاہراً کیا باطناً۔
ثنویت تثلیت اور شرک مطلق کے عقیدے بہت قدیم ہی نہیں، بلکہ یونان، ایران، مصر، ہند، عراق، چین وغیرہ دنیا کے اکثر ملکوں میں شائع رہ چکے ہیں، آیت کا یہ جزو ان سارے ہی عقائد پر ضرب لگاتا ہے۔

۴۳۹ یہ ولدیت کا عقیدہ غلط ہی نہیں بلکہ اصلاً مہمل اور تنزیہ الوہیت کے لحاظ سے تو ہین شانِ الوہیت کے بالکل منافی ہے۔

۴۴۰ خالق کا صحیح رشتہ مخلوق کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے، مالک و مملوک میں مباینت لازمی ہے، برخلاف اس کے والد و مولود کے درمیان مجانست ہم جنسی و ہم نوعی شرط ہے تو جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی۔

۴۴۱ کیا اُسے بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے جو وہ کسی کو شریک کرے؟

۴۴۲ (عار نہ کریں گے کیا عالم ناسوت میں، اور کیا برزخ میں اور کیا آخرت میں)

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ

اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ ضرور اپنے پاس سب کو جمع کرے گا

جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ

۴۴۳ پھر جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انھوں نے نیک کام بھی کئے ہوں گے تو وہ ان کو ان کا

اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ

پورا پورا اجر دے گا اور انھیں اپنے فضل سے اور زائد دے گا ۴۴۴

۴۴۳ اَلْمَسِيْحُ. اَلْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ. ایک طرف حضرت مسیح اور دوسری طرف ملائکہ مقربین یہی دونوں دنیا میں گزرے ہیں، مشرکوں نے فرشتوں کو دیوی دیوتا کے نام دے کر شریک الوہیت ٹھہرایا اور مسیحیوں نے مسیح کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچایا، اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح سے ان دونوں کی نفی الوہیت کی گئی اور بتا دیا گیا کہ اللہ کی عبدیت کوئی چیز توہین والی نہیں، مسیح اور ملائکہ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں نہ کہ اس میں کسی قسم کا بھی عار محسوس کرتے ہوں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ مراتب شرف میں عبدیت مرتبۂ اعلیٰ ہے۔

بعض مفسرینؒ اس آیت کے تحت میں انبیاء و ملائکہ کے درمیان تفاضل کی بحث چھیڑ دی اور ایک گروہ افضلیت ملائکہ کا قائل ہو گیا ہے۔

[illegible]

دوسرے گروہ نے فیصلہ افضلیت انبیاء کے حق میں دیا ہے۔

[illegible]

بہ حیثیت مجموعی معتزلہ اور بعض اشاعرہ فریق اول کے ساتھ ہیں اور جمہور اشاعرہ فریق دوم کے ساتھ۔

[illegible] المؤمنين افضل من الانبياء المرسلين وهو قول القاضي ابي بكر الباقلاني والحليمي من أئمة الاشعرية وجمهور المعتزلة واما جمهور الاشعرية فمفضلون الانبياء على الملائكة (کبیر)

لیکن انصاف کی عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ آیت زیر بحث کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں اور نہ اس مسئلہ میں مناظرہ سے کچھ حاصل ہی ہے جب کہ قرآن و سنت دونوں خاموش ہیں۔

[illegible] الخلاف في هذه المسئلة [illegible]

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا

اور جن لوگوں نے عار و تکبر کیا ہوگا سو انہیں وہ دردناک عذاب دے گا اور یہ لوگ اپنے حق میں

يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ

کسی غیر اللہ کو دوست نہ پائیں گے نہ مددگار ۴۲۵ اے لوگو! تمہارے

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

پاس یقیناً ایک دلیل تمہارے پروردگار کے پاس سے آچکی ۴۲۶ اور ہم تمہارے اوپر ایک کھلا ہوا نور اتار چکے ۴۲۷

۴۲۳ یہاں بیان اس عام قانون کا ہو رہا ہے کہ کوئی اللہ کی بندگی میں عار اور تکبر کر ہی کیوں کر سکتا ہے؟ اللہ تو ایسا حاکم مطلق ہے کہ وقت موعود پر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔

۴۲۴ (جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے)

يُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ۔ یعنی جتنا اجر مقرر و موعود ہے، وہ تو انہیں پورا ملے ہی گا۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی جو لوگ عقیدۃً اور عمل دونوں کے اعتبار سے عبد بنے رہے۔

۴۲۵ خلاصہ یہ کہ بزرگ ترین اور مقبول ترین بندے بھی بہر حال بندے ہی ہوتے ہیں، غالی مریدوں، معتقدوں کا اپنے شیخ یا کسی پیمبر کو اس کی حدِ عبدیت سے باہر نکال دینا اپنے کو مستحقِ عذاب بنانا ہے۔

الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا۔ یعنی جنھوں نے عبد بننے سے عار رکھا۔

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ ولی اور نصیر میں فرق یہ ہے کہ ولی ایجابی طور پر ایصالِ نفع پر قادر ہوتا ہے اور نصیر سلبی طور پر دفعِ مضرت پر۔

ولیا ای قریبا ینفعهم (ابن عباسؓ) نصیرا ای مانعا یمنعهم من عذاب الله (ابن عباسؓ)

۴۲۶ (کافی اور محکم)

بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ اس برہان سے مراد رسول اللہ صلعم کی ذاتِ اقدس ہے، جن کی سیرتِ پاک اور تعلیم کی جامعیت نے ہر مشکل کو آسان اور ہر تنہیر کو پانی بنا دیا ہے۔

ای رسول من ربکم (ابن عباسؓ) یعنی محمدا صلعم عن الثوری (قرطبی) الجمهور علی ان البرهان هو محمد صلعم۔ (بحر)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ۔ خطاب ساری نسلِ انسانی جملہ اہلِ مذاہب کو عام ہے۔

یایها الناس من جمیع اصناف الملل (ابن جریر) یقول تعالٰی مخاطبا جمیع الناس (ابن کثیر)

خطاب لکافة المکلفین (روح)

۴۲۷ یعنی قرآن مجید جس کے اندر بڑے اور چھوٹے انفرادی اور اجتماعی سارے مسائل کا حل موجود ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ

تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اُسے انھوں نے مضبوط پکڑا انھیں وہ ضرور اپنی رحمت وفضل میں داخل

وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿۱۷۵﴾ يَسْتَفْتُونَكَ

کرے گا ۲۲۸ اور انھیں اپنے تک سیدھی راہ دکھا دے گا ۲۲۹ لوگ آپ سے حکم دریافت

قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ

کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تمھیں (میراث) کلالہ کے باب میں ۲۳۰ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے

وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن

کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو ۲۳۱ تو اسے اس کا ترکہ نصف ملے گا ۲۳۲ اور وہ مرد وارث ہوگا اس (بہن)

لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ

کے کل ترکہ) کا اگر اس (بہن) کے اولاد نہ ہو ۲۳۳ اگر دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کو ترکہ کے دو تہائی ملے گا ۲۳۴

ای کتابا مبینا (ابن عباس) انوراً مبیناً هو القرآن عن الحسن (قرطبی) وهو القرآن کما قاله قتادة ومجاهد والسدی (روح)

۲۲۸ یعنی جنت میں داخل کرکے اور بھی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔

آمَنُوا بِاللّٰهِ۔ یعنی اللہ کی توحید اور نفی شرک پر ایمان لائے۔

وَاعْتَصَمُوا بِهٖ۔ یعنی اللہ کے دین کو مضبوط پکڑے رہے۔

بِهٖ۔ میں ضمیر قرآن کی جانب بھی گئی ہے اگرچہ اس پر اعتراض بھی کیا گیا ہے۔

ای بالقرآن (قرطبی) واخرج ابن جریر وغیرہ عن ابن جریج ان الضمیر راجع الی القرآن أعنی النور المبین وهو خلاف الظاهر (روح)

اور اللہ کی طرف ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔

قیل ای باللہ (قرطبی) ای عصموا به سبحانه انفسهم. (روح)

۲۲۹ یعنی دنیا میں انھیں طریق رضا پر ثابت وقائم رکھا جائے گا، اور اطاعت کی برکت سے انھیں ثبات علی الطاعات کی توفیق ہوگی۔

ای یثبتهم علی طریق مستقیم فی الدنیا مقدم ومؤخر (ابن عباس)

اس سے منکرین ایمان واعمال صالحہ کی حالت معلوم ہوگئی کہ اُن کو یہ ثمرات نہ ملیں گے (تھانوی)

وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ

اور اگر (وارث) چند بھائی بہن مرد و عورت ہوں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملے گا ۴۵۵

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

اللہ تمہارے لئے (یہ احکام) کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہی میں نہ پڑو ۴۵۶ اور اللہ ہر شے کا پورا علم رکھتا ہے ۴۵۷

۴۵۰ کلالہ وہ ہے جس کے نہ اولاد ہو اور نہ والدین زندہ ہوں۔

۴۵۱ اور یہ بہن حقیقی یا عینی ہو یا علاتی یعنی باپ کی طرف سے ہو۔ اخیافی یعنی صرف ماں کی طرف سے بہن کا حکم سورہ کے شروع (آیت ۱۲) میں آچکا ہے۔

۴۵۲ (اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو تو اُسے ملے گا، ورنہ خود اُسی بہن پر لوٹ آئے گا۔) چچا، چچا زاد بھائی وغیرہ عصبات میں داخل ہیں، ادائے قرض، اجرائے وصیت بہرحال مقدم ہے۔

۴۵۳ (اور والدین بھی نہ ہوں)

۴۵۴ اور بقیہ ایک تہائی عصبہ کو ملے گا ورنہ بطور رد پھر انہی بہنوں کو مل جائے گا، بہنیں اگر دو سے زائد ہوں تو اُن کا بھی یہی حکم ہے۔

۴۵۵ یعنی بھائی کو دہرا اور بہن کو اکہرا حصہ ملے گا، یہ بیان عام قاعدہ یا اصول کا ہے، باقی تفصیلات کہ عینی بھائی اور عینی بہن کا اثر علاتی بھائی بہنوں پر کیا پڑے گا، کتب فقہ و فرائض میں ملیں گی۔ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً یعنی ایسی میت کے بھائی بہن ہوں جس پر اطلاق کلالہ کا ہو۔

۴۵۶ (اور معاشرت دنیوی اور جزائے آخرت دونوں میں نقصان سے محفوظ رہو) میراث و ترکہ کے احکام کو سرسری و ناقابل التفات سمجھنا خود ضلالت ہی کی ایک قسم ہے۔

۴۵۷ اپنی صفت علم لاکر یاد دلا دیا کہ ان احکام میں بندوں کی ساری رعایتیں اور مصلحتیں جمع کر دی گئی ہیں، اور اس سے احکام تقسیم ترکہ اور زیادہ مؤکد ہو گئے۔

(۵)

رکوعھا ۱۶

سُوْرَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ

ایاتھا ۱۲۰

سورۂ مائدہ مدنی [1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ نہایت مہربان باربار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۥ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ

اے ایمان والو (اپنے) معاہدوں کو پورا کرو [2] تمہارے لئے چوپائے مویشی جائز کئے گئے ہیں بجز

اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ

(اُن چیزوں کے) جن کا ذکر (آگے) تم سے کیا جاتا ہے [3] ہاں شکار اس حال میں کہ تم احرام میں ہو جائز نہیں [4]

[1] سورہ مدنی اس معنی میں ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ رسول اللہ صلعم کے قیام مدینہ (بلکہ آخر عمر شریف) کا زمانہ ہے ورنہ واقعۃً اس کے بیشتر حصہ کا نزول مکہ معظمہ میں حجۃ الوداع (ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ) کے موقع پر ہوا ہے اور کچھ صلح حدیبیہ (سنہ ۶ھ) سے واپسی کے وقت اور کچھ سال فتح مکہ سنہ ۸ھ میں، روایتوں میں آتا ہے کہ جس وقت اس کا نزول ہوا ہے آپ اونٹنی پر سوار تھے نزول وحی کے ثقل کو جانور تک نے محسوس کیا، اور وہ بیٹھ گئی۔

[2] (اور اس کو ایک امر دینی سمجھو)

اَلْعُقُوْد۔ عقد کا لفظ عام ہے اور ہر عہد شرعی کو شامل خواہ اس کا تعلق خالق سے ہو خواہ مخلوق سے —
بامحاورہ شستہ اردو میں اسی کو قول و قرار بھی کہا جاتا ہے۔

العھود التی بینکم وبین اللہ او بین الناس (ابن عباس) والظاھر عموم العقود فی کل ربط یوافق الشرع سواء کان اسلامیا او جاھلیا۔ (بحر)

عبادات کے علاوہ بھی جتنے عہد سیاسیات، تجارت، معاشرہ وغیرہ معاملات و اخلاقیات سے متعلق ہو سکتے ہیں سب اس میں آ گئے

قال الحسن یعنی بذلک عقود الدین وھو ما عقدہ المرء علی نفسہ من بیع وشراء واجارۃ وکراء ومناکحۃ وطلاق ومزارعۃ ومصالحۃ وتملیک وتخییر وعتق وتدبیر وغیر ذلک من الامور ما کان ذلک غیر خارج عن الشریعۃ وکذلک ما عقدہ علی نفسہ للہ من الطاعات (قرطبی)

[3] (اور وہ ذکر کہیں دور نہیں، قریب ہی آ رہا ہے۔ حرمت علیکم المیتۃ الخ کے تحت میں)

بھیمۃ الانعام۔ اضافت تشبیہ کے لئے ہے یعنی مویشیوں سے ملتے جلتے ہوئے چوپائے جو نہ درندے ہوں نہ شکاری

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ① يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَآئِرَ اللّٰهِ

بے شک اللہ جو چاہے حکم دے ۵ اے ایمان والو بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت

وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّينَ الْبَيْتَ

والے مہینوں کی اور نہ (حرم میں) قربانی والے جانوروں کی اور نہ گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کی اور نہ بیت الحرام

الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا

کے قصد کرنے والوں کی جو اپنے پروردگار کے فضل اور رضامندی کے طالب بنے ہیں ۶ اور جب تم احرام کھول چکو تو اب شکار کر سکتے ہو ۷

اما بهيمة الانعام فلملابسة اسمه (بيضاوی) اى ما يماثل الانعام فى الاجترار وعدم الانياب (بیضاوی)

مراد ہیں ہرن، نیل گائے وغیرہ ایسے چوپائے جو شکاری اور درندے نہ ہونے میں مویشیوں (گائے بیل، اونٹ بھیڑ، بکری) سے مشابہ ہوں، البتہ خچر گدھے، وغیرہ جن کی حرمت حدیث صحیح سے ثابت ہے اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔

۴ یعنی شکار حلال چوپایوں کا بھی۔

الصَّيْد شکار سے یہاں مراد صرف ان جانوروں کا شکار ہے جن کا کھانا جائز ہے۔

الصيد فى هذا الموضع مختص بما يوكل لحمه۔ (راغب)

باقی سانپ، بچھو وغیرہ موذی جانوروں کا اس ممانعت سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ ان کے ہلاک کرنے پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے، صید ہی کے لفظ نے اسے بھی واضح کر دیا کہ شکار ان جانوروں کا مراد ہے جو وحشی ہوتے ہیں، اور جن کے پکڑنے میں کسی تدبیر یا حیلہ کی ضرورت پڑتی ہے، عام گھریلو جانور بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ جو عادۃً شکار کر کے نہیں لائے جاتے اور روزانہ محض ذبح کر کے کھانے کے کام میں لائے جاتے ہیں، ان کے ذبح کی کوئی ممانعت نہیں۔

اى ما كان صيداً اوهو حلال فى الاحلال دون الاحرام وما لم يكن صيداً فهو حلال فى الحالين (قرطبی)

وَأَنْتُمْ حُرُمٌ۔ حالتِ احرام میں ہو یا حدودِ حرم کے اندر داخل ہو، خواہ بلا احرام ہی ہو، ممانعت کا اصل مدار صید کا حدودِ حرم کے اندر موجود ہونا ہے۔

۵ (کہ وہی حکم ہمیشہ عین مطابق مصلحت ہوگا۔)

ارادۂ الٰہی سے بالاتر کوئی قانون نہیں جس کے وہ ماتحت ہو، وہ خود سب سے بالاتر ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اسرارِ احکام کی تفتیش کی ممانعت کا اشارہ ہے۔

۶ (اپنے زعم و پندار میں)

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا۔ مشرکین عرب بھی اس وقت حج و عمرہ کی نیت سے بیت اللہ کا قصد کرتے رہتے تھے فضل سے مراد ان کی منفعتِ دنیوی ہو سکتی ہے، حج کے موقع پر تجارت بھی خوب زوروں پر ہوتی تھی۔

رضوان۔ سے مراد ان کے حسب پندار رضائے الٰہی ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ

اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ کسی قوم سے جو تمہیں بیزاری اس بنا پر ہے کہ انھوں نے تمہیں مسجدِ حرام سے روک دیا تھا تو تم

تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠

(اس بیزاری کے باعث) زیادتی کرنے لگو۔ ۵ اور ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقوے میں کرتے رہو۔

قال جمهور المفسرين معناه يبتغون الفضل والارباح في التجارة و يبتغون مع ذلك رضوانه في ظنهم (قرطبی)

شعائر اللہ۔ شعائر جمع شعیرہ کی ہے مراد اعلامِ الٰہی ہیں یعنی وہ چیزیں ہیں جن کے ادب و احترام کے تحفظ کے لئے اللہ نے کچھ احکام مقرر کر دیے ہیں۔

جمع معالم دين الله (معالم)

ان احکام و آداب کی خلاف ورزی کرنا ان شعائر کی بے حرمتی کرنا ہے مثلاً حدودِ حرم اور حالتِ احرام کا ایک ادب یہ ہے کہ ان حدود میں یا اس حال میں شکار بند کیا جائے اب اس کی خلاف ورزی کرنا شعائرِ حرم و احرام سے بے ادبی کرنا ہے۔

والشھر الحرام۔ بطور اسم جنس آیا ہے لفظاً واحد معنیً جمع یعنی سارے حرمت والے مہینے۔

الشهر مفرد محلى باللام الجنسية والمراد به عموم الاشهر الحرم (بحر)

مطلب یہ ہوا کہ ان چاروں متبرک مہینوں میں قتال کی ابتدا نہ کرو۔

الھدی۔ لفظ اُن قربانیوں کے لئے مخصوص ہے کہ جو کعبۂ مقدس کو لے جائی جاتی ہیں۔

الهدي مختص بما يهدى الى البيت (راغب) هي اسم لما يهدى اي جعل شعارا و علما (مدارک)

ان کی بے حرمتی یہ ہوگی کہ ان قربانیوں سے تعرض کیا جائے۔

القلائد۔ یہ پٹے اسی نشانی کے لئے گلے میں پڑے رہتے تھے کہ یہ اللہ کی نذر ہیں یا حرم ہی میں ذبح ہوں گی،

القلائد سے مراد ذوات القلائد ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے تبرکات کی تعظیم بوجہ تعلق ذات واجب التعظیم کے مفہوم ہوتی ہے پھر چونکہ فضل و رضوان کا تعلق مشرکین سے ہے اس لئے یہ مفہوم بھی ہوا کہ طالب رضائے حق قابلِ رعایت ہے اگرچہ اخذِ طریق میں اس نے غلطی کی ہو، اسی طرح دیتھم سے اشارہ رحمتِ الٰہی کے عموم و وسعت کی جانب نکلتا ہے

۵ (جب کہ خود وہ شکار حدودِ حرم میں نہ ہو)

فَاصْطَادُوْا صیغۂ امر ہے لیکن وجوب کے معنی میں نہیں بلکہ صرف اجازت کے مفہوم میں۔

اي فلا جناح عليكم في الاصطياد لزوال المانع (روح) والامر للاباحة بعد الحظر (روح) اباحة للاصطياد بعد حظره عليهم (مدارک) اي فقد أبيح لكم ما كان محرما عليكم في حال الاحرام من الصيد (ابن کثیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ محض ایک امرِ مباح کے لئے صیغۂ امر کا وارد ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس مباح کے ترک سے اس کے ممنوع ہونے کا شبہ ہونے لگے اس مباح کا کرنا ہی مطلوب ہوتا ہے اور یہیں سے ان متشددین کی

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾

اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو ۹ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۱۰

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ

تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت ۱۱ اور جو جانور غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو ۱۲

وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ

اور جو گلا گھٹنے سے مر جائے اور جو کسی ضرب سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جو کسی کے سینگ سے مر جائے اور جسے کوئی درندہ

إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ

کھانے لگے بجز اس صورت کے کہ تم اسے ذبح کر ڈالو اور جو جانور استھانوں پر بھینٹ چڑھایا جائے ۱۳ اور یہ کہ قرعہ کے تیروں سے ۱۴

غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے، جو مباحات کے ترک کر دینے میں حرام ہی کی طرح تشدد و غلو رکھتے ہیں۔

۸ (بلکہ اس عقلی ناگواری اور طبعی انقباض کے باوجود معاملہ ان سے بھی حق و انصاف ہی کا رکھو۔) مراد کفار قریش ہیں، جنھوں نے ۶ھ میں مسلمانوں کو بیت اللہ تک پہنچنے اور عمرہ کرنے سے حدیبیہ میں روک دیا تھا۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ ایسے موذی اور خدا ناترس دشمنوں سے بھی ہر غصہ و اشتعال کے باوجود برتاؤ عدل ہی کا رکھو۔ اللہ اللہ! کیا ٹھکانا ہے اس فراخ دلی کا!

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس سے بغض فی اللہ ہو اس کے معاملات میں بھی حدود شرعی سے تجاوز جائز نہیں۔

۹ کیسے زریں اصول کی تعلیم مل رہی ہے! نیکی میں سب کے شریک رہو، بدی اور فسق میں کسی کا ساتھ نہ دو! "مہذب" قوموں کا سا نمونہ نہ رکھو کہ اپنی قوم سب پر مقدم، اور اپنی پارٹی بہرحال اپنی پارٹی! ادھر قاعدے اور اصول غیروں سے معاملت کے بتلائے تھے، اب یہاں ارشاد آپس کی معاملت سے متعلق ہو گیا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہیں سے معلوم ہوا کہ حسن و قبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے اور مشائخ اہل تربیت کے ہاں اسی قاعدے پر عمل ہے، یہیں سے وجوب ان مجلسوں میں شرکت کا نکل آیا جن کا مقصد اشاعت دین و نصرت دین ہے اور حرمت ان اجتماعی اداروں میں شرکت کی نکل آئی جن سے بے دینی یا بدعملی کی تائید ہوتی ہو۔

الْبِرّ۔ بِرّ بہت جامع مفہوم رکھتا ہے، نیکی کی چھوٹی بڑی ہر قسم اس کے اندر آجاتی ہے۔

البرّ اسم لمجموع ما یتقرب به الی اللّٰه تعالٰی من الایمان والاخلاق والآداب والاعمال وکل واحد منها یعدّ خصلة او شعبة من البرّ (المنار)

اور لغت میں اس کا مفہوم ہی توسعِ خیر کا لیا گیا ہے اور سچائی کو بھی اس میں لیا گیا ہے کہ وہ بھی خیر ہی کی ایک قسم ہے۔

التوسع فی فعل الخیر ویستعمل البرّ فی الصدق لکونه بعض الخیر المتوسع فیه۔ (راغب)

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ

تقسیم کیا جائے یہ سب گناہ (کے کام) ہیں ؃۱۵ آج کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے ؃۱۶ سو تم ان سے

وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نہ ڈرو۔ اور مجھی سے ڈرو ؃۱۷ آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور

نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

تمہارے لئے اسلام کو بہ طور دین کے پسند کر لیا ؃۱۸

ذَكَّيْتُمْ۔ ذکاۃ ذبح کے معنی میں ہے۔

الذکاۃ فی کلام العرب الذبح قالہ قطرب (قرطبی)۔ لتذکیۃ الذبح (فہن) ود کانہ ان نقطع اوداجہ او دمہ وتذکر اسم اللہ علیہ اذا ذبحتہ (مجاز) وذکیت الشاۃ ای ذبحتہا وحقیقۃ التذکیۃ اخراج الحرارۃ الغریزیۃ (راغب)

؃۱۴ ایک دستور اہل جاہلیت کا یہ تھا کہ تیروں پر اجازت و ممانعت کے الفاظ لکھ رکھتے تھے اور بعض خالی چھوڑ دیتے تھے اور سفر، تجارت، جنگ وغیرہ کے اہم موقعوں پر یہ کرتے کہ انہی تیروں سے جا کر فال لیتے اور جو حکم نکل آتا اسی پر عمل کرتے (صحیح بخاری)، کتاب التفسیر میں ایک روایت اسی مضمون کی ہے :۔

والاستقسام ان یجیل القداح فان نہتہ انتہی وان امرتہ فعل ما امرہ وقد اعلموا لقداح اعلاما بضروب یستقسمون بہا۔

صحابہ، تابعین اور اکثر مفسرین سے یہی معنی منقول ہیں۔

یعنی القداح کانوا یستقسمون بہا فی الامور (ابن جریر عن ابن عباسؓ) وکذا روی عن مجاہد وابراہیم النخعی والحسن البصری ومقاتل بن حیان (ابن کثیر) فمعنی الاستقسام بالازلام طلب معرفۃ الخیر والشر بواسطۃ ضرب القداح وہو اختیار الجمہور (کبیر)

مجاہد تابعی کے ایک قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی، فال گیری اور وہم پرستی کی یہ شکل اہل عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، ایران اور روم کی بڑی بڑی مہذب و متمدن قومیں اس میں مبتلا تھیں۔

قال سہام العرب وکعاب الفارس والروم کانوا یتقامرون بہا (ابن جریر، ابن کثیر، قرطبی عن مجاہد)

مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ آج کل چٹھی ڈالنے کا جو دستور نکلا ہے، وہ اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک شکل قمار کی ہے۔

؃۱۵ (اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے دین و آئین کی خلاف ورزی میں داخل ہیں)

ذٰلِكُمْ کا اشارہ ممکن ہے کہ استقسام بالازلام تک محدود ہو، لیکن زیادہ قابل قبول یہ قول ہے کہ ان سب چیزوں کی طرف ہو جن کی ممانعت اوپر آ چکی ہے۔

يرجع إلى جميع ما ذكر من الاستحلال لجميع هذه المحرمات وكل شيء منها فسق وخروج من الحلال إلى الحرام (قرطبي). والإشارة إلى جميع ما تقدم ذكره من التحليل والتحريم (كبير)

ذٰلک۔ اشارہ بعید ہے، یہاں کنایہ ان افعال کی بُعدِ منزلت سے ہے۔

ومعنى البعد في الإشارة إلى بعد منزلته في الشر (روح۔ ابو سعود)

فسق۔ یہاں کفر کے مفہوم میں ہی لیا گیا ہے۔

فسق اي كفر (بحر)

ورنہ یوں عام معنی فسق کے خروج کے ہیں یعنی ان چیزوں یا ان میں سے کسی پر عمل کرنا حلال سے نکل کر حرام کی طرف آنا ہے۔

۱۶ (کہ یہ دین کبھی بھی مغلوب یا گمنام ہو سکے گا)

آیت کے نزول کا وقت یوم جمعہ (ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ ۔ ۵ ربیا ۶ ارمارچ ۶۳۲ء) بعد عصر مقام عرفات ہے۔

نزلت في يوم عيد في يوم الجمعة ويوم عرفة (ترمذی ابواب تفسیر القرآن عن ابن عباسؓ)

رسول اللہ صلعم نے اس کے نزول کے کُل دو مہینے اکیسؔ دن بعد انتقال فرمایا، نکتہ رس و دقیقہ سنج اصحابی آیت کے مضمون ہی سے سمجھ گئے تھے کہ اب دین ہر طرح مکمل و مستحکم ہو چکا، نبی کے مشن کی تکمیل ہو چکی ہے تو اب دنیا میں مزید قیام کی ضرورت کیا رہی اور زمانہ مفارقت نبوی کا قریب آ گیا چنانچہ حدیث و سیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ آیت کو سن کر رو پڑے تھے

۱۷ یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرو۔ یہ گویا وعدۂ الٰہی ہے کہ اب تشویش و تردد کی چیز غلبۂ کفر و استیلاءِ کفار نہیں بلکہ احکام شریعت سے تجاوز و تزلزل ہے یہی چیز ایسی ہے جو مسلمانوں کو ضرر پہنچا سکتی ہے اور ان کے حق وجود کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے خشیت الٰہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی مسلمانوں میں ضعف پیدا کر سکتی ہے نہ کہ اہل کفر وغیرہ کی کوئی خارجی قوت اور تاریخ و تجربہ نے اسے لفظاً بلفظ ثابت کر دکھایا ہے اس پورے چودہ سو سال کے عرصہ میں جب کبھی اور جہاں بھی ملت کو نقصان پہنچا ہے اپنے ہی ضعفِ ایمان، بے عملی سے، بدعملی سے، خوفِ خدا کی کمی سے

۱۸ (قیامت تک کے لئے)

اکملت لکم دینکم۔ یہ اکمالِ دین بہ لحاظ قوت بھی ہے اور بہ لحاظ احکام و قواعد بھی۔

اتممت علیکم نعمتی۔ یہ اتمامِ نعمت اسی دین کی تکمیل سے ہوا، اس اکمالِ دین و اتمامِ نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم، اضافہ، تصرف کی گنجائش نہ رہی، نہ کسی اور نبی کی بعثت کی حاجت ختم نبوت پر اگر کوئی دلیل صریح و مستقل نہ موجود ہوتی تو خود یہی آیت بھی کافی ہو سکتی تھی، عقیدۂ امامت کا، جو در حقیقت اجرائے نبوت ہی کی ایک شکل ہے، رد بھی یہیں سے نکل آتا ہے۔

البتہ ہر دور میں نو پیدا حالات و مسائل کے مطابق نئے نئے احکام کا انکشاف اہلِ علم و اجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب و سنت کے اصول و قواعد کے مطابق و ماتحت قیامت تک کرتے رہیں گے۔

اشیاء کی حلت و حرمت کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا تھا، تو یہ مسئلہ بھی اسی کتاب اتم کے اندر آ گیا اور اس میں بھی اب کسی تغیر و تصرف کی گنجائش نہ رہی۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ فقہائے ظاہر اور حکمائے باطن نصوص سے جو مستنبط کرتے ہیں وہ بھی سب دین ہی میں

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

ہاں جو کوئی بھوک کی شدت سے بے قرار ہو جائے، گناہ کی طرف رغبت کئے بغیر ۱۹ سو اللہ بڑا مغفرت

رَّحِيْمٌ ۝۳ يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ

والا ہے بڑا رحمت والا ہے ۲۰ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیز (کھانے کی) ان پر حلال کی گئی ہے

داخل ہے، ورنہ اکمالِ دین کے بعد اس کی اجازت نہ ہوتی۔

اَلْيَوْمَ دینِ الٰہی چلا تو شروع ہی سے آرہا تھا، لیکن ہر نبی کے عہد میں زمان و مکان کے مصالح و مقتضیات کے لحاظ سے احکامِ شریعت وقت و مقام کے ساتھ محدود و مخصوص رہتے تھے، دین اب پہلی بار عالمگیر اپنے جزئیات و تفصیلات کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اَلْيَوْمَ میں اشارہ اسی جانب ہے کہ اب خدائی پروگرام میں وحدتِ نسلِ انسانی کا زمانہ شروع ہونے کو ہے، دنیا اب تک مختلف جغرافی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت دشوار تھا، اور آپس میں نامہ و پیام کی بھی کوئی آسان راہ نہ تھی، ہر علاقہ گویا اپنے اپنی جغرافی و طبعی سرحدوں کے اندر محصور و محفوظ تھا، دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جو راہ میں حائل رہتے، ان کا عبور کرنا تقریباً محال تھا، ریل، سائیکل، موٹر، لاری، تار، ٹیلیفون وغیرہ خواب و خیال میں بھی نہ تھے، اب کائناتِ ارضی کی تاریخ میں پہلی بار اس کا وقت آرہا تھا کہ انسانیت کے بٹے اور کٹے ہوئے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں، رسل و رسائل کے ذرائع وسیع ہوں، اور جس طرح نظامِ تکوینی میں ہر فرد کے لئے اس کے وجود میں آنے سے قبل ہی اس کے لئے ہوا کا، اور روشنی کا اور پانی کا سامان حکمتِ الٰہی موجود رکھتی ہے، اسی طرح نظامِ تشریعی میں رحمتِ حق نے چاہا کہ نوعِ انسان کی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کا انتظام پیشتر سے موجود رہے، چنانچہ قرآن کے سے جامع ہدایت نامہ و دستورالعمل کو موجود کر دیا گیا۔

۱۹ (اور حرام ماکولات میں کسی شے کو کھا لے)

فاباح اللّٰہ عند الضرورۃ اکل جمیع ما نص علی تحریمہ فی الآیۃ (جصاص)

مَخْمَصَةٍ ۔ کے معنی شدید بھوک کے ہیں۔

المخمصۃ جوع وخلاء البطن من الطعام (قرطبی) ای مجاعۃ (مجاز) قال ابن عباس والسدی وقتادۃ المخمصۃ المجاعۃ (جصاص) قال اھل اللغۃ الخمص والمخمصۃ خلو البطن من الطعام عند الجوع

غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ یعنی حرام شے محض بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر کھائی جائے، حصولِ لذت کی نیت نہ ہو اور نافرمانی یا قانون شکنی مقصود نہ ہو۔

ای غیر معتمد لمعصیۃ فی قصدہ، قالہ قتادۃ والشافعی رحمہما اللّٰہ (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس کی اجازت بضرورت دی، اس سے حظِ نفس کا قصد جائز نہیں، جیسے طبیب یا گواہ عورت یا اس کے جسم کو بضرورت دیکھے، بہ قصدِ شہوت نظر کرنا حرام ہے۔

۲۰ صفتِ غفر لا کر یہ یاد دلا دیا کہ اگر قدرِ ضرورت سے کوئی ایک آدھ لقمہ زیادہ کھا گیا جب بھی

قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ

آپ یہ کہہ دیجئے کہ تم پر (سب) پاکیزہ جانور حلال کئے گئے ہیں اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھا رکھا ہے ان کا شکار جو شکار پر چھوڑے جاتے ہیں

معاف کر دیا جائے گا، اور صفتِ رحمت سے یہ اشارہ ہے کہ قانون ایسے موقع کے لئے دیکھو کیسا نرم و آسان رکھ دیا۔

۲۱ٮ (کتے اور باز کے شکار کئے ہوئے جانوروں میں سے)

یہ سوال کرنے والے منکرین نہ تھے، مومنین و صحابہ ہی تھے، اور حلت و حرمتِ اشیاء کے سلسلہ میں اس ارشاد حق کی ضرورت تھی

بذلك يا محمد اصحابك ما الذي احل لهم (ابن جریر)

لَهُمْ یعنی مسلمانوں پر صحابہ کا اصل سوال یہ تھا کہ شکاری جانوروں (مثلاً کتے اور باز) کے ذریعہ سے شکار کئے ہوئے جانوروں میں سے کون کون حلال ہیں؟ آیا سب ہی حلال جانور اس طریق شکار کے بعد بھی حلال رہتے ہیں یا کچھ مخصوص جانور حلال رہ جاتے ہیں، اور وہ بھی مخصوص شرائط ما تحت؟

اللہ حضرات صحابہ پر بے شمار رحمتیں نازل کرے، امت کے کام کی کیسی کیسی چیزیں خدا اور رسول سے دریافت کر ڈالیں، یہ معلومات اگر پیشتر سے نہ موجود ہوتے تو آج کتنی دشواریاں پڑ جاتیں!

۲۲ٮ جواب یہ ملا کہ جو حلال جانور ہیں وہ اس طریق شکار کے بعد بھی حلال رہتے ہیں، البتہ کچھ شکار کے شرائط آگے آ رہے ہیں۔ طیّب کے اصل معنی مدنیذ و دلپسند کے ہیں، طیب کی تعریف میں لیکن اہل لغت سے بھی نقل ہوا ہے کہ وہ پاک و لذیذ غذا ہے جسے طبع سلیم قبول کرے

يقال طاب الشئ يطيب طيبا فهو طيّب (راغب) واصل الطيب ما يستلذه الحواس وما يستلذ النفس (راغب)

۲۳ٮ دو شرطیں اتنے ہی جواب سے نکل آئیں، پہلی شرط تو یہ نکلی کہ وہ شکاری جانور سکھائے ہوئے سدھائے ہوئے ہوں، اور فقہائے بات سے بات یہ پیدا کی ہے کہ یہ قید صرف وحشی جانوروں کے لئے نہیں بلکہ گھریلو جانوروں کے لئے بھی ہے، چنانچہ گھریلو جانور اگر تربیت یافتہ نہ ہو تو اس کا کیا ہوا شکار حلال نہ ہو گا، البتہ جو جانور (وحشی ہو یا گھریلو) سکھایا ہوا ہو گا اس کا فعل خود شکاری کا فعل سمجھا جائے گا، دوسری شرط یہ ظاہر ہوئی کہ وہ جانور تمہارے چھوڑے ہوئے جھپٹیں، یہ نہیں کہ از خود شکار پکڑ لائیں اور تمہارے سامنے ڈال دیں۔

الجوارح جارحہ کی جمع ہے معنی ہیں ہر شکاری جانور کے خواہ وہ پرندہ ہو یا درندہ۔

تسمى الصائدة من الكلاب والفهود والطيور جارحة (راغب)

جارحہ کا نام ہی اس لئے جارحہ پڑا کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے۔

قيل في الجوارح انها ما يجرح بناب او مخلب (جصاص) سميت جوارح من الجرح لانها تجرح الصيد عند امساكه (مدارک)

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ ترکیب میں اس کا عطف الطیبات پر ہے اور صید مضاف محذوف ہے۔

عطف على الطيبات اى احل لكم الطيبات وصيد ما علمتم فحذف المضاف (كشاف) اى وصيد ما علمتم (قرطبی)

مُكَلِّبِيْنَ۔ مُکلِّب کے ایک معنی تو ہیں کتے کو تعلیم دینے والا، اور دوسرے معنی ہیں شکار پر چھوڑنے والا، دونوں میں کوئی منافات نہیں، اور اہل لغت نے دونوں کی گنجائش رکھی ہے۔

المكلّب معلم الكلاب الصيد مضريها عليه وقد يكون الكليب واقعا على الفهد وسباع الطير (بحر)

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا

تم انھیں اس طریقہ پر سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے ۲۴ سو کھاؤ اس (شکار) کو جسے (شکاری جانور) تمہارے لئے پکڑ رکھیں ۲۵

اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾

اور اللہ کا نام اس (جانور) پر لے لیا کرو ۲۶ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۲۷ بیشک اللہ حساب (بہت) جلد کر دینے والا ہے ۲۸

مکلّب معلم الکلاب علی الصید معلم لھا وقد یکون التکلیب واقعًا علی الفھد وسباع الطیر (لسان)

المکلّب الذی یعلم الکلب (راغب) التکلیب ھو التضریۃ بالشیٔ والتسلط علیہ لغۃً۔ (ابن العربی)

مُکَلِّبِیْنَ کے لفظ سے یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ تعلیم و تربیت صرف کتوں کے ساتھ مخصوص ہے شکاری پرندے بھی بلا اختلاف فقہاء سب اسی حکم میں داخل ہیں۔

لایختص ذلک بالکلاب دون غیرھا فوجب حملہ علی العموم ولا نعلم خلافًا بین فقہاء الامصار فی اباحۃ صید الطیر (جصاص)

گویا یہ پہلی شرط حلت کی تفصیل ہو گئی۔

۲۴ فقہاء نے تعلیم و تربیت کا معیار کتے کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سکھایا ہوا کتا شکار کو پکڑ کر خود نہ کھا جائے اور باز کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سدھے ہوئے باز کو جب آواز دی جائے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلا آئے۔

۲۵ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ یعنی وہ شکار مسلمان شکاری ہی کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ جانور کے اپنے لئے۔ اس نص نے اسے صاف کر دیا جو فقہاء قبل کے الفاظ سے استنباطاً سمجھے تھے اور اس کا معیار وہی ہے جو اوپر کے حاشیہ میں ابھی بیان ہو چکا، تو اگر کتا اس شکار کو خود کھانے لگے یا باز شکاری کے بلانے سے واپس نہ آئے تو یہی سمجھا جائے گا کہ جانور نے شکار مالک کے لئے نہیں اپنے لئے پکڑا۔ عَلَيْكُمْ میں عَلٰی کے معنی لَ کے ہیں اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ جانور خود اس شکار کو نہ کھائے اور اسے شکاری کے لئے روکے رکھے۔

ای حبس لکم ولم یاکل (قرطبی) الامساک علی صاحبہ ان لا یاکل منہ۔ (مدارک)

اور قرطبی نے اس معنی پر صحابیوں میں سے ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ اور تابعین میں سے عکرمہؒ، قتادۃؒ، ابن جبیر اور عطاءؒ کا اور ائمہ فقہ میں سے نخعی، شافعی، احمد، اسحٰق، ابو ثور اور ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا اتفاق نقل کیا ہے۔

والیہ ذھب اکثر الفقہاء (بیضاوی)

البتہ باز، شکرہ وغیرہ شکاری پرندوں کی تادیب اس حد تک ذرا دشوار ہی ہے، اس لئے فقہاء کے دقیقہ سنج گروہ نے انھیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ رکھا۔

وقال بعضھم لا یشترط ذلک فی سباع الطیر لان تادیبھا الی ھذا الحد متعذر (بیضاوی) قال ابوحنیفۃ وابو یوسف ومحمد وزفر یوکل صید البازی وان اکل (جصاص) واما البازی فانہ معلوم انہ لا یمکن تعلیمہ بترک الاکل وانہ لا یقبل التعلیم من ھذہ الجھۃ (جصاص) فان اکل منہ لم یوکل اذا کان صید کلب ونحوہ فاما صید البازی ونحوہ فاکلہ لا یحرمہ (مدارک)

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪

آج جائز کر دی گئیں تم پر (لذیذ) پاکیزہ چیزیں ۲۹ اور جو لوگ اہل کتاب ہیں ان کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے ۳۰

۲۶ یعنی شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ لیا کرو۔

یعنی اذا ارسل جارحۃ فقل بسم اللہ (ابن عباس) ای سموا علیہ عند ارسالہ (مدارک) ومن

شرائط ذکاۃ الصید التسمیۃ علی الارسال (جصاص)

حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے:۔

عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلعم اذا ارسلت کلابک المعلمۃ وذکرت اسم اللہ فکل مما امسکن علیک (صحیح بخاری)

عدیؓ بن حاتم صحابی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سکھایا ہوا کتا اللہ کا نام لے کر چھوڑو تو پھر وہ جو تمہارے لئے پکڑے رکھے اُسے کھا سکتے ہو۔ فقہاء نے حدیث بالا ہی سے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ ذبح حیوانات کے وقت جو بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اسی کے قائم مقام وہ بسم اللہ ہے جو شکار پر شکاری جانور کے چھوڑتے وقت پڑھی جائے۔

ھذا یدل علی ان حال الارسال بمنزلۃ حال الذبح فی وجوب التسمیۃ علیہ (جصاص) وشرط

التسمیۃ من الذابح حالۃ الذبح او الرمی بصید او الارسال (درمختار)

۲۷ (ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے)

ذرا موقع کی تصویر چشم تصور میں لائیے، خوب بھوک لگی ہوئی ہے، شکرا یا کتا بڑے لذیذ گوشت کا جانور پکڑ کر لایا ہے، شوق بے قرار ہے کہ جلد سے جلد اس کے کباب بنیں اور بھنے ہوئے شکار سے جی بھر کر لذت حاصل کی جائے۔ اب کون اس موقع پر یاد دلائے کہ شرائط حلت ذرا مستحضر کر لیجئے، جانور سدھا ہوا ہے یا نہیں؟ اُسے چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ دی گئی تھی یا نہیں؟ وغیرہا۔ بجز تقویٰ الٰہی کے کس میں اس وقت یہ یاد دلانے کی قوت ہے؟

۲۸ (اور یہی مراقبہ ہر دشوار حکم کی تکمیل کو آسان بنا دے گا)

خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن حکیم میں احکام جہاں جہاں بھی آئے ہیں ان کے متصل ہی کوئی اس قسم کا فقرہ بھی ضرور مل جاتا ہے جس سے یاد آخرت یا اللہ کے علم کل کا استحضار ہو جائے، ہر دشواری کو آسان بنا دینے کا، ہر سختی کو پانی کر دینے کا نسخہ اس سے بڑھ کر آج تک نہیں دریافت ہو سکا ہے۔

۲۹ (اور یہ جواز قیامت تک رہے گا، کوئی نئی شریعت اُسے منسوخ کرنے والی اب نہیں آنے کی۔)

طیب پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔

۳۰ (بہ شرطیکہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہ لے دیا گیا ہو۔)

تثلیث مقدس کے نام پر اگر کوئی جانور ذبح ہوا ہو گا تو وہ محققین حنفیہ کے یہاں حلال نہیں، حرام ہو گا۔

قال ابو حنیفۃ وابو یوسف ومحمد وزفر من کان یہودیا او نصرانیا من العرب والعجم

فذبیحتہ من کاۃ اذا سمی اللہ علیہا فان سمی النصرانی علیہا اسم المسیح لم توکل (جصاص)

طعام سے مراد حلال جانور ہیں، جو اہل کتاب کے ہاتھ کے ذبح کئے ہوں، جیسا کہ صحابیوں، تابعین

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ

اور تمہارا کھانا ان کے لئے جائز ہے ۱۳۱ اور (اسی طرح تمہارے لئے جائز ہیں) مسلمان پارسا بیبیاں اور ان کی پارسا بیبیاں

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

جن کو تم سے قبل کتاب مل چکی ہے جب تم انھیں ان کے مہر دے دو ۱۳۲

اور ائمۂ تفسیر نے سمجھا ہے، ورنہ مطلق کھانا تو دوسرے غیر مسلموں کے ہاں کا بھی جائز ہے کچھ اہل کتاب کی تخصیص نہیں۔

وفی المراد بالطعام فیھا وجوہ ثلاثۃ الاول انہ الذبائح والاکثرون علی القول الاول (کبیر) ھو ھھنا خاص بالذبائح عند کثیر من اھل العلم بالتاویل (قرطبی) وعلیہ اکثر المفسرین (روح) روی عن ابن عباس وابی الدرداء والحسن ومجاھد وابراھیم وقتادۃ والسدی انہ ذبائحھم وظاھرہ یقتضی ذلک (جصاص)

بعض فقہاء اُمت نے تصریح اور تاکید کی ہے کہ جن اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے انھیں واقعۃً اور عملاً یہودی اور نصرانی ہونا چاہئے، محض اسمًا یا نسلاً ان کا "قوم" اہل کتاب کے ہاں ہونا کافی نہیں، ورنہ جو علت مشرکین کے ذبیحہ کی حرمت کی ہے وہی یہاں بھی مشترک ہے، حضرت علیؓ اور دوسرے صحابیوں کے فتوے اس باب میں موجود ہیں، اس وقت جو نصرانی محض نام کے تھے ان کے ذبیحہ کے کھانے سے آپ نے روک دیا ہے، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور بعض تابعین سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

عن علیؓ قال لاتاکلوا ذبائح نصاری بنی تغلب فانھم لم یتمسکوا بشئ من النصرانیۃ الا شرب الخمر (ابن جریر) عن ابن عباسؓ قال لاتاکلوا ذبائح نصاری العرب وذبائح نصاری ارمینیۃ (ابن جریر) وقال بھذا من الصحابۃ علیؓ وعائشۃؓ وابن عمرؓ وھو قول طاؤس والحسن (قرطبی)

کثرت سے اکابر تابعین وائمۂ فقہ کا یہ قول موجود ہے کہ کتابیوں کا ذبیحہ بہر صورت جائز ہے۔

وذھب اکثر اھل العلم الی انہ یحل وھو قول الشعبی وعطاء والزھری ومکحول (معالم)

حسن بصری تابعی کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ اگر کوئی یہودی یا نصرانی کے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام خود سن لو جب تو نہ کھاؤ، ورنہ کھا لینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

وقال الحسن اذا ذبح الیھودی والنصرانی فذکر اسم غیر اللہ وانت تسمع فلاتاکلہ واذا غاب عنک فکل فقد احل اللہ لک۔ (معالم۔ روح)

لیکن واضح رہے کہ یہ سارے اختلافات اس صورت حال کے موقع پر ہیں جب جانور بہر حال ذبح ہوا ہو، لیکن جب ذبح ہی کی نوبت سرے سے نہ آئے مثلاً مرغ کو گردن مروڑ کر ہلاک کر دیا گیا تو ایسے غیر مذبوح جانور کے جواز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور آج کل برائے نام مسیحی قوموں میں جو عام دستور ہے، سب پر ظاہر ہے۔

۱۳۱ (سو تم اپنے کھانے سے انھیں بلا تکلف کھلا سکتے ہو)

مسلمان رک رہے تھے کہ معلوم نہیں ہمارے لئے جائز بھی ہے یا نہیں کہ ہم کتابیوں کو اپنے کھانے میں سے

کھاسکیں یہاں تصریح کر دی گئی کہ بے تکلف جائز ہے۔

فلاجناح علیکم ان تطعموھم (مدارک) ای وحل لکم ان تطعموھم من طعامکم (کبیر)

یہ صراحت اس لئے بھی ضروری تھی کہ نکاح کا بیان متصل بعد آرہا ہے ذبیحہ تو طرفین سے حلال ہے لیکن مناکحت کا قیاس اس پر درست نہ ہوگا۔ نکاح کتابیوں کی صرف عورتوں سے مسلمان مرد کا جائز ہے مسلمان عورت کا نکاح کتابی مرد سے جائز نہیں

لاجرم ذکر اللہ تعالیٰ ذلک تنبیہا علی التمییز بین النوعین۔ (کبیر)

۵۳۲ ابھی ذکر کھانے پینے کی حلال چیزوں کا تھا اب ذکر عورتوں کا ہے کہ زن مسلم اور زن کتابی تمہارے لئے حلال ہے مواکلت کی طرح مناکحت بھی انسان کی ایک طبعی خواہش ہے اس لئے دونوں کے احکام اگر اکٹھے لائے گئے تو عین باہمی مناسبت کا تقاضہ ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ۔ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ۔ مسلمات اور کتابیات دونوں کے درمیان اصل قدر مشترک سلسلۂ وحی و نبوت پر ایمان ہے یہود و نصرانیوں کے اعمال فاسقانہ ہوں اور بعض عقائد کیسے ہی غالیانہ ہوں بہرحال اصلاً وہ لوگ توحید ہی کے قائل ہیں اور سلسلۂ وحی و نبوت کے ماننے والے اور عقائد کے باب میں یہی دو عنوانات اہم ترین ہیں البتہ یہ خیال رہے کہ "نصرانیت" موجودہ یورپی قوموں کی مسیحیت کے مرادف نہیں۔

نکاح کتابیوں کے ساتھ بالکل جائز ہے نفس جواز میں کوئی گفتگو اس نص کے بعد چل ہی نہیں سکتی البتہ فقہاء نے مفسدوں پر نظر کر کے اور مصلحت شرعی کا لحاظ کر کے فتویٰ یہ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاحوں سے بچنا چاہئے۔

یجوز تزوج الکتابیات والاولی ان لا یفعل (فتح القدیر) وصح نکاح کتابیۃ وان کرہ تنزیہا (در مختار)

اور کتابیہ حربیہ کے ساتھ نکاح کی کراہت میں تو شبہ نہیں۔

وتکرہ الکتابیۃ الحربیۃ اجماعا لافتتاح باب الفتنۃ (فتح القدیر) واصحابنا یکرھون مناکحات اھل الحرب من اھل الکتاب (جصاص) یجوز للمسلم ان یتزوج کتابیۃ فی دار الحرب ولکنہ یکرہ (مبسوط)

حنفیہ کے اس قول کا ماخذ حضرت علیؓ کا ایک اثر ہے جس میں آپ نے کتابیہ مقیم دار الحرب سے نکاح پر کراہت ظاہر کی ہے۔

بلغنا عن علی بن ابی طالب انہ سئل عن مناکحۃ اھل الحرب من اھل الکتاب فکرہ ذلک وبہ نأخذ (مبسوط)

علامہ شامی نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح غیر حربیہ کے ساتھ تو محض مکروہ تنزیہی ہے لیکن حربیہ کے ساتھ مکروہ تحریمی۔

قولہ والاولی ان لا یفعل یفید کراھیۃ التنزیہ فی غیر الحربیۃ وما بعدہ یفید کراھۃ التحریم فی الحربیۃ (رد المحتار)

وَالْمُحْصَنٰتُ۔ ترکیب میں عطف ہے الطیبات پر اوپر کی آیت میں۔

الْمُحْصَنٰت۔ پر حاشیہ پارہ پنجم کی ابتداء میں گزر چکا، یہاں مراد ہے کہ قید عصمت کی پابند اور پارسا ہوں، یہ نہ ہو کہ ادھر کسی کے عقد میں بھی ہوں اور ادھر بدچلنی اور عصمت فروشی بھی جاری رکھیں۔

الحصان فی النساء ھی العفۃ عن الزنا (ابن کثیر)

لفظ کے لانے سے مقصود عصمت کی عظمت کو بڑھانا اور اس کی ترغیب دینا ہے، ورنہ قانونی حیثیت سے نکاح منعقد تو ہر نیک چلن، بدچلن اور بیوی باندی سب کا ہو سکتا ہے۔

ھی الحرائر والعفائف ولیس ھذا شرط لصحۃ النکاح بل ھو للاستحباب لانہ یصح نکاح الاماء

اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ

اور قید نکاح میں لانے والے ہوں نہ کر (محض) مستی نکالنے والے اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے ۳۳

ع ۵۱ ۵

من المسلمات ونکاح غیر العفائف (مدارک) روی عن الحسن والشعبی وابراهیم والسدی انهم العفائف (جصاص) قال ابو عبید یعنی العواهر فهذا ایدل علی ان معنی الاحصان عندهم هنا کان علی العفة (جصاص)

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ۔ مہر شرط نکاح نہیں لیکن مہر کی عظمت اور اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید بار بار اس کا ذکر تصریحاً کرتا ہے۔

وتقیید التحلیل بایتاء الاجور یدل علی تاکد وجوبها (کبیر) وتقیید الحل باتیانها لتاکید وجوبها (روح)

شیخ رشید رضا مصری نے آیت کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث اس پر کی ہے کہ جن مشرک عورتوں سے نکاح ممنوع ہے اُن سے مراد صرف مشرکات عرب تھیں یا عام مشرکات، اور ابن جریر طبری کے حوالہ سے ترجیح پہلی شق کو دی ہے۔

ملخص هذا الفتوی ان المشرکات اللاتی حرم اللہ نکاحهن فی اٰیة البقرة من مشرکات العرب وهو المختار الذی رجحه شیخ المفسرین ابن جریر الطبری (المنار)

۳۳ نکاح اسلام میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں، ایک اہم اور زبردست اخلاقی اجتماعی روحانی ادارہ ہے اس کے منافع و مصالح فرد کے لئے، خاندان کے لئے، معاشرہ کے لئے سبھی کے لئے بے شمار ہیں اور اسی رعایت سے نکاح یا شادی کے لئے اردو میں بھی دوسرا لفظ "خانہ آبادی" کا ہے، اُجڑے ہوئے سنسان اور ویران گھر کے گھر اسی ذریعہ سے آباد ہوتے ہیں، مرد و زن کے باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصود ایک خاندان کی بنیاد رکھنا، ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو، اپنے کو مہذب و متمدن کہلانے والی لیکن حقیقۃً جاہلی قوموں میں اس صورت مناکحت کے علاوہ دو اور صورتیں مرد و زن کے تعلق کی پہلے بھی جاری رہی ہیں اور اب بھی جاری ہیں۔ ایک شکل تو کھلم کھلا بدکاری کی ہے عورت زنا کے لئے آزاد ہے اس کو باقاعدہ اپنا پیشہ بنالے، نہ سوسائٹی اُسے اس سے روک سکے، نہ حکومت، جو مرد جب چاہے اس کے ہاں جا کر ایک خاص کرایہ دے کر اپنے جسم کا پانی بہا آئے اور منہ کالا کر کے چلا آئے دوسری صورت چوری چھپے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنی ہی مٹ جائیں اور شریف و رسوا میں کوئی فرق نہ رہ جائے البتہ اس سے پبلک فضیحتا (SCANDAL) نہ پھیلیا ہو، یعنی جانتے اپنی جگہ سب ہوں لیکن عام زبانوں پر چرچے نہ پھیلیں۔ اسلام نے ان دونوں مہذب جرموں کو ایک لعنت قرار دیا اور جائز صورت مرد و عورت کے جنسی شہوانی تعلق کی صرف نکاح بنائی، نکاح چوری چھپے نہیں اعلان کے ساتھ ہوتا ہے اس میں خدا کا نام درمیان میں لا کر، خالق کائنات کا واسطہ ڈال کر، مرد عورت کی راحت آسائش کا ذمہ لیتا ہے اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول کر لیتی ہے دو اجنبی خاندان ملتے ہیں، دُہری سسرالیں قائم ہوتی ہیں، سسرالی عزیزوں کا ایک طویل سلسلہ وجود میں آتا ہے میاں بیوی پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہونے میں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقبل نباہ کے لئے عمر کے ہر دور، مال و اقبال کے ہر اتار چڑھاؤ، صحت و علالت کے ہر امکان کے لئے تیار کرتے ہیں اور یہ معاہدہ گواہوں کی موجودگی میں بزرگوں اور خوردوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان لا کر قرآن مجید نے ازدواجی و خانگی زندگی کا دو ٹوک

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ

اور جو کوئی ایمان سے انکار کرے گا تو اس کا عمل اکارت جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

والوں میں سے ہوگا ۳۴ اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو ۳۵

معیار پیش کر دیا جہاں کوئی مادی تہذیب آج تک نہیں پہنچ سکی ہے اسلام نے نکاحی تعلق میں ایک تقدیس پیدا کر دی ہے۔

۳۴ (گو اس کا حال اور مستقبل قریب بظاہر کیسا ہی خوشنما ہو)

بِالْاِيْمَانِ یعنی مقتضیات ایمان سے ان چیزوں سے جو ایمان لانے سے واجب ہو جاتی ہیں اور انہی میں حلّت وحرمت کے مسائل بھی آجاتے ہیں۔

ای بشرائع الاسلام وما احل اللہ وما حرم (کشاف) قال الزجاج معناہ من احل ما حرم اللہ او حرم ما احل اللہ فھو کافر۔

حَبِطَ عَمَلُهٗ۔ کوئی عمل کیسا ہی خوشنما ہو اگر روح سے خالی ہے تو اس کا شمار نیکی میں نہیں ہو سکتا، ایمان تمام (بجمیع) اسی روح عمل کا ہے تو جس کی نیت ہی سرے سے درست نہیں اور جو ایمان کی دولت سے یکسر محروم ہے ظاہر ہے کہ اس کے اعمال صرف صورۃً نیک ہو سکتے ہیں نہ کہ معنی وحقیقت کے لحاظ سے، نیکی کی نقل اور چیز ہے اور خود نیکی اور۔

۳۵ یعنی نماز کا ارادہ کرو اور حالت وضو میں نہ ہو جیسا اٹھ کھڑے ہو جانا مراد نہیں۔

ای اذا اردتم (قرطبی) فالتقدیر فاذا اردت فاکتفی بالسبب عن المسبب (برہان) ای اذا اردتم القیام عبّر عن ارادۃ الفعل بالفعل المسبب عنھا للایجاز (بیضاوی)

اتنا فقرہ کہ حالت وضو میں نہ ہو یا محدث ہو محذوف مانا گیا ہے اجماعاً اسی لئے وضو پر وضو نماز کے لئے ضروری نہیں۔

وظاھر الآیۃ یوجب الوضوء علی کل قائم الی الصلوۃ وان لم یکن محدثا والاجماع علی خلافہ (بیضاوی) مطلق ارید بہ التقیید والمعنی اذا قمتم الی الصلوۃ محدثین (بیضاوی) وقد روی نفی ایجاب الوضوء بکل صلوۃ من غیر حدث عن ابن عمر وابی موسیٰ وجابر بن عبد اللہ وعبیدۃ السلمانی وابی العالیۃ وسعید بن المسیب وابراھیم والحسن ولاخلاف بین الفقہاء فی ذلک (جصاص)

تازہ وضو گو فرض نہیں لیکن اس کی فضیلت بہت زائد وارد ہوئی ہے اور رسول اللہ صلعم اور خلفاء راشدینؓ کا تعامل بھی یہی تھا چنانچہ وضو پر وضو کرنے کے استحباب کے سب قائل ہیں۔

وقد روی عن النبی صلعم اخبار فی تجدید الوضوء (جصاص) وقد روی عن ابی بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ انھم کانوا یتوضئون لکل صلوۃ وھذا محمول علی انہ فعلوہ استحباباً (جصاص) وقال صلی اللہ علیہ وسلم لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالوضوء عند کل صلوۃ۔ فھذا کلہ یدل علی استحباب الوضوء عند کل صلوۃ وان لم یکن محدثا (جصاص) قال ابن سیرین کان الخلفاء یتوضئون لکل صلوۃ (قرطبی) حملوا الامر علی الندب وکان کثیر من الصحابۃ منھم ابن عمر یتوضئون لکل صلوۃ طلباً للفضل وکان علیہ السلام یفعل ذلک۔ (قرطبی)

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ

تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں پر مسح کر لیا کرو اور

وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ

اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھو لیا کرو۔ ۳۶

۳۶ اب تعلیم ارکانِ وضو کی ہو رہی ہے۔ اسلام بخلاف دوسرے مذہبوں کے باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ظاہری و جسمانی صفائی کا بھی بہت قائل ہے اور اس نے اپنی مرکزی عبادت نماز سے قبل وضو کو لازمی ٹھہرایا ہے کہ بغیر اس کے نماز درست ہی نہیں۔ آیت احکام قرآنی کی اہم ترین آیتوں میں سے ہے۔

[illegible]

یہاں تک کہ اس آیت کے اندر سے بعض بعض علماء اور فقہاء نے، آٹھ آٹھ سو اور ہزار ہزار مسئلے تخریج و مستنبط کئے ہیں۔

ولقد ... [illegible] ... مسئلة ... [illegible]

[illegible]

وضو میں فرض صرف چار چیزیں ہیں اور انہی کا آیت میں بیان ہے:۔

(۱) فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ چہرہ کا دھونا۔ (۲) وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا۔ (۳) وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ سر کا مسح کرنا یا پانی میں تر کیا ہوا ہاتھ اس پر پھیرنا۔ (۴) وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ پیروں کا ٹخنوں سمیت دھونا۔ ان کے علاوہ اور جو چیزیں ہیں مثلاً کلی کرنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی لینا، خلال کرنا، وغیرہ وغیرہ، ان میں سے بعض امور مسنون ہیں، اور بعض مستحب۔ تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی، تفسیر سے اس کا تعلق نہیں۔ اعضائے وضو پر پانی بہانا، انہیں دھونا، مَلنا، صاف کرنا اپنے اندر جتنی بھی حکمتیں، روحانی و جسمانی مصلحتیں رکھتا ہے، وہ حضور قلب میں جس حد تک معین ہو سکتا ہے۔ ان پہلوؤں پر تفصیل سے لکھنے کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہوگی۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ۔ مالکیہ کے ہاں چہرہ دھونے کے معنی یہ ہیں کہ پانی اس پر بہایا جائے اور ہاتھ بھی پھیرا جائے۔ لیکن حنفیہ کے ہاں محض پانی کا اس پر بہہ جانا کافی ہے، ہاتھ سے ملنا اور رگڑنا لازمی نہیں۔

ولابد فی غسل الوجه من نقل الماء الیه وامرار الید علیه وهذه حقیقة [illegible]

وقال آخرون وهو قول اصحابنا وعامة الفقهاء علیه اجراء الماء علیه ولیس علیه دلکه [illegible]

وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ۔ اِلٰی اظہار غایت و انتہا کے لئے آتا ہے۔ اور اس فیصلہ کا تعلق سیاق سے ہے کہ اِلٰی کا مابعد بھی اِلٰی کے ماقبل کے ساتھ شامل رکھا جائے یا اس سے الگ سمجھا جائے۔ بعض ماہرین نحو نے یہ بھی کہا ہے کہ مابعد اگر ہم جنس ہے تو ماقبل کے ساتھ شامل سمجھا جائے گا اور اگر غیر جنس ہے تو اس سے خارج رہے گا۔

لان ما بعد الی اذا کان من نوع ما قبلها دخل فیه وله سیبویه وغیره (قرطبی) [illegible]

[illegible] الی المرافق ان المرافق فیما یغسل (تاج) [illegible]
(بحر محیط)

الی کبھی معیت کے معنی بھی دیتا ہے اور مع کا مرادف ہوتا ہے۔

وبالی للمعیۃ۔ (راغب)

چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اسی معنی میں آیا ہے: واذا خلوا الی شیٰطینہم۔ من انصاری الی اللہ۔ ولا تاکلوا اموالہم الی اموالکم وغیرہا۔ اور بہت سے نحویین نے یہاں بھی الی اسی معنی میں لیا ہے۔

فان جماعۃ النحویین جعلوا الی بمعنی مع ھٰہنا واوجبوا غسل المرافق والکعبین (ت ج)

رسول اللہ صلعم کا عمل بھی کہنیاں دھونے کا تھا، بہرحال لفظ الی سے اگر کچھ اشتباہ رہ بھی گیا ہو تو سنتِ رسول نے اُسے رفع کر دیا ہے۔

روی جابر بن عبد اللہ ان النبی صلعم کان اذا بلغ المرفقین فی الوضوء ادار الماء علیہما وفعلہ ذلک عند نا علی الوجوب لورودہ مورد البیان (جصاص) عن النبی صلعم انہ کان یدیر الماء علی مرفقیہ (مدارک)

حنفیہ کے ہاں تو کہنی کا اعضاءِ وضو میں داخل ہونا ایک متفقہ مسئلہ ہے ہی (اختلاف صرف امام زفر سے منقول ہے)

والذی ذکرنا من دخول المرافق فی الوضوء ھو قول اصحابنا جمیعا الا زفر (جصاص)

باقی دوسرے مذاہبِ فقہ نے بھی کہنی کا دھونا لازم قرار دیا ہے۔

وجمہور الفقہاء علی دخولہا وحکی عن الشافعی انہ قال لا اعلم خلافا فی ان المرافق یجب غسلہا (روح) فقد نقل ابن ہبیرۃ اجماع الائمۃ الاربعۃ علی فرضیۃ غسل الیدین مع المرفقین (روح) قال الجمہور غسل الید الی المرفقین واجب معہما (کبیر)

وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ۔ مسح سے مراد بھیگے ہوئے ہاتھ کے پھیر لینے سے ہے۔ جملہ کی ترکیب (برؤسکم) اس کی مقتضی ہے کہ مراد پورے سر کا مسح نہیں بلکہ اس کے کسی حصہ کا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے ہاں سر کے چوتھائی حصہ کا مسح کافی ہے، اور ب تبعیض کیلئے ہے

یقتضی مسح بعضہ (جصاص) لخبر ابراھیم ان الباء للتبعیض وقد کان من اھل اللغۃ مقبول القول فیہا (جصاص)

الباء مزیدۃ وقیل للتبعیض (ابو سعود) روی عن اصحابنا فیہ روایتان احداھما ربع الرأس والاخری مقدار ثلاث اصابع (جصاص)

نحویین کے ایک گروہ نے ب کے تبعیضیہ ہونے سے انکار بھی کیا ہے۔

وکونہا للتبعیض ینکرہ اکثر النحاۃ حتی قال بعضہم وقال من لا خبرۃ لہ بالعربیۃ الباء تفید التبعیض ولیس بشیء یعرفہ اھل العلم (بحر)

تاہم ربعِ سر کے لئے حنفیہ کے ہاں دلیل سنتِ رسول سے ہے، آپ کا تعامل پیشانی پر مسح کا تھا اور پیشانی کی مقدار ربعِ سر کے برابر ہو جاتی ہے۔

والمفتقر بیان النبی صلعم وھو ما روی انہ مسح علی ناصیتہ وقدرت الناصیۃ بربع الرأس۔ (مدارک)

وَاَرْجُلَكُمْ شامی ونافع وعلی وحفص سب کی قرأت نصب کے ساتھ رجل مروی ہے۔ اَرْجُلَكُمْ فَاغْسِلُوْا کا مفعول ٹھہرتا ہے اور وُجُوْهَكُمْ اور اَيْدِيَكُمْ پر عطف ہوتا ہے، اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں اور پیروں کو دھوؤ

بالنصب شامی ونافع وعلی وحفص والمعنی فاغسلوا وجوھکم وایدیکم وارجلکم (مدارک)

قرأ نافع ابن عامر والکسائی ارجلکم بالنصب (قرطبی) عن ابی عبد الرحمن قال قرأ علی الحسن والحسین

ثم أدار رجلكم الى الكعبين فمسح علىٰ ذلك وكان يفضي بين الناس فقال وارجلكم وهذا من المقدم والمؤخر من الكلام (ابن جرير) قرأ علي وعبد الله بن مسعود وابن عباس في رواية وابراهيم والضحاك ونافع وابن عامر والكسائي وحفص عن عاصم بالنصب كانوا يرون غسلها واجبا.
(جصاص)

دونوں پیروں کا دھونا ہی (نہ کہ ان پر صرف مسح کرنا) سنتِ رسولؐ سے بھی ثابت ہے اور تعاملِ صحابہؓ سے بھی، اور عطاء تابعی کا قول ہے کہ صحابہ کا اس بارہ میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

هذا مذهب الجمهور والكافة من العلماء وهو الثابت من فعل النبي صلعم (قرطبي) عن علي قال اغسلوا الاقدام الى الكعبين (ابن جرير) وعن عطاء قال والله ما علمت لن احدا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم مسح على القدمين اعا أمر هذه الاعضاء (مدارك) يوجبه السنة الشائعة وعمل الصحابة وقول اكثر الائمة (بيضاوي) ان النبي صلى الله عليه وسلم غسل وما مسح قط (ابن العربي) قال جمهور الفقهاء والمفسرين فرضهما الغسل.
(كبير)

اور فقہاء کی عبارتیں بھی انھیں مفسرین کے قریب قریب ہیں۔

ولنا ان النبي صلى الله عليه وسلم واظب على غسل الرجلين وبه امر من علمه الوضوء ورأى رجلا يلوح عقبه فقال ويل للاعقاب من النار (المبسوط) والجواب بان وجوب ولهذه بالعبارة والقرى بالدلالة لا طائل تحته بعد انعقاد الاجماع القطعي على افتراضهما فان الاجماع انعقد على غسلهما (بحر الرائق)

لیکن دوسری قرأت جرِّ لام کے ساتھ اَرْجُلِکُمْ کی بھی ہے یعنی بجائے نصب کے خفض کی۔

وقرأ ذلك آخرون من قراء الحجاز والعراق بخفض الارجل (ابن جرير) قرأ ابن كثير وحمزة وابو عمرو وعاصم في رواية ابي بكر عنه بالجر (كبير) قرأ ابن عباس والحسن وعكرمة وحمزة وابن كثير بالخفض (جصاص)

اس ترکیب میں اَرْجُلِکُمْ کا عطف بجائے وُجُوْھَکُمْ و اَیْدِیَکُمْ کے رُءُوْسِکُمْ پر ہوتا ہے اور اَرْجُلِکُمْ بجائے فَاغْسِلُوْا کے مفعول ہونے کے بِرُءُوْسِکُمْ کے حرف جارّہ بِ کا مجرور ٹھہرتا ہے اور ترجمہ اس صورت میں یہ ہوگا۔

مسح کرلیا کرو اپنے سروں اور اپنے پیروں پر۔

چنانچہ شیعہ امامیہ کا مذہب مسح قدمین یہیں سے ماخوذ ہے۔

وهو مذهب الامامية من الشيعة۔ (كبير)

لیکن یہ مذہب محض امامیہ کا نہیں بلکہ بعض اکابر اہلِ سنت بھی اس طرف گئے ہیں اور بعض تابعین بلکہ بعض صحابہؓ سے بھی یہ مسلک نقل ہوا ہے۔

قال انس نزل القرآن بالمسح والسنة الغسل (ابن جرير) وكان عكرمة يمسح رجليه وقال ليس في الرجلين غسل انما نزل فيهما المسح (قرطبي) وعن ابن عباس وقتادة افترض الله مسحين وغسلين وبه قال عكرمة والشعبي (ابن العربي) نقل القفال في تفسيره عن ابن عباس وانس بن مالك وعكرمة والشعبي وابي جعفر محمد بن علي الباقر ان الواجب فيهما المسح (كبير)

امام المفسرین ابن جریر طبری نے تحسین دونوں قرأتوں ہی کی کی ہے نصب کی اور خفض کی بھی۔

وكانت القراءتان كلتاهما حسنا صوابا۔

بلکہ موصوف کا رُجحان مسلکِ مُحقق وجمہور کی جانب بالکل غیر مخفی ہے۔

والصواب من القول عندنا فی ذلک ان اللہ امر بعموم مسح الرجلین بالماء فی الوضوء (ابن جریر)

لیکن خود "مسح" سے ابن جریر کی مراد (جیسا کہ ابھی اُن کی عبارت میں گزر چکا) مسح جزوی نہیں بلکہ مسح پورے پیروں کا، اور یہی حسن بصری تابعی سے بھی منقول ہے۔

والمحفوظ عن حسن البصری استیعاب الرجل کلھا بالمسح (جصاص)

اور اس توضیح کے بعد قدمین سے مراد پیر کے اوپر کے کسی حصہ کا مسح نہیں بلکہ پورے پیر کا مسح ہے مسح اور غسل کے درمیان فرق عملاً کچھ زیادہ نہیں رہ جاتا ہے سوا اس کے کہ غسل میں عضو پر پانی بہایا جاتا ہے اور مسح میں بھیگا ہوا ہاتھ اُس پر پھیر لیا جاتا ہے۔

اور متأخرین میں اسی طرف رشید رضا مصری بھی گئے ہیں۔

والصواب من القول عندنا فی ذلک ان اللہ امر بعموم مسح الرجلین بالماء فی الوضوء کما امر بعموم مسح الوجہ بالتراب فی التیمم واذا فعل ذلک بھما المتوضئ کان مستحقا اسم ماسح غاسل لان غسلھما امرار الماء علیھما أو اصابتھما بالماء ومسحھما امرار الید وما قام مقام الید علیھما (المنار)

امام ابن جریر نے خود ہی یہ سوال قائم کیا ہے کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ مسح سے مراد سر کا تو مسح جزئی ہے اور پیر کا مسح کلی، اور پھر خود ہی جواب دیا ہے :-

الدلیل علی ذلک تظاھر الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ویل للأعقاب وبطون الاقدام من النار۔

اس کی دلیل وہ وعیدیں ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایڑی اور پیر کے تلوے خشک رہ جانے پر بیان فرمائی ہیں۔

اور مذہبِ جمہور اہلِ سنّت کی تائید میں دو دلیلیں اور بھی قابلِ ذکر ہیں :-
ایک یہ کہ اَرْجُلَکُمْ کا اعراب اگر جر سے بھی ہو تو محض لسانی قاعدۂ مجاورت کے لحاظ سے حکم فقہی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا
دوسرے یہ کہ ایسے شخص سے جس نے وضو میں پیر پوری طرح نہیں دھوئے تھے حضرت عمرؓ نے وضو دوبارہ کرا کے نماز پڑھوائی، جس کے معنی یہ ہیں کہ بغیر پیر دھوئے وضو ناقص تھا۔

اِلَی الْکَعْبَیْنِ. یعنی ٹخنوں کو شامل کرکے۔

وحکم الکعبین کالمرفقین۔ (البحر الرائق)

اِلیٰ کے مفہوم سے متعلق یہاں بھی وہی بحثیں ہوئی ہیں جو اِلَی الْمَرَافِقِ کے تحت میں اوپر گزر چکیں۔
وضو ہی کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان ایک طویل بحث نیت کی بھی آگئی ہے۔ حنفیہ کے ہاں نیت واجب نہیں، دوسرے ائمہ کے بابت روایتیں مختلف ملتی ہیں۔

وقال کثیر من الشافعیۃ لا حاجۃ الی نیۃ وھو قول الحنفیۃ (قرطبی) النیۃ فی الطھارۃ ولا نیۃ فیہ وبہ قال مالک والشافعی واکثر العلماء وروی الولید بن مسلم عن مالک انھا غیر واجبۃ فیہ وبھا قال ابوحنیفۃ والاوزاعی سواء قارنتہ النیۃ اولم تقارنہ (جصاص) قال ابوحنیفۃ وابو یوسف

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ

اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو (سارا جسم) پاک صاف کرو ۳۷ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے

اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً

کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو ۳۸ پھر تم کو پانی نہ ملے ۳۹

وعن كل طهارة بماء يجوز بغير نية ولا يجزى التيمم إلا بنية وهو قول الثوري وقال الاوزاعي يجزى الوضوء بغير نية (جصاص) قال الشافعي النية شرط لصحة الوضوء والغسل وقال ابو حنيفة ليس كذلك (كبير) اختلف علماء الامصار هل النية شرط صحة الوضوء ام لا فذهب فريق منهم الى انها شرط وهو مذهب الشافعي ومالك واحمد وذهب فريق آخر الى انها ليست بشرط وهو مذهب ابي حنيفة والثوري (بداية المجتهد)

۳۷ یعنی غسل کر لو، یا سارے جسم کو پانی سے دھو ڈالو۔

اى فاغتسلوا (معالم۔ بیضاوی) امر بالاغتسال بالماء (قرطبی)

جُنُبًا۔ جنابت پر حاشیہ سورۃ النساء میں گزر چکا۔

فَاطَّهَّرُوْا۔ یہیں سے نکتہ سنج فقہاء نے سارے جسم کے دھونے کا حکم نکالا ہے اور محض بعض اعضاء کے دھو ڈالنے کو کافی نہیں سمجھا ہے اور غسل واجب میں کلی، غرغرہ اور ناک میں پانی ڈالنے کا حکم بھی یہیں سے پیدا ہوا ہے۔

عموم سائر البدن فلا يجوز الاقتصار على بعضه (جصاص) يقتضي تطهير داخل الفم والانف۔ (جصاص)

۳۸ (یا کسی اور طریقہ سے غسل ٹوٹ چکا ہو اور اب غسل کی ضرورت ہو)

لٰمَسْتُمُ۔ ملامست سے کنایہ صحبت سے ہے، صحابہؓ، تابعین، لغت سب سے یہی ثابت ہے۔

يكنى بالملامسة عن الجماع (راغب) الملامسة هنا الجماع (قرطبی) قال علیؓ وابن عباسؓ وابو موسیٰؓ والحسنؒ وعبيدةؒ والشعبي هي كناية عن الجماع (جصاص) فمن قرأ ولمستم فظاهره الجماع لا غير لان المفاعلة لا تكون الا من اثنين الا في اشياء نادرة (جصاص)

۳۹ اس کا تعلق ضرورتِ وضو و غسل کی سب شکلوں سے ہے یعنی پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو، خواہ بسبب مرض کے خواہ بسبب فاصلہ کے یا کسی اور سبب سے۔

معناه فلم تقدروا على الماء (راغب)

سردی لگ جانے کا خوف، بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ، پانی لانے میں بہت دشواریاں، یہ ساری چیزیں پانی نہ ملنے ہی کے حکم میں داخل ہیں، حدیث میں تصریح موجود ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے پانی ہوتے ہوئے بھی تیمم کر لیا، اس لئے کہ پانی سے انہیں سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا، اور رسول اللہ صلعم نے اسے جائز رکھا۔

فقد روى في حديث عمرو بن العاص انه تيمم مع وجود الماء لخوف البرد فاجازه النبي صلعم ولم ينكره۔ (جصاص)

حنفیہ کے ہاں سردی کے عذر پر بجائے غسل کے تیمم کر لینا بالکل جائز ہے۔

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ

تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کر لیا کرو ۱۴۰؎

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ

اللہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے ۱۴۱؎

قال ابوحنيفة ومحمد من خاف من البرد ان اغتسل جاز له التيمم ان خاف من الضرر. (جصاص)

تیمم کے ساتھ نماز جماعت میں بھی شرکت کی پوری اجازت حدیث میں موجود ہے۔

وقد صح عن عمران بن حصين في هذا وهو ان رسول الله صلعم رأى رجلا معتزلا لم يصل في القوم فقال يا فلان ما منعك ان تصلي في القوم فقال يا رسول الله اصابتني جنابة ولا ماء قال عليك بالصعيد فانه يكفيك. اخرجه البخاري (قرطبي)

فقہاء امت نے جنھیں حقیقۃً حکماء اُمت کہنا چاہیے، اسے خوب صاف کر دیا ہے کہ پانی مل سکتا تو ہو لیکن بہت گراں قیمت پر، یا موجود تو ہو لیکن اتنی کم مقدار میں کہ پینے کے لئے نہ بچ سکے گا تو ایسے موقع پر پانی کا وجود اس کے عدم ہی کے برابر ہے، اور تیمم بالکل درست ہوگا۔

والمسئلة التي اتفق اصحابنا عليها ان الوجود امكان استعمال الماء الذي يكفيه لطهارته من غير ضرر فلو كان معه ماء وهو يخاف العطش او لم يجد الا بثمن كثير تيمم وبني عليه ان يدلي فيه (جصاص)

۱۴۰؎ تیمم کا بیان اور اس کا طریقہ سب سورۃ النساء کی آیت متعلقہ کے ماتحت گزر چکا ہے۔ صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ صعید سے مراد مٹی کی جنس ہے جس چیز میں بھی اجزاء ارضی شامل ہوں سب کا حکم آ جائے گا۔

وكان الصعيد اسما للارض اقتضي ذلك جواز التيمم بكل ما كان من الارض (جصاص) قال ابوحنيفة يجزي التيمم بكل ما كان من الارض التراب والرمل والحجارة والزرنيخ والنورة والطين الاحمر والمرداسنج وما اشبهه وهو قول محمد وزفر (جصاص)

۱۴۱؎ (احکام شریعت کے ذریعہ سے، بلکہ وہ تو تنگی رفع کرتا رہتا ہے جیسا کہ احکام تیمم سے ابھی ابھی ظاہر ہوگا) آیت میں ایک بہت بڑی اصل کا بیان آ گیا یعنی یہ کہ اللہ نے شریعت میں مشقت و تعب نہیں رکھی ہے اور اس ایک اصل سے بیسیوں مسائل نکل سکتے ہیں، اور محقق رازی کی نظر اس نکتہ تک خوب پہنچی ہے۔

اعلم ان هذه الآية اصل كبير معتبر في الشرع وهو ان الاصل في المضار ان لا تكون مشروعة (کبیر)

احکام کا وہ مجموعہ جس پر شریعت کا اطلاق ہوتا ہے، وہ تو نام ہی بہترین نقشہ زندگی کا ہے اور اس کا مقصود بھی یہ ہے کہ جو کوئی اس ہدایت نامہ پر عمل کرے، وہ زندگی کی دشواریوں کو بہترین اور سہل ترین طریق پر عبور کر سکے۔ احکام شریعت کو سخت سمجھ لینا ایسا ہی احمقانہ ہے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق اور تجربہ کار باپ کی ہدایتوں کو، یا کوئی مریض اپنے دل سوز اور حاذق طبیب کے احکام کو ظلم و جبر سے تعبیر کرنے لگے، بلکہ ان دونوں مثالوں سے بھی کہیں بڑھ کر احمقانہ

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٦﴾ وَاذْكُرُوْا

بلکہ وہ (تو یہ) چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک صاف رکھے ۴۲ اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے، تاکہ تم شکرگزاری کرو ۴۳ اور اپنے اوپر اللہ کی

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

نعمتوں کو یاد کر لیا کرو ۴۵ اور اس کے اس عہد کو بھی جس کا اس نے تم سے معاہدہ کیا ہے، اس وقت جب تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا ۴۶

اور شیخ رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ احکام میں تنگی کی نفی جو اس آیت میں کی گئی ہے وہ مطلق صورت میں ہے اور اس کا تعلق اولاً اور براہ راست تو ان احکام سے ہے جو اس صورت میں مذکور ہیں اور ثانیاً اور بالواسطہ جمیع احکام شریعت سے۔

ومن طرق هذا نفى الحرج وامرادبه اولاً وبالذات ما يتعلق باحكام الآية او بما تقدم من الاحكام من اول السورة وثانياً وبالتبع جميع احكام الاسلام (المنار)

۴۲ (معنوی وظاہری ہر اعتبار سے)

طہارت کا لفظ صفائی قلب و جسمانی پاکیزگی دونوں کے لئے عام و وسیع ہے، چنانچہ شریعت کے احکام دونوں اقسام کے جامع ہیں۔ مَا يُرِيْدُ. بعض متکلمین نے آیت کے ان الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب ارادہ ہے۔

دلت الآية على انه تعالى مريد وهذا متفق عليه بين الائمة (کبیر)

یہی الفاظ ان نیم مشرک، نیم ملحد قوموں کی تردید کے لئے بھی کافی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو صفت ارادہ سے محروم محض مشین کی طرح چند قاعدوں کا پابند و محکوم سمجھے ہوئے ہیں۔

تطہیر. باب تفعیل سے ہے یعنی خوب اچھی طرح تمہیں پاک و صاف کر دے۔ یہاں یہ نکتہ بھی خوب سمجھ لیا جانا چاہئے کہ ایک طرف صوفیۂ محققین اور دوسری طرف فقہائے امت نے کتاب و سنت ہی سے جو جزئیات احکام نکال کر پیش کئے ہیں، ان سے مقصود بھی تمام تر اسی تطہیر ظاہری و باطنی کی راہ میں سہولتیں پیدا کرنا ہے نہ کہ اور تنگی و تشدد!

۴۳ (اور ادائے شکر کی اعلیٰ ترین فرد ان احکام کی تعمیل ہے)

لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ. اور وہ اتمام نعمت یہی ہے کہ وہ اپنے قرب اور رضا کے راستے سہل ترین اور کامل ترین صورت میں تمہیں بتا دے

نعمته بالاسلام وببيان شرائع الدين (جلالین)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ شرعی رخصتوں سے تنگ دل ہونا اور ان پر ہوائے نفس کا شبہ کرنا جیسا کہ عمل میں غلو رکھنے والے کرتے رہتے ہیں، مزاحمت حق ہے۔

۴۴ (اور اس کی بڑی نعمت یہی ہے کہ اس نے فلاح دنیوی و اخروی کے طریقے اس تفصیل و اس تکمیل کے ساتھ تمہیں بتا دیئے ہیں)

النعمة هنا الاسلام. (بحر)

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ نعمة الله سے یہاں مراد ان نعمتوں کی تعداد نہیں بلکہ جنس نعمت ہے، نعمة بطور اسم جنس مستعمل ہوا ہے اس لئے ضرورت صیغۂ جمع کی نہیں پڑی۔

وهي نعمة الاسلام او الاعم على ارادة الجنس. (روح)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ

اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سینوں کے اندر تک کا علم رکھتا ہے ۴۶ اے ایمان والو اللہ

اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ

کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو ۴۷

۴۵ میثاقکم۔ اس سے کون سا عہد مراد ہے؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد عالم ارواح کا وہ عہد ہے جو سارے بنی آدم سے اقرار ربوبیت کی بابت لیا گیا تھا۔

قال مجاهد وكلبى ومقاتل هو الميثاق الذى اخذه الله تعالى منهم حين اخرجهم من ظهر ادم۔ (کبیر)

روح انسانی کے اندر جو فطری طلب خدارسی کی اور طبعی خواہش خداطلبی کی ہے یہ اسی عہد کا عملی ظہور ہے لیکن خطاب یہاں عام نوع بشر سے نہیں، بلکہ اہل ایمان سے ہے، اس لئے آسان اور بے تکلف صورت یہ ہے کہ وہ عہد مراد لیا جائے جو ہر کلمہ گو انسان اسلام قبول کرتے وقت کرتا ہے یعنی تعمیل احکام کا اجمالی عہد۔

قيل الميثاق اقرار كل مومن بما التزمه (بحر)

اس سے بھی زیادہ دل نشین تفسیر یہ ہے کہ میثاقکم سے مراد بیعت واطاعت کے وہ عہد ہیں جو رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں سے لئے تھے ابن عباسؓ صحابی اور سدی تابعی وغیرہم سے یہی معنی مروی ہیں۔

والذى عليه الجمهور من المفسرين كابن عباسؓ والسدى هو العهد والميثاق الذى جرى لهم مع النبى صلعم على السمع والطاعة فى المنشط والمكره كما جرى ليلة العقبة وتحت الشجرة (قرطبى) المراد هو المواثيق التى جرت بين رسول الله صلعم وبينهم فى ان يكونوا على السمع والطاعة فى المحبوب والمكروه (كبير) وهذه هى البيعة التى كانوا يبايعون عليها رسول الله صلعم عند اسلامهم (ابن كثير) وذلك حين بايعوا رسول الله صلعم على السمع والطاعة فى ما احبوا وكرهوا وهو قول اكثر المفسرين (معالم)

ایسے عہد لئے تو تھے رسول اللہ صلعم نے لیکن حق تعالیٰ نے ان کے اہتمام شان کے اظہار کے لئے انہیں منسوب اپنی ہی جانب کیا۔

واضافه تعالى الى نفسه كما قال انما يبايعون الله اذ بايعوا رسول الله صلعم (قرطبى)

سدی تابعی سے یہ تفسیر بھی منقول ہے کہ اس میثاق سے مراد حقانیت اسلام کے دلائل عقلی و نقلی ہیں اور متکلمین نے عموماً یہی معنی اختیار کئے ہیں۔

قال السدى المراد بالميثاق الدلائل العقلية والشرعية نصبها الله تعالى على التوحيد والشرائع وهو اختيار اكثر المتكلمين (كبير)

۴۶ اس حقیقت کے استحضار سے تعمیل احکام میں اخلاص کا پیدا ہو جانا لازمی ہے، ورنہ عمل بلا اخلاص سے تو محض مشقت ہی مشقت ہاتھ رہے گی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ اللہ سے ڈرنا یہی ہے کہ اس کے احکام کی مخالفت سے بچو پہلے یہ بتایا کہ تعمیل احکام میں نفع

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ

اور کسی [illegible] کی [illegible] تمہیں [illegible] پر [illegible] کہ تم (اس کے ساتھ) انصاف ہی نہ کرو، انصاف کرتے رہو کہ (وہ) تقویٰ سے بہت قریب ہے ٤٢٨

[illegible] حکام [illegible] کیے جائیں پھر یہ یاد دلا دیا کہ تم عہد و معاہدہ بھی تو کر چکے ہو اب [illegible] ہے۔ تقویٰ [illegible] میں اشارہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ نقض عہد تمہیں پر جرم بھی کھا رہی ہے

٤٢٦ [illegible] مومن کے مقتضائے شان ہے۔)

[illegible] کے احکام کی پوری پابندی کرتے رہو۔

[illegible] ما امرکم بہ من الامر بمعروف والعمل بہ

[illegible] الانقیاد لتکالیف اللہ تعالیٰ. (کبیر)

[illegible] اللہ کی رضا جوئی کے لئے۔

[illegible] (قرطبی)

مطلب یہ ہوا کہ حقوق اللہ کی ادائی میں ہر وقت مستعد رہو۔

[illegible] (کبیر)

شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ یعنی [illegible] انصاف کا لحاظ رکھو۔ یہ تاکید ہوئی حقوق العباد کی ادائی کی۔

[illegible] (کبیر)

٤٢٥ گویا ادائے حقوق ہی کا دوسرا نام تقویٰ ہے۔

اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۔ یہ بالکل حکیمانہ ترتیب کے مطابق ہے پہلے ممانعت ناانصافی اور زیادتی سے ہوئی، پھر اس سلب کے بعد ایجابی حکم عدل کا ملا۔

شَنَاٰنُ قَوْمٍ جس قوم یا جماعت سے مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کے دشمنی ہوگی، ظاہر ہے کہ وہ دشمن اسلام قوم کافروں ہی کی ہوگی۔ تو گویا تاکید اس کی ہوئی کہ دشمنوں تک کے ادائے حقوق میں کمی نہ کرو ——— اللہ اللہ! دنیا کا کون قانون ایسا نکلے گا جس نے اپنے باغیوں اور معاندوں کے حقوق کی یہاں تک رعایت رکھی ہو، فقہاء نے آیت سے یہ حکم نکالا ہے کہ کافر کا کفر اسے اس حق سے محروم نہیں کر دیتا کہ عدل اس کے معاملہ میں کیا جائے یا حقوق اس کے ادا کئے جائیں۔

[illegible] الآیۃ علی ان کفر الکافر لا یمنع من العدل علیہ. (قرطبی)

اور عدل کا وجوب جب کفر کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے تو کفر سے کمتر درجہ کی چیزوں فسق، بدعت وغیرہ کے ساتھ اس کا وجوب کیوں کر نہ جمع ہوگا، جب منکروں، باغیوں، سرکشوں کے ساتھ عدل واجب ہے، تو توحید و رسالت کے قائلوں کے ساتھ یہ وجوب کتنا اور مؤکد ہوگا۔ اکابر شارحین نے اس طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔

فیہ تنبیہ عظیم علی ان وجوب العدل مع الکفار الذین ہم اعداء اللہ اذا کان بہذہ الصفۃ [illegible] الظن بوجوبہ مع المؤمنین (کشاف۔ کبیر۔ مدارک) وفی الآیۃ تنبیہ علی مراعاۃ حق المؤمنین بالعدل اذ کان تعالیٰ قد امر بالعدل مع الکافرین. (بحر)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ کو اس کی پوری خبر ہے کہ تم کیا کرتے رہتے ہو ۴۹؎ جو لوگ کہ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹ وَالَّذِيْنَ

اور اچھے کام کرتے رہے اللہ نے ان سے وعدہ کرلیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے ۵۰؎ اور جن لوگوں نے

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰

کفر کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا سو ایسے لوگ دوزخ والے ہیں ۵۱؎

شدتِ غضب میں کون اپنے آپ پر قابو رکھ سکتا ہے، یہاں تاکید سی کی ہو رہی ہے کہ جو غصہ تمہارے دلوں میں کافروں کے خلاف ہے وہ کہیں تمہیں ان کے مقابلہ میں زیادتی پر نہ آمادہ کردے تو زیادتی نہ ہونے پائے عدل و اعتدال کا لحاظ ہر معاملہ میں رہے۔

والمعنى لا يحملنكم شدة بغضكم للمشركين على ترك العدل فيهم فتعتدوا عليهم بارتكاب ما لا يحل كمثلة

نهاهم أولاً عن أن يحملهم البغضاء على ترك العدل ثم استأنف فصرح لهم بالأمر بالعدل تأكيداً وتشديداً۔ (تفسیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاملات میں طبیعیات پر عمل نہ کرنا ایک مجاہدہ ہے، اور یہاں اسی کی تعلیم ہے۔

۴۹؎ اللہ کی اس ہمہ بینی و ہمہ دانی کا استحضار ہی تقویٰ کی ہر منزل اور ہر مرحلہ کو آسان بنا سکتا ہے اسی لئے یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں تقویٰ کا حکم ہے اکثر اسی کے متصل ہی اس مضمون کا بیان بھی مل جاتا ہے چنانچہ اسی سے ملتی جلتی ایک آیت پارہ پنجم سورۃ النساء میں بھی آئی ہے یاایها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط-الخ۔ مفسر تھانویؒ نے خوب فرمایا کہ معاملات میں بے انصافی کے سبب عموماً دو ہی ہوتے ہیں یا تو کسی فریق کی رعایتِ مروت اور یا کسی فریق کی عداوت و مخالفت سورۃ النساء میں اقامتِ عدل کا حکم سببِ اول کی مناسبت سے ہے اور یہاں سببِ دوم کی مناسبت سے۔

۵۰؎ (اور اللہ جس اجر کو بڑا کہے اس کی بڑائی کا کیا ٹھکانا ہے!)

وَعَدَ اللّٰهُ جو تنجیز میں جان ڈال دینے والا لفظ ہی وعدۂ الٰہی ہے اہلِ ایمان کے لئے کس قدر شوق افزا اور کیسا روح پرور ہوگا!

۵۱؎ (اور اُسی میں ہمیشہ پڑے رہنے والے)

اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔ صاحب میں مفہوم عارضی و ہنگامی اجتماع کا نہیں بلکہ مستقل اور طویل تعلق کا پایا جاتا ہے اس لئے کافروں کو اصحابِ دوزخ کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ وہ گویا دوزخ ہی کے لئے بنے ہیں یا دوزخ انہی کے لئے بنی ہے اگر صرف وعید کی صورت ہوتی تو کچھ اُمید نجات کی باقی بھی رہ جاتی۔

الصاحب الملازم ولا فرق بين أن تكون مصاحبته بالبدن وهو الأصل والأكثر أو بالعناية والهمة ... لا يقال في العرف إلا لمن كثرت ملازمته (راغب) المصاحبة والاصطحاب أبلغ من الاجتماع لأجل أن المصاحبة تقتضي طول لبثه (راغب) أي ملابسوا النار الشديدة التأجج ملابسة مؤبدة (روح)

فخر المفسرین فخر رازیؒ نے حسبِ معمول اس موقع پر بھی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے، اور دوسرے بھی ان کی راہ چلے ہیں:

يفيد الحصر والمصاحبة تقتضي الملازمة كما يقال اصحاب الصحراء اى الملازمون لها (کبیر)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ

اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو (جو) تم پر ہے یاد کرو جب ایک قوم نے ٹھان لی تھی کہ تم پر اپنے ہاتھ

قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا

دراز کرے ۵۲ لیکن اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے ۵۳ اور اللہ سے

اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

ڈرتے رہو ۵۴ اور ایمان والوں کو چاہیے کہ بھروسہ اللہ ہی پر رکھیں ۵۵

وهم دائمون فی عذاب اذ ھم لهم اثهم ... مصورة لو عدده مکون لرجاء لهم فی ذلك (بحر) لم يؤمن بانجسة فی ... لوعيد قطع ... (روح)

اور آیت ہی سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ خلود جہنم کفار ہی کے لئے ہے۔

هذه الآية نص قاطع فی ان الخلود ... الا للکفار (کبیر)

۵۲ (اور اس نیت کے ساتھ کہ تمہارا خاتمہ ہی کر دیں، اور ظاہر میں قریش بھی ان کے اسی ارادہ کی تائید میں تھے) يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ۔ بسط ید کے ایک معنی عربی میں حملہ کرنے پکڑنے مارنے کے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔

يستعمل تارة للصولة والضرب (راغب) يقال بسط اليه يده اذا بطش به (کبیر)

اردو میں بھی "دراز دستی" ایسے ہی موقعوں کے لئے ہے۔

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ۔ یہ کون لوگ تھے؟ مخالفین و معاندین کا مراد ہونا تو ظاہر ہی ہے، سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہاں متعین طور پر کن معاندین کی جانب اشارہ ہے؟ اشارہ، اگر اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف سمجھا جائے تو اس وقت سب سے بڑے دشمن مشرکین قریش تھے، اور ارباب تفسیر کا ایک گروہ اسی جانب گیا ہے۔

وهم المشرکون (کبیر) روی ... عن ابن عباس ... (کبیر)

اور اگر مراد مابعد کے زمانہ سے لی جائے تو اس وقت سب سے پُرقوت مخالفین یہود عرب تھے، چنانچہ ایک گروہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔

موقع نزول کی روایتیں متعدد ہیں لیکن ان میں تعارض و تناقض کچھ بھی نہیں، اور قوم کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی جماعت ہی مراد ہو، کوئی مخصوص لیڈر یا سرغنہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

لا يخفى ان سبب النزول محتمل تعدده وان القوم قد يطلق على واحد۔ (روح)

۵۳ (بلکہ آخر میں تمام قرائن ظاہری کے خلاف تم ہی کو کامیاب اور غالب کر دیا) کف ید، بسط ید کی ضد ہے، مطلب یہ ہوا کہ دشمنوں نے تم پر حملہ کر کے تمہارا قلع قمع کر دینا چاہا تھا لیکن اللہ نے ان کے حملوں کو ناکام رکھا، اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔

ع ۲

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ

اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا ۵۶ اور ہم نے ان میں بارہ۱۲ سردار مقرر کئے تھے ۵۷

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں رد ہے اُن افراط پسند جاہلوں کا جو اللہ کی دُنیوی نعمتوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

۵۴ (جیسا کہ اب تک ڈرتے رہے ہو)

غلبہ و کامیابی کی مسرّت کو یاد دلا کر معاً بعد تقوائے الٰہی کے استحضار سے صاف اشارہ اس امر کی طرف پایا جاتا ہے کہ غلبہ و کامیابی میں بڑا دخل تقویٰ الٰہی کو ہے، قناعت، بے طمعی، بے نفسی، ہمدردی، صداقت شعاری، ایثار، حفظِ حدود، غرض سیرت و کردار کی ساری انفرادی و اجتماعی خوبیاں اس ایک جامع لفظ "تقوائے" کے اندر آگئیں۔

۵۵ (نہ کہ اپنے دست و بازو، اپنی ہمت و تدبیر پر)

کامیابی و کامرانی کے بعد بڑا خطرہ یہی رہتا ہے کہ گھمنڈ اپنی قوت بازو اور اپنی عقل و فرزانگی پر ہو جاتا ہے۔ قرآن انسان کو پست ہمتی اور تعطل کی تعلیم ہرگز نہیں دیتا، اُسے سرگرم عمل برابر رکھنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا بھی روادار نہیں کہ انسان خود پرستی اور اسباب پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو جائے، وہ تعلیم بار بار اسی کی دیتا ہے کہ نظر اسباب سے بڑھ کر مسبب الاسباب پر رکھنا چاہیے، اسی نے پہلے بھی بگڑے کام بنائے ہیں اور اسی کی ذات کا سہارا آخرت تک قائم ہے۔

۵۶ (ان کی اطاعت و وفاداری کا، ان کے پیمبروں کے واسطے سے)

ابھی تاکید اللہ پر اعتماد اور اس کے احکام کی تعمیل کی آچکی ہے اب شہادت بنی اسرائیل کی تاریخ سے لائی جا رہی ہے کہ دیکھو اس موحد قوم نے بھی جب نافرمانی اختیار کی تو کیسے کیسے وبال میں پڑنے لگی۔

۵۷ (اُن کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق)

قوم اسرائیل بارہ۱۲ قبیلوں میں تقسیم تھی، اور ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار تھا بارہ سرداروں کا قرآنی عدد توریت کے بیان کے عین مطابق ہے توریت میں ہے کہ مصر سے نکلنے کے دوسرے برس خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا:

"تو بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا، مطابق ان کے فرقوں کے اور اُن کے آبائی خاندانوں کے اسم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سر سے برگن کر حساب کر، اور ہر فرقہ سے ایک ایک آدمی ہر ایک جو اپنے اپنے آبائی خاندان کا سردار ہے تمہارے ساتھ ہو" (گنتی ۱-۲-۴)

آگے ان سرداروں کے نام درج ہیں، اور وہ تعداد میں بارہ۱۲ ہیں۔

اسی طرح توریت میں ایک دوسری جگہ کنعان (فلسطین) پر فوج کشی سے ذرا قبل کے موقع پر ہے:-

"خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں، ایک ایک مرد اُن کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دے، چنانچہ موسیٰؑ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشتِ فاران میں اُن کو بھیجا، وہ سب لوگ بنی اسرائیل کے سردار تھے"

یہاں بھی سرداروں کی تعداد بارہ۱۲ درج ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اصل ہے مشائخ اہل تربیت کی اس عادت کی کہ وہ مریدوں پر ان کی

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ

اور اللہ نے (ان سے یہ بھی) کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۵۸ اگر تم نماز کی پابندی رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ

رہو گے اور میرے پیمبروں پر ایمان لاتے رہو گے اور ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو اچھے طور پر قرض دیتے رہو گے تو میں

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

تمہارے گناہ ضرور دور کردوں گا اور ضرور تم کو بہشت کے باغوں میں داخل کردوں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ۵۹

اصلاح، نگرانی کی غرض سے اپنے نائبوں کو مقرر کردیتے ہیں اور اس میں اُن کی باہمی مناسبت کا لحاظ رکھ لیتے ہیں۔

۵۸ معیتِ الٰہی کا تصور ایک خدا پرست قوم کے لئے کس درجہ ہمت آفریں، شوق افزا ہے اور اس کے بعد کس قدر قوی اور مطمئن ہو جاتا ہے اور شکست کا کوئی سوال بھی اس کے بعد ذہن کے سامنے نہیں رہ سکتا، آج ایک حاکم کریم کے ایک معمولی فرد سے کہہ دے کہ "گھبرانا مت ہم تمہارے ساتھ ہیں" تو اسے کس قدر قوت و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ خالقِ کائنات، مالک الملک، حاکم علی الاطلاق اپنی معیت کا یقین دلا رہا ہے۔ اسکینیت و جمعیت کا کوئی درجہ اس کے بعد باقی رہ سکتا ہے؟ یہ ایک پہلو تھا، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے، کوئی معصیت اس استحضارِ معیتِ الٰہی کے بعد ممکن ہے؟ جب کوئی اپنے سے ذرا بڑا نگرانی کے لئے پاس موجود رہتا ہے جب تو اس کی مروت لحاظ یا دباؤ سے ہم اپنے اوپر قابو حاصل کر لیتے ہیں اور قصداً کوئی کوتاہی یا لغزش اپنے سے سرزد نہیں ہونے دیتے، چہ جائیکہ ہمہ بیں و ہمہ داں مالک مولیٰ کی معیت کا استحضار! کوئی معصیت بھی اس کے بعد ممکن رہ جاتی ہے۔

غرض ترغیب و ترہیب کے جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے معیتِ الٰہی کا مراقبہ بہترین و مؤثر ترین ہے۔ محققین نے یہی صاف کر دیا ہے کہ معیت سے یہاں مراد معیتِ جسمانی نہیں جیسے مخلوق کے درمیان ہوتی ہے بلکہ احاطۂ علم و قدرت و نصرت کے لحاظ سے۔

انی معکم بالعلم والقدرۃ فاسمع کلامکم وارٰی فعالکم واعلم ضمیرکم و اقدر علی ایصال الجزاء [illegible]

الیکم (کبیر) ای بالعلم والحیاطۃ وفی ھذہ المعیۃ دلالۃ علی عظم الاعتناء والسماع [illegible]

۵۹ خوب خیال رہے کہ ایمان و حسن عمل کی اصل جزا قرآن مجید نے آخرت ہی میں رکھی ہے اور سارا زور جنت اور اس کی نعمتوں ہی پر دیا ہے یہاں تک کہ یہود وغیرہ قدیم قوموں کے تذکرہ کے سلسلہ میں بھی اسی کو بار بار دہرایا ہے ۔۔۔ دنیوی کامیابی اور غلبہ کو بھی بیان کیا ہے لیکن صرف کہیں کہیں اور وہ بھی گویا ضمنی اور ثانوی طور پر بطور انعام اصلی کے تتمہ کے ۔۔۔ اور یہی بڑا فرق قرآن اور توریت کے درمیان ہے۔

اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ یعنی جو پیمبر میری طرف سے آئندہ آتے رہیں گے، ان کی تصدیق کرو گے۔
وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ یعنی اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کی مدد کرو گے۔

ای رددتم عنھم اعداءھم (قرطبی) نصرتموھم بان تردّوا عنھم اعداءھم (مدارک)

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٢﴾ فَبِمَا

اور جو کوئی تم میں سے اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو بے شک اس نے ضائع کر دی راہِ راست ۶۰ غرض ان کی

نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ

پیمان شکنی ہی کی بنا پر ہم نے انہیں رحمت سے دور کر دیا ۶۱ اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا ۶۲

اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یعنی اللہ کی راہ میں نیک کاموں میں اخلاص و خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتے رہو گے۔ ہر زبان کے کچھ خاص محاورے ہوتے ہیں جو دوسری زبان والوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ انہی میں سے عربی کا یہ محاورہ ہے جو اردو خوانوں کو اجنبی سا محسوس ہوتا ہے۔ قرض کی حقیقت عرفی زبان میں صرف اس قدر ہے کہ یہ وہ مال ہے جس کی واپسی کچھ مدت بعد لینے والے پر لازم اور واجب ہو جاتی ہے۔

سمّاه قرضا ... الإنفاق من أموال ... قرضا (روح)

تو اسی واپسی کے لزوم و وجوب کی بنا پر اللہ کی خدمت میں مال پیش کرنے کو قرض سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور حَسَنًا کے اضافہ نے یہ قید لگا دی کہ وہ خدمت مال اخلاص و خوش دلی کے ساتھ ہو۔

۶۰ (اور بھٹک گیا)

بَعْدَ ذٰلِكَ یعنی اس عہد و پیمان کے بعد

۶۱ چنانچہ خود توریت بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانی، عہد شکنی اور ملعونیت کی داستان سے لبریز ہے۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ میں ب سببیہ ہے اور قرآن نے یہ صاف کر دیا کہ یہ ساری قومیں بگڑ گئیں اور بنی اسرائیل خود اپنے عہد و قرار کے توڑنے پر تل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز لعنت الٰہی میں گرفتار ہوتے گئے۔ لعنت کے مفہوم یعنی رحمتِ الٰہی سے محرومی پر حاشیے پہلے گزر چکے ہیں۔

لعنّاهم أي طردناهم وأبعدناهم من الرحمة قاله عطاء والزجاج (معالم)

بِمَا میں مَا نے معنیٔ تاکید کے پیدا کر دیئے۔

ما زائدة للتوكيد عن قتادة وسائر أهل العلم وذلك أنها تؤكد الكلام بمعنى تمكنه في النفس من جهة حسن النظم ومن جهة تكثيره للتوكيد ... موضوعة للتأكيد بالتكرير (قرطبی)

إياه سببية وما مزيدة لتوكيد الكلام وتمكينه في النفس (روح) ما مزيدة لإفادة تفخيم الأمر (ابن کثیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے یہ نکلا کہ بعض معاصی سے قبض طاری ہو جاتا ہے۔

۶۲ (کہ حق بات قبول نہیں کرتے)

یہ قلب کی قساوت یعنی کلمۂ حق کے قبول کرنے سے گریز اسی ملعونیت کے اثر سے ہے اور لعنت کی حقیقت ہے لطفِ حق سے دوری اور رحمتِ حق سے مہجوری۔

اللعن الإبعاد والطرد من الرحمة (قرطبی) محتمل التأويل الباطل ومحتمل تغيير اللفظ (کبیر)

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ

وہ کلام کو اس کے موقع ومحل سے بدل دیتے ہیں، اور جو کچھ انھیں نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک (بڑا) حصہ

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا

بُھلا بیٹھے ہیں ۶۶۳ اور ان سے بجز معدودے چند کے آپ کو اُن کی خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے ۶۶۴

یہود کی قساوتِ قلب کا ذکر انجیل میں بھی بار بار آیا ہے :۔

"اُس نے ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف اُن پر غصہ سے نظر کرکے اس آدمی سے کہا" (مرقس۔ ۳ : ۵) "ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ملامت کی" (مرقس۔ ۱۶ : ۱۴) "تو اپنی سختی اور غیر تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لیے اپنے واسطے غضب کما رہا ہے" (رومیوں۔ ۲ : ۵)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس طرح معاصی سے قبض طاری ہوجاتا ہے اسی طرح قبض سے معاصی پیدا بھی ہوجاتے ہیں تتمہ

۶۶۳ (اور اسی بڑے حصہ میں تصدیق رسالتِ محمدیؐ بھی شامل ہے)

قال ابن عباسؓ ترکوا نصیبا مما امروا بہ فی کتابھم وھو الایمان بمحمد صلعم (کبیر)

حَظًّا۔ تنکیر معنی کی بڑائی کے لئے ہے یعنی بڑا حصہ۔

ای نصیبا جزیلا وقسطا وافیا (مدارک) نصیبا وافیا۔ (بیضاوی)

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ اس میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفیں آگئیں۔

ای یتأولونہ علی غیر تاویلہ (قرطبی) قیل معناہ یبدلون حروفہ (قرطبی)

یہود مسیحیوں کی طرح خود بھی وحی لفظی کے قائل نہیں اور نہ اپنے صحیفوں بلکہ خود توریت تک کی محفوظیت کے مدعی ان کا تو سارا کام مسیحیوں کی طرح بجائے اصل متن کے ترجمہ کے زور پر چل رہا ہے اور ترجمہ بہتر سے بہتر بھی اصل سے جتنا دور ہوتا ہے ہر صاحب علم پر روشن ہے پھر ترجمہ در ترجمہ میں یہ لوگ ارادی ترمیم وتصرف سے شرماتے نہیں فخریہ اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں

۶۶۴ یہود کی دینی ودنیوی خیانتوں کی مثالیں خود قرآن ہی میں جابجا مذکور ہیں، مثلاً ان کا اخفاء احکام توریت ان کی جھوٹی اور جعلی شہادتیں پیش کرنا۔ وقس علی ہذا۔

خَآئِنَةٍ سے مراد خیانت ہے اور ایسا استعمال عربی میں عام ہے۔

الخائنۃ الخیانۃ قال قتادۃ وھذا جائز فی اللغۃ (قرطبی) الخائنۃ فی ھذا الموضع الخیانۃ وضع وھو اسم موضع المصدر (ابن جریر) بمعنی المصدر ونظیرہ کثیر کالکافیۃ والعافیۃ وقال تعالی فاھلکوا بالطاغیۃ ای الطغیان (کبیر)

خَآئِنَةٍ کا اطلاق کبھی علامہ ونسابہ کی طرح مبالغہ کے لئے بھی ہوتا ہے۔

ان تقع خائنۃ للواحد کما یقال رجل نسابۃ علامۃ فخائنۃ علی ھذا للمبالغۃ یقال رجل خائنۃ اذا بالغت فی وصفہ بالخیانۃ (قرطبی)

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ۔ اور یہ معدودے چند وہ تھے جو بعد کو ایمان لے آئے۔

مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَمِنَ الَّذِيْنَ

سو آپ اُن کو معاف کر دیجئے اور (ان سے) درگزر کیجئے ۶۵ بے شک اللہ نیک کاروں کو پسند کرتا ہے ۶۶ اور جو لوگ

قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠

کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا ۶۷ سو جو کچھ انہیں نصیحت کی گئی (اس کا) بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے ۶۸

۶۵ یعنی اُن کے ان جرائم کے باوجود ابھی آپ انتقام نہ لیجئے اور بلا ضرورتِ شرعی ان کی تفضیح و رسوائی کا سامان نہ کیجئے

۶۶ (اور اسی نیک کاری کی ایک فرد یہ ہے کہ بلا ضرورتِ شرعی کسی کی تفضیح و رسوائی نہ کی جائے)

مُحْسِنِيْنَ۔ احسان کے معنی عربی میں صرف حسنِ عمل اور نیک کاری کے ہیں اُردو کے "احسان" کا اُسے مرادف نہ سمجھا جائے۔ نکتہ سنجوں نے یہیں سے یہ حقیقت اخذ کی ہے کہ جب کافروں اور کافر بھی کیسے غدّار و خائن کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ حسنِ عمل اور نیک کاری قرار پایا تو پھر مسلمان کے ساتھ عفو و درگزر کے معاملہ کی فضیلت کا کہنا ہی کیا!

سبه علی ان العفو عن الکافر الخائن احسان فضلا عن العفو عن غیرہ (بیضاوی)

۶۷ (ویسا ہی عہد جس کا ذکر ابھی بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اوپر آچکا ہے)

قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى۔ اندازِ بیان کی احتیاط ملاحظہ ہو یہ ارشاد نہیں ہوا کہ ہم نے نصاریٰ سے عہد لیا بلکہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، ان سے ہم نے عہد لیا۔

نَصٰرٰى، نصرانی کی جمع ہے اور اس لفظ پر حاشیے پ ۱ میں گزر چکے زیرِ آیت وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى الخ

۶۸ (اور اسی بُھلائے ہوئے بڑے حصہ میں توحیدِ الٰہی بھی شامل ہے اور تصدیقِ رسالتِ محمدیؐ بھی)

یہ قرآن کا ایک عجیب معجزہ ہے کہ آج جو صحیفے انجیلوں کے نام سے مسیحی ہاتھوں میں موجود ہیں، صدگونہ تحریفات کے بعد بشاراتِ محمدی ان میں اب تک باقی ہیں، حضرت یحییٰؑ کے سلسلہ میں ہے:۔

"جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا، پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں پس انہوں نے اُس سے کہا پھر تو ہے کون؟" (یوحنا۔ ۱: ۱۹۔۲۲)

"انہوں نے اُس سے سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ۔ نہ وہ نبی۔ تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟" (یوحنا۔ ۱: ۲۵)

یہ بار بار "وہ نبی" کے سوال کے کیا معنی؟ ضروری ہے کہ کسی معروف نبی کی پیش گوئی یہود میں مدت سے چلی آرہی ہو! اور یہ النبی یقیناً مسیح سے الگ کوئی تھے، جیسا کہ اوپر کے سوالات سے ظاہر ہے۔

اور آگے چلئے، خود مسیحؑ نے ایک بار عید کے اخیر دن کھڑے ہو کر پکارا کہ اگر کوئی پیاسا ہو تو میرے پاس آ کر زندگی کا پانی پیئے "پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا، بے شک یہی وہ نبی ہے، اوروں نے کہا یہ مسیح ہے" (یوحنا ۷: ۴۰)

ایک حوالہ اور ملاحظہ ہو حضرت مسیح دنیا سے رخصت ہونے سے قبل اپنے شاگردوں کو تسلی دیتے ہیں "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے" (یوحنا۔ ۱۴: ۱۶)

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ

تو ہم نے ان میں باہم بغض اور عداوت قیامت تک کے لئے ڈال دیا ۶۹ اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اللہ

اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ

انھیں عنقریب وہ جتلادے گا ۷۰ اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے (یہ جو) رسول آئے ہیں، یہ تمہارے سامنے کتاب

لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ

(الٰہی) کے (وہ مضامین) کثرت سے کھول دیتے ہیں جنھیں تم چھپاتے رہے ہو ۷۱ اور بہت سے امور کو نظر انداز بھی کر جاتے ہیں ۷۲

(مددگار کے لفظ پر انجیل کے اردو نسخہ میں "یا وکیل یا شفیع" بھی درج ہے)

اب یہ ابد تک ساتھ رہنے والا مددگار "یا شفیع یا وکیل" بجز نبی "خاتم النبیین" کے اور کون ہے؟ اسی کی تاکید ایک بار پھر حضرت مسیحؑ کی زبان سے ملاحظہ ہو:—

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو وہ اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا، اور وہ آکر دنیا کو گناہ، اور راستبازی اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔" (یوحنا ۱۶: ۷-۸)

اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہوئے کہ وہ نبی آکر پرانی شریعتیں منسوخ کرے گا اور نئی شریعت چلائے گا۔

حَظًّا پر حاشیہ ابھی نمبر ۶۳ میں گزر چکا۔

صیغۂ نکرہ یہاں بھی "بڑائی" کے اظہار کے لئے ہے یعنی بڑا حصہ۔

والظاھر ان التنکیر للتعظیم ای ان مانسوہ واضاعوہ منہ کثیر (المنار)

۶۹ (جس سے وہ کبھی ایک کلمہ پر متحد نہ ہو سکیں گے)

بَيْنَهُمُ یعنی مسیحی قوموں کے درمیان۔ اشارہ نصرانیوں کے اندرونی مذہبی اختلافات کی جانب ہے، مسیحیوں کے اندر جس کثرت سے فرقے ہیں اور پھر ان میں باہم جس درجہ شدید اختلافات ہیں، باہر والوں کو اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، اور اگر اس مفہوم میں یورپ کی موجودہ سیاسی قومیں شامل بھی جائیں تو ان کی باہمی رقابتیں اور عداوتیں تو اور زیادہ ظاہر و روشن ہیں، جرمنی کی آویزش فرانس سے، امریکہ کا غصہ روس پر، فرانس کی عداوت اسپین سے، برطانیہ کی بدگمانی اٹلی سے وغیرہا، اور یہ جوڑ ہمیشہ بدلتے ہی رہتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ خاص سنہ کی یہ مثالیں اس کے دس سال بعد بھی قائم رہیں، اندرونی نفسانیت اور کشمکش کی حد و حساب ہی نہیں۔

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی ہمیشہ یا مستقل طور پر۔ قرآن مجید ظاہر ہے کہ محاورۂ انسانی کے مطابق ہے اور محاورہ میں قیامت تک ایسے مواقع پر مراد یہ ہوتی ہے کہ جب تک اس شے کا وجود باقی ہے، قرآن مجید ہی میں ابلیس کے ذکر میں ہے کہ اس پر لعنت قیامت تک رہے گی، یعنی بالکل ظاہر ہیں کہ وہ لعنت اس پر ہمیشہ رہے گی، نہ یہ کہ وہ یوم حشر کے بعد لعنت سے نجات پا جائے گا۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے ۴۳ اس کے ذریعہ سے اللہ

مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ

انھیں سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کی پیروی کرتے رہتے ہیں ۴۴ اور انھیں اپنی توفیق سے

اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

نور کی طرف تاریکیوں سے نکال کر لاتا ہے اور انھیں سیدھی راہ دکھاتے رہتا ہے ۴۵

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی جس طرح عقاب اُخروی کا سبب بنتے ہیں، عقابِ دنیوی کا بھی باعث بن سکتے ہیں۔

۴۰ سوف یعنی قیامت میں، قرآن مجید قربِ آخرت کے استحضار کے لئے بار بار اس کی آمد و وقوع کے لئے سوف کا لفظ اختیار کیا ہے۔ القاءِ عداوت و بغض باہمی میں ذکر وبالِ دنیوی کا تھا، اب ذکر سزائے آخرت کا آگیا۔

۴۱ (اور یہ بجائے خود ایک شہادت ہے اُن کے پیمبرانہ علم کی)

مطلب یہ ہوا کہ یہ پیمبر باوجود خود اُمّی ہونے اور باوجود تمھاری طرف سے ہر سعیِ اخفاء کے توریت وانجیل کے اصل مضامین وحی الٰہی سے معلوم کرکے ظاہر کردیتے ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ۔ اب خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔

۴۲ (اور یہ حلم و عفو بجائے خود ایک شہادت ہے ان کے پیمبرانہ اخلاق کی)

يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ یہ مضامین جنھیں آپ نظرانداز کرجاتے ہیں وہ ہیں، جن کے اظہار سے بجز مجرموں کی تفضیح کے اور کوئی شرعی غرض وابستہ نہیں۔

انما لم یظهره لانه لاحاجة الی اظهاره فی الدین (کبیر) لا یبینه اذا لم تضطر الیه مصلحة دینیة ومافیه احیاء الشریعة واماتة بدعة (کشاف)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہیں سے اہل اللہ کی یہ عادت ہے کہ جب تک کوئی مصلحت دینی نہ ہو مقتضائے غیظ پر عمل نہیں کرتے، اور عداوت میں بھی شفاءِ غیظ نفسانی کا قصد نہیں کرتے۔

۴۳ نور سے اشارہ ہے رسالتِ محمدی کی جانب اور كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ سے قرآن مجید کی جانب۔

یعنی بالنور محمد اصلعم وکتاب مبین هو القرآن الذی انزله علی نبینا (ابن جریر) نحد قیل محمد صلعم عن الزجاج وکتاب مبین ای القرآن فانه یبین الاحکام (قرطبی)

۴۴ یعنی رضائے حق کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کی تلاش و فکر میں رہا کرتے ہیں۔

ای من یعلم اللہ تعالیٰ انه یرید اتباع رضاء اللہ تعالیٰ بالایمان به (روح)

یہیں سے یہ حقیقت بھی روشن ہوجاتی ہے کہ راہ ہدایت انھی کے نصیب میں آتی ہے جو از خود اس کی تلاش، طلب میں رہتے ہیں

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ۚ قُلۡ فَمَنۡ

وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو عیسیٰ مسیح ابن مریمؑ ہے ۷۶ آپ کہئے کہ ۷۷

يَمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا إِنۡ أَرَادَ أَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَأُمَّهٗ

بھلا تو اللہ سے کون کچھ بھی بچا سکے اگر وہ ہلاک کر دینا چاہے مسیح ابن مریمؑ اور ان کی والدہ کو ۷۸

سُبُلَ السَّلٰمِ۔ پوری سلامتی، مادی و روحانی ہر حیثیت سے مکمل جنت ہی میں جا کر نصیب ہو سکتی ہے اس کے راستے یعنی جنت میں جانے کے طریقے صحیح عقائد اور صحیح اعمال ہیں۔

طرق السلامة الموصلة الی دار السلام وهو الجنة (قرطبی) قیل طرق الجنة (بحر)

بِہٖ میں ضمیر کتاب کی طرف ہے۔

ای بالکتاب المبین (کبیر) ظاهرہ انه یعود علی کتاب الله (بحر) ای بالقرآن (مدارک)

۷۵ یعنی عمر بھر انھیں سیدھی راہ پر قائم رکھتا ہے۔

الظُّلُمٰتِ سے مراد کفر کی تہ بہ تہ تاریکیاں ہیں۔

ای من ظلمات الکفر والجهالات (قرطبی)

النُّوۡرِ سے مراد ایمان و طاعت کی روشنی ہے۔

ای الی نور الاسلام والهدایة (قرطبی)

بِإِذۡنِهٖ سے مراد ارادۂ الٰہی، توفیق الٰہی، یا مشیت تکوینی ہے۔

ای بتوفیقه (کبیر) ای بارادته وتوفیقه (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اصل مقصود طلب رضا ہے، دخول جنت اس کے تابع ہے۔

۷۶ اس عقیدہ کو جو کھلا ہوا شرک ہے خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید "نصرانیت" سے تعبیر نہیں کرتا، نہ ایسے لوگوں کو نصاریٰ یا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ سے موسوم کرتا ہے، ان کا ذکر تو الذین قالوا انا نصاریٰ کے تحت میں ابھی اوپر آ چکا ہے اب جن لوگوں کا ذکر ہے ان کے لئے تو کھلا ہوا حکم تکفیر ہی کا ہے۔

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِينَ الخ مسیحیت موجودہ کی متعدد شاخوں کے عقیدے تو کھلے ہوئے مشرکانہ ہیں، مثلاً SABELLIANSIM و MONAR CHIANISM DOCETISM وغیرہا، ان کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تفسیر انگریزی، اردو میں ان کی اصطلاحوں کے ترجمے بھی دشوار ہیں، لے ہی وہ مسیحیت جو مسلک جمہور کے مطابق ہے اور صدیوں سے دنیا میں خوب پھیلی ہوئی ہے وہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، عقیدۂ اتھاناسیس (ATHANASIAN CREED) جو کیتھولک، پروٹسٹنٹ وغیرہ سب مشہور و مقبول فرقوں میں مشترک ہے اس میں یہ الفاظ صراحۃً موجود ہیں:

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر، عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے، باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق، باپ غیر محدود، بیٹا

وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

اور جو کوئی بھی زمین پر ہے سب کو لـه اور آسمانوں پر اور زمین پر اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے

وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾

اس (سب) پر اللہ ہی کی حکومت ہے لـه وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے لـه

غیر محدود اور روح قدس غیر محدود۔ باپ ازلی بیٹا ازلی اور روح قدس ازلی۔ یونہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح قدس قادر مطلق، ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا اور روح قدس خدا"۔۔۔ کھلا شرک اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

اَلْمَسِيْحُ اور مَرْيَمَ دونوں پر حاشیے پہلے گزر چکے ہیں۔

اَلْمَسِيْحُ کے ساتھ ابن مریم کا اضافہ بجائے خود ایک ضرب کاری ہے عقیدۂ الوہیت مسیح پر کہ جسے تم عین خدا قرار دے رہے ہو، وہ تو خود ایک خاتون کا فرزند تھا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں صریح رد ہے اُن لوگوں پر جو خالق و مخلوق میں اتحاد کے قائل ہیں۔

لـه (اس مسیح پرستی کی تردید میں اے ہمارے پیغمبر!)

لـه (طبعی موت سے)

اَنْ يُّهْلِكَ۔ اہلاک تو ایک ہوتا ہے بصورت عذاب وہ یہاں مراد نہیں یہاں اہلاک بصورت موت طبعی مراد ہے۔

المراد بالاھلاک الاماتة والاعدام مطلقا لاعن سخط وغضب (روح)

مَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ مِلْکٌ یہاں قدرت کے معنی میں ہے۔

الملک ھو القدرة (کبیر) یملک بمعنی یقدر من قولھم ملکت علی فلان امرہ ای اقتدرت علیہ (قرطبی)

پورے فقرے کا مفہوم یہ ہوا کہ کون اللہ کے ارادہ کی راہ میں حائل و مانع ہو سکتا ہے؟

یعنی فمن الذی یقدر علی دفع شیئ من افعال اللہ تعالی ومنع شیئ من مرادہ (کبیر) ای فمن یقدر ان یمنع من ذلک شیئا (قرطبی) فمن یمنع من قدرتہ وارادتہ شیئا (بیضاوی)

فَمَنْ میں مَن لانے سے مراد یہ ہے کہ اگر تمہارا یہ عقیدہ صحیح ہے تو بتاؤ، اسی مفہوم کو ترجمہ میں "اچھا تو" ظاہر کیا گیا ہے۔

وَاُمَّهٗ۔ مسیحؑ کے ساتھ حضرت مریمؑ کا ذکر لانے کی مناسبت یہ ہے کہ دنیائے مسیحیت کی ایک بڑی آبادی کے نزدیک وہ بھی شریک الوہیت ہیں اور لاکھوں بلکہ کروڑوں مسیحیوں کے اعتقاد میں مرتبۂ خدائی پر فائز ہیں، اصل حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تفسیر انگریزی۔

حاصل استدلال یہ ہوا کہ قوت، قدرت، ارادہ و اختیار میں کوئی مخلوق حتیٰ کہ مسیحؑ و مریمؑ بھی خدا تعالیٰ خالق کائنات کے مقابلہ میں کچھ بھی لائے جا سکتے ہیں؟ اور اللہ کی مشیت کی راہ میں ذرا بھی حائل ہو سکتے ہیں؟ کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ نہیں، پھر جب یہ ہے کہ تمہاری عقل کیسی ماری گئی ہے کہ تم مسیحؑ (یا مسیحؑ و مریمؑ دونوں) کو شریک الوہیت ٹھہرا رہے ہو!

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ

اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں ۵۸۲

۵۷۹ (کہ بے اختیاری بے بسی، اور مخلوقیت میں حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ بھی ساری ہی مخلوق جیسے ہیں، اور اس اعتبار سے اِن میں اور اُن میں کوئی فرق نہیں)

اراد عطف من فی الارض علی المسیح وامه ایذانا من جنسهم لاتفاوت بينهما وبينهم فی البشرية (کشاف)

یعنی ان عیسیٰ مشاکل من فی الارض فی الصورة والخلقة والجسمية والتركيب وتغییر الصفات والاحوال. (کبیر)

۵۸۰ (بلاکسی کی شرکت و اعانت کے)

آسمانوں پر اور زمین پر اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اس پر یعنی ساری موجودات و کائنات پر۔

۵۸۱ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اور اس سے ان کا استدلال یہ تھا کہ ایسے محیّر العقول وجود کو انسان یا بشر کیسے تسلیم کر لیا جائے؟ وہ یقیناً فوق البشر ہے اور اُلوہیت کا حصہ دار۔ یہاں جواب اسی کا دیا گیا ہے کہ اللہ تو پیدا کرنے کی ہر صورت پر اور ہر صورت سے پیدا کرنے پر قادر ہے اس نے اگر کسی مخلوق کو عام اور عمومی عادت کے خلاف کسی اور طریقہ سے پیدا کر دیا تو اس سے اس مخلوق کی اُلوہیت یا غیر مخلوقیت کیسے ثابت ہو گئی؟ یَخْلُقُ مَا يَشَآءُ۔ جو کچھ چاہے اور جس طرح چاہے، خواہ سُنتِ عادی کے موافق ہو یا مخالف، پیدا کر سکتا اور پیدا کرتا رہتا ہے، اُس کی قوتِ خلّاقی کسی صورت اور کسی طریق کے ساتھ مخصوص و معیّن نہیں، تخلیق کی ہر نوع اور ہر صنف، بلا واسطہ اور بواسطہ سب پر یکساں قادر ہے۔

ای یخلق ای خلق یشاءه فتارة یخلق من غیر اصل واخری من اصل وتارة من اصل یجانسه ویخلق بلا توسط شیئ من المخلوقات وقد یخلق بتوسط مخلوق آخر (روح) ای ان خلقه لیس مقصورا علی نوع واحد بل ما تعلقت مشیئته بایجاده اوجده واخترعه (بحر)

۵۸۲ (اور اس لئے عام نوعِ انسان سے کہیں افضل و اشرف)

نَحْنُ صیغۂ جمع متکلم سے مراد یہاں افراد نہیں بلکہ قوم یا ملت، مجموعۂ افراد مراد ہے یعنی یہود من حیث القوم اور نصاریٰ بہ حیثیت ملت۔ بائبل میں آج تک اس قسم کے حوالے موجود ہیں:۔

"خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے"۔ (خروج ۔ ۴ : ۲۲)

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو" (استثناء ۱۴ : ۲۲)

"جب اسرائیل لڑکا تھا میں نے اس کو عزیز رکھا اور اپنے بیٹے کو مصر سے بُلایا"(ہوسیع ۱۱ : ۱)

"جتنوں نے اُسے قبول کیا، اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا"۔ (یوحنا ۔ ۱ : ۱۲)

"جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے چلتے ہیں، وہی خدا کے بیٹے ہیں"۔ (رومیوں ۔ ۸ : ۱۴)

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی انگریزی تفسیر۔

اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ میں ابناء سے مراد حقیقی صُلبی بیٹے نہیں اور نہ اس کے یہ معنی ہی لازمی طور پر ہیں،

صلبی بیٹے کے لئے عربی میں دوسرا لفظ ہے ولد ابن کا اطلاق مجازی معنی لئے ہوؤں پر اور طرح ہوتا ہے اور عربی میں اس کا یہ مجازی استعمال بہت عام ہے۔

يقال لكل ما يحصل من جهة شئ او من تربيته او بتفقده او كثرة خدمته له او قيامه بامره هو ابنه نحو فلان ابن حرب وابن السبيل للمسافر وابن الليل وابن العلم وفلان ابن بطنه وابن فرجه اذا كان همته مصروفا اليهما وابن يومه اذا لم يتفكر فی غده۔ (راغب)

اور اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب ابن بنت یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے چیزیں ان کی جانب منسوب ہوا کرتی ہیں

وللأب والابن والبنت اسماء ... (المزهر ...)

اور آگے ازہری لغوی اور ابن الاعرابی لغوی کے حوالے سے ایک بڑی طویل فہرست ایسے ناموں کی دے دی ہے جو عربی میں کسی کے "ابن" کی حیثیت سے مشہور و متعارف ہیں، مثلاً ابن الطین حضرت آدم کے لئے ابن اللیل چور کے لئے، ابن الاقوال باتونی شخص کے لئے وغیرہا۔

بعض مفسرین تہم اللہ نے بھی بغیر اس کے کہ بائبل کے محاوروں کا مطالعہ کیا ہو محض اپنے اشراق ایمانی سے یہاں یہی معنی قرار دیئے ہیں یعنی ہم خاصان خدا میں سے ہیں ہمارا درجہ عام خلقت کا مقابلہ ہی کیا۔

كما كان يقول رهط مسيلمة نحن انبياء الله ويقول اقرباء الملوك وحشمهم نحن الملوك (كشاف) ای اعزة عليه كالابن على الاب (مدارك) لفظ الابن كما يطلق على ابن الصلب فقد يطلق ايضا على من يتخذ ابنا واتخاذه ابنا بمعنى تخصيصه بمزيد الشفقة والمحبة (كبير) ارادوا ان الله تعالیٰ لنا كالاب فی الحنو والعطف ونحن كالابناء له فی القرب والمنزلة (معالم. ابو سعود) ولو اهذا يطلق عندهم على التشريف والاكرام (كبير) ومرادهم بالابناء المقربون ای نحن مقربون عند الله تعالیٰ قرب الاولاد من والدهم (روح) البنوة هنا بنوة الحنان والرأفة (بحر)

اور شیخ رشید رضا مصری جن کی نظر سے توریت و انجیل پوری طرح گزر چکی ہیں انھوں نے ان کتابوں سے بہت سی نظیریں ان الفاظ کے استعمال کی اکٹھی کر کے آخر میں صاف لکھ دیا ہے:۔

فعلم من هذه النصوص واشباهها ان لفظ ابن الله يستعمل فی كتب القوم بمعنى حبيب الله الذی يعامله الله معاملة الاب لابنه من الرحمة والاحسان والتكريم فعطف احباء الله على ابناء الله للتفسير والايضاح (المنار)

ان سب حوالوں سے ثابت ہو گیا کہ لفظ ابن اللہ ان لوگوں کی کتابوں میں مرادف ہے حبیب اللہ کے یعنی اللہ کے ساتھ وہ تعلق رکھتا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتا ہے شفقت و لطف و کرم کا، اور اس لئے "احباء" کی اس پر عطف بطور تفسیر و توضیح کے ہے۔

گویا حاصل تقریر یہود و نصاریٰ کا یہ تھا کہ ہم سب اونچی ذات والے اور خاص مقربین حق میں ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی دعویٰ جیسے ہندوستان میں برہمنوں کی اور اپنے کو چندر بنسی اور سورج بنسی کہلانے والے راجپوتوں کی زبان سے سنے جاتے ہیں۔

ومقصود الفريقين هو المعنى المتضمن ما حاولوا حاصل دعواهم ان لهم فضلا ومزية عند الله تعالیٰ على سائر الخلق (روح) وبجملة فكلام ان اليهود والنصارى كانوا يرون لانفسهم فضلا على سائر الخلق

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ

آپ کہہ دیجئے تو پھر خدا انھیں گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے ۵۸۳ نہیں بلکہ تم (محض) بشر ہو مخلوقات میں سے ۵۸۴

يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا ۵۸۵ اور اللہ ہی کی حکومت آسمانوں اور

وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ

زمین پر اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس (سب) پر بھی ہے اور اسی کی طرف واپسی ہے ۵۸۶ اے اہل کتاب!

قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ

تمہارے پاس ہمارے (یہ) رسول جو تمہیں صاف صاف بتاتے ہیں آپہنچے ایسے وقت میں کہ رسولوں کا آنا بند تھا ۵۸۷

بسبب اسلافهم الافاضل من الانبياء حتى انتهوا فى معطيه انفسهم۔ (کبیر)

اور اسی سے ملتی جلتی ذہنیت خود مسلمانوں کے اندر بھی پیرزادگی، مشائخ زادگی، مخدوم زادگی کے گھمنڈ سے پیدا ہوگئی ہے۔

۵۸۳ (جس کے تم خود قائل ہو)

بداعمالی پر دنیوی سزاؤں کا ترتب تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی جس سے یہود و نصاریٰ کسی کے لئے انکار ممکن نہ تھا، اور ان دنیوی سزاؤں کے تذکرہ سے عہد عتیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اس میں صریح رد ہے اس شخص پر جو اللہ کے ساتھ ایسے قرب کا قائل ہو جس میں معصیت پر بھی مواخذہ نہ ہو۔

۵۸۴ (اور بلا امتیاز و استثناء انھیں کی طرح عام قاعدوں کے تحت میں داخل ہو)

یعنی جزاء و سزا کا جو قانون ساری دنیا کے لئے ہے، وہی تمہارے لئے بھی ہے۔

۵۸۵ (اور وہی قادر مطلق، حاکم برحق یہ وعدہ کرچکا ہے کہ اہل ایمان کے لئے مغفرت ہے، اور اہل کفر کے لئے دائمی عذاب)

یعنی اس کی مشیت سب پر غالب ہے، وہ کسی کی محکوم نہیں، نہ کسی کی مروت، نہ کسی کا دباؤ اس کے اوپر غالب۔

۵۸۶ (نہ کہ کسی نبی یا ولی کی طرف، نہ کسی فرشتہ یا دیوتا کی طرف)

مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ آخرت میں پیشی ابن اللہ مسیح کے دربار میں ہوگی، اور یہود اس خیال میں تھے کہ ان کے آباء و اجداد یعقوبؑ اور اسحٰقؑ اور ابراہیمؑ انھیں عذاب الٰہی کی گرفت سے بچالیں گے۔

حکیم الامت تھانویؒ نے اس موقع پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ لفظ بہ لفظ نقل ہونے کے قابل ہے:-

"یہ دعویٰ مذکورہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ہمارے زمانہ کے جاہل پیرزادوں کا انتساب تولدیا اتصال سلسلہ کی بنا پر گھمنڈ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ایک گونہ ذاتی خصوصیت اور نسبت ہے، جو معاصی وغیرہ سے قطع نہیں ہوتی اور ہم کیسے ہی ہوں مگر اس انتساب یا اتصال کے زور سے کھڑے جنت میں جائیں گے۔"

أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ

کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ بشارت دینے والا آیا نہ تنبیہ کرنے والا ۵۸۸ (اب تو) آگیا تمہارے

وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٩﴾

پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا ۵۸۹ اور اللہ ہر چیز پر (پوری) قدرت رکھنے والا ہے ۵۹۰

السَّمٰوٰتِ ...... بَيْنَهُمَا۔ اصطلاح قرآنی میں اس سے مراد ساری کائنات، ساری موجودات سے ہوتی ہے۔

۵۸۷ (اور دنیا صدہا سال سے وحی تازہ کی نعمت سے محروم تھی)

رَسُوْلُنَا۔ ہمارے یہ رسول جن کی آمد آمد کی اہل کتاب مدت سے سن رہے تھے انجیل میں بار بار ذکر "وہ نبی" THE PROPHET کا یہود کی زبان سے آتا ہے اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ ایک متعارف نبی کا آنا مدتوں سے مسلم چلا آرہا تھا۔

يُبَيِّنُ لَكُمْ یعنی صاف صاف احکام شریعت بتلاتے رہتے ہیں علیٰ فترۃ من الرسل کی تقدیر کلام یوں بھی کی گئی ہے۔

علی حین فترۃ من الرسل۔ ای جاءکم علی حین فترۃ من ارسال الرسل (کشاف) ای علی فتور من الارسال (کبیر)

فترۃ کے لفظی معنی انقطاع عمل یا سکون کے ہیں۔

ای سکون والاصل فیہا انقطاع العمل عما کان علیہ من الجد فیہ (قرطبی)

اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیانی زمانہ کو کہتے ہیں۔

الفترۃ ما بین کل نبیین (تاج) ای علی انقطاع ما بین النبیین عن ابی علی وجماعۃ اہل العلم (قرطبی) سمیت المدۃ التی بین الانبیاء فترۃ (کبیر)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم صلعم کے درمیان وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا رہا ہے حضورؐ کا سال ولادت ۵۷۱ء (یا ۵۷۰ء) ہے اور سال بعثت ۶۱۰ء ہمارے ہاں بھی متعدد تابعین سے یہی مدت منقول ہے۔

وقال قتادۃ کان بین عیسیٰ ومحمد علیہما السلام ست مائۃ سنۃ وقال مقاتل والضحاک ووہب بن منبہ الا ان وہبا زاد عشرین سنۃ (قرطبی)

۵۸۸ (اس لئے ہم کو دین کے باب میں صحیح اور تفصیلی کافی علم ہونے ہی نہیں پایا۔)

أَنْ تَقُولُوا۔ یعنی کہیں قیامت کے دن یہ عذر پیش کرنے لگو۔ اَنْ یہاں لئلا کے معنی میں ہے۔

ای لئلا او کراہۃ ان تقولوا (قرطبی) فقدرہ القراء لان لا تقولوا (ابو سعود)

مِنْ بَشِيرٍ۔ میں مِنْ نفی و انکار میں زیادتی کے لئے ہے کہ کوئی بھی تو نہیں آیا۔

وزیادۃ من فی الفاعل للمبالغۃ فی نفی المجئ (روح)

۵۸۹ (سو سن لو کہ اب عذر کی کوئی گنجائش تمہارے پاس باقی نہیں رہی، آگے ماننا نہ ماننا تمہارا فعل ہے)

والتقدیر ہنا لا تعتذروا فقد جاءکم (روح) والفاء متعلق بمحذوف ای لا تعتذروا فقد جاءکم (مدارک)

۵۹۰ (اور یہ اسی کی قدرت کا ایک ظہور ہے کہ اس نے صدیوں کے بعد ایک پیغمبر اور وہ بھی سب پیغمبروں سے بڑا مبعوث کردیا)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ۹۱ کہ اے میری قوم! اللہ کا وہ احسان تم اپنے

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا

اوپر یاد کرو جب اس نے تمھارے اندر نبی پیدا کئے اور تمھیں خود مختار کیا ۹۲

آیت کے اس ٹکڑے سے یہ پہلو بھی صاف ہوا جاتا ہے کہ گو اس نے تمھاری حجت قطع کرنے کو پیغمبر مبعوث کردیئے تاہم اگر وہ چاہتا تو بغیر اس کے بھی تم پر حجت قائم کردیتا، اور تمھیں دم مارنے کی مجال نہ ہوتی۔

۹۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا وہ زمانہ ہے کہ جب بنی اسرائیل مصریوں کی غلامی و محکومی سے آزاد ہو کر جزیرہ نمائے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ایک ہی وقت میں ان کے دینی پیغمبر بھی تھے اور دنیوی لیڈر بھی انھیں آمادہ کر رہے ہیں کہ اپنے وطن فلسطین چلو، ظالم و غاصب قوم عمالقہ کو وہاں سے نکال دو اور خود اس پر حکمرانی کرو۔ تازہ ترین تاریخی اور اثریاتی تحقیق کے مطابق مصر سے خروج بنی اسرائیل کا زمانہ سنہ ۱۴۴۴ ق م کا ہے اور فلسطین پر اسرائیل کی فوج کشی کا زمانہ سنہ ۱۴۰۰ ق م کا۔ اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے، عجب نہیں کہ یہ آپ کے بالکل آخری زمانہ کی ہو جیسا کہ توریت کے صحیفہ استثنا باب اول سے اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسی صحیفہ استثناء میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ آپ نے یہ تقریر دریائے یردن کے اسی پار موآب کے میدان میں واقعۂ خروج مصر کے چالیسویں سال کے گیارھویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو ارشاد کی تھی۔

۹۲ (اے اسرائیلیو!)

يٰقَوْمِ۔ خطاب یہاں قوم سے بہ حیثیت مجموعی ہے، افراد سے نہیں۔

فِيْكُمْ میں فی، مِن کے مرادف ہے۔

فيكم اى منكم (ابن عباسؓ)

نبوت ایک انفرادی اور شخصی منصب ہوتا ہے اسی لئے فیکم وارد ہوا ہے یعنی تمھاری قوم کے اندر افرادِ انبیاء ہوتے رہے۔

جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا۔ مَلِك کے معنی عربی میں لازمی طور پر بادشاہ اور تاجدار کے نہیں، ہر آزاد خود مختار اور صاحب حیثیت شخص پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

يقال من استغنى عن غيره فهو ملك (قرطبی) الملك اسم لكل من يملك السياسة إما فى نفسه وإما فى غيره سواء تولى ذلك او لم يتول (راغب) كل من كان مستقلا بامر نفسه ومعيشته ولم يكن محتاجا فى مصالحه الى احد فهو ملك (كبير) كل من ملك بيتا وخادما او امرأة فهو ملك. (ابن جریر)

حدیث میں ہر ایسے شخص پر ملک کا اطلاق آیا ہے، جو اپنا ذاتی مکان اور زوجہ اور خادم رکھتا ہو۔

عن النبى صلعم من كان له بيت او قال منزل ياوى اليه وزوجة وخادم يخدمه فهو ملك. (قرطبی)

وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ

اور تمہیں وہ دیا جو دنیا میں کسی (قوم) کو بھی نہیں دیا گیا تھا ۹۳؎ اے میری قوم! اس زمین مقدس میں

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ

داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے ۹۴؎ اور پچھلے پیروں واپس نہ ہو ورنہ بالکل خسارہ

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ

میں پڑ جاؤ گے ۹۵؎ وہ بولے کہ اے موسیٰ! اس سرزمین پر تو بڑی زبردست قوم (آباد) ہے ۹۶؎

عن زید بن اسلم قال قال رسول اللّٰہ صلعم من کان لہ بیت وخادم فھو ملک (ابن جریر)

اور قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ملک سردار، افسر، فوجی قائد کے معنی میں آچکا ہے ابعث لنا ملکا (بقرہ ۲۴۶) خود اہل فلسطین کے محاورہ میں بھی تقریباً ہر سردار یا دشادی کہلاتا تھا (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۸ ص ۵) اسی لئے یہاں متعدد ائمہ و اکابر نے مُلُوک کا ترجمہ مخدوم یا اور ایسے ہی مترادفات سے کیا ہے۔

ای جعلکم ملوکا وعن ابن عباس یعنی الخادم والمنزل والمرأۃ ... وعکرمۃ والحکم بن عیینۃ (قرطبی) اصحاب خدم وحشم (جلالین) وقال ... یعنی اصحاب خدم وحشم (معالم)

اسرائیلی ابھی چند سال قبل تک محکوم، مغلوب و مقہور تھے اور اب ہر طرح آزاد و خود مختار تھے بالکل بجا تھا کہ تقابلِ حالات کے اظہار کے لئے اب انہیں ملوک سے تعبیر کیا جاتا۔

یعنی ما کنتم فیہ من ملک فرعون (ابن عباس) وقال السدی یعنی وجعلکم احرارا تملکون انفسکم بعد ما کنتم فی ایدی القبط بمنزلۃ اھل الجزیۃ فینا (کبیر)

۹۳؎ یہ نعمتِ عظمیٰ نعمتِ توحید ہے تاریخ سے ثابت ہے کہ اقوام عالم میں نسلی و قومی حیثیت سے توحید اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے ورنہ اور قومیں من حیث القوم شرک ہی میں مبتلا رہی ہیں ہمارے مفسرین کو اس مضمون کی آیتوں کی تفسیر میں بڑی دشواری پیش آتی رہی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کو سب سے افضل مان لیا جائے تو پھر امتِ محمدی کے لئے کون سا مقام باقی رہ جائے گا؟

اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے یہاں مقابلہ تو دنیا کی ساری قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے ان میں بیشک سب سے افضل و اشرف نسل اسرائیلی ہی ہے کہ برخلاف دوسری قوموں کے شرک اور وہم پرستیوں کے توحید اور اس کے لوازم یعنی رسالت، وحی، حشر وغیرہ عقائدِ صحیحہ کی حامل دنیا کی تاریخ میں یہی ایک قوم رہی ہے، بخلاف اس کے امتِ محمدی تو کسی قوم یا نسل کا نام ہی سرے سے نہیں یہاں تو اسرائیلی، اسمٰعیلی، حبشی، چینی، روسی، جاپانی جو کوئی بھی عقائدِ اسلامی پر ایمان لے آئے وہی امتِ محمدی میں داخل ہے اس پر مفصل حاشیے انّی فضّلتکم علی العٰلمین کے تحت میں سورۂ بقرہ کے رکوع ۵ و ۶ میں گزر چکے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کے خاندان میں سے ہونا ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے کیونکہ اس تعلق سے دین اس پر سہل ہو جاتا ہے البتہ اس پر فخر اور گھمنڈ روا نہیں۔

۹۴ف (لوح محفوظ میں یا اپنے علم میں)
حضرت موسیٰؑ موقع ترغیب پر فرما رہے ہیں کہ وہ زمین تو تمہارے لئے مقدر ہو ہی چکی ہے ذرا سی ہمت و کوشش کرو تو ابھی مل جاتی ہے۔
الارض المقدسۃ التی مقدس سرزمین سے مراد شام ہے فلسطین (کنعان) اسی کے ایک علاقہ کا نام ہے۔
ھی الشام (ابن جریر عن قتادۃ) الارض المقدسۃ دمشق وفلسطین وبعض الاردن (ابن جریر عن ابن عباسؓ)
توریت میں ان وعدوں کی صراحتیں موجود ہیں:۔
• دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہو اور اس زمین کو جس کی بابت خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا، میراث میں لو" (استثناء۔ ۱:۸) "تا اس سرزمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کے کہا ہے میں تمہیں دوں گا، سکونت کرے" (استثناء۔ ۳۰:۲۰) "مضبوط ہو جاؤ اور دلاور ہو خوف نہ کھاؤ اور ان سے مت ڈرو، کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے، وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا۔" (استثناء۔ ۳۱:۶)

۹۵ف دنیوی خسارہ تو ظاہر ہی ہے کہ حکومت اور اتنی بڑی حکومت سے محروم ہو جاؤ گے اور اُخروی خسارہ یہ کہ حکم جہاد کی نافرمانی کا خمیازہ آخرت میں اٹھانا پڑے گا۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی سے کبھی کبھی دنیوی مضرتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

۹۶ف یہ قوم عمالقہ کی تھی، جو ایک بڑی زور آور اور جنگ آزما قوم تھی، بنی اسرائیل کی پرانی حریف توریت اور تاریخ اسرائیل اس کی خون ریزیوں کی داستان سے رنگین ہے، توریت میں اس مقام پر بنی اسرائیل کی زبان سے یہ الفاظ ادا کئے گئے ہیں:
"ہمیں زور نہیں کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔" (گنتی۔ ۱۳:۳۲)
"یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگلتی ہے اور سب لوگ جنہیں ہم نے وہاں دیکھا بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو اِن بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا، اور ہم اپنی نظروں میں ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم اُن کی نظروں میں تھے۔" (گنتی۔ ۱۳:۳۳)
جَبَّارِیْنَ جبار کا اطلاق بڑے ڈیل ڈول والوں، کلے ٹھلے والوں پر بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں یہی مراد ہے۔
ای عظام الاجسام طوالا (قرطبی) یقال رجلًا جبارًا اذا کان طویلًا عظیمًا قویًا والقوم کانوا فی غایۃ القوۃ وعظم الاجسام (کبیر)
روایات یہود میں ذکر بہت مبالغہ کے ساتھ ان کے قد و قامت کی درازی کا آیا ہے اور ان کی درازی عمر بھی بہت کچھ مذکور ہیں ــــ لفظ جبار جو قرآن مجید نے ان کے لئے استعمال کیا ہے یہ وہی ہے جو خود توریت میں ان کے لئے آیا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباسات میں نقل ہو چکا۔

وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم تو وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں البتہ وہ اگر وہاں سے نکل جائیں تو ہم جبھی داخل ہونے کو تیار ہیں ۹۷

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ

(اس پر) وہ دو آدمی جو (اللہ سے) ڈرنے والوں میں تھے (اور) اُن دونوں پر اللہ کا فضل تھا بولے ۹۸ تم ان پر چڑھائی کرکے شہر کے دروازہ تک تو چلو

۹۷ بنی اسرائیل ایک طرف تو اپنے ان مخالفین یعنی عمالقہ کی ہیبت و شوکت سے اس قدر مرعوب تھے اور دوسری طرف تن آسانیوں کے عادی، فرائضِ جہاد سے جی چرانے والے بھی ایسے تھے کہ وطن تک کے لئے اپنے پیمبر اور دُنیوی لیڈروں کی ترغیب کے باوجود آمادہ نہ ہوئے۔

توریت میں اُن کی زبان سے ادا کیا گیا ہے:۔

• وہ لوگ جو وہاں بستے ہیں زور آور ہیں، اور اُن کے شہر بہت مضبوط قلعوں میں ہیں اور ہم نے بنی عناق کو بھی وہاں دیکھا، اور اس زمین کی دکھن کی طرف عمالیقی بستے ہیں.... ہمیں زور نہیں کہ ہم اُن لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں" (گنتی ۔ ۱۳: ۲۸، ۳۱)

نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ماقبل، اسرائیلیوں کا یہ قول بھی بطریق استبعاد تھا، خوب سمجھے ہوئے تھے کہ نہ عمالقہ وہاں سے از خود نکلیں گے اور نہ ہمیں چڑھائی کی نوبت آئے گی۔

انما قالوا هذا على سبيل الاستبعاد (كبير) قيل قالوا ذلك على سبيل الاستبعاد ان يقع خروج الجبارين منها۔ (بحر)

۹۸ (ان کم ہمتوں کو حوصلہ دلانے کے لئے)

رَجُلٰنِ۔ ان دو میں سے ایک کا نام یوشع بن نون تھا، اور دوسرے کا کالب بن یوفنا، یوشع سردار تھے قبیلہ بنی افرائیم کے، اور کالب قبیلۂ بنی یہودا کے۔

مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جن میں خوفِ خدا تھا جن کے دلوں میں تقویٰ الٰہی اور خشیت تھی۔

اى يخافون الله سبحانه ويتقونه (بيضاوى) كانه قيل رجلان من المتقين (كشاف)

اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا۔ اللہ کا فضل و ایمان اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں حق گوئی و حق پرستی کی توفیق دی اور وہ شوکتِ کفار سے مرعوب نہ ہوئے۔

اى باليقين والصلاح۔ (قرطبى)

موسیٰ علیہ السلام نے جیسا کہ ہر دانشمند فوجی لیڈر کو ایسے موقع پر کرنا چاہئے، کیا یہ کہ فلسطین پر فوج کشی سے قبل اپنی قوم کے ہر قبیلہ سے اُس کے کل بارہ معززین و شرفاء کو چن کر ملک کے متعلق تحقیق حال کے لئے یا بہ اصطلاح توریت "جاسوسی" کے لئے آگے روانہ کر دیا، اس میں سے دس نے آکر یہ مبالغہ آمیز رپورٹ دی کہ غنیم بہت ہی طاقتور ہے اس سے مقابلہ کرنا اپنی جان کھونا ہے، باقی دو نے اس کے برعکس ہمت افزا باتیں بیان کیں۔

توریت کے بیانات اس موقع پر بھی حسبِ معمول بڑے طویل ہیں، تاہم کچھ اقتباسات تو بہر حال قابلِ نقل ہیں:۔

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ

سو جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اسی وقت غالب آجاؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اگر تم ایمان رکھتے

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا

ہو ۹۹ وہ لوگ بولے اے موسیٰؑ! ہم ہرگز وہاں کبھی بھی نہ داخل ہوں گے جب تک کہ وہ لوگ وہاں موجود

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

ہیں سو آپ خود اور آپ کے خداوند چلے جائیں اور آپ دونوں لڑ بھڑ لیں ہم تو یہاں سے ٹلتے نہیں ۱۰۰

" پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تا کہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں ایک ایک مرد ان کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دے چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشت فاران سے ان کو بھیجا، وہ سب لوگ بنی اسرائیل کے سردار تھے اور ان کے نام یہ ہیں — اور موسیٰؑ نے انہیں بھیجا کہ زمین کنعان کی جاسوسی کریں — اور اس زمین کو دیکھو کہ کیسی ہے وہ لوگ جو وہاں کے بسنے والے ہیں کیسے ہیں زور آور ہیں یا کمزور تھوڑے ہیں یا بہت اور وہ زمین جس پر وہ رہتے ہیں کیسی ہے اچھی ہے کہ بری اور وہ شہر جن میں وہ بستے ہیں کیسے ہیں خیموں میں ہیں یا قلعوں میں اور زمین کیسی ہے جید یا بنجر اس میں درخت ہیں یا نہیں (گنتی ۱۳: ۲۱-۲۵)

" وہ لوگ چڑھے اور زمین کی جاسوسی دشت صین سے رحوب تک جو حمات کے راستہ میں ہے کی، وہ چالیس دن کے بعد اس زمین کی جاسوسی کر کے پھرے " (گنتی ۱۳-۲۱-۲۵)

انھوں نے آکر جو کچھ کہا وہ حاشیہ نمبر ۹۶ میں نقل ہو چکا۔

۹۹ ان لوگوں نے ایک بڑی گہری اور عارفانہ حقیقت بیان کر دی کہ اصل امتحان تو حضرت حق کے ہاں بس عزم و ہمت ہی کا ہوتا ہے باقی نتائج میں برکت تو از خود پیدا ہو جاتی ہے توریت میں اس مقام کی منظر کشی یوں کی ہے :-

" تب کالب نے موسیٰؑ کے حضور لوگوں کو چپ کروایا اور کہا کہ البتہ ہم لوگ چڑھیں گے اور ملک یا لیں گے کیونکہ ہمیں بلاشبہ اس کے لینے کا زور ہے " (گنتی ۱۳-۳۰) " اور نون کے بیٹے یشوع یفنہ کے بیٹے کالب نے جو اس زمین کی جاسوسی کرنے والوں میں سے تھے اپنے کپڑے پھاڑے اور انھوں نے بنی اسرائیل کی ساری جماعت کو کہا، وہ زمین جس پر ہم گزر اس کی جاسوسی کے لئے بڑا نہایت خوب زمین ہے اگر خدا ہم سے راضی ہے تو ہم کو اس زمین میں لے جائے گا، اور یہ زمین جس پر دودھ اور شہد بہہ رہا ہے ہم کو عنایت کرے گا، مگر تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ تم اس زمین کے لوگوں سے ڈرو وہ تو ہماری خوراک ہیں ان کا سایہ ان سے جا چکا ہے پر خداوند ہمارے ساتھ ہے ان کا خوف نہ کرو، تب ساری جماعت نے چاہا کہ ان پر پتھراؤ کرے " (گنتی ۱۴: ۶-۹)

(توریت کی اس عبارت میں یوشع کے بجائے یشوع اور یوحنا کے بجائے یفنہ کے نام عبرانی تلفظ و املاء کے مطابق درج ہیں)

۱۰۰ یہ کہنے والی بنی اسرائیل کی عام جماعت تھی جو ان فہمائشوں سے غیر متاثر رہی تھی توریت میں اس موقع کی

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ

(موسیٰؑ نے) عرض کی کہ اے میرے پروردگار میں تو سوا اپنے اور اپنے بھائی کے اور کسی پر اختیار رکھتا نہیں سو تو ہی جدا کر دے اور

الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ

(اس) بے حکم قوم کے درمیان فیصلہ کر دے ۱۰۱ ارشاد ہوا کہ اچھا تو وہ ملک ان پر چالیس ۴۰ سال کے لئے حرام

یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ

کر دیا گیا یہ لوگ زمین پر بھٹکتے پھریں گے ۱۰۲

منظر کشی یوں کی گئی ہے :۔

"تب ساری جماعت چلا کر روئی اور لوگ اس رات بھر روتے رہے، پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انھیں کہا کہ اے کاش ہم مصر میں مر جاتے اور کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہو جاتے! خداوند کس لئے ہم کو اس زمین میں لا کر تلوار سے گرا دیتا ہے اور ہماری جورواں اور بچے پکڑے جائیں۔" (گنتی ۱۴: ۱-۳)

"تب ساری جماعت نے چاہا کہ اُن پر (یوشع اور کالب پر) پتھراؤ کرے۔" (گنتی ۱۴: ۱۰)

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ ۔ اسرائیلیوں کی اس تقریر کا گستاخانہ طرز تو ظاہر ہی ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشرک قوموں سے متاثر ہو کر یہ موحد قوم بھی اپنے عقیدے میں شرک اس حد تک داخل کر چکی ہو۔ مشرک قوموں کا یہ ایک عام دستور تھا کہ میدان جنگ میں جاتے تو اپنی مورتیوں، ٹھاکروں کو اپنے ساتھ لے جاتے اور عقیدہ رکھتے کہ ان کے دیوتا بھی ان کے ساتھ ساتھ ہیں۔

اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ یہ واضح رہے کہ اسرائیلیوں کی اس وقت تک کوئی الگ باقاعدہ فوج نہ تھی بلکہ ساری قوم کا ہر بالغ وتندرست مرد مسلح اور فوجی سپاہی تھا۔ اُردو روزمرہ میں اس فقرہ کو یوں ہی ادا کیا جائے گا۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ۔ یہ فقرہ ایک خداپرست قوم کی زبان سے کس درجہ گستاخانہ تھا!

۱۰۱ یعنی فیصلہ ان دو فریقوں کے درمیان، جن میں ایک طرف ہم دو بھائی ہیں بے بس وبے اختیار اور دوسری طرف یہ جم غفیر ہے، ہر طرح گستاخ ونافرمان۔

اَخِیْ بھائی سے مراد حضرت ہارونؑ تھے جو خود بھی پیغمبر برحق تھے۔ یہ دعا ظاہر ہے کہ ان پیمبران برحق نے اپنی ناکارہ قوم کی سرکشی اور بغاوت اور اپنی بے بسی پوری طرح محسوس کرنے کے بعد ہی کی۔ توریت کے صفحات اسرائیلیوں کی گستاخانہ روش کے تذکرہ سے لبریز ہیں۔ آیت میں بڑی تسکین کا سامان اکابر اُمت کے لئے ہے۔ قوم جب سرکشی اور نافرمانی کے رنگ پر چل جائے تو پیمبران برحق تک کی کوششیں ناکام رہتی ہیں، پھر کسی ولی یا بزرگ کی سعی اصلاح اگر ناکام رہے تو وہ دل شکستہ کیوں ہو۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ دعائے موسوی میں لفظ اَخِیْ کے بڑھانے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ شیخ اپنے مخلص تابع میں بھی وہی حاکمانہ تصرف رکھتا ہے جو خود اپنے نفس میں۔

۱۰۲ (اور اسی جزیرہ نمائے سینا میں ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔)

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ

سو آپ (اس) بے حکم قوم پر (ذرا) غم نہ کیجیے ۱۰۳ اور آپ انھیں آدم کے دونوں بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ سنائیے

مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ یعنی ان کے لئے تکوینی طور پر اب یہ ممکن ہی نہ ہوگا کہ چالیس سال سے قبل اس ارضِ مقدس میں داخل ہوسکیں اور جو نعمت انھیں تھوڑی جدوجہد کے بعد فی الفور مل جارہی تھی اب اس کے لئے انھیں چالیس سال کا انتظار کرنا ہوگا اور ان کی موجودہ نسل کا بڑا حصہ اسی انتظار میں ختم ہو جائے گا۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ میں ان سے جو وعدہ ہو چکا تھا، وہ بالکل مطلق اور غیر مشروط صورت میں نہ تھا، وہ مشروط تھا، ان کی جدّوجہد کے ساتھ۔

والمراد بقوله كتب الله لكم اى بشرط ان تجاهدوا اهلها فلما ابوا الجهاد قيل فانها محرمة عليهم (مدارک)

يسع ان يكون الله قد جعلها على شريطة القيام بطاعته واتباع امره فلما عصوا حرمها ايّاهم (جصاص)

توریت میں اس مقام پر ہے:۔

”مجھے اپنی حیات کی قسم کہ ساری زمین خداوند کے جلال سے معمور ہوگی کہ وہ سب لوگ جنھوں نے میری شوکت اور میرے معجزے جو میں نے مصر میں اور اس بیابان میں ظاہر کئے دیکھے اب تک مجھے اس مرتبہ آزما چکے اور میری آواز پر کان نہ دھرے وہ اس زمین کو جس کی بابت میں نے ان کے باپ دادوں سے قسم کی تھی نہ دیکھیں گے بلکہ کوئی ان میں سے جنھوں نے مجھے غصہ دلایا اُسے نہ دیکھے گا۔“ (گنتی ۱۴: ۲۱-۲۳) ”مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے میں تم سے ویسا ہی کروں گا، تمہاری، نعشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کئے گئے ان کے کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کے اوپر والے تک جنھوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان ہی میں گریں گی اور تمہارے لڑکے اس دشت میں چالیس سال تک بھٹکتے پھریں گے اور تمہاری بدچلنی کے اٹھانے والے ہوں گے۔“ (گنتی ۱۴: ۳۳) ”ان دنوں کے شمار کے موافق جن میں تم اس زمین کی جاسوسی کرتے تھے جو چالیس دن ہیں ہر دن پیچھے ایک سال ہوگا، سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھاتے رہو گے تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔ میں نے جو خداوند ہوں کہا ہے کہ میں اس سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہیں ایسا ہی کروں گا، اس دشت میں وہ برباد ہو جائیں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے۔“ (گنتی ۱۴: ۳۴، ۳۵)

عصر حاضر کے ایک فرنگی ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن کے تخمینہ کے مطابق یہ زمانہ ۱۴۴۷ ق م اور ۱۴۰۷ ق م کے درمیان کا ہے۔

اَرْبَعِیْنَ۔ فعل حرّم کا ظرف زمانی ہے۔

اربعين ظرف التحريم (مدارک)

۱۰۳ پیمبر آخر پیمبر ہوتے ہیں، رحمت و شفقت کے پتلے، عفو و کرم کے مجسمے، کہاں خود ہی تو دعا کی تھی کہ نافرمان قوم کو سزا ملے اور کہاں اب جو سزا، وہ بھی صرف دنیوی، ملنے لگی تو لگا خود آپ ہی کا دل پسیجنے، اور ان لوگوں پر رحم کرنے عین اسی وقت حکم ہوا کہ حکمت کاملہ میں ایسے نافرمانوں کے لئے سزا یہی مناسب ہے اور آپ ان پر غم نہ کیجیے۔ خطاب موسیٰ علیہ السلام سے ہے جیسا کہ جمہور مفسرین کا قول ہے اور سیاق خود اسی کا مقتضی ہے۔

فالخطاب لموسى عليه السلام كما هو الظاهر واليه ذهب اجلّة المفسرين (روح)

إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۖ

(یہ اس وقت ہوا) جب دونوں نے ایک نیاز پیش کی ۵۰۱ ان میں سے ایک کی تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی ۵۰۲

۴۰۱ (اے ہمارے پیغمبر!)
عَلَیْھِمْ۔ میں ضمیر کس طرف ہے؟ اہل کتاب، خصوصاً معاندین اہل کتاب کی طرف ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔
قائل علی اھل الکتاب (کبیر) ای اقصص علی ھؤلاء البغاۃ الحسدۃ (ابن کثیر) واتل علی ھؤلاء
الیھود الذین ھموا ان یبسطوا ایدیھم الیکم۔ (ابن جریر)
لیکن عام نوع انسانی بھی مراد ہوسکتی ہے۔
واتل علی الناس (کبیر)
قصہ کا مقصود دو امور کی تعلیم دینا ہے (۱) ایک یہ کہ نسب کی بزرگی مطلق صورت میں کام نہیں آتی مقبول صرف وہی
ہوتا ہے جو حکم کا مطیع ہوتا ہے۔
(۲) دوسرے یہ کہ انسان حسد سے متاثر ہو کر کیسی کیسی شیطانی حرکتیں کر گزرتا ہے۔
ابْنَیْ اٰدَمَ۔ مراد قابیل و ہابیل ہیں، یا بہ اصطلاح توریت قائن و ہابل، قابیل بڑے تھے اور ہابیل چھوٹے،
حسب تصریح توریت قابیل کاشت کار تھے، اور ہابیل بھیڑ بکری کے چرواہے یا گلہ بان۔
بِالْحَقِّ۔ تقدیر کلام یوں ہے۔
متلبسا بالحق۔ تلاوۃ متلبسۃ بالحق والصحۃ (کشاف)
عجب نہیں یہ مقصود یہ ظاہر کرنا ہو کہ قرآن کی یہ بیان کی ہوئی روداد بالکل سچ ہی سچ ہے توریت وغیرہ کی روایتوں کی طرح
یہ قصہ بھی حق و باطل کی ملاوٹ نہیں رکھتا محقق رازیؒ نے ایک پہلو اور بھی رکھا ہے یعنی یہ قرآنی حکایت دوسری قرآنی حکایتوں
کی طرح ہدایت کا سبق لینے کے لئے ہے جاہلیت قدیم و جاہلیت جدید کی طرح قصہ محض قصہ کی غرض سے آرٹ
محض آرٹ کی غرض سے، قرآن مجید کا مقصود نہیں ہوسکتا۔
ای لیخبر بما ھو المعلوم علی اللعب والباطل مثل کثیر من الاقاصیص التی لا فائدۃ فیھا وانما ھی لھو الحدیث
اور یہ بات اسی ایک حکایت کے ساتھ خاص نہیں، قرآن مجید کی ساری حکایتوں اور قصوں سے مقصود یہی عبرت و موعظت و ہدایت ہے (کبیر)
وھذا یدل علی ان المقصود بالذکر من الاقاصیص والقصص فی القراٰن العبرۃ لا مجرد الحکایۃ (کبیر)

۵۰۱ (اللہ کے حضور میں)
قُرْبَانًا۔ قربانی یہاں اصطلاحی معنی میں یعنی ذبیحہ کے مرادف نہیں بلکہ لفظی معنی اور وسیع مفہوم میں نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے۔
القربان ما یتقرب بہ الی اللہ (راغب) القربان۔ اسم لما یتقرب بہ الی اللہ تعالٰی من
ذبیحۃ او صدقۃ (کبیر) القربان ما یقصد بہ القرب من رحمۃ اللہ تعالٰی من اعمال البر (بحر)
قُرْبَان۔ اسم جنس ہے، واحد و جمع دونوں موقعوں پر اسی صورت سے آتا ہے۔
اسم جنس فھو یصلح للواحد والعدد (کبیر)

قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

(اس پر وہ دوسرا) بولا کہ میں تجھ کو قتل کر کے رہوں گا ٦٠ (پہلے نے) کہا اللہ تو متقیوں کا (عمل) قبول کرتا ہے ٦١

٦٠ (اس لئے کہ وہ مخلصانہ نہ تھی)
روایتوں میں آتا ہے کہ چھوٹے بھائی ہابیل کی نذر مخلصانہ تھی اس نے اپنے گلے کی بہترین بھیڑ پیش کردی تھی وہ قبول ہوگئی بڑے بھائی قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار کا ناقص حصہ پیش کیا، وہ قبول نہ ہوا، قبولِ نیاز کی علامت اُس زمانہ میں یہ تھی کہ ایک آگ آسمان سے آکر نذر قبول کرے جاتی تھی توریت میں اس کے اشارے بار بار آئے ہیں۔

٦٠ قابیل ہابیل سے خفا پہلے ہی کسی معاملہ میں تھا، اور یوں بھی سن میں بڑا تھا، اپنے کو بزرگی اور مقبولیت کا زیادہ حقدار سمجھتا تھا، اب شدّتِ حسد سے بہت ہی برافروختہ ہو کر بے گناہ بھائی کی جان لینے پر آمادہ ہوگیا۔

توریت میں یہ پورا قصہ یوں درج ہے:۔

"چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت میں سے خداوند کے واسطے ہدیہ لایا اور ہابل بھی اپنی پلوٹھی اور موٹی بھیڑ بکریوں میں سے لایا، اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو قبول کیا، پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو قبول نہ کیا، اس لئے قائن نہایت غصہ اور ترش رُو ہوا، اور خداوند نے قائن سے کہا تجھے کیوں غصہ آیا اور اپنا منہ کیوں بگاڑا، اگر تو اچھا کرتا تو کیا مقبول نہ ہوتا؟ اور اگر تو اچھا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر موجود ہے' اور تیرا ارادہ رکھتا ہے پر تو اس پر غالب آ، اور قائن نے اپنے بھائی ہابل سے باتیں کیں اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن نے اپنے بھائی ہابل پر اٹھا، اور اُسے مار ڈالا" (پیدائش۔ ۴: ۳، ۸)

٦١ (اور تم چونکہ مقامِ تقوے اور اخلاص پر قائم نہ رہے اس لئے قبولِ نذر کے معاملہ میں ناکام رہے اس میں میری کیا خطا ہے؟)

لان حصول التقوى شرط فى قبول الاعمال (کبیر)

محقق رازیؒ نے لکھا ہے کہ تقوے میں ان تین اُمور کی رعایت لازمی ہے ایک یہ کہ قبولِ طاعت میں غایت خشیت کا انحصار ہو اور اپنی طرف سے کوئی بات تکمیل طاعت میں اٹھا نہ رکھی جائے دوسرے یہ کہ امکانی کوشش اس امر کی رہے کہ طاعت سے رضاء الٰہی کے سوا اور کچھ مقصود نہ ہو تیسرے یہ کہ غیر اللہ کی شرکت و آمیزش ذرا بھی اس طاعت میں نہ ہو

حقيقة التقوى امور احدها ان يكون على خوف و وجل من تقصير نفسه فى تلك الطاعة فيتقى باقصى ما يقدر عليه عن جهات التقصير. وثانيها ان يكون فى غاية الاتقاء من ان ياتى بتلك الطاعة لعرض سوى طلب مرضاة الله تعالى. وثالثها ان يتقى ان يكون لغير الله تعالى فيه شركة (کبیر)

محققین اہلِ سنّت کا اس پر اتفاق ہے کہ تقویٰ سے اس سیاق میں مراد تقویٰ شرک ہے، تو جو شرک سے محفوظ اور توحید پر قائم رہا، تو جن اعمال میں اس نے صدقِ نیت سے کام لیا، وہ مقبول ٹھہریں گے اور جو شرک و معصیت دونوں سے بچا، وہ قبولِ رحمت دونوں کا حقدار ٹھہرا

قال ابن عطية المراد بالتقوى هنا اتقاء الشرك باجماع اهل السنة فمن اتقاه وهو موحد فاعماله التى تصدق فيها نيته مقبولة (قرطبی بحر) واما المتقى الشرك والمعاصى فله الدرجة من القبول والختم بالرحمة (قرطبی)

لَئِنْ بَسَطْتَ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ

واگر تو اپنا ہاتھ مجھ پر اُٹھائیگا کہ مجھے قتل کر ڈالے ؀ تو میں (جب بھی) اپنا ہاتھ تجھ پر اٹھانے کا نہیں کہ تجھے قتل کر ڈالوں ؀

اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ

(کیونکہ) میں تو اللہ پروردگارِ عالم سے ڈرتا ہوں ؀ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے (قتل کا) گناہ اور

وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾

اپنا (پچھلا) گناہ (دونوں) اپنے سر رکھ لے پھر تو دوزخیوں میں شامل ہو جائے ؀ یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی ؀

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اپنے کسی کمال کا اظہار موقع شکر پر جائز ہے بطور فخر نہیں۔

؀ (باوجود اس کے کہ میں بے قصور ہوں)

؀ (حالانکہ تیرے ارادۂ قتل پر مطلع ہو کر اور آمادگیٔ قتل دیکھ کر میرے پاس جوازِ قتل کا عذر بھی موجود ہے) فقرہ کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ تم جس طرح آغازِ قتل میں دلیر ہو میں ابتداءً بالقتل کی جرأت نہیں رکھتا یہ مطلب نہیں کہ مدافعت میں تلوار اٹھانا جائز نہ ہو۔ شریعت اسلامی میں جب قرائن قوی سے یہ معلوم ہو جائے کہ قاتل حملہ کر ہی چاہتا ہے تو جواب و مدافعت میں تلوار اٹھانا بالکل جائز ہے بلکہ اگر مصلحتِ اسلامی اس کی مقتضی ہو تو ایسے موقع پر واجب بھی ہو جاتا ہے۔

قال ابن عباسؓ لئن بدأتنی بقتل لم ابدأك به ولم یرد انی لا ادفعك عن نفسی اذا قصدت قتلی (جصاص)

یجب علی من قصد انسان بالقتل قتله اذا امکنه (جصاص) انه فی شرعنا یجوز دفعه اجماعا وفی وجوب ذلك علیه خلاف والاصح وجوب ذلك (قرطبی) واختلف فی هذه الآیة والصحیح من المذهب انه یلزم الرجل دفع الفساد عن نفسه وغیره وان ادی للقتل۔ (روح)

محققین اہلِ سنت نے اس فتویٰ پر علاوہ احادیثِ نبوی کے متعدد آیاتِ قرآنی سے بھی استدلال کیا ہے مثلاً (۱) وقاتلوهم حتی لا تکون فتنة، کہ قصدِ قتل یقیناً فتنہ میں شامل ہے (۲) ولكم فی القصاص حیوة کہ اسی سزائے قتل کے خوف سے قاتل قتل سے باز رہے گا (۳) فان بغت احدٰهما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی الخ کہ فئۂ باغیہ قصدِ قتال ہی کرتی ہے اور انہی آیاتِ قرآنی و احادیثِ نبوی سے استدلال کر کے حضرت علیؓ نے خوارج سے قتال ان کے قصدِ قتال کی بنا پر جائز رکھا تھا اور سب صحابیوں نے آپؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔

وقد قتل علی بن ابی طالبؓ الخوارج حین قصدوا قتل الناس واصحاب النبی صلعم معه موافقون له علیه وقد روی عن النبی صلعم آثار فی وجوب قتلهم (جصاص)

مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ کے فقرۂ نفی میں ایک تو بجائے فعل کے اسم فاعل اور پھر حرف ب نفیِ بسط کی تاکید و استمرار کے لئے ہے

لتاکید النفی بما فی حیزها من الباء للمبالغة فی اظهار براءته عن بسط الید ببیان استمراره علی نفی البسط (ابو سعود) واکد النفی بالباء (بیضاوی) ذکر الشرط بلفظ الفعل والجزاء بلفظ اسم الفاعل مقرونا بالباء المؤكدة لتاکید النفی (ابیا نوری)

۱۱۱ (اور مدافعت تک میں ہاتھ نہیں اٹھاتا، تیری سی جسارت کہاں سے لا سکتا ہوں کہ خدا سے ذرا نہیں ڈرتا، اور بالکل بلا وجہ میرے قتل پر آمادہ ہو گیا ہے)

اصل مسئلہ شرعی تو وہی ہے جو اوپر کے حاشیہ میں مذکور ہو چکا، البتہ الفاظِ قرآنی کے ظاہر سے سند پکڑ کے بعض بزرگوں نے ایسے موقع پر بھی عفو و درگزر ہی کو اختیار کیا ہے اور بعض اکابر سے منقول ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری وقت کا طرزِ عمل اسی آیت کے مطابق تھا یعنی اپنی جان دینا گوارا کر لی اور جان کے دشمنوں سے مقابلہ و قتال قبول نہ فرمایا۔

قال ایوب السختیانی ان اول من اخذ بهذه الآیة من هذه الامة عثمان بن عفان رواه ابن ابی حاتم (ابن کثیر) وهذا فی الشرع جائز لمن ارید قتله ان ینقاد ویستسلم طلبا للاجر کما فعل عثمان (معالم) قال بعضهم المعصوم القتل ان اراد ان یستسلم جاز له ذلک وهکذا فعل عثمان (کبیر) انما المسلم کالمسلم عثمان بن عفان (بحر)

اِنِّیْٓ اَخَافُ۔ جملہ تعلیلیہ ہے اور اسی لئے ترجمہ میں "کیونکہ" بڑھا دیا گیا۔

اشارة الی کون الجملة تعلیلیة لما قبله وهذا التفسیر احسن من کل ما یوجد فی التفاسیر (تھانوی)

علل ذلک بقوله انی اخاف الله (ابو سعود) تعلیل للامتناع عن بسط یده لیقتله (روح)

۱۱۲ (جو کھلا ہوا نتیجہ تیری بدکرداریوں کا ہوتا ہے)

اِثْمِیْ کے معنی "میرے گناہ" کے نہیں بلکہ اہلِ تحقیق کے نزدیک "میرے قتل کے گناہ" کے ہیں، اور تقدیرِ کلام یوں ہے

باثم قتلی (ای) (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود وناس من اصحاب الرسول) ای باثم قتلی (ابن کثیر عن ابن عباس ومجاهد والضحاک وقتادة والسدی) ای باثم قتلی وهذا قول اکثر المفسرین (معالم)

اِثْمِکَ۔ سے مراد وہ گناہ ہیں جو قابیل اس تازہ اقدامِ گناہ سے قبل کر چکا تھا، یا وہ پہلا گناہ جس کے پاداش میں اس کی نذر قبولیت سے محروم رہ گئی تھی۔

واثمک فی معصیة الله وغیر ذلک من معاصیک (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود وناس من اصحاب الرسول) اثمک الذی علیک قبل ذلک (ابن کثیر عن ابن عباس ومجاهد والضحاک وقتادة والسدی) اثمک الذی لاجله لم یتقبل قربانک (مدارک) قال اکثر العلماء ان المعنی ترجع باثم قتلی واثمک الذی عملته قبل قتلی قال الثعلبی هذا قول عامة اکثر المفسرین (قرطبی)

فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۔ اس جزو سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ قابیل کافر تھا، اس لئے کہ اصحاب النار کا اطلاق قرآنی اصطلاح میں کافروں ہی پر ہوتا ہے۔

وقد استدل بقول هابیل لاخیه قابیل انه کان کافرا لان لفظ اصحاب النار انما ورد فی الکفار حیث وقع فی القرآن (قرطبی)

لیکن اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ استدلال صحیح نہیں، اصحاب النار وہ سارے ہی لوگ ہیں جو کچھ دیر کے لئے بھی دوزخ میں چلے جائیں اور یہ سزا مومن عاصی کے لئے بھی ممکن ہے۔

وهذا مردود بما ذکرناه عن اهل العلم فی تاویل الآیة ومعنی من اصحاب النار مدة کونک فیها (قرطبی) ولا یقوی هذا الاستدلال لانه کنایة عن المقام فی النار مدة ما بالصحبة (بحر)

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

غرض اس کے نفس نے اُسے اپنے بھائی کے مار ڈالنے پر آمادہ کر دیا تو اس نے اُسے مار ہی ڈالا،[۱۱۴] سو وہ بڑا نقصان اٹھانے والوں میں ہو گیا[۱۱۵]

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ سارا وبال تم ہی پر پڑے تجھ پر پڑے۔ یہ مراد نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی گناہ کرو، کسی کے لئے یہ چاہنا کہ وہ گناہ کرے جائز نہیں۔ البتہ اس چاہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ گناہ کا وبال گناہ گار ہی پر پڑے۔

والمراد انی ارید ان تبوا بعقاب اثمی واثمک لانہ لایجوز ان یکون مرادہ حقیقۃ الاثم اذ غیر جائز لاحد ارادۃ معصیۃ اللہ من نفسہ ولا من غیرہ (جصاص) معناہ انی ارید ان تبوا بعما قتلی فیکون ارادۃ صحیحۃ لانہا موافقۃ لحکم اللہ عز وجل (معالم)

تَبُوْٓاَ۔ باء کے معنی اُلٹ کر پڑنے کے ہیں۔

ومعنی تبوأ ترجع والبواء الرجوع بالقود (جصاص) وقیل تحمل (معالم)

۱۱۳ اپنے عام حکیمانہ اُسلوب کے مطابق قرآن مجید نے یہاں بھی ایک مخصوص واقعہ کے بیان کے ضمن بعد ہی قانونِ عام بھی سنا دیا۔

۱۱۴ ہابیل کی اس مؤثر تقریر سے قابیل ذرا بھی متاثر نہ ہوا، بلکہ مقابلہ و مزاحمت کی طرف سے بے فکر ہو کر عجب نہیں جو قتل پر اور زیادہ آمادہ ہو گیا ہو۔

فَقَتَلَهٗ۔ توریت میں ہے :-

"اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن اپنے بھائی ہابل پر اٹھا اور اُسے مار ڈالا" (پیدائش ۴: ۸)

یہ تصریح کہیں نظر سے نہیں گزری کہ قابیل نے کس طریقہ سے جان لی، گلا گھونٹ کر، یا پتھر مار کر، یا کسی دھار دار چیز سے گلا کاٹ کر۔ عربی کا لفظ قتل، جان لینے کی ہر صورت کے لئے عام ہے۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ۔ یعنی اُسے نفس نے اس کام پر رفتہ رفتہ دلیر و مستعد بنا دیا، اور اُسے اس کی نظر میں خوشگوار کر دکھایا۔

ای حسنت وسولت نفسہ وشجعتہ علی قتل اخیہ (ابن کثیر)

یہ حال ہر بدی و معصیت کا ہے۔ ابتداءً ہر فطرت سلیم اُس سے رکتی ہے، ہچکچاتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ نفس اس کی جانب مائل اور اس پر گرویدہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی طرف سے جھجک مٹتی جاتی ہے، یہاں تک کہ انسان اُسے بے دھڑک کر گزرتا ہے۔

۱۱۵ خسران اور نقصان اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ دنیا میں سب سے پہلا قتل کیا، قتلِ انسانی اور برادر کشی کا مرتکب ہوا، اور آخرت میں عذاب شدید کا مستحق ٹھہرا۔

فَاَصْبَحَ۔ سے یہ مراد نہیں کہ قتل رات ہی کے وقت ہوا تھا، اَصبح کا اطلاق وقت مبہم کے لئے عام ہے، وقوعِ قتل و حصولِ خسران دن یا رات کے جس حصہ میں بھی ہوا ہو اس لفظ کے اعتبار سے بے تکلف جائز ہے۔ اَصْبَحَ "ہو گیا" کے معنی میں اور صار کے مرادف عرب کا عام محاورہ ہے۔ بعضوں کو اس محاورہ کے سمجھنے میں عجب غلطی ہوئی ہے۔

ولا دلالۃ فی قولہ فاصبح علی ان القتل کان لیلا وانما المراد بہ وقت مبہم جائز ان یکون لیلا

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ

اس پر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کو کھودتا تھا تاکہ اسے دکھا دے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح

سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا

چھپائے ۲۶ے (یہ دیکھ کر) وہ بولا ہائے میری کمبختی کہ میں اس سے بھی گیا گزرا ہوا کہ اس کوے ہی کے

الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (۳۱)

برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا ۲۷ے غرض وہ (بہت ہی) شرمندہ ہوا ۲۸ے

وجائزات یکون نہارًا وھذا اعادۃ العرب فی اطلاق مثلہ والمراد بہ الوقت المبہم (جصاص) اصبح بمعنی صار (بن الانری ام بصلوا اضحی وظل وامسی وبات بمعنی صار (بحر)

۲۶ے یہ روئے زمین پر پہلا قتل تھا، اور قابیل غریب کو یہ بھی تجربہ نہ تھی کہ اپنے مردہ بھائی کی لاش کو آخر کرے کیا! آخر ایک معمولی اور حقیر سا پرندہ انتظاماتِ تکوینی کے ماتحت اس قاتل کو دفن کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا گیا۔

سَوْءَةَ کے لفظی معنی جسم کے پوشیدہ رکھے جانے والے حصہ کے ہیں۔ یہاں مراد نعش سے ہے۔

ای جیفۃ اخیہ (کبیر) قیل جمیع جیفتہ فان المیت کلہ عورۃ (بحر)

۲۷ے قاتل اب بہ کمال حسرت وندامت کہہ رہا ہے کہ مجھے تو اس مردار خوار جانور کے برابر بھی فہم وشعور نہیں! توریت میں تو ہابیل کی تدفین کا کچھ ذکر نہیں، البتہ شارحینِ توریت نے ایک پرندہ کا ذکر کیا ہے کہ اس کے عمل تدفین کو دیکھ کر آدمؑ وحواؑ نے بھی ہابیل کا لاشہ زمین میں دفن کیا، لیکن پرندہ کا نام بجائے کوے کے جنگلی فاختہ آیا ہے، ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد اول ص ۴۹

اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ بعض فقہاء نے اس بیان سے جواز قیاسِ تمثیلی کا استنباط کیا ہے۔

فیہ دلیل علی باب التشبیہ (ابن العربی)

يٰوَيْلَتٰٓى ۔ ویل مدۂ تقبیح ہے حسرت ودرد کے موقع پر آتا ہے جیسے اُردو میں کوئی کہے اے میری شامت! یا ہائے میری خرابی!

قال الاصمعی ویل تقبیح ... وقد توقع موضع التحسر والتفجع منہ (بحان)

۲۸ے (اپنی اس تباہ حالی پر)

یہ ندامت قتلِ نفس پر نہ تھی جو توبہ کی قائم مقام کسی درجہ میں بھی ہو سکتی، بلکہ قتل کے بعد اسے جو دشواریاں نظر آئیں صرف ان پر تھی، جسے ندامتِ طبعی کہا جا سکتا ہے، جو کسی حد تک بھی توبہ کا کام نہیں دے سکتی، گویا قاتل صرف پریشان ہوا، پشیمان اب بھی نہ ہوا۔

ولم یکن ذلک ندم توبۃ (قرطبی) قیل انہ ندم علی القتل علی غیر جہۃ القربۃ الی اللہ تعالیٰ منہ وخوف عقابہ (جصاص) فکان ندمہ لاجل ھذہ الاسباب لا لکونہ معصیۃ (کبیر)

نصف القرآن

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ

اسی باعث ہم نے بنی اسرائیل پر یہ مقرر کردیا کہ جو کوئی کسی کو کسی جان کے (عوض کے) یا زمین پر فساد (کے

نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ

عوض) کے بغیر مار ڈالے ۱۱۹؎ تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا ۱۲۰؎

جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ

اور جس نے ایک کو بچالیا تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچالیا ۱۲۱؎

حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ اگر یہ ندامت عواقب قتل پر نہیں بلکہ قتل ہی پر مانی جائے جب بھی ہر ندامت توبہ نہیں جب تک معذرت اور انکسار اور فکر تدارک بھی اس کے ساتھ شامل نہ ہو یہ ندامت اگر کہیں معصیت کو معصیت سمجھ کر اور خوفِ خدا سے ہوتی تو توبہ قبول ہی نہ ہوگئی ہوتی۔

ولو ندم على الوجه المامور به لقبل الله توبته وغفر ذنوبه (جصاص) الندم له شروط فكل من جاء بشروطه قبل منه ومن اهل بها او بشئ منها لم يقبل (ابن العربی) الندم على المعاصى انما ينفع منه اذا عزم على ان لا يفعل فى المستقبل۔ (ابن العربی)

۱۱۹؎ (اور اس طرح قتلِ ناحق کا مرتکب ہو)

آیت سے ظاہر ہوگیا کہ جو بھی قتلِ ارادی بجز ان دو صورتوں کے کیا جائے وہ قتلِ ناحق ہوگا۔

نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ۔ یعنی وہ قتل بہ طور قصاص یا کسی قتل کے عوض میں ہو۔

فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ۔ یعنی وہ قتل کسی ایسے جرم کے پاداش میں ہو جس سے ملک میں بدامنی اور فساد کی بنیاد پڑ رہی ہو اور نظامِ عالم پر اس سے ضرب لگ رہی ہو، مثلاً رہزنی، بغاوت، حرام کاری وغیرہ۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ۔ یعنی ان مفاسد کے باعث جو قتلِ ناحق سے پیدا ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ سے اشارہ قصۂ قتل ہابیل کی جانب نہیں، بلکہ ان مفاسد کی جانب ہے جو قتلِ ناحق سے لازم آتے ہیں۔

هو اشارة الى ما مر ذكره فى هذه القصة من انواع المفاسد الحاصلة بسبب القتل الحرام (کبیر)

آیت کے اس ٹکڑے سے فقہاء نے قیاسِ شرعی کا بھی اثبات واستناد کیا ہے۔

فيه ابانة عن المعنى الذى من اجله كتب على بنى اسرائيل ما ذكر فى الآية (جصاص) وفيه دليل على اثبات القياس ووجوب اعتبار المعنى التى علق بها الاحكام وجعلت عللا واعلاما لها (جصاص)

۱۲۰؎ آیت پر یہ جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرد کا قاتل اور ساری نوع کا قاتل برابر کیسے ہوسکتے ہیں تو یہ لفظ فکانما پر غور کرنے پر جاتا رہتا ہے یہ ارشاد ہرگز نہیں ہو رہا ہے کہ ایک کا قاتل اور سب کا قاتل قانون کی نظر میں یکساں ہوگا قانون، عدالت اور ضابطہ کی نظر میں دونوں جرموں کی مساوات کا یہاں مطلق ذکر نہیں، مقصود قاتل کی فطرت پر روشنی ڈالنا ہے جو ظالم وفاجر ایک شخص کی بھی جان بلاوجہ اور بےقصور لے ڈالنے میں نہیں ہچکچاتا، اس کی جسارت اور خبث نفس سے

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ز

اور یقیناً اُن لوگوں کے پاس ہمارے پیمبر کھلے ہوئے احکام لے کر آئے ۱۲۳ؕ

بعید کیا ہے، جو وہ پائے تو سارے انسانوں کو تہ تیغ کر کے رکھ دے ۔۔۔ اصل شے تو اس شخص کی نظر میں قانونِ شریعت کی بے وقری اور اس کے خلاف ورزی پر اس کی دلیری ہے۔

من حیث انہ ھتک حرمۃ الدماء وسن القتل وجرّأ الناس علیہ (بیضاوی) المقصود من تشبیہ قتل النفس الواحد بقتل النفوس المبالغۃ فی تعظیم امر القتل العمد العدوان وتفخیم شانہ (کبیر) فیں المعنی من استحل واحدا فقد استحل جمیعا لانہ انکر الشرع (قرطبی)

حدیث نبوی میں بھی یہ مضمون ایک جگہ آیا ہے کہ روئے زمین پر جو بھی قتلِ ناحق ہوتا ہے اس کے وبال کا ایک حصہ قابیل کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کہ بانیٔ اوّل اس جور و ستم کا تو وہی ہوا ہے۔

عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلعم لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمھا لانہ اول من سن القتل۔ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب خلق آدم وذریتہ)

موجودہ توریت میں تو جرم قتلِ انسانی سے متعلق صرف اس قدر ہے:۔

"جو کوئی آدمی کا لہو بہاوے آدمی ہی سے اس کا لہو بہایا جائے گا کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے" (پیدائش ۹:۶)

لیکن تالمود میں (حسب روایت راڈول، انگریزی مترجم قرآن) حسب ذیل مضمون بھی موجود ہے:۔

"جو کوئی کسی ایک اسرائیلی کو بھی مار ڈالے گا، اس کے لئے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے ساری نسلِ اسرائیل کو قتل کر دیا"۔

۱۲۱ؕ ایک حدیثِ صحیح میں بھی یہ مضمون ایک عام قاعدہ وضابطہ کی صورت میں آیا ہے:۔

من سن سنۃ حسنۃ فعمل بھا کان لہ اجرھا ومثل اجر من عمل بھا لا ینقص من اجورھم شیئا ومن سن سنۃ سیئۃ فعمل بھا کان علیہ وزرھا ووزر من عمل بھا لا ینقص من اوزارھم شیئا

(جو کوئی کسی نیک رسم کی بنیاد ڈال دے اور اس پر عمل بھی کرے اُسے، جزا اپنی بھی ملتی ہے، اور اس کے بعد اس پر تمام عمل کرنے والوں کا بھی، بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے اجر سے کچھ کم کیا جائے، اور جو کوئی کسی رسمِ بد کی بنیاد ڈال دے اور اس پر عمل بھی کرے اس پر گناہ اپنے کئے کا بھی پڑتا ہے، اور جتنے بعد اس پر دوسرے عمل کرنے والوں کا بھی بغیر اس کے کہ ان کے گناہ کچھ کم ہوں)

اگر نقل کی اتنی تصریحات نہ موجود ہوتیں، جب بھی یہ مسئلہ اپنی جگہ پر عقلی تھا۔

(اَحْیَاھَا) احیا کے معنی یہاں زندہ کرنے کے نہیں، موت سے بچ لینے اور اسبابِ ہلاکت سے دور رکھنے کے ہیں۔

قال مجاھد نجاھا من الھلاک (جصاص) من سلم من قتلھا (معالم) المراد من احیاء النفس تخلیصھا عن المھلکات مثل الحرق والغرق والجوع المفرط والبرد والحر المفرطین (کبیر) الاحیاء ھھنا مجاز (معانی)

یہ بچا لینا مستحق مدح واجر جب ہے جب خونِ ناحق سے بچا یا جائے ورنہ بچا لینے کو اگر اپنے مطلق اور عمومی معنی میں رکھا جائے تو موقع قصاص وغیرہ پر قتل واجب سے کسی کو بچانا بجائے خود ایک معصیت اور اعانت علی الحرام ہے۔

۱۲۲ؕ (اور اُن ہی احکام میں قتلِ ناحق اور خوں ریزی کی ممانعت بھی داخل تھی)۔

ثُمَّ إِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم بَعْدَ ذَٰلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ ﴿٣٢﴾ إِنَّمَا

اس پر بھی ان میں کے بہت سے لوگ ملک میں زیادتی کرنے والے ہی رہے ١٢٣ جو لوگ

جَزَٰٓؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا

اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے میں لگے رہتے ہیں ١٢٤

البیّنات۔ سے مُراد دلائل و معجزات بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہاں زیادہ چسپاں معنی احکام و ہدایات کے ہیں۔
ای بالامر والنھی والعلامات (ابن عباسؓ) "صاف حکم" (شاہ عبد القادر دہلویؒ)
جَآءَتْهُمْ۔ هُمْ کی ضمیر انہی بنی اسرائیل کی جانب ہے۔
١٢٣ (یہاں تک کہ بعض اوقات تو خود اُن ہی پیغمبروں کو مار ڈالا۔)
ثُمَّ۔ کبھی استبعاد کے لئے بھی آتا ہے۔
ثمّ للتراخی فی الرتبة والاستبعاد (روح) جئ ثم ابدا انا بترتبه وتراخیه فی الاعقاب (مغنی)
چنانچہ یہاں اسی معنی میں ہے کہ جو نتیجہ ان پیغمبروں کے آنے کا نکلنا تھا وہ تو کچھ بھی نہ نکلا، البتہ اس کے برعکس نکلا۔
لَمُسْرِفُونَ۔ اسراف میں ہر قسم کی زیادتی اور ہر قسم کے گناہ آ گئے۔ اور مطلب یہ ہوا کہ پیغمبروں کی آمد کے باوجود اسرائیلیوں کی اکثریت احکامِ شریعت کی مسلسل خلاف ورزی کرتی رہی۔
الاسراف فی کل امر التباعد عن حد الاعتدال مع عدم مبالاة به (روح) ای ان اکثرهم مجاوزون الحد تارکو امر الله (قرطبی) ای مجاوزون امر الله ورسله باتباعهم اهواءهم وخلافهم علی انبیاءهم وذلک کان اسرافهم فی الارض
١٢٤ یہ کون لوگ ہیں؟ اور آیت کے ان دو جملوں میں باہمی تعلق کیا ہے؟ اہل تحقیق کے نزدیک (ابن جریر) دونوں فقروں کے درمیان کا "و" واو تفسیری ہے اور اس لئے دوسرا فقرہ يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ پہلے فقرہ الذین یحاربون الله ورسوله کی تشریح و تفسیر اور اس کی مُراد متعین کر رہا ہے۔
ویسعون فی الارض فسادا ھذا ھو معنی محاربة المسلمین (جمل)
مُراد یہاں رہزنوں اور ڈاکوؤں کے گروہ سے ہے عام اس سے کہ وہ کافر ہوں یا مسلم یہی گروہ جب نکلتا ہے تو ہتھیار باندھ کر پوری شان و شوکت کے ساتھ کہ جن پر حملہ کیا جائے وہ بیچارے مقابلہ بھی نہ کر سکیں، عاصیوں اور نافرمانوں کے طبقہ میں یہ گروہ خصوصیت کے ساتھ محاربین کا مصداق ہوتا ہے۔
ذهب اکثر المفسرین وعلیه جملة الفقهاء الی انها نزلت فی قطّاع الطریق (روح) والصحیح ان هذه الآیة عامة فی المشرکین وغیرهم فی من ارتکب هذه الصفات (ابن کثیر) یتناول کل من کان موصوفا بهذه الصفة سواء کان کافرا او مسلما (کبیر) نزلت فی قطّاع الطریق من المسلمین وهذا قول اکثر الفقهاء (کبیر) المراد قطّاع الطریق من اهل الملة (جصاص) ولم یسم بذلک کل عاص لله تعالی اذ لیس بهذه المنزلة فی الامتناع واظهار المغالبة فی اخذ الاموال وقطع الطریق (جصاص)

اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ

ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے

خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ

کاٹے جائیں، یا وہ ملک سے نکال دیے جائیں ۱۲۵

ایک قول بعض غیر مستند متاخرین (عن بعض المتأخرين ممن لا يعتد به) کا یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آیت کے مصداق مرتدین ہیں، لیکن محققین نے تصریح کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ یہ قول سرتاسر لغو و باطل ہے۔

هو قول ساقط مردود مخالف للآية ولإجماع السلف والخلف (جصاص) لا خلاف بين السلف والخلف من فقهاء الامصار ان هذا الحكم غير مخصوص باهل الردة وانه فيمن قطع الطريق وان كان من اهل الملة (جصاص)

يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ محاربہ اپنے لفظی معنی میں اللہ سے تو کسی کا ممکن ہی نہیں، رسول اللہ صلعم سے ممکن تھا، لیکن کبھی کسی مسلم سے واقع نہیں ہوا، اور بعد وفات شریف تو اس کا امکان ہی نہ رہا، یہاں محاربہ سے مراد معصیت اور مخالفت یا اللہ اور اس کے رسول کے قانون کو توڑنا اور اس سے مقابلہ کرنا ہے، اہل لغت نے یہی معنی لئے۔

يعني المعصية اي يعصونه (لسان) اي يعصونه (تاج)

اور اہل تفسیر تو سب اسی طرف گئے ہیں۔

اي الذين يخالفون احكام الله واحكام رسوله (كبير) المحاربة هي المضادة والمخالفة وهي صادقة على الكفر وعلى قطع الطريق واخافة السبيل (ابن كثير)

يَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا۔ مسلمان تو خیر مسلمان ہی ہیں، ان کے ساتھ ذمیوں کے بھی مال اور جان دونوں اللہ اور اس کے رسول کے بخشے ہوئے حفظ و امن میں ہوتے ہیں، اب جو کوئی ان پر بلا عذر حملہ کرتا ہے وہ پوری طرح سعی فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی اللہ اور رسول سے محاربہ بھی ہے۔

سمّي قاطع الطريق محاربا لله لكون المسافر معتمدا على الله تعالى فالذي يزيل امنه محارب لمن اعتمد عليه في تحصيل الامن (فتح القدير) سموا محاربين تشبيها لهم بالمحاربين من الناس (جصاص)

فقہاء حنفیہ نے یہاں یہ قید لگائی ہے کہ جس رہزنی کا یہاں ذکر ہے اور جس کی سزا یہاں درج ہے، یہ شہر اور یا قرب شہر میں معتبر نہیں، شہر اور قرب شہر صرف تعزیر و قصاص کا محل ہے یہاں حد جاری نہ ہوگی۔

ومذهب ابي حنيفة وجماعة ان المحاربين هم قطاع الطريق خارج المصر واما في المصر فيلزمه حد ما اجترح من قتل او سرقة او غصب ونحو ذلك (بحر) وقال قوم [illegible] في الامصار [illegible] المحاربين في اثبات هذا الحد وهو قول ابي حنيفة (معالم) [illegible] المحاربة في [illegible] خارجا عن المصر هذا قول سفيان الثوري واسحق والنعمان (قرطبي)

۱۲۵ چاروں سزائیں یہاں مذکور ہوئیں اور چاروں الگ الگ نوعیت کے لئے ہیں۔ قول صحیح و معتبر یہی ہے بیکہ

امام کو ان چاروں سزاؤں میں سے ہر ایک موقع کے لئے اختیار دے دیا گیا ہے، گرچہ بعض اکابر اس طرف بھی گئے ہیں۔

ذهب ... الى ان هذه العقوبات على ترتيب الجرائم لا على التخيير (معالم) وقال ابن عباس وابو مجلز وقتادة والحسن وجماعة لكل رتبة من الحرابة رتبة من العقاب (بحر) والمراد منه والله اعلم التوزيع على الاحوال (هدایه)

اَوْ۔ حرف اَوْ جو یہاں سزاؤں کے درمیان بار بار آیا ہے، تخییر کے لئے نہیں، تفصیل کے لئے ہے۔

واو فى الآية على هذا للتفصيل (بيضاوى) قال ابن عباس فى رواية عطاء كلمة او هٰهنا ليست للتخيير بل هى لبيان ان الاحكام تختلف باختلاف الجنايات وهذا قول الاكثرين من العلماء (كبير)

يُقَتَّلُوْا۔ یہ سزا اس موقع کے لئے ہے، جب رہزنوں نے کسی کو صرف قتل کیا ہو اور نوبت مال لینے کی نہ آئی ہو۔

تقتيل۔ باب تفعیل سے ہے اور اس کے معنی میں باب قتل یا قصاص پر زیادتی ہے، یہیں سے اشارہ اس نکتہ کی طرف ہو رہا ہے کہ یہ حقِ شریعت ہے، محض ولی کے معاف کر دینے سے معاف نہیں ہوگا۔

ويقتلون حدا حتى لو عفا الاولياء عنهم لا يلتفت الى عفوهم لانه حق الشرع (هدايه)

رہزنی کا جرم، تنہا فرد یا افراد کے خلاف نہیں، معاشرہ کے خلاف بھی ہے، جیسا کہ دنیا کے فاضل ترین مقننوں اور قانون سازوں نے تسلیم کر لیا ہے، اس لئے مستغیث افراد کی دست برداری ایسے مقدمہ کو ختم کرنے کو کافی نہیں۔

يُصَلَّبُوْا۔ یہ سولی کی سزا اس صورت کے لئے ہے جب رہزنی میں قتل و غارت دونوں کا ارتکاب ہوا ہو، حنفیہ کے ہاں سولی کی سزا کے لازمی ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے، امام ابو الحسن قدوری کا قول ہے، اور یہی ظاہر الروایۃ ہے کہ سولی دینے نہ دینے کا امام کو اختیار ہے۔

ثم ذكر فى الكتاب التخيير بين الصلب وتركه وهو ظاهر الرواية (هدايه) فى ظاهر الرواية هو مخير فى الصلب ان شاء فعله وان شاء لم يفعله واكتفى بالقتل (مبسوط)

لیکن امام یوسفؒ کا قول ہے کہ سولی ضرور دی جائے، اس لئے کہ اولاً تو یہ نصِ قرآنی کے مطابق ہے اور دوسرے سزا سے جو مقصود تشہیر اور دوسروں کے لئے عبرت ہے وہ بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

وعن ابى يوسفؒ انه لا يتركه لانه منصوص عليه والمقصود التشهير ليعتبر به غيره (هدايه)

وعن ابى يوسفؒ قال ليس للامام ان يدع الصلب لان المقصود به الاشتهار ليعتبر غيره (مبسوط)

خود صاحب ہدایہ کا کہنا یہ ہے کہ تشہیر تو نفسِ قتل ہی سے ہو جاتی ہے، البتہ سولی سے اس تشہیر میں اور زیادتی ہو جاتی ہے، اس لئے یہ امام ہی کی رائے پر چھوڑنا چاہیے۔

ونحن نقول اصل التشهير بالقتل والمبالغة فى الصلب فيخير فيه (هداية)

تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ۔ یعنی داہنا ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا، یہ سزا اس صورت میں ہے کہ صرف مال لوٹا ہو اور جان نہ لی ہو، اس سزا کے باب میں بھی فقہاء حنفیہ میں کسی قدر اختلاف ہے، امام محمدؒ سے منقول ہے کہ جب قتل یا سولی کی سزا اپنے اپنے دفعاتِ جرم کی بنا پر نافذ ہو رہی ہو تو یہ قطعِ اعضاء کی سزا نافذ نہ کی جائے گی، اس لئے کہ کسی بڑی حد کے اجراء کے بعد چھوٹی حد کے اجراء کا سوال باقی نہیں رہتا، مثلاً اگر کسی پر چوری اور زنا دونوں ثابت ہوں تو سزا صرف زنا کی ملے گی، اور سنگ ساری کے ہوتے ہوئے ہاتھ کاٹے جانے کی الگ سزا کی ضرورت نہ رہے گی، لیکن امام ابو حنیفہ کا فرمانا ہے کہ قطعِ اعضاء اور سولی یہ تعداد میں دو سزائیں ہی نہیں بلکہ مجرم کے ہاتھ پیر کاٹ کر

ذٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡيٌ فِي الدُّنۡيَا وَلَهُمۡ فِي الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۳۳﴾

یہ تو ان کی رُسوائی دنیا میں ہوئی ۱۲۶ؒ اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۱۲۷ؒ

قتل یا سولی ایک ہی سزا ہوئی یہ سزا سخت ترین جنگ ہے لیکن یہ اس لئے کہ جرم بھی تو سخت ترین تھا اور جرم کی شدت یہ ہے کہ مجرم نے قتل و غارت (مار اور لوٹ) دونوں کر کے امن عامہ کو انتہا درجہ کا نقصان پہنچا دیا۔ یہ ساری تفصیلات ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں مذکور ہیں
یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ۔ یہ اس صورت میں کہ ابھی نوبت نہ جان لینے کی آئی نہ مال لوٹنے کی محض قصد و اقدام ہی کے بعد گرفتاری ہو گئی۔ ملک سے نکال دیئے جانے سے ایک مراد تو جلاوطنی ہے۔ دوسرے یہ کہ مجرم ملک میں آزادانہ چلنے پھرنے نہ پائیں ان کی آزادی سلب کر لی جائے اور وہ قید خانہ میں بند کر دیئے جائیں۔ فقہاء حنفیہ نے بھی آخری معنی اختیار کئے ہیں اور لغت بھی اس کی تائید میں ہے
وقال ابو حنیفة النفی من الارض هو الحبس وهو اختیار اکثر اهل اللغة (کبیر) والمراد بالنفی عند نا الحبس
واحتج العرب تستعمل النفی بذلك المعنی لان الشخص یفارق بیته واهله (روح) من یحبسهم ان یجد وافی السجن۔
فقہاء حنفیہ کہتے ہیں کہ جلاوطنی کی صورت میں مجرم یا تو کسی دوسرے اسلامی شہر میں چلا جائے گا تو وہاں جا کر فتنہ و فساد کا باعث بنے گا، یا اگر دارالحرب چلا گیا تو وہاں دشمنانِ اسلام کی تقویت کا سبب بن جائے گا۔ اس لئے یہاں مراد حبس اور قید ہی ہے ۔۔۔ مبسوط، ہدایہ، فتح القدیر وغیرہ میں یہ بحثیں تفصیل سے ملیں گی۔
ان چار صورتوں کے علاوہ پانچویں صورت یہ بھی ممکن ہے کہ رہزنوں نے کسی کو محض زخمی کر کے چھوڑ دیا ہو تو اس کا حکم مثل عام زخمیوں کے ہوگا۔ یہاں قانون قصاص و ضمان کی دفعات چلیں گی اور یہ حق العبد ہونے کے باعث معاف بھی ہو سکے گا۔ "روشن خیالی" اور "تجدد نوازی" جو دوسرا نام ہے جاہلیتِ فرنگ سے مرعوبیت کا، ممکن ہے اسلامی سزاؤں کی ان سختیوں پر چیں بجبیں ہو، لیکن ساری قیاسی اور عقلی بحثوں سے قطع نظر صرف عملی اور تجربی حیثیت سے نہ دیکھ لیا جائے کہ جن ملکوں نے اپنے ہاں قانون کو نرم کر کے سزائیں ہلکی سے ہلکی کر دی ہیں اُن کے ہاں جرائم اور بدامنی کا کیا حال ہے؟ اور ان قوموں کا ہاں کیا جن کے ہاں اب تک اسلامی تعزیرات و حدود کا نفاذ جاری ہے؟ ۔۔۔ امریکہ اور برطانیہ اور فرانس کا ریکارڈ جرائم کے لحاظ سے بلووں اور ڈاکوں، قتل و غارت کے لحاظ سے کیا ہے اور نجد و حجاز و یمن کا کیا؟ GUNMEN اور GANGSTER قسم کی نئی نئی اصطلاحیں روز کہاں پیدا ہو رہی ہیں؟ بدنام تو لوٹ مار اور کھسوٹ کشت و خون کے لئے کسی زمانے میں عرب کے بدوی تھے، لیکن اب کیا نسبت انھیں مہذب دنیا کے روشن دور میں ڈاکوؤں سے رہ گئی ہے؟ ۔۔۔
یہ تو واقعات ہیں واقعات، خوش اعتقادی کا کوئی سوال نہیں۔ عقلاً اور اصلاً بھی یہی بات کہ اسلام نے معاش اور معیشت اور معاشرت کا جو بہترین نظام دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے اور فرد و جماعت دونوں کے لئے فراغ خاطری اور آسائش و سہولت کے جتنے موقعے بہم پہنچا دیئے ہیں اُن کے بعد بھی جو ظالم اللہ کی ان نعمتوں کی شدید ناشکری کر کے امن عامہ پر ڈاکہ ڈالتا، اور اللہ کے بندوں کی جان اور مال بہ جبر لے لینا چاہتا ہے اور ثبوت جو اپنے انتہائی خبثِ نفس کا دے رہا ہے ایسا خبیث الفطرت مستحق بھی سخت ترین سزا کا ہے۔
۱۲۶ؒ عبرت و موعظت کے لئے سزاؤں کا محض سخت یا جسمانی حیثیت سے تکلیف دہ ہونا ہی کافی نہیں، تفضیح و رُسوائی، دماغی و قلبی تکلیف کا پہلو بھی ان میں نمایاں ہونا چاہیئے۔ فقہاء نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ رہزنی اور ڈکیتی کا ارتکاب

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ تو جانے رہو کہ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا رحمت

رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ

والا ہے ۱۲۸ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو ۱۲۹ اور اس کا قرب تلاش کرو ۱۳۰

ع ٥ / ٩

گر ایک حول یا جتھے نے کیا ہے تو فرداً فرداً ہر ایک کے متعلق جرم کے ثبوت کی حاجت نہیں محض اس گروہ سے وقوعِ جرم کا ثبوت کافی ہے اس لئے کہ جتھے کے کسی فرد نے بھی جو کچھ کیا ہے، جتھے ہی کی قوت کے بھروسہ پر کیا ہے چنانچہ قتل بالغرض ہزنوں کی جماعت میں سے کسی ایک نے بھی کیا ہے تو محاربہ میں بہرحال بیدا جتھا شریک ہوا اور قصاص میں قتل سب ہوں گے۔

فان باشر القتل احدهم اجري الحد عليهم اجمعهم لانه جزاء المحاربة (هدايه) ان باشر القتل احدهم يجب الحد على الجميع ۔ (شرح وقايه)

۱۲۷ (اور یہ نہ سمجھا جائے کہ دنیا کی سزا ایسے مجرموں کے لئے کافی ہو جائے گی)
یہیں سے فقہاء حنفیہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ اجرائے حد کفارۂ معصیت کے لئے کافی نہیں۔

دل على ان اقامة الحد عليه لا تكون كفارة لذنوبه (جصاص) والآية اقوى دليل لمن يقول ان الحدود لا تسقط العقوبة في الآخرة ۔ (روح)

اور یہی مذہب مالکیہ کا بھی نقل ہوا ہے۔

۱۲۸ (اسی لئے وہ توبہ کرنے والوں سے حد بھی ساقط کئے دیتا ہے)
اب نہ ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے نہ سولی اور نفی فی الارض (حبس) کا اختیار باقی رہے گا، یہ متعین حدود جو اللہ کی مقرر کی ہوئی تھیں توبہ کے بعد ساقط ہو جائیں گی، اور کوئی دعوے اور مطالبہ حکومت اسلامی کی طرف سے باقی نہیں رہے گا، البتہ وارثوں اور مدعیوں کو اب بھی اختیار ہے کہ خواہ معاف کر دیں خواہ مال پر صلح کر لیں، خواہ خون کے بدلہ میں خون کا مطالبہ کریں، اب معاملہ صرف بندوں کے درمیان رہ گیا۔

وان اخذ بعد ما تاب وقد قتل عمداً فان شاء الاولياء قتلوه وان شاؤا عفوا عنه لان الحد في هذه الجناية لا يقام بعد التوبة (هدايه) ومتى سقط الحد المذكور في الآية وجبت حقوق الآدمي في المال والنفس والجراحات (جصاص) فان كان قد قتل فان شاء الاولياء قتلوه وان شاؤا عفوا عنه لان هذا القتل قصاص فيصح العفو عنه والصلح به (فتح القدير)

تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۔ توبہ کے تحقق کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ اس کا وجود مجرموں پر قابو پائے جانے سے پہلے پایا جائے بغیر اس کے صدقِ توبہ اور اخلاص ثابت نہ ہوگا، فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ توبہ محض زبانی و لفظی کافی نہیں، عملی علامتیں بھی اصلاحِ حال اور صدقِ توبہ کی ظاہر ہونی چاہیئے۔

حتى يجب لا ما القول بل يظهر سيماء الصلحاء (رد مختار)

۱۲۹ یعنی اس کے احکام کی نافرمانی سے ڈرو اور بچو)
تقویٰ ہی ایسی چیز ہے جو جاہ و مال کی ہر حرص بیجا سے بچا سکتا ہے۔

۱۳۰ (طاعتوں کے ذریعہ سے)
وَسِیْلَۃ۔ کے معنی قرب کے ہیں، اہلِ لغت اور تابعین سب سے یہی معنی مروی ہیں۔

یعنی بالوسیلۃ القربۃ (ابن جریر) توسلت الی فلان بکذا بمعنی تقربت الیہ (ابن جریر) الوسیلۃ القربۃ التی ینبغی ان یطلب بہا (قرطبی) الوسیلۃ ھی القربۃ عن ابی وائل والحسن ومجاھد وقتادۃ وعطاء والسدی وابن زید وعبد اللہ بن کثیر (قرطبی) الوسیلۃ القربۃ او الزلفۃ یقال توسل الی بکذا ای تقرب۔ (ابن قتیبہ)

اور قرب کا بہترین ذریعہ احکامِ الٰہی کی تعمیل ہے۔

اطلبوا الیہ القرب فی الدرجات بالاعمال الصالحۃ (ابن عباسؓ) استعیرت لما یتوصل بہ الی اللہ تعالیٰ من فعل الطاعات وترک السیئات (مدارک) فالمراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ وذلک بالعبادات والطاعات (کبیر) وحقیقۃ الوسیلۃ الی اللہ تعالیٰ مراعاۃ سبیلہ بالعلم والعبادۃ وتحری مکارم الشریعۃ وھی کالقربۃ۔ (راغب)

جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت میں مرحوم بزرگانِ دین کی استعانت اور فوت شدہ انبیاء و اولیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے انھوں نے عربی کے وسیلہ (بمعنی قرب کی) اُردو کے وسیلہ (بمعنی ذریعہ) کا مرادف سمجھ لیا ہے اور ایسی شدید و فاحش غلطیاں نادر نہیں، کثیر الوقوع ہیں، علامہ آلوسی نے بڑے بسط و تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ

واما اذا کان المطلوب منہ میتًا او غائبًا فلا یستریب عالم انہ غیر جائز وانہ من البدع التی لم یفعلہا احد من السلف (روح)

(میت یا غائب شخص سے دعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی عالم کو شک نہیں، اور یہ ایک ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں کسی نے بھی نہیں کیا ہے) اور لکھا ہے کہ:۔

ولم یروی عن احد من الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وھم احرص الخلق علی کل خیر انہ طلب من میت شیئًا

(حضرات صحابہؓ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہوا ہے لیکن کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ انھوں نے صاحبِ قبر سے کچھ طلب کیا ہو)

صحابیوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اتباعِ سنّت ضرب المثل کی حد تک شہرت رکھتا ہے ان کی حالت یہ تھی:۔

قد صح عن ابن عمرؓ انہ کان یقول اذا دخل الحجرۃ النبویۃ زائرًا السلام علیک یا رسول اللہ السلام علیک یا ابابکرؓ السلام علیک یا ابت ثم ینصرف ولا یزید علی ذلک ولا یطلب من سید العٰلمین صلعم او من ضجیعیہ المکرمینؓ شیئًا وھم اکرم من ضمنتہ البسطۃ وارفع قدرًا من سائر من احاطت بہ الافلاک المحیطۃ۔

(جب روضۂ نبوی میں زیارت کے لئے داخل ہوتے تو صرف اس قدر کہتے کہ السلام علیک یا رسول اللہ السلام علیک یا ابابکرؓ السلام علیک ابا جان، اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے نہ کچھ مانگتے سرورِ عالم سے نہ ان کے ان مقربین سے حالانکہ سارے زمین و آسمان کی مخلوقات میں ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے)

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور اس کی راہ میں جد و جہد کرو ۱۳۱؎ تاکہ (ہر طرح) فلاح پاؤ ۱۳۲؎ بے شک جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے

لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ

پاس ساری دنیا کی چیزیں ہوں اور اتنی ہی اُن کے پاس اور بھی ہوں تاکہ وہ انہیں معاوضہ میں دے کر قیامت کے

مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾

دن عذاب سے چھوٹ جائیں تو وہ ان سے (ہرگز) قبول نہ کی جائیگی اور ان کے لئے عذاب دردناک (ہی) ہے ۱۳۳؎

روضۂ مبارک کے سامنے دعا کرنے سے بڑھ کر کون سی شے مقبول ہو سکتی ہے لیکن :۔

ممن کانت الصحابة رضی اللہ تعالیٰ عنہم یستقبل القبلة ولم یروعنهم استقبال القبر الشریف عند الدعاء مع انه افضل من العرش۔

(یہاں بھی صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے تھے قبلہ رُخ ہو کر اور یہ نہیں کرتے تھے کہ دعا کرتے وقت قبر شریف کی طرف منہ کر لیں باوجود اس کے کہ وہ مقام عرش سے بھی افضل ہے[1])

اور تو اور سلام پڑھتے وقت تک کے لئے :۔

واختلف الائمة فی استقباله عند السلام وعن ابی حنیفة انه لا یستقبل بل یدبر ویستقبل القبلة (ائمہ میں اختلاف ہے کہ منہ کس طرف رکھنا چاہئے لیکن امام ابو حنیفہؒ کا فیصلہ اس موقع کے لئے بھی یہی ہے کہ منہ قبر شریف کی طرف نہ کرے بلکہ ادھر پشت رکھے اور چہرہ قبلہ شریف کی طرف رہے)

غرض یہ کہ بعض اہل بدعت نے لفظ وسیلہ سے جو اپنے لئے پناہ ڈھونڈی ہے وہ سرتاسر بودی اور بے بنیاد ہے۔

۱۳۱؎ وسیلہ ہی کی طرح عربی کے جہاد کو بھی لوگوں نے اُردو کے جہاد کے مفہوم میں لے رکھا ہے۔ اردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے صرف قتال فی سبیل اللہ کے معنی پر مخصوص ہو چکا ہے۔ عربی میں یہ حصر و تحدید صحیح نہیں۔ عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے۔ ہر سخت کوشش جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے، خاص کر دشمنانِ دین کے مقابلہ میں اصطلاحِ قرآنی میں جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔

الجهاد والمجاهدة استفراغ الوسع فی مدافعة العدو (راغب) وهو المبالغة والاستفراغ ما فی الوسع والطاقة من قول او فعل (تاج)

اور جہاد جس طرح رزم میں تیغ و تفنگ سے ہو سکتا ہے اسی طرح بزم میں مال و دولت اور قلم و زبان سے بھی ہو سکتا ہے

۱۳۲؎ (اور سب سے بڑی فلاح رضائے الٰہی کا حصول ہے)

فلاح کا لفظ دنیوی، اُخروی، مادی و روحانی ہر طرح کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر شامل ہے۔

---

[1] علامہ آلوسی کے اس آخری قول پر کوئی دلیل نظر سے نہیں گزری۔

يُرِيدُونَ اَنْ يَّخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ز

چاہیں گے کہ نکل آئیں آگ سے حالانکہ اس سے (کبھی) نہ نکل پائیں گے، اور ان کے لئے

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

مستقل عذاب ہے ۱۳۴

لیس فی کلام العرب کلہ اجمع من لفظۃ الفلاح لخیری الدنیا والآخرۃ کما قالہ ائمۃ اللسان (تاج)

ملاحظہ ہو اَلْمُفْلِحُوْنَ پر حاشیہ سورۃ البقرہ کے رکوع اول میں۔

لَعَلَّ پر حاشیے پہلے گزر چکے ہیں، کہ جب اس کا استعمال حق تعالیٰ کی زبان سے ہوتا ہے تو معنی میں مفہوم شک و احتمال کا باقی نہیں رہتا بلکہ تیقن پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۳۳ توحید و رسالت کی طرح معاد و آخرت کے مسئلہ میں اہل جاہلیت سیکڑوں غلطیوں میں مبتلا رہتے ہیں، ان ہی میں سے ایک چلی ہوئی اور بڑی غلطی یہ ہے کہ وہاں کے معاملات کو بھی دنیا پر قیاس کر کے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح یہاں کی عدالتوں، دفتروں، محکموں میں لین دین سے کام چلا لیا جاتا ہے ایسے ہی نذرانوں، رشوتوں کی گرم بازاری وہاں بھی ہوگی، اور ہر خطا و لغزش پر کسی نہ کسی مالی معاوضہ سے قلم پھیر دیا جا سکے گا، قرآن مجید کو اس عالمگیر غلطی کی بار بار تردید کرنی پڑی، اور بتانا پڑا ہے کہ کفر کا فدیہ یا کفارہ آخرت میں کسی مال و دولت سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔

اَنَّ لَهُمْ۔ ان لکل واحد منهم کے معنی میں ہے یعنی ان میں سے ایک ایک کے پاس بھی اگر اتنا مال ہوتا۔

مَعَهٗ۔ میں ضمیر واحد غائب اسی مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا کی طرف ہے۔

لَوْ۔ یہ حرف جس عبارت پر آتا ہے، اکثر اس سے مراد ایک اَن ہونی بات بہ طور فرض محال کے ہوتی ہے چنانچہ یہاں بھی یہی مراد ہے کہ اس فرض محال پر بھی کوئی صورت عذاب سے نجات کی نہ ہو سکے گی۔

مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ اس کے تحت میں وہ سب کچھ آگیا، جو ذہن انسانی میں سما سکتا ہے۔

۱۳۴ (جو کبھی ہٹنے والا اور مٹنے والا نہیں)

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ وہ عذاب پائدار و مستقل ہے، جو نہ کبھی ہٹ سکے اور نہ کبھی مٹ سکے۔

معناہ دائم ثابت لا یزول ولا یحول (قرطبی) عذاب دائم ثابت لا یزول عنهم ولا ینتقل ابدًا۔ (ابن جریر)

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ۔ عذاب اور وہ بھی عذاب الیم!

ظاہر ہے کہ دوزخیوں کو کیسی کچھ تڑپ، کیسی کچھ حسرت، کیسی کچھ تمنا اس عذاب سے نکل بھاگنے کی ہوگی۔

مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ اس ارشاد سے اُن حسرت نصیبوں کی حسرت نصیبی پر گویا مہر لگ گئی، عذاب سے نکلنے کا نہ کوئی امکان ہے، نہ کوئی تدبیر کام دے سکتی ہے بلکہ اب یہ بھی سنا دیا گیا کہ یہ عذاب جس درجہ کا شدید و ہولناک ہوگا، اسی طرح لازوال بھی ہوگا۔

اشتداد عذاب قبل کی آیت میں بیان ہو چکا، استداد عذاب اب بتا دیا گیا، اس عذاب دائمی کی خصوصیت چونکہ

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا

اور چوٹے اور چوٹی ع دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو ۱۳۵

کافروں کے ساتھ بیان ہوئی اہل سنت متکلمین نے یہ نتیجہ اور صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ مخلص کلمہ گو بہر صورت عذاب سے خلاصی پا جائے گا۔

اجمع اصحابنا وهذه الامة على انه تعالى يخرج من النار من قال لا اله الا الله على سبيل الاخلاص (كبير)

اور امام رازیؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ کی ترکیب خود حصر پر دلالت کر رہی ہے یعنی یہ عذاب دائمی صرف کافروں پر ہوگا نہ کہ غیر کافروں کے لئے۔

وهذا يفيد الحصر فكان المعنى ولهم عذاب مقيم لا لغيرهم (كبير)

۱۳۵ (اے حکام)

اجرائے حدود شرعی و قصاص کا حق صرف اہل حل و عقد یا حکومتِ اسلامی کے حکام ہی کو حاصل رہتا ہے اس لئے خطاب بھی قدرۃً ان ہی سے ہے۔

خطاب مع قوم يصح منهم ان يكونوا على معين منهم وهو امام الزمان كما ذهب اليه الاكثرون (كبير)

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ لا کر یہ بتا دیا گیا ہے کہ جرم قابلِ تعزیر کی حیثیت سے مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں یا یہ نہ ہوگا کہ مجرم اگر عورت ہے تو اس کی سزا کچھ بڑھا دی جائے یا عورت ہونے کی بنا پر اس کی سزا کچھ گھٹا دی جائے، دوسری قوموں کے قانون میں مرد و عورت کے درمیان سزا کی عدم مساوات کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔

سرقة. اپنے لغوی معنی میں تو مطلقاً ہر چوری کو کہیں گے لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد ہوتی ہے غیر کے مال کو کسی خاص جگہ سے اور کسی خاص مقدار میں چرا لینا۔

السرقة اخذ ما ليس له اخذه في خفاء وصار ذلك في الشرع لتناول الشيء من موضع مخصوص وقدر مخصوص (راغب) فقد ثبت عندنا ان الحكم معلق بمعنى غير الاسم يجب اعتباره في ايجابه وهو الحرز والمقدار (جصاص)

ان دو قیدوں کے لگ جانے سے ایسی بیسیوں چیزیں جو ہر جگہ اور ہر مقدار میں مل جاتی ہیں ان کی چوری، چوری کی فقہی تعریف سے خارج ہو گئی۔ پھر چوری کے ثبوت کے دو ہی طریقے ہیں ایک مجرم کا اقرار، دوسرے عادل گواہوں کی شہادت۔

السرقة انما تظهر باحد الامرين اما بالبينة او بالاقرار (المحيط)

جس چوری پر حد جاری ہوگی اس کی مالیت حنفیہ کے ہاں کم از کم ایک دینار یا دس درہم کی ہونا چاہیے اور اس چیز کو کسی محفوظ مقام میں ہونا چاہیے، اور خود وہ چور جس پر حد واجب ہوگی اسے عاقل و بالغ ہونا چاہیے۔

اذا سرق العاقل البالغ عشرة دراهم او ما يبلغ قيمته عشرة دراهم مضروبة من حرز لا شبهة فيه وجب القطع (هدایه)

حفاظت عرفِ عام کے تابع ہے، کوئی جامع و مانع معیار اس کا خارج میں موجود نہیں۔

الحرز هو ما نصب عادة لحفظ اموال الناس وهو يختلف في كل شيء بحسب حاله (قرطبی)

ع سارقة کا ترجمہ ایک لفظ سے چوٹی ہی ہو سکتا ہے اور اسی کے خیال سے سارق کا ترجمہ بجائے "چور" کے چوٹے کیا گیا کاش اردو میں لفظ "چور" کے مقابل مؤنث کے لئے "چورنی" موجود ہوتا۔

فقہاء نے ادھر بھی متعدد شرطیں کتاب و سنت کے مزاج کو سمجھ کر اور انہی سے اخذ کرکے لگائی ہیں۔ حنفی فقہ میں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) چور عاقل و بالغ ہو، بچہ اور مجنون پر حد نہیں ہے۔

(۲) مال نظر بچا کے لے گیا ہو، کھلے خزانے چھین جھپٹ کر نہ لے گیا ہو، غاصب اور اُچکے کی سزائیں دوسری ہیں، حد سرقہ نہیں۔

(۳) مال کسی کی ملک ہونا چاہئے، غیر مملوک مال (مثلاً کفن جو کسی کی ملک نہیں ہوتا) کی چوری حد سرقہ مستوجب کی تعریف میں نہ آئے گی۔

(۴) مال کسی غیر کی غیر مشترک ملک ہو، چور کے اپنے مال کے ساتھ مخلوط و مشترک نہ ہو، شوہر، بیوی، اولاد وغیرہ پر حد اسی لئے جاری نہ ہوگی کہ ان کا مال کے ساتھ خلط و اشتراک رہا کرتا ہے۔

(۵) مال کسی حد اور درجہ تک حفاظت میں ہو، خواہ حقیقۃً (مثلاً کسی سپاہی، چوکیدار وغیرہ کے پہرہ میں) خواہ حکماً (مثلاً مکان کے اندر، صندوق کے اندر وغیرہ) سر راہ کھلے اور پڑے ہوئے مال کے اٹھا لینے پر حد سرقہ جاری نہ ہوگی، چوکی دار، پہرہ دار وغیرہ اگر چوری کریں تو وہ خیانت کی دفعہ میں ملزم ہوں گے، حد سرقہ کے مستوجب نہ ہوں گے۔

علماء متکلمین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ اُمت کے لئے نصب امام ضروری ہے، اس لئے کہ اجرائے حدود کا حکم درجۂ فرض میں ہے اور اجراء کی صورت اجماع اُمت سے طے ہو چکا ہے کہ افراد سے ممکن نہیں اس لئے امام معین کا ہونا لازمی ہے۔

احتج المتکلمون بهذه الآية في انه يجب على الامة ان ينصبوا لانفسهم اماماً معيناً والدليل عليه انه تعالى اوجب بهذه الآية اقامة الحد على السراق والزناة فلابد من شخص يكون مخاطبا بهذا الخطاب واجمعت الامة على انه ليس لآحاد الرعية اقامة الحدود على الجناة بل اجمعوا على انه لا يجوز اقامة الحدود على الاحرار الجناة الا للامام (کبیر)

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا۔ چوری کی سزا میں پہلی بار داہنا ہاتھ پہونچے سے کاٹا جائے گا، دوسری بار کی چوری میں بایاں پیر ٹخنہ سے قطع کر دیا جائے گا، اس کے بعد کی چوریوں میں فقہاء نے سنت ہی سے اخذ کرکے لکھا ہے کہ اب مزید سزا قطع اعضاء کی نہیں، بلکہ قید کی دی جائے گی، چوری کی یہ سزا قطع ید، عرب میں پہلے سے جاری تھی اسلام نے اُسے قائم رکھا، اور اس میں چند قیود و شرائط کا اضافہ کر دیا۔

وقد كان القطع معمولا به في الجاهلية فقرر في الاسلام وزيدت شروط أخر (ابن کثیر)

دنیا کے اور قانونوں اور دوسری تہذیبوں میں بھی چوری کی سزا کہیں تو ایک طویل مدت کی اسیری رہی ہے اور کہیں جلا وطنی اور کہیں قطع اعضاء اور کہیں پھانسی یا اور کسی طریقہ سے ہلاکت۔

دوسری حدود شرعی کی طرح، خوب واضح رہے کہ سرقہ کی حد صرف دار الاسلام ہی میں جاری ہوگی اور دشمنوں کے ملک میں اور دوران جہاد و قتال میں جاری نہ ہوگی، ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں یہ مضمون، محدثین و فقہاء کے حوالہ سے بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے۔

وقد نص احمد واسحٰق بن راهويه والاوزاعي وغيرهم من علماء الاسلام على ان الحدود لا تقام في ارض العدو. وذكرها ابو القاسم الخرقي في مختصره فقال لا يقام الحد على مسلم في ارض العدو

(فضلاء اسلام میں سے احمد اور اسحٰق بن راہویہ اور اوزاعی وغیرہم نے صاف حکم لکھا ہے کہ مسلمانوں پر حد دشمنوں کی سرزمین پر جاری نہ کی جائے اور یہی قول ابو القاسم خرقی نے اپنی مختصر میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ مسلمانوں پر حد

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

اُن کے کرتوتوں کے عوض میں اللہ کی طرف سے بطور عبرتناک سزا کے۔۱۳۶ اور اللہ بڑا قوت والا ہے، بڑا حکمت والا ہے۔۱۳۷

دشمن کے ملک میں جاری نہ کی جائے گی۔)

رواہ ابوداؤد وقال ابو محمد المقدسی وھو اجماع الصحابۃ۔

یہ روایت ابوداؤد کی ہے اور ابو محمد مقدسی نے کہا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔

اور تفسیر المنار میں اسی طرح کے اقوال چند آیات کے بعد آیۂ کریمہ و من تعلم منھا سوال اللہ علیہ [illegible] کے تحت بیان ہوئے ہیں۔

۱۳۶ سزائے سرقہ کی اہمیت آیت سے بالکل ظاہر ہے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا۔ چوری شریعت اسلامی میں ایک بدترین جرم ہے، اسلام نے فرد و جماعت دونوں کے لئے امن و امان اور سکون خاطر کا جو بہترین، کامل ترین نظام قائم کیا ہے، چور اس میں رخنہ ڈالنا اور اس ساری فضا کو درہم برہم کر ڈالنا چاہتا ہے، آیت کے اس ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ چوری کا بدبخت مجرم ہے ہی ایسی سخت سزا کا مستحق۔ شریعت موسوی کا قدم بھی اس باب میں کچھ پیچھے نہیں، کچھ آگے ہی ہے۔ نقب زن کی جان سے امان اٹھ جاتی ہے کوئی اگر اُسے قتل کر ڈالے تو اس کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا۔ "اگر چور سیندھ مارتے ہوئے دیکھا جائے اور کوئی اسے مار بیٹھے اور وہ مر جائے تو اس کے لئے خون نہ کیا جائے گا۔" (خروج۔۲۲: ۲)

اجازت ہی نہیں، ایک جگہ تو حکم تک توریت میں نقب زن کے قتل کا ملتا ہے:۔

"اگر کوئی شخص اپنے بھائیوں بنی اسرائیل میں سے کسی کو چرا لے میں پکڑا جائے اور اس کا بیوپار کرے یا اُسے بیچ ڈالے تو چور مار ڈالا جائے اور تو شر کو اپنے درمیان سے دفع کر۔" (استثناء۔۲۴: ۷)

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ نکال کہتے ہیں ایسے عذاب و سزا کو جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔

ای مالیجب ان ینکل بہ عن ذٰلک الفعل (قرطبی) ای عظۃ من اللّٰہ بما عوقبا بہ من راھما ابن قتیبۃ

فلسفۂ تعزیر کے واقفین جانتے ہیں کہ مجرم کے لئے سزا کی تجویز کرنے میں دو بڑے پہلو پیش نظر ہوتے ہیں:۔ ایک انتقامی یعنی مظلوم یا مستغیث کے جذبات کی تسکین، دوسرے انسدادی یعنی آئندہ کے ممکن مجرموں کی حوصلہ فرسائی و ہمت شکنی۔ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ اسی دوسرے پہلو کی تاکید و تقویت کے لئے ہے، اور پھر من اللّٰہ سے اشارہ یہ بھی ہوگیا کہ یہ خدائی فیصلہ ہے، بندوں کو اس میں ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل نہیں۔

جزآءً و نکالًا۔ دو لفظ الگ الگ آئے اور دونوں مفعول لہٗ بلا عطف ہیں، علماء بلاغت نے کہا ہے کہ جزاء میں اشارہ حق العبد کے اتلاف کا ہے اور نکال میں حق اللہ کے اتلاف کا۔

والجزاء اشارۃ الی ان فیہ حق العبد والنکال اشارۃ الی ان فیہ حق اللّٰہ تعالٰی۔ (روح)

۱۳۷ (وہ سزا وہی مقرر کرتا ہے جو عین اُس کے تقاضائے قدرت و حکمت کے شایان شان ہے) صفت عزیز لاکر یہ یاد دلا دیا کہ اللہ حاکم مطلق ہے وہ جس جرم کی جو سزا چاہے، مقرر کر دے، کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں پہنچتا، اور صفت حکیم سے اشارہ اس طرف کر دیا کہ اس کا کوئی سا بھی حکم حکمتوں اور مصلحتوں

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ

پھر جو شخص اپنی حرکت ناشائستہ کے بعد توبہ کرلے، اور اپنی اصلاح کرلے تو بیشک اللہ اس پر توجہ کرے گا ۱۳۸

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

بے شک اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے ۱۳۹

سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے اس نے چوری کی بھی سزا وہی مقرر کی، جو فرد اور جماعت دونوں کی مصلحتوں کے عین مطابق ہے۔ امام رازیؒ نے اس مقام پر اصمعی کے حوالہ سے یہ حکایت نقل کی ہے کہ میں ایک روز ایک بدوی عرب کے سامنے سورۂ مائدہ زبانی پڑھ رہا تھا، یہ آیت آئی، اور یہاں سہوا میری زبان سے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ نکلا، بدوی نے کہا کہ یہ کس کا کلام ہے؟ میں نے کہا کلام الٰہی ہے، اس پر وہ بولا کہ اسے دوبارہ پڑھو، میں نے پھر پڑھا، اور اب مجھے تنبیہ ہوگئی کہ بجائے عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ کے میری زبان سے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ نکل گیا تھا، بدوی نے کہا کہ بیشک اب ٹھیک پڑھا، میں نے کہا تمہیں کیسے پتہ چلا، اس نے جواب دیا کہ یاق کلام سے، یہاں جب ذکر سزا و عقاب کا ہے تو عین مقتضائے بلاغت یہی ہے کہ صفات بجائے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کے عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ہی لائی جائیں۔

۱۳۸ (رحمت کے ساتھ یوں کہ پچھلا گناہ معاف کردے گا اور توبہ پر استقامت کی بھی توفیق دے گا)

فَمَنْ تَابَ۔ یہ توبہ قاعدۂ شریعت کے مطابق ہونا چاہیے، فقہاء نے کہا ہے کہ چرائی ہوئی چیز مالک کو واپس کردینا چاہیے اور اگر تلف ہوچکی ہو تو اس کا تاوان مالک کو دے اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو، مالک سے معاف کرانے کی کوشش کرے کہ یہ جز لازم تکمیل توبہ ہے، باقی سزائے قطع ید جو حق العباد کی اتلاف کی سزا ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ محض توبہ سے منسوخ نہیں ہوجاتی۔

فامّا القطع فلا يسقط عنه بالتوبة عند الاكثرين (معالم) والقطع لا يسقط بالتوبة (قرطبی) لم يسقط شئ ولا توبة السارق (ابن العربی) وقال الجمهور لا يسقط عنه هذا الحد (كبير)

حنفیہ اور مالکیہ کا اس پر اتفاق ہے۔

لیکن امام شافعیؒ کے ایک قول میں اس سے اختلاف بھی نقل ہوا ہے، اور ایک گروہ نے اس پر استدلال اس سے کیا ہے کہ آیت کے آخر میں غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ جو آگیا ہے۔

قال بعض العلماء التابعين يسقط عنه الحد لان ذكر الغفور الرحيم فى اخر هذه الاية (كبير)

فقیہ مفسر ابن العربی مالکی نے اس کے رد میں تفصیل سے کلام کیا ہے، (احکام القرآن جلد اول ص ۲۵۳)

وَاَصْلَحَ یعنی آئندہ کے لئے ایسی عادتیں اور حرکتیں چھوڑدے، توبہ کا تعلق ماضی سے تھا، اور اصلاح حال کا تعلق مستقبل سے ہے، باریک بیں فقہاء نے لفظ وَاَصْلَحَ سے یہ بھی استنباط کرلیا ہے کہ مجرم نے جب توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلی تو اب اس پر طعن جائز نہیں، مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ توبہ کا معتبر ہونا اصلاح پر موقوف ہے، مثلاً سرقہ وغیرہ کا مال بہ شرط امکان واپس کردینا، ورنہ مالک سے معاف کرالینا، اور جب مالک نہ معلوم ہو تو اللہ کی راہ میں تصدق کردینا۔

۱۳۹ (چنانچہ صفت عفو کے تقاضہ سے اس نے پچھلا گناہ معاف کردیا، اور صفت رحمت کے تقاضہ سے آئندہ کے لئے توفیق تقوےٰ دیدی)

امام رازیؒ نے آیت میں ان صفات کے آنے سے جو موقع مدح پر لائی گئی ہیں، معتزلہ کے رد میں یہ استدلال کیا ہے کہ

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ

کیا تو نہیں جانتا کہ بس اللہ ہی کی حکومت آسمانوں اور زمین میں ہے ۱۴۰ وہ جسے چاہے سزا دے

وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۰﴾ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ

اور جسے چاہے معاف کر دے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۱۴۱ اے پیمبر! آپ کو وہ لوگ رنج

لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا

میں نہ ڈالیں جو دوڑ دوڑ کر کفر میں پڑتے ہیں ۱۴۲ (خواہ) اُن میں سے ہوں جو اپنے منھ سے

بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛۚ

تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے ۱۴۳ (خواہ) اُن میں سے

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ یَاْتُوْكَ ؕ

ہوں جو یہودی ہیں جھوٹ کے بڑے سننے والے ۱۴۴ سننے والے دوسرے لوگوں کی خاطر جو آپ کے پاس نہیں آتے ۱۴۵

توبہ کی قبولیت اللہ کے ذمہ کچھ واجب نہیں ہے، واجب ہوتی تو یہ فضل و احسان کو یاد دلانے والی صفات لائی جاتیں۔

دلّت الآية على ان قبول التوبة غير واجب على الله تعالى لانه تعالى تمدح بقبول التوبة والتمدح انما يكون بفعل التفضل والاحسان لا بأداء الواجبات (کبیر)

۱۴۰ (اے مخاطب!)

یہ یاد دلا دیا ہے کہ جس نے یہ سزائیں تجویز کی ہیں بس وہی ایک مالکِ حقیقی اور قادرِ تحقیقی ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب عام ہر انسان سے ہے۔

قيل معناه الم تعلم ايها الانسان فيكون خطابا لكل واحد من الناس (معالم)

۱۴۱ (اور کوئی چیز اُس پر قدرت نہیں رکھتی)

وہ حاکمِ مطلق ہے، آمر علی الاطلاق ہے، وہ کسی قانون سے مجبور نہیں کہ مجرم کو ہمیشہ سزا ہی دے اس میں تردید ہو گئی، ہندی مشرکوں کے قانون "کرم" (ناگزیر مکافاتِ عمل) کی۔

یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ۔ لیکن وہ سزا اُسی کو دیتا ہے جو سزا ہی کے لائق ہوتا ہے اس کی حکمتِ کاملہ خود ہی جانچ کر لیتی ہے کہ کون کس لائق ہے۔

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ یہ معافی چاہے صرف آخرت میں ہو چاہے دونوں جگہ۔

۱۴۲ یعنی آپ ایسے لوگوں کی باتوں سے رنج نہ قبول کریں۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ

کلام کو اس کے صحیح موقعوں سے بدلتے رہتے ہیں ۱۲۶ کہتے رہتے ہیں کہ اگر تمھیں یہ ملے تو قبول

هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ

کر لینا اور اگر یہ نہ ملے تو اس سے احتیاط رکھنا ۱۲۷

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ قرآن مجید کی سی قیامت تک باقی رہنے والی کتاب میں رسول اللہ صلعم کا ذکر صیغۂ غائب میں بجز الرسول والنبی ہے اور صیغۂ حاضر میں یاایہا الرسول ایہا النبی سے بغیر صفات کے لانا بجائے خود اس امر کی طرف مشیر ہے کہ اب کوئی دوسرا شخص وصف نبوت و رسالت میں شریک ہو کرنے والا نہیں جس سے تعیین وصف میں اشتباہ پیدا ہو سکے يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ یعنی کفریات کی طرف بے تکلف اور بہ شوق و رغبت لپکتے ہیں يُسَارِعُوْنَ مضارع ہے مسارعۃ باب مفاعلۃ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ کفر کی جانب ایسے ساعی ہیں کہ گویا ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں امام رازیؒ نے کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ تو قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے لیکن يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ سے مخاطبت صرف دو ہی جگہ وارد ہوئی ہے ایک یہاں اور دوسری جگہ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ میں اور یہ طرز خطاب شرف و تعظیم کے لئے ہے

وهذا الخطاب لاشك انه خطاب تشريف وتعظيم (كبير)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے اہل طریق کی اس عادت کی اصل نکلتی ہے کہ اہل اعراض کی بدحالی پر کچھ زیادہ فکر نہیں کرتے

۱۲۳ ظاہر ہے کہ مراد منافقین ہیں، زبان پر دعویٰ ایمان، دل میں ایمان کا گزر نہیں۔ مِنَ الَّذِيْنَ میں مِنْ بیانیہ ہے، مراد ہے من المنافقين۔ اور اسی پر عطف ہے مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا کا جو ابھی آرہا ہے۔

۱۲۴ منافقین اور یہود دونوں قسم کے لوگوں میں وصف مشترک یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹ اور باطل کے بڑے سننے والے اور قبول کرنے والے ہیں۔ سَمّٰعُوْنَ میں سمع قبول کرنے کے معنی میں ہے اور عربی میں یہ استعمال عام ہے۔

والسمع يستعمل ويراد منه القبول (كبير) اى قابلون لما تفتريه الاحبار (بيضاوى)

لِلْكَذِبِ کے لام لاجل الكذب کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی یہ لوگ خبریں اس لئے سنتے ہیں کہ جھوٹ بولیں اور غلط شہرت دیں

اى يسمعون منك لكى يكذبوا عليك (كبير) اى يسمعون منك لاجل ان يكذبوا (راغب)

۱۲۵ (بربنائے کبر و تعصب)

تجافوا عنك تكبرا او افرطا فى البغضاء (بيضاوى)

یعنی کچھ تو ایسے ہیں جو بربنائے کبر و تعصب آپ کی خدمت میں آتے ہی نہیں، مثلاً یہود خیبر اور کچھ ایسے ہیں جو آپ کی مجلس میں حاضر تو ہوتے ہیں لیکن طلب حق کی غرض سے نہیں، بلکہ مثل مخبروں اور جاسوسوں کے کہ دوسروں کی لگائی بجھائی کریں۔

۱۲۶ یہ وصف ان ہی اکابر یہود کا بیان ہوا، جو فرط عداوت و کبر سے خود تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے نہ تھے اور جب موقع دیکھتے تو اپنے ہاں کے کلام الٰہی میں تحریف سے بھی نہ چوکتے، روایتوں میں بھی آتا ہے کہ یہود اپنے ہاں کی زناکاری کا ایک مقدمہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں لائے آپ نے فرمایا کہ توریت میں حکم سنگساری کا موجود ہے

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور جس کے لئے اللہ ہی کو گمراہی منظور ہو تو اس پر تیرا زور اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں چل سکتا ۱۴۸ یہی لوگ

لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ۚۖ وَّلَهُمْ فِى

وہ ہیں جن کے لئے اللہ کو منظور نہ ہوا کہ ان کے دلوں کو پاک (صاف) کرے ۱۴۹ ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ

اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے ۱۵۰ جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں حرام کے بڑے کھانے والے ہیں ۱۵۱

اسی کے مطابق سزا جاری کر دو، وہ ظالم اس سزا ہی کو چھپا گئے۔

۱۴۷ یعنی اس کے مان لینے کا اقرار نہ کرنا۔

يَقُوْلُوْنَ۔ یعنی یہ لوگ اپنے والوں سے اپنے جتھے کے لوگوں سے جنھیں یہ مجلس نبوی میں بھیجے رہتے تھے کہتے ہیں۔

هٰذَا۔ یعنی یہ حکم محرّف، اصلی اور آسمانی حکم کے بجائے اُن کا اختراعی حکم۔

فَخُذُوْهُ۔ یعنی اس کے ماننے کا اقرار کر لینا۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت سے اس شخص کی مذمت نکل رہی ہے جو اہل علم کی طرف رجوع اس غرض سے نہیں کرتا کہ مسئلہ پر عمل کرے گا، بلکہ اس امید پر کرتا ہے کہ اگر اس کی مرضی کے موافق قول مل گیا تو اسے کو اپنی بڑائی کا پرچا

۱۴۸ (کہ تو اس گمراہی کو پیدا ہونے سے روک دے اے مخاطب!)

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ۔ اس ارادۂ الٰہی کا ترتّب خود اس شخص کے عزم گمراہی پر ہوگا۔

فِتْنَتَهٗ۔ فتنہ کے یہاں کھلے ہوئے معنی ضلالت اور مغضوبی کے ہیں۔

اى ضلالة فى الدنيا وعقوبة فى الآخرة (قرطبى) اى عذاب كما روى عن الحسن وقتادة واختاره الجبائى وابو مسلم (روح) بعض نے کفر مراد لی ہے اى كفره (بحر)

مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ کے قانون تکوینی کے مقابلہ میں۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ شیخ کی شفقت و توجہ بدون فضل و توفیق الٰہی کچھ نفع نہیں دیتی۔

۱۴۹ (ان کے کفریات سے اور یہ اس لئے کہ یہ لوگ خود ہی اس کا عزم نہیں کرتے)

مطلب یہ ہوا کہ جب یہ لوگ خود اپنی اصلاح کا قصد نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس اپنی ضد پر قائم ہیں تو یہ ایک قانون الٰہی تکوینی ہے کہ بندہ کے عزم و فعل پر اُس فعل کی تخلیق بھی ہو جاتی ہے اور اس قانون تکوینی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس میں ایک طرف تو رسول اللہ صلعم کو تسکین دی گئی اور دوسری طرف معتزلہ کا رد بھی نکل آیا جو خالق افعال اللہ کو نہیں بندہ کو سمجھتے ہیں۔

۱۵۰ عذابِ آخرت کا ظہور تو آخرت ہی میں ہوگا، لیکن دنیا کے عذاب تفضیح کا ظہور اس شدت سے چند ہی روز کے اندر

فَاِنۡ جَآءُوۡكَ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ‌ ۚ

اور اگر یہ آپ کے پاس آئیں تو (خواہ) اُن کے درمیان فیصلہ کردیجئے (خواہ) انھیں ٹال دیجئے ١٥٢ؕ

ہوکر رہا کہ دوست دشمن سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، منافقین میں نفاق ایک ایک کا کھل گیا اور یہ سب خیر و ذلیل ہوئے اور یہود توان کے بڑے سے بڑے پرقوت قبیلے بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع، سب کے سب شکست کھا کر قید ہوئے یا جلا وطن ہوئے یا تہ تیغ ہوگئے۔

١٥١ سَمّٰعُوۡنَ۔ اَکّٰلُوۡنَ۔ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں یعنی یہ نہیں کہ یہ لوگ کبھی کبھی جھوٹ میں بھی پڑ جاتے اور کبھی کبھی رشوت بھی لے لیتے ہیں، بلکہ یہ دونوں وصف گویا ان کے خمیر و سرشت میں داخل ہوگئے ہیں۔

سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ۔ یہ وصف یہود کے خواص و عوام دونوں کا بیان ہوا۔ سمع میں یہاں سننے کے ساتھ کذب و باطل کا قبول کرنا بھی ہے ابھی یہ لفظ آیت ماقبل میں گزر چکا ہے، دوبارہ زور و تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔

کررہ تاکید او تعظیما (قرطبی) کرر للتاکید (مدارک)

اَكّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ۔ سُحت۔ ہر حرام خوری کے لئے عام ہے۔

السحت الحرام او ماخبث من المکاسب (قاموس) وھو کل مالا یحل کسبه (مدارک)

یہاں مراد رشوت ہے اور یہی معنی اب اس کے خاص ہوگئے ہیں۔

سمی الرشوۃ فی الحکم سحتا (تاج) سمی الرشوۃ سحتا (راغب) قال الزجاج سمیت الرشوۃ التی کانوا یاخذ ونہا بالسحت (کبیر) وفی الحدیث ھو الرشوۃ فی الحکم (مدارک) ھو الرشوۃ (ابن کثیر)

یہ وصف یہود کے خواص و اکابر کا بیان ہورہا ہے جو رشوت اور نذرانے لے لے کر غلط سلط احکام بتانے اور مسائل کے مسخ کر ڈالنے کے عادی ہوگئے تھے خود ان کی کتاب آسمانی میں ان کو عدل پر قائم رہنے اور رشوت نہ لینے کے باب میں یہ حکم ملا تھا کہ "اپنے سارے فرقوں میں قاضی اور حاکم مقرر کیجیو، وہ انصاف سے لوگوں کی عدالت کریں تو عدالت میں مقدمہ بگاڑیو تو طرفداری نہ کیجیو اور نہ رشوت لیجیو کہ رشوت دانشمندوں کی آنکھوں کو اندھا کردیتی ہے اور صادق کی باتوں کو پھیر لیتی ہے" (استثناء ١٦: ١٨ و ١٩) لیکن انہی کے بزرگوں نے تالمود میں احکام یہ جاری کردیے تھے کہ جب کسی مقدمہ میں ایک فریق اسرائیلی ہو اور دوسرا غیر اسرائیلی تو اگر اسرائیلی کے موافق فیصلہ یہودی شریعت کے مطابق ہوسکتا ہے تو یہی کردو اور کہہ دو کہ یہی ہمارا قانون ہے اور اس کے موافق فیصلہ غیر اسرائیلی قانون کے مطابق ہوسکتا ہو تو یہی کردو، اور غیر اسرائیلی سے کہہ دو کہ تمہارے ہاں کا ضابطہ یہی ہے، اور اگر ایسا فیصلہ دونوں ضابطوں میں سے کسی ضابطہ سے بھی نہ ہورہا ہو تو کسی حیلہ سے کام لو"۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت اللہ کی رحمت پر بڑی دلیل ہے کہ اس میں مذمت کو کثرت عادت معصیت پر مرتب فرمایا، سرسری خطا پر مذمت نہیں فرمائی جس سے عادۃً کوئی خالی نہیں رہتا یہی شان ہوتی ہے مشائخ اہل تربیت کی کہ خفیف امور سے تسامح کرتے ہیں۔

١٥٢ (آپ کو دونوں چیزوں کا اختیار ہے جیسی بھی آپ کو مصلحت معلوم ہو)

فَاِنۡ جَآءُوۡكَ یعنی جب یہ کوئی مقدمہ معاملے کر آپ کے پاس آئیں۔ مدینہ میں رسول اللہ صلعم اب حاکم اور دنیوی حیثیت سے بھی امیر و مقتدر تھے کچھ تو اس لئے بھی کہ یہود کو اپنے معاملات آپ کے سامنے لانے پڑتے تھے، پھر یہ بھی تھا کہ بہت سے مسائل میں شریعت محمدی شریعت یہود سے کہیں زیادہ نرم تھی، اس لالچ میں بہت سے

وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

اور اگر آپ انھیں ٹال دیں جب بھی یہ آپ کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان

بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ

(قانون) عدل کے مطابق فیصلہ کریں ۱۵۳ بے شک اللہ عدل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ۱۵۴ اور آپ سے یہ کیسے فیصلہ کراتے ہیں

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

دراں حالیکہ اُن کے پاس توریت موجود ہے ۱۵۵ اور اس میں اللہ کا حکم (درج) ہے ۱۵۶ پھر اس کے بعد ہٹ جاتے ہیں ۱۵۷

یہود مدینہ اپنے قضیے فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلعم ہی کی خدمت میں لایا کرتے تھے، فیصلہ واجب امیر اسلام پر تو ذمیوں ہی کے درمیان ہے، دوسرے کافروں کے لئے واجب نہیں، صرف جائز ہے، حسب ضرورت و مصلحت۔

ھذا التخییر من اللہ تعالی ولا یجب علینا الحکم بین الکفار اذا لم یکونوا اھل ذمۃ بل یجوز الحکم ان اردنا (قرطبی) ھذا التخییر مختص بالمعاھدین الذین لا ذمۃ لھم (کبیر)

۱۵۳ (اور وہ قانونِ عدل اب منحصر ہے قانونِ اسلام میں)

وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ۔ آپ کا یہ ٹالنا بھی کسی مصلحت دینی ہی کے ماتحت ہوتا۔

فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا۔ اس لئے آپ اندیشہ نہ کریں کہ ناخوش ہو کر یہ لوگ آپ سے دشمنی نکالیں گے۔

بالقسط ای بالعدل الذی امرت بہ وھو ما تضمنہ القرآن واشتملت علیہ شریعۃ الاسلام (روح)

اختیار آپ کو اس بارے میں تو دیا گیا تھا کہ کافروں کے درمیان فیصلہ فرمائیں یا نہ فرمائیں لیکن فیصلہ اگر کیا جائے تو قطعی ہے کہ قانونِ شریعت ہی کے ماتحت کیا جائے، اس کا اختیار نہیں کہ فیصلہ کسی اور قانون کے مطابق کر دیا جائے۔

۱۵۴ (اور اللہ جن کے ساتھ محبت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ انھیں توفیق بھی حق پر قیام کی دیتا ہے گا)

یہاں یہ یاد دلا دیا گیا ہے کہ وہ لوگ کیسے ہی اہل جور ہوں، آپ بہر حال اُن کے معاملہ میں بھی طریق حق و عدل سے ذرا تجاوز نہ کیجئے

بالقسط ای بالحق والعدل وان کانوا ظلمۃ خارجین عن طریق العدل (ابن کثیر)

۱۵۵ (جس کا کتابِ الٰہی ہونا انھیں مسلّم ہے)

كَيْفَ۔ کلمۂ تعجب ہے یعنی اظہار حیرت اس پر ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب آسمانی رکھنے کے باوجود ہر کسی معاملہ میں فیصلہ کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں!

تعجیب من تحکیمھم من لا یؤمنون بہ والحال ان الحکم منصوص علیہ فی الکتاب الذی ھو عندھم (بیضاوی) تعجیب من تحکیمھم (کشاف)

اوپر کسی حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ یہود کا رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہونا معرفتِ حق کے لئے تو ہوتا نہ تھا، بلکہ کہیں اپنے مطلب اور اپنی غرض کے لئے ہوتا کہ شاید کوئی آسان تر حکم مل جائے۔

وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ

اور یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ۱۵۸ بے شک ہم ہی نے توریت نازل کی ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے ۱۵۹

[illegible] على انهم ما قصدوا بالتحكيم معرفة الحق واقامة الشرع وانما طلبوا به ما يكون اهون عليهم وان لم يكن حكم الله تعالى فی زعمهم (بیضاوی)

۱۵۶ جس خاص حکم کا یہ ذکر برابر چل رہا ہے اور یہود نے اسے رسول اللہ صلعم سے چھپا ڈالنا چاہا تھا وہ حکم رجم یا سنگ ساری ہے اور قرآن کے اعجاز کے لئے یہ دلیل بھی بجائے خود کافی اور قوی ہے کہ یہود کی ہزار کوشش اخفاء کے باوجود شادی شدہ زناکاروں کے لئے حکم قتل ورجم کسی نہ کسی صورت میں آج تک توریت میں باقی ہے اور موجودہ توریت سے ہیہم تحریفات بھی اسے یکسر اور تمام تر دور نہ کر سکیں، چند حوالے ملاحظہ ہوں:۔

"اور وہ شخص جو دوسرے کی جورو کے ساتھ یا اپنے پڑوسی کی جورو کے ساتھ زنا کرے، وہ زنا کرنے والا اور زنا کرنے والی دونوں قتل کئے جائیں۔" (احبار۔ ۲۰: ۱۰) "اور وہ مرد یا عورت جس کا یار دیو ہے یا جادوگر ہو تو دونوں قتل کئے جائیں اور چاہئے کہ تم ان پر پتھراؤ کرو، اُن کا خون بھی اُن ہی پر ہوئے۔" (احبار۔ ۲۰: ۲۷) "اگر کوئی جورو کرے اور اس سے خلوت کرے اور کہے کہ میں نے اس عورت سے بیاہ کیا، جب میں اس کے پاس گیا تو میں نے اسے کنواری نہ پایا، اگر یہ بات سچ نکلے اور لڑکی کے کنوارے پن کی نشانیاں باقی نہ پائیں تو وہ اس لڑکی کو اس کے ماں باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں اور اس کی بستی کے لوگ اس پر پتھراؤ کریں کہ وہ مر جائے۔" (استثناء۔ ۲۰: ۱۳۔ ۲۱) "اگر کوئی مرد شوہر والی عورت سے زنا کرتے پایا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں، مرد جس نے اس عورت سے صحبت کی اور عورت بھی۔" (استثناء ۲۲: ۲۲)

اور انجیل کے واسطہ سے جو گواہی پہنچی ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ کھلی ہوئی ہے:۔

"فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا کہ اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے، توریت میں موسیٰؑ نے ہم کو حکم دیا کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں، پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے؟" (یوحنا ۸: ۶۔ ۶)

۱۵۷ پہلے تو خود ہی فیصلہ کرانے کے لئے رسول کی خدمت میں آئے، اور جب فیصلہ سن لیا تو اس سے ہٹ بھی گئے۔ ثُمَّ۔ تعجب میں ترقی کے لئے ہے، یعنی حیرت بالائے حیرت کے اظہار کے لئے۔

ثم للتراخی فی الرتبة (روح) تصريح بما علم لتاكيد الاستبعاد والتعجب۔ (روح)

۱۵۸ ان کے اس طرز عمل نے ظاہر کر دیا کہ ان کا ایمان قرآن و صاحب قرآن پر تو کیا ہوتا، توریت و صاحب توریت پر بھی کامل و محکم نہیں

مومنين بك او بكتابهم كما يدعون (مدارك) مؤمنين بكتابهم كما يدعون۔ (کشاف)

۱۵۹ یعنی جلی احکام الٰہی درج ہیں۔
هُدًى۔ یعنی عقائد اور مسائل سے متعلق ہدایات و احکام تھے۔
نُوْرٌ۔ یعنی وضوح تھا احکام عمل سے متعلق۔
التَّوْرٰىةَ پر حاشیہ سورۂ آل عمران کے شروع میں گزر چکا۔

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ

اسی کے مطابق وہ نبی جو اللہ کے مطیع تھے یہودی لوگوں کا فیصلہ کرتے تھے اور (اسی طرح) ان کے مشائخ و

وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ

علماء (بھی) ۱۶۰ اس لئے کہ انھیں کتاب اللہ کی نگہداشت کا حکم دیا گیا تھا ۱۶۱ اور وہ اس کے گواہ تھے ۱۶۲

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ. اس میں رد آگیا یہود کے موجودہ عقیدہ کا کہ توریت صاحب الہام انبیاء کی مرتب کی ہوئی ایک انسانی کتاب ہے، توریت اسلامی عقیدہ کے مطابق خدا کے ہاں سے نازل شدہ کتاب ہے، سوا اس صورت کے کہ خود لفظ "انزال" میں اتنی وسعت اور لچک پیدا کر دی جائے کہ خالص وحی الٰہی کا درجہ پیغمبروں کے کشف و الہام کو بھی دے دیا جائے۔

۱۶۰ مقصود توریت کی اہمیت و شرف کا اظہار ہے، یہ وہ کتاب الٰہی ہے جو پچھلی صدیوں میں معیار حق و عدل رہی ہے، علماء و مشائخ و انبیاء بنی اسرائیل کے لئے۔

النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا. یہود کی اصطلاح میں "نبوت" اسلامی نبوت سے بالکل الگ ایک مفہوم رکھتی ہے، ان کے ہاں یہ ہرگز ضروری نہیں کہ نبی کا تعلق اللہ کے ساتھ جڑا ہوا اور مستحکم ہو یا نبی کی نسبت مع اللہ قوی ہو، وہ "نبی" یا "نبوت" کے قائل صرف ان الفاظ کے لفظی معنی میں تھے، نبی ان کے ہاں پیش گوئی کرنے والا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ صاحب کشف بھی تھا جیسے مشرک قوموں میں کاہن ہوتے تھے، خود یہود کے ہاں نبی اور کاہن کی اصطلاحیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ عہد عتیق میں ذکر ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر جعلی اور جھوٹے نبیوں کا آیا ہے، جو کفر و شرک کی دعوت دینے والے تھے، صرف چند بطور نمونہ کے ملاحظہ ہوں:۔

"اگر تمہارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمہیں کہے، آؤ ہم غیر معبودوں کی جنھیں تم نے نہیں جانا، پیروی کریں، تو ہرگز اس نبی یا خواب دیکھنے والے کی بات پر کان مت دھریو، وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا۔" (استثناء۔ ۱۳: ۱-۳ و ۵) "وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔" (استثناء ۱۸: ۲۰-۲۲) "انبیاء میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں، میں نے انھیں نہیں بھیجا اور حکم نہیں دیا، نہ انھیں کہا، یہ نبی تلوار اور کال سے ہلاک کئے جائیں گے۔" (یرمیاہ ۱۴: ۱۳: ۱۶)

قرآن مجید نے ان ہی عقائد کے مد نظر الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا کی قید لگا کر بتا دیا کہ النَّبِيُّوْن سے مراد جھوٹی اور شیطانی نبوت کرنے والے نہیں، بلکہ سچے اور وحی الٰہی سے مشرف نبی ہیں۔

الرَّبّٰنِيُّوْن. مراد اہل اللہ و مشائخ و علماء باطن ہیں۔

العلماء الحکماء (قرطبی) الربانیون فوق العلماء (قرطبی)

الْاَحْبَار. مراد علماء ظاہر و فقہاء ہیں۔

قال ابن عباس ہم الفقہاء (قرطبی) الحبر الرجل العالم وہو ماخوذ من التحبیر وہو التحسین فہم یحبرون العلم ای یبینونہ ویزینونہ (قرطبی)

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ

سو تم انسانوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو ۱۶۳ اور میرے احکام کو دنیا کی متاعِ قلیل کے عوض نہ بیچ ڈالو ۱۶۴

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو کافر ہیں ۱۶۵

لِلَّذِیْنَ ھَادُوْا۔ میں لِ عَلٰی کے معنی میں ہے۔

اللام بمعنی علی ای علی الذین ھادوا۔ (بحر)

لِ بیانیہ بھی سمجھا گیا ہے، اور تقدیرِ کلام یوں سمجھی گئی۔ لاجل الذین ھادوا۔

واللام لبیان اختصاص الحکم بھم کانہ قیل لاجل الذین ھادوا۔ (روح)

۱۶۱ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ توریت حفاظت اور عملدرآمد کے لئے اکابر یہود کی سپردگی میں دیدی گئی تھی۔

اُسْتُحْفِظُوْا۔ استحفاظ کے معنی ہیں کسی سے سوال کرنا کہ وہ حفاظت و نگہداشت رکھے۔

ای بسبب ما طلب اللہ منھم حفظھم لکتاب اللہ وکلفھم حفظھا واخذ عھدہ علیھم فی العمل بھا والقول بھا (بحر)

مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ۔ میں مِنْ بیانیہ ہے۔

من للتبیین۔ (بیضاوی)

بِمَا میں بِ سببیہ ہے۔

الباء فی بما للسبب۔ (بحر)

۱۶۲ گواہ اس امر کے کہ یہ کتاب، کتابِ الٰہی ہے، اور محافظ اس کے متن و عبارت کے۔

ای علی الکتب بانہ من عند اللہ (قرطبی) کانوا علیہ رقباء لئلا یتبدل (بحر) رقباء لا یترکون ان یغیر (بیضاوی) شھداء علی ان کل ما فی التوراۃ حق وصدق ومن عند اللہ۔ (کبیر)

۱۶۳ (کہ میں انکارِ حق پر ہر سزا پر قادر ہوں)

خطابِ قرآن اپنے معاصر مقتدایانِ یہود سے کر رہا ہے۔

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ خلقت سے ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے حسبِ منشاء توریت نبوتِ محمدیؐ کی تصدیق کردی تو ہمارے عوام ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے، رؤساء و اکابرِ یہود کے لئے قبولِ حق یا تصدیقِ محمدیؐ سے پہلا مانع یہی حبِ جاہ تھا، یہ سراسر بیجا تھا۔

۱۶۴ (اور یہ نذرانے وغیرہ جو عوام سے حاصل ہوتے ہیں، ان کے بند ہوجانے کا ڈر دل سے نکال ڈالو۔)

مقتدایانِ یہود کو قبولِ حق و تصدیقِ اسلام سے پہلا مانع تو حبِ جاہ تھا جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے اور دوسرا مانع یہ حبِ مال تھا۔

۱۶۵ (کہ غیر شرعی احکام کو شرعی احکام قرار دے رہے ہو اور انسانی قانون کو خدائی قانون کہہ کر چلا رہے ہیں)

مقتدایانِ یہود کا اصلی اور سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ اپنے گڑھے ہوئے قانون اور مسائل کو خدائی قوانین و مسائل کہہ کر چلاتے تھے فتوے خود اور اپنی طرف سے دیتے اور کہتے کہ یہی دینی مذہب کا حکم ہے اور یہی تفسیر بعض اکابرِ تابعین سے منقول ہے

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ ٱلنَّفْسَ بِٱلنَّفْسِ وَٱلْعَيْنَ بِٱلْعَيْنِ

اور ہم نے اُن پر اس میں یہ فرض کر دیا تھا ۱۶۶ کہ جان کا بدلہ جان ہے، اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا

وَٱلْأَنفَ بِٱلْأَنفِ وَٱلْأُذُنَ بِٱلْأُذُنِ وَٱلسِّنَّ بِٱلسِّنِّ

ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت ۱۶۷

کفر کی دفعہ اگر کسی غیر خدائی قانون کے مطابق فیصلہ کرنے والے مسلمان پر عائد ہوگی بھی تو صرف اس صورت میں جب وہ بیّن وصریح حکم کی خلاف ورزی دیدہ و دانستہ کرے، نہ اس وقت جب کہ حکم کی دلالت ہی خفی ہو اور غلط تعبیر وہ نادانستہ یا غیر شعوری طور پر کر رہا ہو۔

قال العلماء هذا اذا رد نص حكم الله عيانا عامدا فاما من خفى عليه او اخطأ فى تاويل فلا (معالم)

عکرمہ تابعی نے کہا ہے اور امام رازیؒ نے بھی اس قول کی تصویب کی ہے کہ جب تک کوئی کسی حکم الٰہی کو دل سے مان رہا ہے اور زبان سے اس کا اقرار کر رہا ہے، اس وعید کے تحت میں آ کیوں کر سکتا ہے؟ عمل اس کا اس کے مخالف بھی ہو، جب بھی وہ محض عاصی یا تارک کہا جائے گا نہ کہ منکر یا باغی۔

قال عكرمة قوله ومن لم يحكم بما انزل الله انما يتناول من انكر بقلبه وجحد بلسانه اما من عرف بقلبه كونه حكم الله واقر بلسانه كونه حكم الله الا انه اتى بما يضاده فهو حاكم بما انزل الله تعالى ولكنه تارك له فلا يلزم دخوله تحت هذه الآية وهذا هو الجواب الصحيح. (كبير)

اس خاص مسلک میں خارجیوں کے مذہب کی ہمارے زمانہ میں پھر زبردست تجدید شروع ہوئی ہے بڑے بڑے خوشنما القاب و خطابات کے ساتھ، اور اس دعایۃ میں خاص کام اسی آیت سے لیا جاتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ آیت کی تفسیر مذہب اہل سنّت کے مطابق ذرا تفصیل سے کر دی جائے۔

۱۶۶ (قتلِ عمد یا دانستہ ضرب رسانی کی صورت میں)

عَلَيْهِمْ۔ ضمیر یہود کی طرف ہے، ذکر اُن ہی کا برابر چل رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک دلیل اس امر کی ہے کہ مَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ کا تعلق بھی یہود ہی سے ہے۔

فِيهَا۔ میں ضمیر متفقہ طور پر توریت کی جانب ہے۔

وَكَتَبْنَا۔ سے اس کی صراحت ہو گئی کہ توریت کی تعزیرات اللہ ہی کی مقرر کی ہوئی ہیں۔

۱۶۷ موجودہ توریت میں اتنے تحریفی انقلابات کے بعد بھی یہ حکم ان الفاظ میں موجود رہ گیا ہے:۔

"اگر وہ اس صدمہ سے ہلاک ہو جائے تو تو جان کے بدلے میں جان لے اور آنکھ کے بدلے میں آنکھ، دانت کے بدلے دانت، اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم، اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔" (خروج ۲۱: ۲۳۔ ۲۵) "اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگا دے سو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اُس سے ایسا ہی کیا جائے۔" (احبار ۲۴: ۲۰) "اور تیری آنکھ مروت نہ کرے

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۖ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۖ وَمَنْ لَّمْ

اور زخموں میں قصاص ہے ۱۶۸ سو جو کوئی اسے معاف کر دے تو وہ اس کے حق میں کفارہ ہو جائے گا ۱۶۹ اور جو

يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ

کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ تو ظالم ہیں ۱۷۰ اور ہم نے ان کے

بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪

پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا تصدیق کرنے والے اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کے ۱۷۱

جان کا بدلہ جان آنکھ کا بدلہ آنکھ دانت کا بدلہ دانت ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا۔" (استثناء ۱۹: ۲۱)

۱۶۸ (رضائے الٰہی کے لئے یا اپنی ہی غرض سے)

بِهٖ۔ اس کو یعنی اس قصاص کو، اس بدلہ لینے کے حق کو۔

ای تصدق بالقصاص (قرطبی)

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ سے مراد ہے کہ زخم بھی قصاص ہیں۔

ای ذات قصاص (بیضاوی) ای مقتص (قرطبی ای یقتص فیها (جلالین)

۱۶۹ یعنی موجب اجر و ثواب اور اس معاف کر دینے والے کے گناہوں کے دور ہونے کا باعث بن جائے گا۔

هُوَ۔ یعنی یہ معاف کر دینا، یہ اپنے جائز حق سے دست برداری۔

لَهٗ۔ یعنی اس معاف کر دینے والے کے حق میں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ترغیب ہے عفو کی اور یہ اہل اللہ کی عادات میں داخل ہے۔

۱۷۰ (اپنے حق میں)

یعنی بہت برا کام کرنے والے ہیں یہود کا ذکر اب بھی چلا جا رہا ہے پہلے ذکر یہ تھا کہ ان کے اکابر و مشائخ اپنی طرف سے ایک فتوے گڑھ کر دے دیتے ہیں اور اسے شریعت الٰہی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں ایسے لوگ اپنی اس حرکت سے یقیناً کافر ہو جاتے ہیں فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اب ذکر انہی یہود کا ہے کہ یہ اجرائے حدود قصاص میں احکام شریعت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، تو یہ اپنے ہی اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ واولٰئك هم الظّٰلمون۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۶۵

۱۷۱ یہ تصدیق خود موجودہ محرف اور مسخ شدہ انجیل میں حضرت مسیح کی زبان سے موجود ہے:۔

• "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔" (متی ۵: ۱۷)

اٰثَارِهِمْ۔ میں ضمیر انبیاء اسرائیل کی جانب ہے۔

ای النبیین الذین اسلموا من قبلك یا محمدؐ۔ (ابن جریر)

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ۔ یعنی ہم نے ان کے نقش قدم پر پیچھے پیچھے بھیجا، ان الفاظ میں اشارہ اس جانب بھی ہو گیا کہ

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ

اور ہم نے انھیں انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے ۱۷۲ تصدیق کرنے والی اپنے قبل کی کتاب یعنی توریت

التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ

کی ۱۷۳ اور پرہیزگاروں کے لئے ایک ہدایت اور نصیحت ۱۷۴ اور اہل انجیل پر بھی لازم ہے کہ اللہ نے جو کچھ

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤىِٕكَ

اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں ۱۷۵ اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ

هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا

نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں ۱۷۶ اور ہم نے آپ پر (یہ) کتاب اُتاری ہے سچائی کے ساتھ تصدیق

بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ

کرنے والی ان کتابوں کی جو اس سے پیشتر اُتر چکی ہیں اور ان پر محافظ ۱۷۷

حضرت مسیح اسی طرح کے نبی تھے جیسے کہ ان کے قبل بنی اسرائیل میں اور نبی ہو چکے تھے' ان کی شخصیت اور اُن کی وحی دوسرے انبیاء کی شخصیت اور وحی سے کچھ مختلف نہ تھی۔

۱۷۲ قرآن مجید بار بار یہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نامی کوئی کتاب وحی یا الہام کی گئی تھی اب یہ کتاب دنیا کی نظروں سے معدوم ہے اور آئندہ کے کسی اسلامی محقق کا کام یہ پتہ لگانا ہے کہ آخر یہ کتاب آسمانی ہوئی کیا؟ اور کب اور کیسے غائب ہو گئی؟ عہد نامہ جدید جسے عوام انجیل کا مرادف سمجھتے ہیں' اس کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویدار تو کوئی بھی نہیں' نہ عیسائی نہ غیر عیسائی' وہ تو حضرت عیسیٰؑ کے کچھ ملفوظات اور کچھ حالات ہیں' آپ کے بہت بعد کچھ مجہول الحال لوگوں کے لکھے ہوئے۔

هُدًى یعنی عقائد و مسائل صحیحہ۔

نُوْرٌ۔ یعنی واضح احکام عملی۔

۱۷۳ انجیل کی اصطلاح میں "شریعت" (LAW) سے مراد شریعت موسوی یا توریت ہوتی ہے اور اس کی بابت موجودہ انجیل میں یہ تصریح موجود ہے کہ "آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے ہٹ جانے سے آسان ہے" (لوقا ۱۶: ۱۷)

۱۷۴ یعنی نفع اس سے صرف پرہیزگار ہی اٹھائیں گے ورنہ ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب اُس ملک اور زمانہ کے عام و خاص سب ہی تھے۔

۱۷۵ خود انجیل مروجہ کی تعلیم اس سلسلہ میں یہ ہے:۔

"جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا' اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا' لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور اُن کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔" (متی ۵: ۱۹)

مگر ایک لطیفہ یہ ہے کہ موجودہ "انجیل" میں احکام قانونی کا حصہ بس برائے نام ہی ہے، فوجداری اور دیوانی کے قانون کے بیسیوں باب سرے سے خالی ہیں، ان کے بجائے اخلاقی وعظ البتہ ملتے ہیں۔

فقہاء نے یہاں سے یہ نکتہ بھی اخذ کیا ہے کہ پچھلی شریعتوں سے جو حصہ منسوخ نہیں ہوا ہے وہ اس معنی میں اب بھی واجب العمل ہے کہ وہ اب یعنی ہماری شریعت کا جزو بن گیا، اور اسی میں شامل ہو گیا ہے۔

فیہ دلالۃ علی مالم ینسخ من شرائع الانبیاء المتقدمین فھو ثابت علی معنی انہ صار شریعۃ النبی صلعم (جصاص) انھم مامورون باستعمال احکام تلک الشریعۃ علی معنی انھا قد صارت شریعۃ للنبی علیہ السلام (جصاص)

۱۷۶ ظاہر ہے کہ آیت کا خاص تعلق اہل انجیل ہی سے ہے، مسیحیوں ہی کو حکم مل رہا ہے کہ جب دعوی انجیل کے ماننے کا ہے تو عمل بھی اُسی کتاب الٰہی کے مطابق وماتحت ہونا چاہیے۔

وقد تقدم ان ھذہ الآیۃ نزلت فی النصاری وھو ظاھر من السیاق (ابن کثیر) امر القسیسین والرھبان ان یحکموا بما فی الانجیل (معالم) قال الاصم فی النصاری (کبیر)

آیت کو آج مسلمانوں پر چسپاں کرنا خوارج کی دعایت کا نادانستہ یا دانستہ شکار ہو جانا ہے۔

۱۷۷ (اے پیغمبر!)

توریت وانجیل کے بعد اب ذکر قرآن مجید کا شروع ہو رہا ہے۔

بِالْحَقِّ۔ یعنی ایسی کتاب جو بجائے خود سچی ہے، ہر شک وکذب سے برتر۔

ای بالامر الحق (قرطبی) یعنی بقولہ بالحق بالصدق ولا کذب فیہ ولاشک انہ من عند اللہ۔ (ابن جریر)

مِنَ الْكِتٰبِ۔ کتاب بطور اسم جنس آیا ہے۔

من جنس الکتاب (قرطبی)

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ۔ تصدیق کرنے والی ان پچھلی کتابوں کی کہ وہ بھی منزّل من اللہ ہی ہیں، اس تصدیق سے اُن کتابوں کی تحریفات وتصحیفات کی تصدیق ہرگز لازم نہیں آتی۔

مُهَيْمِنًا۔ مہیمن کے لفظی معنی ہیں حفظ ونگہبانی کرنے والا۔

اصل الھیمنۃ الحفظ والارتقاب (ابن جریر)

مُراد یہ کہ قرآن ہی سب اگلی کتابوں کے لئے معیار صحت وصداقت ہے۔

شھیدا علی الکتب کلھا ویقال امینا علی الکتب (ابن عباس) مؤتمنا علیہ (ابن جریر عن ابن عباس)

قال قتادۃ معناہ الشاھد وقیل الحافظ (قرطبی) قال بعضھم معناہ شھیدا ــــــــــــ

وقال بعضھم معناہ امینا علیہ (ابن جریر عن ابن عباس) ای شاھدا علیہ وھو قول مجاھد وقتادۃ والسدی والکسائی (معالم) قال سعید بن جبیر وابو عبید مؤتمنا علیہ (معالم)

محقق ابن کثیر نے "حاکم" اور "امین" اور "شہید" اور "موتمن" وغیرہ متعدد معنی نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ سب قریب المعنی ہیں اور مُهَيْمِن کا مفہوم ان سب پر شامل ہے، اور قرآن سب کتابوں کی خاتم اور سب سے اکمل واعظم واجمع ہے۔

ھذہ الاقوال کلھا متقاربۃ المعنی فان اسم المھیمن یتضمن ھذا کلہ فھو امین وشاھد وحاکم علی کل

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ

تو آپ ان لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ کیا کیجئے اور ان لوگوں کی خواہشوں پر عمل

مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ

نہ کیجئے ۱۷۹؎ اس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے پاس آچکی ہے ۱۸۰؎ تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی تھی ۱۸۱؎

لکتاب فلہ جعل اللہ ھذا الکتاب العظیم الذی انزلہ اخر الکتب وخاتمھا اشملہا واعظمہا واکملہا۔ (ابن کثیر)

مجاہد تابعی کی جانب منسوب ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ مہیمن سے مراد ذات محمدیؐ ہے اور علیہ میں ضمیر قرآن (الکتاب) کی طرف ہے گویا محمد صلعم قرآن پر بطور مہیمن کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی نقل میں کہیں غلطی ہوگئی ہے' امام ابن جریر لکھتے ہیں کہ یہ معنی تو قواعد عربیت کے لحاظ سے غلط ہیں' اگر یہی مراد ہوتی تو مصدقا اور مھیمنا کے درمیان واو عطف نہ ہوتا' عطف کے بعد دونوں صفتیں ایک ہی موصوف' قرآن کی ہو سکتی ہیں۔

وھذا التاویل بعید من المفھوم فی کلام العرب بل ھو خطأ وذلک ان المھیمن عطف علی المصدق فلا یکون الا من صفۃ ما کان المصدق صفۃ لہ۔ (ابن جریر)

قرآن مجید کی دو صفتیں پہلے بیان ہو چکی تھیں ایک یہ کہ وہ بذات خود صحیح اور سچا ہے' دوسرے یہ کہ وہ قبل کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے' تیسری صفت مہیمن کی اب بیان ہوئی' مصدق و مہیمن ان دو صفات کے لانے سے قرآن مجید کی دو حیثیتوں کو بیان کرنا ہے' ایک یہ کہ سابق کتابوں کے کل مضمون اس کے اندر آگئے' اور اس میں جمع و محفوظ ہیں' دوسرے یہ کہ قرآن ان کتابوں پر بطور نگراں کے کام دے گا' یعنی ان کی تحریفات و تصحیفات کے لئے معیار کا کام بھی دے گا (جیسا کہ اب تک بھی نہیں کیا ہے)

۱۷۸؎ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق جو اب سب کے سب قرآن میں محفوظ ہیں۔

ای بما فی القرآن (مدارک)

بَيْنَهُمْ۔ یعنی اہل کتاب کے درمیان' جب کہ ان کے معاملات آپ کے سامنے پیش ہوں۔

ای بین الیھود (کبیر) ای بین اھل الکتاب کما قال ابن عباسؓ۔ (روح)

۱۷۹؎ (اور وہ سچائی وحی الٰہی کی روشنی ہے قرآن کے اندر ہو یا اس کے باہر)

ای بالقرآن والوحی الذی نزلہ اللہ تعالٰی علیک (کبیر) المراد سائر الاحکام (روح)

۱۸۰؎ خطاب عام ہے' نوع انسان بھی مراد ہو سکتی ہے' اور اہل کتاب بھی۔

ایھا الناس (مدارک۔ بیضاوی) ایھا الامم الباقیۃ (روح)

شِرْعَةً سے مراد ہر نبی کی لائی ہوئی تعلیم یا کتاب ہے' اور منہاج اس پیمبر کا تعامل یا سنت ہے' گویا یہ بتا دیا کہ کتاب و سنت کی دو گونہ نعمت قدیم موحد قوموں کے حصہ میں بھی ودیعت رہی ہے۔

عن ابن عباسؓ سبیلا وسنۃ وکذا روی عن مجاهد وعکرمہ وحسن البصریؒ وقتادۃ والضحاک والسدی (ابن کثیر)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ

اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی امت بنا دیتا ۱۸۱؎ لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ تمہیں

مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

آزماتا رہے اس میں جو وہ تمہیں دیتا رہا ہے تو تم نیکیوں کی طرف لپکو ۱۸۲؎

ایک قول یہ بھی ہے کہ شرعۃ سے مراد مطلق شریعت ہے اور منہاج سے مراد کمالاتِ شریعت۔

قال اخرون بینهما فرق فالشرعة عبارة عن مطلق الشريعة والطريقة عبارة من مكارم الشريعة وهو المراد بالمنهاج فالشريعة اول والطريقة اخر وقال المبرد الشريعة ابتداء الطريقة، والطريقة المنهاج المستمر (کبیر)

۱۸۱؎ (اور آپس میں کوئی دینی اختلاف باقی ہی نہ رکھتا سب کے سب دینِ حق پر متحد و متفق ہوتے)

ای فجعل شریعتکم واحدۃ وکنتم علی الحق (قرطبی) فجمع الناس کلهم علی دین واحد وشریعۃ واحدۃ۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ یعنی اگر مشیتِ تکوینی یہی ہوتی، اگر اللہ تعالیٰ کو مصالحِ تکوینی کے اعتبار سے یہی منظور ہوتا (ابن کثیر) مخاطبت یہاں ساری نوعِ انسانی یا مختلف اقوام سے ہے۔

هذا خطاب لجميع الامم واخبار عن قدرته (ابن کثیر)

۱۸۲؎ یعنی قانونِ اسلام کی طرف، جو نام ہی نیکیوں اور بھلائیوں کے تسلسل کا ہے۔

اَلْخَيْرَاتِ۔ خیرات کا لفظ جامع ہے، اس کا اطلاق نیکیوں کے جملہ اقسام پر ہوگا۔

المراد کل ما امر اللّٰه تعالٰی به (مدارک)

یہاں جبر و اختیار، خیر و شر کے پورے فلسفہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے، ارشاد یہ ہے کہ اگر حکمتِ مطلقہ کا تقاضہ یہ ہوتا کہ سب کو یکساں راہِ حق ہی پر رکھا جاتا تو تکوینیات کے قانون ہی دوسرے ہوتے، نہ یہ اختلافِ عقول باہم باقی رکھا جاتا، نہ یہ اختلافِ طبائع، نہ یہ اختلافِ استعدادات، سب انسان اختلافِ احوال کے باوجود یکساں یک گمد ہوتے، بظاہر سب حق پر ہوتے، لیکن حقیقۃً سب بے ارادہ بے اختیار مجبور مشین کی طرح حرکت کرتے رہتے، لیکن مشیتِ تکوینی کو یہ منظور ہی نہ ہوا، اس لئے انسان کی خلقت و ترکیب ہی دوسرے طریق پر ہوئی، وہ فاعل مختار و با ارادہ بنا کر بھیجا گیا کہ اپنے قصد و ارادہ سے کام لے کر ایک راستہ کو چھوڑ، دوسرے کو انتخاب کر سکے۔

لِّيَبْلُوَكُمْ۔ اس میں انسان کے صاحبِ ارادہ و اختیار ہونے کی غایت و مقصود کی جانب اشارہ ہو گیا، حق کا باطل سے، صالح کا فاسد سے، خیر کا شر سے انتخاب ہی ارادہ و اختیار کا صحیح استعمال ہے اور یہی ہے انسان کی آزمائش۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ یعنی طاعتوں کی طرف قدم بڑھاؤ، لپکو۔

ای سارعوا الی الطاعات (قرطبی)

فقہاء نے لفظ استباق سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ عباداتِ واجبہ میں عجلت کرنا تاخیر سے افضل ہے۔

وهذا یدل علی ان تقدیم الواجبات افضل من تاخیرها (قرطبی حصص)

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٤٨﴾

اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے تو وہ تمہیں وہ بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو ۱۸۳

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ

اور آپ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے رہئے اسی (قانون) کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے اور اُن کی خواہشوں پر

وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِن

عمل نہ کیجئے ۱۸۴ اور ان لوگوں سے احتیاط رکھئے کہ کہیں یہ آپ کو بچلا نہ دیں آپ پر اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے ۱۸۵

تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ

پھر اگر یہ روگردانی کریں تو جان لیجئے کہ اللہ کو بس یہی منظور ہے کہ ان کے بعض جرموں پر انہیں پاداش کو پہنچا دے ۱۸۶

۱۸۳ (باوجود وضوحِ حق کے، اور جزا بھی اسی کے مطابق دے گا)
مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا. سب کی واپسی اُسی کے حضور میں ہونا اور اُسی سے سابقہ پڑنا ہے اس میں رد آگیا ان تمام مشرکانہ خیالات کا، جن کا ماحصل یہ ہے کہ حشر کی داوری بجائے حق تعالیٰ کے کسی اور کے سپرد ہوگی۔
فَيُنَبِّئُكُمْ. خبر دینا یہاں محض اطلاع دینے کے معنی میں نہیں بلکہ جزا دینے پر بھی شامل ہے۔
ای یفعل بکم من الجزاء الفاصل بین المحق والمبطل (روح) فالانباء ھنا مجاز عن المجازاۃ بما فیھا من تحقق الامر۔ (مدح)

۱۸۴ (اے پیغمبر!)
فَاحْكُم بَيْنَهُم. یعنی اُن اہلِ کتاب خصوصاً یہود کے درمیان فیصلہ کیجئے، جب وہ اپنا مقدمہ آپ کے سامنے لائیں، آیت کا یہ ٹکڑا ابھی اوپر آچکا تھا، دوبارہ اس کا ورود تاکید کے لئے ہے۔
وتکرر بزواد احکم بینھم بما انزل اللہ للتاکید (قرطبی)
بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ. سے مراد قرآن مجید ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن اگر توریت و انجیل ہی مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان کتابوں کے بھی ٹھیک الہامی اور وحی شدہ احکام کے مطابق ہی فیصلہ کیجئے، نہ کہ اُن کے اضافوں اور تحریفوں کے مطابق جو انھوں نے اپنے دل سے ان کتابوں میں کر لئے ہیں۔
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ. اس جزو آیت کی تکرار صرف ظاہری ہے، حقیقی نہیں کہ حکم دو مختلف مسئلوں کے بارہ میں ہے۔
لیس بتکرار لما تقدم من مثلہ لانھما نزلا فی شیئین مختلفین احدھما فی شان الرجم والآخر فی التسویۃ بین الدیات (جصاص)

۱۸۵ اس حد تک التزام اور اتنی احتیاط کا اہتمام برابر کرتے رہنا بقول مفسر تھانویؒ خود باعثِ اجر ہے۔
أَن يَفْتِنُوكَ. رسول معصوم کا کسی حکم الٰہی سے بچلنا قصد و عمد سے تو ہو ہی نہیں سکتا، لامحالہ سہو و نسیان ہی کی بنا پر ہوگا، اور یہیں سے ہے کہ آیت سے بعض محققین نے پیغمبر کے لئے جوازِ نسیان پر استدلال کیا ہے۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ

اور یقیناً زیادہ آدمی تو بے حکم ہی ہوتے آئے ہیں ۱۸۸ تو کیا یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں ۱۸۹

وفی الآیۃ دلیل علی جواز النسیان علی النبی صلعم (قرطبی) قال اہل العلم ہذہ الآیۃ تدل علی ان الخطاء والنسیان جائزان علی الرسول (کبیر)

۱۸۶ (اسی دنیا میں)

بَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ۔ جرموں سے یہاں مُراد یہود کا فیصلۂ قرآنی اور تحکیم رسول سے انکار ہے۔

یرید به التولی عن حکم الله سبحانه وتعالی (بیضاوی)

حقیقت یہ نظر ہے کہ کفر یا محض بدعقیدگی کی سزا آخرت پر رکھی گئی ہے لیکن جو بیت یا دنیا میں فتنہ و فساد پھیلانے کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔ چنانچہ یہود کو قید کی، جلاوطنی کی اور قتل کی سزائیں پانے سے اسی دنیا میں دیکھ لیا۔ بَعْضِ۔ کا لفظ لانے سے اظہارِ عظمت واہمیت مقصود ہے، جیسا کہ لفظ کے نکرہ لانے سے ہوتی ہے۔

فیہ دلالۃ علی التعظیم کما فی التنکیر (بیضاوی) ہذا الابہام فیہ تعظیم التولی وفرط اسرافہم فی ارتکابہم (بحر)

فَاِنْ تَوَلَّوْا۔ اور یہ روگردانی آپ کے فیصلہ سے ہوگی، جو عین حکمِ قرآنی کے مطابق ہوگا۔

عن الحکم المنزل وارادوا غیرہ (بیضاوی)

۱۸۷ (اس لئے آپ زیادہ رنج وتردد میں نہ پڑیں۔)

النَّاس۔ سے مُراد عام نوعِ انسانی بھی لی گئی ہے، اور قوم یہود بھی جن کا ذکر برابر چلا آرہا ہے۔

والمراد من الناس العموم وقیل الیہود (روح) ظاہر الناس العموم ویحتمل ان یکون الناس للعہد وہم الیہود الذین تقدم ذکرہم۔ (بحر)

۱۸۸ (حالانکہ اُس دَور سے خود ہی پناہ مانگتے ہیں)

یہود و نصاریٰ کو قائل کیا جارہا ہے کہ تم جو اسلام کے قانون سے گریز کررہے ہو تو یہ تو عمداً دورِ جاہلیت ہی کی طرف واپس جانا ہوا، جس قانون کی بنیاد تمام تر عدل اور ہر جہتی انصاف پر ہے، وہ تو اسلام ہی کا خدائی قانون ہے، ورنہ جاہلی تو ہر قانون کا عملدرآمد تو اسی اہل اصول پر رہا ہے (اور دورِ جاہلیت عرب اس سے مستثنیٰ نہ تھا) کہ زبردست کا ساتھ دو، جو قوی ہے اُسے قوی تر کردو اور زیردستوں کی کوئی پروا نہ کرو، خود یہود اہل کتاب صاحبِ شریعت ہونے کے باوجود اس فضا سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ ان کے دو قبیلے بنو نضیر اور بنو قریظہ جو حوالی مدینہ میں آباد تھے، ان میں بنو نضیر چونکہ زبردست تھے اس لئے انھوں نے قاعدہ یہ مقرر کر لیا تھا کہ قتل وغیرہ کے معاملات میں دیت کی جتنی رقم خود دیتے اس کی دوگنی شرح سے بنو قریظہ سے وصول کرتے!

الْجَاهِلِيَّةِ۔ جاہلیت پر حاشیہ ۲۹۲ آل عمران آیت ۱۵۴ میں گزر چکا ہے، قانونِ جاہلیت کا اطلاق ہر ایسے قانون پر ہوگا، جو خدائی اور آسمانی قانون کے مقابلہ میں بشری دماغ نے تراشا ہو، حافظ ابن کثیر نے اسی آیت کے تحت بڑے سخت الفاظ میں اور بہت تفصیل کے ساتھ ان لوگوں پر تنقید کی ہے، جو خدائی قانون کے مقابلہ میں اور اُسے کھلا ہوا بے دخل کرکے غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں یا بشری اختراعات کو دخل دیتے ہیں، اور ایسے لوگوں کو قطعی کافر ٹھہرایا ہے،

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿٥٠﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور جو قوم یقین (و ایمان) رکھتی ہے اس کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہو سکتا ہے؟ ۱۸۹ اے ایمان والو

اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ

یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا ۱۹۰

جس سے جہاد واجب ہے۔ واضح رہے کہ ابن کثیر کے زمانہ تک تاتاری قانون مسلمان حکومتوں میں چل نکلا تھا۔

ينكر تعالى على من خرج عن حكم الله المحكم المشتمل على كل خير الناهي عن كل شر وعدل إلى ما سواه من الآراء والأهواء والاصطلاحات التي وضعها الرجال بلا مستند من شريعة الله كما كان أهل الجاهلية يحكمون به من الضلالات والجهالات مما يضعونها بآرائهم وأهوائهم وكما يحكم به التتار من السياسات الملكية المأخوذة عن ملكهم

رومی قانون، انگریزی قانون، ہندو قانون، کسی بھی غیر اسلامی قانون کی گنجائش اسلامی حکومت میں نہیں۔

۱۸۹ شریعت الٰہی سے بڑھ کر عادلانہ و حکیمانہ صحیح و مناسب قانون اور کون ہو سکتا ہے لیکن اتنی موٹی سی بات بھی محسوس وہی کرتے ہیں جن کی عقلیں شرک و الحاد کے زنگ سے صاف اور ایمان و ایقان کی روشنی سے منور ہوتی ہیں۔
بڑی حیرت اور بڑی عبرت کے قابل آج کی اُن آزاد "مسلم" قوموں کی حالت ہے جو فرنگی قوموں کے اثر سے طلاق، خلع، تعدد ازدواج، ترکہ وغیرہ معاملات و فقہیات کے متعدد شعبوں میں فرنگی قانون کو دھڑا دھڑ اپنائے چلے جاتے ہیں اور جوش تقلید فرنگ میں ان شدید مفاسد کو بھی نظر کے سامنے نہیں لیتے جو ان بشری اور محدود، خود بنائے ہوئے قوانین کے نفاذ سے معاشرے میں پیدا ہو جانے لازمی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی جنسی انارکی اور خانگی ابتری کو دیکھ کر مسلمان بجائے اس کے کہ فرنگیت سے بچتے اور جھجکتے، اُلٹے خود اس کے خیر مقدم کے لئے بیتاب ہونے لگے ہیں۔ عدم توازن اور معاشرے میں اختلال و انتشار انسان کی خود ساختہ شریعت پر چلنے کا وہ لازمی نتیجہ ہے جس سے مفر کی کوئی صورت ہی نہیں۔

۱۹۰ (جو صاحب کتاب ہونے کے باوجود قانون الٰہی کے منکر بلکہ اس کے باغی ہیں)

اَوْلِيَآءَ۔ ولی کی جمع ہے اور ولی کا اطلاق دوست، قریب اور ناصر و مددگار سب پر ہوتا ہے۔ یہاں جس چیز کی ممانعت فرمائی گئی ہے وہ، نِری دوستی، محبت، قربِ اختصاصی کا ہے۔ رہا عدل و حسنِ سلوک تو اس کا تعلق کفر و اسلام سے نہیں وہ تو ہر فرد بشر بلکہ ہر مخلوق کے حق میں لازمی ہے۔ ایک تیسری اور درمیانی صورت مصالحت و معاملت کی رہ جاتی ہے، تو وہ اہل اسلام کی اپنی مصلحت کے تابع ہے، صلح اور عہد و پیمان ہر کافر جماعت سے مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں۔ ممانعت قطعی صرف موالات یا دوستانہ اتحاد اور برادرانہ مناصرۃ کی ہے۔

هذا يدل على قطع الموالاة شرعًا (قرطبی) أي لا تعتمدوا على الاستنصار بهم ولا تتوددوا إليهم (کبیر)

اور پھر یہ ممانعت جب اہل کتاب سے دوستی اور یگانگت کی ہے جو توحید، سلسلۂ نبوت اور جزائے آخرت کے عقائد میں کم از کم اصولی طور پر تو مسلمانوں سے متحد ہیں تو ظاہر ہے کہ مشرکین و دہریئین کے مقابلہ میں یہ ممانعت کتنی مؤکد اور اشد ہوگی جو مسلمانوں کے ساتھ بنیادی قیدوں کی کچھ بھی قدر مشترک نہیں رکھتے، یہ زندگی ہو جب بھی کافر کتابی درجہ میں تو وہ بہر حال رہیں گے۔

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں ۱۹۱ اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی کرے گا وہ ان ہی میں (شمار) ہوگا ۱۹۲

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

بیشک اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا ۱۹۳ اس لئے تو ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے اُن کی

يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۤئِرَةٌ ؕ

طرف دوڑتے ہوئے دیکھتا ہے (وہ) کہتے ہیں کہ ہمیں تو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ہم پر کہیں کوئی آفت نہ پڑ جائے ۱۹۴

فاذا امر بمعاداۃ الیہود والنصاری لکفرہم فغیرہم من الکفار بمنزلتہم (جصاص)

۱۹۱ (اپنی مناسبتِ باہمی اور اسلام سے عداوتِ مشترک کی بنا پر)

مطلب یہ ہوا کہ یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہیں ہی، باقی خود یہود و نصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے کم سے کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں، ان کے آپس میں اگر تمہارے خلاف سازباز ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں، لیکن تم جو اہل ایمان ہو، تم میں اور منکرینِ قرآن میں مناسبت ہی کیا اور اشتراک کیسا؟ آج جب کہ یہ سطریں پہلی بار لکھی جا رہی ہیں (جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ مئی ۱۹۴۸ء میں) فلسطین کی سرزمین پر ایک اسرائیلی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف یہود اور نصرانی قوموں کا سازباز قرآن مجید کی اس پیش خبری کی معجزانہ تصدیق پیش کر رہا ہے اور پھر اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز اور دنیا کو دنگ کر دینے والی مثال یہودی نصرانی اتحاد کی اواخر ۱۹۶۳ء میں پیش آئی، جب یہود نے اپنا تبری نامہ قتل مسیح کی ذمہ داری سے متعلق پیش کیا اور دنیائے مسیحیت کے پیشوائے اعظم نے اسے انجیلوں کی واضح ترین اور بار بار کی دہرائی ہوئی شہادتوں کے باوجود قبول کر لیا!

۱۹۲ یعنی وہ بھی اُن ہی میں داخل و شامل اور اُن ہی کا ایک جزو یا ضمیمہ سمجھا جائے گا۔

ای من جملتہم وحکمہ حکمہم وھذا تغلیظ من اللہ وتشدید فی وجوب مجانبۃ المخالف فی الدین (مدارک)

غیروں، بیگانوں، اللہ کے دشمنوں سے دوستی ہو نہیں سکتی جب تک پہلے ان کی عظمت یا محبت کا نقش دل پر نہ بیٹھ لے، اور مسلمانوں کی اپنی پختگی سے کچھ نہ کچھ ہٹ نہ لے، قومی تشخص اور ملت کی خودی کے لئے لازمی ہے کہ ملتِ اسلامی کے دوستانہ، رازدارانہ، برادرانہ تعلقات غیر مسلموں سے ممنوع قرار دے دیئے جائیں، یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دشمنانِ دین کے ساتھ خلا ملا میل جول زیادہ رکھتے ہیں، اُن کے اندر سے فہم دین اور دینی تصلب اور ملی خودداری رخصت ہو جاتی ہے، حدیث نبوی میں دوسری قوموں کے وضع و لباس اختیار کرنے، اُن سے تشبہ پیدا کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ عجب نہیں کہ اسی حکمت اور اصول پر مبنی ہو۔

۱۹۳ یعنی دین کی سمجھ اور غیرت کی ایسے لوگوں سے سلب ہو جاتی ہے۔

ظٰلِمِیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین خدا کے دشمنوں کو دوست و رازدار بنا کر خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔

الذین ظلموا انفسہم بموالاۃ الکفرۃ (کشاف، مدارک)

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا

یقین کیا عجب کہ اللہ (کامل) فتح ہی دے دے یا (اور کوئی) خاص بات اپنی طرف سے (کر دے) تو

عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿٥٢﴾

اس وقت یہ اپنے پوشیدہ دلی خیالات پر شرمندہ ہو کر رہیں ۱۹۵ ف

۱۹۴ ف (اور نہ اس وقت یہودی ساہوکاروں سے دوستانہ تعلقات کام آئیں گے)

دَآئِرَةٌ۔ مراد ہے گردش زمانہ سے کوئی اتفاقی مصیبت مثلاً قحط، گرانی، شکست جنگ وغیرہ۔

والدائرۃ ھی التی تدور من قوم الی قوم (کبیر) ای بدور من دوائر الدھر کالدولۃ التی تدور من دائرۃ من الواحد ی الدائرۃ من

عمّی و بہ بمعنی والحوادث المحرمۃ (کبیر) من دوائر الزمان ای شر من صروفہ و دولۃ من دولہ فیحتاجوا الیھم (کشاف)

مدینہ اور نواح مدینہ میں یہود کی حیثیت مہاجنوں، صرافوں اور بینکر زکی سی تھی، اور عرب آبادی اپنی ہر مالی

افتاد و مصیبت کے وقت سہارا انھیں کا ڈھونڈتی تھی۔

الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ سے مراد منافقین مدینہ ہیں، یہی ان احکام الٰہی کے باوجود یہودی

مہاجنوں، ساہوکاروں سے برابر رشتہ موالات قائم کئے ہوئے تھے۔

مَّرَضٌ۔ سے مراد شک و نفاق کا مرض ہے۔

مرض شک ونفاق والمراد ابن ابی و اصحابہ (قرطبی) المنافقون مثل عبداللہ ابن ابی و اصحابہ (کبیر)

فَتَرَى۔ میں خطاب عام ہے، یعنی اے دیکھنے والے۔

فِيْهِمْ۔ یعنی ان کی دوستی کی طرف جن سے ان کا لین دین جاری تھا۔

ای فی موالاتھم و معاونتھم (بیضاوی۔ قرطبی) فی مودۃ الیھود و نصاری نجران لانھم کانوا اھل

ثروۃ وکانوا یعینونھم علی مھماتھم و یقرضونھم (کبیر)

يَقُوْلُوْنَ یعنی مسلمانوں سے بطور حیلہ بازی اور سخن سازی کے کہتے ہیں، روایتوں میں آتا ہے کہ مدینہ میں جو

پرقوت جتھا عبداللہ بن ابی کی سرداری میں منافقوں کا تھا، وہ برابر متمول یہود و نصاریٰ سے لین دین جاری

رکھے ہوئے تھا، اور مسلمانوں سے کہتا رہتا کہ کل کی کیا خبر، اگر کہیں یہی لوگ تم پر غالب آ گئے، یا کوئی اور مصیبت ہم تم پر

پھٹ پڑی تو بغیر ان لوگوں سے مدد لئے کچھ بنائے نہ بنے گی، اس لئے انھیں ساتھ لئے رہنا ضروری ہے۔

۱۹۵ ف اور شرمندگی بھی کیسی؟ دہری بلکہ تہری تہری شرمندگی اٹھانا پڑے، پہلی کھسیاہٹ تو اسی کی کہ

سمجھے کیا تھے اور ہوا کیا، دوسری جھنجلاہٹ اپنی رسوائی پر جو نفاق کمبخت کی بدولت ظہور میں آئی، تیسرا غصہ

اپنی اس ناکامی پر کہ ادھر کافروں سے دوستی کچھ آڑے نہ آئی اور ادھر مسلمانوں سے بھی بُرے بنے!

عَسَى اللّٰهُ۔ عسیٰ کا حال بھی لعلّ ہی کا سا ہے، جب اس کا تعلق حق تعالیٰ کے کسی فعل سے ہوتا ہے

تو معنی میں شک و احتمال نہیں رہتا، بلکہ مفہوم یقین کا پیدا ہو جاتا ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (حیرت سے) کہیں گے ارے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی قسمیں بڑے زور و شور

أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ﴿٥٣﴾

سے کھایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں! ۱۹۶ ان کے عمل (سب) غارت گئے اور یہ لوگ گھاٹے میں آگئے ۱۹۷

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ

اے ایمان والو! تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، سو اللہ عنقریب ایسے لوگوں کو (وجود میں)

بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى

لے آئے گا ۱۹۸ جنہیں وہ چاہتا ہوگا اور جسے وہ چاہتے ہوں گے، ایمان والوں پر وہ مہربان ہوں گے اور کافروں کے

الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ

مقابلہ میں وہ سخت ہوں گے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے ۱۹۹

يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ۔ یہ فتح مسلمانوں کو اُن ہی کافروں کے مقابلہ میں حاصل ہوگی جو آج ان منافقوں کی امیدوں کا سہارا اور جائے پناہ بنے ہوئے ہیں۔

أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ۔ اللہ کی طرف سے کوئی خاص بات مثلاً اُن ہی منافقین کی پردہ دری اُن کے ناموں کی تعیین کے ساتھ۔

۱۹۶ (لیکن اب تو حقیقتِ حال کچھ اور ہی ظاہر ہو رہی ہے)

یہ کہنے والے مومنین ہوں گے اور اس وقت آپس میں کہیں گے جب منافقین کا نفاق کھل کر رہے گا۔

۱۹۷ (آخرت اور دنیا دونوں میں)

(استحقوا اللعن فی الدنیا والعقاب فی الآخرۃ (کبیر)

دنیا میں یوں کہ کافروں کی معاونت لاحاصل نکلی، اور مسلمانوں کے سامنے قلعی کھل کر رہی، اور آخرت میں یوں کہ اُن کی ظاہری نیکیاں، بالکل بے وزن نکلیں۔

أَعْمَالُهُمْ۔ میں اعمال سے ان کے وہ اعمال تو مراد ہیں ہی جن پر انھیں طاعات ہونے کا گمان تھا، لیکن مراد ان کی منافقانہ کارروائیاں اور دو رُخی چالیں بھی ہو سکتی ہیں۔

۱۹۸ (اُن مرتدوں کے بجائے، دین کی خدمت کے لئے)

سو کسی فرد یا جماعت کے ارتداد سے دینِ اسلام یا خدائے اسلام کو مطلق ضرر نہیں۔

۱۹۹ (دین و جہاد کے باب میں)

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۵۴﴾

یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کرے، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے ۲۰۰

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ

تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسولؐ اور ایمان والے ہیں جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ﴿۵۵﴾

زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں، اس حال میں کہ وہ خشوع بھی رکھتے ہیں ۲۰۱

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ۔ قرآن مجید نے اسے بار بار صاف کیا ہے کہ خدائے اسلام بعض مشرک قوموں کے خداؤں کی طرح ایک بے جان و بے حس مشین، یا محض علت العلل نہیں، وہ خوش بھی ہوتا ہے اور ناخوش بھی، وہ پسند بھی کرتا ہے اور ناپسند بھی، وہ حکم بھی دیتا ہے اور منع بھی کرتا ہے، یہاں یہ بتایا کہ وہ فلاں فلاں اوصاف والوں کو پسند کرتا ہے اور وہ لوگ بھی اس کو محبوب رکھتے ہیں

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِينَ۔ یہی مضمون سورۃ الفتح، رکوع چار میں بھی بیان ہوا ہے، أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔

أَذِلَّةٍ۔ کے معنی ہیں نرمی و شفقت سے لبریز۔

ای مرافقین بالمؤمنین ویرحمونهم ویلینون لهم (قرطبی) لیس المراد بكونهم ذلة هو انهم مهانون بل المراد المبالغة فی وصفهم بالرفق ولین الجانب (کبیر)

أَعِزَّةٍ کے معنی ہیں غالب، سخت، مستقل۔

ای اشداء غلاظ علی الکفار یعادونهم ویغالبونهم (معالم) هم فی الغلظة علی الکفار کالسبع علی فریسته

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ مجاہدون کے ساتھ ہر جگہ فی سبیل اللہ کی قید لگی رہنا بے معنی نہیں، اشد مجاہدے اور سخت قسم کی مشقتیں مشرک، ملحد، منافق سب ہی اپنے اپنے دنیوی، ملکی، وطنی، شخصی، قومی اغراض و مقاصد کے لئے کیا کرتے ہیں، جیل جاتے ہیں، تازیانے کھاتے ہیں، گولیاں سینے پر لیتے ہیں، پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں، مومن مسلم کی شان امتیاز یہ ہے کہ اس کے مجاہدے بڑے ہوں یا چھوٹے جو بھی ہوں اللہ کی راہ میں رضائے الٰہی کی غرض سے دین خدا کی سربلندی کی خاطر ہوں

لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ یہ شان مومنین مخلصین کی ہے، برخلاف منافقین کے کہ وہ اگر جہاد میں شریک ہوتے بھی ہیں تو دبے دبائے، شرمائے ہوئے، کافروں کی طعنہ زنی سے ڈرے سہمے ہوئے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اہل طریق کے طرز عمل کی تصریح آ گئی۔

۲۰۰ (جس کو چاہے اس مرتبے سے نواز دے)

ذٰلِكَ۔ اشارہ ایمان اور ان اوصاف عمل کی جانب ہے جو بھی اوپر بیان ہو چکے۔

اشارة إلى ما تقدم من الاوصاف (بیضاوی)

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی رکھے گا، سو بیشک اللہ ہی کا گروہ غالب ہے۔

وَاسِعٌ۔ اس کے ہاں کی وسعتوں، گنجائشوں کا کیا پوچھنا، وہ چاہے تو سب ہی کو ان اوصاف سے متصف کر دے۔

عَلِيْمٌ۔ لیکن اس کا علم بھی تو ہمہ گیر و دقیق ترین ہے، وہ اُن ہی کو ان اوصاف سے متصف کرتا ہے جو اس کے علم کامل میں اس کے اہل ہوتے ہیں۔

۲۰۱ـ (حالتِ نماز میں خصوصاً)

وَلِيُّكُمُ۔ یہاں ولی اس معنی میں ہے کہ وہ جس سے تعلقِ دوستی رکھا جائے یعنی تعلقِ حقیقی دوستی۔ وخطاب اُمتِ اسلامی سے ہے۔ ذکر اس کا تھا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ اب گویا ارشاد ہو رہا ہے کہ دوست اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کو بناؤ۔

ومعناه على التعدد والا ... اولياء انما اولياء كم الله ... ورسوله ... والمؤمنون ...

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں ایسے شخص سے علیحدہ رہنے پر دلالت ہے جو اہل اللہ اور ان کے طریق کے ساتھ مسخر کرے۔

وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ میں وَ حالیہ ہے۔

والواو للحال (کشاف) ای یعملون ذلك فی حال الرکوع (کشاف)

لیکن خود رکوع کے اس سیاق میں کیا معنی ہیں؟ رکوع یہاں یعنی خشوع ہے، نماز کی اصطلاحی ہیئت مراد نہیں۔

تارة يستعمل فی التواضع والتذلل (راغب) الرکوع بمعنی الخضوع والتذلل لا بالمعنی المعروف ... (روح) وهو الخشوع والاخبات والتواضع لله اذا صلوا واذا زکوا (کشاف) والرکوع هنا ظاهره الخضوع لا الهيئة التی فی الصلوٰة (بحر)

مطلب یہ ہوا کہ ان کی اقامتِ صلوٰۃ و ادائے زکوٰۃ محض صورتِ ظاہری کے لحاظ سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ صحیح کیفیتِ باطنی کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ۔ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ غرض یہ کہ وہ لوگ عقائد اور اعمالِ بدنی و مالی اور اخلاص و اخلاق سب کے جامع ہوں گے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ عین ذکر میں اگر کسی ایسے شغل کا ہجوم و تقاضا ہو کہ اگر اس سے فارغ نہ ہو تو اس کا قلب مشغول رہے تو اس سے جلد فارغ ہو جانا ہی مستحسن ہے۔

۲۰۲ـ (بہ اعتبارِ اصل حقیقت کے، گو بعض اوقات اس غلبہ کے آثار کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر ظاہر نہ ہوں)

بہ قول مفسر تھانویؒ حقیقۃً ارفع تو مومنین ہی ہیں، گو حکمتِ ابتلاء وغیرہ کی بنا پر کسی خاص محل مثلاً اس دنیا میں اور کسی خاص وقت تک اس ارفعیت کے آثار نمایاں نہ ہوں، ارفعیت بجائے خود قائم ہے خواہ اس کے آثار بعد ایک مدت کے اسی دنیا میں ظاہر ہو جائیں، خواہ کسی دوسرے محل کے لئے، مثلاً آخرت میں اپنے ظہور کے اصلی اور مقدر وقت پر ظہور پذیر۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ غلبہ کی تفسیر اگر قوتِ قلب سے کی جائے تو فہم سہل تر ہو جائے، اہل اللہ پر اسبابِ مغلوبیت کا ظاہر کتنا ہی ہجوم ہو، لیکن ان کو ضعف و انشکاکت بوجہ توکل و تعلق مع اللہ کے نہیں ہوتا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب تم ہم سے بس یہی ضد رکھتے ہو نہ کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور جو کچھ ہمارے

اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اوپر نازل ہوا اس پر اور جو کچھ ہم سے پیشتر اُتر چکا ہے اُس پر ۲۰۷ اور یہی کہ تم میں سے اکثر نافرمان ہیں ۲۰۸

شن طن سے بجایا جاتا ہے۔ یہ شرف صرف اسلام کے ساتھ مخصوص ہے کہ اس نے عبادت کے اعلانِ دعوت کا طریقہ ایسا نکالا جو عبادت کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ بجائے خود بھی ایک عبادت ہی ہے! اذان میں ہوتا کیا ہے؟ نہ باجہ نہ گھنٹا، نہ جرس نہ ناقوس، نہ کوئی نغمہ نہ کوئی ترانہ بس اللہ کی حکومت و کبریائی، اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو نماز کی طرف بلاوا! الفاظ کل یہی ہوتے ہیں کہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ (چار بار) اللہ ہی بڑا ہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (دو بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (دو بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ (دو بار) لپکو نماز کی طرف حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ (دو بار) لپکو فلاح و بہبود کی طرف اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ (دو بار) نماز نیند سے کہیں بہتر ہے (صرف نماز فجر کے وقت) اَللّٰهُ اَكْبَرُ (دو بار) اللہ ہی بڑا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (ایک بار) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

فرمائیے اس سے پاکیزہ تر پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس وسیع کرۂ ارض کے جس قطعہ میں جہاں بھی کوئی مسجد ہے مؤذن اس پاک گھر میں خود بھی پاک و صاف ہو کر باوضو کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر اللہ کی کبریائی اللہ کی یکتائی محمدؐ کی رسالت کی منادی بلند آواز سے کرتا رہتا ہے اور لوگوں کے لئے عبادت و فلاح کی دعوت بغیر کسی مادّی آلہ کی مدد کے فضا میں پانچ بار ہر روز بلند ہوتی رہتی ہے! ظالم اسی صدائے خیر و فلاح کو روکنا اور بند کرنا چاہتے تھے! غیر قوم والے اس قدرتی حسن سے جس طرح متاثر ہوتے رہتے ہیں، اُس کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۲۰۶ اس پاکیزہ صدا کا کون سا جزو آخر قابلِ مضحکہ ہے؟ کون سا پہلو اس کا قابلِ تمسخر ہے؟ اتنا صحیح، سچا، سنجیدہ پیام آخر کس اعتبار سے ناقابلِ التفات ہے، اور جا سے قابلِ تحقیر سمجھیں کیا اُن کی انتہائی بے عقلی، کج فہمی پر کسی مزید دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہے؟

اِتَّخَذُوْهَا۔ میں ضمیر صلوٰۃ کی طرف بھی ہو سکتی ہے، اور ندا (اذان) کی طرف بھی۔

الضمیر للصلوٰۃ او للمناداۃ (کشاف)

سیاق کے لحاظ سے اذان ہی مراد لینا بہتر ہوگا۔

۲۰۷ یعنی ہمارے اصولِ دین میں سے تمہیں عداوت اور ضد اس کے کسی جزو سے ہے؟ ہمارا جرم بس یہی ہے نہ کہ ہم توحید کے پرستار ہیں، اور اپنے نبی کے ساتھ ساتھ تمہارے انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

قُلْ۔ خطاب پیغمبرؐ کو ہے کہ آپ سب مسلمانوں کی طرف سے یہ جواب دیں۔

قال علی سبیل التعجب هل تجدون فی هذا الدین الا الایمان باللّٰه والایمان بما انزل علی محمد صلعم والایمان

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ ۚ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ

آپ کہئے کہ کیا میں تمہیں بتلا دوں وہ جو اس سے بھی بدتر ہے باعتبار سزا کے اللہ کے یہاں ۲۰۹ وہ وہ ہے جس پر

وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ

اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر غضب کیا ہے ۲۱۰ اور جن میں سے بندر اور سور بنا دیئے ۲۱۱ اور انہوں نے شیطان کی پوجا کی ۲۱۲

عیب الانتقاء (کبیر)

تَنْقِمُوْنَ مِنَّا۔ نقم کے معنی ہیں برا سمجھنا، مبغوض رکھنا، اور عیب لگانا، یہاں تینوں معنی چسپاں ہو سکتے ہیں۔

معناہ تسخطون وقیل تکرھون وقیل تنکرون والمعنی متقارب (قرطبی) ھل تنکرون منا وتعیبون (بیضاوی)

۲۰۸ (خود اپنے دین کے معیار سے بھی)

اہل کتاب بلحاظ دینی اور اخلاقی اعتبار سے اتنے گر چکے تھے کہ قرآن مجید نے کلیۃً نہیں تو اکثریت کے لحاظ سے بھی ذم قرار دے دیا۔

ای فسقکم ثبت معلوم عندکم لانکم تعلمون انکم فی دینکم فساق (کبیر)

وَاَنَّ میں واو مع کے معنی بھی دے سکتا ہے۔

یجوز ان یکون الواو بمعنی مع (کشاف۔ کبیر)

اس ترکیب کے بعد آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم ہم سے ہمارے ایمان ہی کی بنا پر تو منتقم ہو، باوجود اس کے کہ تم خود ہی نافرمان ہو

ما تنقمون منا الا الایمان مع ان اکثرکم فاسقون (کشاف) ای لان اکثرکم فاسقون تنقمون منا ذلک (قرطبی)

۲۰۹ (جسے تم اپنے لئے برا سمجھ رہے ہو)

یعنی تم تو ہمارے طریقہ کو برا سمجھ رہے ہو، لیکن میں تمہیں اس طریقہ کا پتہ بتلائے دیتا ہوں جو واقعی عند اللہ سزا و پاداش کے لحاظ سے بدترین ہے۔

مِنْ ذٰلِکَ۔ یعنی ہمارے اس طریقہ سے جو تمہارے نزدیک موجب صد عیب ہے۔

ای من ذلک المنقوم (بیضاوی) ای بشر من نقمکم علینا (قرطبی) اشارۃ الی المنقوم (کبیر)

۲۱۰ (ان کے اسی طریق مبغوض کے باعث)

لَعَنَهُ۔ لعنت پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے کہ اس کے معنی رحمت الٰہی سے دوری اور مہجوری کے ہوتے ہیں۔

مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ کا مضاف محذوف ہے اور تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔

بشر من اھل ذلک من لعنہ اللہ او بشر من دین من لعنہ اللہ (بیضاوی) لابد من حذف المضاف

وتقدیرہ بشر من اھل ذلک (کبیر)

ذکر ہو چکا ہے۔

۲۱۱ یہ لوگ جو بندر اور سور بنا دیئے گئے کون تھے، کہاں کے تھے، کس زمانہ کے تھے، قرآن مجید اس باب میں خاموش ہے اور احادیث صحیح میں بھی کوئی تفصیل وارد نہیں ہوئی ہے اس لئے اس پر محض اجمالی ایمان بالکل

کافی ہے البتہ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ قردۃ بننے والوں سے مراد یہود ہیں بلکہ ان میں سے بھی اصحاب السبت ہیں جن کا ذکر سورۂ بقرہ پارہ اول میں آچکا ہے اور خنازیر سے مراد مسیحی اصحاب المائدہ ہیں، جن کا ذکر اسی سورت میں آگے آرہا ہے۔

قال اهل التفسير عنى بالقردة اصحاب السبت وبالخنازير كفار مائدة عيسى (كبير) اى مسخ بعضهم قردة وهم اصحاب السبت وبعضهم خنازير وهم كفار مائدة عيسى۔ (روح)

لیکن یہ قول بھی سلف ہی سے مروی چلا آرہا ہے کہ مسخ محض معنوی ہوا تھا صوری نہ تھا یعنی صورتیں وہی رہی تھیں، صرف سیرتیں بندروں اور سوروں کی ہوگئی تھیں، مفردات میں لغت خنزیر کے تحت میں ہے:۔

قيل عنى من اخلاقه وافعاله مشابهة لاخلاقها لا من خلقته خلقتها وروى ان قوما مسخوا خلقة وكذا ايضا فى الناس قوم اذا اعتبرت اخلاقهم وجدوا كالقردة والخنازير وان كانت صورهم صور الناس (راغب)

اس ناچیز سیاہ کو اس آیت کی تفسیر کے باب میں خاص طور پر تردد تھا مسودۂ اول کی تحریر کے وقت (اپریل ۱۹۴۳ء میں) حکیم الامت مفسر تھانویؒ زندہ وسلامت تھے، حل مشکل کے لئے عریضہ ان کی خدمت میں بھیجا، اور اس میں امام راغب کی عبارت مذکورۂ بالا نقل کر دی، جواب جو موصول ہوا اس کو خلاصۃً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ: اولاً تو ایسی تاویلیں ان صحیح ومسلم اور عقلی قواعد کے اکثر مخالف پڑتی ہیں۔

النصوص تحمل على ظواهرها لا تعدل الى المجاز الا اذا تعذرت الحقيقة الناطق يقضى على الساكت۔

ثانیاً خود الفاظ قرآنی اس تاویل کو مستبعد بتا رہے ہیں، مثلاً لفظ جعل تصییر پر دال ہے تو اس کا مفعول ثانی ایسی ہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلی کے خلاف ہو، اور قردۃ وخنازیر بالتاویل تو وہ خود ہی ہو چکے تھے، اس میں جعل کے کیا معنی اس جعل کا تو یہ حاصل ہوا کہ جعل القردة قردة وجعل الخنازير خنازير بہ الفاظ دیگر جعل الخبيثين خبيثين! کیا اس سے کلام کے بے معنی ہونے کا شبہ قوی نہیں ہو سکتا جو کلام اللہ سے نہایت مستبعد ہے، ثالثاً جب وہ خود خبیث ہو چکے تھے تو اب ان کو خبیث بنانے کے کیا معنی، رابعاً سورۂ بقرہ میں ہے فجعلناها نكالا لما بين يديها وما خلفها وموعظة للمتقين تو سزا پر تو نکال اور موعظہ صادق آتا ہے مگر عقائد واخلاق فاسدہ تو خود موجب سزا ہیں نہ کہ سزا، خامساً ایسی تاویل کو نص کی تکذیب نہ کہیں گے لیکن کیا بدعت بھی نہ کہیں گے؟ اگر شبہ کیا جائے کہ بعض سلف کو بدعتی کہنا لازم آتا ہے تو یہ بدعت اجتہادی محل وعید نہیں، ورنہ اگر اس تاویل کو سنت میں داخل کیا جائے تو جمہور کو بدعتی کہنا لازم آئے گا۔

گنجائش بہر حال کسی درجہ میں اس تاویل کی موجود ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

شیخ رشید رضا مصری نے کہا ہے کہ اگرچہ عامۂ مفسرین مسخ جسمانی کے قائل ہیں لیکن سیوطی کی درمنثور میں محدث ابن المنذر ومحدث ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا نہ کہ صوری اور سورۂ بقرہ میں اسی مضمون کی آیت کی تفسیر کے ذیل میں ظاہر ہو چکا ہے کہ ترجیح اسی معنی کو ہے اور مجاہد تابعی کا قول لغت وزبان کے اعتبار سے بھی بعید نہیں۔

وجمهور المفسرين على ان معنى ذلك انهم مسخوا فكانوا قردة وخنازير حقيقة وانقرضوا، وفى الدر المنثور اخرج ابن المنذر وابن ابى حاتم فى قوله كونوا قردة خاسئين قال مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة. فالمراد على هذا انهم صاروا كالقردة فى نزواتها والخنازير فى اتباع شهواتها وقدم فى تفسير اية البقرة ترجيح هذا القول من جهة المعنى بعد نقله عن مجاهد. وليس قول مجاهد بالبعيد من استعمال اللغة (المنار)

أُولَٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَآءِ السَّبِيلِ ۝٦٠ وَإِذَا

یہ لوگ مقام کے اعتبار سے بدتر اور راہ راست سے بہت دور ہیں ۲۱۳ اور جب یہ لوگ

جَآءُوكُمْ قَالُوٓا ءَامَنَّا وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِۦ ۚ

تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ وہ کفر کو لے کر آئے تھے اور اسی کو لے کر چلے گئے ۲۱۴ اور اللہ

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ۝٦١ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَٰرِعُونَ فِى

خوب جانتا ہے اس چیز کو جسے یہ لوگ چھپاتے ہیں ۲۱۴ اور آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھتے ہیں گناہ اور ظلم

الْإِثْمِ وَالْعُدْوَٰنِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝٦٢

اور حرام کھانے پر لپکتے ہوئے، کیسے برے ان لوگوں کے کرتوت ہیں ۲۱۵

۲۱۲ یہ ترجمہ اس صورت میں ہے جب عَبَدَ بطور فعل پڑھا جائے اور تقدیر کلام یوں ہوگی وَمَنْ عَبَدَ الطَّاغُوتَ عطف اس صورت میں مَن لعنہ اللہ پر ہوگا۔

جعلوہ فعلا ماضیا وعطفوہ علی فعل ماض وھو غضب ولعن (قرطبی) عطف علی صلۃ من کانہ قیل ومن عبد الطاغوت (کشاف)

دوسری ترکیب یہ بھی جائز ہے کہ عبد کو اسم اور عبید کی جمع سمجھا جائے اس صورت میں عبد کا عطف القردۃ والخنازیر پر ہوگا اور پورے فقرہ کے معنی ہوں گے کہ "انہیں بندر اور سور اور پرستار شیطان بنا دیا"۔

طاغوت۔ پر حاشیے سورۂ بقرہ پ۳ میں گزر چکا۔

طاغوت۔ طغیان سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق باطل و منکر کی ہر شکل پر ہو سکتا ہے۔

الطاغوت اسم فیہ معنی المبالغۃ من الطغیان الذی ھو مجاوزۃ الحد المشروع والمعروف الی الباطل والمنکر فھو یشمل کل مصادر طغیانھم (المنار)

یہود رفتہ رفتہ کاہنوں کے بہت معتقد اور گرویدہ ہو گئے تھے اور کہانت وغیرہ تمام شیطانی فنون ان پر غالب آ گئے تھے، اسی پیروی باطل کو شیطان کی پرستاری یا عبادت سے تعبیر کیا گیا۔

عن ابن عباس الطاغوت الکھنۃ وکل من اطاع احدا فی معصیۃ اللہ فقد عبدہ (کشاف)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جب مصلحت دینی ہو تو مخالف کے ذم کو خوب ظاہر کر دیا جائے اور یہ صبر و حلم کے منافی نہیں۔

۲۱۳ (اسی دنیا میں)

شَرٌّ مَّكَانًا۔ آخرت میں کہ وہ مکان دوزخ ہے۔ شر کو یہاں مضاف مکان کی طرف کیا گیا ہے اور مراد اس سے اہل مکان ہیں

(ان مکانھم النار واما المؤمنون فلا شر فی مکانھم (قرطبی) جعلت الشرارۃ للمکان وھی لاھلہ للمبالغۃ (مدارک)

۲۱۴ (یعنی ان کے عقائد کفر و نفاق کو)

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ

کیوں اُن کے مشائخ اور علماء انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کے کھانے سے نہیں روکتے ہیں کیسی بُری

السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ

ان کی کارستانیاں ہیں! ۲۱۶؎ اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ بند ہو گیا ۲۱۷؎

ذکر اب منافقین کا ہے خصوصاً منافقین یہود کا، جو اپنے عقائد کفر کے باوجود اپنے کو مسلمان آبادی کے درمیان چالاکی سے ملے جلے رکھتے تھے۔

هذه صفة المنافقين (قرطبی) ای منافقوا الیهود (جلالین)

اِذَا جَآءُوْكُمْ۔ یعنی یہ منافقین جب مسلمانوں کی مجلسوں میں آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے ہیں۔

دَخَلُوْا بِالْكُفْرِ۔ یعنی تمھاری مجلس کے اندر عقائد کفر لیے ہوئے آئے۔

خَرَجُوْا بِالْكُفْرِ۔ یعنی تمھاری مجلس سے باہر وہی عقائد کفر لیے ہوئے واپس ہوئے مطلب یہ ہوا کہ انھیں مسلمانوں کی مجلس سے نفع مطلق نہ ہوا، جو کفریہ عقائد لے کر آئے تھے، وہی لے کر چلے بھی گئے۔

والمعنی انهم لم ينتفعوا بشیء مما سمعوه بل دخلوا كافرين وخرجوا كافرين (قرطبی)

۲۱۵؎ ذکر یہود کا ہے۔

الْاِثْمَ۔ جھوٹ کی قسم کے سارے گناہ اس میں شامل ہیں، یا وہ گناہ جو گنہگار کی ذات تک محدود رہیں۔

الاثم الكذب وقيل الاثم ما يختص بهم (کشاف) يعني عن قول الكذب والزور (ابن جریر)

الْعُدْوَانِ۔ یہ لفظ ہر قسم کے ظلم، زیادتی اور سرکشی پر حاوی ہے، یا وہ گناہ جو دوسروں تک متعدی ہو۔

العدوان الظلم وقيل العدوان ما يتعداهم الى غيرهم (کشاف)

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ۔ اس میں سود، رشوت اور جبر یا مکر سے حاصل کی ہوئی ہر آمدنی آگئی، پرانے حکماء کی تحلیلِ نفس کے مطابق اثم قوتِ نطقیہ سے صادر ہوتا ہے اور عُدْوان قوتِ غضبیہ سے اور اکل سحت قوتِ شہویہ سے۔

۲۱۶؎ آیت ماقبل میں ذکر عوام یہود کا تھا، اس آیت میں ذکر خواص و اکابر یہود کا ہے۔ لَوْلَا، اَفَلَا کے معنی میں ہے۔

لولا بمعنی افلا (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اس کا داخلہ مستقبل پر ہوتا ہے جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی صیغۂ امر کے اور ممانعت کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

فاذا كانت للمستقبل فهی فی معنی الامر كقولہ لا تفعل وهی هنا للمستقبل بقول هلا ينهاهم ولم لا ينهاهم (بحر محیط)

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ صحابہ، تابعین اور علماء سلف سے مروی ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی سخت ترین آیتوں میں سے ہے۔

عن ابن عباس هی اشد آية فی القرآن (کشاف) عن الضحاك ما فی القرآن آية اخوف عندی منها (کشاف)

كان العلماء يقولون ما فی القرآن آية اشد توبيخا للعلماء من هذه الآية ولا اخوف عليهم منها (ابن جریر)

۲۱۷؎ یہ مسلمانوں کے افلاس پر طنز و استہزاء کی راہ سے ایک فقرہ تھا، محاورہ میں اس سے مراد بخل و تنگدستی ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ

جو کوئی اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک کرے گا، سو اللہ اس پر جنت حرام کردے گا، اور اس کا ٹھکانا دوزخ

النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۷۲ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا

کی آگ ہے اور (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۲۴۷ یقیناً وہ (بھی) کافر ہوگئے جنھوں نے کہا کہ

اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ

خدا تین میں سے تیسرا ہے ۲۴۸ حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے ۲۴۹

۲۴۵ ملاحظہ ہو اسی سورہ کا حاشیہ ۲۱۔ خوب خیال کرلیا جائے کہ قرآن مجید انصاری اور ان کے کا فرقوں بلکہ فرقوں کے درمیان فرق کرتا ہے، ان لوگوں کا ذکر نام کے ساتھ نہیں، صرف صفات کے ساتھ کرتا ہے، اور انھیں ایک الگ مستقل اُمت قرار دیتا۔ ہبرٹ جرنل (لندن) دنیائے مسیحیت کا ایک بلند پایہ علمی سہ ماہی رسالہ ہے، اس کے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے نمبر میں ہے: "مسیحی کے عقیدہ میں مسیح تمام تر خدا نہیں، بلکہ جو عقیدہ جتنا زیادہ مستبعد ہو اسی قدر خوش عقیدگی سے قریب ہوتا ہے"۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں صاف رد ہے حلول واتحاد کا جس کے قائل جاہل صوفیاء ہوئے ہیں۔

۲۴۶ ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران آیت ۵۱۔
قرآن مجید کے بیان کی تائید اس حد تک تو موجودہ محرف انجیلیں بھی کررہی ہیں:۔
"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴: ۱۰) "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت" (لوقا ۴: ۸) "یسوع نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸: ۱۹)

۲۴۷ (جو شفاعت کی حد تک بھی اُن کی مدد کرسکے)
یہ سب عیدیں مسیحیوں یا عیسائیوں کے لئے آرہی ہیں، جو مسیح پرستی کے شرک کو اپنے لئے باعث ننگ نہیں، باعث فخر سمجھے ہوئے ہیں۔
مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ۔ ہر قسم کے شرک پر حاوی ہے خواہ ذاتی ہو یا صفاتی۔
مِنْ اَنْصَارٍ۔ صیغۂ جمع لانے میں نکتہ یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اپنے بہت سے ناصروں اور شافعوں کا زعم تھا۔

۲۴۸ موجودہ مسیحیوں کے کافر بلکہ مشرک ہونے پر یہ صاف نصوص موجود ہیں۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس، یہ تینوں اقنوم (اصل) منفرداً بھی خدا ہیں، اور مجتمعاً بھی۔ تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں، اور تینوں مل کر بھی۔

۲۴۹ (جو نہ اقنوموں میں تقسیم ہے نہ اور کسی طرح)
مِنْ اِلٰهٍ۔ میں مِنْ زائد کلیت یا استغراق کے لئے ہے اور آیت کے معنی ہیں کہ سرے سے ایسے معبود کا کوئی وجود ہی نہیں، جو صفتِ وحدانیت سے متصف نہ ہو۔
من مزیدۃ للاستغراق (بیضاوی) والمعنی وما الٰہ قط فی الوجود الا الٰہ موصوف بالوحدانیۃ لاثانی لہ (کشاف) اکد ذلک بزیادۃ من الاستغراقیۃ (بحر)

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ

اور جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے وہ اُن میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر بڑھا دیتا ہے ۲۲۱

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا

اور ہم نے اُن کے درمیان دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے ۲۲۲ جب جب وہ لڑائی کی

أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ

آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اُسے بجھا دیتا ہے ۲۲۳ اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ۲۲۴

۲۲۱ اپنے ضد و عناد کی بنا پر اسی نسخۂ شفا کو یہ لوگ اپنے حق میں ازدیادِ مرض کا سبب بنا لیتے ہیں۔
مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ ۔ یعنی یہی قرآن۔

۲۲۲ یعنی اُن کا ہر قبیلہ اور فرقہ دوسرے کا دشمن ہے۔
بَيْنَهُمْ ۔ مراد یہود کے اندر کے فرقے اور قبیلے ہیں کہ یہود ہی کا ذکر قریب میں ہے۔
ای القینا بین طوائف الیھود (قرطبی) المراد وقوع العداوۃ بین فرق الیھود (کبیر)
جائز یہ بھی ہے کہ ضمیر کُل اہلِ کتاب کی طرف ہو جس کا ذکر اس کے قبل آچکا ہے۔
قال مجاھد ای بین الیھود والنصاریٰ (قرطبی) المراد منہ مابین الیھود والنصاریٰ من العداوۃ وھو قول الحسن ومجاھد (کبیر)

۲۲۳ آگ کا بجھانا یہ کہ اللہ اُن کی یہ شرارتیں چلنے نہیں دیتا، اُن کی تدبیریں باطل کر دیتا ہے خصوصاً اس طرح کہ ان ہی میں کے ایک دوسرے کے مخالف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔
اطفاؤھا صرف اللہ عنھم ذلک وتفریق آرائھم وحل عزائمھم وتفرق کلمتھم والقاء الرعب فی قلوبھم (بحر)
أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ ۔ یعنی مومنین کے خلاف جنگ کی تدبیریں سوچتے ہیں، جنگ کے نقشے تیار کرتے ہیں۔ جنگ کی آگ روشن کرنا، عربی محاورہ میں کنایہ ہے جنگ کی تیاری سے۔
قال الجمھور ھو استعارۃ وایقاد النار عبارۃ عن اظھار الحقد والکید والمکر بالمؤمنین والقتال (بحر) ایقاد النار کنایۃ عن ارادۃ الحرب (روح)
قدیم اہلِ عرب جنگ کے وقت واقعۃً بھی آگ روشن کیا کرتے تھے اور اس اعتبار سے یہ فقرہ محض مجازاً واستعارۃً نہیں بلکہ لفظاً بھی صحیح ہو جاتا ہے۔

۲۲۴ (دوسرے دوسرے ذرائع سے)
دنیا میں قانونِ الٰہی کے نفاذ کی مخالفت کرنا خواہ وہ کسی عنوان سے بھی ہو بہرحال اور بہرصورت فساد فی الارض ہی ہے انفرادی بربادی واجتماعی ہلاکت دونوں کا پیش خیمہ۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا

درآں حالیکہ اللہ فساد پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۲۲۵ اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار

لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ

کرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں اُن سے دور کر دیتے اور ہم ضرور انھیں نعمت کے باغوں میں داخل کر دیتے ۲۲۶ اور

اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا

اگر وہ توریت اور انجیل کی پابندی کرتے اور اُس کی جو اُن پر ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) نازل ہوا ہے ۲۲۷

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ

تاکہ یہ لوگ (خوب) کھاتے (رزق) اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پیروں کے نیچے سے (بھی) ان ہی میں ایک جماعت میانہ رو بھی ہے ۲۲۹

۲۲۵ (بلکہ سخت مبغوض رکھتا ہے)
اللہ کی رضامندی کو فساد فی الارض سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔
فساد تو نام ہی غیر طبعی مرضیاتِ الٰہی کے خلاف صورت حال کا ہے۔

۲۲۶ اٰمَنُوْا یعنی قرآن اور حامل قرآن پر ایمان لاتے۔
اٰمَنُوْا کے مطلق رکھنے میں بعض اہل علم نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ اہل کتاب اگر محمد رسول اللہ پر ایمان لے آئیں تو یہ تو خیر عین مقصود ہی ہے لیکن اگر اپنے پیمبر اور اپنی ہی کتاب پر سچا اور پورا ایمان رکھیں تو پیمبر کی ہدایت اور کتاب کی عبارت بھی تو بالآخر انھیں اسی ایمان مصطفوی پر لائے گی ۔

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است — عاقبت ما را بداں شہ رہبر است

۲۲۷ (بہ واسطہ نبی آخر الزماں)
مراد قرآن و شریعت اسلامی ہے۔
اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مراد ہے ان کتابوں کی عدم تحریف اور ان کے احکام پر عمل۔
واقامة التورٰىة والانجيل العمل بمقتضاهما وعدم تحريفهما۔ (قرطبی)
وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ اس کے معنی علاوہ قرآن مجید کے خود ان کے انبیاء کی دوسری کتابوں کے بھی کئے گئے ہیں
قيل كتب انبياءهم (قرطبی) من سائر كتب الله لانهم مكلفون الايمان بجميعها۔ (مدارک)

۲۲۸ یعنی اس دنیا میں آسمانی اور زمینی برکتوں سے خوب تمتع حاصل کرتے۔
فَوْقِ وتَحْتِ کے الفاظ عموم تمتع دنیوی اور زور و تاکید کے لئے ہیں۔
ذكر فوق وتحت للمبالغة فى ما يفتح عليهم من الدنيا (قرطبی) المراد منه المبالغة فى شرح السعة (کبیر)

وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ

لیکن اکثر ان میں کے ایسے ہیں جو بہت ہی برا کر رہے ہیں ۲۳۰ اے (ہمارے) پیغمبر جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار

إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ

کی طرف سے اترا ہے وہ (سب) آپ (لوگوں تک) پہنچا دیجئے ۲۳۱ اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں ۲۳۲

آیت سے یہ استنباط بھی کیا گیا ہے کہ طاعت و عمل صالح خوشحالی اور وسعت رزق کے موجبات میں سے ہیں۔

دلت الآیۃ علی ان العمل بطاعۃ اللہ تعالیٰ سبب لسعۃ الرزق (مدارک)

۲۲۹ (اور یہی میانہ رو جماعت آگے چل کر ایمان لے آئے گی)

مُّقْتَصِدَةٌ۔ اقتصاد۔ کے معنی عمل میں راہ اعتدال اختیار کرنے کے ہیں۔

والاقتصاد الاعتدال فی العمل (قرطبی)

یہاں مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت عیسیٰ مسیح کے باب میں نہ افراط کے غلو تک پہنچ جاتے ہیں، نہ تفریط کے قعر میں گر پڑتے ہیں

مقتصدۃ فی القول فی عیسیٰ ابن مریم (ابن جریر)

مسیحیوں میں نجاشی شاہ حبشہ اور ان کے رفقاء اور یہود میں عبداللہ بن سلام اور ان کی جماعت یہ سب اسی امت مقتصدہ کے افراد ہوئے ہیں

۲۳۰ اشارہ اہل کتاب کی تحریف کتب و تکذیب انبیاء کی جانب ہے۔

۲۳۱ (اور اسی کا نام حق رسالت ادا کر دینا ہے)

مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ۔ اس میں قرآن مجید کے سارے کا سارا آجانا تو ظاہر ہی ہے باقی جو چیزیں وحی خفی کے ذریعہ سے رسول اللہ صلعم کو تعلیم ہوتی تھیں، وہ بھی اس عموم میں شامل ہیں۔

قال ابن عباسؓ المعنی بلغ جمیع ما انزل الیک (قرطبی) فیہ امر للنبی صلعم بتبلیغ الناس جمیعا ما ارسلہ بہ الیہم من کتابہ واحکامہ وان لا یکتم منہ شیئا خوفا من احد ولا مداراۃ لہ (جصاص) جمیع ما انزل الیک (مدارک)

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ۔ تبلیغ کے موقع پر یہ انداز خطاب بجائے خود نہایت بلیغ و حکیمانہ ہے کہ اے مخاطب تمہاری تو حیثیت ہی تمام تر رسول کی، پیغام پہنچانے والے کی ہے۔

۲۳۲ یعنی اگر آپ نے کوئی بات احکام خداوندی میں سے چھپا لی تو گویا آپ نے فریضۂ رسالت ادا ہی نہیں کیا۔

فان کتمت شیئا منہ فما بلغت رسالتہ (قرطبی عن ابن عباسؓ) لضرانہ ان ترک تبلیغ شیء منہ فھو کمن لم یبلغ شیئا (جصاص) فکانک لم تبلغ الرسالۃ اصلا (مدارک) لان کتمان بعضہا ککتمان کلہا (جلالین)

اور ایسے مفروضات اور محالات عادی ہی نہیں بلکہ محالات عقلی، مثلاً ایک کے بجائے دو خداؤں کا ہونا، تو قرآن مجید نے بیان توحید تک تو روا رکھے ہیں، ان میں رد آ گیا ان غالی اہل ضلال کا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ نے نعوذ باللہ کسی خوف یا مصلحت سے قرآن مجید ہم تک پورے کا پورا نہیں، بلکہ کسی قدر ناقص صورت میں پہنچایا ہے۔

دلت علی انہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یسر الی احد شیئا من امر الدین (قرطبی)

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۶۷

اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا ۲۳۳؎ یقیناً اللہ کافر لوگوں کو راہ نہ دکھائے گا ۲۳۴؎

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

آپ کہہ دیجیے کہ اہل کتاب تم کسی بھی راہ (حق) پر نہیں جب تک تم توریت و انجیل کی پابندی نہ کرو اور اس

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

(کتاب) کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے اوپر اتری ہے ۲۳۵؎ اور جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا

مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸

گیا ہے وہ یقیناً ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کو بڑھا کر رہے گا، ۲۳۶؎ تو آپ کافروں پر افسوس نہ کیجیے ۲۳۷؎

اور حقیقۃً یہ ہے بھی مرتبۂ رسالت سے بہت ہی گری ہوئی چیز کہ پیمبر یا عبد کامل بھی کوئی حکم شریعت کسی مروت یا کسی خوف سے چھپا جائے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کیسی لطیف اور سچی بات اس موقع پر کہی ہے کہ اگر آپ کوئی سا بھی جزو قرآن کریم کا چھپا جاتے تو وہ یہی جز چھپاتے

قالت لوکان محمد کاتما شیئا من القرآن لکتم ھذہ الآیۃ (ابن کثیر)

فقہاء نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ رسولؐ کی طرح علماء امت کے لئے بھی کسی مسئلۂ شریعت کا اخفاء و کتمان جائز نہیں

ھذا تادیب للنبی صلعم وتادیب لحملۃ العلم من امتہ الا یکتموا شیئا من امر شریعتہ (قرطبی)

۲۳۳؎ (کہ آپ کے قتل و ہلاک پر قدرت حاصل کرسکیں)

اس لئے آپ تبلیغ کے باب میں تو اپنی جان کی ذرا فکر نہ کیجیے، مخالفین و معاندین جو کچھ بھی چاہیں کرتے رہیں۔

یعصمک من القتل فلا یصلون الی قتلک (معالم)

ایک سوال یہاں یہ پیدا کیا گیا ہے کہ جب محفوظیت کا وعدہ ہو چکا تھا، تو پھر جنگ احد میں جسم مبارک کو جراحتیں کیسے پہنچیں؟ مفسرینؒ اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں لیکن سب سے زیادہ صاف اور بے تکلف جواب حضرت تھانویؒ کے قلم سے یہ ہے کہ وعدہ محفوظیت سیاق تبلیغ میں کیا گیا ہے اس لئے اس کا تعلق بھی قدرۃً اتنی ہی محفوظیت سے ہے جو آپ کے فرائض تبلیغ میں مانع نہ ہو، بالکلیہ محفوظیت نہ مقصود تھی نہ ہو سکتی تھی کہ مرض، صدمہ، زخم وغیرہ تو حکمت تکوینی کے ماتحت رفع درجات و ترقی مراتب کے لئے ضروری ہیں آیت سے علماء نے یہ استنباط بھی کیا ہے کہ علماء حق پرست خدا کے کام کو اپنے ذمہ سمجھیں اور اپنی ضرورتوں کا کفیل اسی کے فضل کو سمجھے رہیں۔

۲۳۴؎ (کہ آپ تک پہنچ کر اپنے ملعون منصوبوں کو پورا کرسکیں)

لایمکنھم مما یریدون انزالہ بک من الہلاک (کشاف)

۲۳۵؎ یہاں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ مدار فضیلت کا، مقبولیت کا، احکام الٰہی کا اتباع ہی ہے تو پھر جب سرے سے اس سے گریز ہے تو کیسی افضلیت اور کہاں کی مقبولیت؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ

بے شک جو لوگ ایمان لا چکے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور صابی اور نصرانی (غرض) جو بھی اللہ اور روزِ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۹)

آخرت پر ایمان رکھتا ہوا اور نیک عمل بھی کرے سو ایسوں کو نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۲۳۸ؔ

عَلٰی شَیْءٍ۔ یعنی راہِ راست و دینِ حق۔

ای علی دین یعتد به (کشاف۔ بیضاوی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بغیر اتباعِ شریعت کے کوئی کمال معتبر نہیں۔

۲۳۶ؔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۲۱

۲۳۷ؔ حضورِ انورؐ فرطِ شفقت و ترحم سے کافروں کے حال پر بےچین و مضطرب رہا کرتے تھے ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ اتنا غم و تاسف نہ کیجئے، یہ لوگ اپنی ضد و عناد کی بنا پر مستحق کسی ہمدردی و رعایت کے نہیں۔

آیت رسول اللہ کی تسلی کے لئے ہے آپ کو ممانعت نفسِ حزن سے نہیں کی گئی ہے کہ وہ آپ کے لئے ایک امرِ طبعی تھا، بلکہ افراطِ حزن سے کی گئی ہے۔

وهذه تسلية للنبي صلعم وليس بنهي عن الحزن لانه لا يقدر عليه ولكنه تسلية ونهي عن التعرض للحزن (قرطبی) لا تتأسف بسبب نزول اللعن والعذاب عليهم فانهم من الكفرين المستحقين لذلك (کبیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اعراض کرنے والوں پر زیادہ قلق نہ کرے جیسا کہ بعض مبالغین فی الشفقۃ کرتے ہیں۔

۲۳۸ؔ آیت کے الفاظ و مطالب کی تشریح پارۂ اول رکوع ۸ آیت ۶۲ کے تحت گزر چکی۔

سورۂ توبہ کی آیت ولا یدینون دین الحق الخ کے تحت میں الصابئون پر بھی حاشیہ درج ہو گزر چکا ہے، باقی محقق جصاص رازی حنفیؒ نے ایک بات صابیوں کے بارے میں یہ لکھی ہے کہ ان کے اندر دو فرقے ہیں، وہم فریقان، ان میں سے ایک فرقہ جو نواحی کسکر و بطائح میں رہتا ہے اس کا دین نصاریٰ سے مشابہ ہے، اور یہ لوگ حضرت یحییٰ اور حضرت شیث پیمبروں کو مانتے ہیں، اور ان پر کتبِ آسمانی کا نزول تسلیم کرتے ہیں۔

والنصرى تسميهم يوحنايه فهذه الفرقة	نصاریٰ انھیں کو یوحنایہ (جان دی بپٹسٹ کا ماننے
يجعلها ابو حنيفة من اهل الكتب ابيح اكل	والا) بتلاتے ہیں، اور اسی فرقہ کے لئے امام ابوحنیفہ کا قول
ذبائحهم ومناكحة نسائهم (جلد ۲ ص۱۱۳-۱۱۴)	ہے کہ یہ اہلِ کتاب ہیں، ان کا ذبیحہ جائز اور ان کی
	عورتوں سے نکاح درست۔

اور انھیں صابیوں کا ایک دوسرا فرقہ ہے، جو نواحِ حرّان میں آباد ہے، وہ بُت پرست ہیں، اور نہ کسی نبی کو مانتے ہیں، اور نہ کسی کتاب آسمانی کے قائل ہیں۔

فهؤلاء ليسوا اهل الكتاب ولاخلاف ان	تو یہ لوگ نہ اہلِ کتاب میں داخل ہیں، اور نہ اس میں

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا

بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس (بہت سے) پیغمبر بھیجے ۲۳۹ جب جب کوئی

جَآءَهُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوَىٰٓ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ﴿٧٠﴾

پیغمبر ان کے پاس ایسا حکم لائے جس کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا تو بعض کو جھٹلاتے تھے اور بعض کو تو مار ہی ڈالتے تھے ۲۴۰

وَحَسِبُوٓا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ

اور یہی گمان کرتے رہے کہ (وہاں) کچھ نہ پڑے گا ۲۴۱ سو اندھے اور بہرے ہوگئے ۲۴۲ پھر اللہ نے ان پر رحمت سے توجہ فرمائی ۲۴۳

[illegible] لا [illegible] وهم
[illegible] الى حنيفة في معاملة الصابئين من
اهل [illegible] محمول على مراجعة الفرقة الاولى وهما
ابو يوسف ومحمد [illegible] الصابئين ليسوا
اهل [illegible] محمول على الفريقين.

کوئی اختلاف ہے کہ ان کا ذبیحہ درست ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے تو امام ابوحنیفہؒ نے جن صابئین کو اہل کتاب میں شمار کیا ہے اس سے ان کی مراد صابئین کا فرقہ اول ہی سے ہے اور امام ابویوسفؒ و امام ابو محمدؒ کے ہاں صابئین بلا کسی تفریق و تفصیل کے دائرہ اہل کتاب سے خارج ہیں۔

۲۳۹ چنانچہ قوم بنی اسرائیل کی تاریخ گویا انبیاء مرسلین ہی کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔
مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔ یہ عہد توحید ہی سے متعلق تھا۔

۲۴۰ یعنی کم و بیش مخالفت تو انہوں نے سب ہی انبیاء کی کی، جو ذرا سا بھی کوئی حکم ان کی مرضی کے خلاف لے کر گئے لیکن بعض کی تکذیب سے گزر کر بات تک کر ڈالا۔ یہود کے قتل انبیاء وغیرہ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔ انجیل میں بیان اس سے کہیں زیادہ زوردار الفاظ میں دُہرایا گیا ہے:۔

"اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچوگے، اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے، اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے ماروگے، اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے" (متی ۲۳ : ۳۲-۳۴)

ملاحظہ ہوں پارۂ اول کے حاشیے آیت ۶۱ پر۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ سارے کبائر کی اصل اتباع ہویٰ ہے، اس لئے صوفیاء اس کے استیصال کی سخت کوشش کرتے رہے ہیں۔

۲۴۱ (ان پر تکذیب انبیاء اور قتل انبیاء کا)
فِتْنَةٌ کے ایک معنی سزا کے بھی ہیں۔
فتنه العذاب (قاموس)
قرآن مجید میں بھی فتنہ ایک دوسرے موقع پر اسی معنی میں آیا ہے۔
ذوقوا فتنتكم اى عذابكم (راغب)

ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

پھر بھی ان میں کے بہت سے اندھے اور بہرے ہی بنے رہے اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے ان کے کرتوت۲۴۴ے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ

یقیناً وہ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو مسیحؑ ابن مریمؑ ہے۲۴۵ے حالانکہ (خود)

الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ

مسیحؑ نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میرے پروردگار اور اپنے پروردگار (یعنی) اللہ کی عبادت کرو۲۴۶ے

اہلِ تحقیق نے یہی معنی یہاں بھی لئے ہیں۔

ای عذاب وقتل (معالم)

صحیفۂ زبور میں حضرت داؤدؑ کی ایک مناجات بھی اسی معنی ومفہوم کی تائید میں ہے:۔

"اے خداوند! شریر کب تک، ہاں شریر کب تک شادیانے بجائیں گے؟ وہ بکتے اور گستاخی کی باتیں بولتے، سارے بدکاری کرنے والے لاف زنی کرتے، اے خداوند تیرے لوگوں کو پیس ڈالتے ہیں اور تیری میراث کو دکھ دیتے ہیں اور بیوہ اور پردیسی کو جان سے مارتے ہیں اور یتیم کو قتل کرتے ہیں اور کہتے ہیں خداوند نہ دیکھے گا، یعقوب کا خدا ہرگز نہ سمجھے گا" (زبور ۹۴: ۳-۷)

فتنۃ کے مشہور ومتعارف معنی آزمائش کے ہیں، وہ بھی یہاں لیے جا سکتے ہیں اور بعض مفسرین نے یہی اختیار کئے ہیں۔

انہ لا یقع من اللہ عزوجل ابتلاء واختبار بالشدائد (قرطبی)

۲۴۲ے یعنی ان کے اس گمان وپندار نے اور حق تعالیٰ کی طرف سے مہلت نے انھیں قبولِ حق وکلمۂ حق کی طرف سے اور زیادہ غافل وبے نیاز کر دیا۔

عموا عن الھدیٰ وصموا عن سماع الحق (قرطبی) عموا عن الرشد وصموا عن الوعظ (مدارک)

۲۴۳ے (اور مزید ہدایت کے لئے کوئی اور پیمبر اُن میں بھیجا)

یا عام قانونِ رحمت کے مطابق، انھیں کسی اور طرح ہدایت کے مواقع آئے۔

۲۴۴ے (اور وقت مناسب پر انھیں سزا دے کر رہے گا)۔

فیجازیھم بحسب اعمالھم (مدارک)

صحیفۂ زبور میں حضرت داؤدؑ کی زبان سے ہے:۔

"اے قوم کے بے وقوفو سمجھو! اے جاہلو تم کب ہوشیار ہوگے؟ وہ جس نے کان لگایا کیا نہیں سنتا؟ وہ جس نے آنکھ بنائی کیا نہیں دیکھتا؟ وہ جو قوموں کو تنبیہ دیتا ہے کیا وہ سزا نہ دے گا؟ وہ جو انسان کو دانش سکھلاتا ہے کیا وہ واقفیت نہ رکھتا ہوگا؟" (زبور ۹۴: ۹)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی پر اصرار سے استعداد بالکل مضمحل ہو جاتی ہے اور اسی کو بطلانِ استعداد کہا جاتا ہے۔

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ

جو کوئی اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک کرے گا، سو اللہ اس پر جنت حرام کردے گا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ

النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا

کی آگ ہے اور (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۲۴۷ یقیناً وہ (بھی) کافر ہوگئے جنہوں نے کہا کہ

إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ

خدا تین میں سے تیسرا ہے۔ ۲۴۸ حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے ۲۴۹

۲۴۵ ملاحظہ ہو اسی سورہ کا حاشیہ ۲۶۰۔ خوب خیال کرلیا جائے کہ قرآن مجید النصاریٰ اور ان صحیح کافروں بلکہ مشرکوں کے درمیان فرق کرتا ہے ان لوگوں کا ذکر نام کے ساتھ نہیں صرف صفات کے ساتھ کرتا ہے اور انہیں ایک الگ مستقل امت قرار دیتا ہے۔ ہبرٹ جرنل (لندن) دنیائے مسیحیت کا ایک بلند پایہ علمی سہ ماہی رسالہ ہے اس کے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے نمبر میں ہے: "مسیحی کے عقیدہ میں مسیح تمام تر خدا ہیں، عقلاً جو عقیدہ جتنا زیادہ مستبعد ہو اسی قدر خوش عقیدگی سے قریب تر ہے"۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں صاف رد ہے حلول واتحاد کا جس کے قائل جاہل صوفیاء ہوئے ہیں۔

۲۴۶ ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران آیت ۵۱

قرآن مجید کے بیان کی تائید اس حد تک تو موجودہ محرّف انجیلیں بھی کررہی ہیں:۔

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر"۔ (متی ۴: ۱۰) "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت"۔ (لوقا ۴: ۸) "یسوع نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ (لوقا ۱۸: ۱۹)

۲۴۷ (جو شفاعت کی حد تک بھی اُن کی مدد کرسکے)

یہ سب جدید مسیحیوں یا عیسائیوں کے لئے آئینہ ہیں، جو مسیح پرستی کے شرک کو اپنے لئے باعث ننگ نہیں باعث فخر سمجھے ہوئے ہیں۔

مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ۔ ہر قسم کے شرک پر حاوی ہے خواہ ذاتی ہو یا صفاتی۔

مِنْ أَنْصَارٍ صیغۂ جمع لانے میں نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے بہت سے ناصروں اور شافعوں کا زعم تھا۔

۲۴۸ موجودہ مسیحیوں کے کافر بلکہ مشرک ہونے پر یہ صاف نصوص موجود ہیں، مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ بیٹا، روح القدس یہ تینوں اقنوم (اصل) منفرداً بھی خدا ہیں اور مجتمعاً بھی، تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی۔

۲۴۹ (جو نہ اقنوموں میں تقسیم ہے نہ اور کسی طرح)

مِنْ إِلَٰهٍ۔ میں مِنْ زائد کلیت یا استغراق کے لئے ہے اور آیت کے معنی ہیں کہ سرے سے ایسے معبود کا کوئی وجود ہی نہیں، جو صفتِ وحدانیت سے متصف نہ ہو۔

من مزيدة للاستغراق (بیضاوی) والمعنى وما الٰه قط فى الوجود الا الٰه موصوف بالوحدانية لا ثانى له (کشاف) اکّد ذلك بزيادة من الاستغراقية (بحر)

وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ

اور اگر یہ لوگ اپنے (ان) اقوال سے باز نہ آئے تو ان میں سے جو لوگ کافر رہیں گے ان پر عذاب

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ

دردناک واقع ہو کر رہے گا ۲۵۰؎ سو یہ لوگ اللہ کے سامنے کیوں توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے ؟

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ

درانحالیکہ اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے ۲۵۱؎ مسیحؑ ابن مریمؑ اور کچھ نہیں ہیں بجز ایک رسول کے ۲۵۲؎

وٰحد۔ صفات کی یکتائی وغیرہ کے علاوہ عدد کے لحاظ سے بھی ایک۔ اس لفظ کا استعمال جب ذات باری تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے تو اس سے مراد ایسی ذات ہوتی ہے جس میں تجزی بھی ناممکن ہو اور تکثر بھی ایسی ذات فرد جس کے لئے وحدت ہمیشہ اور لازمی ہو اور جو کسی کی شرکت کو قبول ہی نہ کرے۔

واذا وصف اللہ تعالٰی بالواحد معناہ ھو الذی لا یصح علیہ التجزی ولا التکثر (راغب)

الواحد ھو الفرد الذی لم یزل وحدہ ولم یکن معہ آخر (نہایۃ) یہ وہ ذات ہے جو بے مثل و بے نظیر ہونے میں منفرد اور ناقابل تقسیم و تجزی ہو لے اور بے مثل و نظیر ہونے کے اوصاف بس ذات باری ہی میں جمع ہو سکتے ہیں۔

وقال ابو منصور الواحد منفرد بالذات فی عدم المثل والنظیر (تاج) وقیل الواحد الذی ھو لا یتجزأ ولا یثنی ولا یقبل الانقسام ولا نظیر لہ ولا مثل ولا یجمع ھذین الوصفین الا اللہ تعالٰی (تاج۔ نہایۃ)

۲۵۰؎ (آخرت میں ان کے کفر صریح کے پاداش میں)

عَمَّا يَقُوْلُوْنَ۔ یعنی تثلیث کے اس مشرکانہ قول و عقیدہ سے۔

ای یکفوا عن القول بالتثلیث (قرطبی)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ۔ یعنی ان میں جو لوگ کافر رہ جائیں گے اس کے بعد بھی کہ ان کے عقائد کی گمراہی ان پر پوری طرح واضح ہو چکی۔

ای الذین اقاموا علی ھذا الدین (کبیر۔ عن الزجاج) الذین بقوا منھم علی الکفر (بیضاوی)

مِنْهُمْ۔ میں مِنْ تبعیضیہ ہے، علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنے اس مشرکانہ عقیدہ سے باز آجائیں گے اور ایمان لے آئیں گے، ایسے لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔

خص الذین کفروا بعلمہ ان بعضہ یؤمنون (معالم)

۲۵۱؎ ان لوگوں کی حماقت دکھائی ہے کہ ابھی مہلت باقی ہے، اور پھر ایسے غفور و رحیم خدا کے سامنے توبہ و استغفار کر کے اس کے عفو و رحمت سے فائدہ نہیں اٹھاتے!

غَفُوْرٌ۔ غفور۔ اس کے حق میں جو طالب مغفرت ہو۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ

اُن سے قبل بھی (اور) رسول گزر چکے ہیں ۲۵۳ اور ان کی ماں ایک راستباز بی بی تھیں ۲۵۴ دونوں کھانا کھاتے تھے ۲۵۵

الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

دیکھو کہ ہم کس کس طرح صاف صاف دلائل ان کے سامنے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھو کہ وہ کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں ۲۵۶

رَّحِيْمٌ . رحمٰن اس کے حق میں جو طالب رحمت ہو۔
مسیحیوں کے رد کے موقع پر ان صفات کے لانے میں شاید ایک پہلو یہ بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ تو خود غفور و رحیم ہے، اس کے ان ذاتی صفات کو بروئے کار لانے کے لئے اس کی کوئی ضرورت تھوڑے ہی ہے کہ کوئی "ابن اللہ" اپنے کو سب کی طرف سے بہ طور فدیہ و کفارہ پیش کرے!

۲۵۲ (نہ کہ خدا یا فرزند خدا . یا معاذ اللہ دشمن خدا)
یہ عیسیٰ مسیحؑ کا صحیح مرتبہ بیان کر دیا، اس میں رد آ گیا، ایک طرف مسیحی افراط کا جو آپ کو مظہر خدا یا اوتار سمجھتے تھے اور دوسری طرف یہودی تفریط کا، جو معاذ اللہ آپ کو ایک شعبدہ باز ساحر قرار دیتے تھے، پ۶ سورۃ النساء کے حواشی ۴۲۳ و ۵۱۰ (یعنی حواشی آیت نمبر ۱۷۱) وغیرہ بھی ایک بار پھر ملاحظہ کر لئے جائیں۔
اِبْنُ مَرْيَمَ . ابن مریم لا کر مسیح پرستوں کو یہ یاد دلا دیا کہ مسیح تو ایک عورت، فانی عورت کے بطن سے تھے، بشر کے سوا اور ہو کیا سکتے تھے۔

۲۵۳ (اور ان ہی کے سے ایک رسول یہ بھی ہیں، نہ وہ اوتار یا دیوتا تھے، نہ یہ اوتار یا دیوتا ہیں)
۲۵۴ (نہ کہ مادر خدا جیسا کہ مسیحیوں نے قرار دے لیا ہے، اور نہ کہ معاذ اللہ بے عصمت جیسا کہ یہودیوں نے انھیں متہم کر رکھا ہے)
صِدِّيْقَةٌ . وہ ہے جو نافرمانی سے غایت بُعد اور فرمانبرداری میں کمال رکھتی ہو۔
المراد بكونها صديقة غاية بعدها عن المعاصي وشدة جدها واجتهادها في اقامة مراسم العبودية (كبير)

اردو محاورہ میں پورا مفہوم لفظ "ولیہ" یا "ولی بیوی" ہی سے ادا ہوتا ہے اور شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ میں ولیہ ہی استعمال کیا ہے، اس ایک لفظ میں پورا رد آ گیا، مسیحیوں کی افراط اور یہودیوں کی تفریط دونوں کا۔

۲۵۵ (اور اپنے سارے کمالاتِ بشری کے باوجود احتیاجات بشری سے منزہ و بالاتر نہ تھے۔)
اس نے بتا دیا کہ یہ مقدس ماں اور مقدس تر فرزند دونوں بہر حال قوائے بشری ہی سے مرکب تھے اور کھانے پینے ساری بشری ضرورتوں کے محتاج، تو جو ایسے صاحب احتیاج ہوں انھیں خدائی کا مرتبہ دیتے ہوئے تثلیثیوں کو شرم نہیں آتی؟

۲۵۶ اور اس طرح کے خرافات میں برابر پڑے ہوئے ہیں کہ "باپ" "بیٹا" اور "روح القدس" تینوں جدا جدا مستقل اقنوم ہیں، "عالم لاہوت" میں تینوں کی وحدت ایک ہی خدا ہے تین خدا نہیں "بیٹا" ازل ہی میں باپ سے پیدا ہوا،

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ

آپ کہئے کہ کیا تم اللہ کے سوا ایسے کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ نقصان پہنچا سکے نہ نفع، اور اللہ ہی تو

وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا

(سب کی) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے ۲۵۷ آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اپنے دین

فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا

میں ناحق غلو نہ کرو ۲۵۸ اور ان لوگوں کی من مانی باتوں پر نہ چلو ۲۵۹ جو پہلے (خود بھی)

مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ ع

گمراہ ہو چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہ راست سے (بہت) بھٹک چکے ہیں ۲۶۰

اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں باپ سے ہوا ہے" "روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں بلکہ بیٹے سے بھی ہوا ہے" "خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں، ایک ایک پورا اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ دار ہیں، جہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے" "اقنوم وجود باپ ہے اقنوم حیات بیٹا اور اقنوم علم روح القدس ہے۔"

یہ صرف چند عقیدے بطور نمونہ مسیحیوں کے "اسرار الٰہیات" سے پیش کئے گئے ورنہ اسی طرح اور بھی بہتیرے ہیں، قرآن مجید کہتا ہے کہ ایک طرف سیدھے صاف، سادہ اور ہر شخص کی سمجھ میں آجانے والے بیانِ توحید کو دیکھو اور دوسری طرف الفاظ و اصطلاحات کے اس گورکھ دھندے پر نظر کرو! امام رازیؒ نے سچ کہا جب یہ کہا کہ اس سے بڑھ کر مہمل و نامعقول عقیدے دنیا کے پردہ پر کسی کے نہ ہوں گے۔

ولا يرى في الدنيا مقالة اشد فسادا واظهر بطلانا (کبیر)

۲۵۷ اس ایک عالم کل، ہمہ دان، ہمہ بین، ہمہ تواں کے سوا عبادت کے قابل اور ہے کون؟

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ اللّٰهِ یہ سارا خطاب مسیحیوں ہی سے ہے اور ان کے مشرک ہونے پر نص قرآنی کی مہر لگا رہا ہے، مسیحیوں کی مشہور و ضخیم و مستند انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس میں ایک جگہ فخر کے ساتھ درج ہے کہ کلیسا نے اپنی طویل تاریخ میں "کبھی ایسا نہیں کیا کہ خدا کے ساتھ ساتھ مسیح سے بھی دعا نہ کی ہو"۔ (جلد اول ص۱۰۲)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں رد ہے مشائخ کو مستقل متصرف سمجھنے والے جاہلوں کا۔

۲۵۸ (بلکہ اپنے اصل دین اور عقائد حق پر قائم رہو)

اَهْلَ الْكِتٰبِ سے یہاں مراد مسیحی ہیں اور الکتاب سے انجیل۔

يعني بالكتٰب الانجيل (ابن جرير) قل يا محمد لهؤلاء الغالية من النصارى في المسيح

(ابن جرير) قيل الخطاب للنصارى خاصة (بیضاوی)

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

جو بُرائی انھوں نے اختیار کر رکھی تھی، اُس سے باز نہ آتے تھے، کیسا بے جا تھا جو کچھ وہ کر رہے تھے ۲۶۳ف

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ

آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں ۲۶۴ف کیسا بیجا ہے وہ جسے وہ

لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

اپنے آگے بھیج چکے ہیں، جس سے اللہ ان سے ناخوش ہوا اور وہ لوگ عذاب میں ہمیشہ پڑے رہیں گے ۲۶۵ف

۲۶۲ف اِن مسلسل نافرمانیوں کی داستان سے اسرائیلیوں کے مذہبی نوشتے اور صحیفے خود بھرے ہوئے ہیں نمونے کے طور پر صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"انھوں نے ایسی شرارتیں کیں کہ جن سے خداوند کو غصہ ور کیا، کیونکہ انھوں نے بُت پوجے باوجودیکہ خداوند نے انھیں کہا تھا کہ تم یہ کام نہ کیجیو، اور باوجود اس کے کہ خداوند نے سارے نبیوں اور غیب بینوں کی معرفت سے اسرائیل اور یہوداہ پر باتیں جتائی تھیں، پر انھوں نے نہ سُنا، بلکہ اپنے باپ دادوں کی گردن کشی کی مانند جو خداوند اپنے خدا پر ایمان نہ لائے تھے گردن کشی کی، اور اس کے قانونوں کو اور اس کے عہد کو جو اس نے اپنے باپ دادوں سے باندھا تھا اور اس کی گواہیوں کو جو اُس نے اُن پہ دی تھیں رد کیا اور بطالتوں کو اختیار کیا اور بیہودہ ہوئے اور اُن اُمتوں کے پیرو ہو گئے جو اُن کے گرد و پیش تھیں جنھیں دکھا کے خداوند نے انھیں حکم کیا تھا کہ تم ان کے سے کام مت کیجیو، اور انھوں نے خداوند اپنے خدا کے سب حکم ترک کئے، اور اپنے لئے ڈھالی ہوئی مورتیں یعنی دو بچھڑے بنائے، اور یسیرت بنا رکھی، اور آسمانی ستاروں کی ساری فوج کی پرستش کی اور بعل کی عبادت کی، اور انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا اور فال گیری اور جادوگری کی اور اپنے تئیں بیچ ڈالا کہ خداوند کے حضور بدکاریاں کریں کہ اُسے غصہ دلادیں، ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نپٹ غصہ ہوا"۔ (۲ سلاطین۔ ۱۷: ۱۲-۱۸)

پارۂ اول آیت ۸۳ کے حاشیے بھی ملاحظہ ہوں۔

۲۶۳ف (باوجود بار بار کی تبلیغ وہدایت کے)

یعنی بجائے ندامت واستغفار کے انھیں اپنی کفریات پر اصرار تھا۔

ای کانوا لاینتھون عن منکر اتوہ (ابن جریر) التناھی بمعنی الانتہاء۔ (روح)

دوسرے معنی لایتناھون کے یہ ہو سکتے ہیں کہ "وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے" اور یہی معنی اکثر نے لئے ہیں وھو الذی علیہ الجمہور انہ تفاعل من النھی ای کان لاینھی بعضھم بعضا (کبیر) ای لاینھی بعضھم بعضا (کشاف۔ قرطبی) یک دیگر را منع نمی کردند (شاہ ولی اللہؒ)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

ایمان والوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والے آپ یہود اور مشرکین ہی کو پائیں گے ۲۶۸ؔ اور آپ

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ

ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں سب سے زیادہ قریب انھیں پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ۲۶۹ؔ

۲۶۸ؔ یعنی اسلام سے مخالفت وعداوت تو ہر غیر مسلم کو ہے، لیکن اس عموم میں مرتبۂ خصوصی مشرکین ویہود کو حاصل ہے کہ وہ شدید ترین دشمنانِ اسلام ہیں۔

۲۶۹ؔ آیت پر اشکال متعدد وارد ہوئے ہیں، اور جوابات بھی متعدد دیے جاچکے ہیں، مثلاً ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مراد صرف رسول اللہ صلعم کے معاصر مسیحی ہیں، یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن بنیادی اشکال صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ آیت کے لفظ نصاریٰ پر پورا غور نہ کیا گیا اور اسے "مسیحیوں" کا مرادف سمجھ لیا گیا، آیت میں مسیحی یا عیسائی سرے سے مراد ہی نہیں، بلکہ نصاریٰ سے مراد نصاریٰ ہی ہیں، جو کہ حضرت عیسیٰ کو نبی ماننے والا، نہ کہ انھیں ابن اللہ قرار دینے والا ایک قدیم فرقہ ہوا ہے، اور اس کا شمار ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے اربابِ کلیسا "ملحدوں" میں کرتے رہے ہیں، اور قدیم مفسروں میں بھی کوئی کوئی اس نکتہ تک پہنچ گیا تھا۔

قال مجاهد نزلت فی ناس من اهل الکتٰب کانوا علی شریعة مما جاء به عیسیٰ اٰمنوا بالرسول فاثنی الله علیهم وقال الآخرون هذه صفة قوم کانوا علی شریعة عیسیٰ من اهل الایمان (ابن جریر)

نَصٰرٰى۔ پر مفصل حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا ہے، وہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

قَالُوْٓا۔ کا لفظ بھی حشو نہیں، ذکر اُن کا ہو رہا ہے، جو اپنے نصاریٰ ہونے کا اقرار کر رہے ہیں، موجودہ فرنگی قومیں اور حکومتیں تو اپنے مسیحی ہونے کے بھی کھلے اقرار میں لیت و لعل کرتی ہیں، اور حکومت کو مذہب سے الگ رکھنے ہی کے اظہار کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں، چہ جائیکہ اپنے کو "نصرانی" کہیں، ان ٹھیٹھ دنیادار ملحد نیم مشرک قوموں کو قدیم نصرانیت سے کوئی علاقہ ہی نہیں، اس لئے ان کی مودت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اَقْرَبَهُمْ۔ ذکر یہاں قربِ مطلق کا نہیں، صرف قربِ اضافی کا ہو رہا ہے۔

لَتَجِدَنَّ۔ میں اگر خطاب رسول اللہ صلعم سے سمجھا جائے تو مراد بظاہر صرف آپ کے معاصرین ہی سے ہوگی، اور مشرکین، یہود، نصاریٰ، ہر دور، ہر ملک کے قیامت تک مراد نہ ہوں گے۔

واما صدقه علی اهل العصر الاول فظاهر اتم الظهور (المنار)

العَدَاوَةَ۔ یعنی وہ بغض جس کا ظہور قول و عمل سے ہوتا رہے۔

بغضا یظهر اثرها فی القول والعمل (المنار)

مَوَدَّةً۔ یعنی وہ محبت جس کا ظہور قول و عمل سے ہوتا رہا ہے۔

محبة یظهر اثرها فی القول والعمل (المنار)

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ

اور وہ جب اس (کلام) کو سنتے ہیں جو پیمبر پر اتارا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھیں دیکھیں گے کہ ان سے

تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا

آنسو بہے ہیں اس لئے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾

سو تو ہم کو بھی تصدیق کرنے والوں میں لکھ لے ۱۲۷۵

۱۲۷۵ یہ تصدیق کرنے والے کون لوگ تھے؟ حدیث و سیر کی کتابیں اس پر متفق ہیں کہ اس سے مراد نجاشی (شاہ حبشہ متوفی ۹ ہجری) اور اس کے درباری ہیں، یہ لوگ سیحی تھے اور قبل ہجرت نبوی جب آپ نے ہجرت مدینہ سے قبل صحابیوں کی ایک جماعت کی ہجرت ملک حبشہ کو کرائی تھی تو ایک موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کی فرمائش پر سر دربار سورۂ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، اس پر نجاشی اور اہل دربار متاثر ہو کر رو پڑے۔

قال ابن عباس نزلت فی النجاشی واصحابہ (کبیر) عن عبد اللہ بن زبیر قال نزلت ھذہ الآیۃ فی النجاشی واصحابہ (ابن کثیر) فبکی واللہ النجاشی حتی اخضلت لحیتہ وبکت اساقفتہ حتی اخضلوا مصاحفھم حین سمعوا ما تلا علیھم ثم قال النجاشی ان ھذا والذی جاء بہ عیسی لیخرج من مشکوۃ واحدۃ (ابن ھشام)

واذا۔ و یہاں عطف ہے خبر سابق لا یستکبرون پر (عکبری)

ما انزل الی الرسول۔ یہ سورۂ مریم کی آیتیں تھیں۔

فقرأ علیہ صدرا من کٓھٰیٰعٓصٓ (ابن ھشام) ثم امر جعفرا ان یقرأ علیھم القرآن فقرأ سورۃ مریم (قرطبی)

اعینھم تفیض من الدمع۔ افاض یعنی آنسو کثرت سے رواں ہو گئے۔

فاض الماء اذا سال منصبًا (راغب)

اہل علم کا تاثر عموماً اس قسم کا ہوتا ہے، وہ ہائے وائے نہیں کرتے البتہ ان کے آنسو چلنے لگتے ہیں۔

وھذہ احوال العلماء یبکون ولا یصعقون ویسألون ولا یصیحون (قرطبی)

مما عرفوا من الحق۔ کلام حق سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو جانا اور گریہ طاری ہو جانا گویا سنت صالحین ہے توریت میں ہے:۔

"سب لوگ شریعت کی باتیں سن کر روتے تھے" (نحمیاہ۔ ۸: ۹)

زیادہ ہنسنا جس طرح غفلت کی دلیل ہے، اسی طرح رقت قلب علامت عبرت پذیری اور بیداری روح کی ہے اور گریہ اور رقت قلب کے فضائل کلام مسیح میں طرح طرح سے وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

"مبارک ہو تم جو اب روتے ہو کیونکہ ہنسو گے" (لوقا۔ ۶: ۲۱)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٨٦﴾

اور جو لوگ کفر کرتے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تو وہی دوزخ والے ہیں ٢٧٤ع

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ

اے ایمان والو! اپنے اوپر ان لذائذ کو جو اللہ نے تمہارے لئے جائز کی ہیں حرام نہ کرلو، اور

لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٨٧﴾

حدود سے باہر نہ نکلو۔ بے شک اللہ حدود سے باہر نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ٢٧٥

الآیة دالة علی ان المومن الفاسق لایبقی مخلدا فی النار (کبیر)

فاثابھم اللّٰه بما قالوا۔ سے اہل سنت نے یہی استدلال کیا ہے کہ اقرار داخل ایمان ہے۔

وفیه دلیل علی ان الاقرار داخل فی الایمان کما ھو مذھب الفقھاء (مدارک)

ونطمع میں و حالیہ لیا گیا ہے۔

والواو فی ونطمع واو الحال (کشاف)

مع القوم الصالحین میں مع فی کے معنی میں بھی سمجھا گیا ہے۔

قیل مع بمعنی فی (قرطبی)

٢٧٤ اولٰئك کے حصر سے یہ ظاہر ہوگیا کہ اصحاب جحیم یعنی دوزخ میں مستقل رہنے والے کافر ہی ہوں گے نہ کہ غیر کافر یا فاسق مسلم۔

یفید الحصر انما ولٰئك اصحاب الجحیم لاغیرھم فھذا یقتضی تخصیص ھذا الدوام بالکفار (کبیر)

٢٧٥ تحریم حلال کی ایک عام اور چلی ہوئی صورت یہ ہے کہ کسی جائز لذت سے بقصد قربت حق اپنے کو ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جائے، غیر مذہب والے اس عادت کا شکار بکثرت ہو چکے ہیں، کسی مسلمان کا ایسی جسارت کرنا گویا اس کا اقرار کرنا ہے کہ شریعت نے فلاں فلاں پرہیز کے مقرر کرنے میں کمی رہ گئی ہے اور اب میں اپنی عقل و تجربہ سے اس فروگذاشت کی تلافی کر رہا ہوں، ہاں کسی طبی یا انتظامی مصلحت کی بنا پر کسی جائز لذت سے دست بردار ہو جانا اور چیز ہے اور بعض بزرگوں سے ترک لذات کے سلسلہ میں جو مجاہدے منقول ہیں، سمجھنا چاہئے کہ وہ اسی قبیل سے ہوں گے، کم سے کم حسن ظن کا تقاضا تو یہی ہے۔

لاتحرموا۔ تحریم اعتقادی، تحریم قولی، تحریم عملی کی تینوں صورتوں پر شامل ہے۔

ای لاتعتقدوا تحریم ما احل اللّٰه تعالٰی لکم ولا تظھروا باللسان تحریم ما احل اللّٰه لکم ولاتجتنبوا عنھا اجتنابا یشبه الاجتناب من المحرمات (کبیر)

طیبات ما احل اللّٰه لکم۔ ان پاکیزہ اور جائز چیزوں میں صرف غذا ہی نہیں، بلکہ لباس، ازدواج وغیرہ ہر قسم کی لذتیں آگئیں اور طیبات کے تحت میں ہر وہ جائز لذت شامل ہے جس کی طرف قلب اور طبیعت کو میلان

فواکہ اور شیرینی اور حلوے کی دوسری لذیذ قسمیں بھی آپ سے نوش فرمانا ثابت ہیں۔

روی انہ کان یاکل الرطب والبطیخ (جصاص) روی ان رسول اللہ صلعم کان یاکل الدجاج والفالوذج وکان یعجبہ الحلواء والعسل (مدارک۔ مجمع)

کلوا۔ کے امر و اجازت کا دائرہ صرف کھانے کی چیزوں تک محدود نہیں، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، سواری، مکان غرض برتنے کی ساری ہی چیزیں اس کے اطلاق میں داخل ہیں۔

الاکل فی ھذہ الآیۃ عبارۃ عن التمتع بالاکل والشرب واللباس والرکوب ونحو ذلک (قرطبی)

والمراد بالاکل التمتع فید خل فیہ الشرب مثل قولہ لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وھو یعم کل ماینتفع بہ من طعام وشراب ولباس ومتاع وماوی (المنار)

ابن عباسؓ صحابی نے فرمایا کہ جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پہنو، بس لحاظ صرف اس کا رکھو کہ اسراف اور فخر و نمائش کے حدود تک نہ پہنچ جاؤ۔

عن طاؤس قال سمعت ابن عباسؓ یقول کل ماشئت والبس ما اخطاتک اثنتین سرفا ومخیلۃ (جصاص)

اور رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ سارے لذائذ جائز ہیں، جو فطرت سلیم کے مطابق ہوں اور جن کے استعمال میں اعتدال ملحوظ رہے اور حرام سے احتیاط۔

ھدی القراٰن فی الطیبات ای المستلذات ھو ما تقتضیہ الفطرۃ السلیمۃ المعتدلۃ من التمتع بھا مع الاعتدال والتزام الحلال کھدیہ فی سائر الاشیاء التی یسرف فیھا بعض الناس ویقصر بعض (المنار)

فقیہ جصاص رازیؒ نے لکھا ہے کہ صحابیوں میں حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت حسنؓ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابوہریرہؓ سے اور مشہور تابعی قاضی شریحؒ سے لباس میں پشمینہ کا استعمال ثابت ہے۔ (احکام القرآن)

کلوا صیغۂ امر ہے لیکن مراد یہاں وجوب نہیں صرف اباحت ہے۔

کلوا صیغۃ امر وظاھرھا للوجوب الا ان المراد ھھنا الاباحۃ والتحلیل (کبیر)

کھانے پینے کے باب میں اسوۂ رسولؐ ہر مومن کے لئے قابل تقلید ہے کہ آپؐ نے کبھی کبھی لذیذ غذاؤں کو بھی تناول فرمایا ہے، خواہ چوپایوں کا، یا پرندوں کا، یا مرغ کا گوشت اور کبھی کبھی سوکھی روکھی پر بھی قناعت کی ہے، خالی جو کی روٹی نمک کے ساتھ، اور کبھی آپؐ نے بھوک میں بھی بسر کی ہے اور کبھی آسودہ ہو کر بھی تناول فرمایا ہے، البتہ کھانے کا اہتمام آپؐ نے کبھی نہیں فرمایا ہے گو آپؐ میٹھا اور سرد بھی پسند فرماتے تھے، اور یہ سب رشید رضا مصری نے اپنی تفسیر المنار میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مما رزقکم اللہ۔ میں من تبعیض کے لئے ہے اس میں ادھر اشارہ ہے کہ جائز چیزوں میں سے کچھ کھاؤ پیو، اور کچھ دوسروں کی نذر کر دو تاکہ اسراف سے بھی بچے رہو۔

کلمۃ من للتبعیض فکانہ قال اقتصروا فی الاکل علی البعض واصرفوا البقیۃ الی الصدقات والخیرات لانہ ارشاد الی ترک الاسراف کما قال ولا تسرفوا۔ (کبیر)

رزقکم اللہ۔ لاکر یہ جتا دیا کہ دنیوی نعمتوں سے تمتع کرنے وقت یہ بہر صورت یاد رہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ

[illegible]

الْأَيْمَانَ ۖ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ

[illegible]

أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ

[illegible] تین دن کے روزے ہیں ۲۸۰

[illegible] غیر اللہ کا عطیہ

[illegible] کا طریقہ ہے۔

۲۷۷ (قانون دنیوی میں)

یعنی ایسی قسم کا کوئی کفارہ واجب نہیں کرتا۔

اللغو فی ایمانکم۔ بے معنی قسموں پر حاشیہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا۔ پ ۲ حاشیہ آیت ۲۲۵

۲۷۸ (اور اس کے توڑنے کی سزا میں دنیوی کفارہ مقرر کرتا ہے۔)

بما عقدتم الایمان۔ جھوٹی قسم ایک تو کسی گزشتہ واقعہ سے متعلق ہو سکتی ہے جیسے کسی واقعہ کا وقوع قسم کو کر بیان کیا جائے اور وہ خلاف واقعہ تھا، یہاں ایسی قسموں کا ذکر نہیں۔ قسموں کی ایک دوسری قسم یہ ہے کہ مستقبل میں کسی امر کے وقوع یا عدم وقوع کو بطور عہد یا قسم کے مؤکد کر کے بیان کیا جائے، یہاں یہی قسم مراد ہے۔

عقدتم۔ عقد کے لفظی معنی گرہ دینے کے ہیں، مجازاً عہد، قسم، بیع وغیرہ کے مؤکد کرنے پر بولا جاتا ہے۔

لفظ کی قرأت عقدتم بلا تشدید اور عاقدتم سے بھی آئی ہے، عقدتم میں تشدید قسم کے زور دار اور مؤکد بنانے کے لئے ہے۔

وقرأ بتشديدها وذلك لتوكيد اليمين (عكبري)

۲۷۹ یہ کفارہ قسم توڑنے کے بعد ہی واجب ہوگا، اس کے قبل نہیں ادا ہو سکتا ہے۔

قسم خواہ ارادۃً توڑی ہو یا بھول چوک سے ٹوٹ گئی ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ کفارہ دونوں صورتوں میں واجب ہوگا۔

اطعام۔ یہ کھانا دونوں وقتوں کا ہوگا، یہ کھانا چاہے دس شخصوں کو ایک دن میں کھلا دیا جائے، یا ایک ہی شخص کو دس دن تک کھلایا جاتا رہے۔

کسوتهم۔ کپڑا ایسا ہو کہ جسم کے اکثر حصہ کے لئے کافی ہو۔

تحریر رقبۃ۔ لفظی معنی گردن آزاد کر دینے کے ہیں، مراد غلام یا باندی کا آزاد کرنا ہے۔

رقبۃ۔ کا لفظ سورۃ النساء ع ۱۳، آیت ۹۲ میں آچکا ہے اور اس کی جمع رقاب سورۃ البقرۃ ع ۲۲ آیت ۱۷۷ میں

ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ

یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم اٹھا چکے اور اپنی قسموں کو یاد رکھا کرو ۲۸۱ اللہ اسی لئے

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾ يٰٓاَيُّهَا

تمہارے لئے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر گزار رہو ۲۸۲ اے ایمان والو!

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ

شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس بڑی گندی باتیں ہیں شیطان کے کام ۲۸۳

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

سو اس سے بچے رہو تاکہ فلاح پاؤ ۲۸۴

او۔ کفارہ کی یہ تینوں صورتیں جو یہاں ارشاد ہوئیں، ان کی ترتیب ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان پر عمل بھی نمبروار اسی ترتیب سے ہو، بلکہ اختیار ہے کہ احوال کا لحاظ کرکے جو کفارہ بہتر معلوم ہو وہی دیا جائے۔

لاخلاف فی ان کفارۃ الیمین علی التخییر (قرطبی) ومعنی او التخییر وایجاب احدی الکفارات الثلاث (مدارک)

بلکہ فقہائے مالکیہ نے تو تصریح کردی ہے کہ ضرورت کا اعتبار کیا جائے: وعندی انہا تکون بحسب الحال فان علمت محتاجا فالاطعام افضل لانک اذا اعتقت لم ترفع حاجتہم وزدت محتاجا (ابن العربی)

۲۸۰ (اور یہ تینوں روزے متواتر ہونے چاہئیں)

یہ رعایتی کفارہ صرف معذوری کی صورت میں ہے اور جوں ہی مقدرت کا عذر ساقط ہوگا یہ رعایت بھی ازخود ختم ہو جائے گی، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی نے یہ کفارہ کے روزے شروع کئے اور دو روزے پورے بھی رکھ چکے تھے کہ اسے طعام یا لباس کی مقدرت حاصل ہوگئی تو اب تیسرا روزہ رکھنے کے بجائے اسے اصل کفارہ ہی دینا چاہئے۔

فمن لم یجد۔ فقہاء نے کہا ہے کہ یہاں مقدرت کا معیار صاحب نصاب ہونا ہے۔

۲۸۱ (تاکہ اس کے توڑنے اور پھر کفارہ دینے کی نوبت ہی نہ آئے)

اذا حلفتم۔ یعنی جب تم حلف لے چکے اور اسے توڑ بھی چکے۔

۲۸۲ شکر یہ اس کا کہ حاکم علی الاطلاق و حکیم مطلق نے تمہاری چھوٹی بڑی دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی ساری ضرورتوں و مصلحتوں کا لحاظ اور سب کی رعایت رکھ لی اور اس طرح تم کو ایک بہترین نظام زندگی کا سرمایہ دار بنا دیا۔

کذالک۔ یعنی ایسی مثالیں کمال تبیین کے لئے بیان ہوتی ہیں۔

ای تبیین لکم ایاتہ تبیینا مثل ذلک (عکبری)

۲۸۳ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں فطرت انسانی اور طبیعت بشری سے پھر کچھ نہ کچھ لگاؤ ہوتا ہے لیکن

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي

شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں دشمنی اور کینہ شراب اور جوے کے ذریعہ

الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ

سے ڈال دے ۲۸۵ اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے ۲۸۶

یہ چاروں چیزیں تو ایسی ہیں کہ انسان ان کی جانب تمام تر خارجی مؤثرات ہی کے اثر سے آتا ہے اور یہ بالکل ہی شیطان کی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ رجس من عمل الشیطان ان کی بالکل صحیح تصویر کشی ہے۔ فطرتِ بشری ان سے خود ابا کرتی ہے۔

خمر اور میسر پر حاشیہ سورۃ البقرۃ رکوع ۲۷ آیت ۲۱۹ کے تحت، اور انصاب اور ازلام پر اسی سورہ مائدہ کے شروع میں درج ہو چکے، شراب اور جوئے کی مادی مضرتوں کے لئے ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن۔

من عمل الشیطان یعنی براہ راست تحریک شیطانی کا نتیجہ، نہ کہ محض نفس بشری کا تقاضہ۔

لأنه مسببٌ عن تسويله وتزيينه (بیضاوی) لانه يحمل عليه فكأنه عمله (مدارک)

محض رجس ہی نہیں بلکہ من عمل الشیطن کی صراحت کے بعد عجیب طفلانہ سوال حال ہی بعض حلقوں کی طرف سے پیش ہوا ہے کہ قرآن میں شراب کی "حرمت" مذکور نہیں۔

۲۸۴ اور فلاح دینی و دنیوی، مادی و روحانی، جسمانی و دماغی، انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے سود و بہبود پر شامل ہے۔ مفسر زمخشری نے لکھا ہے کہ حرمتِ خمر و میسر کے متعدد طریقے قرآن نے اس آیت میں جمع کر دیئے۔

(۱) آیت کی ابتداء کلمہ حصر انما سے کی یعنی ان چیزوں کی بس یہی کل حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) ان دونوں چیزوں کا ذکر انصاب و ازلام جیسی مسلم گندی چیزوں کے ساتھ کیا۔

(۳) انہیں رجس قرار دیا۔ (۴) انہیں عمل شیطان ٹھہرایا۔

(۵) صاف صاف ان سے اجتناب کا حکم دیا۔ (۶) ان سے احتراز کو موجب فلاح بتلایا۔

(۷) ان کی مضرتوں کا ذکر کیا۔

فاجتنبوه میں ضمیر رجس یا عمل الشیطان کی جانب ہے۔

الضمير للرجس (بیضاوی) والضمير يرجع الى الرجس او الى عمل الشيطان (مدارک)

حرمتِ خمر پر اگر دوسرے نصوص نہ موجود ہوں، جب بھی یہی ایک آیت کافی ہے، اس لئے کہ اول تو لفظ رجس موجود ہے، جو خود تحریم کا مقتضی ہے اور پھر فاجتنبوه بصیغۂ امر۔

اقتضت هذه الاية تحريم الخمر من وجهين احدهما قوله رجس لان الرجس اسم فى الشرع لما يلزم اجتنابه والوجه الآخر قوله تعالى فاجتنبوه وذلك امر والامر يقتضى الايجاب (جصاص)

۲۸۵ شراب نوشی اور قمار بازی کی دنیوی مضرتوں اور اخلاقی قباحتوں کی تفصیل لکھنے پر کوئی آئے تو کتاب کی کتاب تیار ہو سکتی ہے، قرآن مجید نے یہاں ان کی صرف سب سے بڑی اور کلیدی مضرت، خانہ جنگی کی طرف اشارہ کر دیا

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ

سو اب بھی تم باز آجاؤ گے؟ ۲۸۶ اور اطاعت کرتے رہو اللہ کی اور رسول کی، اور احتیاط رکھو اور

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

اگر اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو صاف پہنچا دینا ہے ۲۸۷ اور بس

شراب و قمار دونوں کے مضر اثرات شر و فساد کی شکل میں روز مرہ کے مشاہدہ میں ہیں۔ مے نوشی اور جرائم کا قریبی تعلق آج ماہرین فن کے فراہم کئے ہوئے اعداد سے ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور جوئے کی لت میں پڑ کر بڑے بڑے مشاہیر کا اپنی دولت، سلطنت، عزت و ناموس تک گنوا بیٹھنا ہندوستان کے قدیم ترین تاریخی قصہ مہابھارت سے ظاہر ہو رہا ہے۔

جاہلیت عرب کے مہذب باشندے ان دونوں بلاؤں میں بُری طرح مبتلا تھے، ٹھیک اسی طرح جیسے آج جاہلیت فرنگ کی مہذب آبادی پر بھی دونوں بلائیں بری طرح مسلط ہیں، ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن۔

فی الخمر والمیسر۔ میں فی سببیہ ہے یعنی ان کے ذریعہ یا واسطہ سے۔

اے بسببہما (جمل) اے بسبب تعاطیہما (روح) فی متعلقۃ بیوقع وھی بمعنی السبب (عکبری)

الخمر۔ خمر کے اصل معنی اگرچہ صرف شراب انگوری کے تھے لیکن بعد کو یہ لفظ ہر قسم کی نشہ آور شراب کے لئے استعمال ہونے لگا۔

کل شیء اسکر فھو خمر (جصاص) الخمر سمیت لکونھا خامرۃ لمقر العقل وھو عند بعض الناس اسم لکل مسکر وعند بعضھم اسم للمتخذ من العنب والتمر (راغب)

شراب کے سلسلہ میں یہ یاد رہے کہ جس طرح اس کا پینا ناجائز ہے اسی طرح اس کا بنانا، اس کا بیچنا، اس کے کاروبار میں حصہ لینا، اس سے کسی طرح نفع اٹھانا، سب ناجائز ہے۔ حدیث ابوداؤد میں ان اللہ حرم الخمر وثمنھا صاف آچکا ہے اور فقہاء نے تمام متعلقات شراب کی حرمت پر دلائل نقل کئے ہیں۔ "آبکاری" کا عظیم الشان محکمہ اور پُر منفعت کاروبار اسلامی حکومت کے تحت میں ایک منٹ کے لئے بھی زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔

مرشد تھانویؒ نے اس آیت کے ذیل میں خوب فرمایا کہ معاصی میں جیسے اُخروی مضرتیں ہیں، دنیوی قباحتیں بھی بہت ہیں۔

۲۸۶ ذکر اللہ اور الصلوٰۃ میں مناسبت باہمی یہ ہے کہ نماز ذکر الٰہی ہی کی فرد اعلیٰ و افضل ہے اور عام کے ساتھ اس کی صورت خاص کی تصریح کر دینا قرآن مجید کا عام اسلوب بیان ہے، ضمناً اس سے نماز کی عظمت اور اہمیت و اشرفیت پر پوری روشنی پڑ گئی۔

خص الصلوٰۃ من الذکر بالافراد للتعظیم والاشعار بان الصاد عنھا کالصاد عن الایمان (بیضاوی)

وخص الصلوٰۃ من بین الذکر لزیادۃ درجتھا کانہ قال وعن الصلوٰۃ خصوصًا (مدارک)

شراب و جوئے کے دنیوی نقصانات کی طرف اشارہ ابھی اوپر ہو چکا اب بیان ان کی دینی مضرتوں کا ہو رہا ہے۔

[illegible] کی حرمت کی جو تحقیق [illegible] بیت جو بھی ذرا سی صورت میں شطرنج وغیرہ تمام قماری کھیلوں [illegible] تک بھی حد تو رکھا [illegible] اور صحابہ اور تابعین سے بھی منقول ہے۔

[illegible] النرد وقال

[illegible] بالنرد والشطرنج قمار [illegible] (قرطبی)

۲۸۷ (شراب اور قمار)

اصحاب نبی جو [illegible] تھے اسے سنتے ہی پکار اٹھے ہم باز آگئے! ہم باز آگئے!

[illegible] فقالوا انتهينا انتهينا (ابن جریر)

کیا ڈسپلن تھا۔ [illegible] کا اور کیسی زبردست اصلاحی قوت تھی عرب کے امی حکیم کی کہ دم کے دم میں بڑے بڑے [illegible] کو [illegible] بلکہ [illegible] اور صالحین کا سردار بنا دیا! سچ کہا ہے اکبر الٰہ آبادی نے

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا!

فهل انتم منتهون [illegible] کی۔ [illegible] ایک اور [illegible] آرہی تھی اب اس فقرہ نے اسے اور مؤکد کر کے گویا شدت ممانعت پر مہر لگا دی۔

[illegible] انواع الصوارف (بیضاوی)

[illegible] فان الاعذار قد انقطعت (بیضاوی)

صیغۂ استفہام ایسے موقع پر صیغۂ امر سے بھی بلیغ تر ہوتا ہے۔

[illegible] وهذا ابلغ من الامر (عتیق)

علامہ زمخشری نے ایک سوال یہاں یہ پیدا کیا ہے کہ پہلی آیت میں خمر و میسر کا ذکر انصاب و ازلام کے ساتھ کیا ہے اور اگلی میں انھیں دو کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اور خود اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور انھیں کو شراب و قمار سے روکنا مقصود ہے پہلی آیت میں چاروں منکرات کا ذکر ایک ساتھ اس امر کے اظہار کے لئے اور مسلمانوں کو شراب و قمار سے مزید نفرت دلانے کے لئے تھا کہ یہ ایسے اعمال ہیں جن کا ارتکاب اہل جاہلیت و مشرکین ہی کر سکتے ہیں

ذکر الانصاب والازلام لتاکید تحریم الخمر والمیسر [illegible] جمیعا من اعمال الجاهلیة

واهل الشرك [illegible] المقصود [illegible] الخمر والمیسر (کشاف)

۲۸۸ (احکام اور پیام کا سوائے تبلیغ پوری پوری کر چکے اور عذر کی گنجائش کسی کو نہ رہی اب یہاں لانا نہ لانا تمھارا ہی کام ہے)

رسول کی ذمہ داری کے ان حدود کو قرآن مجید نے بار بار بیان کیا ہے اور افراد امت کو قبول ورد ایمان میں بالکل آزاد رکھا ہے۔

اطیعوا الرسول۔ یہ اطاعت اللہ اور رسول کی سارے احکام شریعت میں ہوگی۔
قرآن مجید نے اطاعتِ رسول کی صراحت بار بار کی ہے رسول بہ حیثیت رسول جو بھی حکم دیں اس کی تعمیل

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے ہوں جبکہ وہ لوگ تقوی

مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا

رکھتے ہوں ۲۸۹ اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر تقوی کریں ۲۹۰ اور ایمان رکھتے ہوں اور پھر تقوی کریں اور خوب نیکی کریں ۲۹۱

حکم الٰہی ہی کی طرح ضروری ہے۔

واحذروا۔ یہ احتیاط کا حکم احکام کی نافرمانی سے متعلق چل رہا ہے یعنی نافرمانی سے بچو۔

۲۸۹ (اور اس لئے اس وقت کی حرام چیزوں سے محترز ہوں)

فی ما طعموا۔ جبکہ وہ وہ چیزیں کھا رہے ہوں جو اس وقت میں حلال ہوں۔

طعموا بہ لہ یحرم علیہم (بیضاوی)

روایتوں میں آتا ہے کہ جب شراب و قمار کی حرمت کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے سوال کیا کہ پھر ان کا کیا حشر ہوگا، جو اب تک شراب پیتے اور قمار کا مال کھاتے رہے؟ اور پھر اب زندہ بھی نہیں جو توبہ اور استغفار سے کام لیں، بلکہ وفات پاچکے ہیں، یہ آیت اس پر نازل ہوئی ـــ سوال اسی قسم کا تھا جیسے حکم تحویل قبلہ کے بعد بعض صحابیوں نے سوال کیا تھا کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی جاچکی ہیں، ان کا کیا حشر ہوگا؟ اور اس کا جواب بھی قرآن ہی میں موجود ہے، ماکان اللہ لیضیع ایمانکم ـــ سوال دونوں موقعوں پر بالکل قدرتی تھا، اور آج جن لوگوں نے سوال پر استعجاب ظاہر کیا ہے انھوں نے خود اپنی سطحیت و کم فہمی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

چار چار صحابیوں ابن عباسؓ و جابرؓ، براء بن عازبؓ و انس بن مالکؓ اور چار چار تابعیوں حسنؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ و ضحاکؒ کی سند سے جصاص نے کہا ہے کہ:۔

لما حرم الخمر قال رجال من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھم یشربون الخمر

من ای نحو ھھو لہ النصارٰۃ کیف بمن مات وھم یشربونہ فانزل اللہ تعالیٰ ھذہ الآیۃ۔

۲۹۰ یعنی ان چیزوں کو ترک کردیں جو پہلے حلال تھیں، اور اب حرام ہوگئی ہیں۔

وعملوا الصّٰلحٰت۔ یہ عمل صالح تو دلیل ہے ان کے ایمان و تقوی کی۔

۲۹۱ مطلب یہ ہے کہ نزول شریعت کے ہر دور میں اور ہر منزل میں وہ اتباع احکام اور احترام قیود پر حریص ہوں احسان۔ سلوک شرعی میں آخری مرتبہ کا نام ہے، ایک تو محض کسی کام کو کسی نہ کسی طرح محض کر ڈالنا اور ایک ہے اسی کو بہ خوبی انجام کرنا، دل جمعی کے ساتھ، اس میں حسن و زیبائی کے کمالات پیدا کر کے کرنا، اسی کا نام احسان ہے، اسے اردو کے چلے ہوئے لفظ احسان (و منت) سے کوئی تعلق نہیں، اس قرآنی احسان کا ترجمہ حسن کاری سے بھی ہوسکتا ہے۔

ثم اتقوا۔ اس تقوی سے بھی یہی مراد ہے کہ جو چیز اب حرام ہوئی ہے اسے ترک کردیں۔

وامنوا۔ ایمان کی تصریح سے اشارہ اور ہوگیا کہ بنیاد ہی تو مبنی و منشاء سارے اعمال صالحہ کا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ

اور اللہ تو محبت رکھتا ہے خوب نیکی کرنے والوں سے ۲۹۲ اے ایمان والو! اللہ تمہیں آزمائے گا قدرے شکار سے جس تک

الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ

تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں ۲۹۳ تا کہ اللہ معلوم کرے کہ کون شخص اس سے بے دیکھے ڈرتا ہے ۲۹۴

بغیر جڑ کے شاخوں کے معنی کیا؟ اور بغیر ایمان کے کوئی عمل صالح ہو کیوں کر سکتا ہے۔
جصاص رازی نے کہا ہے کہ تقویٰ کا ذکر آیت میں تین مرتبہ آیا ہے اور ہر مرتبہ ایک نئی مراد ہے پہلے تقویٰ سے اشارہ ماضی کی طرف ہے اور دوسرے سے مستقبل کی طرف، اور تیسرے سے مراد بندوں پر ظلم و زیادتی سے بچنا ہے۔

واعاد ذکر التقاء فی الآیۃ ثلاث مرات فاما الاول فمن اتقی فی ما سلف والثانی الاتقاء منھم فی مستقبل الاوقات والثالث اتقاء ظلم العباد والاحسان الیھم۔

۲۹۲ (سو ایسے ایمان تقویٰ و حسنِ عمل والوں کے مبغوض و مردود ہونے کا تو احتمال ہی نہیں ان کا شمار تو محبوبوں اور مقبولوں میں ہے)
علماء نے اس پوری آیت سے ہر مباح لذت سے پورے استلذاذ و انتفاع کا جواز نکالا ہے۔

قال ابن خویز منداد تضمنت ھذہ الآیۃ تناول المباح والشھوات والانتفاع بکل لذیذ من مطعم ومشرب ومنکح وان بولغ فیہ وتنوھی فی ثمنہ (قرطبی)

۲۹۳ یعنی وہ شکار کے جانور تم سے بہت دور بھی نہ ہوں گے، قریب ہی پھرتے رہیں گے کہ تمہارے لئے ان کا شکار بآسانی ممکن ہوگا۔
روایتوں میں آتا ہے کہ یہ ذکر مقام حدیبیہ کا ہے شکار کے جانور بالکل آس پاس لگے پھرتے تھے لیکن مسلمان حالتِ احرام میں تھے اس لئے شکار سے محتاط و محترز رہے۔

انزلت ھذہ الآیۃ فی عمرۃ الحدیبیۃ فکانت الوحش والطیر والصید تغشاھم فی رحالھم (ابن کثیر)

لیبلونکم اللہ۔ سورۃ کے شروع میں آچکا ہے کہ حالتِ احرام میں شکار ممنوع ہے اب یہاں اس کی کچھ تفصیل بیان ہوگی، ملاحظہ ہوں اسی سورۃ المائدہ کے حواشی ۲۴ و ما بعدہ۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ لیبلونکم سند ہے ان مشائخ کے لئے جو اپنے طالبین کے صدق و اخلاص کا امتحان کرتے رہتے ہیں۔
من الصید میں من یا تو تبعیض کے لئے ہے یا تمیز کے لئے یا جنس کے لئے۔

قیل فی موضع من ھھنا انھا للتبعیض وقیل انھا للتمیز (جصاص) ومن للتبعیض اولبیان الجنس (مدارک) یرید ببعض الصید فمن للتبعیض (قرطبی)

۲۹۴ یعنی اس آن دیکھے معبود کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرتا ہے۔
لیعلم اللہ۔ یعنی تا کہ اللہ دنیا کی نظر میں بھی اس شخص کے عمل سے معلوم کرے اللہ کا علم تو ہمیشہ ہی سے

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سو جو کوئی اس کے بعد حد سے نکلے گا تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے ۲۹۵ اے ایمان والو شکار کو

لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۗ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ

مت مارو جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو ۲۹۶ اور تم میں سے جو کوئی دانستہ اسے مارے گا تو اس کا جرمانہ

مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ

اسی طرح کا ایک جانور ہے جس کو اس نے مار ڈالا ہے ۲۹۷ (اور) اس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں گے

الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ

خواہ وہ جرمانہ چوپایوں میں سے ہو جو نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچائے جاتے ہیں اور خواہ مسکینوں کو کھانا کھلا دینا ۲۹۸

ہے ایسے موقعوں پر مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شخص کے عمل سے بھی یہ کیفیت ظاہر ہو جائے۔

۲۹۵ بعد ذلک۔ یعنی اس حکمِ حرمت کے بعد، یا اس شکار کی آزمائش میں پڑنے کے بعد۔

بعد ذلک الابتلاء بالصید۔ (بیضاوی)

اعتدی۔ یعنی احکامِ شرعی کی حد سے نکلے گا اور شکارِ ممنوع کا مرتکب ہوگا۔

شکار اہلِ عرب کی عام عادت میں داخل تھا، اور صحابہ رضی اللہ عنہم شکار کے ہمیشہ سے عادی تھے اس لئے ان کی اطاعت اور قوتِ ضبط کا پورا امتحان ہو رہا تھا۔

بشیء یہ دل بڑھانے کے لئے ہے کہ امتحان کوئی ایسا بڑا نہیں ایک حقیر ہی شے کا ہے۔

التقلیل والتحقیر فی بشیء للتنبیہ علی انہ لیس من العظائم (بیضاوی) لیعلم انہ لیس بفتنة من الفتن العظام التی تدحض عندھا اقدام الثابتین۔ (کشاف)

۲۹۶ (یا تم خود تو حالتِ احرام سے باہر ہو لیکن وہ شکار حدودِ حرم کے اندر ہو)

یہ عام ممانعت خشکی اور تری کے ان جانوروں کے حق میں بھی ہے جن کے قتل یا شکار کا جواز قرآن مجید ہی کی کسی دوسری آیت یا حدیثِ صحیح سے ثابت ہو گیا ہے، مثلاً دریائی جانور، یا سانپ، بچھو، بھیڑیا، کاٹنے والا کتا وغیرہا۔

قد روی ابن عباسؓ وابن عمر وابو سعید وعائشة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خمس یقتلھن المحرم فی الحل والحرم الحیة والعقرب والغراب والفارة والکلب العقور (جصاص) واما ما کان من السباع لا یبتدئ (جصاص)

لا تقتلوا۔ قتل کے معنی اردو میں فقہی اصطلاح کے مطابق ہلاک کی ایک بالکل خاص صورت کے ساتھ محدود ہو کر رہ گئے ہیں، عربی کے قتل کے مفہوم میں یہ تنگی نہیں، وہ جان لے لینے کی ہر صورت کے لئے عام ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔

القتل ھو کل فعل یفیت الروح وھو انواع (قرطبی)

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ

تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمہارے نفع کے لئے اور قافلوں کے لئے ۳۰۳

وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ

اور تمہارے اوپر جب تک تم حالتِ احرام میں ہو خشکی کا شکار حرام کیا گیا

وما ذکرہ اللہ تعالیٰ فی ھذہ الآیۃ من الھدی والاطعام والصیام فھو علی التخییر لان او تقتضی ذلک وروی نحو ذلک عن ابن عباس وعطاء والحسن وابراھیم روایۃ وھو قول اصحابنا (جصاص)

ن ۳۰۰ یعنی جو لوگ یہ جرمانہ ادا کر چکے، وہ معاف ہو جائیں گے۔
دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ قبل اسلام یا قبل نزول حکم جو کچھ گزر چکا اس سے درگزر کردی جائے گی۔
عما کان فی الجاھلیۃ (ابن جریر عن عطاء) عما سلف منکم فی جاھلیتکم (ابن جریر) عما مضیٰ فی الجاھلیۃ وعما سلف قبل التحریم فی الاسلام (کبیر)

ل ۳۰۱ (اس جسارت اور ڈھٹائی کا)
گناہ کا اعادہ خود ایک دلیل ہے بے باکی اور ڈھٹائی کی۔
فینتقم اللہ۔ قرآن کا انتقام، اردو کے چلے ہوئے انتقام سے مختلف ہے، عربی میں نقمہ کے معنی مطلق سزا کے ہیں
النقمۃ العقوبۃ (راغب)
مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ توبہ سے یہ علتِ انتقام خود ہی مرتفع ہو جائے گی۔

۳۰۲ اس میں رد آگیا، بہت سی مشرک قوموں کے عقیدہ کا، جن کا معبود ہر طرح کی فعالیت سے محروم ہے، قرآن نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کو بار بار جتایا ہے کہ اللہ جب چاہے سخت سزا دینے پر بھی قادر ہے۔

۳۰۳ بحری مسافروں کے لئے دریائی جانوروں کے شکار کی اجازت ان کے حق میں رحمتِ خاص ہے۔
یہ ہدایتیں حالتِ احرام کے بارہ میں مل رہی ہیں، وَأَنتُمْ حُرُمٌ کے تحت میں۔
صید البحر۔ بحر سے صرف سمندر مراد نہیں، ہر قسم کے دریا، ندی، جھیل، تالاب وغیرہ غرض پانی کا ہر ذخیرہ اس کے تحت میں آجاتا ہے۔

وعنی بالبحر فی ھذا الموضع الانھار کلھا والعرب تسمی الانھار بحارا (ابن جریر) اصل البحر کل مکان واسع جامع للماء الکثیر (راغب) المقصد فیہ صید الماء فسائر حیوان الماء یجوز للمحرم اصطیادہ ولا نعلم خلافا فی ذلک بین الفقہاء (جصاص) والمراد بالبحر جمیع المیاہ والانھار (کبیر) والمراد بالبحر جمیع المیاہ (معالم)

اور دریائی جانور کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے کہ وہ وہ جانور ہے جس کا مولد بھی پانی ہے اور مسکن بھی پانی اس لئے مرغابی، بط وغیرہ اس تعریف کے بعد دریائی جانور کے حکم سے نکل گئے۔
طعامہ میں ضمیر صید کی طرف ہے۔

عمارت کی پیمائش میں اختلاف ہے، بلندی ۴۷ فیٹ یا ۵۰ فیٹ ہے، طول ۳۶ یا ۴۰ فٹ اور عرض ۳۰ یا ۳۲ فٹ کرسی سنگ مرمر کی ہے، اور زمین سے ۱۰ انچ بلند، شمالی کونے کو رکنِ عراقی کہتے ہیں، مغربی زاویہ رکن شامی کہلاتا ہے، جنوبی گوشہ رکن یمانی، اور مشرقی زاویہ رکن اسود، حجر اسود جس کا بوسہ طوافِ حج میں کیا جاتا ہے، اسی رخ پر دیوار میں نصب ہے، زمین سے ۵ فٹ بلند، دروازہ ایک ہے، جو شمالی مشرقی دیوار میں ہے، زمین سے ۷ فٹ بلندی پر، جس زمانہ میں وہ کھلتا ہے، تو اترنے چڑھنے کو ایک پہیہ دار زینہ لگا دیا جاتا ہے۔

یہ بھی شریعت کا متفقہ مسئلہ ہے کہ خانہ کعبہ سے نیچے تحت الثریٰ تک، اور اوپر آسمان تک، اس سیدھ میں جو کچھ بھی ہے، سب استقبال نماز کے لئے کعبہ ہی کے حکم میں ہے۔

کعبہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی نوعِ انسانی کی، روایتوں میں ہے کہ اولین کعبہ حضرت آدمؑ کے خیمہ کی شکل میں جنت سے اترا تھا، موجودہ پختہ عمارت کے معمار اول حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔

البیت الحرام کو بیت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں چھت اور دیواریں ہیں، اور یہ حقیقتِ بیت ہے نہ اس لئے کہ اس میں کسی کی سکونت ہے۔

والبیت سمی بذلک لانھا ذات سقف وجدار وھی حقیقۃ البیتیۃ وان لم یکن بھا ساکن (قرطبی)

قیاماً یعنی لوگوں کی حفاظت و نگہداشت کا ذریعہ و واسطہ اور پھر قیاماً للعرب نہیں، قیاماً للناس، یعنی ساری کائناتِ انسانی اسی کے دم سے قائم، انسانیت کی سانس اسی کے وجود سے وابستہ، گویا اس میں اس کا وعدہ بھی آ گیا کہ جب تک انسانی آبادی قائم ہے، خانۂ کعبہ کا بھی وجود باقی رہے گا۔

اراد انہ جعل ذلک قواماً لمعایشھم وعماداً لھم فھو قوام دینھم ودنیاھم (جصاص) اصلہ قوام وھو ما یستقیم بہ الامر ویصلح (کبیر) یعنی یقومون بھا (قرطبی) ای سبباً لقوام مصالح الناس (کبیر) ھو سبب لامن الناس عن الآفات والمخافات وسبب لحصول الخیرات والسعادات فی الدنیا والآخرۃ (کبیر) ای سبب اصلاح امورھم (روح)

امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ کعبہ کے سبب قوام ہونے کی متعدد توجیہیں کی گئی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ وہ سب درست ہوں اور کعبہ قیاماً للناس کسی ایک ہی جہت سے نہیں، متعدد جہات سے ہو۔

لایبعد حمل الآیۃ علی جمیع ھذہ الوجوہ وذلک لان قوام المعیشۃ اما بکثرۃ المنافع واما بدفع المضار واما بحصول الجاہ والریاسۃ واما بحصول الدین فلما کانت الکعبۃ سببا لحصول ھذہ الاقسام الاربعۃ وثبت ان قوام المعیشۃ لیس الا بھذہ الاربعۃ ثبت ان الکعبۃ سبب لقوام الناس (کبیر)

احادیث میں آتا ہے کہ جب خانۂ کعبہ کا ہدم کافروں کے ہاتھ سے ہو جائے گا، تو اس کے بعد قیامت بھی آ جائے گی۔

ف ۳۰۶ ھدی اور قلائد پر حاشیے پارۂ ششم میں سورۂ مائدہ کے شروع میں گزر چکے۔

الشھر الحرام۔ یعنی حرمت والے چاروں مہینے۔

وھو اسم جنس والمراد الاشھر الثلاثۃ باجماع من العرب (قرطبی) اراد بالشھر الحرام الاشھر الحرم الاربعۃ الا انہ عبر عنھا بلفظ الواحد (کبیر) عن الحسن انہ قال ھو الاشھر الحرم فاخرجہ مخرج الواحد لانہ اراد الجنس۔ (جصاص)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

سوائے عقل والو اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ (پوری) فلاح پا جاؤ ۳۱۲ؔ اے ایمان والو ایسی

اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ

باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں ۳۱۳ؔ

ولو اعجبک کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "گو تجھے بھلی لگے"۔

سرّک (معالم) اے وان سرّک ایہا الناظر۔ (روح)

آج دنیا میں فسق و خُبث کی کثرت بھی ہے اور ہر طرح کی ظاہری خوشنمائی و زینت بھی اور ایسا ہی کم و بیش ہر زمانہ میں رہا ہے، اور عام بشری طبیعتوں کا اس سے متاثر و مرعوب ہونا بھی قدرتی ہے ـــ خبث و نجاست کی "کثرت" جب آج سے ۱۴ سو سال قبل بھی تھیں تو آج اس کی کثرت کا کہنا ہی کیا!

۳۱۲ؔ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

فاتقوا اللہ۔ یعنی راہ ہدایت اور پاکیزگی ہی کی اختیار رکھو، اور بدی اور گندگی کی کثرت یا ظاہری خوشنمائی سے متاثر ہو کر ادھر نہ جھک جاؤ۔

اے امزوا لطیب وان قل علی الخبیث وان کثر (کشاف)

تفلحون کو فاتقوا پر مرتب کر کے گویا یہ بتا دیا کہ فلاح کی بنیاد تقوی الٰہی ہی پر ہے۔

خطاب اولی الالباب سے کر کے ادھر اشارہ کر دیا کہ عین عقل و بصیرت ہی کا تقاضہ یہ ہے کہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی سے بچا جائے، اور راہ تقوی اختیار کی جائے۔

اولی الالباب۔ لُب کے معنی عقل خالص کے ہیں، جو ہر طرح کی آمیزش و کدورت سے پاک ہو۔

اللب العقل الخالص من الشوائب۔ (راغب)

عقل انسان کے پاس اللہ ہی کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی نعمت ہے، قرآن مجید عقل کو دباتا نہیں، بلکہ صحیح حدود کے اندر عقل سلیم سے کام لینے پر تاکید کی ہے۔

فاتقوا ... تفلحون۔ انسان اگر عقل سلیم سے ذرا کام لیتا ہے تو اس پر خود واضح ہو جائے کہ دین و دنیا کی ساری برکتیں اور راحتیں اسلام ہی کے پیش کردہ نظام زندگی سے وابستہ ہیں۔

۳۱۳ؔ ممانعت ایسے سوالات کی ہو رہی ہے جو سر تا سر فضول و لایعنی ہوں، شتاو گوں کے جزئیات زندگی کے بابت سوالات کرتے رہنا۔ سوال دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ کوئی معاشی یا معادی ضرورت واقعی پیش آجائے، یا اس کے پیش آجانے کا احتمال قوی ہو اور صاحب شریعت سے ادب و احترام کے ساتھ اس کی بابت پوچھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ غرض و مقصد صحیح کچھ بھی نہ ہو، اور دور دور کے احتمالات پیدا کر کے سوال محض سوال کرنے ہی کی نیت سے کیا جائے، تحقیقات اپنے دل سے گڑھے جائیں، اور گویا رسول ؐ کا امتحان لینے کو سوالات ان کے

وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ

اور اگر تم انھیں دریافت کرتے رہو گے اس زمانہ میں جبکہ قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی ۳۱۴ اللہ نے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۱۰۱ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا

ان کو بے درگزر کی، اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا حلم والا ہے ۳۱۵ لوگ تم سے قبل بھی ایسی ہی پوچھ پاچھ کر چکے ہیں،

بِهَا كٰفِرِيْنَ ۱۰۲ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَاۗىِٕبَةٍ

پھر ان سے منکر ہو ہو گئے ہیں ۳۱۶ اللہ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے نہ سائبہ کو نہ وصیلہ کو نہ حامی کو ۳۱۷ البتہ

سامنے پیش کئے جائیں، یہاں ذکر اسی آخری قسم کا ہے اور اسی سوال بازی کو ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔

اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ ناگوار ہونے کی صورتیں شاید یہ کہ کھلے کسی چھپانے والے واقعہ کی پردہ دری ہو جائے اور انھیں تفضیح و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے یا ایسے احکام نازل ہو جائیں جن کی تعمیل تم پر شاق گزرے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت انس رضی صحابی سے روایت آئی ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ سے عرض کی کہ اچھا یہ بتایئے کہ میرا باپ کون تھا؟ آپؐ نے فرمایا کہ فلاں شخص، اسی طرح ترمذی وغیرہ میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب فرضیتِ حج کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرنا شروع کیا کہ یہ ہر سال فرض ہے؟ ــــ یہ دو نمونے ہیں اس قسم کے بیجا سوالات کے جن کے خلاف یہاں تنبیہ کی جا رہی ہے۔

"احکام میں جیسا یہ سوال بوجہ افراط کے ممنوع ہے واقعات میں یہ سوال موجب تفریط فی الطاعۃ والادب بھی ہے چنانچہ بخاری میں یہ بھی ہے کہ استہزاءً پوچھتے تھے ــــ پس آیت سب اقسام سوال کو اور سب اقسام جواب کو شامل ہے کو علت نہی کی کہیں افراط ہو گی کہیں تفریط اور ناگواری جواب کا احتمال کہیں تحریم سے ہو گا کہیں رسوائی سے کہیں زجر سے اور بعد ختم نزول وحی کے ایسے سوالات سے نہی کی علت اضاعتِ وقت اور مجیب کو ضیق میں ڈالنا ہے" (تھانوی)

روی مسلم عن المغیرۃ بن شعبۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ حرّم عقوق الامہات وکرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السؤال الخ وقد قال کثیر من العلماء والتکثیر من السؤال فی المسائل الفقہیۃ تنطعا وتکلفا فی مالم ینزل والاغلوطات وتشقیق وقد کان السلف یکرھون ذلک ویرونہ من التکلف (قرطبی)

۳۱۴ تو ایسے ہی سوالات جن میں یہ احتمالات ہوں ممنوع قرار دیئے جاتے ہیں۔

ھذا تادیب من اللہ لعبادہ المومنین ونھی لھم عن ان یسألوا عن اشیاء مما لا فائدۃ لھم فی السوال والتنقیب عنھا لانھا ان اظھرت لھم تلک الامور ربما ساء تھم وشق علیھم سماعھا (ابن کثیر)

۳۱۵ (اس لئے حکم کی خلاف ورزی پر گرفت اگر فوری نہیں ہوئی تو اس سے مطمئن اور بے خوف نہ ہو جاؤ) عنھا یعنی ان سوالات کے بارہ میں جو تم اب تک کر چکے۔

ای عن المسئلۃ او عن السؤالات (قرطبی) ای عما سلف منکم من مسائلکم واغضابکم للرسول بسببھا (کبیر)

وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

جو لوگ کافر ہیں وہی اللہ پر جھوٹ جوڑتے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے

الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى

کام ہی نہیں لیتے ۳۱۸ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ نازل کیا ہے اس کی طرف

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ

اور رسول کی طرف، تو ۳۱۹ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے ۳۲۰

غفور. اس صفت غفور کا اقتضاء ہے کہ اس نے ماضی کو معاف کر دیا.

۳۱۶ اس کفر و انکار کی دو صورتیں ممکن تھیں اور دونوں واقع ہو چکی تھیں، ایک یہ کہ جو احکام دیئے گئے ان کا حق ادا نہ کیا، دوسرے یہ کہ جو واقعات بیان کئے گئے ان سے متاثر نہ ہوئے.

قوم من قبلکم. یہاں لوگوں کی طرف اشارہ ہے [illegible] صورت میں بنی اسرائیل سے لی گئی ہے کہ سابق انبیاء کی امتوں میں وہی کھود کھود کر اور کرید کرید کر سب سے زیادہ سوال کرنے کے عادی رہے ہیں، گنجائش دوسری امتوں سے بھی مراد ہونے کی ہے.

۳۱۷ ما جعل اللہ یعنی اللہ نے ان چیزوں کو مشروع نہیں کیا.

[illegible] ولا مرية (مدارك)

یہ سب اصطلاحیں عرب جاہلیت کی ہیں.

بحیرہ. وہ اونٹنی تھی جو پانچ بچے جنتی اور ان میں کا آخری نر ہوتا، اس کا کان چیر کر اسے سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا، اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاتا.

سائبہ بھی وہ اونٹنی ہے جو کسی دیوتا کے نام پر سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دی جاتی اور اسے چارہ پانی سے نہ روکا جاتا.

وصیلہ بھی اونٹنی ہی کی ایک قسم ہے، مادہ جننے والی، اسے بھی کسی دیوی کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا.

حامی. نر اونٹ کی ایک قسم ہے، جس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا.

اہل شرک کی رسمیں ہر ملک میں ملتی جلتی سی ہیں، یہاں یہ بتایا ہے کہ اس قسم کی گڑھی ہوئی رسمیں اور ایسے جانوروں کا ادب و احترام ہرگز مشروع نہیں.

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں ابطال ہے اہل جاہلیت کی اس بدعت کا کہ بعض چیزوں کو غیر اللہ سے نامزد کر دیتے تھے جیسا کہ اب بھی بعض جہلاء ارواح طیبہ سے تقرب حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں.

۳۱۸ اور سمجھتے رہتے ہیں کہ خدا ان خرافات سے خوش ہوگا.

[illegible]

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٠٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

تو کیا جب بھی کہ ان کے بڑے نہ کسی شے کا علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یاب بھی ہوں ۳۲۱ اے ایمان والو تم اپنی

آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ

فکر میں لگے رہو، کوئی بھی گمراہ ہو جائے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں جبکہ تم راہ پر چل رہے ہو ۳۲۲

یفترون علی اللہ الکذب۔ اہل شرک اپنے حق ملہ وغیرہ کی طرح رسوم کے باب میں بھی افتراء علی اللہ پر بڑے جری وبے باک ہوتے ہیں، اور یہ گڑھنے والے عمومًا مشرکین کے خواص واکابر ہوتے ہیں۔

اکثرھم لا یعقلون۔ یہ کورانہ تقلید کرنے والے مشرکین کے عوام ہوتے ہیں، اور انہیں کی تعداد بڑی ہوتی ہے۔

والمعنی ان الرؤساء یفترون علی اللہ الکذب واما الاتباع والعوام فاکثرھم لا یعقلون (کبیر)

۳۱۹ یعنی حق وباطل کا معیار محض احکام خدا ورسول کو قرار دو، اپنے مزعومات وظنونات کو شریعت کی کسوٹی پر کس کر جانچو۔

۳۲۰ (اور ہمیں کسی مزید تحقیق کی ضرورت نہیں)

تقلیدِ جامد جاہلوں کا سہارا ہر ملک اور ہر دور میں رہا ہے۔ کسی صاحب علم کی تقلید اگر اس اعتماد پر کی جائے کہ وہ احکام شریعت کا ماہر ہے تو یہ ممنوع نہیں بلکہ عین مطلوب ہے لیکن آنکھ بند کر کے اپنے اسلاف کی راہ پر اس لئے چلتے رہنا کہ وہ اسلاف تھے یہ اندھی تقلید محض معصیت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتی ہے اور اسی کا نام رسم پرستی ہے ـــــ آج ہندوستان کی بڑی آبادی کے پاس نہ کوئی ”کتاب“ ہے نہ کسی رسول کی تعلیم محفوظ بس صرف رسوم کا ایک مجموعہ ہے جو سیکڑوں ہزاروں برس ہوئے ہاتھ آگیا تھا، اور اسی طرح اندھا دھند اس کی پوجا ہوتی چلی آرہی ہے۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں ابطال ہے جاہل صوفیہ کے اس طریقہ کا کہ جب ان کے سامنے شریعت پیش کی جاتی ہے تو اس کے بجائے وہ اپنے مشائخ کے معمولات سے تمسک کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

۳۲۱ یعنی کیا ان کا یہ خیال جب بھی ہے جب ان کے بزرگ علم نہ رکھتے ہوں حقائق دین سے کسی شے کا، اور ہدایت نہ رکھتے ہوں کسی کتاب الٰہی کے ذریعہ سے؟

وتقدیرہ أحسبھم ذلک ولو کان آباؤھم (کشاف)

اَوَ میں و حالیہ ہے، اور اس پر ہمزہ (اَ) انکار کا داخل ہوا ہے۔

والواو للحال قد دخلت علیھا ھمزۃ الانکار (کشاف)

اندھی تقلید آباء اور سلف پرستی پر جو ملامت آیت سے ٹپک رہی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔

۳۲۲ حکم افراد کو ہے کہ تم دوسروں کی فکر میں اتنا زیادہ کیوں گھلے جاتے ہو، مقدم فکر اپنی ہے، اپنے مطالبات دین ادا کئے جاؤ، تم پر دوسرے کی ذمہ داری نہیں ہے، تم سے پرسش تمہارے ہی احوال کی ہوگی۔ آیت میں ایک زبردست اصول یعنی شخصی ذمہ داری کا اثبات ہے، اور ان لوگوں کا ابطال ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت میں گم رکھنا چاہتے ہیں۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہے سو وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہتے تھے ۳۲۳ اے ایمان والو جبکہ

آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ

تم میں سے کسی کو موت آجائے وصیت کے وقت تمہارے آپس میں گواہ دو شخص تم میں سے معتبر ہوں ۳۲۴

علیکم انفسکم۔ یعنی اپنے نفس کی نگرانی اپنے اوپر لازم کر لو۔

معناه احفظوا انفسكم من المعاصي (قرطبی)

علیکم محاورہ میں جب صیغۂ مخاطب میں آتا ہے تو اس کے معنی لازم پکڑ لینے کے ہوتے ہیں۔ صیغۂ غائب وغیرہ میں نہیں آتا۔

تقول علیك زیداً بمعنی الزم زیداً ولا یجوز علیه زیداً بل انما یجری هذا فی المخاطبة (قرطبی)

دوسروں کی بھی بقدر وسعت و استطاعت اصلاح شخصی مطالبات دین ہی میں شامل ہے ان کے منافی نہیں مقصود دوسروں کی اصلاح کے کام سے روکنا نہیں صرف اس کے مبالغہ آمیز تخیل میں اعتدال پیدا کرنا ہے مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کو اچھی بری بات بتاؤ نہیں بلکہ یہ ہے کہ دوسروں کی عیب چینی اور کھوج میں نہ پڑے رہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو بجائے خود ایک انفرادی فریضہ ہے اس کا سقوط مقصود نہیں اور آیت سے اس کی کوئی سند نہیں مل جاتی کہ جب ممکن بھی ہو جب بھی انسان دوسروں کی ہدایت و اصلاح کا فریضہ ترک کیے رہے اسلام تو ایک اجتماعی دین ہے جس میں فرد کے ساتھ ساتھ جماعت ملت کی بھی صلاح و فلاح مطلوب ہے۔

قال ابن خویز منداد تضمنت الآیة اشتغال الانسان بخاصة نفسه وترکه التعرض لمعایب الناس والبحث عن احوالهم فانهم لا یسألون عن حاله فلا یسأل عن حالهم (قرطبی) ومن الاهتداء اتباع امر اللّٰه فی انفسنا وفی غیرنا فلا دلالة فیها اذاً علی سقوط فرض الامر بالمعروف والنهی عن المنکر (جصاص) اخبر ابوبکرؓ ان هذه الآیة لا رخصة فیها فی ترك الامر بالمعروف والنهی عن المنکر (جصاص) لیس فیها دلیل علی ترك الامر بالمعروف والنهی عن المنکر اذا کان فعل ذلك ممکنا (ابن کثیر)

آیت کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ انسان جب یہ دیکھ لے کہ وعظ و پند مطلق کارگر نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اس پر اور مضحکہ ہوتا ہے تو ایسے موقع پر چاہئے کہ سکوت سے کام لے، اور بس اپنے ہی ذاتی اعمال کی فکر میں لگا رہے۔

قیل الآیة فی اهل الاهواء الذین لا ینفعهم الوعظ فاذا علمت من قوم انهم لا یقبلون بل یستخفون ویظهرون فاسکت عنهم۔ (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہی طریقہ ہے عارفین سالکین کا کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر دینے کے بعد پھر کسی کے زیادہ درپے نہیں ہوتے۔

۳۲۳ (کہ حشر میں اصلی وقت و مقام نتائج کے ظہور تام کا ہوگا)

الی ... جمیعاً یہ تصریح ضروری تھی اس لیے کہ بعض مذہبوں نے داور حشر بجائے اللہ کو قرار دینے کے ابن اللہ وغیرہ کو قرار دیا ہے

۳۲۴ قرآن محض ایک پند نامۂ اخلاق نہیں، قانون کی بھی کتاب ہے، زندگی میں قانون اخلاق خطابت

سب ہی کی اپنی اپنی جگہ ضرورت ہوتی ہے اور قرآن نے جو مکمل ہدایت نامہ اور زندگی کا مکمل دستور العمل ہے سب ہی سے اپنی اپنی جگہ کام لیا ہے اس جگہ قانون وصیت و وراثت کا بیان مختلف پہلوؤں سے آرہا ہے۔

بینکم۔ یعنی تمہارے آپس کے معاملات میں، مثلاً موت کے وقت ورثہ کو مال سپرد کرنے کے وقت اصطلاح فقہ میں ایسے اشخاص کو وصی کہتے ہیں اور انھیں کے اقرار و اظہار کو گواہی سے تعبیر کیا گیا ہے یہاں کوئی حکم نہیں مل رہا ہے، صرف بہ طور مشورۂ مناسب کے ارشاد ہو رہا ہے۔

منکم۔ یعنی مسلمان ہوں، تم میں سے ہوں تمہارے غیر نہ ہوں۔

ای من المسلمین قاله الجمهور (ابن کثیر)

ہاں اوصیاء کو مسلمان ہونا چاہیے، عادل یا ثقہ ہونا چاہیے اور تعداد میں دو ہونا چاہیے لیکن فقہاء نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ان کا مسلمان اور عادل ہونا صرف افضل ہے شرط لازمی نہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید میں بھی ابھی آرہا ہے اور یہ قبول شہادت میں ذمیین تک کے لئے یہ وسعت صرف مسئلہ وصیت میں ہے۔

هذان شرطان لجواز استشهاد الذميين عند فقد المؤمنين ان يكون ذلك فى سفر، وان يكون فى وصية كما صرح بذلك شريح القاضى (ابن كثير) قال شريح من كان بأرض غربة ولم يجد مسلما يشهده على وصيته فاشهد كافرين على اى دين كانا من دين اهل الكتاب او عبدة الاوثان فشهادتهم جائزة ولا يجوز شهادة كافر على مسلم الا على وصية فى سفر (معالم)

صاحب تفسیر المنار نے یہاں ایک مستقل عنوان مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلموں کی شہادت کا قائم کرکے یہ بتایا ہے کہ جہاں کہیں زن مسلمہ کی حرمت و ناموس کا معاملہ ہے وہاں تو شہادت میں مومنین کی قید لگی ہوئی ہے لیکن جہاں یتیموں کو محض مال دلانے یا خرید و فروخت کا ذکر ہے وہاں کوئی ایسی قید نہیں حکم مطلق ہے۔

نرى انه جل وعز اشترط فى الاستشهاد والاشهاد فى الوقائع المتعلقة بامور المومنات الشخصية ان يكون الاشهاد من المومنين ولم يذكر هذا القيد فى الاشهاد على دفع اموال اليتامى اليهم ولا فى الاشهاد على البيع (المنار)

امام ابوحنیفہؒ نے اسی آیت سے ذمیوں کے آپس کے معاملات میں ان کی قبول شہادت کے جواز پر استدلال کیا ہے

استدل ابو حنيفة بهذه الآية على جواز شهادة الكفار من اهل الذمة فى ما بينهم وقال ومعنى او آخران من غيركم اى من غير اهل دينكم فدل على جواز شهادة بعضهم على بعض (قرطبى)

ضربتم فى الارض۔ ضرب فى الارض۔ کے معنی محاورہ میں سفر کرنے کے آتے ہیں (مطلق ضرب کے معنی سفر کرنے اور چلنے کے نہیں جیسا کہ ایک جدید فرقہ نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیا ہے بلکہ جب فعل ضرب کا صلہ فی کے ساتھ آئے اس وقت یہ معنی ہو جاتے ہیں)

اى سافرتم (قرطبى)

پوری تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔

ان انتم ضربتم فى الارض فاصابتكم مصيبة الموت	اگر تم سفر کر رہے ہو اور اس حال میں تمہیں موت آگئی اور تم نے اپنے
فاوصيتم الى اثنين عدلين فى ظنكم ودفعتم	خیال میں دو متدین شخصوں کو اپنا وصی مقرر کرکے مال ان کے سپرد کر دیا
اليهما ما معكم من المال ثم متم وذهبا الى ورثتكم	پھر تمہاری وفات ہو گئی اور دونوں وصی تمہارا ترکہ لے کر تمہارے وارثوں

فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ

پھر اگر خبر ہو جائے کہ وہ دونوں (وصی) حق بات دبا گئے ۳۲۸ تو دو گواہ دوسرے ان کی جگہ اور مقرر ہوں ان لوگوں میں سے

خطاب یہاں وارثوں سے ہے۔

۳۲۷ شریعتِ اسلامی جو انفرادی و اجتماعی ہر بشری ضرورت کی کفیل ہے یہاں ایک کثیر پیش آجانے والی ضرورت کا صحیح طریقہ تعلیم کر رہی ہے ارشاد یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنی موت کے وقت اپنا مال کسی کو حوالہ کرنا چاہے تو چاہئے کہ دو معتبر مسلمانوں کو گواہ کر جائے لیکن گواہ اگر مسلمان نہ مل سکیں جیسا کہ حالتِ سفر وغیرہ میں اکثر اتفاق ہو جاتا ہے تو پھر دو غیر مسلموں ہی کو گواہ بنالے پھر اگر ان گواہوں کی دیانت ہی سے متعلق شبہ ہو جائے اور وارث اپنا دعوی ان کے بیان کے خلاف پیش کر دیں لیکن گواہ نہ رکھتے ہوں تو اس وقت خود ان اوصیاء سے مؤکد بہ حلف بیان لیا جائے۔ کہا گیا ہے بعد نماز کہ وہ وقت عموماً عظمتِ الٰہی کے استحضار کا ہوتا ہے اور مسجد میں کہ خلق کے سامنے انسان عادۃً کذب بیانی سے شرماتا ہے۔

بعد الصلوٰۃ۔ نماز سے یہاں مراد عموماً نماز عصر لی گئی ہے گو جائز ہر نماز کا وقت سمجھا گیا ہے۔

يعنى صلاة العصر قاله الاكثر من العلماء وقيل اى صلوٰة كانت (قرطبی) اى صلاة العصر كما روى عن ابى جعفر وقتادة وابن جبير وغيرهم وعموران تكون اللام للجنس اى بعد اى صلاة (روح)

تحبسونهما من بعد الصلوٰۃ۔ مفسر تھانویؒ نے کہا کہ اس سے مقصود قسم کی قوت اور اہمیت کو اور بڑھا دینا ہے، زمانِ متبرک اور مکان اجتماعِ خلق کی قید کے ساتھ۔

ولو كان ذا قربى۔ انسان عموماً اور عادۃً عزیزوں قریبوں ہی کے نفع کا لحاظ کر کے جھوٹ بولنے اور جھوٹا حلف اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خالقِ فطرت کا کلام ہے فطرتِ بشری کے کیسے کیسے چھپے ہوئے چوروں کا لحاظ رکھا ہے۔

شهادة الله۔ یعنی جس بات کے بیان کرنے پر ہم اللہ کی طرف سے مامور ہیں۔ عظمتِ الٰہی کے استحضار اور خشیت للہ کے بیدار کرنے کیلئے قرآن مجید اسلوب بھی کیسے کیسے مؤثر اختیار کرتا ہے یہاں محض شہادۃ کو شہادۃ اللہ سے تعبیر کر کے اس کی کتنی اہمیت بڑھا دی۔

۳۲۸ یعنی ظاہراً ان گواہوں کا کاذب و خائن ہونا معلوم ہو جائے۔

عثر على۔ یعنی اگر اس کی خبر ہو گئی، اگر یہ کھل گیا۔

عثر على كذا اى اطلع عليه (قرطبی)

آیت کی ترکیب حضرت عمرؓ جیسے اہلِ زبان صحابی اور زجاج جیسے نحوی کو دشوار معلوم ہوئی ہے اور دوسرے مفسرین کرام کا ذکر ہی نہیں۔

قال عمر هذه الآية اشكل ما فى هذه السورة من الاحكام وقال الزجاج اصعب ما فى القرآن من الاعراب (قرطبی)

البتہ رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے قول کا یہ مطلب نہیں کہ آیت کا مفہوم از روئے اعراب متعین کرنا دشوار ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جو حکم اس آیت میں بیان ہوا ہے وہ سورۃ کے دوسرے احکام سے مشکل تر ہے۔

وما نقله الواحدى عن عمر فليس مما يؤيد ما نقل عن المفسرين من استصعابهم معناه ان احكامها اشكل من سائر احكام السورة (المنار)

اور اسی ضمن میں شیخ نے بڑی دلچسپ بات یہ لکھی فرمائی ہے کہ مفسرین کو دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ

الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ

جن کا حق دبا ہے میت کے قریب تر لوگوں میں سے ۳۲۹ اور یہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں

مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ ذٰلِكَ

کی گواہی سے زیادہ درست ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی ہے، ورنہ بے شک ہم ہی ظالم ٹھہریں گے ۳۳۰ یہ اس کا

اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ ۳۳۱

قریب ترین ذریعہ) ہے کہ لوگ گواہی ٹھیک دیں۔ یا اس سے ڈرتے رہیں کہ ہماری قسمیں ان کی قسموں کے بعد الٹی پڑیں گی

ان کے یہاں اپنے پیمانے نحو وفقہ کے ہوتے ہیں اور وہ قرآن کو انھیں سے ناپنا چاہتے ہیں! حالانکہ قرآن ہر اصول نحو اور ہر قاعدہ فقہی سے بالاتر ہے۔ لانا ان سارے علوم و قواعد کو قرآن کے ماتحت چاہیے نہ کہ قرآن کو ان کے ماتحت بنانا۔

ان امثال هذا الاعراب والمصرح في الصعوبة في اعراب بعض الآيات او في حكمها الا انهم مذاهب في النحو والفقه يحملون عليها القرآن، ولا يجعلون القرآن فوق النحو والفقه والمذاهب كلها فهو اصل الاصول، فما وافقه فهو مقبول وما خالفه فهو مردود مرذول (المنار)

۳۲۹ اب مقدمہ کا رخ بدل گیا، اوصیاء جو پہلے مدعی علیہ تھے، ورثہ کے مقابل، اب خود مدعی ہو گئے، اور ورثہ جو اوصیاء کی خیانت کا دعویٰ لے کر آئے تھے، اب مدعی علیہ بن گئے۔

یعنی فی الایمان او فی الشهادة (قرطبی)

یقوم مقامهما۔ اگر دو کے بجائے ایک ہی گواہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

من الذین استحق علیهم الاولیان یعنی ان لوگوں میں سے جنھیں مال وصیت پہنچنا تھا یعنی میت کے قریب تر اور مال کے وارث

روی عن سعید بن جبیر قال معنی الاولیان بالمیت یعنی الورثة (جصاص) الاقربان الی المیت (کبیر)

اولیان آیت میں بدل ہے فآخران سے۔

ان المعنی عند اهل التفسیر من الذین استحقت علیهم الوصیة والاولیان بدل من قوله فآخران قاله ابن السری واختاره النحاس (قرطبی)

۳۳۰ یہ سب تعلیم اس غرض سے مل رہی ہے کہ یہ گواہ بھی اپنی ذمہ داری کا خوب اچھی طرح احساس و استحضار کرلیں سوا اس کے کہ جس کا ایمان یا خوف خداوندی بالکل ہی زائل ہو چکا ہو کوئی برائے نام مسلم بھی ایسے جھوٹے حلف کی جرأت کیسے کر سکتا ہے وما اعتدینا یعنی ہم نے حق و صداقت سے ذرا تجاوز نہیں کیا ہے، نہ اس مال کے مطالبہ میں، ورنہ اوصیاء پر الزام خیانت لگانے میں

ای ما اعتدینا فی طلب هذا المال وفی نسبتهم الی الخیانة (کبیر)

۳۳۱ شاہ عبدالقادر دہلویؒ اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

"یعنی وارثوں کو شبہ پڑے تو قسم دینے کا حکم رکھا، اس لئے کہ قسم سے ڈر کر اول ہی جھوٹ نہ ظاہر کریں پھر اگر ان کی

بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ

اللہ سے ڈرتے رہو اور سنتے رہو اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا

الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۗ قَالُوْا

۳۳۲ (اس دن سے ڈرو) جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا ۳۳۳ پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں

لَا عِلْمَ لَنَا ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

کیا جواب ملا تھا ۳۳۴ وہ عرض کریں گے کہ ہم کو علم نہیں چھپی ہوئی باتوں کے خوب جاننے والے تو بس آپ ہی ہیں ۳۳۵

بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم کھائیں یہی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں جانیں کہ ہماری قسم الٹی پڑے گی (موضح القرآن)

ذلک۔ یعنی یہی قانون جو دو آیتوں میں بیان ہوا ہے۔

اے الحکم الذی ذکرنا والطریق الذی شرعنا (کبیر)

علی وجهها۔ یعنی مطابق حقیقت۔ بلا آمیزش۔

اے علی حقیقتها من غیر تغییر لها (روح)

او یخافوا... ایمانهم۔ اور اس ڈر سے جھوٹی قسم کھانے سے رک جائیں۔

"اگر سپردگی مال زائد کی نہیں ہوئی قسم کھالیں اور اگر ہوئی ہے تو گناہ سے ڈر کر انکار کر دیں یہ حکمت تو تحلیف اوصیاء میں ہے" (تھانوی) "اور ہم کو خفیف ہونا پڑے گا، یہ حکمت تحلیف ورثہ میں ہے" (تھانوی)

۳۳۲ یہ راہ ہدایت سے محرومی دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے حصہ میں آتی ہے جو گویا نافرمانی کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہیں اس ساری نافرمانی کا وبال یہ پڑتا ہے کہ نہ دنیا میں انھیں راہ راست پر چلنے کی توفیق ہوتی ہے اور نہ آخرت میں انھیں اس کا ثمرہ یا جنت نصیب ہوگی۔

اے لا یهدیهم الی حجة او الی طریق الجنة (بیضاوی)

واتقوا اللّٰہ یعنی تقویٰ الٰہی پر نظر اپنے تمام معاملات میں رکھو اور ادائے شہادت میں بھی تقوے کا تعلق محض قول سے نہیں، عمل و قلب سے بھی ہے یہ گویا اس امر کی تاکید ہے کہ قانونی احکام میں بھی نظر محض ضابطہ پر نہ رہے بلکہ ان پر عمل پوری دیانت، صداقت و اخلاص کے ساتھ کیا جائے۔

واسمعوا۔ یعنی احکام الٰہی کو سنتے اور مانتے رہو۔

معاملاتی احکام کی آیات پر واتقوا اللّٰہ لانے سے ان احکام کی اہمیت و تاکید بھی مقصود ہے۔

۳۳۳ (مع ان کی امتوں کے)

ذکر قیامت کے موقع کا ہے۔

تقدیر کلام یوں ہے واتقوا یوم یجمع اللّٰہ الرسل بعض نے اذکروا اور بعض نے اذکر و اذمن کیا ہے

مقصود بہ صورت میں تخویف وتہدید ہے۔

ھل سعد برو معوا لوم یجمع اللہ الرسل عن الزجاج وقیل المعنی یراذکروا واحذروا یوم
القیامة حین یجمع اللہ الرسل والمعنی متقارب والمراد التخویف والتہدید (قرطبی)

۵۳۴ (ان امتیوں کی طرف سے)

یعنی تمہاری دعوت آیا قبول کی یا رد کی ؟ ماذا یہاں بماذا کے مراد ہے۔

ای بای جہة (من الصدق) قبل القول بماذا المستفہم (روح)

امت کے نافرمانوں کے مواجہہ میں یہ مکالمہ بجائے خود ایک عذاب ان نافرمانوں اور سرکشوں کے حق میں ہوگا۔

وارادان یفضحہم بذلک علی رؤس الاشہاد لیکون ذلک نوعا من العقوبة لہم۔ (قرطبی)

امام رازیؒ نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب بیان یہ ہے کہ احکام وشرائع کے مفصل بیان کے متا
بعد یا تو ذکر صفاتِ الٰہی کا شروع کر دیا جاتا ہے یا حالات انبیاء کا، یا احوال قیامت کا، اور مقصود ان سب صورتوں
میں ان احکام کی تعمیل کے لئے قلب کو زیادہ آمادہ کر دینا ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔

اعلم ان عادة اللہ تعالیٰ جاریة فی ھذا الکتاب الکریم انه اذا ذکر انواعا کثیرة من الشرائع
والتکالیف والاحکام اتبعها اما بالالٰہیات واما بشرح احوال الانبیاء او بشرح احوال القیامة
لیصیر ذلک مؤکدا لما تقدم ذکره من التکالیف والشرائع (کبیر)

۵۳۵ یعنی ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پیچھے انہوں نے کیا کیا؟ یا یہ کہ ان کے واقعی کیا عقائد تھے ہم تو اپنے سامنے ان کے
صرف ظاہری اقوال واعمال کو جانتے تھے باطن کا علم تو صرف آپ ہی کو ہو سکتا ہے اور جزا وسزا انہیں اصل عقائد پر ملے گی۔

معناه لا علم لنا بباطن ما اجاب به اممنا لان ذلک ھو الذی یقع علیه الجزاء (قرطبی)

دوسری تفسیر اسی سے ملتی یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ جواب محض غلبۂ خشیت سے ادا ہوگا یعنی آپ کے علم کامل ومحیط کے آگے
ہمارا علم ہیچ ہے جو کچھ علم ہمیں ہے یہ بھی خود اس کا بھی تو ہم سے عالم تر ہے بعض صحابیوں اور تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

لا علم لنا الا انک تعلم ما اظہروا وما اضمروا ونحن لا نعلم الا ما اظہروا فعلمک فیہم انفذ من علمنا (ابن عباسؓ)

امام المفسرین ابن جریر طبریؒ اور فخر المفسرین امام رازیؒ دونوں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

واولی الاقوال بالصواب قول من قال معناه لا علم لنا الا علم انت اعلم به منا (ابن جریر) وھو الاصح۔ (کبیر)

دونوں تفسیروں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں۔

امام رازیؒ نے ایک تیسرے معنی یہ بھی بیان کئے ہیں کہ ہمیں جو کچھ حاصل ہے وہ محض درجۂ ظن کی چیز ہے اور آج
جو کشف حقائق کا دن ہے محض ظن کام نہیں دے سکتا، آج تو علم ہی کام دے گا، اور وہ بس آپ ہی کو حاصل ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس ذہول کی وجہ بعض نے تجلی جلال کے آثار ظہور کو بتایا ہے۔

اذ قال۔ یہ صیغۂ ماضی بمعنی مستقبل ہے، قرآن مجید کے اس عام اسلوب بیان کے مطابق، کہ مستقبل
کے کسی بالکل قطعی ویقینی واقعہ کے وقوع کو ادا صیغۂ ماضی ہی سے کیا جاتا ہے۔

(ای فی التعبیر عن المستقبل بالماضی۔ (بیضاوی۔ المنار)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى

(وہ وقت یاد میں رکھو) جب اللہ عیسیٰؑ بن مریمؑ سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اوپر اور اپنی والدہ کے اوپر یاد

وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ

کرو ۳۳۶ جب کہ میں نے تمہاری تائید روح القدس (کے واسطہ) سے کی تھی ۳۳۷ تم آدمیوں سے کلام (ماں کی)

وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ

گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی ۳۳۸ اور جبکہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دی ۳۳۹

۳۳۶ انعامات کا سرچشمہ صرف وہی ذات تبارک و تعالیٰ ہے، مسیحؑ اس کے صرف ایک انعام پائے ہوئے معزز و مقرب بندے ہیں اور والدۂ مسیحؑ اس کی صرف ایک انعام پائی ہوئی معزز و مقرب بندی۔

عیسیٰ بن مریمؑ نے یاد دلا دیا گیا کہ وہی نبی جو ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ ابن اللہ۔ عیسیٰ اور مریم پر تاریخی حاشیے پہلے بھی گزر چکے اور آیندہ بھی آئیں گے۔

وعلی والدتك۔ اس طرز تخاطب سے مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت و شرف ثابت ہوتا ہے۔

۳۳۷ مختلف انبیاءؑ کی امتیازی شانیں بھی مختلف رہی ہیں، حضرت عیسیٰؑ کی شان امتیازی یہ تھی کہ آپ کو حضرت جبرئیلؑ کی تائید ایک درجۂ خاص میں حاصل تھی۔

سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۵۳ میں اس فقرہ اور لفظ روح القدس پر حاشیے گزر چکے۔

۳۳۸ اس پورے فقرے پر حاشیے سورۂ آل عمران میں آیت نمبر ۴۶ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

کہلاً کے لفظ سے ایک نوپیدا فرقے نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بوڑھی عمر تک پہنچ کر بھی اس دنیا میں زندہ تھے، حالانکہ لفظ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ فی المهد (بچپن) کے مقابلہ کی بڑی عمر اور پوری عمر یا پختہ عمر ہے جو نوجوانی کے ختم پر ۳۰، ۳۵ سال کے سن میں حاصل ہو جاتی ہے، لغت کے کچھ حوالے اس نوٹ میں درج ہو چکے ہیں، کچھ اب ملاحظہ ہوں، ایک میں صراحت ہے، ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان والے کو کہلاً کہتے ہیں۔

الكهل من الرجال الذي جاوز الثلاثين ووخطه الشيب (جوهري) الكهل من الرجال من زاد على ثلاثين سنة إلى الاربعين۔ (نهايه)

اور حدیث میں جو لفظ "کہلاً" آیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جنت میں عاقل و بالغ داخل ہوں گے۔

وقيل اراد بالكهل ههنا الحليم العاقل اي ان الله يدخل اهل الجنة الجنة حلماء عقلاء (نهاية لسان)

اور اردو میں اس کو پختہ عمر والا کہتے ہیں، مستند اردو مترجمین قرآن بھی اسی طرف گئے ہیں، بڑھاپے سے ترجمہ کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔

"بڑی عمر میں" (شاہ عبدالقادرؒ، تھانویؒ) "بڑے ہو کر" (نذیر احمدؒ) ادھیڑ (شاہ رفیع الدینؒ)۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـٴَـةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا

اور جب تم مٹی سے پرندہ جیسی ایک شکل میرے حکم سے وجود میں لانے لگے تھے پھر تم اس کے اندر پھونک مارتے تھے تو وہ

بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ

میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا ٣٣٩ اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے ٣٤٠

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ٣٠ سال کے اندر کسی روایت میں نہیں آئی ہے مسیحی اور اسلامی دونوں روایتوں میں ٣٠ سے اوپر کی آئی ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ مفردات راغب پر نگاہ گئی کہ جن چند لغات کا بیان رہ گیا ہے ان میں یہ لغت "کہل" بھی ہے[1] اور عجب مزید یہ کہ صحاح جوہری کے فارسی ترجمہ صراح میں بھی یہ لفظ چھوٹ گیا ہے۔

٣٣٩ حضرت عیسیٰ براہ راست حق تعالیٰ کے شاگرد تھے جیسا کہ اور سب انبیاء بھی ہوئے ہیں، اور سب سے بڑھ کر ہمارے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

الکتٰب۔ یہاں بطور اسم جنس کے ہے یعنی آسمانی کتابوں کی جنس۔

[illegible]

الحکمۃ۔ التورٰیۃ۔ الانجیل ان سب پر حاشیے گزر چکے سورۂ آل عمران آیت ٤٨ کے تحت۔

٣٤٠ ان سب خوارق پر حاشیے سورۂ آل عمران میں گزر چکے، آیت ٤٩ کے تحت۔

معجزہ اصطلاح میں ہر اس خارق عادت کو کہتے ہیں جس کا ظہور پیمبر کے ہاتھ سے کافروں اور منکروں پر پیمبر کی تائید میں و نصرت الٰہی کے اظہار کے لئے کرا دیا جاتا ہے۔

اور خارق عادت وہ واقعہ ہے جو کہ دنیا میں بندوں کے سمجھے اور قرار دیئے ہوئے کسی قاعدہ سے الگ ہو مثلاً عام قاعدہ بندوں کے مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ ہندوستان میں جون کے مہینہ میں تیز گرمی اور دسمبر میں تیز سردی پڑتی ہے اب اگر کسی پیمبر کی دعا سے جون میں برف جمنے اور دسمبر میں لو چلنے لگے تو یہ اس پیمبر کا معجزہ کہلائے گا۔ منکروں یا منکرین معجزات کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ بندوں کے مشاہدہ و تجربہ کو خود قدرت کی طرف سے کسی مستقل قاعدہ یا قانون کا اعلان سمجھے اور دوسری غلطی یہ کہ قاعدوں اور قانونوں کو قانون ساز اور قاعدہ گر کی مرضی و ارادہ سے بے نیاز خود مستقل، غیر لایزال (?) حیثیت بھی سمجھ بیٹھا۔

باذنی کی تکرار اس سارے سلسلۂ معجزات میں قابل غور ہے ___ جو کچھ بھی ہو رہا تھا بادی النظر میں کیسا ہی عجیب و غریب ہو، بہرحال تھا وہ اذنِ الٰہی، قانونِ تکوینی ہی کے کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت!

[illegible] (...)

تخلق۔ خلق کے معنی یہاں صورت بنانے کے ہیں۔

[illegible] الطائر (معالم)

تنفخ فیہا میں ضمیر مؤنث ھیئۃ کی طرف نہیں بلکہ کہیئۃ کے ک کی جانب ہے۔

[1] "مفردات راغب" مطبوعہ ١٣٢٨ھ [illegible]

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریمؑ! کیا آپ کا پروردگار قدرت رکھتا ہے کہ ہم پر

عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۲﴾

کھانے کا خوان آسمان سے اتار دے ۳۴۶؎ (اس پر عیسیٰؑ نے) کہا کہ اللہ سے ڈرو! اگر ایمان رکھتے ہو ۳۴۷؎

یعنی الذین لم یوصوا بك وبحمد وانبوتك (قرطبی)

۳۴۴؎ یا یہ کہ "ہم پورے مسلم ہیں"۔

مسلم کا لفظ کوئی نو پیدا اصطلاح نہیں، انبیاء کے ماننے والے تو ہمیشہ اور ہر نبی کے دور میں مسلم ہی کہلاتے ہیں۔

واذ اوحیت الی الحواریین۔ حواری پر حاشیہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا۔

وحی۔ کا اطلاق عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔

الوحی کل شیء دللت به من کلام او کتاب او اشارة او رسالة (ابن قتیبہ)

وحی۔ کے معنی قلب میں القاء یا الہام کے بھی ہوتے ہیں۔

والوحی فی کلام العرب معناہ الالہام ..... ای الہمتہم وقذفت فی قلوبہم (قرطبی) المراد بذلك الوحی الالہام والالقاء فی القلب (کبیر) قیل المراد بالوحی الیہم الہامہ تعالیٰ ایاہم (روح) عن السدی یقول قذفت فی قلوبہم (ابن جریر) قیل المراد بھذا الوحی وحی الہام (ابن کثیر)

وحی کے یہ معنی لے کر تو آگے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن وحی کو امر کے مرادف بھی قرار دیا گیا ہے۔

قال ابو عبیدة اوحیت بمعنی امرت وقیل اوحیت ھھنا بمعنی امرتہم (قرطبی) وجاء استعمال الوحی بمعنی الامر فی کلام العرب کما قال الزجاج (روح)

اس صورت میں صرف اتنا محذوف ماننا پڑے گا کہ "اے عیسیٰ، تمہارے ذریعہ سے"!

ای امرتہم فی الانجیل علی لسانك (روح) یحتمل ان یکون المراد اذا وحیت الیہم بواسطتك (ابن کثیر)

۳۴۵؎ یٰعیسی بن مریم۔ اس طرز خطاب سے صاف ظاہر ہے کہ حواری بھی آپؑ کو ابن مریم ہی سمجھتے تھے، ابن اللہ کا کوئی شائبہ بھی ان کے خیال میں نہ تھا۔

ھل یستطیع ربك۔ حواری بہرحال صاحب ایمان تھے، سوال سے ان کی مراد بہ قول مفسر تھانویؒ یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی امر مثلاً اس کا خلاف حکمت ہونا اس سے مانع تو نہیں؟

المراد من ھذا الکلام استفہام ان ذلك ھل ھو جائز فی الحکمة ام لا (کبیر) قیل ھذہ الاستطاعة علی ما تقتضیه الحکمة والارادة فکانہم قالوا ھل ارادة اللہ تعالیٰ وحکمته تعلقت بذلك اولا (روح)

مائدة من السماء۔ مائدہ کے اصل معنی خوان طعام کے ہیں اور پھر مطلق طعام کو بھی کہنے لگے۔

المائدة الطبق الذی علیه الطعام ویقال لکل واحدة منہما مائدة (راغب) مائدة وھی الخو

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ

وہ لوگ بولے کہ ہم تو (بس) یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں، اور اپنے دلوں کو مطمئن کر لیں اور یقین

صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

کر لیں کہ آپ ہم سے سچ بولے ہیں اور ہم اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں ۳۲۷ عیسیٰ ابن مریمؑ نے دعا کی ۳۲۸

علیہ الطعام (جوھری) المائدۃ فی المشھور الخوان الذی علیہ الطعام وتطلق المائدۃ علی نفس الطعام ایضًا (روح) المائدۃ الخوان الذی علیہ الطعام قال قطرب ویسمی الطعام ایضًا (قرطبی)

یہاں مراد کھانے ہی سے لی گئی ہے۔

قیل استدعوا طعامًا (راغب)

۳۲۶ یعنی بلا ضرورت خرق عادت کی طلب و فرمائش آداب ایمان کے بالکل خلاف ہے۔

اتقوا اللہ فی تعیین المعجزۃ فانہ جار مجری التعنت والتحکم (کبیر) اتقوا اللہ من أمثال هذا السؤال واقتراح الآیات (روح)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں زجر ہے کہ اہل اللہ میں خوارق کو تلاش کیا جائے۔

۳۲۷ حواری اپنی صفائی میں یہ تقریر کر رہے ہیں کہ سوال سے ہماری غرض کوئی بے ادبی نہیں تھی مقصود صرف اس قدر تھا کہ

ناکل منہا۔ ہم اس آسمانی غذا سے کچھ کھائیں اور اس سے لذت و برکت حاصل کریں۔

اکل تبرک (روح۔ معالم)

وتطمئن قلوبنا۔ اور اس خرق عادت کے مشاہدہ سے ہمارا ایمان اور ترقی حاصل کرے۔

بازدیاد الیقین کما قال عطاء (روح)

ونعلم۔ اور ہم مشاہدہ کی مزید قوت کے ساتھ یقین حاصل کریں۔

علم مشاھدۃ وعیان علی ما قدمناہ (روح)

اَنْ قد صدقتنا۔ کہ آپ اپنے دعوی نبوت میں بالکل سچے ہیں۔

ای ان قد صدقتنا فی ادعاء النبوۃ (روح) ای تزداد ایمانا ویقینا (معالم)

ونکون علیھا من الشاھدین } اور اس کے بعد ہم دوسروں کے سامنے بھی یہ گواہی دے سکیں کہ ہاں ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسا معجزہ دیکھا ہے، اور اس طرح ان کی ہدایت کا ذریعہ بھی بن جائیں۔

عند من لم یحضرھا من بنی اسرائیل (روح) ونکون من الشاھدین للہ عند بنی اسرائیل (معالم)

نرید۔ ارادہ یا تو اپنے عام معنی میں ہے اور یا شوق و تمنا کے معنی میں۔

والارادۃ اما معناھا الظاھر او بمعنی المحبۃ (روح)

۳۲۸ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھ لیا کہ حواریوں کی غرض فاسد نہیں تو اب ان کے فرمائشی معجزہ

اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا

کہ اے اللہ اے ہمارے پروردگار ہم پر سے ایک خوان (طعام) آسمان سے ایسا اتار دیجئے کہ وہ ہمارے لئے (یعنی ہم میں) اگلوں

وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ

اور پچھلوں کے لئے ایک جشن بن جائے اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے اور ہمیں عطا کر دیجئے اور آپ ہی بہترین عطا کرنے والے ہیں ۳۴۹

مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ

اللہ نے فرمایا کہ وہ کھانا ضرور تم پر اتاروں گا لیکن پھر جو کوئی تم میں سے کفر اختیار کرے گا اسے سزا بھی وہ دوں گا کہ وہ سزا دنیا

اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

والوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا ۳۵۰ اور (وہ وقت بھی قابل یاد رکھنے کے ہے) جب اللہ فرمائے گا ۳۵۱ کہ اے عیسیٰ ابن مریم

ع ۱۵ / ۵

کے لئے حضرت حق سے دعا و مناجات کی۔

۳۴۹ دعا کے الفاظ اللھم، ربنا، وارزقنا وانت خیر الرازقین کس کس طرح عقیدۂ اُلوہیت مسیح پر ضرب لگانے والے ہیں! اللھم اور ربنا دونوں میں الوہیت و ربوبیت کا مکرر انتساب حق تعالیٰ کی جانب حضرت مسیح کی زبان سے ہے۔

عیدًا۔ عید کہتے ہیں اس خوشی کو جو بار بار لوٹ کر آتی رہے، یعنی اسے تہوار کا دن بنا لیں۔

العید السرور العائد (کشاف) یستعمل العید فی کل یوم فیہ مسرۃ (راغب) ای یکون یوم نزولھا عیدا۔ (مدارک)

لاولنا واخرنا۔ یعنی ہم لوگ جو موجود ہیں ان کے لئے بھی اور جو لوگ ہمارے بعد آئیں ان کے لئے بھی۔

ای لاھل زماننا ولمن یجیء بعدنا (روح) قال ابن عباس لاولنا اھل زماننا ولمن یجیء بعدنا (معالم)

ایۃ منک۔ ایک ایسی نشان بن جائے میری پیمبری کا کہ اس سے مومنین کا ایمان بڑھ جائے اور منکرین پر حجت قائم ہو جائے۔

ایۃ کائنۃ منک دالۃ علی کمال قدرتک وصحۃ نبوتی (روح) علی صحۃ نبوتی (مد[illegible])

من السماء۔ یہ لازمی نہیں کہ نزول آسمان ہی سے ہو، بلکہ صرف جہت آسمان یا بلندی سے نزول بھی مراد ہو سکتا ہے۔

والمراد بھا اما المحل المعھود وھو المتبادر من اللفظ واما جھۃ العلو (روح)

سماء پر حاشیے بار بار اس تفسیر میں آئے ہیں کہ اس لفظ سے کلام عرب میں مراد ہمیشہ آسمان ہی نہیں ہوتی بلکہ مطلق بلندی بھی مراد ہوتی ہے۔

وانت خیر الرازقین۔ رزق سے معاً رازق تک پہنچ جانا اور فوراً خیر الرازقین کی حمد و ثنا میں لگ جانا پیمبروں کی زبان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

۳۵۰ ایسی کھلی ہوئی حسی و مشاہدہ میں آئی ہوئی نعمت کا انکار جس شدید درجہ کی ناشکرگزاری ہے، سزا بھی اسی درجہ میں شدید ملے گی۔

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

کیا تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ "خدا کے علاوہ مجھے اور میری والدہ کو بھی معبود بنا لو" ۳۵۱؎ (عیسیٰ) عرض

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ

کریں گے پاک ہے تو میرے لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ میں ایسی بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا ۳۵۲؎

قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ

اگر میں نے کہا ہوتا تو یقیناً تجھ کو اس کا علم ہوتا، تو تو جانتا ہی ہے جو کچھ میرے دل میں ہے البتہ میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے

اجر ایمان کا دار و مدار غیبت پر بھی ہے اب جو واقعہ سلسلۂ اسباب عادیہ سے اس قدر الگ ہو جیسا کہ بلا اسباب ظاہری بلکہ خلاف اسباب ظاہری، آسمان یا جہت آسمان سے تیار شدہ کھانے کا اتر آنا نہایت عجیب اور معمول سے زیادہ نمایاں معجزہ ہے اتنے کھلے ہوئے خارق عادت کے ایمان پر انکار کرنا غیب ہی سے نہیں کہنا چاہئے کہ شہود کے بعد بھی انکار پر قائم رہنا ہے، جو جحود کی قبیح ترین شکل ہے اور ایسے جرم کی سزا بھی شدت جرم ہی کی مناسبت سے شدید ترین ہوگی۔

انی منزلها علیکم۔ مفسرین کے ایک گروہ نے ان الفاظ سے یہ استنباط کیا ہے کہ نزول مائدہ ضرور واقع ہو کر رہا، لیکن مفسرین ہی کے دوسرے گروہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس کی بھی قید لگا دی ہے یعنی ان سائلم اور واقعۂ نزول سے انکار بعض تابعین تک سے منقول ہے۔

فقال مجاهد والحسن لم ینزل (معالم) قال الحسن ومجاهد لما سمعوا الشرط فاشفقوا فلم ینزل (بحر) قال الحسن ان المائدة لم تنزل (مدارك)

منزلها۔ اس صیغۂ تفعیل نے ایک معنی یہ بھی پیدا کر دئے ہیں کہ یہ نزول خوان بار بار ہوتا رہے گا۔

مرة بعد اخرى كما ينبئ عن ذلك صيغة التفعيل (روح) اے منزلها مرة بعد اخرى (كبير)

۳۵۱؎ (قیامت کے دن)

یہ سوال و جواب مسیحیوں یعنی مسیح پرستوں کو اور زیادہ قائل اور شرمندہ کرنے کے لئے میدان حشر میں ہوگا۔

قال قتادة وابن جريج واكثر المفسرين انما يقول له هذا يوم القيامة (قرطبی) الجمهور على ان هذا السوال يكون في يوم القيامة (مدارك) قال سائر المفسرين انما يقول الله له هذا القول يوم القيامة (معالم)

۳۵۲؎ مسیح پرستی تو خیر موجودہ مسیحیت کے مرادف ہی ہے لیکن مریم پرستی بھی مسیحی دنیا کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، دعائیں اس "خدا کی کنواری" کو مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، نذریں اور نیازیں ان کے نام پر کی جاتی ہیں، کیتھولک گرجاؤں میں قد آدم تصویریں ان کی لگی رہتی ہیں، جن کے آگے مراسم پرستش بجا لائے جاتے ہیں۔

مریم پرستی پر مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

سوال سے مقصود ظاہر ہے کہ استفہام و استفسار نہیں، بلکہ مسیح پرستوں اور مریم پرستوں پر مزید حجت قائم کرنا،

إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١١٦﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ

بے شک تو ہی تو ہے پوشیدہ چیزوں کا خوب جاننے والا ۳۵۴ میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا بجز اس کے جس کا تو نے

اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ

مجھ کو حکم دیا تھا یعنی یہ کہ میرے اور اپنے پروردگار اللہ کی پرستش کرو ۳۵۵ میں ان پر گواہ رہا جب تک میں ان کے درمیان رہا

اور انھیں اور زیادہ خجل ولاجواب کرنا اور انھیں خود انھیں کی نظر میں ذلیل کرنا ہے۔

ولیس ھو باستفھام انہ سالہ عن ذلک لیعلمہ من ادعی ذلک علیہ لیکون انکارہ بعد السوال ابلغ فی التکذیب واشد فی التوبیخ والتقریع۔ (قرطبی)

۳۵۳ میری مجال نہیں کہ میں ایسا صریح کلمۂ باطل زبان سے نکال سکتا!

فخر المفسرین امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ کے براہ راست سوال اقلت للناس کا جواب براہ راست ما قلت دینے اور یوں اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے اسے تمام تر علم الٰہی کے حوالے کر دیئے اور یہی مقام ادب و تواضع کے زیادہ مناسب بھی تھا

فلم یقل بانی ما قلت ھذا الکلام لان ھذا یجری مجری دعوی الطھارۃ والنزاھۃ والمقام مقام الخضوع والتواضع (کبیر)

سبحانک یعنی پاک ہے تو ہر قسم کی شرکت سے اور ہر ایسے انتساب سے جو تیری شان کے لائق نہ ہو۔

۳۵۴ حضرت عیسیٰ عرض کریں گے کہ بالفرض میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی اور جب تیرے علم میں نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی میرے ناقص و محدود علم اور تیرے کامل و غیر محدود علم کا تقابل ہی کیا، میری ہر چھپی ہوئی چیز خوب تجھ پر روشن، لیکن تیری کوئی سی بھی چھپی ہوئی چیز مجھ پر روشن نہیں، اور ایک میرے ہی مغیبات پر کیا موقوف ہے، تجھ پر تو ہر غیب روشن ہے۔

انک انت علام الغیوب سے مقصود حق تعالیٰ کے علم محیط و کامل کا اثبات ہے اور اس میں رد آگیا بہت سی مشرک قوموں کے عقائد واہیہ کا۔

یہ حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا جواب ہے، پہلا جواب لفظ سبحانک میں آگیا یعنی تیری شانِ تنزیہی کے بالکل خلاف ایسی بات میں زبان سے نکال کیونکر سکتا تھا۔

ما فی نفسک۔ سے بعض اہل باطل نے حق تعالیٰ کی تجسیم نکالنی چاہی ہے اور کہا ہے کہ نفس سے مراد جسم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا، اول تو نفس و ذات مرادف ہیں، جسمیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

النفس عبارۃ عن الذات یقال نفس الشئ وذاتہ بمعنی واحد (کبیر) قال الزجاج النفس عبارۃ عن جملۃ الشئ وحقیقتہ یقول تعلم جمیع ما اعلم من حقیقۃ امری ولا اعلم حقیقۃ امرک (معالم) ای ذاتک فنفس الشئ ذاتہ وھویتہ والمعنی تعلم معلومی ولا اعلم معلومک (مدارک)

اور پھر نفسی کے مقابلہ میں نفسک لانا ہی بہ قاعدۂ مشاکلت عربی اسلوبِ بیان میں فصیح تر ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾

پھر جب تو نے مجھے (دنیا سے) اٹھالیا (جب سے) تو ہی ان پر نگراں ہے اور آپ ہر چیز پر گواہ ہیں ۳۵۶

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾

تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں ۳۵۷ اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو ہی زبردست حکمت والا ہے ۳۵۸

ذکر هذا الکلام علی طریق المطابقة والمشاکلة وهو من فصیح الکلام (کبیر)

۳۵۵ موجودہ انجیلیں بھی باوجود اپنے تثلیثی شرک کے اس توحیدی تعلیم کو مٹا نہ سکیں :-

"یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا، اور دیکھو فرشتے آکر اس کی خدمت کرنے لگے۔" (متی ۴: ۱۰ و ۱۱)

"یسوع نے جواب میں اس سے کہا لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (لوقا ۴: ۸)

ان اعبدوا میں ان مفسرہ اے کے مرادف ہے۔

ان مفسرة بمعنی ای (مدارک) ان مفسرة (کبیر)

حضرت کا یہ کلام آپ کی کمال عبدیت اور انتہائی عبودیت پر دلالت کر رہا ہے آپ نے اس پیام توحید کو بھی براہ راست اپنی جانب منسوب نہیں کر دیا کہ میں انھیں یہ پیام دے آیا تھا بلکہ یوں عرض کیا کہ میں تو وہی کہہ آیا تھا جس کا حکم تو نے ہی دیا تھا، پیام توحید بھی میری اپنی جانب سے نہ تھا تیرے ہی ارشاد کی تعمیل یہ بھی تھی۔

۳۵۶ آیت میں ایک بار پھر حضرت حق کے علم محیط و کامل کا اثبات ہے۔

کنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم یعنی میں جب تک دنیا میں زندہ رہا میری امت کا حال میرے علم و مشاہدہ میں آتا رہا

فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم یعنی جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا، اس کے بعد سے مجھے کچھ خبر نہیں

توفیتنی۔ یہ لفظ دونوں مفہوموں کو شامل ہے زندہ آسمان پر اٹھالئے جانے کو بھی جیسا کہ جمہور امت کا قول ہے

المراد منه وفاة الرفع الی السماء (کبیر) ای قبضتنی بالرفع الی السماء کما یقال توفیت المال اذا قبضته وروی هذا عن الحسن وعلیه الجمهور۔ (روح)

اور طبعی موت کو بھی جیسا کہ جبائی معتزلی کا قول ہے اور مفسرین نے بھی اسے قبول کئے بغیر نقل کیا ہے۔

وعن الجبائی ان المعنی امتنی ولاهی ان رفعه علیه السلام الی السماء کان بعد موته والیه ذهب النصاری (روح) قیل هذا یدل علی انه توفاه وفاة الموت قبل ان ترفعه ولیس بشیء (بحر)

قال الحسن الوفاة وفاة الموت ووفاة النوم ووفاة الرفع (بحر)

"جب تو نے مجھے قبض کر لیا" (ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ) "جب تو نے مجھے بھر لیا" (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ)

۳۵۷ (اور تو ان کا مالک و مختار اور پیدا کرنے والا ہے تو جو چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے میں دخل دینے کی مجال نہیں رکھتا میں ان کا لاکھ خیر خواہ سہی پھر بھی وہ حق تو نہیں رکھ سکتا جو خالق کو اپنی مخلوق پر اور معبود کو اپنے عبد پر ہوتا ہے

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ

اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے جب سچوں کے کام ان کا سچ آئے گا ۳۵۹ؔ ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

نیچے ندیاں بہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیش کو رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش رہا اور وہ اللہ سے

عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

خوش رہے یہی بڑی کامیابی ہے ۳۶۰ؔ

عبد و معبود کا رشتہ دنیا کے ہر ممکن رشتہ پر فائق و مقدم ہے۔

۳۵۸ؔ تو ان کی مغفرت ہی کر دینا چاہے تو کون تجھ کو روک سکتا ہے تو سب پر غالب العزیز ہے تیرا ارادہ سب پر حاکم و مقتدر لیکن تو اسی کے ساتھ الحکیم بھی تو ہے تیرا کوئی فیصلہ خلاف حکمت ہو نہیں سکتا، تو کرے گا وہی جو تیرے آئین و حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا، میں ایک بندہ ہو کر اس میں دخل دینے والا کون؟

یعنی انت قادر علی ما ترید، حکیم فی کل ما تفعل لا اعتراض لاحد علیک فمن انا والخوض فی احوال الربوبیۃ (کبیر)

واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو قیامت میں ہوگی جہاں کافروں اور منکران دین حق کے لئے کوئی محل ہی شفاعت کا نہیں، یہیں سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے اس کلام میں ان کے پیمبر جلیل القدر ہونے کے باوجود کوئی شائبہ شفاعت کا نہیں، بلکہ مقصود تمام تر اللہ کی طرف تفویض ہے۔

ومقصودہ منہ تفویض الامور بالکلیۃ الی اللہ تعالٰی وترک التعرض والاعتراض بالکلیۃ (کبیر)

دل ذلک علی ان غرضہ تفویض الامر بالکلیۃ الی اللہ تعالٰی وترک التعرض لھذا الباب من جمیع الوجوہ (کبیر)

ضمناً حضرت مسیحؑ کے اس کلام سے تردید بھی مسیحیوں کے اس عقیدہ کی نکل آئی کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کے نہیں، خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا، جیسا کہ موجودہ انجیل میں ہے:-

"باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا، بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے"۔ (یوحنا ۵:۲۲)

۳۵۹ؔ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد اوپر کے سب مکالمات و مخاطبات کے بعد ہوگا۔

الصادقین۔ وہ ہیں جو دنیا میں عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ پر قائم رہے ہوں۔

(المعنی ان صدقھم فی الدنیا ینفعھم فی القیامۃ (کبیر)

اس کے ماتحت میں انبیاءؑ کے علاوہ عام مومنین بھی داخل ہیں۔

صدقھم یعنی وہ سچائی جس کا اقرار انھوں نے دنیا میں کیا تھا، اقرار توحید و رسالت۔

۳۶۰ؔ بڑی کامیابی کس چیز کو کہا گیا ہے؟ جمہور مفسرینؒ کا خیال ہے کہ یہ اشارہ پوری آیت کی جانب یعنی نعمت جنت اور نعمت رضوان الٰہی سب کی جانب ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے اس (سب) کی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۶۱

الجمہور علی ان قولہ ذلک عائد الی جملۃ ما تقدم من قولہ لھم جنات الی قولہ ورضوا عنہ (کبیر)
لیکن امام رازیؒ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ الفوز العظیم کا تعلق صرف رضوان الٰہی سے ہے جس کے مقابلہ میں جنت کی عام نعمتوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

وعندی انہ یحتمل ان یکون ذلک مختصا بقولہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ فانہ ثبت عند ارباب الالباب ان جملۃ الجنۃ بما فیھا بالنسبۃ الی رضوان اللہ کالعدم بالنسبۃ الی الوجود وکیف والجنۃ مرغوب الشھوۃ والرضوان صفۃ الحق وای مناسبۃ بینھما (کبیر)

امام موصوف تصوف کے بھی ذوق شناس تھے خدا جانے خشک متکلم کیسے مشہور ہو گئے خود بھی خشک متکلموں سے عاجز تھے چنانچہ یہیں اپنا خیال لکھ کر فرماتے ہیں:۔

وھذا الکلام یشمئز منہ طبع المتکلم الظاھری ولکن کل میسر لما خلق (کبیر)

ابداً۔ صراحت کے ساتھ یہ دوام اور ابدیت کی خوشخبری اہل جنت ہی کے حق میں آئی ہے ورنہ اہل دوزخ کے لئے وعید صرف لفظ خلود کی حد تک ہے۔

(اشارۃ الی الدوام (کبیر)

۳۶۱ ایجاد و اعدام ہستی سے نیستی اور نیستی سے ہستی ہر چیز پر قادر۔ اس کی قدرت علی الاطلاق کو کسی شرط و قید سے محدود و مقید کرنا سرتا سر جہل ہے۔

مخلوقات پر حکومت و سلطنت جو کچھ ہے وہ خدائے واحد و یکتا کی ہے نہ کہ کسی فرزند خدا یا مظہر خدا وغیرہ کی۔

مافیھن۔ ما غیر ذوی العقول یا بے جانوں کے واسطے آتا ہے اور من ذوی العقول کے لیے امام رازیؒ نے یہ سوال قائم کر کے کہ یہاں من کے بجائے ما کا استعمال کیوں ہوا ہے جواب یہ دیا ہے کہ ساری مخلوقات اپنے مسخر ہونے کے اعتبار سے خالق کی قضا و قدرت کے آگے ایسی ہیں کہ جیسے ان میں جمادات کی طرح نہ کوئی توت ہو نہ بہائم کی طرح عقل ہے اللہ کی قدرت کے سامنے وہ گویا بالکل بے قدرت اور اللہ کے علم کے سامنے وہ گویا بالکل بے علم ہیں۔

ولم یقل ومن فیھن فغلب غیر العقلاء علی العقلاء والسبب فیہ التنبیہ علی ان کل المخلوقات مسخرون فی قبضۃ قھرہ وقدرتہ وقضائہ وقدرہ وھم فی ذلک التسخیر کالجمادات التی لا قدرۃ لھا وکالبھائم التی لا عقل لھا فعلم الکل بالنسبۃ الی علمہ کلا علم وقدرۃ الکل بالنسبۃ الی قدرتہ کلا قدرۃ (کبیر)